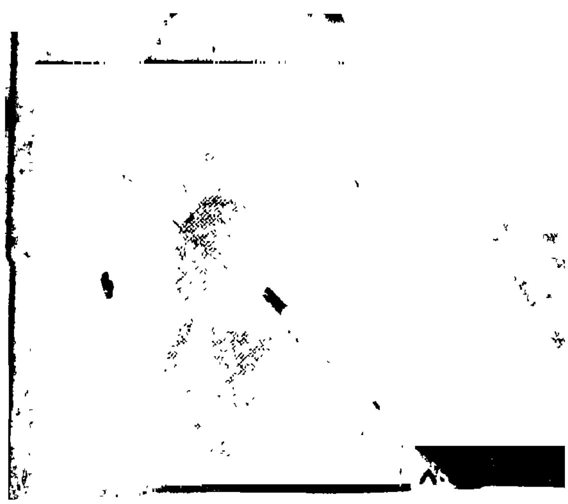
طوع



صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہو جیے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان ٹائیلٹ کے لوازمات، اون گرم کپڑا، ٹیلرنگ و صرف جنٹس کے لئے تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت موجود رہتا ہے

لٹ سٹریٹ کراچی

ا ح ا ر

ہی آج بھی ہے
...چاہئے کہ اسے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی ز لا برہان ... اینڈ

یہی آج بھی رہا ہے۔

20 JAN 1952

سلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتبہ	بدل اشتراک
آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۲ شلنگ

جلد ۵	جنوری سنہ ۱۹۵۲ء	نمبر ۱

فہرستِ مضامین

بخوبی آگاہ۔ لیکن ... اسے اپنے نصب العین
...راط مستقیم سمجھتا ہی نہیں۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے (اور ...

باسمہ تعالیٰ

سالِ نو

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

اشاعتِ زیرِ نظر سے طلوعِ اسلام کی (نشأۃِ ثانیہ کی) عمر کا پانچواں سال شروع ہوتا ہے۔ اور اگر اس کے دورِ اول کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو اس نے اب اپنی زندگی کے نویں سال میں قدم رکھا ہے۔ تجربے نے بتایا ہے کہ اس کی زندگی کا چوتھا سال اس پر کچھ "بھاری" ہوتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ اس کٹھن منزل سے آگے نکل آیا ہے اور اب امید ہے کہ بتوفیقِ ایزدی، یہ آگے ہی آگے بڑھتا جائے گا۔ ھی حتیٰ مطلع الفجر۔

جیسا کہ قارئین نے خود محسوس کر لیا ہوگا، طلوعِ اسلام (بقول علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ) ایک علمی کھیل نہیں بلکہ ایک نہایت اہم تحریک کا نقیب ہے۔ وہ تحریک ہے اس دین (نظامِ زندگی) کا دوبارہ احیاء جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا اور جو آج قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ دنیا نے شاید اس سے زیادہ ستم ظریفی کبھی نہ دیکھی ہوگی کہ ہر مسلمان (جاہل اور "عالم") اقرار کرتا ہے کہ قرآن پر اس کا ایمان ہے اور یہی اس کے لئے نورِ ہدایت ہے۔ لیکن جب اسے قرآن کے مطابق نظامِ زندگی کے قیام کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو یہی مسلمان ("عالم" اور جاہل ـــــ سب سے پہلے "عالم" اور ان کی دیکھا دیکھی بیچارا جاہل) اس آواز کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ یہ مخالفت سب سے زیادہ اس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے جسے "علمائے کرام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وہ عوام کو اُکساتے ہیں کہ شور مچاؤ تاکہ قرآن کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑنے پائے ـــــ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے؟

قرآن نے کفار کے متعلق کہا تھا کہ وہ اپنے متبعین کو تاکید کیا کرتے تھے کہ لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (۴۱/۲۶) "تم اس صورت میں کامیاب ہو سکتے ہو کہ تم خود بھی اس قرآن کو کبھی نہ سنو اور اس قدر شور مچاؤ کہ کوئی اور بھی اسے سننے نہ پائے۔" حیرت ہے کہ [illegible] سے جو مسلک کفار کا بتایا تھا اسے خود مسلمان (اور عوام نہیں بلکہ ان کے اکابر) اختیار کر رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام قرآن کی دعوت کا نقیب ہے اس لئے اس کی مخالفت غیر متوقع نہیں۔ ہر طرف سے شور مچایا جا رہا ہے کہ اس کی آواز نہ خود سنو نہ کسی کو سننے دو۔ لعلکم تغلبون۔ "شور مچانے" کی تلقین اس لئے کی جاتی ہے کہ ان کے پاس طلوعِ اسلام کے قرآنی دلائل کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہی نہیں۔ [illegible] الٰہی نے کہہ دیا ہے کہ جو شخص قرآن کے خلاف دلیل لانا چاہے اسے سن رکھنا [illegible] چاہئے کہ اسے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی (۲۵/۳۳)۔ جسے دلیل نہیں ملے گی وہ شور مچائے گا۔ یہی اُس وقت ہوتا تھا، یہی آج ہو رہا ہے۔

قرآنی نظام کی بنیاد اس اصلِ عظیم پر ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ ...یت صرف خدا کے دیئے ہوئے قانون کی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض احکام کی ...یات بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے اور دیگر احکام کے صرف اصول بیان کرتا ہے۔ جن احکام کے وہ صرف اصول بیان کرتا ہے ...ے مقصود یہ ہے کہ ان کی جزئیات، زمانے کے ساتھ ساتھ بدلنے والی ہیں، ہمیشہ غیر متبدل رہنے والی نہیں۔ ان جزئیات کو ...نظامِ حکومت مرتب کرے گا۔ اسی کا نام اسلامی شریعت ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت کوئی جامد، غیر متبدل اور متصلب ...بطہ قانون نہیں بلکہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ رہنے والا نظام ہے جس کے اصول غیر متبدل ہیں۔ ان غیر متبدل ...لوں کی روشنی میں، سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئیات مرتب فرمائیں۔ حضورؐ کے بعد آپ ...خلفائے کرامؓ نے، حسب ضرورت، اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ان میں ردوبدل کیا۔ اس سلسلے کو بدستور ...ے چلتے رہنا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد خلافت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ بھی رک گیا۔ اب اس ...سلہ کو دوبارہ جاری کرنے کا طریق وہی ہے جسے رسول اللہؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئیات، ہم ...پنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کریں۔

یہ تو ہے قرآنی نظام کی تشکیل کا طریق۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نظام کے قیام سے مقصود کیا ہے۔ اس کا مقصود قرآن ...اپنے پہلے فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی رب العالمین۔ اسی کو ربوبیتِ عامہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسے معاشرے کا قیام جس میں تمام ...رادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اس معاشرے کا نظام ہو اور وہ ہر فردِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کے کامل نشوونما کیلئے ...ساں طور پر اسباب و ذرائع بہم پہنچائے۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرے میں نہ کسی کو ذاتی حکومت کے اختیارات حاصل ہوں گے ...کوئی رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت میں لا سکے گا۔ نہ کوئی دولت سمیٹ کر سرمایہ داری کے جراثیم پھیلا سکے گا نہ کوئی خدا ...زمین پر سانپ بن کر بیٹھ سکے گا۔ نہ اس میں ملوکیت ہوگی نہ ملا ازم کی پیشوائیت۔ قرآنی نظام وہ ضربِ کلیمی ہے جس کے ...سامنے کوئی فرعون (نمائندۂ ملوکیت) ہامان (ترجمانِ پیشوائیت) اور قارون (لعنتِ سرمایہ داری کا مظہر) سر نہیں اٹھا سکے گا۔ ...یہ معاشرہ درحقیقت اس زمین پر جنت کا عکس ہوگا۔ اسی میں نوعِ انسان کے قیام کا راز پوشیدہ ہے اور یہی امنِ عالم کا کفیل ہے۔

لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون۔

طلوعِ اسلام اسی نظامِ قرآنی کے قیام کی طرف دعوت دینے کی تحریک کا نقیب ہے۔ ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت ...باب اقتدار کی طرف سے بھی ہوگی اور مدعیانِ مذہب و شریعت کی طرف سے بھی۔ سرمایہ دار طبقہ بھی اسے اپنی مفاد پرستیوں ...کی راہ میں سنگِ گراں سمجھیگا اور جاگیردار بھی اسے گردن زدنی قرار دے گا۔ طلوعِ اسلام اپنے راستہ کی ان تمام مشکلات سے باخبر ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی بے سروسامانی سے بھی بخوبی آگاہ۔ لیکن، بایں ہمہ، اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر اس قدر یقینِ محکم ہے کہ وہ اس راستے کے علاوہ کسی اور راہ کو صراطِ مستقیم سمجھتا ہی نہیں۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے (اور خدا کرے

کہ ایسا بھی کبھی نہ ہو) کہ صعوباتِ سفر سے ان کے پاؤں شل ہو جائیں اور وہ تھک کر بیٹھ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کر لے، کہ اس راہ کے علاوہ ہر دوسری راہ تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے جانے والی ہے۔

یہ ہے طلوعِ اسلام کا مسلک اور یہ ہے اس کا واضح نصب العین۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے سب سے پہلا مرحلہ تطہیرِ فکر کا ہے۔ مسلمان، ہزار برس سے عجمی سازش کا شکار ہو کر دین کی راہ سے ہٹ کر ایک دوسری راہ پر چلا جا رہا ہے۔ یہ دوسری راہ وہ ہے جو عجمی اقنومِ ثلاثہ (یعنی یہود کی پیشوائیت، عیسائیت کی خانقاہیت اور ایران کی مجوسیت) نے "مذہب" کے نام سے متعین کی اور جو ملوکیت کے سائے میں مولویت اور خانقاہیت کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ یہی قوتیں اس "عجمی اسلام" کی محافظ و نگہبان رہیں اور یہی قوتیں آج بھی اسے سہارا دے رہی ہیں کہ یہ کہیں زمانے کے تھپیڑوں سے گر نہ جائے۔ لیکن برف کے بت، رات کی برودت میں، قائم رہ سکتے ہیں، سورج کی ہر کرن ان کے لئے پیغامِ موت ہوتی ہے۔ اب زمانے کے تقاضے اس قدر شدید ہو رہے ہیں کہ اس قسم کی کھوکھلی لکڑیوں کے آسرے پر، یہ جسدِ بے روح زیادہ عرصے تک تختِ سلیمانی پر مسلط رہ نہیں سکتا۔ لیکن مسلمان کی نگاہوں پر عقیدت مندی اور اسلاف پرستی کے اسقدر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ یہ زمانے کے ان تقاضوں کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا سب سے پہلا کام اس کی نگاہوں سے ان پردوں کا ہٹانا ہے۔ اسی کا نام تطہیرِ فکر ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف مروجہ مذہب کی اصل و حقیقت کو بے نقاب کر کے بتایا جائے کہ یہ وہ دین نہیں جسے خدا نے بھیجا تھا اور دوسری طرف دینِ حقیقی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کر کے دکھایا جائے کہ یہ ہے اس نظامِ زندگی کا ضابطہ جسے نوعِ انسان کے لئے خود خدا نے متعین کیا ہے۔ یہ قرآنی فکر جسقدر عام ہوگی اسی قدر نظامِ قرآنی کی تشکیل کے لئے فضا سازگار ہوتی جائے گی۔ طلوعِ اسلام سر دست اسی پہلے مرحلے سے گذر رہا ہے۔ اسی مرحلے کا اگلا قدم یہ ہوگا کہ ملک میں ایسے مکاتب (مدرسے اور کالج) قائم کئے جائیں جن میں علومِ جدیدہ کے ساتھ ساتھ قرآنی نظام کی تعلیم دی جائے اور اس طرح بچوں کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح قرآنی خطوط پر ہوتی چلی جائے تاکہ بڑے ہونے پر ان میں سے ہر ایک نوجوان، قرآنی نظام کا ایک فعّال عنصر بن جائے۔ یہی وہ نوجوان ہوں گے جن کے ذہنوں کا جلا، قلب کی حرارت، نگاہوں کی وسعت، پیشانیوں کا نور، خون کی گرمجوشی، بازوؤں کی قوت اور قدموں کی استقامت، ایک سیلابِ بے پناہ بن کر آمریت اور غیر خدائی نظام کے قصرِ مشید کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔ اور اس کے بعد پھر سے وہ نظامِ ربوبیت قائم ہو سکے گا جسے آسمان کی آنکھ نے ایک مرتبہ دیکھا ہے اور اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آجتک سرگرداں اور دن اور رات چشم براہ ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ نظام قائم ہو کر رہے گا ورنہ قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنا قطعاً بے سود تھا۔ یہ کب قائم ہوگا؟ اس کا انحصار ہے ہماری جدوجہد اور سعی و عمل پر کہ جنت کی وراثت یکسر عمل کا نتیجہ بتائی گئی ہے۔ اس وقت ساری دنیا، اپنے اپنے غلط نظامہائے زندگی کے انسانیت سوز نتائج و عواقب سے تنگ آ کر ایک نئے نظام کی تلاش میں، مضطرب و بیقرار پھر رہی ہے۔ چونکہ ان اقوامِ عالم کے سامنے وحی کی روشنی نہیں اس لئے وہ اپنے ظن و تخمین کی وادیوں میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کا سر پھٹتا ہے، کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹتی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اگلی لاٹھی کدھر سے اٹھے گی اور کس کے

لگے گی۔ دنیا میں، اس سے قبل، شاید ہی کوئی دور ایسا آیا ہو جس میں پوری کی پوری انسانیت، اپنے بنائے ہوئے زندان سے نکلنے ے لئے اس طرح تڑپ رہی ہو۔ غور کیجئے کن حالات میں، اس قوم پر جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور جسے ضابطۂ ائینِ خداوندی کا امین بنایا گیا تھا، کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا فرمودہ لگاتے ہوئے چراغ کو تہِ دامن چھپائے بیٹھی ہے اور اس طرح خود بھی اس کی روشنی سے محروم ہے اور باقی دنیا کو بھی اندھیرے ں رکھے ہوئے ہے۔ اگر اسے تعلّی پر محمول نہ کیا جائے (بلکہ تحدیثِ نعمت سمجھا جائے) تو یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ اس وقت عرشی صاحب کے الفاظ میں) ساری دنیا میں صرف طلوعِ اسلام اس آواز کو بلند کر رہا ہے کہ اس "یدِ بیضا" کو پھر سے آستین سے باہر نکال کر دنیا کو بقعۂ نور بنا دو تاکہ اس کی روشنی میں تم بھی جانبِ منزل جادہ پیما ہو سکو اور تمہارے پیچھے پیچھے باقی دنیا بھی من و عافیت کی جنت کی طرف گامزن ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آواز اس وقت بڑی کمزور ہے اور اس کا حلقہ بڑا محدود۔ لیکن اسے صورِ قیامت بنا دینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آواز فی الواقعہ حق اور صداقت کی آواز ہے تو اسے شیدِ کامرانی بنانے میں جو مدد بھی آپ کر سکیں گے وہ قرآنی نظام کے قیام کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھانے کے مرادف ہوگا۔ ہی وہ طریقہ ہے جس سے قطرے، دریا بن جاتے ہیں اور افراد، کارواں کی صورت اختیار کر کے، راستہ کی پُرخطر گھاٹیوں سے محفوظ و مصئون، جانبِ منزل رواں دواں بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ہم افراد سے زیادہ، ان اداروں کی توجہ بھی اس نقطہ کی طرف مبذول رانا چاہتے ہیں، جو قرآنی نظام کی تشکیل کو اپنا مطمحِ نگاہ سمجھتے ہیں، کہ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ طلوعِ اسلام کا قدم صحیح راہ پر اٹھ رہا ہے، تو الگ الگ، منتشر کوششوں کی بجائے، وہ اسی کو اپنی سعی و عمل کا مظہر کیوں نہ بنا لیں؟ اس سے، اس منزل کی طرف جانے والے تمام افراد کے لئے وحدتِ مرکز اور ہم آہنگی فکر و عمل پیدا ہو جائے گی جو نظامِ قرآنی کے لئے اصل و بنیاد ہے۔ ابتداءً نیتیں کتنی ہی نیک اور دل کیسے ہی پُرخلوص کیوں نہ ہوں، الگ الگ مراکز سے، آگے چل کر، الگ الگ فرقے بن جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ اس لئے یہ، قرآنی نگاہ رکھنے والے تمام افرادِ ملت کے خیالات کا ترجمان ہے۔ بنابریں، اس نہج کے لکھنے والے اسی میں لکھیں اور ان خیالات کو پھیلانے کا جذبہ رکھنے والے، اسی کو پھیلائیں۔ اس سے اس قرآن برادری کے افراد، تشتتِ فکر و نظر اور انتشارِ سعی و عمل سے بچ جائیں گے۔

بہرکیف، افراد ہوں یا ادارے، جو بھی طلوعِ اسلام کے مسلک سے متفق ہوں، ان کی ہر کوشش، اس آواز کو آگے بڑھانے کا موجب اور اس تحریک کی تقویت کا باعث ہوگی۔ اس باب میں ہمیں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو اسے اپنا فریضۂ حیات سمجھتا ہے وہ از خود اس میں شرکت کرے گا۔ جو ایسا نہیں سمجھتا، اس سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ بیکار ہی نہیں بلکہ اس کی کوئی امداد (جو بہرحال طوعاً نہیں بلکہ کرہاً ہوگی) اس تحریک کی راہ میں الٹا روڑا بن کر اٹک جائے گی، جس طرح مجبوراً ساتھ چلنے والے کا ساتھ، ہمرہانِ سفر کے لئے زنجیرِ پا بن جایا کرتا ہے۔ بطیبِ خاطر چلنے والے آئیں اور راہ نوردانِ شوق کے اس قافلے میں شامل ہو جائیں جو سر میں سودائے عشق، دل میں ذوقِ تجسس، نگاہوں میں کیفِ آرزو

اور ہاتھ میں قندیلِ قرآنی لئے، ستاروں کی سی خاموشی اور نرم روی سے بے سازو یراق جانبِ منزل بڑھے چلا جا رہا ہے۔ زادِ راہ کی کمی، مخالفتوں کا ہجوم، حالات کی نامساعدت چھلاوے بن بن کر ڈرا رہی ہے لیکن افق کے اُس پار سے آنے والی ایک بے صوت صدا ہے جو نغمۂ جبریل کی طرح یہ کہتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے کہ

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ

الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۰

نحن اولیاءکم فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم فیھا ما

تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون ۰ نزلا من غفور رحیم ۰

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ

وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین

ان حسین آرزوؤں اور تابناک تمناؤں کے جلو میں، طلوع اسلام اپنی زندگی کے اس نئے سال میں قدم رکھتا ہے۔

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے

ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر!

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

ایک ضروری اطلاع

طلوع اسلام کے ابتدائی دو سال میں، محترم پرویز صاحب کے بعض ایسے اہم مقالات زیب دہ اوراق ہوئے تھے جنھوں نے ہر سوچنے والے کے قلب و نگاہ میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ ان مضامین کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض دوبارہ چھاپے گئے لیکن اس پر بھی ان پرچوں کی ایک کاپی بھی کہیں سے نہیں ملتی اور ان مضامین کی مانگ بدستور چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا بریں، جو حضرات ان مضامین کی اشاعت کے بعد سے حلقہ طلوع اسلام میں شامل ہوئے ہیں انھوں نے ان مضامین کو ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا، اور جب ان کا حوالہ کسی دوسرے مضمون میں آتا ہے تو وہ اسے طلب کرتے ہیں۔

ان مسلسل تقاضوں کے پیشِ نظر فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان مضامین کو طلوعِ اسلام ہی میں پھر سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ارادہ ہے کہ آئندہ اشاعت میں، ان میں سے سب سے اہم مقالہ، "اسباب زوالِ امت" محترم پرویز صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد، شائع کر دیا جائے۔ جو احباب (معہ ایجنٹ صاحبان) اس پرچہ کی زیادہ کاپیاں لینا چاہیں وہ پہلے اطلاع فرما دیں تاکہ پرچہ اس تعداد کے مطابق چھاپا جائے۔ اس کے بعد، ان اہم مضامین میں سے اور بھی اسی طرح شائع کر دیئے جائیں گے۔ کذٰلک نصرف الاٰیات لقوم یشکرون۔

لمعات

میر انیس نے کہا تھا:

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے رخصت سے پھر آکے منہ دکھایا ہے تجھے
اب کیوں نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

مثال تو کچھ اچھی نہیں، لیکن چونکہ تشبیہ تام ہے اس لئے وہ مسلمان جو آگ اور خون کے دریا پیر کر پاکستان پہنچے ہیں یہاں کے رگلی کوچہ سے کہہ سکتے ہیں کہ — مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — اور یہاں کے ذرے ذرے سے تخاطب کر سکتے ہیں کہ — میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے — دنیا کی قوموں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں، لیکن یہ واقعہ، تاریخ کے صفحات میں شاید ہی کہیں اور ملے کہ کسی قوم نے آزادی تو حاصل کرلی ہو بغیر ایک قطرۂ خون بہائے، لیکن سے محض اپنے مستقر تک پہنچنے کے لئے اس طرح آغشتہ خاک و خون ہونا پڑے۔ ہم اپنے افلاس تدبر اور فقدانِ اہلیت کو چھپانے اور اس طرح اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے لاکھ کہیں کہ مسلمانوں نے حصولِ آزادی کی خاطر اسقدر قربانیاں دی ہیں۔ لیکن اس طرح خونِ ناحق کے وہ دھبے کبھی نہیں مٹ سکتے جن سے ہم زمانے کی ریگِ رواں کو شفق آگیں بنا چکے ہیں، نہ ہی وہ لُٹی ہوئی عصمتیں واپس مل سکتی ہیں جو ناموس و شرافت کی ہر عدالت میں ہماری ملی بے حمیتی کی زندہ شہادتیں ہیں۔ ہم میں سے وہ کبوترانِ حرم[1]، جو تقسیمِ ہند کی قیامتِ صغریٰ سے پہلے ہی اڑ کر بامِ پاکستان پر آبیٹھے تھے، انھیں کیا علم کہ صحنِ گلستاں سے باہر مرغانِ رشتہ برپا پر کیا گذری تھی؟

بسمل کے لوٹنے کی کسی دل کو کیا خبر کس کے گلے چھری چلی، قاتل کو کیا خبر
رستے میں کون لٹ گیا منزل کو کیا خبر کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر

خاروں سے پوچھئے نہ کسی گل سے پوچھئے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھئے

---

[1] تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

لیکن مسلمانوں نے یہ ساری لرزہ انگیز مصیبتیں اور قیامت خیز صعوبتیں اس لئے برداشت کیں کہ ان کے ذہن میں تھا کہ وہ محکومی اور غلامی کے انسانیت سوز جہنم سے نکل کر حریت و آزادی کی انسانیت ساز جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ کس قدر حسین تھا یہ خیال اور کیسی دلکش تھی یہ تمنا۔ اس بات کو قریب ساڑھے چار برس ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان عوام نے جو سر میں یہ سودا لیکر آئے تھے، اس جنت کو پا لیا؟

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد کچھ ایسے چھوئی موئی واقعہ ہوئے ہیں کہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں میں سے کسی کا ذرا سا بھی ذکر چھیڑیئے، ان کا کلیجہ فوراً دھک دھک کرنے لگ جاتا ہے کہ ان پر کوئی آفت آئی۔ یحسبون کل صیحۃ علیھم۔ کہیں پتہ کھٹکا اور انھوں نے کان کھڑے کئے۔ کونسا ملک ہے جس میں کمزوریاں نہیں اور کونسی قوم ہے جو لغزشوں اور کوتاہیوں سے منزہ ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ خوش نصیب ممالک اور فیروز بخت اقوام اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دل کے کانوں سے سنتی ہیں اور پھر ان کی تلافی کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کی سیئات مبدل بہ حسنات ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن جن قوموں کے "ستارے گردش میں ہوں" وہ اپنی کمزوریوں کے تذکرے کو کبھی گوارا نہیں کرتیں۔ اس سے ان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے اور ان کی پیشانی پر حجر کے نقشے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ان کے عیوب و اسقام ان کے سامنے آتے ہیں نہ ان کی اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بدبختی سے یہی صورت پیدا ہو چکی ہے اس لئے یہاں ہر سوچنے والا دل گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی کشمکشِ پنہاں میں مبتلا رہتا ہے جو (بقولِ غالب) اس کے دلِ پرحسرت کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا تحفظ سب سے مقدم ہے۔ اس سے کس صحیح العقل انسان کو انکار ہو سکتا ہے؟ جس پاکستان سے ہم دل کی گہرائیوں سے، کہتے ہیں کہ

میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

اس سے زیادہ گراں بہا متاع اور کونسی ہو سکتی ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان سے مراد کیا ہے؟ اگر پاکستان سے مراد ہے فقط ایک خطۂ زمین جو چاروں طرف سے جغرافیائی حدود سے گھرا ہوا ہے، تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ خطۂ زمین مقصود بالذات ہے، یا کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ ظاہر ہے کہ ایک خطۂ زمین، خواہ وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو کبھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتا۔ اس کی قیمت اسی میں ہوتی ہے کہ وہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس خطۂ زمین میں ایک قوم اپنی مملکت قائم کرتی ہے۔ مملکت بھی مقصود بالذات شے نہیں۔ یہ بھی کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ عام

انسانوں کے نزدیک اپنی مملکت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد مملکت کی خوشحالی اور فراخ سامانی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس سے دنیا کی نگاہ میں ان کا وقار قائم ہوتا ہے اور اس طرح وہ عزت اور طمانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن کا حامل مسلمان اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس کے نزدیک اپنی مملکت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام عدل و ربوبیت کے قیام کا ذریعہ بنتی ہے جو قوانین خداوندی کی رو سے تشکل ہوتا ہے اور جس میں افراد انسانیہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کی جنت میں بستے ہیں۔ کسی خطۂ زمین کا تحفظ اسلئے ضروری ہوتا ہے کہ اس سے یہ مقاصد وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ بنیاد ہوتی ہے ایک عمارت کی۔ پٹڑی ہوتی ہے ایک گاڑی کے چلنے کی۔ عمارت کے بغیر بنیاد کی قیمت کیا ہے؟ گاڑی کے بغیر پٹڑی کی حفاظت کے کیا معنی ہیں؟ گودی میں کھڑا جہاز سب سے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن کیا جہازوں کو گودیوں میں کھڑا رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے؟ لہذا پاکستان کے استحکام سے مقصود یہ ہے کہ یہ ہمارے تصوراتِ حیات اور نظریاتِ زندگی کی کہکشاں گیر عمارت کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے اسے جان دے کے پایا، اور مر مر کے بسایا ہے۔ ہم اپنے خون سے اس کی حفاظت کریں گے۔ لیکن اس بنیاد پر کوئی عمارت بھی تو بنے! پاکستان کی ساڑھے چار سالہ زندگی پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس بنیاد پر کوئی ایک ردا بھی کہیں رکھا گیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جس کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امڈے چلی آرہی ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دولت کو کریں کیا؟ لیکن قوم، اس طبقے کا نام تو نہیں۔ قوم تو ان سے الگ کہیں اور رہتی ہے! بستی کا ہے کو ہے، زندگی کے سانس گن رہی ہے۔ لیکن اس طبقے کے محلات اس قدر بلند ہیں کہ وہاں سے نیچے فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے والی قوم دکھائی تک بھی نہیں دیتی۔ دولت کی فراوانی سے کوئی عیب ایسا نہیں جو ان کی سوسائٹی میں حسن نہ بن چکا ہو، کوئی برائی ایسی نہیں جس کا لائسنس عام نہ ہو چکا ہو۔

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

"ارباب شریعت" سے اس طبقے کا ساجھا ہے اور اس کی وجہ سے یہ حضرات بھی اس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ تشکیل پاکستان سے پہلے وہ ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انھیں اب وہ سب کچھ میسر ہے (کوٹھیاں۔ ٹیلی فون۔ موٹریں۔ فیکٹریاں) جنھیں اس سے پہلے، یہ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور اپنی ہوسِ ناکام کی تسکین کے لئے، ان چیزوں کو "دنیا کے کتوں" کا حصہ بتایا کرتے تھے۔ ان میں سے جس کے حصے میں کچھ کمی ہو جاتی ہے وہ ارباب ثروت و اقتدار

کی پارٹیوں کی شراب اوران کی بیویوں کی بے پردگی کو چوراہے میں اچھالتا ہے اورجب اس کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے تو پھر برسرِ منبر گنگنانا شروع کر دیتا ہے کہ

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

اوراس کے بعد، جس طرح اس سے پہلے، اسکولوں کے بچے "برکاتِ عہدِ انگلشیہ" کی تفاصیل دھرایا کرتے تھے، یہ حضرات، دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کی "اسلامی خدمات" کی فہرست گنانا شروع کر دیتے ہیں مثلاً قرارداد مقاصد پاس کرنے سے یہ مملکت مسلمان ہوگئی ہے۔ رمضان شریف میں شراب کی دکانیں بند کرادی جاتی ہیں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ تراویح کی نماز کے لئے بدھنے اور مصلے بہم پہنچا دیئے جاتے ہیں اور ٹریم کا وقت بارہ بجے رات تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان، عید اور شبرات میں چینی کا کوٹا زیادہ کر دیا جاتا ہے۔ رمضان میں دفاتر کے اوقات میں تبدیلی کردی جاتی ہے۔ جمعے کے مبارک دن کو دفاتر بارہ بجے بند کردیئے جاتے ہیں۔ محرم میں ریڈیو پرگانے کے ساتھ ساز نہیں بجائے جاتے۔ کسی بڑے آدمی کی وفات پر ریڈیو سے مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیو کی نئی عمارت میں قرآن کریم کی آیت (قولوا للناس حسنا) نہایت جلی حروف میں لکھی گئی ہے۔ کراچی ایڈمنسٹریشن نے فطرانے اور کھالیں جمع کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر قبلے کا رخ دکھانے کیلئے تیر کے نشانات لگادیئے گئے ہیں۔ ریڈیو پر ہر صبح قرآن کریم کا درس دیا جاتا ہے (جس میں واو کے معنی آورستائے جاتے ہیں)۔ عید میلاد النبیؐ کی تقریب سرکاری طور پر منائی جاتی ہے۔ ٹرومین کو قرآن شریف بطور تحفہ دیا گیا ہے۔ قائد اعظم کی یادگار میں ایک دارالعلوم کی تعمیر کا اعلان کیا گیا ہے۔

اب اور چاہتے کیا ہو؟ —— پمبری مل جائے!

قوم یہ وعظ سنتی ہے اور "یا اللہ تیرا شکر" کہہ کر پھر فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے لگ جاتی ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ کیا یہی تھی وہ عمارت جس کے لئے سرزمینِ پاکستان کو بطور اساس و بنیاد حاصل کیا گیا تھا؟ کیا یہی تھا وہ مقصد جس کے لئے مسلمان نے اسے جان دیکے پایا اور مر مر کے بسایا تھا؟ کیا یہ بعینہٖ وہی کچھ نہیں جو مسلمانوں کے دیگر ممالک، مثل افغانستان، ایران، عراق، نجد، حجاز، وغیرہ میں ہورہا ہے۔ اگر یہ وہی کچھ ہے تو کیا یہاں بھی اس کے نتائج وہی کچھ نہیں نکلیں گے جو ان ممالک میں برآمد ہوچکے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ دنیا کی زندہ قوموں میں کسی قطار اور شمار میں ہی نہیں۔ وہاں بھی یہی کیفیت ہے کہ ایک طبقہ سب کچھ سنبھالے اور سمیٹے ہوئے ہے اور باقی قوم کیچڑ کے کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے؟ یہ سب کچھ اسلامی ممالک کی شان ہے۔ ان کے برعکس، دنیا کے ملحدوں اور بے دینوں کے ممالک کو دیکھئے۔ ان میں سے بھی اسکی مثال لیجئے

(یعنی انگلستان کی) جسے سرمایہ داری کا ملک کہا جاتا ہے۔ وہاں کوئی بیکار ایسا نہیں جس کا روزینہ مقرر نہیں۔ کوئی بیمار ایسا نہیں جس کا مفت علاج نہیں ہوتا۔ کوئی بچہ ایسا نہیں جس کی پرورش اور تعلیم کا انتظام نہیں۔ کوئی بوڑھا ایسا نہیں جس کی پنشن متعین نہیں۔ دولت وہاں بھی اوپر ہی کے طبقے میں گردش کرتی ہے لیکن بایں ہمہ نیچے کے طبقے کا کوئی فرد نہیں جو ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائے۔ یہ تو مغرب کی کیفیت ہے۔ اب اسی قسم کے ملحد اور بے دین ایک مشرقی ملک کو لیجئے اور وہاں طبعی ضروریات نہیں بلکہ اخلاقی معیار کو دیکھئے۔ (ہمارے ایک دوست نے جو ابھی ابھی جاپان سے آئے ہیں بتایا کہ وہاں) کوئی شخص جانتا ہی نہیں کہ جھوٹ بولنا کسے کہتے ہیں۔ مکانوں میں تالا لگانے کا سامان ہی نہیں ہوتا۔ وہاں کسی کی کوئی چیز چوری نہیں جاتی۔ وہاں ریلوں میں کوئی ٹکٹ ہی نہیں پوچھتا کیونکہ وہاں کوئی شخص بلا ٹکٹ سفر نہیں کرتا۔ ان کے لغت میں گالی کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ یہ ملحدوں اور بے دینوں کے ممالک ہیں۔ ان کی طرف دیکھئے اور ـــــ بازِ بخویشتن نگر۔

آپ یہ سب کچھ سننے کے بعد کہدیں گے کہ

کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل بھی ناصح! ۔۔۔ یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

"ہوش میں آنے کی شکل" نہ تو ان اسمبلیوں سے پیدا ہو سکے گی نہ وزارتوں کے کابینوں سے۔ نہ یہ ملا کے حجروں سے ابھرے گی نہ شیخ طریقت کی خانقاہوں سے۔ اس کی ابتدا (جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں) درسگاہوں سے ہوگی۔ قرآن نے اس کی شکل یہی بتائی ہے جب اس نے کہا کہ نظامِ ربوبیت کے قیام کی صورت یہ ہے بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ ضابطہ قانون خداوندی کو سمجھنا اور سمجھانا اور اسے اسقدر دہرانا کہ یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور آج اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو لوگ اس طریق کار کی اہمیت پہچانتے ہوں وہ کچھ وقت کے لئے تصور کرلیں کہ ابھی ہم پہلے دور ہی میں ہیں۔ وہ سرسید بنکر اٹھیں اور ملک میں دو چار ایسی درسگاہیں قائم کردیں جن میں قرآن کی تعلیم دی جائے۔ ملا کے قرآن کی نہیں، خدا کے قرآن کی جو انسان کو صرف تسخیرِ ارض و سمٰوٰت کے راز ہی نہیں بتاتا بلکہ اس پر اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے نکل جانے کی راہیں بھی کشادہ کردیتا ہے۔ ان منجمد انسانوں کو چھوڑ دو کہ جنہوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ اپنی تمام توجہات مرکوز کردو ان سیال قلوب پر (یعنی آنیوالی نسلوں پر) جنہیں تم جس قالب میں ڈھالنا چاہو ڈھال سکتے ہو۔ اس سرزمین کی حفاظت کا انتظام رکھو اور اس متاعِ عظیم کے امین تیار کرنے کیلئے درسگاہیں تیار کرو۔ ہم میں قرآن سکھانے والے موجود ہیں۔ قرآن سیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ بس ان دونوں میں رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ رابطہ درسگاہوں سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ملک کے ان خطوں میں جن کی آب و ہوا نہایت عمدہ ہو، شہروں سے ذرا دور، دایۂ فطرت کی گود میں اقامتی درسگاہیں

تعمیر کردی جائیں جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت و پرورش کا سارا انتظام موجود ہو۔ دس پندرہ برس تک نہایت خاموشی سے ان درسگاہوں کو مصروفِ تعلیم و تربیت رہنے دو۔ اس کے بعد دیکھو کہ ان میں سے کس قسم کے شہباز نکلتے ہیں۔ اسی قسم کے شہباز کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا

سیاستدانوں کے ہنگامے انہی کے حوالے کردو۔ بزنس والوں کو چور بازاری کی بھول بھلیاں میں الجھا رہنے دو۔ ملا کو قوم کی عاقبت سنوار کر اپنی روٹی کمانے کے دھندے میں لگا رہنے دو۔ یہ سب میدان ان کے لئے چھوڑ دو اور تم قوم کے بچوں کو سنبھال لو۔

لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے　　　بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے

تم دیکھو گے کہ آخرالامر ان سب کی متاع کاسد ثابت ہوگی۔ ان کے کاروبار میں نقصان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ لیکن جس تخم صالح کی تم آبیاری کرو گے وہ ایک دن ایسا تناور درخت بن جائیگا جس کی شاخیں فضائے عالم میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں گی۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ قوم وہی زندہ رہ سکتی ہے جو مفادِ عاجلہ (دنیا۔ پیش پا افتادہ مفاد) پر مستقبل کی خوشگواریوں کو ترجیح دے۔ وبالاخرۃ ھم یوقنون۔ اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون۔

آپ کی بے علمی یہ کہکر آپ کو فریب دے دیگی کہ دنیا برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ قوموں کی تقدیریں صبح شام بدل رہی ہیں۔ بین الاقوامی حالات قدم قدم پر پلٹا لے رہے ہیں۔ مزاجِ روزگار اتنی سرعت سے بدل رہا ہے اور ہمیں ایک ایسا پروگرام بتایا جا رہا ہے جس میں دس پندرہ سال انتظار ہی میں گزر جائیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو چالیس دن تک پلاسٹر میں رکھنا ہی ہوگا خواہ اتنی دیر میں قافلہ کتنا ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائے۔ تپ دق کا علاج کبھی ایک رات میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں تک سینی ٹوریم میں رہنا پڑتا ہے۔ آپ اس پروگرام کو یہ کہکر نہ ٹال دیجئے کہ ——— آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک ——— اگر آپ نے اس پروگرام کو تشکیل پاکستان کے فوری بعد شروع کر دیا ہوتا تو اس وقت تک اس کی ایک تہائی منزل ختم ہو چکی ہوتی۔ اگر آپ اسے اب بھی شروع کر دیں تو ہر گزرنے والا دن آپ کے عرصۂ انتظار میں کمی کرتا جائیگا۔ تیزی سے بڑھنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے، جو کچھ اور لوگ کرنا چاہیں، انھیں کرنے دیجئے۔ لیکن آپ اس سمت گام طرازی کار کو اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ اس کے نتائج نہایت درخشندہ اور پائیدار ہونگے۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

رحمۃ اللعالمین

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو ۱۲ دسمبر کی شام بتقریب عید میلاد النبی ریڈیو اسٹیشن کراچی سے نشر ہوئی اور جسے ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام]

یہ قرآن کا ارشاد ہے اور ہمارا ایمان کہ حضور نبی اکرم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تمام اقوام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وما ارسلنٰک الا رحمۃ اللعالمین۔ غیر مسلم اقوام بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہیں کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے متعلق جو عقیدہ چاہیں رکھیں لیکن وہ یہ دعوےٰ کس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کے پیغمبر کا ظہور دوسری اقوام کے لئے بھی رحمت ہے؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اس کے جواب کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری کے علاوہ یہ دعویٰ اتنا بڑا ہے کہ خود اس کی اہمیت اس کے ثبوت کی متقاضی ہے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کی رسالت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ وہ اُن تمام بندشوں کو توڑ دے گا جو نوع انسان کی حریت و آزادی کی راہ میں حائل تھیں اور ان تمام زنجیروں کو کاٹ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسی زنجیریں تھیں جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور نبی اکرمؐ نے ان زنجیروں کو کس طرح توڑا۔

سب سے پہلے نظامِ حکومت کو لیجئے۔ انسانوں کو دنیا میں مل جل کر رہنا ہے اس کے سوا ان کی زندگی کی کوئی اور صورت نہیں۔ مل جل کر رہنے سے باہمی مفاد کا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس ٹکراؤ سے نزاع اور اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ فساد ہے۔ لہٰذا انسان کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ مل جل کر رہنے کی کونسی شکل پیدا کی جائے جس سے اختلافات اور نزاعات پیدا نہ ہوں۔ اور اگر پیدا ہوں تو ان کا تصفیہ امن اور سلامتی سے ہو جایا کرے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے جو صورت تجویز کی اسے نظامِ حکومت کہتے ہیں۔ حکومت کا وجود تو عمل میں آیا اس ضرورت کے ماتحت، لیکن ہوا یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا انھوں نے اسے خود اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ انھیں خدشہ تھا کہ ان کی اس مستبدانہ روش کے خلاف لوگوں کے دل میں بغاوت کے خیالات پیدا ہو جائیں گے اس لئے انھوں نے آہستہ آہستہ اس قسم کا عقیدہ پیدا کر دیا کہ بادشاہ خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے اور دوسرے انسان اس کی خدمت اور اطاعت کیلئے پیدا ہوتے ہیں۔ ظہور نبی اکرمؐ کے وقت تمام مہذب دنیا کی یہی حالت تھی۔ ہر ملک اور ہر قوم میں تمام اقتدارات بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔ جسے ایشور کا اوتار اور خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا اور باقی انسان اس کی خدمت گزاری اور فرماں پذیری کیلئے زندہ رکھے جاتے تھے۔ مدتوں کی غلامی سے دنیا اس نظام حکومت کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور نظامِ حکومت ان کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔

نبی اکرمؐ تشریف لائے اور انھوں نے ساری دنیا کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو! کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی چلائے۔ انسانوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ ان کے باہمی مشورے سے ہونا چاہئے۔ یعنی نظام حکومت مشاورتی ہونا چاہئے نہ کہ شخصی اور استبدادی۔ اس ایک آواز نے غلامی اور محکومی، زبردستی اور فرماں پذیری کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ آج ساری دنیا اس مشاورتی نظام کو بہترین نظام اجتماعیہ قرار دے رہی ہے۔ اگر آج سے تیرہ سو سال پہلے صحرائے حجاز سے یہ آواز نہ اٹھتی، تو سوچئے کہ آج دنیا کی کیا حالت ہوتی؟ کیا یہ آواز تمام نوعِ انسانی کے لئے نسخۂ رحمت نہیں ثابت ہوئی؟

اب ایک اور سمت دیکھئے۔ ملوکیت کی غلامی انسان کے جسم کی غلامی تھی لیکن اس سے بدتر ایک اور غلامی تھی جس کے طوق وسلاسل میں انسان کی روح جکڑی ہوئی تھی۔ یہ غلامی تھی پیشوائیت (Priesthood) کی غلامی۔ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی سے انسان کی یہی دنیا برباد ہوتی تھی۔ لیکن مذہبی پیشواؤں کے ارشاد کی تکمیل میں ذرا سی کوتاہی، دنیا اور آخرت دونوں میں ذلت و رسوائی کا موجب بن جاتی تھی۔ اس لئے ان کی حکومت انسان کی روح پر چھائی ہوئی تھی۔ اور ان کی ہیبت اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذروں میں حلول کر چکی تھی۔ نبی اکرمؐ آئے اور آپ نے ساری دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ یاد رکھو! خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ بارگاہِ خداوندی کا حاجب و دربان بن کر بیٹھ جائے۔ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ اس آوازۂ حریت سے باطل کی عقیدت مندیوں کی تمام زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں اور نوعِ انسانی نے پیشوائیت کی غلامی کے عذاب سے نجات حاصل کر لی۔ سوچئے کہ اگر ساتویں صدی عیسوی میں یہ حریت آموز اور انقلاب آفریں آواز بلند نہ ہوتی تو آج روحِ انسانیت کن زنجیروں میں جکڑی ہوتی! کیا یہ آواز ساری دنیا کے لئے نوید رحمت نہیں بنی؟

ملوکیت اور پیشوائیت نے اپنے استبداد کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا کہ کچھ انسان پیدائشی طور پر حکومت اور پرستش کے حقوق لیکر آتے ہیں۔ اور دوسرے انسان جنم ہی نیچ قوموں میں لیتے ہیں۔ انسانوں کی یہ تقسیم خود خدا کی متعین کردہ ہے اس لئے اس کے خلاف لب کشائی خدا کے فیصلوں کے خلاف سرکشی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ فریب ملوکیت و پیشوائیت ایک مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ احترام آدمیت کا پرچم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ساری دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یاد رکھو! پیدائش کے اعتبار سے چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ عزت اور تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں، نہ کہ خاندان کی نسبتیں۔ پیدائشی نسبتوں سے معاشرے میں امتیازی خطوط کھینچنے والے، فسادِ آدمیت کے جرم عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس آواز نے تمام انسانوں کو ایک صف میں لاکر کھڑا کر دیا اور اس طرح پیدائشی امتیازات کے وہ تمام بندھن ٹوٹ گئے جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ پوچھئے تاریخ عمرانیت کے مبصرین سے کہ اگر دنیا میں یہ آواز بلند نہ ہوتی تو آج دنیا کس دور سے گذر رہی ہوتی!

اور آگے بڑھیئے! انسانوں نے مختلف ملکوں اور خطوں میں بسنا شروع کیا اور یہی خطے ان کا وطن قرار پا گئے۔ اس ...یادہ ان جغرافیائی حدود کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ لیکن ذہنِ انسانی کی تنگ نظری سے دریاؤں اور ندیوں کی یہی لکیریں قومی ...ذات کے سانپ بن گئیں۔ اور اس کے بعد ہر خطے کا انسان دوسرے خطے کے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہی وہ ...ت پرستی (نیشنلزم) ہے جو دنیا میں اس قدر کشت و خون اور تباہی و بربادی کا موجب بن رہی ہے۔ حضور نبی اکرم م نے دنیا کو پکار کر کہدیا کہ تمہارے وطنوں کی لکیریں خود ساختہ ہیں۔ تمام انسان بلاتمیز رنگ و نسل و زبان و وطن ایک درخت ...اخیں اور ایک کنبے کے افراد ہیں۔ ان سب کو ایک بن کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ ان سب کی حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ ذرا غور ...ے کہ آج ساری دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی جو آوازیں اٹھ رہی ہیں کیا وہ اسی پیغام وحدتِ انسانیت کی صدائے ...شت نہیں؟ سوچئے کہ اگر فضائے عالم اس آواز سے نا آشنا ہوتی تو کسی ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ ساری دنیا ...نسانوں کو ایک برادری کی طرح، ایک عالمگیر نظام کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے؟

اب انسان کی زندگی کے ایک اور گوشے کو لیجیئے۔ انسان کی حالت یہ تھی کہ مذہبی دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی نجات کی فکر ...غلطاں و پیچاں تھا اور معاشی دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی فکر میں سرگرداں و حیراں۔ یعنی ساری دنیا میں محض افراد (INDIVIDUALS) بستے تھے۔ انسانیت (Humanity) کا کہیں وجود نہ تھا۔ سوچئے کہ جس دنیا میں ہر فرد اپنی فکر میں مضطرب و بے چین پھر رہا ہو اس میں کس قدر نفسا نفسی کی قیامت برپا ہوگی؟ اس تخمِ انفرادیت کا نتیجہ وہ شجر ...نہ ہے جسے سرمایہ داری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں ہر انسان دوسرے کا خون پی جانے کی فکر میں ...ہا ہے۔ دنیا اس جہنم سے گذر رہی تھی کہ نوعِ انسانی کا وہ محسنِ اعظم آیا اور اس نے وحدتِ انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت ...س طرح اجاگر کر کے دکھا دیا کہ ہر فرد کو دوسرے افراد کی پرورش اور تربیت میں خود اپنی ذات کی بالیدگی اور بردمندی نظر ...نے لگی۔ اس نے کہا کہ جو نظام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے اسباب و ...ئع بہم پہنچانے کا ذمہ دار نہیں بنتا، اسے دنیا میں قائم رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ پیغام نہ تھا ایک زلزلہ تھا جس سے دنیا کا ...یاردن زمین میں دھنس گیا اور اس کے تمام خزانوں اور دفینوں کے دروازے ہر حاجتمند کے لئے کھل گئے۔ کہئے کہ یہ زلزلہ ...یز پیغامِ انقلاب تمام نوعِ انسانی کے لئے مایۂ رحمت تھا یا نہیں؟

آپ ان چند ابھرے ہوئے عنوانات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ پیغمبرِ اسلام کا ظہور تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت ہے ...ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان ایک ...فاصل کے طور پر کھڑی ہے۔ اس مقام سے انسانیت کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑی ہے جس سے اس کے سامنے زندگی کی ...دید راہیں کھل گئی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اسی تیرہ سو سال میں انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جسقدر ایسے انقلابات

آئے ہیں جن کے نتائج تعمیرِ انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں، ان کا سرچشمہ وہی پیغام تھا جو محمد رسول اللہ کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ اس پیغام نے انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئی تعبیر عطا کی جس سے نبضِ کائنات باندازِ نو تپش آمادہ ہو گئی۔ کارلائل کے الفاظ میں:

> نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور ساری دنیا کو شعلہ صفت بنا گیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی اسی کو راستہ دکھا سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ بارش اسی کسان کی جھولی موتیوں سے بھر سکتی ہے جس نے اپنے کھیت کو سیرابی کے قابل بنا رکھا ہو۔ اسی طرح رسالتِ محمدیہ بھی اسی قوم کے لئے صحیح معنوں میں رحمت بن سکتی ہے جو اپنے معاشرے کو ان خطوط پر تشکیل کرے جو اس پیغامِ خداوندی نے نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے متعین کئے ہیں۔ اسی لئے دوسرے مقام پر ہے کہ ورحمۃ للذین اٰمنوا منکم۔ یہ رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس نظامِ خداوندی کو اپنا نصب العین زندگی بنائیں۔ رحمت کہتے ہیں اس قالب (Pattern) کو جس کے اندر کوئی شے اپنی تکمیل کو پہنچے۔ انسان کی صلاحیتیں صرف اس قالب کے اندر اپنی کامل نشوونما حاصل کر سکتی ہیں جو آئینِ خداوندی کی حدود سے تشکل ہوتا ہے۔ جب انسانی ہیئتِ اجتماعیہ اس نظام کے قالب میں ڈھل جائے گی اس وقت انسان دیکھے گا کہ رسالتِ محمدیہ کس طرح فی الواقعہ رحمۃ للعالمین ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

مُلّا کا بہشت

بہشتے بہر پاکانِ حرم است بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است
بگو "عجمی" مسلماں را کہ خوش باش بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

اسلام ایک تحریک تھی۔ تحریک اسی وقت تک تحریک رہتی ہے جب تک اس میں حرکت رہے۔ حرکت نام ہے جدوجہد کا
ے قرآن کی اصطلاح میں جہاد کہتے ہیں۔ جدوجہد کی قدر و قیمت اس نصب العین کی نسبت سے متعین ہوتی ہے جس کے حصول
لئے وہ جدوجہد عمل میں آئے۔ اسلام کے سامنے ایک ایسا بلند نصب العین تھا جس کے مقابلے میں دنیا کا ہر نصب العین ہیچ ہے۔
نصب العین تھا تمام دنیا میں ایک ایسا نظام عدل و احسان قائم کرنا جس میں ہر فردِ انسانی کے تمام مضمر جوہروں کی کامل نشوونما
ہو سکے۔ اسی کا دوسرا نام ہے قرآنی نظامِ حکومت جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے نہیں جھکتا، نہ کوئی کسی کا دستِ نگر
رہتا ہے۔ اس میں تمام اقتدارات و اختیارات صرف خدا کے قانون کے لئے ہوتے ہیں۔ والملك یومئذٍ للہ۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے
نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ اس لئے جو قوم اس نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے گی
اس کی ساری زندگی مسلسل سعی و عمل اور متواتر تگ و تاز کی زندگی ہوگی۔ قرآن، اس قوم کا نام جماعتِ مومنین (یا امت وسطیٰ) رکھتا ہے
ان کے اس بلند و بالا نصب العین کو ایمان سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے حصول کے لئے پیہم جدوجہد کو اعمالِ صالحات کے نام سے پکارتا ہے۔
ان سب کا نتیجہ، اس کے نزدیک ہے جنت۔ دنیا میں بھی جنت کی زندگی اور اس کے بعد بھی جنت۔ ظاہر ہے کہ جنت کی راہ پھولوں
کی سیج نہیں۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

اس راہ میں بڑی بڑی صبر آزما گھاٹیاں آتی ہیں۔ چونکہ دنیا بھر کی مستبد قوتیں اس نظامِ عدل و ربوبیت کے قیام میں اپنی سیادت و
قیادت کا خاتمہ دیکھتی ہیں اس لئے وہ ہر ممکن طریق سے اس کے قیام و استحکام کی مخالفت کے لئے پورے ساز و سامان کے ساتھ
مقابلے کے میدان میں اتر آتی ہیں۔ لہذا جنت کی راہ، باطل کی ان تمام قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ سے شروع ہوتی ہے اور آگ اور
خون کے دریاؤں میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے ان لوگوں سے، جو اس راہ پر چلنے کے لئے آمادگی ظاہر کرتے ہیں کھلے کھلے
الفاظ میں کہدیا کہ وہ اپنے اس فیصلے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ کیا فیصلہ کر رہے ہیں۔ یہ پوجا پاٹ اور بھگتی یا پرستش کی راہ
نہیں کہ گوشۂ عافیت میں بیٹھے، گیان دھیان میں مگن ہیں اور اس خوش فہمی میں مست کہ وہ جنت کے حقدار بن رہے ہیں۔

اسی جنت کے حصول کے لئے تو مفاد پرست گروہوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ انہی مشکلوں اور سختیوں سے یہ نظام[1] پہلے قائم ہوا تھا اور اسی طرح سے اب قائم ہوگا۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم، مستہم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہٗ متٰی نصر اللہ، الا ان نصر اللہ قریب - (۲/۲۱۴)

کیا تمہارا اندازہ یہ ہے کہ تم اس جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے؟ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی انہی مراحل سے گذرنا ہوگا جن مراحل سے وہ لوگ گذرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس قسم کے انقلاب کی کوشش کی۔ مخالفتوں کے ہجوم سے ان لوگوں کی حالت یہ ہوگئی کہ سختیوں اور مصیبتوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا اور وہ گھبرا اٹھے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہماری کوششوں کی بارآوری کا وقت کب آئے گا؟ تب کہیں جا کر ان کی کوششیں ثمر بار ہوئیں۔

دوسری جگہ ہے۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین - (۳/۱۴۲)

کیا تمہارا خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم نے اپنے اعمال و کردار سے یہ ثابت ہی نہیں کیا کہ تم میں سے کون کس قدر سعی و عمل کا مالک ہے اور کون کس قدر استقامت کا حامل۔

یہ تھی وہ جنت جس کا وعدہ قرآن نے کیا تھا۔ یعنی خالص سعی و عمل کا نتیجہ (جزاء بما کانوا تعملون)۔ وہ جنت جو مومن کے خونِ جگر میں پوشیدہ تھی۔

مجاہدین کی جماعت، محمد رسول اللہ کی قیادت میں، شمشیر اور قرآن کو ہاتھ میں لیکر اٹھی اور اس نظامِ ربوبیت کی تشکیل (یعنی اس جنت کے حصول) کی راہ میں جو قوت بھی حائل ہوئی اسے گردِ راہ بنا کر رکھ دیا۔ اس زمانے کی مہذب دنیا میں ایک طرف عیسائیوں کی (بازنطینی) سلطنت تھی اور دوسری طرف ایرانیوں کی حکومتِ کسروی۔ ان کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی مذہبی سیادت تھی جو استبداد اور خون آشامی میں ان "دنیاوی" سلطنتوں سے کسی صورت میں کم نہ تھی۔ یہی قوتیں تھیں جو قرآنی انقلاب کے مقابلے میں آئیں اور بری طرح سے پسپا ہوئیں۔ یہ قومیں میدانِ جنگ میں تو شکست کھا گئیں لیکن انہوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو اپنے سینے کے آتشکدوں میں سلگتے رکھا۔ جب مسلمانوں کی مرکزیت ذرا کمزور ہوئی تو یہ شکست خوردہ قومیں اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلیں تاکہ اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کریں۔ اس کے لئے انہوں نے حربہ کیا استعمال کیا؟ قرآن نے اسے نہایت لطیف پیرائے میں بیان فرمایا ہے ارشاد ہے:

---

[1] اس نظام کی تشریح کے لئے اس آیت سے پہلی آیت دیکھئے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق نظام سے مقصود تمام نوعِ انسانی کو امتِ واحدہ بنانا ہے۔ لیکن اپنے اپنے مفاد کی خاطر اختلافات کرنے والے لوگ اس نظام کی تشکیل کی راہ میں حائل ہوں گے۔ یہی وہ مفاد پرست ہیں جن سے اس راہ میں قدم قدم پر مقابلہ ہوگا۔

وقالت طائفۃ من اھل الکتاب اٰمنوا بالذی انزل علی الذین اٰمنوا وجہ النھار واکفروا اٰخرہ لعلھم یرجعون (۳:۷۲)

اہل کتاب کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یوں کرو کہ مسلمانوں میں جا کر مل جاؤ۔ صبح کے وقت ان کے قرآن پر ایمان لے آؤ (دن بھر ان میں
اپنے خیالات پھیلاتے رہو) شام کو اس سے انکار کردو۔ شاید اس طرح ان میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ واپس آجائیں۔

بنی حربہ یہ استعمال کرو کہ مسلمان بن کر ان میں جا گھسو اور چپکے چپکے اپنے خیالات کو پھیلاتے رہو حتیٰ کہ ان کے دین کا ڈھانچہ تو ان
رہ جائے اور روح اس میں یکسر تمہارے خیالات کی حلول کر جائے۔ لعلھم یرجعون۔ انھیں ان کے دین سے پھرانے کا یہی کامیا
طریقہ ہے۔ چنانچہ وہ آئے اور نہایت مقدس لبادوں میں ملبوس ہو کر مسلمانوں کے اندر گھل مل گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کی
قوت کا راز اس مجاہدانہ تگ و تاز میں ہے جس میں وہ "حصولِ جنت" کی خاطر ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ وہ اسی مجاہدانہ سعی و عمل کے
زخم خوردہ تھے، اس لئے ان کی سازش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اس مجاہدانہ حرارت سے محروم کردیا جائے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا
مسلمانوں کی یہ تمام تگ و تاز "حصولِ جنت" کے لئے تھی اس لئے ان سازش کرنے والوں نے سوچا کہ اگر انھیں جنت حاصل کرنے کے
سہل سے طریقے بنا دیئے جائیں تو رفتہ رفتہ ان کی مجاہدانہ روح خود بخود سلب ہوجائے گی۔ اس مقصد کے لئے روایات سازی کا در
کھلا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایسی ایسی احادیث وضع کیں جن سے گھر بیٹھے بٹھائے جنت مل جاتی تھی۔ چونکہ ان احادیث کو منسو
کردیا جاتا تھا حضور رسالتمآبؐ کی ذات گرامی کی طرف، اس لئے ان کا اثر یقینی تھا۔ اس طرح یہ روایات پھیلائی گئیں او
تھوڑے سے عرصہ کے بعد آسمان کی آنکھ نے دیکھا کہ وہی قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی قوتوں کا تختہ الٹ دیا تھا، راکھ کا ڈھیر بن
رہ گئی۔ اور اس طرح

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہی ہیں وہ روایات جنھیں ہمارے علمائے کرام، اقوال رسول اللہؐ سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ وہ خود بھی
بڑے فریب میں مبتلا ہیں اور قوم کو بھی کتنے بڑے دھوکے میں رکھ رہے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو چند ایک نمونے دکھائیں ان "احادیثِ م"
کے جو حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں محفوظ ہیں اور جو مُلا کی غلط نگہی اور کوتاہ اندیشی سے ہمارے دین کا جزو بن رہی ہیں۔ دیکھئے کہ
احادیث کی رو سے، وہی جنت جس کے حصول کا قرآنی طریقہ اوپر مذکور ہے کتنے سستے داموں ہاتھ آجاتی ہے۔ حصولِ جنت کے ان طر
کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ جس قوم کو اس طرح سے جنت مل جائے اس میں قوتِ عمل کا کوئی شائبہ بھی باقی رہ سکتا ہے؟

لیجئے اب روایات کی رو سے جنت کے ٹکٹ خریدیئے۔ دیکھئے کتنی سستی جارہی ہے۔

مصافحہ سب سے پہلے سلام علیکم کیجئے اور ہاتھ ملایئے۔ لیجئے! جنت مل گئی۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب
مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ انھیں بخش دیتا ہے۔

اب مسجد میں چلئے اور وضو کیجئے۔ جنت حاضر ہے۔

وضو سے جنت

مسلم کی حدیث ہے کہ وضو کرنے والے کے تمام گناہ پانی کے ساتھ ٹپک جاتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا آخری قطرہ ہر عضو کے آخری گناہ کو ساتھ لیکر ٹپکتا ہے۔

مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ جو شخص پورا پورا وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد نماز پڑھتا ہے اور نماز بھی اچھی طرح ادا کرتا ہے تو نماز کے بعد بالکل ایسا ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرتا ہے اور وضو کے بعد یہ کلمات کہتا ہے کہ "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ" تو ایسے شخص کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ (مسلم)

ابن خزیمہ کی روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت بلالؓ سے دریافت کیا کہ تم کیا عمل کرتے ہو؟ میں نے تمہاری جوتیوں کی آواز جنت میں سنی کہ تم مجھ سے بھی آگے آگے چل رہے ہو۔ بلالؓ نے عرض کیا کہ دو کام میرے معمول رہا ہیں۔ ایک ہمیشہ باوضو رہتا ہوں۔ جب وضو ٹوٹ جاتا ہے تو فوراً دوسرا وضو کر لیتا ہوں۔ اور جب وضو کرتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ادا کر لیا کرتا ہوں۔

کہئے ؟ کس قدر سستی رہی جنت! وضو کیا تو تمام گناہ اس کے پانی میں بہہ گئے۔ اور اگر ساتھ دو رکعتیں نفل بھی پڑھ لئے تو خود رسول اللہؐ سے بھی آگے آگے جنت میں پہنچ گئے۔

اس سے بھی آسان

مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص موذن کے جواب میں اذان کے الفاظ دہراتا ہے لیکن حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتا ہے تو یہ شخص جنت میں جائے گا۔

گناہ کئے جاؤ!

جسے قانون کی اصطلاح میں جرم کہا جاتا ہے اسے مذہب کی زبان میں گناہ کہتے ہیں۔ جرم ایک مرتبہ کا بھی کم نہیں ہوتا لیکن عادی مجرم کے لئے تو سوسائٹی میں کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، مُلّا کے مذہب نے جرائم کے لئے ایسا لائسنس دے رکھا ہے کہ صبح سے شام تک جرم پر جرم کئے جاؤ لیکن ساتھ نمازیں بھی پڑھتے جاؤ۔ سب جرم معاف ہوتے جائیں گے۔ چنانچہ طبرانی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم جلتے رہتے ہو یعنی آگ کے کام کرتے رہتے ہو لیکن جب صبح کی نماز پڑھ لیتے تو وہ تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ یعنی دوزخ سے دور کر دیتی ہے پھر ظہر تک وہی کام کرتے ہو لیکن ظہر کی نماز تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ پھر عصر تک وہی کام کرتے ہو لیکن عصر کی نماز ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے گناہوں کو مٹا کر تم کو ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب تم سو رہتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا یہاں تک کہ نیند سے جاگو (اور اگر رات کو دوزخ کے کام کرتے رہو تو صبح کی نماز انہیں ٹھنڈا کر دے گی۔)

باجماعت نماز

ترمذی کی حدیث ہے کہ چالیس دن تک تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے والا دوزخ اور نفاق دونوں سے بری کر دیا جاتا ہے۔

لیجئے! ایک چلہ پورا کر لیجئے اور عمر بھر کے لئے جو جی میں آئے کیجئے۔ دوزخ میں آپ کبھی نہیں جا سکتے۔

اور رعایت

اور اگر چالیس دن کی نماز باجماعت بھی آپ پر گراں گزرتی ہے تو اس رعایت سے فائدہ اٹھایئے۔ بخاری اور مسلم

[ترمذی] ہوں میں ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرتا ہے اور ولا الضالین کہتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ مقتدیوں میں سے جس شخص کی آمین ملائکہ کی آمین کے ساتھ ادا ہوئی اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

بخاری اور امام مالکؒ کی ایک حدیث میں ہے کہ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہہ کر رکوع سے سر اٹھائے تو تم ربنا لک الحمد کہا کرو۔ جو بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

مستقل الاٹمنٹ یہاں تو صرف گناہ بخشنے کا ذکر تھا۔ مسلم کی ایک حدیث ہے کہ جو شخص علاوہ فرض کے، دن رات میں بارہ رکعتیں پڑھ لے اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ترمذی کی روایت ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعت نفل پڑھنے والے کیلئے جنت میں گھر بنا دیا جاتا ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ ظہر کے فرضوں سے پہلے جو شخص چار رکعتیں پڑھتا ہے اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔

ساتھ رونگا بھی! مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ کے لئے آیا اور خاموش بیٹھکر خطبہ سنا تو اس کے گناہ نہ صرف جمعہ سے جمعہ تک بخش دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن کے اور زائد گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔ (یہ رونگا ہے)

وظائف سے جنت وظائف، عجمی اسلام کا امتیاز خصوصی ہیں۔ "دین اور دنیا" کا کوئی معاملہ پیش آجائے، اس کے لئے نہ کسی محنت کی ضرورت ہے نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی حاجت۔ بس ایک وظیفہ پڑھ لیجئے، مطلب حل ہو جائے گا۔ لیجئے۔ اب حصولِ جنت کے دو چار وظائف بھی سن لیجئے۔ نسائی کی حدیث ہے کہ جس نے صبح اور مغرب کی نماز کے بعد سات مرتبہ اللھم اجرنی من النار (یا اللہ مجھے دوزخ سے نجات دے) پڑھ لیا تو دن اور رات میں کسی وقت بھی مر جائے وہ جنت میں جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے والا اگر دوسری نماز کے وقت سے پہلے مر جائے تو جنت میں جائے گا۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے بستر پر لیٹتے وقت کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ۔ اس کے تمام گناہ بخش دیئے گئے۔ وہ گناہ خواہ دریاؤں کی جھاگ کے برابر ہوں یا درختوں کے پتوں کے برابر، ریگ کے ذروں کے برابر ہوں یا ان کی تعداد ایام دنیا کی مثل ہو یعنی ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے دن ہوں ان کی مثل بھی گناہ ہوں تو سب بخش دیئے جائیں گے۔

مسلم میں ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ یہ ننانوے ہوئے۔ آخری کلمہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحیی و یمیت بیدہ الخیر وھو علی کل شیء قدیر۔ پڑھ کر سو کا عدد پورا کر لیا کرو۔ جس نے یہ وظیفہ پڑھا اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ کتنے ہی زائد کیوں نہ ہوں۔

ترمذی میں ہے کہ جس نے ہر دن میں سو بار قل ہو اللہ پڑھنے کا ورد کر لیا تو اس کے پچاس سالہ گناہ مٹ گئے۔

مسند امام احمدؒ میں ہے کہ حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ہلکا سا وظیفہ بتا دیجئے کیونکہ میں بہت بڑھیا ہو گئی! آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ سو بار پڑھا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو غلام آزاد کئے اور یہ غلام بھی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد۔ سو بار الحمد للہ پڑھا کرو، اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو گھوڑے زین اور لگام سمیت مجاہدین کو دیدیئے۔ سو بار اللہ اکبر کہا کرو۔ اس کا ثواب ایسا ہے جیسے سو اونٹ مع نکیل وغیرہ کے اللہ کے راستے میں دیئے۔ اور سو بار لا الہ الا اللہ کہا کرو۔ یہ کلمہ زمین و آسمان کو ثواب سے بھر دیتا ہے۔ جس دن یہ وظیفہ پڑھے گی اس دن کسی کے اعمال بھی تیرے اعمال کے برابر آسمان پر نہ جائیں گے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی یہ وظیفہ پڑھے تو اس کے اعمال بیشک تیرے اعمال کے برابر ہوں گے۔

حاکم کی روایت ہے کہ جس نے اپنی بیماری میں چالیس مرتبہ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین پڑھا اور پھر اسی بیماری میں مر گیا تو اس کو ایک شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور اگر اس بیماری سے اچھا ہو گیا تو تمام گناہوں سے پاک ہو کر اچھا ہوتا ہے۔

شہادت قرآنی نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہر قربانی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ گراں بہا قربانی انسان کی جان کی قربانی ہے۔ قرآن نے ان سعادت مند نفوس کو "مقتول فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے) کہہ کر پکارا ہے۔ انھیں عام طور پر شہید کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی اعمال میں شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور مجاہدین کے لئے "اللہ کی راہ میں لڑنے والوں" سے بڑھ کر خطرناک اور کوئی نہیں۔ یہی مجاہدین اور مقتولین فی سبیل اللہ تھے جنھوں نے باطل کی قوتوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لئے ان قوتوں کو دوبارہ ابھرنے نہ دینے کا راز اسی میں تھا کہ مسلمان کو جہاد و قتال فی سبیل اللہ سے بیگانہ کر دیا جائے۔ اب دیکھئے کہ اس کے لئے عجمی سازش نے کیا کیا؟

مسلم کی حدیث ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو! حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید۔ جو خدا کی راہ میں مر گیا وہ شہید۔ جو طاعون سے مر گیا وہ شہید۔ جو اسہال (دستوں کی بیماری) سے مر گیا وہ شہید۔ جو پانی میں ڈوب کر مر گیا وہ شہید۔ جو مکان کے گرنے سے دب کر مر جائے وہ شہید۔ (اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ) جو نمونیہ سے مر جائے وہ شہید۔ جو آگ میں جل کر مر جائے وہ بھی شہید۔ جو عورت وضع حمل سے مر جائے وہ بھی شہید۔

غور فرمایا آپ نے کہ شہداء کی فہرست کس طرح بڑھائی گئی ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ ان "شہداء" کو اللہ کے ہاں رعایات کیا ملتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شہید سیدھا جنت میں جاتا ہی ہے لیکن روایات کی رو سے وہ اکیلا ہی جنت میں نہیں جاتا بلکہ جس طرح ریلوے کا ہر ملازم اپنے پاس پر اپنے خویش و اقارب کو بھی ساتھ لے جا سکتا ہے اسی طرح شہید بھی اپنے ساتھ بہت سے اقرباء کو جنت میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ شہید کو اپنے خویش و اقارب میں سے ستر آدمیوں کی شفاعت کا حق دیا جائے گا۔

دیکھیے کتنی بڑی رعایت دی ہے اس ارحم الراحمین نے۔ اور اس پر بھی مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کمبخت ڈوب کر نہیں مرتے
۔ مرنے والا خود بھی جنت میں جائے اور اپنے ساتھ ستر اقربا کو بھی فری لے جائے!

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!

لب نے ڈوب کر مرنے کا صرف یہ فائدہ بتایا تھا کہ

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ۔۔۔ نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ے اگر اس حدیث کا علم ہوتا تو ان فوائد میں اس کا بھی اضافہ کرلیتا!

سافر کی موت

خیر! اگر آپ ڈوب کر نہیں مرنا چاہتے تو نہ سہی۔ جنت میں جانے کی اور بھی کئی راہیں ہیں۔ آپ کچھ ہی کیجئے، اللہ میاں کسی نہ کسی بہانے آپ کو جنت میں لے جاکر رہے گا۔ (معاذ اللہ) وہاں جو مکانات بنوا دیئے گئے ہیں نہیں خالی تھوڑا رکھا جائے گا؟

نسائی میں ہے کہ ایک شخص کی وفات مدینہ منورہ میں واقع ہوئی۔ حضورؐ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد آپؐ نے فرمایا ۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ غیر وطن میں مرتا۔ کسی نے عرض کیا، حضورؐ! سفر میں مرنے سے کیا فائدہ؟ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص سفر میں مرتا ہے ز موت کی جگہ سے لیکر اس کے وطن تک کی مسافت کے برابر جنت میں جگہ دی جاتی ہے۔

غالب نے بھی سفر میں مرنے پر خوشی منائی تھی جب اس نے کہا تھا کہ

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور ۔۔۔ رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

لیکن روایات سازی کے یہ مقدس "شعرا" غالب سے بہت آگے ہیں۔

لڑکیوں کا باپ

اولاد کے معاملے میں انسان بے بس ہے کہ اس کے ہاں لڑکے پیدا ہوں یا لڑکیاں۔ لیکن اس بے بسی میں بھی ایک رعایت کا پہلو ہے۔ حاکم کی روایت ہے کہ جس شخص کے ہاں دو لڑکیاں ہوئیں اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کی جب تک وہ اس کے پاس رہیں تو یہ لڑکیاں اسے جنت میں لے جائیں گی۔

یہ تو رہا اس شخص کا معاملہ جس کی اولاد زندہ رہے۔ اب آیا وہ جس کے بچے فوت ہو جائیں۔ جنت کا ٹکٹ اس کے لئے بھی ریزرو کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحیحین (بخاری اور مسلم) کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے تین نابالغ بچے مر گئے خدائے تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کرے گا۔

بخاری اور مسلم ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ کسی شخص کے تین بچے مر جائیں اور پھر اسے آگ چھوئے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ صرف قسم پورا کرنے کے لئے اسے صراط پر سے گذارا جائے گا!

نسائی میں ہے کہ تین بچوں کی وفات پر جنت ملنے کی بشارت سنکر ایک عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ جس کے دو ہی بچے مرے ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دو کے مرنے پر بھی یہی بشارت ہے۔ اس عورت نے بعد میں کہا کاش میں ایک بچے کے متعلق بھی پوچھ لیتی تو

اچھا ہوتا۔

لیکن اس پر افسوس کیوں؟ اس کمی کو سنن امام احمدؒ کی ایک روایت نے پورا کردیا۔ حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف ایک بچے کی وفات پر بھی جنت کی بشارت دی ہے۔ حتیٰ کہ اسقاطِ حمل پر بھی۔

زن مرید جس شخص کی بیوی زبردست ہو اور وہ بچارا اس کی سختیوں پر اُف تک نہ کرسکے اور بلا چون وچرا اس کے احکام کی تعمیل کرتا رہے اسے سوسائٹی میں زن مرید کہتے ہیں۔ لیکن مُلّا کے مذہب میں اس کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شوہر اپنی بیوی کی ایذا پر صبر کرتا ہے تو وہ جنت میں جائے گا۔

زانیہ عورت قرآن کی رو سے زنا بہت بڑا جرم ہے لیکن جب تک جنت کے ٹکٹ بانٹنے کا کام مولوی صاحب کے ہاتھ میں ہے ایسا جرم بھی معاف کردیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک زانیہ عورت نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہی ہے۔ اس نے اپنا موزہ نکالا اور دوپٹے سے باندھ کر کنوئیں سے پانی نکال کر اسے پلا دیا۔ اس پر اللہ نے اسے جنت میں بھیج دیا۔

خدا کی "موج" پرانے بادشاہوں کے قصے مشہور ہیں کہ ان کا جشن دن آیا تو اتنے قیدی جیل خانے سے رہا کردیئے اور تاجپوشی کا دن آیا تو اتنے قیدیوں کی "بند خلاصی" کی گئی۔ چنانچہ مذہب نے بھی خدا کا تصور ایک مطلق العنان بادشاہ کا پیش کیا ہے جو جس طرح جی میں آئے کرتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر عجم کے شہنشاہ پرست راویوں نے خدا کے لئے بھی ایسی تقاریب پیدا کردیں جن میں وہ دوزخ کے قیدیوں کو رہا کرتا رہے۔ امام بیہقی کی روایت ہے کہ رمضان کی ہر رات میں چھ لاکھ دوزخی آزاد کئے جاتے ہیں اور رمضان کی آخری شب میں تمام گذشتہ تعداد کی مثل دوزخ سے آزاد کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح مسلم میں ہے کہ عرفہ کا روزہ رکھنے سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ اور محرم کی دسویں کا روزہ گذشتہ ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ اس سے آئندہ ایک سال کے گناہوں کا بھی کفارہ ہوجاتا ہے۔

سانپ اور گرگٹ مارنے والا مسلم کی حدیث ہے کہ جو شخص گرگٹ کو پہلی ہی ضرب میں مار دے تو اس کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو دو ضربوں میں مارے۔ اور دو ضربوں سے مارنے والے کا ثواب اس سے زیادہ ہے جو تین ضربوں سے مارے۔

ابو داؤد کی روایت ہے کہ اگر گھر میں سانپ نکلے تو اس سے کہدے کہ تجھے قسم ہے اس عہد کی جو تو نے حضرت نوح اور سلیمان علیہما السلام سے کیا تھا، ہم کو ایذا نہ دیجیو۔ اگر اس کے بعد بھی نکلے تو اسے مار ڈالے۔ امام احمدؒ کی مسند کے مطابق اسے سات نیکیوں کا ثواب ملے گا۔

قرآن کی تلاوت قرآن نظامِ خداوندی کا ضابطۂ قانون ہے جس کے مطابق انسانی معاشرے کی تشکیل ہونی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ قانون، عمل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا عمل قرآن کے مطابق رہتا تو باطل کی قوتیں کبھی سر نہ اٹھا سکتیں لہٰذا عجمی سازش کی پہلی تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کردیا جائے۔ (درحقیقت ان کی ساری سازش کا مقصود یہی

تھا) اس کے لئے انھوں نے مسلمانوں کو یہ بتایا کہ قرآن فقط پڑھنے کی چیز ہے عمل کرنے کی نہیں۔ ثواب اس کے پڑھنے سے ملتا ہے جہاں قرآن کے اعمال کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عملیات ہیں جن کی رو سے بھوت پریت دور کئے جاتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے مسلمانوں کو قرآن کے الفاظ دہرانے میں الجھا دیا یعنی صرف پڑھنے میں۔ قرآن کے الفاظ دہرانے کی برکات کے متعلق تمام کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ نمونۃً دو ایک مثالیں سن لیجئے۔

صحیحین کی روایت ہے کہ ایک صحابی رات کو قرآن پڑھ رہے تھے۔ گھوڑا پاس بندھا تھا، وہ اچھلنے لگا تو انھوں نے قرأت ختم کر دی۔ آسمان کی طرف دیکھا تو بہت سے چراغ معلوم ہوئے جو نیچے سے اوپر کو جا رہے تھے۔ صبح کو حضورؐ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا یہ فرشتے تیرا قرآن سننے آ رہے تھے۔ اگر تو پڑھے جاتا تو عجیب و غریب چیزیں دیکھتا۔

مسلم کی روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں دو نور ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو عطا نہیں ہوئے۔ جو کوئی ایک حرف بھی ان کا پڑھے گا اس کو وہ نور دیا جائے گا۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ آیت الکرسی جس گھر میں پڑھی جاتی ہے اس گھر سے شیطان نکل بھاگتا ہے۔

ترمذی میں ہے کہ اگر سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں کسی جنگل میں تین دن رات تک پڑھی جائیں تو پھر وہاں شیطان کا اثر نہیں ہوتا۔

نسائی میں ہے کہ سورۂ یٰسین قرآن کا دل ہے۔ جو بندہ اس کو رضائے الٰہی اور دار آخرت کے لئے پڑھتا ہے وہ بخشا جاتا ہے۔ تم اسے اپنے مُردوں پر پڑھا کرو۔

ترمذی میں ہے کہ جو شخص سورۂ یٰسین کو ایک دفعہ پڑھ لیتا ہے اسے دس بار قرآن پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حضورؐ نے ایک شخص کو قل ہو اللہ احد پڑھتے ہوئے سن کر فرمایا کہ اس پر واجب ہو گئی۔ کسی نے دریافت کیا کہ کیا واجب ہو گئی۔ فرمایا جنت واجب ہو گئی۔

حاکم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خوش آواز قرآن خواں کی آواز کو نہایت شوق سے سنتا ہے جیسے کوئی گانا سننے والا گانے والے کی آواز کو شوق سے سنتا ہے۔

جنت ضعیفوں اور کمزوروں کیلئے ہے

باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے حق کے پاس ان قوتوں سے بڑھ کر قوت ہونی چاہئے اس لئے اسلام غلبہ اور قوت کا دین ہے۔ فان حزب اللہ ھم الغالبون۔ (غلبہ اور تمکن اللہ کے لشکر کے لئے ہے)۔ قرآن بار بار مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے پاس اتنی قوت جمع رکھو کہ اس سے مخالفین کے دل پر تمہارا رعب چھایا رہے۔ جماعتِ مومنین کی قوت ہی تھی جس نے قیصر و کسریٰ کی شوکت و سطوت کو غبارِ راہ بنا دیا تھا۔ اس لئے مخالفین یہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نہ نکال دیا جائے کہ قوت و سطوت خدا کے ہاں برگزیدگی کا موجب ہے ان پر غالب آنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس قسم کی احادیث وضع کرنی شروع کر دیں کہ خدا کے مقرب بندے وہ ہیں جو ضعیف و ناتواں ہیں، جن پر محتاجی اور مفلسی چھائی رہتی ہے۔ جو کمزوری اور بے چارگی کے مجسمے ہیں۔ جو دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ چنانچہ بخاری اور

مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا کہ کثرت سے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں فقیر تھے۔

طبرانی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میرا حوض بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس کے آب خوروں کی تعداد اتنی ہے جتنے آسمان کے تارے۔ اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ جو لوگ سب سے زیادہ اس حوض پر آئیں گے وہ فقرائے مہاجرین ہونگے۔ کسی نے عرض کیا ان کا حال بیان فرمایئے وہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا یہی لوگ جن کے بال پریشاں کپڑے میلے کچیلے، اونچے درجے کے لوگ انھیں اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ کوئی ان کے پاس پھٹکنے کا روادار نہیں۔ ان پر کسی کا حق ہو تو وہ چھاتی پر چڑھ کر لے لے اور اگر ان کا کسی پر حق ہو تو یہ بچارے اپنی کمزوری کے باعث کچھ نہ کر سکیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ خدا کے مقربین کا کیا حلیہ بیان ہو رہا ہے ؟ ژولیدہ مو۔ پریشان حال۔ بوسیدہ اور میلا کچیلا لباس۔ کوئی انھیں اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتا۔ کمزوری اور ناتوانی کا یہ عالم کہ بالادست ان کا حق دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ بچارے سوائے آہ بھر کر رہ جانے کے کچھ نہیں کر سکتے!

یہ ہیں مقربین بارگاہ خداوندی جن کے لئے عجمی سازش نے جنت مخصوص کر دی ہے!

ترمذی میں ہے کہ فقراء اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے۔

ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہؐ کو مسکنت اور مساکین اس قدر محبوب تھے کہ آپ دعا مانگا کرتے تھے کہ اللھم احیینی مسکینا وتوفنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین (یا اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ۔ مسکین ہی مار اور میرا حشر بھی مسکینوں کے ساتھ کر)

یہ وہ مسکنت ہے جسے قرآن نے خدا کا عذاب بتایا ہے۔ جب یہودیوں کے متعلق کہا کہ وضربت علیھم الذلۃ والمسکنت . . .

بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں اہل جنت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کمزور اور حقیر اور ضعیف مسلمان جنتی ہیں۔ اگر اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو ضرور سچا کر دے۔

طبرانی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت میں وہ لوگ بھی ہیں کہ اگر وہ تم سے ایک پیسہ مانگیں تو تم انھیں نہ دو۔ لیکن اگر اللہ سے جنت مانگیں تو اللہ انھیں جنت دیدے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے کپڑے میلے کچیلے، بال پریشاں، مفلسی کے مارے بالکل شکستہ حال لیکن اگر خدا پر قسم کھا بیٹھیں تو خدا ان کی قسم کو پورا کر دے۔

مفلسی، تنگدستی، پریشاں حالی، بیچارگی، ناتوانی، غرضیکہ محکومیت اور محتاجی کی تمام لعنتیں مسلمانوں کے لئے صفاتِ حسنہ بنا دی گئیں۔ اور یہ چیز ان کے ذہن میں راسخ کر دی گئی کہ مصیبتیں اور پریشانیاں گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ

مصیبتیں گناہ کا کفارہ بن جاتی ہیں

مسند امام احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب کسی بندے کے گناہ بہت ہیں اور کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا جن سے گناہوں کا کفارہ ہو سکے تو اللہ تعالیٰ اسے رنج و مصائب میں مبتلا کرتا ہے اور یہ مصائب اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ بیماری بھی! طبرانی میں ہے کہ جب کوئی مومن بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے ایسا پاک کر دیتا ہے جیسے

بھٹی لوہے کو زنگ اور میل کچیل سے پاک وصاف کردیتی ہے۔
بخاری میں ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ بیماری اور سفر سے اس بندے کے میں جو کمی ہو رہی ہے اسے پورا لکھتے جاؤ۔
مسند امام احمد میں ہے کہ بیماری کی خطائیں اس طرح گر جاتی ہیں جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ مومن اگر بت ہو جاتا ہے تو گناہوں سے پاک ہو کر تندرست ہوتا ہے اور اگر مر جاتا ہے تو مرحوم و مغفور ہو کر مرتا ہے۔
کیسا عمدہ سودا ہے احسرت موہانی نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ

صحتیں لاکھوں میری بیماریٔ غم پر نثار　　جس میں لوٹے بارہا ان کی عیادت کے مزے

اسے معلوم نہیں تھا کہ بیماری میں چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی ہوتی ہے۔ اگر تندرست ہو گئے تو تمام سابقہ گناہ معاف اور اگر ئے تو سیدھے جنت میں۔

رسے جنت ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ بخار اور درد سر سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ خواہ یہ گناہ احد کے پہاڑ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں (ابویعلیٰ)۔ حتیٰ کہ "ایک دن کا بخار بھی مومن کے تمام گناہوں کو دور کر دیتا ہے" (ابن ابی الدنیا)
جب ایک دن کا بخار بیمار کے تمام گناہوں کو دور کر دیتا ہے تو چالیس دن کا ٹائیفائڈ یا برس دن کا تپ دق تو سارے کے گناہ دور کر دیتا ہوگا!

رھا اور اندھا تو آنکھ بند کئے سیدھا جنت میں جا پہنچتا ہے۔ چنانچہ بخاری میں ہے کہ جب اللہ کسی بندے کی آنکھیں لے لیتا ہے تو اسے اس کے بدلے میں جنت دے دیتا ہے۔

وت گزینی قرآن نے جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا تھا کہ ہم نے انھیں امت وسطیٰ بنایا ہے لتکونوا شھداء علی الناس تاکہ یہ تمام نوع انسان کے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور جو ذرا بھی عدل کے راستے سے ہٹنے لگے ہے فوراً سیدھی راہ پر لے آئیں۔ لیکن عجمی سازش نے آکر بتایا کہ خدا کے مقرب وہ ہیں جو گھروں کے اندر خلوت میں بیٹھے رہتے اپنی خطاؤں پر روتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ترمذی میں ہے کہ کسی نے حضورؐ سے پوچھا کہ نجات کس میں ہے۔ فرمایا کہ اپنی زبان بند رکھ، اپنی خطاؤں پر رو اور گھر میں بیٹھ رہ۔
ابوداؤد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ وقت آئیگا کہ لوگوں میں وعدہ اور اقرار کا وزن گھٹ جائے گا۔ امانت کی بی وقعت باقی نہیں رہے گی۔ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر حاضرین کو بتایا کہ فتنے اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے س طرح بوریا بُنا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ ایسے وقت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ فرمایا اپنے گھر میں بیٹھ جا اور اپنی جان و مال کر۔ نیکی کو اختیار کر، بدی کو چھوڑ۔ اپنی جان کو دوزخ سے بچا اور پبلک زندگی سے علیحدہ ہو جا۔
اور باطل کی قوتوں کو کھلا چھوڑ دے کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کریں۔ بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ شہروں کو چھوڑ کر

جنگل میں چلے جانا چاہئے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب پچیس نمازوں کے برابر ہے۔ لیکن جنگل میں لوگوں سے علیحدہ ہو کر نماز ادا کرنے کا ثواب پچاس نمازوں کے برابر ہے۔ (ابوداؤد)۔

یہ وہی رہبانیت کی زندگی ہے جسے مٹانے کیلئے قرآن آیا تھا یعنی یا تو جنگلوں میں چلے جاؤ اور اگر شہر میں رہو تو اپنے اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے رہو اور خدا کے خوف سے روتے رہو۔ چنانچہ بیہقی کی روایت ہے کہ ایک دن حضورؐ وعظ فرمارہے تھے۔ ایک شخص وعظ میں رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے پاس بیٹھنے والے بھی سب بخش دیئے گئے خواہ ان کے گناہ مثل پہاڑ کے بھی کیوں نہ ہوں۔ اسی میں ایک انصاری کا واقعہ لکھا ہے کہ اس پر خدا کا خوف اس قدر غالب آگیا کہ ہر وقت رویا کرتا تھا۔ حضورؐ نے جب اس کا ذکر سنا تو اس کے مکان پر تشریف لے گئے اور جا کر اسے گلے سے لگایا۔ انصاری پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مر کر گر پڑا۔ (بیہقی)۔

یہ ان مجاہدین کی کیفیات بیان ہو رہی ہیں جن کی زندگی قرآن نے یہ بتائی تھی کہ یقاتلون فی سبیل اللہ ویقتلون و یُقتلون۔ کہ وہ اللہ کی راہ میں، باطل کی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں۔ پھر میدانِ جنگ سے یا تو فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا وہیں جان دیدیتے ہیں۔ غور فرمایا آپ نے کہ اس طرح کی شمشیر برہنہ قوم کو کس طرح خانقاہوں کے راہب بنا کر رکھ دیا؟

جنازے سے جنّت

یہاں تک تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا جس سے جنت ملتی تھی۔ اور نہیں تو کوئی ورد وظیفہ ہی سہی۔ لیکن اب اس سے بھی آگے بڑھیے۔ مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر کسی میت کی نماز میں چالیس آدمی شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ جس میت پر مسلمانوں کی تین صفیں نماز پڑھتی ہیں اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اور بخاری میں ہے کہ اگر کسی میت کو چار یا تین یا دو آدمی بھی اچھا کہدیں تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔

اور اگر یہ بھی نہ ہو تو . . . .

اور بفرضِ محال اتنا بھی نہ ہو اور مردے کو کشاں کشاں دوزخ تک لے جائیں تو کیا وہاں سے بھی چھٹکارے کی کوئی صورت ہے؟ ہے کیوں نہیں! بیہقی کی روایت ہے کہ ایک بندے کو ارشاد ہوگا آگ میں داخل ہو جا۔ وہ دوزخ کے کنارے پہنچکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے گا اور کہے گا کہ خدا کی قسم مجھے خدا سے اچھی امید اور بھلائی کا گمان تھا۔ ارشاد ہوگا۔ اسے لوٹا لاؤ۔ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں۔

مختصراً یہ ہیں طریقے اس جنت کو حاصل کرنے کے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ اس کی راہ میں ایسے جانگداز مراحل آتے ہیں کہ اور تو اور، خود رسول اور اس کے رفقائے کار گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ جنت نتیجہ تھی اس انقلابِ عظیم کا، جس کی رو سے دنیا کے ہر مفاد پرست گروہ کے ہاتھوں سے اقتدار چھین کر تمام اختیارات قانونِ خداوندی کے ہاتھ میں آجاتے تھے اور خدا کی طرف سے عطا فرمودہ رزق کے چشمے خدا کے بندوں کے لئے عام ہو جاتے تھے۔ اس انقلاب میں

نہ قیصر کی شوکت باقی رہتی تھی نہ کسریٰ کی سطوت۔ نہ نظامِ خانقاہیت کی روباہ بازیوں کو اذنِ فریب دہی مل سکتا تھا، نہ احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو اپنی سیادت و قیادت قائم کرنے کی اجازت۔ یہ نظام اُن تمام مفاد پرست جماعتوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا اس لئے انھوں نے جب میدانِ جنگ میں شکست کھائی تو مذہب کا نقاب اوڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں آگھسے اور روایات کے پردے میں، اس نظام کے ہر عنصر کو نگاہوں سے اوجھل کر کے مسلمانوں کو مذہب کی توہم پرستیوں میں الجھا دیا۔ اب یہی "مذہب" ہے جس کا محافظ ہمارا مُلّا ہے یعنی عجم کی سازش کا مستقل پاسبان۔ یہ سازش روایات کے آسرے پر پروان چڑھی اور انہی کے سہارے پر آج تک قائم ہے۔ انہی روایات کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ "قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ ہیں" (مثلہٗ معہٗ)۔ ہو سکتا تھا کہ فریب خوردگان "مذہب" میں سے کسی کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ ہم اس جھوٹ کو کس طرح آگے بڑھاتے چلے جائیں۔ لیکن اس خدشہ کا علاج بھی پہلے ہی سوچ لیا گیا تھا۔ اس کے لئے یہ عقیدہ پیدا کر دیا گیا کہ نیک کام کے لئے جھوٹ بولنے میں بھی گناہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضورؐ نے (معاذ اللہ) فرمایا کہ

مسلمانوں میں صلح کرانے کی غرض سے اگر کچھ جھوٹ بھی بول دیا جائے تو جھوٹ کا گناہ نہیں ہوتا۔ (ابوداؤد)

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تو ہر "نیک کام" کے لئے جھوٹ بولنا جائز قرار پا گیا[1]۔ اب کون بتا سکتا ہے کہ روایاتِ جھوٹ کے اس انبار میں کتنا حصہ ابتدائی سازش والوں کا ہے اور کتنا حصہ ان کا جنھوں نے "نیک مقصد" کی خاطر روایات کو وضع کیا۔ نوح ابن ابی مریم نے قرآن کی ایک ایک سورت کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں جن کو مفسرین (بالخصوص بیضاوی) نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ جب ان پر جرح کی گئی تو انھوں نے اقرار کیا کہ میں نے یہ حدیثیں خود بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ بہت سے عابد اور زاہد ایسے تھے جو لوگوں کو اچھے کاموں کی رغبت دلانے کے لئے حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ یہ تو وہ جھوٹ تھا جو ابوداؤد کی روایت کے مطابق نیک کاموں کے لئے بولا گیا۔ باقی رہا وہ جھوٹ جو خالص سازش کے ماتحت افترا کیا گیا سو اس کا ٹھکانہ ہی کیا۔ شیخ محمد طاہر گجراتی تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ جب ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے لے گئے تو اس نے کہا کہ "میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں"۔ بہرحال جھوٹ پہلی سازش کے ماتحت بولا گیا یا بعد میں "ابلہانِ مسجد" نے "نیک کاموں" کے لئے اس جھوٹ کی حمایت کی، نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ یعنی یہ جھوٹ مسلمانوں کا مذہب بن گیا۔ وحی غیر متلو اس کا نام رکھ کر اسے قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ٹھہرا دیا گیا۔ نہیں! بلکہ اسے قرآن کا ناسخ قرار دیدیا گیا اور اس طرح مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ بنا کر ایک انقلاب آفریں امت کو قبرستانوں کے محافظ بنا کر رکھ دیا۔

ان امور کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ صورتِ حالات کیا ہے؟ مُلّا سے اس بارے میں کچھ کہنا بے سود ہے اس لئے کہ یہ ساری عجمی سازش (دانستہ یا نادانستہ) اسی کے آسرے پر بڑھی، پھولی پھلی اور اب اسی کے ذریعے قائم ہے۔ وہ اسے قائم رکھنے کے لئے

---

[1] میکیاؤلی (Machiavelli) جو مغرب کی ابلیسی سیاست کا امام ہے۔ اسی عقیدے کا علمبردار ہے کہ حصولِ مقصد کے لئے جو ذریعہ بھی اختیار کیا جائے، جائز ہوتا ہے۔

ہر ممکن کوشش کریگا۔ سوال اس طبقے سے ہے جو معاملات پر غور و فکر کر سکتا ہے کہ یہ لغویات جنھیں عجمی سازش نے "مذہب" کا نام دے رکھا ہے بالآخر کب تک برداشت کی جائیں گی۔ ان کی وجہ سے ساری دنیا میں اسلام بدنام ہو رہا ہے۔ ہر جگہ مسلمان ذلیل و خوار ہو رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی وجہ سے اُس ذاتِ گرامی (علیہ التحیۃ والسلام) کی جو نوعِ انسانی کیلئے روشنی کا جگمگاتا چراغ بن کر آئی تھی، ایسی پست تصویر سامنے آتی ہے جس سے اپنوں کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں اور جسے اغیار یہ کہہ کر دنیا کو دکھاتے پھرتے ہیں کہ (معاذ اللہ) یہ ہیں مسلمانوں کے پیغمبر! عجمی سازش کے علمبردار یہی چاہتے تھے جسے ہم اس طرح کامیاب بناتے چلے آرہے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس اسلام کی تعلیم وہ ہو جو ان احادیث میں پیش کی گئی ہے جو سابقہ صفحات میں آپ کی نگاہوں سے گذر چکی ہیں، اس اسلام کو آپ دنیا کے سامنے کس منہ سے پیش کر سکتے ہیں۔ اور جو قوم اس تعلیم کو خدا کی وحی سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھرے اس کے پنپنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ بخاری ۔ مسلم ۔ موطا ۔ سنن امام احمدؒ ۔ ابو داؤد ۔ ترمذی ۔ نسائی ۔ امام بیہقی ۔ وہ کتابیں ہیں جنھیں حدیث کی معتبر ترین کتابیں مانا جاتا ہے ۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جنھیں "قرآن کے ساتھ قرآن کا ہم پایہ" قرار دیا جاتا ہے۔

سوچئے کہ جب تک مسلمان ان چیزوں کو دین کی اصل مانتا رہے گا اس وقت تک اس کی موجودہ حالت سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے؟ عجمی سازش نے اسلام سے جی بھر کر انتقام لے لیا ہے۔ لیکن کیا اس کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا؟ یاد رکھو! جس چیز نے باطل کی ان قوتوں کا شیرازہ بکھیرا تھا وہ قرآن تھا۔ انھوں نے اپنی سازش سے قرآن کو مسلمانوں کی نگاہ سے اوجھل کر دیا اور اس کی جگہ اپنا بنایا ہوا مذہب مسلمانوں میں رائج کر دیا اور اسے منسوب کر دیا ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف۔ اب اس سازش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ جس طرح نبی اکرمؐ نے قرآن کے ذریعے باطل کی تمام قوتوں کو شکست دی تھی، اسی طرح مسلمان پھر قرآن کو اپنی نہج زندگی کی اصل قرار دے لے اور اس سے باطل کی قوتوں کو پھر تباہ و برباد کر دے۔

اور اگر آپ (خدانکردہ) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ آپ کو دوبارہ زندگی عطا کر سکے یعنی آپ عجمی سازش کی ہم نوائی میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نامکمل ہے اور اس کی تکمیل ان روایات سے ہوتی ہے جو عجمی ٹکسالوں میں گھڑی گئی تھیں، تو پھر یہ کہنا چھوڑ دو کہ خدا نے آپ کو ایک مکمل دین دیا تھا۔ یہ کہو کہ خدا نے ایک نامکمل دین دیا تھا جس کی تکمیل عجم کی کمین گاہوں میں جا کر ہوئی۔ اس کا اعتراف کیجئے اور پھر یا تو "گھروں میں بیٹھ کر روئیے" اور یا "پانی میں ڈوب کر مر جائیے" تاکہ آپ کو شہادت کا درجہ نصیب ہو جائے اور آپ اپنے ساتھ ستر ستر آدمیوں کو جنت میں لے جائیں۔

بگو "عجمی" مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است

اسلام کا نظامِ سیاست

جناب ہارون خاں شروانی صاحب

تلخیص و ترجمہ: جناب اصغر علی صاحب

اسلامی نظامِ سیاست کا موضوع چھیڑتے ہوئے میں سرِدست احادیث کے ضخیم مجموعوں پر بحث نہیں کروں گا کیونکہ قرآن ہی میں جا بجا ایسے مفصل اور جامع احکام و فرامین ملیں گے جو تاریخی مثالوں سے پُر ہیں۔ میں اپنی گفتگو کو محض قرآن کے سیاسی زاویوں تک محدود رکھوں گا اور جہاں تاریخی مثالوں کا حوالہ آئیگا وہاں کسی معتبر سند کی روشنی میں متن کی وضاحت کروں گا۔

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ رسولِ کریمؐ کی بعثت سے لیکر وفات کی تئیس سالہ سیاسی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ رسول کریمؐ کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی۔ جب مکہ معظمہ سے دو میل کے فاصلے پر غارِ حرا میں وہ مشہور آیت اقرأ باسم ربك الذی نازل ہوئی۔ جس میں انسان کی بے بضاعتی اور علم کی اہمیت جو انسانی عظمت کا ذریعہ ہے، صریح طور پر بیان کی گئی ہے۔ علم الاشیا اور قوانینِ فطرت کا انکشاف قرآن کا بنیادی تصور ہے اور اس کے تمام تر احکام میں صرف اسی پر زور دیا گیا ہے کہ انہی سے انسان پر کائنات کے ابدی قوانین کے رازہائے سربستہ و اشگاف ہوتے ہیں۔ اور شاید اسی نظریہ کے پیش نظر قرآنی طریقِ حیات کو قدیم اور غیر متبدل کہا جاتا ہے۔

بیعتِ عقبہ (۶۲۰ء) سے اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں کا سراغ ملتا ہے۔ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ مکہ کی حدود سے باہر ایک ویران گوشے میں صرف بارہ آدمیوں نے پہلی مرتبہ رسول کریمؐ سے پیمانِ وفا باندھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی رسول کریمؐ بے یار و مددگار ایک جھاڑی کے نیچے تشریف فرما ہیں اور یہ بارہ افراد ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرتے ہیں کہ وہ آفاقی اور غیر متبدل قانونِ الٰہی پر عمل پیرا ہوں گے، خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کریں گے، چوری اور بدکاری کے مرتکب نہ ہوں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے، افترا اور غیبت سے پرہیز کریں گے، اور غم و شادمانی میں وفادار رہیں گے۔

یہاں سے تزکیۂ نفس، اصلاحِ معاشرہ اور عملِ شرعی کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسری بیعت جو دو سال بعد کی گئی، رسول کریمؐ کے احکام کی تعمیل اور بشرطِ ضرورت ان کے تحفظ کا تذکرہ واضح طور پر تھا۔ اور رسولِ کریمؐ نے اپنی طرف سے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کے اور بیعت کرنے والوں کے حقوق یکساں رہیں گے۔ اسی سال جب مسلمانوں کی مختصر سی جماعت اہل مکہ کے ظلم و تعدی سے پریشان ہوکر رسول کریمؐ کی قیادت میں مدینہ پہنچی تو پیغمبرِ اسلام نے وہاں اس عظیم اسلامی اخوت کی بنیاد رکھی، جس میں

نسلی، لسانی اور جغرافیائی امتیازات کی کوئی گنجائش نہ تھی اور جہاں مہاجر اور انصار بھائی بھائی کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

مدینہ میں مسلمانوں کو مقامی یہودیوں سے واسطہ پڑا۔ اس نوزائیدہ مملکت کے لئے مسلمانوں کے علاوہ ان یہودیوں کا تحفظ بھی ضروری تھا۔ رسول کریمؐ کی دور اندیشی اور سیاسی فراست اس عہدنامے سے ظاہر ہوتی ہے جس میں یہودیوں کو مسلمانوں کے مساوی شہری حقوق تفویض کئے گئے، اور یہ اعلان کیا گیا کہ مدینے کی یہ دونوں جمعیتیں ایک ہی پارٹی متصور ہوں گی، قانون شکنی کرنے والے خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں سزا کے مستوجب ہوں گے۔ مسلمان اور یہودی مشترکہ طور پر تحفظِ مملکت کے ذمہ دار ہوں گے اور تمام تنازعات خود پیغمبر اسلام طے کریں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر وہ لوگ جنھیں تحفظ کا ذمہ دیا گیا تھا، اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے تو مساوی شہری حقوق اور آزادیٔ ضمیر کا منشور اپنی جگہ برقرار رہتا۔ لیکن یہودی بہت جلد عہدنامہ کی خلاف ورزی پر اتر آئے اور انھوں نے ایسے حالات میں نوزائیدہ مملکت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کی، جبکہ اہالیانِ مکہ کے حملے کا خطرہ بدستور موجود تھا۔ لیکن پیغمبر اسلام اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ اور انھوں نے نجران کے نصاریٰ کو بھی منشورِ آزادی دیدیا اور اعلان فرمادیا کہ ان کا مذہب اور جان و مال محفوظ رہیں گے، مذہبی رسومات ادا کرنے میں انھیں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی، کسی پادری کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹایا جائے گا، کسی بت یا صلیب کو برباد نہیں کیا جائے گا، ان سے کوئی محصول نہیں لیا جائے گا اور انھیں عساکر مہیا نہیں کرنے پڑیں گے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان اہل ذمہ کی مسلح سازشوں کی وجہ سے ان عظیم عہدناموں میں سے کوئی بھی موثر ثابت نہیں ہو سکا۔ یہودیوں کے قبیلوں کو یکے بعد دیگرے مدینہ سے نکالنا پڑا اور پیغمبر اسلام کو غسان کے نصاریٰ کے خلاف مہم بھیجنی پڑی کیونکہ انھوں نے مدینہ کے ایک پُرامن سفیر کو قتل کر دیا تھا۔ بہرصورت وفات سے قبل پیغمبر اسلام نے تمام عرب کو ایک قانون کا مطیع بنا دیا تھا۔ اور اس ملک کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ سیاسی معجزہ ان لاتعداد انسانوں کی وحدتِ فکر و عمل کا نتیجہ تھا جو ۶ مارچ ۶۳۲ء کے تاریخی دن پیغمبر اسلامؐ کا خطبہ حجۃ الوداع سننے کو جمع ہوئے تھے۔ وہ خطبہ انسانی تاریخ میں ایک اہم ترین اعلان ہے۔ یہ امر ان لوگوں کے لئے جو عرفات کے میدان میں جمع تھے فی الواقع وجۂ صد افتخار تھا کہ جس مہم کا آغاز ان کے پیغمبر نے بمشکل بیس سال قبل کیا تھا وہ آج بخیر و خوبی سرانجام دی جا چکی تھی۔ رسول کریمؐ نے اس واقعہ کے پورے دو ماہ بعد ۸ جون ۶۳۲ء کو انتقال فرمایا۔

اس عظیم الشان ہستی کے چند اہم ترین سیاسی کارناموں پر جس نے عملاً ساری بنی نوع انسان کی زندگی کا رخ بدل دیا، نظر ڈالنے کے بعد میں اب موضوع کے تمام گوشوں پر بحث کر سکوں گا۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ یہ استدلال کا جو طریق قرآن نے اختیار کیا ہے وہ تاریخی طریقِ استدلال ہے جس میں عمومی تصورات کی وضاحت عرب اور ہمسایہ ملکوں کے تاریخی شواہد سے کی گئی ہے۔ حتی کہ جہاں قرآن کوئی مجرد نظریہ پیش کرتا ہے، وہاں بھی وہ اہلِ عرب کی قدیم تاریخ کے

ع کی روشنی میں اس کی تشریح کرتا ہے۔ قرآن قدیم سلطنتوں اور دوسری قوموں کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے
ن کے زوال کے بین اسباب کا تجزیہ کرتا ہے تاکہ آنے والے عبرت حاصل کر سکیں۔ مثلاً قدیم سلطنتوں میں مصر کو صحیح طور پر
تر ین اور محکم ترین سلطنت کہا گیا ہے۔ لیکن یہ سلطنت اس لئے نیست و نابود ہو گئی کہ اس کے حکمران انسان کی بے مائیگی اور
نِ الٰہیہ کی ہمہ گیری کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کو فرعونِ مصر کے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ
نے قانونِ الٰہیہ سے سرتابی کی تھی۔ اور وہ ارضِ خداوندی پر ظلم و تشدد کا علمبردار تھا۔ اس کا ایک بڑا جرم یہ بھی تھا کہ اس
اپنی قوم کی وحدت قائم رکھنے کی بجائے اسے گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، جن میں سے کسی پر اس کا لطف و کرم ہوتا تھا اور کسی پر غیض و
ضب، اور اس طرح وہ خدا کی مخلوق پر تطاول و تعدی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ قرآن اسرائیلیوں کی مثالیں دے کر واضح کرتا ہے
خدا نے انھیں اپنے خاص لطف و کرم سے سرفراز کیا، اور نہ صرف ان میں سے پیغمبر پیدا کئے، بلکہ انھیں بادشاہت بھی
شی۔ اور جب حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان پر ظلم شروع ہو گیا اور انھیں گھروں سے نکالا جانے لگا تو انھیں طالوت جیسا
لمراں دیا گیا (۲-۲۴۶) اس تمام واقعہ سے یہ حقیقت نمایاں طور پر ابھرتی ہے کہ ایک اچھے امیر کے لازمی اوصاف علم اور
رت ہیں۔ یہ اوصاف آج بھی اسی قدر مسلم ہیں جس قدر کہ صدیوں پہلے تھے۔

قرآن قوموں کے اصلی طرزِ حکومت کا حوالہ دیئے بغیر ان کے زوال کے اسباب کی تعمیم بھی کرتا ہے۔ اور یہ عظیم الشان کلیہ
قائم کرتا ہے کہ خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ تبدیلی ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے نہ پھوٹے۔
چونکہ کائنات کے قوانین فی نفسہ کسی ناانصافی پر مبنی نہیں ہیں اس لئے ہر ملت کو پہلے صحیح کردار کے اصول و قواعد سے آگاہ کر دیا
جاتا ہے لیکن جب وہ سرکشی کر کے ان حدود کو توڑ دیتی ہے تو کسی دوسری ملت سے بدل کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کائنات
کا سلسلہ ایسا ہے کہ قومیں بھی افرادِ بنی نوع انسان کی طرح عروج و زوال کی منزلوں سے گزرتی ہیں۔ جب ملی امراض ناقابلِ
علاج ہو جاتے ہیں تو قومیں افراد کی طرح راہیِ ملکِ عدم ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی جگہ نئی اور زیادہ صحت مند قومیں
ابھر آتی ہیں۔

قرآن خدا کی وحدت اور زمین پر اس کی حکمرانی کے تصورات سے پُر ہے۔ اس تصورات سے تین نمایاں نظریات مترشح ہوتے
ہیں، جن کا تعلق قرآن کے سیاسی گوشوں سے ہے۔ اول تو یہ کہ ایک حکمراں کی حیثیت سے خدا کی وحدت کا تصور قانونی وحدت
کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور جیسا کہ خود قرآن صراحت کرتا ہے، اس کے شرعی احکام کائنات کے غیر متبدل قوانین سے ہم آہنگ
ہیں۔ دوسری بات جو یاد رکھنی چاہئے یہ ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کی نظر میں اس کی تمام رعایا مساوی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح
خدا کی حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان اس کے نزدیک برابر ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان قانونِ فطرت کو بدلنے کی
قوت نہیں رکھتا — اس کا کام صرف یہ ہے کہ نظامِ کائنات کے اسرارِ پوشیدہ کی جستجو کرتا رہے، بالکل اس طرح جیسے کوئی
سائنسداں قوائے فطرت کا سراغ لگاتا ہے یا جیسے کوئی عالم معاشیات انسان اور معاشی دولت کے قدرتی رشتہ کی

چھان بین کرتا ہے۔

قانونِ خداوندی کی حکومت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، یا کم از کم اس کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے پر رضامند ہوتے ہیں وہ ہر نوع کے زیاں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ حکم عدولی کے مرتکب ہوتے ہیں وہ حکومت کی حفاظت سے محروم ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے آجکل کی حکومتوں میں مجرم سزائے قید، جرمانہ یا قتل کے مستوجب قرار دیئے جاتے ہیں۔ کائنات کا حقیقی حاکم اللہ ہے، اسی کا قانون سب پر نافذ ہے، انسان زمین پر اس کا نائب ہے[1] جس کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ قانونِ الٰہی کے مطابق دنیا میں عدل قائم کرے۔ یہ ہے قرآن کی تعلیم اور یہی ہے عدل کا وہ نصب العین جس سے انسان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور جسے آج دنیا بھر میں انسان کا مقدس ترین حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

قرآن کے نزدیک فتنہ و فساد سے زیادہ کوئی شے نفرت انگیز نہیں، کیونکہ انہی سے نظامِ سیاست میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر قرآن میں جگہ جگہ آیات موجود ہیں۔ جب اللہ نے انسان کو اپنا نائب[1] بنایا تو فرشتوں کو شبہ ہوا کہ وہ دنیا میں قتل و غارت گری اور فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ دوسری جگہ اللہ نے اسرائیلیوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں، اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالیں۔ یہ ہدایت قرآن میں بار بار آئی ہے، کیونکہ انسان کی انسان سے عداوت میں اعتدال پیدا کرنا ضروری تھا۔ قرآن کے نزدیک قتل سے فساد قبیح تر ہے اور جو لوگ فساد برپا کرتے ہیں ان پر خدا کی لعنت نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے حکومت کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ فساد کو حتی الامکان پر امن ذرائع سے رفع کرے۔ لیکن اگر حالات مقتضی ہوں تو پوری قوت سے اس کا استیصال کرنا چاہئے۔ جو لوگ سیاسی جنگ و جدل کی طرح ڈالتے ہیں ان کی اطاعت لازم نہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کو قتل کر دینا چاہئے یا جلاوطن کر دینا چاہئے۔ اس عمل کو قرآن نے خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کا مترادف قرار دیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے مکہ کو اپنا مسکن بنایا تو انھوں نے خدا تعالیٰ سے پہلے یہی دعا مانگی کہ وہ ہمیشہ امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنا رہے۔ اسلامی نظامِ سیاست کی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے متخالف اور معاند عناصر میں اتحاد و یگانگت پیدا کر دی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ متحد رہیں، ایک دوسرے سے ہمدردی کریں اور بھائی بھائی بن کر رہیں۔ ورنہ ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو دوسرے مفسدین کا ہوتا ہے۔

یہ ان اسلامی اصول حرب کے عین مطابق ہے جن کا تذکرہ خصوصاً دوسری سورۃ میں آیا ہے۔ اس سورہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ مملکت کے خلاف جنگ کرتے ہیں ان کے خلاف جہاد لازم ہے، اور جونہی وہ جنگ سے باز آئیں اور قانونِ الٰہی کی حاکمیت تسلیم کرلیں تلوار کو نیام میں رکھ لینا چاہئے۔

یہ اصول قرآن کی حقیقی روح کے مطابق ہے۔ کیونکہ دو بنیادی نظریے جو قرآن نے پیش کئے "ایمان" (بمعنی امن) اور "اسلام" (بمعنی اطاعت) کی اصطلاحوں میں مضمر ہیں۔ ساتھ ہی یہ اصول اقتدار کے جدید تصور کے بھی عین مطابق ہے۔ کیونکہ کسی مرکزی اقتدار کی اطاعت کے بغیر حکومت کا تصور بے معنی ہے۔ علاوہ بریں کیونکہ قانونِ الٰہیہ سب سے ارفع اور ہمہ گیر ہے، اس لئے

---

[1] انسان خدا کا نائب نہیں۔ یہ عقیدہ غیر قرآنی ہے۔ طلوعِ اسلام

جائز طور پر انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس ضابطے کے سامنے جو رسول کریمؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہوا، سر تسلیم خم کرے۔
ں کو انتباہ کیا گیا ہے کہ وہ نام نہاد ضابطہ ہائے زندگی جو ان کے آبا و اجداد نے اختیار کئے تھے، درست نہیں تھے۔ کیونکہ ان کی
ت محدود اور قانونِ فطرت کا ادراک ناقص تھا اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ان کے مابین کسی مسئلے کے بارے میں اختلاف
ۓ تو وہ قانون کی طرف رجوع کریں جو ان کو ان کے خدا کی طرف سے ملا ہے۔ جس میں انھیں اپنے تمام مسائل کا حل مل جائیگا۔
انوں کے لئے صرف ایک مجہول قسم کی اطاعت ہی کافی نہیں، بلکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر حالات کا اقتضا ہو تو وہ دنیا میں
نِ الٰہی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بہ رضا و رغبت اپنا سب کچھ قربان کر دیں اور ہر طرح کی اذیت، بھوک اور مصائب کا
ہ کریں۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ خود رسولِ کریمؐ اپنی بارہ سالہ مکی زندگی میں پابندی سے اس اصول پر عمل پیرا رہے۔ گو انھیں پریشان
ا، ان پر سنگ باری کی گئی، انھیں اذیتیں پہنچائی گئیں، ان کے خلاف سازشیں کھڑی کی گئیں اور بالآخر وہ اپنے ان ساتھیوں
ت جن کی نظر میں وہ خیرِ مجسم تھے مکہ سے دو سو میل دور مدینہ کو ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

قرآن انسانی مقتضیات کا صحیح اندازہ . . کرکے یہ اعلان کرتا ہے کہ گو قانونِ الٰہی کی خاطر اتنی عظیم قربانیاں ایک فرد
قطۂ نظر سے سخت اور ناگوار ہو سکتی ہیں، لیکن وہ بالکل لابدی اور ناگزیر ہیں کیونکہ انجام کار وہ مجموعی حیثیت سے قوم کے لئے
مند ہوتی ہیں۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی مفادات کا بنیادی تضاد بھی واضح ہوتا ہے۔ اور فرد کے لئے اجتماعی مفاد کی خاطر
ں دولت اور زندگی قربان کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر قرآن اعلان کرتا ہے کہ قتل کے معاملے میں قصاص
ہیں قوم کی زندگی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر انسانی زندگی کا احترام ممکن نہیں۔ قرآن کے قوانین محض قتل اور چوری کے
ئم یا قصاص کے اس عظیم اصول تک ہی محدود نہیں، بلکہ قرآن قانونی شہادت حتیٰ کہ قانونی دستاویز نویسی کے بھی عمومی اصول
ن کرتا ہے۔ مثلاً یہ اصول کہ قرض وغیرہ کے معاملات کو ہمیشہ ضبطِ تحریر میں لے آنا چاہئے۔ یا یہ کہ فروخت اور رہن کے معمولی کاروبا
ضبطِ تحریر میں لانا ضروری نہیں، اور یہ کہ کسی لین دین کو ثابت کرنے کے لئے صرف دو شہادتیں کافی ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان بنیادی
مولوں کو نہ صرف رسول کریمؐ کی زندگی یا ساتویں صدی عیسوی میں ہی کافی اثر و نفوذ حاصل ہوا بلکہ موجودہ دور کے قوانین میں بھی
ن کے حقیقی اثرات موجود ہیں۔

ان امور سے قرآنی نظام میں قانونِ عدل کی زبردست اہمیت ہم پر واضح ہوتی ہے۔ رسالت، بنیادی عدالت بیان کی
باتی ہے کیونکہ منقول ہے کہ قدیم زمانے کے پیغمبروں کو آسمانی کتابیں دے کر اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ انسانوں کے باہمی تنازعات
طے کریں اور پیغمبر اسلامؐ نے اعلان کیا کہ مجھے عدل پر مامور کیا گیا ہے۔

منصفوں کے لئے عدل و انصاف ہی کا حکم ہے نہ یہ کہ وہ اپنی ذاتی پسند یا ناپسندیدگی، محبت یا نفرت سے متاثر ہوں۔ اور
گواہوں کے لئے ہدایت ہے کہ وہ سچ بولیں۔ ساتھ ہی یہ صحت مند اصول بھی وضع کیا گیا ہے کہ جھوٹا استغاثہ کرنے والے کو سخت
سزا ملنی چاہئے۔ یہ اصول ہر حکومت کیلئے لازمی اور ناگزیر ہیں، ان کی اساس کچھ ہی ہو لیکن ان کی عالمگیر موزونیت سے انکار

نہیں کیا جاسکتا۔

اُن معاشرتی اصلاحات کا تذکرہ میرے احاطۂ مضمون سے باہر ہے جو قرآن نے ایک ایسے معاشرے میں نافذ کیں، جو قبائلی حدود کے علاوہ اور کسی پابندی سے آشنا نہ تھا اور نہ میں اس بظاہر ناممکن الحصول اتحاد و برادری کے متعلق گفتگو کروں گا جسے قرآن اعدائے سابقہ میں ائتلافِ قلبی اور عناصرِ متحارب کی یگانگت کا نام دیتا ہے۔ جو لوگ قانونِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں قرآن انھیں ہدایت کرتا ہے کہ وہ حبل اللہ سے اعتصام کریں اور باہمی تفرقہ اندازی سے مجتنب رہیں۔ قرآن مسلمانوں کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی بیان کر جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جب تک مالکِ مکان اجازت نہ دے کوئی کسی دوسرے کے مکان میں داخل نہ ہو۔ حتیٰ کہ ایسے مواقع پر جبکہ آپ کو خلوت کی ضرورت ہے تو آپ کے بچوں کو بھی کمرے میں اجازت لیکر داخل ہونا چاہیئے۔ یا یہ کہ تاجروں کو اپنا سامان معین اوزان کے مطابق تولنا چاہیئے یا یہ کہ چوری، زنا، بہتان وغیرہ شرمناک افعال کی روک تھام کرنی چاہیئے۔ اس نوع کی بہت سی معاشرتی اصلاحات کا قرآن میں جا بجا ذکر ہے اور یہ اصلاحات صرف نظریات کے طور پر پیش نہیں کی گئیں تھیں بلکہ سرکش عربوں کو ان پر عمل پیرا کیا گیا اور اس طرح صحرا کے بدو اعلیٰ مدبر، جرنیل، تاجر اور حکمراں بن گئے اور ان لوگوں سے بھی برتر ہو گئے جو اپنے ہزاروں سال کی پرانی تہذیب پر نازاں تھے۔

قرآنی حکومت میں مشاورت کو ایک اہم مقام حاصل ہے جہاں اچھے مسلمانوں کے اور اوصاف گنوائے گئے ہیں یا انھیں خدا پر توکل کرنے والوں کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جہاں انھیں معصیت سے پرہیز کرنے والے اور انسانی حقوق کے نگہبان کہا گیا ہے، وہاں ان کی یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ ضرورت کے وقت آپس میں مشاورت کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ رسولِ کریمؐ کو بھی ہدایت کی گئی کہ جہاں انھیں ایک مرتبہ فیصلہ کرنے کے بعد خدا کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیئے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مسئلہ پر پہلے مشاورت طلب کرلیں . . . . اسی صحیح جمہوری جذبہ کے پیشِ نظر جس میں نہ صرف مشیروں کی تعداد بلکہ ان کی صلاحیت کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا دینِ قرآنی نے دنیا سے کم از کم اپنے بنیادی اصولوں کا لوہا منوا لیا۔ اس جذبہ کی مزید شہادت اس اصول سے ملتی ہے جس پر قرآنی محصولات (Qurani Taxation) کی اساس ہے۔ درحقیقت پیغمبرِ اسلامؐ کی سیدھی سادی زندگی کی طرح قرآنی بنیادوں پر قائم کی ہوئی حکومت بھی سیدھی سادی تھی اور اپنے قیام کے لئے وسیع مالیات کی محتاج نہ تھی۔ اس طرح قرآن نے ایک اعلیٰ اور کم صرفہ نظامِ حکومت کی مثال قائم کی۔

قرآن میں صرف تین محصولات کا ذکر ہے۔ ۲½[لہ] فی صدی زکوٰۃ، جزیہ، جو غیر مسلموں سے عسکری خدمات سے مستثنیٰ ہونے کی صورت میں واجب الوصول تھا، اور خراج جو اراضی پر لگان کی شکل میں تھا۔ جنگوں کا غیر معین مالِ غنیمت ان محصولات سے علاوہ تھا۔ جہاں تک زکوٰۃ اور مالِ غنیمت کا تعلق ہے قرآن نے ان کی تقسیم کی مدات مقرر کر دی ہیں۔ ان کا صرف ایک مخصوص حصہ

لہ قرآن نے "زکوٰۃ" کی شرح کہیں متعین نہیں کی۔ طلوعِ اسلام

حکومت کی تحویل میں دیدیا ہوتا ہے، اور باقی حصہ اس طرح تقسیم ہو کہ دولت مندوں کے مال ومتاع میں سے کچھ حصہ ملک کے غریبوں اور محتاجوں کو ملے، اور حکومت کے مصارف کا بڑا حزبہ دوسرے ذرائع آمدنی سے حاصل ہو۔

لیکن قرآن کی اکملیت کا صحیح احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم بین الاقوامی معاملات، قوانینِ جنگ، تدبر سیاست اور معاہدوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جنگ کا پہلا اصول جو پیغمبر اسلام کو بذریعہ وحی تعلیم کیا گیا یہی تھا کہ جہاد محض اس لئے ضروری ہے کہ دشمنوں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے، اور جہاد صرف ان ہی لوگوں کے خلاف جائز ہے جنھوں نے عملی طور پر مسلمانوں کی نوزائیدہ قوم کے خلاف جنگ کی طرح ڈالی ہے۔ اور جنگ جاری اس وقت تک رکھنی چاہیئے جب تک کہ فتنہ کا مکمل طور پر سدباب نہ ہو جائے۔ اسی اثنا میں اگر دشمن معاہدۂ امن پر آمادگی کا اظہار کرے تو اس کی پیشکش کو رد نہیں کرنا چاہیئے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن ان کفار سے معاہدے اور دوستی کی اجازت ہرگز نہیں دیتا جو قانونِ الٰہی سے بغاوت کرتے ہیں۔ اور جب ایک دفعہ ان کے خلاف جہاد شروع کر دیا جائے تو ان کے ساتھ کسی قسم کی رورعایت نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وحی نے بار بار اس فرق کو نمایاں کیا ہے جو غیر مسلموں کے ان دو گروہوں کے درمیان تھا جن میں سے ایک تو مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور دوسرے نے اپنے معاہدوں کو توڑ دیا تھا اور مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو قطعی طور پر یہ حکم دیدیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کبھی اپنے معاہدے نہ توڑیں جو اپنے قول وقرار پر کاربند رہتے ہیں۔

قرآن نے جنگی قیدیوں کے ساتھ جس نرمی کی تلقین کی ہے وہ انسانی معاشرے میں ایک غیر معمولی ترقی کی آئینہ بردار ہے۔ جنگ بدر سے جنگی قیدیوں کو زندہ رکھنے بلکہ انھیں حقیر سے تاوان پر رہا کرنے یا ان سے بچوں کی تعلیم جیسا کوئی مفید کام لینے کا دستور جاری کیا گیا، انہی عربوں کو جن کی عورتیں بھی میدان جنگ میں مرتے ہوئے انسانوں پر ترس نہیں کھاتی تھیں، اس یوم عظیم کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جب پیغمبر اسلامؐ ہزاروں مجاہدین کے سپہ سالار کی حیثیت سے فاتح بن کر مکہ میں آئے اور فاتحین میں سے کسی نے بھی ان لوگوں کو چھوا تک نہیں جنھوں نے کچھ عرصے پہلے انھیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب ہم رواداری کے اس عظیم اصول کی طرف آتے ہیں جسے قرآن نے نہایتِ حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابھی صرف ساتویں صدی عیسوی تھی اور دنیا مذہبی رواداری کے نام تک سے ناآشنا تھی۔ اس لئے سیاسی نظریات کی تاریخ میں یہ بات بڑی عجیب اور حیران کن تھی کہ قرآن نے متفرق مذہبی عقائد کو مسلمات کا درجہ دیدیا اور اس مبانی پر اس عظیم الشان نصب العین کی عمارت استوار کر دی کہ "دین میں جبر واکراہ کی گنجائش نہیں ہے"۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کو جب وہ فرعون کے پاس گئے، نرم کلامی کا حکم دیا گیا تھا، اسی طرح مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ کسی اور مذہب وعقیدہ کے لوگوں سے بات چیت کریں، تو ان کی گفتگو کا انداز نہایت مصالحانہ ہونا چاہیئے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ نصب العین اس شخص نے پیش کیا جو بذاتِ خود ہر نوع کی اذیتوں کا شکار بن چکا تھا۔ اسے حکم تھا کہ اگر آبادی کا صرف ایک حصہ ایمان لائے تو اسے آبادی کے دوسرے حصے کے متعلق خدا کے احکام کا منتظر رہنا چاہیئے۔ اگرچہ مسلمانوں کو مخالفوں اور منافقوں کے ساتھ

ستی ومحبت سے منع کیا گیا ہے تاہم قرآن نے ایسے لوگوں اور ان عیسائیوں کے درمیان جو اپنے نبیوں کی تعلیمات کے پیش نظر م دل اور خدا ترس تھے ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔ جہاں تک مکہ کے غیر مسلموں کا تعلق ہے ایک پوری کی پوری سورت ان سے علق نازل ہوئی ہے۔ اور آخر میں یہ عظیم الشان اصول وضع کیا گیا ہے کہ "قل یا ایھا الکفرون لا اعبد ما تعبدون" یہ بات م ہے کہ اگرچہ مذہبی فکر کا رخ اس صحت مند نظریہ کے ہمہ گیر اطلاق کی سمت رہا ہے لیکن موجودہ دور میں بھی دنیا کے بعض اہم حصول ں مذہبی ایذا رسانی کے قدیم وحشیانہ جذبہ کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور اپنے ہی ہم وطنوں اور ہم زبانوں کو محض اس لئے نہیں اپنایا ا رہا ہے کہ ملک کے باشندوں کی اکثریت سے ان کے مذہبی عقائد مختلف ہیں۔

آخر میں اب میں بین الاقوامیت کے اصول کی طرف آتا ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب قرآن نازل ہوا تو دنیا میں متخاصم اور ارب قوموں، جماعتوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی تھی، اور اسلام نے بین الاقوامیت کا نظریہ پیش کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا لاشبہ یہ ایک دلیرانہ اقدام تھا۔ لیکن یہ اقدام قرآن کے دوسرے اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اگرچہ قرآن اس نظریہ کو تسلیم تا ہے کہ انسان طبقات میں منقسم ہے اور مدارج کا تعین اس لئے جائز ہے کہ صلاحیتیں پرکھی جا سکیں، لیکن یہ بالکل واضح طور پر تا دیا گیا ہے کہ ذات پات کی تمیز اور متخاصم جماعتوں کا وجود ایک نوع کا عذاب ہے، جو گمراہی پر نازل ہوتا ہے۔ اور جو قومیں اور قبیلے بھی موجود ہیں ان کا طبعی سرچشمہ ایک ہی ہے، اور ان کے وجود کا جواز صرف یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ممیز ہو سکے پھر دوسرا نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ کسی مخصوص خاندان، نسل، قبیلے یا قوم سے متعلق ہونا برتری کا معیار نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی معیار ذاتی کردار کی بلندی ہے۔ اس شخص کی زندگی جس نے اپنی عزیزہ کی شادی ایک آزاد شدہ غلام کے ساتھ کی، جس نے ایک آزاد شدہ غلام کو قریش کا کمانڈر مقرر کر دیا، جس نے اپنے اقتدار کے پورے عروج پر بھی غریب ترین انسان کی سی زندگی بسر کی، جس کے دل میں مظلوموں اور مصیبت زدوں کی بہبودی کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہ تھا، یہ پرانی قیود کے خلاف ایک زبردست بغاوت کی زندہ مثال ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بین الاقوامیت کے علمبرداروں کی راہ میں ہمیشہ سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ وہ نسلی، لسانی اور جغرافیائی حدود کو عبور نہیں کر سکتے۔ اور خواہ انسان کی تمنائیں اور نظریات کتنے ہی مقدس کیوں نہ ہوں، وہ ابھی تک ان حدود کو عبور نہیں کر سکا ہے۔ اور نہ ہی "پارلیمانِ آدم" یا "وفاقِ عالم" قائم کرنے کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہو سکا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے انسان کو ایک راہ دکھائی۔ قانونِ الٰہی کی راہ۔ جو نسلی، ملکی، لسانی اور جغرافیائی حد بندیوں کے برعکس تمام بنی نوعِ انسان کے لئے قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ رسول کریمؐ نے روم، فارس، حبشہ، عرب اور دوسرے ملکوں کے باشندوں کے ساتھ جو قانونِ الٰہی پر ایمان لائے تھے ایک عظیم الشان اتحاد قائم کر کے نہ صرف ایک نظریہ ہی پیش کیا بلکہ اس نظریہ کی اکملیت اور کامیابی کا عملی ثبوت بھی بہم پہنچایا۔

39۵9.7....

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

کے

چند عنوانات

آنحضرتؐ کا بچپن ــــــ اسوۂ محمدیہؐ پر ایک نظر ــــــ گنبدِ خضراء

حضرت ابوذر غفاریؓ ــــــ حضرت اویس قرنیؓ ــــــ مثنوی اسرارِ خودی

پیامِ مشرق ــــــ جاوید نامہ ــــــ ضربِ کلیم ــــــ اسبابِ زوالِ امت

عربی خط ــــــ نابینائی ــــــ سفرِ حج ــــــ میری طالب علمی

بڑا سائز ــــــ ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت مجلد چار روپے۔ محصولڈاک نو آنے

ادارہ طلوعِ اسلام، رابسن روڈ۔ کراچی

شیعہ

(علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

[طلوع اسلام کی ایک سابقہ اشاعت میں' نادرشاہ اور اتحاد سنی و شیعہ کے عنوان سے علامہ اسلم صاحب کا مضمون شائع ہوا ـــ اس پر بہت سے حضرات نے کہا ہے کہ فرقہ شیعہ کے بنیادی مذہبی عقائد کے متعلق بھی کچھ لکھنا ضروری ہے کیونکہ ان کے متعلق صحیح معلومات بہت کم پائی جاتی ہیں۔ ان حضرات کے تقاضے اور اس ضرورت کے پیش نظر، علامہ اسلم صاحب کا یہ مضمون درج طلوع اسلام کیا جاتا ہے جو ان کی تصنیف، تاریخ الامت جلد ہشتم سے ماخوذ ہے۔

طلوع اسلام نہ شیعہ ہے نہ سنی۔ نہ اہل حدیث نہ اہل قرآن۔ یہ کسی فرقہ سے بھی متمسک نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک فرقہ بندی از روئے قرآن شرک ہے۔ اس لئے اس میں اگر کسی فرقہ کے متعلق کچھ شائع ہوتا ہے تو وہ محض بغرض معلومات ہوتا ہے اور اگر کسی فرقہ کے کسی مسلک پر تنقید ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے فرقے کے نقطۂ نگاہ سے نہیں ہوتی بلکہ خالص قرآن کی روشنی میں ہوتی ہے۔ اسلئے زیر نظر مضمون کو بھی اسی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ خود علامہ اسلم صاحب کا بھی یہی مسلک ہے۔ اس لئے ان کے اس قسم کے مضامین میں بھی "حب علیؓ یا بغض معاویہؓ" کے محرکات کی تلاش بے سود ہوگی۔ ان کا قلم صرف خدا کے لئے اٹھتا ہے اور اس کی کتاب کی تعلیم کی نشر و اشاعت ان کا وظیفۂ زندگی ہے۔ طلوع اسلام]

شیعہ کا اختلاف بھی جمہور امت سے خلافت ہی کے مسئلہ میں ہے۔ اور یہ فرقہ بھی خوارج کی طرح خالص سیاسی ہے جس پر بعد میں دینی رنگ چڑھا دیا گیا۔

شیعیت کا پہلا تخم صحابہؓ میں سے وہ جماعت تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتی تھی مثلاً حضرت عباسؓ، ابوذر غفاریؓ، مقداد بن اسودؓ، عمار بن یاسرؓ اور سلمان فارسی وغیرہ لیکن یہ خیال سادہ تھا جس میں نہ نبی کی طرح امام کی تقدیس شامل تھی نہ اس کے منصوص ہونے کا عقیدہ تھا۔ بلکہ صرف حضرت علیؓ کی محبت، عظمت اور قرابت رسول کی خصوصیت کی وجہ سے ان کو خلیفہ دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔

لیکن انتخاب حضرت ابوبکرؓ کا ہو گیا اور تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کی بیعت کر لی اور اپنی خلافت کا نہ دعویٰ کیا نہ اپنے حق کی کوئی نص پیش کی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوئے تو ان کے ہاتھ پر بھی بیعت کی اور ان کی زندگی بھر ان کے حامی اور مطیع رہے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت کو بھی تسلیم کیا۔

حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو جانے کے چند سال بعد اپنے خاندان بنی امیہ کے اثر میں آ گئے۔ اور بڑی بڑی ولایات کی حکومتیں
لو دیدیں، جس سے حریفوں کی نگاہوں میں ان کی خلافت کا انداز اموی حکومت کا معلوم ہوا۔ اس وقت مخفی جمعیتیں قائم
یں اور عبداللہ بن سبا کی سازش سے جو صنعا کا یہودی تھا عراق سے لیکر مصر تک ان کے خلاف بغاوت پھیلائی گئی۔ اس کا
م یہ ہوا کہ ان مقامات کے لوگوں نے مدینہ میں آ کر حضرت عثمانؓ کو قتل کر ڈالا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس سبائی تحریک میں شیعیت میں وصی کا عقیدہ داخل کیا گیا یعنی مشہور کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے اپنے بعد حضرت علیؓ کی خلافت
صیت کی ہے اور وہ ان کے وصی ہیں۔

بعد میں اس کی تشریح یہ کی گئی کہ امام جمہور کے انتخاب سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ امامت دین کا رکن ہے اور ان عام مصالح میں سے
ں ہے جو امت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے خود نبی کا فریضہ ہوتا ہے کہ اپنے بعد امام کو متعین کر جائے۔ پھر ہر امام دوسرے
م کی تعیین کرتا ہے۔

اماموں کا انتخاب اللہ کے ہاتھ میں رکھ دینے کی وجہ سے ان کی عظمت کا بھی دعویٰ کیا گیا کہ وہ ہر قسم کے گناہ بلکہ غلطی و
ا سے بھی معصوم ہیں۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر امام منصوص کی معرفت اصول ایمان میں سے قرار دی گئی اور یہی نقطہ مومن اور کافر
درمیان حد فاصل رکھا گیا۔ پھر یہ تلقین کی گئی کہ یہ امامت صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق ہے۔ اس طرح بتدریج
ندانی حکومت کا سیاسی دعویٰ مذہب بنا لیا گیا۔

اس جماعت میں خوارج سے بھی زیادہ فرقے ہوئے۔ کچھ تو دینی مبادی میں اختلافات کی وجہ سے اور کچھ ائمہ کی تعیین میں لیکن
منقرض ہو گئے۔ اب ان کے بڑے فرقے دو باقی رہ گئے ہیں۔ زیدیہ و امامیہ۔

زیدیہ یہ جماعت امام زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کی پیرو ہے۔ اور شیعہ میں سب سے زیادہ معتزل اور اہل سنت
سے قریب تر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ امام زید رئیس معتزلہ واصل بن عطار کے شاگرد تھے اور اس کی تعلیم کا
ن کے اوپر پڑا تھا۔ وہ فاضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی خلافت کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت علیؓ کو جملہ صحابہ میں
ل مان کر بھی شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ امام کی تعیین کے لئے وحی الٰہی یا النص کے قائل نہ تھے۔ بلکہ بنی فاطمہ میں سے جو
عالم، زاہد، سخی، شجاع ہو اور اہلیت رکھتا ہو اور امامت کا دعوی لیکر کھڑا ہو جائے وہ امام ہے۔

ان کے نزدیک امامت محض نظری شے نہیں تھی بلکہ عملی تھی جس کے لئے خروج لازمی تھا۔ ۱۲۲ھ میں انھوں نے جب ہشام
عبدالملک کے مقابلے میں خروج کیا تو شیخین کی خلافت کے قائل ہونے کی وجہ سے شیعہ امامیہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا،
لگ ہو گئے اور اسی دن سے رافضی کہے جانے لگے۔ آخر وہ مقتول و مصلوب ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے یحییٰ اپنی امامت
عوے لیکر اٹھے وہ بھی ۱۲۵ھ میں مارے گئے۔

آج یمن کے مسلمانوں میں بڑی تعداد اس فرقہ کی ہے۔ اہل سنت سے ان کے اختلافات اصول و فروع میں بہت تھوڑے ہیں۔

امامیہ

ان کا نام امامیہ اس لئے رکھا گیا کہ ان کی تمام مذہبی تعلیمات کا مرکزی نقطہ امام ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی صلی(اللہ علیہ وسلم) کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق ہے، نہ صرف اہلیت وصلاحیت کے باعث بلکہ بطریق النص۔ پھر ان کے امامت انہیں کی فاطمی اولاد میں محصور رہے۔ جو یکے بعد دیگرے متعین ہیں، اور ان کی معرفت اصول ایمان میں سے ہے۔

ان کے دو فرقے ہیں۔ اسماعیلیہ اور اثنا عشریہ۔ اسماعیلیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امام سادس جعفر صادقؒ کے بیٹوں میں (سے امامت) موسیٰ کاظمؒ کی طرف نہیں منتقل ہوئی جیسا کہ اثنا عشریہ کا خیال ہے بلکہ اسماعیل امام ہوئے۔ اسی نسبت سے اس جماعت (کا نام) رکھا گیا۔ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ امام کے پاس جب قوت نہ ہو تو وہ مستور رہے اور صرف اس کے دعاۃ تبلیغ کریں۔ چنانچہ ائمہ برابر مخفی رہے۔ یہانتک کہ عبداللہ المہدی قوت حاصل کرنے کے بعد ظاہر ہوا۔ اور ۲۹۵ھ میں اس نے افریقہ میں فاط(می سلطنت) قائم کی۔ غالباً اسی وجہ سے یہ جماعت باطنی کہی جاتی ہے۔

اثنا عشری بارہ امام کے قائل ہیں جو سلسلہ بہ سلسلہ حضرت علیؓ سے امام غائب تک ہیں۔ توضیح کیلئے ان کا مختصر (شجرہ)

۱- حضرت علیؓ ابن ابیطالب

۲- امام حسنؓ متوفی ۵۰ھ
- حسن
- عبداللہ المحض
- محمد (نفس زکیہ) ابراہیم
- یہ دونوں بھائی خلیفہ منصور پر خروج کر کے مقتول ہوئے۔

۳- امام حسینؓ مقتول ۶۱ھ
۴- علیؒ (زین العابدین) متوفی ۹۴ھ
۵- ابوجعفر محمد باقرؒ متوفی ۱۱۳ھ
۶- ابوعبداللہ جعفر صادقؒ متوفی ۱۴۸ھ
۷- موسیٰ کاظم متوفی ۱۸۳ھ
۸- ابوالحسن علی رضا متوفی ۲۰۲ھ
۹- ابوجعفر محمد جواد متوفی ۲۲۰ھ
۱۰- علی ہادی متوفی ۲۵۴ھ
۱۱- ابو محمد حسن عسکری متوفی ۲۶۰ھ
۱۲- محمد (مہدی منتظر) ۲۶۰ھ میں غائب ہوئے۔

محمد بن الح(نفیہ)
- ابوہاشم
- بنی عباس نے انہیں کے (بعد)
- کا دعویٰ کر کے خلافت

اسماعیل
- محمد
- اسماعیل
- محمد
- احمد
- عبداللہ
- احمد
- حسین

عبداللہ المہدی بانی دولت فاطمیہ متوفی ۳۲۲ھ

منصب امامت

شیعہ کے مخصوص عقائد کا مرکزی نقطہ امام ہے اس لئے یہاں امام کے متعلق اس جماعت کے نہایت اختصار کے ساتھ مذہب شیعہ کی سب سے معتبر کتاب کافی سے التقاط کر کے لکھا ہو(ں جو ابو جعفر محمد بن) یعقوب کلینی بغدادی متوفی ۳۲۹ھ کی تالیف ہے اور شیعوں میں اس کی صحت ومقبولیت کا وہی درجہ ہے جو سنیوں میں صحیح بخاری کا ہے

ابوحمزہ کہتے ہیں کہ امام جعفرؓ نے فرمایا کہ اللہ کی بندگی وہی کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جو معرفت نہیں رکھتا وہ یوں ہی گمراہی سے اس کا پرستار بنا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ معرفتِ الٰہی کیا ہے؟ فرمایا اللہ عزوجل کی تصدیق۔ حضرت علیؓ کی موالات اور ان کی پیروی، ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی پیروی اور ان کے دشمنوں سے اللہ کے سامنے برأت۔ یہ ہے اللہ کی معرفت۔ امام رضا نے کہا کہ جملہ انسان اطاعت میں ہمارے غلام ہیں اور دین میں ہمارے محب۔

امام ابوجعفرؓ نے فرمایا۔ ہم علمِ الٰہی کے خزانے دار ہیں اور وحیِ الٰہی کے ترجمان۔ جو لوگ زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ہیں، ان سب پر ہم اللہ کی حجت ہیں۔

امام رضا سے ایک طویل کلام ائمہ کی توصیف میں مروی ہے جس میں یہ فقرے بھی ہیں: امام گناہوں سے پاک اور عیبوں سے بری ہوتا ہے۔ علم کے ساتھ مخصوص اور حلم کے ساتھ موصوف . . . . لوگوں نے سخت غلطی کی اور جھوٹ گھڑا کہ جان بوجھ کر اہلِ بیت کو چھوڑا۔ اور اللہ و رسول کے انتخاب کئے ہوئے سے منہ موڑا۔ نسک و زہد، علم و عبادت، قدس و طہارت کے معدن۔ رسول کی دعاؤں میں مخصوص اور بتولؓ مطہرہ کی اولاد۔

امام ابوجعفرؓ نے فرمایا۔ ہم شجرِ نبوت ہیں اور رحمت کا گھر، حکمت کی کنجیاں ہیں اور علم کے معدن، رسالت کا موضع ہیں اور ملائکہ کی آمد و رفت کا مقام۔ اللہ کے بندوں کے پاس ہم اس کی امانت ہیں۔ ہم اس کے حرمِ اکبر ہیں اور ہم اللہ کا ذمہ اور اس کا عہد ہیں۔ جس نے ہمارا عہد پورا کیا اس نے اللہ کا عہد پورا کیا اور جس نے ہمارا عہد توڑا اس نے اللہ کا عہد توڑا۔

ائمہ کے پاس وہ ساری کتابیں ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں اور وہ ان سب کو باوجود زبانوں کے اختلاف کے سمجھتے ہیں۔ پھر اللہ نے ائمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شے کی تشریح ہے۔ مکمل قرآن سوائے ائمہ کے کسی کے پاس نہیں اور وہ اس کا پورا علم رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس نے پورا قرآن جمع کر لیا وہ جھوٹا ہے۔ کسی نے اس کو جس طرح پر وہ نازل ہوا نہ جمع کیا نہ حفظ کیا سوائے علی بن ابی طالب اور ان ائمہ کے جو ان کے بعد ہیں۔ ائمہ کے پاس اسمِ اعظم ہے اور وہ جفر بھی رکھتے ہیں جو چمڑے کا ایک تھیلا ہے جس میں انبیاء اور اوصیاء نیز گزشتہ علمائے بنی اسرائیل کے علوم ہیں۔ ان کے پاس مصحفِ فاطمہ ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے اور اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کے دو علم ہیں۔ ایک وہ جس کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا اور ایک وہ جس کو اس نے ملائکہ اور انبیاء کو سکھلایا۔ اس کو ہم جانتے ہیں۔

ائمہ جب کسی شے کا علم چاہتے ہیں تو اللہ ان کو بتلا دیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور جب مرتے ہیں تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں۔

جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے ائمہ سب کا علم رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اللہ نے رسول کو کوئی علم نہیں سکھلایا مگر یہ کہ ان کو حکم دیا کہ امیر المومنین علیؓ کو سکھلا دیں۔ اسلئے وہ علم میں نبی کے شریک تھے۔ پھر یہ علم ائمہ کو ملا۔

اللہ نے ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور ان کی نافرمانی سے منع کیا ہے وہ بمنزلہ رسول کے ہیں بجز اس کے کہ نبی نہیں ہیں۔

ہر امام اپنے بعد آنے والے امام کو کتابیں، علوم اور اسلحہ سپرد کر دیتا ہے اور ائمہ کوئی کام بلا حکم اور بلا عہد الٰہی نہیں کرتے اور اس کے حکم سے ذرا بھی آگے قدم نہیں بڑھاتے۔

اللہ و رسول نے ہر ایک امام کی یکے بعد دیگرے تصریح کر دی ہے۔ ہر امام اپنے بعد کے امام کو امامت سپرد کرتا ہے اور اس کیلئے ایک ملفوف کتاب اور ایک وصیت نامہ چھوڑ جاتا ہے جس میں آدمؑ کی تخلیق سے لیکر فنائے عالم تک جو ضرورتیں پیش آنے والی ہیں سب کا حل ہے۔ امام کے لئے غیبت بھی ہے جب اس کے غیبت کی خبر سنو تو انکار نہ کرو۔ اور بارہویں امام غائب ہیں۔ وہی مہدی ہیں جو روئے زمین کو جب کہ وہ ظلم و ستم سے بھر جائیگی عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔

جو شخص امامت کا اہل نہ ہو اور اس کا دعوےٰ کر بیٹھے وہ کافر ہے۔

امام ابوجعفر سے مروی ہے کہ اللہ نے کہا ہے کہ جو رعیت امام ظالم کی تابع ہو گی جو اللہ کی طرف سے نہ ہو اگرچہ اپنے اعمال میں نیک اور پرہیزگار ہو گی میں اس کو عذاب دوں گا اور جو رعیت اسلام میں امام عادل کی تابع ہو گی جو اللہ کی طرف سے ہو، اگرچہ بدکار اور گنہگار ہو گی میں اس سے درگذر کروں گا۔[۱]

امام کو امام ہی غسل (میت) دیتا ہے۔

امام جعفر نے فرمایا: اللہ جب کسی امام کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو عرش کے نیچے سے شربت لیکر اس کو پلاتا ہے۔ وہ چالیس دن تک ماں کے شکم میں کوئی کلام نہیں سنتا۔ جب اس کی پیدائش ہوتی ہے تو وہی فرشتہ جس نے شربت پلایا تھا اس کے دائیں بازو پر آ کر لکھتا ہے " وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلماتہ" (تیرے رب کا کلمہ سچائی اور عدل کی رو سے پورا ہے اس کو کوئی بدلنے والا نہیں) جس وقت وہ امام اپنے منصب پر پہنچتا ہے اللہ ہر ملک میں اس کیلئے ایک منارہ کھڑا کر دیتا ہے جس کی روشنی میں وہ تمام بندوں کے کام دیکھتا ہے۔

فرشتے اماموں کے گھروں میں آتے ہیں، ان کے فرش پر بیٹھتے ہیں اور ان کے پاس خبریں لاتے ہیں۔ لوگوں کے پاس وہی بات حق ہے جو امام کے ذریعے سے ملی ہو۔ اور جو بات امام کے ذریعہ سے نہ ملی ہو وہ باطل ہے۔

ساری زمین امام ہی کی ہے۔ یہ اہل بیت ہیں جن کو اللہ نے زمین کا وارث بنایا ہے۔

مال غنیمت کا خمس چھ حصوں میں تقسیم کیا جائیگا۔ اللہ۔ رسول۔ قرابت دار۔ یتیمی۔ مساکین اور مسافر۔ ان میں سے پہلے تین حصے امام کے ہیں۔ اس لئے امام کا حصہ خمس میں سے نصف، یعنی کل مال غنیمت کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔ مال فئے (غنیمت بلا جنگ) نیز جنگل، معدن اور سمندر وغیرہ اکیلے امام کے ہیں۔

---

[۱] اللہ کا یہ قول قرآن میں تو کہیں نہیں ہے۔

میں نے ائمہ اہل بیت کی تعلیمات اور ان کے دعاوی میں سے یہ تھوڑی سی باتیں لی ہیں ظاہر ہے کہ ان اقوال کو وہی تسلیم سکتا ہے جو ان ائمہ پر ایمان رکھتا ہو ورنہ یہ سب کے سب بخط مستقیم قرآن کے خلاف ہیں اور غالباً اسی احساس کی بنا پر اس آن کو جس پر امت ایمان رکھتی ہے ناقص قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور کامل قرآن ائمہ کے پاس محفوظ بتایا گیا ہے۔ پھر اس کے او مصحف فاطمہ بھی ان کے ہاتھوں میں ہے جو اس قرآن سے تگنا اور تعلیمات کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے۔

یہ دعاوی اگرچہ مذہبی رنگ میں ہیں لیکن اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب کے سب استحقاق خلافت کے سیاسی منصوبے ے ارد گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور ان کا اصل مقصود صرف اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کے لئے امت کو ہموار کرنا ہے ر حکومت بھی علی الاطلاق!!

اہل سنت کی نگاہ میں خلیفہ بھی دوسرے انسانوں جیسا انسان ہے۔ انھیں کی طرح پیدا ہوتا ہے، پرورش پاتا ہے اور سیکھتا ۔اس کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی فضیلت نہیں سوائے اپنی ذاتی لیاقت کے جس کی وجہ سے اس کا انتخاب ہوا۔ نہ اس پر وحی تی ہے نہ اس کا تسلط روحانی ہے۔ وہ صرف قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے کا مجاز ہے اور اس پر امت کو احتساب کا حق ہے بلکہ لطاروی پر معزول کر دینے کا بھی۔

اور شیعوں کا امام تو اپنی سرشت و فطرت میں انسانوں سے بالاتر ہے۔ ماں کے پیٹ ہی میں عرش کے نیچے سے شربت کا پیالہ پینے لگتا ہے۔ تشریع کا حق رکھتا ہے اس پر تنقید گمراہی ہے۔ اس کا قول و فعل حق و باطل اور خیر و شر کا معیار ہے۔ وہ ایسا روحانی رہنما ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ دینی اعمال بھی بلا اس پر ایمان لائے ہوئے بیکار ہیں۔

یہ باتیں قرآن کی حسین و جمیل، سادہ و بسیط، فطرتی و جمہوری تعلیمات کے بالکل متضاد ہیں جو تمام بنی نوعِ انسان کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد کہتا ہے اور نسبی بنیاد پر کسی کو کوئی حق نہیں دیتا، نہ پیدائشی طور پر کسی انسان کی دینی فضیلت کو مانتا، نہ صلاح و تقویٰ کی وراثت کا قائل ہے بلکہ ہر شخص کی قیمت کا مدار خود اس کے ایمان اور عمل پر رکھتا ہے۔ چنانچہ صدر اول کے لوگ ان باتوں سے جو ان ائمہ سے مروی ہیں بالکل ناآشنا تھے۔ خود حضرت علیؓ اور حسینؓ بھی خلیفہ یا امام کے متعلق وہی سادہ نظریہ رکھتے تھے جو اہل سنت کا ہے۔ نہ اس کو معصوم سمجھتے تھے نہ تنقید سے بالاتر۔ چنانچہ اسی کافی میں روایتیں ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا: لا تکفوا عن مقالۃ بحق او مشورۃ بعدل فانی لست آمن ان اخطی (سچی بات یا انصاف کے مشورہ سے نہ رکو کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں۔)

نیز امام حسینؓ اپنے بھائی امام حسنؓ کی صلح کو جو انھوں نے معاویہؓ کے ساتھ کی تھی ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے لو جزّ انفی کان احب الی مما فعلہ اخی (اگر میری ناک کاٹ لی جائے تو میں اس کو اس سے بہتر سمجھوں گا جو میرے بھائی نے کیا)

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ جب سے ایرانی اس جماعت میں شامل ہوئے جو اپنے بادشاہوں کے تقدس اور خطا سے

بالاتر ہونے کا خیال رکھتے تھے، اس وقت سے یہ باتیں شیعیت میں داخل ہوئیں۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ جب سے عباسی تختِ خلافت پر آگئے اس وقت سے علویہ میں اپنے حق کے احساس کی تلخی بڑھ گئی اور وہ قرابت قریبہ کی خصوصیت کی بنا پر اپنی فضیلت اور عظمت کو زیادہ زور کے ساتھ پیش کرنے لگے۔ خلیفہ منصور کے نام نفس زکیہ کا خط پہلے آپ پڑھ چکے ہیں[1]۔ اسی زمانے کی دوسری عظیم الشان شخصیت امام جعفر کی ہے۔ انھیں سے بیشتر یہ روایتیں مروی ہیں۔ مگر میرے نزدیک ان روایات کا انتساب ہی ائمہ اہل بیت کی طرف مشکوک ہے۔ کیونکہ شیعہ کی پہلی کتاب ہی کافی ہے جو چوتھی صدی ہجری میں مدون ہوئی۔ اس مدت مدید میں شیعہ راویوں کے لئے ان روایات میں تغیر و تبدل بلکہ اضافہ و الحاق کا پورا موقع تھا لیکن چونکہ شیعہ ان روایات کو صحیح مانتے اور ان کے اوپر عقیدہ رکھتے ہیں اسلئے تاریخی حیثیت سے مجھکو اپنے کلام کی بنیاد ان کے مسلمات پر رکھنی پڑی ورنہ میں اس کو نظر انداز کر دیتا۔

دیگر شیعی عقائد مہدی منتظر کے عقیدے کی طرف ضمناً اشارہ ہو چکا ہے۔ یہ عقیدہ شیعوں سے پیدا ہوا اور اس کی اتنی اشاعت ہوئی کہ سنیوں میں بھی مقبول ہو گیا۔ اگرچہ بخاری و مسلم جو اہل سنت میں حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتابیں تسلیم کی گئی ہیں مہدی کی روایتوں سے خالی ہیں مگر ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان کو لیا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ آخری زمانے میں اہل بیت میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جس کی پیروی ساری امت کرے گی اور وہ اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کرکے دین اور عدل پھیلائے گا۔

ان روایات کے اسناد میں بعض بزرگوں خاص کر ابن خلدون نے بسط کے ساتھ کلام کیا ہے اور سب کو ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے مگر شیعہ کے یہاں یہ عقیدہ ارکانِ دین داخل ہے۔

بعضوں کے نزدیک اس کا اصلی سبب یہ ہوا کہ کربلا کے حادثے کے بعد جب اہل بیت کی خلافت کی امید منقطع ہو گئی اس وقت رؤسا رشیعہ نے اس مایوسی کو دور کرنے اور جماعت کو زندہ رکھنے کے لئے مہدی غائب کا عقیدہ پھیلایا۔ اسی زمانے میں ابو سفیان کی شاخ سے خلافت نکل کر مروان کے ہاتھ میں چلی گئی۔ علویہ کی تقلید میں خالد بن یزید نے جس کو اپنے گھر سے خلافت نکل جانے کا سخت قلق تھا سفیانی کا خیال پیدا کیا یعنی ایک شخص اس خاندان کا ظاہر ہو کر ابو سفیان کی اولاد میں خلافت کو واپس لائے گا۔ یہ روایتیں کتب حدیث میں ہیں۔ عباسیہ نے اپنے دور میں جب دیکھا کہ علوی اور اموی دونوں گھرانوں میں ایک ایک آنے والے مہدی کا خیال ہے تو عباسی مہدی کی روایتیں تیار کرائیں جو طبرانی اور حاکم وغیرہ نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے اسی خیال سے اپنے بیٹے کا نام مہدی رکھا ہو۔ ابو الفرج اصفہانی لکھتا ہے کہ مطیع بن ایاس جو خطباء میں سے تھا اس کی مہدویت کی حدیثیں تراشا کرتا تھا۔ اس طرح پر مسلمانوں کی اکثر جماعتوں میں مہدی کا عقیدہ پیدا ہو گیا جو امت کے لئے ایک زندہ عذاب اور مستقل تعزیر بن گیا۔ سلسلہ وار مدعیانِ مہدویت کھڑے ہونے لگے اور دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے صرف زیدیہ باوجود اس کے کہ وہ بھی شیعہ ہیں اس عقیدے سے ہمیشہ منکر رہے۔

---

[1] یہ مضمون طلوع اسلام میں شائع نہیں ہوا۔

رجعت | قرآن نے اگرچہ صاف صاف تصریح کردی ہے:-

الم یروا کم اھلکنا قبلھم من القرون انھم الیھم لا یرجعون وان کل لما جمیع لدینا محضرون - (۳۶/۳۱-۳۲)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی نسلیں ہم نے ہلاک کی ہیں جو ان کی طرف پلٹ کر نہیں آتی ہیں اور وہ سب کی سب ہمارے پاس حاضر رکھی گئی ہیں۔

مگر شیعہ میں مہدی کے عقیدے کے ساتھ رجعت کا بھی عقیدہ ہے۔ یعنی ظہور مہدی کے بعد حضرت علیؓ حسنؓ حسینؓ وغیرہ جملہ ائمہ دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے اور ان کے مخالفین ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ ومعاویہؓ ویزید وغیرہ بھی لائے جائیں گے اور ان کو سزائیں دی جائیں گی۔ شریف مرتضیٰ نے لکھا ہے کہ ابوبکرؓ وعمرؓ کو مہدی کے زمانے میں ایک درخت پر سولی دی جائیگی۔

تقیہ | یہ بھی امامیہ کے عقائد کا جزو ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنے عقیدہ کو چھپائے رکھنا اور عمل سے اس کے خلاف ظاہر کرنا کہ کسی کو شیعیت کا شبہ نہ ہوسکے کافی میں امام جعفرؒ سے مروی ہے کہ "دین کا ۹/۱۰ حصہ تقیہ میں ہے اور جو تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے"۔ امام رضا۔ کسی نے تقیہ کی بابت سوال کیا۔ فرمایا کہ "تقیہ میرا دین ہے اور میرے باپ دادا کا دین ہے۔ جس میں تقیہ نہیں اس میں ایمان نہیں"۔ کوئی شیعہ سنیوں کے ساتھ نماز پڑھے تو بڑے ثواب کا مستحق ہوجاتا ہے۔ بعض ائمہ اہل بیت سے مروی ہے کہ جس نے تقیہ سے کسی سُنّی کے پیچھے نماز پڑھ لی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

بہت سے تاریخی واقعات کو بھی اس جماعت نے تقیہ پر محمول کیا ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ نے ابوبکرؓ وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کی بیعتوں میں تقیہ سے کام لیا امام حسنؓ نے معاویہؓ کے ساتھ تقیہ سے صلح کی وغیرہ۔ اسی تقیہ سے بعض شیعہ بظاہر سنی بن گئے اور انھوں نے اپنے کو سُنّی علما مثلاً ابن جریر اور ابن قتیبہ وغیرہ کے ناموں سے مشہور کرکے اپنی روایتیں اہل سنت میں پھیلائیں۔

تبرّا | شیعہ اپنے عقیدے میں اہل بیت کو خلافت رسول کا حقدار سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ خلفاء ثلاثہ خاص کر شیخین رضی اللہ عنہما کو ظالم اور غاصب قرار دیتے ہیں اور ان سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں اور تبرا کرتے ہیں۔ کافی میں امام جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ "تین قسم کے لوگ ہیں جن سے اللہ نہ کلام کریگا نہ ان کے گناہ بخشے گا بلکہ ان کو دردناک عذاب دیگا۔ ایک وہ جس نے امامت کا دعویٰ کیا اور اس کا اہل نہ تھا۔ دوسرا وہ جس نے اللہ کے متعین کئے ہوئے امام کا انکار کیا۔ تیسرا وہ جو خیال رکھتا ہے کہ ابوبکر وعمر میں اسلام کا کوئی شائبہ بھی تھا"۔

ان کے عقیدے میں سوائے شیعہ کے سارے مسلمان کافر ہیں اور رسول اللہؐ کے بعد بجز چند صحابہ کے (جو حضرت علیؓ کی خلافت کے خواہاں تھے) جملہ صحابہ سو گئے۔ انھیں وجوہات سے وہ خلفاء ثلاثہ، نیز ام المومنین حضرت عائشہؓ وحفصہؓ وغیرہ سے تبرا کرتے ہیں اور اس کو قربت و ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کافی کی روایات میں ان حضرات پر لعنت بھیجنے کے لئے خاص خاص ماثورہ دعائیں ہیں۔

جماعت شیعہ | شروع میں حضرت علیؓ کی خلافت کے خواہاں جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں چند مخلص اور نیک دل صحابہ تھے۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے حامیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ سبائی تحریک نے جس قدر حضرت عثمانؓ کے مخالف پیدا کئے اسی قدر حضرت علیؓ کے طرفدار۔ واقعۂ کربلا سے بھی بنی امیہ کی طرف سے بہت سے دلوں میں نفرت پیدا ہوگئی جو اہل بیت کے حامی بن گئے۔ نو مسلم عجمی قومیں جو بنی امیہ کے استکبار و استبداد سے تنگ تھیں اپنی فروتری کو دیکھ کر اس جماعت میں شریک ہوگئیں کیونکہ یہ بنی امیہ کے مخالف تھے۔ ایرانی امراء و رؤسا اس خیال سے ان ائمہ کے حامی ہوگئے کہ ان کے یہاں سلطنت کی وراثت شاہی نسل میں چلتی تھی۔ حکومتِ الٰہی ان کی سمجھ میں نہ آسکی اور انھوں نے رسول اللہ کو بھی کسریٰ خیال کیا۔ جن کے بعد ان کی نظر میں ان کی جانشینی کے حقدار صرف ان کے اہل بیت ہو سکتے تھے۔

الغرض مختلف اسباب سے مختلف جماعتیں اس فرقے میں شامل ہوئیں جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ابنِ سبا کی طرح اسلام سے انتقام لینے کے لئے محب اہل بیت بن گئے تھے۔

شیعہ پر سختیاں

خوارج اور شیعہ دونوں اس بارے میں متفق تھے کہ بنی امیہ او بنی عباس ظالم اور غاصب ہیں۔ اگرچہ دونوں کی عداوت کے اسباب مختلف تھے۔ خوارج ان کی خلافت کو اس لئے ناجائز سمجھتے تھے کہ وہ حکومتِ الٰہی نہ تھی بلکہ شخصی اور استبدادی سلطنت تھی اور شیعہ اس لئے کہ انھوں نے ان کے ائمہ کا حق غصب کرکے ان کو خلافت سے محروم کر دیا تھا اور خود اس پر قابض ہوگئے تھے۔ اس وجہ سے دونوں فرقے ان کے دشمن تھے اور ان کے تسلط کو مٹانا چاہتے تھے۔

خوارج اپنے عقیدے کا اظہار کرکے کھلے میدان میں مقابلہ کرتے تھے جس کے باعث خلفاء کو آسانی ہوئی کہ قوت سے رفتہ رفتہ ان کو فنا کر دیا۔ لیکن شیعہ کے پاس تقیہ کا حربہ تھا وہ جب موقع پاتے کھلے میدان میں لڑتے ورنہ تقیہ کے میدان میں روپوش ہو جاتے۔ اس وجہ سے ان کا مٹانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ باوجود تمام سختیوں کے بھی آخرکار یہ زندہ رہ گئے۔ غالباً یہی علت تھی جو ائمہ اہلبیت اپنے معتقدوں کو تقیہ کی سخت تلقین اور تاکید کیا کرتے تھے اور اس کو دین کا ۹/۱۰ حصہ کہتے تھے۔

بنی امیہ نے ابتدا ہی سے ان پر سختی شروع کی۔ امیر معاویہؓ نے اپنے تمام عمال کو حکم بھیجا کہ "جو شخص حضرت علیؓ اور ان کے اہلِ بیت سے تولاّ رکھے یا ان کے مناقب روایت کرے اس کا نام وظائف کے دفتر سے کاٹ دو اور اس کی شہادت ساقط الاعتبار کر دو صرف شیعۂ عثمان کو اپنے پاس آنے دو اور ان کے فضائل میں جو روایتیں بیان کی جائیں ان کو مع ان کے راویوں کے ناموں کے مجھے بھیجتے رہو۔"

کوفہ شیعوں کا مرکز تھا جس کا عامل زیاد تھا۔ وہ چونکہ حضرت علیؓ کے زمانے میں شیعہ رہ چکا تھا اس وجہ سے اس جماعت کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس نے جہاں جہاں ان کو پایا قتل کیا۔ اس کے بعد جو کچھ رہ گئے ان کو اس کے بیٹے عبداللہ بن زیاد نے ختم کیا۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے ان کو کھجوروں کے درختوں پر لوگوں کی عبرت کے لئے سولیاں دیں، ہاتھ اور پاؤں کاٹے آنکھوں میں سلائیاں پھیریں اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مارا۔ حجاج بن یوسف جب عراق کا والی ہوا تو اس نے بھی وہی

برتاؤ رکھا۔ اس کو کافر یا زندیق سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی شیعہ سے تھی۔ عربی کے مشہور ادیب اصمعی کے دادا نے ایک دن اس سے کہا کہ میرے والدین نے میرے اوپر بڑا ظلم کیا۔ اس نے پوچھا کیا؟ بولا کہ میرا نام علی رکھدیا۔ حجاج مسکرایا اور اس کو ایک ناحیہ کا عامل مقرر کردیا۔

جملہ اموی عمال کا یہی حال تھا۔ وہ شیعیت کی تہمت پر بھی ہاتھ پاؤں کاٹ لیتے یا قید کرکے مال ومتاع ضبط اور مکان منہدم کردیتے۔

عباسی اور بھی زیادہ اہل بیت کی طرف پُر حذر تھے کیونکہ وہ خود ان کے شریک کار رہ چکے تھے۔ اس وجہ سے ان کے عہد میں شیعوں پر اور بھی سختیاں بڑھ گئیں۔ ابومسلم خراسانی نے سینکڑوں سپاہی اسی لئے مقرر کر رکھے تھے کہ جہاں کسی شیعہ کو پا جائیں قتل کردیں۔ عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ ان کا دشمن متوکل تھا۔ اس نے امام حسینؓ کی قبر ۲۳۶ھ میں معہ تمام ملحقہ عمارتوں کے منہدم کرادی جس پر ہل چلا کر کاشت ہونے لگی[1]۔ لیکن باوجود ان تمام سختیوں کے شیعہ اپنے عقیدہ اور عمل سے ہٹے نہیں اور ان کے آخری خلیفہ مستعصم تک کبھی پنہاں کبھی آشکارا مقابلہ کرتے رہے۔

کاش یہ ساری جماعتیں سیاسی مقصد میں متحد ہوتیں اور سنی، خارجی اور شیعہ سب اسلام کو پیش نظر رکھتے اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش میں اپنی قوتیں برباد نہ کرتے تو آج اسلام کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ یہ قریشی خانوادوں کی حکومت کا سودا تھا جس نے ہیجان برپا کیا۔ اور ان کی باہمی رقابتوں نے امت کا شیرازہ بکھیرا۔ ورنہ مسئلہ نہایت سادہ اور صاف تھا کہ خلافت کا مدار انتخاب عام پر رکھدیا جائے۔ شیعہ جو امام منصوص کے قائل ہیں انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اللہ اگر کسی کو ماں کے شکم سے خلافت کیلئے تیار کرتا تو اس کا تخت خلافت پر آجانا لازمی تھا۔ اور جب نہ آسکا تو سمجھنا چاہئے کہ انتخاب جمہوری کا حق ہے۔

رعایت کی میعاد ختم

تاریخ رسالت اور معراج انسانیت (معارف القرآن جلد سوم وچہارم)

کی قیمتوں میں رعایت کی آخری تاریخ

۳۱ دسمبر ۱۹۵۱ء تھی، جواب گذر چکی ہے

لہٰذا اب یہ کتابیں اپنی اصلی قیمت یعنی پندرہ ۱۵ روپے (جلد سوم) اور بیس ۲۰ روپے (جلد چہارم) پر ملیں گی۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

---

[1] ان مظالم کی تفصیل دیکھنی ہو تو ابوالفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبین اور ابوبکر خوارزمی کے بعض رسائل کا مطالعہ کیجئے۔

مسلم لیگ کی سیاست

قارئین کو اس عنوان سے اچنبھا ضرور ہوگا اور بادی النظر میں یہ بات ہے بھی اچنبھے کی کہ طلوعِ اسلام کو موجودہ مسلم لیگ کی سیاست سے کیا وجہ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت پاکستانی بساطِ سیاست کی ساری مہرہ بازی مسلم لیگ ہی کی شرمندہ احسان ہے۔ (براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی کیونکہ ہر قسم کی سرگرمیوں کو خواہی نخواہی لیگ ہی سے منسوب کر دیا جاتا ہے) اس لئے لیگی سیاست کے جائزہ لینے کو طلوعِ اسلام کے اوراق میں مداخلت بیجا نہیں تصور کیا جانا چاہیئے۔

ہم مسلم لیگ کے سابقہ احوال وظروف کو چھوڑ کر آغازِ سخنی اس حرفِ شیریں سے کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا۔ چنانچہ وابستگانِ مسلم لیگ آج قیامِ پاکستان کو مسلم لیگ کا کارنامہ قرار دیتے ہوئے یہ دلیل لاتے ہیں کہ ایسی جماعت کو ضرور باقی رہنا چاہیئے جس نے ایسا کارِ نمایاں سرانجام دیا ہے۔ بلکہ ان کے قول کے مطابق قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے باقی رکھنے کی ضرورت اور شدید ہوگئی ہے کیونکہ اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا اور یہی اس کا صحیح و کماحقہٗ تحفظ کر سکتی ہے۔ یہ دلیل ایک منطقی مغالطہ ہے۔ اگر اربابِ لیگ خود اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہیں تو وہ یقیناً قوم کو اس میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ذرا غور کرنے سے یہ مغالطہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ مسلم لیگ نے پاکستان بنایا صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ یہ مسئلہ ذرا وضاحت چاہتا ہے۔ سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ ابتداءً مسلم لیگ منجملہ دیگر سیاسی جماعتوں کے ایک سیاسی جماعت تھی لیکن جب اس نے اپنا نصب العین پاکستان تجویز کیا اور اپنی جدوجہد کا رخ اس منزل کی جانب موڑا تو ملتِ اسلامیہ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا ذریعہ اسی جماعت کو بنا لیا اور حالت من تو شدم تو من شدی کی ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۴ء کے بعد جب مسلم لیگ نئے عزائم اور تازہ ولولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں آئی تو قائد اعظمؒ نے غیر مسلموں سے سیاسی مذاکرات میں ہمیشہ اولیں مطالبہ یہی پیش کیا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ مطالبہ پاکستان کا یہ اعجاز تھا کہ اس نے مسلمانوں اور مسلم لیگ کو بالکل یک جان بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کیا مسلم لیگ کی معرفت اور مسلم لیگ کے نام سے کیا۔ گویا بالفاظِ دیگر ملتِ اسلامیہ نے حصولِ آزادی کے لئے جو جمعیت تیار کی اسے مسلم لیگ کا نام دیا۔ یہ جمعیت ملت کا مرکزی ادارہ تھا جو حصولِ پاکستان کے بعد مملکتِ پاکستان میں بدل گیا۔ اب آزادی حاصل کرنے کے بعد ملت اپنے اجتماعی امور کسی سیاسی جماعت کی معرفت سرانجام نہیں دیگی کیونکہ وہ دورِ غلامی کی مجبوری و بے چارگی کی دلیل تھی۔ اب اس کی سرگرمیوں کا منبع و مرکز حکومتِ پاکستان ہے۔ وہی اس کا مرکز ہے اور وہی اس کی سیاسی جماعت۔ لہذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا بدیں وجہ غلط ہے کہ پاکستان درحقیقت ملت کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مسلم لیگ اب بھی باقی ہے بدیں وجہ غلط ہے

کہ مسلم لیگ بہ حیثیت ایک مرکزی ادارے کے حکومت میں تبدیل ہوگئی۔ اب مسلم لیگ سے مراد حکومت یعنی مرکزِ ملت ہے تو واقعی اس مرکز کی اب بھی ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ لیکن یہ کہنا کہ حکومت کے باوجود مسلم لیگ یعنی ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہے' دو عملی کی علامت ہے اور ملت اور مرکز کے باہمی ربط و تعلق سے بے خبری محض کی دلیل۔

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ مسلم لیگ پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے ساتھ ہی کالعدم ہوگئی یا حکومت میں تبدیل ہوگئی' اس امر کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ مسلم لیگ کے بقا و استحکام کا سوال خارج از بحث ہے۔ اصل سوال تحفظ و استحکامِ ملت کا ہے اور اس کا واحد ذریعہ مرکزِ ملت یعنی حکومت ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ بدستورِ سابق مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرانے پر مصر ہیں وہ جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے ملت و مرکزِ ملت کے ربط و اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ملت یا ملی نظام کے کبھی دو مرکز نہیں ہو سکتے ۔ اور جب بھی کوئی گروہ اس 'شرک' کا مرتکب ہوا ہے وہ انتشار و خلفشار ہی کا شکار ہوا ہے۔ چونکہ عام مسلمان ایک طرف اس نازک فرق کو سمجھ نہیں سکتے اور دوسری طرف وہ جذباتی واقع ہوئے ہیں' اس لئے ان سے خالصۃً جذباتی اپیل کی جاتی ہے اور قائداعظم کے نام کا واسطہ دیکر مسلم لیگ کے باقی رکھنے کی درخواستیں کی جاتی ہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ مسلم لیگ قائداعظم کا ترکہ ہے۔ اول تو یہ کہنا ہی قائداعظم کی توہین ہے' کیونکہ ان کا حقیقی ترکہ پاکستان ہے نہ کہ مسلم لیگ۔ یہی ان کی عمرِ عزیز کا ماحصل تھا' اسی کیلئے وہ مصروفِ جدوجہد رہے اور اسی کے تحفظ میں بقیہ عمر صرف کردی۔ لہٰذا ان کا ورثہ پاکستان ہے اور قائداعظم سے عقیدت مندانہ وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان کو مضبوط و خوشحال بنائیں۔ لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مسلم لیگ ہی قائداعظم کا ورثہ ہے تو اس طرح تو بے شمار قابلِ وراثت اشیاء انھوں نے چھوڑی ہیں' تو ہم کیوں نہ ایسی تمام اشیاء کے حقدار و وارث قرار پائیں۔

پھر وضاحت سے سن لیجئے کہ گفتگو کی یہ اساس ہی غلط ہے۔ مسلم لیگ قوم کا ایک چولہ تھا جسے اس نے بدل دیا۔ اب وقت کو پیچھے نہیں لوٹایا جاسکتا کہ پھر اس کرتے کو زیبِ تن کرلیا جائے۔

یہ اسی دو عملی اور 'قومی شرک' کا نتیجہ ہے کہ ملی زندگی میں قدم قدم پر مضحکہ انگیز حرکتیں ہورہی ہیں۔ مسلم لیگ کے حق میں ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت کے لئے ایک محاسب جماعت کی ضرورت ہے اور مسلم لیگ یہ فریضہ بطریقِ احسن ادا کریگی۔ یہاں بھی اس اصل' اساس کو نظرانداز کردیا جاتا ہے کہ ملت اپنے اجتماعی امور یا انصرامِ اہلِ افراد کے سپرد کرکے معطل ہوکر نہیں بیٹھ جاتی بلکہ اس منصرم جماعت (حکومت) کے اعمال کی نگران و محاسب رہتی ہے۔ اس نگرانی اور محاسبے کے لئے وہ کوئی سی آئی ڈی کا محکمہ نہیں قائم کرتی جو کراما کاتبین کی طرح ان کے اعمال کو لکھتے رہتے ہیں اور پھر پرچہ کاٹ کر کسی کے پیش کردیتے ہیں بلکہ وہ نظام میں ایسی گنجائش رکھتی ہے جس کے ذریعہ وہ ان منصرمین کا محاسبہ کرتی ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق یہ تواصی کا فریضہ اس خوش اسلوبی سے طے ہوتا ہے کہ کوئی گروہ یہ محسوس بھی نہیں کرتا کہ وہ دوسرے گروہ سے الگ یا مختلف گروہ ہے۔ وہ ایک ہی جسدِ ملت کے اعضا ہوتے ہیں اور اشتراک و تعاون کا ل ـــ ائتلاف ـ سے امورِ ملی کو سرانجام دیتے جانبِ منزل رواں دواں چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ قرآن اس محاسبہ کی کیا صورت پیش کرتا ہے۔ اپنے سیاسئین کی سہولتِ فہم کے لئے ہم ان کے اپنے دستور و نظامِ سیاسی سے ہی اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس وقت

پاکستان کا نظامِ حکومت یہ ہے کہ گورنر جنرل مع کابینہ مجلس دستور ساز کے سامنے جوابدہ ہے۔ یہ مجلس وقتاً فوقتاً اپنے اجلاس منعقد کرتی ہے اور حکومت کی کارگذاری پر بحث و تمحیص کر کے پرانی غلطیوں کی اصلاح کرتی ہے اور آئندہ کے لئے نئی تجاویز عمل پیش کرتی ہے۔ (ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ موجودہ مجلس دستور ساز ایسا کرتی ہے یا نہیں پیشِ نظر نقطہ کی وضاحت کے لئے اتنا کافی ہے کہ مجلس مذکورہ کا آئینی فریضہ اس قسم کا ہے) گویا یہ مجلس حکومت پاکستان کی محاسب ہے۔ عوام کے نکتۂ نگاہ سے اس مجلس میں دو خوبیاں ہیں ایک یہ کہ یہ کسی نہ کسی طریقۂ انتخاب سے معرضِ وجود میں آئی اور دوسرے یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ طرزِ خیال کے لوگ موجود ہیں۔ بلکہ اس میں غیر مسلم بھی شریک ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ موجودہ اسمبلی پاکستان کے عوام کی صحیح نمائندہ ہے بلکہ اس میں یہ گنجائش ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ متفرق خیال کے گروہوں کا نمائندہ بنایا جا سکتا ہے۔ نیز اس مجلس کو یہ آئینی حیثیت بھی حاصل ہے کہ حکومت اس کے سامنے جوابدہ ہے اور اس کے مشوروں پر عمل کرنے پر ایک حد تک مکلف بھی۔ تو گویا جہاں تک حکومت کے محاسبے کا تعلق ہے اس فریضہ کو مجلس دستور ساز بطریقِ احسن پورا کر سکتی ہے اور اسی قسم کا محاسبہ مفید و موثر بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک سیاسی جماعت کا محاسبہ خوش خیالی سے زیادہ وقیع نہیں۔ بلکہ وہ بداہتاً غیر ضروری ہے۔ کیونکہ جب حکومت کی نگران و محاسب جماعت یعنی مجلس دستور ساز موجود ہے تو ایک سیاسی جماعت کس مرض کی دوا ہو گی؟ اگر مقصد محاسبہ ہے تو وہ تو پورا ہو رہا ہے۔ ہاں اگر یوں کہا جائے کہ حکومت کی محاسب جماعت مجلس دستور ساز ہو اور اس کی محاسب جماعت کوئی اور۔ مثلاً مسلم لیگ۔ تو شاید ایک بات بھی ہو۔ لیکن اس صورت میں مسلم لیگ ہی کو آخری محاسب کیوں تسلیم کیا جائے؟ کیوں نہ اس پر بھی محاسبہ کیا جائے، اور اس پر بھی اور اس پر بھی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر اس طرح محاسبہ در محاسبہ شروع کر دیا جائے تو نظامِ حکومت ایک پولیسی نظام بن کر رہ جائیگا جسے کوئی بھی پسند نہیں کریگا۔

مسلم لیگ کی یہ دلیل کہ حکومت کے محاسبہ کے لئے (مجلسِ دستور ساز کے علاوہ) ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہے، علمی اور عقلی اعتبار سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اعتراض دراصل مسلم لیگ پر ہی وارد نہیں ہوتا بلکہ مغربی تصورِ جمہوریت پر وارد ہوتا ہے جس کی اساس احزابی (پارٹی) طرزِ حکومت پر ہے۔ یہ طرزِ حکومت اپنے گہوارۂ یورپ بالخصوص برطانیہ میں بھی ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی ناکامی کی یہی سب سے بڑی دلیل ہے کہ زمانۂ امن میں تو اس سے جوں توں کر کے کام چلا لیا جاتا ہے لیکن جونہی جنگ کے غیر معمولی حالات پیش آتے ہیں یہ سارا سسٹم معطل ہو جاتا ہے۔ برطانیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں پارٹی سسٹم کے مطابق حکومت ہوتی ہے بلکہ وہیں اس پارٹی طرزِ حکومت کی مناسب و بہتر مثال میسر آ سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود گذشتہ جنگ میں جب انگریز قوم ہنگامی حالات سے دوچار ہوئی تو یہ قبا اس کے قالب پر راست نہیں رہ سکی اور اس نے بلاتکلف اسے بالائے طاق رکھ دیا۔ واضح رہے کہ زمانۂ امن میں تو ہر نظام اپنے پرانے زور پر چلتا جاتا ہے بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اس کی راہ میں کوئی موانعات نہیں ہوتے لیکن اس کی آزمائش ہنگامی حالات ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس نظام کو دیکھا گیا ہے کہ ہنگامی حالات میں آزمائش آپڑنے پر یہ طرزِ حکومت ناکام ہو گیا۔ محض برطانیہ پر ہی کیا موقوف ہے زمانۂ جنگ میں اکثر و بیشتر ممالک میں ایسا ہوا۔ فلہٰذا جو طریقِ حکومت حیاتِ قومی کے نازک مرحلوں میں کام نہ آسکے اس کی افادیت پر کیسے ایمان

یا جاسکتا ہے۔ برطانیہ کے حالات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو اس نظام کی ناکارگی اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے انتخابات نے حزب عمال (لیبر پارٹی) کو مسند حکومت پر متمکن کیا لیکن پارلیمان میں انہیں کوئی نصف درجن ارکان کی اکثریت حاصل ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عمال اور قدامت پسند ملی مسائل کو گلدستہ طاق نسیاں بنا کر کلیتہً جنگ اقتدار میں منہمک ہوگئے۔ ایٹلی، سابق وزیر اعظم نے پوالہ وار کوششیں کیں کہ ان کی وزارت محفوظ رہے۔ اور چرچل پارٹی نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ حکومت لیبر کے قبضے سے نکل کر ان کے قبضے میں آجائے۔ اس باہمی جدال نے ایک سال کے اندر ہی نئے انتخابات ناگزیر کر دیئے۔ نئے انتخابات بدیں وجہ منعقد کرائے گئے کہ کسی ایک پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہو جائے تاکہ وہ ملک اور قوم کے لئے کچھ کام کر سکے۔ اگر چرچل جیسا محب وطن اور آزمودہ کار انگریز اپنی ساری کوششوں کا محور اسی ایک نقطے کو بنا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریق سے مخالف جماعت کو نیچا دکھائے اور اس کی بجائے خود حکومت حاصل کرے تو تا بدیگراں چہ رسد۔ چنانچہ جب نئے انتخابات منعقد ہوئے تو انگلستان کے سامنے کوئی اصول یا اہم مسئلہ انتخاب نہیں تھا، نہ عام رائے دہندوں کا مقصود کسی خاص سیاسی جماعت کی شکست و فتح تھا۔ بلکہ وہ اس بات کے متمنی تھے کہ جو حکومت بھی بنے وہ نمایاں اکثریت کی مالک ہو تاکہ وہ دیرپا ثابت ہو سکے اور شکست کے غم سے محفوظ رہ کر ملک کے لئے کچھ کر سکے۔ مبصرین جانتے ہیں کہ جن ووٹروں نے چرچل کو یا ان کے خلاف ووٹ دیئے، ان میں سے بیشتر نہ قدامت پسند تھے نہ وہ لیبر ہی سے اتفاق رکھتے تھے۔ درحقیقت انہیں اس سے اتنا سروکار نہیں تھا کہ کون برسر اقتدار ہوتا ہے جتنا اس سے تھا کہ اسے کتنی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ انگلستان کے نئے انتخابات دبی زبان سے اعتراف ہیں اس حقیقت کا کہ پارٹی طرز حکومت ناکام ہو چکا ہے۔ مگر

بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

ان نظائر کے باوجود ہم بغرض استدلال یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مسلم لیگ کی اب بھی ضرورت ہے۔ لیکن یہ دیکھنے کے لئے کہ جو تجربہ ممالک یورپ میں ناکام ثابت ہو رہا ہے وہ پاکستان میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے، ہمیں مسلم لیگ کے عمل کو دیکھ کر استنباطِ نتائج کرنا ہوگا۔ مسلم لیگ کا عمل ہی مسلم لیگ کے دعوے کی محک ہو سکتا ہے۔ جب یہ فرض کر لیا جائے کہ مسلم لیگ کی ضرورت ہے اور اسے باقی رہنا چاہیئے تو یہ آرڈیننس نافذ کر دینا ہوگا کہ مسلم لیگ کے علاوہ کوئی اور سیاسی جماعت تشکیل پذیر نہیں ہوگی (جیسا کہ ترکی میں ہوا کہ وہاں ابتداءً ایک پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹی بن ہی نہیں سکتی تھی) ورنہ ایک برسر اقتدار جماعت کا وجود کم از کم ایک حزب مخالف کے وجود کو مستلزم ہے۔ اور جب ایک سے زائد جماعتوں کی گنجائش رکھ دی جائے تو پھر ان کی تعداد پر کوئی تحدید نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی صورت میں متعدد احزاب سیاسی کا معرض وجود میں آنا بالکل قدرتی اور قابل فہم ہے۔ اور جب متعدد جماعتیں ہوس اقتدار میں ڈوبی ہوئی میدان سیاست میں آجائیں گی تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قسم کی نوضیت کا دور دورہ ہو جائے گا۔ مسلم لیگ نے اس نوضیت کو اپنے مخصوص حربوں سے پیدا ہونے سے ضرور روکا ہے، لیکن اس نے قوم میں ایسا استبداد روا رکھا کہ بزم سیاست بالکل سونی ہو کر رہ گئی۔ مثلاً ایک طرف تو اس نے اس آمریت سے

گریز کیا کہ اپنے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں پر قانونی پابندی لگا دے، لیکن دوسری طرف اس نے عملاً کوشش کی کہ کوئی سیاسی جماعت اس کی حریف نہ ہو سکے۔ چنانچہ گو قانوناً جماعت سازی جرم نہیں تاہم ہنگامی قوانین اور دارو گیر کے ذریعہ اس نے مخالفت کو بالکل کچل کر رکھ دیا ہے۔ بلکہ اب تو اس استبداد کی یہ صورت ہو گئی ہے کہ اپنی جماعت کے جو افراد جماعتی اعمال و کوائف پر نکتہ چینی کی جرأت کرتے ہیں ان کو بھی خار راہ کی طرح راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس طرح اب مسلم لیگ چند افراد کی مفاد پرستانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے تمام اعضا جنگ اقتدار کے شکار ہیں اور اسی کے دم سے اس بے روح جسد میں زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

اس جماعت کے کارناموں کا سرسری جائزہ تفہیم مطالب کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا مرکز سے کیجئے۔ آغازِ ۱۹۴۷ء میں قائداعظم کی صدارت میں مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری عہدیدار، وزراء وغیرہ لیگ کے عہدیدار نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قائداعظم صدارت کے عہدے سے دستکش ہو گئے، لیکن بعد میں اس آئینی شق کو منسوخ کر دیا گیا اور لیاقت علی خاں مرحوم کو وزیراعظم ہوتے ہوئے صدر منتخب کر لیا گیا۔ ان کے بعد نئے وزیراعظم کی نظر اس خالی نشست پر پڑی لیکن خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کے رکن نہیں رہے تھے، اس لئے یہ دشواری پیش آئی کہ انھیں کیسے صدر منتخب کیا جائے کیونکہ آئین کی رو سے تو صدر کے لئے لیگ کا ممبر ہونا ضروری ہے۔ اس مشکل کا حل بڑی آسانی سے یوں مل گیا کہ جس آئینی شق نے پابندی عائد کی تھی، اسے ہی منسوخ کر دیا گیا اور اس طرح وزیراعظم پاکستان کے لئے صدارت کا راستہ صاف ہو گیا۔ یوں تو آئین کوئی ایسی ناقابل تبدیل شے نہیں کہ مصلحت وقت کے مطابق اسے بدلا نہ جا سکے لیکن موجودہ حالات میں مسلم لیگ کا آئین ایسی موم کی ناک بن گیا ہے کہ اسے جس قالب میں چاہیں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اور اس کا ڈھال لیا جانا اس حد تک مسلم ہے کہ (سنا گیا ہے کہ) جب خواجہ ناظم الدین صاحب کی صدارت کے لئے راستہ صاف کیا جا رہا تھا تو ساتھ ساتھ ہی ان کی صدارتی تقریر حکومتِ پاکستان کے محکمہ اطلاعات کی طرف سے 'سائیکلوسٹائل' ہو رہی تھی اور ریڈیو والے اس کا ریکارڈ بھی تیار کر رہے تھے۔ (یعنی انتخاب سے پہلے ہی یہ معلوم تھا کہ صدر وہی ہوں گے)؛ چنانچہ جب مسلم لیگ کا وہ اجلاس منعقد ہوا جس میں خواجہ صاحب کو صدر چنا جانا تھا تو دکھتے ہیں کہ) سرکاری ذرائع سے تیار شدہ صدارتی تقریر پہلے سے موجود تھی اور اسے سرکاری ذرائع سے ہی اجلاس میں تقسیم کرایا گیا اور اسی شام کو اس تقریر کا ریکارڈ ریڈیو پاکستان سے سنایا گیا۔

مرکز سے 'صدارت و وزارت' کی وحدت کی رو جو چلی تو وہ صوبوں کو بھی لے ڈوبی۔ چنانچہ اس وقت نہ محض وزیراعظم پاکستان ہی مرکزی مسلم لیگ کے صدر ہیں بلکہ صوبائی وزرائے اعظم بھی صوبائی لیگوں کے صدر بن گئے ہیں، اور اس طرح 'جماعت' اور حکومت کی وحدت کمان کے پرفریب پردے میں ایک ہی شخص کو دونوں پر مسلط کر کے دونوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ جب مسلم لیگ نے اپنے عہدیداروں کو وزارتیں قبول کرنے سے منع کر دیا تھا تو پنجاب کے موجودہ وزیراعظم ممدوٹ صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ انھیں وزارت کی مطلق ہوس نہیں، بلکہ ان کے لئے عزت کا آخری درجہ جماعت کی صدارت ہے۔ لیکن جب مسلم لیگ کی سیاست نے

کروٹ لی اور حکومت اور پارٹی کے دونوں دروازے ارکان جماعت کے لئے کھل گئے تو دولتانہ صاحب اس آخری نقطۂ عزت پر پہنچ کر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکے اور انھوں نے صدارت و وزارت دونوں پر قبضہ جمالیا۔ اس میں دولتانہ کی خصوصیات نہیں، تمام صوبوں میں یہی کچھ ہوا۔ اس وحدت کمان سے جماعت اور حکومت کی سرحدیں مل گئی ہیں اور جماعت حکومت کا زینہ بن گئی ہے۔ اس سے جماعت کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔ ایک طرف حکومت پر متمکن گروہ اپنے اقتدار کو جمہوری رنگ دینے کے لئے جماعت باقی رکھنا چاہتا ہے کیونکہ جماعت اس کے اعمال سیاہ پر ایک پردے کا کام دیتی ہے، اور دوسری طرف وہ ناکام آرزو، جنھیں ہوس اقتدار کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی، جماعت کو اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ بام حکومت پر پہنچنے کا یہی واحد زینہ ہے۔ تو گویا اس وقت جماعت میں جو چمک دمک نظر آتی ہے، وہ جماعت کی حقیقی چمک نہیں بلکہ وہ چاند کی طرح کسی سے مستعار ہے۔ اندریں حالات جب جماعت کے ارکان حکومت کے عہدوں پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہوں، وہ عہدیداران حکومت پر تنقید کیسے جرأت کر سکتے ہیں۔ وہ تو الٹا اُن کی خوشامد کریں گے کیونکہ اس تملق پیشگی سے وہ ان کی عنان کرم اپنی طرف منعطف کرا سکیں گے (اور اگر کوئی تنقید کریگا تو وہ بھی اس غرض سے کہ ترغیب سے نہیں تو ترہیب (ڈرانے) سے اپنا کام نکالے) اس طرح جماعت محاسب بننے کے بجائے حکومت کی حاشیہ نشین بن کر رہ گئی ہے اور اسکا کام یہی رہ گیا ہے کہ حکومت کے کاروبار پر تحسین و آفرین کہے اور "بایں بہانہ مگر خود دراز کنم" کی مصداق ہو۔

ارباب لیگ ان صریح حقائق کیکس حد تک آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ یا وہ کس دلیری سے قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں؟ اس کا اندازہ ممتاز دولتانہ کے ایک حالیہ بیان سے ہوگا جس میں کہا گیا ہے :

> میں مسلم لیگ کو اسقدر مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ دیکھے کہ وزارت اس کے حکم کی تعمیل نہیں کر رہی ہے تو وہ اس وزارت کو نکال باہر کر سکے اور اس کے بجائے ایسی اور وزارت مرتب کرا سکے جو اسکے حکم کے تابع ہو (لاہور۔ ۱۴ دسمبر)

کتنے حسین اور جمہوری الفاظ ہیں! کون ان کی صداقت سے انکار کریگا؟ لیکن مسلم لیگ کی مخصوص سیاست کے پس منظر میں ان کی معنویت کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک جمہوری مغالطہ ہے جس میں قوم کو مبتلا کیا جا رہا ہے اور بس۔ اوّل تو خیر سے مسلم لیگ نے نہ کوئی واضح نصب العین سامنے رکھا ہے اور نہ کوئی صاف لائحہ عمل طے کیا ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کوئی وزارت لیگ کی ہدایت اور پروگرام کے مطابق مصروف کار ہے یا نہیں۔ لیکن اگر بالفرض ایسا نصب العین اور لائحہ عمل موجود بھی ہو، اور یہ پتہ بھی چل جائے کہ اس پر یا اس کے مطابق عمل نہیں ہو رہا تو ہوگا کیا؟ مثلاً پنجاب میں ایسی کاروائی عمل میں لائی جائے تو صدر مسلم لیگ دولتانہ صاحب مسلم لیگ کا اجلاس طلب فرمائیں گے جس میں دولتانہ صاحب وزیر اعظم سے جواب طلب کیا جائیگا۔ اور ملزم جج بن کر اپنے مقدمے کا آپ فیصلہ صادر کریگا کہ اسے یعنی

مجھے بیک بینی و دو گوش وزارت سے نکال دو اور اس کی بجائے میری بجائے کسی غیر کو کرسی وزارت پر فائز کر دو!

مسلم لیگ کے بازارِ سیاست میں متاعِ امانت کس حد تک میسر آسکتی ہے؟ اس کا اندازہ صوبہ سرحد کے انتخابات سے لگایا جا سکتا ہے جن میں صوبائی لیگ کے صدر اور صوبائی حکومت کے وزیر اعظم عبد القیوم نے جمہوریت ہی کی نہیں، انسانیت کی بھی خوب ہی مٹی پلید کی۔ انتخابی جنگ کی تیاریوں میں لیگ کی تمام دوربار توپوں نے حصہ لیا۔ مشرقی پاکستان کے وزیر اعظم۔ نور الامین۔ اپنے صوبے کو قحط اور موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگے بھاگے سرحد پہنچے اور مسلم لیگ کے لئے یوں ووٹ طلب کئے کہ اگر مسلم لیگ کھمبے کے لئے بھی ووٹ مانگے تو اپنا ووٹ کھمبے کو دیدو۔ مخالفین لیگ متعجب ہیں کہ نور الامین نے یہ کیا کہہ دیا۔ لیکن بہ نظرِ غائر دیکھنے سے کوئی وجہ تعجب باقی نہیں رہتی کیونکہ پارٹی میں ارکان کی انفرادی خوبیاں یا خامیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور نمایاں حیثیت جماعت کو حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ووٹ افراد کے نام پر نہیں بلکہ جماعت کے نام پر طلب کئے جاتے ہیں اور ووٹ دینے والوں کو یہ موقع ہی نہیں دیا جاتا کہ وہ افراد کی سیرت و کردار کا بھی جائزہ لے سکیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ افراد بھرے مجمعوں میں اپنی خامیوں کا اعتراف کرتے سنائی دیتے ہیں لیکن ان کی ... پر زور ... ہے کہ میں مسلم لیگ کا ادنیٰ خادم ہوں' اور مسلم لیگ میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔

خود وزیر اعظم پاکستان نے جذبات سے لبریز تقریر کی۔ انھیں ایسے کرنا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ چند دن پیشتر لیگ کے صدر اعظم "منتخب" ہو چکے تھے۔ انھوں نے جماعت اور حکومت دونوں کو سراہا اور مسلم لیگ کے حق میں ووٹ کو پاکستان کے استحکام و ترقی کے لئے ووٹ کا مرادف قرار دیا۔ عبد القیوم خاں۔ کہ انھیں ذاتی فتح و شکست کا معرکہ درپیش تھا۔ ایک قدم اور آگے بڑھے اور یہانتک کہہ گئے کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینا پختونستان کے پروپیگنڈے کو جھوٹا ثابت کرنا ہے۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ کے برخلاف ووٹ طلب کرنے والے یا برخلاف ووٹ دینے والے تمام کے تمام پختونستان کے حامی ہیں۔ قیوم اس قسم کی الزام تراشی اور دشنام دہی بڑی آسانی سے کر سکتا تھا کیونکہ صوبائی حکومت اس کے اپنے ہاتھ میں تھی اور مرکزی حکومت صدر مسلم لیگ کے قبضہ میں۔ پشاور سے کراچی تک کون اس سے باز پرس کرنے والا تھا؟ اور مخالفین لیگ؟ کوئی جیل کے اندر، کوئی سیفٹی ایکٹ کا شکار، کوئی پشاور بدر، کوئی سرحد بدر، وہ دم ماریں تو غدار کہلائیں اور دار و گیر کا شکار ہوں۔

ان حالات میں سرحد کے انتخابات شروع ہوئے۔ وحدت کمان نے خوب ہی گل کھلائے۔ قیوم کو اپنا راستہ صاف کرنا تھا۔ وہ حکومت کا اثر و دبدبہ لے کر میدان میں آیا اور اپنے حریفوں کا ایک ایک کرکے سر کچلا۔ لیگ اور حکومت اس کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں اور وہ ان دونوں سے بلند ہو گیا تھا۔ لہذا حریف سے مراد وہ شخص تھا جو مجموعہ جماعت و حکومت کا حریف تھا۔ اپنے آدمیوں میں ٹکٹ بانٹے گئے اور ان مسلم لیگیوں کو ان سے محروم رکھا گیا جو جماعت سے وابستہ تو تھے مگر قیوم کے حریف تھے۔ منجملہ دیگر حضرات کے ان میں آل پاکستان مسلم لیگ کا جنرل سکریٹری یوسف خٹک بھی تھا۔ قیوم نے اسے ٹکٹ نہیں دیا۔ خٹک کی اپیل مرکز تک پہنچی۔ مرکز نے اسے قبول کر لیا اور ٹکٹ عطا کر دیا۔ قیوم نے خٹک کے مقابلے میں، جسے اس کی جماعت کے مرکز نے نامزد کیا تھا، ایک غیر لیگی کو کھڑا کر دیا اور اسے کامیاب کرا دیا۔ انتخاب کے دوران میں اپنے مرکز کے امیدوار کو اس نے اس طرح سے پریشان کیا کہ اسے

انتخاب سے دست بردار ہونا پڑا۔

ضمناً یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس استبداد و تظلم کے باوجود مخالفین لیگ نے لیگ سے کچھ زیادہ نہیں تو برابر کے ووٹ ضرور حاصل کئے۔ قیوم خاں سے تو یہ پوچھنا بیکار ہے کہ کیا آدھا صوبہ سرحد جس نے لیگ کے خلاف ووٹ دیئے پختونستان کا حامی ہے؟ لیکن ہم صدر پاکستان مسلم لیگ سے ضرور ایک دو سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہر پاکستانی سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اپنا ووٹ مسلم لیگ کو دے۔ لیکن آپ کا صدر و وزیر اعظم صوبہ سرحد کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے ان مسلم لیگی امیدواروں کو شکست دلوائی جنھیں مرکز نے نامزد کیا تھا، اور ان کے مقابلے میں غیر لیگیوں کو کامیاب بنایا؟ کیا یہ لیگ دشمنی نہیں؟ کیا یہ لیگ کے ضابطہ کے خلاف نہیں؟ ذرا اپنے جنرل سکریٹری یوسف خٹک سے پوچھئے کہ وہ قیوم خاں کی کارستانیوں اور انتخابات کی آزادی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ انھوں نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ انتخابات کو منسوخ کرا کے دم لیں گے۔ ایک مقامی مسلم لیگ کا اپنی وزارت پر تنقید کرنا تو ایک طرف، کیا مرکزی مسلم لیگ اپنی صوبائی شاخ سے باز پرس کرنے کی جرأت کر سکتی ہے؟ اگر کر سکتی ہے تو وہ کس موقع کے انتظار میں ہے؟ اگر نہیں کر سکتی تو وہ قوم کو کیوں دھوکہ دے رہی ہے؟

لیکن نہیں اس میں اچنبھے کی بات نہیں۔ قیوم کی تعدی و تظلم مذمت کے قابل نہیں کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی شاندار فتح ہوئی ہے اور مسلم لیگ کی وزارت دوبارہ بن گئی ہے۔ اگر جمہوریت کا خون ہوا ہے، اگر انسانی اقدار کو پامال کیا گیا ہے، اگر افراد کو کچلا گیا ہے، تو کوئی بات نہیں۔ ان کا نتیجہ حسب خواہ نکلا ہے۔ فہو المراد۔ قیوم جماعت کی اس کمزوری کو سمجھتا ہے۔ مرکز نے خود مثال قائم کر کے اس کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار دیدی ہے۔ اب وہ صوبے کے سینے پر بھی چڑھا ہے اور مرکز کو بھی آنکھیں دکھا رہا ہے۔ مرکز اپنی جگہ پر مجبور ہے کہ اس کی پشت پر ہاتھ رکھے اور اسے خوش رکھے۔
'بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنم'

یہ کچھ سرحد ہی پر موقوف نہیں۔ پنجاب میں بھی انتخابات ہو چکے ہیں جہاں ہر شخص یہ کہہ رہا ہے کہ پیسے اور پولیس نے مسلم لیگ کو کامیاب بنا دیا۔ انتخابات سے پیشتر پنجاب میں جو ہڑبونگ مچی تھی، اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ اس وقت سندھ میں آئین و سیاست کو جس طرح ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ بلوچستان اور مشرقی پاکستان ان سے بہتر نہیں۔ مسلم لیگ پاکستان کو ایک خطرناک وادی میں لے آئی ہے۔ چند آدمی اقتدار و دولت کی جنگ لڑ رہے ہیں' اور ان کے قدموں کے نیچے نادار، بھوکے، ننگے، مریض، جاہل عوام خاک میں لوٹ رہے ہیں۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں　　خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

قوم سیاست میں مردنی چھائی ہوئی ہے۔ جہانتک نام نہاد جمہوری اداروں کا تعلق ہے وہ معطل و بےکار پڑے ہوئے ہیں۔ قوم سیاسی پارٹیوں سے بھی بددل ہے اور حکومت سے بھی نالاں ہے۔ قوم کی قوتِ فکر معطل ہو چکی ہے اور قوائے عملیہ مضمحل۔

انھیں زندگی اور اس کے حقیقی ہنگاموں سے دلچسپی نہیں رہی۔ اس قبرستان میں بھی قیامت آئے گی کبھی؟

اگرچہ درست ہے کہ

ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت

تو قیامت کا اس سے زیادہ موزوں وقت اور کونسا ہو سکتا ہے؟

اس صورتِ حالات کا علاج صرف ایک ہے جسے وہ طلوعِ اسلام جو اپنی نشاۃِ اولیٰ کے زمانے میں مسلم لیگ کا سب سے بڑا حامی تھا، چار برس سے مسلسل دہراتا چلا جا رہا ہے۔ وہ علاج یہ ہے کہ

(i) مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس کا وجود، ملت میں تشتت و افتراق کا موجب ہے۔

(ii) مسلم لیگ کو ختم کرنے کے بعد، ملک میں پارٹیاں بنانے کو قانوناً جرم قرار دیدیا جائے تاکہ ملک اس لعنت سے پاک ہو جائے۔

(iii) اس کے بعد پوری کی پوری امت ایک جماعت (پارٹی) بن جائے گی۔ اس ایک جماعت (امتِ واحدہ) کے حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کے جذبے کی نشوونما کی جائے۔

(iv) ساری ملت کی اس طرح از سرِ نو تنظیم کی جائے کہ قوم کو چھوٹی چھوٹی وحدتوں (Units) میں تقسیم کیا جائے اور ان میں باہمی مشاورت سے نیچے سے لے کر اوپر تک حکومت کے تمام اداروں کو آزادانہ انتخاب سے پُر کیا جائے۔

اس طرح ملک سے پارٹی بازی کی لعنت ختم ہو کر صحیح نمائندہ حکومت کی طرح پڑ جائے گی۔

اگر یوں کیا گیا تو

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

باب المراسلات

پولیس کے ایک جلسۂ میلاد میں مجھے بلایا گیا، میرے ساتھ دیوبند کے تعلیم یافتہ ایک نوجوان تھے۔ ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو دیکھا پولیس کے چھوٹے، بڑے افسر اور ملازمین جمع ہیں۔ نعت خوانی شروع ہے۔ ایک پنجابی نعت خواں کی نعت کا ایک شعر آپ بھی سنئے۔ مسدس حالی کی بحر میں۔

خدا جس نوں پکڑے، چھڑائے محمدؐ محمدؐ دے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا

یعنی خدا کی گرفت سے تو محمدؐ چھڑا سکتے ہیں، لیکن محمدؐ کی گرفت سے چھڑانے کی طاقت کسی میں نہیں۔

میرے سامنے قرآن مجید کی آیہ ذیل آ آ کر ڈرا رہی تھی:

أَفَأَنتَ تُنقِذُ مَن فِي النَّارِ

(اے پیغمبر!) جو شخص آگ میں ہے کیا تو اسے چھڑا لے گا؟

اگر خدائے نباشد ز بندۂ خوشنود شفاعتِ ہمہ پیغمبراں ندارد سود

مسلمان کلام اللہ کی توہین کر رہا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے مسلمان ہی مرحبا، جزاک اللہ کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اس کے بعد ایک افسر صاحب تقریر کے لئے آگے بڑھے۔ انھوں نے چند منٹ انکسار میں صرف کئے، پھر مقررانہ انداز میں موضوع شروع کیا۔ دورانِ تقریر میں ہر دو چار منٹ کے بعد فرماتے "درود پڑھو"۔ حاضرین آہستہ پڑھتے تو آپ فرماتے "بلند آواز میں پڑھو"۔

آپ کی پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کے تمام نکات میرے لئے بالکل نئے حقائق تھے۔ اس لئے میں نے ان نوادر کو قلمبند کر لینا مناسب سمجھا تاکہ مجھ ایسے بہت سے ناواقفانِ اسرار مستفید ہو سکیں۔

محترم مقرر نے فرمایا:

آج معشوقِ قدرت کی ظاہری دنیا میں تشریف آوری کا دن ہے۔ ویسے تو آپ اس وقت بھی موجود تھے جب آدم کا پتلا پانی اور مٹی سے جدا نہیں ہوا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بادشاہ کی آمد سے پہلے سپاہی محل ورود کا معائنہ کرنے کے لئے آتے ہیں، پھر بڑے افسر آخر میں پائیلٹ آتا ہے۔ یہ سب تیاریاں اور احتیاطیں بادشاہ کی عظمت و شان کے مطابق سرانجام دی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضور معشوقِ قدرت کی آمد سے پہلے آدم علیہ السلام کی بعثت سپاہی کی حیثیت رکھتی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا کہ جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ دنیا ہمارے معشوق کے استقبال کے لئے آراستہ ہے یا نہیں؟ آدمؑ کے دو بیٹوں میں کشت و خون کا

واقعہ ہوا۔ زمین خون کے دھبوں سے داغدار ہوگئی۔ معشوق قدرت کی آمد رک گئی۔ آخر نوح علیہ السلام تشریف لائے اور کئی ہزار سال[1] اسی کوشش میں لگے رہے یہانتک کہ ساری زمین کو طوفان نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح ہابیل کے خون کے دھبے صفحۂ ارض سے دور ہوئے۔ لیکن اب زمین ویران اور بے رونق تھی اس وجہ سے معشوقِ قدرت کی تشریف آوری مناسب نہ سمجھی گئی۔ اس بے رونقی دور کرنے کے لئے سوارانِ کشتی کی نسل کو ترقی دی گئی۔ اس دوران[2] میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ہوا انھوں نے آگ کو گلزار بنایا تاکہ معشوق قدرت تشریف لانے تو اس گل وگلزار سے لطف اندوز ہو۔ "درود[2] پڑھو"

سب کے بعد عیسیٰ علیہ السلام پائیلٹ کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اب زمین عروس نو کی طرح معشوق قدرت کے لئے آراستہ ہو چکی تھی اور سراپا انتظار ہو رہی تھی۔ اس اضطراب دید کی حد یہ ہے کہ عیسیٰؑ کی ولادت کے لئے نہ باپ کی راہ دیکھی گئی اور نہ ان کی وفات کے لئے ملک الموت کا انتظار کیا گیا۔ ان بندھے قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر معجزانہ طور پر دنیا میں تشریف لے آئے اور خارقانہ انداز سے ایک ہی جست لگا کر چرخ چہارم پر جا بیٹھے اور اپنے بھیجنے والے کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔" درود پڑھو"

اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بازار کائنات صرف معشوق قدرت کی خاطر سجایا گیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

محمدؐ کی گر رونمائی نہ ہوتی قسم ہے خدا کی خدائی نہ ہوتی

"سبحان اللہ، جزاک اللہ، مرحبا" کی آوازیں آرہی تھیں، میری آنکھیں تو نہیں دل رو رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ ہماری پولیس کو یہ اسلام سکھایا جا رہا ہے۔ اسی شام کو ایک عزیز جو ملٹری کے ڈاکٹر ہیں تشریف لائے اور انھوں نے اپنے جلسے کی ایسی ہی کیفیت بیان کی۔ فرق یہ ہے کہ یہاں تقریر کرنے والے ایک افسر تھے اور وہاں ایک مولوی صاحب۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہماری فوج کو بھی اسی قسم کا اسلام سکھایا جاتا ہے۔ میرے ساتھ جو دیوبندی نوجوان تھے، انھوں نے میرے تعجب کو بھانپ کر بتایا کہ یہ تقریر جو آپ نے آج سنی ہے، کوئی نئی چیز نہیں۔ بریلوی مولوی صاحبان ہمیشہ اسی قسم کی تقریریں فرمایا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ اور اس ملک کے کروڑوں مسلمان اس قسم کے مواعظ کو سننا ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔

مذکورہ تقریر کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ "اس وقت ہم بہت سے محسوس مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کا حل ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تلاش کرنا ہے۔ آپ کی ذات مبارک بہت سی صفات کی جامع ہے اور ہر صفت ایک الگ نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپؐ بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی ہیں، سوداگر بھی ہیں، معلم و مبلغ بھی ہیں، زاہد و عابد بھی ہیں اور سپہ سالار بھی ہیں، بے یارومددگار بھی ہیں اور فاتح و ظفر مند بھی ہیں، باہمہ بھی اور بے ہمہ بھی۔ الغرض کسی قسم کا آدمی ہو وہ آپؐ کی سیرت پاک میں اپنے لئے نمونہ تلاش کر سکتا ہے۔ جو خوبیاں سابقہ انبیاء میں جزئی طور پر ملتی ہیں وہ سب آپ میں ایک ہی جگہ

---

[1] نقل مطابق اصل ہے۔ [2] اوپر کی عبارت میں کئی جگہ "درود پڑھو" آنا چاہئے تھا جو مجھے فراموش ہو گیا۔

جمع ہو گئی ہیں۔ کہنے والے نے ٹھیک کہا ہے :

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مسیحؑ کی زندگی میں بادشاہی کا نمونہ نہیں، سلیمانؑ کے حالات میں درویشی نہیں، موسیٰؑ میں فتمندی نہیں۔ وغیرہ ذالک۔ جس طرح قرآن میں تمام آسمانی کتابوں کا عطر آگیا ہے اور اس پر مزید بھی بہت کچھ ہے۔ اسی طرح آپؐ کی ذات میں تمام نبوتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ اب کسی گذشتہ و آئندہ نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کے بعد آج تک جو متنبی قسم کے لوگ ہوئے ہیں، ان کو تو غلامی کی ذلت سے نکلنا بھی نصیب نہیں ہوا بلکہ بعض تو غلامی و محکومی ہی کے مبلغ تھے۔

ہمارا یہ اجلاس ایک خاص طبقے کے لوگوں کا اجتماع ہے۔ اس طبقے کے لئے آپ کی سیرت پاک سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت دنیا میں بے شمار مذاہب ہیں۔ لیکن کثرت تین مذاہب کے پیروؤں کی ہے۔ بدھ۔ عیسائی اور مسلمان۔ ان میں کا ہر گروہ کروڑوں کی تعداد میں پھیلا ہوا ہے۔ مقدم الذکر دونوں مذہبوں کے بانی تارک، راہب اور درویش قسم کے بزرگ تھے۔ ان کے مشاغل و اعمال میں کوئی تنوع اور بوقلمونی نہیں۔ ہم کو ان سے ملائم اخلاق کا درس ملتا ہے اور بس۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک سپاہی کی حیثیت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کو آسمان وحی سے حکم پہنچتا ہے کہ "جنگ کر اس معاملے میں تو اپنی ذات کا ذمہ دار ہے"۔ جب آپ وردی پہن کر مسلح ہو جاتے ہیں تو آواز آتی ہے کہ "اپنے ایمان لانے والوں کو بھی جنگ کی ترغیب دے"۔ (۴/۸۵) یعنی محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ سب مسلح ہو جائیں۔ سب سپاہی بن جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا دین ایک مقدس سپاہی سے شروع ہوا اور ہمارے سلف صالحین سپاہی ہی تھے۔ خدا کے سپاہی۔ دین کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے والے سپاہی۔ اگر وہ سپاہی نہ ہوتے تو یہ دین مکہ کی گلیوں سے باہر نہ نکل سکتا۔ ہم جو یہاں بیٹھے ہیں، کوئی کیشو رام ہوتا اور کوئی کیکر سنگھ۔ یہ تلوار اور قرآن کی برکت ہے کہ ہم عبداللہ اور عبدالرحمٰن بنے بیٹھے ہیں۔ تلوار اور قرآن

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند کائنات زندگی را محور اند (اقبال)

سپاہیوں کو فخر کرنا چاہئے کہ ان کا پیغمبر اسلامؐ پہلا سپاہی تھا۔ اگر وہ تلوار اور قرآن کو ساتھ ساتھ رکھیں تو وہی اپنے پیغمبرؐ کے سچے پیرو ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ملکی دفاع کا ہے۔ ہماری دفاعی مساعی نہ حکومت پر احسان ہے نہ کسی اور پر۔ اسی سے ہمارے دین کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اسی سے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، اسی سے ہماری بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کی آبرو بچ سکتی ہے۔ خدانخواستہ اگر ہم موجودہ آزادی کو ہضم نہ کر سکے اور اپنی بد اطواریوں سے نااہل ثابت ہوئے تو ہماری آئندہ نسلیں (اگر ہوئیں تو) ہم پر لعنت کریں گی کہ[1]

ہمارے بڑوں کو ایک بڑا خطۂ زمین مل گیا تھا جس میں وہ گروہ ہر طرح کی ترقی کر سکتے تھے لیکن وہ

---

[1] یہ آخری فقرے وقتِ تحریر اضافہ کر رہا ہوں۔

اپنی نالائقیوں کی وجہ سے اس کو سنبھال نہ سکے۔

خدا وہ دن نہ لائے کہ یہ منحوس الفاظ پورے ہو جائیں۔ میں آپ کے سامنے دست بستہ اسی قرآن کا واسطہ دیکر عرض کرتا ہوں جو میرے ہاتھ میں ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالیں وہ ناہنجارانہ طور طریقے جو ہمیں غلامی کے زمانے سے ورثہ میں ملے ہیں، انھیں ترک کر دیں۔ نیک عملی اور راست روی اختیار کریں۔ اسی میں ملک کا بچاؤ ہے اور اسی میں ہماری فلاح و نجات ہے۔"

میں یہ تقریر کر کے رخصت ہوا۔ میرے بعد پھر وہی نعت خوانی شروع ہو گئی

"حسینوں کی بانکی ادا ہیں محمدؐ　　گنہگار کے بخشوا ہیں محمدؐ"

یہ نقل بھی مطابق اصل ہے — میں اسی وقت سے اس کرب میں مبتلا ہوں کہ میری قوم کا انجام کیا ہوگا۔ یہ زہر قاتل جو دین کے نام پر ہمیں پلایا جا رہا ہے۔ ہم اس سے اپنے آپ کو کس طرح بچا سکتے ہیں؟ اور جو شخص یہ زہر کا پیالہ پینے والوں کے لب سے جدا کرنا چاہتا ہے اس کو کافر، بے دین، ملحد وغیرہ القاب و خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں عوام تو خیر عوام ہیں ملٹری اور پولیس تو ملک و حکومت کی بنیادیں ہیں۔ انھیں تو اس مہلک وعظ و تبلیغ سے بچایا جائے اور کوئی بھلے آدمی منتخب کر کے ان کی تعلیم دین کے لئے مقرر کئے جائیں اور اس قسم کے خرافاتی واعظوں کی زبانوں پر کم از کم سرکاری محکموں میں تالا لگایا جائے۔

میرے خیال میں اس زہرناکی کا پہلا ذمہ دار وہ شخص ہے جس نے غیر قرآنی روایات کو دین میں داخل کیا۔

دل نے کانوں سے سنی، دل سے زباں تک پہنچی　　بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عرشی۔ لاہور

طلوع اسلام محترم عرشی صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں صرف ایک مجلس عید میلاد کی روئداد تحریر فرمائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عید میلاد کی قریب قریب ہر مجلس میں یہی کچھ ہوتا ہے، جو انھوں نے بیان فرمایا ہے۔ اس میں نہ افسر کی تخصیص ہے نہ مولوی صاحبان کی۔ نہ بریلوی کی نہ دیوبندی کی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ عید میلاد النبیؐ کی (سالانہ) تقریب پر پورے پاکستان میں جس قدر "اہم" مجالس ہوتی ہیں، اگر ان کی روئداد یک جا شائع کر دی جائے تو غیر مسلموں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے یہی ایک مجموعہ کافی ہو سکتا ہے! یہ اس ذات گرامیؐ کی بعثت مقدسہ کی تقریب کے متعلق ہو رہا ہے جو تمام نوع انسان کو خوشگواریوں اور کامرانیوں کی راہ دکھانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

اس باب میں، اس سال ایک اور اہم چیز کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان اس تقریب عالیہ میں جو کچھ کرتے تھے اس کے متعلق پھر بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں ہیں۔ مسلمانوں کا سمجھدار طبقہ ان لغویات کو صحیح نہیں مانتا۔ لیکن اس سال بحمد اللہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی طرف سے یہ تقریب مقدس، سرکاری طور پر منائی گئی ہے۔ اگر آپ

محافل کی روئداد پڑھیں جنھیں اب "سرکاری" ہونے کا بھی شرف حاصل ہو چکا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا انداز بھی ان مجالس سے مختلف نہ تھا جنھیں عامیانہ مجالس کہا جاتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ غیر مسلم اقوام ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہوں گی۔ ہمارے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتی ہیں، اس کا بھی زیادہ افسوس نہیں۔ سب سے بڑا رنج تو یہ ہے کہ اقوامِ عالم، اُس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہوں گی جس کی بعثت کی تقریب اس طرح منائی جاتی ہے۔ اس سال عین اس تقریب سے متصل، اقوامِ متحدہ کی طرف سے منعقد کردہ "حقوقِ انسانیت کا دن" (Human Rights Day) منایا گیا۔ ہمیں اقوامِ عالم کو بتلانا یہ چاہیئے تھا کہ "حقوقِ انسانیت" کا دن منانا چاہتے ہو تو اس ذاتِ گرامیؐ کی بعثت کا دن مناؤ جس نے انسانوں کو سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ انسان کے بہ حیثیت انسان کیا حقوق ہوتے ہیں؟ لیکن دوسروں پر کیا گلہ جب ہماری اپنی حالت یہ ہے کہ ہم نوعِ انسان کے اس محسنِ اعظمؐ کے ظہور کی "تقریب" درود پڑھ پڑھ کے، (بلکہ گا گا کر) مناتے رہتے ہیں اور "حقوقِ انسانیت" کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کا متعین کردہ دن مناتے ہیں! اے کاش مسلمان کو کوئی بتائے کہ

تو قدرِ خویش ندانی! بہا ز تو گیرد
وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

تاریخِ رسالت (معارف القرآن جلد سوم)

رسول کریم صلعم سے پیشتر کے انبیائے کرامؑ کی دعواتِ انقلاب کا تذکرہ۔

قیمت پندرہ روپے

معراجِ انسانیت (معارف القرآن جلد چہارم)

سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام قرآن کے آئینے میں۔

قیمت بیس روپے

نوادرات - مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری۔

ضخامت چار سو صفحات - قیمت چار روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

اے رحمۃً للعالمینؐ

(طلوعِ اسلام کے حلقۂ قارئین میں سے ایک صاحبدل بزرگ شیخ محمد یعقوب صاحب نے اس سال حج کو روانہ ہونے سے کچھ عرصہ پہلے خیال ظاہر فرمایا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر حاضری کے وقت ایک بالکل نیا سلام پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور مجھ سے فرمائش کی کہ ممکن ہو تو اس موضوع پر کوئی خاص نظم لکھ دوں۔ میں نے اس سعادت کو غنیمت جانا۔ کچھ عرصے سے ایک نعتیہ مستزاد زیرِ ترتیب تھا اسے مکمل کر کے ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو عین اس رات شیخ صاحب کے حوالے کیا جس رات ان کے ہوائی جہاز کی حجاز کو روانگی تھی۔ چلتے وقت انھوں نے ہدایت کردی تھی کہ جب تک یہ سلام روضۂ پاک پر پڑھ نہ لیا جائے، شائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ اب ان کے واپس تشریف لانے پر یہ نظم چند اشعار کے اضافے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کی جاتی ہے۔ اسد)

اے سب جمیلوں سے جمیل، اے سب حسینوں سے حسیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
اے وہ کہ تیری مثل فطرت کے تصور میں نہیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
آدم کو تو پہلے ہی دن، ابلیسِ سرکش کے سوا — سجدہ فرشتوں نے کیا
انسانیت نے تیرے قدموں پر جھکائی ہے جبیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
پہلوں کو تجھ پر فخر ہے، پچھلوں کو تجھ پر ناز ہے — تو مایۂ اعزاز ہے
اے اعتبارِ اولیں، اے افتخارِ آخریں — اے رحمۃً للعالمینؐ
ہے اس سے ظاہر کس قدر تیری صداقت کا اثر — تیری امانت کا اثر
دشمن بھی دل سے مانتے تھے تجھ کو صادق اور امیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
تجھ کو حکیمِ لم یزل نے از رہِ لطف و عطا — وہ خرمنِ حکمت دیا
منکر بھی نادانستہ یا دانستہ جس کے خوشہ چیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
اہلِ جہاں محتاج ہیں تیرے ہی فیضِ عام کے — ممنون ہیں اسلام کے
ہے کون ایسا جو ترے دامن کے سائے میں نہیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
تیرے تکلم سے دلِ انساں کو پیغامِ سکوں — افزائشِ جذبِ دروں
تیرے تبسم سے غمِ دوراں کی تلخی انگبیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
ہاں گو سئے نازِ اکثر بہ شانِ بے نیازی لے گئے — مردانِ غازی لے گئے
شاہوں سے بازی لے گئے تیرے غلامِ ادنیٰ تریں — اے رحمۃً للعالمینؐ
ہر امتحاں کے وقت رکھ لیتا ہے اس کی آبرو — تیرے شہیدوں کا لہو
امت ہے تیری سرخرو، اے سبز گنبد کے مکیں — اے رحمۃً للعالمینؐ
انسانیت پھر اپنے ہتھیاروں سے خود بسمل ہوئی — پھر زندگی مشکل ہوئی
قوموں میں پھر ابھرے ہیں جذباتِ تمنا و بغض و کیں — اے رحمۃً للعالمیں

یہ انقلاب دم بہ دم اور محوِ خواب اہلِ حرم   غافل عرب، غافل عجم
باطل کے ہنگاموں کا شور اور اہلِ حق خلوت گزیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
ملت جو بے ترتیب و بے تنظیم و بے شیرازہ ہے   غفلت کا یہ خمیازہ ہے
روز ایک زخمِ تازہ ہے ہر داغِ کہنہ کے قریں   اے رحمۃ للعالمینؐ
قصہ فلسطیں کا بھی ہے کشمیر کا بھی ذکر ہے   دونوں کی سب کو فکر ہے
ہے اس سے دنیا کے مسلمانوں کا دل اندوہ گیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
مسلم کو پہنچائیں زیاں غیروں میں یہ طاقت کہاں   ہو بھی تو یہ جرأت کہاں
اکثر ہنے آزارِ جاں اپنے ہی مارِ آستیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
ایسے مسلماں بھی ہیں جو ایماں کے دعویدار ہیں   دیں سے مگر بیزار ہیں
اغیار کے تو یار ہیں اور دوستوں کے عیب چیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
ایسے مسلماں بھی ہیں جو گرویدۂ افرنگ ہیں   غیروں سے ہم آہنگ ہیں
اسلام کی تقدیر کا آتا نہیں ان کو یقیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
اچھا سمجھ کر اس میں ہو جاتے ہیں مسلم مشتغل   اتنے ہوئے ہیں سادہ دل
جس چیز کو ان کے لئے اچھا کہیں اعدائے دیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
ایسے ہی نادانوں کا رخ ہے مغربیت کی طرف   یا مزدکیت کی طرف
جو تیرے دیں کے حسنِ عالمگیر سے واقف نہیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
تیری نگاہِ زندگی پرور سے ہوکر بہرہ ور   بیگانگی ہو اس قدر
اشکِ ندامت سے ہے تر اہلِ نظر کی آستیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
بارے تری امت میں پھر آثار بیداری کے ہیں   انداز ہشیاری کے ہیں
جنبش سی ہے اک ساحلِ بربر سے تا اقصائے چیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
اک بار پھر امت تری آئے قدیمی شان پر   کرکے عمل قرآن پر
غالب ہو کل ادیان پر اک بار پھر دینِ مبیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
تیرے غلاموں کو یہ پاکستان کی نعمت ملی   برکت سے تیرے نام کی
گہوارۂ اسلام بھی بن جائے اب یہ سرزمیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
نسبت تجھی سے ہے ہمیں حالت بری ہے یا بھلی   بس ہے سہارا آخری
عقبیٰ میں بھی دنیا میں بھی تیری شفاعت[1] کا یقیں   اے رحمۃ للعالمینؐ
ملت کی خدمت کے لئے بارے اسدؔ کو بھی ملے   لطفِ نگاہِ خاص سے
چشمِ جہاں بین و دلِ بیدار و حرفِ دل نشیں   اے رحمۃ للعالمینؐ

اسدؔ ملتانی

---

[1] قرآن کی رو سے شفاعت کا کیا مفہوم ہے اس کے متعلق طلوع اسلام میں کبھی تفصیل سے لکھا جائیگا۔ عام مروجہ مفہوم تو بہرحال قرآنی نہیں۔ طلوع

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road

KARACHI

BRANCHES :—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY.

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for :—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London —
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.



سول ایجنٹ: مسلم اینڈ کمپنی جوڑیا بازار کراچی ۲

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گرامون ریکارڈ کے ذریعہ سے نئی زبان سکھاتا ہے:

زبان وہ سیکھئے

جو اہل زبان بولتے ہیں



نصابی کتابوں سے آپ کوئی غیر ملکی زبان" دسے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے اس کیلئے ضروری ہے۔ آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب ولہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں، لنگوافون" سے یہ چیزیں بہت جلد پوری پوری طرح اور بغیر محنت دکوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کے لئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اُس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سنکر سمجھ کی مہارت پیدا کر دیتا ہے'

اس طریقہ تعلیم میں درس وتدریس کے منجمد قواعد وضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال سکھا ایسے ماحول میں رکھدیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں، یا سیرگاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ دل پسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائینگے، زبان سیکھنے کیلئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلوما حاصل کیجئے، مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے۔ فوراً تفصیلی جواب دیا جائیگا؛

زبان سیکھنے کیلئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی ......
عربی	بنگالی	ہندوستانی ......
فرانسیسی	روسی	چینی ......
اسپینش	اطالوی	ڈچ ......
سویڈش	نارویجین	فنش ......
زچ	پولش	لاطینی ......
یونانی	الفک	ملائے ......
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی ......
جرمن	ترکی	پرتگالی ......

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض ....

نام ....

پتہ ....

....

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کراچی۔

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جسمیں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے، بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے \ نہیں

پام روز

ٹائیلٹ سوپ آپ کے جسم کو ہر قسم کے میل سے بالکل صاف کر دے گا اور آپ کی جلد کو ملائم رکھے گا۔
نہانے کے لئے ہمیشہ اس کا استعمال کیجئے

اسپیشل کیمل

کپڑے دھونے کا نہایت اعلیٰ صابن ہے
ہر قسم کے کپڑے بڑے اطمینان سے دھوئیے۔ اسپیشل کیمل ان کو مصفا اور اجلا بھی رکھے گا اور دیرپا بھی بنائے گا۔

پام روز —— اور —— اسپیشل کیمل

خریدنے میں آپ کا ذاتی فائدہ بھی ہے اور قومی مفاد بھی۔

ہمیشہ پاکستانی مصنوعات کی سرپرستی کیجئے

کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS
BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil



High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'



BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams: "BENGALI"

P. O BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone: Office: 3338; Mills: 2006

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robson Road, Karachi.

طلوع اسلام

فروری ۱۹۵۲



قالہ خصوصی

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو۔ اور

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا، مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں — ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

D. I —

... Mills

تشریف لائیے

(AM)

No. 162

...HI-2

Telephone | Office : 3338 | Mills : 2606

غلام محمد اینڈ برادرز، کراچی

...re Road. Karachi and Text Printed at Adbi Press,
...issued from Tolu-e-Islam Office Robeson Road. Karachi.

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مرتب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	محمد یونس	دس آنے (پاکستانی)
غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

جلد ۵	فروری ۱۹۵۲ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ عرصے سے اخباری حلقوں میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ کراچی میں ایک بین الاسلامی علماء کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ پچھلے دنوں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ مجوزہ کانفرنس کا انعقاد فروری میں ہوگا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا محرک کون ہے۔ اس کا انتظام کس کے سپرد ہے۔ اس کے مصارف کا کون کفیل ہوگا۔ اس سے مقصد کیا ہے؟ یہ سب امور پردۂ اخفا میں ہیں۔ ہر بار صرف اس قدر خبر شائع ہوتی ہے کہ مجلس استقبالیہ کے صدر، ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب (وزیر حکومت پاکستان) ہونگے۔ اور بس۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے کچھ چیزیں عجیب رازدارانہ طور سے .... (MYSTERIOUSLY) وجود کوش ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اس سے پہلے بالعموم ہوتا یہ تھا کہ کوئی کانفرنس منعقد ہونے والی ہو تو اس کے متعلق عام اطلاعات نشر کی جاتی تھیں کہ وہ کانفرنس فلاں انجمن، جماعت یا ادارے کی طرف سے منعقد ہوگی۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ ہوں گے۔ پھر اس کے اخراجات کیلئے چندے کی اپیلیں شائع ہوتی تھیں۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین سے رکنیت کی فیس وصول کی جاتی تھی۔ خود کانفرنس کے اجلاس میں چندے کی اپیلیں ہوتی تھیں۔ جہاں دیانت ساتھ نہیں چھوڑتی تھی، کانفرنس کے آمد و خرچ کے حسابات شائع ہوتے تھے۔ غرضیکہ جو کچھ ہوتا تھا کھلے بندوں، دن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ دوسرے کاروبار کی طرح کانفرنسوں کے انعقادات بھی "بلیک مارکیٹ" میں ہوتے ہیں۔ اندر ہی اندر سودا پکا ہو جاتا ہے اور باہر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

پچھلے سال اسی کراچی میں "آل پاکستان علماء" کا ایک اجتماع ہوا جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مختلف فرقوں کے علمائے کرام جمع ہوئے اور انہوں نے دستور پاکستان کے سلسلے میں چند ایک "کلمات طیبہ" ارقام فرما دیئے۔ ان میں سے بعض حضرات ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی پہنچے۔ دوسروں نے ریل کے اعلیٰ درجوں میں سفر کیا۔ اکتیس علماء کی رہائش و خورونوش کے جملہ انتظامات ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس پر ہزاروں روپے صرف ہو گئے ہوں گے۔ لیکن کسی کو آج تک پتہ نہیں چلنے پایا کہ یہ اجتماع کس کی طرف سے ہوا اور کون اس کے اخراجات کا متحمل ہوا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اجتماع کے منتظم ایک مقامی مسجد کے پیش امام تھے۔

اب اس نئی بین المسلمین علماء کانفرنس کے انعقاد کی خبریں افق سے ابھر رہی ہیں اور کسی کو نہیں بتایا جاتا کہ اس مجوزہ ماہ عالم تاب کا مطلع کون سا "چاہ نخشب"* ہے۔ سب سے بڑی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ "بلیک مارکیٹ" علماء کے اجتماعات کے سلسلے ہی میں سامنے

---

* مشہور ہے کہ ابن مقنع نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس کا "معجزہ" یہ تھا کہ اس کے اعلان کے مطابق رات کو آسمان پر پورا چاند نمودار ہو جاتا تھا۔ اس کیلئے اس نے ایک کنوئیں میں کچھ کیمیائی مسالے جمع کر رکھے تھے جن کا عکس آسمان پر پڑتا تھا۔ اس کنوئیں کو چاہ نخشب کہا جاتا تھا۔ نخشب ترکستان کی ایک قدیم بستی کا نام تھا۔

... at Adbi Press, ...

آتی ہے۔ بہرحال چونکہ اس مجوزہ کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں حکومت کے ایک وزیر کا نام بھی منسلک ہے اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کانفرنس کا تعلق ضرور عالمِ بالا سے ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علما حضرات کی اصل پوزیشن کیا ہے اور ان کے اس قسم کے اجتماع سے حاصل کیا ہوگا؟

لفظ "علماء" عالم کی جمع ہے اور عالم کے معنی ہیں صاحبِ علم۔ لہٰذا لغوی معانی کے اعتبار سے ہر وہ شخص جو کسی فن کا علم رکھے، عالم ہے۔ لیکن ہمارے ہاں "علم" کا ایک خاص مفہوم ہے۔ وہ "عالم" ایک خاص اصطلاح۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ایک مضمون (بہ عنوان قرآنی تصورِ مملکت) رسالہ معارف میں شائع ہوا۔ انھوں نے اس میں حضرت طالوت کے تذکرے کے سلسلے میں لکھا کہ قرآن میں ہے کہ اللہ نے انھیں "علم و جسم میں وافر حصہ دیا ہے" جس سے ظاہر ہے کہ مال و دولت یا حسب و نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی اور بہادری بادشاہت کی اولیں ضرورتیں ہیں"۔ مرتبِ معارف (سید سلیمان ندوی صاحب) نے لفظ "سیاست دانی" پر نشان دیکر نیچے نوٹ لکھا کہ "قرآنی اصطلاح میں علم کا مفہوم معرفتِ حق[1] ہے"۔ یعنی انھوں نے فوراً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو متنبہ کر دیا کہ دیکھنا کہیں علم کے مفہوم کو وسعت دیکر سیاستِ مدن اور اشیائے فطرت کے علوم کے ماہرین کو "علماء" کی صف میں لاکر کھڑے کر دینے کے "کفر" کے مرتکب نہ ہو جانا۔ لہٰذا مولوی کے نزدیک علم سے مراد ہیں صرف وہ بوسیدہ کتابیں جو اسے پڑھائی (بلکہ رٹائی) جاتی ہیں اور "علماء" سے مراد ہے وہ طبقہ جو اس خاص "علم" کا ماہر ہوتا ہے۔ اس علم کی حقیقت کیا ہوتی ہے جس کی تحصیل کے بعد یہ حضرت "علمائے کرام" بن بیٹھتے ہیں اور جس کے دائرے کے باہر ان کے نزدیک جہالت ہی جہالت ہوتی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، ایک ایسے "عالم" کی زبان سے سنئے جسے یہ حضرات "سرخیل زمرۂ علماء ہند" قرار دے چکے ہیں۔ یعنی ابوالکلام صاحب آزاد (تذکرے میں) لکھتے ہیں:

> مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ سلسلے برگ و بار و ثمراتِ فساد کو انہی سے ظہور و نمو ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسمِ اصل و اساسِ علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیاوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دین الخالص سے مرکب ہے اور کسقدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت و عجمیت سے؟ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علما علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیرہ ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقبِ شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔ وانّ من العلم جہلاً۔

یہ ہے وہ علم جس کی تکمیل کے بعد ہمارے دینی مدارس میں مولویت کی سند ملتی ہے اور یہ ہے وہ سند جس کی بنا پر امت سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاروبار (حتیٰ کہ نظم و نسقِ حکومت بھی) ان "علماء" کے سپرد کر دے اور ان کی قیادت و سیادت میں فلاحِ دارین تصور کرے۔ آپ ذرا ان درسگاہوں کا نصاب اٹھا کر دیکھئے جنھیں ہمارے دینی مدارس کہا جاتا ہے۔ وہ نصاب نہیں، چند قبریں ہوں گی جن میں ہزار برس کی بوسیدہ اور متعفن ہڈیاں، عقیدت و ارادت کے کفن میں لپٹی ہوئی ملیں گی۔ نہ کہیں ندرتِ فکر، نہ جدتِ افکار کہ ندرت کا نام ان کے ہاں بدعت ہے اور

---

[1] حالانکہ "معرفتِ حق" کا لفظ تک بھی سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی قرآن نے خدا کی معرفت کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کا مطالبہ خدا پر ایمان اور اس کے قانون (قرآن) کی اطاعت کا ہے۔ لیکن ملا بیچارے کو کیا خبر کہ قرآن کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا لکھا ہے۔

کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت کھلی ہوئی گمراہی ہے) یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف اور تو اور، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو بھی کرنا پڑ رہا ہے جو خود انہی قبرستانوں کے متولیوں میں سے ہیں۔ وہ، رسالہ ترجمان القرآن (بابت دسمبر ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء) میں ہندی مسلمانوں کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں[1] سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علوم اوائل تک محدود تھا ہمارے نظام تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرف آخر ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے چڑھائے جائیں۔ انہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنفین اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرسین مشغول رہے۔ کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیق، کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے قریب کی ان صدیوں[1] میں ہمارے ہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔

یہ ہے مبلغ علم ان حضرات کا جنہیں "علمائے کرام" کہہ کر علم و دانش کا منہ چڑایا جاتا ہے اور جنہیں تمام اسلامی ممالک سے یکجا اکٹھا کرنے کی تجویز کراچی میں طے پا رہی ہے۔

یہ تو رہا ان حضرات کا علم۔ اب ذرا ان کے عمل کے متعلق بھی، انہی کے سرخیل (ابوالکلام صاحب آزاد) کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ تذکرہ میں فرماتے ہیں:

> ان کا سرمایہ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔

ہلاکو خاں کے ہاتھوں برپا شدہ قیامت صغریٰ اور اس کے بعد کے نتائج و عواقب کے متعلق لکھا ہے:

> تاتاریوں کو سب سے پہلے دعوت حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی پیکار نے دی تھی۔ نو مسلم حکمران مذہب و علم سے ناآشنا تھے اس لئے مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہائے مذاہب کے ہاتھ آ گئی۔ ہر مذہب کے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پا گئے۔ یہی چیز صدہا مفاسد و مصائب کا باعث ہوئی۔ ایک طرف علمائے دنیا و فقہائے دولت کا ایک گروہ عظیم پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف باہمی تعصب و تفرقہ الگ روز بروز بڑھنے لگے۔ حتیٰ کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی، ان کی بنا پر اب خواص و فقہا ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے۔

جو حالت تاتاریوں کی یورش کے بعد پیدا ہوئی تھی، وہی حالت تشکیل پاکستان کے بعد پیدا ہو رہی ہے۔ اس زمانے کے "نو مسلم حکمرانوں" کی طرح یہاں بھی برسر اقتدار طبقہ "علوم مذہب" سے ناآشنا ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو ان "علماء و فقہاء" کا محتاج سمجھتا ہے اور یہ علماء و فقہاء اس موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ جن مولویوں کو ہندوستان میں کوئی پوچھتا تک نہ تھا، پاکستان میں وہ

---

[1] اس قصے کو سر دست رہنے دیجئے کہ یہ جمود و تعطل قریب کی صدیوں سے ہے یا پہلی صدیوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ طلوع اسلام۔

اس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بایدوشاید۔ یہ کانفرنسیں اور اجتماعات، ارباب اقتدار کے اسی جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) اور علما حضرات کے جذبۂ سلب ونہب (EXPLOITATION) کے مظاہر و غماز ہیں۔ ورنہ جہاں تک امت کی اصلاح و فلاح کا تعلق ہے اس کے متعلق ابوالکلام صاحب آزاد کے ان الفاظ کا دہرا دینا کافی ہے کہ

> آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کسی سچائی کی خاطر کچھ نقصانِ جان ومال اٹھالے اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ لیکن مدعیانِ علم و مشیخیت اور زہد فروشانِ سجادۂ طریقت سے اتنی بھی امید نہیں۔ (تذکرہ)

امت کی خاطر ایثار و قربانی تو ایک طرف، ان کی تو حالت یہ ہے کہ

> خدا کے بندوں کو فریب دیتے دیتے اس طائفۂ بوالہوس کی جرأتیں یہاں تک بڑھ گئی ہیں کہ عالم سرائر والخفایا کو بھی دھوکا دینے میں چست و چالاک ہو گئے ہیں۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔ (تذکرہ)

یہ سب کچھ کیا کس مقصد کے لئے ؟

> شریعت الٰہی جو عدل و صداقت کے قیام کے لئے آئی تھی، اس کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غضب و سلب و نہب کے تمام کاروبار جاری ہوگئے۔ اور دنیا کی تباہی کیلئے اس سے بدتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لیکر اس دنیا میں برائی پھیلائی جائے۔ (ایضاً)

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اس باب میں لکھتے ہیں کہ

> عام طور پر جو حالت طبقۂ متوسط کی تھی وہی علماء کی بھی تھی۔ ان میں بیشتر وظیفہ خوار تھے۔ کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا درباری سے وابستہ ہو جانا۔ اس کے وظیفے کھا کر اس کی منشاء کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیریں کرنا۔ اپنے ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا اور اپنے مخدوموں کی خاطر علمائے حق کو دبانے کے لئے مذہب کے ہتھیار استعمال کرنا ان کا شعار تھا۔ (ترجمان القرآن)

جو کچھ تاریخ میں پہلے ہوا وہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ صرف وظیفوں اور تنخواہوں کی شکلیں بدلی ہیں۔ اصل اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ذرا نگاہ دوڑا کر دیکھئے کہ ہمارے علمائے کرام میں سے کتنے ہیں جن کا ذریعۂ معاش معلوم و مشہود ہے۔[1] یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے بیکاروں کا یہ گروہ ہمیشہ قوم کو آپس میں لڑاتا رہا۔ بقول ابوالکلام صاحب آزاد:

> گذشتہ دور میں جو بلائیں ہمارے سروں پر آئیں اسی جماعت کی بدبختی اور نحوست کی راہ سے آئیں۔ بادشاہوں کو یہی لوگ راہِ راست سے ہٹا کر گمراہ کرتے تھے۔ بیشتر طریقے جو گمراہی کے طریقے ہیں جن لوگوں نے بھی اختیار کئے، انہی لوگوں کی بدولت۔

گذشتہ زمانے میں ان "حضرات" کی نحوست کی راہ سے جو بلائیں امت کے سر پر آئیں، انھیں تو چھوڑیئے۔ ابھی کل تقسیم ہند کی تحریک اور اس کے تعاقب میں ملت اسلامیہ پر کشت و خون، غارت گری و ستم کاری، ہلاکت و بربادی، عزت و ناموس کی تباہی کی جو

---

[1] مودودی صاحب ہمیشہ اپنے اور اپنی جماعت کے اراکین کے لئے استثناء کی راہیں نکال لیتے ہیں۔

قیامت ٹوٹی، اس کی ذمہ دار بھی انہی بدبختوں کی نحوست تھی۔ ساری ملت مطالبۂ پاکستان میں متفق اللسان ایک طرف تھی، اور یہ حضرات علمائے کرام اس کی مخالفت میں ایڑی سے ڈاڑھی تک کا زور لگانے میں دوسری طرف۔ نیشنلسٹ علماء، امت کو متحدہ قومیت کے دامِ ہمرنگِ زمین کے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے، اپنے سامری فن آقایانِ نامدار کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ اسلامی جماعت کے مزاج شناسانِ خدا و رسول، اس تحریک کو یکسر غیر اسلامی قرار دینے اور بانی تحریک (محمد علی جناحؒ) کو ملاحیاں سنانے میں سب سے پیش پیش تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہیں ہندو یہ کہہ کر انگریز کے سامنے پیش کرتا تھا کہ دیکھ لو مطالبۂ پاکستان مسلمانانِ ہند کا متفقہ مطالبہ نہیں۔ انہی کی مشئومہ مساعی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان ملا تو اس طرح کا لولا، لنگڑا ملا اور اس افراتفری میں ملا جس سے ہر ایک کو نفسا نفسی پڑ گئی۔ جناح اِن بدبختوں کی منتیں کرتا رہا کہ اس بچاری قوم کی حالت پر رحم کھاؤ اور اس طرح ان کی ہلاکت سامانیوں کا موجب نہ بنو۔ لیکن یہ اس کے جواب میں اپنی دشنام طرازیوں کی بوچھاڑ کو اور بھی تیز کر دیتے تھے۔ آج وہی "علماء کرام" ہیں جو نہایت ڈھٹائی سے پاکستان کے مائدہ نعمت کے خصوصی اجارہ دار بن رہے ہیں یا بننے کی فکر کر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ "علمائے کرام" جنہیں کبھی کھلے بندوں اور کبھی بلیک مارکیٹ انداز سے یوں سر پر چڑھایا جا رہا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کی کوششوں میں حکومت پاکستان کا ہاتھ ہے اور اگر ہے تو کس قدر۔ لیکن اگر یہ کچھ حکومت کے ایماء سے ہو رہا ہے تو ہمیں نہایت رنج اور تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ مذہب اور ملوکیت (ملا اور اربابِ حکومت) کا وہی دیرینہ سمجھوتا ہے جس کی رو سے، حکومت، اربابِ مذہب کی عیش سامانیوں کی کفیل ہوتی ہے اور اربابِ مذہب، ارکانِ حکومت کی نصرت و حفاظت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ اور عوام بیچارے چکی کے ان دو پاٹوں میں پستے رہتے ہیں۔ ہم کئی بار ان صفحات پر لکھ چکے ہیں (اور نہ معلوم ہمیں ابھی کتنی مرتبہ اس جگر خراش حقیقت کو دہرانا ہے) کہ اگر اہلِ پاکستان نے تاریخ کی یادداشتوں سے عبرت حاصل نہ کی اور مملکت کے اقتدار کا کوئی گوشہ (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اربابِ مذہب کے ہاتھوں میں دیدیا تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پاکستان کی بھی وہی حالت ہو جائے گی جو (مثلاً) آج افغانستان و عراق و حجاز کی ہے جہاں زمامِ اختیارات کا ایک سرا مُلّا کے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھئے۔ مُلّائیت (مذہبی پیشوائیت) کا وجود قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن آیا ہی اس لئے تھا کہ انسانیت کو شخصیت پرستی کے ان اطواق و سلاسل سے آزاد کرائے۔ آپ کو عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں کسی مولوی کا نام تک دکھائی نہیں دیگا۔ تاریخ کے صفحات، علامہ ابوبکر صدیقؓ، مولانا عمر فاروقؓ اور مولوی عثمان غنیؓ کے سے اندازِ تخاطب و تعارف سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ یہ گروہ اس وقت کی پیداوار ہے جب یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے اقنوم ثلاثہ، اسلام سے اپنی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے بھیس بدل کر مسلمانوں میں آگھسے اور انھوں نے پھر سے مذہبی پیشوائیت کی اس لعنت کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا جسے قرآن نے اس طرح دور کیا تھا۔ یہ گروہ اس وقت سے آج تک شجر ملت پر اکاس بیل بن کر مسلط ہے جس سے درخت تو جڑوں تک سے سوکھ چکا ہے لیکن اکاس بیل ہری بھری، پھلتی چلی جا رہی ہے۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کو جن کے پاس (خود ان کی اپنی شہادتوں کی رو سے جن کے حوالے اوپر دیئے جا چکے ہیں) نہ علم ہے نہ عمل، اسقدر اہمیت کیوں دی جا رہی ہے؟

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟

بالآخر کوئی وقت تو ایسا آنا چاہئے جب امت بیچاری کو اس عذاب سے نجات مل سکے۔

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے   آخر گناہگار ہے، کافر نہیں ہے یہ

لیکن اس تمام ہنگامے سے ایک چیز ایسی بھی ہے جو ہمارے لئے قدرے تسلی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کسی ایک مرکز یا نقطہ پر جمع ہونا ان کی "فطرت" کے خلاف ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان کا وجود ہی تشتت وانتشار اور تحزب وتفرق کا رہین منت ہے۔ اس لئے انہیں ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش خود ان کی تباہی اور رسوائی کا موجب بن جائے گی۔ اس چار سال میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کوئی ایک مسئلہ نہیں جس پر یہ لوگ عملاً متفق ہوگئے ہوں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (بار دیگر) ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں:

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہوجائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہوگئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہوسکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچکر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں کرسکتے۔۔۔۔۔ فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھکر بھی متحد ویک دل نہیں ہوسکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار والفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے[1]۔ (تذکرہ ص ۸۴-۸۳)

ہم منتظر ہیں کہ مجوزہ کانفرنس انعقاد پذیر ہوجائے تو دیکھیں کہ ـــــ اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

(۲)

آخری کاپی پریس میں جارہی تھی کہ البیان (لاہور) کی تازہ اشاعت سے ایک ایسی جگر پاش اطلاع ملی جسے لکھتے وقت دل کا خون آنکھوں میں آرہا ہے۔ قارئین کچھ عرصے سے "احباب لاہور" کا تذکرہ ان صفحات میں دیکھتے آرہے ہیں۔ یہ وہ احباب ہیں جو طلوع اسلام کے پیش کردہ فکر ومسلک کی نشر واشاعت میں بڑے جذب وانہماک سے کام لے رہے ہیں اور جس قرآنی نہج زندگی کو انھوں نے حق

---

[1] خود اپنے گروہ کے خلاف اس قسم کی دشنام طرازی بھی اسی گروہ کے ایک فرد سے ممکن تھی۔ "غیر مولوی" اس تندی وتیزی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ ان لوگوں کی باہمی گالیوں کے تماشے دیکھنے ہوں تو ان کے مناظروں اور مباحثوں کے تذکرے تاریخ کی کتابوں میں پڑھئے۔ (طلوع اسلام)

سمجھا ہے اسے اوروں تک پہنچانے میں مصروفِ سعی و عمل ہیں۔ اس حلقۂ احباب کے ایک نہایت مخلص اور گرم جوش رکن میرزا خدابخش (کے۔ بی۔ مرزا) تھے۔ خبر ملی ہے کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی پرورش و تربیت ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں "حسبنا کتاب اللہ" کی روح پرور صدائیں آج سے بہت پہلے سے فضا میں گونج رہی تھیں۔ انہی آوازوں کا اثر تھا کہ مرزائے مرحوم خالص قرآنی ذوق لیکر پروان چڑھے اور اپنی زندگی کی فرصت کے تمام لمحات کو اسی ذوق کے عام کرنے میں صرف کر دیا۔ کیسا نورانی ہے یہ ذوق اور کس قدر مبارک ہے یہ زندگی! ہم اس حادثۂ جانکاہ میں مرحوم کے متعلقین کے شریکِ غم ہیں اور قرآنی سفرِ زندگی میں ان کے رفقائے کار کی اس حرماں نصیبی پر ہم اندوہ، اور اس دعا میں ان کے ہم نوا کہ

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

---

(۳)

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا، اس پرچے میں محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز و حقیقت کشا مقالہ "اسباب زوال امت" ان کی نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مقالہ کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ سابقہ اشاعت کے اعلان کے بعد اس پرچے کی زائد کاپیوں کی فرمائشیں آنی شروع ہو گئیں حتیٰ کہ ایک صاحب نے دو سو کاپیوں کی قیمت پہلے ہی ادا کر دی۔ چنانچہ اندازہ یہ ہے کہ اس پرچے کی جسقدر زائد کاپیاں چھپوائی گئی ہیں وہ بھی جلد ہی نکل جائیں گی۔ لہذا اگر آپ اس مقالہ کی عام اشاعت چاہتے ہیں تو اپنے لئے زائد کاپیاں جلدی منگا لیجئے۔ ورنہ بعد میں یہ پرچہ بھی (حسب سابق) ختم ہو جائیگا۔ اس مقالے میں ایسی بنیادی حقیقتیں پیش کی گئی ہیں جن سے ہر سوچنے والے کے قلب و نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم محترم پرویز صاحب کے دیگر اہم مضامین کو بھی اسی طرح وقتاً فوقتاً دوبارہ شائع کرتے رہیں کہ

این مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

ذرا ہنس لیجئے | یوں تو کتابت کی غلطیاں عام طور پر دلچسپ ہوتی ہیں لیکن طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ایک غلطی بہت ہی پرلطف ہے۔ میر انیس کی رباعی کا یہ مصرع ـــ رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے ـــ اس طرح چھپا ہے

رخصت سے پھر آ کے منہ دکھایا ہے تجھے

کیوں؟ ہے نا پُرلطف!

محترم اسد صاحب فرماتے ہیں کہ "ملا کا بہشت" کے عنوان میں علامہ اقبال کے اس مصرع ـــ بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش ـــ میں جو تصرف کیا گیا ہے ـــ بگو عجمی مسلماں را کہ خوش باش ـــ اس میں لفظ "عجمی" نے مصرع میں کسی قدر جھول پیدا کر دی ہے۔ بالکل درست ہے۔ لیکن اس ایک مصرع پر ہی کیا موقوف ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا گوشہ ہے جس میں عجمیت نے جھول نہیں پیدا کی؟

اسبابِ زوالِ اُمت

پرویز

چہ گویمت کہ چہ بودی، چہ کردۂ، چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازیٔ محمود
تو آں نۂ کہ مصلےٰ ز کہکشاں می کرد
شراب صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود

[محترم پرویز صاحب کا یہ اہم مقالہ طلوع اسلام بابت جنوری فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اب احباب کے تقاضوں کے پیش نظر اسے، صاحب مقالہ کی نظر ثانی کے بعد، دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔

جو احباب اسے اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں ان کے لئے اس کا دوبارہ پڑھنا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ صاحب مقالہ نے اس میں بہت سے مجمل مقامات کی توضیح کی ہے اور کئی ایک حواشی کا اضافہ بھی۔

جن احباب نے اس مقالہ کو اس سے پہلے نہیں پڑھا ان سے گزارش ہے کہ وہ اسے ایک عام مضمون سمجھکر سرسری طور پر نہ پڑھ جائیں۔ یہ مقالہ درحقیقت ہماری سیزدہ سالہ تاریخ پر قرآن کی روشنی میں، نہایت عمیق تبصرہ ہے جس میں ملت کے زوال کے اسباب کی تشخیص بڑے غور و فکر سے کی گئی ہے اور اس کے بعد علاج کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے جو ان کے مدت العمر کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس مضمون کا ایک ایک فقرہ بڑے غور و فکر کا محتاج ہے۔ طلوع اسلام]

طلوع اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۹ء میں "ایک اہم سوال" کے عنوان سے ایک ایسی بحث کا آغاز کیا جس کی اہمیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ سوال مختصر الفاظ میں یہ تھا کہ دنیا میں مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان کی حالت پست و زبوں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ اس کے بعد طلوع اسلام نے یہ لکھا تھا کہ

اب آپ سوچئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصر، حالات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوام عالم کے مقابل میں مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا باعث ان کا مذہب ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اس کے بعد طلوع اسلام نے تمام ارباب فکر و نظر کو دعوت دی تھی کہ وہ وقت کے اس اہم سوال پر غور کریں اور اپنے نتائج فکر و تدبر سے طلوع اسلام کو مطلع فرمائیں تاکہ انہیں طلوع اسلام میں شائع کر کے کسی آخری نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں مختلف گوشوں سے جو کچھ طلوع اسلام میں شائع ہوتا رہا میں بغائر اس کا مطالعہ کرتا رہا کہ سوال زیر غور وہ تھا جس نے خود مجھے ایک عرصے سے طلسم پیچ و تاب بنا رکھا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کسی صاحبِ فکر کی طرف سے اس کا کھلا کھلا جواب میرے سامنے آسکے۔ طلوع اسلام میں اس

ضمن میں جو کچھ اس وقت تک شائع ہوا ہے اس کا بیشتر حصہ تو اسی انداز کا تھا کہ چونکہ مسلمانوں نے اپنا مذہب چھوڑ رکھا ہے اسلئے ان کی حالت اس قدر پست و ذلیل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کے جواب کے متعلق طلوع اسلام نے شروع ہی میں لکھ دیا تھا کہ

یہ جواب حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے تو غیر مسلم اقوام مغرب نے مذہب کو کب سے بالائے طاق رکھا ہے۔ انہوں نے اس سے بھی پہلے اور ان سے کہیں شدید تر انداز سے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس لئے اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام دنیا کے ہر گوشے میں کمزور اور ذلیل ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنہوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا ان کی حالت کونسی اچھی ہے؟

اس دوران میں اکثر حضرات نے براہِ راست مجھ سے اور بعض نے طلوع اسلام کی وساطت سے پوچھا کہ میں اس باب میں کیوں خاموش ہوں؟ استفسارات نے تقاضے اور تقاضوں نے اصرار و تکرار کی صورت اختیار کی۔ میں ان تقاضوں کے جواب میں بھی خاموش تھا اور جب بعض احباب کا اصرار لب کشائی پر مجبور ہی کر دیتا تھا تو اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا تھا کہ

داستانِ اومپرس از من کہ من | چوں بگویم آنچہ نباید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ | ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ

یہ نہیں کہ اس سوال کے جواب میں میرے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، یہ سوال ایک عرصے سے خود میرے سامنے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی سوال پر کیا منحصر ہے۔ میری تو تمام عمر اسی اجمال کی تفصیل ہے کہ

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

لیکن اس سوال کے جواب میں جو دشواری میرے گلوگیر ہو رہی تھی وہ یہ خیال تھا کہ میری بصیرتِ قرآنی نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے مسلمان اسے سننے کے لئے ابھی تیار نہیں۔ حضرت علامہ نے کہا تھا کہ

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

فرنگ ان کی نواؤں کی تاب لا سکا یا نہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہنوز مسلمان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان نواؤں کی تاب لا سکے جو اس کی صحیح تصویر کو قرآن کے آئینہ میں بے نقاب دیکھ کر ایک قلب حساس سے فغاں بن کر اٹھتی ہیں اور فضا کے سینے کو چیر کر آسمان سے جا ٹکراتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے بڑی الم انگیز اور حدیث ہے بڑی جگر خراش کہ مسلمان اپنی اصلی تصویر دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینہ میں اپنی بھیانک شکل دیکھ کر آئینہ توڑ ڈالا تھا، ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتا ہے جو اسے اس کے حقیقی خط و خال سے آگاہ کرتا ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے، دلّی میں ایک بڈھے باپ کا اکلوتا جوان بیٹا فوت ہو گیا۔ فرطِ غم نے باپ کو پاگل کر دیا۔ وہ رات کو اٹھا اور بیٹے کی لاش کو قبر سے نکال لایا۔ وہ لاش کو سینے سے لگائے پھر رہا تھا۔ جو شخص لاش کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھتا وہ اسے چاقو دکھاتا اور جو اس لاش کو مردہ کہتا وہ اسے پتھر مارتا۔ مسلمان نے بھی چند تصورات و رسوم کی لاشوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ جو شخص ان لاشوں کو اس سے الگ کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے وہ اسے چاقو دکھاتا ہے اور جو انہیں مردہ کہتا ہے وہ اسے پتھر مارتا ہے۔ میں نے عمر بھر اس کی کوشش کی ہے کہ جس انداز سے قرآن کی روشنی نے یہ حقیقت مجھ پر بے نقاب کی ہے کہ جس جسدِ بے جان کو مسلمان محبوب جاں نواز سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے وہ ایک لاش سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی انداز سے یہ حقیقت دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دوں۔ اس لئے مجھے طلوع اسلام کے پیش کردہ سوال کے متعلق بھی اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں کچھ عرض کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سوال ایسا تھا کہ جس بات تک میں مسلمانوں کو آہستہ آہستہ

بتدریج پہنچانا چاہتا تھا، یا ایک ہی جست میں انھیں اس منزل کے سامنے لاکھڑا کرنا چاہتا تھا اس لئے میں اس باب میں لب کشائی کیلئے متامل تھا اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں ایک طرف میرا یہ مسلک تدریج و امہال، مزید تربص انتظار، ضبط و انضباط کا متقاضی تھا اور قدم قدم پہ یہ کہہ کر عناں گیر ہو رہا تھا کہ

غمِ دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد

وہاں دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ جب میں عام طور پر ان جوابات کو دیکھتا جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو رہے تھے تو اس احساس سے کہ

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجا ست عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجا ست؟

بزیرِ خرقۂ پیراں سبوچہ ہا خالی است فغاں کہ کس نشناسد مئے جوانہ کجا ست؟

میری بیتابی تمنا، تدریج و امہال کی "مصلحت کوشیوں" کو بالائے طاق رکھ دینے کے لئے کوندے کی طرح لپکتی تھی اور میں اس کے لئے تیار ہو جاتا تھا کہ جو بات آخر میں جاکر کہنی ہے اسے آج ہی کیوں نہ کہدوں کہ بالآخر

از سینہ تا بچند برآرم فرو برم
ایں نیم قطرہ خوں کہ زمژگاں چکیدنی است

میں اسی کشمکش میں تھا کہ بعض قریب ترین احباب (اور ادارۂ طلوعِ اسلام) کا تقاضا اس نقطہ تک آپہنچا کہ جہاں — بیا کہ من سپر انداختم — کے سوا کچھ اور چارہ نہیں رہا کرتا۔ یہ ہے اس محفلِ شوق میں میرے سب سے آخر میں پہنچنے کی داستانِ جبر و اختیار یعنی

ایں آہِ جگر سوزے در خلوتِ صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

اس مقام پر میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں آئندہ سطور میں پیش کروں گا، آپ اس سے متفق ہوں یا نہ لیکن اتنا ضرور کیجئے کہ میری گزارشات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور انھیں محض جذبات کی شعلہ فشانیوں کی نذر نہ کر دیجئے اور دوسرے یہ کہ ان پر نگاہِ تعمق غور کیجئے کہ ان میں بہت سی باتیں شاید آپ کے سامنے پہلی مرتبہ آئیں اور ان پامال راہوں سے کچھ الگ راستے دکھائیں جن پر ہم آنکھیں بند کر کے چلنے کے خوگر ہو رہے ہیں۔

اور اگر آپ میری تشخیص سے متفق ہوں تو پھر سوچئے کہ اس مزمن مرض کے لئے قرآن نے جو علاج تجویز کیا ہے اسے کس طرح بلا مزید توقف و تربص عملاً شروع کر دیا جائے۔

انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا۔ (۳۴/۴۶)

میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم دو دو ایک ایک کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور پھر غور کرو (کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے اس پر کس طرح عمل کیا جائے)

سوال زیر غور کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ ایک ایسی صداقت ہے جسے بطور ایک حقیقت ثابتہ کے، ہر جگہ بلا شک و شبہ تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے اس دعوے کے اثبات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ابھی اگلے دنوں (شروع دسمبر ۱۹۵۵ء میں) کراچی میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک

کانفرنس (بین الملی اسلامی اقتصادی مؤتمر) کا انعقاد ہوا جس میں تمام اسلامی ممالک (یعنی مسلمانوں کی سلطنتوں) کے نمائندے جمع تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے محترم غلام محمد صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں ان اقدار و عناصر کو ایک ایک کر کے گنایا جو دنیا کے مسلمانوں میں (جن کے نمائندے اس مؤتمر میں شریک تھے) مشترک تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہا:

> چوتھا عنصر جو ہم میں بطور قدر مشترک موجود ہے، کچھ خوش آئند نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم سب پست اقوام ہیں اور ترقی میں پس ماندہ۔ مغرب کے مقابلہ میں، جو صنعت و حرفت میں بڑا ترقی یافتہ ہے۔ ہم نااہل ہیں اور ہمارا معیار زیست بڑا پست ہے بعض اوقات تاسف انگیز حد تک پست۔ اور پانچواں عنصر جو اس سے بھی زیادہ ہماری بدبختی کا آئینہ دار ہے، یہ ہے کہ اگرچہ ہم سیاسی طور پر کم و بیش آزاد ہیں، اقتصادی طور پر ہم مغربی اقوام کے پنجۂ آہنی کی گرفت میں ہیں ...... اور اس سے تو آپ متفق ہوں گے کہ دوسروں کے مفاد، فیصلوں اور قوت کے سامنے اقتصادی زیردستی، آزادی نہیں، آزادی کے فریب اور نقاب میں چھپی ہوئی غلامی ہے۔ اس لئے ہم سب نہ ابھی کامل طور پر آزاد ہی ہیں اور نہ ہی اپنے گھروں کے آپ مالک۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس دعوے کے اثبات کے لئے جس کا ذکر اوپر ہو رہا تھا، اس سے زیادہ کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ اور یوں بھی وہ کونسا دن ہے اور کونسی تقریب، جس میں چار مسلمان اکٹھے ہوں اور اپنی زبوں حالی کی مرثیہ خوانی کرتے دکھائی نہ دیں۔ اپنی حالت پر ماتم یہ تو ہماری زندگی کا معمول ہو رہا ہے۔ یہ اور بات ہو کہ یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ ہمارا ایسا حال کیوں ہو گیا ہے اور اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟

عزت و ذلت کسے کہتے ہیں

اب ایک امر تنقیح طلب اور ہے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ مسلمان، قوت و ثروت، دولت و حشمت، صنعت و حرفت اور سیاست و مملکت میں غیر مسلموں سے پیچھے اور ان کا آستاں افتادہ ہے۔ اسے ہم نے ان کی نکبت و ذلت سے تعبیر کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عزت اور ذلت کا یہ معیار ہی غلط ہے یعنی جن عناصر کا نام تم نے عزت رکھ چھوڑا ہے، اسلام انھیں وجۂ عزت قرار ہی نہیں دیتا۔ لہٰذا جب عزت و ذلت کا معیار ہی غلط ہے تو اس معیار پر مسلمانوں کی حالت کو پرکھنا اور اس پر پورا نہ اترنے پر انھیں پست و ذلیل قرار دینا کب صحیح قرار پا سکتا ہے؟ چنانچہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس اعتراض کا جواب ہی یہ دیا جاتا ہے کہ "عزت سب خدا کے لئے ہے" اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ صاحب عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم) اور پرہیزگار (متقی) وہ ہے جو دنیا کی آلودگیوں اور خباثتوں سے مجتنب رہے۔ دنیا کا مال و دولت فتنہ ہے۔ انسان جتنا اس فتنے سے دور رہے اتنا ہی خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باخدا وہ ہے جو سب سے زیادہ دنیا سے کنارہ کش ہو۔ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ مومن دنیا میں اس طرح رہتا ہے جس طرح جیل خانہ میں قیدی۔ دنیاوی زیبائش و آرائش اور تحسین و تزئین حرام ہے اور لذائذ و حظائظ مکروہات۔ دولت و قوت، فرعونیت کی علامتیں ہیں اور غلبہ و تسلط ابلیسیت کی سرکشی۔ لہٰذا جب یہ مفروضہ ہی غلط ہے (کہ مسلمان ذلیل و خوار ہے) تو اس پر قائم کردہ عمارت بھی از بنیاد تا بام غلط۔

اس موضوع پر میں، اس سے پہلے اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اب کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن چونکہ دنیا اور اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لئے یہ باطل تصور "مذہب" کا پیدا کردہ ہے اور "دین" کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے اس لئے اس کے بعض گوشوں کے متعلق کچھ مختصراً عرض کرنا ناگزیر ہے۔

انسان دنیا میں رہتا ہے اور ان قوانین طبیعی کے مطابق جو ہر ذی حیات کے لئے جاری و ساری ہیں، اسے زندہ رہنے کے لئے متاعِ دنیا سے متمتع ہونا ناگزیر ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، دیگر ضروریاتِ زندگی ہر جینے والے کے لئے ضروری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سامانِ زیست

کا محتاجوں اور بھکاریوں کی طرح ملنا سزاوارِ انسانیت ہے یا عزت و تکریم سے حاصل ہونا تقاضائے آدمیت. ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے صحیح جواب کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے نہ ارسطو کی عقل کی۔ ہر ذی شعور انسان، بشرطیکہ اس کی عقل پر کورانہ تقلید کے پردے نہ پڑ چکے ہوں اور وہ خود سوچنے کی صلاحیت کھو نہ بیٹھا ہو۔ بلاتامل کہہ دے گا کہ ذلت و رسوائی کی روٹی کے مقابلہ میں عزت و آبرو کا رزق ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس عزت و آبرو کی روٹی کو قرآن "رزق کریم" کہتا ہے اور اسے سچے مومنوں کا حق قرار دیتا ہے۔

والذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اٰووا نصروا اولٰئک ھم المومنون حقا، لھم مغفرۃ ورزق کریم (۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) پناہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ ہیں جو سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے حفاظت کا سامان اور عزت کی روٹی ہے۔

اس کے مقابلہ میں قرآن دوسرے گروہ کا ذکر کرتا ہے (جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) جو اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لھم فی الدنیا خزیٌ (۲/۱۱۴) "ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے"۔ ذلۃٌ فی الحیاۃ الدنیا (۷/۱۵۲) "ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت ہے"۔ وہ دنیا میں سخت عذاب کے دن گزارتے ہیں۔ عذابا الیما فی الدنیا (۹/۷۴) "ان کے لئے دنیا میں المناک سزا ہے"۔ یہ سزا بھوک اور خوف کا عذاب ہے۔ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف (۱۶/۱۱۲) "اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا"۔ یعنی اس دنیا میں سامانِ زیست کا میسر نہ آنا۔ یا میسر آنا تو اس ذلت و خواری سے میسر آنا جس میں ہر وقت بالادست قوتوں کا خوف سر پر سوار رہے، قرآن کی رو سے خدا کا عذاب ہے۔ اس کے برعکس طیب اور خوش گوار زندگی کہ جسے خدا کا انعام کہا گیا ہے وہ ہے جس میں ذلت و خواری نہ ہو۔ ولا یرھق وجوھھم قتر ولا ذلۃ (۱۰/۲۶) "نہ ان کے لئے روسیاہی ہوگی نہ ذلت و خواری"۔ جنتِ آدم کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لا تجوع فیھا ولا تعریٰ وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحیٰ (۲۰/۱۱۸) اس میں نہ بھوک ہے نہ برہنگی۔ نہ پیاس ہے نہ دھوپ، یعنی خوراک، لباس، مکان سب کچھ میسر ہے اور عزت کے ساتھ میسر۔

زت کی روٹی کیسے ملتی ہے؟

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دنیا میں عزت کی زندگی جس میں سامانِ زیست کی فراوانی ہو اور اس کے لئے کسی بالادست قوت کا خوف دامنگیر نہ ہو، انسانیت کے شایانِ شان زندگی ہے۔ بھوک اور خوف کی زندگی، خدا کا عذاب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں سامانِ زیست اور قوت و ثروت جس سے دوسروں کا خوف باقی نہیں رہتا، حاصل کس طرح سے ہوتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کائنات، طبیعیات کے قانون (Physical Laws) کے مطابق چل رہی ہے اس لئے طبیعی زندگی کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کیلئے طبیعیات کے قانون کی اتباع کرنی ہوگی۔ اس میدان میں ہر انسان برابر ہے۔ مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب دونوں کی طبیعی زندگی ایک ہی قانون کے مطابق چل رہی ہے تو اسبابِ زندگی کے حصول کے لئے قوانین بھی ایک ہی ہوں گے جس طرح ایک غیر مسلم سانس لیکر زندہ رہتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے لئے بھی ہوا وجہ زیست ہے۔ جس طرح وہ غذا کا محتاج ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ سنکھیا کا اثر دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ جب ایک یہودیہ نے رسول اللہؐ کے کھانے میں زہر ملایا تھا تو اس زہر کا اثر حضورؐ کے جسم پر اسی طرح ہوا جس طرح کسی اور دوسرے انسان کے جسم پر ہوتا ہے۔ لہٰذا متاعِ حیات اور سامانِ زندگی کے حصول کے لئے ہر انسان کے لئے یکساں قانون ہیں۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب خدا نے کہا ہے کہ وسخر لکم ما فی السماوات والارض (پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے)۔

تو اس کا مخاطب انسان ہے صرف مسلمان نہیں۔ جو تسخیرِ فطرت کے لئے جدوجہد کرے گا، فطرت اپنے چھپے ہوئے خزانے اس کے حوالے کر دیگی۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز نہیں ہوگی۔ خدا نے آدمی کو "خلیفہ فی الارض"[1] کہا ہے اور آدمی ہی کو علم الاسماء (علم اشیائے فطرت) دیا ہے۔ لہذا جو بھی اس علم سے فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا لے۔ فطرت اس باب میں نہ کسی سے بخل کرے گی نہ کسی کی رعایت۔ اس کے لئے اس ضمن میں مسلم و غیر مسلم، مومن و کافر سب برابر ہیں۔ مومن و کافر کا فرق متاعِ فطرت کے استعمال میں جا کر ہوگا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔ تسخیرِ فطرت کی جدوجہد کے نتائج میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ دیکھئے قرآن کس قدر وضاحت سے کہتا ہے کہ

من کان یرید الحیاۃ الدنیا وزینتھا نوف الیھم اعمالھم وھم فیھا لا یبخسون (۱۱/۱۵)

جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے ہم اس کی جدوجہد کا پورا پورا ماحصل اسے دنیا میں دیدیتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

تنقیحاتِ بالا سے حسبِ ذیل نتائج ہمارے سامنے آگئے۔

(۱) دنیاوی زندگی میں سامانِ زیست کی فراوانی اور بے خوفی ہی شایانِ شانِ انسانیت ہے۔

(۲) سامانِ زیست تسخیرِ فطرت سے ملتا ہے۔

(۳) فطرت کے ذخائر ہر اس شخص اور قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں جو ان کے لئے جدوجہد کرے اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

(۴) جو تسخیرِ فطرت میں جدوجہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۵) اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے حصول میں دوسروں کی محتاجی، لعنت اور ذلت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے۔

دنیا اور آخرت کا مفہوم

اب آگے بڑھیئے۔ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جن میں "دنیاوی متاع" کو حقیر کہا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں "آخرت" کو عزیز و پائدار۔ یہی وہ آیات ہیں جن سے "مذہب" نے سہارا پکڑا اور دنیائے ناثبات کی تمام متاعِ حقیر و ذلیل کو کفار کا حصہ بنا دیا۔ اور آخرت اپنے پیاروں کے لئے مخصوص کرلی۔ لہذا قرآن کے ان مقامات کا صحیح طور پر سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ اس میں ایک ایسی بات سامنے آئیگی جو بہت سوں کے لئے شاید بالکل نئی ہو۔ لہذا یہ مقام ذرا گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔

---

[1] قرآن نے آدم کو خلیفہ فی الارض کہا ہے لیکن ہم نے اسے خلیفۃ اللہ فی الارض سمجھ لیا (یعنی زمین میں خدا کا نائب) جب اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ کیا فرعون و نمرود بھی خلیفۃ اللہ ہو سکتے ہیں تو پھر اس "خلافتِ الٰہیہ" کو مومنین کے لئے مخصوص کر دیا۔ حالانکہ قرآن نے آدم کو کہیں خلیفۃ اللہ فی الارض نہیں کہا۔ خلیفہ کے معنی کسی کے پیچھے آنے والا (SUCCESSOR) "جانشین" کے ہیں۔ زمین میں آدمی سے پہلے جو نوع آباد تھی، آدمی اس نوع کا جانشین ہے۔ یعنی اس کی جگہ اب یہ آباد ہے۔ یہ ہے مفہوم [illegible] الارض کا۔ یعنی زمین میں انواعِ سابقہ کا جانشین۔ نہ کہ اللہ کا نائب۔ اسی آدمی کو اللہ نے علم اسماء فطرت دیا تھا جو اس سے پہلی آبادی کو حاصل نہیں تھا۔ وہ [illegible] ارتقا میں اس سے پیچھے تھیں۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ یہ تمیز آگے چل کر آتی ہے جہاں ماحصلِ تسخیرِ فطرت کے استعمال کا سوال آتا ہے۔

خدا کی نیابت کا تصور اس لئے بھی غلط ہے کہ نیابت (TO REPRESENT) ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ اللہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اس لئے اس کی نیابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن، انسان کی پیدائش سے لیکر اس کی طبیعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہے اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے کو حیاتِ اخروی سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن (اور یہ لیکن بہت اہم ہے) دنیا اور آخرت کے الفاظ سے قرآن کا فقط یہی مفہوم نہیں۔ وہ ان الفاظ کو کچھ اور معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے اور جب تک ان قرآنی اصطلاحات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے قرآن کا منشاء اور منطوق سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن فہمی کی راہ میں یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے سے وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو گئے جو آج ہمارے لئے اس درجہ وجۂ پریشانی قلب و نظر بن رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود، ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہی نہیں کہ ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے بلکہ بعض اوقات قرآنی مفہوم میں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے اور انسان، قرآنی آیات کو (معاذ اللہ) چیستاں سمجھنے لگ جاتا ہے۔ لہذا قرآن فہمی کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کی ان اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس کے بعد ان اصطلاحی معنوں سے بات بالکل صاف ہو جائے گی۔ ان اصطلاحاتِ قرآنیہ میں "دنیا" اور "آخرت" کی اصطلاحات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان اصطلاحات تک پہنچنے سے پہلے، ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ حیات بعد الممات کا عقیدہ صحیح نہیں۔ حیات بعد الممات تو ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا قرآن میں جہاں آخرت سے مراد حیات بعد الممات ہے، وہاں اس سے فی الحقیقت حیات بعد الممات مراد ہے۔ ہم فقط اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن نے دنیا اور آخرت کے الفاظ کو صرف اسی مفہوم کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اصطلاحی طور پر ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اور اس وقت ہمارے سامنے انہی اصطلاحی معانی کی وضاحت ہے۔

• دنیا کے لفظی معنی ہیں "قریبی" اور "آخرت" کے معنی ہیں "بعد میں آنے والا"۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں (انسان یا انسانوں کے گروہ، اقوام)۔ ایک وہ جو ہمیشہ پیش پا افتادہ، قریبی مفاد (IMMEDIATE GAIN) کے پیچھے لپکتے ہیں۔ ان کی تمام تگ و تاز مفاد عاجلہ کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنا آپ ہوتا ہے۔ انھیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ بعد میں آنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ فقط اپنے عیش و آرام کو سوچتے ہیں۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ آنے والی نسلوں پر کیا گزرے گی۔ ان کی ساری جدوجہد "حال" کے لئے ہوتی ہے۔ "مستقبل" کی انھیں کچھ فکر نہیں ہوتی۔ قرآن ان پیش پا افتادہ، قریبی، مفادِ عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہذا اس کے نزدیک "متاعِ دنیا" سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے۔ اور "سامانِ آخرت" سے مقصود ہوتا ہے وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لئے تیار کرتا ہے (قرآن کی رو سے اس باب میں نسل سے مراد کسی انسان یا خاندان کی اپنی ذریت نہیں بلکہ آنے والی پوری انسانیت ہے)۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) مفاد عاجلہ (صرف اپنے حال کی خوشگواری) کے لئے کوشش کرتا ہے اس کا حال تو خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن اس کا مستقبل (آخرت) روشن نہیں ہوتا۔ لیکن انسانیت کی صحیح زندگی یہ ہے کہ انسانی کوششیں صرف حال کی خوشگواری میں ہی صرف نہ ہو جائیں بلکہ آنے والی انسانیت (یعنی مستقبل) کی خوشگواری کے لئے بھی جدوجہد کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ پیش پا افتادہ مفاد (متاعِ دنیا) بڑی کشش و جاذبیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کی درخشندگی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے عیش و آرام کی زندگی ملتی ہے۔ اس میں محنت بہت کم کرنی پڑتی ہے اور اس کے نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس نظریہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے والی اقوام کی نسلوں کا مستقبل، تیرہ و تاریک ہو جاتا ہے۔ لہذا اس قوم کا "آخرت" میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ پیش پا افتادہ مفاد بالکل ابھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لہذا مستقبل کے مفاد کے لئے وہی کوشش کرے گا جسے اس کوشش کے ان دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔ اسے قرآن "ایمان بالغیب" کہتا ہے۔ یعنی "ان دیکھے نتائج پر

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں۔ ان کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے۔ یہی ان کی متاع ہے۔ ان میں سے ایک جاتا ہے اور زمین میں ہل جوت کر اپنی اس متاعِ حیات کو "مٹی میں ملا آتا ہے"۔ دوسرا اس پر ہنستا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا کر گھر لے آتا ہے۔ اول الذکر کو مکی اور باجرہ کی روٹیوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات فاقے بھی کاٹنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے کسان کے بچے مزے سے گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اس کسان کو "دنیا کی" (قریبی) خوش حالی نصیب ہو گئی۔ لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مستقبل اُس دوسرے کسان ہی کا روشن ہوگا جس کے گھر ایک ایک دانہ، سات سات سو دانوں کے خوشے اور کھلیان بن کر آئے گا۔ بیج کو فصل بننے تک کا عرصہ تو اسے محنت اور مشقت سے گزارنا ہوگا، لیکن اس کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جائے گا کہ اس کا حال (دنیا) بھی خوشگوار ہوگا اور مستقبل (آخرت) بھی روشن۔ لیکن اس کے لئے شرطِ اولیں اس کسان کیلئے اس حقیقت پر ایمان ہے کہ جس نے جو دانہ مٹی میں ملا دیا ہے وہ ضائع نہیں جائے گا۔ کائنات میں ایک اٹل قانون جاری و ساری ہے جو اس دانہ کو کونپل میں تبدیل کرے گا۔ کونپل ڈنٹھل بنے گی، ڈنٹھل میں خوشہ آئے گا اور خوشہ جھولیاں بھر بھر کر اناج دیدے گا۔ اسے اپنی محنت اور کائنات کے اس اٹل قانون کے نتائج پر یقینِ محکم ہونا چاہئے۔ اگر اس پر یقین نہیں ہے تو یہ کبھی اپنے دانے مٹی میں نہیں ملائے گا۔ یہ بھی دوسرے کسان کی طرح انھیں پسوا کر گھر لے آئے گا۔ کائنات کا یہ قانون، جو دانہ کو خوشہ میں تبدیل کرتا ہے، سنۃ اللہ (قانونِ خداوندی) کہلاتا ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (لا تبدیل لسنۃ اللہ) اس کا اٹل اور غیر متبدل ہونا ہی اس پر ایمان کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کسان کو اس کا یقین نہ ہو کہ دانہ، خوشہ ضرور بن جائے گا۔ تو وہ اپنے دانوں کو مٹی میں ملانے کا خطرہ (RISK) بمشکل مول لیگا۔ اسے قرنہا قرن کے تجربے[1] نے بتا دیا ہے کہ فطرت کے اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ جب دانے کو ایک خاص قاعدے کے مطابق مٹی میں ملا دیا جائے تو وہ خوشہ میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اب یہ دوسری شرط سامنے آئے گی یعنی دانہ کو ایک خاص قاعدہ اور اصول کے مطابق مٹی میں ملایا جائے اور اس کے بعد وقت پر سے پانی پہنچایا جائے۔ اس پروگرام میں دیکھئے بیک وقت دو کوششیں مصروفِ عمل ہیں۔ ایک فطرت کا غیر متبدل قانون اور دوسرے کسان کی محنت۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی ہوگی تو خوشگوار نتیجہ برآمد ہو کر رہے گا (اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں)۔ اگر کسان کی کوششیں قانونِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوں گی، تو اس کی محنت ضائع جائے گی (اولٰئک حبطت اعمالھم) قانونِ فطرت اور انسان کی کوششوں کی اس ہم آہنگی کو تقویٰ کہا جاتا ہے (وقی کے معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اس طرح گھسنا کہ وہ ہموار ہو جائیں۔)

تقویٰ کا مفہوم

کشمکشِ حق و باطل

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کہتا ہے کہ قانونِ فطرت، حق اور باطل کی کش مکش کا نام ہے۔ حق کہتے ہیں کسی اسکیم کے مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو جب وہ ٹھوس نتیجہ کی شکل میں سامنے آ جائے۔ اور باطل اس کے برعکس، اس کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہوتا ہے جو تخریب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شے کے تخریبی پہلو سے ایک تعمیری پہلو برآمد ہوتا ہے۔ دانے کا خاک میں مل کر پھٹ جانا[2]، اس اسکیم کا تخریبی پہلو ہے لیکن اس تخریب (DESTRUCTION) سے تعمیر (CONSTRUCTION) کونپل کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح

---

[1] انسانوں کا تجربہ جو نسلاً بعد نسل متوارث آگے چلا آتا ہے، تاریخ کہلاتا ہے۔ قرآن تاریخ کو اسی لئے بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ذکر کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ (تفصیل کسی دوسرے مقام پر ملے گی)

[2] فالق الحب والنوٰی (۶/۹۵) "دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا" اسی صفتِ خداوندی پر شاہد ہے۔

آگے بڑھتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں یہ قانونِ کش مکشِ حق و باطل (تخریب و تعمیر) سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کش مکش میں غلبہ ہمیشہ حق کا ہوتا ہے۔ یعنی آخرالامر، تعمیری پہلو، تخریبی پہلو پر غالب آتا ہے اور اس طرح یہ کائنات، اپنے تخلیقی مدارج طے کرتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ "تخلیقِ ارض و سماء بالحق" سے یہی مفہوم ہے۔ یعنی کائناتی قانون کا ماحصل تعمیر ہے، تخریب نہیں۔

کائنات میں یہ قانونِ خداوندی، اشیائے کائنات کے اختیار و ارادہ کے بغیر جاری و ساری ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ کل لہ قانتون۔ لیکن انسان کو اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان اپنی دنیا میں اس قانون کو اپنے اختیار و ارادہ سے نافذ کرے گا۔ یہاں کسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو بیج کے دانوں کو قانونِ قدرت کی ہم آہنگی میں سپردِ خاک کر دے۔ اور چاہے تو انہیں چکی میں پسوا کر روٹی پکالے۔ اگر وہ اپنی محنت کو کائناتی قوانین کا ہم آہنگ بنا دے گا تو اس کی محنت اس طرح بارآور و ثمربار ہوگی جس طرح آفاقی دنیا میں خدا کا قانون بارآور ہوتا ہے۔ وہاں بھی تعمیری پہلو (حق) کا تخریبی پہلو (باطل) پر غلبہ ہوگا اور یہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ لہذا جو چاہتا ہے کہ آخرالامر، تعمیری پہلو غالب رہے اور اس طرح اس کا مستقبل روشن ہو جائے اسے چاہیئے کہ وہ قانونِ خداوندی کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی کوششوں کو اس قانون سے ہم آہنگ کر دے۔ ایسی قوم کا حال بھی درخشندہ ہوگا اور مستقبل بھی روشن۔

مقصودِ زندگی

دنیا اور آخرت کے اس اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مقامات پر غور کیجئے جن میں قرآن نے صرف دنیا (حال کے پیش پا افتادہ مفاد) کو خزف ریزے اور آخرت (مستقبل) کے مفاد کو متاعِ حقیقی قرار دیا ہے، ساری بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر فرد یا ہر قوم صرف اپنی اپنی ذات کو سامنے نہ رکھے جس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان صرف اپنے ذاتی مفاد ہی کو مقصودِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ مقصودِ زندگی، نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ کیونکہ اس سے انسانیت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ خود غرض انسانوں (یا اقوام) کو پیش پا افتادہ مفاد پر جھپٹ پڑنے والے قرار دیتا ہے اور ان مفاد کو متاعِ دنیوی (قریبی مفاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ انسان ہیں جو دنیا میں ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں پوری کی پوری انسانیت پروان چڑھے۔ اسے وہ مستقبل کی خوش حالی (آخرت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک محض قریبی مفاد (دنیا) کے حصول کی جدوجہد کبھی مستحسن قرار نہیں پا سکتی۔ اس کے نزدیک حقیقی سعی و طلب

۱؎ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (21/18) ہم حق (کی تعمیری قوتوں) سے باطل (کی تخریبی قوتوں) پر نشانہ لگائے رہتے ہیں، تو حق کی تعمیری قوتیں، باطل کی تخریبی قوتوں کا سر کچل دیتی ہیں۔ اور اس کا مآل یہ ہوتا ہے کہ تخریبی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں (اور تعمیری قوتیں ٹھوس نتیجہ کی شکل میں باقی رہ جاتی ہیں)۔

۲؎ انسانی نظامِ تمدن و معاش میں، معاشی زندگی کے لئے قرآن نے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے، اور ان آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں، سماء کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن چاہتا یہ ہے کہ انسان کی معاشی زندگی، ان سماوی قوانین (مستقل اقدار) کے ساتھ ہم آہنگ رہے اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ اگر انسان کی معاشی زندگی مستقل اقدار سے بے نیاز ہو جائے تو اس سے انسانی تمدن میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جنہیں وہ فساد فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر اس کی معاشی زندگی مستقل اقدار سے ہم آہنگ ہو تو اس کا نتیجہ انسانی نظامِ اجتماعیہ میں ہموار ہوتا ہے جسے وہ اصلاح کے نام سے پکارتا ہے۔ اعمالِ صالحہ ایسے کام ہیں جو انسانی نظامِ تمدن کی ناہمواریوں کو مٹا کر ان کی جگہ ہمواریاں پیدا کر دیں۔ سردست ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی معارف القرآن (جلد پنجم) میں ملے گی۔ انشاء اللہ۔

انسانیت کے مستقبل کی خوشگواری کے لئے ہونی چاہئے۔ یعنی پوری کی پوری نوعِ انسانی کی خوش حالی، اپنی اور آنے والی نسلوں کی مرفہ الحالی۔ پوری کی پوری ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کی ترقی۔

قرآن ان دونوں گروہوں کی زندگی اور اس کے مآل کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ محض پیش پا افتادہ مفاد (حال کی بہبود) کی فکر کرتے ہیں، انہیں اپنی کوششوں کے نتائج فوراً مل جاتے ہیں لیکن ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

دو گروہ

فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما له فی الاٰخرة من خلاق (۲/۲۰۰)

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انہیں قریبی مفاد ہی مل جانے چاہئیں (انہیں وہ مفاد مل جاتے ہیں) لیکن ان کا مستقبل (کی خوشحالیوں) میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوں، انہیں اس کے مطابق حصے مل جاتے ہیں:

ومنهم من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار۔ اولٰئك لهم نصیب مما کسبوا۔ واللّٰه سریع الحساب (۲/۲۰۱)

اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا نشو و نما دینے والا قانون ایسا کر دے کہ ان کا حال بھی مستحسن ہو جائے اور مستقبل بھی، اور اس طرح وہ بدحالیوں اور نامرادیوں کے (انسانیت سوز عذاب سے بچ جائیں، تو ان کی کوششوں کے نتائج انہیں اس طرح سے مل جائیں گے۔ اس لئے کہ اللہ (کا قانونِ مکافات) نتائج برآمد کرنے میں دیر نہیں لگاتا (جس وقت وہ پختگی حاصل کر لیتے ہیں ٹھیک اسی وقت ان کا ظہور ہو جاتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم مستقبل کی خوش گواریوں اور مرفہ الحالیوں کے لئے جدوجہد کرے، اس کا حال تاریک ہو، اس لئے کہ مستقبل کی خوش حالی کے لئے ابتدائی جدوجہد کے بعد، ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں حال اور مستقبل کے کنارے ملتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ کسان والی مثال میں، جب وہ ابتدائی مشکلات پر قابو پا کر فصل تیار کر لیتا ہے تو فصل کے گھر آنے کے ساتھ ہی اس کا حال خوش گوار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اگلی فصل کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس جدوجہد کا ماحصل پھر مستقبل کی مرفہ الحالیوں کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ

للذین احسنوا فی هذه الدنیا حسنة (۱۶/۳۰)

جو لوگ حسنِ عمل[1] کرتے ہیں، ان کی یہ دنیا (حال کی زندگی) حسین بن جاتی ہے۔

اور حال کے ساتھ، ان کا مستقبل بھی روشن ہو جاتا ہے۔

الذین اٰمنوا وکانوا یتقون۔ لهم البشریٰ فی الحیٰوة الدنیا وفی الاٰخرة۔ لا تبدیل لکلمٰت اللّٰه۔ ذالك هو الفوز العظیم۔ (۱۰/۶۳-۶۴)

---

[1] قرآن نے عمل صالحہ کو اعمالِ حسنہ کہہ کر پکارا ہے۔ حُسن کیا ہے؟ توازن و تناسب (PROPORTION) قائم رکھنے کا نام۔ اس سے الگ، حسن کی اور کوئی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جس طرح اعمالِ صالحہ کے معنی ایسے کام ہیں جو زندگی کی ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدل دیں۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ کے معنی وہ اعمال ہیں جو انسان کی متضاد قوتوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن و تناسب قائم رکھ سکیں یہی کامیابیوں اور شادکامیوں کی اصل و بنیاد ہیں (تفصیل معارف القرآن میں ملے گی)۔

جو لوگ (زندگی کے اس صحیح نظریہ پر جو قرآن نے پیش کیا ہے) یقین رکھتے ہیں، اور پھر اپنی معاشی زندگی کو آسمانی قوانین سے ہم آہنگ کرتے ہیں (تقویٰ)۔ ان کے لئے حال کی زندگی اور مستقبل دونوں میں خوشگواریاں ہیں۔ یہ خدا کا ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے۔

…ا تک ہم نے دو گروہ دیکھ لئے۔ ایک وہ جو صرف اپنے حال کو خوش گوار دیکھنا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا …ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اول الذکر گروہ کا حال خوشگوار ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا، اور مؤخر الذکر کا حال …ر مستقبل دونوں خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منہا۔ ومن یرد ثواب الآخرۃ نؤتہ منہا۔ (۳/۱۴۴)

جو صرف حال کی خوش گواریاں چاہتا ہے اسے یہ کچھ مل جاتا ہے۔ جو مستقبل کی تابناکی کیلئے خواہاں ہوتا ہے اسے وہ ملجاتا ہے۔

…خدا کا قانون یہ نہیں کہ صرف حال کی خوشگواریاں چاہنے والوں کی کوششوں کو رائیگاں کر دے۔ وہ پیش پا افتادہ مفاد ملتے ہیں۔ …نہیں یہ مفاد مل جاتے ہیں۔ اور جو مستقبل پر نگاہ رکھتے ہیں ان کی کوششیں اسی نہج سے بار آور ہوتی رہتی ہیں۔ دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل …میں اس حقیقت کبریٰ کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا:

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہٗ فیہا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہٗ جہنم یصلٰہا مذموما مدحورا (۱۷/۱۸)

جو شخص (یا قوم) پیش پا افتادہ (فوری) فائدہ چاہتا ہے، تو ہم اپنے قانون کے مطابق، اسے مفادِ عاجلہ (فوری فائدہ) دیدیتے ہیں۔ لیکن مستقبل میں اس کے لئے ایسی زندگی ہوگی جس میں ساری صلاحیتیں جھلس جائیں گی اور اس کا نشو و نما رک جائے گا (جہنم کے یہی معنی ہیں) اور اس زندگی میں وہ اپنے آپ کو بدحال اور ٹھکرایا ہوا پائے گا۔

یہ ایک گروہ ہوا۔ اور دوسرا گروہ۔

ومن اراد الآخرۃ وسعیٰ لہا سعیہا۔ وھو مؤمن۔ فاولٰئک کان سعیہم مشکورا (۱۷/۱۹)

لیکن جو انسان (یا قوم) مستقبل کا طالب ہو۔ اور اس کیلئے جیسی کوشش کرنی چاہئے ویسی کوشش کرے۔ اور وہ اپنی کوششوں کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھے (کہ ایمان کے بغیر یہ کوشش ناممکن ہے) تو ان کی یہ کوششیں پورا پورا پھل لائیں گی۔

یہ فطرت کا قانون ہے، نہ اول الذکر گروہ کی کوششیں ضائع جاتی ہیں اور نہ ثانی الذکر کی۔

کلا نمد ھؤلاء وھؤلاء من عطاء ربک۔ وما کان عطاء ربک محظورا۔ (۱۷/۲۰)

ہماری نشو و نما دینے والی سہولتیں (عطاء ربک⁵) دونوں گروہوں کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ تیرے رب (کے قانونِ نشو و نما) کی بخششِ عام کسی پر بند نہیں ہوتی)

ان کوششوں میں ہر قوم اپنی جد و جہد کے مطابق آگے بڑھتی جاتی ہے۔ انظر کیف فضلنا بعضہم علیٰ بعض (۱۷/۲۱) تاریخی نظائر پر غور کرو اور دیکھو کہ ہمارا یہ قانونِ معاشی کارگاہ میں کس طرح مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ لیکن آخر الامر

---

۵ قرآن میں ربوبیت اس قانون کا نام ہے جو نشو و نما دیتا ہے۔ عطاءِ ربانی وہ سہولتیں ہیں جو نشو و نما کے لئے عام ملتی ہیں۔ ہوا، دھوپ، بارش، زمین، سب کے لئے بلا مزدِ معاوضہ عام ہیں۔ یہ نہیں کہ حال کی خوش گواریاں چاہنے والوں پر یہ عمومی بخششیں بند ہو جائیں اور مستقبل چاہنے والوں پر اس کے دروازے کھل جائیں۔ خدا کا قانون مومن و کافر دونوں کے لئے یکساں ہے۔ دونوں کو اس قانون کے مطابق نتائج ملتے چلے جاتے ہیں۔

ہوتا ہے کہ صرف حال کی خوش گواریاں چاہنے والے مٹ جاتے ہیں اور مستقبل کی مرفہ الحالیوں کے طالب بلند مدارج حاصل کر لیتے ہیں۔ وللاخرۃ اکبر درجت و اکبر تفضیلا (۱۷/۲۱)۔ مستقبل کے درجات اور معاشی[۵۱] خوشحالیاں سب سے بڑھ کر ہیں۔ اور مستقبل صرف اسی کے لئے ہوتا ہے جو معاشی زندگی کو ابدی قوانین (مستقل اقدار) کے تابع رکھے۔ اور اس طرح "ارض وسما"[۵۲] میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ لیکن جو قوم دنیا کی زندگی کے لئے کوئی الگ خدا تجویز کرلے (یعنی یہاں کی زندگی کے لئے اور قوانین وضع کرلے) اور آخرت کے لئے اور قوانین سامنے رکھے، تو یہ وہ شرک ہے جس کا نتیجہ بدحالی اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لاتجعل مع اللہ الٰھا اٰخر فتقعد مذموما مخذولا (۱۷/۲۲)

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قانون) نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے۔

لیجئے! یہ ایک تیسرا گروہ سامنے آگیا۔

تیسرا گروہ گروہ اول ——— وہ لوگ جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ مستقبل کو تسلیم ہی نہیں کرسکے۔ انھوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں۔ اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انھیں پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے۔ یعنی جو مستقبل سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوام مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ ان کے سامنے اگر مستقبل ہے تو صرف اپنی قوم (نسل) کا۔ وہ نوعِ انسانی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ ان کا وحدتِ انسانیت پر ایمان ہی نہیں۔ نیز وہ زندگی کو فقط طبیعی زندگی مانتے ہیں جس کا سلسلہ سانس بند ہوجانے سے منقطع ہوجاتا ہے۔ لہذا وہ زندگی کے مستقبل پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

گروہ ثانی ——— وہ گروہ ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس ایک ضابطۂ حیات ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کرتا۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک ہوتے ہیں۔ فی الدنیا حسنۃ فی الاخرۃ حسنۃ۔ اس گروہ کو قرآن مومنین کی جماعت کہتا ہے۔ ان کے پیش نظر تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہوتی ہے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جو حال اور مستقبل کو دو الگ الگ دنیائیں قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ کوششیں ایسی ہیں جو صرف د[نیا] کی کامیابی عطا کرتی ہیں اور کچھ ایسی جو عاقبت سنوارتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جس کی عاقبت سنور رہی ہو اس کی دنیاوی زندگی بھی کامیاب ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ یہ سمجھتا ہے کہ جس کی دنیاوی زندگی نامراد و ناکام ہو اس کی آخرت کامیاب و کامران ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک آخرت سے مراد انسانیت کا مستقبل نہیں بلکہ مرنے کے بعد ہر فرد کی اپنی اپنی زندگی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہاں کی زندگی کو وہاں کی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ یعنی اس کے نزدیک دنیاوی زندگی کی خوش حالیوں اور ناداریوں کے لئے کوئی اور قانون کا ہے اور اخروی کامیابیوں اور شادکامیوں کے لئے کوئی اور قانون۔ وہ ان دونوں کے لئے قانون کا سرچشمہ ایک نہیں سمجھتا۔ وہ ہر دو دائرے میں الگ الگ "خداؤں" کا قانون رائج سمجھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر سفر کرنے والا ڈوب کر رہے

---

۵۱ قرآن میں فضل کا لفظ معاشی خوشحالیوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔

۵۲ "ارض وسما" قرآن میں اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، ارض، معاشی زندگی اور سماء، آسمانی قوانین جن کے مطابق مستقل اقدار متعین ہوتی ہیں، اس کی تفصیل معارف القرآن میں ملے گی۔

۵۳ شرک کے یہ معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون سامنے رکھے اور دوسرے دائرے میں کوئی اور قانون۔

جو شخص درخت کی جڑ میں آگ جلاتا ہے اور پتوں پر پانی چھڑکتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ کسی انسانی جسم کے ایک حصے کا خون صالح ہو سکتا ہے اور دوسرے حصے کا کثیف۔ اس کا ایمان ہے کہ پودے کی اولیں کونپل مرجھا کر خشک ہوتی ہے تو ہونے دیجئے، خوشے دانوں سے بھرے ہوئے ملیں گے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک کونپل کے لئے الگ قانون ہے اور ڈنٹھل اور خوشوں کے لئے الگ قانون۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) حیاتِ کائنات سے متعلقہ قانونی وحدت (Unity of Law) کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اسے کہدیجئے کہ اس کا حال بھی بدحال ہوگا اور مستقبل بھی تاریک۔ غور کیجئے قرآن اس باب میں کس قدر ابھرے ہوئے الفاظ میں حقیقت کو واشگاف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض۔ (۲/۸۵)

کیا تم قانونِ کائنات کے ایک حصے پر ایمان لائے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟

جو ایسا کرتا ہے:

فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزیٌ فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الیٰ اشدالعذاب (۲/۸۵)

جو تم میں سے ایسا کرے (خواہ وہ اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے) اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ اس کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت[1] کے دن وہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

قرآن، اس نہج زندگی کا نام "کفر بعد الاسلام" (۹/۷۴) قرار دیتا ہے اور اس گروہ کو وہ "منافقین" کی جماعت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے حال اور مستقبل دونوں کو تاریک بتاتا ہے (عذابًا الیمًا فی الدنیا والاخرۃ ۹/۷۴) اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ معاشی زندگی میں ان کا کوئی پرسانِ حال اور مددگار نہیں ہوتا (ومالھم فی الارض من ولی ولا نصیر۔ ۹/۷۴)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے:

ایک گروہ وہ ہے جس کی حال کی زندگی، کامیابی اور کامرانی کی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

ایک گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔

اس کے نزدیک ایسا گروہ کوئی نہیں ہو سکتا جس کا حال تو تاریک ہو لیکن مستقبل روشن۔ وہ کہتا ہے کہ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بہرحال تاریک ہوتا ہے۔ من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ۔ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی کی دنیاوی زندگی ذلت و خواری میں گزرے اور عاقبت سنور رہی ہو۔ جو ایسا کہتا ہے وہ حال اور مستقبل کی نشو و نما کے لئے الگ الگ خداؤں کا قانون ماننا چاہتا ہے۔ یہ شرک ہے توحید نہیں۔ منافقت ہے، ایمان نہیں۔

زندگی کے ٹکڑے

قرآن آیا تو اس نے دیکھا کہ ساری دنیا نے، حیاتِ انسانی کو، طول اور عرض دونوں سمتوں میں بری طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ طول میں یوں کہ اس نے دنیا اور آخرت کو الگ الگ دنیائیں تصور کر رکھا ہے۔ دنیا ارباب حکومت کے سپرد ہے جو حال کو کامیاب بنانے کے مدعی ہیں۔ آخرت، اربابِ مذہب کے قبضہ میں ہے جو لوگوں کی عاقبت

[1] قیامت کے قرآنی مفہوم کیلئے معارف القرآن کی آخری جلد تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔

سنوارنے کے دعویدار ہیں۔ عرض کی سمت دیکھا تو ہر فرد اپنے آپ کو الگ حیات کا پیکر سمجھتا ہے اور اگر زندگی کی بعض ضروریات کے
تقاضے بعض انسانوں کو ایک جگہ جمع بھی کر دیتے ہیں (جنہیں شعوب و قبائل و اقوام کہا جاتا ہے) تو وہ گروہ صرف افراد کا مجموعہ بنتے ہیں
وحدتِ حیات کے مظہر نہیں ہوتے۔ یہ تھی ساری آباد دنیا کی حالت نزولِ قرآن کے وقت۔ وہ حالت جس نے اسے "فساد فی البر والبحر"
کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور شرک کہہ کر پکارا ہے۔
قرآن نے کہا کہ حیات کی اس طرح تقسیم، نفسِ واقعہ (Facts) کے خلاف ہے۔ حیاتِ انسانی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت
(INDIVISIBLE UNIT) ہے۔ وہ نہ طول کی طرف بٹ سکتی ہے نہ عرض کی سمت۔ طول کی سمت، یہ ایک جوئے رواں ہے
جس کا ہر قطرہ ندی کا لاینفک حصہ ہے اور یہ ندی از اول تا آخر ایک ہی ندی ہے۔ مسلسل و متواتر، غیر منقسم و غیر منقطع ازل سے ابد تک زمان
(TIME) کی صراطِ مستقیم پر مختلف نشانات، صرف گزرگاہوں کے نشانات ہیں۔ اور بس۔ اس لئے یہاں دنیا اور آخرت (حال اور مستقبل)
کی تمیز، نفسِ واقعہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب حقیقت حال یہ ہے تو یہ روش یکسر باطل ہے کہ حال کے متعلق ارباب حکومت کے قوانین عمل پیرا
ہوں اور مستقبل کے متعلق، عمائد مذہب کے آئین و دساتیر۔ دوسری جانب عرض کی سمت آئیے تو مختلف افراد ایک نفسِ حیات کے مظاہر ہیں۔
اسی طرح جیسے قمقمے، پنکھے، مشینیں، سب بجلی کی ایک لہر (ELECTRIC CURRENT) کے حرکیاتی مظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے
افراد، شعوب، قبائل، اقوام کی تقسیم بھی غیر فطری ہے۔ تمام انسانیت ایک خاندان کے افراد، ایک درخت کے پتے اور ایک سمندر کے
قطرے ہیں جن کی اصل و بنیاد (BASE) ایک ہے۔

دین کیا ہے

یہ تھی وہ عظیم القدر حقیقت جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ اس نے صرف اس حقیقت کو بطور ایک نظریہ ہی کے پیش
نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ انسانی نظامِ تمدن و معاشرت میں اس وحدتِ حیات کا عملی مظاہرہ کس طرح سے ہوگا۔ یہ
عملی طریق، جس سے یہ عظیم القدر حقیقت ایک زندہ پیکر کی صورت میں سامنے آجاتی ہے، دین کہلاتا ہے۔ لہٰذا دین نام تھا اس طریقِ عمل کا
جس سے ایک طرف حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) ایک غیر منقسم وحدت بن جاتے تھے، اور دوسری طرف تمام افرادِ نوعِ انسانی،
ایک عالمگیر برادری کے ایسے اجزاء جیسے سمندر کے قطرات۔ دین کے ارکان و مناسک، اس غیر مرئی حقیقت کو مشہود و محسوس شکل میں سامنے
لانے کے ذرائع و اسباب تھے۔ یعنی یہ عوامل و عناصر تھے اس نظامِ زندگی کے جسے قرآن نے الدین کہہ کر پکارا ہے۔ ان ذرائع و اسباب نے
تھوڑے سے عرصہ میں الدین (نظامِ زندگی) کی حقیقتِ مجردہ کو لباسِ مجاز میں بایں نمط جلوہ طراز کر دکھایا کہ فرشتوں کی آنکھوں نے بداہۃً
دیکھ لیا کہ "انی اعلم ما لا تعلمون" سے مفہوم کیا تھا! دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی (یا یوں کہئے کہ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا
کہ تمام اقتدار، انسانوں کے ہاتھ سے چھن کر، اس قانون کے ہاتھ میں آگیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے انسانوں کا خود ساختہ نہ تھا
بلکہ وہاں سے ملا تھا جو حیاتِ انسانی کا سرچشمہ ہے اور جسے خدا کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں اطاعت فقط قانون کی تھی۔ اور قانون کی اطاعت
بھی غلام کی سی اطاعت نہیں بلکہ ایک اندرونی تقاضے کی تسکین۔ اس طرح جیسے پیاس بجھانے کے لئے پانی پینا اندرونی تقاضے کی تسکین
ہوتا ہے، کسی کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس طرح دین کے نظام میں اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہا اور جب اقتدار کسی کے ہاتھ میں
نہ رہا تو زندگی کی ناہمواریاں بھی ناپید ہو گئیں۔ اس نظام کے حلقہ میں بسنے والی تمام جماعت کی زندگی کا نصب العین تھا انسانیت
کے مستقبل کی درخشندگی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ان کا حال خود بخود روشن ہو گیا۔ اس لئے کہ، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ یہ فطرت
کا اٹل قانون ہے کہ جس کا مستقبل روشن ہو اس کا حال ضرور تابناک ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن نے کیسی وضاحت سے اس قانون
کو بیان کیا ہے

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیاۃ الدنیا ویوم یقوم الاشہاد (۴۰/۵۱)

ہم ان لوگوں کی کھیتیوں کو (جو مستقبل کی خوشحالی پر) ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے حال کی زندگی میں بھی سیراب[1] کرتے ہیں اور مستقبل میں بھی جب نتائج خود کھڑے ہو کر پکار اٹھیں گے۔

یہ نہیں کہ یہ نصرت یونہی اتفاقیہ عمل میں آجاتی ہے۔ بلکہ فرمایا کہ کان حقاً علینا نصر المؤمنین (۳۰/۴۷) "ہم پر مومنین کی نصرت فرض ہے"۔ غور کیجئے۔ قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری اور محکمیت کس قدر واضح انداز سے بیان کی گئی ہے۔ دوسری جگہ اسی جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نحن اولیاءکم فی الحیاۃ الدنیا والاٰخرۃ (۴۱/۳۱) "دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں ہم تمہارے پشت و پناہ ہیں"۔ قرآن نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ مستقبل کی خوش حالیوں کے ضامن نظام میں ابتداءً محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور نتائج نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، مفادِ عاجلہ والے، تھوڑی سی کوشش سے محسوس نتائج سامنے لے آتے ہیں لیکن گھبراؤ نہیں، مفادِ عاجلہ والے تم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے۔ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً (۴/۱۴۱) ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا کا قانون، مستقبل پر ایمان رکھنے والوں پر، کفار (صرف مفادِ عاجلہ کو سامنے رکھنے والوں) کو غلبہ دیدے"۔ یہ لوگ اپنے سامنے مفادِ عاجلہ کے ڈھیر دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیں کہ زندگی کی دوڑ میں یہ آگے نکل گئے اور وہ پیچھے رہ گئے جنھوں نے مستقبل کو سامنے رکھا۔ ان کا یہ گمان غلط ہے۔ بیج بونے والا کسان کبھی اس کے مقابلہ میں ناکام نہیں رہ سکتا جس نے اپنے بیج کے دانوں کو پسوا کر روٹی پکالی۔ لایحسبن الذین کفروا سبقوا، انھم لایعجزون (۸/۵۹) "مفادِ عاجلہ والے یہ گمان نہ کرلیں کہ یہ آگے نکل گئے۔ بالکل نہیں، یہ کبھی دوسرے گروہ پر بالادست نہیں ہو سکتے"۔ والعاقبۃ للمتقین۔ انجامِ کار غلبہ انھیں کا رہے گا جو حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ کفار (مفادِ عاجلہ والوں) کا مومنین پر غلبہ پانا تو ایک طرف۔ یہ دونوں گروہ برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ افمن کان مؤمناً کمن کان فاسقاً، لایستوٗن (۳۲/۱۸) "کیا مومن اور فاسق دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے"۔ پھر اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ حال کی زندگی میں "کفار اور فاسقین" بڑھے ہوئے ہوں گے اور مومنین کا غلبہ صرف حیاتِ اخروی میں ہوگا۔ ان کا حال درخشندہ ہوگا اور ان کا مستقبل۔ قرآن نے اسے بالکل واضح کر دیا کہ یہ غلبہ و تسلط اسی دنیا میں ہوگا۔ ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض۔ ام نجعل المتقین کالفجار (۳۸/۲۸) کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس دنیا میں (فی الارض) [معاشی زندگی میں (فی الارض)] ان کو جو ایمان لائے اور انھوں نے زندگی میں ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے، ان کے برابر کر دیں گے جنھوں نے ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے؟ کیا ہم حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرنے والوں کو ان کے برابر کر دیں گے جو ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں" (فجار[2])۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بالآخرت کا فطری نتیجہ عاقبت بینی اور مآل اندیشی ہے۔ سو جو قوم عاقبت اندیش ہو اس کا مقابلہ وہ لوگ کس طرح کر سکتے ہیں جو دُور کی بات سوچ ہی نہ سکیں۔

---

[1] نصر کے معنی سیراب کرنا ہے۔ قرآن نے اعمال اور ان کے نتائج کے لئے عام طور پر کھیتی کی مثال دی ہے۔ ارض و سما کا باہمی امتزاج، یعنی بارش کے قطروں کا زمین کے ذرات سے ہم آغوش ہونا۔ زمین مردہ کی حیات بعد از موت، بیج کا پھوٹنا، کونپل کا ابھرنا، شاخ کا استوار ہونا، خوشے کا پکنا، پھلوں سے جھولیاں بھرنا وغیرہ سب "فلاح" (کھیتی) کی تفسیریں ہیں۔ اسی اعتبار سے اس نے نصرتِ خداوندی کو بھی سیرابی سے تعبیر کیا ہے۔

[2] فجر کے معنی ہیں پتھر کی چٹان کا پھٹ کر اس سے پانی بہہ نکلنا۔ فجار، دو پہاڑوں کے درمیانی راستے کو، اور انفجار پہاڑیوں کو بارود (DYNAMITE) سے اڑا دینے کو کہتے ہیں۔

جماعتِ مومنین

اور ان تمام دعاوی (یا قوانینِ فطرت) کی زندہ شہادت وہ نتائج تھے جو ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ کیا اس جماعت سے بڑھکر جسے قرآن نے مومنین کے خطاب سے پکارا ہے کسی اور جماعت کی آخرت بھی سنوری ہوئی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس جماعت سے بڑھ کر کسی اور جماعت کی دنیا بھی زیادہ کامیاب تھی؟ ان کی حکومت اسی زمین پر قائم ہو گئی تھی (لیستخلفنھم فی الارض)۔ ان کی جنت یہیں سے شروع ہو چکی تھی[1]۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو خدائی قانون سے ہم آہنگ کر لیا تھا (رضوا عنہ) اور خدائی قانون کی انقلاب آفریں قوتیں ان کی کوششوں سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ (رضی اللہ عنھم)۔ نتیجہ دنیا کے سامنے تھا۔

اسلام کی اس سب سے پہلی داعی جماعت نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ یونہی کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ قانونِ فطرت کا اٹل نتیجہ تھا۔ جس طرح کسی معمل (LABORATORY) میں کیمیاوی تجزیہ اور امتزاج (CHEMICAL ANALYSIS AND SYNTHESIS) سے مخصوص نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی حیات اجتماعیہ میں قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی و توافق سے بھی اٹل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انہی اٹل نتائج کا نام استخلاف فی الارض تھا جس میں انسانی زندگی کو کامل ہمواری اور توازن نصیب ہو گیا تھا۔ اور اس لئے اس میں حسن ہی حسن جگمگا رہا تھا۔ اس میں حیات، طول اور عرض دونوں میں اپنی وحدت قائم کئے ہوئے تھی۔ نہ آخرت دنیا سے الگ تھی اور نہ انسانیت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس جماعت نے تسخیرِ فطرت سے کائنات کی بکھری ہوئی قوتیں اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھیں اور ماحصلِ فطرت (متاعِ ارض) کو آسمانی قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس تحصیل و تقسیم کے نظام کا نام دین تھا۔ یعنی متاعِ ارضی (دنیاوی اسبابِ زیست) کے حصول کے لئے ہر فرد کی اپنی اپنی بساط کے مطابق پوری جدوجہد اور کامل سعی و کاوش۔ اور اس مجموعی ماحصلِ متاعِ ارضی کی تقسیم اس انداز سے کہ ہر فرد کو اس کی امکانی قوتوں (POTENTIALITIES) کے نشوونما پانے (FULLY DEVELOPED ہونے) کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔ اس کا نام قرآنی نظامِ ربوبیت تھا۔

یہ تھا دین جس میں نہ ملوکیت کی سیادت تھی، نہ مذہبی پیشوائی کی قیادت۔ نہ طبقات کی تقسیم تھی، نہ بساطِ زندگی کی ناہمواریاں۔ نہ دنیا، آخرت سے الگ تھی، نہ حال مستقبل سے جدا۔

اس کے بعد؟

اب اس کے بعد تاریخ کا ایک ورق اور الٹئے اور ایک عجیب تماشہ دیکھئے۔ وہی قوم تھی اور ان کے ہاتھوں میں وہی قرآن۔ لیکن اب ایک طرف ملوکیت اپنے پورے جبروت و اقتدار کے ساتھ مسلط تھی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت اپنے کامل تقدس اور طمطراق کے ساتھ مستولی۔ انسانیت طبقات میں بٹ چکی تھی اور زندگی کے قدم قدم پر ناہمواریاں درراہ تھیں۔

اس مقام پر فطرۃً یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر وہ نظامِ دین انسانی زندگی کی برومندی کا ضامن اور اس کی نشوونما کا کفیل تھا تو وہ مسلسل آگے کیوں نہ بڑھتا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی جگہ پھر وہی غیر فطری نظامِ کہن کیوں مسلط ہو گیا؟

---

[1] قرآن کی رو سے جنت اور دوزخ کس طرح اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں اس کے لئے ضمنی طور پر میرے مضمون "نظریۂ ارتقاء" اور "نجات" ملاحظہ فرمائیے جو طلوعِ اسلام بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

میں اس سوال کا جواب متعدد بار دے چکا ہوں[1]، اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ اس وقت صرف
نا دیکھئے کہ دین کے جس نظام کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، وہ نظام انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔
گر آپ اس نظام کی کفایت کو تسلیم کرتے ہیں تو سر دست اس بحث میں نہ جائیے کہ وہ مستقل طور پر قائم کیوں نہ رہا۔ دیکھئے صرف یہ کہ اگر
سی نظام کو پھر سے قائم کر لیا جائے تو انسانیت جگمگا اٹھے گی یا نہیں؟ یوں بھی اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں (یعنی مسلمان) جنہیں
یہ تسلیم ہے کہ اس نظام میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تمام ناہمواریوں کو مٹا کر، کاروانِ زندگی کو پھر سے
متوازن و ہموار راہوں پر لے چلے۔ لہٰذا ہمیں اس وقت اس بحث میں الجھنے کی بجائے (کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا) صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ
ملتِ اسلامیہ (یعنی موجودہ مسلمان) جس ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس ذلت کے اسباب کیا ہیں اور اس کی اصلاح کی صورتیں کیا۔

بہر حال یہ آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے نظام میں بادشاہت (ملوکیت) کا کہیں نام تک نہ تھا اور مذہبی پیشوائیت کو کوئی جانتا
نہ تھا۔ اب ہم تاریخ کے جس دور میں پہنچے ہیں وہاں ملوکیت بھی موجود تھی اور مذہبی پیشوائیت بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کی رو سے حیات کی وحدت غیر منقطع
ہوتی ہے اس لئے اس میں حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ایک ہی قانون ہوتا ہے جو پوری کی پوری غیر منقسم
حیات پر حاوی ہوتا ہے۔ ملوکیت[2] سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تصور کر لیا جائے۔ جب آپ حال اور
مستقبل (دنیا اور آخرت) کا تصور تو رکھتے ہوں لیکن دنیاوی اصولوں کیلئے قانون کا سرچشمہ الگ تجویز کر لیں، تو لامحالہ آپ کو آخرت کیلئے
بھی ایک جداگانہ ضابطہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ ضابطہ جو صرف آخرت سے متعلق ہو، مذہب[3] کہلاتا ہے۔ لہٰذا ملوکیت اور مذہب، وحدتِ
حیات کے ٹوٹنے کے بعد، لازم و ملزوم طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ جس طرح پانی کے ایک قطرہ کا تجزیہ کیا جائے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن
جداگانہ اور متمیز تشخص کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔

مذہب اور ملوکیت ملوکیت اگر مذہب کو اپنے اندر سمو لے تو دین وجود میں آجاتا ہے۔ اسی طرح اگر مذہب ملوکیت کو اپنے اندر
مدغم کر لے تو دین متشکل ہو جاتا ہے۔ یعنی دین میں ملوکیت اور مذہب کا الگ الگ تشخص باقی نہیں رہتا۔
لہٰذا ملوکیت اپنے قیام کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ مذہب اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اور مذہب اپنے قیام کے لئے ملوکیت کا قیام ضروری
سمجھتا ہے۔ اس طرح ان دونوں میں (بظاہر تضاد و تخاصم کے باوجود) باہمی سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ کھشتری (حکومت کرنے والی قوم)

---

[1] معارف القرآن کے کئی ایک مقامات پر اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے اور آئندہ بھی ہوگی۔ بایں ہمہ اگر سوال زیر نظر کے ضمن میں مزید توضیحات کی
غرض سے اس مسئلہ پر مزید گفتگو کی ضرورت پیش آئی تو میں اس کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا، اور یہ بھی کہ اس کے آگے
نہ چلنے سے ان اصولوں پر کوئی حرف نہیں آتا جو مستقل اقدار کی حیثیت سے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔

[2] قرآن کی رو سے ملوکیت صرف یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی
امور کیلئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو۔ خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دین کے نظام میں وراثتِ
اقتدار کا تصور یکسر باطل ہوتا ہے کیونکہ اس میں جب انفرادی اقتدار ہی نہیں ہو سکتا تو اقتدار کی وراثت کیسی؟

[3] آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں "مذہب" اور "دین" کے دو الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن، مذہب نہیں لایا تھا حتیٰ کہ "مذہب" کا
لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اس وقت پیدا ہوا
جب نظام دین مفقود ہو گیا۔ آج ہمارے پاس مذہب ہے، دین نہیں۔

براہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور براہمن، کھشتری کو اشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ محراب و منبر سے بادشاہ کو ظل اللہ قرار دیکر ایدہ اللہ بنصرہٖ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تخت و تاج، مساجد و مکاتب کے لئے جاگیریں وقف کرکے مذہبی سیادت کی حفاظت کرتا ہے۔ مذہب اس کے معاوضہ میں ملوکیت کے استحکام و بقا کے لئے لوگوں کے دل میں یہ فریب پختہ طور پر جاگزیں کرتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت چیز ہے۔ سیاست و حکومت کے دھندے "دنیا داروں" کے لئے ہیں۔ خدا کے نیک بندوں کو دنیاوی امور سے الگ رہنا چاہئے ان کا مقصود و منتہیٰ، آخرت کی نجات ہے۔ ان کا محبوب و مطلوب خدا کا دیدار ہے۔ جو جتنا اس دنیا میں ذلیل ہوگا، اتنا ہی خدا کے ہاں مقرب و مقبول ہوگا۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس فسوں سازی سے، عوام کی توجہات آخرت پر مرتکز ہو جاتی ہیں اور ملوکیت اپنی ہوس رانیوں اور خون آشامیوں میں بے زمام ہو جاتی ہے۔ اب ملوکیت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی طرف سے لوگوں کو "صبر" (استبداد کے خلاف لب تک نہ ہلانے) کی ایسی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ہر جور و ستم کو خدا کی رحمت سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے مقربانِ بارگاہِ خداوندی کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ وہ مفلسی اور تباہ حالی کو "اللہ کے پیاروں" کی علامات قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ یوں مذہب کی فسوں کاریوں سے، ملوکیت کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تاریخ کے قدیم ایام میں، مذہب کو اپنی دسیسہ کاریوں اور ابلہ فریبیوں کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی، دین کے ضوابط (جو حضرات انبیاء کرام کے وساطت سے انسانوں کو ملتے تھے) محفوظ نہیں رہتے تھے۔ اس لئے اربابِ مذہب کے لئے یہ آسان تھا کہ جو کچھ جی میں آیا اُسے "کتاب اللہ" کہہ کر پیش کردیں۔ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔ لیکن اسلام کے معاملہ میں صورت مختلف تھی۔ یہاں دین کا ضابطہ (قرآن) اپنی اصلی شکل میں موجود تھا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود، خدا نے لے رکھا تھا۔ اس لئے اب مذہب کو اپنی فسوں کاریوں کے لئے کاوش کرنی پڑی۔ ان حالات میں کامیابی کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ دین کے ضابطہ قرآن کے الفاظ اور اس نظام کے ارکان کو تو علیٰ حالہٖ قائم رہنے دیا جائے لیکن ان کے مقصود و مفہوم کو یکسر بدل دیا جائے۔ چنانچہ

مذہب کے حربے

اس کے لئے مذہب نے یہ عقیدہ عام کیا کہ کلام الٰہی (ضابطۂ دین۔ قرآن کریم) کے الفاظ میں برکت ہے[1] (معنوں میں نہیں۔ الفاظ میں) انھیں صرف دہراتے رہنا چاہئے (جس طرح ہندو مذہب میں منتروں کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں) اسے تلاوتِ قرآن کہتے ہیں یعنی بغیر سمجھے الفاظ کو دہراتے رہنا۔ (حالانکہ تلاوت کے معنی ہی کسی کے پیچھے چلنا یعنی پیروی کرنا ہے) دیکھئے۔ اس ایک حیلے سے مذہب اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوگیا۔ دین کا ضابطہ (قرآن) بھی مسلمانوں کے سامنے رہا۔ اور انھیں قرآن سے یکسر الگ بھی کردیا۔ مذہب نے تلاوتِ قرآن (یعنی بے سمجھے اس کے الفاظ کو دہراتے رہنے) کے ثواب میں ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ساری قوم اس میں الجھ کر رہ گئی۔ حالانکہ اسی قرآن میں منافقوں کے متعلق یہ مذکور ہے کہ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم (۳/۱۶۶) "وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔" بلا سمجھے الفاظ کے دہراتے رہنے سے بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان زبان سے وہ الفاظ ادا کرتا رہتا ہے جن کا کوئی مفہوم اس کے دل میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح قرآن میں ہے کہ حالتِ سُکر (نشہ) میں صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ کیونکہ تم اس وقت جو کچھ زبان سے کہتے ہو اسے سمجھتے نہیں اس سے ظاہر ہے کہ صرف الفاظ دہراتے رہنا یکسر بے سود ہے۔

ذرا آگے بڑھئے تو پھر تفاسیر کے ذریعے ان تمام قرآنی اصطلاحات کو جنھیں دین نے اپنے نظام کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا تھا

---

[1] الفاظ میں تاثیر کا تصور انسانی تاریخ کے عصرِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ منتر، تعویذ، گنڈے ورد، وظیفے۔ قرآنی آیات کے "اعمال" سب اسی اصل کی شاخیں ہیں۔

نئے معنی پہنانے شروع کردیئے جس سے ہر بات "آخرت" سے متعلق ہوجائے اور لوگوں کی نگاہوں میں "دنیا" ذلیل و قابلِ نفرت شے بن جائے۔ اعمال، جزا، سزا، حسنات، سیّات، فلاح، خسران، عزت، ذلت، سرخروئی، روسیاہی، سب کے سب "آخرت" پر اٹھا کر رکھ دیئے گئے۔

اب آئی "دین" کے اُن ارکان کی باری، جو اس نے اپنے نظام کے قیام کے لئے تجویز کئے تھے۔ کلمہ، صلوٰۃ، قیام، زکوٰۃ، حج، یہ سب ذرائع تھے نظامِ دین کے قیام و استحکام کے۔ مذہب نے انہیں رسوم بنا کر مقصود بالذات قرار دیدیا۔ یعنی یہ اعمال، کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی ادائیگی ہی مقصود ہے۔ اور بس۔

جن طبائع میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن کے الفاظ دہرانے یا ارکانِ اسلام ادا کرنے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ تو ان کی تسکین کے لئے کہہ دیا کہ ان سے ثواب[1] حاصل ہوتا ہے اور یہ ملے گا آخرت میں جا کر۔ ثواب کا لفظ ایسا مبہم ہے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی بات نہ بنے وہاں کہہ دیجئے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ آپ کہنے والے سے کہئے کہ صاحب! ثواب عربی کا لفظ ہے اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ ارشاد فرما دیجئے تاکہ بات واضح ہوجائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد آگے چل ہی نہیں سکے گا۔ اسلئے کہ مذہب کا سارا کھڑاگ ہی مبہمات پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں ثواب کا تصور بھی مبہم ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس حقیقت یا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا۔

اب آیا خدا۔ سو اس کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آسمانوں میں بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی پرستش کرتے رہیں۔ پرستش، ترجمہ ہوگیا عبادت کا۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ قوانینِ الٰہیہ کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کرو اور اپنی زندگی اس نظام کے تابع بسر کرو، اس کا نام تھا عبادت۔ مذہب نے اسے پرستش سے بدل دیا۔ یعنی ایک خاص وقت پر خاص انداز میں، خاص قسم کی حرکات و سکنات۔ اور ان کے متعلق کہہ دیا کہ ان سے اللہ خوش ہوجاتا ہے اور اگر ایسا کچھ نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو کر جہنم کی آگ میں جھونک دیتا ہے۔

عوام، ملوکیت کا استبداد اپنے سامنے دیکھتے تھے۔ مذہب کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس سے ان میں ملوکیت کی مخالفت کا احساس نہ ابھر آئے۔ اس کی پیش بندی کے لئے اس نے یہ عقیدہ پیدا کردیا کہ دنیا میں سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتا۔ ان بادشاہوں کی کیا مجال ہے کہ یہ اپنی مرضی سے کچھ کرسکیں۔ یہ ہمارے سامنے یونہی اکڑتے ہیں۔ اللہ کے سامنے ان کی کیا حیثیت ہے۔ اس لئے ان کا کیا مقدور ہے کہ یہ اُس کے حکم کے خلاف کچھ کرسکیں۔ لہٰذا جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا ہے سب مشیّت ایزدی سے ہوتا ہے۔ "خدا شناس" کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تیر کو دیکھے، اُسے ہر وقت نگاہ تیر انداز پر رکھنی چاہیئے۔ اس عقیدہ تقدیر نے ملوکیت کی گرفت کو فولادی بنا دیا۔ اب ان کی ہر شیطنت، خدا کی مشیت کا مظہر قرار پاگئی، جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

روایات سازی

مذہب نے اپنا جال بچھانے کے لئے یہ تمام حربے استعمال کئے لیکن اس کے باوجود اسے اپنی کامیابی کا کُلّی اطمینان نہیں تھا۔ اس لئے کہ لوگ مذہب سے ان تمام باتوں کی سند مانگتے تھے اور قرآن سے ان کی سند ملتی نہیں تھی۔ اس کے لئے مذہب کو ایک بڑی مقدس پناہ ڈھونڈنی پڑی۔ اور یہ تھی روایات پرستی کی پناہ۔ روایات سازی دینی ہی

[1] "ثواب" کے قرآنی مفہوم کے لئے دیکھئے میرا مضمون "نجات" جو طلوعِ اسلام کی اکتوبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع ہوچکا ہے۔ اس وقت اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے فرمایا ہے کہ فَآتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (۱۴۷/۳) یعنی انہیں اللہ دنیا میں ثواب (یا دنیا کا ثواب۔ حصہ) بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ثواب کوئی ایسی شے نہیں جس کا تعلق اس دنیا سے نہ ہو۔ یا وہ ایسی غیر محسوس شے ہو۔ انسان کو پتہ ہی نہ چلے کہ اسے ثواب ملا ہے یا نہیں۔

آسان تھی جیسی پہلے مذاہب میں کتاب اللہ کی تحریف۔ بلکہ جیسا کہ آگے چل کر بتلایا جائے گا، اس سے بھی زیادہ آسان۔ جس کسی کے جی میں آیا ایک عربی کا فقرہ گھڑا۔ اس سے پہلے "حدثنا زید عن عمر عن بکر۔ قال، قال رسول اللہ ﷺ" کے الفاظ بڑھائے۔ لیجئے! یہ عربی کا فقرہ مذہب کی سند (یعنی حدیثِ رسول اللہ ﷺ) بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے جس قدر عقیدت مسلمان کو ہو سکتی ہے وہ کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اس لئے جو قول یا عمل رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا جاتا، وہ از خود مقدس اور واجب الاحترام ہو جاتا۔

دین میں تحریف و الحاق کا یہ طریقہ، سابقہ مذاہب کی تحریف و الحاق سے بھی زیادہ آسان اور دور رس تھا۔ اُن مذاہب میں تحریف و الحاق کسی نہ کسی کتاب کے گوشوں کے اندر کرنی ہوتی تھی۔ یہاں کتابِ الٰہی کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اور "دین سازی" کے لئے کھلا میدان ہاتھ آ گیا۔ اب ان تمام اباطیل و خرافات کے لئے جن سے ملوکیت اور مذہب کو تقویت ملتی تھی مقدس اسناد موجود تھیں۔ جو بات مَن مانی چاہی اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کر دی۔ اب کس کی ہمت تھی جو یہ کہہ دیتا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں مانتا۔ اگر کسی نے کسی معاملہ میں اتنا کہہ دیا کہ یہ بات تو قرآن کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو اس کا نہایت آسان جواب موجود تھا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہ ﷺ زیادہ سمجھتے تھے۔ کہئے! اس کا کیا جواب تھا؟ اس سے اور آگے بڑھے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حدیث، قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اسلئے اصل دین حدیث قرار پا گئی اور قرآن اس کے تابع چلا گیا۔ یعنی قرآن ان لوگوں کی خود ساختہ مظنونات کے تابع ہو گیا۔

جب تک روایات سازی کا یہ سلسلہ زبانوں تک محدود رہا ان میں ہر آن اضافے ہوتے رہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہیں کتابوں میں درج کر دیا گیا جس سے مزید روایات سازی کا سلسلہ رک گیا۔ لیکن مذہب کو ابھی مزید اسناد کی ضرورت رہتی تھی۔ ملوکیت کے نت نئے تقاضے اس کے مقتضی تھے کہ اس کی تقویت کے لئے تازہ ترین اسباب مہیا کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔

ائمہ پرستی

دین کا نظام یہ تھا کہ قرآن میں اصولی قوانین دے دیئے گئے تھے جن کی روشنی میں جزئی احکام اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق، ملت نے خود مرتب کرنے تھے[1]۔ یہ تدوینِ جزئیات، تفقہ فی الدین (دین کے اصولی قوانین پر غور و فکر کرنے) سے ہوتی تھی۔ یہ جزئیات مرکزِ نظامِ ملت کی طرف سے مرتب اور قانون کی شکل میں نافذ ہوتیں۔ اسی کو اسلامی شریعت کہتے ہیں۔ دین کا نظام ختم ہوا تو مذہب نے اپنی تقویت کے لئے، روایات کے بعد اس "تفقہ" (فقہ) سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان فقہی احکام کی سند کے لئے رسول اللہ ﷺ تک بھی نہیں پہنچنا پڑتا تھا۔ ان کی نسبت "ائمہ فقہ" میں سے کسی کی طرف کرنی ہوتی تھی اور ائمہ فقہ میں جسے جی چاہے شامل کر لیا جا سکتا تھا۔ اب رسول پرستی سے آگے بڑھے تو ائمہ پرستی شروع ہو گئی۔ اس میں ملوکیت اور مذہبیت کو اپنی تقویت کے لئے اور بھی زیادہ سامان مل گیا۔

تصوف

روایات اور فقہ میں کسی حکم کی سند کو رسول اللہ ﷺ یا کسی امامِ فقہ تک بہرحال پہنچانا پڑتا تھا۔ اس میں بعض اوقات دشواریاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ روایات کتابوں میں مدون ہو چکی تھیں۔ فقہی مسائل بھی رفتہ رفتہ کتابوں میں جمع ہو گئے اور ائمہ کی فہرست بھی محدود ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع ہو گیا کہ اب کسی اور کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں۔ یہ راستہ بند ہوا تو ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں کسی حکم کے لئے کسی سند کی ضرورت ہی نہ تھی، یہ تھا سلسلہ کشف و الہام۔ ایک بزرگ کہہ دیتا تھا کہ مجھے یہ بات کشف سے معلوم ہو گئی ہے۔ اور کشف سے مراد تھی براہِ راست خدا سے ہمکلامی۔ یا وہ "علمِ لدنی" جو بغیر ظاہری اسناد کے رسول اللہ ﷺ سے سینہ بسینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یعنی ختمِ نبوت کا عقیدہ بھی اور خدا سے ہم کلامی کا دعویٰ بھی۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق خدا کے اس حکم پر بھی ایمان ہو کہ

---

[1] تفصیل اس اجمال کی میرے مضمون "اسلامی نظام" اور اس کے تضمنات میں ملے گی جو طلوعِ اسلام میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

بلغ ما انزل علیك (جو آپ پر وحی کیا جاتا ہے اسے سب تک پہنچا دو) اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی کہ رسول اللہؐ نے "دین کا مغز" کھلے بندوں دنیا تک نہیں پہنچایا تھا۔ اسے سربستہ راز کے طور پر اس طرح سینہ بہ سینہ آگے منتقل کیا تھا کہ کسی اور کو خبر نہ ہونے پائے۔ یہ تھا تصوف۔ اس میں "مذہب" اپنے مقصد میں اور بھی کامیاب ہو گیا۔ یعنی مذہب کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے کہ دنیاوی امور دنیا داروں کے لئے ہیں اور مذہب کا کام انسان کی عاقبت سنوارنا ہے۔ تصوف میں یہ عقیدہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کشف و کرامات یہ خدا سے ہم کلامی اور رسولؐ کے علم لدنی کی وراثت صرف اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو دنیا کو یکسر ترک کر دے۔ جس کے دل میں دنیا کا ذرہ بھر بھی خیال باقی رہا وہ اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس مسلک نے ملوکیت کو یکسر بے لگام کر دیا۔ اسی جہت سے ہم نے تصوف کو مذہب کی انتہائی شکل قرار دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر دین کا تصور کسی دھندلی سی شکل میں بھی باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی رو سے مقصد زندگی قرار پاتا ہے انفرادی نجات۔ اور تصوف کی رو سے انفرادی نجات (تزکیۂ نفس) کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے ترک دنیا۔ ترک لذات!

اختلافات

جس نظریہ یا پروگرام کی صداقت کا معیار اس کے بدیہی اور ٹھوس نتائج ہوں، اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا میں بیس مختلف مقامات پر سائنسدان، اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں، پانی کا تجزیہ کر رہے ہوں۔ ان سب کا نتیجۂ عمل ایک ہو گا اس لئے اس باب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ ٹھوس حقائق کی دنیا (MATTER OF FACT WORLD) سے الگ ہو کر محض نظری اور مجرد (ABSTRACT) مباحث میں الجھ جائیں۔ دین کا نظام اپنی صداقت کیلئے ٹھوس نتائج کو معیار قرار دیتا تھا جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے تھے۔ لہٰذا دین میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک قانون۔ ایک نظام۔ اس پر عمل پیرا ہونے والوں کی ایک جماعت۔ ایک نہج فکر، ایک طریق کار، لہٰذا ایک ہی نتیجہ، پھر تشتت و انتشار اور تباین و افتراق کہاں سے آسکتا تھا؟ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مذہب کی ساری گفتگو "آخرت" سے متعلق تھی۔ اور آخرت کسی کی آنکھوں کے سامنے تھی نہیں جو یہ معلوم ہو جاتا کہ مذہب کے دعاوی صحیح ہیں یا غلط۔ مثلاً ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ یوں نماز پڑھئے اس سے آپ کی نجات ہو جائے گی۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ نہیں یوں نہیں، یوں پڑھئے۔ تب آپ کی نجات ہو گی۔ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کس طریق سے آپ کی نجات ہو گی۔ لہٰذا نظری عقائد اور ان اعمال و رسوم میں جن کے نتائج اگلی دنیا پر اٹھا رکھے جائیں اختلاف لازمی ہے۔ اسلئے اگر دین کی امت واحدہ، مذہب میں پہنچ کر بہتر فرقوں میں بٹ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ یہ تفریق و تقسیم، یہ تحزب و تشیع، ایسی چیز تھی جس سے مذہب کو اپنی گرفت کی محکمی میں کچھ خطرہ ہو سکتا تھا لیکن اس کے پاس ان خطروں کی روک تھام کے لئے بڑے بڑے مقدس حربے موجود تھے۔ اس نے جھٹ سے عربی کا ایک فقرہ (اختلاف امتی رحمۃ۔ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔) تراشا اور اسے منسوب کر دیا اس ذات گرامیؐ کی طرف جس کی بعثت کا مقصود تمام نوعِ انسانی کی وحدت تھی۔ جب یہ فقرہ حدیث بن گیا تو اختلاف کے رحمت ہونے میں کیا شبہ باقی رہا؟ قرآن اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا تھا۔ لیکن اس حدیث نے اسی شرک کو عینِ رحمت بنا کر دکھا دیا۔

یہ کچھ مذہب کی طرف ہو رہا تھا۔ دوسری طرف دنیا والے (ارباب ملوکیت) باہم خانہ جنگیوں میں مصروفِ پیکار تھے۔ دین میں اقتدار اشخاص کے ہاتھوں میں نہیں رہتا لیکن ملوکیت میں تمام کا تمام اقتدار و اختیار انسانوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ جب قوت کسی ایک انسان کے ہاتھ میں آجائے تو ہر شخص یہی چاہے گا کہ وہ قوت اس کے ہاتھ میں ہو۔ لہٰذا ملوکیت کے نظام میں حکومت کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ مذہب نے حالت یہ پیدا کردی کہ ملت کی عظیم اکثریت کو امورِ دنیا سے نفرت دلا کر "عاقبت سنوارنے" کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا۔ اور نظری مباحث سے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرکے، انہیں گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔ دوسری طرف دنیا سمٹ کر چند افراد یا چند خاندانوں کے قبضہ میں آگئی اور ان میں اس کی تقسیم پر باہمی کشت و خون شروع ہوگیا۔

لہذا جب امن ہوتا تھا تو ملت، مذہبی مباحثات و مناقشات میں الجھی رہتی تھی اور جب ارباب اقتدار میں باہمی جنگ ہوتی تھی تو مذہب اس جنگ کو جہاد کا نام دے کر ملت کو میدانِ جنگ میں لے جاتا تھا۔ جہاں ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے سینے میں پیوست ہوتی تھی اور اس طرح ان میں سے قتل کرنے والا غازی اور قتل ہونے والا شہید قرار دیدیا جاتا تھا۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما (۹۳/۴) "جو ارادۃً کسی مومن کو قتل کردے تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی، اور اس کے لئے سخت عذاب تیار رہے گا"۔ یہ خدا کا فرمان تھا۔ لیکن ارباب مذہب ان قاتلوں کو جنت کے پروانے تقسیم کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہی ملوکیت کا تقاضا تھا۔ مذہب کا منصب، ملوکیت کا استحکام ۔ اور اس طرح اپنی بقا تھا۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اگر کوئی شخص اس پر تھوڑے سے وقت کیلئے بھی خالی الذہن ہوکر غور کرے گا تو وہ بلا تامل اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ یہ سب باتیں خلافِ عقل و بصیرت تھیں۔ اس لئے اس کے دل میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ مذہب نے اس قسم کی باتوں کو منوا کیسے لیا۔ اسلام نہ سہی، وہ لوگ بالآخر انسان تو تھے۔ اگر وہ قرآنی بصیرت سے نہیں، محض انسانی دانش ہی سے کام لیتے تو مذہب کے ایسے کھلے ہوئے، کمزور حربوں کا کبھی شکار نہ ہوتے!

مذہب بھی اس خطرہ کو محسوس کرتا تھا اس لئے اس نے اس کی روک تھام کی بھی فکر کرلی تھی۔

مذہب میں عقل کو دخل نہیں

دین، اپنی دعوت کی شہادت کے لئے اپنے ٹھوس، تعمیری نتائج پیش کرتا تھا۔ اس لئے اس کی دعوت یکسر علی وجہ البصیرت تھی (ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی) لیکن یہی بصیرت مذہب کی دشمن تھی۔ اس لئے مذہب نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مذہب کی دنیا، شعور و ادراک کی حدوں سے ماوراء ہے۔ اس لئے ان معاملات میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ جو عقلی توجیہات طلب کرے گا وہ ابلیسی گروہ میں شامل ہوگا۔ اسلئے کہ اول من قاس ابلیس "جس نے سب سے پہلے عقلی قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا"۔ اس کے برعکس جنت بیوقوفوں کے لئے ہے (اھل الجنۃ بُلہٗ)۔ لہذا، جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے، سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کئے جاؤ۔ مذہب نے اپنے اولین مخاطب سے یہ کہا۔ اور اس کے بعد آنے والی نسلوں سے یہ کہ تم صرف یہ دیکھو کہ تمہارے اسلاف کی روش کیا تھی۔ تم آنکھیں بند کرکے ان کی تقلید کئے جاؤ۔ یہی راہ صواب ہے۔ یہی جنت کا سیدھا راستہ ہے۔

تقلید

یوں تو مذہب کی طرف سے لایا ہوا ہر نظریہ اور ہر تصور تباہی اور بربادی کا پیغام بر ہوتا ہے لیکن ان میں سے عقیدۂ تقلید کے اثرات سب سے زیادہ تباہ کن اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ غور کیجئے۔ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز شئے کون سی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقل ہے۔ اب جس نظریۂ زندگی میں عقل کو سلب کردیا جائے اس کی رو سے انسان، حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عقل و دانش سے کام نہ لینے والوں کو شر الدواب (بدترین خلائق) اور حیوانات سے بھی گئے گزرے ہوئے قرار دیا ہے (اولئک کالانعام بل ھم اضل)۔ تقلید سے انسان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا

دل تو ہوتا ہے لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ ولہم اعین لا یبصرون بھا۔ آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ ولھم اٰذان لا یسمعون بھا۔ کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے کبھی سنتے نہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ یہ سیدھے جہنم میں جاتے ہیں (۷/۱۷۹)
ان کا مسلک زندگی یہ ہوتا ہے کہ جس روش پر اپنے اسلاف کو دیکھا، گوش بند و چشم بند و لب بند، اس روش پر اندھا دھند چلے جاتے ہیں۔ انھم الفوا اٰباءھم ضالین۔ فھم علیٰ اٰثارھم یھرعون (۳۷/۶۹-۷۰)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے۔ ثم ان مرجعھم لا الی الجحیم (۳۷/۶۸) ذرا اس حقیقتِ کبریٰ پر غور کیجئے کہ قرآن نے اسلاف کی کورانہ تقلید کرنے اور اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے۔ جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کی تبیین کا یہ مقام نہیں۔ اس کے متعلق کسی دوسرے وقت گفتگو کی جا سکے گی[1]۔ اس وقت صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ کائنات میں ہر شے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی حادثے سے آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح، انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقا جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقا علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں جنھیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیق مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطل ہو جائیں تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی لہذا وہ قابلِ نمو ذی حیات کے بجائے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن کے رہ جاتی ہے اور مٹی اور پتھر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن، ارتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اور کسی ایک مقام پر رک جانے کا نام جہنم رکھتا ہے[2]۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اس نے جہنم کے ایندھن کے لئے الناس (انسان) اور حجارۃ (پتھروں) کو ایک ہی شق میں شمار کیا ہے (وقودھا الناس والحجارۃ)۔ قانونِ ارتقا کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ جس عضو سے کوئی ذی حیات کام لینا چھوڑ دے، رفتہ رفتہ فطرت اس عضو کو بیکار سمجھ کر اس کی افزائش (بلکہ پیدائش) ہی روک دیتی ہے۔ اس طرح جب کوئی قوم سوچ سے کام لینا ترک کر دے تو کچھ نسلوں کے بعد اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے تقلید کا وہ تباہ کن اور دُور رس اثر جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس سے صرف موجودہ نسل ہی تباہ نہیں ہوتی اُس قوم کی آنے والی نسلیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ اس قوم میں انسان پیدا ہی نہیں ہوتے حیوان پیدا ہوتے ہیں اور حیوان ہی مر جاتے ہیں۔ تقلید کی انہی ہلاکت آفرینیوں اور تباہ کاریوں کے پیش نظر قرآن نے اس شدومد سے اس کی مخالفت کی ہے کہ باید و شاید۔ اس نے بتایا ہے کہ ہر رسول کا پیغام تقلید کی مخالفت کرتا تھا اور اسی بنا پر ان کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ وہ مقلدین کو علم و دانش (یعنی دین) کی طرف دعوت دیتے تھے اور یہ اسلاف کی تقلید کو حسن کارانہ شیوۂ زندگی ٹھہراتے تھے۔ خدا کے رسول اس قوم کو اس مسلک کے خلاف جھنجھوڑتے تھے اور قوم اتنی ہی سختی سے اس کی مخالفت کرتی تھی۔ ان کی مخالفت بھی بجا تھی۔ علم الحیوانات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کبھی چمگادڑ (خفاش) کی آنکھیں بھی دوسرے پرندوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ چمگادڑوں نے ان سے کام لینا چھوڑ دیا تو اب ان کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی ہو گئی ہے کہ وہ نورِ آفتاب کی تاب ہی نہیں لا سکتے۔ اس لئے ان کا

---

[1] دیکھئے میرے مقالات "نجات" اور "ارتقاء"۔ مطبوعہ طلوع اسلام بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۵۱ء
[2] جہنم کے مرادف عربی لفظ جحیم ہے جس کے معنی روک دینے کے ہیں۔

سب سے بڑا دشمن سورج ہوتا ہے۔ وہ تو یوں کہئے کہ ان کا بس نہیں چلتا، ورنہ وہ کبھی سورج کو افق سے ابھرنے نہ دیں۔ رسولؑ دین کی روشنی عطا کرتے تھے اور ان لوگوں کی حالت چمگادڑوں کی طرح ایسی ہو چکی تھی کہ انھیں اس روشنی سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اس لئے یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کا یہی پیغام تھا اور ہر رسول کی اسی طرح مخالفت ہوتی رہی۔ وہ حضرت نوحؑ کے متعلق کہتا ہے کہ جب انھوں نے دین کی روشنی کی طرف دعوت دی تو آپ کی قوم نے اس دعوت کا یہی جواب دیا کہ ما سمعنا بھذا فی اٰبائنا الاولین (۲۳/۲۴) "ہم نے یہ بات اپنے اسلاف کے ہاں نہیں سنی" اس لئے ہم اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا جب آپ کی قوم نے کہا کہ اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا (۱۱/۶۲) کیا تو ہمیں ان کی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبودیت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں؟" یہی کچھ قوم شعیبؑ نے کہا (۱۱/۸۷) یہی جواب حضرت موسیٰؑ کو ملا۔ قالوا اجئتنا عما وجدنا علیہ اٰباءنا (۱۰/۷۸) "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو دیکھا ہے؟" یہی قوم حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قالوا وجدنا اٰباءنا کذالک یفعلون (۲۶/۷۴) "انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے"۔ یہی جواب حضور نبی اکرمؐ کو ملا۔ سورۂ لقمان میں ہے:-

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اٰباءنا (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی کی اتباع کریں گے جس کی اتباع ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔

غور کیجئے۔ قرآن نے دین اور مذہب کا فرق کتنی وضاحت سے بتایا ہے۔ مذہب، اسلاف پرستی (تقلید) سکھاتا ہے۔ دین اس تقلید سے روکنے کے لئے آتا ہے تاکہ انسان، وحی کی اصولی روشنی میں، اپنی عقل و خرد سے کام لے کہ یہی شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت ہے۔ لیکن قرنہا قرن کی تقلید نے ان کی آنکھوں کو چمگادڑ کی آنکھیں بنا دیا ہوتا ہے، اس لئے انھیں روشنی سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور وہ اس کی مخالفت میں چلا اٹھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کی دعوت کے ساتھ یہی ہوتا رہا (۴۳/۲۳) وہ تاریخی نظائر و شواہد سے بتانا یہ چاہتا ہے کہ تقلید سے انسان کی نگاہ ایسی غلط انداز ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی، اسے مارِ سیاہ بن کر دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔ تقلید میں چونکہ مستقبل تاریک اور ماضی درخشندہ نظر آتا ہے۔ اس لئے انسان کی نگاہیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف رہتی ہیں۔ اس کا منہ الٹا ہوتا ہے (یعنی آنکھیں گدی کی طرف ہوتی ہیں) یہی جہنم کی زندگی ہے۔ یوم تقلب وجوھھم فی النار (۳۳/۶۶) "جس دن ان کے چہرے جہنم میں اُلٹے کر دیئے جائیں گے"۔ یہی وہ اوندھے منہ چلنے والے ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے کہ افمن یمشی مکبا علیٰ وجھہ اھدیٰ امن یمشی سویا علیٰ صراط مستقیم (۶۷/۲۲) "کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلا جا رہا ہو سیدھے راستہ پر ہے یا وہ جو ہموار و متوازن راہ پر سیدھا چلا جا رہا ہو"۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ تقلید سے رسومِ کہنہ کے طوق و اغلال اس بری طرح سے گردن کو جکڑے رہتے ہیں کہ ان سے گردن اوپر کی اوپر اٹھی رہتی ہے اور انسان کو اپنے سامنے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ انا جعلنا فی اعناقھم اغلالاً فھی الی الاذقان فھم مقمحون (۳۶/۸) "ہمارے قانون نے ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال رکھے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک چڑھ گئے ہیں جس سے ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ان کے سر اوپر کے اوپر کو اٹھے رہتے ہیں"۔ اور یہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وہ اطواق و اغلال تھے جنھیں اتارنے کے لئے رسول اکرمؐ تشریف لائے تھے۔ (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم ۷/۱۵۷)۔ جب ایک عرصہ کی تقلید سے قوم کے قوائے فکریہ اس طرح مفلوج ہو جاتے ہیں کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ تو قرآن کے الفاظ میں، اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینٰھم

فہم لا یبصرون ([illegible])" ہمارا قانونِ فطرت' ان کے سامنے بھی دیواریں کھینچ دیتا ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور (ان کی عقل و خرد پر) پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور ان کی بصارت سلب کر لی جاتی ہے۔"

اسی حقیقت پر بانداز دگر غور کیجئے۔ ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا کہ ہر نسل اپنے لئے آپ راہیں تراشے۔ عام راستوں سے ہٹ کر سوچنے والے انسان (یعنی مقاصد کی تخلیق کرنے کے اہل دماغ) بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اسی لئے ہر آنے والی نسل کے لئے یہی راہ آسانی اور احتیاط کی تھی کہ وہ اپنے اسلاف کی باتوں کو جمع کر کے ان پر عمل پیرا ہوتی رہے۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں زندگی کی رفتار ایسی سست تھی کہ نئے تقاضے جلدی جلدی سامنے نہیں آیا کرتے تھے۔ قرآن نے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ اب عقل و علم کے خزانے عام کر دیئے گئے ہیں۔ اب ذہنِ انسانی سنِ رشد و بلوغت کو پہنچ چکا ہے' اسلئے اب انسانوں کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ استقرائی علم سے اپنی راہیں آپ تراشے۔ اس نے انسانی سعی و کاوش کو ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچانے کے لئے وہ[1] مستقل اصول دیدیئے جو مرورِ زمانہ سے تغیر پذیر نہ ہوں' اور کہہ دیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر نسل اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل آپ تلاش کرے۔ گزشتہ نسلوں کا تجربہ (جسے تاریخ کی یادداشتیں کہتے ہیں) بھی کارآمد شے ہے اس لئے قرآن نے اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ لیکن اس تجربے سے مستفید ہونے اور آنکھیں بند کر کے پرانی ڈگروں پر چلے جانے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ دین کا نظام تھا لیکن مذہب نے آنے والی نسلوں کو اسلاف کی تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر، بڑھنے والی انسانیت کو پھر وہیں پہنچا دیا جہاں وہ انسان کے عہدِ طفولیت میں تھی اور اس طرح وہ انسان کی تاریخ کو ہزاروں سال پیچھے کی طرف لے گیا۔

مذہب تقلید کے عقیدہ سے انسانوں کو اس مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ ایسی قوم میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی کیسے رہ سکتی ہے؟

جذباتِ نفرت

اب آگے بڑھئے۔ دنیا سے تنفر اور علم و عقل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قابلِ نفرت بن جاتی ہے۔ چنانچہ مذہب پرست لوگوں کی نگاہ میں کائنات کے ہر گوشے میں شر ہی شر دکھائی دیتا ہے۔ انھیں ہر حسین شے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ انھیں موت کا آئینہ دار اور ہر گلفشاں پیشانی انھیں جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے۔ جب بہار خوشی کے جھولے جھولتی ہے تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ جب چاندنی مسکراتی ہے تو وہ منہ بسور لیتے ہیں۔ ان کے بجھے ہوئے چہرے اور نورِ مسرت سے محروم آنکھیں صاف بتا رہی ہوتی ہیں کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی آرزوؤں کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں!

حسنِ فطرت

ادب، موسیقی، آرٹ، سائنس، زیبائش و آرائش کے شگفتہ اسباب و ذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔ دین، کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حُسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے آتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح انداز میں رکھی گئی ہے۔ جب ہر شے اپنے مقام پر رہے تو اس کا ماحصل حسنِ کائنات ہوتا ہے۔ اس حسن (موزونیت) کے قیام و افزائش کے لئے، اور تو اور ابلیس کی بھی اپنے مقام پر ضرورت ہوتی ہے کہ حسن کی جلال آفرینیاں اور شعلہ انگیزیاں اسی کے ردِعمل سے جلوہ تاب ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خیر سے خیر شے کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ شر بن جاتی ہے۔ حسن موزونیت کا نام ہے اور موزونیت یہی ہے کہ ہر شے اپنے صحیح مقام پر ہو۔ پسکال کے الفاظ میں "اگر قلوپطرا کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو تاریخِ دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔" دین یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے موٹر کار میں، پٹرول کے ساتھ موبل آئل بھی لابنفک ہے۔ خیر اس وقت پیا

---

[1] علامہ اقبال اسے ...... (ECONOMISING HUMAN EFFORTS) کہتے ہیں۔

ہوتا ہے جب موبل آئل پٹرول کے ٹینک میں بھر دیا جائے۔ پھر گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

حدود اللہ

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ آپ قرآن میں دیکھئے۔ صرف چند چیزیں ہیں جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند باتیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔ اس میں اوامر و نواہی کی فہرست نہایت مختصر ہے۔ باقی امور کے متعلق صرف حدود (BOUNDARY LINES) کھینچ دی گئی ہیں اور انسانی فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنی دنیا، اپنی صوابدید کے مطابق آپ پیدا اور آباد کرے۔ قرآن، حریت فکر پر کم از کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا مقصود انسانی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ قد افلح من زکھا (جس نے نفسِ انسانی کی صلاحیتوں کو ابھارا اس کی کھیتی ثمر بار ہوئی)۔ اس کے برعکس مذہب کو دیکھئے تو وہ انسانی زندگی کے ایک ایک سانس پر داروغے مقرر کر دیتا ہے۔ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنی عقل و فکر سے کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ بچہ کی پیدائش سے لیکر انسان کے مرنے تک (بلکہ مرنے کے بعد تک بھی) ایک ایک قدم پر اپنا حکم نافذ کرتا رہتا ہے۔ دایاں قدم اٹھاؤ، تو یہ کرو۔ بایاں اٹھاؤ تو یہ پڑھو۔ پانی پیو تو یوں کرو۔ روٹی کھاؤ تو یہ کرو۔

حرام و حلال

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دین نے چند چیزوں کو حرام قرار دیا تھا لیکن مذہب میں حلال اور حرام کی فہرستوں کو دیکھو کتابوں پر کتابیں بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ قرآن میں[1] مردار، بہتے ہوئے لہو، لحم خنزیر اور غیر اللہ کی طرف منسوب کردہ اشیاء کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا ہے کہ ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب (۱۶/۱۱۶)" اور دیکھو۔ ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جو جھوٹی بات آجائے اسے بے دھڑک کہہ دیا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ چیز حرام۔ اس طرح (حرام حلال ٹھہرانا) اللہ پر افترا پردازی ہے (اس لئے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرانا تھا، وہ اس نے حرام قرار دیدی ہیں) کسی شے کو انسانوں کیلئے حرام قرار دیدینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی آزادی کو بری طرح سے جکڑنا ہے۔ اس لئے دین میں یہ اختیار کسی انسان کو نہیں دیا جاتا۔ اس کا اعلان ہے کہ

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق (۷/۳۲)

ان سے پوچھو کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟

یعنی خدا کہتا ہے کہ ہمارے سوا اور کون ہے جو کسی چیز کو حرام قرار دے سکتا ہے[2]؟ مذہب کے اجارہ دار خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو چیز حرام قرار دیتے ہیں؟ وہ خدا سے علی الرغم کہتے ہیں کہ تم اپنی حرام کردہ چیزوں کی فہرست کو دیکھو اور پھر ہماری فہرستوں پر نگاہ ڈالو۔ خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ حرام قرار دینے کے اختیارات کس کے وسیع ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ دین جب ملوکیت اور مذہب میں بٹ جاتا ہے تو وہ اختیارات جو خدا نے صرف اپنے قانون تک محدود رکھے تھے، انسانی ہاتھوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ارباب حکومت اپنے دائرہ میں انسانوں کو اپنا محکوم بناتے ہیں۔ اور ارباب مذہب اپنے دائرہ میں انہیں اپنے تابع فرمان رکھتے ہیں۔ یہ حرام، وہ حلال، یہ کرو، وہ نہ کرو سب مذہب کے استبدادی فرامین ہیں جو شاہی احکامات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی گرفت کی شدت میں ان سے زیادہ محکم۔ اس لئے کہ شاہی فرامین کا اثر تو وقتی ہوتا ہے لیکن مذہب کا استبداد دل کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ لیکن مذہب کا غلبہ و تسلط ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ تخت و تاج کی حکومت میں وہ لذت کہاں جو مسانید فتاویٰ کی حکومت میں ہے۔

---

[1] ان اشیاء کی حرمت کی کیا وجہ ہے، اس کے متعلق کسی اور موقعہ پر لکھا جائے گا۔

[2] قرآن تو رسولؐ کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ تا بدیگراں چہ رسد!

خدا نے انسان کو اختیار وارادہ عطا کیا تھا۔ دین کا نظام اس اختیار وارادہ میں وسعتیں عطا کرتا اور اس سے ایسے نتائج پیدا کراتا تھا جن سے انسانیت کو عروج وارتقار حاصل ہو۔ مذہب اپنے استبدادی احکام سے اس اختیار وارادہ کو کچلتا ہے۔ لہٰذا مذہب یکسر غیر انسانی زندگی بسر کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے۔ جب آپ خلافِ انسانیت زندگی پر مجبور کئے جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

(۱) یا تو آپ کی انسانیت مسخ ہو جائے گی اور آپ شرفِ اختیار وارادہ کو چھوڑ کر جمادات ونباتات کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے۔ (مذہب میں قوم کی اکثریت کی یہی حالت ہو جاتی ہے اس لئے وہ تقلید پر رضامند ہو جاتے ہیں)

(۲) یا آپ ان مستبدانہ پابندیوں سے ایسی سرکشی اختیار کر جائیں گے کہ پھر آپ ان حدود کا بھی احترام نہیں کریں گے جو دین نے نظامِ انسانیت میں ربط وضبط پیدا کرنے کے لئے اصولی طور پر متعین کئے ہیں (اس قسم کے سرکش وبے باک انسان بالعموم مذہب گزیدہ ہوتے ہیں)

(۳) اور یا پھر منافقت کی زندگی بسر کریں گے۔

منافقت شقِ سوم ذرا تفصیل طلب ہے جس طرح ملوکیت کے استبداد میں منافقانہ زندگی، خوشامد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح مذہب کی دنیا میں منافقانہ زندگی بھی خوشامدانہ مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں خدا کا تصور ایک جابر ومستبد بادشاہ کا سا قائم ہو جاتا ہے جس سے انسان ڈرتا ہے، خوف کھاتا ہے، اس لئے اسے خوش رکھنے کے لئے اس کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے حضور چڑھاوے چڑھاتا ہے (مذہب میں نماز، روزہ، صدقہ، خیرات اسی خوشامدانہ مسلک کے مظاہر بن جاتے ہیں) اور اس طرح انسان بزعمِ خویش خدا کو خوش کر لیتا ہے۔ اب رہیں مذہب کی غیر فطری پابندیاں۔ انھیں توڑنے کیلئے اس کا جی للچاتا ہے۔ لیکن مذہبی زندگی کا تقدس اسے علانیہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اس کے لئے وہ فریب کارانہ راہیں تلاش کرتا اور بہانے تراشتا ہے۔ وہ حسنِ فطرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیف اندوز نہیں ہوتا، کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ موسیقی کو حرام قرار دیتا ہے لیکن مزامیر (سازوں) کے بغیر سن لینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ آرٹ اس کے نزدیک سخت قابلِ نفرت شے ہے لیکن "ہاف ٹون تصویر"[1] اتروا لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ حسن اور اس کی نیرنگیوں کا تصور تک بھی اس کے نزدیک جہنم میں پہنچا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن وہ ایک "معشوقِ حقیقی" کی فریبانگیز اصطلاح میں حسن کی شعبدہ کاریوں اور بادۂ گلفام کی کیف باریوں کے سرور آور تذکرے جھوم جھوم کر سنتا ہے اور اس طرح ذہنی تعیش سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات، نفسیاتی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس قسم کے غیر فطری دباؤ (REPRESSION) سے جنسی بدنہادی (SEX PERVERSION)[2] پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے مظاہرے بڑے گھناؤنے ہوتے ہیں۔ اسی جنسی بدنہادی کا نتیجہ ہے کہ غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کے مدعی دھڑا دھڑ شادیاں کئے چلے جاتے ہیں اور بے حد وشمار لونڈیوں سے متمتع ہونا عین

---

[1] تصویر کے مسئلہ پر ایک مرتبہ، ہندوستان کی ایک نامور مذہبی ہستی نے تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ اوپر کے دھڑ (BUST) کی تصویر اتروانا جائز ہے (اس لئے کہ اس وقت تک ان کی اپنی تصویریں شاید اسی انداز کی اتری ہوں گی) انھیں ذرا ماڈرن بننے کا بھی شوق ہے۔ اس لئے "آدھے دھڑ" کی بجائے انگریزی کی اصطلاح استعمال کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انھوں نے "ہاف ٹون" لکھ کر اپنی انگریزی دانی کا مضحکہ اڑایا تھا۔

[2] (SEX PERVERSION) کے لئے کوئی موزوں لفظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ بدنہادی، اس کا پورا پورا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے مسخ شدہ فطرت، یا غیر فطری راہوں پر چل نکلنا، اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ بھی (PERVERSION) کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ غوایت کی مکروہ ترین شکل ہوتی ہے۔

"شریعت حقہ" کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ آپ کتب فقہ و روایات کو دیکھئے۔ ان کا کتنا بڑا حصہ جنسیات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ان کا ذکر ایسی تفاصیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر بے حیائی کی آنکھیں بھی جھک جائیں۔ دینؔ نے صرف وہ پابندیاں عائد کی تھیں جو انسانی معاشرے کے نظم و ضبط کے لئے لاینفک تھیں۔ اور ان کا نتیجہ غیر فطری دباؤ نہیں بلکہ دریا کو طغیانیوں سے بچانے کے لئے اس کے ساحلوں کا تعین تھا۔ مذہب نے اپنے غیر فطری استبداد سے اس دریا کے سامنے بند لگادیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پانی زمین دوز راہوں میں جا چھپا اور جہاں اسے نرم زمین دکھائی دی وہیں سے سر نکال لیا کہ ابھار پانی کی فطرت کا تقاضا تھا۔ آپ اس تقاضے کو روک نہیں سکتے۔

پری رُو تاب مستوری ندارد　　چو در بندی، ز روزن سر برآرد

جن تباہیوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ تھیں جو مذہب نے خارجی دنیا میں پیدا کیں۔ اور جو خرابیاں اوپر مذکور ہیں وہ ہیں جو اس کی وجہ سے دلوں کی داخلی دنیا میں وجود پذیر ہوئیں۔ ان خرابیوں نے پوری قوم کی سیرت کو مسخ کر دیا۔ جب کوئی قوم ایک عرصہ تک اس قسم کی منافقانہ زندگی بسر کرنے کی خوگر ہوجائے تو اس قوم سے جرأت و جسارت، اور کشادگی و شگفتگی کے جوہر سلب ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ پست حوصلگی اور دوں ہمتی، تنگ نظری

مذہبی ضابطۂ اخلاق اور کوتاہ دامنی کے دنائت انگیز عیوب پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن مذہب ان عیوب کو محاسن بنا کر دکھانے کے لئے ایک اور حربہ استعمال کرتا ہے، جسے وہ ضابطہ اخلاق کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عاجزی اور ناتوانی کو خدا کے بندوں کی صفات قرار دیتا ہے۔ پست حوصلگی اور دوں ہمتی کا نام صبر اور توکل رکھتا ہے۔ فاقہ زدگی کو استغنا کے پرفریب نقاب میں چھپاتا ہے۔ بے عملی کی افیون کو تقدیر الٰہی کا تریاق بنا کر دکھاتا ہے۔ بزدلی کا نام "رنجاں مرنج" مسلک حیات رکھ دیتا ہے۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ ہر وہ فساد انگیز قوت جو رزق کے سرچشموں کو اپنے باپ دادا کی ملکیت قرار دے کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، اس قابل ہے کہ اس کی گردن مروڑ دی جائے۔ مذہب کا ضابطہ اخلاق اس قسم کی لوٹ کھسوٹ کو "ھذا من فضل ربی" کہہ کر ان ناہمواریوں دراز دستیوں کو کھلا لائسنس عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ مذہب کا دائرہ اثر و نفوذ زیادہ تر غریب طبقے تک محدود رہتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں سے وہ اپنے ضابطہ اخلاق کو نہایت آسانی سے منوا لیتا ہے۔ باقی رہے اس ضابطہ کے ایسے گوشے جن کا تعلق بالادست طبقے سے ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں امور دنیاوی کا نظم و انصرام ہوتا ہے۔ تو وہ انھیں وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے کہ ظلم کرنا برا ہے۔ غریبوں کو ستانا اچھا نہیں۔ ہر حقدار کو اس کا حق دینا ضروری ہے۔ سائل کو رد نہیں کرنا چاہئے۔ محتاج کو دھتکارنا معیوب ہے۔ مذہب اس باب میں اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے کہ بالادست طبقہ کو اس قسم کے وعظ کہتے رہنا ضروری ہے۔ اس کا نام اس نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" رکھ لیا ہے۔ جب بالادست طبقے کی طرف سے مفلوک الحال محتاجوں کی طرف کوئی بھیک کا ٹکڑا آپڑتا ہے تو مذہب ان کی شان میں قصیدے کہنے شروع کر دیتا ہے اور ان غریبوں اور محتاجوں کو جن کے حقوق کے غصب و نہب سے ان بالادستوں کی شان و شوکت قائم ہوتی ہے "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے خود ساختہ پرفریب مفہوم سے عمر بھر دعائیں دینے اور ان غاصبین کا بے دام غلام بنا رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ ہے اس ضابطہ اخلاق کی حقیقت جو مذہب کا عروۃ الوثقیٰ ہوتا ہے اور جسے وہ نہایت بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ اس کے متعین کردہ نظام (دین) کے ضابطہ کی ایک شق کی مثل کوئی قانون مرتب کرکے دکھاؤ اور دنیا ایسا قانون مرتب کرکے نہیں دکھا سکتی جس میں معاشی نظامِ حیات، مستقل اقدارِ سماوی سے اس طرح ہم آہنگ ہو۔ اس لئے دین اپنے نظام میں بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے۔ لیکن مذہب جس ضابطہ اخلاق کو پیش کرتا ہے وہ دنیا کی ہر قوم میں مشترک ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مذہب کا یہ دعویٰ کہ وہ دوسرے مذہب پر فوقیت رکھتا ہے، بالبداہت باطل ہوتا ہے۔ اسی لئے ابوالکلام صاحب آزاد نے مسلکِ گاندھوی کی تائید میں اپنے پورے زورِ خطابت کے ساتھ لکھا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں

ن" عالمگیر سچائیوں" سے مراد یہی ضابطہ اخلاق تھا۔ یعنی جھوٹ نہ بولو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ غریب کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ۔ یہ سچائیاں واقعی تمام
ذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس میں تو بلکہ مذہب کی بھی تخصیص نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو لامذہب کہتے ہیں اور خدا کی ہستی
ے کے بھی قائل نہیں وہ بھی ان "عالمگیر سچائیوں" کے معترف ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا بڑا مستحسن فعل ہے
بذا اگر اسلام بھی صرف وہی ضابطہ اخلاق پیش کرتا ہے تو اس کے اس دعوے کے معنی کیا ہیں کہ میری پیش کردہ تعلیم کی ایک شق کی مثل
بھی کوئی انسان پیش نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی پیش کردہ تعلیم اس عام اخلاقی ضابطہ سے ماورا کچھ ہے جس کی مثل و نظیر ناممکن
ہے۔ یہ تعلیم ہے وہ نظام ربوبیت جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے اور جس کی نظیر دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا (اس کی تفصیل میں اپنے اکثر
مضامین میں پیش کر چکا ہوں) عام ضابطہ اخلاق[1] اس نظام کی تمہیدات میں آجاتا ہے۔
دین، نظام زندگی پیش کرتا ہے۔ لیکن مذہب کے پاس بھی پیش پا افتادہ ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ چند رسوم مذہب
پرستوں کا ایک طبقہ (جسے تصوف والے اہل شریعت کہہ کر پکارتے ہیں)۔ . . . .
. . . اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے مذاہب سے برسرپیکار رہنے میں ہی اپنی بقا کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس ضابطہ
اخلاق سے قطع نظر کر کے غیر مذاہب والوں سے اپنے رسوم و مناسک کے اصلح و انفع ہونے پر مناظرے اور مباحثے کرتا رہتا ہے۔
لیکن مذہب کا دوسرا گوشہ، جسے تصوف کہتے ہیں، ان رسوم و مناسک کی اہمیت کو کم کر کے دوسرے مذاہب سے ضابطہ اخلاق کے
اشتراک پر آمادہ مفاہمت ہو جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ مفاہمت ایسی یک رنگ ہو جاتی ہے کہ رام اور رحیم ایک ہی سکہ کی دو
طرفیں قرار پا جاتی ہیں چونکہ تصوف کی دنیا تخیلات کی پیدا کردہ ہے اس لئے شاعری اسے خوب ہوا دیتی ہے۔ تصوف، شاعری کے
لئے نہایت وسیع میدان پیدا کرتا ہے اور شاعری تصوف کو حقیقت بنانے کے لئے وہ "دلائل" بہم پہنچاتی ہے جن کی حقیقت تشبیہات
سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ شاعری بے عمل قوم کے لئے زندگی کا پرسکون بہانہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ، شاعری ان
کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے، تصور ہی تصور میں زندگی کے مختلف مراحل و مدارج طے کئے جاتی ہے

---

[1] قرآن نے مومنین کی صفات عالیہ کے لئے اخلاق کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ یہ اصطلاح بعد میں علم الاخلاق کے معلمین کی وضع کردہ
ہے جنھوں نے اسے (ETHICS) یا (MORALS) کے مفہوم کے لئے وضع کیا۔ قرآن میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وانک لعلی خلق
عظیم (۶۸/۴)۔ (یعنی آپ خلق عظیم پر ہیں)۔ خُلق اور خَلق کا مادہ ایک ہی ہے۔ خلق کے معنی توازن قائم کرنا ہے۔ . . . . . .
(یہ CREATION) کے مفہوم سے الگ ہے۔ CREATOR کے لئے قرآن نے بدیع (السموات والارض) کا لفظ استعمال کیا ہے جس
کے معنی ORIGINATOR ہیں۔ لہذا خلق کے معنی توازن کے ہیں۔ خلیق متوازن کو کہتے ہیں۔ اس لئے حضورؐ کے متعلق جب فرمایا کہ
انک لعلی خلق عظیم تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ آپ میں مختلف انسانی قوتیں اپنے انتہائی توازن کو لئے ہوئے ہیں۔ اور یہی انسانیت کا کمال
ہے۔ اس سے بلند (اور مکمل) توازن ذات خداوندی میں ملتا ہے جہاں تمام قوتیں (جنہیں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے) اپنے انتہائی توازن کے ساتھ
مجتمع ہیں۔ اسماء کے ساتھ لفظ حسنیٰ اسی توازن کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ حسن نام ہی توازن کا ہے
نبی اکرمؐ نے جس قرآنی نظام ربوبیت کو قائم فرمایا وہ اسماء الحسنیٰ ہی کے توازن کا عکس اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس جہت سے بھی حضورؐ
خلق عظیم پر تھے۔ یعنی اس نظام کے حامل جو انتہائی توازن لئے ہوئے ہے۔
خلق کے اس مفہوم اور اخلاق (MORALS) کے عام مفہوم میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ دین نظام خلق (متوازن نظام) کو پیش کرتا
ہے اور مذہب اس ضابطہ اخلاق کو جو ہر جگہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

جب کبھی زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے، اس کے لئے کسی شاعر کا برجستہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

مذہب اس سادہ لوح قوم کو اس طرح نظریات میں الجھائے رکھتا ہے اور ملوکیت کو کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔

کفر بعد از ایمان جب قرآن کا الاوادین (عملی نظامِ حیات) مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ تمام جیتے جاگتے نتائج جو اس نظام کا فطری نتیجہ تھے، معدوم ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ یہ نتائج، قانون کے ساتھ وابستہ ہیں، کسی قوم کے نام یا اس کی تراش خراش کے ساتھ نہیں۔ لہذا جب اس قوم نے جو اس ضابطۂ حیات کی اصلیت پر یقین رکھتی تھی، اسے ضابطۂ زندگی ماننے سے عملاً انکار کر دیا تو اس پر کامرانیوں اور کامیابیوں کی راہیں مسدود ہو گئیں دیکھئے! قرآن نے اس حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ

کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانھم۔ بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کس طرح عروج و ارتقاء کی راہیں کھول دے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لانے کے بعد پھر اس سے (عملاً) انکار کر دے۔

وشھدوا ان الرسول حق۔ درآنحالیکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس نظامِ حیات پر عمل کرنے والے رسول کی جدوجہد نے کیسے تعمیری نتائج پیدا کئے تھے (حق)

وجاءھم البینات۔ اور اس طرح اس نظامِ زندگی کی واضح دلیلیں اس کے سامنے روشن ہو گئی تھیں۔

واللہ لا یھدی القوم الظالمین[1]۔ اللہ کا قانون اس قوم پر عروج و ارتقاء کی راہیں کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ پر نہیں رہنے دیتی (ظلم)

اولٰئک جزاءھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین (۳/۸۵-۸۶)۔ ان لوگوں کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتائجِ حسنہ سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کا قانون، اس قانون کو ٹھوس حقائق میں تبدیل کرنے والی کائناتی قوتیں اور انسانوں کا اجتماعی نظام پیدا کرتا ہے۔

ان آیات سے یونہی نہ گزر جائیے۔ یہ ایک عظیم الشان قانون کو بیان کرتی ہیں۔ "کفر بعد از ایمان" وہی ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ الذین جعلوا القرآن عضین (۱۵/۹۱)۔ وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے الگ الگ ٹکڑے کر دیئے۔ "اس نظامِ واحد کو دنیا اور آخرت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح ملوکیت اور مذہب وجود میں آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ دین کے نظام کے تمام ٹھوس نتائج سے محروم رہ گئے۔ ملوکیت اور مذہب، دونوں دین ہی کے الگ الگ ٹکڑے ہیں لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ ان دونوں میں دین کی کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی۔ پانی کی مثال پر پھر غور کیجئے۔ پانی کا فطری خاصہ ہے کہ وہ آگ بجھاتا ہے۔ لیکن

---

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشیئ فی غیر موضعہ المختص بہ (راغب) یعنی کسی شے کا اس مقام پر نہ رکھا جانا جو اس کے لئے مختص ہے جب کسی نظام کے پرزے اپنی اپنی جگہ پر نہ رہنے دیئے جائیں تو اس سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے جس کا نام فساد یا سوء ہے جو حسن یا اصلاح کی ضد ہے۔ قرآن نے سورۂ نمل میں ظلم کو سوء سے تعبیر کر کے حسن کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ دیکھئے (۲۷/۱۱)

اسی پانی کے اجزائے ترکیبی کو جب الگ الگ کر دیا جائے اور پانی کا قطرہ اس طرح، ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے تو ان اجزا کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ (آگ کو بجھانا تو ایک طرف) ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلنے کا سامان بہم پہنچاتی ہے (کوئی چیز آکسیجن کے بغیر جلتی نہیں)۔ یعنی پانی کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی جزو میں بھی پانی کی خاصیت (PROPERTY) باقی نہیں رہتی بلکہ اس کے برعکس خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دینؔ جب الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو اس کے دونوں ٹکڑوں (حکومت اور مذہب) میں سے کسی میں بھی دین کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ ان کی خصوصیات، دین کی خصوصیت کی ضد ہوتی ہیں۔ دینؔ، وحدت پیدا کرنے آیا تھا۔ ملوکیت اور مذہب نے، ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور یہ قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے کا فطری نتیجہ تھا (جسے عذاب کہا جاتا ہے)۔

قل هو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا و یذیق
بعضکم بأس بعض۔ انظر کیف نصرف الآیات لعلهم یفقهون (۶/۶۶)

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس پر قادر ہے کہ (اس کی خلاف ورزی کرنے سے) تم پر خارجی دنیا سے عذاب لے آئے یا داخلی دنیا (تمہارے پاؤں کے نیچے) سے۔ یا تم گروہوں میں بٹ کر خلط ملط ہو جاؤ (اور اس طرح تمہاری وحدت ختم ہو جائے) اور تم ایک دوسرے کی شدتِ قوت کا شکار ہو جاؤ۔ دیکھو! ہم کس طرح (تاریخی شہادات سے) ان حقائق کو پھیر پھیر کر تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم ان پر غور و فکر کرو۔

اربابِ مذہب، نتائج کو اعمال سے اتنا دور لے گئے کہ انھوں نے سب کچھ "آخرت" پر اٹھا رکھا۔ اس لئے ان کا دنیا میں کچھ حصہ نہ رہا اہلِ حکومت نے اپنی تمام توجہات قریبی مفاد (دنیا) پر ہی مرتکز کر دیں۔ اس لئے ان کا حال تو خوشگوار ہو گیا۔ لیکن مستقبل روشن نہ ہو سکا اس لئے کچھ عرصہ کے بعد ان سے حکومت و سلطنت بھی چھن گئی۔ غور کیجئے۔ قرآن نے حال (دنیا) اور مستقبل (آخرت) کے اس فرق کو کس قدر نمایاں اور حال کے پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھنے والوں کے مآل کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے،

یا ایها الذین آمنوا ما لکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل الله اثاقلتم الی الارض۔ ارضیتم بالحیاة
الدنیا من الآخرة۔ فما متاع الحیاة الدنیا فی الآخرة الا قلیل (۹/۳۸)

اے وہ جو ایمان کے دعویدار ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ[1] میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ کیا تم مستقبل سے بے فکر ہو کر قریبی مفاد کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو (تم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ) قریبی مفاد تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

اگر تم اس روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

الا تنفروا یعذبکم عذابًا الیمًا و یستبدل قومًا غیرکم ولا تضروه شیئًا والله علیٰ کل شیءٍ قدیر (۹/۳۹)

اگر تم نے (مستقبل کی تابناکی کے لئے) قدم نہ اٹھایا تو یاد رکھو خدا کا قانون تمہیں اس کی بڑی دردناک سزا دے گا۔ یعنی تمہاری جگہ وہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم (اس انحراف سے) خدا (کے قانون) کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے (خود ہی تباہ ہو گے)۔ اللہ کا قانون ہر عمل کو اس کے نتیجہ کے ساتھ موافق کر دیتا ہے۔ (قدر)

---

[1] فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ) کے قرآنی مفہوم کے لئے آپ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا ہو گا۔ سر دست اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن اس اصطلاح کو بالعموم اجتماعی نظام کے لئے استعمال کرتا ہے جس کی بنیادیں مستقل اقدار (وحی) پر ہوں۔

چنانچہ اس طرح، رفتہ رفتہ ان کی وسیع و عریض حکومتیں یا ختم ہو گئیں یا سمٹ سمٹا کر چھوٹی چھوٹی جاگیر داریوں میں تبدیل ہو گئیں جن کی بقا آج دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ جب تک اقوامِ مغرب کی سیاسی مصلحت کوشیوں کا تقاضا ہو یہ جاگیر داریاں قائم رہیں گی۔ جب ان کے مصالح کا تقاضا دوسرا ہوا انہیں ختم کر دیا جا سکتا ہے۔ جوں جوں سلطنتیں مٹتی گئیں (یعنی امورِ دنیا دوسروں کے ہاتھوں میں چلے گئے) قوم زیادہ سے زیادہ مذہب پرست بنتی گئی۔ چنانچہ آج ساری دنیا کے مسلمانوں کی یہی حالت ہے، جہاں جہاں ان کی حکومتیں باقی ہیں، ملوکیت اپنی بدترین شکل میں موجود ہے۔ اور جہاں حکومتیں ختم ہو گئی ہیں وہاں مذہبیت اپنے جذام کو لئے ہوئے ان پر مسلط ہے۔ حکومتیں آپس میں برسرِ پیکار رہیں اور مذہب پرست گروہ آپس میں نبرد آزما۔ ان کا تمام معاشرہ، علمی سرمایہ، ان کے تصوراتِ حیات، ان کے نظریاتِ زندگی۔ سب کے سب افسردگی کے پیغامبر دار ہیں اور موت کے نقیب۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

اور یہ اس لئے کہ

حقیقت، خرافات میں کھو گئی — یہ امت، روایات میں کھو گئی

غور و تدبر | قرآن نے مسلمانوں کو قدم قدم پر دعوتِ فکر دی تھی۔ زمین و آسمان میں فکر، انفس و آفاق میں فکر، دنیا اور آخرت میں فکر۔

کذالک یبین اللہ لکم الایات لعلکم تتفکرون ۰ فی الدنیا والاخرۃ (۲/۲۱۹)

اس طرح اللہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔

اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر تم "عذاب النار" سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ارض و سما میں غور و فکر کرو۔ اسی غور و تدبر سے تم اس قانونِ خداوندی کا مطالعہ کر سکو گے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، اور جب تم یہ معلوم کر لو گے کہ کائنات میں کونسا قانون نافذ العمل ہے جس سے یہ محیر العقول سلسلہ اس قدر متوازن و ہموار، اپنی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتے جا رہا ہے، تو تم یہ بھی معلوم کر لو گے کہ تمہیں اپنی حیاتِ اجتماعیہ میں اس ہمہ گیر قانون کو کس طرح ایک موثر حقیقت بنانا ہے یہی "اللہ کے ذکر" سے مفہوم ہے۔

ان فی خلق السماوات والارض۔ واختلاف اللیل والنھار لایات لاولی الالباب ۰ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السماوات والارض۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ سبحانک فقنا عذاب النار (۳/۱۸۹-۱۹۰)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض و سماوات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردشوں میں، اربابِ دانش و بینش کے لئے (ارتقاء کی سیدھی راہوں کے) نشانات ہیں۔ وہ اربابِ دانش جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہمیشہ ارض و سماوات کی تخلیق پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اور اس انداز کے گہرے تدبر و تفکر کے بعد اس حقیقت کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ کے نشو و نما دینے والے قانون نے کائنات کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تخریبی پہلو (تعمیری پہلوؤں پر) غالب آجائے اور اس طرح اس دنیا کو جہنم بنا دیں۔ خدا کا تعمیری پروگرام ایسے تخریبی مآل سے کوسوں دور ہے۔

اس لئے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے واضح کر دی تھی کہ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں وہ اگر تعداد میں تھوڑے بھی ہوں تو بھی ان لوگوں کی اکثریت پر غالب رہتے ہیں جو سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے۔ وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون

• اگر تم میں سو آدمی بھی ایسے ہوگئے (جو سمجھ بوجھ سے کام لینے والے ہوں) تو وہ ہزار کافروں کو مغلوب کر کے رہیں گے۔ اس لئے کافروں کا گروہ ایسا ہے جو سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا۔ یہ ہے دنیا میں قوموں کی کامیابی کا راز۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے قرآن کی یہ تعلیم رہی انہوں نے اشیائے فطرت غور و فکر کرنا اور کائنات کی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنانا، عین فریضۂ زندگی سمجھا لیکن جب مذہب کے تقلیدی مسلک نے ان کے قوائے فکریہ کو مفلوج کر دیا تو عقل و فکر سے کام لینا ان پر حرام ہوگیا۔

عالم کسے کہتے ہیں

قرآن نے عالم کا لفظ سائنٹسٹ[1] (SCIENTIST) کے لئے استعمال کیا تھا۔ سورۂ فاطر میں دیکھئے کس طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا:

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کا قانون بادلوں سے پانی برساتا ہے؟

فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا الوانھا۔ اور اس پانی (اور مٹی کے امتزاج) سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کر دیتا ہے۔

ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود۔ اور پہاڑوں میں سرخ و سپید مختلف رنگوں کے خطے ہیں۔ اور بعض ان میں سے (سنگ موسیٰ کی سی) سیاہی لئے ہوئے ہیں۔

ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانہ۔ اور (نباتات و جمادات کی دنیا سے آگے بڑھئے تو) انسانوں اور حیوانوں کی دنیا میں غور کیجئے کہ یہ کس قدر انواع و اقسام کی دنیا ہے۔

کذالک انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ یہ کائنات اسی طرح پھیلی ہوئی ہے سو جو لوگ اس پر غور و فکر کے بعد اس کے متعلق علم حاصل کر لیتے ہیں، وہی قانونِ خداوندی کی عظمت و کبریائی کا صحیح احساس کر سکتے ہیں۔

غور کیجئے۔ یہاں علماء کا لفظ استعمال ہی ان کے لئے ہوا ہے جو کائنات کے مختلف شعبوں پر غور و فکر کرتے ہیں (اسی کو سائنس کہتے ہیں) لہٰذا اس کا ترجمہ ہی سائنٹسٹ ہے۔ لیکن جب دین، مذہب سے بدل گیا تو علماء کے معنی لائبریرین کے رہ گئے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ میں نے مذہبی علماء کو لائبریرین کس طرح سے کہہ دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں سب سے بڑا عالم کون ہوتا ہے۔ وہ جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق، بخاری میں کیا لکھا ہے۔ فتح الباری نے اس کی تفسیر کیا بیان کی ہے۔ علامہ آلوسی کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ درمختار میں اس کی بابت، حواشی سعدیہ، بدایع اور دار سے کیا منقول ہے۔ صاحب ہدایہ نے ذخیرہ سے کیا نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ علامہ شامی نے شیخ ابن ہمام سے کیا نقل کیا ہے۔ جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے وہی سب سے بڑا "مفتیٔ دین" اور "عامل شرع متین" ہوتا ہے۔ یہ لائبریرین کا کام نہیں تو اور کیا ہے؟ چونکہ مذہب کی دنیا میں کسی معاملہ میں اپنی رائے کو دخل دینا سب سے بڑا جرم ہے اس لئے سب سے زیادہ صحیح جواب وہ ہوگا جس میں کہیں عقل کی بو نہ آنے پائے۔ اور یہ مسائل جن کے لئے ان ذخائر کتب کی اوراق گردانی و سطور شماری ہوتی ہے، ہوتے کس قسم کے ہیں؟ ایک عزیز دوست گزشتہ حج کے لئے عازم ہوئے تو میں نے ان سے خاص طور پر کہا کہ وہ وہاں مختلف ممالک کے علماء سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کن

---

[1] قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ علم کو اگر مستقل اقدار سماوی (وحی) سے ہم آہنگ نہ کیا جائے، تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ سورۂ مومن میں ان اقوامِ سابقہ کے متعلق جو قوتوں اور ثروتوں کی مالک تھیں، فرمایا کہ فلما جاءتھم رسلھم بالبینات فرحوا بما عندھم من العلم۔ "جب ان کے پاس ہمارے فرستادہ واضح دلائل لیکر آئے تو انہوں نے یہ کہہ کر (منہ پھیر لیا) کہ جو کچھ ہمیں ہمارے علم نے دے رکھا ہے ہم اس پر مطمئن ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون (۴۰/۸۳) "ان کو ان تباہیوں نے آدبوچا جنہیں وہ ایک استحقار آمیز ہنسی سے ٹال دیا کرتے تھے"۔ لہٰذا دین کا نظام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے مستقل اقدار سماوی (وحی) کے مطابق ان کا استعمال کیا جائے۔

مسائل و مباحث پر گفتگو کرتے ہیں۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ کم وبیش تمام علمائے مکہ و مدینہ اور دیگر ممالک اسلامیہ سے مل کر آئے ہیں۔ جن مسائل پر سب سے زیادہ گفتگو رہی وہ یہ تھے کہ جمع بین الصلوتین بالقصر فی عرفہ والمزدلفہ (عرفہ اور مزدلفہ میں نمازوں میں قصر بالجمع) جائز ہے یا نہیں؟ قبروں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ مرکز توجہ یہ مسئلہ عظیمہ تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ شیخ عبدالظاہر (امام حرم) اور شیخ عبدالمہیمن ابوالسمح (امام حرم) اور شیخ عبدالرزاق مدیر مدرسہ دارالحدیث مکہ مکرمہ اور مولانا شیخ عبدالرزاق العفیفی الازہری جیسے "علمائے کبار" سب کے سب اسی اہم مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ ڈاڑھیوں منڈے متعلق بھی گفتگو تھی اور میز پر کھانا کھانے کے متعلق بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب "امور دنیا" کو دنیا داروں کے سپرد کر دیا جائے تو اہل مذہب کے لئے اور کون سے مسائل رہ جاتے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکے۔ ان "علماء" میں ایک گروہ ان کا بھی ہے جو اپنے آپ کو غیر مقلد کہتا ہے۔ اس سے ناواقف لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ شاید عقل و فکر سے کام لینے کے مدعی ہوں گے۔ لیکن یہ شبہ ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ مقلد اور غیر مقلد فرقہ بندی کی اصطلاحیں ہیں۔ عقل و فکر سے کو دونوں کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مقلد ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلد روایات کی تقلید۔ مقلد ائمہ ہوں یا مقلد روایات، تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم رسول اللہؐ یا صحابہ کبارؓ یا ائمہ فقہؒ کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسول اللہؐ، صحابہ کبارؓ اور ائمہ فقہؒ تو کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ تو مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ لہٰذا ان کی اتباع تو یہ ہے کہ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل اسی طرح خود سوچئے جس طرح وہ حضرات خود سوچا کرتے تھے۔

غور کیجئے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ہزاروں برس سے اس نے سوچنا ترک کر رکھا ہو، کیا اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی رہ سکتی ہے؟ آبائی مسلک کا اثر کس قدر غیر مرئی بلکہ غیر محسوس اور کس درجہ گہرا اور تحت الشعور میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مختلف مثالوں سے لگ سکتا ہے۔ ایک مسلمان بچہ، گوشت کی طرف لپک کر جائیگا لیکن وہی گوشت ایک جینی کے لڑکے کے سامنے لائیے، اسے اس سے جھرجھری آجائے گی اور اس کی طبیعت متلانے لگے گی۔ اس کی طبیعت کا ایسا ردعمل کسی منطقی فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں عقل و شعور کو دخل ہی نہیں ہوتا۔ طبیعت کا یہ ردِعمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو دیکھئے قرآن نے جن چار چیزوں کو بہ نصِ صریح حرام قرار دیا ہے ان میں ایک وما اھل بہ لغیر اللہ (۲/۱۷۳) بھی ہے۔ یعنی ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ ہمارے ہاں پیروں اور اولیاؤں کی نیازیں روز دی جاتی ہیں۔ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ان کی حرمت بہ نصِ صریح ثابت ہے لیکن چونکہ ہمارے گھروں میں ان کا عام رواج ہے، اس لئے ان نیازوں کو چھوٹے بڑے سب کھاتے ہیں اور طبیعت پر اس کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، چوہا چونکہ کھایا نہیں جاتا، اگر کھاتے وقت سامنے سے گذر جائے، یا اس کا ذکر تک بھی کر دیا تو متلی ہونے لگ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے شراب کے پیالے میں چوہیا گر جائے تو اس کے نزدیک وہ شراب بھی "حرام" ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسے اٹھا پھینکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک چینی اس چوہے کو مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ اور اس باب میں آپ کا ذہن کبھی اس طرف آنے کے لئے ہی نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق آپ کی طبیعت کا ردعمل سوچ سمجھ کا نتیجہ ہونا چاہیے۔

انہی مثالوں سے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب ایک قوم اپنے آباؤ اجداد کے مسلک پر تقلیداً چلی جا رہی ہو تو واقعات حوادث کے متعلق ان کا ردعمل کسی غور و تدبر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا ردعمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جس بات کو غیر شعوری طور پر مستحسن مانتے چلے آتے ہیں وہ مستحسن نظر آتی ہے اور جسے غیر شعوری طور پر مذموم سمجھتے چلے آرہے ہیں وہ مذ

ہوتی ہے۔ نہ اُسے مستحسن سمجھنے کے لئے ان کے پاس کوئی واقعی دلیل ہوتی ہے نہ اسے مذموم سمجھنے کے لئے کوئی تحقیقی برہان۔ مناظروں اور مباحثوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہیں اپنے مسلک کی "حقانیت" کے لئے دلائل تراشنے پڑتے ہیں۔ لیکن مناظرہ ہمیشہ فریقین کی ذاتی قابلیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر فریق اس "ایمان" کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اس کا مسلک عین حق و صداقت کا مسلک ہے اور فریقِ مقابل کا مسلک غوایت و ضلالت کی روش۔ اس "ایمان" کے بعد، ذاتی قابلیتوں کا تقابل ہوتا ہے۔ اور بس۔

مذہب پرست مسلمان کی یہ حالت ہزار برس سے ہو رہی ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں فکرِ نو کا، کہ جس پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے، کہیں امکان بھی ہو سکتا ہے؟

معنیٔ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست — مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اند ہمہ

صدیوں کی تقلید سے مسلمانوں کا ذہن، مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کے غاروں کی طرح تاریک ہو چکا ہے جس میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پا سکتی۔ مسلمان کی آج حالت یہ ہے کہ

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و ملّائے او محروم شوق

جب کسی قوم کا ذہن اس طرح تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو تو عروج و ارتقا کی راہیں اسے نظر کس طرح آ سکتی ہیں؟ کظلمات فی بحر لجی یغشٰہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب۔ ظلمات بعضھا فوق بعض۔ اذا اخرج یدہ لم یکد یرٰھا۔ ومن لم یجعل اللہ لہٗ نورًا فما لہٗ من نور (۲۴/۴۰)۔ جیسے سمندر کی گہرائیوں میں تاریکیوں کی لہر پر لہر چڑھتی آ رہی ہو، داخلی دنیا کی تاریکیوں کا یہ عالم اور خارجی دنیا کی یہ کیفیت کہ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا رہی ہو۔ اندھیرا ہے کہ اندھیرے کے اوپر چڑھے جا رہا ہے۔ ایسا اندھیرا کہ اپنا ہاتھ باہر نکالئے تو وہ بھی دکھائی نہ دے (یعنی دوسروں کا صحیح مقام متعین کرنا تو ایک طرف، خود اپنا مقام بھی دکھائی نہ دے) دکھائی کیسے دے؟ دکھائی تو دینا تھا دین کی روشنی سے۔ جب دینِ خداوندی ہی روشنی نہ دے تو روشنی کہاں سے ملے؟ مذہب خود تاریکی ہے۔ تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی۔ روشنی کیسے مل سکتی ہے؟

یہ ہے حالت آج مسلمان کی۔ اس کی دنیا، ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بادشاہتیں، سرمایہ داریاں، جاگیرداریاں، زمینداریاں، غرضیکہ معاشی زندگی کی تمام ناہمواریاں (جسے قرآن نے فساد فی الارض کہہ کر پکارا ہے) سب اسی لعنتِ کبیرہ کے مظاہر ہیں۔

اور اس کی "آخرت" مذہب کی تاریکیوں میں چھپی ہوئی، شریعت کے رسوم و مروجات، علمِ کلام کے نظری مباحث، تصوف کی فسوں کاریاں، سب انہی تاریکیوں کے پیدا کردہ چھلاوے ہیں۔ اور ان کے اندر جکڑا ہوا بیچارہ مسلمان، حسرت بھری نگاہوں سے دوسری قوموں کو دیکھتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟

آں کہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست — فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملّا و پیر

اس ذہنی اور جسمانی استکراہ و استبداد کے بعد سینہ میں روشنی کی کرن کہاں سے آ سکتی ہے؟

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

زوال کا بنیادی سبب

یہ ہیں اسبابِ زوالِ امت؛ اسباب" محض تفصیل کے اعتبار سے۔ ورنہ درحقیقت سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے مذہب[1]۔ دنیا میں آج تک کسی مذہب پرست قوم نے ترقی نہیں کی۔ نظر دوڑا کر دیکھئے۔ یہ حقیقت ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دے گی جسقدر کوئی قوم زیادہ مذہب پرست ہے اسی قدر وہ دنیاوی ترقیوں میں پست و زبوں حال ہے۔ تبت کے لاموں کے پیرو اور چین کے بدھ مت کے تبع پورے کے پورے مذہب میں ڈوبے ہوتے ہیں، ان کی حالت ظاہر ہے۔ جن قوموں میں ایک طبقہ مذہب پرست ہوتا ہے اور دوسرا دنیادار، ان کا مذہب پرست گروہ، دنیادار طبقہ سے پست حالت میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں ساتن دھرمی فرقہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ خود یورپ میں عیسائی خانقاہوں کے مذہب پرست گروہ ہمیشہ پیچھے رہے۔ دنیا کے تھپیڑے رفتہ رفتہ ایسا کر دیتے ہیں کہ مذہب پرست طبقہ کے افراد، اُدھر سے کٹ کٹ کر، دنیاداروں کی طرف آجاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس قوم کی اکثریت "دنیاداروں" کی ہوجاتی ہے اور مذہب، عبادت گاہوں کی چاردیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ جیسے آج کل یورپ میں عام طور پر ہورہا ہے۔ جب یہ تھپیڑے اور شدت اختیار کر لیتے ہیں تو مذہب کو خارج البلد کر دیا جاتا ہے اور پوری کی پوری قوم خالص "دنیادار" ہوجاتی ہے۔ جیسے (کہتے ہیں کہ) روس میں ہوا ہے (یا کم از کم مارکس کے فلسفہ کا دعویٰ ہے) یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ ان کی اکثریت مذہب پرست ہے اس لئے پست و زبوں حال، جو کچھ مذہب نے دوسری جگہ کیا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے اور ہورہا ہے۔ دیکھئے اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن کریم نے کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا یہ پیغام نوعِ انسانی کے لئے یکسر ہدایت و رحمت ہے لیکن

یضل به کثیرًا ویهدی به کثیرًا (۲/۲۶)

اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور بہت سوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔

قرآن ہی کے قانون کے مطابق تباہی

اس آیتِ جلیلہ پر غور کیجئے۔ خدا کہتا ہے کہ اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔ وہی پانی جو زندگی کی اساس ہے، انسان کی موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ یہ کون ہیں جن کے حصہ میں اسی قرآن سے بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ وما یضل به الا الفاسقین۔ گمراہی فاسقین کے حصہ میں آئے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ فاسقین کون ہیں؟ وہ کہتا ہے الذین ینقضون عهد الله من بعد میثاقه "وہ لوگ جنہوں نے قانونِ خداوندی (سنۃ اللہ) کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنے کا عہد کیا لیکن اس کے بعد اس عہد کو توڑ دیا" اس کی مزید وضاحت ان الفاظ سے فرمادی کہ ویقطعون ما امر الله به ان یوصل "ہاں! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس چیز کے ٹکڑے کر دیئے جسے ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا" خدا کے قانون نے یہ بتایا تھا کہ حیات ایک غیر منقطع وحدت ہے۔ طول میں بھی اور عرض میں بھی۔ طول میں دنیا اور آخرت، حال اور مستقبل میں کوئی حد فاصل نہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل جوئے رواں چلی جاتی ہے۔ اس لئے دنیا اور آخرت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے لئے الگ الگ ضوابطِ زندگی تجویز کرنا فسق ہے، شرک ہے۔ اسی طرح، عرض کی طرف وحدتِ انسانیت کے بجائے، انسانوں کو افراد، شعوب، قبائل، اقوام میں تقسیم کر کے حد بندیاں قائم کر دینا بھی اس وحدت کا قطع کر دینا ہے اور یہ فسق ہے۔ اس فسق و شرک کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہوجائیں گی (ویفسدون فی الارض) اور ایسی قوم کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت نامراد و ناکام رہے گی۔ (اولٓئک هم الخاسرون ۲/۲۶)۔

---

[1] اس حقیقت کو نظرانداز نہ ہونے دیں کہ اسلام، دین ہے مذہب نہیں۔ مذہب بعد کی پیداوار ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی وہ ہیں جن کا ذکر سابقہ صفحات میں آچکا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ان مختصر سی آیات میں کتنے اہم، اساسی قانونِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین کا ام حیات کی وحدت کو عملاً قائم رکھنے کے لئے آیا تھا۔ یہ وہ نظام تھا جس کا نتیجہ اصلاح فی الارض (معاشی زندگی میں ہمواریاں، رحسن مآب، مستقبل کی خوش گواریاں تھا۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ہدایت ہے۔ اس کے بعد، قرآن کی حامل قوم نے اس حدت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے بھی ٹکڑے کر دیئے۔ ایک حصہ کو دنیا سے متعلق سمجھ کر حقوق العباد قرار دے لیا ور دوسرے حصہ کو آخرت سے چپکا کر حقوق اللہ نام رکھ لیا۔ اس کا نتیجہ فساد فی الارض (حال کی تباہی) اور خسران فی الآخرت (مستقبل کی بربادی) تھا۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ضلالت ہے۔ قرآن وہی تھا لیکن اب وہ سرچشمۂ ہدایت ہونے کے بجائے موجبِ ضلالت بن گیا۔ دین میں قرآن ضابطۂ حیات تھا۔ مذہب میں پہنچکر قرآن مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔ یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ ہزار برس سے یہ قوم، لبظاہر قرآن کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے لیکن اس قرآن سے انھیں سوائے ضلالت اور خسران کے اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کائنات کا قانون یہ ہے کہ ہر شے اپنے اصلی مقام پر ہی اپنے مضمر فوائد سے متمتع کر سکتی ہے۔ اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیجئے، وہی شے ضرر انگیز ہو جائے گی۔ پانی کو کشتی کے نیچے رکھئے وہی پانی کشتی کی روانی کا ذریعہ ہوگا۔ اسے کشتی کے اوپر لے آئیے وہی پانی سیلابِ بلا بن کر کشتی کو لے ڈوبے گا۔ کسی شے کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا، قرآن کی اصطلاح میں ظلم کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے بتا دیا کہ ظالمین کے لئے قرآن میں ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ وما ننزل من القرآن ما ھو شفاء و رحمت للمومنین۔ ولا یزید الظالمین الا خسارا (۱۷/۸۲)۔ "اور ہم نے قرآن میں جو کچھ نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔ لیکن جو اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیں گے ان کے لئے اس میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں"۔ مسلمان کے کاروبارِ زندگی میں جو چیز گھاٹے کا موجب بن رہی ہے وہ قرآن ہے جسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا گیا ہے۔ قرآن جب اپنے حقیقی مقام پر تھا تو دین کہلاتا تھا اور جب اس مقام سے ہٹ گیا تو اس کا نام مذہب ہو گیا۔ قرآن وہی ہے، اس کا مقام بدل گیا ہے۔

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم	جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز	تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا	کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اسبابِ زوال آپ کے سامنے آگئے اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس زوال کو عروج سے بدلنے کی راہیں کون سی ہیں۔ بات صاف ہے اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اس وقت مسلمانوں کی سمجھ میں شاید ہی آئے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے	ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

پس چہ باید کرد؟

بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو "مذہب" چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد، ان کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ یا تو یہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قریبی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک (SCRUPLES) ان کے عناں گیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد جو حشر اقوامِ عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔ موت تو آئے گی لیکن وہ اس قسم کے تپ دق اور جذام کی سسکیوں سے تو اچھی ہوگی۔ اور دوسرا راستہ یہ کہ مذہب کو چھوڑ کر دین کو اختیار کر لیا جائے۔ اس میں قریبی مفاد بھی اس انداز کے ہوں گے کہ دنیا کی دوسری قومیں اس پر رشک کریں گی، اور اس کے بعد مستقبل بھی ایسا روشن اور تابناک ہوگا کہ واشرقت الارض بنور ربھا (زمین اپنے نشو و نما دینے والے خدا کے نور سے جگمگا اٹھی)

یاد رکھو جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کریگی اس کی اس کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ اسے حال کی زندگی میں
بھی ذلت و رسوائی نصیب ہوگی اور اس کے بعد بھی سزا ملے گی۔
قرآن، دین کے نظام کو خالصتہً اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ "شتر مرغی" انداز سے نہیں۔ فاعبد واللہ مخلصین لہ الدین (۳۹/۲-۳)

یہ ہے میرے نزدیک صحیح راہ عمل۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے بہت کم لوگ اس کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں گے
(تاوقتیکہ وہ اس کا مطالعہ خالی الذہن نہ کریں) اور جو اسے سمجھ سکیں گے ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے
اپنے اندر آمادگی پائیں گے۔ نہ سمجھ سکنا اس لئے کہ مذہب اپنے اعتقادات و رسوم کو اس قدر مقدس بنا رکھتا ہے کہ انسان اس
کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کسی ملحد سے باتیں کیجئے تو وہ کم از کم عقلی دلائل تو سنے گا، لیکن مذہب پرست
گروہ عقل کو پاس تک نہیں پھٹکنے دے گا۔ اور جو کچھ اس کے پاس تقلیدی وراثت سے پہنچ چکا ہے، اسے کسی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے
قطعاً تیار نہیں ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ
افمن زین لہ سوء عملہ فراٰہ حسناً، فان اللہ یضل من یشاء ویھدی من یشاء (۳۵/۸)
جس کا برا عمل اس کے لئے خوش گوار بن جائے اور اسے نہایت حسین دکھائی دے۔ کیا وہ بھی کبھی سیدھے راستہ پر آ سکتا
ہے! یہ ہے وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق گمراہی اور ہدایت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔
جو بات کو غلط سمجھے اس کے راہ راست پر آ جانے کی توقع ہوتی ہے لیکن جو اسے سمجھے ہی بالکل صحیح تو وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؛
اسی لئے رسول اللہ کو ارشاد ہوا کہ فلا تذھب نفسک علیھم حسرات (۳۵/۸) "سو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو چکی ہو انھیں را
راست پر لانے کی فکر میں تو اپنی جان کو کیوں ہلاک کرتا ہے"؟
اور سمجھ جانے کے بعد، عمل کرنا اس لئے دشوار ہوتا ہے کہ اس راہ میں ایسے ایسے معبود (انداداً من دون اللہ) کھڑ
ہوتے ہیں جن کا خود اپنے ہاتھوں سے توڑنا کسی خلیل اکبری کا کام ہو سکتا ہے۔ نیز یہ کہ مذہب کی راہ ایسی تن آسانی کی را
ہوتی ہے کہ اسے چھوڑ کر دین کی پیہم سعی و عمل کی راہ اختیار کرنا، لوہے کے چنے چبانا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہ
دین کی مخالفت ہمیشہ مترفین (تن آسان لوگوں) کی طرف سے ہوتی۔ مجھے ان تمام باتوں کا احساس ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجھے
قرآنی بصیرت نے جس نقطہ تک پہنچایا ہے میں نے اسے کاغذ پر محفوظ کر دینا ضروری سمجھا ہے کہ آج نہیں تو آنے والی
نسلوں میں شاید کوئی اس سے مستفید ہو سکے۔ اگر اُس وقت کوئی قرآن پر غور کرنے والا اسی راستے چل نکلا تو اسے میرے
پاؤں کے نشانات دیکھ کر کم از کم اتنا اطمینان تو ہوگا کہ اس راہ سے اس سے پہلے کوئی اور بھی گذرا ہے
اور اگر میرے مخاطبین میں ایسے ارباب فکر و نظر موجود ہیں جو میرے ان نتائج فکر قرآنی سے متفق ہیں، تو مجھے اس
بڑی مسرت ہوگی، اگر وہ مجھے اس سے مطلع فرمائیں، کیونکہ دنیا میں جو رشتہ قرآنی فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک نگہی سے پیدا ہوتا ہے
سے زیادہ محکم رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے اس ربط باہمی سے ہم اس مسئلہ پر مزید غور و فکر سے، راستہ کی دشوا
میں آسانیاں پیدا کر سکیں اور اس طرح قرآنی بصیرت کی شمع عالمتاب سے ان پردوں کو اٹھا سکیں جو ہزار برس کی تا
تاریکیوں اور مذہبی ظلمتوں سے اس پر پڑے ہوئے ہیں (لیخرج الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات من
الظلمات الی النور) میرا ایمان ہے (اور میرے تجربہ نے اس ایمان کو مشہود کر کے دکھا دیا ہے) کہ جب تک ہم

قرآن کو اپنے سامنے نہیں رکھتے، دین کا نظام ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور ہم کبھی وہ انقلاب پیدا نہیں کرسکتے جو قرآن نے ایک مرتبہ پیدا کیا تھا اور جسے ہر وقت پیدا کرنے کی قوت وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ طریق کار ہے جو قرآن کی حامل قوم کے ذریعے ساری انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردے گا۔ وہ انقلاب جس میں دنیا یہ حقیقت عملاً سامنے دیکھ لے گی کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس　　نکتۂ شرعِ مبین این است و بس

[یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جنوری۔ فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد محترم پرویز صاحب کو اس ضمن میں بہت سے استفسارات موصول ہوئے۔ ان میں سے بعض اہم سوالات کے جوابات طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے جو مندرجہ صدر مقالہ کے بعض مقامات کی تشریح کرتے ہیں۔ ذیل میں ان سوالات اور جوابات کو بھی درج کردیا جاتا ہے تاکہ اس مقالہ کی تکمیل ہوجائے۔ طلوعِ اسلام]

سوال (۱) آپ نے انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کی روحانی ضروریات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ اسلام کا منتہیٰ انسان کی معاشی زندگی میں توازن پیدا کرنا ہے؟

جواب۔ انسان کی معاشی ضروریات سے مراد صرف روٹی کپڑا نہیں بلکہ وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں جن سے انسان کے مضمر جوہروں کو کامل نشوونما کا موقع ملے یعنی انسان کے اندر جسقدر عمدہ صلاحیتیں ہیں ان تمام صلاحیتوں کے تکمیل پانے اور بردمند ہونے کے لئے مواقع میسر ہوں اور اس کے بعد ان صلاحیتوں کو ربوبیتِ عامہ کیلئے ایک نظام کے تابع استعمال کیا جائے۔ معاشی توازن سے یہی مراد ہے اور زیرے نزدیک اسلام کا یہی منشا ہے۔ کیا کسی نظام کا یہ کارنامہ کم معرکہ آرا، محیر العقول اور قابلِ فخر ونازہے کہ وہ اس قسم کا معاشی توازن قائم کردے۔ اور اس نظام کا قیام کسی ایک خطۂ زمین یا انسانوں کے کسی ایک گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا دائرۂ عمل ونفوذ تمام دنیا کے انسانوں کو محیط ہو؟ علاوہ بریں اگر خالص "معاشیات" کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ ہم صبح سے شام تک معاشی مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروفِ سعی وعمل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ضروریات کی اہمیت سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکار دراصل غمازی کرتا ہے مادی زندگی کے متعلق اس تصور کی جو عیسائیت کی رہبانیت اور عجمی تصوف نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کررکھا ہے جس کی رو سے ہم مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ مادی زندگی اور اس کے تقاضے کوئی ایسی شے نہیں جس کی طرف نسبت سے ہم جھینپے جھینپے محسوس کریں۔ عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعویدار بھی تھوڑی تھوڑی تک مادی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے۔ اور زبان سے ہم میں ہر شخص مادی دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسلام اس قسم کی جھجک اور جھینپ کی زندگی کو منافقت کی زندگی قرار دیتا ہے۔ وہ حقائق کا بے نقاب سامنا کرتا ہے اور ہر حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کرتا ہے۔ وہ معاشی خوشگواریوں کو خدائی نعمتیں قرار دیتا ہے۔ اسی کے نزدیک معاشی خوشگواریوں کا حصول قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ نفرت وہ نظام ہے جو ایسی معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے جن میں نوعِ انسانی کا بیشتر حصہ اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم رہ جاتا ہے چہ جائیکہ وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے اسباب و ذرائع ہر قدم پر موجود پائے۔ قرآن کے نزدیک حسنِ عمل کا تقاضا ہے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز (یعنی ناہموار معاشی نظام) کو مٹا کر اس کی جگہ عدل اور احسان کا متوازن معاشی نظام قائم کرے۔ فرمایئے کہ جس نظام کا مقصود منتہا یہ ہو کیا آپ کے نزدیک وہ نظام کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟ اس نظام کے قیام اور قیام کے بعد لقا و استحکام کے لئے انسان کو جس قسم کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور "روحانیت" بھی ہوسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "ثواب" کی طرح "روحانیت" بھی

ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ بولنے کو ہر شخص یہ لفظ بولے گا لیکن پوچھنے پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس لفظ سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بہت دور کی کوڑی لائے گا تو کسی بزرگ کی کرامات گنا دیگا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان "کرامات" سے کہیں بڑھ کر محیر العقول "کرامات" ہندو سنیاسیوں اور یوگیوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر اسلامی تعلیم کا مغز اور منتہیٰ اس قسم کے محیر العقول واقعات ہیں اور اسی کا نام "روحانیت" ہے تو اس میں اسلام کی کیا خصوصیت ہے۔ یہ تو غیر مسلموں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ یاد رکھئے قرآن نے کہیں بھی روحانیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا مطالبہ "ربانی" بننے کا ہے جو اس کے معنی ہیں نشو و نما دینے والے نظام کے، املین۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ نظامِ عدل و احسان اس قدر "روحانیت پرور" ماحول پیدا کر دے گا جس میں ہر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے برومند ہونے کے مواقع یکساں طور پر موجود پائے گا۔ یہی وہ ماحول ہوگا جس میں "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔ یہی وہ ماحول تھا جس کی ایک جھلک آسمان کی آنکھ نے سرزمینِ عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر دیکھی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا میں وہ آج تک سرگرداں پھر رہا ہے۔

جسے تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے وہ کوئی چیستان نہیں کہ بغیر 'علم لدنی' کے کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ قرآن (اور عربی زبان) کی رُو سے تزکیہ کے معنی ہیں، بڑھنا، پھولنا، پھلنا، برومند ہونا جسے (GROWTH) یا (DEVELOPMENT) کہتے ہیں۔ اور نفس کے معنی ہیں انسانی صلاحیتیں۔ لہٰذا تزکیۂ نفس کے معنی ہوئے انسانی صلاحیتوں کا نشو و نما پانا۔ اسی کا نام ربوبیت ہے۔ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما، انسانی معاشرہ سے الگ ہو کر زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کے چلوں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتی ہے عین انسانی معاشرہ کے اندر معاشرتی زندگی میں انسان کے سامنے نت نئے دن، نئے نئے مسائل اور نئے نئے تقاضے آتے رہتے ہیں۔ انسانی صلاحیتیں ان تقاضوں کے حل اور ان موانع کے دور کرنے سے جلا پاتی ہیں اور اسی طریق سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی صلاحیتیں کس قدر نشو و نما پا چکی ہیں۔ محمد رسول اللہ والذین معہ نے اسی قسم کا معاشرہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے چلہ کشی اور نفس کشی سے اپنی "روحانیت" نہیں بڑھائی تھی — "روحانیت" بڑھانے کا وہ طریقہ جسے تصوف "مغزِ دین" بتاتا ہے، عجمی تصور کی پیداوار اور "مذہب" کی ایجاد ہے۔ دین انفرادی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی سکھانے کو آیا تھا۔ لہٰذا دین کے نظام میں (جسے معاشرتی کہہ لیجئے یا معاشی) صحیح "روحانیت" بڑھنے کا راز پوشیدہ ہے۔ میں اس نظام کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہوں۔

سوال ۲: آپ نے لکھا ہے کہ

(i) جو قوم اپنی کوششوں کو کائنات کے قانون سے ہم آہنگ کرتی ہے اس کی کوششیں بار آور ہوتی ہیں اور

(ii) اور جو قوم صرف اپنے لئے نہیں بلکہ آنیوالی نسلوں کے لئے سوچتی ہے اس کی "آخرت" بہتر ہو جاتی ہے۔

یورپ کی قومیں تسخیرِ فطرت بھی کر رہی ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے غلبہ و تسلط کی فکر بھی کرتی رہتی ہیں۔ تو کیا آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح یورپ کی اقوام کو بہترین مومن قرار دیتے ہیں؟

جواب ۲: جی نہیں! میں یورپ کی اقوام کو "مومن" قرار نہیں دیتا۔ اگر آپ میرے مضمون کے دوسرے مقامات کو بھی ساتھ ملا کر دیکھتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ میں نے اقوامِ یورپ کے متعلق واضح طور پر لکھا ہے کہ

گروہِ اول: وہ لوگ ہیں جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور مستقبل کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انھیں پیش پا افتادہ مفاد

حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے جو مستقبل سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوامِ مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ ان کے سامنے مستقبل ہے تو صرف اپنی قوم (نسل) کا۔ وہ نوعِ انسانی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ ان کا وحدتِ انسانیت پر ایمان ہی نہیں۔ نیز وہ زندگی کو فقط طبیعی زندگی مانتے ہیں جس کا سلسلہ سانس بند ہو جانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے مستقبل پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

اس سے ذرا آگے چل کر لکھا ہے؛

> بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو مذہب چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد ان کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ یا تو یہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قومی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک ان کے عنان گیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد جو حشر اقوامِ عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ میں یورپ کی اقوام کو مومن اور متقی قرار نہیں دیتا بلکہ ان کا شمار ان میں کرتا ہوں جو آخرت کے منکر ہیں۔ ایک تو ان کے پیشِ نظر نوعِ انسانی کا مشترکہ مفاد نہیں بلکہ اپنی اپنی گروہ بندیوں کا مفاد ہے اور دوسرے وہ ظہورِ نتائجِ اعمال کے لئے حیات بعد الممات کے قائل نہیں جس کی وجہ سے وہ انسان کی موجودہ زندگی کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قسم کا متوازی معاشی نظام قائم ہی نہیں کر سکتے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظام صرف وہ قوم قائم کر سکتی ہے جو زندگی کو طول اور عرض دونوں میں غیر منقطع تسلیم کرے۔ اور یہ تصور صرف قرآن دیتا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی کوششوں کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کرے گا اس کی کوششیں نتیجہ خیز اور بار آور ہوں گی۔ پانی کے لئے قانونِ کائنات یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جو کسان اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اس کا کھیت سیراب ہوگا۔ جو پانی کی سطح سے اونچا بنائے گا پانی از خود وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لانے کا یہی طریق ہے۔ جو قوم تسخیرِ فطرت کرے گی اس کی کوششیں بار آور ہوں گی۔ اقوامِ مغرب اس نہج سے مسلمانوں سے آگے ہیں کہ وہ فطرت کے دبے ہوئے خزانوں کو کھود کھود کر باہر نکال رہی ہیں اور ان سے دھڑا دھڑ متمتع ہو رہی ہیں۔ انھیں مفادِ عاجلہ (دنیاوی نعماء) نصیب ہیں۔ ہم ان سے محروم ہیں۔ صرف اس حد تک ان کی کوششیں کائناتی قانون سے ہم آہنگ ہیں۔ ہماری کوششیں اتنی بھی ہم آہنگ نہیں۔

جنھیں مفادِ عاجلہ نصیب نہیں، زندگی اور اس کی حرارتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سمجھنا فریبِ نفس ہے کہ اگر مفادِ عاجلہ نصیب نہیں تو نہ ہوں۔ ہماری آخرت تو خوشگوار ہے!

جنھیں مفادِ عاجلہ میسر ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو صرف مفادِ عاجلہ ہی کو مقصودِ زندگی سمجھتے ہیں اور انسانیت اور خود زندگی کے مستقبل سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس غیر متوازن نظامِ زندگی کے قیام کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی بساط آج ہر طرف بچھ رہی ہے، ان کا حال روشن ہے۔ لیکن مستقبل تاریک۔ یہ بہر حال ان سے بہتر ہیں جن کا حال تاریک ہے یعنی جن کی قسمت میں امروزہ نہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مفادِ عاجلہ کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ انسانیت اور زندگی کے مستقبل پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کا حال بھی درخشندہ ہے اور مستقبل بھی تابناک۔ یہ گروہ پہلے گروہ سے بہتر ہے جس کا صرف حال ہی روشن ہے۔ یہی ہے وہ گروہ جو اس قسم کے متوازن معاشی نظام کے قیام کا کفیل ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ نظام صرف اسی گروہ کے ہاتھوں قیام پذیر ہو سکتا ہے جو وحدتِ انسانیت اور وحدتِ حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ قرآن اس نظام کے قیام کا عملی طریقہ بتاتا ہے جس کا نام تقویٰ ہے، یعنی مفادِ عاجلہ کے لئے اپنی

کوششوں کو قانونِ کائنات سے ہم آہنگ کرنا اور کوششوں کے ماحصل کو مستقل اقدار (وحی) سے ہم آہنگ کرکے ایسے ماحول کا قیام جس میں انسانیت بڑھے، پھولے اور پھلے۔ لہٰذا اس نظام کا قیام قرآنی ضابطے کے بغیر ناممکن ہے۔

سوال ۳: آپ نے لکھا ہے کہ اسلام ایک معاشی نظام قائم کرتا ہے۔ روس کی اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک بہترین معاشی نظام قائم کرتی ہے۔ اس نے ایک حد تک اس نظام کو قائم کرکے بھی دکھا دیا ہے۔ پھر اسلام اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟

جواب ۳: اول تو اشتراکیت کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں بہ حیثیتِ نظام بڑا فرق ہے۔ اشتراکیت کے نظام کی بنیاد "مساواتِ شکم" پر ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ ربوبیت ایک ایسا متوازن ماحول پیدا کرتا ہے جس میں نہ صرف روٹی کا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے بلکہ ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور بر ومند ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع بھی میسر ہوتے ہیں

لیکن اصل فرق اس اساس و بنیاد کا ہے جس پر اشتراکیت اور اسلام اپنے اپنے نظام کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر (سلیم کے نام دو خطوط میں[1]) لکھ چکا ہوں، اشتراکیت کا تصورِ حیات یکسر مادی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اشتراکی موت کے بعد تسلسلِ حیات کا قائل نہیں، نہ ہی وحدتِ انسانیت کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کی بنا پر اشتراکیین اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے اس لئے ان کے سامنے مفادِ عاجلہ کے سوا اور مفاد آ ہی نہیں سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نوعِ انسان سے ہمدردی کا جذبہ وہ قوتِ محرکہ ہے جس کی بنا پر وہ اس قسم کا عالمگیر نظامِ معیشت قائم کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ لیکن یہ جذبہ تو اخلاقی قدر کے ماتحت آتا ہے اور مادی نظریۂ حیات میں اخلاقی اقدار کا تصور بار ہی نہیں پا سکتا۔ یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو کمیونزم کا میکانکی فلسفۂ زندگی اخلاقی اقدار کو مٹانے کا داعی ہے لیکن دوسری طرف وہ اپنی تحریک کے قیام کے لئے دلیل اور جواز خود اخلاقی نظام سے مستعار مانگتا ہے۔ یاد رکھئے۔ میکانکی تصورِ حیات کا ماننے والا کبھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ "میں اپنی محنت کے ماحصل کو دوسرے کی بہبود کے لئے کیوں صرف کروں" اگر کوئی اس کا جواب دیتا ہے تو مجھے اس سے اطلاع دیجئے۔ لہٰذا اشتراکی نظام مادی نظریۂ حیات کے ماتحت یا تو ہنگامی جذبات کے ماتحت قائم کرایا جا سکتا ہے یا پھر استبداداً۔ اس وقت اشتراکی عوام کو یورپین اقوام کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبۂ انتقام کی بنا پر مشتعل کیا جاتا ہے اور یہی جذبہ ان کے اس "جنون" کا ذمہ دار ہے جو ان کی مساعی میں اس قدر گرمجوشی پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے منفیانہ جذبات پر کسی تعمیری انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ مشتعل گشتہ انتقامی جذبات فرو ہو جائیں گے تو پھر اس نظام کے قیام کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ اُس وقت اس نظام کے اربابِ حل و عقد، اپنی قیادت و سیادت، بلکہ اقوامِ عالم میں اپنی امامت کے تحفظ اور بقا کی خاطر، عوام سے اسی طرح اس نظام کے قیام کے لئے کام لیں گے جس طرح ہر دوسرے نظام میں مستبد طبقہ، نچلے طبقے سے کام لیتا ہے۔ یاد رکھئے۔ کوئی نظام آئیڈیلوجی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور مادی نظریۂ حیات کوئی آئیڈیالوجی نہیں رکھتا۔

اس کے برعکس اسلام جس متوازن نظامِ ربوبیت کا قیام چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت اور تسلسلِ حیات کے غیر متزلزل عقیدہ پر رکھتا ہے (توحیدِ خداوندی پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی قانون نافذ العمل ہے جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر حاوی ہے اور جس کے اثر و نفوذ کا دائرہ، طبیعی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے)

---

[1] اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام کا فرق سمجھنے کے لئے ان "خطوط" کا مطالعہ بہت فائدہ بخش ہوگا۔ اس لئے ان خطوط کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے۔ اور اگر آپ کے پاس وہ پرچے نہ ہوں تو انہیں منگا لیجئے۔

ِ زندگی کی اساس (BASE) ایک الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے اور مختلف افراد اس کے مظاہر ہیں۔ اس عقیدہ کی
بادوں پر وہ ایک عملی پروگرام کی عمارت اٹھاتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پروگرام میں شریک ہونے والے کی اپنی ذات میں ایک تغیر
قع ہوتا جاتا ہے۔ اس نفسیاتی تغیر کا نام تعمیرِ سیرت یا استحکامِ ذات ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں یہ تغیر رونما ہوتا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں
نظامِ ربوبیت وجود کوش ہوتا چلا جاتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس طرح ایک دائرہ بن جاتا ہے جس سے انسان کی داخلی اور خارجی دونوں
نیاؤں میں ربوبیت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی وہ طریقِ نشوونما ہے جس سے آہستہ آہستہ تدریجاً پانی کا قطرہ
غوشِ صدف میں گہر بن جاتا ہے۔ اس استحکامِ ذات سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے اور موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔
س نظام کی اطاعت اکراہاً اور استبداداً نہیں کرائی جاتی بلکہ یہ خود نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے۔ یا یوں کہئے
ہ یہ اطاعت اس نظامِ ربوبیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ جب کھجور پک کر خود بخود شاخ سے الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑے تو اس کی یہ کیفیت
طاعت کہلاتی ہے۔ اس لئے اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ہر "تربیت یافتہ نفس" (یعنی جس نفسِ انسانی کی نشوونما اس نظامِ ربوبیت
ی روسے ہوگی) اس نظام کی اطاعت (بلکہ یوں کہئے کہ اس کے قیام و استحکام کے لئے جدوجہد میں شرکت) کا جذبہ اپنی ذات میں
ابلتا ہوا پائے گا۔ اسلام کے متوازن معاشی نظام سے مراد اس قسم کا نظامِ ربوبیت ہے، نہ کہ محض روٹی کا حل، اور ایسا حل جو مقصود
بالذات بن کر رہ جائے یعنی جب روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد انسانی نشوو ارتقاء کے میدان بھی ختم ہو جائیں اور اس لئے اس کی
سعی و عمل کے محرکات کے چشمے بھی سوکھ جائیں۔

یہاں اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جو نظام تمام افرادِ معاشرہ کی جملہ ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور ان کی تمام انسانی صلاحیتوں
کے کامل نشوونما کے اسباب و ذرائع فراہم کرنے کا ضامن بنے گا اس میں رزق کے سرچشمے خود نظام کی تحویل میں ہونگے نہ کہ افراد کے قبضے میں۔

سوال ۴: آپ نے لکھا ہے کہ دین نے قیام صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔ مذہب میں یہ چیز نماز کی رسم ادا کرنے کے مرادف بن گئی۔ اس
سے مترشح ہوتا ہے کہ دین میں صلوٰۃ کی کوئی اور شکل ہوگی۔ وہ کونسی شکل ہوگی؟ آپ کس قسم کی نماز پڑھتے ہیں؟

جواب ۴: دین نے نظامِ ربوبیت کی تشکیل اور قیام کے لئے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ایک پروگرام مرتب کیا ہے۔ صوم و
صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وغیرہ اسی پروگرام کے اجزا ہیں۔ یہ پروگرام اس جماعت کی ساری زندگی کو محیط ہوتا ہے جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار
ہوتی ہے۔ کبھی غیر مرئی شکل میں جب اس کی روح اس جماعت کی سانس بن جاتی ہے اور کبھی مرئی اور محسوس صورت میں۔ اس پروگرام
کی مرئی اور محسوس صورت کا نام "ارکانِ دین" ہیں۔ مذہب میں ان کی یہ مرئی اور محسوس صورت تو قائم رہتی ہے لیکن محض ایک رسم
بن کر جس کا تعلق زندگی اور اس کے حوائج سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب یہ ارکان نظامِ ربوبیت کو متشکل کر رہے ہوں تو یہ اس نظام کے
قیام کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور جب یہ محض رسمی طور پر ادا کئے جاتے ہوں تو ان کے متعلق تصور کر لیا جاتا ہے کہ یہ "انفرادی نجاتِ آخروی"
کا موجب ہیں۔ یہ ہے مفہوم میرے اس بیان کا کہ دین میں اقامتِ صلوٰۃ، محض نماز پڑھنے تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ مؤقت فریضۂ
صلوٰۃ، اس نظامِ صلوٰۃ کے اندر آجاتا ہے لیکن اس نظام سے الگ ہٹ کر اس کا کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ دین، قوانینِ خداوندی
کی اطاعت سکھاتا ہے۔ مذہب پوجا پاٹ کی تعلیم دیتا ہے۔ فلہٰذا سوال شکل و صورت کا نہیں، نتائج کا ہے۔ ان ارکان کی شکل و
صورت تو دین میں بھی یہی رہے گی لیکن اس وقت یہ دین کی زندہ اور متحرک مشینری کے پرزے ہونے کی جہت سے تابندہ نتائج
کے حامل ہوں گے۔ آج یہ پرزے اس مشینری کے اندر فٹ ہونے کے بجائے الگ الگ پڑے ہیں۔ اس لئے کوئی نتیجہ پیدا

نہیں کر رہے۔ یہ ارکان کس طرح نظامِ ربوبیت کی تشکیل و بقا کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ارکان کا فطری اور یقینی نتیجہ اس نظامِ ربوبیت کا قیام ہے جس میں نوعِ انسانی توازن بدوش معاشرتی و معاشی نظم و ترتیب کی سازگار فضاؤں میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے گی۔ یوم یقوم الناس لرب العالمین۔

لہٰذا میرا یا کسی اور کا، کسی اور شکل و صورت کی نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بھی اسی شکل و صورت کی نماز پڑھتا ہوں جس کی اور مسلمان پڑھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے آپ یہ دھوکہ نہیں دیتا کہ قرآن کا مقصود یہی صلوٰۃ ہے جس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

اس مقام پر پوچھا جاسکتا ہے کہ جب تم سمجھتے ہو کہ قرآن کا مقصود اس قسم کی بے روح نماز نہیں تو پھر تم نماز پڑھتے ہی کیوں ہو؟ اوّل تو اس لئے کہ قیامِ صلوٰۃ (یعنی دین کی صلوٰۃ کا قیام) ایک فرد کے بس کی بات نہیں یہ ایک اجتماعی پروگرام ہے۔ لہٰذا جب تک اس رسمی نماز کی جگہ حقیقی صلوٰۃ کے قیام کا امکان نظر نہیں آتا، میں بھی باقی قوم کے ساتھ چلے جا رہا ہوں کہ بالآخر میں بھی انہی میں کا ایک ہوں۔ البتہ میں اس امید کے سہارے یہ کچھ کرتا ہوں کہ جس وقت بھی ہمارے مقدر کا ستارہ پلٹا تو دین کے نظامِ ربوبیت کے لئے ان ہی بے جان ڈھانچوں میں روح پھونکی جائے گی کہ قیامت، نفخِ صور ہی سے بپا ہو گی۔ میں اسلام کے مستقبل سے نا امید نہیں ہوں۔ بلکہ دنیا کا مستقبل اسی کے ساتھ وابستہ سمجھتا ہوں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۱ء باب المراسلات)

اس میں شبہ نہیں کہ میں اس پروگرام کی ان جزئیات کو جو قرآن نے متعین نہیں کیں، غیر متبدل نہیں سمجھتا لیکن ان میں تغیر و تبدل کا حق بھی کسی فرد کو نہیں۔ نہ مجھے نہ کسی اور کو۔ اس کا حق اس مرکزِ ملت کو ہو گا جو قرآن کے مطابق نظام قایم کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ اس کی تفصیل بھی میرے مضمون "اسلامی نظام" میں آچکی ہے[1]

سوال ۵۔ آپ نے لکھا ہے کہ مذہب نے ملوکیت کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا (یا ملوکیت نے مذہب کے ساتھ مفاہمت کرلی) کیا اس سے آپ کی یہ مراد ہے کہ بزرگانِ مذہب نے عمداً اور دانستہ ملوکیت کو تقویت دینے کے لئے اس قسم کا سمجھوتہ کرلیا؟ پھر آپ نے لکھا ہے کہ اس سمجھوتے میں روایات، فقہ اور تصوف نے ملوکیت کو بڑی مدد دی۔ کیا یہ چیزیں اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟

جواب ۵: میں نے نہ تو ملوکیت کے ضمن میں کسی بادشاہ کا نام لیا، نہ مذہب کی سمت کسی بزرگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا مقصود افراد نہیں، بلکہ وہ نتیجہ ہے جس تک ہمیں تاریخ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے اسلاف کے متعلق میرا وہی مسلک ہے جو قرآن نے ہر مسلمان کے لئے متعین فرمایا ہے کہ اخوننا الذین سبقونا بالایمان (کہ وہ ہمارے بھائی ہیں جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے رخصت ہوگئے۔ ملوکیت اور مذہب دو (INSTITUTIONS) ہیں اور میری تنقید ان انسٹی ٹیوشنز ہی سے متعلق ہے۔ نہ کہ افراد سے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کس نے دانستہ کیا کچھ کیا اور نا دانستہ کیا کچھ، سو اس کا فیصلہ خدا کر سکتا ہے۔ ہم اس امر کیلئے جج بننے پر مکلف نہیں۔ اس باب میں بھی میرا مسلک وہی ہے جسے قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور فرعون سے مکالمہ کے ضمن میں فرمایا ہے کہ جب فرعون نے کہا کہ فما بال القرون الاولی (اے موسیٰ یہ کہو کہ اسلاف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟) تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ علمها عند ربی فی کتاب (کہ ان کا علم اللہ کے ہاں ان کے نامۂ اعمال میں ہے)۔ بزرگانِ کرام میں سے جس کسی نے دین کی کوئی خدمت کی ہے ہم ان کے شکر گزار ہیں، لیکن تاریخ کی یہ حقیقت

---

[1] یہ مضمون بھی بڑا اہم ہے اور ہمارا ارادہ ہے کہ اسے بھی دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ (طلوعِ اسلام)

ہمارے سامنے ہے کہ جس نظامِ دینی کو محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا تھا، بعد میں وہ ثنویت میں تبدیل ہوگیا اور مذہب اور حکومت انسانی زندگی کے دو مستقل دوائرِ عمل قرار پاگئے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کس طرح ہوا اور کن کے ہاتھوں سے، نہ ہی یہ کہ ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ۔ دانستہ ہو یا نادانستہ، نتیجہ ایک سا ہی مرتب ہوتا ہے۔ کوئی ماں اگر اپنے بچے کو نادانستہ دوائی کی جگہ زہر کی پڑیا دیدے تو اس کا نتیجہ بھی اسی طرح موت ہوتا ہے جس طرح دانستہ زہر دینے کا نتیجہ۔ ہم آج اس زہر کو اس لئے تریاق نہیں کہہ سکتے کہ اسے نادانستہ دیا گیا تھا۔ جتنی جلدی اس زہر کو زہر کہہ دیا جاتا بہتر تھا تاکہ آنے والے بچے اس سے ہلاک نہ ہوتے، اور اگر اسے اس وقت تک زہر نہیں کہا گیا تو کسی وقت تو اس کی ابتدا ہونی چاہیئے! جب ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک یقینی معیار موجود ہے جو زہر کو زہر اور تریاق کو تریاق بتا دیتا ہے تو ہم اس پڑیا کو کیوں نہ پرکھ کر دیکھ لیں کہ زہر ہے یا تریاق۔

باقی رہا یہ کہ کیا روایات، فقہ وغیرہ اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟ سو میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان کا مقصد کچھ اور تھا لیکن انہیں اس نئے مقصد کے لئے استعمال کیا گیا، اور اس استعمال کے لئے پہلے یہ کیا گیا کہ انہیں ان کے اصل مقام سے ہٹا کر ایک نئی حیثیت دیدی گئی۔ ان کی یہ نئی حیثیت اس خرابی کا اصل موجب ہے اور جب تک انہیں ان کی اصلی حیثیت نہیں دی جائے گی یہ خرابی بدستور قائم رہے گی۔

دین کے غیر متبدل اصول قرآن کے اندر ہیں، ان کی جزئیات اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق امتِ محمدیہ نے خود متعین کرنی تھیں۔ دین کی اصلی سند قرآن تھا، اس لئے اسے یقینی طور پر محفوظ رکھا گیا۔ باقی چیزیں وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے تھیں، اس لئے انہیں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہ کرامؓ میں جب تک ان چیزوں کو یہی حیثیت دی جاتی رہی ان سے نفع ہی نفع برآمد ہوا، خرابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بعد میں آنے والوں نے ان روایات کو اس لئے اکٹھا کیا کہ ان سے اس عہدِ ہمایوں کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ یہ تھا جمع وتدوینِ روایات کا جذبۂ محرکہ اور یہ تھا ان روایات سے مقصود۔ لیکن بعد میں جب ملوکیت کو اپنے مقام کے لئے مقدس سہاروں کی ضرورت پڑی تو انہیں اس کی جستجو ہوئی کہ یہ سہارے کہاں سے مل سکیں گے۔ قرآن سے یہ سہارے مل نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ قرآن کا ہر حرف اپنی اصلی شکل میں محفوظ تھا جس میں نہ کسی تبدیلی کی گنجائش تھی نہ اضافے کا امکان۔ اگر کوئی شخص قال اللہ تعالیٰ کہہ کر ایک لفظ بھی ایسا اپنی زبان پر لاتا جو قرآن میں نہیں تھا تو ہزاروں ہاتھ اس زبان کو پکڑنے کے لئے بیک وقت اٹھ آتے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ قرآن میں نہیں ہے، اس پر اضافہ کیا جارہا ہے۔ لہٰذا ان سہاروں کے لئے کسی دوسری طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ گوشہ وہی ہو سکتا تھا جو قرآن کی طرح محفوظ نہیں تھا اور جس میں ہر قسم کے ردوبدل اور تحریف والحاق کی گنجائش تھی۔ یہ روایات کا مجموعہ تھا۔ جھوٹی روایات وضع کرنے میں کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ لیکن اگر روایات کو محض تاریخ ہی قرار دیا جاتا تو ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان روایات کو دین قرار دیا گیا بالکل قرآن جیسا دین (مثلہٗ معہٗ) بلکہ اس سے بڑھ کر کیونکہ روایات قرآن کی ناسخ بھی قرار دی گئیں اور اس پر قاضی بھی۔ جب روایات کی حیثیت تاریخِ دین سے خود دین میں تبدیل کر دی گئی تو پھر جس چیز کو چاہا دین بنا دیا۔ روایات سازی کی صدہا کامیاب کوششوں کا ذکر کتب جرح وتعدیل میں موجود ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی کوششیں ایسی بھی ہوں گی جنہیں احتساب کی نگاہیں پکڑ نہیں سکیں۔ ان دانستہ کوششوں کے علاوہ، جو کچھ نادانستہ اور بڑی نیک نیتی سے ہوا وہ بھی اپنی مقدار اور مضرت رساں نتائج کے اعتبار سے کچھ کم نہیں تھا۔ جب بھی ظنیات کو یقین کا درجہ دے دیا جائے، یہ کچھ ہونا لازمی ہے۔

جو کچھ روایات کے بارے میں ہوا وہی کچھ فقہ کے ساتھ ہوا۔ فقہ ان جزئیات کا نام تھا جو اربابِ تفقہ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے وقت میں نافذ العمل ہونے کے لئے مدون کی تھیں یا یوں سمجھئے کہ یہ ان فیصلوں کا نام تھا جو مسلمان بادشاہوں کے وقت ان کی عدالتوں سے صادر ہوتے رہے۔ جب وہ زمانہ گزر گیا تو ان جزئیات کی حیثیت بھی تاریخ کی

حیثیت دہ گئی یعنی یہ بتانے کے لئے کہ فلاں زمانے میں فلاں اصول کو یوں نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ان فقہی جزئیات کو بھی غیر متبدل قرار دے کر دین بنا دیا گیا ـــ قرآن جیسا دین ـــ اور جس طرح روایات میں جو جی میں آیا اسے رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا گیا اسی طرح فقہ کے متعلق بھی جو مناسب سمجھا گیا کسی امام فقہ کے نام سے مشہور کر دیا اس طرح یہ چیز بھی ملوکیت کی تقویت کا ذریعہ بن گئی۔

باقی رہا عجمی تصوف تو اس کا تو تصور ہی اسلام میں ایک اختراع تھی۔ اگر تصوف نام ہے اعمال میں اخلاص کا تو اس کے لئے نہ کسی جداگانہ اصطلاح کی ضرورت تھی نہ کسی فن کی۔ اسے کہ وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو منافقت کہلاتا ہے یا بے معنی رسم۔ عمل با اخلاص ہی ان نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جو قرآن نے اعمال صالح کے پرکھنے کے لئے واضح الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں تاکہ اس باب میں کسی کے لئے کوئی غلط فہمی، کوئی دھوکہ یا اشتباہ کی گنجائش نہ ہو۔ لیکن تصوف نے اس ثنویت کو سند الوہیت عطا کر دی جو دین اور دنیا میں دوئی کا باعث بنی تھی اور جس سے ملوکیت نے اپنی زندگی پائی تھی۔ قرآن نے عیسائیت کے متعلق کہا تھا کہ اس میں رہبانیت کو بطور ایک بدعت اختیار کیا گیا لیکن وہ اس بدعت کو بھی نباہ نہ سکے۔ اس لئے کہ انسانی جذبات کو دبانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان جذبات کو دوسری سمتوں کی طرف منتقل کر کے انھیں مفید نتائج کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ رہبانیت انھیں دبانے کی کوشش کر کے انھیں مختلف زمین دوز راہوں سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے مذہب اسی قسم کے غیر فطری دباؤ کی زندگی سکھاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے جذبات کا وہ Perversion جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری کتب روایات و فقہ میں اس قسم کے Perversion سے متعلق جتنا لٹریچر ملتا ہے وہ ان حضرات کا پیدا کردہ یا جمع کردہ ہے جنھوں نے روایات یا فقہ کی پہلے پہل جمع و تدوین کی۔ نہ معلوم اس لٹریچر میں کہاں کہاں کی چیزیں آ کر شامل ہو گئیں اور کن راہوں سے یہ سانپ حریم کعبہ میں آ گھسے۔ لیکن جب ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ کعبہ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے تو کیا ہم اسے محض اس لئے باہر نہ پھینکیں کہ یہ سانپ غلاف کعبہ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے؟ وقت ہے کہ ہم حریم کعبہ کو اس قسم کے بتوں سے پاک و صاف کریں۔ ان بتوں کی کعبہ میں باریابی نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصود رسالت نہ بزرگان دین کے پیش نظر تھی، نہ مجتہدین ملت کا مدعا۔ ہماری بدبختی سے انھوں نے کسی نہ کسی طرح وہاں تک راہ پالی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان سانپوں کو کچل کر باہر پھینک دیا جائے یا اپنی عقیدتمندیوں کا دودھ پلا پلا کر ان کی پرورش کی جائے

(یہ تھے وہ سوالات اور جوابات جو "اسباب زوال امت" کے سلسلے میں طلوع اسلام بابت ماہ جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ آپ ان تفاصیل کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر اصل مضمون کو پڑھئے کیونکہ وہ مضمون بار بار پڑھنے اور سمجھنے کا ہے۔ طلوع اسلام)

کیا آپ نے المیزان کے حصے خریدنے کی اطلاع دیدی ہے؟
اگر نہیں دی تو جلدی کیجئے۔

نقد و نظر

PRAYER FOR PROGRESS | مصنف عبدالرزاق صاحب۔ سٹاکسٹ: محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

تحریک پاکستان میں مسلمان بڑی بے تکلفی سے نعرے لگایا کرتے تھے کہ پاکستان میں قرآنی آئین کا نفاذ ہوگا۔ ہر کہ ومہ اس نعرے میں برابر کا شریک تھا۔ تمام وابستگان تحریک متفق اللسان تھے کہ پاکستان کی سرزمین پاک کو نظام خداوندی کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔ اس وقت کسی نے نہ سوچا اور شاید کسی کو سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی کہ قرآنی نظام کہتے کسے ہیں اور وہ نافذ کیسے ہوگا۔ لیکن جب پاکستان قائم ہوگیا تو ان لفظوں کی صدائے بازگشت اس تقاضے کی صورت میں سنائی دینے لگی کہ اگر جانتے ہو تو بتاؤ کہ اسلامی نظام ہے کیا؟ آج قریباً ساڑھے چار سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن مسلمان اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ یہی وجہ ہے آج تک پاکستان کا آئین مرتب نہیں ہوسکا اور بظاہر یہ عقدہ لاینحل ہی نظر آرہا ہے۔ تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی اور مثال ملتی ہو کہ کوئی تحریک حصول مقصد میں کامیاب ہوکر بھی نہ طے کرسکے کہ وہ مقصد تھا کیا جس کے لئے یہ کامیابی ہوئی ہے؟ مسلمانوں کی صورت یہ ہے کہ

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا،

ارباب اقتدار جو قرآنی آئین کی تنفیذ کے نعرے لگانے میں سب سے پیش پیش تھے اس سطح سے بلند نہ ہوسکے۔ انھوں نے پہلو بدل بدل یہ نعرے لگانا شروع کردیئے کہ پاکستان کا آئین "اسلامک سوشلزم" پر استوار ہوگا۔ چنانچہ جہاں جہاں بھی وہ گئے انھوں نے اسی کو دہرایا جب مرحوم لیاقت علی خاں امریکہ کے دورے پر گئے ہیں تو انھوں نے خصوصیت سے اس کا چرچا کیا کہ پاکستان میں اسلامک سوشلزم پر نظام نافذالعمل ہوگا۔ اس سے قدرتی طور پر دیگر ممالک میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ اسلامک سوشلزم ہے کیا اور اس کا دیا ہوا آئین دنیا کے مروج آئینوں سے کیسے مختلف اور بہتر اور برتر ہے۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ چند امریکی پروفیسر کراچی آئے تو انھوں نے چند چیدہ چیدہ مسلمانوں سے ایک پبلک محفل میں یہ پوچھ ہی لیا کہ ذرا آپ اسلامک سوشلزم کے اصولوں کی وضاحت کردیجئے۔ اس کے جواب میں انھیں یہ کہا گیا کہ ہنوز اس آئین کا سراغ نہیں دیا جاسکا کیونکہ ابھی اس کا تجربہ کیا جارہا ہے۔

اس سوال کا جواب کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے اٹھتے بیٹھتے یہ کچھ کہتے رہنے سے ممالک یورپ میں یہ تجسس پیدا ہوا ہے کہ اسلامک سوشلزم کی ماہیت دریافت کریں چنانچہ ایسی کتابوں کی مانگ بڑھتی جارہی ہے جو بیرونی ممالک کو تحریک پاکستان کی غرض و غایت یا پاکستان کے نصب العین۔ یعنی اسلام۔ سے روشناس کرائیں یہ وقت تھا کہ اگر حکومت پاکستان اسلامی آئین مرتب نہیں کرسکی تو کم از کم مفکر آگے بڑھتے اور فکر اسلامی کو از سر نو مرتب کرکے حالات حاضرہ کی روشنی میں اقوام عالم کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ اسلام کے نظام کو سامنے رکھ کر اپنے مروج آئینوں سے اس کا تقابل کرکے اسلام کی برتری کی معترف ہوجاتیں۔ لیکن مسلمان کہ خود اس کا دامن فکر و تدبر

ہی تھا، دیگر اقوام کی کیا راہبری کرسکتا تھا۔ وہ خود راہ گم کردہ تھا، ہزار سال کی روایات میں کھویا ہوا۔ زندگی سے دور، زندگی کے ہنگاموں کی دور۔ ان میں کئے فقیہان اسلام، لغت ہائے حجازی کے بوجھ میں دبے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔ انھیں اپنی خبر نہ تھی، وہ کیا ہی کے حالات کوائف کیا سمجھتے۔ یوں بھی بیسویں صدی میں ملا کے لئے بیسویں صدی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن ملا بھی لات ومنات کی طرح بھیس بدلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس نے ایک نئی نوع کو آگے بڑھایا ہے جس کا خمیر یکسر ملائیت سے اٹھایا گیا تھا لیکن انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرکے "ماڈرن" بن چکی تھی۔ یہ طبقہ اس سے بیشتر اپنی تعلیم کا ماحصل انگریزی کی راہ پر نثار کرتا رہا تھا لیکن اب اس طبقے کے لئے نیا میدان کھل گیا کہ اسلام، ان کے لئے آسان موضوع اور مشغلہ موجود تھا۔ انھوں نے اشہب قلم سنبھالے اور شہسوار بن گئے چنانچہ اس دوران میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ متعدد کتابیں ایسی شائع ہو چکی ہیں جن میں وہی ملا کی دقیانوسیت انگریزی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ بلند آہنگ عنوانوں کیساتھ

اس میدان کے نئے شہسوار جناب عبدالرزاق صاحب بی اے ہیں آپ مشرقی پاکستان کی سول سروس کے رکن ہیں اور آپ کی انگریزی تصنیف کا نام ہے PRAYER - For Progress کتاب کا ضمنی عنوان ہے "شریعت کی روشنی میں عبادت الٰہی کی معقول توجیہ" ابتدا ہی میں آپ نے یہ سوال اٹھائے ہیں کہ کیا عبادت کا جذبہ طبعی ہے؟ اس کا جواب وہ بڑی آسانی سے یہ دیتے ہیں کہ عبادت انسان کی جبلت میں داخل ہے۔ کیسے؟ جواب سن لیجئے کیا آپ پر یاس وکرب کی ایسی گھڑی نہیں گذری کہ آپ نے دل ہی دل میں اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہو اور اللہ سے نجات کی دعا مانگی ہو؟ ساخوشی کے خاص موقعوں پر بھی ہوتا ہے جب انسان "بے اختیار" ہو کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ کیا یہ قطعی ثبوت نہیں کہ عبادت جبلت میں داخل ہے؟ دراصل عبادت کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت کردیا گیا ہے۔ یہ جذبہ کائنات کی فطرت میں بھی ودیعت کردیا گیا ہے۔ دونوں عبادت کرتے ہیں یا دونوں کو کرنی چاہیئے انسان کو (بے جان) کائنات سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ وہ کیسے انہماک سے عبادت میں مصروف ہے! کتاب بالعموم اسی قسم کے "استدلات" سے بھری پڑی ہے۔ مصنف کے چند مفروضات ہیں جنھیں وہ بزعم خود "عقلی" دلایل سے ثابت کرتے ہیں ثبوت عموماً یوں ہوتا کہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ یوں ہوتا ہے۔

گو کتاب کا موضوع تو یہ ہے کہ عبادت کا بہ حیثیت ذریعہ ترقی جائزہ لیا جائے لیکن فاضل مصنف نے جو کچھ اسلام کے متعلق سن رکھا ہے اسے کسی نہ کسی طریق سے ضرور سپرد قلم کر گئے ہیں۔ اسلام کے ساتھ آپ نے سائنس اور فلسفہ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ اور بزعم انھیں غلط ثابت کیا ہے۔ مثلاً دوسرے باب میں کائنات کی تخلیق و مقصد پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ مادہ میں توانائی ہے لیکن

یہ توانائی کہاں سے آئی؟ ہم یہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ مادہ کسی سرچشمہ سے توانائی حاصل کرتا ہے لیکن ہم یہ سمجھ نہیں سکتے کہ توانائی مادے کا خاصہ ہے۔ یہاں سے مادہ پرست اور خدا پرست کا فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔ اول الذکر اسے مادہ کی خاصیت متصور کرتا ہے اور آخرالذکر کا عقیدہ ہے کہ توانائی اللہ کی طرف سے ہے۔

مصنف نے قدرے تعلی سے دعویٰ باندھا ہے کہ انھیں سائنس اور فلسفہ کی غیر مانوس وادیوں میں سرگرداں و جادہ پیما رہنا پڑا کیونکہ موضوع کی وضاحت کے لئے ایسا ناگزیر تھا لیکن مصنف کے طرز بحث اور انداز استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کی حد دورحاضر کی حد سے بہت پیچھے ہے۔ گو یہاں اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں لیکن عہد حاضرہ کی تحقیقات جس مقام پر پہنچ چکی ہیں وہاں مادہ اور توانائی کی

نبوت ختم ہو چکی ہے جسے مصنف نے مدارِ بحث بنا کر استنباطِ نتائج کیا ہے۔ کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کر کے آپ اس قدرتی سوال کو سامنے لاتے ہیں کہ اس تخلیق کا مقصد بالآخر کیا ہے؟ اور ایک ہی فقرے میں بلا بحث یہ جواب دیکر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "خالق رحمٰن" کی فطرت کا تقاضا تخلیق ہے۔ عقیدتمندوں کی محفل میں بیٹھ کر تو یہ "مسکت" جواب دیا جا سکتا ہے لیکن سائنس و فلسفہ کا ذکر چھیڑ کر اتنا جواب دیکر پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ مگر اسی ایک بات ہی پر کیا موقوف ہے، مصنف نے کہیں دلیل و برہان کی ضرورت نہیں سمجھی، اور جسے انھوں نے بزعم خود دلائل کہاہے وہ ایسی ہی لاطائل بحثیں ہیں۔

ارتقاء کے نظریہ پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ڈارون کے نظریہ کی تغلیط کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ کسی بوزنے نے انسان کا بچہ جنا ہو؟ اب کون کہے کہ صاحب میں نے دیکھا ہے۔ جب کوئی کہنے کے لئے آگے نہیں بڑھتا تو لا محالہ صاحب کتاب یہ نتیجہ نکالیں گے کہ ارتقاء کا نظریہ سراسر غلط ہے۔ اس کے مقابلے میں 'اسلامی' نظریہ مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے براہِ راست انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ (انسان کیا دوسری تمام نوعیں ویسی کی ویسی پیدا ہوئیں۔ کسی میں کوئی 'ارتقاء' نہیں ہوا) انسان کی روح جنت میں پہلے ہی سے رکھی پڑی تھی (البتہ وہ عبادت میں مصروف تھی) اسے وہاں سے اٹھا کر اس مجلس آب و گل میں مقید کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا جہاں آدم اور حوا کی اولاد چلی۔ کیسے؟ یہ تاریخ کی داستان ہے، جسے مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے۔

انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اسے حیوانات سے یوں ممتاز کیا کہ اسے حسِ ششم یعنی ضمیر عطا کی۔ یہ حس یعنی ضمیر انسان کو 'ذات غیب' کا ادراک عطا کرتی ہے تاکہ انسان راہِ راست سے بھٹک نہ جائے۔ اللہ انسان کو ضمیر کے واسطے سے متنبہ کرتا رہتا ہے اور خیر او شر سے آگاہ رکھتا ہے ــــ اگر ضمیر کا یہ مقام ہے اور وہ واقعی خدا کے پیغام براہِ راست رسول کرتی ہے اور انسان کو آگاہ و متنبہ کرتی ہے تو خدا نے نبی کیوں بھیجے؟ علیحدہ علیحدہ کتابیں کیوں نازل کیں؟ اور قرآن کو کیوں قیامت تک محفوظ رکھا؟ یہ سوالات ایسے ہیں جنھیں مصنف نے لائق اعتنا نہیں سمجھا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مصنف کے نزدیک اللہ اور ضمیر کے درمیان کیا کچھ ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انسان کے ضمیر اور نفس میں پیہم جنگ رہتی ہے۔ اللہ عموماً اس جنگ میں مداخلت نہیں کرتا (بلکہ وہ غیر جانبدار رہتا ہے) کیونکہ اس نے فریقین کو اس انداز سے تیار کر رکھا ہے کہ آخر کار ضمیر کی فتح مقدر ہے۔ اگر انسان ضمیر کو کامیاب بنانے میں ناکام رہتا ہے تو وہ اس کا قصور ہے، اللہ کا نہیں ("اللہ کا اس میں کوئی قصور نہیں" یہ الفاظ مصنف نے کئی جگہ دہرائے ہیں۔ اللہ کو اس قسم کا وکیل شاید ہی کبھی میسر آیا ہوگا۔) ذرا آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ کو انسانی روح کی حقیقی فلاح مقصود ہے اس لئے وہ ضمیر او رنفس کی جنگ میں کبھی کبھی مداخلت کر بھی گذرتا ہے۔ مداخلت کے وقت وہ "درد کی مہمیز" استعمال کرتا ہے۔ یعنی وہ پیغمبر بھیجتا ہے جو اذیتیں ـــ درد ـــ اٹھا کر انسان کے لئے مثال قائم کرتے ہیں۔ اس قسم کی متعلق گفتار کے بعد آپ حسن استنباط کا یوں مظاہرہ کرتے ہیں لہٰذا انسان اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہے۔

مصنف کا یہ بھی ارشاد ہے کہ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ انھیں جنت میں داخل کرے۔ اس غرض کے لئے وہ اپنے بندوں کو اس دنیا میں انعامات بھی دیتا ہے لیکن اگر سارے کا سارا انعام یہیں دیدے تو جنت میں اس کے پاس دینے

کے لئے کیا رہ جائے۔ اس لئے وہ انعام میں سے کچھ کاٹ کر جنت معمور کرتا رہتا ہے۔ دوسرے یہ بھی تو مصیبت ہے کہ اگر بندوں کو پورے انعام واکرام میسر آجائیں تو وہ ان کی لذتوں میں کھو جائیں گے اور پاک اور صاف نہیں رہیں گے۔ اگر کوئی کہدے کہ یہ مصائب جاں گسل ہیں تو ان کو مصنف یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ مصائب یقیناً جہنم کی سزا کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ گویا انسان کا انتخاب دنیاوی مصائب اور جہنم کے عذاب میں ہے۔ اب بتائیے مشرقی پاکستان کے اس رکن سول سروس میں اور ملاّ میں اس کے سوا اور کیا فرق باقی رہ جاتا ہے کہ وہ دنیا کو عربی زبان میں 'دارالمحن' کہتا ہے اور یہ انگریزی میں۔ وہ "قدامت پسند" ہے اور یہ "ماڈرن"!

انسان کی دنیاوی زندگی پر بحث کرتے ہوئے آپ انسانی عمر کا ذکر کرتے ہیں اور اس مروجہ خیال کی کہ انسان کی عمر قلیل ہے، یوں تردید کرتے ہیں کہ انسان کی دنیاوی زندگی آخرت کی تیاری ہے اور اس کی حیثیت ثانوی ہے لہذا اسے مختصر ہی ہونا چاہیئے۔ اور پھر انسان کو دیکھیئے کہ وہ دولت کماتا ہے تو، بھوکا رہتا ہے تو، تسخیرِ فطرت کرتا ہے تو، ہر حال میں ناخوش رہتا ہے۔ جب اس کی زندگی کا انداز یہ ہے تو لمبی عمر یعنی چہ!

ایک باب "انسان، اس کے مسائل اور ان کا حل" سے مختص ہے۔ کتنا دلکش عنوان ہے، اور جو مصنف سائنس اور فلسفہ کے نظریات بھی کھنگال چکا ہے، وہ کتنی دلچسپ بحث کرے گا! لیکن بحث کا ماحصل یہ ہے کہ انسان نے اس دنیا میں گناہ کی زندگی اختیار کی جس سے اس کے لئے طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ گو مصنف نے اس سے بالفاظ صریح یہ ثابت نہیں کیا اگر انسان گناہ نہ کرے تو اس کیلئے کوئی مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو لیکن جسد کتاب میں لرزش خفی بالکل اسی قسم کی ہے۔ اس 'اسلام' اور عیسائیت کی رہبانیت میں کیا فرق ہے؟ اسے خود مصنف بھی سمجھ نہیں سکے ہوں گے، چہ جائیکہ وہ کسی اور کو سمجھائیں۔

مصنف فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نیکو کاروں کو اذیتیں پہنچاتا ہے تو انھیں پاک وصاف کرنے کی نیت سے ایسا کرتا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گناہگاروں پر عنایات واکرام کیوں؟ اس کی وجہ بھی صاف ہے۔ گناہگاروں کو جنت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اللہ ان کو پاک وصاف کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لہذا وہ ان کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ وہ مہربان ہے اس لئے وہ انھیں خوشحال رکھتا ہے۔ یہ اللہ بھی عجیب اللہ ہے۔ وہ گناہگاروں کو خوش حال رکھے تو مہربان کہلائے اور نیکو کاروں کو مصائب میں مبتلا رکھے تو مہربان کہلائے!

مصنف کے طرز استدلال کی ایک اور دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔ موت کا ڈر دور کرنے کے خیال سے آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موت تکلیف دہ مرحلہ نہیں۔ چنانچہ پہلے تو آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب کوئی انسان مر کر واپس نہیں آیا تو یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ مرنے والے کو اذیت ہوتی ہے۔ اس کی تقویت کے لئے وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک مرض میں ان کی حالت نازک ہو گئی اور آپ مرمر کے بچے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب میں بیہوش تھا تو اگر میں اس حالت میں مر جاتا تو مجھے اس بے ہوشی کی وجہ سے موت کی مفروضہ اذیت کا احساس بھی نہ ہوتا۔ شاید اس تجربہ کی بنا پر آپ نے ایک کلیہ بیان کیا ہے کہ موت سے پیشتر ہوش بجا نہیں رہتا (لہذا اذیت نہیں ہوتی) یا اگر ہوش باقی رہے تو موت ایسی ناگہانی واقع ہوتی ہے کہ اذیت کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اس کلیہ کے لئے آپ کے پاس سند کیا ہے؟

یہ کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن سند کس کس بات کی طلب کی جائے، یہاں تو کسی بات کی بھی سند نہیں بمصنف سند سے بہت اونچے ہیں۔

موت کا ڈر دور کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ عبادت ہے۔ نیز یہ دلیل بھی کہ روح غیر فانی ہے جو موت سے نہیں مرتی۔ لیکن روح کے غیر فانی ہونے کی دلیل کیا ہے؟ ڈلیل یہ کہ تمام مذاہب اس کی تعلیم دیتے ہیں اور بیشتر انسان اسے تسلیم کرتے ہیں!! اور سند کیا چاہئے؟

ایک باب میں ترقی کے لوازمات گنوائے گئے ہیں اور ارکان خمسہ کی حکمتوں کو اس طرح ثابت کیا گیا ہے کہ ملّا بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ نماز کا ہر رکن ناقابل تغیر ہے۔ اذان کی انسانی آواز بھی "غیر متبدل" عنصر ہے۔ نماز روح کی ورزش ہے اور امور دنیا سے علیحدگی کا ایک ذریعہ بھی۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسے سمجھنا بھی چاہئے لیکن (اس سمجھنے سے کہیں) زیادہ ضروری خشوع ہے جو نماز میں پیدا ہونا چاہئے۔ جو لوگ نماز کے الفاظ کے معانی نہیں سمجھتے وہ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ وہ خدا کے حضور کھڑے ہیں اور اس سے قرآنی الفاظ میں خطاب کر رہے ہیں۔ "حضور" پیدا کرنے کے لئے یہی احساس کافی ہونا چاہئے۔

پھر ارشاد ہے کہ نماز معاشری ادارہ نہیں جو لوگ نماز کو معاشری ضرورت یا مصلحت سمجھتے ہیں وہ نماز کو اس کے بلند ترین مقام سے پست ترین درجہ میں لے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ نماز کو اجتماعی فعل سمجھنا تو ایک طرف لائق مصنف آخری باب میں شریعت کے نکتہ چینوں اور شریعت میں اصلاح کے خواہاں لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ خوش قسمتی سے شریعت میں اصلاح پسندی ابھی تحریک کی صورت اختیار نہیں کر سکی۔ اس اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ توجہ کا مرکز روحانیت سے ہٹا کر انسانی اجتماع (معاشرت) کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ لیکن اگر قوم روحانیت سے ہٹ گئی تو مذہب ختم ہو جائیگا (یہاں ہم مصنف سے پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ یہ رائے ان کی سو فیصدی صحیح ہے۔ بس ایک مرتبہ اس روحانیت کا پردہ چاک ہو جائے تو مذہب ـــ دین نہیں، مذہب ـــ خود بخود ختم ہو جائے گا)

الغرض کہاں تک تبصرہ کیا جائے کتاب کے ایک ایک صفحے پر حکمت و مذہب کے موتی بکھرے پڑے ہیں جن احباب میں ان موتیوں کو چننے کی ہمت ہے وہ کتاب دیکھیں۔ مصنف نے کتاب لکھنے میں جس قدر مطالعہ کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام سے متعلق کتاب ہے اور ساری کتاب میں صرف ایک مرتبہ اقبال کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ اس نے پاکستان کا تصور دیا ہے۔ ہمارے اس دور میں یہ ذکر بھی اتفاق سے ہو گیا ہے۔ کیونکہ مصنف نے خواہ مخواہ پاکستان کا ذکر کر دیا جس کے ضمن میں قائداعظم اور اقبال کا نام لینا ناگزیر ہو گیا۔ جس شخص کا اقبال سے تعارف صرف اسقدر ہو وہ اسلام پر جس قسم کی کتاب لکھ سکتا ہے ظاہر ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہرچند مصنف نے کتاب کا عنوان "عبادت" تجویز کیا، لیکن جو کچھ اسلام کے متعلق سنا سنایا یاد تھا وہ سب کچھ انھوں نے جیسے جی میں آیا لکھ دیا اور اس میں ربط کی ناکام کوشش کہیں کہیں اس میں عبادت کا ذکر کر کے کی۔ یہ کتاب تفنن طبع کا وافر سامان اپنے اندر رکھتی ہے لیکن اس کا المناک پہلو یہ ہے کہ یہ انگریزی میں لکھی گئی ہے اور اسے جب بیرونی ممالک پڑھا جائے گا تو باہر والے اسے سند تسلیم کریں گے اور اسلام کے متعلق وہ رائے قائم کریں گے جو مصنف نے پیش کی ہے۔ اگر یہ کتاب پرانے ملا کی

لکھی ہوئی تو اور بات تھی کیونکہ اسے عام طور پر ملا کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اب یہ کتاب ایک تعلیم یافتہ — غیر مُلّا — کی تصنیف کردہ ہے۔ جس نے محنت اور مطالعہ سے یہ طومار جمع کیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں دنیا بھر میں جس طرح اسلام کو ذلیل و رسوا کریں گی اس کا اندازہ فی الحال نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ابھی ایسی کتابوں کو شائع ہو کر چار دانگ عالم میں نشر ہونے دیجئے اور چند سالوں میں آپ دیکھئے گا کہ خود مسلمانوں کی محنت سے اسلام کی راہ میں توہین و استہزاء کے کس قسم کے ہمالیہ پہاڑ حائل ہو جائیں گے۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اسلام مصنف کے نزدیک قرآن اور حدیث کا مجموعہ ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں آپ کے نزدیک غیر متبدل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت انسانی ہر دور میں اور ہر جگہ یکساں ہے۔ سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

غضب خدا کا، ایک شخص معمولی حساب کی کتاب لکھتا ہے تو لوگ دیکھتے ہیں کہ اس فن میں اس کا درک کہاں تک ہے۔ لیکن یہاں ایک شخص اٹھتا ہے اور اس کی جہالت کے نشتر سے نہ خدا محفوظ رہتا ہے، نہ رسول، نہ قرآن، نہ اسلام، لیکن اس سے کوئی بازپرس نہیں کرتا؟

کتاب پر قیمت درج نہیں۔ البتہ کاغذ اتنا موٹا لگایا گیا ہے کہ یہ دو سو صفحات کی کتاب دوگنے حجم کی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔

ربِ اسلام

یہ ۲۰ صفحات کا ایک پمفلٹ ہے جسے شیخ محمد انور صاحب کاشمیری نے لکھا ہے اور ادارۂ تربیتِ ذہنی پشاور نے شائع کیا ہے۔ (قیمت اس کی ۲ ار فی نسخہ ہے)۔ مصنف کے الفاظ میں یہ مقالہ درحقیقت ان کی ایک تصنیف " فکر معاش " کا ایک باب ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے دیگر ابواب میں ایک باب " اسلام کا قانون اساسی " ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ " اسلام کا قانونِ اساسی صرف قرآن ہے "۔ آخری باب " ملکیت زمین " ہے جس میں " اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ از روئے قرآن زمینداری قطعاً حرام ہے۔ بلکہ قرآن کا زرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ صرف اتنی زمین ہی کسی شخص (کاشتکار) کی ملکیت ہو سکتی ہے جسے وہ خود کاشت کر سکے اور جو اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہو "۔

ہمیں اس سے پہلے شیخ محمد انور صاحب کی کسی تحریر کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن انہوں نے اپنی غیر شائع شدہ تصنیف کے ابواب کا جن الفاظ میں تعارف کرایا ہے ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اصولی طور پر آپ کا مسلک وہی ہے جس کا نقیب طلوع اسلام ہے۔ اس سے ہمیں خوشی ہوئی کہ اب طلوع اسلام بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

میرے اب یہاں رازداں اور بھی ہیں

قرآن کے معاشی نظام کا پورا پورا نقشہ محترم مصنف کے ذہن میں کیا ہے اس کا اندازہ تو ان کی تصنیف (فکر معاش) —

دیکھنے ہی سے لگ سکے گا۔ لیکن زیر نظر مقالہ سے اتنا اندازہ ضرور لگ سکتا ہے کہ آپ کی فکر قرآنی ہے۔ اگرچہ اس میں ہنوز پختگی نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اسی نہج پر قرآن میں غور و تدبر کرتے رہے تو قرآن کی بہت سی راہیں اور واضح اور کشادہ ہو کر ان کے سامنے آتی جائیں گی۔ ہم اپنے ہم فکر مصنف سے درخواست کریں گے کہ قرآن کے معاشی نظام کے متعلق طلوع اسلام میں جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے وہ اس پر بھی غور کریں۔ ممکن ہے اس سے ان پر بعض ایسے مقامات واضح ہو جائیں جن کے متعلق محسوس ہوتا ہے کہ انہیں کچھ ذہنی الجھاؤ ہے۔

احکام الہدیٰ فی حقیقت الہویٰ | یہ کتاب کا نام ہے اور اس کا عرف ہے "قرآن اور حقیقت شرک"۔ کتاب کا عمود یہ ہے کہ مسلمانوں کا موجودہ طرز عمل کہ وہ انفرادی طور پر نماز، روزہ وغیرہ کی پابندی کرتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر قانون شریعت کو پس پشت ڈال دیتے، منافقت اور شرک کی زندگی ہے۔ حقیقی توحید یہ ہے کہ انسان کی پوری کی پوری زندگی قانونِ شریعت کے تابع ہو۔ ایسا نظر آتا ہے کہ مصنفِ کتاب (داعی حق وصداقت حافظ محمد سرور صاحب) کا دل مسلمانوں کی بداعمالیوں کو دیکھ دیکھ کر سخت مجروح ہو چکا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ان کی اصلاح ہو جائے۔ یہ جذبات نہایت نیک اور یہ آرزوئیں بڑی مقدس ہیں لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ

کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل بھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

جو شخص اس سوال کا عملی حل بتا سکے اسی کا درد نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

کتاب کی ضخامت ۵۲۲ صفحات۔ کتابت اور کاغذ اچھا۔ قیمت مجلد -/۸/۵۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ اسلامیہ ۱۹۵/۱۷ خدا داد کالونی۔ کراچی ۵

سو شعر | مرتبہ محمود علی خاں صاحب جامعی۔ شائع کردہ مکتبہ شاہد کراچی۔ قیمت چھ آنے۔

ہمارے سکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور عام قارئین اردو شعرائے متقدمین کے کلام سے اکثر ناآشنا رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مطالعہ کے لئے انہیں مناسب راہنمائی نہیں ملتی اور دوسرے ان شعرا کے ایسے انتخاب موجود نہیں ہیں جنہیں بآسانی دیکھ سکیں۔ ترقی یافتہ زبانوں بالخصوص انگریزی میں "انتخاب" بجائے خود ایک صنف بن گیا ہے۔ وہاں مشہور کتابوں کے ایسے ایسے انتخابات مرتب کئے گئے ہیں کہ وہ بجائے خود تصانیف معلوم ہوتے ہیں۔ اردو میں ابھی کسی گوشے کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی تو انتخاب کی فکر و کاوش کون کرتا!

ہندوستان میں جامعہ ملیہ نے اپنے تعلیمی ضروریات کے پیش نظر، سو شعروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ طلبہ کیلئے

ضرور مفید تھا، اور اس کی افادیت اسی حد تک ہو سکتی تھی، کیونکہ ضخیم دیوانوں میں صرف ایک شعر نکال لینے سے آخر کہاں تک پورے کلام کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔ انتخاب بہرحال جامع ہونا چاہئے۔ بعینہٖ یہی سلسلہ کراچی سے بھی شروع کیا گیا ہے۔ یہ اسی پرانی لکیر کی فقیری ہے۔ اس میں کوئی جدت نہیں، نہ کمی و بیشی ہے۔ تاہم یہ تقلیدی اشاعت بھی غنیمت ہے کیونکہ یہ پاکستان کے طلبہ کے کام آسکتی ہے۔

اس وقت تک غالب، درد، میر، مومن، فانی، اکبر، حسرت اور اصغر گونڈوی کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ ہر انتخاب کے ساتھ شاعر کا مختصر تعارف شامل کرکے اس سلسلہ کو اور مفید بنا دیا گیا ہے۔

انتخابات کی افادیت مسلم ہے اور اردو میں ان کی ضرورت اشد ہے۔ لیکن کرنے کا کام یہ ہے کہ ضروری کتابوں اور دیوانوں کے ایسے انتخابات شائع کئے جائیں جو ان کتابوں کا صحیح آئینہ ہوں اور اپنے اندر تشنگی نہ رکھتے ہوں۔ یہ کام بجائے خود محنت و کاوش اور ذوق کا متقاضی ہے۔ جو ہمارے ہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

معاملہ کی باتیں

۱ - طلوع اسلام ہر مہینے باقاعدگی سے جملہ خریداروں کے نام بھیجدیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو پرچہ نہ ملے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاک میں گم ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں ادارہ سے متعلق بدظنی کرنے کی بجائے ادارہ کو اطلاع دیدیجئے کہ آپ کو پرچہ نہیں ملا تاکہ پرچہ دوبارہ بھیج دیا جائے۔

۲ - خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھئے۔ یہ نمبر آپ کے پتے کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔

۳ - چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کرتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھئے۔

خوارج

علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "خوارج" عدم گنجائش کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا اب آئندہ پرچے میں شائع ہوگا

گوجرانوالہ

میں طلوع اسلام کی تقسیم بشیر صحرائی (امرتسری) صاحب ریل بازار کے سپرد ہے

حقائق و عبر

عین بروقت...

حکومت پاکستان کے متعلق عام طور پر لوگوں کو شکایت ہے کہ وہ عام امور میں بروقت یا قبل از وقت فیصلے نہیں کرتی جس سے معاملات اور الجھ جاتے ہیں اور طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شکایت سابقہ معاملات میں صحیح ہو یا غلط کم از کم ایک تازہ معاملہ میں تو سو فیصدی غلط ہے۔ مصر اور سوڈان کا قضیہ کب سے الجھا چلا آ رہا ہے۔ حال ہی میں شاہ فاروق نے اپنے "شاہ مصر و سوڈان" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا ایک اثر یہ ہوگا کہ غیر ملکی سفیر جو آئندہ مصر میں متعین ہوں گے انھیں اپنے کاغذات سفارت وغیرہ "شاہ مصر و سوڈان" کے حضور پیش کرنے ہوں گے۔ اس کا مطلب واضح الفاظ میں یہ ہوگا کہ ایسا کرنے والے شاہ فاروق کو شاہِ سوڈان بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی ممالک نے شاہِ فاروق کے نئے لقب کو تسلیم کر لیا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اتفاق کی بات ہے کہ اس نئے لقب کا اعلان ایسے وقت میں ہوا جب پاکستانی سفیر جناب اسحق سیٹھ صاحب مصر سے سبکدوش ہو کر مراجعت فرمائے وطن ہو رہے تھے۔ چنانچہ فوراً یہ مسئلہ سامنے آیا کہ نیا وزیر متعین کرنے کی صورت میں نیا خطاب بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل اور سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ شاہ مصر کو شاہ مصر و سوڈان تسلیم کرتے ہیں تو مشکل۔ تسلیم نہیں کرتے تو مشکل۔ چپ رہا نہیں جا سکتا کیونکہ نیا سفیر بھیجنے کے ساتھ ہی مہر خاموشی توڑنی پڑتی ہے۔

اب دیکھئے کہ آپ کی حکومت نے اس لاینحل مسئلہ کا کیا آسان حل سوچ لیا۔ فوراً فیصلہ کر دیا کہ سیٹھ صاحب کو واپس مصر بھیج دیا جائے نہ نیا سفیر مقرر ہو نہ لب کشائی کی نوبت آئے۔

اس فیصلے پر نکتہ چینی بھی ہوئی لیکن حکومت کی مشکل ظاہر تھی۔ بالآخر سنا ہے کہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ نئے وزیر کے تقرر کے وقت شاہ فاروق کے نئے خطاب کو تسلیم کر لے گی۔ اب بحث کی صورت یہ ہے کہ کوئی نیا سفیر مقرر ہی نہ کیا جائے۔

اس پر بھی اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ حکومت اہم امور کے فیصلے بروقت نہیں کرتی تو آپ کا قصورِ فہم ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ شاہِ فاروق کے ہاں لڑکا دیر سے پیدا ہوا ورنہ حکومت بیچاری تو یہاں تک اعلان کر دیتی کہ جب نومولود حکمراں ہوگا تو حکومت اسے شاہ مصر و سوڈان تسلیم کر لے گی۔

۲۔ "شرعی" پارٹی

اس حقیقت کے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں سے افرنگی تو چلا گیا ہے لیکن افرنگیت کا زور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے ان کاموں کے لئے افرنگیوں ہی کا انتخاب عمل میں آتا ہے جن کے متعلق خود افرنگی کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا کہ انھیں ان کاموں کے لئے بھی چنا جا سکتا ہے۔ مثلاً دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دستور

کی تسوید کے لئے ایک خالص افرنگی ڈرافٹسمین مجلس دستور ساز کے سکرٹیریٹ میں مصروفِ خامہ فرسائی ہیں۔ ان کے بعد ایک اور صاحب بہادر کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہمارے قائداعظم (مرحوم و مغفور) کیسے تھے۔ غور فرمائیے! قائداعظم ہمارے اور ان کی سیرت نگاری کا کام ایک ایسے صاحب (MR. BOLITHO) کے سپرد کیا گیا ہے جسے عمر بھر ان سے ملنے تک کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ خیر سے پاکستان میں تشریف فرما ہیں اور ہر "راہ رو" سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا قائداعظم کی کوئی بلت تو سناتے جاؤ۔ کہتے ہیں کہ ان کی "محنتِ شاقہ" پر کوئی پچاس ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے بعد وہ قائداعظم کی سوانح حیات قلمبند فرمائیں گے اور کتاب ان کی اپنی ملکیت ہوگی!

بہر حال یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اصل بات اس سے آگے آتی ہے۔ لندن کے ایک اخبار کی اطلاع ہے کہ ان صاحب کو پاکستان کے پریس اٹاشی مسٹر سلمان۔ اے۔ علی اور ان کی بیگم صاحبہ نے الوداعی پارٹی دی جس میں پاکستان کے ہائی کمشنر متعینہ لندن اور ان کی بیگم صاحبہ، ڈپلومیٹک سٹاف کے ارکان، نامور اربابِ قلم اور دیگر مشاہیر شریک تھے۔ جو صاحب اخبار مذکور کی یہ خبر پڑھ رہے تھے انھوں نے کہا کہ لکھا یہ ہے کہ سلمان صاحب نے بولیتھو صاحب کو "شرعی" پارٹی دی۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ "شرعی" پارٹی کا مفہوم کیا ہے۔ جب اخبار دیکھا تو اس میں لکھا تھا "SHERRY PARTY"

یعنی خالص شراب کی دعوت!

اسی "شرعی" پارٹی کی نسبت سے شاید مُلّا شیدا نے لکھا تھا کہ

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے حسن را پروردگارے۔ عشق را پیغمبرے

شاہ جہاں کو اس شعر کی کیا قدر ہوسکتی تھی! نہ ہوئے شیدا صاحب آج زندہ جو اس کیف انگیز تصور کی داد پاتے!

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے نمائندو! خوش رہو۔

۳۔ اہم تبدیلی حکومت پاکستان کے خلاف ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ اس نے ابھی تک گورنمنٹ اوف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو اپنا عروۃ الوثقیٰ بنا رکھا ہے اس لئے پاکستان آزاد ہونے کے بعد بھی انگریز کا غلام ہے۔ یہ الزام بہت بڑا اتہام ہے۔ ہم تنقید کے خلاف نہیں، لیکن اتہام کو تو کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ خالص اتہام ہے کہ حکومت پاکستان نے گورنمنٹ اوف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو علیٰ حالہ نافذ کر رکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان میں ہنوز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی رائج ہے لیکن حکومتِ پاکستان نے اس میں ایسی ایسی اہم تبدیلیاں کرلی ہیں کہ ان سے سابقہ "غلامی" کی بہت سی شقیں آزادی میں بدل گئی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ اوف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی شق ۲۶ میں لکھا تھا کہ کوئی شخص مجلس مقننہ کا ممبر نہیں بن سکتا

(i) وہ فاترالعقل ہو۔

(ii) دیوالیہ ہو۔

(iii) دو سال یا اس سے زیادہ کی قید کا سزایاب ہو۔

(iv) انتخابات کے سلسلہ میں کسی ناجائز یا خلاف قانون کارروائی کا مرتکب ہوا ہو۔

اب اس ایکٹ کو اٹھا کر دیکھئے جسے حکومت پاکستان نے اپنے ہاں رائج کر رکھا ہے۔ اس میں شق ۲۶ کے سامنے لکھا ہے — "حذف کر دی گئی" — (OMITTED)۔ غور کیجئے! کس قدر اہم تبدیلی ہے؟ اب ہر فاتر العقل، ہر دیوالیہ، ہر سزایاب، یا الیکشن میں چار سو بیس کا مرتکب، دھڑلے سے ممبر بن سکتا ہے! اگر یہ آزادی نہیں تو اور کسے آزادی کہتے ہیں؟ آزادی نام ہے پابندیاں ہٹا دینے کا۔ انگریزوں نے نے محکوم قوم پر خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں کہ کوئی پاگل، کوئی دیوالیہ، کوئی مجرم، مجلس مقننہ کا ممبر منتخب نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے نوازا۔ ہم نے ان پابندیوں کو بیک جنبش قلم اٹھا دیا۔ سبحان اللہ! آزادی بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے!! ر ہمیں آزادی نہ ملتی تو پاگلوں کو مجلس مقننہ کے بجائے پاگل خانوں میں بھیجنا پڑتا۔ دیوالیوں اور مجرموں کے لئے قید خانے بنوانے پڑتے۔ ب مسئلہ کیسا آسان ہو گیا؟

ہم بعض وقت سوچتے ہیں کہ اگر انگریز کا قانون علیٰ حالہ رہتا اور ہمیں اس میں تبدیلی کرنے کی آزادی نہ ملتی تو ہماری مجلس دستور ساز کی کتنی نشستیں خالی ہو جاتیں! کیا اب بھی تم خدا کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرو گے؟

۴۔ ساقی نامہ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ خلافت گاہ کراچی میں شراب خانوں کی تعداد کتنی ہے؟

اس کا تو ہمیں علم نہیں۔ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے یہاں قریب ایک سو دس شراب خانے تھے اور اب "اللہ کے فضل سے" دو تین زیادہ ہی ہیں۔

ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

۵۔ نظریۂ اضافیت

ایک اور صاحب پوچھتے ہیں کہ آئن شٹائن کا نظریۂ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) سمجھنے کے لئے کونسی کتاب پڑھی جائے!

اب نظریۂ اضافیت سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی تشریف لے آئیے۔ چار دن میں بات سمجھ میں آجائے گی۔ ایک شخص عمر بھر آپ میں رہتا ہے۔ کسی کو اس کی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ اسے وزیر یا سفیر بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے ہی دن دنیا بھر کی تمام خوبیاں اس میں جمع ہو جاتی ہیں۔ چاروں طرف سے اس کی حمد و ستائش کے غلغلے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے تدبر و سیاست، فہم و فراست، علم و عقل، جہانیاں و جہاں بینی کے چرچے ساری فضا کو مرتعش کر دیتے ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

میاں تو ایک طرف، بیگم صاحبہ بھی مسائل سلطنت کی عقدہ کشائی میں نورجہاں، مہمات امور کے سرکرنے میں چاند بی بی اور فصاحت و طلاقت میں قرۃ العین سے کم دکھائی نہیں دیتیں۔ یہاں کسی انجمن کا افتتاح ہو رہا ہے۔ وہاں خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ کہیں کسی نئی کلب کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ اخبارات کی پیشانیاں ان کی تصاویر سے مزین کی جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کہ اتنے میں میاں صاحب قلمدانِ وزارت یا کرسئ سفارت سے الگ ہو جاتے (یا کر دیئے جاتے) ہیں اور اس کے دوسرے ہی دن، ان دونوں کی خوبیاں غائب غلّہ ہو جاتی ہیں اور یہ شہاب ثاقب پھر فضاؤں کی تیرگی میں کھو جاتے ہیں۔

اسے کہتے ہیں "اضافیت" یعنی جہاں ہر خوبی اور قابلیت اضافی ہو، ذاتی نہ ہو۔ مسند حکومت پر آبیٹھے تو اس کی نسبت کی ساری خوبیاں جمع ہو گئیں۔ جہاں یہ نسبت الگ ہوئی، پھر نظام صاحب سقے کے سقے۔

حسنِ اتفاق

سے ہمارے پاس، علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کی سیرت الرسول (تاریخ الامت حصہ اول) کے آٹھ نسخے آگئے ہیں۔ تاریخ الامت قریب قریب نایاب ہو رہی ہے اس لئے ان چند نسخوں کی موجودگی مغتنمات میں سے ہے۔ قیمت فی ۔/۸/۳ علاوہ محصولڈاک ہے۔ جو آٹھ فرمائشیں سب سے پہلے موصول ہوں گی انھیں کتاب بھیجدی جائے گی۔

ناظم طلوع اسلام۔ کراچی

اطلاع

دسمبر ۱۹۵۱ء کے طلوع اسلام میں نصرت کتاب گھر کی طرف سے کتابوں کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ شاید کتاب لمیٹڈ" بند ہوگئی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں "کتاب لمیٹڈ" کا باقاعدہ کام جاری ہے "نصرت کتاب گھر" کا اس ادارے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

کتاب لمیٹڈ۔ رالسن روڈ۔ کراچی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن۔ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائناتؐ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے محصولڈاک ۲؎

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز

ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil	High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'





BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams: "BENGALI" P. O. BOX No. 162 KARACHI-2 Telephone | Office: 3336 | Mills: 2608

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road, Karachi.

طلوع اسلام

۱۹۵۳



صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ھے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہوسکتا جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہوسکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا، مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجیے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں — ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

پرچون کے لئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیاز اگین: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

تقسیم ہند کے بعد تھوڑے ہی دن بعد کا واقعہ ہے، ایک عزیز نے مجھ سے کہا کہ کراچی کے کلکٹر یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ تم یہاں آ گئے ہو۔ وہ دیر تک معارف القرآن اور طلوع اسلام کی باتیں کرتے رہے۔

کچھ دنوں بعد میں شام کے وقت باہر سے آیا تو دور سے دیکھا کہ کوئی صاحب میرے ہاں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا چہرہ سامنے سے نہیں ایک سمت سے مجھے دکھائی دے رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر حضرت علامہ اقبالؒ کی تصویر آ رہی تھی۔ یہی تھے کراچی کے کلکٹر، خاں صاحب محمد اسحٰق بدرالدین۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا گویا برسوں کے بچھڑے ملے ہیں۔ میں حیران تھا کہ قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کس طرح غائبانہ یگانگت پیدا کر دیتی ہے۔

اس کے بعد اس تمام عرصے میں یہ کیفیت رہی کہ وہ میری تحریروں کا ایک ایک لفظ نہایت غور و فکر سے پڑھتے۔ جہاں اختلاف ہوتا، ایک بزرگانہ شفقت کی ڈانٹ سے اس پر متنبہ کرتے۔ اور جب میرے بیان سے بات واضح ہو جاتی تو ہمیشہ لپک کر گلے لگا لیتے۔ لوگ انہیں صرف ایک قابل منتظم اور دیانتدار اور ہمدرد افسر کی حیثیت ہی سے پہچانتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ قدرت نے انہیں کس قدر ذہنِ رسا، قلبِ سلیم، نگہِ پاک، احساسِ عمیق اور فکرِ بلند عطا کیا تھا۔ اقبالؒ کے شاگرد بھی تھے اور نہایت عقیدتمند بھی۔ ان کا ذکر چھڑ جاتا تو کیف و جذب کے عالم میں گھنٹوں باتیں سناتے رہتے۔ بڑی پر لطف اور معنیٰ خیز۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع۔ فلسفے اور تاریخ پر گہری نگاہ۔ قرآن سے بڑا لگاؤ۔ اور حضور رسالت مآبؐ سے والہانہ عشق تھا۔

۸ اپریل، منگل کی شام میرے ہاں تشریف لائے لیکن میں مکان پر موجود نہ تھا (اس کا مجھے اب عمر بھر افسوس رہے گا)۔ صبح اطلاع ملی کہ ان کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی ہے۔ دو دن کی مختصری علالت کے بعد یکسر خلافِ توقع، جمعہ کی صبح انتقال کر گئے۔

میرا دل اب عمر بھر ان کی کمی محسوس کرتا رہے گا۔ اس محبت سے اقبالؒ کی باتیں سنانے والا۔ اس غور و فکر سے قرآن کی باتیں سننے والا۔ اس عشق و عقیدت سے ذاتِ رسالتمآبؐ کا نام لینے والا۔ اس بزرگانہ شفقت سے ٹوکنے والا اور اس وسعتِ قلب سے اعترافِ حقیقت کر لینے والا، اب شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

پرویز

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	محمد یونس	دس آنے (پاکستانی)
" غیر ممالک ۲۱ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

جلد ۵	مئی سنہ ۱۹۵۲ء	نمبر ۵

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تصوف کی کتابوں میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت مقدس، خضر صورت بزرگ تشریف لائے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم آرام سے سو رہے ہو اور اس دفعہ حج اکبر ہے۔ اس میں شامل کیوں نہیں ہوتے؟ سونے والے نے اس مشفق و مکرم کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور اٹھکر اپنے عازمِ حج ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کے ہزارہا مریدوں نے جب یہ سنا تو وہ سب کارواں در کارواں، اپنے مرشد کی معیت میں، حج اکبر کے لئے تیار ہو گئے۔ اس بزرگ کے پیر نے جب یہ سنا تو اس سے پوچھا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے اپنے خواب کا ماجرا سنایا تو انھوں نے کہا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ وہ "مقدس بزرگ" کون ذات شریف تھے! وہ شیطان تھا جو تمہیں بہکانے کیلئے آیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ شیطان کا کام تو ہمیشہ نیک کاموں سے روکنے کا ہے۔ وہ مجھے حج اکبر میں شمولیت کی تلقین کیوں کریگا؟ پیر نے کہا کہ خلیفۂ وقت نے جہاد کا اعلان کیا ہے اور شیطان نہیں چاہتا کہ مسلمان اس میں شریک ہوں۔ اس لئے وہ انھیں اس قسم کے "نیک کاموں" میں الجھاتا پھر رہا ہے۔

یہ قصہ حقیقت ہو یا تمثیلی افسانہ، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ ابلیسی فریب کاریوں اور روباہ بازیوں کا نہایت لطیف مرقع۔ ابلیس اپنے اصلی خط و خال میں بہت کم دھوکہ دے سکتا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز وہ مقدس نقاب ہیں جن میں چھپکر وہ غارت گرِ دین و دانش ہوتا ہے — اسی قسم کا ایک مقدس نقاب ہے جس میں چھپکر، افرنگ کی ابلیسی سیاست آجکل مسلمانانِ عالم کیلئے رہزنِ ایمان و ہوش ہو رہی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ گذشتہ عالمگیر جنگ، اقوامِ یورپ (بشمولیتِ امریکہ) کیلئے ایک بہت بڑے مقابلے کا میچ تھا جس میں ہر ٹیم جان کی بازی لگاکر شریکِ نبرد آزمائی تھی۔ اس میچ میں آخر الامر روس اور دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ (SEMI-FINAL) میں آگئے ہیں۔ اب یہ ٹیمیں فائنل میچ کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ اور اگلی جنگ ان کے درمیان فیصلہ کن مرحلہ ہوگی۔ اس کے بعد یا تو ساری دنیا پر روس کا تسلط ہوگا اور یا امریکی، برطانوی۔ امریکی بلاک غالب آجائے گا۔ روس کے پاس ایک پیغام[1] ہے اور اس کے پیغام رساں ساری دنیا میں مصروف کار ہیں۔ — یہ پریشان روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو، ادعائے لامذہبیت کے باوجود، ایک "مذہبی دیوانگی" کے ساتھ اپنے پیغام کی تبلیغ میں پیکر جذب و انہماک بنے، مصروف تگ و تاز رہتے ہیں۔ "برطانوی۔ امریکی بلاک" کے پاس پیغام کوئی نہیں۔ اسلئے وہ اپنے حمایتیوں کی تعداد بڑھانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ اس باب میں ان کی نظر سب سے پہلے مسلم ممالک پر ہے جن کی جغرافیائی پوزیشن اس فائنل میچ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ امریکہ کے پاس سونے کا سمندر ہے جس سے وہ ان ممالک کے اوپر کے طبقے کو جس وقت چاہے خرید سکتا ہے۔ لیکن اس کے سامنے گذشتہ

---

[1] ہمیں اسوقت اس پیغام کے حسن و قبح سے بحث نہیں۔ اس وقت صرف کہنا یہ ہے کہ اس کے پاس ایک پیغام ہے جس کے ذریعہ وہ اپنا اثر دوسرے ممالک میں پھیلا رہا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ۔ برطانیہ بلاک کے پاس کوئی پیغام نہیں ہے۔

ایک آدھ صدی کی تاریخ کے ایسے سبق ہیں جن کی موجودگی میں وہ اس قسم کا سطحی سودا کچھ زیادہ منفعت بخش تصور نہیں کرتا۔ اس نے دیکھا ہے کہ مغربی اقوام نے اپنی دسیسہ کاریوں کیلئے اسلامی ممالک میں مختلف تحریکیں چلائیں۔ انھوں نے ان تحریکوں کی کامیابی کے لئے اوپر کے طبقے کو ساتھ ملایا لیکن نتیجہ ہمیشہ یہ رہا کہ کچھ وقت کے بعد نیچے کے طبقے (عوام) نے ان تحریکوں کو ناکام بنا دیا۔ اب "برطانوی۔ امریکی بلاک" اس تجربہ شدہ طریق کار کو دہرانا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی مقاصد براری کیلئے چاہتا یہ ہے کہ کوئی ایسی تحریک شروع کی جائے جو براہِ راست عوام کو اپیل کرے۔ مسلمان عوام مذہب پرست ہیں اور جذباتی (یہ دونوں چیزیں ہیں بھی لازم و ملزوم۔ مذہب کا دار و مدار ہوتا ہی جذبات پر ہے۔ یہ تو فقط دین ہے جو بصیرت اور جذبات کے نہایت متوازن امتزاج سے فلاح و سعادت کی راہیں کھولتا ہے)۔ خدا کا نام ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کیلئے کافی ہے۔ مدبرین یورپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں (اور دیکھ رہے ہیں) کہ خود مسلمانوں کا اوپر کا طبقہ کس طرح خدا کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلتا اور انھیں اپنی مفاد پرستیوں کیلئے آلۂ کار بناتا ہے۔ لہٰذا برطانوی۔ امریکی بلاک نے سمجھ لیا کہ مسلم عوام میں اگر کوئی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے تو وہ خدا کے نام پر ہی ہوسکتی ہے۔ دوسری طرف ان کی خوش قسمتی سے روس خدا کا منکر ہے۔ لہٰذا ان کی تحریک جدید کی چولیں نہایت ٹھیک بیٹھ رہی ہیں۔ روس نے کہا تھا کہ

دنیا کے مزدورو! اپنا متحدہ محاذ قائم کرو۔

کس کے خلاف؟ روس کے حریفوں کے خلاف!

برطانوی۔ امریکی بلاک نے اس کے مقابلے میں یہ سلوگن (نعرہ) وضع کیا ہے کہ

دنیا کے خدا پرستو! اپنا متحدہ محاذ قائم کرو۔

کس کے خلاف؟ روس کے خلاف!

غور کیا آپ نے کہ "خدا" سے کیا کام لیا جا رہا ہے؟ سچ کہتے ہیں کہ خدا "بڑا مسبب الاسباب" ہے۔ وہ "ڈوبتوں کا سہارا" ہے۔ وہ مشکل کشا اور دستگیر" ہے۔ اس بلاک کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ روس کے پیغام کا کیا جواب ہوسکتا ہے؟ اس بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں "خدا" کام آگیا۔ وہی "خدا" جس کے متعلق مارکس نے کہا تھا کہ وہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں عوام کیلئے افیون ہے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ کتنا بڑا مقدس نقاب ہے جسے اوڑھ کر شیشہ گرانِ فرنگ کی ابلیسی سیاست اپنی مطلب براری کیلئے میدان میں آئی ہے! اس بلاک نے اس تحریک کو (حسب معمول) نہایت منظم طریق پر چلا رکھا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے سائنٹسٹ اور مفکر جو کل تک طبیعیاتی انکشافات اور فلسفیانہ تحقیقات کی رو سے ثابت کیا کرتے تھے کہ خدا کا وجود محض ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے اور کارگہ کائنات میں خدا کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ سب اپنی تحریروں میں نہایت غیر محسوس طریق پر اب یہ لکھتے جا رہے ہیں کہ خدا کا وجود ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اس کے بغیر یہ کائنات ایک ثانیہ کیلئے بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس پیغام کو رٹتے ہوئے ان کے "سیاسی پادری" تمام عالمِ اسلام میں پھیل رہے ہیں مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ ہم اور آپ ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں اس لئے آؤ! دہریت اور خدا فراموشی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو [illegible] کیلئے اٹھ کھڑے ہوں اور ایک متحدہ محاذ بنا کر اپنے ایمان کی حفاظت کرو۔

ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ محض قیاس نہیں۔ اس کی تائید میں واقعاتی شہادات موجود ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب اپنے مقالہ "اساسِ اسلام" میں ایک اسی قسم کے واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> حال ہی میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے اور اس نظریۂ حیات پر کس طرح ایک ترقی پسند اور مہذب و متمول مملکت کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے کہا کہ میں موحد ہوں اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں۔ مغرب کی مادیت، دہریت اور مادی اشتراکیت سے بیزار ہوں۔ میں نے اس کو اسلام کا نقطۂ نظر علم و عمل، اور جماعت و مملکت کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو سُن کر اس نے کہا کہ ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے۔ خدا کے بارے میں ہم ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کی بابت بھی ہم بہت کچھ متفق ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی تمام موحد جماعتیں یا افراد ایک متحدہ محاذ دہریت اور مادیت کے خلاف قائم کریں۔ ہم میں اور تم میں دین اور اخلاق کی باتیں تو مشترک ہیں۔ کیا ہم اس اشتراکِ عقائد کی بنیاد پر اشتراکِ عمل پیدا نہیں کرسکتے۔

یہ حربہ کسقدر مؤثر ثابت ہورہا ہے اس کا اندازہ اس جواب سے لگائیے جو خلیفہ صاحب نے اس سیاسی مشنری کو دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> میں نے اس کو جواب دیا کہ تم کو شاید یہ سنکر تعجب ہو کہ اسلام نے تیرہ سو برس پیشتر ہی صلائے عام دنیا کے تمام موحدوں کو دی تھی کہ آؤ تم اور ہم توحید اور اعمالِ صالحہ کی بنا پر اشتراکِ عمل سے کام کریں۔ یہود اور نصارٰی نے اس دعوت کو قبول نہ کیا لیکن اسلام کی طرف سے یہ صلائے عام ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔ اگر تم اس پر لبیک کہو تو یہ عین منشائے اسلام ہے۔ ہماری طرف سے پورا تعاون ہوگا، کیونکہ یہ اسلام ہی کی دعوت ہے۔ ("اسلام کی بنیادی حقیقتیں" ص۲۳۶-۲۳۷)

سردست اس سوال کو چھوڑیئے کہ اسلام نے یہود و نصارٰی کو جو دعوتِ اشتراک دی تھی اس کی نوعیت کیا تھی۔ اور کیا اُس وقت دعوتِ اشتراک دینے والوں (مسلمانوں) کی یہی پوزیشن تھی جو آج "برطانیہ۔ امریکہ" کے مقابلہ میں مسلمانانِ عالم کی ہے (یا جو سویڈن کے اُس عیسائی کے مقابلے میں خلیفہ صاحب کی تھی)۔ اس وقت تو اُس عیسائی موحد سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ کل ہی جنگِ عظیم میں جرمنی اُسی قسم کا خدا پرست (بلکہ عیسائی) تھا جیسے آپ اور آپ کے دیگر حلیف تھے۔ اور اس کے مقابلے میں روس کی دہریت اور مادی اشتراکیت وہی تھی جو آج ہے۔ اس وقت آپ کا جذبۂ خدا پرستی کہاں گیا تھا جو آپ نے عیسائی جرمن کا ساتھ چھوڑ کر خدا کے منکر روس کا ساتھ دیا تھا؟

پھر اس سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ جن مسلمانوں کے متعلق آپ آج یہ فرمارہے ہیں کہ ان میں اور آپ میں بلحاظِ عقائد و اعمالِ صالحہ فرق نہیں۔ کم از کم چھ سات سو برس سے، آپ جیسے "موحدین" کی نوکِ شمشیر سے ان توحید پرستوں کے سینے چھدتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی سلطنتیں تم نے مٹائیں۔ ان کی ثروتیں تم نے چھینیں۔ ان کی عظمتیں تم نے لوٹیں۔ ان کی عزتیں تم نے خاک میں ملائیں۔ ان کی بستیاں تم نے برباد کیں۔ ان کی قبروں کے نشان تک تم نے باقی نہ چھوڑے۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس کے ذروں کو تم نے ان کے خون سے لالہ زار نہ کیا ہو۔ یورپ کے مرغزاروں میں، افریقہ کے صحراؤں میں، ترکستان کے پہاڑوں میں، مصر کے دریاؤں میں، ہر جگہ اور ہر مقام پر تم نے ان کے خون کی ندیاں بہادیں۔ تم وہ ہو کہ جوشِ انتقام میں ان کے بزرگوں کی ہڈیاں تک قبروں سے نکلوا کر سپردِ دریائے شور کردیں۔ تم وہ ہو کہ ان

گھروں میں سچ مچ گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ اگر تم ان واقعات کو قصۂ ماضی سمجھتے ہو تو انھیں چھوڑ دو، اور دیکھو یہ کہ آج بھی تم "خدا پرستوں" کی حکومتیں ان توحید پرستوں کے ساتھ کیا کچھ کر رہی ہیں۔ کیا مراکش اور تونس میں بھی توحید پرست آباد نہیں؟ کیا مصر اور فلسطین میں انہی خدا پرستوں کی آبادیاں نہیں! انھیں بھی چھوڑو۔ جس سرزمین (پنجاب) میں بیٹھکر آج تم یہ دعوتِ اشتراکِ عمل دے رہے ہو، کل ہی اس سرزمین پر جو حشر برپا کرایا گیا تھا اس کے پیچھے تم "خدا پرستوں" ہی کا ہاتھ نہیں تھا؟ اسے بھی چھوڑیئے! آج کشمیر میں جن لاکھوں انسانوں کی زندگی کو تم جہنم بنا رہے ہو کیا وہ تمہارے ہی جیسے خدا پرست نہیں ہیں؟ ان تمام خونریزیوں اور انتقام جوئیوں، ان تمام حشر سامانیوں اور ذلت آفرینیوں کے بعد "خدا پرستی" کے عقیدے کے اشتراک پر متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی! جو ہاتھ تم آج یوں مصافحے کے لئے بڑھا رہے ہو، دیکھتے نہیں کہ اس ہاتھ سے ابھی تک ہمارے خونِ ناحق کے قطرے کس طرح ٹپ ٹپ زمین پر گر رہے ہیں! کل تک ہم تمہارے "خدا" اور اس "خدا کے اکلوتے بیٹے" کے بدترین دشمن تھے۔ آج ہم اُس خدا کے پرستار قرار پا رہے ہیں، کل تک جو ہاتھ ہماری رگِ جان پر تھا (اور آج بھی ایک ہاتھ وہیں ہے) آج وہ ہاتھ اشتراکِ عمل کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اقبال نے پیرس کی مسجد کی تعمیر پر جو کچھ کہا تھا وہ آج بھی حرفاً حرفاً دھرایا جا سکتا ہے۔ اس کے دلِ دردمند نے پکارا تھا کہ

میری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے　　کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ بازوں نے　　تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بت خانہ
یہ بت کدہ انہی غارت گروں کی ہے تعمیر　　دمشق ہاتھ سے جن کی ہوا ہے ویرانہ

دوسری طرف اِن دعوتِ اشتراک دینے والوں کے مخاطبین (مسلمانانِ عالم اور ان کے مذہبی اور سیاسی راہ نماؤں) کو دیکھئے۔ ان میں سے ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جو برطانیہ۔ امریکی بلاک کے دانستہ آلۂ کار بن کر "روس کی دہریت" کے جلی عنوان کے نیچے، اسلام کو سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کا نظام ثابت کرنے کی "مقدس" کوششوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ لیجئے صرف ان لوگوں کو جو دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ روس اور امریکی بلاک کی جنگ درحقیقت خدا کے انکار اور خدا کے اقرار کی جنگ ہے۔ یہ بحث بہت طویل ہے کہ قرآن کی رو سے خدا کے اقرار کے معنی کیا ہیں اور کیا ہر وہ شخص جو یہ کہدے کہ وہ خدا کو مانتا ہے، قرآنی تصورِ ایمان کے مطابق خدا کا ماننے والا تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ قرآن میں تھوڑا سا تدبر بھی اس حقیقت کو بے نقاب کر دے گا کہ اس کے نزدیک خدا کا ایک مخصوص تصور ہے اور وہ (باقی چیزیں چھوڑ کر محض) اس تصور کے اعتبار سے بھی باقی "خدا پرست" اقوام سے الگ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن، خدا کے ماننے والوں کو بھی اسی طرح دعوتِ ایمان باللہ دیتا ہے جس طرح منکرینِ خدا کو۔ وہ صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو یہ لوگ راہِ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ خدا کا وہ مخصوص تصور جو قرآن نے دیا ہے وہ بنیاد ہے جس پر اس کے تمام نظامِ معاشرہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ خدا پر جو ایمان اس قسم کے انسانی معاشرہ پر متفرع نہیں ہوتا، وہ ایمان، قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں۔ اسی لئے وہ قرآنی تصورِ خدا کا انکار کرنے والوں کو کافر (نہ ماننے والے) کہہ کر پکارتا ہے۔ خواہ وہ روس کا دہریہ ہو یا برطانیہ کا عیسائی

ذرا سوچئے کہ جس قسم کے خدا پر ایمان کا نتیجہ یورپ کا موجودہ نظریۂ زندگی اور اندازِ معاشرہ ہو، وہ خدا، قرآن کا خدا ہو سکتا ہے؟ قرآن کے خدا پر ایمان، وحدتِ انسانی کا نظریہ عطا کرتا ہے۔ یورپ کے خدا پر ایمان، انسانیت کو قومیتوں میں بانٹ کر اس کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ آج دنیا قومیت پرستی کے جس جہنم میں جل رہی ہے وہ یورپ کے اسی "خدا" کا پیدا کردہ ہے جسے وطنیت کہکر پکارا جاتا ہے۔ اسی "خدا کی پرستش" کا نتیجہ ہے کہ آج امریکہ اور یورپ کی تمام سفید قومیں، باقی دنیا کی کالی قوموں کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اور نہ صرف بنگاہِ نفرت دیکھتی ہیں بلکہ ان کے خون کو شیرِ مادر کی طرح غٹ غٹ کر کے پی جاتی ہیں۔ ایشیاء اور افریقہ کی اقوام دہریہ تو نہیں ہیں۔ یہ خدا کی ماننے والی اقوام ہیں۔ کیا یورپ کی سفید فام اقوام، ان میں اور اپنے آپ میں کوئی بھی وجۂ اشتراک دیکھتی ہیں! کیا وہ اِن اقوام کو کسی اور "خدا" کی مخلوق نہیں سمجھتیں؟ یورپ کی "خدا پرست" اقوام کے نزدیک، مستقل اقدار اور ابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں۔ ہر وہ کام جس سے ان کی قومی منفعت مقصود ہو، نیکی ہے اور جس کام سے کسی غیر قوم کو فائدہ پہنچتا ہو گناہ ہے۔ ہر وہ طریق جس سے اپنی نیشن کو تقویت پہنچے جائز ہے اور ہر وہ عمل جس سے غیر قوم کی بہبود ہو ناجائز۔ کیا آپ اس نظریۂ زندگی کی حامل اقوام کو "خدا پرست" کہیں گے؟ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ قرآن اس قسم کے "خدا پرستوں" کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ب ان سے پوچھئے کہ زمین و آسمان کو کس نے بنایا تو وہ بلا تامل کہدیں گے کہ اللہ نے۔ لیکن اسی کے بعد جب ان سے کہا جائے گا کہ پھر آؤ، اس اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کریں، تو وہ کنی کتراتے ہوئے نکل جائیں گے۔ قرآن نے اہلِ کتاب (عیسائیوں اور یہودیوں) سے یہی کہا تھا کہ جب تم خدا کا اقرار کرتے ہو تو پھر خدا کے ضابطۂ قانون سے انکار کرنے میں پیش پیش کیوں ہو؟ (ولا تکونوا اول کافر بہ) یہی وہ بنیاد تھی جس پر اس نے انہیں دعوتِ اشتراکِ عمل دی تھی۔ یعنی ان لا نعبد الا اللہ۔ کہ ضابطۂ خداوندی کے سوا اور کسی کا حکم نہ مانا جائے۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان باللہ ہے۔ نہ کہ یورپ کی عیسائی اقوام کا ایمان کہ وہ خدا کا اقرار کرتی ہیں لیکن زندگی اپنے خود ساختہ نظام و قوانین کے مطابق بسر کرتی ہیں۔ اگر خدا کا اقرار زندگی کے بنیادی تصورات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو ان کا عیسائی ہونا تو ایک طرف، ان کا مسلمان ہو جانا بھی بے معنی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے خالی ہے / فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں / قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دینِ مصطفٰے انگریز / سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہانتک خدا کے انکار یا اقرار کا تعلق ہے، روس کی دہریت اور برطانیہ۔ امریکہ بلاک کے "ایمان" میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن کے نزدیک دونوں مردود و مطرود ہیں اور اس لئے مسلمانوں کے نزدیک، سگِ زرد برادرِ شغال، دونوں یکساں ہیں مسلمان کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنے ناقابلِ تبدل مستقر پر قائم ہو اور اس کے بعد دنیا کو دعوت دے کہ جو فرد یا جماعت انسانیت کو اس راہ پر لے جانے میں ممد و معاون ہونا چاہے وہ اٹھے۔ ہم اس کا تعاون بطیبِ خاطر قبول کریں گے۔ لیکن آج مسلمان اپنا یہ مقام

کھو بیٹھا ہے اس لئے (جیسا کہ ہر موقعہ پر کہا جاتا ہے) اسے دنیا کی بڑی بڑی قوموں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کو برطانیہ۔ امریکی بلاک کی بجائے، روس کے حاشیہ نشینوں (CAMP FOLLOWERS) میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مقصود فقط اتنا ہے کہ اس اہم مسئلہ کا فیصلہ کہ مسلمانوں کو اپنا رُخ کس سمت کرنا چاہیئے، روس کی دہریت اور فریقِ مخالف کی مزعومہ خدا پرستی کی رُو سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس باب میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں اس خدا کے منکر ہیں جس کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ خدا پرستی کے اُن جذبات سے الگ ہو کر جسے امریکی بلاک، اپنی مفاد پرستی کے لئے ابھار رہا ہے، اس اہم معاملہ کا فیصلہ (ON MERITS) کریں۔

مسلمانوں کیلئے کسی معاملہ کے فیصلہ کرنے کی شکل تو ایک ہی ہے کہ وہ دیکھیں کہ اس باب میں قرآن کا حکم یا اس کا اصولی منشا کیا ہے؟ لیکن فیصلہ کرنے کا یہ انداز تو ان کیلئے ہے جن کا ایمان ہو کہ من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ جو منزل من اللہ (قرآن) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، ان کا شمار نہ ماننے والوں (کفار) میں ہوتا ہے۔ لہٰذا دورِ حاضر کے مسلمانوں کے سامنے یہ انداز پیش کرنا ہی خود فریبی ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے جو دنیا کی ہر (SECULAR STATE) اختیار کرتی ہے۔ یعنی ہر معاملہ میں اپنا نفع اور نقصان سامنے رکھ کر وہ راہ اختیار کر لی جائے جو سودِ خویش کی طرف لے جانے والی ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ (SECULAR STATE) کے الفاظ سن کر ہمارے خود فریب یا ابلہ فریب برادرانِ ملت کی پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں گی۔ لیکن حقائق پیشانیوں کی شکنوں سے تو نہیں بدل جایا کرتے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حکومتیں سیکولر (SECULAR) ہی ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ اسے کہتے ہیں جس میں مذہب شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) تک محدود رہے اور باقی معاملات "دنیاوی طریق" پر طے پائیں۔ جب سے مسلمانوں کا دین، مذہب سے تبدیل ہوا ہے، مذہب کا دائرہ شخصی قوانین تک محدود ہے۔ آج مختلف اسلامی ممالک پر نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ ہر جگہ یہی نقشہ دکھائی دیگا۔ جس طرح انگلستان میں خدا گرجے کی چار دیواری تک محدود ہے اسی طرح مسلمانوں کے ممالک میں اس کا احاطہ صحنِ مسجد سے آگے نہیں۔ لہٰذا اگر انگلستان کی مملکت سیکولر اسٹیٹ ہے تو مسلمانوں کی مملکتیں کیوں سیکولر نہیں۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر رکھا ہے اور مسلمان اعترافِ حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے، ترکوں نے البتہ اس کی جرأت کی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ ان کی اسٹیٹ، سیکولر اسٹیٹ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اِس وقت (مثلاً) مملکتِ پاکستان اور ترکی مملکت میں کیا فرق ہے جس کی وجہ سے ایک کو سیکولر اسٹیٹ کہا جائے اور دوسری کو ریلیجس اسٹیٹ؟ جب صورتِ حالات یہ ہے تو پھر بین الاقوامی معاملات کے فیصلے اسی طرح کیجئے جس طرح دنیا کی اور سلطنتیں کرتی ہیں۔ پھر "خدا" کا نام بیچ میں کیوں لایا جائے! خدا کا نام لینا صرف اسی کو زیب دیتا ہے جو اپنے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے دیئے ہوئے قانون کے مطابق کرے۔ اسی کو خدا کا ماننے والا کہا جائے گا۔ اگر یہ صورت نہیں تو خدا کو اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ آپ اس کے نام کی حفاظت کیلئے متحدہ محاذ بنانے پھریں۔ برطانیہ۔ امریکی بلاک کی طرف سے یہ دعوتِ محاذ متحدہ خدا کے نام کی حفاظت کے لئے نہیں، بلکہ اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے ابلیسی سیاست کا نقاب پوش حربہ ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ مشرقی ممالک میں بالعموم اور مسلمانوں کے عوام میں بالخصوص یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں مُلّا بھی انگریز پر

اور ٹوڈی کہلا کر بدنام نہیں ہوتا بلکہ دعوت الی اللہ کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے اور اس کی "دین اور دنیا" دونوں سنور جاتے ہیں۔ دنیا میں بھی حور و قصور، جنت میں بھی حور و قصور۔

فرنگ آئین رزاقی بداند — بایں بخشد از و و امی ستاند

بہ شیطاں آنچناں روزی رساند — کہ یزداں اندراں حیراں بماند

---

(۲) یوم اقبال

اپریل آیا اور ملک میں حسب معمول اقبال ڈے کی تقاریب منائی گئیں۔ جیسا کہ طلوع اسلام ہمیشہ دہراتا رہتا ہے، اقبال کسی شخصیت کا نام نہیں جس کا سالانہ عرس منایا جانا چاہئے۔ اقبال نام ہے ایک پیغام کا جو ہمارے نزدیک عصر حاضر میں قرآن کا پیغام ہے۔ اس لئے اقبال ڈے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس پیغام کو تازہ کریں اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ حد تک آشنا کرائیں تاکہ ہماری روش زندگی قرآن کے پیغام کے مطابق ڈھل جائے۔ لیکن، جیسا کہ غلامانہ ذہنیت کی حامل اقوام میں بالعموم ہوتا ہے اقبال نہ تو شخصیت رہا اور نہ ہی پیغام، بلکہ وہ مختلف پارٹیوں کے لئے اپنی اپنی مقصد براری کا آلۂ کار بن گیا۔ چونکہ عوام کو اقبال سے محبت اور عقیدت ہے اس لئے ہر پارٹی یہ چاہتی ہے کہ وہ اس راستے عوام میں مقبولیت حاصل کرلے۔ اس کا نام ہے تقریب یوم اقبال۔ چونکہ بدقسمتی سے خود ہماری حکومت بھی ایک پارٹی بن کر رہ گئی ہے اس لئے اب اقبال ڈے حکومت کی طرف سے بھی منایا جانے لگا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ مرکزی حکومت کے دفاتر میں یوم اقبال کی تعطیل بدستور بند ہے)۔ اس منافست (RACE) میں ہر پارٹی کی خواہش دوسری پارٹی کو شکست دینا ہوتی ہے اس لئے جس چیز کا نام اقبال ڈے کے اہتمامات میں تزک و احتشام اور تزئین و آرائش ہے وہ درحقیقت دنگل کی زور آزمائی ہوتی ہے۔ حساس طبائع اس کھینچا تانی کو دیکھتی ہیں اور خون کے آنسو پی کر رہ جاتی ہیں کہ وہ اقبال جو ساری عمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

کا پیغام دیتا رہا، خود قوم میں پارٹی بازی کی تقویت کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدبختی کیا ہوگی؟ پھر لطف یہ ہے کہ یہ جوش و خروش اور یہ احترام و عقیدت فقط ایک دن کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سال بھر کسی کو یاد بھی نہیں پڑتا کہ اقبال نامی کوئی شخص یہاں گذرا ہے۔ آج فرانس، اٹلی، انگلستان، جرمنی، امریکہ میں کلام اقبال کے ترجمے ہو رہے ہیں لیکن اس کے اپنے گھر میں (گھر سے مراد ہے وہ قوم جو اس کے پیغام کی اولیں مخاطب تھی) اس کی کس مپرسی کا یہ عالم ہے کہ ایک سالانہ عرس کے علاوہ اس کا کہیں تذکرہ تک نہیں ہوتا، بجز ریڈیو کے قوالوں کی تانوں اور طبلے کی تھاپ میں۔ حیرت ہے کہ آج سارے ملک میں دس بیس ایسے اہل ذوق بھی نہیں جو خالصتاً پیغام اقبال کی نشر و اشاعت کے لئے ایک بزم اقبال قائم کر سکیں؟ کیسی "حسین و سادہ و رنگین" ابتدا تھی اس بزم اقبال کی جسے انٹر کالجیٹ برادرہڈ کے چند نوجوانوں نے مسجد شاہ چراغ میں ترتیب دیا تھا اور جس کے پیش نظر اقبال کی عظمت و عقیدت کے سوا کوئی ذاتی مقصد نہ تھا۔ کیا اب ہمارے کالجوں میں بھی کوئی ایسے نوجوان طالب علم نہیں ہیں جو

اس پاکیزہ مقصد کو اپنی مساعی کا مرکز بنالیں اور اقبال کو ان ہوس کاروں کے پنجے سے چھڑا کر اپنے بے داغ سینے میں محفوظ رکھ لیں!
اقبال ان نوجوانوں سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے   میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

خدا کرے قوم کے وہی نوجوان جو اقبال کی آرزوؤں کے مرکز، اس کی دعاؤں کے محور، اس کے نالۂ نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کے مخاطب اور اس کی متاعِ عشق کے وارث تھے، پھر سے اٹھیں اور پیامِ اقبال کے لئے (کہ جو درحقیقت قرآن کا پیغام ہے) ایک سادہ اور پاکیزہ "مٹی کا حرم" بنادیں جس کی آستاں کسی ہوسناک و منصب پسند کے ناپاک و بے ذوق سجدوں سے ملوث نہ ہوسکے۔

لیکن وہ جو اقبال نے کہا تھا کہ

ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

افسردگی و پژمردگی کے اس آرزوکُش ماحول میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایک ایسا مژدۂ جانفزا بھی ہے جس کی تابندگی و درخشندگی سے ساری فضا آئینہ پوش ہے۔ ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے، سفیر مصر متعینہ پاکستان کا تعارف، سالِ گذشتہ اِن اوراق میں کرایا جاچکا ہے۔ پچھلے سال انھوں نے، یوم اقبال کی تقریب پر، پیام مشرق کا عربی منظوم ترجمہ، بحضورِ ملت پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ سال بھر نہایت خاموشی سے اپنے سوزِ عشق کو دل میں لئے، ضربِ کلیم کے ترجمے میں مصروف رہے اور اس کے بعد شبانہ روز کی تگ و تاز کے بعد، حالیہ یوم اقبال کی تقریب پر اسے اقبال کی بارگاہِ قلندری میں پیش کردیا۔ محترم عزام بے کا کتنا بڑا ہے یہ کارنامہ اور کتنا بڑا ہے یہ احسان ملتِ اسلامیہ پر، اس کا اندازہ آنے والا مورخ ہی لگا سکے گا جو دیکھے گا کہ ان کی جگر کاوی اور عرق ریزی سے ملت اسلامیہ کا کتنا عظیم حصہ پیام اقبال (یعنی بالواسطہ پیام قرآن) سے آشنا ہوگیا۔ چہ عجب کہ اس سے عرب ممالک میں پھر سے وہ انقلاب پیدا ہوجائے جو ایک مرتبہ اس زمین اور اس آسمان کو بدل دینے کا موجب بن چکا ہے اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے سورج کی آنکھ اب تک وا ہے۔
ہم محترم عزام بے کی خدمت میں ملتِ اسلامیہ کی طرف سے دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے متدعی ہیں کہ وہ اپنی اس مبارک و مسعود کوشش کو بدستور جاری رکھیں تاآنکہ پورے کا پورا اقبال عربی زبان میں منتقل ہوجائے۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ اب جناب ممدوح، اسرار و رموز کے ترجمہ کی طرف متوجہ ہیں۔ اس کوشش کا انداز بھی نہایت جاذب و حسین ہے جس کا تذکرہ خود محترم عزام بے نے، ضرب کلیم کے تعارف میں کیا ہے۔ کسقدر خوش بخت ہے وہ مختصر سا حلقۂ اربابِ قلب و نگاہ جسے پیام اقبال کی افہام و تفہیم کے ایسے خوشگوار مواقع میسر ہو رہے ہیں۔
لیکن بایں ہمہ بہار آفرینی و رنگیں نوائی، کسقدر تاسف انگیز ہے یہ تصور کہ ہمارے ہاں کوئی بھی انبارِ گل ایسا نہیں جس کے نیچے نشترِ خار نہ چھپا ہو۔ محترم عزام بے نے اُس والہانہ عشق و محبت کے ساتھ جس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کے اپنے سینے میں قلبِ تپاں موجزن ہو، اپنی سال بھر کی جگر سوزی کا ماحصل، یعنی ضرب کلیم کے عربی ترجمے کا اولیں نسخہ (جسے انھوں نے خاص طور پر اشاعت سے

پہلے ہی مصر سے منگا لیا تھا) کراچی کے یومِ اقبال کے جلسۂ عام میں، اثر و جذب میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ، اپنی گہری عقیدتمندی سے، صدر مجلسِ اقبال، کراچی، محترم سردار عبدالرب صاحب نشتر، کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن (اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے زمین میں گڑھ جاتی ہیں کہ) انھوں نے شکریہ تو ایک طرف، اس کی رسید تک میں ایک لفظ رسماً و تکلفاً بھی زبان تک آنے نہ دیا، حالانکہ اپنی پوری تقریر میں یہ کتاب ان کے ہاتھ میں تھی اور محترم ڈاکٹر عزام بے ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ اگر یہ سہو تھا تو یقیناً اس قابل کہ اس کی کماحقہ تلافی کی جائے۔ اور اگر (خدانکردہ) ایسا دانستہ کیا گیا تھا (جسے باور کرنے کو قطعاً ہمارا دل نہیں مانتا) تو۔ ۔ ۔ ۔ (اس "تو" کے بعد کیا لکھا جائے !!) بہرحال، یہ سہو تھا یا عمد، ہم ملت اسلامیہ پاکستانیہ کی طرف سے، اپنی جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے جناب محترم و ممدوح، ڈاکٹر عزام بے، سے خواستگارِ عفو ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی اس بے لوث خدمتِ عظیم کی قدر و منزلت ہر حساس قلب کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ ہمیں اس "قلندرِ بزمِ اقبال" کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلبی سے کامل توقع ہے کہ وہ ہماری اس عفو طلبی کو شرفِ پذیرائی عطا فرمائیں گے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

ضربِ کلیم

[ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے، سفیر مصر متعینہ پاکستان کے ترجمۂ ضربِ کلیم کا تعارف اشاعتِ رواں کے لمعات میں مختصر الفاظ میں کرایا جا چکا ہے۔ ذیل میں اس عربی ترجمہ کے ابتدائی صفحات کو اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تین مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔

(۱) مقدمہ 		از ڈاکٹر عزام بے صاحب

(۲) تعارف 		از صاحبِ موصوف

(۳) پیش لفظ 		از محترم پرویز صاحب

ان تعارفی مقالات سے نہ صرف ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ ہی کا تعارف ہو جاتا ہے بلکہ پیامِ اقبال کے بہت سے اہم گوشے بھی ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ امر طلوع اسلام کے لئے موجب صد فخر و ہزار سعادت ہے کہ اس کے دامن کو ان قیمتی جواہر کے قابل سمجھا گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ 		طلوع اسلام]

---

(۱) مقدمہ

(ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے بالقابہ)

خدایا ہم تجھ ہی سے توفیق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے شاعر فیلسوف ڈاکٹر محمد اقبال کے فارسی دیوان، پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ تقریباً دس ماہ میں تیار ہو گیا اپریل ۱۹۵۱ء میں علامہ مرحوم کی تیرہویں برسی کے موقعہ پر یہ عربی دیوان کراچی میں چھپ کر شائع ہوا اور مجلس اقبال نے یوم اقبال کے سرکاری اجتماع میں اس کو پاکستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

عربی میں اقبال کے کلام کا یہ ترجمہ مرحوم کی دلی تمنا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ آخر کار وہ منزل آگئی جس کی طرف میں نے بارہا قدم بڑھانے کی کوشش کی لیکن مصروفیتیں ہمیشہ سدِ راہ ہوتی رہی تھیں۔

"پیامِ مشرق" کے اس عربی ترجمہ "رسالۃ المشرق" نے پاکستان کے اہلِ علم، ادیب اور سیاسی طبقہ میں غیر معمولی اثرات پیدا کئے اور عربی خوان طبقہ میں اس کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کامیابی نے مجھے اسی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت دی کہ اس عظیم المرتبہ شاعر کے دوسرے دیوانوں کو بھی عربی میں منتقل کروں۔ اور اس تحریک نے مجھے اس کام کو جس کی خود میں نے ہی ابتدا کی تھی، جاری رکھنے اور اس کیلئے دشواریاں برداشت کرنے پر آمادہ رکھا۔ رسالہ "اشرق" کی اس مقبولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پاکستانی احباب اور متعارفین ایک دوسرے ترجمہ کی امید میں میری طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔

"پیامِ مشرق" کے ترجمہ کے بعد میں نے اس مقصد کیلئے "جاویدنامہ" کو تجویز کیا جس کے ترجمہ کے لئے میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ "جاویدنامہ" ایک ایسی داستان ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کے بہت سے احوال کا تذکرہ کیا ہے اور سیاحتِ سیارات کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ و افکار کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی صاحب مثنوی کو اپنا دلیل راہ بنایا ہے اس لئے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر "پیامِ مشرق" کے بعد "جاویدنامہ" کو ترجمہ کے لئے منتخب کر لیا۔

لیکن اقبال کو پسند کرنے والے اور اس کے شیدائیوں میں سے ایک دوست نے جو نہ صرف اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ و سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان مخصوص افراد میں سے ہیں جن کو اقبال سے صحبتیں میسر رہی ہیں اور انھوں نے اقبال کے تعارف اور اس کے پیغام کی توضیح و تشریح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، ایک دوسرے دیوان کے ترجمہ کی تجویز میرے سامنے رکھی۔

ہمارے دوست جناب غلام احمد پرویز نے فرمایا: میری رائے ہے کہ آپ "ضربِ کلیم" کا ترجمہ کریں جو اقبال کا خود مرتب کردہ آخری دیوان ہے۔ اور "ارمغانِ حجاز" کے سوائے جو اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے، اس کی آخری منظومات میں سے ہے۔ اس لئے اس دیوان "ضربِ کلیم" میں اقبال کا فلسفہ اور اس کے محکم افکار و نظریات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور ان خاص موضوعات میں جن کو اس نے دیوان کی فصول قرار دیا ہے، اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ "جاویدنامہ" ایک طویل، مسلسل اور دقیق نظم ہے جس کے سمجھنے کے لئے فلسفہ و تاریخ کے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے اور صرف ان لوگوں کیلئے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہے جن کو علم و ادب سے بہرۂ وافر میسر آیا ہو۔ "جاویدنامہ" کا مترجم ترجمہ کی تکمیل سے قبل اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے برعکس "ضربِ کلیم" کا مترجم ہر قطعہ کا ترجمہ کر لینے کے بعد ایک نتیجہ خیز کام کی تکمیل کر لیتا ہے اور ایک فصل کو ختم کر کے ایک مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ "ضربِ کلیم" میں اشعار کی تعداد کم اور ترجمہ کی سہولت نسبتاً زیادہ ہے۔ محترم دوست پیہم اسی قسم کے دلائل پیش کرتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کی رائے سے متفق ہو گیا کہ جاویدنامہ پر ضربِ کلیم کے ترجمہ کو ترجیح دوں اور اس داستان کو ایک بار پھر کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھوں۔ اللہ مددگار رہے۔

ہماری رائے تھی کہ ترجمہ سے پہلے اس دیوان کے مطالعہ، تحقیق مطالب اور اس کی تعبیرات میں غور و فکر کے لئے ایک جگہ مجتمع ہوتے رہیں اس کے لئے طے پایا کہ اس قسم کے اجتماعات مصری سفارتخانہ کراچی کے قصر میں منعقد ہوں اور جب تک اس دیوان کے مطالعہ سے فراغت میسر آئے ہفتہ میں دو یا تین بار ہم جمع ہوتے رہیں۔

اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ مختلف مشغولیتیں ان مجالس میں سدِ راہ نہ ہوں ہم نے اس امر کا اہتمام کیا کہ ایک مجلس سے اس وقت تک اٹھیں جب تک آئندہ نشست کیلئے کوئی وقت مقرر نہ کر لیا جائے۔ ان مجالس کا اشتیاق اور ان کی یاد ہمیں ان کی شرکت کیلئے زیادہ مستعد رکھتی تھی۔

ہیں، فاضل محترم غلام احمد پرویز اور محترم سید عبدالواحد (انسپکٹر جنرل جنگلات، حکومت پاکستان) جو فلسفۂ اقبال اور اس کی سیرت پر لکھنے والے مصنفین میں سے ہیں اس مجلس کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اقبال دوست احباب بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ بعض لوگ پابندی سے آتے اور بعض ایک دو مجلسوں میں ہی شرکت کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ حلقہ کبھی تنگ اور کبھی وسیع ہوتا رہتا تھا۔

وقتاً فوقتاً ہم دعوتوں کا اہتمام بھی کرتے تھے اور ان میں مجلس اقبال کے دوسرے ارکان اور اس کے صدر چودہری نذیر احمد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے تھے جو اس وقت پاکستان کے وزیر صنعت تھے۔

محترم غلام احمد پرویز شیخ مجلس تھے۔ وہ کتاب پڑھتے، اس کی تشریح کرتے اور فکرِ اقبال کی بحث و تفصیل میں کسی شعری و ادبی یا فلسفی موضوع کی انتہا تک پہنچ جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام کو قرآنی حقائق سے مربوط کرتے جاتے۔

ان مجالس کو "مجلس اقبال" یا "مجالس اقبال" کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے "درویشانِ اقبال" اور "قلندرانِ اقبال" کے نام سے موسوم کئے جاتے۔ اور غلام احمد پرویز صاحب "شیخ درویشاں" اور "شیخ قلندرانِ اقبال" تھے۔

عید الفطر کے بعد ۱۳۷۰ھ میں ہم نے "ضربِ کلیم" کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس سے فارغ ہوئے تو میں نے کتاب کے آخری صفحہ پر بطور یادداشت حسب ذیل کلمات لکھے:

"شنبہ ۵ محرم ۱۳۷۱ھ (۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کی شب میں دیوان کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا
اول و آخر خدا ہی کے لئے حمد و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ روح اقبال پر رحم فرمائے"۔

تین ماہ میں کتاب ختم ہوگئی، اگرچہ اس دوران میں بعض اوقات مشاغل کی کثرت کی وجہ سے ہم مجلس کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور ان کا سلسلہ ہمارے اندازے کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔

شبِ دوشنبہ ۱۱ رشوال ۱۳۷۰ھ (۱۶ رتموز ۱۹۵۱ء) کو ضربِ کلیم کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ اور جب میں اس کے ترجمہ سے فارغ ہوا تو ان سطور کے نیچے جن میں مطالعہ کی تاریخ ثبت کی گئی تھی میں نے ذیل کے کلمات تحریر کئے:

"اللہ تعالیٰ نے شب پنجشنبہ ۱۸ صفر الخیر ۱۳۷۱ھ (۱۸ رتشرین ۲ ۱۹۵۱ء) کو ترجمہ کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائی"۔

اس طرح تقریباً چار ماہ تک میں ترجمہ کے کام میں مشغول رہا اور مطالعہ کتاب کے ڈیڑھ ماہ بعد اس سے فراغت میسر آگئی۔

---

* "پیامِ مشرق" کے ترجمہ میں طباعت کی صفائی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے جو فرو گذاشتیں رہ گئی تھیں ان کی مکافات کی غرض سے اس دیوان کی طباعت کیلئے میں نے مصر کو ترجیح دی۔ چنانچہ سفرِ وطن کی تیاری شروع کی اور جب ۷ ردسمبر کو وطن مالوف پہنچا تو سفرِ پیہم اور کثرت مشاغل کے دوران میں فرصت کے جو لمحات میسر آئے ان میں دیوان کی تبییض اور اس کو طباعت کیلئے تیار کرنے کا شغل جاری رکھا۔ فاضل عزیز محمود جعفر الجبالی (ٹیکس انسپکٹر حکومت مصر) نے ان مبیضات کو ٹائپ کرنے کی ذمہ داری لی۔

لجنۃ الازہر نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس دیوان کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کریں تاکہ یہ انہی کی مطبوعات میں شمار کیا جائے۔

میں نے شکرگذاری کے ساتھ ان کی یہ پیش کش قبول کرلی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی طباعت میرے قیام وطن کے دوران میں مکمل ہو جائے تاکہ میں خود اس کی تصحیح کی نگرانی کرسکوں اور ضرورت ہو تو بعض کلمات میں ترمیم وتبدیل کا فرض بھی انجام دوں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی مجھے پاکستان آنا پڑا۔

عزیز محترم جناب جبالی طباعت کی نگرانی اور پابندی کے ساتھ میرے پاس ہوائی ڈاک سے پروف بھیجتے رہنے کی ذمہ داری انجام دیتے رہے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

واقعی یہ ایک خوش نصیبی ہے کہ اس عظیم فلسفی شاعر۔ اقبال۔ کی تمنا میرے ذریعہ برآرہی ہے اور اقبال کے بعض دواوین میرے توسط سے عربی میں منتقل ہو کر قرآنی زبان کی ادبی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ امر بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ اسلام کے اس ممتاز شاعر کی چودھویں سالانہ یادگار کے موقعہ پر میں ضرب کلیم کو عربی لباس میں پیش کر رہا ہوں جیسا کہ اس سے قبل تیرھویں برسی کے موقعہ پر میں نے "پیام مشرق" کے ترجمہ کی پیش کش کی تھی۔

بارہا میں نے یہ آرزو کی تھی کہ اقبال کے دواوین کا عربی میں ترجمہ کروں لیکن مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ توفیق الٰہی سے آٹھ ماہ سے کم مدت میں دو دیوانوں کے ترجمہ کی خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہو سکے گا اور ایک ہی سال میں ان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔

اس توفیق عظیم کے لئے اللہ ہی کا شکر و سپاس ہے اور اسی سے توفیق والہام اور راستکاری کی التجا کی جا سکتی ہے۔ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

عبدالوہاب عزام۔ کراچی

۱۹ رجمادی الثانی ۱۳۷۱ھ۔ ۱۰ فروری ۱۹۵۲ء

---

(۲) تعارف

(ڈاکٹر عزام بے موصوف)

ضرب کلیم اقبال کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جو انسان بحیثیت فرد، انسان بحیثیت رکن جماعت، دین، تربیت، ادب اور سیاست کے متعلق حکیمانہ افکار ونظریات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کلام شعریت کی نسبت فلسفہ اور تفکر میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے لیکن جذبات اور تخیل کی آمیزش نے اس کو شعر کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ کائنات کی ہر وہ حقیقت شعر بن جاتی ہے جو انسان کے جذبہ و وجدان سے آب ورنگ حاصل کر لیتی ہے یا جس کو انسانی تخیل ایک خاص شکل وصورت میں نمایاں کر دیتا ہے۔

شعریت ایک دائرہ ہے اور موضوعاتِ شعر اس دائرہ کے خط محیط سے مرکز تک مرتب اور منظم ہیں۔ بعض موضوعات خطِ محیط سے قریب تر ہیں۔ ان کو شعر سے کم اور ان موضوعات سے زیادہ قریبی ربط ہوتا ہے جو اس دائرے سے خارج ہوں۔ بعض موضوعات شعریت میں زیادہ عمیق ہوتے ہیں اور اس طرح جذبہ وتخیل کے تناسب کے ساتھ یہ ترتیب مرکزی دائرہ کی خالص شعریت تک پہنچ جاتی ہے۔

ضرب کلیم میں بعض اوقات اقبال کا کلام شعر کی اس صنف میں جلوہ آرا ہوتا ہے جو مجرد حقائق سے قریب تر ہے اور بعض مرتبہ

خالص شعریت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرکز شعر کی بہ نسبت خطِ محیط سے زیادہ قریب ہے۔

اس بنا پر پیامِ مشرق کی بہ نسبت مجھے ضربِ کلیم کے ترجمے میں زیادہ مشقت اور دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ اس دشواری کی ایک خاص وجہ میری یہ زبردست خواہش بھی تھی کہ ترجمے میں شعری نزاکتیں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اصل کا حسنِ شعر پھیکا نہ ہو جائے اور وہ ہلکی سی رنگین شعری نقاب نہ اتر جائے جو اقبال نے حقائقِ فلسفہ کے چہرے پر ڈالی ہے۔ کہیں ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل کرنے کی وجہ سے شعر کی یہ ننھی ننھی کلیاں مرجھا نہ جائیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کلام نغمہ موسیقی نہیں بلکہ ایک ایسی ضربِ خاراشگاف ہے جو سینۂ سنگ سے چشمے پیدا کرتی ہے جیسا کہ خود اقبال نے کہا ہے:

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ بہ زورِ دست و ضربِ کاری کا ہے مقام

شاید پڑھنے والے اس کلام میں شاعرانہ انداز، تخیل اور تازگی فکر کی جستجو کی بجائے ان حقیقتوں کو زیادہ شفاف محسوس کریں گے جن کو پیرایۂ شعر میں ظاہر کیا گیا ہے اور شاید اس طرح وہ انشا پرداز اور مترجم کی ان دشواریوں کا بھی اندازہ لگا سکیں گے جو ایک سنجیدہ اور متین اسلوبِ شعر میں ان حقائق کی نقاب کشائی میں پیش آئی ہیں۔

ابواب و فصول شاعرِ مشرق نے ضربِ کلیم کو چھ فصلوں پر تقسیم کیا ہے اور ان سے پہلے دو قطعے اور ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ پہلا قصیدہ ان چند ابیات پر مشتمل ہے جن میں دیوان کو نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کے نام معنون کیا گیا ہے۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے قارئین سے خطاب کیا ہے اور قصیدہ کو دیوان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دیوان کی فصول حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور مسلمان۔ (یہ اس دیوان کی سب سے طویل فصل ہے)
(۲) تعلیم و تربیت۔
(۳) عورت۔
(۴) فنونِ لطیفہ۔ (یہ دیوان کی دوسری طویل فصل ہے۔)
(۵) سیاستِ مشرق و مغرب۔
(۶) محرابِ گل افغان کے افکار۔

فلسفۂ اقبال اس موقع پر اقبال کے فلسفے کے متعلق بھی چند مختصر کلمات پیش کرنا مناسب ہے جو اقبال کے مقاصدِ عالیہ اور اس کا منتہائے نظر سمجھنے میں پڑھنے والوں کیلئے مددگار ثابت ہوں گے۔ اقبال کے فلسفہ کی اساس وہ تصور ہے جس کو اس نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال نے بہت سے اشعار میں اپنے اس مسلک کو واضح کیا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مثنوی بھی مخصوص کی ہے

جس کا نام اسرارِ خودی ہے۔

فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ

(ا) خودی جوہرِ کائنات ہے، نظامِ کائنات کی بنیاد اور اس کا سرِ حیات ہے۔

(ب) حیاتِ خودی مقاصد اور امنگوں کی تخلیق پر مبنی ہے۔

(ج) عشق آرزو، سعیٔ پیہم، بیباک عمل اور خطر پسندی سے خودی کو فروغ میسر آتا ہے۔

(د) جہادِ مسلسل اور جہدِ پیہم سے زندگی قوت و نمو اور فروغ پاتی ہے اور جھجک، تردد، آسائش طلبی اور پستیوں پر قناعت سے شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اعتماد ہو، فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنے قول و فعل میں خودی کو نمایاں کرے۔ تقلید، غیر پر اعتماد اور دوسروں کے سامنے دستِ طلب بڑھانے سے اجتناب کرے اور ان قوتوں سے غافل نہ ہو اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔

ان چیزوں سے خودی محکم ہوتی ہے اور خودی کا استحکام ہی اس زندگی کا مقصد ہے۔ شاعرِ مشرق اشیاء کی حسی اور معنوی قوت کا دلدادہ ہے اور اسی لئے وہ جرمن فلسفی نیٹشے کو پسند کرتا ہے لیکن اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے صرف جسم کا ادراک کر سکا اور عرفانِ روح سے بے بہرہ رہا اس کی دسترس محض علم و عقل تک ہے قلب و عشق تک اس کو رسائی حاصل نہ ہوسکی اور اس لئے اقبال کہتا ہے کہ وہ نکتۂ توحید کا اہل نہ تھا۔

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم　　نگاہ چاہئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے

اقبال کے نزدیک قوت و قدرت عناصرِ جمال ہیں۔ جلال کے بغیر کمالِ جمال ناممکن ہے۔ جلال اور جمال کے عنوان سے ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے:

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی　　کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر　　نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

بلکہ وہ کہتا ہے کہ افسردہ و مضمحل شعلے عذاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں۔

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ　　کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبال کے نزدیک حسن و قبح اور خیر و شر خودی کی پستی و بلندی کے تابع ہیں۔

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل　　جو ہو نشیب میں پیدا وہ قبیح و نامحبوب

پختہ اور محکم خودی کی انفرادیت جماعت میں منسلک ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتی۔ "رموزِ بے خودی" میں اقبال نے واضح کیا کہ ایک فردِ قوی کس طرح جماعت سے وابستہ ہو کر استفادہ کرتا ہے اور اس وابستگی کے باوجود اس کا انفرادی تشخص کس طرح بر

رہتا ہے۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے ایک قطعے میں کہتا ہے:

شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

انسان کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا ہ

وسخر لکم ما فی الارض جمیعا ہ

وسخر لکم الانھار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار واٰتاکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا

انسان مجبور و بے اختیار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہے۔ اس کا عزم نشانِ تقدیر ہے یا آثارِ قضا پر جاری ہے۔ ایک مومن آزاد اس دنیا میں بلکہ دنیا و آخرت میں صلاح و فساد اور بقا و فنا کا معیار ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

نباتات و جمادات قانونِ طبیعت کے محکوم ہیں لیکن مردِ مومن اپنے پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تہذیبِ جدید اقبال کہتا ہے یورپین تہذیب محض مادی ہے جس میں نہ قلب ہے نہ روح۔ اقبال نے اس تہذیب پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس مادی تہذیب کے فلاسفہ کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان کے بیشتر نظریات کو رد کر دیتا ہے وہ صرف اسلام اور اس کی تہذیب میں بشریت کی فلاح دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی نوعِ انسانی کے باہمی ربط و اتلاف کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اس کو برادرانہ انس و تعاون کے ساتھ شاہراہِ حق پر مجتمع کر سکتی ہے۔

اقبال کا فلسفہ ضربِ کلیم میں خودی اور عناصرِ خودی کے متعلق اقبال کا فلسفہ۔ اسلامی اور یورپی تہذیب کے متعلق اس کے نظریات اور ان کے علاوہ اس کے دوسرے حکیمانہ افکار و آراء، یہاں تک کہ ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ ضربِ کلیم کی تقریباً ہر فصل میں جھلکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک وہ موسیقی حرام ہے جس سے روح میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوتا ہو۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب

مصور کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی عکاسی کرے اور فطرت کی محاکات کرتے ہوئے آثارِ طبیعت میں اپنا نقشِ خودی نمایاں کرے۔

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تونے آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فقر ضربِ کلیم اور دوسرے دیوانوں میں بہت سے مواقع پر اقبال نے فقر پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ فقر کو کلیدِ خیر و سعادت اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقر خطرات میں بیباکانہ کود پڑنے کا محرک ہے۔

وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی ۔۔۔ کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے

اس کا دعوےٰ ہے:

عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور ۔۔۔ خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم

وہ کہتا ہے:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے ۔۔۔ ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے ۔۔۔ تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

اور اس لئے اس کی تمنا ہے کہ

اللہ کرے تجھکو عطا فقر کی تلوار

اقبال کے کلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فقر بے زری یا مال کی کمی کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ احتیاج معاش اور اس متاعِ دنیوی کی حاجتمندی کا نام ہے جس کو انسان اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہے بلکہ فقر سے اس کی مراد یہ ہے کہ نفس ہوس ملک اور حرص و طمع کی قیود سے آزاد رہ کر عمل کی طرف اس طرح پیشقدمی کرتا رہے کہ کوئی کامیابی اس میں سرکشی اور کوئی محرومی اس میں پستی پیدا نہ کر سکے۔ بسا اوقات فقیر سیم و زر کے انبار کا بھی مالک ہو سکتا ہے اور بہت مرتبہ صاحب سطوت بادشاہ بھی۔ لیکن مال و متاع کسی وقت بھی اس کی سطوت و جبروت کو درماندہ نہیں کر سکتے۔

فقر کا یہ مفہوم بعض صوفیا کی تشریح سے مختلف نہیں ہے۔

قشیری نے اپنے رسالے میں یحییٰ ابن معاذ کا قول نقل کیا ہے کہ

فقر کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیازی ہو۔

شبلیؒ کا بیان ہے کہ

فقر کی ادنیٰ ترین علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کا مالک ہو کر اس کو ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالے اور پھر اس کے قلب میں یہ خطرہ گذر جائے کہ اس میں سے صرف ایک دن کی روزی روک لیتا تو اس کا فقر صادق نہیں ہے۔

رسالہ قشیریہ میں ایک دوسرے موقعے پر کہا گیا ہے۔

صحتِ فقر کا معیار یہ ہے کہ اس ذات کے سوا جس کی طرف فقیر کی احتیاج ہے کسی چیز کے حصول سے استغنا میسر نہ آئے۔

۔دی نے عوارف المعارف میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

جب فقر الی اللہ درست ہوجاتا ہے تو غنا غنی باللہ میسر آتا ہے یہ دونوں احوال ہیں اور ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوتی۔

۔یانات سے واضح ہے کہ فقر ملک ومال کے فقدان کا نام نہیں ہے اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے وابستہ ۔ن کو وہ پالیتا ہے یا کھو دیتا ہے یعنی دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہ ہو خواہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہو۔

اقبال کہتا ہے:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈھ وہ فقر　　جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا　　اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا　　بے تیغ وسناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری　　اللہ سے مانگ یہ فقیری

---

(۳) پیش لفظ

(محترم پرویز صاحب)

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے، علامہ اقبال نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی۔

اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب، ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ۔یک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ ۔غیر انقلاب ہے اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف، جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا اور دامِ ہمرنگ ۔مین کی صورت میں، عینِ اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کر دیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو مٹانے کیلئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش ۔رحقیقت انتقام تھی یہود ونصاریٰ ومجوس کی ان شکستوں کا جو انھیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی قوت وسطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر، غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا۔ اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم ۔س سراب رنگ وبو کو ہیچ مچ کا گلستاں سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفۂ حشیشین۔ مجوس کی غلامانہ نسل پرستی۔ یہود کی قشری شریعت رسومات۔ رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت، ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوالہ تھی، کوتاہیٔ امل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ"

نظام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں، طوفان در طوفان امڈے چلا آرہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملّتِ اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جارہی تھیں۔ ضربِ کلیم اسی تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اسقدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کردیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کردی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کرسکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے، حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ

(الف) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمودِ زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہوجاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی، اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطۂ زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے ملسکتا ہے اور جو آج، اس آسمان کے نیچے، قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہوجاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اسلئے کہ اسماء کیلئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حُسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیائے فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و ائتلافِ ملت کے محکم تصور سے انسان اور کائنات۔ انسان اور انسان۔ اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۶) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ، انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افراد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں، ہنستی، کھیلتی، رقص کرتی، شاداں و فرحاں، اقطار السموات والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تصور کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آگئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا ہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ، قوم کو ذاتی فائدہ حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العینِ حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق، وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ پاگل خانے میں گذارنا ہوگا۔ اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون کے لئے مصروف پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبال نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا۔ جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں، اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا استوار ہوگا

اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، اقبال اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے، ضربِ کلیم، جس سے اقبال بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کرکے رکھدیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب بتوں کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں، فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے ابلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اترتے ہیں۔

پیام اقبال کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیق محترم صاحب السعادۃ، عبدالوہاب عزام بے کی "خارہ شگافی اور جوئے شیر آوری" کے تصدق، تنگنائے اردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادبان کشا ہوتا ہے، اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک شرمندۂ ساحل تھی، بیکراں بنا رہا ہے۔

اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی جو اس پیام حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اسقدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے ان سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

محترم پرویز صاحب کے تعارف کا یہ حصّہ اوّل ہے۔ حصہ دوم عدم گنجائش کے باعث روک لیا گیا ہے۔ انشاء اللہ ان دونوں حصّوں کو آئندہ اشاعت میں یکجا شائع کر دیا جائے گا۔

مدیر

پیغامِ اقبال اور ہم

(یہ نظم ۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو یوم اقبال کے جلسہ جہانگیر پارک کراچی میں پڑھی گئی)

اک جہاں بہرہ ور اقبال کے الہام سے ہے
ہم وہ گروہ ہیں جنھیں عشق فقط نام سے ہے

ذوق

روشناس اس نے کیا رومی و رازی سے ہمیں
دوستی اپنی ابھی حافظ و خیام سے ہے

تمدن

کہا تعمیرِ خودی پر ہے تمدن کی بنا
ہم نے جانا کہ یہ تعمیرِ در و بام سے ہے

پردہ

عورتوں کے لئے کی اُس نے جو تلقینِ حجاب
ہم سمجھتے رہے شاعر کے یہ اوہام سے ہے

مجلسِ اقوام

انجمن جس کو وہ کہتا تھا کفن دُزدوں کی
رابطہ اپنا اُسی مجلسِ اقوام سے ہے

فتنہ

جس کے فتنے سے ہمیں اس نے خبردار کیا
ہم کو امید اسی فطنتِ ناکام سے ہے

حرم

اُس نے تعمیرِ حرم پر ہمیں مائل تو کیا
پھر بھی الفت ہمیں افرنگ کے اصنام سی ہے

جمہوریت

اُس نے بچنے کو کہا ہیئتِ جمہوری سے
اور ہمیں اُنس اسی کے قفس و دام سے ہے

وطنیت

تھا جہاد اس کا ہمیشہ وطنیت کے خلاف
اپنے نزدیک مقدم وطن اسلام سے ہے

وحدتِ ملت

ہم کو لاکھ اُس نے دیا وحدتِ ملت کا سبق
پھر بھی تنظیم ہماری ابھی اقوام سے ہے

قرآن

کہا قرآن سے ملتی ہے مسلمان کو حیات
اور ہمیں کد ہے تو قرآن کے احکام سی ہے

اسلام

اُس کو تو فکر چمن بندیٔ اسلام کی تھی
ہم کو اندیشہ چمن بندیٔ اسلام سے ہے

اس نے جو کچھ بھی کہا ہم نے کیا اُس کے خلاف
کس قدر ضد ہمیں اقبال کے پیغام سے ہے

(اسد ملتانی)

اسلامی نظام

پرویز

[جناب پرویز کا یہ محققانہ مقالہ طلوعِ اسلام بابت ماہ جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ "اسلامی نظام کیا ہے اور اسے کس طرح رائج کیا جاسکتا ہے"۔ یہ عنوان ویسے بھی کچھ کم اہم نہیں لیکن تشکیل پاکستان کے بعد اس کی اہمیت نے ایک عملی شکل اختیار کرلی ہے اور گذشتہ چار سال سے اس کے متعلق مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے اس مقالہ کی مانگ برابر جاری رہی ہے۔ اب احباب کے مسلسل تقاضوں کے پیشِ نظر، صاحبِ مقالہ کی نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ آپ اس مضمون کا مطالعہ گہری توجہ سے فرمائیے اس لئے کہ جو خیال، مروجہ معتقدات سے ذرا بھی ہٹ کر پیش کیا جائے وہ شروع شروع میں انوکھا دکھائی دیا کرتا ہے کیونکہ طبائع اس سے غیر مانوس ہوتی ہیں۔ اگر آپ اسے گہری نظر سے دیکھیں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس میں وہی کچھ بتایا گیا ہے جو قرآن چاہتا ہے۔

اس مقالہ کی اشاعت کے بعد محترم پرویز صاحب نے دو ایک مقامات پر اس کے بعض اجمالات کی تفصیل پیش کی تھی ہم ان اضافوں کو بھی اس مقالہ کے ساتھ ہی شائع کرتے ہیں تاکہ پورے کا پورا موضوع بیک وقت سامنے آجائے۔ طلوعِ اسلام]

غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ "شخصیت پرستی" کے عنوان سے میرا ایک مبسوط مضمون شائع ہوا۔ اس میں میں نے بتایا تھا کہ اسلامی نظامِ زندگی میں قرآن، احادیث اور فقہ کی صحیح حیثیت کیا ہے اور انہیں کس مقام پر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ مسلمانوں کا اکثر و بیشتر مسلک یا روات پرستی ہے ... یا ائمہ پرستی ... اور میرے مضمون میں خالص "خدا پرستی"[1] کی طرف دعوت دی گئی تھی اس لئے ان کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت نا گزیر تھی۔ اس لئے بھی کہ عجمی تصورات، جو اس شخصیت پرستی کے ذمہ دار ہیں، مسلمانوں کے دل و دماغ پر صدیوں سے مسلط ہو رہے ہیں اور ان کے اثرات، ان کے خون کے ذرات تک میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان کا ازالہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ معتقدات خواہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اور وہ اس متاعِ گراں قدر کے چھننے میں سخت صدمہ محسوس کرتا ہے۔ بنا بریں اس دعوت کی مخالفت اور بھی شدید ہوئی۔ حتیٰ کہ میرے بعض قریبی دوستوں تک نے اس سے متاثر ہو کر مجھ سے کہا کہ تم نے اس نظری بحث کو کیوں چھیڑ دیا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بحث نظری نہیں ہے۔ نظری بحثوں میں الجھنے کے لئے میرے پاس وقت کہاں ہے۔ بقول اکبرؔ

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب حصولِ پاکستان کی تحریک جاری تھی۔ اس تحریک سے میری اور دیگر ہمنوا حضرات کی وابستگی اس بنا پر تھی کہ ہمارے نزدیک

---

[1] "خدا پرستی" سے مقصود خدا کو پوجنا نہیں بلکہ خالص قوانینِ خداوندی کی اتباع ہے۔

اس خطۂ ارض میں اسلامی نظام زندگی کی از سرِ نو ترویج کے امکانات تھے۔ ہرچند اس وقت یہ توقع کسی کو بھی نہ تھی کہ پاکستان اتنی جلدی مل جائیگا لیکن یہ امید تو تھی کہ کسی نہ کسی دن یہ خورشید کامرانی ہمارے لئے فردوس گوش ضرور بنے گی۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، سب سے پہلا اقدام اسلامی نظامِ حکومت کی ترتیب و تدوین کا ہوگا۔ ضروری تھا کہ اس کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا جائے اور اس کے راستے میں جو الجھاؤ اور پیچیدگیاں حائل ہونے والی تھیں انہیں رفتہ رفتہ صاف کر دیا جائے تاکہ جب اس نظام کی عملی تشکیل کا وقت آئے تو اس کی ترتیب میں دقت پیش نہ آئے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس وقت کثرتِ تعبیر سے یہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہو جائے اور جس طرح ترکوں نے انہی دشواریوں سے تنگ آ کر نظامِ شریعت کو ناممکن العمل سمجھ لیا اور اپنے آئین و دساتیر کے نقشے معمارانِ مغرب سے مستعار لے لئے، یہاں بھی ایسا ہی نہ ہو جائے اور ہم نے پاکستان سے جس قدر امیدیں باندھ رکھی ہیں، وہ موہوم خواب اور نگاہ فریب سراب سے زیادہ ثابت نہ ہوں۔ لہٰذا میں نے جو بحث چھیڑی تھی وہ نظری بحث نہ تھی بلکہ یکسر عملی نتیجہ کی طرف لے جانے والے مذاکرات تھے۔ چنانچہ آج اسلامی نظام کی تشکیل و ترویج کے متعلق جو آوازیں چاروں طرف سے اٹھ رہی ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں یہ بحث یکسر عملی حیثیت لئے ہوئے تھی۔[1]

اسلامی نظام نہایت سیدھے سادے اصولوں پر قائم اور آئینۂ فطرت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں ٹیڑھ نہیں، سلوٹ نہیں، جھول نہیں۔ ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفٰوت۔ جن چیزوں کے اندازے خدا نے مقرر کر دیئے ہیں ان میں کہیں نقص و تفاوت نہیں ہوا کرتا۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور۔ جدھر جی چاہے نگاہ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہیں کسی گوشے اور کونے میں بھی فطور نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار نہیں بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھو ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر۔ ہر بار نگاہ ناکام و نامراد کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی اور کہیں کوئی الجھاؤ نہیں پائے گی۔ جس قدر الجھاؤ اور پیچیدگیاں، جتنی دشواریاں اور پریشانیاں جس قدر اختلافات و نزاعات، جتنی فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں ہیں سب ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف ۔۔۔ رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے میں ہے

اسلامی نظام کی بنیاد

اسلامی نظام کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اس اصل الاصول میں احترامِ آدمیت اور انسانی مساوات کا راز پوشیدہ ہے۔ اطاعت صرف قانونِ خداوندی کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ حکومت کا حق صرف اس احکم الحاکمین کے ضابطۂ قوانین کو ہے اس میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔ ولا یشرک فی حکمہ احدا (کہف)

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ۔۔۔ حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

---

[1] چنانچہ تجربے نے بتا دیا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، تدوینِ دستورِ اساسی کے ضمن میں یہی کچھ ہوا (اور ہو رہا ہے)۔ البتہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جو مسودہ دستورِ اساسی مرتب کر کے مجلسِ آئین ساز کے پاس بھیجا گیا ہے اس کی اساس و بنیاد وہی تصورات تھے جو محترم پرویز صاحب کی قرآنی فکر کے پیدا کردہ ہیں۔ طلوعِ اسلام

قرآن کریم کی تعلیم اس باب میں ایسی صاف اور واضح ہے کہ اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ چونکہ میرا خطاب اس وقت مسلمانوں سے ہے جن کا اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان ہے، اس لئے مجھے اس کے متعلق لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حکومت کا یہ اصول کس طرح نوعِ انسانی کو داخلی اور خارجی کشمکش سے نجات دلا کر حریت و آزادی کی صحیح فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں انسانیت پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلام میں حکومت اور اطاعت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ وہ ہر فرد کو براہ راست تو کوئی حکم نہیں دیتا، نہ ہی ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ تو پھر اس کی اطاعت کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کا جواب بھی صاف اور واضح ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جن قوانین کی اطاعت چاہتا ہے وہ اس نے بوساطت جناب نبی اکرمؐ انسانوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ انہی قوانین و ضوابط کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار صراحت کر دی ہے کہ اس کی اطاعت، قرآنی نظام کی اطاعت سے ہوگی۔ لہذا، اسلامی نظامِ حکومت کی اساس قرآن کی اطاعت ہے۔ حکومت اسی کے مطابق قائم کی جائے گی۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "ان میں قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم کرو" جو ایسا نہ کرے اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) "جو قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم نہ کرے تو وہ کافر ہے"۔

قرآن کا انداز

قرآن خدا کی طرف سے آخری کتاب ہے جو انسانوں کو دی گئی ہے۔ اب غور کیجئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے لیکر (کہ جب قرآن نازل ہوا) قیامت تک کس قدر مختلف زمانے آئیں گے اور ان زمانوں میں کس قدر مختلف طبقات کے لوگ ہوں گے۔ قرآن، تمام نوعِ انسانی کے لئے، تمام زمانوں کے لئے، خدائی حکومت کا جامع ضابطۂ قوانین ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں کی تمدنی زندگی (Social Life) کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں کے طریقِ بود و ماند اور اسلوبِ معاش و معاشرت بدلتے رہتے ہیں۔ آج رسائل آمد و رفت کی وسعتوں سے ساری دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں جس سے انسانوں کے بین الاقوامی روابط و معاملات اس نہج و انداز کے ہوگئے ہیں کہ ہزار سال قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج دنیا کی کوئی قوم خود مکتفی (Self - Sufficient) اور دوسروں سے مستغنی (INDEPENDENT) نہیں ہو سکتی۔ لہذا ظاہر ہے کہ عصرِ حاضر کے تمدنی تقاضے ازمنۂ سابقہ کے تقاضوں سے مختلف ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے۔ لہذا ان میں مرورِ زمانہ سے تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انسان کی طبیعی زندگی کو لیجئے۔ جس طرح چھٹی صدی عیسوی کے زمانے کے انسان کی پیاس پانی سے بجھتی تھی، اسی طرح آج کے انسان کی پیاس کی تسکین بھی پانی ہی سے ہوتی ہے۔ یا جہانِ ذوق و نظر (APPRECIATIVE WORLD) میں جس طرح نزہت و لطافت ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے وجۂ شادابیٔ قلب و نگاہ تھی، اسی طرح آج کے انسان کے لئے باعثِ شگفتگیٔ دیدہ و دل ہے۔ اسی اصول کے تابع، جس طرح صداقت و شرافت، ہزار سال پہلے کے انسان کیلئے باعثِ فخر و مباہات تھی اسی طرح آج کے انسان کے لئے بھی وجہ تکریم و تفضیل ہے۔ ان چیزوں پر

زمانے کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ

(۱) انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور مرورِ وقت سے ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) لیکن اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

لہٰذا جس ضابطۂ قوانین و ضوابط کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے، نظامِ زندگی بننا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان ہر دو تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کسی خاص وقت کے لئے نظامِ زندگی بن سکے گا۔ چونکہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے (دین کے معنی ہی نظامِ حیات ہیں) جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور زمان و مکان کی تقیدات سے ماوراء، اس لئے۔ . . اس میں انسانی زندگی کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں

(۱) بعض اصول ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کردی گئی ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن پر مرورِ زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہوں گے، ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں۔

(۲) باقی اصول ایسے ہیں جن کی صرف حدود متعین کردی گئی ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان کی جزئیات، ہر زمانے کے انسان اپنی اپنی ضروریات (یعنی اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں) کے مطابق خود متعین کریں گے، اس شرط کے ساتھ کہ یہ جزئیات، ان حدود سے متصادم نہ ہوں۔

مثلاً قرآن میں زانی، سارق، ڈاکو، باغی کی سزا متعین ہے۔ وضو کی تفصیل موجود ہے۔ جب کوئی انسان بلا وصیت مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو تو تقسیمِ ترکہ کے حصے مقرر ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کی تعین سے منشاءِ خداوندی یہی ہے کہ ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ . . . دوسری طرف، مثلاً نظامِ اقتصادیات میں قرآن نے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ روپیہ کی گردش اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ محض اوپر کے طبقے میں ہی نہ پھرتا رہے۔ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (۵۹/۷) یہ ایک محکم اصول ہے جو بطورِ اصول قیامت تک کیلئے کارفرما رہ سکتا ہے لیکن وہ جزئی قواعد جن سے یہ مقصد حاصل ہو مختلف زمانوں میں بدلتے رہیں گے اس لئے قرآن نے ان کی تفاصیل و جزئیات سے بحث نہیں کی۔ یا مثلاً محاصلِ حکومت (Govt. Revenues) کے سلسلے میں اس نے زکوٰۃ کا ذکر بار بار کیا ہے۔ لیکن سارے قرآن میں دیکھ جائیے کہیں بھی اس کی شرح (Rate) مقرر نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ شرح، مختلف زمانوں میں، حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہے گی[1]۔ زکوٰۃ کی شرح کو بلا تعین چھوڑ دینے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ منشاءِ خداوندی یہی ہے کہ اس کی شرح، حکومت اسلامی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کرلے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کے اصول کی طرح، اس کی طرح بھی ناقابلِ تغیر ہوتی تو قرآن نے جہاں اتنی مرتبہ زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے۔ وہاں ایک آدھ آیت میں اس کی شرح کا تعین بھی کردیتا۔ اللہ کے لئے یہ کونسی مشکل بات تھی؟

---

[1] زکوٰۃ کی شرح و حقیقت کے متعلق میرا ایک بسوط مضمون طلوعِ اسلام میں شائع ہوچکا ہے، اسے ایک نظر ضرور دیکھ لینا چاہئے۔

لہذا یہ ظاہر ہے کہ جن اصولوں کی جزئیات، قرآن نے متعین نہیں کیں، اس سے منشارِ ایزدی یہی ہے کہ ان کی جزئیات مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق ادلتی بدلتی رہیں گی، اس لئے اپنے اپنے زمانے کی اسلامی حکومت ان کی تفاصیل خود طے کرے گی۔ ان جزئیات کا نام شریعت ہوگا یعنی قانونِ حکومتِ اسلامی۔ پھر سمجھ لیجئے کہ شریعت یعنی قانونِ حکومتِ اسلامی مشتمل ہوگی،۔۔۔

(۱) ان ناقابلِ تغیر جزئیات پر جو قرآن نے خود متعین کر دی ہیں اور جو معدودے چند ہیں۔ اور

(۲) ان تفاصیل و جزئیات پر جو قرآنی اصولوں کے دائروں کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کی ملت اسلامیہ، قرآنی قاعدوں کے مطابق خود وضع کرے گی۔

اس خاکے کو سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔

پہلی قرآنی حکومت

قرآن نازل ہونے کے بعد سب سے پہلی حکومتِ خداوندی، نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائی۔ اس کے لئے حضورؐ نے

(۱) ان احکام کو بجنسہٖ نافذ فرمایا جو قرآن میں بالتفصیل آئے ہیں۔ یعنی جن کی جزئیات قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ اور

(۲) جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، ان کی جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین فرمائیں۔ اس زمانے میں ہنوز تمدنی وسعت اتنی زیادہ نہ تھی جو مختلف النوع معاشرتی اقتضایات کا موجب بنتی۔ وہ سیدھا سادہ دور تھا اسلئے اس میں تفصیلی احکام کی ایسی کثرت نہ تھی جیسی بعد میں جاکر ہوئی۔ لہذا حضورؐ کی متعین فرمودہ جزئیات بھی کچھ زیادہ نہ تھیں۔

ان ہی دونوں کے مجموعے کا نام شریعت اسلامی، یا ضابطۂ قوانین حکومت خداوندی تھا۔ اس ضابطہ کی اطاعت حکومتِ حقہ کی اطاعت یعنی خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔

نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو نہایت محفوظ شکل میں لکھوا کر، اور حفاظ کو حرف بحرف یاد کرا کر اور ان کا یاد کیا ہوا خود سن کر امت کے حوالے کر دیا۔ اور خود اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ "ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ باقی رہیں وہ جزئیات جو شق ۲ کے مطابق حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر خود متعین فرمائی تھیں چونکہ وہ ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے متعین نہیں کی گئی تھیں، اس لئے حضورؐ نے نہ ان جزئی احکامات کو کہیں قلمبند کرایا نہ انھیں کسی کو حفظ کرایا، نہ ان کا کوئی مجموعہ امت کو دیا، اور چونکہ صحابہ کبارؓ اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے نہ انھوں نے اس کا مطالبہ کیا اور نہ ہی کسی ایسے مجموعے کو مدون کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کتب تاریخ و آثار اس پر شاہد ہیں کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کے سوا امت کو اور کوئی مجموعۂ احکام نہیں دیا۔ اور مذکورہ صدر تصریحات کی روشنی میں اس کی لِم بھی صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ

جن اصولوں کی جزئیات کو ابدی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھنا منشائے خداوندی نہ تھا، ان جزئیات کو ابدی طور پر غیر متبدل رکھنا منشائے نبی اکرمؐ کس طرح ہو سکتا تھا؟

رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدین کے فیصلوں میں اختلاف

اور جب یہ چیز نہ منشائے خداوندی تھی اور (لہذا) نہ منشائے رسولِ خدا

تو حضورؐ ان جزئیات کو، قرآن کی طرح محفوظ کر کے، امت کو کیوں دیتے؟ رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے (خلیفہ کے معنی جانشین ہیں) اب قرآنی اصولِ حکومت کے مطابق، حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت کے مترادف ہوگئی۔ چونکہ آپ کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں بُعد نہیں تھا اور دونوں کے تمدنی مقتضیات ایک ہی تھے اس لئے عام طور پر نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلیوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لیکن بایں ہمہ جن معاملات میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوئی ان میں تبدیلی بھی کی گئی اور جو نئے امور و قضایا سامنے آئے ان میں نئے فیصلے بھی دیئے گئے۔ کتب روایات و آثار میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ نے ایسے فیصلے صادر کئے جو نبی اکرمؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں سے مختلف تھے۔ امورِ حکومت میں سب سے اہم معاملہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ حضورؐ نے نہ کسی کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا نہ نامزد۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور حضرت عمرؓ نے انتخاب کو چھ حضرات میں محدود کر دیا۔ یہ فیصلے ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کے فیصلے سے مختلف تھے۔ یا مثلاً حضرت عثمانؓ نے جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا۔ اسی طرح شراب خوری کی سزا کا تعین نہ قرآن میں ہے نہ حضورؐ کے زمانے میں اس کی تعیین ہوئی۔ اسے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے متعین کیا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کتب آثار میں ہے کہ آپ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دیدیں تو وہ طلاق بائنہ مان لی جائے گی، تو آپ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ ایسی طلاق کو بائن قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے نافذ قرار دیا اور فرمایا کہ لوگوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اب یہی حکم مناسب ہے۔ چنانچہ یہ حکم نافذ العمل ہوا اور شریعت کا حکم قرار پا گیا۔ یعنی رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک حکم، حکمِ شریعت تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کے برعکس دوسرا حکم، حکمِ شریعت قرار پا گیا اور اس وقت اسی حکم کی اطاعت، اطاعت "خدا اور رسولؐ" مانی گئی۔ چنانچہ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہدِ عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان کر فیصلہ کر دیا جائے۔
> چنانچہ یہ فیصلہ کر کے آپ نے تحلیل کا دروازہ بند کر دیا تاکہ لوگ حلالہ سے باز رہیں۔

نئے فیصلے اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مملکت میں توسیع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ تمدنی ضروریات میں بھی وسعت ہوگئی اور ایسے ایسے امور اجتماعیہ سامنے آئے جو نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں پیش نہ آئے تھے چنانچہ ان معاملات و قضایا کے متعلق نئے نئے احکام وضع کرنے پڑے۔ مثلاً دفاتر کا قیام، جیل خانوں کی تعمیر، سکوں کی ترویج وغیرہ۔ اس باب میں امام ابن قیم اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن عقیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> سیاست کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعے عوام اصلاح سے قریب ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور۔ اگرچہ اس معاملہ کو

---

[1] مجھے اس وقت حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ پر بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا ہے کہ اصولی طور پر خلفائے راشدین اس حقیقت سے آشنا اور اس پر عمل پیرا بھی تھے کہ نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ جزئیات ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے وضع نہیں کی گئی تھیں۔ (طلاق کی صحیح قرآنی صورت کیا ہے، اس کے متعلق طلوع اسلام میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

متعلق نہ قرآن میں واضح حکم موجود ہو نہ حدیث میں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سیاست دینی ہے جس کی شرع نے وضاحت کردی ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود صحابہ کرامؓ نے اس کی تغلیط کی ہے سچ پوچھو تو اجتہاد رائے کا یہ سلسلہ عہد خلفائے راشدین سے چلا آرہا ہے حضرت علیؓ نے چند زنادقہ کو جلایا۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو غیر معمولی یہ مصاحف کو جلایا۔ حضرت عمرؓ نے جو نصر بن حجاج کو جلاوطن کیا۔ یہ سب اگر اجتہاد رائے نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے جن جزئیات کو متعین فرمایا تھا ان کا دائمی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا نہ ہی تمام کی تمام شریعت ان ہی جزئیات کے اندر محصور ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت اپنے اپنے زمانے کے اقتضایات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں بھی کر سکتی تھی۔ ان پر اضافے بھی۔ ناقابل تغیر صرف قرآن کے اصول اور اس کی متعین کردہ جزئیات تھیں (اور ہیں) چنانچہ جہاں ہمارے سامنے ان جزئیات میں تغیر و تبدل اور حک واضافے کے واقعات آتے ہیں جنھیں قرآن نے متعین نہیں کیا تھا، وہاں یہ واقعہ بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کے مہر بڑھ چڑھ کر باندھ رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ مہر کی کوئی حد متعین کردی جائے۔ آپ نے مسجد میں لوگوں کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تو ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ اے عمرؓ! کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ

وآتیتم احداھن قنطارا فلا تأخذوا منه شيئا

اگر تم نے ان بیویوں میں سے کسی کو مال کا ڈھیر بھی بطور مہر دیدیا تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

آپ نے سن کر کہا کہ اس عورت نے سچ کہا۔ عمر غلطی پر تھا۔

ایک خلیفہ کے فیصلے کے خلاف دوسرے خلیفہ کا فیصلہ

خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا ہو۔ مثلاً

(۱) قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں کیا۔ . . . . نبی اکرمؐ نے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو (جو امرائے قبائل میں سے تھے) ایک بار تالیف قلوب کے لئے سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں انھوں نے کچھ زمینیں طلب کیں تو انھیں وہ بھی دیدی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس اراضی کو یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ اللہ نے اسلام کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دیا ہے اس لئے وہ زمینیں اب ان کے حقداروں کو دی جائیں گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مطلقہ عورت نے اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کر لیا (حالانکہ قرآن میں اس کی ممانعت آئی ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کے کوڑے لگوائے اور فیصلہ صادر فرمایا کہ جو عورت اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کرے اگر اس کے شوہر کی اس کے ساتھ مقاربت نہیں ہوئی، تو دونوں میں علیحدگی کرادی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ شوہر اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقاربت ہو چکی ہو تو اس علیحدگی کے بعد وہ اس سے نکاح نہیں کر سکے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کے جزو ثانی سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ بعد اختتام عدت

توحضورؐ ان جزئیات کو، قرآن کی طرح محفوظ کرکے، امت کو کیوں دیتے؟ رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے (خلیفہ کے معنی جانشین ہیں) اب قرآنی اصولِ حکومت کے مطابق، حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کے مترادف ہو گئی۔ چونکہ آپ کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں بُعد نہیں تھا اور دونوں کے تمدنی مقتضیات ایک ہی تھے اس لئے عام طور پر نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلیوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لیکن بایں ہمہ جن معاملات میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوئی ان میں تبدیلی بھی کی گئی، اور جو نئے امور و قضایا سامنے آئے ان میں نئے فیصلے بھی دیئے گئے۔ کتب روایات و آثار میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ نے ایسے فیصلے صادر کئے جو نبی اکرمؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں سے مختلف تھے۔ امور حکومت میں سب سے اہم معاملہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ حضورؐ نے نہ کسی کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا نہ نامزد۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور حضرت عمرؓ نے انتخاب کو چھ حضرات میں محدود کر دیا۔ یہ فیصلے ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کے فیصلے سے مختلف تھے۔ یا مثلاً حضرت عثمانؓ نے جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا۔ اسی طرح شراب خوری کی سزا کا تعین نہ قرآن میں ہے نہ حضورؐ کے زمانے میں اس کی تعیین ہوئی۔ اسے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے متعین کیا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کتب آثار میں ہے کہ آپ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دیدیں تو وہ طلاق بائنہ مان لی جائے گی، تو آپ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ اسی طلاق کو بائن قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے نافذ قرار دیا اور فرمایا کہ لوگوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اب یہی حکم مناسب ہے۔ چنانچہ یہ حکم نافذ العمل[1] ہوا اور شریعت کا حکم قرار پا گیا۔ یعنی رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک حکم، حکمِ شریعت تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں، اس کے برعکس دوسرا حکم، حکمِ شریعت قرار پا گیا اور اس وقت اسی حکم کی اطاعت، اطاعت "خدا اور رسولؐ" مانی گئی۔ چنانچہ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہدِ عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ یک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان کر فیصلہ کر دیا جائے۔
> چنانچہ یہ فیصلہ کرکے آپ نے تحلیل کا دروازہ بند کر دیا تاکہ لوگ حلالہ سے باز رہیں۔

نئے فیصلے

اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مملکت میں توسیع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ تمدنی ضروریات میں بھی وسعت ہو گئی اور ایسے ایسے امور اجتماعیہ سامنے آئے جو نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں پیش نہ آئے تھے چنانچہ ان معاملات و قضایا کے متعلق نئے نئے احکام وضع کرنے پڑے۔ مثلاً دفاتر کا قیام، جیل خانوں کی تعمیر، سکوں کی ترویج وغیرہ۔ اس باب میں امام ابن قیم اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن عقیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> سیاست کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعے عوام اصلاح سے قریب ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور۔ اگرچہ اس معاملہ میں

---

[1] مجھے اس وقت حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ پر بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا ہے کہ اصولی طور پر خلفائے راشدین اس حقیقت سے آشنا اور اس پر عمل پیرا بھی تھے کہ نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ جزئیات ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے وضع نہیں کی گئی تھیں۔ (طلاق کی صحیح قرآنی صورت کیا ہے، اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

متعلق نہ قرآن میں واضح حکم موجود ہو نہ حدیث میں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سیاست وہی ہے جس کی شرع نے وضاحت کر دی ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود صحابہ کرامؓ نے اس کی تغلیط کی ہے۔ سچ پوچھو تو اجتہاد رائے کا یہ سلسلہ عہد خلفائے راشدین سے چلا آ رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے چند نادقہ کو جلایا۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو غیر معمول بہ مصاحف کو جلایا۔ حضرت عمرؓ نے جو نصر بن حجاج کو جلا وطن کیا۔ یہ سب اگر اجتہاد رائے نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے جن جزئیات کو متعین فرمایا تھا ان کا دائمی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا نہ ہی تمام کی تمام شریعت ان ہی جزئیات کے اندر محصور ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت اپنے اپنے زمانے کے اقتضایات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں بھی کر سکتی تھی۔ بدن پر اضافے بھی۔ ناقابل تغیر صرف قرآن کے اصول اور اس کی متعین کردہ جزئیات تھیں (اور ہیں) چنانچہ جہاں ہمارے سامنے ان جزئیات میں تغیر و تبدل اور حک و اضافے کے واقعات آتے ہیں جنھیں قرآن نے متعین نہیں کیا تھا، وہاں یہ واقعہ بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کے مہر بڑھ چڑھ کر باندھ رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ مہر کی کوئی حد متعین کر دی جائے۔ آپ نے مسجد میں لوگوں کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تو ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ اے عمرؓ! کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ

واٰتیتم احدٰھن قنطارًا فلا تأخذوا منہ شیئًا

اگر تم نے ان بیویوں میں سے کسی کو مال کا ڈھیر بھی بطور مہر دیدیا تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

آپ نے سن کر کہا کہ اس عورت نے سچ کہا۔ عمر غلطی پر تھا۔

ایک خلیفہ کے فیصلے کے خلاف دوسرے خلیفہ کا فیصلہ

خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا ہو۔ مثلاً

(۱) قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں کیا۔ . . . .
. . . . نبی اکرمؐ نے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو (جو امرائے قبائل میں سے تھے) ایک بار تالیف قلوب کے لئے سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں انھوں نے کچھ زمینیں طلب کیں تو انھیں وہ بھی دیدی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس اراضی کو یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ اللہ نے اسلام کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دیا ہے اس لئے وہ زمینیں اب ان کے حقداروں کو دی جائیں گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مطلقہ عورت نے اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کر لیا (حالانکہ قرآن میں اس کی ممانعت آئی ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کے کوڑے لگوائے اور فیصلہ صادر فرمایا کہ جو عورت اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کرے اگر اس کے شوہر کی اس کے ساتھ مقاربت نہیں ہوئی، تو دونوں میں علیحدگی کرا دی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ شوہر اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقاربت ہو چکی ہو تو اس علیحدگی کے بعد وہ اس سے نکاح نہیں کر سکے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کے جزو ثانی سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ بعد اختتام عدت

اس شوہر سے نکاح جائز ہوگا خواہ مقاربت ہوئی ہو یا نہ۔

(۳) حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت، غلام کی بیوی ہو کر صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر حرام ہو جائے گی لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں ہوگی۔

(۴) اگر کوئی مرد حالتِ مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق اس عورت کو متوفی کے ترکہ سے اسی صورت میں حصہ ملے گا کہ اس کا خاوند عدت کے زمانے میں فوت ہو جائے۔ اگر عدت کی مدت گذر جائے تو پھر متوفی کے ترکہ سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے فیصلہ دیا کہ اس باب میں حد مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بہر حال ترکہ کی مستحق ہوگی۔

(۵) جس حاملہ عورت کا شوہر مر جائے حضرت عمرؓ نے اس کی عدت وضع حمل مقرر کی۔ لیکن حضرت علیؓ کا فیصلہ ہے کہ وضع حمل اور چار مہینے دس دن کی مدت میں جونسی مدت طویل ہوگی وہی اس کی عدت ہے۔

(۶) دادا کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دلواتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(۷) حضرت ابوبکرؓ لوگوں پر برابر برابر مال تقسیم کراتے تھے اور کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہی رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہ کے خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو حضورؐ کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو مٹا دیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتب تاریخ و آثار میں مذکور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ ... کی متعین کردہ جزئیات کو ناقابل تغیر و تبدل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانے کے لئے شریعت ہوتا تھا، اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانے والوں کے لئے شریعت۔

ازاں بعد خلفائے راشدین کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی جس کا لازمی نتیجہ دین اور دنیا کی تفریق تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ بادشاہوں نے (جو اپنا نام خلیفہ ہی رکھتے تھے) "امور دنیا" کی سرانجام دہی کا فریضہ اپنے ذمے رکھا اور "امور دینی" فقہا کے سپرد ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ کہ اسلامی نظام کا وہ اصل الاصول جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ شریعت کی جزئیات متعین کرنے کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ ملت کا اجتماعی منصب تھا جس کی تکمیل مجلس شوریٰ اور امیر ملت کے فیصلوں سے ہوتی تھی۔ اب نہ امیر ملت تھا نہ اس کی مجلس شوریٰ، اس لئے جزئیات کی تعیین کس طرح ہوتی؟ ... اب لوگ فقہا کے پاس اپنے امور وقضایا لاتے۔ وہ پہلے قرآن کی طرف نگاہ دوڑاتے۔ اگر اس کی متعین کردہ جزئیات سے بات طے ہو جاتی تو ہوالمراد ورنہ وہ عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ کے فیصلوں میں تفحص کرتے۔ اور اگر وہاں بھی مناسب حال کوئی فیصلہ نہ ملتا تو مجبوراً خاموش رہتے۔ اس ضرورت کے ماتحت نبی اکرمؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال و کوائف اور اقوال و اعمال کی جمع و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔

روایات

ان ہی مجموعوں کا نام کتبِ روایات ہے۔ چنانچہ ان میں سب سے پہلا مجموعہ جو آج ہمارے پاس ہے مؤطا امام مالکؒ ہے جو تقریباً ۱۴۰ھ میں مدون ہوئی۔ اس میں کم و بیش پانچ سو روایات ہوں گی جو بیشتر احکام ہی پر مشتمل ہیں۔ بنی عباس کے عہدِ حکومت میں، سلطنت بہت وسیع ہوگئی اور تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے نئے نئے مسائل پیش کر دیئے جن کا حل روایات عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں نہیں مل سکتا تھا۔ اور فقہا کے لئے یہ بھی مشکل تھا کہ ہر نئے معاملہ میں خاموشی اختیار کر لیں۔ اس ضرورت کے ماتحت روایات وضع ہونی شروع ہوئیں اور سو سال کے عرصہ میں (جس . . میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم مدون ہوئی ہیں۔ یعنی نبی اکرمؐ کے قریب اڑھائی سو سال بعد) ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ ایک امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے قریباً سات ہزار منتخب کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔ اس ضرورت کے علاوہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وضع روایات کے لئے اور بھی بہت سے اسباب محرک و مؤید ہوئے لیکن یہ بحث میرے اس موضوع سے خارج ہے۔ مجھے اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دینی لامرکزیت سے جب جزئیات شرعیہ کی تعیین کا دروازہ بند ہوا تو لوگوں کو کس طرح مجبوراً سابقہ متعین شدہ جزئیات پر اکتفا کرنا پڑا اور جب وہاں سے ہر مسئلہ کا جواب نہ ملا تو ان روایات میں کس طرح اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

فقہ

لیکن ان کے ساتھ اہل فکر کا ایک اور گروہ بھی تھا جس نے ایسے مقامات پر خاموش رہنے یا وضعی حدیثوں کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اس مشکل کا ایک اور حل سوچا۔ ان کے سامنے جب کوئی نیا سوال آتا تو وہ قرآن یا روایات کو سامنے رکھ کر قیاساً استنباط کرتے اور اس طرح اپنی فکر اور رائے سے مسئلہ پیش نظر کا حل متعین کر لیتے۔ گروہ اول اہلحدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ اور گروہ ثانی اہل الرائے یا اہل فقہ کہلایا۔ مؤخر الذکر گروہ میں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسف، بغداد کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تو ان کی قابلیت و تفقہ سے ان کی فقہ دولت عباسیؔ کا رسمی قانون بن گئی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس فقہ میں اور وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یہی وہ فقہ ہے جو فقہ حنفی کے نام سے متعارف ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، ملت کی مجلس شوریٰ اور ان کے منتخب کردہ امام کے تفقہ فی الدین کے اجتماعی فیصلے نہ تھے جو عہدِ اولیٰ میں شریعت کی جزئیات بنتے تھے۔ یہ ائمہ فقہ کے انفرادی تفقہ و تدبر کے نتائج تھے۔ جنہیں حکومت اپنے مقاصد کے ماتحت بطور قانون رائج کر دیا کرتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قانون کے محرکات، خاص مقاصد و مصالح ہوں تو اس کا اصول سے دور ہٹ جانا مستبعد نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعۂ فقہ میں نہ معلوم کس کس گوشے کے فیصلے اور کون کون سے اسباب و عواطف کے قضایا شامل ہوتے رہے۔ ملوکیت کا استبداد جو کچھ زندگی کے اور شعبوں میں کیا کرتا ہے وہی کچھ یہاں بھی ہوا یعنی وضعی حدیثوں کی طرح فقہ کے مجموعۂ فتاویٰ میں بھی ایسی ایسی چیزیں شامل ہو گئیں جو کھلے طور پر قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔

اس طرح احادیث اور فقہ کے مجموعے مرتب ہوئے۔

دین، مذہب سے بدل گیا

زوالِ بغداد کے بعد، ملت کی دنیاوی مرکزیت بھی ختم ہو گئی اور تشتت و افتراق کی اس عالمگیر افراتفری میں دین یکسر مذہب میں تبدیل ہو کر چند نجی عقائد اور رسومات ظواہر کا نام رہ گیا

(واضح رہے کہ دین، رفتہ رفتہ مذہب میں تو اسی زمانے سے بدلنا شروع ہوگیا تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی۔ زوالِ بغداد کے بعد اس سلسلہ کی تکمیل ہوگئی تھی) علماء نے اپنی عظمت قائم رکھنے کے لئے مختلف مراکز قائم کرلئے اور امت سے کہدیا گیا کہ وہ مذہب سے متعلق ہر معاملہ کے لئے ان ہی مراکزِ عقیدت کی طرف رجوع کیا کریں۔ اس طرح مسلمانوں میں خالص برہمنیت (PRIEST HOOD) قائم ہوگئی جو ان کی زندگی کے ہر اس شعبہ پر جو مذہب سے متعلق تھا پورے طور پر چھا گئی۔ اگرچہ ان علماء میں باہمی اختلافات بیحد تھے اور مختلف فرقوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں مسلمان اصولی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھے یعنی اہلِ حدیث اور اہل الرائے یا اہلِ فقہ۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی چپقلش و آویزش، ملت اسلامیہ کی بدبختی کی ایک مستقل داستان ہے۔ گروہ سازی کا خاصہ ہے کہ انسان ان امتیازات میں جن سے اس کا فرقہ دوسرے فرقے سے متمیز ہوتا ہے بڑا تشدد برتتا ہے کیونکہ اسی سے اس کا فرقہ قائم رہ سکتا ہے۔ اسی کا نام تعصب ہے۔ یہی تعصب اختلافات کو مستقل اور دائمی حیثیت دے کر ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا موجب بن جاتا ہے۔ نیز جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر شعبہ انحطاط پذیر ہوجاتا ہے اور اس کا اثر خاص طور پر اس کی فکری صلاحیت پر پڑتا ہے۔ چونکہ قوم میں جدت افکار و قوت تخلیق باقی نہیں رہتی اس لئے وہ تقلید جامد کو مسلکِ زندگی قرار دے لیتی ہے اور اپنے افلاسِ فکر و نظر اور فقدانِ تدبر و اجتہاد کو "اسلاف پرستی" کا مقدس نام دے کر خوش ہونے لگتی ہے . . . . . ۔اسلاف پرستی کے لئے ضروری ہے کہ گزرے ہوئے زمانے کو اپنے زمانے سے مقدس و مزکی قرار دیا جائے اور اپنے ماضی کو درخشندہ اور حال و مستقبل کو تاریک بنایا جائے۔ زوالِ بغداد کے بعد، یہ تمام خرابیاں ابھر کر سطح پر آگئیں اور علماء نے امت کو یہ کہہ کر سلا دیا کہ

(۱) مذہب جو کچھ بننا تھا بن چکا۔ جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اب اس میں نہ تغیر و تبدل ہوسکتا ہے نہ حک و اضافہ۔

(۲) یہ مذہب، علماء کو اسلاف سے وراثت میں ملا ہے اس لئے اسے علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۳) تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم مذہب کے ہر معاملہ میں علماء کی طرف رجوع کرو اور ان کے فیصلوں کو خدا اور رسول کا فیصلہ سمجھو۔

(۴) چونکہ عقل کو مذہب میں کوئی دخل نہیں اسلئے اگر علماء کا کوئی حکم تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کے سمجھنے پر اصرار نہ کرو۔

(۵) بزرگوں کے راستے پر آنکھ بند کرکے چلتے جاؤ کہ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو تمہیں سیدھا جنت کی طرف لیجائے گا۔

(۶) یاد رکھو تمہارا زمانہ فسق و فجور کا زمانہ ہے اس میں گنہگار بستے ہیں۔ تمہارے اسلاف کا زمانہ علم و تقویٰ کا زمانہ تھا اسلئے تم گنہگار اس کے اہل ہی نہیں کہ مذہب کے معاملات میں دخل دے سکو۔ اگر اسلاف کا کوئی فیصلہ قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے اپنی نظر کا قصور سمجھو کیونکہ اسلاف تم سے زیادہ قرآن فہم تھے۔

ان لوریوں سے انھوں نے قوم کو سلا دیا اور اس طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی مسانیدِ برہمنیت کی عظمت بٹھا دی۔ واشربوا فی قلوبھم العجل۔

اب انھیں قوم کی طرف سے تو کسی حملہ کا اندیشہ نہیں رہا تھا مگر . . . اپنے باہمی اختلافات کے باعث ایک دوسرے کی طرف سے پر اس ضرور تھے۔ اس کے لئے انھوں نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، عقائد میں شدت اور تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ

ان کے متبعین، ان عقائد میں ذرا سی لغزش یا تبدیلی کے خیال سے کانپ اٹھیں اور اس میں انھیں ایمان جاتا دکھائی دے۔ چنانچہ اہلِ فقہ کے مقابلہ میں احادیث کو عین اسلام بنانے کے لئے یہ عقائد وضع کئے گئے کہ

(۱) احادیث بھی در اصل منزل من اللہ ہیں۔ اس لئے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو (جس کی ہم قرآن میں تلاوت کرتے ہیں) اور دوسری غیر متلو جو احادیث میں ہے۔

(۲) جن باتوں کی صراحت قرآن میں نہیں ہے انھیں اللہ نے اس لئے مجمل چھوڑ دیا تھا کہ رسول اللہؐ اس اجمال کی تفصیل متعین کردیں (اس طرح کتابِ دین گویا دو مصنفوں کی مشترکہ تصنیف قرار پاگئی) چنانچہ امام اوزاعی کا قول ہے کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی۔ (دیکھئے مختصر جامع بیان العلم)

(۳) قرآن میں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے اس سے مراد قرآن اور احادیث کی اطاعت ہے۔ لہذا احادیث قرآن کی مثل (مثلہ معہ[1]) ہیں اور قرآن ہی کی طرح ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل۔ بلکہ قرآن کو حدیث منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

(۴) جب یہ اعتراض کیا گیا کہ احادیث میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو قرآن کے خلاف[2] ہیں تو یہ کہا گیا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں یعنی اگر قرآن اور حدیث میں دو باتیں باہم متعارض ہوں تو حدیث کا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ (ایضاً)

ان کے مقابلہ میں اہلِ فقہ بھی اپنے عقائد میں کم متشدد نہ تھے۔ ان کے نزدیک امت کے لئے اب قرآن کا کوئی عملی فائدہ باقی نہ تھا۔ اس میں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ ائمہ فقہ نے حاصل کرکے اپنے مجموعۂ فتاوی میں جمع کر دیا۔ اب قرآن کی تلاوت فقط ثواب حاصل کرنے یا مردوں کو بخشنے کے لئے رہ گئی۔ جو جزئیات قرآن نے متعین نہیں کی تھیں، انھیں ائمہ فقہ نے متعین کر دیا اور اب ان کی متعین فرمودہ جزئیات قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ نہ ان میں حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ ادل بدل۔ اس لئے کہ اب مزید اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ حالانکہ خود ائمہ فقہ کا بھی یہ منشا نہ تھا کہ ان کے تفقہ کے استنباطات و اجتہادات کو ابدی طور پر ناقابلِ تغیر مان لیا جائے۔ ایک ہی نہج فکر کی فقہ کے مختلف ائمہ کے باہمی اختلافات اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے قیاس و آراء کو کبھی منزہ عن الخطا نہیں سمجھتے تھے۔ خود امام اعظمؒ اور ان کے شاگردانِ جلیل امام محمدؒ اور امام یوسفؒ کے قیاسات و استنباطات نے

[1] مثلہ معہ کے متعلق طلوع اسلام میں ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] مثلاً قرآن نے زنا کی سزا سو درے مقرر کی ہے۔ لیکن احادیث میں شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم (سنگسار) ہے جو قرآن پر خالص اضافہ ہے۔ یا قرآن نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے (بلکہ اللہ نے اسے فرض قرار دیا ہے) کہ وہ اپنے ترکہ کیلئے وصیت کرے۔ لیکن احادیث کہتی ہیں کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی ورثاء کے لئے نہیں۔ یا قرآن دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہیں چاہتا۔ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے لیکن احادیث کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہے۔ یا قرآن نے جنگی قیدیوں کے متعلق حکم دیا ہے کہ انھیں فدیہ لیکر چھوڑ دو یا احساناً۔ لیکن حدیث کی رو سے جنگی قیدیوں کو قتل کردینے اور غلام بنالینے تک کا بھی حکم ہے۔ مسلمانوں میں غلامی آئی ہی روایات کے راستے سے ہے۔ قرآن نے اس کے سب راستے بند کر دیئے تھے ——— یہ احکام کی چند ایک مثالیں ہیں ورنہ جہاں تک دین کی روح کا تعلق ہے عجمی ٹکسالوں میں وضع شدہ روایات نے اسے یکسر مسخ کر دیا ——— ہے۔ اس کی تفصیل میرے اکثر مضامین میں ملے گی۔

میں اختلاف ہوتا تھا۔ علاوہ بریں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ قرآن وسنت ہی سے اخذِ مسائل کرتے ہیں لیکن ان کی فقہ میں ایسے ایسے فیصلے موجود ہیں جو قرآن کے بھی خلاف جاتے ہیں (اور اہلِ حدیث کے اعتراضات کی رو سے خود سنت رسول اللہ کے بھی خلاف) مثلاً فقہ کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کی وراثت میں سے کچھ نہیں ملتا۔ (اس لئے کہ یہ اس کا جرم ہے کہ اس کا باپ، اس کے دادا کی موجودگی میں کیوں مر گیا) حالانکہ یہ فیصلہ قرآن کے خلاف ہے۔ یا غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق تمام احکام، حالانکہ قرآن نے غلامی کو سرے ہی سے مٹا دیا تھا اور صرف ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق احکام دیئے تھے جو نزولِ قرآن کے وقت پہلے سے موجود تھے۔ یا مثلاً وراثت کے قانون میں عول کا قاعدہ کہ جس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) حساب کے ابتدائی قواعد بھی معلوم نہ تھے۔

اب اگر ان سے کہا جائے کہ فقہ کے یہ فیصلے قرآن کے خلاف ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا امام اعظمؒ زیادہ سمجھتے تھے؟ اس جواب کے بعد وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے دین کے گرتے ہوئے ستون کو تھام لیا ہے۔

بہرحال، اس طرح احادیث اور فقہ مستقل دین بن گئیں اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا کر، واجب العمل ٹھہر گئیں اور ان کی اطاعت کا نام ہوا اللہ اور رسول کی اطاعت۔ حالانکہ ان سے مفہوم صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانے سے لیکر مختلف ادوار میں دین کو کس طرح سے سمجھا گیا اور شریعت کی جزئیات کی تعیین میں کیا کیا کوششیں ہوئیں۔ یعنی اگر جعلی روایات کو بھی الگ کر لیا جائے اور فقہ میں جو کچھ ادھر اُدھر سے شامل ہو گیا ہے اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو بھی ان سے صرف یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے فلاں فلاں اصول کے متعلق فلاں فلاں زمانے میں کس قسم کی جزئیات متعین ہوئی تھیں۔ نہ رسول اللہؐ کا منشا تھا کہ یہ جزئیات ابدی طور پر ناقابلِ تغیر ہیں اور نہ ہی فقہاء کا مقصود تھا کہ ان کی جزئیات قیامت تک کیلئے دین بن جائیں۔ یہ خیال ہی بعد کی پیداوار ہے۔

معاشرتی جزئیات بھی دین بن گئیں

روایات کو دین بنا لینے سے ایک اور خرابی بھی ہوئی۔ نبی اکرمؐ عرب میں پیدا ہوئے اس لئے جس طرح آپ کی زبان عربی تھی اسی طرح آپ کی عام معاشرت اور طریق بود و ماند بھی وہی تھا جو اس زمانے کے عربوں کا تھا۔ اس معاشرت کی ایسی خرابیاں جو اسلام کے خلاف جاتی تھیں ان کی بیشک حضورؐ نے اصلاح فرما دی لیکن اس کے بعد حضورؐ کے رہن سہن کا طریق تو لامحالہ وہی تھا جو اس زمانہ کے عربوں میں مروج تھا۔ وضع قطع، لباس کی تراش خراش، سامانِ نقل و حرکت، اسباب حرب و ضرب۔ غرضیکہ روزمرہ کے رہنے سہنے کے طریقے اور برتنے کی چیزیں وغیرہ سب اسی انداز کی تھیں جن کا اس زمانے میں رواج تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جب تک قانون کی کسی شق سے متصادم نہ ہوں، قانون کی حدود میں نہیں جکڑی جاتیں اور ہر زمانے کے معاشرتی انداز کے مطابق اختیار کی جا سکتی ہیں۔ آپ کے کوٹ کی لمبائی کتنی ہونی چاہئے۔ آپ کو جوتا کس قسم کا پہننا چاہئے۔ پانی کس قسم کے برتن میں پینا چاہئے (گلاس میں یا پیالہ میں) وقس علیٰ ہذا۔ یہ چیزیں دین میں داخل نہیں ہیں۔ لیکن جب روایات مرتب ہوئیں تو چونکہ وہ تاریخ تھیں عہد رسالتمآبؐ (صحابہ کرامؓ کی)، اس لئے اس قسم کے عام معمولات کی باتیں بھی ان میں آ گئیں اور جب بعد میں روایات دین بن گئیں تو یہ چیزیں بھی جزوِ دین قرار پا کر قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر سمجھ لی گئیں۔ ان کا

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف معاملات کی دنیا میں قانونی جزئیات میں ردوبدل کرنے کا اختیار ملت سے سلب کر لیا گیا بلکہ روزمرہ کے معمولات میں بھی انہیں ایک خاص وضع کی معاشرت کا پابند کر دیا گیا۔ پاجامہ کتنا لمبا ہونا چاہئے، بالوں کی مانگ کس طرف نکالنی چاہئے، مسواک کی لمبائی کتنی ضروری ہے، غسل کے لئے کتنے لوٹے پانی چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ دین جسے زمانہ کی ضرورتوں کا حل تجویز . . . کرنا چاہئے تھا، ظواہر پرستیوں (RITUALISM) کا ایسا سخت مجموعہ بن گیا جس میں کہیں لوچ اور لچک نہیں۔ اگر کسی مولوی صاحب کو معلوم ہو جائے کہ میت کے غسل کے پانی میں بیری کے پتے نہیں ڈالے گئے، تو وہ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیں گے۔ یہودیوں کے تالمود کو اٹھا لیجئے۔ ہندوؤں کے شاستروں کو دیکھئے۔ ایک ایک رسم کی ادائیگی میں کتنی کتنی جانکاہ پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ ان کے ہاں مذہب کی کوئی مراد ھا ناچ نہیں سکتی جب تک نو من تیل نہ ہو۔ قرآن نے حضورؐ کی بعثت کا مقصد . . . یہ بتایا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)، کہ وہ رسولؐ کافۃ للناس۔ انسانوں کو اس بوجھ سے آزاد کر دے گا جس کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے اور ان اطواق وسلاسل کو اتار کر پھینک دے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ یہ اطواق وسلاسل، ملوکیت کا استبداد اور برہمنیت (Preist hood) کی رسوم پرستیاں تھیں۔ حضورؐ نے ان اطواق وسلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا لیکن مسلمانوں نے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے شرگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور اپنے احبار و رہبان کے مقدس ہاتھوں سے . . . اپنی گردنوں میں ڈال لیا اور ان غیر فطری قیود کا نام دین قرار دے لیا۔ یہ "دین" بھلا زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دے سکتا تھا؟ لہٰذا جو مسلمان ان قیود سے تنگ آئے انھوں نے ان اطواق وسلاسل کو اس زور سے اتار کر پھینکا کہ ان کے ساتھ ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی۔ قرآن) کا قلاوہ بھی ان کی گردنوں سے نکل گیا۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ جو قفس کی تیلیوں میں بند ہیں تو اس طرح کہ انہیں آزادی کی فضا میں ایک سانس تک لینا نصیب نہیں اور جو آزاد . . . ہیں تو ایسے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑ رہے ہیں لیکن آشیانہ کہیں میسر نہیں۔

قرآن کہیں نہیں

یوں وہ فروعات و جزئیات جنہیں ابدی طور پر ناقابلِ تغیر رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصودِ رسالتؐ دین بن گئیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اس وقت تک چلا آ رہا ہے۔ وہی فرقہ بندیاں، وہی گروہ سازیاں، وہی عملی برہمنیت (PRIEST HOOD) اور وہی ان کی اسلاف پرستی، وہی تقلید جامد اور وہی اس کے افسردہ نتائج۔ آپ کسی معاملہ کے متعلق اہل حدیث حضرات سے پوچھئے وہ کہہ دیں گے کہ بخاری میں یوں آیا ہے۔ مسلم کی روایت یہ ہے اور کسی اہل فقہ سے پوچھئے تو جواب ملے گا کہ المبسوط میں یہ لکھا ہے۔ اور شامی میں یوں آیا ہے۔ عالمگیری کا یہ فتویٰ ہے۔ فلاں امام کا یہ قول ہے۔ کوئی یہ نہیں کہیگا کہ قرآن نے یہ حکم دیا ہے۔ اس لئے کہ قرآن سب کے نزدیک ساقط العمل ہو چکا ہے اور اس لئے مہجور و محجوب۔ اس اشخاص پرستی سے تنگ آ کر آج سے کچھ عرصہ پہلے بعض لوگوں نے رجعت الی القرآن کی آواز بھی اٹھائی لیکن چونکہ یہ چیز ان کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھی کہ قرآن نے جن جزئیات کو متعین نہیں کیا انہیں کس طرح سے متعین کیا جائے گا۔ اس لئے وہ اس اعتراض سے گھبرا کر کہ اگر قرآن ہی دین کی تکمیل کے لئے کافی ہے تو اس میں سے فلاں فلاں بات کی تفصیل نکال کر دکھاؤ گے قرآن سے ان جزئیات کو بھی متعین کرنے

کہ اس نے صرف اصول دیئے تھے۔ وہ اس کوشش ناکام وناصواب میں ایسے الجھے کہ ٹھکانے کی بات کچھ بھی نہ کرسکے اور خود
فرقہ (اہل قرآن) بن کر رہ گئے۔
اسے پھر سن لیجئے کہ

(۱) قرآن نے جن جزئیات کو خود متعین کر دیا ہے وہ قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر و تبدل ہیں (اور ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے)

(۲) باقی امور کے لئے اس نے اصول مقرر کئے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی حکومت اسلامی (یاد رکھئے افراد نہیں بلکہ حکومت جو قرآنی اصول مشاورت کی رو سے قائم کی جائے) اپنے زمانے کے مقتضیات کے مطابق، عقل کی روشنی میں ان کی جزئیات خود متعین کرے گی۔ اور یہی جزئیات اس زمانے کیلئے نظام شریعت قرار پائیں گی۔ ان جزئیات کی تعیین میں، ہر زمانے کی قرآنی حکومت، ان کوششوں کو بھی سامنے رکھے گی جو اس سے قبل مختلف ادوار کی اسلامی حکومتوں نے (اور مختلف افراد نے) اس باب میں کی ہیں۔ اس بنا پر مجموعۂ احادیث اور کتب فقہ سے بطور نظائر (PRECEDENTS) فائدہ اٹھایا جائیگا ان میں جو باتیں قرآنی اصولوں کے مطابق ہوں گی اور موجودہ زمانے کے تقاضے ان میں تغیر و تبدل کے متقاضی نہ ہوں گے وہ علیٰ حالہٖ رکھ لی جائیں گی۔ یا ان میں مناسب تغیر و تبدل کر کے از سر نو رائج کیا جائیگا۔ باقی خود متعین کی جائیں گی۔

کھشتری اور برہمن

مذہب کو ایک پرائیویٹ حیثیت دے کر اسے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا جو سلسلہ، دینی لامرکزیت اور ملت کا شیرازہ بگڑنے کے زمانے سے شروع ہوا تھا وہ آج تک جاری ہے اپنے زمانے میں دیکھئے۔ دنیا میں متعدد "اسلامی سلطنتیں" موجود ہیں لیکن ہر جگہ دین اور دنیا کی ثنویت (DUALISM) کا نظام کارفرما ہے۔ حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہے اور مذہب علماء کے تسلط میں، اور دونوں کا استبداد عوام کے اذہان و قلوب پر مسلط۔ چونکہ ارباب ملوکیت اور عمائد مذہب کے مفاد مشترک ہیں اس لئے ان دونوں میں اس قسم کی ملی بھگت ہے جس طرح کھشتری راجاؤں اور برہمنوں میں تھی۔ راجہ، برہمنوں کی رکھشا (حفاظت) کرتے تھے اور برہمن، راجاؤں کو اشیرباد (سلامتی کی دعائیں) دیتے تھے اور دونوں مل کر عوام کو ملوکیت کے آہنی پنجے میں جکڑے رکھتے تھے۔ یہی حالت ہمارے ہاں کی ملوکیت میں تھی۔ بادشاہ علماء کو قاضی اور مفتی بنا دیتے تھے اور علماء بادشاہوں کو ظل اللہ بتا کر خطبوں میں ان کے نام صلوٰۃ و سلام کے ساتھ لیتے تھے اور عوام بیچارے ان دونوں کے تغلب و استبداد کے نیچے کچلے جاتے تھے۔ یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ غضب خدا کا۔ آج دنیا میں شخصی حکومتیں کہیں باقی نہیں رہیں بجز مسلمانوں کی حکومتوں کے۔ جس طرح بردہ فروشی کہیں باقی نہیں بجز مکہ کی گلیوں کے۔ غور کیجئے یہی علماء ایک طرف ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ جرم عظیم جس کی وجہ سے یزید مستحق لعنت سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ اس نے سلطنت کو انتخاب کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ باپ سے وراثتاً پایا تھا اور اس طرح خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا تھا۔ لیکن

احادیث میں یزید کے متعلق بھی عجیب چیز ملتی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کریگا بخشا ہوا ہے (مغفور لہم) اور طبری کا بیان ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے اس کے ایک دستے کا سپہ سالار خود یزید تھا۔

ملوکیت اور ملائیت

دوسری طرف حالت یہ ہے کہ بنی امیہ سے لیکر آجتک ان تمام بادشاہوں کی جنھوں نے سلطنت کو یزید ہی کی طرح وراثتاً حاصل کیا تھا اور آج بھی جو اسی طرح تخت وتاج کے مالک بنے بیٹھے ہیں علمار کی طرف سے تائید ومحافظت حاصل رہی ہے۔ (اور آج بھی ہے) بادشاہ ان کی پرورش کرتے تھے اور یہ بادشاہوں کے تخت وتاج کی حفاظت کرتے تھے۔ اور آج تک یہی سلسلہ جاری ہے۔ قرآن کا نظام نہ وہ نافذ کرنا چاہتے ہیں نہ یہ۔ اسلئے کہ اس نظام میں نہ ملوکیت باقی رہ سکتی ہے نہ ملائیت (PRIEST HOOD) قرآن ان دونوں کا خاتمہ کردیتا ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اطاعت صرف ایک خدا کے قانون کی اور بس۔ اور اس کا ذریعہ ملت کے منتخب کردہ بہترین افراد پر مشتمل مجلس شوریٰ اور ان میں کا منتخب کردہ بہترین فرد امام جو قرآن کے قانون کو دنیا میں نافذ کردے۔ یہ نظام جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ان حکومتوں میں نافذ نہیں ہو سکتا جن پر اس وقت مسلمان بادشاہوں کا تسلط ہے اور جن کی محافظت علمار کے اوراد و فتاویٰ سے ہورہی ہے۔ اس نظام کے نفاذ کی ابتدا اگر کہیں ہوسکتی ہے تو وہ سرزمین پاکستان ہی ہے اس لئے کہ اس پر ابھی شخصی ملوکیت کا تغلب نہیں ہوا۔ اس میں جس انداز کی حکومت ہم چاہیں رائج کرسکتے ہیں۔ لہذا پاکستان کا خطۂ ارض ایک تجربہ گاہ ہے جس میں قرآن کا وہی نظام جو سب سے پہلے محمد رسول اللہ والذین معہٗ (علیہم التحیۃ والسلام) کے مقدس ہاتھوں سے سرزمین حجاز میں نافذ ہوا تھا بار دگر رائج ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر یہاں دستورسازی کا کام ان لوگوں کے سپرد ہوگیا جو ان جزئیات کو ناقابل تغیر وتبدل سمجھتے ہیں جو کہیں ہزار برس پہلے، اس زمانے کی تمدنی ضروریات کے پیش نظر وضع کی گئی تھیں یعنی ہمارے علمار کرام) ... تو یہاں بھی دوصورتوں میں سے ایک صورت ناگزیر ہوگی۔ یعنی

(۱) جو نظام یہ حضرات پیش کریں گے وہ ناممکن العمل بھی ہوگا اور بیحد متنازعہ فیہ بھی[۱]، اس لئے قوم سرے سے دینی نظام ہی سے اظہار برأت کردیگی اور ترکوں کی طرح حکومت کی بنیاد خالص دنیاوی قوانین پر رکھ لے گی اور یا

(۲) وہ پارٹی جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار وحکومت ہوگی، ان سے مصالحت کرکے مذہب ان کے سپرد کردے گی اور ان کی عباؤں اور قباؤں کے سائے میں اپنی من مانی حکومت چلائے گی۔ اس طرح علمار کی سیادت بھی قائم رہے گی اور ارباب قوت کی قیادت بھی۔ لیکن دین کا قیام نہ اِس صورت میں ہوسکے گا نہ اُس صورت میں۔

اب آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ میں نے جب یہ بحث چھیڑی تھی کہ نقہ یا روایات قیامت تک کیلئے ابدی دین نہیں بن سکتیں تو وہ محض نظری مباحثہ نہ تھا بلکہ ایک خالص عملی نتیجہ کی طرف دعوت دینے کی تحریک تھی۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ارباب فکر ونظر سوچیں کہ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو غلط نظام' دین کے نام سے' مسلمانوں پر اتنی صدیوں سے مسلط چلا آرہا ہے اور جس نے ان کی حالت یہ کردی ہے کہ

---

[۱] متنازعہ فیہ کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علمار کا تمام گروہ اس ہزار برس میں اتنی سی بات کا فیصلہ نہیں کرسکا کہ نماز میں ہاتھ کھلے چھوڑنے چاہئیں یا باندھنے اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس جگہ۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ کوئی متفقہ علیہ ضابطۂ آئین تیار کردیں گے اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ پورا نظام تو ایک طرف یہ تو کسی ایک مسئلہ کا بھی متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ شیعہ کا جواب اور، سنی کا اور، مقلد کا اور، غیر مقلد کا اور، ان کے ہاتھ میں نظام شریعت کی تدوین کا کام دیکر قوم مصیبت میں پھنس جائے گی۔

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

قرآنی نظام

وہی نظام اب آزاد پاکستان میں ان پر مسلط کر دیا جائے۔ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ نے جب انھیں یہ آزاد خطۂ زمین موہبت فرمایا ہے تو اس میں پھر اس قرآنی نظام کو رائج کیا جائے جسے چشمِ فلک نے ایک مرتبہ دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔ اس نظام قرآنی کی تشکیل و ترویج کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کی تعلیم بڑی واضح، بین اور تضاد و تعارض سے پاک ہے۔ وہ عقلِ انسانی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ہر زمانے کے انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ اس کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنے فہم و تدبر سے اپنے لئے آپ قانونی جزئیات مرتب کریں۔ اس سے زیادہ آسان اور عقلِ انسانی کے عین مطابق اور کونسا نظام ہوگا! کہ

نہ جس میں عہدِ کہن کے فسانہ وافسوں نہ جس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
وہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں حقائقِ ابدی پر مدار ہے جس کا
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں طلوع ہے صفتِ آفتاب جس کا غروب
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

مخالفت

میں جانتا ہوں کہ اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے جو دین کے خلاف ہو بلکہ اس لئے کہ اس سے ہمارے "اربابِ شریعت" کو اپنی عظمت و عقیدت کی مسندیں چھن جانے کا خوف ہے۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو نظامِ شرعی کی تنفیذ و ترویج کا مطالبہ ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں رہے۔ لیکن وہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے یہ کہہ کر اس دعوت کی مخالفت کریں گے کہ دیکھئے! یہ ایسا نظام وضع کرنا چاہتے ہیں جس میں رسول اللہؐ کی حدیثوں ہی سے انکار ہو رہا ہے[1]۔ حالانکہ اس نظام میں حدیثوں سے انکار نہیں بلکہ انھیں ان کے اس مقام پر رکھنا ہے جو مقام خود منشائے رسالتؐ تھا۔ رسول اللہؐ کا یہ منشا کبھی نہ تھا کہ حضورؐ کے ہنگامی اور وقتی فیصلے قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر سمجھ لئے جائیں۔

روایات

اگر حضورؐ کا یہ منشا ہوتا تو جس طرح آپ قرآن کو لکھوا کر بحفاظت ملت کے سپرد کر گئے تھے اپنی متعین فرمودہ جزئیات کا مجموعہ بھی اسی طرح لکھوا کر بحفاظت ملت کو دے جاتے۔ لیکن رسول اللہؐ اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو دے کر نہیں گئے ان روایات کو لوگوں نے اپنے طور پر جمع کیا اور وہ بھی حضورؐ کی وفات کے سینکڑوں برس بعد۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں ان میں سے کسی حدیث کے متعلق بھی کوئی شخص قطعی اور حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقعہ

---

[1] یہ مضمون جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس قرآنی تصورِ حکومت کی جس قدر مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

رسول اللہ ہی کا ارشاد ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، احادیث کا صحیح ترین مجموعہ بخاری کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ احادیث امام بخاریؒ نے رسول اللہؐ سے دو اڑھائی سو سال بعد، لوگوں کی زبانی سن کر جمع کیں۔ اڑھائی سو سال کے عرصہ میں سنی سنائی باتیں جس قدر قابل اعتماد رہ سکتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حالانکہ صورت یہ تھی کہ حضورؐ کے بہت بعد نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے سامنے ایسی احادیث آجاتی تھیں جنھیں وہ دیکھتے تھے کہ قرآن کے خلاف ہیں اس لئے وہ انھیں رد کر دیتے تھے۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاق بائنہ پائی ہوئی عورت کے لئے شوہر کے ذمہ نہ مکان ہے نہ نفقہ۔ جب حضرت عمرؓ کے سامنے آئی تو آپ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی بات کیسے مان لی جائے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جب بدر والی حدیث بیان کی کہ مردے سنتے ہیں تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ ابن عمرؓ پر رحم کرے۔ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ مردے نہیں سن سکتے۔ اسی طرح جب آپ کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مردہ پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو آپ نے کہا کہ یہ حدیث غلط ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ سو جب خود صحابہؓ کے زمانے میں اس قسم کی احادیث مروج ہو گئی تھیں تو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ان کی جو کیفیت ہو گئی ہو گی وہ ظاہر ہے۔ بالخصوص جب اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ نادانستہ

وضعی احادیث

نہیں بلکہ خاص مقاصد کے ماتحت جھوٹی حدیثیں اس کثرت سے وضع کی جایا کرتی تھیں کہ پناہ بخدا۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ عبدالکریم ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرام اور حلال کے احکام ہیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس قسم کے ہزاروں واضعین احادیث اس عرصہ میں پیدا ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے صحیح ترین مجموعوں میں بھی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن پر دین ہنستا ہے اور عقل روتی ہے۔ کہیں ان میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے پاس جب ملک الموت آیا تو آپ نے اس کے ایسا تھپڑ مارا جس سے اس کی آنکھ باہر نکل پڑی۔ یا حضرت موسیٰ اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ کر نہا رہے تھے کہ پتھر کپڑے لیکر بھاگ اٹھا اور آپ اس کے پیچھے ننگے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یا یہ کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک رات میں نوّے بیویوں سے مقاربت کی۔ یا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ اور کہیں اس قسم کی احادیث کہ جس سے خود شانِ نبوت پر حرف آجائے۔ مثلاً یہ کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا تھا جس سے آپ کو نسیان ہو گیا تھا۔ یا حضورؐ نے پیٹ کی بیماری میں اونٹوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا اور قتل کے جرم میں ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا اور وہ پیاس سے تڑپ رہے تھے لیکن انھیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ یا اس قسم کے اساطیر کہن (MYTHOLOGY) کی باتیں کہ حضرت آدمؑ کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ جبرئیل و میکائیل جنگ بدر میں سفید کپڑے پہنے ہوئے حضورؐ کی طرف سے لڑتے تھے۔ شیطان حضرت ابوہریرہؓ کی محافظت میں رکھے ہوئے مال کو چرانے آتا تھا اور آپ اس کی بہانہ سازیوں پر یقین کر کے اسے چھوڑ دیتے تھے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں بیل اور بھیڑیا انسانوں کی طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ مرغ جب بولتا ہے تو فرشتے کو دیکھتا ہے اور گدھا بولتا ہے تو شیطان کو دیکھتا ہے۔ یا حضرت ابن عمرؓ کے پاس ریشم کا ایک ٹکڑہ تھا، آپ جہاں جنت میں پہنچنے کا ارادہ کرتے وہ اڑا کر پہنچا دیا کرتا تھا۔ یا رسول اللہؐ کو ایک درخت نے بتایا کہ جنات آپ سے قرآن سن کر گئے ہیں۔

سب حدیثیں بخاری شریف میں موجود ہیں۔ اور یہ تو یونہی چند مثالیں ہیں۔ حدیثوں کے تمام مجموعے اس قسم کی حدیثوں سے بھرے پڑے ہیں۔

حدیثوں کے اس قدر ظنی ہونے کی وجہ سے ہی امام ابو حنیفہؒ ان احادیث کو بھی مسترد کر دیا کرتے تھے جو قیاس صحیح کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ جب سفر میں جاتے تو قرعہ ڈالتے اور ازواج مطہرات میں جس کے نام قرعہ نکلتا انھیں ساتھ لے جاتے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیا کہ قرعہ اندازی تو اصولاً قمار بازی ہے اس لئے اس حدیث کو کیسے صحیح مان لیا جائے۔ یا مثلاً جب کسی نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری جدا نہ ہوں انھیں بیع کے فسخ کرنے کا حق رہتا ہے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اگر یہ دونوں ایک ہی قید خانہ میں ہوں یا ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے ہوں تو اس صورت میں بیع پختہ ہی نہیں ہو سکے گی۔ وقس علیٰ ہذا۔

وقت کے تقاضوں کی بنا پر احکام میں اجتہاد کی تو ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں صحابہؓ نے دین کی اس لم کو کس قدر صاف طور پر سمجھا تھا۔ قرآن میں چوری کی سزا قطع ید ہے لیکن اس کا تعین نہیں کہ چور کسے کہا جائے گا۔ ایک مرتبہ قحط پڑا اور کچھ لوگوں نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کر لی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں قطع ید (ہاتھ کاٹ دینے) کی سزا نہیں دی۔

میں نے ان مثالوں کو اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ نظام اسلامی کی تدوین کیلئے جس مسلک کی طرف میں نے دعوت دی ہے اس میں احادیث کو ان کے اصلی مقام پر رکھا جائے گا۔ اسلئے اس باب میں غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر راہ حق وصداقت کو چھوڑ نہیں دینا چاہئے

پس چہ باید کرد

ان تصریحات کے پیش نظر کرنے کا کام یہ ہے کہ مجلس دستور ساز ملت کے منتخب ارباب فکر ونظر کی ایک ایسی کمیٹی متعین کرے جس میں ماہرین قوانین ودساتیر عالم اور وہ حضرات شامل ہوں جو قرآن وتاریخ دین پر غائر نگاہ رکھتے ہوں۔ ماہرین قوانین یہ تجویز کریں کہ پاکستان کی حکومت کے لئے کون کون سی شقوں پر مشتمل ضابطہ قانون کی ضرورت ہے۔ پھر قرآن اور تاریخ دین جاننے والے حضرات اس خاکہ کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ

(۱) ان میں کون کون سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق قرآن نے فروعات وجزئیات تک متعین کر دی ہیں۔ اور

(۲) کون کون سی ایسی ہیں جن کے متعلق صرف اصولی حکم دیا ہے۔

شق ثانی کے متعلق وہ غور کریں کہ اس قسم کے مسائل اس سے پیشتر نبی اکرمؐ کے زمانے سے لیکر بعد تک کبھی سامنے آئے ہیں۔ اور اگر آئے ہیں تو ان کے متعلق کیا روش اختیار کی گئی۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ روش کیا آج بھی نافذ العمل ہو سکتی ہے یا موجودہ زمانے کے مقتضیات اس میں تغیر وتبدل چاہتے ہیں۔ اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ ہو تو اسے علیٰ حالہ رہنے دیا جائے ورنہ اس میں حسب اقتضایات زمانہ مناسب ردوبدل کر دیا جائے۔ اس ردوبدل میں یہ اصل ہر وقت پیش نظر رہے کہ کوئی 'فرع' قرآن کی اصل سے کہیں متعارض نہ ہو۔ یہ مجموعۂ قوانین، ملت اسلامیہ پاکستانیہ کا ضابطہ نظام شریعت ہوگا اور اس میں مزید ضروریات کے ماتحت حسب حال تغیر وتبدل ہوتا رہے گا۔ یہ فریضہ تمام ملت کا مشترکہ ہے جسے ملت اپنے منتخب کردہ حضرات کے سپرد کرے گی۔ اس میں کسی خاص جماعت کی اجارہ داری نہیں ہوگی۔ قوانین شریعت یا ان کی تعبیر وتفسیر افراد کے ذمے نہیں رکھی جائے گی اس لئے "پرائیویٹ علماء" کی

ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ قوانین کی ترتیب وتدوین بھی اصولِ جمہوری کے ماتحت، ملت کا مشترکہ فریضہ ہوگا اور ان کی تنفیذ و ترویج یا تعبیر وتفسیر (INTERPRETATION) بھی ملت کی قائم کردہ حکومت ہی کے ذمے ہوگا۔ وہیں کا فیصلہ فتویٰ کہلائے گا۔

مجھے تسلیم ہے کہ یہ تجربہ چونکہ ایک مدت کے بعد دہرایا جارہا ہے اس لئے شروع شروع میں جو قانون بنے گا اس میں شاید خامیاں رہ جائیں۔ لیکن ان خامیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے ہمارا یہ قدم صحیح راستے پر ہوگا اور آہستہ آہستہ تجربے کے بعد یہ خامیاں بھی رفع ہوتی جائیں گی۔ اور پھر ایک دن ہم ساری دنیا کو یہ کہنے کے قابل ہوجائیں گے کہ یہ ہے وہ نظامِ زندگی جسے خالقِ کائنات نے انسانیت کی نشوونما کے لئے متعین فرمایا تھا اور جو ارتقائے شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ وہ دن ہوگا جب زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ واشرقت الارض بنور ربھا۔ اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ

برخیز کہ آدم را، ہنگام نمود آمد　　　این مشتِ غبارے را، انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں "اسلامی نظام" کی افادیت، ہمہ گیریت، فوقیت اور افضلیت سے بحث نہیں کی۔ اس لئے کہ یہ پہلو موضوعِ پیشِ نظر سے خارج ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلامی نظامِ شریعت سے مفہوم کیا ہے اور اس کی ترتیب وتشکیل کس طرح عمل میں آئے گی۔ باقی رہا یہ کہ یہ نظام کیا نتائج پیدا کرے گا اور وہ نتائج کس طرح مترتب ہوں گے۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ایک نکتہ واضح طور پر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اور وہ یہ کہ

عقلِ انسانی کا مقام

اس نظام میں کس طرح انسانی عقل کو اس کا صحیح مقام عطا کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف اسی ایک جہت سے ہی دیکھا جائے تو بھی اسلامی نظام کی عظمت نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ جب سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے "مذہب اور عقل کی کشمکش" ہمیشہ اس کے سامنے رہی ہے۔ دنیائے مذہب نے ہر بار یہی پکارا کہ اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی حدیں ماورائے سرحدِ ادراک سے شروع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عقل کو ہمیشہ یہی دعویٰ رہا کہ انسانی زندگی کے فیصلوں کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ وہ اپنے اس حق میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کرسکتی اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں قرآن ایک ایسا سنگِ میل ہے جہاں سے فی الواقعہ ایک نئے اندازِ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے عقل اور مذہب کے صحیح حدود متعین کرکے ان میں اس قسم کی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ وہ دو متضاد و متخاصم عناصر ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون و رفیق بن گئے ہیں۔ قرآن کے اوراق کو الٹتے جائیے شروع سے اخیر تک آپ دیکھیں گے کہ وہ عقل و بصیرت، فہم و فراست، علم و دانش، تدبر و تفکر کو کس طرح وجہِ شرف و تکریم قرار دیتا ہے۔ وہ مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک صاحبانِ دانش و بینش، اولی الابصار و اولی الالباب ہی وہ لوگ ہیں جو اس کے پیغام کو سمجھنے اور اسے بروئے کار لانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس، عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو وہ "بدترین خلائق" قرار دیتا ہے۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون ﴿﴾ (یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کچھ کام نہیں لیتے)

اس کے نزدیک ایسے انسان اس قابل ہی نہیں کہ انھیں انسانوں کے زمرہ میں شامل کیا جائے۔

ولقد ذرأنا لجھنم کثیرا من الجن والانس لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم آذان لا یسمعون بھا اولئک کالانعام بل ھم اضل ط اولئک ھم الغافلون ○ (۱۷۹)

کتنے ہی جن وانس ہیں جنھیں ہم نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے (یعنی ان کے اعمال کے بدلے ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس قلب ودماغ ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ عقل ودانش کو الگ رکھ کر حیوانوں کی طرح ہوگئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے، یہ وہ لوگ ہیں جو (دنیا وما فیہا سے) بے خبر زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ چونکہ عقل کا فطری منصب تحفظ ذات (PRESERVATI-N OF SELF) ہے۔ یعنی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس فرد کی طبعی زندگی کو محفوظ رکھے جس کی وہ پاسبان ہے۔ اسلئے جس وقت مختلف افراد کے مفاد آپس میں ٹکرائیں گے۔ (اور ایسا تصادم، اجتماعی زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے) اس وقت ان افراد کی عقول کی باہمی جنگ لازمی ہے۔ اسی کو (BATTLE OF WITS) کہتے ہیں۔ یعنی عقل انسانی، صرف افراد کے حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔ انسانیت کے مفاد کلی کا تحفظ اس کے حیطۂ فراست سے باہر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ افراد کی عقل کو ایسی حدود کے اندر رکھا جائے جس سے وہ انسانیت کے مفاد کلی کے لئے ضرر رساں نہ ہوسکے۔ ان ہی حدود کا نام وہ اصولی قوانین ہیں جو قرآن نے انسانی زندگی کی راہنمائی کے لئے متعین کئے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے عقل انسانی کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ تسخیر کائنات میں اپنی تمام قوتیں صرف کردے۔ یہ ہے "عقل اور مذہب میں وہ تطبیق وموافقت جسے قرآن نے پیدا کیا"۔[1] اس کے نزدیک عقل آنکھ ہے اور قرآنی اصول، سورج کی روشنی۔ نہ آنکھ روشنی کے بغیر اپنا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے اور نہ روشنی آنکھ کے بغیر کسی مصرف کی ہے۔ عقل کو الگ کرکے انسانوں کی دنیا پتھروں کا ڈھیر بن جائے گی لیکن عقل کو چھوڑ کر، یہ دنیا درندوں کے بھٹ میں تبدیل ہوجائے گی۔ عقل وفکر سے کام نہ لینے والے، قرآن کے نزدیک انسانی زندگی کی سطح سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن عقل سرکش اور علم بیباک کا نام اس کی زبان میں ابلیسیت اور شیطانیت ہے۔ عقل، جب ان ابدی اصولوں کی رفاقت میں کام کرتی ہے جنھیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے تو اس سے یہ دنیا اس جنت میں تبدیل ہوجاتی ہے جس کی تلاش میں آدم اتنے عرصہ سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسلامی نظام عقل اور ابدی اصولوں میں یہی رفاقت وتعاون پیدا کرتا ہے۔ ملائیت (PRIESTHOOD) کی افیون عقل کو سلب کرتی ہے اور ملوکیت کا استبداد، ان ابدی اصولوں کی جگہ، انسان کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کراتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسانی زندگی کے خلاف اور احترام آدمیت کی نقیض ہیں۔ ان کے برعکس اسلامی نظام حکومت عقل کو اجاگر کرتا ہے اور اسے اس نور مبین (کھلی کھلی روشنی) میں چلاتا ہے جو اس کی راہنمائی کے لئے قرآنی آفتاب کی کرنوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج بلکہ رفاقت سے شرف انسانیت بلند سے بلند تر ہوتا ہوا زمین کی پستیوں سے آسمان کی رفعتوں

---

[1] اس امر کی تفصیل معارف القرآن کی جلد دوم میں ملے گی۔

طرف ابھرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہیں اسلامی نظام کے صحیح نتائج۔

لیکن اس حقیقت کو بھی یاد رکھئے کہ کوئی نظام اپنے صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اسے چلانے والے اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کریں۔ باہر کی دنیا کا انقلاب، اندر کی دنیا کے انقلاب کا عکس ہوا کرتا ہے۔ قرآنی نظام میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ دل کی دنیا میں تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر یہی تبدیلیاں اس نظام کو بطریقِ احسن چلائے جاتی ہیں اس طرح ایک ایسا دائرہ (CYCLIC ORDER) قائم ہو جاتا ہے جو خود اپنے زور دروں (MOMENTUM) سے متحرک رہتا ہے۔ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور اس نظام میں فرد اور جماعت کا کیا تعلق ہوتا ہے یہ چیزیں کسی دوسرے وقت عرض کروں گا[1]۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ جس اسلامی نظام کے لئے چاروں طرف سے پکار ہو رہی ہے وہ ہے کیا اور آج اسے مرتب کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے میں نے گذشتہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

بعض مقامات کی مزید وضاحت

[مندرجہ صدر مضمون جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں اپنے مخصوص سلسلۂ مقالات "سلیم کے نام خطوط" کے ضمن میں اس مضمون کے بعض اہم مقامات کی مزید توضیح فرمائی۔ وھوہذا۔ طلوع اسلام]

تمہارا خط ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس خط کا اُس دن سے انتظار کر رہا تھا جس دن تمہیں طلوعِ اسلام کا وہ پرچہ بھیجا ہے جس میں "اسلامی نظام" سے متعلق میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس لئے تم نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ غیر متوقع نہیں اور نہ ہی وہ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ جو ان شبہات کا محرک ہوا ہے سلیم! تم ابھی نہیں جانتے کہ جو عقیدہ کسی قوم میں صدیوں سے متوارث چلا آ رہا ہو اور توارث اور ماحول کے موثرات سے انسانی تحت الشعور (SUB-CONSCIOUS MIND) کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہو وہ کس طرح مبنی علی الحقیقت نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اس قسم کے عقیدہ کی تائید میں دلائل و براہین بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہ دلائل و براہین ذہنِ انسانی کے بعد کے تراشیدہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس عقیدہ کو ان دلائل و براہین کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ عقل کا منصب تحفظِ ذات (PRESERVATION OF SELF) ہے اور شکستِ پندار خواہ وہ علمی اور نظری میدان ہی میں کیوں نہ ہو، ضعفِ ذات کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے عقل، ہر اس عقیدہ کے لئے جو انسان نے غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہو دلائل و براہین وضع کرتی رہتی ہے تاکہ فریقِ مقابل سے شکست کھا کر انسان کی ذات میں احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) نہ پیدا ہو جائے کہ احساسِ کمتری جذبۂ مرعوبیت کا موجب بنتا ہے اور جذبۂ مرعوبیت ضعفِ ذات کا سبب۔ اس لئے جب کبھی انسان کے سامنے کوئی

---

[1] اس ضمن میں "سلیم کے نام خطوط" کا سلسلہ دیکھئے جو طلوع اسلام میں شائع ہوتا چلا آ رہا ہے۔

ایسی بات آئے جس سے اس کے کسی عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو تو عقل کی طرف سے پہلا ردعمل اس نئے نظریئے یا اصول کی تردید ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر اختیار کردہ عقائد کو منزہ عن الخطا سمجھ کر ان کے گرد حصارِ عافیت کھینچنے کی کوشش کا نام تقلیدِ اعمیٰ ہے جو صحیح علم و بصیرت کی بدترین دشمن اور ہر دعوت الی الحق اور حرکت انقلاب کی اولین مخالف ہوتی ہے۔ آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے ہر داعی الی اللہ کی دعوت حق و صداقت کے جواب میں یہی کیا گیا کہ جو عقائد ہمارے آباؤ اجداد سے متوارث چلے آرہے ہیں ہم انھیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ (وکذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا آباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ آثارھم مقتدون۔ ۴۳/۲۳)۔ اسی طرح، اے رسولِ عربی! ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے سہل انگار طبقہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے ہیں)۔ لیکن سلیم! ذرا سوچو کہ کسی عقیدے کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپِ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملے ہوں یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انھیں فنا کر دیا جائے تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے۔ حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحیٔ مبین کی شکل میں ہماری رشد و ہدایت کیلئے ہمیں عطا کی گئی ہے لہٰذا میں نے جو کچھ کہا ہے اسے اس ازلی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو اور پھر نتیجہ پر پہنچو۔ یہ کہدینے سے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو جمہور کو اسلاف سے ملا ہے نہ جمہور کے اس موروثی عقیدہ کو صحیح قرار دیسکتا ہے نہ میرے معروضات کا ابطال کر سکتا ہے صحت و سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے، نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اسے کہو کہ اس کیلئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

سلیم! بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ بڑھانے کو جتنی جی چاہے بڑھائے جایئے لیکن سمجھنے کے لئے بالکل واضح اور سادہ۔

ہم عشق کے ماروں کا، اتنا سا فسانہ ہے　　سمٹے تو مرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

تم تھوڑی دیر کے لئے یوں کرو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھی بھول جاؤ اور جو عقیدہ تمہیں وراثتاً ملا ہے اسے بھی الگ رکھ دو (ثم تتفکروا) پھر از خود غور کرو کہ قرآن تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا متعین ہے لیکن شراب کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اب اس سے یا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن، شراب خواری کو جرم ہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس کی سزا تجویز نہیں کی گئی لیکن یہ نتیجہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے کہ

(۱) قرآن کی رو سے خمر (شراب) رجس من عمل الشیطان (۵/۹۰) ہے یعنی ناپاک فعل شیطانی۔

(۲) زنا کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ انہ کان فاحشۃ (۱۷/۳۲) وہ فحش کاری ہے۔

اور (۳) شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے۔ فانہ یأمر بالفحشاء والمنکر (۲۴/۲۱)

اس لئے شراب بھی فواحش میں سے ہوئی (کیونکہ شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے اور شراب (خمر) شیطانی عمل ہے۔ اس لئے جس طرح زنا

فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم، اسی لئے شراب فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ منشائے قرآنی یہ ہے کہ شراب (خمر) کی کوئی سزا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شراب (خمر) کی سزا ضروری ہے تو قرآن نے اس کی سزا متعین کیوں نہیں کی جس طرح زنا کی سزا متعین کردی ہے۔

ایک غیر مسلم معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص کتاب ہے۔ وہ کسی جرم کی سزا متعین کر دیتا ہے کسی کو غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جن جرائم کی تعزیر (یعنی اجمال کی تفصیل) قرآن نے متعین نہیں کی، ان کی تعیین رسول اللہؐ نے کردی ہے اور اس طرح کتاب اللہ کی تکمیل ہوئی ہے اس کا نام سنت قرار دیا جاتا ہے[1] اور دین سے مفہوم ہوتا ہے قرآن اور سنت۔

لیکن ذرا سوچو سلیم! کیا اس سے اس اعتراض کا واقعی جواب مل جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے! اعتراض یہ تھا کہ کیا خدا خود اِن چیزوں کی تعیین نہیں کرسکتا تھا جو اُسے انھیں اس طرح غیر متعین چھوڑ کر دوسروں سے تکمیل کرانی پڑی؟ اسے کونسا امر مانع تھا کہ جس طرح زنا کی سزا متعین کردی تھی اسی طرح شراب (خمر) کی بھی تجویز کردیتا۔ یا جس طرح روزوں کے مہینے اور اوقات کی تخصیص کردی تھی زکوٰۃ کی شرح بھی مقرر کردیتا۔ مقام رسالت کی اس عظمت و رفعت کے باوجود جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ـــــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــــ ذاتِ خداوندی کے متعلق یہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اس نے ان تفاصیل و جزئیات کی خود تکمیل کیوں نہیں کی؟ یہ اعتراض ایسا قوی تھا کہ اس کے لئے ایک آفاقی سہارا ڈھونڈھنا پڑا۔ یعنی یہ عقیدہ وضع کرنا پڑا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے مجموعہ کا نام قرآن ہے (اسے وحیٔ متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحی وہ جو قرآن سے باہر، رسول اللہؐ کی روایت میں ہے (اسے وحی غیر متلو کہتے ہیں کیونکہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ اس عقیدہ سے اس اعتراض کا جواب یوں مل گیا کہ ان جزئیات کی تعیین بھی خود خدا ہی نے کردی ہے۔ البتہ وہ اصل کتاب (قرآن) میں نہیں بلکہ روایات کے مجموعوں میں ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ یہ دلیل (یا عقیدہ) کس طرح بداہتًا غلط اور درایتًا کمزور ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وحی کی اس تقسیم کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ وہاں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں ہے ـــ واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک۔ لامبدل لکلماتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا۔ (۱۸/۲۷) "تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدل نہیں سکتا۔ (اور اگر تو بھی بفرضِ محال ایسا کرے تو) اس کے سوا تو کہیں پناہ نہ پائے گا۔" سارے قرآن میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ خارج از قرآن وحی کہیں اور بھی ہے یا وحی کی کوئی دوسری قسم بھی ہے۔ البتہ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (متلو اور غیر متلو) اور وہیں سے یہ عقیدہ مسلمانوں نے مستعار لیا۔ (اس کی تفصیل تم نے معراج انسانیت کے باب ظہر الفساد میں دیکھ لی ہوگی)۔

---

[1] چونکہ شراب کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجویز نہیں فرمائی بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ نے متعین کی ہے اسلئے سنت کا مفہوم اور بھی وسیع کردیا جاتا ہے جس میں نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے کے اقوال و اعمال سب شامل کرلئے جاتے ہیں۔

پھر ذرا اسے بھی سوچو سلیم! کہ وحی کی اس تقسیم سے بالآخر مقصود کیا تھا؟ وہی خدا (وحی کا بھیجنے والا) وہی رسول (جس پر وحی بھیجی جاتی تھی) وہی زبان (جس میں وحی نازل ہوتی تھی) - وہی مخاطب (جن کی ہدایت کے لئے وحی آتی تھی) دونوں وحیوں کی حیثیت بھی برابر (مثلہٗ معہٗ) لیکن اس کے باوجود کچھ وحی قرآن میں اور کچھ وحی قرآن سے باہر۔ یہ حکم کہ اٰتوا الزکوٰۃ (زکوٰۃ دو) قرآن میں؛ اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بہ شرح اڑھائی فیصدی دو' قرآن سے باہر۔ کیا قرآن میں "اڑھائی فیصدی" کے الفاظ نہیں لائے جاسکتے تھے؟ کیا اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا[1]؟ سوچو سلیم! کہ اس تقسیم خداوندی میں کونسی مصلحت تھی! یہ تو ہوا عملِ خداوندی کے متعلق عقیدہ کہ اس نے وحی کی اس طرح تقسیم کردی! اب اس کے بعد عملِ رسالت دیکھئے کہ اس عقیدہ کی رو سے حضورؐ نے وحی کی ایک قسم (متلو) کے متعلق تو اتنی احتیاط برتی کہ اسے تمام وکمال لکھوا دیا۔ شروع سے اخیر تک' اسی ترتیب کے مطابق جس میں یہ کتاب ہے' حفاظ کو زبانی یاد کرا دیا۔ ان کے حفظ کردہ کو بار بار سن لیا۔ اور اس طرح یہ وحی قرآن کی دفتین میں محفوظ کر کے امت کو دیدی۔ باقی رہی وحی کی دوسری قسم (روایات) سو اسے نہ کہیں لکھوایا، نہ کسی کو یاد کرایا، نہ اس کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا بلکہ اگر کسی نے از خود تبرکاً کچھ لکھنا بھی چاہا تو اسے روک دیا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن (مسلم) "مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو"۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ دین نام رکھا جاتا ہے قرآن (وحی متلو) اور سنت (وحی غیر متلو) کا۔ اور دین کے جزو اول کی حفاظت کا تو اس قدر انتظام واہتمام کیا جاتا ہے اور جزو ثانی کو اس طرح لاوارث چھوڑ دیا جاتا ہے! کیا اس سے رسول اللہؐ کے منصبِ رسالت (دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے) پر (معاذ اللہ) حرف نہیں آتا؟ کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ سب کچھ زبانی یاد کرلیا کرتے تھے اس لئے روایات کو لکھوانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس پر تو غور کرو کہ اگر عربوں کا حافظہ ایسا ہی قابلِ اعتماد تھا تو پھر قرآن کو کیوں لکھوایا گیا؟ اور پھر یہ بھی کہ جس طرح قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کرایا گیا اور ان کے یاد کئے کی تصدیق کی گئی' اسی طرح روایات کو بھی کیوں نہ یاد کرا کر ان کی تصدیق کردی گئی! "وحی غیر متلو" کی تدوین وتحفظ کے بارے میں عمل خداوندی اور عمل رسالت تم دیکھ چکے۔ اب عمل خلفائے راشدین دیکھئے۔ انھوں نے بڑے . . . . . . اہتمام سے قرآن کریم کے نسخے تیار کئے اور ان مصدقہ نسخوں کو سلطنت کے مختلف گوشوں میں پہنچایا اور حکم دیدیا کہ جہاں کہیں کوئی اختلاف ہو ان مصدقہ نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ انتظام انھوں نے دین کے ایک جزو (وحی متلو یعنی قرآن) کے متعلق کیا لیکن دین کے دوسرے جزو (وحی غیر متلو یعنی احادیث) کے متعلق کچھ نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ان کی تحریر وروایت کی کوشش کر رہا ہے اسے اس سے روکا اور عند الضرورت اس پر سخت مواخذہ بھی کیا۔ (تفصیل اس کی تم کئی بار سن چکے ہو) ذرا سوچو سلیم! کہ یہ تمام تصریحات تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں! کیا لامحالہ تم اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ یہ عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ نہ یہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت اور نہ مسلکِ خلافتِ راشدہ۔ اس تمام عہد میں وحی کی ایک ہی قسم تسلیم کی جاتی تھی جو قرآن میں محفوظ تھی۔ یہی اللہ نے رسولؐ کو دیا، اسی کو رسولؐ نے امت تک پہنچایا اور اسی کو صحابہؓ نے آگے بڑھایا۔

---

[1] سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس کیلئے یہی دلیل دی ہے کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

اسے ایک بار پھر سُن رکھو سلیم! کہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔ اگر احادیث دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہؐ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ دین کے اس حصے کو بھی مستند طور پر مرتب کر کے امت کو دیکر جاتے؟ [illegible] کے مجموعے، حضورؐ کی وفات کے بہت عرصہ بعد، لوگوں نے انفرادی طور پر مرتب کئے تھے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ رسول اللہؐ [illegible] ایسے اہم حصے کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے!! اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ کے نزدیک یہ حصہ دین کا جزو تھا ہی نہیں۔ جو لوگ اب احادیث کو دین سمجھ رہے ہیں ان سے یہ سوال پوچھئے۔ ان میں سے کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔

اب یہ دیکھو کہ اس غلط عقیدہ نے دین میں خرابیاں کس قدر پیدا کیں! قرآن اپنی محفوظ شکل میں امت کے پاس موجود تھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی تھی۔ اس لئے اس میں ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس روایات کا کوئی مصدقہ مجموعہ امت کے پاس نہ تھا لیکن انہیں اس عقیدہ کی رو سے قرآن کا ہم پلہ قرار دیا گیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس سے دین میں کس قدر تحریف و الحاق کا دروازہ کھل گیا۔ جس کا جی چاہتا کوئی حکم اپنی طرف سے وضع کرتا اور اس کے ساتھ دو چار راویوں کے نام کا اضافہ کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتا، اور یہ حکم دین کا جزو بن جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرکھ کر سکتا کہ یہ واقعی قولِ رسولؐ ہے یا خود ساختہ روایت۔ معیار تھا تو یہ کہ جن دو چار راویوں کے نام بطور اسناد شامل کئے گئے ہیں، وہ ان پرکھنے والوں کے معیارِ ثقاہت پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ غور کرو سلیم! کہ جس دین (قرآن) کو خدا اور اس کے رسولؐ نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے دیا تھا اس دین میں تحریف و الحاق کے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ قرآن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ آپ کو بھی اس کی مجال نہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے۔ قل ما یکون لی ان ابدلہٗ من تلقائی نفسی۔ ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۰/۱۵)" ان سے کہدو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے کچھ تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے کہ ولو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لاخذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۶۹/۴۴-۴۶)" اگر رسول کسی بات کو یونہی ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگ جان کاٹ ڈالتے"۔ لیکن اب واضعین حدیث کیلئے میدان صاف تھا کہ جو جی میں آئے وضع کریں اور اسے رسول اللہؐ تک منسوب کر دیں اور جب ان سے کہا جائے کہ یہ تعلیم قرآن میں تبدیلی ہے یا اس پر اضافہ، جس کے رسول اللہؐ مجاز نہ تھے تو اس کا کھلا ہوا جواب موجود تھا کہ یہ تبدیلی یا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ تو وحی غیر متلو کے ذریعہ سے کیا تھا جو خدا ہی کی طرف سے تھا اس لئے یہ تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس "وحی غیر متلو" نے نہ صرف ان جزئیات ہی کو ابدی طور پر متعین کر دیا جنھیں قرآن نے غیر متعین رکھا تھا بلکہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ بھی کر دی۔ مثلاً قرآن نے زانی کی سزا سو درّے مقرر کی ہے روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ سزا غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی ہے۔ شادی شدہ کی سزا سنگسار ہے۔ یا قرآن نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنے مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے لیکن روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی وارثین کے حق میں نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

یعنی پہلے تو صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ چونکہ قرآن نے ان احکام کی جزئیات . . خود . متعین . . نہیں کیں اس لئے یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔

لیکن اب وحی غیر متلو کے عقیدہ نے یہ کیا . . . کہ جن . . احکام کی تفاصیل قرآن نے متعین کی ہیں وہ خود ناقص ہیں اور ان کی تکمیل و ترمیم وحی غیر متلو کے ذریعے ہوتی ہے جس کا دروازہ (کم از کم) امام بخاری اور مسلم کے زمانے تک ضرور کھلا تھا۔

کیوں سلیم! کچھ بات سمجھ میں آئی؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خلجان پیدا ہو رہا ہے کہ (i) اس اعتراض کا صحیح جواب تو ابھی تک سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین کیوں چھوڑ دیا اور (ii) یہ کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ مسلمانوں میں کس طرح رائج ہو گیا! اگر تم نے اصل مضمون کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان اعتراضات کے جواب بھی وہیں سے مل جاتے۔ لیکن اس دفعہ تو تم نے بھی وہی کچھ کیا جو عوام کیا کرتے ہیں کہ جونہی کوئی خیال ایسا سامنے آیا جو ان کے کسی مروجہ عقیدہ کے خلاف ہو، انھوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراضات شروع کر دیئے۔ یہ روش تو تمہاری فطری افتاد کے خلاف تھی۔ لیکن تمہاری معذوری پر میری نگاہ ہے۔ جو عقائد نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آئیں وہ انسان کے نفسِ غیر شعوریہ کی گہرائیوں میں مسلّم صداقتیں بن کر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اسلئے اب آؤ ان اعتراضات کی طرف۔

تم جانتے ہو کہ قرآن، تمام دنیا کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ضابطۂ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز ہوتی ہے اصول اور ایک چیز فرع۔ قرآنی ضابطۂ قانون کے اصول، وہ مستقل اقدار ہیں جو ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہیں۔ لیکن ان اصولوں کی فروعات، انسان کی تمدنی زندگی کے ان عملی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں جو مختلف زمانوں کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ فروعات غیر متبدل نہیں ہو سکتیں۔ قرآن نے (بجز چند ایک فروعات کے) انسانی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق قوانین کے اصول بنائے ہیں اور ان کی جزئیات . . متعین نہیں کیں . . . قرآن کا ایک ایک حرف غیر متبدل ہے (لاتبدیل لکلمات اللہ) اگر قرآن جزئیات خود ہی متعین کر دیتا تو ان میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہ ہو سکتا۔ (جیسا کہ ان چند جزئیات میں نہیں ہو سکتا جو اس نے متعین کر دی ہیں اور جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ منشائے ایزدی یہی تھا کہ انھیں غیر متبدل رکھا جائے) اس لئے یہ ضابطۂ قانون (جس میں تمام جزئیات . . . غیر متبدل ہوتیں) . . تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات قرار نہ پا سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت وغیرہ آج . . . . . ناکام کیوں ہوئے ہیں! انھیں . . . ان کے اپنے پیروؤں نے کیوں چھوڑ دیا ہے . . . . خوشی سے نہیں چھوڑا۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ مجبوری کیا تھی! یہی کہ کسی زمانہ میں جو مذہبی رسوم و قیود (یعنی جزئیاتِ قانون) متعین ہوئیں وہ ان مذاہب میں غیر متبدل قرار پا گئیں۔ اب وہ جزئیات عصرِ حاضر کے انسان کے تمدنی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ اربابِ مذہب اس عقیدہ کی بنا پر کہ وہ غیر متبدل ہیں، ان کی پابندی پر مصر تھے۔ کچھ عرصہ یہ کشمکش رہی اور بالآخر ان کے معتقدین، وقت کے اٹل تقاضوں سے ایسے مجبور ہوئے کہ انھیں ان جزئیات کو جھٹک کر پھینک دینا پڑا اور چونکہ ان کی آسمانی کتاب ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں اس لئے ان جزئیات کے ساتھ ہی مذہب بھی گیا۔ (در اصل ان کے ہاں مذہب نام ہی ان جزئیات کا رہ گیا تھا) تم نے دیکھا سلیم! کہ یہودیوں کو تالمود کی جزئیات، عیسائیوں کو سینٹ پال کی جزئیات اور ہندوؤں کو منوجی کی جزئیات، جنھیں ابدی اور غیر متبدل کہا جاتا تھا کس طرح زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر الگ کرنی پڑیں۔ قرآن کے پیشِ نظر جہاں انسانی زندگی کے نشو و ارتقا کے لئے مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول تھے وہاں اس کی

تمدنی زندگی کے ہمیشہ بدلنے والے تقاضے بھی تھے۔ اس لئے اس نے ایسا ضابطۂ حیات دیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا تھا اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اس میں نوع انسانی کے لئے ابدی ضابطۂ حیات بننے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے جزئیات کو اس لئے متعین نہیں کیا کہ وہ انھیں قابل تغیر و تبدل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر کسی زمانے میں متعین شدہ جزئیات ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنی مقصود ہوتیں تو قرآن انھیں خود ہی متعین کر دیتا۔ لہٰذا قرآن کے غیر متعین جزئیات کو کسی زمانے میں متعین کر کے انھیں آئندہ کے لئے غیر متبدل قرار دینا دین کی اس صلاحیت کو سلب کر لینا ہے جس کی بنا پر یہ ابدی طور پر ضابطۂ حیات بن سکتا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ اگر کسی اسلامی حکومت کو یہ مجبوری ہو کہ وہ کسی حالت میں بھی اڑھائی فیصدی سے زیادہ انکم ٹیکس عائد نہ کر سکے اور وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی سال بھر کے فاضلہ اثاثہ (Surplus Assets) پر ہو تو وہ حکومت کبھی چل سکتی ہے؟ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دے کر اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا تاکہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے۔ قرون اولیٰ میں خلافت راشدہ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فیصدی مناسب سمجھا اس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فیصدی ہے تو یہی بیس فیصدی شرعی شرح قرار پا جائے گی۔

یہ ہے وہ مصلحت سلیم! جس کی بنا پر قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دیا۔ اب کسی ایک وقت کی متعین کردہ جزئیات کو ابدیت سے ہمکنار کر دینا اس دین فطرت کو غیر فطری بنا دینا ہے۔ سلیم تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ عصر حاضر کا مسلمان اگر مذہب سے بیگانہ بلکہ سرکش ہو رہا ہے تو اس لئے کہ اسے ان جزئیات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اس کے موجودہ زمانے کے تقاضوں میں فٹ (FIT) نہیں ہوتیں۔ اگر اس کے سامنے قرآن کے اصول رکھ کر اس سے کہا جائے کہ ان اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے والی جزئیات خود متعین کر لو، تو دیکھو وہ کس طرح لبیک اللھم لبیک کہتا ہوا اس حریم نظرت کے گرد مستانہ وار طواف کرنے لگتا۔ قرآن کی تو یہ کیفیت ہے سلیم! کہ

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست ۔۔۔ عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ۔۔۔ ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش ۔۔۔ می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دوسری شق لیجئے یعنی یہ کہ یہ جزئیات غیر متبدل کس طرح قرار پا گئیں۔ اسی کو بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ کیسے پیدا ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین اسلئے چھوڑ دیا تھا کہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان کا تعین خود کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل فرمائی لہٰذا حضورؐ نے سب سے پہلے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متعین جزئیات کو متعین فرمایا۔ آپؐ کے بعد خلافت راشدہ کے زمانے میں ان جزئیات میں حسب ضرورت اضافے بھی ہوئے اور ترمیمات بھی۔ سلیم! تم حیران ہو گے کہ وحی غیر متلو کے عقیدہ کا سراغ نہ رسول اللہ کے

زمانے میں کہیں ملتا ہے نہ صحابہؓ کے عہد میں۔ وہ زمانہ اس اصطلاح سے قطعاً ناواقف نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک وحی ایک ہی تھی اور وہ قرآن میں محفوظ تھی۔ اس سے باہر وحی کہیں نہ تھی اس لئے خارج از قرآن کوئی چیز غیر متبدل بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سلاطین نے امور سلطنت اپنے ذمہ رکھ لئے اور امور دین کو انفرادی طور پر علماءؔ[1] کے سپرد کر دیا تو قرآنی اصولوں کے جزئیات متعین کرنے کا جو اسلوب قرآن نے بتایا تھا (یعنی بذریعہ حکومت) وہ خود بخود مٹ گیا جن لوگوں کے ذمے امور دین کا تحفظ قرار پایا انھوں نے سوچا کہ مرکزی قوت (حکومت) نے جزئیات کو قانون کی حیثیت دیکر نافذ کرنے کا طریقہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے اگر مروجہ جزئیات کے متعلق یہ کہدیا گیا کہ وہ صرف اس زمانے کے لوگوں کے لئے شریعت تھیں جن کے لئے انھیں مرتب کیا گیا تھا تو ملت شریعت کے بغیر رہ جائے گی اور اس طرح ان میں سخت انتشار (Anarchy) پھیل جائے گا۔ لہذا ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس وقت کی مروجہ جزئیات کو غیر متبدل قرار دے کر واجب التعمیل ٹھیرا دیا جائے۔ ان کو غیر متبدل قرار دینے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انھیں تمام و کمال ذات رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے اور یہ کہدیا جائے کہ حضورؐ نے انھیں بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا اس لئے یہ ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انھیں وحی قرار دینے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ جو لوگ ذاتی اجتہادات سے مسائل میں استنباط کر کے جزئیات متعین کر رہے تھے (یعنی اہلِ فقہ) اس عقیدے کی رو سے ان کے رد کی ناقابلِ تردید دلیل مل جاتی تھی۔ یعنی ایک چیز کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اسے حضورؐ نے بذریعہ وحی متعین فرمایا اور دوسری کے متعلق یہ کہ اسے (مثلاً) امام ابو یوسفؒ نے اپنی رائے سے متعین کیا تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کی جبینِ عقیدت اول الذکر کے سامنے جھکے گی۔ جہاںتک میں سمجھ سکا ہوں سلیم! جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے کا اولیں جذبہ محرکہ یہی تھا[2]۔ یعنی ملت کو بالکل بے زمام چھوڑ دینے یا اشخاص کی ذاتی آراء کے تابع کر دینے کے بجائے انھیں تقلید کی حدود میں مقید کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ایک اضطراری حالت کے لئے وقتی علاج تو ضرور تھا لیکن اس سے وضع احادیث کا اتنا بڑا دروازہ کھل گیا کہ جو کچھ کسی کے جی میں آیا اس نے قال رسول اللہؐ کے عنوان سے دو چار رواۃ کی تائید کے ساتھ گھڑا اور اسے جزو دین بنا دیا۔ اب یہی دین ملت کے لئے ابدی طور پر ناقابلِ تغیر شریعت بن گیا۔ جب تک حکومت اور مذہب کی یہ تفریق باقی رہی یہ سوال عملی طور پر بے معنی تھا کہ یہ جزئیات جو تقلیدی طور پر اسلاف سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں علیٰ حالہٖ رہنی چاہئیں یا ان میں تغیر و تبدل ہونا چاہئے۔ اسلئے کہ حکومت سے الگ ہٹ کر یہ جزئیات مذہبی رسوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زکوٰۃ اڑھائی فیصدی ہوتی یا چالیس فیصدی دونوں صورتوں میں خیرات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اب بھی جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن مذہب، حکومت سے الگ ہے، وہاں

[1] سلیم! تم حیران ہوگے کہ علماء کا ایک جداگانہ طبقہ اور مولوی اور مولانا کے الفاظ نہ عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں دکھائی دیتے ہیں نہ زمانہ خلافت راشدہ میں۔ یہ بھی اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب سلطنت دین سے الگ ہو گئی اور "قیصر اور پوپ" کے دوائر منصب جداگانہ قرار پا گئے۔ "حضرت مولانا ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت مولوی عمر فاروق رضؓ" آج بھی کس قدر نامانوس نظر آتے ہیں۔

[2] میں اسوقت اس سازش سے بحث نہیں کر رہا جو عجمی عناصر (یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت) نے اسلام سے انتقام لینے کی غرض سے کی اور جس کی رو سے انھوں نے روایات سازی کے راستے اپنے خیالات اور عقائد کو عین اسلام بنا کر دکھایا۔ اس کے متعلق دوسرے مقامات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

ان جزئیات کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے اب سے پہلے اس سوال نے عملی حیثیت اختیار نہیں کی۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد یہ آواز ہر در و دیوار سے اٹھنی شروع ہوگئی ہے کہ اس کا آئین شرعی ہونا چاہئے (اور یہی تشکیل پاکستان کا مقصد بھی ہے) لہٰذا اب اس سوال نے بھی عملی شکل اختیار کرلی ہے کہ یہ جزئیات جو ہمارے ہاں متوارث چلی آرہی ہیں، ناقابلِ تغیر ہیں، یا زمانے کے مقتضیات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل بھی ہوسکتا ہے۔ جو لوگ دل سے چاہتے ہیں کہ یہاں نظامِ شریعت رائج کیا جائے وہ بھی اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر شریعت انہی جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے جسے اربابِ شریعت ناقابلِ تغیر قرار دے رہے ہیں تو پاکستان کا نظام چل کیسے سکے گا؟ اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ یہ جزئیات ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انھیں چھوا تک نہیں جاسکتا۔ اس لئے انھیں اسی طرح اختیار کرنا ہوگا۔ انھیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ ایسا کرنے سے ہم اس زمانے میں زندہ بھی رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ تقلید کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے اور اعمال کو کبھی نتائج سے نہیں پرکھا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ دہلی میں ہم ایک پریس میں گئے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی روٹری مشین پوری سرگرمی سے چل رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر۔ پورے زور و شور کے ساتھ، لیکن اس کے تختہ پر کاغذ نہیں تھا اس لئے گو مشین تو چل رہی تھی لیکن چھپتا کچھ نہیں تھا۔ مسلمانوں کے اعمالِ مذہبی کی مشین صدیوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر چھپتا کچھ نہیں۔ اولٰئك حبطت اعمالهم (ان کے عمل بے نتیجہ رہتے ہیں) اور ضل سعیهم (ان کی کوششیں رائیگاں)۔ لیکن اب سلیم! خدا خدا کرکے ہمیں ایک ایسا موقعہ ملا ہے جس میں حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے اور ملوکیت کا استبداد و تغلب ہنوز ہم پر مسلط نہیں ہوا۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ جس قسم کا آئین چاہیں بنالیں۔ صدیوں کے بعد پھر وہ وقت آیا ہے کہ ناموسِ فطرت ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

تو اپنی سرنوشت پھر اپنے قلم سے لکھ		خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگر سلیم! اس وقت ہم نے مبدأ فیض کی اس موہبتِ کبریٰ سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر قرآن ہماری زندگی کا ضابطۂ حیات کبھی نہیں بن سکے گا۔ اور ہم آزادی کی فضائے بسیط میں کبھی سانس نہیں لے سکیں گے۔ میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر اپنے درد و کرب کی تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنھوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں		میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز		میری خلوت و انجمن کا گداز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوجاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

مجھے سلیم! یہی غم کھائے جارہا ہے کہ ہمارے نظامِ شریعت کے دعویدار وہی ہیں جن کا ایمان ہے کہ فقہ و روایات کی وہ

جزئیات جو ہزار سال پیشتر وقتی . . . تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ اس لئے وہ انہی جزئیات کے مجموعہ کو قانونِ شریعت بنا کر سامنے لے آئیں گے جو آج کے حالات میں کبھی قابلِ عمل نہ ہو سکے گا اور مسلمان اس سے ایسا بددل ہو گا کہ دوبارہ اس کی طرف رُخ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح اللہ کی یہ نعمتِ عظمیٰ ہماری شامتِ اعمال سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صرف ہم پر ہی ظلم نہیں ہو گا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر ظلم ہو گا کہ اس سے انسانیت اس نور سے محروم رہ جائے گی جس میں اسے اپنے شرفِ مجد کی ارتقائی منازل طے کرنی تھیں۔ وذالک خسران المبین۔

سلیم! تم کہتے ہو کہ جب اصولِ قانون، اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے اور ان کی جزئیات امت نے اپنے اپنے زمانے میں متعین کیں تو رسول اللہ پر ایمان لانے سے کیا مفہوم ہو گا! تمہارے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی اس لئے کہ تم کبھی اس قسم کا سطحی اعتراض نہیں کیا کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے؟ تاریخ شاہد ہے (اور اس کا مسلمان کو خود اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن محمدؐ ابن عبد اللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ثبوت ہے کہ خود محمدؐ ابن عبد اللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اور قرآن ہی حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قانون ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اس وقت تک وجہِ شرفِ انسانیت ہے جب تک انسان اللہ کی حکومت کو باعثِ احترامِ آدم سمجھتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچو سلیم! کہ اس حقیقت سے بھی تو ہمیں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آشکارا کیا کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات خود ہمیں متعین کرنی ہیں۔ اگر حضورؐ انہیں متعین کر کے حکومتِ خداوندی کو متشکل نہ فرماتے تو ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ منشائے خداوندی کیا ہے؟

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے　　　　اینہا سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے

لیکن حضورؐ کی سیادت تو اسی میں تھی کہ آپ نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیا اور . . . . . صحیح حریتِ فکر و نظر عطا کر کے اسے ان اغلال و سلاسل کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جس میں وہ جکڑا چلا آتا تھا۔ یہ اغلال و سلاسل تھے وہ استبداد، جو ملوکیت اور برہمنیت کی شکل میں انسانی اعصاب پر سوار . . . تھا۔ حضورؐ نے بتایا کہ انسان کا تعلق اس کے خدا کے ساتھ براہِ راست ہے اور خدا اور بندے کے درمیان، اور تو اور، خدا کا رسول بھی حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انداز حکومت (کہ اصول خدا نے متعین کئے ہیں اور ان کی جزئیات انسان خود متعین کریں گے) خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے وہ عدیم المثال تعلیم جسے قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ[1]

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔ ولکن

---

[1] [illegible]

کونوا ربٰنیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون - ۳/۷۸

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکومت ونبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا سے وریٰ میرے بندے بن جاؤ۔ (اس کا شیوہ یہ ہوگا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ) تم سب ربانی انسان بن جاؤ (اور اس کا طریق یہ ہے کہ) تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے فقید المثال عمل سے انسانوں کو یہ سکھائے کہ وہ کس طرح ربانی انسان بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کا اور ان کے خدا کا براہِ راست تعلق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور اس تعلق کا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔ اس تعلق کی عملی شکل پہلے رسول اللہ نے خود متعین کر کے دکھائی۔ آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کو چاہیئے تھا کہ اس تعلق کو مسلسل قائم رکھے۔ لیکن امت بہت جلد اس راستہ سے بھٹک گئی اور اس نے اپنے اور خدا کے درمیان وہی انداد (غیر خدائی قوتیں) حائل کرلئے جنھیں درمیان سے ہٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہٹا کر پھینک دیا تھا۔ یہ انداداً من دون اللہ کہیں ارباب سیاست تھے اور کہیں احبار و رہبان۔ جنھوں نے خدائی احکام کی جگہ اپنے احکام کی پرستش کرائی۔ کسی نے قیاسات کی رو سے کسی امام کا آسرا لیکر اور کسی نے روایات کے راستے خود رسول اللہ کا سہارا پکڑ کر۔ حالانکہ نہ ان ائمہ نے اس کی تلقین کی تھی اور نہ رسول اللہ نے اس کی تعلیم دی تھی۔ تو پھر سلیم! کوئی تو وقت ایسا آنا چاہیئے جب امت کو اس بے راہ روی سے روک کر اسے راستہ پر لگایا جائے جس سے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان پھر براہِ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک پاکستان نے وہ موقعہ ہم پہنچا دیا ہے۔ لیکن اگر اب بھی ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وہی انداداً من دون اللہ حائل رہے یعنی یا حکومت ارباب سیاست کے اپنے تصورات کے مطابق قائم ہو گئی یا ہمارے احبار و رہبان کے اشخاص پرستی کے معتقدات کے مطابق تو پھر خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ شاید دوبارہ نہ جڑ سکے۔ یہ خدشہ ہے سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیوں اور میرے دل کی پوشیدہ بیتابیوں

کا باعث۔

اس آخری نکتہ سے سلیم! تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ "اسلامی نظام" محض چند قوانین کے مجموعے کا نام نہیں جو کسی قوم (یا ایک حکومت کے تابع آجانے والے انسانوں) کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے میکانکی طور پر نافذ کر دیئے جائیں گے۔ قانون کیا ہے؟ انسانوں کو ان اعمال سے روکنے کا ذریعہ جن سے ان کی تمدنی زندگی میں فساد و انتشار واقعہ ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قوموں (یا جماعتوں اور سلطنتوں) نے مختلف انداز وطرق (قوانین) وضع کئے ہیں۔ ان میں اکثر قوانین مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قاتل کی سزا (موت) انگریز کے قانون میں بھی وہی ہے جو قرآن کے قانون میں ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کے قانون اور ہمارے شرعی قانون میں کوئی فرق نہیں۔ اب فرض کرو کہ اگر انگریز مختلف جرائم کی وہی سزائیں اپنے ہاں رائج کر لیتا ہے جنھیں ہم شرعی حدود کہتے ہیں تو کیا سلیم! اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ انگریز کا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا؟ بالکل نہیں۔ ...... ایک قدم آگے بڑھو۔ اگر ہم بھی

اپنے ہاں جرائم کی وہی سزائیں تجویز کرلیں جنھیں شرعی تعزیرات کہتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ ہمارا نظامِ زندگی اسلامی ہوگیا! ہرگز نہیں۔ اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ شرعی قوانینِ جرم و سزا کو نافذ کردینے کا نام اسلامی نظام نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوانینِ شرعی، نظامِ اسلامی کا ایک جزو ہیں۔ اس وقت تک جسقدر مطالبات پیش ہورہے ہیں وہ محض قوانینِ شرعی کی تنفیذ کیلئے ہورہے ہیں اگر ہماری حکومت ان شرعی قوانین کو اختیار کرلے تو ہمارے اربابِ شریعت مطمئن ہوجائیں گے کہ "حکومتِ خداوندی" کا قیام ہوگیا۔ لیکن اِدھر ان قوانین کا نفاذ ہوگا اور اُدھر ان قانونی موشگافیوں کے ذریعہ ان قوانین کی گرفت سے بچنے کے حیلے وضع کئے جائیں گے۔ سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک باب بابُ الحیل بھی ہوتا ہے یعنی وہ حیلے جن سے مجرم قانونی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ تم حیران ہوگے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! لیکن سلیم! میں ایک حقیقت بیان کررہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو ان کتابوں کو اٹھا کر خود دیکھ لو اور پھر علامہ ابن قیم رہ کی اعلام الموقعین دیکھو جس میں ان "شرعی حیلوں" کا رد کیا گیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے ان حیل میں سے ایک حیلہ مثالاً لکھتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ بھی جاؤ گے کہ "شرعی حیلوں" سے مفہوم کیا ہے۔ دو آدمیوں نے مل کر ایک مکان سے مال چرایا اور موقعہ پر گرفتار ہوگئے۔ عدالت میں پیش ہوئے جرم ثابت تھا۔ شرعی تعزیر کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹنا چاہئے۔ لیکن اب دیکھئے کہ یہ کس طرح اس سزا سے بچتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ سرکار! میں نے صرف نقب لگائی ہے۔ نقب لگانا چوری نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے بیشک مال اکٹھا کیا اور اسے لیکر چلا۔ لیکن منقوب دکان میں پڑا ہوا مال، مالِ محفوظ نہیں کہلا سکتا۔ اور چوری مالِ محفوظ کو لے جانے کا نام ہے۔ لہذا مجھ پر چوری کا جرم عائد نہیں ہوسکتا۔ لیجئے دونوں چور چوری کے جرم سے بری ہوگئے۔ اب ان پر کوئی اور فردِ جرم لگائیے۔ اس قسم کے حیلے سلیم! روز عدالتوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ وکلاء کے معاش کا بیشتر حصہ اسی قسم کی حیلہ تراشیاں ہیں۔ لہذا محض شرعی قوانین کے تنفیذ سے نفوس میں اصلاح نہیں ہوسکتی۔ قلوب میں انقلاب، اسلامی نظام کے قیام سے ہوگا۔ اسلامی نظام کیا ہے؟ اسے سلیم! میں تمہیں اس خط میں نہیں سمجھا سکتا اس کیلئے تمہیں معارف القرآن کی پانچویں جلد کا انتظار کرنا ہوگا یا اگر مجھے اللہ نے فرصت دی تو اس کی اشاعت سے قبل کہیں جداگانہ بھی لکھ دوں گا۔ لیکن وہ پھر بھی جامع اور مکمل نہیں ہوگا۔ اسلامی نظام انسانی زندگی کو اس طرح محیط ہوتا ہے جس طرح فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا انسانی جسم کو لپیٹے ہوتی ہے اور یہی نمط کہ یہ کرہ ہوائی اسکی زندگی کا مدار و اساس ہوتے ہوئے اس کی آزادیوں میں کہیں خلل انداز نہیں ہوتا۔ چلتے چلتے، چند الفاظ میں سلیم! یوں سمجھ لو کہ

(۱) کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں جاری ہے۔

(۲) اسی طرح انسان کی زندگی بھی ایک مقصد لئے ہوئے ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہیٰ اس نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

(۳) خارجی کائنات میں ہر شے بلا اختیار و ارادہ اس مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

(۴) لیکن انسان اپنی دنیا میں صاحب اختیار و ارادہ ہے اسلئے اسے اس نصب العین کی طرف اپنے نظام اجتماعیہ کی رو سے بڑھنا ہوگا۔

(۵) اس نظام اجتماعیہ کا نام الدین یعنی اسلامی نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد وحدتِ خالق، وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ مقصد پر ہے۔

(۶) اس نظام کا اولین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کی تمام انسانی صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کیلئے تمام اسباب و ذرائع ہر ایک کیلئے یکساں طور پر میسر ہوتے ہیں۔ اس کو نظام ربوبیت کہتے ہیں۔

لہٰذا قوانین تعزیرات اس نظام کا ایک جزو ہیں جو افرادِ معاشرہ کی اجتماعی زندگی میں بدعنوانیوں کی روک تھام کیلئے نافذ کئے جاتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں سلیم! کہ آپ اس جزو کو اگر جاری کر سکتے ہیں تو آنا بھی نہ کریں۔ مقصود پورے کے پورے اسلامی نظام کو جاری کرنا ہوگا۔

چونکہ اسوقت بحث صرف یہ تھی کہ شرعی قوانین کی ترتیب و تدوین کس طرح عمل میں آئیگی۔ اسلئے میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں صرف اسی نقطہ تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے اس کو اسلامی نظام نہ سمجھ لینا۔ اس مضمون میں اسلامی نظام کے صرف ایک گوشے سے بحث کی گئی ہے۔ یہ چیز کہ یہ گوشہ (یعنی ضابطۂ قوانین) کس طرح پورے نظام کا جزو بن کر اس مقصدِ عظیم کے حصول میں ممد ہوتا ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے سمجھ میں نہیں آسکتی جبتک پورے کا پورا اسلامی نظام اور اس کا منتہیٰ آپ کے سامنے نہ ہو۔ اس کیلئے سلیم!

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر[1]

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب آتا ہے۔ یہ تمہیں تسلیم ہے کہ ایسے معاملات سامنے آسکتے ہیں جن کی جزئیات نہ قرآن نے متعین کی ہیں اور نہ وہ کہیں روایات میں ملتی ہیں۔ اب اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جزئیات کی تعیین صرف رسول ہی کر سکتا ہے تو ان امور کی جزئیات کو کون متعین کرے گا؟ اس لئے کہ اب بابِ رسالت تو بند ہو چکا ہے۔ یہی وہ الجھن جس کیلئے کہیں ہر صدی کے اخیر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کرنا پڑا اور کہیں مہدی آخرالزماں کا انتظار اٹھانا پڑا۔ اسی سے مدعیانِ نبوت نے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے رسالت کا دروازہ کھول دیا۔ اگر یہ سمجھ لیا جاتا کہ جزئیات کی تعیین امت کا فریضہ ہے تو پھر نہ کسی الگ مجدد کی ضرورت پڑتی نہ کسی جداگانہ مہدی کی۔ نہ یہ کرسیاں رکھی جاتیں نہ ان پر کوئی نبی بن کر بیٹھنے کی جرأت کرتا۔ تجدید و ہدایت کا سلسلہ مسلسل و متواتر قائم رہتا۔ لیکن مسلمانوں نے یہ نہ کیا اور جب اس غلط بینی سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تو ان کے ایسے ایسے حل تجویز کئے جن سے وہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہوتا چلا گیا۔ تم کہتے ہو کہ اس قسم کے امور کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ یہی میں کہتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو اجتہاد پہلے ہو چکا ہے اس میں مزید اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اجتہاد کے محتاج صرف وہی امور ہیں جن میں مقتضیاتِ زمانہ کی رو سے رد و بدل ہو سکتا ہو۔ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے کھلا چھوڑ دیا ہے ان میں کسی ایک زمانہ کا اجتہاد ابدی فیصلہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے ابدی فیصلہ بنا ہونا تو اس کا فیصلہ خود قرآن کر دیتا۔ اور اسے اجتہادِ انسانی کیلئے آزاد نہ رکھتا۔ البتہ ہم اپنے زمانے کے اجتہاد کیلئے ان تمام اجتہادات سے مستفید ہوں گے جو ہم سے پہلے کئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اجتہاد انفرادی نہیں ہوگا۔ بلکہ ملت کے نمائندے تمام معاملات پر غور و فکر کے بعد اجتہاد کریں گے اور اس سے یہ جزئیات مرتب ہوں گی۔ یہ ہے وہ طریق سلیم! جس سے ہم خدا کے ازلی اصولوں کی روشنی میں کہ جو درحقیقت ان کی زندگی ہی کے ترجمان ہیں، ہر زمانے کے مسائل کے نئے نئے حل دریافت کرتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے دینِ مبین۔

لایزال و وارداتش نو بنو   برگ و بارِ محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیر بے غمے   ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

[1] دیکھئے مسودہ دستورِ اساسی پیش کردہ طلوعِ اسلام۔

بشریتِ رسول

شرفِ آدمیت کا نقطۂ ماسکہ اور تحریکِ انقلاب کا بنیادی اصول

(از محترم ایس۔ این۔ باقر صاحب)

"نہیں باقر صاحب!" میرے دوست نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "معاملہ اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ اس کی اصلاح میرے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں پر نگاہ ڈالئے، کہیں زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ہر جگہ تنزل۔ ہر مقام پستی، ہر شعبے میں انحطاط۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان حالات میں تبدیلی پیدا کرنا کسی انسان کے بس کی بات ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اب کوئی رسول ہی آ کر انقلاب پیدا کرے تو کرے، اور رسول بھی ایک آدھ نہیں۔ چالیس کروڑ مسلمانوں کے لئے کم از کم آٹھ دس رسول ہوں تو کام چلے گا۔"

یہ الفاظ میرے اُس دوست تک ہی محدود نہیں بلکہ ترجمان ہیں پوری کی پوری مسلمان قوم کے جو اپنی اصلاح کے معاملہ میں عملاً مایوس ہو چکی ہے۔ آپ کسی مسلمان سے بات کیجئے۔ سب کچھ کہہ سن لینے کے بعد بات یہیں آ کر رک جائے گی کہ "یہ کچھ کرے کون"؟ اور اس کے بعد اطمینان کی صورت صرف یہ کہہ لینے سے پیدا کر لی جائے گی کہ کوئی آنے والا آئیگا اور وہی یہ کچھ کرے گا۔

یہ تصور مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ تاریخ اقوامِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ دنیا میں ہر وہ قوم جو پستیوں میں گر چکی ہے یا زوال آمادہ ہے، اس کی بعینہٖ یہی روش ہے۔ وہ جب اپنے درخشندہ ماضی پر نگاہ ڈالتی ہے تو اس کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب اپنے حال کو دیکھتی ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔ ازاں بعد جب وہ بزعم خویش حالات کا تجزیہ کرتی ہے تو اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس کے جن اسلاف نے اس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا تھا ان میں خاص خدائی قوتیں تھیں۔ وہ قوتیں انہی کا حصہ تھیں۔ ہمیں وہ قوتیں میسر نہیں اس لئے اس قسم کا انقلاب ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے "آنے والے" کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ دنیا کی کسی تنزل پذیر قوم کو دیکھئے۔ اس میں "آنے والے" کا عقیدہ موجود ہوگا۔ ہندوؤں نے تو اسی عقیدہ کے ماتحت زمانے کو جگوں میں تقسیم کر دیا۔ اسلاف کا زمانہ "ست جگ" (دورِ صداقت) اور موجودہ زمانہ "کلجگ" (دورِ کذب و دنائت)۔ اس کے بعد وہ آخری زمانے میں "کلنکی اوتار" کے آنے کے منتظر ہیں جو کلجگ کو پھر ست جگ میں تبدیل کر دے گا۔ زرتشتی بھی مترا کی آمد کے منتظر ہیں۔ یہودی بھی ایک نجات دہندہ کی رجعت کے انتظار میں ہیں۔ عیسائی بھی ہر وقت نگاہیں آسمان کی طرف لگائے بیٹھے ہیں تاکہ وہ فارقلیط۔ وہ خدا کی برگزیدہ روح آئے اور دنیا کی نجات کا باعث بنے۔ (عیسائیوں سے مراد اُن کا مذہب پرست طبقہ ہے نہ کہ عام اقوامِ یورپ جو محض قومی اعتبار سے عیسائی ہیں نہ کہ مذہبی اعتبار سے)۔ اور ان سب کے ساتھ مسلمان بھی موجودہ زمانہ

"چودھویں صدی" (کلجگ) یعنی "قربِ قیامت" کا زمانہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک آنے والے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بعض نے اس انتظار کے وقفے کو کم کرنے کے لئے ہر صدی پر ایک "مجدد" کے آنے کا عقیدہ وضع کر لیا اور اس طرح مسافت کی لمبائی کو نشاناتِ راہ سے بانٹ کر (کم از کم ذہنی طور پر) سفر کی کوفت کو کم کر لیا۔ یہی وہ نفسیاتی محرکات تھے جو ایران میں بہاء اللہ اور پنجاب میں نبوتِ جدیدہ کے موجب بنے۔ اور یہی وہ یاس انگیز کوائف تھے جن کی وجہ سے میرے دوست یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اب چارہ کار اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی طرف سے رسول آئیں اور وہ بھی ایک آدھ نہیں بلکہ درجنوں۔ (تعداد کی زیادتی کا تقاضا درحقیقت یاس و قنوطیت کی شدت کا غماز ہے)۔

پھر سن لیجئے کہ اس عقیدہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ جن اسلاف نے انقلاب پیدا کیا وہ مافوق البشر قوتوں کے حامل تھے اور چونکہ ہم بشریت کی سطح پر ہیں اسلئے ہم ایسا انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔

انسان کی اس نفسیاتی کیفیت، نوعِ انسان کی اس تاریخی شہادت، اور تمام مذہب پرست اقوام کے اس فریبِ نفس کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد سوچئے کہ قرآن نے رسول اللہؐ سے اس شدت اور تکرار سے کیوں کہا کہ ان سے کہدو کہ انما انا بشر مثلکم۔ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ (فرق ہے تو فقط اس قدر جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے)۔ ذرا غور کیجئے کہ قرآن کو اس اعلان کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن کا اولیں مخاطب طبقہ، نہ صرف یہ کہ اقوامِ سابقہ کے تتبع میں کہتا تھا کہ ما انت الا بشر مثلنا (تم تو صرف ہمارے جیسے ایک انسان ہو) بلکہ وہ حضورؐ کی بشریت کو بطورِ اعتراض پیش کرتے اور کہتے تھے کہ مالِ ھٰذا الرسول یا کل الطعام ویمشی فی الاسواق (یہ کیا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے)۔ لہٰذا ان سے یہ کہنا کہ "میں ایک بشر ہوں تمہارے جیسا" ان کے کسی تقاضے کی تسکین یا اعتراض کے جواب میں نہیں تھا۔ یہ درحقیقت اس بنیادی نقطے کے ابطال کے لئے تھا جس سے اقوامِ عالم اس مہلک غلط فہمی میں مبتلا ہو چکی تھیں کہ انقلاب وہی لا سکتا ہے جو مافوق البشر قوتوں کا حامل ہو۔ وہ "غلط فہمی" جس نے بڑی بڑی قوموں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھدیا۔ قرآن نوعِ انسانی کو اس عظیم ہلاکت سے بچانا چاہتا تھا جس نے زندہ انسانوں کی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقتِ کبریٰ کو کس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ہستی مافوق البشر قوتوں کی حامل ہو سکتی تھی تو مسلمانوں کے نزدیک ذاتِ رسالتمآبؐ یقیناً ایسی ہستی ہو سکتی تھی لیکن اسی ذات کی زبانِ اقدس سے بار بار یہ کہلوایا گیا کہ قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ . . . .

ان سے کہدو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ میری طرف خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔

یعنی رسول اللہؐ کی ذات کے دو گوشے (یا دو پہلو) تھے۔ ایک وحی اور دوسری بشریت۔ وحی کے متعلق حضورؐ کو تاکید کر دی گئی کہ اسے دوسروں تک پہنچا دو (بلغ ما انزل الیک)۔ لہٰذا جب وحی کو دوسروں تک پہنچا دیا گیا تو رسول اور مومنین دونوں ایک ہی مقام

بشریت پر آ گئے۔
اب اس انقلابِ عظیم کو دیکھئے جو رسول اللہؐ کے ہاتھوں رونما ہوا۔ اس انقلاب کیلئے رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ تم اس وحی کی
اتباع کرتے رہو جو تمہیں دی گئی ہے اور اسی کی اتباع اپنی جماعت سے کراؤ۔ اس کے سوا کسی اور نظریہ، کسی اور مسلک اور کسی اور
اصول کی اتباع مت کرو۔ لہٰذا انقلاب کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کی ایک جماعت نے (جن میں خود رسول اللہؐ بھی بہ حیثیت ایک
انسان کے شامل تھے) وحی کی اتباع کی اور انقلاب وجود میں آ گیا۔ بنا بریں انقلاب نتیجہ ہوا وحی کی اتباع کا۔ جو انسان اس کی
اتباع کریں گے وہی انقلاب پیدا کر سکیں گے۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت کی ضرورت نہیں ۔ کسی کو مافوق البشر قوت
۔۔ انقلاب قوتِ بشری کی رُو سے ظہور پذیر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ قوت وحی کے متعین کردہ اصولوں کی اتباع میں
عطا ہوئی ہے
صرف کی جائے۔ ... دنیا کے مناحت کے لئے قرآن نے بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا کہ رسول کی حیثیت (وحی سے ہٹ کر)
یہ تھا وہ بلیغ نکتہ جس کی وجہ ... شیدی نہیں ہوتی۔ نبی اکرمؐ نے ابلاغ وحی کے بعد جو کچھ کیا بشریت کی امکانی قوتوں کی بنا پر
بشری کی حیثیت ہوتی ہے۔ مافوق البشر حیثیت ... حضورؐ نے اس انقلاب (قرآنی معاشرہ کی تشکیل) کے لئے ایک پروگرام مرتب
ہی کیا۔ اس میں کسی مافوق البشر قوت کا دخل نہیں تھا۔ ... ذرائع فراہم کئے۔ فریق مقابل سے تصادمات ہوئے۔ فتح بھی ہوئی شکست
فرمایا۔ اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع ... میں زخم بھی کھائے۔ یہ سب کچھ عام انسانوں کے طرق و انداز
بھی ہوئی۔ خود آپؐ کی اپنی ذات کو بھی تکالیف پہنچیں۔ میدانِ جنگ ... جدوجہد اور سعی و عمل میں وہ غلطیاں بھی ہوئیں جو بعض اوقات
کے مطابق ہوا۔ اس میں کہیں مافوق البشریت نہ تھی۔ حتیٰ کہ اس تمام جدو... انسانی تدابیر ہی سے کیا۔ خود قرآن میں اس قسم کے
انسانی تدابیر میں ہو جاتی ہیں۔ ان کا اعتراف بھی کیا اور اس کے بعد ان کا ازالہ بھی انسانی تدابیر ہی سے کیا۔ خود قرآن میں اس قسم کے
بعض تسامح پر تادیب بھی ہوئی۔ قرآن کریم نے آپ کی زندگی کے ان گوشوں کو ابدی طور پر محفوظ ہی اس لئے کیا ہے کہ آپ کی
بشریت ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہے اور کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے پائے کہ وحی کے بعد بھی انقلاب کے لئے مافوق البشر
قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ انقلاب تنہا محمد رسول اللہؐ کی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا بلکہ آپؐ
کے ساتھ آپ کے رفقائے کار بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے الفاظ اس حقیقت کی بیّن
شہادت ہیں۔ اس سے یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ یہ انقلاب انسانوں ہی کی ایک جماعت کے ہاتھوں رونما ہوا تھا۔ اس کے لئے
مافوق البشر قوتوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس جماعت کی خصوصیت صرف اس قدر تھی کہ وہ خالص وحی کی اطاعت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ
خود نبی اکرمؐ بھی کسی وقت کوئی حکم دیتے تو افرادِ جماعت یہ دریافت کر لیتے کہ وہ حکم وحی کی بنا پر ہے یا آپ کا ذاتی ارشاد ہے۔ اور ذاتی
ارشاد کی صورت میں اس حکم کو صرف ایک رائے (ADVICE) کی حیثیت دی جاتی۔ خود قرآن اور تاریخ میں اس قسم کے واقعات
کا ذکر موجود ہے۔ دوسری طرف نبی اکرمؐ کو مکلف ٹھہرایا گیا کہ آپ اس تحریک انقلاب (قرآنی معاشرہ کی تشکیل) سے متعلقہ امور

... یہ مقام نہیں۔

پنی جماعت سے مشورہ کر لیا کریں (وشاورھم فی الامر)۔ اس کے بعد اور کس شہادت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھنے یا سمجھانے کے لئے کہ وحی کے بعد تمام امور میں آپؐ کی حیثیت بشر کی تھی اور انسانوں کی اسی جماعت نے (جس میں خود آپؐ بھی شامل تھے) بشری قوتوں کی بنا پر وہ انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا جو آج ہمارا مطلوب و مقصود ہے، لیکن جس کے حصول کو ہم آج اس بنا پر ناممکن سمجھتے ہیں کہ ہم نے (بزعمِ خویش) سمجھ لیا ہے کہ اس انقلاب کے لئے مافوق البشر قوتوں کی ضرورت ہے لہذا اس کے لئے کوئی مجدد، کوئی مہدی، کوئی مسیح اور کوئی رسول ہی آئیگا تو کام بنے گا۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ میں بھی مختلف افراد کی بشری قوتوں کے تفاوت کو تسلیم کرتا ہوں (یہ تفاوت کیوں ہوتا ہے اور اسے کس طرح کم کیا جا سکتا ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں) لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ جس انقلاب کو ہم اپنی زندگی کا درخشندہ نصب العین قرار دیتے ہیں وہ انقلاب بشری قوتوں سے عمل میں آیا تھا اور جو انقلاب ایک مرتبہ بشری قوتوں سے عمل میں لایا گیا تھا . . . وہ دوسری بار بھی بشری قوتوں سے عمل میں آسکتا ہے۔ بشری قوتوں کے اجاگر ہونے اور اس کے بعد ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر شدت سے مؤثر بننے کا . . . بنیادی اصول یہ ہے کہ نصب العین کی صداقت پر یقین ہو اور اس کے حصول کے لئے دل میں تڑپ . . . وہ جماعت جس کا ہم اوپر ذکر کرتے چلے آرہے ہیں (یعنی محمد رسول اللہ والذین معہ) ان کے دل میں یہی یقین اور تڑپ تھی جس نے ان کی قوتوں کو اس درجہ نتیجہ خیز بنا دیا تھا۔ لیکن یہ چیز بھی مافوق البشر نہیں تھی۔ یہ ایمان ہر وقت پیدا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنے نصب العین کی صداقت پر محکم یقین رکھیں۔ اور اسی یقینِ محکم سے وہ تڑپ پیدا ہوتی ہے جو عمل پیہم کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ لہذا یہ سب قوتیں حیطۂ بشریت کے اندر کی ہیں۔ بنا بریں، ذرا سوچئے کہ وہ کونسی چیز ہے جو ہمارے اسلاف کے پاس تھی اور ہمارے پاس نہیں ہے جس کے لئے ہمیں کسی مافوق البشر قوتوں کے حامل انسان کی آمد کا انتظار ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے رسول اللہؐ کی بشریت پر اس قدر زور دیکر دنیا میں مقامِ بشریت کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اس سے قبل اس کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا۔ مسلمان ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کے مفکر و مورخ اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ جو انقلاب نبی اکرمؐ نے برپا کیا اس کی مثل و نظیر تاریخِ انسانیت میں کہیں نہیں ملتی اور اس کے مقابل، قرآن کریم نے بار بار اعلان کر دیا کہ جس شخصیت کے ہاتھوں یہ انقلاب رونما ہوا وہ ایک بشر تھا۔ لہذا قرآن نے بالفاظِ دیگر یہ بتا دیا کہ وہ انقلاب جسے تم اسقدر تحیر انگیز قرار دیتے ہو اس کا امکان حیطۂ بشریت کے اندر ہے۔ دیکھئے! کہ اس سے امکاناتِ بشریہ کا دائرہ کس قدر وسیع اور اس کا مقام کس قدر بلند ہو گیا۔ رسول اللہؐ کا بشر ہونا، شرفِ بشریت کی دلیل اور سربلندیٔ آدم کی شہادت ہے۔ اس سے ہر فردِ انسانیہ کے دل میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور خود اعتمادی، عروجِ آدمیت کی اولیں اور بنیادی شرط ہے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قرآن نے بار بار آپؐ کی بشریت کو نمایاں کیا . . . اور خود حضورؐ نے اپنی تعلیم اور عمل سے اپنے رفقائے کار کے دل میں اس حقیقت کو ثبت کر دیا کہ (ابلاغِ وحی کے بعد) آپؐ کی حیثیت ایک بشر کی ہے۔ لہذا جو کچھ حضورؐ نے کیا . وہ حضورؐ کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی نقطہ کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہدیا کہ وما محمد الا رسول . . . آپ کی حیثیت ایک پیغام رساں کی ہے۔ اس قسم کے پیغام رساں حضرات آپ سے پہلے بھی آئے تھے۔ جو انقلاب آپ نے

پیدا کیا ہے وہ اسی پیغام (وحی) کی روشنی میں بشری قوتوں کی بنا پر کیا ہے۔ اس لئے آپ کی وفات کے بعد (وحی کی موجودگی میں) کسی ایسی چیز کی کمی نہیں واقعہ ہو جائے گی جو اس انقلاب کے لئے ناگزیر ہو۔ لہذا تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اب رسول تو ہم میں ہیں نہیں اس لئے یہ انقلاب بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ہمیں پھر اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا چاہئے (یہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہے)۔ یہی وہ آیت تھی جسے حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ آپ کی وفات سے اس نظام میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ نظام کا قیام وحی کی اتباع سے ہے اور وحی ہمارے پاس اپنی مکمل شکل میں موجود ہے۔

یہی وحی (قرآن) آج ہمارے پاس بھی اپنی مکمل اور اصلی شکل میں موجود ہے اس لئے اس کی روشنی میں پھر وہی انقلاب لایا جا سکتا ہے، جو محمد رسول اللہ والذین معہ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا تھا۔ قرآن نے "ہبوطِ آدم" (پستیوں میں گرے ہوئے انسانوں) کا علاج، وحی کی اتباع میں بتایا ہے نہ کہ مافوق البشر قوتوں کے حصول (یا انتظار) میں۔ اس نے "جنت سے نکلے ہوئے آدم" سے یہی کہا تھا کہ تو اپنے تنزل پر غمگین نہ ہو۔ تجھ میں وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو پستیوں کو بلندیوں میں تبدیل کر دینگی۔ بس اس ایک اصول کو یاد رکھو کہ اما یاتینکم منی ھدی۔ فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ "ہماری طرف سے تمہارے پاس ضابطۂ راہ نمائی آئے گا۔ جو اس کی اتباع کرے گا اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔"

آج ہمارے پاس وہ ضابطۂ راہنمائی بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہمارا خوف و حزن، یقین اور اطمینان میں نہیں بدلتا۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان خدا کے اس فرمان پر نہیں . . . کہ انقلاب اس ضابطہ کی اتباع سے رونما ہوگا۔ ہمارا ایمان تو اس امر پر ہے کہ انقلاب، مافوق البشر قوتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ خدا وہ کچھ کہتا ہے۔ ہم یہ کچھ کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ہم اپنی غلط نگہی سے غلط تصورات تو قائم کر سکتے ہیں لیکن . . . خدا کے قانون کے نتائج و عواقب سے نہیں بچ سکتے۔ اس کا قانون یہی ہے کہ انقلاب (وحی کی روشنی میں) بشری قوتوں سے رونما ہوگا۔ جو قوم اسے مافوق البشر قوتوں سے وابستہ سمجھتی ہے وہ ہمیشہ پستیوں میں گری رہے گی۔ دیکھئے! دنیا کی تاریخ (مسلمانوں سمیت) کس طرح پکار پکار کر خدا کے قانون کی پائندہ شہادت بہم پہنچا رہی ہے۔

ان کنتم تعلمون

(نذر الباقر)

حقایق وعبر

۱۔ یہ بھی شریعت

"قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے صراحت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاع حقیقی کا بندہ بنانے کے بعد اس کی رائے اور ضمیر کی پوری پوری آزادی عطا کردے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مقدمہ ذہن نشین کرلینے کے بعد اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کردیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے دراصل نبی بہ حیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بہ حیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ یعنی اس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے، جسے اللہ کا نبی، اللہ کی طرف سے، اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام آیا ہی اسلئے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کردے۔ اور اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم رکھنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے اور آزادانہ اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور ائمہ اور حکام تو درکنار، خود نبی کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔"

(ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

اور یہ بھی

"لیکن یہ تفریق جو انھوں نے (علامہ اسلم جیراجپوری نے) محمد ابن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرت کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ قرآن کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ سے بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان اور حیثیتِ امارت میں کوئی

فرق کیا گیا ہو۔" (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، تفہیمات حصہ اول۔ ص۲۴۵)

پھر سُن لیجئے کہ بات کیا ہوئی!

(۱) اسلام میں جو نبی کی اطاعت فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے وہ اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً محمدؐ ابن عبداللہ ہے۔ وہ اطاعت نبی بہ حیثیت نبی کی ہے

(۱) محمدؐ ابن عبداللہ بہ حیثیت انسان اور محمدؐ رسول اللہ بہ حیثیت مبلغ کی تفریق قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے وہ رسول دینی کی حیثیت ہے۔

(۲) قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو۔

(۲) قرآن کریم میں کوئی خفیف سا خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی میں کوئی فرق کیا گیا ہو

(۳) نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرتے ہیں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔

(۳) نبی کی ذاتی رائے ہوتی ہی نہیں کیونکہ اس کا ہر قول اور ہر فعل رسولِ خدا کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

۲۔ نیز یہ بھی | "اگر کوئی انسان، خدا کا نہیں خود اپنا کوئی خیال پیش کرے تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔"

(ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

اور یہ بھی | "فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ . . . اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا[۱] جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلے کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت، سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔" (ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

۳۔ بلا تبصرہ | "یہ منکرین حدیث دراصل جہل مرکب میں مبتلا ہیں جس چیز کو نہیں جانتے اسے جاننے والوں سے پوچھنے اور سمجھنے کی بجائے عالم بن کر فیصلہ صادر کرتے ہیں اور پھر انھیں شائع کرکے عوام الناس کو گمراہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی گمراہ کن تح

[۱] اس مسئلہ کی بابت قرآن کا کیا حکم ہے، اس کے متعلق تفصیل سے بعد میں لکھا جائے گا۔ طلوع اسلام۔

اکثر ہماری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں اور ان کا کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کو دلائل سے رد نہ کیا جا سکتا ہو لیکن جس وجہ سے مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ اس قماش کے لوگ اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے"! (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

قدم بہ قدم

اس کے ساتھ ذرا اس عبارت کو بھی ملا کر پڑھ لیجئے:-

"قادیان میں ایک بدگو مخالف آیا ہوا تھا جس نے حضرت کے خدام میں سے ایک کو اپنے پاس بلا بھیجا جو اس کے ساتھ گفتگو کرنے چلا گیا۔ جب اس امر کی حضرت مسیح موعود کو خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ ایسے خبیث مفسد کو اتنی عزت نہیں دینی چاہئے کہ اس کے ساتھ تم میں سے کوئی بات چیت کرے" (ملفوظات احمدیہ حصہ چہارم ص۱۴۵) ——— "حیرت ہے کہ ان لوگوں (یعنی میرزا صاحب کے مخالفین) کو نجاست خواری کا کیوں شوق ہو گیا"۔ (ارشاد میرزا صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم - ص۹۲)

۴۔ شاہدٌ من اھلھا

ہمارے علمائے کرام کا سرمایۂ علم کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اس کے متعلق طبقۂ علماء کے سرخیل، ابوالکلام صاحب آزاد کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

ایک بزرگ کہ درس و نظر میں معقولات کے لحاظ سے آج کل مخصوص امتیازی درجہ رکھتے ہیں، ایک دن اسی لب و لہجہ میں جوان بزرگوں کیلئے مخصوص ہے آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری اور الحاد و بیدینی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا یہ شکایت کم از کم آپ لوگوں کی زبانی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی میرے خیال میں تو آپ اور وہ دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب و مسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی قدامت و اولیت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے۔ آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش، وہ یورپ کے پرستار۔ قرآن و سنت سے آپ بھی دور و مہجور، وہ بھی بے خبر و نفور۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک لحاظ سے آپ پر وہ فضیلت رکھتے ہیں۔ آپ کے ائمہ و پیشوا فلاسفۂ یونان ہیں جن کا قدم ذہنیات ضالہ سے آگے نہ بڑھا۔ ان کے معبودانِ علم فلاسفۂ یورپ ہیں جنھوں نے بہرحال دنیا کے آگے تجربہ و استقرار اور کشفیاتِ علمیہ کا دروازہ کھولا۔ ان میں کا ایک لڑکا جو اسکول کی پانچویں کلاس میں سائنس اور طبیعیات کی ریڈر پڑھتا ہے شاید آپ کے مدارس کے ان منتہیوں سے زیادہ صحیح راہ پر ہے جو صدرا اور شمس بازغہ سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ صاحبوں پر مترجمین اور ناقلین عرب تھے جنھوں نے یونانیات کو عربی کا جامہ پہنا کر مقدس بنایا تھا اور معتزلہ اور اخوان الصفا وغیرہم پیدا ہو گئے جنھوں نے مصطلحات و عبائر یونانیات کو علوم دینیہ میں امتزاج و خلطِ کیمیائی کے ساتھ ملا دیا لیکن ان بیچاروں کو یہ اتفاقات اب تک نصیب نہیں ہوئے۔ معاملہ سرسید اور ان کی خوشہ چینان غیر معترف و مقلدین غیر مقر یا مجتہدین فی المذہب سے آگے نہیں بڑھا۔ اگر ان میں بھی کوئی اس ڈھب کا نکل آتا تو آپ دیکھتے کہ ان کے مباحث خاصہ آپ کے امور عامہ سے تو ضرور بازی لیجاتے۔ کم از کم آپ حضرات کو تو اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا چاہئے ——— محتسب چوں خود خورد معذور دارد مست را۔

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعہ سے نئی زبان سکھاتا ہے۔

زبان وہ سیکھئے
جو اہلِ زبان بولتے ہیں



نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب و لہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں۔ لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کے لئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سن کر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقہ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھ دیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں یا سیر گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائیں گے۔ زبان سیکھنے کے لئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے۔ مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے۔ فوراً تفصیلی جواب دیا جائے گا۔

زبان سیکھنے کیلئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی
عربی	بنگالی	ہندوستانی
فرانسیسی	روسی	چینی
اسپینش	اطالوی	ڈچ
سویڈش	ناروےجن	فنش
زرچ	پولش	لاطینی
یونانی	ایفک	ملائے
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی
جرمن	ترکی	پرتگالی

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے۔

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض . . . .

نام . . . .

پتہ . . . .

جنرل سکریٹری صاحب
لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ۔ کراچی

براہِ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جس میں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے، بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے / نہیں ہے۔

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road
KARACHI

BRANCHES:—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for :—

Howards & Sons Ltd, Ilford, London.—
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

FIRDAUS TRADING CORPORATION

Clearing & Forwarding Agents

and

Cotton Merchants

★

SERAI ROAD,
KARACHI

فردوس ٹریڈنگ کارپوریشن

کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹس اینڈ کاٹن مرچنٹس

سرائے روڈ۔ کراچی



FORVIL PRODUCTS are the best, try once any Forvil Products every product is highly perfumed with flowers smell admired by high society peoples.

Sole Agents :—

THE UNITED PERFUMERS

28, LAXMI BUILDING, BUNDER ROAD,

KARACHI.

Regd. No. S. 1089

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for [illegible]

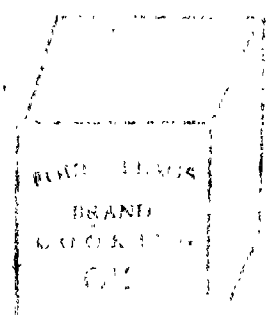
Both

INTERNAL & EXTERNAL [illegible]

BY PRODUCE [illegible]

Highly [illegible] & Nutritive [illegible] Oil

[illegible]



BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's [illegible]

[illegible]

Telegrams: "BENGALI"

P. O. BOX No. [illegible]
KARACHI 2

Telephone: [illegible] 2608

Only Title Printed at Abbas Litho Art, Press, Frere Road, Karachi, and Text Printed at [illegible] by Khurshid [illegible] from [illegible] Office [illegible] Road, Karachi

طلوع اسلام

جون ۱۹۵۲



۱۰/-

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو، اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجیئے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے	سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی
پرچون کے لئے	الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگین: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز، کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) " غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵ — جون ۱۹۵۲ء — نمبر ۶

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ عرصہ سے کراچی کے اخبارات میں، قریب قریب ہر روز، خودکشی کے کسی نہ کسی واقعہ کی خبر درج ہوتی ہے۔ (غالباً دوسرے شہروں میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہوں گے لیکن کراچی کے اخبارات میں بالعموم مقامی واقعات ہی کا ذکر ہوتا ہے)۔ جس تیز رفتاری سے یہ واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور جن مہیب، دردناک، روح فرسا، وحشت انگیز اور جگر پاش داستانوں کے خونچکاں کفن میں لپٹے ہوئے یہ حوادث منظرِ عام پر آتے ہیں، ان کے تصور سے ہر قلبِ حساس طلسمِ پیچ و تاب، اور ہر چشمِ عبرت جوئنا بہ فشاں ہے۔ ابھی ایک واقعہ کی دردانگیز یاد شعور سے تحت الشعور میں جانے نہیں پاتی کہ اس سے زیادہ جگر سوز واقعہ اور سامنے آجاتا ہے، سنجیدہ حلقے ان واقعات سے کافی متوحش اور پریشاں خاطر نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف مفاد پرست طبقے ان واقعات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کرتے ہیں۔ جو جماعتیں، حکومت کی کرسیوں پر خود متمکن ہونا چاہتی ہیں انھیں ان واقعات میں حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا کافی مسالہ مل جاتا ہے۔ کمیونسٹ انھیں نظامِ سرمایہ داری کا لازمی نتیجہ قرار دیکر ان سے اشتراکیت کی صداقت کی دلیل لاتا ہے۔ مولوی، خودکشی کو جرمِ عظیم قرار دیکر مرنے والے کو جہنم رسید کر دیتا ہے اور اس کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے اپنا فریضۂ دینی ادا کر دیا۔ اعصابی اور دماغی امراض کے ماہرین، انھیں عصبی کمزوری بتا کر اپنا اطمینان کر لیتے ہیں کہ تشخیص بالکل صحیح ہو گئی۔ پولیس، ان بخت جانوں کو جو اس اقدام کے باوجود نہیں مر پاتے، عدالت میں لے جا کر سزا دلا دیتی ہے اور مطمئن ہو جاتی ہے کہ ان کا فریضہ بھی ادا ہو گیا —— اخبارات ان "سنسنی خیز" خبروں کو چھاپ کر گرمیٔ بازار کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ کارکنانِ حکومت ان اعداد و شمار کو جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ سالانہ رپورٹ مرتب کرنے میں امداد ملے۔ مرنے والا قبر میں چلا جاتا ہے اور اس کے پس ماندگان جیتے جی جہنم میں —— بس یہ ہوتا ہے انجام ایک واقعۂ خودکشی کا۔ فضا اس سے اس وقت تک مرتعش رہتی ہے جب تک دوسرا واقعہ سامنے نہیں آتا۔ جب دوسرا سامنے آجاتا ہے تو گویا پہلے واقعہ سے متعلق تمام اعمال و ظروف، اسباب و علل، انجام و عواقب، سب خود بخود دلمیسو ہو جاتے ہیں۔

ان واقعات کے اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے تو بیشتر حصہ مفلسی اور ناداری، تہی دامنی اور بیکاری کا نتیجہ دکھائی دے گا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک نوجوان تلاشِ معاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن اسے کہیں کام نہ مل سکا۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کہیں سے کچھ مل جائے، لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ اس انتہائی مایوسی اور

کس مپرسی کے عالم میں اس نے اپنا خاتمہ کرلیا۔

اسی طرح ناداری اور بیکاری کے ساتھ بیماری ہے۔ کئی واقعات ایسے سامنے آئے کہ ایک شخص مدت سے بیمار چلا آرہا ہے۔ لاعلاج تو ایک طرف، کھانے تک کے لئے پیسہ پاس نہیں ...... بیماری نے کام کاج کے بھی قابل نہیں رکھا۔ ہسپتال والوں نے اپنے ہاں داخل کرنے سے انکار کردیا۔ ان حالات میں اس نے یہی سوچا کہ اس زندگی سے موت بہتر۔ اٹھا اور چوتھی منزل سے کود کر جان دیدی۔

کچھ واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جن میں گھروں کے مناقشات خودکشی کا موجب بن جاتے ہیں۔ ساس بہو کی مستقل لڑائی (جو ہمارے معاشرے کا گویا فطری جزو بن چکی ہے) ماں بیٹے کے کشیدہ تعلقات۔ رشتہ داروں کی مخاصمت۔ میاں بیوی کے جھگڑے۔ ان میں نہ صرف خودکشی کے واقعات ہی رونما ہوتے ہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ غصے کی دیوانگی میں بچے کو اٹھا کر دیوار پر پٹک دیا اور وہ پاش پاش ہوکر آغشتہ خاک وخون ہوگیا۔

بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دنیا "ناکامیٔ محبت" کی اصطلاح سے تعبیر کرتی ہے لیکن درحقیقت ان کا تعلق بھی بیشتر، رشتہ داروں کی باہمی کشیدگیٔ تعلقات ہی سے ہوتا ہے۔ لڑکا ایک جگہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ماں باپ نہیں مانتے۔ یتیم بالغ لڑکی اپنے خاوند کے انتخاب میں اپنی رائے رکھتی ہے لیکن اس کا بھائی اسے کہیں اور فروخت کرنا چاہتا ہے۔

وقس علیٰ ہذا

خودکشی کے یہ کثیر التعداد واقعات درحقیقت اس جنون اور دیوانگی کے آثار ہیں جو اس وقت قوم کے دماغوں پر مسلط ہوتا جارہا ہے۔ اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کے تعین کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل کھلی ہوئی اور واضح ہے۔ تقسیم ہند کے ساتھ مسلمانوں پر جو قیامت گذری تھی وہ کسی قوم کے دماغی توازن کو کھودینے کے لئے کم نہ تھی۔ لیکن اس ہولناک مرحلے سے قوم آگے نکل آئی محض اس امید کے سہارے کہ

وہ آئی ۔ لے وہ آئی ۔ دلِ ناصبور صبح !

پاکستان، ان کے خوابوں کی تعبیر۔ ان کی آرزؤں کا گہوارہ۔ ان کی امیدوں کا سہارا۔ ان کے مستقبل کی خوش حالیوں کا ضامن اور ان کی زندگی کی خوشگواریوں کا کفیل نظر آتا تھا۔ قوم اس صبح درخشاں کی امید کے سہارے، شب تیرہ وتار کی بھیانک ظلمتوں سے آگے نکل آئی۔ لیکن یہاں کی پانچ سالہ زندگی نے ان کی تمام امیدوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا۔ انھوں نے اپنے ذہن میں جو نقشے قائم کر رکھے تھے وہ ایک ایک کرکے غلط ثابت ہوگئے۔ انھوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ وہ رات کی تاریکیوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ افقِ پاکستان سے جو صبح نمودار ہوئی ہے، وہ کسی امید کی کرن کو اپنے ساتھ نہیں لائی۔ انھوں نے اس صبح کو دیکھا اور بصد حسرت ویاس پکار اٹھے کہ

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر　　وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیم ہند کی بے پناہ مصیبتوں نے بدن سے قوتِ مدافعت سلب کرلی تھی۔ اس پنج سالہ یاس وناامیدی نے ان کے اعصاب کے ایک ایک تار کو توڑ ڈالا۔ جن کے اعصاب میں کچھ سکت باقی ہے وہ اپنے لئے موہوم امیدیں پیدا کرکے زندگی کے دن پورے کرلیتے ہیں۔ جن میں اتنی سی سکت بھی باقی نہیں رہتی وہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹ لیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے دماغی توازن کا بگاڑ ابھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ورنہ اسوقت حقیقت یہ ہوچکی ہے کہ قوم کا بیشتر حصہ اپنا دماغی توازن کھوچکا ہے کسی میں بات سننے کی تاب نہیں رہی کسی میں برداشت کی قوت نہیں اور غور وفکر کی صلاحیت تو قریب قریب معدوم ہوچکی ہے۔ لیکن ہم نے جس مقصد کے پیش نظر اس بات کو چھیڑا ہے وہ یہ نہیں وہ مقصد اس سے الگ ہے۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ واقعات صرف اتنی ہی حیثیت اور اہمیت رکھتے ہیں کہ اخبارات میں بطور "خبر" چھاپ دیا کریں۔ پولیس والے مردہ کا پوسٹ مارٹم اور زندہ بچ رہنے والے کا چالان کردیا کریں۔ ہم آپ ان خبروں کو پڑھکر اخبار ایکطرف پھینک دیا کریں گویا یہ قطب شمالی کی مچھلیوں کا کوئی واقعہ تھا۔ جس سے ہمارا واسطہ اتنا ہی تھا کہ یہ کسی مقام کی خبر (NEWS) تھی یا انہیں حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا ذریعہ بنالیا جائے یا حکومت کے دفاتر میں اپنی "سالانہ رپورٹ" کے لئے بطور (MATERIAL) سنبھال کر رکھ لیا جائے! کیا یہ واقعات فی الحقیقت اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں؟ کیا ان مرنے والوں کی موت سے خود ہماری موت وحیات کے مسئلے کا کوئی تعلق نہیں؟ کیا ان کے پس ماندگان کی بیکسی اور بے بسی سے ہماری ذلت ورسوائی کا کوئی دامن وابستہ نہیں؟ کیا ان کے اعصاب کی کمزوری کا خود ہمارے اعصاب سے کوئی علاقہ نہیں؟ کیا ان اسباب وعلل کا جن سے مجبور ہوکر یہ خودکشی کرلیتے ہیں ہمارے ماضی، حال اور مستقبل سے کچھ بھی تعلق نہیں؟ کیا یہ اپنی موت کے آپ ذمے دار ہیں، ہم پر اسکی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی؟ کیا انکا دماغی خلل ان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے، اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا؟ کیا یہ اپنا گلا آپ گھونٹتے ہیں، ہمارے ہاتھ ان کے خون کے دھبوں سے دامنِ خضر کی طرح پاک وصاف ہوتے ہیں؟ کیا اقدام خودکشی کرکے زندہ بچ رہنے والا تنہا عدالت کے کٹھرے میں کھڑے ہونے کا سزاوار ہے، ہمارا کوئی جرم نہیں جس وجہ سے ہم بھی اس کے ساتھ وہاں کھڑے ہوں؟ کیا سب الزام اور جرم انہیں کا ہے ہم سب اس باب میں بے گناہ اور معصوم ہیں؟۔

سوچئے کہ کہیں حقیقت یہ تو نہیں کہ اس جرم کا نام ہم نے "خودکشی" اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر خود فریبی یا فریب دہی کا پردہ اٹھ جائے تو خودکشی کرنے والے کے اصل قاتل ہم ہی قرار پائیں؟ یعنی کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے جرم قتل کی سزا سے بچنے کے لئے اس کا نام خودکشی رکھ چھوڑا ہے تاکہ کسی کی نظر ہم پر نہ پڑے!

انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی عدالتیں ان سوالات کا جواب کچھ ہی کیوں نہ دیں کائنات کا وہ عالمگیر قانون جو آفاقی اور انسانی دونوں دنیاؤں کو محیط ہے، اس قسم کے حادثات کا مجرم اس معاشرہ کو قرار دیتا ہے جس میں خودکشی کرنے والا اپنے لئے زندگی اور اسکی خوشگواریوں کا کوئی سامان نہیں پاتا! خودکشی صرف انسانی معاشرے کے اندر ہی ممکن ہے۔ کوئی حیوان خودکشی نہیں کرتا۔ وہ خودکشی کرسکتا ہی نہیں یہ خصوصیت صرف انسانی تمدن کی ہے۔

انسانی زندگی تضادات سے بھرپور ہے۔ اس میں قدم قدم پر تصادم واقع ہوتے ہیں۔ انسان اور خارجی قوتوں میں تضاد۔ انسان اور انسان کے درمیان تضاد۔ اور خود انسان کے اپنے اندر تضاد۔ اس کا سینہ ہمیشہ تضادات کی کشمکش اور تصادمات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ خارجی قوتوں سے مقابلہ کرنے میں انسان کبھی خودکشی نہیں کرتا وہ خودکشی اسوقت کرتا ہے جب وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں عاجز آجاتا ہے۔ یا جب وہ اپنے سینے کی اندرونی کشمکش کے ہاتھوں لاچار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اس تیسری شق کو دیکھیں (یعنی انسان کی داخلی کشمکش) تو اس میں بھی آپ آخرالامر اس نتیجہ پر پہنچینگے کہ اس میں بے کسی اور لاچاری کی نوبت بھی اسوقت ہی آتی ہے جب انسانوں کی دنیا اسکا ساتھ نہیں دیتی۔ اس لئے خودکشی درحقیقت اس زندگی میں ہوتی ہے جہاں انسان کا واسطہ انسان سے پڑتا ہو۔

ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ خارجی قوتوں کے ساتھ نبردآزما ہوتے وقت انسان کبھی خودکشی نہیں کرتا۔ وہ خودکشی اسوقت کرتا ہے جب اس کا واسطہ انسانوں سے پڑے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کائنات کی خارجی قوتیں ایک لگے بندھے قانون کے تابع چل رہی ہیں۔ انہیں اس قانون کی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہے (وسخر لکم مافی السمٰوٰت والارض جمیعا) جسوقت انسان اس قانون کا علم حاصل کر لیتا ہے یہ تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہیں (آدم، علم الاسماء سے مسجودِ ملائک بنتا ہے)۔ ان کے برعکس انسان کسی قانون کی اطاعت پر مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ جس قسم کا قانون چاہے اپنے لئے وضع کرلے اور جب جی چاہے اس قانون کی اطاعت کرے، جب جی چاہے اس سے سرکشی برت لے۔

لیکن انسان معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اور معاشرہ کی ترکیب اور قیام، قانون کے بغیر ناممکن ہے۔ کوئی سوسائٹی قانون کے بغیر قائم رہ ہی نہیں سکتی۔ معاشرہ کے قانون کون بناتا ہے؟ ارباب اقتدار! انسان کی ساری تاریخ اس پر شاہد ہے۔ خواہ وہ شخصی حکومت کا مطلق العنان بادشاہ ہو اور خواہ جمہوری فریب کی مجالس آئین ساز۔ انسان کا خود ساختہ قانون ہمیشہ اربابِ قوت واقتدار کا وضع کردہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا اولیں منشاء ومقصود اقتدار کی حفاظت اور استحکام ہوتا ہے۔ اس معاشرہ میں فرد کا مقام بہ حیثیت فرد کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں تمام اہمیتیں اور جملہ حیثیتیں اضافی (RELATIVE) ہوتی ہیں۔ ذاتی (INTRINSIC) نہیں ہوتیں اس میں آدمی (MAN) کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ کوئی فرد محض فرزندِ آدم (HUMAN BEING) ہونے کی جہت سے متعارف ہی نہیں ہوتا اس کے تعارف (INTRODUCTION) کے لئے کسی نہ کسی اضافی نسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ایسے معاشرہ میں جب تک افراد کی اضافی حیثیت قائم رہتی ہے وہ اپنے آپ کو زندگی اور اس کی خوشگواریوں کا مستحق سمجھتا اور ان کا مورد پاتا ہے۔ لیکن جسوقت یہ اضافی حیثیتیں ختم ہو جاتی ہیں معاشرے میں اسکی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں رہتا۔ نہ ہی معاشرے کو اس سے کوئی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ یہ فرد بالکل تنہا رہ جاتا ہے اور بستی دنیا اور بھری محفل میں اپنے آپ کو اکیلا پاتا ہے۔ تنہائی کا احساس، انسان کو مار دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ انسان کے لئے سب سے زیادہ سنگین سزا، قیدِ تنہائی (SOLITARY CONFINEMENT) ہے۔ اس مقام پر انسان زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں پاتا۔ دنیا میں اس کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ بلکہ دنیا اس کیلئے تنہائی کا قیدخانہ بن جاتی ہے۔ تنہائی کا شدید احساس ہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر انسان خودکشی کر لیتا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی خودکشی کرنے والا کسی کو اپنا رازدار نہیں بناتا۔ وہ اپنے اس ارادے میں کسی کو شریکِ راز نہیں کرتا۔ یہ اس لئے کہ

وہ خودکشی کا ارادہ ہی اسوقت کرتا ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ جو انسان بھی یہ سمجھ لے کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے وہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ زندگی اسے کالی ناگن بنکر ڈستی ہے۔ یہی خودکشی کا مقام ہوتا ہے۔

اب آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ خودکشی کرنے والا خود مجرم ہوتا ہے یا مجرم ہوتا ہے وہ معاشرہ جو اسے یہ سمجھنے اور محسوس کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا کوئی نہیں اگر معاشرہ اسے تنہا نہ چھوڑے تو وہ خودکشی نہ کرے۔ لیکن معاشرے کی اس سے دلچسپی اس وقت تک رہتی ہے جب تک معاشرہ اسے . . . . اپنے کسی مقصد کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ جب معاشرے کا کام اس کے بغیر چلتا رہتا ہے تو معاشرے کو اتنا بھی یاد نہیں رہتا کہ ایسا کوئی فرد بھی کبھی موجود تھا۔

لہذا خودکشی پیدا کردہ ہے اس معاشرہ کی جس میں فرد کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے اور تنہا اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ معاشرہ سمجھتا ہے کہ میرا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں فرد معاشرہ کے قیام کے لئے زندہ ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کی حفاظت کے لئے قائم نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو انسانوں کے خود ساختہ قانون پر مبنی ہوتا ہے۔

ایک معاشرہ اور ہوتا ہے۔ اس معاشرہ کی بنیاد ہوتی ہے ایک ایسے قانون پر جو قانونِ کائنات کی طرح انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہوتا بلکہ وہ وہیں سے ملتا ہے جہاں سے قانونِ کائنات ملتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں (چنانچہ قرآن میں قانونِ کائنات کے لئے بھی وحی کا لفظ آیا ہے) اس قانون اور قانونِ کائنات میں فرق یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کائنات کا قانون از خود جاری و ساری ہے۔ لیکن انسانوں نے اس قانون کو اپنے اوپر خود نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اس قانون کی اولیں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرد کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ہر فردِ آدم کے اندر اپنی "روح پھونک دی" ہے (ونفخنا فیہ من روحنا) یعنی ہر پیکرِ انسان اس روحِ خداوندی کا حامل ہے۔ خدا ایک ذات (PERSONALITY) ہے۔ اس لئے نفخ روحِ خداوندی سے مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان' انسان ہونے کی حیثیت سے ذات . . . . . (PERSONALITY) رکھتا ہے یہی ذات (PERSONALITY) اس کے لئے وجہ تکریم ہے۔ (ولقد کرمنا بنی آدم) یعنی ہر آدمی محض آدمی ہونے کے اعتبار سے موجبِ تکریم ہے۔ انسان کی یہ قدر و قیمت ذاتی ہے۔ اضافی نہیں۔ یعنی ہر انسان' ہر آدمی' ہر فردِ انسانیت محض انسان ہونے کی رو سے مستحقِ تکریم و سزاوارِ تعظیم ہے۔ لیکن انسان کی ذات (PERSONALITY) غیر تربیت یافتہ (UN-DEVELOPED) شکل میں ہوتی ہے۔ اسکی نشوونما اور تکمیل معاشرے کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے معاشرے کا وجود لازمی ہے۔ لیکن معاشرہ' فرد کے لئے ہوتا ہے' فرد معاشرے کے لئے نہیں ہوتا۔ معاشرے کا فریضہ' فرد کی حفاظتِ ذات ہے (یا تکمیلِ خودی) ہے یعنی اسکی صلاحیتوں کی نشوونما اور تربیت و تکمیل اگر معاشرے کا کوئی آئین یا تقاضا' فرد کی ذات (اسکے جوہرِ خودی) پر دباؤ کا موجب بنتا ہے۔ اگر اس کی کسی پابندی سے فرد کی ذات . . . . (PERSONALITY) میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ تو یہ معاشرہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے قائم رکھا جائے۔ معاشرے کا کام افراد میں باہمی ربط پیدا کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ اس سے ان کے مضمر جوہروں کی تربیت (DEVELOPMENT) ہو سکے۔ اس معاشرے میں استبداد تو کجا (عام معانی میں) حکومت کا بھی تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں حکومت سے مفہوم ہوتا ہے افرادِ معاشرہ کا باہمی رضامندی سے' قانونِ خداوندی کو اپنے اوپر

نافذ کرلینا۔ اور چونکہ اس قانون کی علتِ غائی انسانی ذات کی تربیت و تکمیل ہوتی ہے اس لئے یہ تمام افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کی ربوبیت (تربیت) کے ذمے دار بن جاتے ہیں۔ (یعنی قرآن کی اصطلاح میں ربانی بن جاتے ہیں)۔ پھر سن لیجئے کہ اس معاشرہ میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ لہٰذا ان افراد پر مشتمل معاشرہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے جو خارجی کائنات میں خود خدا نے براہِ راست اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ اشیائے کائنات کی ربوبیت (نشو و نما اور تکمیل) قانونِ خداوندی کے ماتحت، از خود ہوتی چلی جاتی ہے لیکن انسانی معاشرہ میں یہی چیز خود انسانوں کے ربّانی (ربوبیت کے ذمہ دار) بننے سے ظہور میں آتی ہے۔ اس لئے اس معاشرہ میں جس نظام کا نام حکومت رکھا جاتا ہے وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا ذمہ دار بن جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا "زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو"۔ خارجی کائنات میں عطائے رزق (سامانِ زندگی) کی یہ ذمہ داری قانونِ خداوندی کے ماتحت خود بخود (براہِ راست) ادا ہوتی جاتی ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں یہی ذمہ داری معاشرے (یا اجتماعی نظام) کے ہاتھوں سے ادا ہوگی جو قانونِ خداوندی کی تنفیذ کا مدعی ہے۔ اب سوچئے کہ ایسے معاشرے میں اس کا تصور تک بھی کیا جاسکتا ہے کہ افرادِ معاشرہ کے مفاد کا باہمی تصادم ہوگا؟ جس معاشرے میں فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کا ذمہ دار ہو، اس میں تصادمِ مفاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس معاشرے میں وہ تمام تضادات (CONTRADICTIONS) جو انسان کو انسان سے واسطہ پڑنے سے پیدا ہوتی تھیں، باہمی توافق میں بدل کر حل (RESOLVE) ہوجاتی ہے۔

اب لیجئے انسان کے داخلی تضادات (اندرونی کشمکش)۔ اس قانون کی رو سے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہر فردِ انسانیت، روحِ خداوندی کا حامل ہے۔ یعنی ہر انسان ایک ذات (PERSONALITY) رکھتا ہے لیکن انسانی ذات اپنی غیر تربیت یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں ہوتی ہے اور خدا کی ذات (PERSONALITY) مکمل ترین شکل میں۔ انسان کی ذات اس معاشرے کے اندر آہستہ آہستہ، بتدریج تربیت و تکمیل حاصل کرتی جاتی ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ صفاتِ خداوندی کی مظہر بنتی جاتی ہے خدا کی ذات (PERSONALITY) وہ ہے جس میں کوئی تضاد نہیں۔ اس کے اسماء (صفات) میں کامل ہم آہنگی اور اکمل تناسب و توازن ہے۔ اس لئے جوں جوں انسانی ذات تربیت حاصل کرتی جاتی ہے۔ اس کے اندر تضادات خود بخود حل (RESOLVE) ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح انسان کے داخلی تضادات بھی ہم آہنگی سے بدل جاتے ہیں۔

اب ذرا سامنے لائیے اس معاشرے کو جس میں نہ انسان کے اندر (داخلی) تضادات ہوں اور نہ ہی انسان و انسان میں تضادات جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی ربوبیت کا ذمہ دار ہو اور اس ربوبیت کا نتیجہ انسانی ذات کی تربیت و تکمیل ہو۔ کیا ایسے معاشرے میں کوئی فرد بھی ایسا ہوسکتا ہے جس پر کبھی کوئی وقت ایسا آئے جس میں وہ محسوس کرے کہ وہ تنہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ اس معاشرے کا وجود ہی ان افراد سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس معاشرے میں جماعت (سوسائٹی) ایک اجتماعی نظم و نسق (ORGANISATION) کی حیثیت لئے ہوتی ہے افراد کو جذب کرلینے والا

وجود (ORGANISM) نہیں بن جاتی۔ اس معاشرہ میں ایک انسان (فرد۔ نفس) کی قیمت تمام نوع انسان کے برابر قرار دی جاتی ہے۔ اس لئے اگر معاشرے کی کسی کوتاہی یا غفلت سے، ایک فرد بھی ناحق ضائع ہو جائے تو پورے کا پورا معاشرہ، جملہ انسانیت کے قتل کے جرم کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے۔ فکانما قتل الناس جمیعا (۳۲/۵)۔ گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر دیا۔

غور کیجئے کہ ایسے معاشرے میں کسی فرد کو اس کا خیال تک بھی آسکتا ہے کہ وہ خودکشی کرے! اس معاشرے میں ہر فرد کو خود زندگی اور انسانی ذات کی صحیح صحیح قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ اور پورے کا پورا معاشرہ ہر فرد کی حفاظت و صیانت اور تربیت و تکمیل ذات کے لئے سرگرم عمل رہتا ہے۔ اندریں حالات دنیا سے خودکشی کا وجود مٹانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں اس قسم کا معاشرہ متشکل کر دیا جائے۔ اس قسم کے معاشرے کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے انسانی فکر میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور وہ کائنات، انسانی ذات اور اس کے اقدار کے متعلق تمام تصورات ٹھیک ٹھیک سمجھ لے۔ اس کا نام ہے تعلیم الکتاب والحکمۃ۔ طلوع اسلام کی تمام جدوجہد کا منتہی اور ہر سعی و کاوش کا مقصود و مطلوب، اس قسم کے قرآنی معاشرہ کی تشکیل و قیام ہے۔ اسی کے لئے وہ قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے ہمہ تن اضطراب رہتا ہے۔ موجودہ مذہبی تصورات کے خلاف اس کا جہاد (جسے یہ مُلّا کے مذہب یا عجمی سازش کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے) اس پروگرام کا حصہ لا ہے۔ اس لئے کہ کوئی نئی عمارت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کی پہلی غلط بنیادوں کو اکھیڑا نہ جائے۔ لیکن صرف حصہ لا کسی پروگرام کی کامیابی کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے حصہ "الا" کی بھی اتنی ہی (بلکہ اس سے زیادہ) ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی طلوع اسلام ساتھ کے ساتھ تعمیری نقشے پیش کرتا جارہا ہے۔ لیکن اس باب میں اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے۔ ہمارے پیش نظر پروگرام کے مطابق وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں جب طلوع اسلام اس باب میں "متشابہات" سے "محکمات" تک آجائیگا۔ قرآن پر غور و فکر سے یہ حقیقت ابھر کر ہمارے سامنے آگئی ہے کہ قرآنی خطوط پر ذہنی انقلاب کے بعد اس قسم کے معاشرے کی تشکیل جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، زیادہ وقت نہیں لیا کرتی۔

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ———— حیست معراج؟ انقلاب اندر شعور۔ . . . .

اس لئے انقلاب فکر کے بعد تشکیل معاشرہ کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ درحقیقت صبر آزما، ہمت طلب اور استقامت خواہ مرحلہ انقلاب اندر شعور ہی کا ہوتا ہے۔ یہ ہو جائے تو پھر عشق کی آگ جست تمام قصے طے کر دیا کرتی ہے۔

طلوع اسلام اس مقصد کو لیکر اُٹھا ہے اور اسے اللہ کی توفیق سے پورا بھروسا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل ہو کر رہے گی۔

واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب

(باقی لمعات صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

ضرب الکلیم

[ذیل میں وہ "پیش لفظ" شائع کیا جا رہا ہے جو محترم پرویز صاحب نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے بالقابہ کے "ضرب کلیم" کے عربی ترجمے کیلئے تحریر فرمایا۔ اس کا حصہ اول مئی کے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے لیکن مضمون کے تسلسل اور بالخصوص اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے مکمل شائع کیا جا رہا ہے۔ طلوعِ اسلام]

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے، علامہ اقبال نے اس کا نام ضرب کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی

اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب ضرب کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ غیر انقلاب ہے اُس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف، جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا، اور دامِ ہمرنگ زمین کی صورت میں، عینِ اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کر دیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو نکالنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر، غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوحِ مسلم اس سرابِ رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ، حشیشیئں۔ مجوس کی غلامانہ نسل پرستی۔ یہود کی قشری شریعت رسومات۔ رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفرین خانقاہیت، ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوالہ تھی، کوتاہیٔ امل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ، اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں طوفان در طوفان امنڈے چلا آ رہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملتِ اسلامیہ کی نژادِ نَو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی تھیں۔ ضرب کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اسقدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آ سکتا، جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدّین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رُو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے، حیات کا سرچشمہ ایک ہے اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ

(۱) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمود زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیاءِ فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و ائتلافِ ملت کے محکم تصور سے، انسان اور کائنات۔ انسان اور انسان، اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۲) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ، انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہنستی کھیلتی، رقص کرتی، شاداں و فرحاں اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تصویر کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آ گئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ، قوم کو ذاتی مفاد حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العین حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق، وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ پاگل خانے میں گذارنا ہوگا۔ اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں ۔۔۔۔ مصروفِ پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبالؒ اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملتِ اسلامیہ کو بالخصوص، اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے "ضربِ کلیم"۔ جس سے اقبالؒ بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں، فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے نور و فلاح کے چشمے ابلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اترتے ہیں۔

پیامِ اقبالؒ کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم، صاحب السعادۃ، عبدالوہاب عزام بے کی "ضاربہ تشگافی" اور "جوئے شیر" کے تصدق تنگنائے اردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادبان کشا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اسوقت تک شرمندۂ ساحل تھی بیکراں بنا رہا ہے۔

اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی، جو اس پیام حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اسقدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر وہی تخم صالح بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجر بلند و بالا پیدا ہو چکا ہے، جس کی رفعتوں کے متعلق اصلها ثابت وفرعها فی السماء کہا گیا تھا اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لا شرقیۃ ولا غربیۃ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اس شجر طیب و مبارک کی روئیدگی و بار آوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے اور یہی پیام اقبال کا مقصود و منطوق ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں، اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یا درویش، قلندر، مردِ حُر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے۔ خودی ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبال کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اسلئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئیگا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ "کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟" دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون، اور اس کی اتباع میں حکمائے ایران اور ہند، اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے اسلئے انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سُلا دیا۔

اقبال نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر

یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت تشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک جوں جوں انسان اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔" خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اُس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنیوالے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے شر ہے۔

اقبال کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصلِ قوت ہے کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کیلئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کیلئے اسی تپش و خلش کا نام، اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جد و جہد کی کامیابی کیلئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اول اطاعت، اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کی کامل اتباع جس کیلئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ امالہ یا کظامت (زائد قوتوں کا رُخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبال نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابتِ الٰہیہ سے یہ مراد نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے اسلئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو)۔ یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقامِ اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچکر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبال کی اصطلاح میں فقر، درویشی یا قلندری ہے۔ یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غنیٌ عن العالمین" کا مظہر ہو۔

ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ پیامِ اقبال کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

میانِ اُمتاں والا مقام است — کہ آں امت دوگیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش — کہ خواب و خستگی بروے حرام است

اور

باغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے — فقیرِ اُو بہ درویشی امیرے

لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً۔

یتیم پوتے کی وراثت

یوں تو قرآن کریم کی تعلیم کا کونسا گوشہ ہے جس کی اعجازی کیفیت سے چشم بصیرت محو حیرت نہیں رہ جاتی۔ (اس کا تو ایک ایک لفظ بے مثل و بے نظیر ہے) لیکن بعض احکام کی جامعیت ایسی ہے جس پر غور و فکر سے روح وجد میں آجاتی ہے۔ انہی احکام میں قرآن کا قانونِ وراثت بھی ہے۔ قرآن نے اپنی چار مختصری آیات میں اتنا اہم اور وسیع قانون اس انداز سے اصولی طور پر سمیٹ کر رکھدیا ہے کہ اس کی جامعیت اور ایجاز پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ہماری بدبختی ملاحظہ ہو کہ یہی قانونِ وراثت جب ملا کے ہتے چڑھ گیا تو نہ صرف یہ کہ یہ قانون دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بن گیا بلکہ اس کی بعض شقیں ایسی مضحکہ انگیز شکلیں اختیار کر گئیں کہ انھیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ انہی گوشوں میں ایک مسئلہ یتیم پوتے کی وراثت کا ہے چونکہ یہ مسئلہ (قانونی مسائل کی طرح) فنی ہے اس لئے اسے ذرا غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے صرفِ نظر کر کے اسے عام فہم الفاظ میں سمجھایا جائے۔ ذرا ذیل کے نقشے کو سامنے رکھئے

زید

(زید کا بیٹا) بکر — عمر (زید کا بیٹا)

(بکر کا بیٹا) حامد — رشید (عمر کا بیٹا)

زید کی زندگی میں بکر فوت ہو گیا۔ اس کے بعد زید وفات پا گیا۔ زید کی وفات کے وقت اس کا بیٹا عمر بھی زندہ ہے۔ (اور رشید بھی) اور اس کے ساتھ اس کا یتیم پوتا (حامد) بھی۔ ملا کا مذہب ہے کہ زید کی ساری جائداد، عمر کے حصے میں آگئی۔ حامد کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا قصور؟ یہی کہ وہ یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں، اسے وراثت سے کیوں نہ محروم کیا جائے؟

مرے کو مارے شاہ مدار

ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے۔

ہم نے، اس سے پیشتر، ایک مرتبہ مختصراً اس مسئلے کے متعلق طلوع اسلام (کے باب المراسلات) میں لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اب یہ مسئلہ، ملک کا قانون بن گیا ہے، اس لئے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا جائے۔ پہلے ان دلائل کو لیا جائے جو اس کی محرومی کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس مضمون کو چھاپ دیا جائے جو اس سے قبل طلوع اسلام میں لکھا جا چکا ہے اور پھر علامہ اسلم جیراجپوری کا مقالہ "محجوب الارث" شائع کر دیا جائے۔ موخر الذکر مقالہ آجکل نایاب ہو چکا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک دوست نے . . . ہم تک پہنچایا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس طرح ایک اہم تحقیقی مضمون

طلوع اسلام کے دفتین میں محفوظ ہوجائے گا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اب آئیے ان دلائل کی طرف۔ رسالہ ترجمان القرآن (بابت مارچ ۱۹۵۲ء) میں حسب ذیل سوال اور اس کا جواب شائع ہوا ہے۔

سوال ۔ دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مرجائے تو پوتے کو وراثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت کی حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف مسالک کیا ہیں۔ اور آپ کس مسلک کو مزاج اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی دستگیری کا اسقدر مدعی ہے ایک یتیم کو محض اس لئے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات سے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا۔"

اس کا جواب، ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طرف سے یہ دیا گیا ہے۔

جواب ، فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کردیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے، کیونکہ پوتا بہرحال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پاسکتی ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہوجائے گا۔ یہ نہیں کہ اس شخص کے مرنے پر اس کے ترکہ میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے؟

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لئے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کرے ⅓ مال کی حد تک وہ وصیت کرسکتا ہے اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے، یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو ان کے لئے وصیت کرجائے۔ یہ گنجائش اسی لئے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جاسکے۔

مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں قرآن وحدیث میں کوئی ایسا حکم صریح نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کردیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے"۔ یہی وہ تقلید ہے جس کی قرآن اس شدت سے مخالفت کر رہا ہے اور جس کی وجہ سے قوموں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہوجاتی ہے اور وہ کالانعام بل ھم اضل کی (حیوانی، بلکہ ان سے بھی بدتر) سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔ خود مودودی صاحب اپنی بیشتر تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں قرآن اور حدیث خاموش ہوں انھیں ہم اپنی بصیرت سے حل کریں گے۔ اس چیز کو انھوں نے "دستور پاکستان" کے اس خاکے میں بھی بیان کیا ہے جو ان کی طرف سے مرتب ہو کر شائع ہوا تھا۔ لیکن اب ان کا ارشاد یہ ہے کہ جو امور سلف سے خلف تک وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں ان کے خلاف رائے دینا مشکل ہے، خواہ ان کی تائید میں قرآن وحدیث کا کوئی حکم بھی نہ ملے۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے اس مسلک کی تائید میں دلائل لاکر (بزعم خویش) ثابت کیا ہے کہ یہ مسلک معقول بھی ہے۔ اب ان دلائل اور ان کی معقولیت کو دیکھئے۔ دلیل یہ ہے کہ

(i) پوتا، اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے، نہ کہ براہ راست

جس طرح بہو، اپنے شوہر کے واسطے ہی سے خسر کے مال میں حصہ پاسکتی ہے۔

(ii) فوت شدہ وارث کا حصہ نہیں نکالا جاتا۔ اس لئے یتیم پوتا اپنے دادا کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا۔

یہ دلائل، عقل، علم اور قرآن سب کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قانونِ وراثت کے بھی خلاف۔

مودودی صاحب کا دعوٰی یہ ہے کہ "پوتا اپنے باپ کے واسطہ سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہوسکتا ہے"۔ اور "جب واسطہ نہ رہے تو یہ حق ساقط ہوجاتا ہے"۔ یہ دعوٰی بنیادی طور پر غلط ہے۔ ذرا اس نقشے کو سامنے لائیے جو پہلے پیش کیا جاچکا ہے۔ مودودی صاحب کے دعوے کی بنا پر رشید، عمر کے واسطے سے زید کے مال کا حقدار ہے۔ اور حامد اس لئے زید کے مال کا حقدار نہیں کہ اس کا واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا عمر کی موجودگی میں رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے ایک پائی بھی پاسکتا ہے؟ عمر کی موجودگی میں، زید کے مال کا حقدار عمر ہی ہے نہ کہ رشید۔ یہ قانونِ وراثت کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دلیل کی رو سے بات کیا بنی۔

(ا) حامد اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔

(ب) رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (عمر) موجود ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کی دلیل کو پھر دہرا لیجئے کہ حامد اپنے باپ (بکر) کے واسطے سے ہی زید کے مال کا حقدار ہوسکتا ہے۔ اور چونکہ حامد اور زید کے درمیان واسطہ (بکر) نہیں رہا اس لئے حامد زید کے مال کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ لیکن مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر زید کی زندگی میں حامد فوت ہوجائے تو زید اس کے مال کا حقدار ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہ اگر زید کی زندگی میں عمر بھی فوت ہوجائے تو زید کی موت پر حامد اور رشید دونوں اس کے مال کے حقدار ہوجاتے ہیں

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ

(۱) حامد اور زید کے درمیان کونسا واسطہ تھا جس کی رو سے زید، حامد کے مال میں حقدار بن گیا؟ اور

(۲) زید کی زندگی میں عمر کے مرجانے کی صورت میں، وہ کونسا واسطہ تھا جس کی رُو سے حامد اور رشید دونوں یتیم پوتے زید کے مال کے وارث قرار پا گئے؟

یہ تھی مودودی صاحب کی دلیل! حیرت ہے کہ انھیں (قرآن تو ایک طرف) فنِ وراثت کے ابتدائی اصولوں تک سے بھی واقفیت نہیں۔ مودودی صاحب نے یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہو کی مثال پیش کرکے اس شبہ کو اور بھی قوی کردیا ہے کہ انھیں فی الواقعہ قانونِ وراثت کے مبادیات تک کا بھی علم نہیں۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اس مثال سے عوام اس کے قائل ضرور ہوگئے ہوں گے کہ مودودی صاحب کی دلیل بڑی وزنی ہے۔ کیونکہ جب بکر کی بیوہ زید کے مال سے حصہ نہیں پاسکتی تو بکر کا بیٹا (حامد) کس طرح حصہ پائے گا!

قرآن کی رو سے رشتہ داروں کی دو قسمیں ہیں (اور یہ تقسیم ایسی کھلی ہے کہ ہر شخص اسے تسلیم کریگا)۔ ایک نسبی رشتہ دار یعنی وہ جو اشتراکِ نسب کی بنا پر رشتہ دار ہوں۔ مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ اور نیچے کی طرف بیٹا، پوتا، پرپوتا وغیرہ۔ یا بھائی بہن۔

دوسری قسم عقدی رشتے کی ہے جس میں میاں بیوی شامل ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف نکاح کے عہد و پیمان سے ہوتا ہے، اشتراکِ نسب کی بنا پر نہیں ہوتا۔ اس لئے میاں بیوی کا وارث ہوتا ہے اور بیوی میاں کی۔ بکر کی بیوہ، زید سے نہ تو نسبی رشتے میں ہے نہ اس کے عقد میں آئی ہے۔ پھر وہ زید کے مال میں کس طرح وارث ہوسکتی ہے؟ وہ اپنے شوہر کے مرنے پر اس کے ترکے سے وراثت پاسکتی ہے۔ زید سے اس کا وراثتی تعلق ہی نہیں۔ نسب کا رشتہ مستقل رشتہ ہوتا ہے لیکن عہدی رشتہ، صرف عہد و پیمان تک رہتا ہے۔ بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا مرچکا ہو۔ لیکن اگر بیوی سے عہدِ نکاح توڑ دیا جائے (یعنی طلاق دیدی جائے) تو اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ دادا اور پوتا نسبی رشتے دار ہیں۔ بکر زندہ ہے تو مرگیا ہے تو، حامد بہرحال زید کا پوتا ہے۔ بہو اور خسر کا یہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بہو اور خسر کی مثال سے دادا اور پوتے پر دلیل لانا یکسر غلط ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کا یہ سوال سرے سے غلط ہے کہ کوئی شخص کسی واسطے سے متوفی کے مال میں حقدار ہوتا ہے، مثلاً (نقشے میں دیکھئے) زید کی موت پر (مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک کے مطابق) عمر کو زید کے ترکے سے ایک ہزار روپیہ ملا۔ رشید کا اس ہزار روپے میں ایک پائی کا بھی حصہ نہیں۔ عمر کے مرنے پر رشید، عمر کے مال کا حقدار ہوگا۔ اگر عمر نے اپنی زندگی میں وہ ہزار روپیہ خرچ کردیا جو اسے زید کے ترکے میں ملا تھا تو رشید کے حصے میں اس ہزار روپے میں سے پھر بھی کچھ نہیں آئے گا۔ لہذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ رشید، عمر کے واسطے سے زید کے مال میں حقدار ہوتا ہے۔ اصول اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص واسطے کی موجودگی میں کسی کے مال میں حقدار نہیں ہوتا۔ اس اصول کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی جہاں واسطے کی بجائے حجب کا لفظ استعمال کیا جائے گا جو اس فن کی صحیح اصطلاح ہے۔

مودودی صاحب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں قرآن وحدیث میں کوئی ایسا حکم صریح نہیں ملا جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں کہ "لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے"۔ یہی وہ تقلید ہے جس کی قرآن اس شدت سے مخالفت کر رہا ہے اور جس کی وجہ سے قوموں میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے اور وہ کالانعام بل هم اضل کی (حیوانی، بلکہ ان سے بھی بدتر) سطح پر پہنچ جاتی ہیں خود مودودی صاحب اپنی بیشتر تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں قرآن اور حدیث خاموش ہوں انھیں ہم اپنی بصیرت سے حل کریں گے۔ اس چیز کو انھوں نے "دستور پاکستان" کے اس خاکے میں بھی بیان کیا ہے جو ان کی طرف سے مرتب ہو کر شائع ہوا تھا۔ لیکن اب ان کا ارشاد یہ ہے کہ جو امور سلف سے خلف تک وراثتاً منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں ان کے خلاف رائے دینا مشکل ہے، خواہ ان کی تائید میں قرآن وحدیث کا کوئی حکم بھی نہ ملے۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے اس مسلک کی تائید میں دلائل لاکر (بزعم خویش) ثابت کیا ہے کہ یہ مسلک معقول بھی ہے۔ اب ان دلائل اور ان کی معقولیت کو دیکھئے۔ دلیل یہ ہے کہ

(۱) پوتا، اپنے باپ کے واسطے سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے، نہ کہ براہ راست

جس طرح بہو، اپنے شوہر کے واسطے ہی سے خسر کے مال میں حصہ پاسکتی ہے۔

(۲) فوت شدہ وارث کا حصہ نہیں نکالا جاتا۔ اس لئے یتیم پوتا اپنے دادا کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا۔

یہ دلائل، عقل، علم اور قرآن سب کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ فقہی قانونِ وراثت کے بھی خلاف۔

مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ "پوتا اپنے باپ کے واسطہ سے ہی دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے"۔ اور جب واسطہ نہ رہے تو یہ حق ساقط ہو جاتا ہے"۔ یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے۔ ذرا اس نقشے کو سامنے لائیے جو پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ مودودی صاحب کے دعوے کی بنا پر رشید، عمر کے واسطے سے زید کے مال کا حقدار ہے۔ اور حامد اس لئے زید کے مال کا حقدار نہیں کہ اس کا واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا عمر کی موجودگی میں رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے ایک پائی بھی پاسکتا ہے؟ عمر کی موجودگی میں زید کے مال کا حقدار عمر ہی ہے نہ کہ رشید۔ یہ قانونِ وراثت کا ابتدائی قاعدہ ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دلیل کی رو سے بات کیا بنی۔

(۱) حامد اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (بکر) موجود نہیں ہے۔

(ب) رشید اپنے دادا (زید) کے مال سے حصہ نہیں پاسکتا کیونکہ ان دونوں کا درمیانی واسطہ (عمر) موجود ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کی دلیل کو پھر دہرا لیجئے کہ حامد اپنے باپ (بکر) کے واسطے سے ہی زید کے مال کا حقدار ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ حامد اور زید کے درمیان واسطہ (بکر) نہیں رہا اس لئے حامد زید کے مال کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مودودی صاحب کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر زید کی زندگی میں حامد فوت ہو جائے تو زید اس کے مال کا حقدار ہوتا ہے۔

اور یہ بھی کہ اگر زید کی زندگی میں عمر بھی فوت ہو جائے تو زید کی موت پر حامد اور رشید دونوں اس کے مال کے حقدار ہو جاتے ہیں۔

کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ

(۱) حامد اور زید کے درمیان کونسا واسطہ تھا جس کی رو سے زید، حامد کے مال میں حقدار بن گیا؟ اور

(۲) زید کی زندگی میں عمر کے مرجانے کی صورت میں، وہ کونسا واسطہ تھا جس کی رُو سے حامد اور رشید دونوں یتیم پوتے زید کے مال کے وارث قرار پاگئے؟

یہ تھی مودودی صاحب کی دلیل! حیرت ہے کہ انہیں (قرآن تو ایک طرف) فنِ وراثت کے ابتدائی اصولوں تک سے بھی واقفیت نہیں۔ مودودی صاحب نے یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہو کی مثال پیش کر کے اس شبہ کو اور بھی قوی کر دیا ہے کہ انہیں فی الواقعہ قانونِ وراثت کے مبادیات تک کا بھی علم نہیں۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ اس مثال سے عوام اس کے قائل ضرور ہو گئے ہوں گے کہ مودودی صاحب کی دلیل بڑی وزنی ہے۔ کیونکہ جب بکر کی بیوہ زید کے مال سے حصہ نہیں پا سکتی تو بکر کا بیٹا (حامد) کس طرح حصہ پالے گا!

قرآن کی رو سے رشتہ داروں کی دو قسمیں ہیں (اور یہ تقسیم ایسی کھلی ہے کہ ہر شخص اسے تسلیم کریگا)۔ ایک نسبی رشتہ دار یعنی وہ جو اشتراکِ نسب کی بنا پر رشتہ دار ہوں۔ مثلاً باپ، دادا، پردادا وغیرہ اور نیچے کی طرف بیٹا، پوتا، پرپوتا وغیرہ۔ یا بھائی بہن۔

دوسری قسم عقدی رشتے کی ہے جس میں میاں بیوی شامل ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ صرف نکاح کے عہد و پیمان سے ہوتا ہے، اشتراکِ نسب کی بنا پر نہیں ہوتا۔ اس لئے میاں بیوی کا وارث ہوتا ہے اور بیوی میاں کی۔ بکر کی بیوہ، زید سے نہ تو نسبی رشتے میں ہے نہ اس کے عقد میں آئی ہے۔ پھر وہ زید کے مال میں کس طرح وارث ہو سکتی ہے؟ وہ اپنے شوہر کے مرنے پر اس کے ترکہ سے وراثت پا سکتی ہے۔ زید سے اس کا وراثتی تعلق ہی نہیں۔ نسب کا رشتہ مستقل رشتہ ہوتا ہے لیکن عہدی رشتہ، صرف عہد و پیمان تک رہتا ہے۔ بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے خواہ اس کا باپ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔ لیکن اگر بیوی سے عہدِ نکاح توڑ دیا جائے (یعنی طلاق دیدی جائے) تو اس سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ دادا اور پوتا نسبی رشتے دار ہیں۔ بکر زندہ ہے تو، مر گیا ہے تو، حامد بہر حال زید کا پوتا ہے۔ بہو اور خسر کا یہ رشتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے بہو اور خسر کی مثال سے دادا اور پوتے پر دلیل لانا یکسر غلط ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ مودودی صاحب کا یہ سوال سرے سے غلط ہے کہ کوئی شخص کسی واسطے سے متوفی کے مال میں حقدار ہوتا ہے۔ مثلاً (نقشے میں دیکھئے) زید کی موت پر (مودودی صاحب کے پیش کردہ مسلک کے مطابق) عمر کو زید کے ترکے سے ایک ہزار روپیہ ملا۔ رشید کا اس ہزار روپے میں ایک پائی کا بھی حصہ نہیں۔ عمر کے مرنے پر رشید، عمر کے مال کا حقدار ہوگا۔ اگر عمر نے اپنی زندگی میں وہ ہزار روپیہ خرچ کر دیا جو اسے زید کے ترکے میں ملا تھا تو رشید کے حصے میں اس ہزار روپے میں سے پھر بھی کچھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ رشید، عمر کے واسطے سے زید کے مال میں حقدار ہوتا ہے۔ اصول اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص واسطے کی موجودگی میں کسی کے مال میں حقدار نہیں ہوتا۔ اس اصول کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی جہاں واسطے کی بجائے حجب کا لفظ استعمال کیا جائے گا جو اس فن کی صحیح اصطلاح ہے۔

قرآنی احکام وراثت میں ہے کہ

(i) للرجال نصیب مما ترك الوالدان ۴/۷

(ii) یوصیکم اللہ فی اولادکم ۴/۱۱

یعنی "اولاد" اپنے "والدین" کے ترکہ سے حصہ پاتی ہے۔ یہ حصہ خود خدا نے مقرر کر دیا ہے۔

ہمارے ہاں "اولاد" کے معنی عام طور پر صرف بیٹا، بیٹی کئے جاتے ہیں اور والدین کے معنی صرف ماں باپ۔ لیکن ان الفاظ کے معنی وسیع ہیں۔ ولد میں بیٹا اور بیٹے کی اولاد در اولاد (پوتا، پرپوتا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح والد میں باپ اور باپ کے والد در والد (دادا، پردادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اس اصول کو فقہ میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اولاد میں نیچے تک اور والدین میں اوپر تک سب شامل ہوتے ہیں۔

یہاں سے دوسرا سوال پیدا ہوا۔ مثلاً ایک شخص مر گیا۔ اس کا باپ، دادا، پردادا بھی موجود ہیں اور بیٹا، پوتا، پرپوتا بھی۔ قرآن نے باپ کا حصہ بھی مقرر کیا ہے اور بیٹے کا بھی۔ لیکن جب "والد" کے اندر اوپر تک (دادا، پردادا) شامل ہیں اور "ولد" کے اندر نیچے تک (پوتا، پرپوتا) تو پھر ترکہ کی تقسیم کس طرح ہو؟ اس کیلئے قرآنی اصول اقرب کا ہے۔ اقرب کے معنی ہیں وہ شخص جس کے اور میت کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو۔ مثلاً

نور (دادا)
↑
بشیر (والد)
↑
متوفی ——— احمد ——— (متوفی)
↓
خالد (بیٹا)
↓
نذیر (پوتا)

متوفی (احمد) سے اوپر کی طرف، متوفی کا باپ (بشیر) نور اور احمد کے درمیان روک (یا پردہ یا حجب) ہے۔ اس لئے احمد، نور کا اقرب نہیں ہے۔ اسی طرح نیچے کی طرف، خالد (بیٹا) احمد اور نذیر کے درمیان روک ہے۔ اسلئے احمد نذیر کا اقرب نہیں ہے۔ اس صورت میں احمد کے ترکے میں اوپر کی طرف بشیر اور نیچے کی طرف خالد حقدار ہوں گے۔ لیکن اگر احمد کی وفات کے وقت بشیر زندہ نہ ہو۔ تو احمد، نور کا اقرب ہو جائیگا اور جو حصہ بشیر کا تھا وہی حصہ نور کا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر احمد کی وفات کے وقت خالد زندہ نہ ہو تو احمد، نذیر کا اقرب ہو جائیگا اسلئے جو حصہ خالد کا تھا وہی حصہ نذیر کا ہو جائے گا۔

اب پھر صفحہ ۱۸ کے نقشے کو دیکھئے۔ زید کی وفات کے وقت ایک طرف رشید اور زید کے درمیان عمر کی روک موجود ہے اس لئے زید کے ترکے میں عمر کی موجودگی میں رشید حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری طرف حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں (جو روک تھی — یعنی بکر — وہ پہلے ہی اٹھ چکی ہے) اس لئے حامد، زید کے ترکے میں حقدار ہے اور قرآن نے (ایسی صورت میں) جو حصہ ولد کے لئے مقرر کیا ہے

وہ اسے ملے گا۔ اسی طرح حامد کی موت کی صورت میں حامد کے مال سے زید کو وہ حصہ ملے گا جو قرآن نے والد کے لئے مقرر کیا ہے۔ کیونکہ اب حامد اور زید کے درمیان کوئی روک نہیں۔ (روک ــــ بکر ــــ پہلے اٹھ چکی ہے)۔ اسی طرح، اگر عمر بھی زید کی زندگی میں مر چکا ہوتا تو رشید، زید کے مال سے اپنا حصہ لیتا کیونکہ اس صورت میں رشید اور زید کے درمیان کوئی روک نہ ہوتی۔

اس سے واضح ہے کہ

(۱) والدین اور اولاد کے جو حصے قرآن نے مقرر کئے ہیں وہ صرف ماں باپ اور بیٹی بیٹے کے حصے نہیں بلکہ اوپر تک اور نیچے تک مسلسل جاتے ہیں۔

(۲) حصہ اسی کو ملتا ہے جس کے اور متوفی کے درمیان کوئی حجاب (یا روک) نہ ہو۔ جب روک اٹھ جائیگی تو حصہ مل جائیگا۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کا اصول، کس طرح قرآنی اصول کی نقیض ہے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیوہ بہو کو خسر کے مال سے کیوں حصہ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ خسر کے مال میں بہو کا حصہ قرآن نے مقرر ہی نہیں کیا۔ اسلئے اس کے شوہر کی موجودگی یا اس کی وفات اس سوال پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ تم زید کے مرنے پر، اس کے فوت شدہ بیٹے، بکر کا حصہ نکال کر حامد کو دیتے ہو، اور یہ غلط ہے۔

لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ بکر کا حصہ نکالتا کون ہے؟ (حصہ صرف اس کا ہوتا ہے جو متوفی کی وفات کے وقت زندہ موجود ہو ــــ مُردوں کے حصے کوئی نہیں نکالتا)۔ قرآن کی رُو سے، حامد، اپنے دادا (زید) کے ترکے میں حقدار ہے اس لئے حامد کو خود اس کا حصہ ملتا ہے نہ کہ اس کے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔ اگر بکر کا حصہ نکلتا تو اس کی بیوہ کو بھی کچھ مل جاتا۔ لیکن جب بکر کا حصہ ہی نہیں تو بیوہ یا بکر کے اور رشتہ داروں کو کیا ملے گا؟ پھر سن رکھئے کہ حامد کو براہ راست (زید کے ترکے سے) اپنا حصہ ملتا ہے نہ کہ اپنے متوفی باپ (بکر) کا حصہ۔

ان تصریحات کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ہمارے ملا کا یہ مذہب کہ یتیم پوتا، اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پا سکتا، کس طرح قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے اور ملا کے اس مسلک کی تائید میں مودودی صاحب کے دلائل کی حیثیت کیا ہے؟

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ "رہا یتیم کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں"۔ یعنی، قرآن نے اس یتیم کا جو حصہ مقرر کیا ہے اس سے اسے محروم کر دیا جائے (اور وہ حصہ اس کے چچا کو دلا دیا جائے) اور پھر اس محروم و یتیم کو خیرات کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کیلئے مجبور کر دیا جائے۔ دوسری طرف اس کے چچا کو اس کی جائداد کا مالک بنا کر اس سے اپیل کی جائے کہ اس یتیم کی پرورش کرو۔ اللہ تمہیں اس کی جزائے خیر دیگا۔ قرآن میں یہودیوں کے متعلق آیا ہے کہ وہ پہلے اپنے بھائیوں کو دشمن کے حوالے کر دیتے تھے اور پھر انہیں فدیہ دیکر چھڑاتے تھے تاکہ اس سے ثواب حاصل ہو۔ اسی قسم کا انتظام یہ حضرات یتیم پوتے کے لئے کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے ضمناً وصیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "⅓ حصہ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے"

یہ چیز بھی قرآن کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ قرآن نے وصیت کا پورا پورا حق دیا ہے اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ وصیت صرف ⅓ حصہ مال میں ہو سکتی ہے۔ اللہ نے وصیت کے حکم میں کہیں یہ نہیں کہا کہ وصیت صرف ⅓ حصہ میں ہو سکتی ہے۔ لیکن ملا کہتا ہے کہ نہیں! تم وصیت صرف ⅓ حصہ تک کر سکتے ہو۔ یعنی (معاذ اللہ) خدا کو اتنی بات بھی نہیں کہنی آتی تھی کہ وصیت ⅓ حصہ میں کی جا سکتی ہے[1] وہ اس کیلئے بھی روایات کا محتاج ہوگیا۔ یہ ہے ملا کا روایاتی مذہب!!

جب ہم کہا کرتے ہیں کہ ملا کا مذہب بالکل نو ایجاد ہے اور قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں تو بعض (ناواقف) حضرات کو اس سے بڑی حیرت ہوتی ہے اور وہ اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اب آپ صرف اس ایک مسئلہ میں دیکھ لیجئے (یعنی یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے میں) کہ قرآن کا حکم کیا ہے اور ملا کا مذہب کیا! اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے کہ جس چیز کو ملا "نظامِ شریعت" کہہ کر پکارتا ہے اُسے قرآن سے کسقدر تعلق ہوگا! ہزار برس سے مُلا اپنے اس غیر قرآنی مذہب کو لئے ہوئے آرہا ہے۔ نمعلوم اس سے کسقدر یتیم پوتے محروم الارث ہو کر تباہ و برباد ہوئے ہوں گے۔ ہماری بدبختی کہ اب یہی غلط مذہب، ملک کا قانون بن گیا ہے۔ نمعلوم اب کسقدر مظلوم یتیم ہوں گے جو مُلا کی اس کند چھری سے ذبح ہو چکے ہوں گے اور آئندہ ذبح ہوں گے۔

بات تو اتنی ہی ہے جسے ہم اوپر لکھ چکے ہیں لیکن مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ہم اس مضمون کو بھی دہرا دینا چاہتے ہیں جو اس سے قبل طلوعِ اسلام (بابت جون ۱۹۴۹ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ وہو ہذا۔

یتیم پوتے کا حصہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانونِ وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہمارا مروجہ فقہی قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے قرآن کی رو سے کیسا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانونِ وراثت جس حسن و خوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان، قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اس قانون پر پڑتی ہے جو ہمارے فقہا نے مرتب کیا ہے، اور جو ہزار سال سے

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ جب قرآن میں وراثت کے حصے مقرر ہو چکے ہیں تو پھر وصیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ سو قرآن نے وراثت کے احکام کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے (اور اسے بار بار دہرایا ہے کہ) یہ حصے وصیت پوری کرنے اور قرضہ ادا کر دینے کے بعد عمل میں آئیں گے۔ (من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین)۔ یعنی وصیت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ پورا مال وصیت سے (COVER) نہ ہوتا ہو۔ یا ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ انسان وصیت نہیں کر پایا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو پھر تقسیم مال قرآنی حصوں کے مطابق ہوگی۔ یہ قانون کسقدر انسانیت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اس کے متعلق کسی اور وقت لکھا جائے گا۔

مسلمانوں میں مروج چلا آرہا ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے! اس مروجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمدگر متضاد شقیں موجود ہیں بلکہ اس میں قرآنی اصولوں کی صریح مخالفت بھی ہے۔ جنھیں قرآن وارث قرار دیتا ہے یہ قانون انھیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لئے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔ کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پا جاتا ہے دوسرا محروم رہ جاتا ہے اور سب سے بڑی افسوسناک صورت یہ کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذاللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا۔ اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک (۱) آنی چاہئے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً ($\frac{1}{2}+\frac{1}{4}+\frac{1}{4}=1$) یہ تقسیم درست ہے۔ لیکن ($\frac{1}{2}+\frac{1}{2}+\frac{1}{3}=\frac{4}{3}$) یہ تقسیم غلط ہے کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ (۱) نہیں بلکہ ($1\frac{1}{3}$) ہے۔

یہ ہے بہرحال وہ قانونِ وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کس طرح علمی دنیا میں اپنے آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں لیکن "مسلمانوں" کو اس سے کیا غرض کہ ان کے کسی عمل سے خدا کے متعلق کیا تصور پیش ہوتا ہے اور دنیائے علم و بصیرت میں ان کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے۔ انھیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے بس اسی طرح ہوتا چلا جائے اور جو شخص اس کے خلاف ذرا سی آواز بلند کر کے انھیں کہے کہ آؤ ہم اپنی روش کو اللہ کی کتاب کے مطابق کرلیں، اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔

اس مختصر سی تمہید سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارا مروجہ قانونِ وراثت پورے کا پورا ایسا ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے اور اس کی جگہ اس قانون کو رائج کیا جائے جو خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اس وقت ہم اس قانون کے اس ایک گوشے کو سامنے لائیں گے جس کے متعلق نمایاں طور پر استفسارات موصول ہوئے ہیں یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال۔

قانونِ وراثت چونکہ ایک فنی (Technical) مسئلہ ہے اسلئے اسے سمجھنے کیلئے ذرا دقتِ نظر کی ضرورت ہوگی۔ ہم کوشش کرینگے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے بچ کر عام فہم اور سلیس انداز میں اسے پیش کریں لیکن اس کے باوجود آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا۔ یہ اس طرح سے سمجھ میں آجائے گا۔

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہوگیا) — عمر (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں۔ خالد یتیم ہے۔ حامد کا باپ زندہ ہے۔ زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے

ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائیداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو)۔ اگر محض عقل عامہ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دیگا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پہ باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہی اس کا جرم قرار دیدیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے باپ دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مر چکا ہے اس لئے اب خالد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائیداد کا وارث ہوگا۔

اب آئیے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لئے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کی دو دلیلیں اہم ہیں۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ جو شخص، مرنے والے کے ساتھ، کسی دوسرے شخص کے واسطے سے رشتہ رکھتا ہے تو وہ شخص اس واسطہ کی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا۔ یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے، براہ راست نہیں۔

ٹھیک ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بکر تو مر چکا ہے اسلئے اب خالد اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہے اور اس کے اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا اس لئے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ، اپنے چچا عمر کے واسطہ سے نہیں ہے، اپنے باپ کے واسطے سے تھا اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مر جائے تو اس کی جائیداد زید کو دیدیتے ہیں۔ یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

اب ان کا دوسرا اصول لیجئے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ محکم اصول قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے یتیم پوتا، وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے یہ اصول ہے۔

الاقرب فالاقرب۔ یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے اس لئے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی میں محروم رہ جائے گا۔

زید

بکر (قریب کا رشتہ دار) — عمر (قریب کا رشتہ دار)

خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)

اول تو یہ سن لیجئے کہ ہمارے فقہاء خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ اصول یہ ہے کہ

قریب کے رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔

مثلاً رشید کا انتقال ہو گیا۔ اس کا دادا بھی موجود ہے اور بیٹا بھی۔ ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے اور دادا بعید کا۔ لہذا اس کے بیٹے

کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہئے۔ لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

اب آیئے اس اصول کی طرف۔ اس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر۔ نصیباً مفروضاً (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت۔ ایک معین حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ ہم اس وقت اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے جو اس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقربا میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطہ زیرِ نظر مرکوز رہنا چاہئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے بہت سے قریب اور بعید ہوتے ہیں، مثلاً والدین، اولاد، اولاد کی اولاد، بھائی، بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب خواہ قریب ہوں یا بعید، ایک ساتھ وارث ہوں، اس لئے وراثت کا مدار قربیت پر ہے۔ یعنی میت کے ترکہ میں سے اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقربا جو چھوڑ کر مریں اس میں سے مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میت کے اقربین کو حصہ ملے گا۔ یہ فرق بڑا نازک ہے اور اس کو نظر انداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو، مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا۔

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اسلئے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اقرب جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا۔ اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میت کا سب سے قریبی ہو اس کو حصہ ملے گا، جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملے گا۔ یعنی ہر اس رشتہ دار کو جس کے اور میت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ——— کریم کا دادا زندہ ہے۔

رحیم ——— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے۔

کریم ——— اس کی وفات ہوئی ہے۔

رشید ——— کریم کا بیٹا زندہ ہے۔

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلا واسطہ رشتہ دار ہے) سعید (کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی موجودگی میں، اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں، سعید کو محروم ہو جانا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان، متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب صورت یہ ہے تو پھر پہلی مثال کو سامنے لائیے۔

زید

بکر (وفات پا چکا ہے) — عمر (زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہِ راست رشتہ دار) ہو گئے ہیں۔ اور براہ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے۔ لہٰذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ حامد کو نہیں ملے گا، کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہو چکا ہوتا تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے اور وہ ہے قائم مقامی۔ باپ کی وفات سے بیٹا اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بکر کی وفات سے خالد نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے بعید کا رشتہ دار، درمیانی واسطہ کا قائم مقام اور اس طرح میت سے اقرب ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کے حکم کے مطابق، مرنے والا (مورث) جن لوگوں کا اقرب ہو گا وہ لوگ وراثت پائیں گے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ (زندہ رشتہ داروں) کے لئے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصول کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدہ بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت بھی غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا (رحمہم اللہ) نے دانستہ ایسا کیا۔ ہر انسان کے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے قصور اُن کا نہیں۔ اصل قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے اس لئے اس کے متعلق کسی پس آئندہ کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا چاہئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ اسی ایک مسئلہ وراثت کو لیجئے۔ قرآن نے وصیت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ پھر قانونِ وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں

بائز وارث اپنے آبا واجداد کی جائدادوں سے محروم ہوگئے۔ اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کر لیتا اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہئے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہئے، آئین وقانون سازی کا کام ان کے سپرد کر دیا جن کا عقیدہ ہے کہ فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آرہا ہے وہ وحی منزل کی طرح منزہ عن الخطاء ہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں، تو ان کا وضع کردہ آئین وقانون کس حد تک قرآنی ہوسکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے۔

وفیہا بصائر للناس

روزے کے احکام

(۱) جو تم میں سے رمضان کے مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ (فمن شهد منكم الشهر فليصمه - ۲/۱۸۵)

(۲) جو سفر میں ہو وہ واپسی پر روزے پورے کرلے (فعدة من ايام اخر - ۲/۱۸۴)

(۳) جو گھر پر ہو لیکن مریض ہو، وہ صحت یاب ہونے کے بعد روزے پورے کرلے (ایضاً)

(۴) مریض اسے کہتے ہیں جو عارضی طور پر بیمار ہوگیا ہو اور کچھ وقت کے بعد پھر اپنی صحت کی حالت پر آجائے۔ لیکن جو شخص مثلاً بڑھاپے کی وجہ سے ضعیف ہو رہا ہو۔ یا خلقی طور پر کمزور (CONSTITUTIONALLY WEAK) ہو۔ یا کسی ایسے عارضے میں مبتلا جس میں بھوک یا پیاس سے تکلیف ہوتی ہو اور عارضہ مستقل ہوچکا ہو۔ تو ایسے لوگ دوسرے وقت پر روزے پورے کر ہی نہیں سکتے۔ ان کے متعلق حکم ہے کہ جو شخص روزہ بمشکل برداشت کرسکتے" اُسے اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ رکھ لے اور چاہے تو اسکے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلادے جیسی بھی جسمانی حالت دیکھے ویسا ہی کرے۔ (وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين)

لیجئے دنیا بھر کے انسان ان چاروں شقوں میں آگئے۔

(۵) روزہ ہوتا کیا ہے؟ صبح سے رات تک کھانے پینے اور مباشرت سے اجتناب۔ (۲/۱۸۷)۔

(۶) یہ ہیں احکام (کتاب)۔ ان احکام سے مقصود کیا ہے؟ یہ کہ (i) تم قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی کے خوگر ہو جاؤ (لعلکم تتقون)۔ (ii) جس قانونِ خداوندی پر تم چل رہے ہو اسے دنیا میں نافذ کرکے اس کی بڑائی کا عملی ثبوت دو۔ (لتكبروا الله على ما هدٰىكم) اور (iii) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں (لعلكم تشكرون)۔ ظاہر ہے کہ یہ نتائج صرف قرآنی معاشرے کے اندر مرتب ہوسکتے ہیں۔

یہ ہے روزوں کی حکمت۔ (کتاب اور حکمت دونوں قرآن کے اندر)۔

محجوب الارث

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

[علامہ اسلم جیراجپوری نے یہ مضمون ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا جب وہ ہنوز حدیث اور فقہ کو بھی دین سمجھتے تھے۔ یہ مضمون پہلے رسالہ معارف، اعظم گڑھ میں ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد الگ رسالہ کی شکل میں۔ چونکہ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ ایک علمی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مضمون کو (جو اس وقت نایاب ہو رہا تھا) شائع کردیں تاکہ اس مسئلہ کے تمام گوشے نکھر کر سامنے آجائیں۔ طلوع اسلام]

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الامین وعلی جمیع المسلمین الی یوم الدین۔ اما بعد

اسلامی فقہ فرائض میں ایک مسئلہ محجوب الارث کا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جو بیٹا باپ کی زندگی میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر مرجاتا ہے اس کی یتیم اولاد اپنے دادا کے مرنے پر بشرطیکہ اس نے کوئی اور بیٹا بھی چھوڑا ہو اس کے ترکہ میں سے حصہ نہیں پاتی۔ مثلاً اگر مورث نے بروقت وفات ایک بیٹا اور ایک یتیم پوتا چھوڑا تو اس صورت میں سارے ترکہ کا مورث بیٹا ہوگا۔ اور پوتا محجوب الارث یعنی وراثت سے محروم قرار دیا جائے گا۔ صورت یہ ہے:

مثال — زید — مسئلہ ۱

بیٹا خالد ۱

بیٹا علی (متوفی) — پوتا محمود محجوب

یہ حجب صرف اسی صورت میں محدود نہیں ہے بلکہ عصبات میں عام ہے۔ مثلاً ایک بھائی کی موجودگی میں دوسرے مردہ بھائی کی اولاد یا چچا کے ہوتے ہوئے چچا زاد بھائی بہن وغیرہ سب اسی قاعدے سے محجوب ہیں۔

اس مسئلہ کو فقہا نے اگرچہ ایک مقرر اور طے شدہ قانون بنا کر فقہ کی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ عام طور پر مسلمان اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ خاصکر جب دوسرے اہل مذاہب اعتراض کرتے ہیں اور قانونِ اسلام کو یتیموں کے خاندان سے خارج کرنے کا الزام دیتے ہیں تو ان کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے اور کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔

حال میں دو ایک قانون پیشہ اصحاب محجوب پوتے کی وکالت کے لئے اٹھے۔ بعضوں نے اس کی حمایت میں اخباروں میں مضامین بھی لکھے، قانون ساز مجلس میں بھی تحریک کی [illegible] کو سامنے کھلے

لیلیٰ کے قبیلہ پر چڑھائی کی تھی ناکام میدان سے ہٹ گئے اور بیچارہ پڑا کہتا رہ گیا:

ہم دل میں خوش کہ سبزۂ تربت ہرا ہوا　　　وہ اس ادا سے روئے کہ پلکیں بھی نم نہیں

میرے دل میں ابتدا ہی سے جب سے میں نے فنِ وراثت کی تعلیم پائی یہ مسئلہ برابر کھٹکتا تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی حافظ عبدالاعلیٰ مرحوم جن کو بچپن ہی سے میرے ماں باپ نے تربیت اور تعلیم میں میرا ہمزاد بنا رکھا تھا اسی مسئلہ کا شکار تھے شیرخوارگی کے زمانے میں ان کے والدین انتقال کر گئے تھے لیکن دادا زندہ تھے۔ اور ان کے اور بیٹے بھی تھے۔ بعد میں اگرچہ ان کے نیک دل دادا نے ان کی وراثت کیلئے باقاعدہ وصیت نامہ لکھ دیا لیکن برادر مرحوم کی جوان مرگی نے ان سب جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا۔

میری توجہ اسی زمانے سے اس مسئلہ کی طرف لگی رہی اور متعدد دلائل سے میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ مسئلہ مغز و منشائے اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن یہ سوچکر کہ ممکن ہے میری فہم نے غلطی کی ہو ایک عرصۂ دراز تک ہندوستان کے مختلف اہلِ علم سے جو اس فن سے آشنا تھے اس مسئلہ کے متعلق خط و کتابت کرتا رہا۔ جو مل گیا اس سے زبانی گفتگو کی۔ یہ سب لوگ میرے دلائل کے جوابات سے قطعاً قاصر رہے جس سے صاف روشن ہو گیا کہ یہ مسئلہ فقہ کی ایک قابلِ قبول غلطی ہے جس کی تقلید کسی طرح روا نہیں۔

اس بنیاد پر ۱۹۱۵ء میں میں نے اس بحث کو قلمبند کیا اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کے جولائی اور اگست کے دو نمبروں میں شائع کرا دیا۔ صحیح الخیال علماء اور قانون پیشہ اصحاب جن کو رات دن معاملات سے واسطہ پڑتا ہے، میرے ساتھ موافقت کی اور صرف وہ لوگ جو فقہائے سابقین کے مقلد ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اور ان کو ہونا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ ان کے دفاتر میں کسی غلطی کے قائل نہیں کہ اس کی تحقیق کریں اور جو قائل بھی ہیں تو اس زمانہ میں اس کی اصلاح ناممکن سمجھتے ہیں۔

محجوب الارث کا مسئلہ کوئی فرضی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ میرے پاس چونکہ فرائض کے سوالات بہت آتے ہیں اس وجہ سے اس مسئلہ سے بھی کبھی کبھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔

بعض دفعہ تو ایسی دردناک صورت پیش آگئی ہے کہ باپ کے سامنے وہی بیٹا اپنا کوئی معصوم بچہ چھوڑ کر مر گیا ہے جو اس کے بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق اور خدمتگزار تھا۔ جس نے باپ کی خوب خدمت کی اور اپنی کمائی سے اس کو غنی کر دیا اور دوسرا بیٹا جو موجود ہے وہ نہایت نالائق اور ناکارہ ہے۔ پھر دادا کے مرنے کے بعد وہ یتیم بچہ جو اپنے باپ کے ظلِ عاطفت سے پہلے ہی محروم ہو چکا تھا اب اس کی پیدا کی ہوئی دولت سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور سارا ترکہ وہی ناکارہ اور آوارہ بیٹا لے لیتا ہے۔

میرے ایک دوست جو علی گڑھ میں نامور وکیل ہیں۔ ان کے یہاں ایک عورت چھوٹے چھوٹے چار بچوں کو نہایت خستہ اور تباہ حالت میں لئے ہوئے آئی اور رو رو کر اپنی دردبھری کہانی سنائی کہ سال گذشتہ طاعون میں میرا شوہر مر گیا، اب حال میں ان بچوں کا دادا بھی گذر گیا۔ ان کا ایک چچا ہی ہے جو نہایت نالائق اور آوارہ ہے، اس نے مجھے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا، میرا میکہ اس قابل نہیں ہے کہ ان کو لیکر وہاں گزر کر سکوں، آپ وکیل ہیں۔ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد فرمایئے اور بچوں کے دادا کی جائیداد میں سے جو بہت بڑی ہے عدالت سے چارہ جوئی کر کے کچھ ان کو دلایئے۔

وکیل صاحب کو رقت تو بہت آئی لیکن پھر اس کے کیا جواب دے سکتے تھے کہ افسوس ہے کہ تمہارے بچوں کو اسلامی قانونِ شرع کی رو سے کچھ نہیں مل سکتا اس لئے عدالت میں دعویٰ کرنا فضول ہے۔

آخر وہ بیچاری باچشم تراں یتیم مردہ معصوموں کو لیکر واپس چلی گئی۔

جب اس قسم کی پیش آنے والی کوئی صورت نظر پڑتی ہے تو لوگ یہ کوشش[1] کرتے ہیں کہ دادا اپنی زندگی میں محجوب اولاد کو کچھ دیدے کیونکہ چچاؤں سے امید کم ہوتی ہے اور چونکہ فطرت نے اولاد پر شفقت کرنے کا مادہ انسان میں رکھا ہے، اس لئے اکثر حالتوں میں دادا راضی ہو جاتے ہیں اور ان یتیموں کا تبرعاً واحساناً اپنے مال میں سے کچھ حصہ دیدیتے ہیں۔

لیکن بعض سخت دل ایسے بھی ہوتے ہیں جو صاف صاف کہدیتے ہیں کہ صاحب جب ان کو اللہ نے نہیں دیا تو ہم دینے والے کون۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قانونِ وراثت کے مکمل ہونے کا دعویٰ جو کیا جاتا ہے وہ کہاں تک بجا ہے کہ ایک بیکس و یتیم بچہ اپنے بزرگوں کی زندگی بھر کی کمائی سے محروم ہو رہا ہے اور کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔

اسلئے کہ ایک طرف تو قانون وراثت اس کو محجوب الارث قرار دیتا ہے اور دوسری طرف فقہ دادا کے اوپر اس کے لئے کوئی وصیت بھی فرض نہیں کرتی

اس صورت کو پیش نظر رکھکر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ یہ قانون اس شفقت کے کہاں تک مطابق ہے جو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے۔ اسلام تو سراسر رحم و مہربانی ہے، ہمارے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم دنیا والوں کیلئے رحمت اور بالخصوص یتیموں اور بیکسوں کیلئے شفیق والدین سے بڑھ کر تھے، آپ دنیا میں خود یتیم پیدا ہوئے تھے اور ابتدا ہی سے یتیموں سے اسقدر محبت اور الفت رکھتے تھے کہ جب مکہ معظمہ کی گلیوں سے گزرتے تھے تو یتیم بچے اپنی دولت سمجھ کر دوڑ دوڑ کے قدموں سے لپٹ جاتے تھے۔

چنانچہ آپ کے چچا نے آپ کی مدح میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر یہ تھا۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ   ثمال الیتامیٰ عصمۃ للارامل

ترجمہ: نورانی چہرہ والا جس کی برکت سے باران طلب کی جاتی ہے، یتیموں کا سرپرست اور بیواؤں کا نگہبان۔

تقریباً اسی مضمون کو مولانا حالی مرحوم نے اس بند میں باندھا ہے۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا   مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کی کام آنے والا   وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ   یتیموں کا والی، غریبوں کا مولیٰ

کسی دوسرے ملک میں شاید یہ قانون اس قدر مضرت رساں نہ ثابت ہو جسقدر کہ ہندوستان میں ہے اسلئے کہ یہاں مسلمانوں میں بھی ایک قسم کے خاندان مشترکہ کا رواج ہے یعنی پشتہا پشت تک لوگ ایک ساتھ رہ کر زندگیاں گزارتے ہیں اور بیٹوں کی جو کچھ کمائی ہوتی ہے

---

[1] بعض مولوی اس کوشش کی بھی مخالفت کرتے ہیں [illegible]

وہ جب تک باپ زندہ رہتا ہے، اسی کی ملکیت میں منضم ہوتی جاتی ہے۔

اب اگر اتفاق سے کوئی بیٹا باپ کی زندگی ہی میں اپنا بچہ چھوڑ کر مرجاتا ہے تو چونکہ اس کی کوئی جداگانہ ملکیت قائم نہیں ہوتی اسلئے اس کا کچھ ترکہ ہی نہیں قرار پاتا اور سارا مالی و منالی بچہ کے دادا کے قبضۂ تصرف میں رہتا ہے، پھر جب دادا مرتا ہے تو دوسرے حصہ دار بیچ میں آ کر حائل ہوجاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ یتیم بچہ محجوب قرار پاجاتا ہے اور خود اس کے باپ کے گاڑھے خون کی کمائی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

اب ہم اس مسئلہ پر تفصیلی بحث شروع کرتے ہیں جس سے اس کی پوری حالت منکشف ہوجائے گی اور معلوم ہوجائے گا کہ آیا یتیم اولاد حقیقت میں محجوب ہے بھی یا نہیں۔ ہم جہاں تک غور کرتے ہیں قرآن اور حدیث تو خیر خود فقہ بھی اصولاً ان کو محجوب نہیں کرتی ہے۔

فقہاء نے حجب حرماں کو صرف دو اصول پر مبنی قرار دیا ہے۔

(۱) جو شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس وقت تک وراثت نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ درمیانی شخص موجود ہے۔

(۲) الاقرب فالاقرب۔ یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کرتا ہے۔ اصل الفاظ سراجی کے یہ ہیں:-

وهو (حجب الحرمان) مبني على اصلين احدهما ان كل من يدلي الى الميت بشخص لا يرث مع وجود ذلك الشخص والثاني الاقرب فالاقرب۔

حجب حرماں دو اصول پر مبنی ہے، پہلا یہ کہ جو شخص میت سے کسی کے واسطے سے قرابت رکھتا ہے تو اس واسطہ کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا اور دوسرا الاقرب فالاقرب ہے۔

پہلا قاعدہ جس کو مختصر لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں —— واسطہ کی موجودگی میں ذی واسطہ وارث نہیں ہوتا —— یتیم پوتے کو کسی طرح محروم نہیں کرتا، اسلئے کہ پوتے کو دادا کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ بواسطہ اپنے باپ کے ہے۔ اور جب باپ جو واسطہ تھا موجود ہی نہیں ہے تو پھر پوتا کیوں محروم ہونے لگا۔

دوسرا قاعدہ الاقرب فالاقرب ہے اسی میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے، اس کے ظاہری معنی خیال کر کے لوگوں نے یہ سمجھا کہ بیٹا جو قریبی رشتہ دار ہے، یتیم پوتے کو جو اس سے دور کا رشتہ دار ہے محجوب کر دے گا۔

دراصل یہی اور صرف یہی ایک قاعدہ ہے جس کی بنیاد پر یتیم اولاد محجوب قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم اپنی بحث کا مرکز بھی اسی قاعدہ کو قرار دیتے ہیں —— اگر یہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنوں میں رکھا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محروم کر دے تو وراثت کے بہت سے مسلمہ اور اجماعی مسائل ٹوٹ جائیں گے۔

مثال نمبر ۱

زید —— مسئلہ ۶

دادا ۱ | بیٹا ۵

اس مثال میں بیٹے کی موجودگی میں دادا کو حصہ ملا ہے، حالانکہ بیٹا میت سے بہ نسبت دادا کے اقرب ہے، کیونکہ بیٹا بلا واسطہ اس سے رشتہ رکھتا ہے اور دادا بواسطہ باپ کے اس کا رشتہ دار ہے۔

مثال نمبر ۲

مسئلہ ۶ — زید

باپ	بیٹا	پڑنانی
۱	۴	۱

یہاں بیٹے اور باپ کے ہوتے ہوئے پڑنانی حصہ لے گئی جو نہایت دور کی رشتہ دار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ[۱] کو اسی پر تعجب تھا کہ بھتیجا پھوپی کا وارث ہوتا ہے اور پھوپھی بھتیجے کی وارث نہیں ہوتی، لیکن اگر موجودہ فقہ اُن کے سامنے ہوتی تو ان کو اور بھی حیرت ہوتی کہ نانی بلکہ پڑنانی تک تو نواسے کے ترکہ میں سے حصہ پاتی ہے اور نواسا ان میں سے کسی کا بھی ترکہ نہیں[۲] پاتا۔ دادا محجوب الارث پوتے کا وارث ہوتا ہے اور محجوب الارث پوتا دادا کا وارث نہیں ہوتا۔

مثال نمبر ۳

زینب مسئلہ ۶

شوہر	ماں	دو اخیافی بھائی	دو حقیقی بھائی	دو علاتی بھائی
۳	۱	۲	محروم	محروم

اس مثال میں کسی قاعدہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

حجب حرماں کا پہلا قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دونوں مادری بھائی جو ماں کے واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں اس کی موجودگی میں محروم ہوں لیکن نہیں ہوئے۔

دوسرا قاعدہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ماں جو قریبی رشتہ دار ہے۔ مادری بھائیوں کو محروم کردے لیکن نہیں کرسکی۔

حقیقی اور علاتی بھائی جو قوت قرابت کے لحاظ سے اقوی اور اقرب تھے وہ بھی اخیافیوں کو نہیں محروم کرسکے بلکہ ان کی وجہ سے اُلٹے خود محروم ہو کر بیٹھ گئے۔

یہاں ہم بدنصیبوں کے جو حصہ میں نہیں آتی الٰہی رہ گئی کیا خوبیٔ قسمت وہیں بن کر

دنیا میں کون شخص ہے جو کہہ سکتا ہے کہ حقیقی بھائیوں کو محروم کرکے اخیافی بھائیوں کو حصہ دیدینا جو زیادہ تر اپنے کنبہ کے بھی نہیں ہوتے کسی معقول اصولِ وراثت پر مبنی[۳] ہے۔

---

[۱] چنانچہ کنز العمال میں ہے کہ وہ پھوپی اور خالہ کو محروم نہیں کرتے تھے۔

[۲] تعجب پر تعجب یہ ہے کہ ماں جو کمزور وارث ہے وہ تو دادی کو محروم کردیتی ہے اور باپ جو قوی وارث ہے نانی کو نہیں محروم کرسکتا۔

[۳] اصل بنیاد اس کی یہ ہے کہ اس آیت میں "وان کان رجل یورث کلالۃ او امراءۃ ولہ اخ او اخت" ابی بن کعبؓ کی قرأت کے مطابق اخ او اخت کے بعد "لام" کا اضافہ کرکے فقہا نے اخیافیوں کو ذوی الفروض میں داخل کردیا، اس لئے حقیقیوں سے جو عصبہ ہیں ان کا حق مقدم ہوگیا۔

لیکن اس آیت کے جو معنی قرار دیئے گئے ہیں وہ بوجوہ ذیل ٹھیک نہیں

(۱) ابی بن کعبؓ جن کی قرأت کے مطابق معوذتین قرآن سے خارج ہیں ان کے "لام" قرأت کی روایت جہاں تک ہم کو معلوم ہے بیہقی نے لکھی ہے جن کی تصنیفات کتب حدیث میں طبقۂ ادنیٰ کی ہیں۔

(باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ جس رشتہ سے اخیافی وارث بنائے گئے ہیں، حقیقیوں میں اگر باپ کے رشتہ کا نہ بھی خیال کیا جائے تو کم سے کم رشتہ تو ضرور موجود رہے پھر ان کو محروم کرنے کے کیا معنی۔ چنانچہ امام مزنی کی کتاب المختصر میں ہے کہ اس صورت میں حضرت عمرؓ حقیقیوں کو محروم نہیں کرتے تھے۔

خود فقہا بعض جگہ دو قرابت والوں کو ایک قرابت والے سے اقویٰ قرار دیکر حصہ دلاتے ہیں، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مثال نمبر ۱۴

زید مسئلہ ۱۸

دو بیٹیاں ۱۲ — دو پوتیاں ۲ — پڑوتی ۱ — سکڑوتی ۱ — سکڑوتا ۲

اس صورت کو فقہا مسئلہ تشبیب کہتے ہیں۔ اس میں بیٹیاں اقرب ہیں۔ ان کی موجودگی میں نیچے والیوں کو محروم ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بخلاف اس کے پوتی، پڑوتی، سکڑوتی، سکڑوتا جو سب نیچے اور مختلف درجہ کے ہیں آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بہن قرار دیئے گئے اور سب کو ترکہ میں سے حصہ مل گیا۔ لیکن ایک بدبخت یتیم پوتا ہی ہے جو اپنے باپ کی عدم موجودگی میں اس کے بجائے اپنے چچا کا بھائی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

لبت شکرستان و اوحشمت مے بہ میخواراں — منم کز غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم

ان متعدد اور مختلف قسم کی مثالوں سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ قاعدہ الاقرب فالاقرب اپنے ظاہری معنی میں یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہے وہ بعید کو محروم کردے نہیں لیا جاسکتا ورنہ تمام اعتراضات مذکورہ وارد ہوتے ہیں۔

ان اعتراضات سے بچنے کیلئے یہ جواب دیا گیا کہ یہ قاعدہ یعنی الاقرب فالاقرب صرف عصبات میں ہے ذوی الفروض میں جاری نہیں ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) (۲) یہ قرأۃ بمقابلہ قرأۃ متواترہ کے بالاتفاق تمام امت کے نزدیک نامقبول ہوئی، اور کسی نے کلام نہیں پڑھا۔ لہٰذا اس سے استدلال کرنا اس کو ایک ساتھ ہی نامقبول اور مقبول دونوں قرار دینا ہے۔

۳۔ فقہا اور مفسرین "لہٗ" کی واحد مذکر غائب کی ضمیر کو رجل اور امرأۃ دونوں کی طرف راجع کرتے ہیں جن میں سے امرأۃ مونث حقیقی ہے وہ کبھی اس کا مرجع ہو ہی نہیں سکتی، اس صورت میں لھما، یا لکل واحد منھما چاہئے تھا۔

۴۔ توریث کلالہ والی آیت میں جو آخر سورہ میں ہے اخ اور اخت کے الفاظ بعینہٖ ہی ہیں۔ اب اگر دونوں آیتیں انھیں کی توریث کے متعلق قرار دیجائیں تو دونوں کو ناقص کہنا لازم آتا ہے یعنی اس آیت میں "لاُم" کا لفظ اور اس میں لاب وام یا لاب بڑھانا پڑے گا حالانکہ اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے

۵۔ اگر اس آیت سے اخ اور اخت کی توریث مقصود تھی تو کیوں اللہ تعالیٰ نے لاُم نہیں فرمایا۔ وہ خود کہتا ہے "وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا" تفسیر کے مرتبع پر ابہام کا ہم کے نقائص میں سے ہے جس سے قرآن بہت بالاتر ہے۔ آیت کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں: "اگر کوئی مرد کسی کلالہ کا وارث بنایا جائے یا کوئی عورت۔ بحالیکہ اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک ایک سدس ملے گا۔

"لہٗ" کی ضمیر کا مرجع کلالہ ہے۔ اور "لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا" میں تثنیہ کی ضمیر رجل وامرأۃ کی طرف راجع ہے نہ کہ اخ و اخت کی طرف۔ یورث باب افعال سے ہے مجرد سے نہیں ہے۔

اس آیت میں بھائی اور بہن کا حصہ قطعاً نہیں بیان کیا گیا بلکہ عہدی رشتہ داروں کا ہے۔ بھائی اور بہن کا ذکر صرف اسوجہ سے آگیا ہے کہ یہ والدین اور اولاد کی طرح عہدی رشتہ داروں کو محروم نہیں کرتے بلکہ ان کی موجودگی میں بھی وہ وارث ہوسکتے ہیں۔ (مزید تفصیل کیلئے ہماری کتاب الوراثۃ فی الاسلام ملاحظہ ہو)

لیکن پھر اس پر بھی اعتراضات پڑتے ہیں کہ اچھا بالفرض اگر یہ قاعدہ صرف عصبات میں ہے اور ذوی الفروض میں نہیں ہے تو جدات جو ذوی الفروض ہیں، ان میں قریب بعید کو کیوں محروم کرتی ہے، چنانچہ سراجی میں ہے۔

والقربیٰ من ای جھۃ کانت تحجب البعدیٰ من ای جھۃ کانت

جدہ قریبہ خواہ کسی طرف کی ہو جدہ بعیدہ کو خواہ کسی طرف کی ہو محجوب کردیگی۔

نیز بیٹیاں، پوتیوں کو اور حقیقی بہنیں جب ذوی الفروض ہوتی ہیں تو علاتی بہنوں کو کس قاعدہ سے محروم کرتی ہیں؟

ان اعتراضات سے مجبور ہو کر پھر فقہاء نے تسلیم کیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ ذوی الفروض میں بھی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جن رشتہ داروں کی وراثت کا سبب متحد ہے، ان میں قریب بعید کو محجوب کرتا ہے یعنی ماں، نانی، پڑنانی، دادی، پڑدادی، ان سب کے وارث ہونے کا سبب "امومت" ہے جو سب میں یکساں پایا جاتا ہے، اس لئے ان میں سے جو قریب ہوگی وہ بعید کو محروم کردیگی۔ نیز بیٹیوں اور پوتیوں میں بھی سبب وراثت متحد ہے یعنی "بنتیت" اس وجہ سے بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیاں محروم ہو جائیں گی۔ علیٰ ہذا حقیقی بہنیں بھی بوجہ اتحاد سبب وراثت اور قرب کے علاتی بہنوں کو محجوب کردیں گی۔

یہاں تک آکر فقہا اس بحث کو ختم کردیتے ہیں اور گویا یہ قاعدہ دوم یعنی الاقرب فالاقرب ان کے خیال میں اپنی جگہ پر مضبوط اور مستحکم ہوگیا۔ لیکن ابھی اعتراضات اور باقی ہیں اور بلا ان کے جوابات دیئے ہوئے یہ عقدہ مشکل حل نہیں ہوسکتا۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت محض تمہاری خیالی توجیہ ہے، اس کو ہم تسلیم نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کی بے بنیاد توجیہات سے اس فن میں خرابیاں واقع ہوگئی ہیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو جب ترکہ دلانے میں دخل نہیں ہے تو محروم کرنے میں کیسے داخل ہوگیا۔ مثال نمبر۳ میں اخیافی بھائیوں میں جو سبب وراثت پانے کا ہے وہی حقیقیوں میں بھی موجود ہے، پھر بھی حقیقی محروم کئے گئے اور اخیافیوں کو ترکہ دیا گیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اتحاد سبب وراثت کو حجب حرمان میں اگر کوئی دخل ہے تو پھر ذوی الفروض ہی کے ساتھ اس کو کیا خصوصیت ہے۔ عصبات میں بھی یہی شرط لگانی چاہئے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ بالفرض ہم نے آپ کے اس مشروط قاعدہ کو تسلیم بھی کرلیا کہ ذوی الفروض میں الاقرب فالاقرب کا قانون اس وقت جاری ہوگا جب ان میں سبب وراثت متحد ہوگا لیکن مندرجہ ذیل مثالوں میں یہ قاعدہ ٹوٹ جاتا ہے۔

مثال نمبر۱

زید مسئلہ ۶

بیٹی	پوتی	بھتیجا
۳	۱	۲

یہاں بیٹی اور پوتی کا سبب وراثت متحد ہے اور وہ دونوں ذوی الفروض میں سے ہیں۔ پھر بھی بیٹی نے جو اقرب ہے پوتی کو محروم نہیں کیا۔

مثال نمبر۲

زید مسئلہ ۶

حقیقی بہن	علاتی بہن	بھتیجا
۳	۱	۲

اس صورت میں بھی حقیقی اور علاتی بہنوں کی وراثت کا سبب متحد ہے اور دونوں ذوی الفروض ہیں، چاہئے تھا کہ حقیقی علاتی کو بوجہ اقرب ہونے کے محجوب کرتی۔

علاوہ بریں عصبات میں جہاں آپ نے قاعدہ الاقرب فالاقرب کو بلا کسی قید کے رکھا ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود اتحاد سبب وراثت کے بھی قریب بعید کو محجوب نہیں کرتا۔ مثلاً مسئلہ تشبیب کو لیجئے جو مثال نمبر ۴ میں دکھلایا گیا ہے اس میں پوتی، پڑوتی، سکڑوتی سب کے وارث ہونے کا سبب متحد ہے بلکہ چونکہ وہ سب کی سب سکڑتے کی وجہ سے عصبہ بنائی گئی ہیں اس وجہ سے ان کے عصبہ ہونے کا بھی سبب ایک ہی ہے، پھر بھی ان میں قریب نے بعید کو محجوب نہیں کیا اور سب کو ایک ہی درجہ میں رکھکر یکساں حصہ دیدیا گیا۔

اسی طرح جب عصبہ اور ذوی الفروض کا باہم اجتماع ہوتا ہے تو کہیں فقہ اس قاعدہ کو جاری کرتی ہے اور کہیں نہیں کرتی، بیٹا عصبہ کے ساتھ پوتی صاحبۂ فرض محروم ہو جاتی ہے، لیکن باپ عصبہ کے ساتھ نانی صاحبۂ فرض محروم نہیں ہوتی۔

الغرض یہ صاف روشن ہو گیا کہ الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جس معنی میں فقہا نے استعمال کیا ہے کسی تاویل سے ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ ہر پہلو سے خود انھیں کے مسلمات سے ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ایسے غیر مسلم قاعدے سے یتیم اولاد کو محجوب کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کے قاعدے میں اقرب کا ظاہری مفہوم اگر مراد لیا جائے یعنی یہ کہ مطلقاً درجہ کے لحاظ سے جو قریب ہو وہ بعید کو محجوب کر دے تو یہ قاعدہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، یہاں اقرب سے بجز اس کے کچھ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ:

اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلاواسطہ مورث سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ لیکن بروقت وفات مورث کے وہ واسطہ موجود نہ ہو۔

جس طرح کہ میت کے مرنے کے وقت اگر اس کا باپ موجود نہیں ہے تو دادا بجائے باپ کے رکھا جاتا ہے، اس لئے کہ بیچ میں جو واسطہ تھا یعنی باپ جس کی وجہ سے دادا محجوب ہو جاتا تھا وہ نہیں ہے، لہذا دادا اس واسطہ کی عدم موجودگی سے خود اقرب ہو گیا اور اب کوئی اقرب خواہ وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو دادا کو محجوب نہیں کر سکتا۔

اسی طرح مورث کی وفات کے وقت اگر اس کا کوئی یتیم پوتا ہے تو وہ اپنے متوفی باپ کی جگہ رکھا جائے گا اور وہی حصہ لے گا جو اس کے باپ کا تھا، مورث کا جو بیٹا موجود ہے وہ اس کو محجوب نہیں کر سکتا۔ اسلئے کہ واسطہ کی عدم موجودگی سے وہ خود اقرب ہو گیا ہے۔ تعجب ہے کہ دادا کے معاملہ میں تو فقہا اقرب کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن پوتے کے معاملے میں نہیں۔ پوتے کی بدنصیبی کے سوا اور اس کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

من ازیں طالع شورہ برنجم ورنہ بہرہ مند از سر کویت دگرے نیست کہ نیست

حقیقت یہ ہے کہ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پر ہے۔ لہذا جس بچہ کا باپ مر گیا ہے وہ وراثت میں اس کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ فقہا نے اس مسئلہ میں اسی اصل نکتہ یعنی قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا جس کی وجہ سے ایسی عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یتیم بچوں کو محجوب کرنے لگے۔ یہ امر غور کے قابل ہے کہ جس بیٹے کی موجودگی کی وجہ سے یتیم پوتے کو فقہا محجوب قرار دیتے ہیں وہ بیٹا صرف ایک ہی طرف سے کیوں حاجب ہوتا ہے یعنی صرف پوتے ہی کو دادا کے ترکہ سے کیوں محجوب کرتا ہے، دادا کو اس پوتے کے ترکہ سے کیوں نہیں محجوب کرتا

بلکہ دادا کی وجہ سے الٹا خود ہی محروم ہو جاتا ہے اس سے صاف نمایاں ہو جاتا ہے کہ قائم مقامی کے اصول پر وہ کسی طرح پوتے کا حاجب نہیں ہو سکتا۔

حاصل یہ کہ اقرب کا سوائے اس کے جو ہم نے اوپر لکھا ہے اور کوئی مفہوم ہو ہی نہیں سکتا، یہی معنی لینے سے الاقرب فالاقرب کا قاعدہ جو تقسیم وراثت میں اصل الاصول اور بنیادی قانون ہے اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔

محجوب پوتے کو وارث بنانے پر ظاہر میں جو شبہات ہو سکتے ہیں ہم ان کو خود ہی لکھ کر ان کے جوابات بھی دیتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کی اچھی طرح توضیح ہو جائے۔

شبہ اول: محجوب پوتے کو قرآن کریم کی رو سے کیسے ترکہ دیا جا سکتا ہے اس میں تو کہیں پوتے کا ذکر نہیں، صرف اولاد کا لفظ ہے جس کے معنی بیٹا بیٹی کے ہیں۔

جواب: اس کا الزامی جواب یہ ہے کہ غیر محجوب پوتوں کو فقہا بھی تو ترکہ دلاتے ہیں پس جو آیت ان کی وراثت کی دلیل قرار دی جائیگی وہی ہماری بھی دلیل ہوگی۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اولاد کا لفظ جو قرآن میں ہے اس کے معنی صرف بیٹا بیٹی کے نہیں ہیں بلکہ نیچے تک تمام اولاد اس میں داخل ہے تفسیر خازن میں آیت "ولهن الربع مما ترکتم" کے ذیل میں لکھا ہے:-

اسم الولد يطلق على الذكر والانثى ولا فرق بين الولد وولد الابن وولد البنت فى ذلك

ولد کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں کیلئے بولا جاتا ہے اور اس میں اولاد، اور بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۱۲ صفحہ ۸ مطبوعہ مصر میں ہے:-

الولد اعم من الذكر والانثى ويطلق على الولد الصلب وعلى ولد الولد وان سفل۔

ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں سے عام ہے اور صلبی اولاد اور نیچے تک اولاد کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔

فقہا بھی اس کے ساتھ متفق ہیں: وہ ولد میں ولد الابن کو داخل سمجھتے ہیں۔ شریفیہ شرح سراجی صفحہ ۲۶ مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنو میں ہے۔

ولد الابن داخل فى الولد لقوله تعالىٰ يا بنى آدم

اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی داخل ہے کیونکہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کہا ہے۔

آیت توریث میں جہاں جہاں بھی ولد کا لفظ آیا ہے ہر جگہ بالاتفاق فقہا نے نیچے تک تمام اولاد نر و مادہ کو اس میں داخل سمجھا ہے۔ مثلاً

فان كان لهن ولد فلكم الربع مما تركن

اگر ان کی (تمہاری بیویوں کی) کوئی اولاد ہو تو ان کے ترکہ میں سے تم کو چوتھائی ملیگا۔

فقہا میں سے ایک نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ بیویاں جب صلبی بیٹا یا بیٹی چھوڑ کر مریں اسی وقت شوہروں کو چوتھائی ملے گا بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ وہ پوتا، پوتی، پڑپوتا، پڑپوتی کسی کو بھی اگر چھوڑیں تو شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

اولاد تو پھر بھی ایک عام لفظ ہے، ابن و بنت کے الفاظ جو عربی زبان میں خاص بیٹا بیٹی کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ بھی قرآن میں کئی جگہ وسیع معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں، اور نیچے تک کی تمام اولاد کو شامل ہیں، جا بجا اللہ تعالیٰ نے ہم کو "یا بنی آدم" کہہ کر خطاب کیا ہے بیسیوں نسلیں حضرت یعقوب کی گزر گئی تھیں لیکن ان کی اولاد قرآن میں یا بنی اسرائیل کہہ کر پکاری گئی۔

دور کیوں جائیے خود آیت وراثت ہی کے ایک رکوع کے بعد ہے، حرمت علیکم امھاتکم و بناتکم، یہاں بنات کے لفظ کو تمام فقہا نے بیٹیوں، پوتیوں، پڑپوتیوں، یہانتک کہ نواسیوں پر بھی شامل تسلیم کیا ہے، اس لئے آیت وراثت میں جو اولاد کا لفظ ہے اس میں یقیناً پوتا داخل ہے اور کسی طرح خارج نہیں ہو سکتا۔

اور یہ مجازاً نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ہے، جیسا کہ علامہ ابوبکر بن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے۔ کیونکہ ولد کا لفظ ولادت سے مشتق ہے، اسلئے اولاد کی اولاد بھی حقیقتاً اولاد ہے جس طرح کہ جز کا جز بھی یقیناً جز ہے۔

شبہ دوم: جب محجوب پوتے کو وراثت دلائی جاتی ہے تو پھر سب پوتے برابر ہیں، ہر ایک کا رشتہ دادا کے ساتھ یکساں ہے۔ لہذا صرف وہی پوتا کیوں دادا کا ترکہ پائے جس کا باپ دادا سے پہلے مرگیا ہے، وہ پوتے بھی کیوں نہ وارث ہوں جن کے باپ موجود ہیں۔

جواب: جن پوتوں کے باپ موجود ہیں، اصل میں محجوب وہی پوتے ہیں، کیونکہ ان کے باپ خود ان کے اور ان کے دادا کے درمیان حاجب ہیں، نہ وہ دادا کا ترکہ پوتے کو پہنچنے دیتے ہیں اور نہ پوتے کا ترکہ دادا کو بلکہ دونوں طرف سے بیچ میں خود ہی وارث بن جاتے ہیں اسلئے وہ پوتے جن کے باپ موجود ہیں دادا کے مرنے پر اقرب نہیں ہو سکتے، بخلاف اس پوتے کے جس کا باپ مرگیا ہے کیونکہ واسطہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ دادا کا اقرب ہو جائے گا اسلئے وارث ہوگا۔

بعینہ اس کی مثال ایسی ہے جس طرح کوئی شخص نانی، دادی، اور باپ کو چھوڑ کر مرجائے، ظاہر ہے کہ دادی کو میت کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ کسی طرح نانی کے رشتہ سے کم نہیں ہے، لیکن بوجہ اس کے کہ باپ درمیان میں حاجب موجود ہے دادی محجوب ہو جاتی ہے اور نانی حصہ پا جاتی ہے کیونکہ نانی اور مورث کے درمیان کوئی حاجب موجود نہیں ہے۔

شبہ سوم[1]: بیٹا اور پوتا دونوں عصبہ ہیں اور عصبات میں یہ قاعدہ ہے کہ ذوی الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ "اولی رجل ذکر" یعنی قریب ترین مرد نر کو دیا جاتا ہے اسلئے بیٹے کے ہوتے ہوئے اس قانون کی رو سے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

جواب: اگر عصبات میں "اولیٰ رجلٍ ذکرٍ" کو آپ بطور قانون کلی کے قرار دیتے ہیں تو خود کیوں اس کو جا بجا توڑتے ہیں، مثلاً

مسئلہ

دو بیٹیاں	بہن	بھتیجا
۲	۱	محروم

اس مثال میں بیٹیاں ذوی الفروض ہیں، ان کو دو ثلث دینے کے بعد جو کچھ بچا تھا وہ اس قاعدہ کی رو سے بھتیجے کو جو اقرب ترین مرد نر ہے ملنا چاہئے تھا، لیکن وہ تو محروم کر دیا گیا، اور بہن جو زن مادہ ہے بقیہ کی وارث ہوگئی۔

---

[1] یہ شبہ علمائے اہل حدیث کی طرف سے کیا گیا ہے۔

علیٰ ہذا مسئلہ تشبیب یعنی مثال نمبر ۴ کو دیکھئے اس میں مرد نر اور زن مادہ سب کو ایک ساتھ وارث بنایا گیا ہے کیا قانون کلی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جو قدم قدم پر ٹوٹ جایا کریں؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث: الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھی لاولیٰ رجل ذکر "ذوی الفروض کو ان کے حصے دیکر بقیہ قریب ترین مرد کو دیدو" کسی خاص مسئلہ کے متعلق فرمائی گئی ہے۔ مثلاً یہ صورت فرض کیجئے کہ کوئی شخص ماں، بیٹی، باپ، چچا اور بھائی کو چھوڑ کر مرگیا اس کے بارہ میں یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ ذوی الفروض کے حقوق دیکر جو کچھ بچے قریب ترین مرد کو دیدو لیکن اس کو ایک عام اصول قرار دے لینا صریحاً قرآن کے منافی ہے۔

مثال نمبر ۱

زید مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بیٹا
۳	۵	۱۰

یہاں ماں کو ایک سدس دینے کے بعد آپ کے اس قانون کلی کے مطابق بقیہ پانچ سدس بیٹے کو ملنا چاہئے لیکن قرآن مجید اس کے برخلاف اس صورت میں بیٹا اور بیٹی دونوں کو وارث بناتا ہے اور بیٹے کا نصف بیٹی کو دلاتا ہے۔

زید مسئلہ ۶ — ۱۸

ماں	بیٹی	بہن	بھائی
۳	۹	۲	۴

اس صورت میں ماں اور بیٹی جو ذوی الفروض میں ان کا حصہ دینے کے بعد بقیہ بھائی کو ملنا چاہئے تھا کیونکہ وہ "اولیٰ رجل ذکر" ہے، لیکن قرآن کریم بھائی اور بہن دونوں میں للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ترکہ تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اب سوچئے کہ یہ حدیث جس کی صحت پر تمام اہلِ سنت متفق ہیں قانونِ کلی قرار دینے سے ان کے خلاف پڑتی ہے اور غلط ہوئی جاتی ہے اس لئے یقیناً یہ کسی خاص مسئلہ ہی کے متعلق ہو سکتی ہے۔

یہاں ایک امر اور غور کے قابل ہے کہ آپ جہاں اس کو قانونِ کلی قرار دیتے ہیں کہ بقیہ "اولیٰ رجل ذکر" کو ملنا چاہئے۔ وہاں اس حدیث کو بھی قانونِ کلی ہی سمجھتے ہیں کہ "اجعلوا الاخوات مع البنات عصبۃ" بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنا دو۔

اس مثال نمبر ۲ میں بتائیے تو سہی کہ آپ نے اپنے ان دونوں کلی قوانین میں سے کس پر عمل کیا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کو بھی حصہ مل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ اولاد کے ساتھ بہنوں کو وارث بناتے ہیں وہ آئیں ہم ان کے ساتھ مباہلہ کیلئے تیار ہیں کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو۔

شبہ چہارم: صحیح بخاری کتاب الفرائض میں ہے۔ ولا یرث ولد الابن مع الابن۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وراثت نہیں پاتا۔

جواب: اس جملہ کے معنی تو یہ ہوئے کہ "بیٹے کی اولاد خود اس بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں پاتی"۔ اسلئے کہ اس جملہ میں

دونوں جگہ لفظ ابن پر الف لام تعریف کا ہے اور اصول فقہ میں یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ایسی صورت میں دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہوتی ہے، چنانچہ نورالانوار میں ہے:-

المعرفۃ اذا اعیدت کانت الاولیٰ عین الثانیہ

معرفہ جب دوبارہ لایا جائے گا تو پہلا بعینہ دوسرا ہوگا۔

چنانچہ اسی بنیاد پر اس میں لکھا ہے کہ اس آیت میں

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔

عُسر ایک اور یُسر دو سمجھے گئے ہیں سند میں شاعر کا یہ شعر پیش کیا ہے:-

اذا اشتدت بك البلویٰ ففکر فی الم نشرح　　فعسر بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

جب تجھ پر بلاؤں کی شدت ہو تو الم نشرح کی سورۃ میں غور کر کیونکہ ایک دشواری دو آسانیوں کے درمیان ہے یہ سوچکر خوش ہو جا۔

اصول فقہ کی رو سے اس کے معنی یہی ہوئے کہ بیٹے کی موجودگی میں خود اس کی اولاد محروم رہتی ہے یہ نہیں کہ کسی بیٹے کی موجودگی میں وہ حصہ نہ پائے، اس لئے یہ ہمارے مدعا کے مخالف نہیں ہے بلکہ مطابق ہے۔

علاوہ بریں یہ حدیث نبوی نہیں ہے، صرف حضرت زید بن ثابت کا قول ہے اور تفسیر اور حدیث کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وراثت کے مسائل میں اکثر رائے رکھتے تھے اور ان میں باہم ایک دوسرے سے اختلاف ہو جاتا تھا، چنانچہ کئی مسئلوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابت میں اختلاف واقع ہوا ہے اور ایک نے دوسرے کی رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ فتح الباری میں جد کے متعلق ایک قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسی کی وراثت کے بارے میں اپنے زمانے میں سو فیصلے کئے اور سب ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

شبہ پنجم: امام بخاریؒ نے یہی باب باندھا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بیٹے کی اولاد وراثت نہیں پاتی۔

جواب: بیشک، لیکن جو دلیل وہ اس کے اوپر لائے ہیں وہ ایک تو یہی حضرت زید بن ثابتؓ کا قول ہے جس کے متعلق تفصیل کے ساتھ ہم لکھ چکے ہیں، دوسری "اولیٰ رجل ذکر" والی حدیث ہے جس کے بارہ میں ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف کسی جزئی مسئلہ کا حکم ہے، قانون کلی نہیں ہو سکتی۔

شبہ ششم: جب بڑے بڑے علماء و فقہائے امت نے جن کی بزرگی اور علمی عظمت کو تم خود تسلیم کرتے ہو اپنی کتابوں میں تصریح کے ساتھ لکھدیا ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم اولاد محجوب ہوتی ہے تو پھر تم اس مسئلہ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ [1]

جواب: ان تصریحات سے میں بھی واقف ہوں لیکن فقہی مسائل میں ہم کو ہر ایک فقیہ سے خواہ وہ کتنا ہی معظم و محترم کیوں نہ ہو

[1] یہ بات میرے جواب میں مدرسہ دیوبند کے مفتی صاحب نے لکھی ہے۔

اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے، اور خاص کر اس مسئلہ میں جس کی عدم صحت کے قوی دلائل ہمارے پاس موجود ہوں، ایسے تنازع کی صورت میں قرآن مجید یہ حکم دیتا ہے۔

فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر

تم کسی بات میں آپس میں جھگڑ پڑو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو اگر اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔

اس لئے تاوقتیکہ کتاب اللہ کی کسی آیت سے اس مسئلہ کا ثبوت نہ دیا جائے، یا کوئی حدیث صحیح یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا کوئی فیصلہ پیش نہ کیا جائے اس وقت تک ہم کیونکر ایسا مسئلہ تسلیم کرلیں جو اسلامی شفقت بلکہ انسانی فطرت کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے، اور جس کے مان لینے سے دشمنانِ اسلام کو اسلام کے قانون پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔

علمائے امت نبی تو نہیں ہیں کہ معصوم ہوں چنانچہ خود ان میں باہم بیشمار اختلافات ہیں قطعی حجت صرف کلام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی ہے اور بس۔

قرآن اور حدیث دونوں متوفی بیٹے کی اولاد کو قطعاً محروم نہیں کرتے، فقہ میں اقرب کا صحیح مفہوم متعین نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ یتیم اولاد محجوب قرار پا گئی، حالانکہ خود فقہا کے یہاں اس کے خلاف مثالیں موجود ہیں، مثلاً بیٹی کے ساتھ پوتی کو بھی وہ حصہ دلاتے ہیں، نیز پوتی، پڑپوتی، سکڑپوتی سب کو ایک درجہ میں رکھ کر برابر ترکہ دیتے ہیں لیکن یتیم اولاد کے بارے میں آکر یک قلم حجب حرمان کا فرمان صادر کر دیتے ہیں۔

با کہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں شیریں لب   کشت ما را و دم عیسیٰ مریم با اوست

یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے خارج کر دینا اور ان کو ہمیشہ کیلئے ان کے آباؤ اجداد کی جائداد اور ملکیت سے محروم کر دینا ایک ایسا خلاف فطرت قانون ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر انصاف پسند عقلا اس کو جائز رکھتے ہیں، کوئی شخص ٹھنڈے دل سے سوچکر انصاف سے کہے کہ خدانخواستہ اگر وہ خود یا اس کی اولاد اس قانون کی رو سے محجوب ہو تو کیا وہ اس کو پسند کرے گا؟ لہٰذا ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند، قرآن میں ہے:-

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذریۃ ضعٰفاً خافوا علیھم۔ فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولاً سدیدا

اور ان لوگوں کو خوف کرنا چاہئے جو اگر اپنے بعد ناتوان اولاد چھوڑ جاتے تو ان پر ترس کھاتے اسلئے ان کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور ٹھیک بات کہیں۔

پوتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے۔

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجاً وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ ورزقکم من الطیبات

افبالباطل یؤمنون وبنعمت اللہ ھم یکفرون۔

اور اللہ نے تمہیں میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا کیا اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور پاک چیزوں سے تم کو روزی عطا فرمائی۔ کیا پھر بھی لوگ جھوٹے معبودوں پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

کیا نعمت الٰہی کی قدر و حرمت یہی ہے کہ وہ خاندان سے خارج اور اپنے باپ دادا کی کمائی اور محنت کے ثمرہ سے محروم کر دی جائے اور در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرے۔

یتیم اولاد کے محجوب کرنے میں صرف یہی برائی نہیں ہے کہ وہ اسلامی شفقت اور انسانی فطرت کے خلاف ہے بلکہ معاشرت میں اس سے خرابیاں واقع ہو سکتی ہیں۔

ایک خرابی تو یہ ہے کہ محجوب اولاد کے دلوں میں محرومی کی وجہ سے رنجش پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص فرشتہ تو نہیں ہے کہ مادی جذبات سے بالاتر ہو، انسان کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرے ہی بزرگوں کی کمائی سے جن کا خون میری رگوں میں گردش کر رہا ہے، میرے چچازاد بھائی تو عیش و عشرت کر رہے ہیں اور میں بلا کسی قصور کے اس سے بالکل محروم ہوں تو اس کو صبر نہیں آتا۔

سخن درست بگویم نمے توانم دید   کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

اس رنجش کی بدولت خاندان میں ایک دائمی عداوت کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے دینی اور دنیاوی برکتیں مفقود ہو جاتی ہیں اور ترقی نہیں ہوتی بلکہ بعض حالتوں میں یہ عداوت خاندان پر تباہی اور بربادی لاتی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ جب لائق بیٹوں کو جو باپ کے خدمت گزار ہیں اور اس کی ملکیت کے انتظام و ترقی میں دن رات محنت اور کوشش کرتے ہیں، یہ یقین ہو جائے گا کہ اگر اتفاقاً وہ اپنے باپ سے پہلے مر گئے تو ان کی اولاد محجوب ہو جائے گی۔ تو وہ باپ کی خدمت اور اس کے کاروبار سے پہلوتہی کرنے لگیں گے اور اپنی کمائی اور کوشش سے اپنی جداگانہ ملکیت پیدا کرنے کی فکر میں پڑ جائیں گے کہ اگر احیاناً ایسا حادثہ پیش آ جائے تو ان کی اولاد کے پاس کچھ سرمایہ رہے اور وہ بالکل ہی دست نگر اور محتاج نہ رہ جائے، اسلئے کہ یہ امر فطرتی ہے کہ انسان کو اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔

تو ایسی حالت میں جبکہ بیٹے اس خیال میں پڑ جائیں گے نہ باپ کی جائیداد اور ملکیت کا انتظام درست ہو گا نہ اس میں ترقی ہو سکے گی۔ علاوہ بریں باپ کو اپنے بڑھاپے کے زمانے میں بھی جو توبہ اور عبادت کا وقت ہے اپنے دنیاوی کاروبار سے سبکدوشی حاصل نہ ہو سکے گی، اور اولاد سے وہ جائز آسائش اس کو نہ مل سکے گی جس کی عہد پیری میں ان سے توقع کی جاتی ہے اور نہ اولاد ہی اس کی خدمت کر کے سعادتمندی حاصل کرنے کے قابل ہو گی۔

تیسری خرابی ایک مثال سے سمجھ میں آ سکتی ہے، فرض کیجئے کہ ایک دولتمند کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک بیٹے کے چار بیٹے، ایک کا صرف ایک ہی بیٹا ہے، اب اگر چار بیٹوں کا باپ خود اپنے باپ کی زندگی ہی میں مر جائے تو اس کے چاروں بیٹے محجوب الارث کے قانون کی رو سے سمجھیں گے کہ جو کچھ خاندانی ملکیت ہے وہ دادا کے مرنے پر چچا کو اور پھر اس سے منتقل ہو کر چچازاد بھائی کو ملے گی، ہم چاروں بھائی تو ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے، اس لئے ان میں سے اگر کوئی محرومی کے خیال سے غیظ و غضب میں آ کر اپنے بھائیوں کی خاطر بلا ان کے مشورہ کے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر دادا کی زندگی ہی میں چچا کو

کسی حیلہ سے مار ڈالے تو بالکل قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ آئے دن مال و دولت کے پیچھے دنیا میں خونریزیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بہت ہوا تو یہ ہوگا کہ بشرطِ ثبوت قاتل کو سزا مل جائے گی لیکن اس کے بقیہ تین بھائی جو پہلے بالکل محروم تھے، اب دادا کے ترکہ میں سے تین ثلث کے حصہ دار ہوں گے اور اپنے چچا زاد بھائی سے جو پہلے اپنے باپ کے ذریعہ سے سارے ترکہ کا وارث ہوتا تگنا حصہ پائیں گے اس غریب کا باپ بھی مارا گیا اور حصہ بھی صرف ایک چوتھائی رہ گیا۔ اور قاتل کے بھائی جو محجوب تھے اس سے تگنے کا حقدار ہو گئے[1] اس لئے یہ محجوب الارث کا مسئلہ بعض صورتوں میں قتل اور قطع رحم کا بھی محرک ہو سکتا ہے۔

الغرض مسئلہ محجوب الارث میں ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خرابی ہے اور یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اسی وجہ سے اہلِ اسلام اس مسئلہ کو اگرچہ مانتے چلے آتے ہیں لیکن ان کی طبیعتیں اس سے مالوف نہیں ہیں اور تمام طور پر ان کے دلوں میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

امید ہے کہ فقہائے اسلام ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے اور نہایت کمزور دلائل کی بنیاد پر یتیم اولاد کو خاندانی حقوق سے بلاقصور محروم کر کے اسلام کے مقدس دامن پر یتیموں کے خون کے دھبے نہ ڈالیں گے۔

ہم سے غلطی ہونی ممکن ہے لیکن اسلام دینِ الٰہی ہے وہ ہر قسم کی غلطیوں سے مبرا اور پاک ہے۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب   ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

---

[1] فقہا ایک درجہ کے ایک قسم کے ورثہ میں ترکہ کو علی الرؤس تقسیم کرتے ہیں، مثلاً زید اگر اپنے چار پوتے چھوڑ کر مر جائے جن میں سے تین ایک بیٹے کے ہوں اور ایک ایک بیٹے کا، تو وہ چاروں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ یہ طرز تقسیم ایسا ہے کہ نہ اس پر قرآن شاہد ہے نہ حدیث۔ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ وہ تینوں بیٹے اپنے باپ کے قائم مقام میں جو زیادہ سے زیادہ نصف کا حصہ دار ہو سکتا تھا پھر اس کے قائم مقام تین ثلث کیونکر پا سکتے ہیں۔ یہاں بھی فقہا نے قائم مقامی کے اصول کو نظر انداز کر دیا۔

غلام اور لونڈیاں

آپ کسی مسجد کے منبر سے صداقت و حقانیتِ اسلام پر وعظ سنئے یہ بلند آہنگ دعاوی ہمیشہ آپ کو سنائی دینگے کہ

اسلام نے مذہبی آزادی عطا کی۔

اسلام نے دنیا سے غلامی کا نام و نشان مٹایا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے واعظین و مصلحین کے یہ دعوے بہت بڑی صداقت کے حامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ اتنے ہی بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ہم نے اتنی بڑی متضاد باتیں کس طرح لکھ دیں؟ لیکن یہ تضاد فی الواقعہ موجود ہے اور ہر سوچنے والے دماغ کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ لاریب فیہ کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو مذہبی آزادی عطا کی اور اس نے دنیا سے غلامی کے نام و نشان کو مٹایا۔ اسلئے اسلام جتنی بڑی بلند آہنگی سے چاہے متذکرہ صدر دعاوی کو . . . دنیا کے سامنے پیش کرے اسے اس کا حق حاصل ہے اور اس باب میں نوعِ انسانی پر اس کا احسانِ عظیم ہے۔ لیکن کونسا اسلام؟ وہ اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ جسے ذاتِ رسالتمآبؐ نے دنیا کو دیا اور جو آج بھی قرآن کی دفتین میں محفوظ و مصئون موجود ہے۔ یہ ہے ان دعاوی کی عظیم القدر صداقت کی سند لیکن جس اسلام کو ہمارے اربابِ شریعت پیش کرتے ہیں اگر اس کی طرف سے یہ دعاوی پیش کئے جاتے ہیں تو یہ فی الواقعہ بہت بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں اس لئے کہ اسلام نے نہ مذہبی آزادی عطا کی ہے نہ غلامی کو مٹایا ہے۔ اس اسلام نے مذہبی آزادی کا گلا کس طرح گھونٹا، اس کی تصویر آپ "قتلِ مرتد" کے مضمون میں دیکھ چکے ہیں (جو طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے)۔ زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھئے کہ غلامی کے بارے میں اُس اسلام کا کیا ارشاد ہے جسے عجمی سازشوں نے وضع کیا اور جسے مُلا، خدا اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرکے، وجۂ ننگِ اسلام اور باعثِ تذلیلِ انسانیت بن رہا ہے۔

قرآنی اسلام کی تعلیم

پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنی اسلام کی اس باب میں کیا تعلیم ہے۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، نسل پرستی اور قومیت کی طرح غلامی بھی دنیا میں ایک مسلمہ کی حیثیت سے رائج تھی، مستبد بادشاہوں کو چھوڑئیے۔ مفکرینِ عالم کی یہ کیفیت تھی کہ ارسطو کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز (بلکہ وجوب) میں ستر دلیلیں پیش کیا کرتا تھا۔ عرب میں غلام اور لونڈیاں ان کے معاشرے کا لاینفک جزو بن چکے تھے۔ باہر غلام کام کاج کرتے تھے اور گھروں میں لونڈیاں جنسی تمتع کے مصرف میں لائی جاتی تھیں۔ ان کے ہاں صدیوں سے یہی روش چلی آرہی تھی اسلئے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، غلام اور لونڈیاں ان کے معاشرے کا جزو بن چکے تھے اور ان کی معاشی زندگی کا بیشتر مدار انہی پر تھا۔

قرآن ان اغلال وسلاسل کو توڑنے کیلئے آیا تھا جن میں نوعِ انسانی جکڑے چلی آرہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ غلامی جیسی بدترین لعنت کی زنجیروں کو کس طرح روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کا پیغام، شرفِ انسانیت کا پیغام، اور اس کی دعوت، احترامِ آدمیت کی دعوت ہے۔ اس کے خدا کا اعلان ہے کہ ولقد کرمنا بنی آدم "ہم نے فرزندِ آدم کو مستحقِ تکریم بنایا ہے"۔ یعنی انسان بہ حیثیت انسان، واجب التکریم ہے۔ اس کا انسان ہونا اس کے لئے باعثِ شرف ہے اور یہ شرف وتکریم ہر فرزندِ آدم کیلئے ہے۔ تمام نوعِ انسانی کو "نفس واحدہ" سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ہر انسان کے اندر "روحِ خداوندی" پھونکی گئی ہے۔ یعنی ہر انسان، صفاتِ خداوندی کی ممکنات کا حامل ہے۔ اور قرآنی معاشرے کا مقصود ومطلوب فقط یہ ہے کہ ان ممکن صفات کو مشہود بنا کر ان کی کامل نشوونما کردے۔ انسان کے متعلق جس دین کی یہ بنیادی تعلیم ہو ظاہر ہے کہ اس میں انسانی غلامی کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کے سامنے دو اہم سوال تھے:

قرآن کے سامنے دو مراحل تھے

(۱) نزولِ قرآن کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عربوں (اور دیگر ممالک) کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا جزو بن چکے تھے، ان کیلئے کشود کی راہ۔ اور

(۲) آئندہ کیلئے اس دروازے کا بند کردینا جہاں سے غلام اور لونڈیاں آتے تھے۔

شقِ اول کے متعلق ظاہر ہے کہ ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ہی دن میں نابود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسلام کا منشا یہ تھا کہ انھیں آزاد کرکے باقی انسانوں کے ہم پہلو کھڑا کردے لیکن اُن معاشرتی اور معاشی حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، یہ مقصد بتدریج حاصل ہو سکتا تھا۔ اگر ان تمام غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اس وقت موجود تھے) آنِ واحد میں آزاد کرکے چھوڑ دیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے معاشرے میں سخت انتشار واقع ہو جاتا بلکہ خود ان غلاموں اور لونڈیوں کیلئے بھی عجیب مشکلات کا سامنا ہوتا اور اکثر وبیشتر حالات میں وہ ان خاندانوں کو چھوڑنا ہی نہ چاہتے جن میں وہ گھل مل چکے تھے۔ قرآن نے ان کے متعلق ایسا طریقِ عمل اختیار کیا جس سے وہ آہستہ آہستہ اس آزاد معاشرہ میں جذب ہوتے چلے گئے۔ انھیں حق دیدیا گیا کہ وہ چاہیں تو کچھ فدیہ ادا کرکے پروانۂ آزادی حاصل کرلیں۔ کہیں خود مسلمانوں کو تاکید کردی کہ وہ بعض کوتاہیوں کے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کردیں۔ اسی طرح لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد عورتوں کا سا درجہ دیدیا۔ جب تک یہ غلام اور لونڈیاں بتدریج جذب نہیں ہوگئے ان سے حسن سلوک کا حکم دیا تاکہ وہ انسانی مراعات سے محروم نہ رہنے پائیں۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جسقدر احکام ہیں وہ سب انہی کی بابت ہیں جو اس وقت اس معاشرے میں، لونڈی اور غلاموں کی حیثیت سے موجود تھے۔ قرآن میں جہاں جہاں ان کا ذکر ہے ان الفاظ میں ہے کہ "ماملکت ایمانکم" جو (بطور غلام اور لونڈی) تمہاری ملکیت میں آچکے ہیں۔ کہیں یہ نہیں کہ "جنھیں تم اس کے بعد لونڈی اور غلام بناؤ"۔ یہ تو ہوا شقِ اول کے متعلق۔ یعنی ان لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرے میں موجود تھے۔

آئندہ کیلئے دروازہ بند

اب رہی شقِ دوم۔ یعنی آئندہ کیلئے غلامی کا دروازہ بند کرنا۔ سو اس کے لئے قرآن نے ایسی فصاحت سے حکم دیدیا کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ (اور قرآن کا کونسا حکم ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے خالی الذہن ہوکر دیکھا جائے۔ یہ تو ہمارے روایاتی رنگین شیشے ہیں جو اس کی صاف اور شفاف

تعلیم کو بھی رنگدار بنا دیتے ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُرد و صاف رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

ایامِ جاہلیت میں غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدیوں کو بنایا جاتا تھا اور بعد میں انھیں فروخت بھی کر دیا جاتا تھا۔ (بعض اوقات بچوں کو چرا کر بھی فروخت کیا جاتا تھا لیکن غلاموں اور لونڈیوں کا اصل سرچشمہ جنگ کے قیدی ہی تھا)۔ جنگ کے قیدیوں کو کیا کیا جائے اس کے متعلق سورۂ محمد میں ہے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ۔

جب تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو انھیں تہ تیغ کرو۔ یہاں تک کہ جب ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے (ان کا زور ٹوٹ جائے) تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو۔

یہ ہوئے اسیرانِ جنگ۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان اسیرانِ جنگ کو

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷)

یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔

سارے قرآن میں اسیرانِ جنگ سے متعلق یہی ایک حکم ہے۔ آپ اس حکم کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اس میں کہیں کسی پہلو سے بھی انھیں غلام بنانے کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ یا اس قسم کا گمان بھی گذر سکتا ہے کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بناؤ۔ ان کی عورتوں سے جنسی تمتع کرو۔ پھر جی چاہے تو انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دو۔ فروخت ہونے کے بعد وہ نئے خریدار کے غلام بن جائیں اور لونڈیاں اس کے مصرف میں آنے لگ جائیں۔ اور قیامت تک، جب تک ان کے مالک انھیں آزاد نہ کر دیں، وہ نسلاً بعد نسلٍ غلام اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم رکھے جائیں۔ غلام کا بیٹا بھی غلام رہے اور ساری عمر ایک پیسے کا مالک نہ ہو سکے (خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو جائے)۔ ذرا سوچئے کہ آیۂ مذکورہ بالا سے کسی صورت میں بھی یہ حکم نکل سکتا ہے؟ قرآن کا حکم بالکل صاف ہے۔ دشمن سے جنگ ہو تو اس صورت میں اسیرانِ جنگ تمہارے قبضے میں آئیں گے۔ یہ جنگ کے قیدی ہوں گے۔ تب تک جنگی مصالح کا تقاضا ہو گا یہ قید میں رکھے جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی (DISPOSAL) کا سوال سامنے آئے گا۔ اس لئے قرآن نے دو متبادل صورتیں (ALTERNATIVES) بیان کر دیں۔ یعنی یا فدیہ لیکر (جس میں اپنے قیدیوں کا تبادلہ بھی شامل ہے) یا بطور احسان، ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ قرآن نے نہ انھیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے نہ غلام بنانے کا۔ لیکن ملا کی شریعت کہتی ہے کہ نہیں! خدا کا یہ حکم نا مکمل ہے۔

ملا کا مذہب

اس کی تکمیل اس اسلام سے ہوتی ہے جسے میں پیش کرتا ہوں۔ اور وہ حکم یہ ہے کہ

اسیرانِ جنگ میں قیدیوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے۔ یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن کے مسلمان قیدیوں سے ان کا مبادلہ کر لیا جائے۔ لیکن اگر یونہی رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو، اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن اسیرانِ جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔ (تفہیمات حصہ دوم از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۲۹۲)

مودودی صاحب اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے لکھتے ہیں کہ یہ بات حکومت کے اختیار میں ہے کہ جو صورت چاہے اختیار کرے:

حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انھیں اپنے استعمال میں لائیں (ص۳۴۰)

یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم تو صرف اس قدر ہے کہ "فاما منا بعد و اما فداء" اسیران جنگ کو بطور احسان رہا کر دو یا فدیہ و معاوضہ لیکر لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ حکم ناقص ہے۔ پورا حکم یوں ہے کہ اسیران جنگ کو چاہے بطور احسان رہا کر دو، چاہے فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ اور چاہے انھیں غلام بنا کر رکھو اور ان کی عورتوں کو اپنے مصرف میں لاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ ملا کے پورے مذہب کی بنیا اس عقیدے پر ہے کہ خدا کا کوئی حکم مکمل نہیں ہوتا۔ اس کی تکمیل دوسرے مقامات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب اس باب میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ

مولف[1] کی غلطی کا اصلی سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

(تفہیمات حصہ دوم ص۲۹۲)

اس میں کیا شبہ ہے؟ ایک مسلمان کی اس سے بڑی "غلطی" اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کو مکمل ضابطۂ حیات سمجھتا ہے اور زندگی کے قانون اس سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے! یہ "غلطی" ہی نہیں، ملا کی عدالت میں ایسا جرم عظیم ہے جس کی پاداش میں ایسے مسلمان کو مرتد قرار دیکر حوالۂ دار و رسن کیا جا سکتا ہے! مسلمان اور یہ کوشش کہ صرف قرآن سے قانون اخذ کر لیا جائے! توبہ۔ توبہ۔ کتنا بڑا بہتان ہے خدا کے خلاف، اور کتنی بڑی جسارت ہے قرآن کے خلاف!! معلوم ایسے مسلمان خدا کے سامنے جا کر کیا جواب دینگے جب وہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تم نے میری اس کتاب کو مکمل ضابطۂ قانون سمجھ لیا تھا؟ کیا تم نے میرے متعلق ایسا گمان کیا تھا کہ میں مکمل احکام دے سکتا ہوں؟ کیا تم نے میری اس بات کو فی الواقعہ سچ سمجھ لیا تھا کہ

وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا ۔ لا مبدل لکلمتہ (۶/۱۱۶)

"تیرے رب کے قوانین صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے۔ ان قوانین خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا"

کیا تمہیں اسرار شریعت کے حامل (ملا) بار بار نہیں کہتے تھے کہ خدا کے احکام ناقص ہیں اور اپنی تکمیل کے لئے غیر خداوندی اضافوں کے محتاج ہیں۔ تم اپنی ضد پر اڑے رہے اور ان کی ایک نہ مانی۔ اب کہو تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

ملا کے ذہن میں خدا کا کچھ ایسا ہی نقشہ ہے۔

تضاد بیان | مودودی صاحب نے یہ کچھ تو حافظ اسلم جیراجپوری صاحب کے جواب میں لکھا لیکن جب کسی نے براہ راست ان سے

---

[1] مولف سے مراد ہیں علامہ اسلم جیراجپوری جن کی تالیف "تعلیمات قرآن" پر تنقید کے سلسلے میں مودودی صاحب نے یہ بحث چھیڑی تھی کہ اسلام میں غلامی کا حکم موجود ہے اور مولف کی یہ سخت غلطی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام نے غلامی کو منسوخ کر دیا ہے۔

دریافت کیا کہ "لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے" تو آپ نے تحریر فرمایا کہ

ان سوالات کے جواب میں پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ حقِ ملکیت کی بنا پر تمتع کی اجازت قرآن مجید کی متعدد آیات میں صریح طور پر وارد ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ اس معاملہ میں بڑی بے باکی کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے اعتراضات کر ڈالتے ہیں کہ یہ شاید "مولویوں" کا گھڑا ہوا مسئلہ ہوگا۔ اور بعض منکرین حدیث اس کو اپنے نزدیک "حدیث کے خرافات" میں سے سمجھ کر زبان درازی کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا ایسے سب لوگوں کو آگاہ رہنا چاہئے کہ ان کا معاملہ "مولویوں" کی فقہ اور محدثین کی روایات سے نہیں بلکہ خود خدا کی کتاب سے ہے۔ (ایضاً ص۳۰۸)

آپ پہلے اس بیان کو دیکھئے جس میں مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ "مولف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش کی ہے"۔ اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ مولوی کا من گھڑت مسئلہ نہیں۔ خود قرآن کا حکم ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ کتنا بڑا کھیل ہے جو دین کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے! یعنی جب مصلحت سمجھی یہ کہدیا کہ دین، قرآن ہی کے اندر تھوڑا ہے۔ اس کے ساتھ فقہ اور روایات بھی ضروری ہیں۔ اور جب ضرورت دیکھی یہ کہدیا کہ ہم فقہ اور روایات سے سند ہی نہیں لاتے۔ ہم قرآن پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے قرآن سے وہ آیات نقل کر دی ہیں جو ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے اور جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

علامہ اسلم صاحب نے اسیرانِ جنگ کے متعلق قرآن کی آیت نقل کر کے لکھا تھا کہ اس سے قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت کہیں نہیں نکلتی۔ آیت اور اس کا ترجمہ یہ تھا۔

فاما منا بعد و اما فداء — پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لیکر

اس ترجمہ کے متعلق مودودی صاحب فرماتے ہیں:

اس کے بعد لفظ منّ قابلِ غور ہے۔ منّ کے معنی صرف احسان کے ہیں "احسان رکھ کر چھوڑ دو" مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ (ص۳۰)

لیکن مودودی صاحب خود ہی دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ (ص۲۹)

اور دوسری جگہ

اسلام نے دنیا کے سامنے یہ اصول پیش کیا کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ یا اسیرانِ جنگ سے مبادلہ کر لو۔ یا بطریق احسان رہا کر دو۔ (ص۳۱)

یعنی اگر حافظ اسلم صاحب یہ کہیں کہ "احسان رکھ کر چھوڑ دو" تو یہ ان کا اپنا اضافہ ہے۔ اسلام کا قانون نہیں ہے۔ اور جب مودودی صاحب ارشاد فرمائیں کہ "احسان کے طور پر رہا کرو" تو یہ اسلام کا قانون ہے، ان کا اپنا اضافہ نہیں ہے۔

جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے جب تم چلو، زمین چلے، آسمان چلے!

قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں

اس ضمن میں ایک اور چیز بھی بڑی دلچسپ سامنے آتی ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

آیت میں مناً کا لفظ ہے جس کے معنی احسان رکھنے کے ہیں اور قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ (ص۲۹۳)

غور فرمایا آپ نے کہ ملا اپنی بات کی زچ میں کہاں تک جا پہنچتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ یہ اس قرآن کا ذکر ہے جس میں یہ آیت بھی موجود ہے کہ

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ($\frac{16}{9}$)

یقیناً اللہ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ ورنہ جس ملا کی جرأتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن میں ایسے احکام کی موجودگی میں کہہ دیتا ہے کہ "قرآن میں احسان کا حکم کہیں نہیں دیا گیا"۔ اگر قرآن کہیں اسی کی تحویل میں ہوتا تو معلوم یہ اس کے ساتھ کیا کچھ کرتا!

اس بے بسی میں ذوقؔ یہ عالم بشر کا ہے کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے!

دنیا اس مسئلے کا حل کس طرح کرتی ہے؟

مودودی صاحب بار بار یہ فرماتے ہیں کہ اگر فریق مخالف اپنے قیدیوں کو چھڑائے نہیں۔ اور قیدیوں میں زر فدیہ دیکر آزاد ہونے کی استطاعت نہ ہو تو اس صورت میں ان قیدیوں کو کیا کیا جائے؟ لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہیں غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا جائے۔ دنیا میں آئے دن جنگیں ہوتی ہیں۔ ان میں قیدی بھی پکڑے جاتے ہیں۔ ان قیدیوں سے متعلق مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ خود ہماری آنکھوں کے سامنے دو مہیب اور عظیم جنگیں ہو چکی ہیں جن میں قیدیوں کی مجموعی تعداد کروڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ کیا ان قوموں میں سے کسی کا ذہن بھی اس طرف گیا کہ ان قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر نخاس میں ٹکے ٹکے پر فروخت کرنا چاہیئے؟ ان کفار اور مشرکین کا ذہن تو اس طرف نہ گیا لیکن یہ ہمارے مفتیانِ شریعت ہیں (جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ زندگی، انسانوں کا وضع کردہ نہیں، خود خدا کا عطا فرمودہ ہے۔ اور اس کی مثل اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی) جب ان کے سامنے یہی سوال آتا ہے تو انہیں اس کے سوا کوئی عملی شکل نظر ہی نہیں آتی کہ ان قیدیوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جائے! اور

ان کی عورتوں کو اپنے استعمال میں لایا جائے ۔

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

قرآن اس مسئلہ کا حل صاف بتاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک تمہارے مصالح کا تقاضا ہو' ان قیدیوں کو قیدیوں کی طرح رکھو ۔ اور چونکہ یہ قیدی انسان ہیں' اسلئے ان سے انسانیت کا سلوک کرو' اس کے بعد جب ان کے آزاد کرنے کا سوال سامنے آئے تو تمہیں اجازت ہے کہ ان کے مبادلے میں اپنے قیدی چھڑا لو ۔ یا اگر فریقِ مخالف کے ہاں تمہارے قیدی نہ ہوں (یا کم مقدار میں ہوں) تو زرِ فدیہ لیکر آزاد کردو ۔ اور یہ بھی اجازت ہے کہ انھیں بطور احسان چھوڑ دو ۔ جو صورت مناسب نظر آئے اس کے مطابق عمل کرو ۔ حتیٰ تضع الحرب اوزارھا (۴۷) یہانتک کہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھدے ۔ یعنی تمہارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ دنیا سے جنگ کا سلسلہ ختم ہو جائے ۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ تم جنگ کے قیدیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرو کہ آئندہ وہ تمہارے خلاف ہتھیار ہی نہ اٹھائیں ۔ اور مخالف قوموں سے اس قسم کا احسان مندانہ سلوک کرو کہ تمہارے سامنے ان کا سرِ تسلیم خود ہی خم ہو جائے ۔ یہ تھا قرآن کا منشاء ۔ لیکن ہمارے ملا کا مذہب یہ ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں سے شہوت رانی کرو تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے" ۔ بالکل درست فرمایا ۔ جن لوگوں سے اس قسم کا سلوک ہوگا وہ آئندہ دشمنی پر آمادہ ہی نہیں ہو سکیں گے ؟ وہ تو ایسی قوم کے بے دام غلام بن جائیں گے !

چونکہ غلامی کا تصور ہی ایسا ہے کہ اس سے انسان کے احساسِ انسانیت کو ٹھیس لگتی ہے (بشرطیکہ یہ احساس اندھی تقلید کے افیونی اثر سے مفلوج یا مصلحت کوشیوں سے مجحوب نہ ہو چکا ہو) اس لئے مودودی صاحب کے پاس اس کے خلاف بہت سے اعتراضات پہنچے ۔ ان اعتراضات کو دیکھکر مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

> جنگ میں گرفتار ہونے والے سبایا (لونڈی غلاموں) کے حق میں اسلام نے جو قوانین وضع کئے تھے ان کو سمجھنے میں آج لوگوں کو اسلئے دقتیں پیش آ رہی ہیں کہ اِس زمانے میں وہ حالات باقی نہیں رہے جن کیلئے یہ قوانین وضع کئے گئے تھے ۔ (ص ۳۰۹)

اس اقتباس سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مودودی صاحب بھی وہی بات کہتے ہیں جسے ہم نے شروع میں پیش کیا ہے یعنی یہ کہ قرآن میں "ماملکت ایمانکم" (لونڈی غلاموں) کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان لونڈیوں اور غلاموں کی بابت ہیں جو اس وقت عربی معاشرے میں موجود تھے ۔ جب وہ غلام باقی نہ رہے تو یہ احکام بھی ختم ہو گئے ۔ (البتہ اس کے بعد اگر پھر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے ۔ یعنی کوئی ایسی قوم اسلام لے آئے جس میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں ۔ یا خود مسلمانوں کی وہ سلطنتیں جن میں لونڈی اور غلاموں کو روا رکھ لیا گیا تھا' یا آج بھی روا رکھا جاتا ہے ۔ مثلاً حجاز کی "مقدس" سرزمین اور وہاں کی "خالص اسلامی" حکومت میں ــــ پھر قرآن کی طرف رجوع کریں تو اس وقت پھر وہی احکام نافذ العمل ہو جائیں گے جو زمانۂ بعثتِ نبی اکرمؐ میں نافذ ہوتے تھے) لیکن درحقیقت مودودی صاحب **یہ احکام اب بھی موجود ہیں** اس سے بالکل مختلف بات کہتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ آج بھی جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی

عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مودودی صاحب نظامِ شریعت کی تنفیذ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان سے (۱۹۴۸ء میں) پوچھا گیا کہ

کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی۔ اور کیا اُن غلام اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق ہوگا۔ (ص ۳۲۱)

تو انھوں نے کہا کہ ہاں! نظامِ شریعت میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے وہ حالات بتائے جن میں جنگی قیدی غلام بنائے جاسکتے ہیں اور وہ "دلائل" دیئے جن کی رو سے (مودودی صاحب کے نزدیک) یہ احکام عین مبنی بر حکمت ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ مودودی صاحب سے پھر دریافت کرلے کہ جس نظامِ شریعت کو وہ رائج کرنا چاہتے ہیں اس میں جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔ ان کی تفسیر (تفہیم القرآن) حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں جنگ میں قید شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کرنے کا حکم مستقلاً موجود ہے۔ (اقتباس اوپر دیا جاچکا ہے۔ تفصیل جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے) اور یہ اس لئے کہ ازمنۂ سلف کے شاہی درباروں میں وضع شدہ شریعت میں وہ معاشرہ کس کام کا جس میں لونڈیاں ہی نہ ہوں!

اب وہ دلائل ملاحظہ فرمائیے جن کی رو سے غلامی کو عین مطابقِ حکمتِ الٰہیہ قرار دیا جارہا ہے۔ فرماتے ہیں:

غلامی کے حق میں دلائل

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی اجازت ایسی حالت میں دی گئی ہے[۵۴] جب کہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہو نہ قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو، نہ فدیہ لیکر ہمارے قیدیوں کو چھوڑے اور نہ فدیہ دیکر اپنے قیدی چھڑالے۔ آپ غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں وہ یا تو انھیں قتل کرے گی یا انھیں عمر بھر اس قسم کے انسانی باڑوں میں رکھے گی جنھیں آج کل (CONCENTRATION CAMPS) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ ہے۔ . . . اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کردیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کردی جائے۔ (ص ۳۲۲)

سوال یہ نہیں کہ "کوئی حکومت" ان حالات میں جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ نظامِ شریعتِ اسلامیہ کی حامل حکومت ان حالات میں کیا کرے گی۔ کیا ان کے ہاں بھی اس قسم کے (CONCENTRATION CAMPS) ہوں گے جن میں قیدیوں کو کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لی جائیگی؟ کیا اس نظامِ شریعت میں انسانوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی؟ کیا اس میں قیدیوں کو "شاہی مہمان" (STATE GUESTS.) کی صورت میں رکھنے کی کوئی اجازت نہیں ہوگی؟ کیا وہ نظام ایسا ہی ہوگا کہ اس میں جنگی قیدی شکر کریں گے کہ انھیں غلام بنالیا گیا ہے ورنہ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظام شریعت میں انسانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا کہ اس سلوک کے

[۵۴] اس سے بھی ظاہر ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک یہ اجازت آج بھی موجود ہے اگر وہ حالات پیدا ہوجائیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ طلوع اسلام۔

مقابلے میں غلامی گویا ان کے حق میں بہت بڑا احسان ہوگی! کیا یہی ہوگا وہ نظامِ شریعت جس کے متعلق ہم ساری دنیا کو کہتے چلے آرہے ہیں کہ وہ عرش سے اترا ہوا ہے؟

پھر یہ دیکھئے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان (CONCENTRATION CAMPS) کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں اور دنیا سے کہیں کہ جنگی قیدیوں سے انسانوں جیسا سلوک کرو۔ ہم ان سے کہتے ہیں تو یہ کہ "اسلام" نے اس خرابی کا یہ حل بتایا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں؟ سبحان اللہ! کیسی "آسمان سے نازل شدہ" اصلاح ہے! انسانیت اس حسنِ سلوک پہ ناز کرے گی اور دنیا کے قیدی اس احسانِ عظیم پر سجدہ ریز ہوں گے جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں، ان "مصلحین و مشفقین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا شکار بن رہی ہیں۔ وہ شکر کریں گے کہ ان سے جبری محنت نہیں لی جارہی۔ . . . . صرف ان سے جبری . . . . . کیا جارہا ہے؟

مودودی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ غلام بنانے سے ان کی قانونی حیثیت مشخص ہوجاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ قانونی حیثیت کیا ہے؟

(i) غلام اپنی کمائی کے ایک پیسے کا بھی مالک نہیں بن سکتا۔

(ii) غلام کا بیٹا بھی غلام ہوتا ہے (حتیٰ کہ اگر غیر مسلم غلام مسلمان بھی ہوجائے وہ تب بھی غلام ہی رہتا ہے)

(iii) جب مالک کا جی چاہے اُسے، جس کے ہاتھوں جی چاہے فروخت کر دیا جا سکتا ہے۔

(iv) غلام عورت (یعنی لونڈی) سے بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔ اس میں تعداد کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔

(v) جس لونڈی سے اس طرح جنسی تمتع کیا جائے، اس کا درجہ "شریف بیبیوں" جیسا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد پر بھی پرستار زادگی کا داغ رہتا ہے۔

(vi) لونڈیوں کے ساتھ ہم بستری کی صورت میں عزل (WITHDRAWAL) بھی کیا جا سکتا ہے اور لواطت بھی (اس کی تفصیل اور سند آگے آتی ہے)

(vii) اور جب جی بھر جائے تو لونڈی کو کسی دوسرے کے پاس فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے کہ کتنی بڑی ہے یہ قانونی حیثیت جو غلاموں اور لونڈیوں کو عطا فرمائی جارہی ہے!

عورتوں پر احسانِ عظیم

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کیلئے . . . . اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جائیں۔ (ص۳۲۳)

یعنی اگر کسی معاشرے میں ایک ایک شخص، دس دس بیس بیس عورتیں سنبھال لے۔ ان کے ساتھ، ان کی مرضی کے خلاف، جنسی تعلقات قائم کرلے۔ پھر جب جی چاہے انھیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے اور اس کی قیمت بھی اپنی ہی جیب میں ڈالے۔ تو یہ سب کچھ، ماشاء اللہ، پاکیزگیٔ اخلاق میں داخل ہے۔ اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے اور نہ ہی اس طرح ان کی خرید و فروخت کی جائے تو وہ سوسائٹی میں "مستقل بداخلاقی" پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ ہر وہ بداخلاقی جسے مُلا کی بارگاہ سے جواز کا فتویٰ مل جائے، عین اخلاق ہے۔ اس کے سوا "اخلاق" اور "بداخلاقی" کی تعریف (DEFINITION) اور کیا باقی رہ جاتی ہے! چنانچہ اس کی مزید تشریح خود مودودی صاحب نے کردی ہے۔ ان پر اعتراض یہ کیا گیا کہ

لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع محض شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے۔ (ص ۳۰۷)

نکاح کی ضرورت نہیں

اعتراض سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے۔ چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہو چکی ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا صرف وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں۔ دو گواہ ہوں۔ ایجاب و قبول ہو۔ خطبۂ نکاح پڑھا جائے۔ اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے۔ لیکن اسلام کوئی رسمی (CONVENTIONAL) مذہب نہیں بلکہ ایک عقلی (RATIONAL) مذہب ہے۔ وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ نکاح سے ایک عورت جو ایک مرد کیلئے حلال ہوتی ہے تو آخر اسی بنا پر تو حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اسے حلال کیا ہے۔ اسی طرح اگر ملک یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اسے حلال کرے تو اس میں کراہت کی کونسی بات ہے۔ (ص ۳۱۵)۔

لیجئے! معترض صاحب لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع پر ہی چیں بجبیں ہو رہے تھے، مودودی صاحب کے نزدیک اصلاً نکاح ہی غیر ضروری ہے؟ لونڈیوں کی بات تو بعد میں آئے گی۔ اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔

زید کسی ایسی عورت سے، جس سے قرآن کی رو سے نکاح کیا جا سکتا ہے، عورت کی مرضی سے، تعلقات زناشوئی قائم کرتا ہے۔ وہ دونوں باہمی رضامندی سے اسی طرح رہتے ہیں لیکن نکاح نہیں کرتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا شریعت کی رو سے ان کا یہ جنسی تعلق جائز ہوگا یا ناجائز۔ اور ان کی اولاد، حلال کی اولاد قرار پائیگی یا حرام کی۔

مودودی صاحب کے نزدیک یہ تعلقات بالکل جائز ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے تعلق (بلا نکاح) کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہوں وہ مودودی صاحب سے خود بات صاف کرلیں۔ ہم تو سردست لونڈیوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے لہذا اپنی بات کو انہی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ جنسی حلت و حرمت کے متعلق یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ ہر وہ عورت جسے خدا نے حلال کر دیا ہے، از خود حلال نہیں ہو جاتی۔ اس کیلئے ایک اہم شرط اور بھی ہے۔ اور وہ شرط اسی طرح لاینفک ہے جس طرح خدا کی طرف سے حلت کی شرط۔ اور یہ شرط ہے خود عورت کی رضامندی۔ مثلاً خدا نے زید پر اس کے چچا کی لڑکی حلال قرار دی ہے۔ (یعنی قرآن کی رو سے زید کا نکاح اس کی چچیری بہن سے ہو سکتا ہے) لیکن یہ لڑکی محض خدا کے حلال قرار دینے سے زید کے لئے حلال نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے خود اس لڑکی کی رضامندی (کہ وہ زید کی

بیوی بننا چاہتی ہے) بھی لاینفک ہے۔ اگر وہ لڑکی اس پر رضامند نہیں ہوتی تو وہ (خدا کے حلال کرنے کے باوجود) زید پر حرام ہی رہے گی۔ لہذا جنسی تعلقات کے جائز ہونے کے لئے دو شرطیں لاینفک ہیں۔

اول ـــ اس عورت کو خدا نے حلال قرار دیا ہو۔ اور
دوم ـــ وہ عورت، تعلقاتِ زناشوئی پر رضامند ہو۔ [۱]

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو وہ تعلقات حرام ہوں گے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اگر عورت رضامند نہ ہو تو خدا کی حلال کردہ بھی حلال نہیں ہوتی۔

اب یہ سوچئے کہ کیا لونڈی سے تعلقات کی صورت میں یہ دوسری شرط پوری ہوتی ہے؟ کیا لونڈی سے اس کی رضامندی کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں؟ (ظاہر ہے کہ اس میں اس کی رضامندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ جس کے حصے میں آ جائے اور جس کے ہاتھوں فروخت ہو جائے اُسے اس سے بہر حال ہم بستر ہونا پڑے گا۔

اب آپ غور فرمائیے کہ دنیا کا کوئی ضابطۂ اخلاق بھی ایسا ہے جو اس قسم کے تعلقات کو جائز قرار دیدے؟ خدا کے ضابطۂ قوانین کو تو چھوڑئیے، کیا یورپ کے ملحدین، کفار و مشرکین کے ہاں بھی اس قسم کے جنسی تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے؟ ان تعلقات کو تو ان لوگوں کے ہاں بھی زنا (RAPE) ہی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن قیامت ہے کہ ایسے تعلقات کو اگر روا رکھا جاتا ہے تو اس دین کے (نام نہاد) پیروؤں کے ہاں جو دنیا میں مکارم اخلاق کا بلند ترین ضامن اور عصمت و عفت کا حصن حصین واقع ہوا ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت کہ اس زبردستی کے جنسی تعلقات کی اجازت کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات رسالتمآبؐ کی طرف جو دنیا میں پاکیزگیٔ اخلاق، عفتِ نگاہ اور تطہیرِ فکر و عمل کے سب سے بڑے معلم اور علمبردار تھے! اب اس کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پیٹ کر بیٹھ جائے اور کیا کر سکتا ہے۔ غور کیجئے کہ عجم کی ان سازشوں نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا رکھا ہے یعنی وہ باتیں جنہیں ملحدین و مشرکین کے ہاں بھی شرمناک تصور کیا جاتا ہے، وہ ہمارے "مذہب" کا جزو بنا کر رکھدی گئی ہیں اور انہیں خدا اور رسول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے!

کوئی حد مقرر نہیں!

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب کے سامنے جب یہ اعتراض پیش کیا گیا کہ

اسلامی شریعت میں نکاح کیلئے تو چار کی حد مقرر ہے۔ . . . . لیکن لونڈیوں کے لئے سرے سے کوئی حد رکھی ہی نہیں۔

اس کی کیا وجہ ہے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت نے چار کی حد مقرر کرنے کے سارے فوائد کو باطل کر دیا۔ اس نے خوشحال

---

[۱] معروف شرطیں تین ہیں:
(۱) خدا نے اس عورت کو حلال قرار دیا ہو۔
(۲) مرد اور عورت کی باہمی رضامندی ہو۔ اور
(۳) اور اس رضامندی کا اظہار نکاح کی رو سے کیا جائے۔
چونکہ تیسری شرط کو خود مودودی صاحب نے غیر ضروری قرار دیدیا ہے اس لئے ہم ان سے صرف پہلی دو شرطوں کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

لوگوں کیلئے بے تحاشا عیاشی کا دروازہ کھول دیا اور امراء و رؤسا کیلئے یہ گنجائش نکال دی کہ بے شمار عورتوں کو خرید کر گھروں میں ڈال لیں اور خوب دادِ عیش دیں۔ یہ کچھ مفروضہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عملاً یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ (ص ۳۱۹)

تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اسلئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو اس سوسائٹی میں انھیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ جبکہ لونڈیوں سے تمتع کیلئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو۔ (ص ۳۲۴)

لیکن اگر آپ سے کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ منکوحہ عورتوں کی صورت میں آپ کے ہاں چار تک کی تعداد متعین ہے۔ اور اس کا جواز بھی آپ ہی پیش کرتے ہیں کہ جب عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جائے تو اس طرح انھیں سوسائٹی میں کھپایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو جائے کہ سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد بہت بڑھ جائے تو اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟ آپ کی مذکورہ صدر دلیل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ منکوحہ عورتوں کے باب میں اللہ نے جو آخری حد مقرر کر دی ہے اس میں (معاذ اللہ) دور اندیشی سے کام نہیں لیا گیا۔ دور اندیشی پر مبنی تو ملا ہی کا قانون ہے جس میں لونڈیوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں مقرر کی گئی بلکہ اصول یہ رکھا گیا ہے کہ

جو ہو چمن میں وفورِ گل کا، تو اور دامن دراز ہو جا۔

اور اگر (بقول مودودی صاحب) لونڈیوں سے متعلق قانون بھی خدا ہی کا بنایا ہوا ہے تو یہ عجیب چیز ہے کہ منکوحہ بیویوں کی صورت میں تو اس کا خیال نہ رکھا گیا کہ اگر عورتوں کی تعداد اس سے بھی بڑھ گئی تو کیا کیا جائیگا، اور لونڈیوں کے معاملے میں اس کا خاص خیال رکھا گیا؟

ذہنی آوارگی

انسان اپنی ہوس کاریوں کیلئے بھی کیسے کیسے مقدس بہانے تراشتا ہے! اس کے بعد مودودی صاحب فرماتے ہیں،

رہا آپ کا یہ شبہ کہ لونڈیوں کی ان گنت تعداد سے تمتع کرنے کی اجازت ذہنی آوارگی کا دروازہ کھولتی ہے اور یہ کہ لونڈیوں کے قابلِ بیع و شری ہونے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ مالدار لوگ لونڈیاں خرید خرید کر ایک پورا بیڑہ فراہم کر لیں اور اپنے گھروں کو عیاشی کا اڈا بنا کر رکھ دیں۔ تو یہ اور اس نوعیت کے اکثر شبہات عموماً اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ معاملہ کا ایک ہی پہلو نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور دوسرے پہلو چھپے رہتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ شارع نے اپنا قانون انسانی بھلائی کیلئے بنایا ہے اور اس قانون میں جو سہولتیں اور گنجائشیں رکھی ہیں وہ ان حقیقی ضرورتوں کیلئے رکھی ہیں جو عموماً انسان کو پیش آتی ہیں یا پیش آسکتی ہیں۔ اگر بعض لوگ ان گنجائشوں سے اس قسم کے غلط فائدے اٹھاتے ہیں جن کیلئے درحقیقت شارع نے یہ گنجائشیں نہیں رکھی تھیں تو یہ ان کی اپنی نافہمی ہے یا شرارتِ نفس۔ لیکن اس قسم کی انفرادی غلطیوں کے امکان یا وقوع سے ڈر کر قانون میں ایسی تنگی پیدا کرنا جس سے عام لوگوں کی حقیقی ضرورتیں پوری ہونے میں مشکلات واقع ہوں کسی حکیم کا کام نہیں ہو سکتا۔ (ص ۳۲۰)

اسی ضمن میں آپ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بعد کے زمانے میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا لیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے خلاف تھا۔ (ص ۳۲۶)

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم میں لونڈیاں دھڑا دھڑ آ رہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں تو پھر وہ کونسی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔ جسے لونڈی مل جائے (خواہ حکومت کی طرف سے یا قیمتاً) اور "شریعت" اس

جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو۔ تو پھر اس لونڈی سے تمتع، عیاشی کا حیلہ کسطرح بن جائیگا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کر دیئے جائیں اور پھر ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام دھرا جائے۔ موردِ الزام اس سامان عیاشی کو فراہم کرنے والے ہیں یا ان سے متمتع ہونے والے؟ اس ضمن میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشا کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے (ص ۳۲۴)

یہ صورت بھی، اسی "شریعت" کی رو سے ممکن ہے جو ملّا کی خود ساختہ ہے۔ قرآنی شریعت میں طلاق دیدینا ایسا کھیل نہیں کہ نیلام کنندہ کی طرح ایک، دو، تین کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال دیا۔ قرآنی طلاق کے لئے کئی مراحل طے کرنے کے بعد عدالت سے فیصلہ لینا ہوگا۔ اس میں یہ مذاق نہیں ہوگا کہ گھر بیٹھے ہی طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہا اور معاملہ ختم کر دیا۔

لونڈیوں کا فروخت کرنا

اس کے بعد مودودی صاحب اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ لونڈیوں کو فروخت کرنا نہایت ذلت آمیز فعل ہے۔ فرماتے ہیں۔

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کے بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے . . . . فدیہ وصول کرنے، اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اور اس طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا بھی کوئی کھیل نہیں۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کئے جاتے اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے (ص ۳۲۳)

سرت گردم! کیا دلیل ہے!! یعنی دشمن کے قیدیوں سے کام لینا بہت مشکل ہے۔ اور ان کی عورتوں کا گھروں میں رکھنا بیحد پُرخطر لیکن انہی قیدیوں کو جب غلام بنا لیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اور جب ان کی عورتوں سے ان کے مردوں کے سامنے، ان کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات دور ہو جاتے ہیں جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے پیش آسکتے تھے۔ اس سے فی الواقعہ ان کے جذبات عداوت محبت میں بدل جائینگے۔

اب رہا یہ کہ جب یہ غلام اور لونڈیاں کسی ایک کے لئے وبال جان بن جائیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔ تو یہ فروخت کردہ غلام اور لونڈیاں اپنے نئے مالک کے لئے "واقعی" عین راحت بن جائینگے؟ اس سے انھیں دلی اُنس پیدا ہو جائیگا؟ اور اسی طرح جب وہ انہیں تیسرے کے ہاتھ فروخت کر دیگا تو اس نئے مالک سے اور بھی زیادہ محبت ہو جائیگی!! ان کی دشمنی تو دراصل پہلے ہی سے تھی جس نے انہیں مفت حاصل کر لیا تھا۔ جنہوں نے دام دیکر خریدا ہو ان سے دشمنی کرتے ہوئے انہیں شرم نہیں آئیگی؟

اگر غیر مسلم بھی یہی کریں تو؟

اب آئیے اس اعتراض کی طرف کہ

غیر مسلم محارب قومیں اگر گرفتار شدہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کریں تو عقلاً اس کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کا کیا حق ہے (ص ۳۰۸)

اس کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

رہا آپ کا آخری سوال، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کرتے وقت آپ نے یہ فرض کر لیا تھا کہ دشمن کے قبضے میں جو مسلمان عورتیں جاتی ہونگی ان کو وہ بالکل گھر کی بیٹیاں بنا کر رکھتے ہونگے۔ کیا آپ کا یہ مفروضہ صحیح ہے؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ اس پر ہمیں احتجاج کا کیا حق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تو عورتوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی غلام بنا کر رکھنا نہ چاہتے تھے۔ اگر دشمن اسیرانِ جنگ کے تبادلے پر راضی ہوتے تو ہم ان کے ایک مرد یا ایک عورت کو بھی اپنے پاس غلام بنا کر رکھنے پر اصرار نہ کرتے۔ لہٰذا اگر صدیوں تک دنیا میں غلامی کا رواج رہا اور ایک قوم کی شریف عورتیں لونڈیاں بن بن کر دوسری قوموں کے تصرف میں آتی رہیں تو یہ ہمارے قصور کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کے ذمے دار وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اسیرانِ جنگ کے بارے میں کسی مہذب اور معقول رویّے کو اختیار کرنے پر راضی نہ ہوئے (ص ۱۹-۳۱۸)

یہ عبارت کچھ مبہم سی ہے۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب دوسری قومیں ہماری عورتوں کو لونڈیاں بنائیںگے تو ہم ان کی عورتوں کو لونڈیاں کیوں نہ بنائیں! یعنی اسلام کے اپنے اصول کچھ نہیں۔ جو کچھ دوسرے ان سے کریں یہ وہی کچھ ان سے کرلیں۔ بس یہ ہے اصول۔ وہ ان کے ہاں ڈاکے ڈالیں تو اس کے جواب میں یہ بھی ان کے ہاں ڈاکے ڈالنا شروع کردیں۔ وہ ان سے جھوٹ بولیں تو یہ بھی ان سے جھوٹ بولیں۔ وہ ان سے بے ایمانی (بددیانتی) کریں تو اس کے جواب میں یہ بھی ان سے بے ایمانی شروع کردیں۔ وہ اِن کی راہ چلتی عورتوں کو چھیڑیں یا اٹھالیں تو یہ بھی ان کی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردیں اور انہیں زبردستی اٹھالیں۔ وہ اِن کی عورتوں کو لونڈیاں بنائیں تو یہ بھی ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنالیں! یہ ہوگا مسلمانوں کا اصولِ زندگی اور مسلکِ حیات یہ ہوگا ان کا نمونہ دوسری قوموں کے ساتھ معاملات کے بارے میں! کیسے زرّیں ہیں یہ اصول اور کسقدر بلند ہے یہ مسلک! ایسی قوم کا مسلک و مشرب بتایا جارہا ہے جس کا خدا ان سے کہتا ہے کہ ان مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو مبادا یہ بھی تمہارے خدا کو گالی دیدیں۔ جس کا قرآن ان سے کہتا ہے کہ لایجرمنکم شنأن قوم علی ان لاتعدلوا۔ اعدلوا۔ کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں کہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ تم ان سے بہرحال اور بہرکیف عدل کرو۔ عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ وہ اگر ذلیل حرکات پر اتر آئیں تو تم اپنا بلند مقام چھوڑ کر ان کی پست سطح پر نہ آجاؤ۔ تمہیں تو شاھد علی الناس پیدا کیا گیا ہے۔ تمہیں ساری دنیا کے لئے مکارمِ اخلاق اور حسنِ آئین کا نمونہ بننا ہے۔ اگر تم بھی جوشِ انتقام میں انہی جیسی بیہودہ حرکتیں کرنے لگ گئے تو ان میں اور تم میں فرق کیا رہا!

معترض کا اعتراض

لیکن معترض کا اعتراض ہنوز اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ آج اقوامِ عالم میں کسی کے یہاں بھی یہ قانون نہیں کہ جنگ کے قیدیوں میں عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرکے ان کی خرید و فروخت شروع کردی جائے

لیکن (مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق) اسلامی شریعت میں یہ شق موجود ہے۔ اب اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ کسی جنگ میں مسلمانوں کی عورتیں دشمن کے ہاں قید ہوں اور ان کی عورتیں مسلمانوں کے ہاں۔ دشمن اپنے قیدیوں کا مبادلہ نہ کرے نہ ہی زر فدیہ دیکر انہیں چھڑائے۔ تو ایسے حالات میں (مودودی صاحب کی شریعت کے مطابق) مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ ان قیدی عورتوں سے جنسی تعلقات قایم کریں۔ معترض کا کہنا ہے کہ ان حالات میں اگر دشمن مسلمانوں کی طرف سے پہل ہونے کے بعد جیسے وہ اپنی "شریعت" کے مطابق کرینگے) مسلمانوں کی عورتوں سے بھی اس قسم کی حرکت کرنے لگ جائے تو اس صورت میں مسلمانوں کو یہ حق تو نہیں ہوگا کہ وہ دشمن کے اس رویے کے خلاف احتجاج کرسکیں۔ مودودی صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ (مودودی صاحب کے انداز فکر اور پیش کردہ مسلک کے مطابق) اس کا جواب واضح تھا کہ اسلام کے توانین عالمگیر ہیں۔ اور مسلمانوں کی تمام جدوجہد کا ماحصل یہ ہونا چاہئے کہ اسلام کے قوانین ہر جگہ عام ہو جائیں۔ اور اگر کوئی قوم وہی قانون اپنی ہاں نافذ کرتی ہے جو مسلمانوں کے نظام شریعت میں موجود ہے تو یہ بات مسلمانوں کے لئے باعث مسرت اور وجہ صد افتخار ہوگی۔ لہذا اگر دنیا کی کوئی قوم (مسلمانوں کی طرف سے پہل ہونیکے بعد) ان کی قیدی عورتوں سے اس قسم کی نازیبا حرکت شروع کردیگی، تو مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کے لئے یہ مقام ہزار مسرت و شادمانی کا ہوگا۔ کہ ان کے خدا کا قانون عام ہو رہا ہے اور دنیا کی قومیں (مسلمان ہوئے بغیر) اسلام قوانین پر عمل پیرا ہوتی جا رہی ہیں۔ بلکہ وہ اسی کو اسلام کے "دین فطرت" ہونے کی ایک دلیل قرار دینگے کہ دیکھو! دنیا نے اسقدر جدوجہد کے بعد غلامی کو مٹایا تھا۔ لیکن چونکہ غلامی" انسانی فطرت" کا تقاضا تھی اس لئے ان قوموں کو دوبارہ اس کی طرف لوٹنا پڑا۔ "خدا" اپنے "دین" کو اس طرح انسانوں سے منواتا ہے! کیسا دلکش ہوگا وہ نظارہ کہ مسلمان دشمن کی عورتوں سے زبردستی شب بسر کر رہے ہونگے اور دشمن ان کی بہو بیٹیوں کے ساتھ یہ کچھ کر رہا ہوگا۔ اور مسلمانوں کے ہاں خوشی کے شادیانے بج رہے ہونگے کہ خدا کا دین عام ہو رہا ہے۔ اس وقت ابلیس بوریہ بستر باندھکر اللہ کے ہاں واپس چلا جائیگا کہ اب زمین پر میری ضرورت باقی نہیں رہی۔ میرا مقصد تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا کہ

> مالک کے تصرف میں آجانے کے بعد ایک عورت اگر صاحب اولاد ہو جائے تو وہ اس خاندان کی ایک فرد بن جاتی ہے اسکو ام ولد کہا جاتا ہے۔ اسکی اولاد جائز اولاد سمجھی جاتی ہے۔ اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ (ص ۳۱۵)

لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو، خود مودودی صاحب کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ "ان کی شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتادی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات قایم کئے جائیں اور یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے ہاں اولاد پیدا ہو جائیگی۔ سنئے کہ وہ تدبیر کیا ہے؟

کلیجہ تھامئے! لیکن اس تدبیر کے سننے سے پہلے، ہمارے درد بھرے دل کی ایک کراہ سن لیجئے۔ طلوع اسلام پر وہ وقت انتہائی کرب اذیت کا ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات درج کرنی پڑ جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے نگاہیں زمین میں گڑ جائیں۔ جس سے دوسروں کی نظروں میں اسلام کی سبکی ہو۔ پھر اس سے بھی زیادہ درد و الم کا وقت وہ ہوتا ہے۔ جب اس قسم کی

باتوں کو "حدیث" کہہ کر درج کیا جائے، کیونکہ حدیث سے مراد یہ ہے کہ اس بات کی نسبت ذات رسالتمآبؐ کی طرف کی جاتی ہے۔ حضور ختمی مرتبتؐ کی ذات اقدس و اعظم کا مقام اس قدر بلند ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اسے "خلق عظیم" کہہ کر پکارتا ہے اور حضورؐ کے ذکر کو بلند کرنے کا اعلان کرتا ہے (ورفعنا لک ذکرک) اس لئے طلوع اسلام کے صفحات میں کسی ایسی بات کا درج ہونا جس سے اس ذاتِ گرامی (فداہ ابی وامی) کی شان میں ذرا سا بھی طعن پایا جائے، ہمارے لئے قیامت کا حادثہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم کیا کریں کہ بعض وقت صورت ایسی واقعہ ہو جاتی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہتا۔ مثلاً اسی غلامی کے موضوع کو لیجئے۔ اگر ہم اس مقام پر فقط اتنا کہہ کر آگے گذر جائیں کہ ہماری کتب روایات میں ایسی ایسی شرمناک باتیں موجود ہیں جن کے تصور سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، تو مُلا فوراً اعلان کر دیگا کہ "طلوع اسلام بکواس کرتا ہے۔ نبی اکرمؐ کی احادیث مقدسہ اور ان میں اس قسم کی باتیں! معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ اس دریدہ دہن کو شرم نہیں آتی کہ ایسے ایسے اتہامات تراشتا ہے اور پھر انہیں پوری بے حیائی سے حضور رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کرتا ہے"۔ چونکہ عوام ان کتب روایات کی حدیثوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہ بات بھی بڑی معقول نظر آتی ہے کہ ایسی مقدس کتابوں میں اس قسم کی بے حیائی کی باتیں نہیں ہو سکتیں، اس لئے مُلا کا یہ حربہ کارگر ہو جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ سینے پر پتھر رکھ کر، اس قسم کی مثالیں انہی مقدس کتب روایات سے درج کر دیں تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ان میں فی الواقعہ یہ کچھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلوع اسلام نے مُلا کے مذہب کی مخالفت ہی اس لئے شروع کر رکھی ہے کہ اس مذہب سے دنیا میں مسلمان رسوا ہو رہے ہیں ـــ اسلام سخت بدنام ہو رہا ہے۔ اقوام عالم میں مسلمانوں کے اسلاف ہدفِ طعن و تشنیع بن رہے ہیں۔ خود حضور رسالتمآبؐ کی اس قسم کی تصویر سامنے آتی ہے جس سے (معاذ اللہ معاذ اللہ) انسان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے، اور اس سے بھی آگے، خود خدا کا تصور ایسا قائم ہوتا ہے جو انسان کے دورِ جہالت و بربریت کا پیداوار دکھائی دیتا ہے۔ اگر کبھی طلوع اسلام کے صفحات پر اس قسم کی روایات نقل کر دی جاتی ہیں جو قارئین کے ذوقِ لطیف پر گراں گزرتی ہیں تو محض اس لئے کہ ان کے درج کئے بغیر یہ بات کبھی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی کہ جس مذہب کو مُلا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے کیا وہ فی الواقعہ ایسا ہے جیسا طلوعِ اسلام کہتا ہے؟

یہ ہے وہ ضرورت جس کی وجہ سے طلوعِ اسلام کو بعض اوقات اس تلخ اور ناگوار فریضہ کو سرانجام دینا پڑتا ہے۔ مُلا کہتا ہے کہ طلوع اسلام کو اس "گند اُچھالنے" میں مزہ ملتا ہے۔ ہم اس کی آنکھوں میں وہ بینائی کہاں سے لاکر رکھ دیں جس سے وہ دیکھ سکے کہ ہمارا سینہ کتنے کتنے بڑے گہرے زخموں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ اگر اسے کہیں اس قسم کی بینائی نصیب ہو جائے تو وہ پھر دیکھ سکے کہ ہم کیا کہتے ہیں اور کیوں ایسا کہتے ہیں۔

کیا جانئے کیا کہتا، کیا دیکھتا کیا کرتا — زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

اِس عرضداشت کو سامنے رکھ کر اب اصل موضوع کی طرف آیئے۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خود مُلا کی شریعت نے اس کی بھی تدبیر کر دی ہے

صحیح بخاری کی روایات

کہ لونڈیوں کے ساتھ جنسی تعلقات بھی قائم ہوں اور اولاد کا خطرہ بھی پیدا نہ ہو۔ ہماری طرح چھاتی پر پتھر رکھئے اور سنئے وہ تدبیر! اور اس کے بعد دیوارِ حرم سے ٹکر مار کر سر پھوڑ کر مر جایئے۔ "صحیح" بخاری

کتاب البیوع۔ مطبوعہ مصر جلد دوم ص۳۱ پر یہ حدیث درج ہے:

ان ابا سعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ۔ قال یا رسول اللہ انا نصیب سبیاً فنحب الاثمان فکیف تری فی العزل۔ فقال اوانکم تفعلون ذالک لا علیکم ان لا تفعلوا ذالکم فانھا لیست نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے تھے حضورؐ سے عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم انھیں بیچنا چاہتے ہیں۔ تو عزل[1] کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونا اللہ نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

ذرا سوچا بھی آپ نے کہ یہ نقشہ کس مجلس کا کھینچا گیا ہے؟ صحابہ کبارؓ استفسار کر رہے ہیں اور حضور نبی اکرمؐ جواب دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ عجم کے منافقین نے کس کس طریق سے ہمیں تباہ و برباد کیا ہے۔ یہ ہے وہ تصویر جو انھوں نے آپ کے رسول مقبول اور ان کے صحابہ کبار کی کھینچ رکھی ہے۔ اور یہ تصویر آج اس کتاب میں موجود ہے جسے مُلاّ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ کہہ کر پیش کرتا ہے۔ عزل سے متعلق مذکورہ بالا گفتگو محض نظری حیثیت سے نہیں ہوری بلکہ اسی بخاری (کتاب النکاح۔ باب العزل۔ جلد سوم ص۱۶۲) میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ

قال کنا نعزل علیٰ عھد النبی والقران ینزل

ہم عہد نبوی میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا۔

یہ تھی وہ تدبیر جو (مُلاّ کے مذہب کے مطابق) اس مقصد کے لئے اختیار کی جاتی تھی کہ لونڈیوں کو حمل نہ قرار پا جائے تاکہ اس طرح ان کی قیمت کم نہ ہونے پائے۔

اور اگر اس پر بھی حمل ہو جائے۔ یا وہ پہلے سے حاملہ ہو تو پھر مباشرت کی کیا صورت ہو؟ اس کے لئے اسی بخاری (جلد دوم ص۳۱) میں یہ حدیث بھی موجود ہے۔

لا بأس ان یصیب من جاریۃ الحامل مادون الفرج

اس میں بھی حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے۔

معاذ اللہ! معاذ اللہ!! یہ ہیں وہ "احادیثِ مقدسہ" جنھیں حضور ختمی مرتبتؐ کی ذات گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نہیں شرمایا جاتا کہ کل قیامت کو خدا اور اس کے رسول کے سامنے کیا جواب دینگے۔

اس کے بعد مودودی صاحب فرمائیں گے کہ ان "منکرینِ حدیث" سے جب بات کیجئے یہ "غلاظت سے بھری ہوئی جھاڑو" لیکر سامنے آجاتے ہیں (ترجمان القرآن)۔ ہمیں اس غلاظت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ غلاظت آئی کہاں سے ہے؟ کیا "منکرینِ حدیث"

---

[1] عزل کے معنی ہیں مجامعت کے وقت، رحم کے اندر انزال نہ ہونے دینا۔

اس غلاظت کو اپنے ہاں سے لے آئے ہیں یا یہ غلاظت خود ان "کتب مقدسہ" کے اندر موجود ہے جنھیں آپ حضرات وحیٔ خفی پکار کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں. فرق صرف اس قدر ہے کہ آپ ان چیزوں کو غلافوں میں لپیٹ لپیٹ کر رکھتے ہیں اور (اپنے مطلب کے علاوہ) عوام کو کبھی نہیں بتاتے کہ ان میں کیا کچھ ہے۔ اور "منکرینِ حدیث" انھیں کھول کر لوگوں کے سامنے رکھدیتے ہیں! اس پر آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ اور آنا بھی چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے آپ کی اس "مثلہٗ معہٗ" کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، جس پر آپ کی دین فروشی کا مدار ہے۔

سخت لب و لہجہ اس مقام پر ہمیں دو لفظ ان حضرات سے کہہ لینے کی بھی اجازت دیجئے جنھیں یہ شکایت ہوتی ہے کہ بعض اوقات طلوع اسلام کا لب و لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ ہم ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص وہ باتیں جو اوپر کی روایات میں لکھی ہیں آپ کے والدِ مرحوم کی طرف منسوب کرے۔ یعنی وہ لوگوں سے یہ کہتا پھرے کہ آپ کے والد بزرگوار اپنے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیا کرتے تھے، تو کیا آپ اس شخص کو تبریک و تہنیت کا خط لکھیں گے؟ کیا آپ کا جی یہ نہیں چاہے گا کہ وہ شخص اگر کہیں مل جائے تو اس کی زبان گدی سے کھینچکر نکال لی جائے! اگر آپ کو اپنے والد مرحوم کی شان میں گستاخی کرنے والے کے خلاف اس قدر غصہ آسکتا ہے تو کیا آپ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ جو شخص اس ذاتِ اقدس و اعظم کی شانِ اطہر میں اس قدر گستاخی کرے، جو ہمارے نزدیک جملہ کائنات سے زیادہ محبوب و عزیز ہے، ہم اسے اتنا بھی نہ کہہ سکیں کہ تمہیں ان باتوں کو اُس ہستیٔ مقدس کی طرف منسوب کرتے سے شرم آنی چاہئے؟ اگر کسی کے دل میں رسول اللہؐ کے متعلق اتنی بھی غیرت نہیں ہے تو اس کا ایمان اور اس کے ضوابطِ اخلاق اسے مبارک. ہم اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ (نظیری کے الفاظ میں) وہ ــــ از قبیلۂ ما نیست۔

یہ ہے مختصراً غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مسلک اس نظامِ شریعت کا جسے محترم مودودی صاحب اور ان کی جماعت، پاکستان میں نافذ کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ آپ بھی اس "جہادِ عظیم" میں حصہ لیجئے اور کوشش کیجئے کہ یہ نظام کم از کم تیسری جنگِ عظیم سے پہلے پہلے نافذ ہو جائے تاکہ جب اس کے بعد جنگ کے قیدیوں کا اہم مسئلہ اقوامِ عالم کے سامنے آئے تو آپ ان اقوام سے کہہ سکیں کہ تم نے آج تک اس پیچیدہ اور دشوار مسئلہ کے حل کرنے کی جس قدر شکلیں اختیار کی ہیں وہ سب اس لئے ناکام رہی ہیں کہ وہ انسانوں کے دماغ کی وضع کردہ تدابیر تھیں۔ اب یہ دیکھو کہ اس مسئلہ کا حل اس نظامِ شریعت میں کیا ہے جسے خود "خدا نے" اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا۔ اور وہ حل یہ ہے کہ

> جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں۔ حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے۔ چاہے ان سے فدیہ لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے قبضے میں ہوں۔ اور چاہے انھیں سپاہیوں

میں تقسیم کر دے۔ ان سپاہیوں کو حق ہوگا کہ وہ ان عورتوں سے "بلا نکاح" بلا ان کی رضامندی اور بلا تعداد جنسی تعلقات قائم کریں۔ انھیں یہ بھی اختیار ہوگا کہ اس خیال سے کہ اگر انھیں حمل رہ گیا تو ان کی قیمت کم ہو جائے گی، مباشرت کے وقت عزل کر لیا کریں۔ اور حمل کی صورت میں شرمگاہ کے علاوہ دوسرے طریق سے (من دون الفرج) مجامعت کر لیا کریں۔ اس کے بعد جب جی چاہے انھیں کسی دوسرے کے ہاتھوں فروخت کر دیں۔ جو شخص انھیں اس طرح سے خریدے اسے بھی وہی حق استعمال حاصل ہوگا جو فروخت کنندہ کو تھا۔

جب آپ کی "حکومتِ الٰہیہ" کا نمائندہ، مجلس اقوام عالم میں اس "آسمانی تدبیر" کا اعلان کرے گا تو ساری دنیا "اسلام" کی عظمت و صداقت کا اعتراف کرے گی اور ہر شخص ایسی "نورانی ہدایت" بھیجنے والے "خدا" کے حضور سجدہ ریز ہوگا اور اس طرح

"زمین اپنے پرورش کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"!

اس وقت عجمی سازشیوں کی روحیں اس اعلان کرنے والوں پر حمد و ستائش کے پھول برسائیں گی کہ آج تمہارے ہاتھوں ہمارے مقاصد کی تکمیل ہوگئی!

کس قدر بدبخت ہے مسلمانوں کی قوم جو ایسے "جہادِ عظیم" میں ان مصلحین کا ہاتھ نہیں بٹاتی؟

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

کے

چند عنوانات

آنحضرتؐ کا بچپن — اسوۂ محمدیہ پر ایک نظر — گنبدِ خضراء — حضرت ابوذر غفاریؓ — حضرت اویس قرنیؓ — مثنوی اسرارِ خودی — پیام مشرق — جاوید نامہ — ضرب کلیم — اسبابِ زوالِ امت — خطِ عربی — نابینائی — سفرِ حج — میری طالب علمی

ضخامت چار سو صفحات — قیمت چار روپے

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن۔ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسّلام، خود قرآن کے آئینہ۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر ہیں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائناتؐ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں ــــ کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جِلد مضبوط اور حسین، گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین

قیمت بیس۲۰ روپے ــ محصولڈاک عہ/

ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

(بقیہ لمعات از صفحہ ۱۰)

ہم جانتے ہیں کہ قوم کی حالت ایسی ہو چکی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے بھی حیرت سے پوچھا تھا کہ رب ارنی کیف تحي الموتیٰ (۲/۲۶۰) "میرے پروردگار! مجھے دکھا تو سہی کہ تو ان مردوں کو کس طرح زندہ کردے گا؟" لیکن ان مردوں میں ہنوز زندگی کی رمق باقی تھی۔ ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ ان لوگوں کو جو ذہنی تشتت وانتشار کا شکار ہو چکے ہیں، ایک آواز پر جمع ہونے کی عادت ڈال دو۔ اگر تم نے یہ کرلیا تو تم دیکھو گے کہ اسی مُردوں کی بستی سے کس طرح زندگی کے چشمے ابلنے لگ جاتے ہیں۔ مسلمان بھی اس وقت فکر و نظر کی پریشانی کا شکار ہے۔ اس کے لئے بھی کرنے کا کام یہ ہے کہ اس میں ایک آواز پر جمع ہو جانے کی عادت ڈال دی جائے۔ یہ آواز کسی انسان کی آواز نہیں ہو سکتی۔ یہ آواز خود اللہ کی آواز ہے جو قرآن کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ مسلمانوں کو اسی آواز پر لبیک کہنے کی عادت پڑ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ طلوعِ اسلام کا مشن صرف اتنا ہے کہ یہ مسلمانوں کے سامنے اس رازِ حیات کو بے نقاب کردے کہ استجیبوا اللہ و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴) اس قرآنی نظام کے مرکز کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی دعوت دیتا ہے جو زندگی عطا کرنے والی ہے۔ یاد رکھئے! استجاب (RESPONSE) ہی زندگی کی نشانی ہے۔ زندہ وہ ہے جو کسی کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ خدا چونکہ مستقل حیات ہے اس لئے وہ ہر بلانے والے کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ "میں ہر پکارنے والے کی آواز کا جواب دیتا ہوں"۔ اس لئے اس کا مطالبہ بھی یہ ہے کہ فلیستجیبوا لی (۲/۱۸۶) تم میری آواز پر لبیک کہو۔ میرے بلاوے کا جواب دو۔ خدا کی آواز، اس کا بلاوا، قرآن ہے۔ جس دن مسلمان نے قرآن کی آواز کا جواب دینا شروع کر دیا، اسی دن زندگی کی تمام حرارتیں اس کے لئے وجۂ گرمیٔ محفل بن جائیں گی۔ طلوعِ اسلام سنتِ ابراہیمی کی اتباع میں ان آواز فراموش متوحش پرندوں کو آہستہ آہستہ سدھا رہا ہے کہ وہ اس صدائے سرمدی پر لبیک کہنا سیکھ جائیں۔

بہ جلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم	بجز این دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی!

جب یہ ہو گیا تو پھر دیکھئے گا کہ وہ معاشرہ کتنی جلدی وجود میں آجاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زمزمہ بار و نغمہ خیز ہوگی اور کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کریگا۔ اس لئے خودکشی کا لفظ تک ان کی لغت میں باقی نہ رہے گا۔ آپ نے آج تک کہیں سنا کہ عہدِ رسالتمآبؐ میں کسی شخص نے خودکشی کی ہو؟ وہ معاشرہ تو دنیا کو زندگی بانٹنے کے لئے قائم ہوا تھا۔ اس میں خودکشی کا کیا کام!

شرک

ساری دنیا کے مسلمان خواہ اور ہر بات میں اختلاف رکھتے ہوں لیکن اس ایک بات میں سب یک زبان ہوں گے کہ شرک جرم کبیر اور ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دیگا لیکن شرک کبھی نہیں بخشے گا۔

لیکن جب ان سے پوچھئے کہ شرک کسے کہتے ہیں تو ان کا ذہن بت پرستی سے آگے نہیں جائے گا۔ یعنی ان کے نزدیک بتوں کا پوجنا شرک ہے۔ اور چونکہ مسلمان بتوں کو نہیں پوجتے اس لئے ان میں سے شرک کا مرتکب کوئی نہیں ہوتا۔

ان میں کا ایک گروہ ذرا آگے بڑھتا ہے تو قبر پرستی (مردوں سے مرادیں مانگنے) اور ان کے نام پر نذر نیاز دینے کو شرک قرار دیتا ہے اور اس مطمئن ہوجاتا ہے کہ شرک دوسرے فرقے کرتے ہیں۔ ہم پکے موحد ہیں۔ (چنانچہ یہ اپنے آپ کو کہتے ہی موحد ہیں)۔

قرآن نے شرک کے بیشمار گوشے گنوائے ہیں۔ اسلئے کہ قرآن، شرفِ انسانیت کا علمبردار ہے اور شرک، انسانیت کی تذلیل ہے۔

لیکن ان تمام گوشوں میں ایک گوشہ ایسا ہے جس کی طرف مسلمانوں کے کسی فرقے کی بھی نگاہ نہیں جاتی اور جو شخص اس گوشے کی طرف توجہ دلاتا ہے ہر فرقے کے اربابِ شریعت اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑجاتے ہیں۔

شرک کا یہ گوشہ آپ کو سورۂ شوریٰ کی اس آیۂ جلیلہ میں ملیگا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲/۲۱)

کیا ان لوگوں نے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو انھیں شریعت کے ایسے احکام متعین کرکے دیتے ہیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔

دیکھئے کہ بات کسقدر صاف اور واضح ہے۔ شریعت کا کوئی ایسا حکم وضع کرنا جس کی اجازت اللہ نے نہ دی ہو، قرآن کی رو سے شرک ہے۔ ظاہر ہے کہ "اللہ کی اجازت" یا "اللہ کا حکم" قرآن کے اندر ہی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا بات یوں ہوئی کہ شریعت کا کوئی ایسا حکم وضع کرنا۔ یا کسی حکم کا ماننا جس کی اجازت قرآن سے نہ ملتی ہو، شرک ہے۔ آیت درحقیقت تفسیر ہے اس آیت کی جس میں اللہ نے کہا ہے کہ

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶)

اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا کہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰)

اور جس بات میں بھی تم اختلاف کرو تو (اس کا فیصلہ) اللہ ہی کے حکم کے مطابق ہونا چاہئے۔

اب ان کڑیوں کو ملائیے۔ بات صاف ہوجائیگی۔

(۱) جس معاملے میں اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق ہوگا۔

(۲) صرف اللہ کے حکم کے مطابق۔ اس لئے کہ اللہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

(۳) جو لوگ شریعت کے ایسے احکام دیتے ہیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا تو وہ اللہ کے شریک ہیں۔ ایسے احکام کی اطاعت شرک ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ کتنے ایسے احکام ہیں جنھیں احکامِ شریعت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ اللہ کے حکم کے یکسر خلاف جاتے ہیں۔ آپ اس قسم کے کئی احکام طلوعِ اسلام کے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔

مثلاً

(الف) اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں لیکن ملا کی شریعت کہتی ہے کہ دین بدلنے والے مسلمان کو قتل کر دیا جائے گا۔

(ب) خدا کہتا ہے کہ غلامی جرمِ عظیم ہے۔ جنگ کے قیدیوں کو یا فدیہ لیکر چھوڑ دو۔ یا احساناً رہا کر دو۔

ملا کی شریعت کہتی ہے کہ جنگ کے قیدیوں میں سے مردوں کو غلام بناؤ اور ان کی عورتوں کو بلا حد و نہایت (جتنی جی چاہے) لونڈیاں بنا کر رکھو۔ ان سے بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کرو اور جب جی چاہے دوسرے کے پاس فروخت کر دو۔

(ج) خدا کہتا ہے کہ یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصہ دو لیکن ملا کی شریعت کہتی ہے کہ یتیم پوتے کو وراثت سے محروم رکھو۔

(د) خدا کہتا ہے کہ تمہیں تمہارے مال میں حقِ وصیت حاصل ہے۔ ملا کی شریعت کہتی ہے کہ نہیں! یہ حق صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لئے۔

(س) خدا کہتا ہے کہ ہم نے صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ملا کی شریعت حرام و حلال کی ایسی لمبی لمبی فہرستیں پیش کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔

یہ تو بطور مثال چند فقہی احکام کا ذکر ہے۔ ملا تو اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔

خدا کہتا ہے کہ میرے احکام کا مجموعہ قرآن ہے جس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور اس کی مثل و نظیر ناممکن ہے۔ ملا کہتا ہے کہ قرآن کے ساتھ قرآن جیسا (مثلہٗ معہٗ) مجموعۂ احکام شریعت اور بھی ہے۔ نہ صرف قرآن کی مانند بلکہ وہ قرآن کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

ان چند مثالوں کو سامنے رکھئے اور پھر ایک مرتبہ اور دیکھئے سورۂ شوریٰ کی اس آیت کو

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ۔ (۲۲/۲۱)

کیا ان لوگوں نے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو انھیں شریعت کے ایسے احکام متعین کر کے دیتے ہیں جن کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔

اور اس کے بعد

اے مسلماں! پوچھ اپنے دل سے، ملا سے نہ پوچھ

کہ ان احکام کو شریعت کے احکام سمجھنا۔ اور ان کی اتباع کرنا، توحید ہے یا شرک!

یہ مت دیکھو کہ ہم کیا کہتے ہیں۔ یہ بھی نہ دیکھو کہ مُلا کیا کہتا ہے۔ لیکن اتنا تو دیکھو کہ جس خدا پر تمہارا ایمان ہے، وہ کیا کہتا ہے!

کیا تمہارا ایمان نہیں کہ —— شرک، ظلمِ عظیم ہے!

کیا تمہارا ایمان نہیں کہ —— خدا شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا؟

اگر اس پر تمہارا ایمان ہے تو پھر سوچو کہ جس چیز کو خود خدا شرک قرار دے رہا ہے، اس کے اختیار کرنے سے تم کبھی توحید پرست ہو سکتے ہو؟

اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے تو پھر خود ہی فیصلہ کرو کہ اس قسم کی غیر خدائی شریعت کی اتباع کے بعد تم خدا کو کیا جواب دو گے؟ ملا کے ساتھ کیا بیتے گی؟ اسے چھوڑو۔ سوچو یہ کہ اللہ کے حضور خود تمہارے ساتھ کیا بیتے گی؟ وہاں تو تمہیں ہی جواب دینا ہوگا۔ تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکو گے کہ ہمیں مُلا نے ایسا ہی بتایا تھا۔ پوچھا یہ جائے گا کہ جس قرآن کو ہم نے تمہارے لئے ختمِ رسالت[1] کے بعد حجت (دلیل محکم) بنا کر محفوظ رکھا تھا، وہ قرآن بھی تمہارے پاس موجود تھا یا نہیں! یاد رکھو! اس وقت ان منکرینِ قرآن میں سے کوئی بھی تمہاری سفارش نہیں کر سکے گا!

طلوع اسلام آپ کو صرف اس شرک سے بچنے کی دعوت دیتا ہے۔ مُلا کے پاس اس دعوت کا جواب گالیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اسلئے کہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے لا برھان لہٗ بہ (۲۳/۱۱۷) اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اور جس کے پاس دلیل نہ ہو وہ گالیاں دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے!

---

[1] لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل (۴/۱۶۵)
تاکہ یہ (قرآن) رسولوں کے بعد انسانوں کیلئے اللہ کی طرف سے حجت کا کام دے۔

مساجد کے خطیب

صرف ایک روپیہ میں

طلوعِ اسلام حاصل کر سکتے ہیں

ایک صاحب نے پیشکش کی ہے کہ جو مساجد کے خطیب ایک روپیہ بھیجدیں گے ان کا بقایا چندہ وہ خود ادا کر کے طلوع اسلام ایک سال کے لئے ان کے نام جاری کرا دیں گے۔ لہٰذا جو حضرات طلوع اسلام حاصل کرنا چاہیں وہ جلد از جلد ایک روپیہ ارسال کر دیں۔ چونکہ پیشکش محدود ہے اس لئے جس ترتیب سے منی آرڈر موصول ہوں گے اسی ترتیب سے رسالے بھیجے جائیں گے۔

ناظم طلوع اسلام

نوحۂ انگلیس

آہ، آبادان آبادان نماند
آہ، ایں جا جائے استاداں نماند
چشمِ من روشن، دلم شاداں نماند

دل پریشاں خانہ ویراں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

ایں زمیں از آتشِ ملّی بتفت
نفت وہم ماشینِ من از دست رفت
وائے نفت، اے وائے نفت، اے وائے نفت

در فراقِ نفت گریاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

چوں حقِ ایرانیاں تحقیق شد
از مصدّق صدقِ شاں تصدیق شد
ملّتِ من سخت بے توفیق شد

خود زدستِ خویش نالاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

من ز ایراں نفع ہا اندوختم
و اندریں خاک آتشے افروختم
وائے ناکامی کہ خود ہم سوختم
زیں سبب بے ساز و ساماں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

من بہ عذرِ جستجوئے علم و فن
بُردم ایراں را سوئے عصرِ کہن
تازہ کردم جذبۂ قوم و وطن
برق زن بر دین و ایماں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

ریختم در مُلک طرحِ انقلاب
دخترانش را نمودم بے حجاب
کردمش بیگانہ از علمِ کتاب
بر فتوحِ خویش نازاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

آہ اگر ایراں دگر ایراں شود
بے قرار از جذبۂ ایماں شود
بہرہ مند از حکمتِ قرآں شود
من ازیں اندیشہ لرزاں می روم
می روم از خاکِ ایراں می روم

اسد ملتانی

نقد و نظر

۱۔ حلال و حرام کی تحقیق

مرتبہ سید محمد صبیح ایڈوکیٹ، دارالاشاعت قرآن، ٹھٹھہ ضخامت ۹۲ صفحات معمولی کاغذ قیمت ۸/

سید محمد صبیح صاحب نے اس رسالے میں بتایا ہے کہ قرآن کی رُو سے صرف مردار، بہتا خون، لحم خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں۔ ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں۔

یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہمارے مروجہ اسلام میں حرام و حلال کی جو طولانی فہرستیں ہیں وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں اور کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

اس رسالہ میں ایک مقام البتہ ایسا ہے جو ذرا کھٹکتا ہے۔ اس میں پانچواں سوال حسب ذیل ہے۔

مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے غذا میں ہم پر حرام کیا ہے صرف مردار، بہتا لہو، لحم خنزیر اور جو غیر اللہ کے نام زد کیا جائے۔ تو بقیہ جانوروں کو ہم حرام نہ کہیں مگر ان کے گوشت کھانے سے پرہیز یا انکار کریں تو کیا حرج ہے۔

مرتب نے اس سوال کا جواب صاف صاف الفاظ میں تو نہیں دیا لیکن ان کے انداز سے مترشح ہوتا ہے (اور اس کی تائید رسالہ کے دیگر مقامات سے بھی ہوتی ہے) کہ ان کے نزدیک کسی حلال شے کے کھانے سے انکار کر دینا، خدا کے حکم کی معصیت ہے۔ ہمارے خیال میں یہ رویہ متشددانہ ہے۔ قرآن نے متذکرہ صدر چار چیزوں کو روک دیا ہے کہ انھیں نہیں کھایا جائے گا۔ باقی چیزوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے (حلال) کہ ان کے کھانے کی ممانعت نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا فرض ہے۔ یا کسی حلال شے کے کھانے سے انکار کر دینا، معصیتِ خداوندی ہے۔ حلال شے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ حرام ہے، بیشک خدا کے حکم کے خلاف بغاوت ہے (جس طرح حرام شے کے متعلق کہہ دینا کہ وہ حلال ہے، ضابطۂ خداوندی کے خلاف سرکشی ہے)۔ لیکن اگر کسی حلال شے کے کھانے کو انسان کا جی نہیں چاہتا۔ وہ اسے مرغوب اور خوشگوار نہیں (اسے طیب کہتے ہیں) تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے حکم خداوندی سے سرکشی برتی ہے۔ یہی اصول شادی کے معاملے میں ہے۔ اللہ نے بعض عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا ہے۔ باقی عورتوں کو حلال ٹھہرایا ہے۔ ان حلال عورتوں کے متعلق اجازت ہے کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء۔ ان میں جو تمہیں پسند ہو اس سے نکاح کرو۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ جو شے حلال ہے اسے کھانا ہی پڑے گا خواہ اسے طبیعت پسند کرے یا نہ کرے۔ تو اس سے عجیب مصیبت پیدا ہو جائیگی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان میں سے طبیعت کی رغبت اور پسند کے مطابق کھانی چاہئیں۔

البتہ جن چیزوں سے رغبت نہ ہو انھیں اپنے اوپر حرام نہیں قرار دے لینا چاہئے۔ (اسوقت تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اسلئے انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جب حرام وحلال کے متعلق کبھی تفصیل سے لکھنے کا موقع آئیگا تو ان اجمالی اشارات کی تفصیل بھی بیان کر دی جائے گی اور ان آیات کا صحیح مفہوم بھی پیش کر دیا جائے گا جن سے صبیح صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ حلال شے کے کھانے سے انکار کر دینے سے معصیت خداوندی لازم آجاتی ہے)۔ بہرحال، ہمیں یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ صبیح صاحب دین کے معاملے میں سند اور حجت صرف قرآن کو سمجھتے ہیں۔ وذالك الدين القيم ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذوقِ قرآن میں برکات عطا فرمائے۔

۲۔ مقالاتِ صارم

جناب عبدالصمد صاحب صارم۔ استاذ عربی وفارسی۔ اورنٹیل کالج لاہور کے متفرق مضامین کا مجموعہ جو مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً قدیم اسلامی نظریۂ تعلیم، خوارج، قید خانے اور سزائیں، عورت، جمع قرآن، اور ان کے ساتھ، چیونٹیاں اور سل بھی۔ کچھ مضامین اوریجنل ہیں، کچھ تلخیص وتراجم۔ مضامین عمومی سطح کے ہیں۔ (اس لئے تفصیلی تبصرہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش) ضخامت ۱۷۵ صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ معمولی۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ اور مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ۔ ادارۂ علمیہ۔ دھنی رام روڈ۔ نئی انار کلی۔ لاہور۔

۳۔ کلیاتِ اکبر جلد دوم وسوم
۴۔ اکبر اس دور میں۔

بزمِ اکبر، کراچی کی طرف سے، یہ دو مزید کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ کلیات اکبر حصہ اول پر اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں تبصرہ ہو چکا ہے جس میں ہم کلام اکبر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ لہذا کلیات کے ان حصوں کے متعلق کسی مزید رائے کی ضرورت نہیں۔

"اکبر اس دور میں" جناب اختر انصاری صاحب کی ترتیب دادہ ہے۔ یہ مجموعہ ہے ان مضامین کا جنھیں مختلف حضرات نے اکبر اور ان کی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔ آپ کو ان حضرات کی آراء سے اتفاق ہو یا اختلاف، یہ الگ بات ہے، لیکن کتاب مرتب کی گئی ہے سلیقے سے۔

دونوں کتابیں حسنِ صوری کے اعتبار سے بزم اکبر کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار۔ کلیات، ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت ہے سات روپے۔ دوسری کتاب کی ضخامت ۳۶۰ صفحات ہے اور قیمت ہے پانچ روپے۔ دونوں مجلد اور مطلا ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ بزم اکبر، کراچی

FIRDAUS TRADING CORPORATION

Clearing & Forwarding Agents

&

Cotton Merchants

★

SERAI ROAD,
KARACHI.

فردوس ٹریڈنگ کارپوریشن

کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹس اینڈ کاٹن مرچنٹس

سرائے روڈ۔ کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for,

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil



High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'



BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams: "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office: 3336
Mills: 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road. Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road Karachi.

طلوع اسلام

[illegible]

[illegible]

جولائی ۱۹۵۲



[illegible]

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو، اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہو جیئے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمر سیٹ سٹریٹ، کراچی

پرچون کے لئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگین، ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵ | جولائی ۱۹۵۲ء | نمبر ۷

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

قرآن میں ہے کہ جب منکرینِ قرآن نے دیکھا کہ ہم کسی صورت میں بھی قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نہ دلائل سے، نہ اس کی تعلیم کے نتائج کے پیشِ نظر، تو انھوں نے سوچا کہ ان حالات میں کامیابی کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کو قرآن سننے سے روکا جائے اور جہاں کہیں قرآن پیش کیا جا رہا ہو وہاں اتنا شور مچا دیا جائے کہ کسی کے کان میں اس کا لفظ پڑنے نہ پائے۔

وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیه لعلکم تغلبون (۴۱/۲۶)

منکرینِ قرآن کہتے ہیں کہ اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور مچاؤ۔ شاید تم (اس طریق سے) غالب آجاؤ۔

یہ کیفیت نبی اکرمؐ کے زمانے کے منکرینِ قرآن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھی۔ قرآن کے ساتھ آج تک یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی کچھ خود ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ ذرا سوچئے کہ آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک مسلمان اس حقیقت پر ایمان رکھنے کا مدعی ہے کہ قرآن ہمارے لئے قیامت تک مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ اس کی تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس کی اطاعت سے ہم دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تمہارا یہی ایمان ہے تو جن غیر قرآنی نظریات و معتقدات کو تم نے اپنی شریعت کو متشکل کر رکھا ہے، انھیں چھوڑ کر زندگی کا ضابطہ خالص قرآنی اصولوں پر استوار کرو، تو چاروں طرف سے شور مچا دیا جاتا ہے کہ ایسا کہنے والے کا گلا گھونٹ دو۔ یہ تمہیں گمراہ کر رہا ہے۔ اگر تم نے اس کی آواز سن لی تو تمہاری عاقبت خراب ہو جائے گی۔ تم دین اور دنیا میں کہیں کے نہیں رہو گے۔ اور حیرت بالائے حیرت کہ ان شور مچانے والوں میں پیش پیش وہ طبقہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو حاملینِ شرعِ متین اور محافظینِ دینِ مبین قرار دیتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ زیرِ آسمان اس سے بڑھ کر عبرت و موعظت کا کوئی اور مقام بھی ہو سکتا ہے کہ جس روش کو اللہ تعالیٰ نے "الذین کفروا" (منکرینِ قرآن) کا مسلک بتایا تھا اسے "الذین آمنوا" (قرآن پر ایمان رکھنے کے مدعی) اختیار کئے ہوئے ہیں اور اس شدّومد سے اس پر عمل پیرا ہیں کہ یا ید و شاید! سورج کی آنکھ نے اس سے بڑھ کر طرفہ تماشا شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو!!

آپ طلوعِ اسلام کا مطالعہ ۱۹۳۸ء سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ آپ اس کی قطع کردہ منزل پر ایک تیرتی ہوئی نگاہ ڈالئے اور نہایت محتسبانہ نظر سے دیکھئے کہ آپ کو کوئی مقام بھی ایسا ملتا ہے جہاں اس نے قرآن کا دامن چھوڑا ہو؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ اس کی زندگی میں کوئی وقت بھی ایسا آیا ہے جب عصا برداران شریعت اس کے پیچھے لٹھ لیکر نہ پھر رہے ہوں؟ اگر آپ کو اس سے پہلے اس طرف توجہ دینے کا موقع نہ ملا ہو تو آج اپنے سامنے دیکھئے کہ اس کی مخالفت میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ کوئی محراب و منبر بھی ایسا ہے (الا ماشاءاللہ) جو اس کے خلاف دشنام طرازیوں کی نشرگاہ نہ بن رہا ہو۔ اور عباؤں اور قباؤں پر مشتمل کوئی مجمع بھی ایسا ہے جہاں اس کے خلاف محاذ

بنانے کی تدابیر خودان کے لئے غارت گرِ سکون و اطمینان اور ان کے مقلدین و متبعین کے لئے وجۂ حصولِ جنت نہ قرار پا رہی ہوں؟ اور یہ سب کچھ کس جرم کی پاداش میں؟ صرف اس جرم کی، کہ طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے کہ

لاالٰہ الا اللہ - محمد رسول اللہ

اطاعت خدا کے سوا کسی اور کی جائز نہیں۔ اور محمدؐ اُس کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

اس مقصد کے لئے ان حضرات نے، عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کی خاطر چند لیبل تراش رکھے ہیں۔ جس کے ساتھ وہ لیبل چپکا دیا جائے، عوام اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ان کی یہ لیبل تراشی جیسی تدبیر (STRATEGY) کوئی نئی نہیں۔ بہت پرانی ہے۔ گذرے ہوئے زمانوں کی تاریخ کو چھوڑیئے۔ ابھی چند سال پہلے مثلاً "وہابی" کا لیبل یہی کام دیا کرتا تھا۔ آپ نے وہ قصہ تو سنا ہوگا کہ کسی گاؤں میں مسجد کا مُلّا کسی بات پر (ہندو) بنئے سے ناراض ہو گیا اور اس سے کہا کہ اب دیکھو میں تمہارا حشر کیا کرتا ہوں۔ جمعہ کی نماز کے لئے لوگ جمع ہوئے تو مولوی صاحب نے خطبہ میں فرمایا کہ مسلمانو! تمہیں کچھ علم بھی ہے کہ تمہارے گاؤں میں کیا قیامت برپا ہو گئی ہے! تمہارے گاؤں کا بنیا وہابی ہو گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا! مجمع اٹھا اور بنئے کی دکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ عوام کی تو کیفیت ہی یہی ہوتی ہے۔ اسی قسم کا ایک لیبل ہے "منکرین حدیث" جو ان "مجاہدین" کی طرف سے آج کل طلوعِ اسلام کے خلاف دھڑا دھڑ استعمال ہو رہا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس لیبل کے معنی کیا ہیں اور طلوعِ اسلام کا فی الواقعہ کوئی جرم ایسا ہے جس کی بنا پر اسے حوالۂ دار و رسن کرنے کے منصوبے باندھے جاتے ہیں اور اسے چھونے والوں کو جہنم کا ایندھن قرار دیا جاتا ہے!

"منکرِ حدیث" کے لفظی معنی ہیں "حدیث کا انکار کرنے والا" ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو حدیث کے وجود کا انکار کرے؟ خود طلوعِ اسلام کے پاس حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی ضخیم جلدیں موجود ہیں جن کے اقتباسات اس میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کیا اس کے بعد کوئی سلیم العقل انسان ایسا کہہ سکتا ہے کہ طلوعِ اسلام حدیثوں کے وجود کا منکر ہے؟

اسی قسم کا دوسرا لیبل ہے (بلکہ اسے اسی لیبل کی "دوسری طرف" سمجھئے) "اہلِ قرآن"۔ اہلِ قرآن کے معنی ہوئے "قرآن والا"۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا کوئی مسلمان بھی ایسا ہے جو یہ کہے کہ وہ "قرآن والا" نہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے ذرا پہلے ایک مذہبی فرقہ ایسا پیدا ہوا تھا جسے "اہلِ قرآن" کے نام سے پکارا جاتا ہے (معلوم نہیں انہوں نے اپنا نام خود یہ رکھا تھا یا اسے ان کے ساتھ بطور لیبل چپکا دیا گیا تھا)۔ لیکن طلوعِ اسلام اصولاً اس حقیقت کا اظہار بار بار کر چکا ہے کہ اس کے نزدیک مذہبی فرقہ بندی (از روئے قرآن) شرک ہے اس لئے اسے کسی مذہبی فرقے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جہاں تک "اہلِ قرآن" (کے فرقے) کا تعلق ہے، طلوعِ اسلام ان کے مسلک پر کئی بار تنقید کر چکا ہے کہ ان کے سامنے بھی دین کی صحیح راہ نہیں آسکی۔

یہ تو ہوا ان لیبلوں کا ماجرا۔ اب یہ دیکھئے کہ طلوعِ اسلام کہتا کیا ہے؟ طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ

(۱) دین اس ضابطے کا نام ہے جس کے مطابق تمام انسانوں کو ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

(۲) یہ دین، صرف خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے مل سکتا ہے۔

(iii) یہ دین، آخری مرتبہ اپنی مکمل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا، اور اب قرآن کے اندر محفوظ ہے جس کا حرف حرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اپنے لے رکھا ہے۔

(iv) قرآن میں، بالعموم، دین (ضابطۂ حیات) کے اصول دیئے ہوئے ہیں جو قیامت تک غیر متبدل رہیں گے۔ نہ ان میں کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہے نہ ردو بدل کا امکان۔

(v) ہر دَور کے مسلمان اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، ان ابدی، محکم، غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام خود مرتب کریں گے۔ اس قسم کی ترتیبِ احکام، انفرادی کام نہیں بلکہ یہ سب کچھ ملت شریفہ کے اجتماعی نظام کی طرف سے ہوگا۔ چونکہ ہر دور میں زمانے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اس لئے ان جزئی احکام میں بھی ردو بدل کا امکان ہے۔ جب ضرورت پڑے، مسلمانوں کا اجتماعی نظام ان میں مناسب تغیر و تبدل یا ترمیم و تنسیخ کر سکتا ہے اور ان کی جگہ نئے احکام بھی مرتب کر سکتا ہے۔

(vi) سب سے پہلا قرآنی نظام خود رسول اللہؐ نے قائم کیا۔ اور مندرجہ بالا اصول کے ماتحت آپؐ نے اپنے رفقائے کار (صحابہ کبارؓ) کے مشورے سے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کے جزئی احکام مرتب فرمائے۔

(vii) اگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہوتا کہ دین کے اصولوں کی طرح یہ جزئی احکام (Bye-Laws) بھی ابدی طور پر غیر متبدل رہنے چاہئیں تو وہ ان جزئی احکام کو بھی خود ہی متعین کر کے وحی کے ذریعے نازل کر دیتا اور انھیں قرآن کے اندر قیامت تک کیلئے محفوظ رکھ دیتا۔
اور اگر خود رسول اللہؐ کا یہ منشا ہوتا کہ حضورؐ کے متعین فرمودہ جزئی احکام قیامت تک کے لئے غیر متبدل اور واجب الاطاعت رہیں تو جس طرح آپ نے قرآن کریم کو لفظاً لفظاً لکھوا کر زبانی یاد کرا کر محفوظ شکل میں چھوڑا تھا، اسی طرح اپنے ان احکام کا ایک مجموعہ خود مرتب فرما کر امت کو دے کر جاتے۔
لیکن نہ تو خدا نے ان احکام کو خود متعین کر کے انھیں قرآن کے اندر محفوظ رکھا اور نہ ہی رسول اللہؐ نے اپنے احکام (اقوال و افعال) کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر مستند شکل میں امت کو دیا۔
خدا نے بھی صرف قرآن نازل کیا اور رسول اللہ نے بھی امت کو قرآن ہی دیا اور اسی قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا۔
اسلئے دین کا ضابطہ جو ابدی طور پر واجب الاطاعت اور غیر متبدل ہے خدا اور اس کے رسول کے محولہ بالا فیصلے کے مطابق قرآن ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

(viii) رسول اللہؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی قرآن کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا کافی انتظام کیا۔ لیکن رسول اللہؐ کے احکام (احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کیا۔ بلکہ کئی ایک معاملات میں رسول اللہؐ کے فیصلوں کو بدل بھی دیا کیونکہ اس وقت وہ حالات بدل چکے تھے جن کے پیش نظر رسول اللہؐ نے وہ فیصلے صادر فرمائے تھے اور اس نئے دَور کے تقاضے کچھ اور چاہتے تھے۔

(ix) رسول اللہؐ کی وفات کے قریب سو سوا سو سال بعد (سنہ ۱۴۰ھ) میں امام مالکؒ نے ان روایات کو جمع کیا جو رسول اللہؐ کے اقوال و افعال سے متعلق لوگوں میں مشہور تھیں۔ اس مجموعہ کا نام مؤطا ہے جس میں تین سو سے پانچ سو تک روایات ہیں۔

رسول اللہؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد امام بخاریؒ نے اسی قسم کی روایات کو جمع کرنا شروع کیا اور قریب چھ لاکھ روایات اکٹھی کیں۔ ان میں سے انھوں نے اپنی صوابدید کے مطابق قریب چھ ہزار روایات کو منتخب کرلیا۔ باقی پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو چھوڑ دیا (اور اگر مکررات کو الگ کردیا جائے تو صرف دو ہزار کو منتخب کیا اور باقی پانچ لاکھ اٹھانوے ہزار کو چھوڑ دیا)۔ اس کا نام ہے صحیح بخاری۔

ان کے بعد بہت سے اور حضرات نے بھی اسی قسم کی روایات جمع کیں۔ ان تمام روایات کے مجموعوں کا نام ہے احادیث۔ (حدیث کے معنی ہیں بات۔ احادیث کے معنی ہوئے رسول اللہؐ کی باتیں۔ روایت کے معنی ہیں کسی سے سُنی ہوئی۔ لہٰذا صحیح بخاری سے مراد ہیں رسول اللہؐ کی وہ باتیں جو امام بخاریؒ نے رسول اللہؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد لوگوں سے سن کر جمع کیں۔)

(×) ان احادیث کے متعلق اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے اسی طرح سے وحی ہوئی تھیں جس طرح قرآن کریم وحی ہوا تھا۔ اور یہ "قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ" قیامت تک کیلئے واجب الاطاعت اور غیر متبدل ہیں۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ روایات قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ وحی ہوئی تھیں اور قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنی تھیں تو اللہ تعالیٰ کو چاہیئے تھا کہ انھیں قرآن کے ساتھ نازل کرتا اور رسول اللہؐ کو چاہیئے تھا کہ قرآن کی طرح ان کا محفوظ اور مستند مجموعہ امت کو دے کر جاتے۔ نہ اللہ نے ایسا کیا نہ اس کے رسولؐ نے۔ اڑھائی سو سال بعد امام بخاریؒ نے ان روایات کو جمع کیا اور چھ لاکھ میں سے پانچ لاکھ چورانوے (بلکہ اٹھانوے) ہزار کو اٹھا کر پھینک دیا اور صرف چھ ہزار (یا دو ہزار) کو اپنے مجموعے میں لکھ لیا۔ (معلوم نہیں کہ خود امام بخاری نے کس وحی کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ پانچ لاکھ چورانوے ہزار تو وحی شدہ روایات نہیں ہیں اور صرف یہ چھ (یا دو) ہزار روایات وحی شدہ قرآن کے ساتھ قرآن کی ہم پایہ ہیں جن میں اب قیامت تک کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔)

ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا اور رسول تو ایک طرف، خود ان احادیث کے جمع کرنے والوں کے پیش نظر بھی یہ بات نہ تھی کہ ان کا مجموعۂ روایات وحی منزل ہے۔ دین کا جزو ہے۔ قیامت تک کیلئے غیر متبدل ہے۔ اس زمانے میں جب رسول اللہؐ اور حضورؐ کے عہد ہمایوں کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا تو ان حضرات (جامعینِ احادیث) نے اسی تاریخ کو اس انداز سے لکھا کہ اس زمانے سے متعلق جو بات سنی اور اسے اپنی دانست میں اپنے مقرر کئے ہوئے معیاروں کے مطابق قابل قبول سمجھا، اسے اسی طرح درج کتاب کرلیا۔ چنانچہ خود امام بخاریؒ نے اپنے مجموعے کا نام "رسول اللہؐ اور آپ کے زمانے کی تاریخ" رکھا تھا۔ اس باب میں ایک بہت بڑے حامیِ حدیث محترم مناظر احسن گیلانی صاحب یہ کہنے کے بعد کہ احادیث کے مجموعے دراصل اس دور کی اہم تاریخی تعبیرات ہیں، لکھتے ہیں۔

> ماسوا اس کے سچ یہ ہے کہ بالکلیہ یہ میری تعبیر ہے بھی نہیں۔ فنِ حدیث کے سب سے بڑے امام۔ امام الائمہ۔ حضرت امام بخاری رح نے اپنی کتاب کا جو نام رکھا ہے اگر اسی پر غور کرلیا جائے تو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ سمجھنے والوں نے ہمیشہ اس فن کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ امام بخاریؒ کی کتاب آج تو صرف "بخاری شریف" کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ اس کتاب کا اصلی نام نہیں ہے۔ بلکہ خود امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وایامہ" رکھا ہے۔ اس میں امور اور ایام کے الفاظ قابل غور ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی صحیح تعریف امام بخاریؒ کے نزدیک ان تمام امور کو حاوی ہے

جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے آنحضرتؐ سے تعلق ہو۔ آگے ایام کے لفظ نے تو اس کی تعریف کو اور بھی وسیع کر دیا۔ یعنی وہی بات جو میں نے عرض کی تھی کہ فن حدیث دراصل اس عہد اور زمانے کی تاریخ ہے جس میں محمد رسول اللہؐ جیسی ہمہ گیر، عالم پر اثر انداز ہونے والی ہستی انسانیت کو قدرت کی جانب سے عطا ہوئی۔ (ترجمان القرآن۔ بابت جون۔ اگست ۱۹۴۱ء)

بالکل یہی بات ہم کہتے ہیں یعنی یہ کہ مجموعۂ احادیث نبی اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ کے زمانے کی تاریخ ہے جو روایات کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اس تاریخ کے مجموعے میں جہاں بہت سا حصہ ایسا ہے جس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کے بڑے بڑے درخشندہ گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور جس روشنی سے ہماری زندگی کے راستے کے کئی پیچ و خم منور ہو سکتے ہیں، وہاں اس میں ایسی ایسی باتیں بھی مل گئی ہیں (یا معاندین نے دانستہ ملا دی ہیں) جنہیں کسی صورت میں بھی حضورؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس تاریخی مواد سے اس قسم کی تمام بیہودہ باتوں کو الگ کر دیا جائے تاکہ حضورؐ کی سیرت مقدسہ اپنی خالص اور نورانی شکل میں نکھر کر سامنے آ جائے۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس چھان بین (یا کانٹ چھانٹ) کا معیار کیا ہوگا؟ اس کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی اور مکمل صورت میں موجود ہے اس کتاب میں جس طرح دین کے غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں اسی طرح نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کے اہم گوشے بھی درج ہیں۔ اس کے علاوہ نبی اکرمؐ خود قرآن کی اتباع کرتے تھے اسلئے یہ ناممکن ہے کہ آپ کی حیات طیبہ کا کوئی جزو بھی قرآن کے خلاف جائے۔ لہٰذا اس تاریخی مسالہ کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس نہایت صحیح اور محکم معیار خود کتاب اللہ ہے۔ اس میں جو بات بھی قرآن کے خلاف نظر آئے یا ایسی ہو جس سے حضورؐ کی شان میں طعن پایا جاتا ہو، اسے بلا ادنیٰ تامل الگ کر دیا جائے۔ اور باقی حصہ کو نکھار کر ایک جگہ جمع کر لیا جائے تاکہ اس سے تاریخی کام لیا جا سکے۔ یہ ہماری تاریخ کا گراں بہا سرمایہ ہوگا جس پر ہم بجا طور پر ناز کر سکیں گے۔

یہ ہے حدیث کے متعلق ہمارا مسلک اور اسی مسلک کی طرف طلوعِ اسلام مسلسل دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن مولوی صاحبان کا فتویٰ ہے کہ یہ انکارِ حدیث ہے۔ لہٰذا الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ ارتداد ہے۔ بنا بریں طلوعِ اسلام گردن زدنی ہے کشتنی ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا؟ ان حضرات کا ارشاد یہ ہے کہ بخاری شریف اور اسی قسم کے روایات کے دوسرے مجموعے (جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے) خدا کی طرف سے وحی شدہ ہیں اور ان کا پایہ بالکل قرآن کے برابر ہے (خلٰ معہٗ)۔ جو کچھ ان میں لکھا ہے وہ قرآن ہی کی طرح غیر متبدل دین ہے۔ اسے اسی طرح سے ماننا ہوگا۔ جو ایسا ایمان نہیں رکھتا وہ منکرِ حدیث ہے۔ اس کا خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

حدیث کی حیثیت کے متعلق ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے مولوی صاحبان اس کا جواب تو دیتے نہیں لیکن گالیوں کی بوچھار ضرور شروع کر دیتے ہیں۔ ان گالیوں میں بھی ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ طلوعِ اسلام سے الجھتے الجھتے خود خدا اور اس کی کتاب کے خلاف زہر افشانی شروع کر دیتے ہیں۔ جس زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ آریوں اور عیسائیوں کے مناظرے ہوا کرتے تھے، ان میں انداز یہ ہوتا تھا کہ جونہی کسی مسلمان مناظر نے وید کے متعلق کچھ کہا تو آریہ پنڈت نے کھٹ سے اسی قسم کا اعتراض قرآن کے خلاف جڑ دیا۔ یہی انداز میرزائیوں کے خلاف مناظرہ میں ہوتا تھا۔ جونہی کسی نے میرزا صاحب کی کسی بات پر اعتراض کیا انہوں نے جھٹ سے جواب دیدیا کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) یہ بات تو خود رسول اللہؐ میں موجود تھی۔ اور اس سے خوش ہو گئے کہ ہم نے میدان مار لیا۔ بعینہٖ یہی حالت آج طلوعِ اسلام کے خلاف مولوی صاحبان کی ہو رہی ہے

مثلاً جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جو کچھ کتب روایات میں اسوقت موجود ہے وہ حرفاً حرفاً رسول اللہؐ کے ارشادات ہیں تو وہ اس کے جواب میں تمکنت سے کہدیتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن کریم وہی ہے جو رسول اللہؐ نے اُمّت کو دیا تھا۔ یعنی ان کے نزدیک قرآن صرف طلوعِ اسلام والوں کا ہے اس لئے قرآن کے محفوظ ہونے کا بارِ ثبوت طلوعِ اسلام کے ذمے ہے۔ مولوی صاحبان کا قرآن سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ کہہ کر یہ حضرات خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم نے میدان جیت لیا اور نہیں سمجھتے کہ

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

ہم ان حضرات سے صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کا یہ ایمان ہے یا نہیں کہ قرآن حرفاً حرفاً وہی ہے جو رسول اللہؐ نے امت کو دیا تھا۔ اگر اس پر آپ کا ایمان ہے تو اس کا ثبوت طلوعِ اسلام سے کیوں مانگا جا رہا ہے۔ جو بات آپ کے ایمان کا جزو ہے اس کے لئے ثبوت طلبی کے کیا معنی؟ اور اگر آپ کا اس پر ایمان نہیں تو پھر آپ کی حیثیت مسلمان کی رہتی ہی نہیں۔ اس لئے کہ مسلمان ہونے کیلئے تو اس ایمان کی ضرورت لاینفک ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور یکسر غیر متبدل اور غیر محرف ہے۔

یہیں تک ہی نہیں بلکہ ان میں سے بعض حضرات نے تو یہاں تک "ثابت کرنے" کی بھی کوشش فرمائی ہے کہ اس امر کا ثبوت ہی نہیں مل سکتا کہ رسول اللہؐ نے امت کو قرآن کریم کسی مدون شکل میں دیا تھا۔ اور اگر دیا تھا تو وہ بہ تمام و کمال یہی قرآن ہے جو اس وقت ہمارے پاس ہے۔ غور کیجئے کہ انسان ضد اور تعصب میں کس حد تک اندھا ہو جاتا ہے۔ ان کا مقصد طلوعِ اسلام والوں کو شکست دینا ہے، خواہ اس میں خود خدا کی کتاب بھی ظنی اور غیر یقینی کیوں نہ قرار پا جائے۔ میدانِ مناظرہ میں ان کی بات رہ جانی چاہیئے خواہ اس میں خدا کی بات کیوں نہ بگڑ جائے۔

یہ حقیقت کہ قرآن حرفاً حرفاً وہی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا، ایک مسلمان کے لئے محتاجِ دلیل نہیں۔ اس لئے کہ خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ "ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں"۔ لہٰذا قرآن کا محفوظ ہونا ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ باقی رہا یہ کہ کسی غیر مسلم کی طرف سے یہ سوال ہو تو اس کا کیا جواب ہے۔ سو غیر مسلم تو سرے سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے ہی کا انکار کرتا ہے — حفاظت کا سوال تو اس کے بعد آتا ہے۔

ان حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو قسم کی وحی نازل کی تھی۔ ایک تو قرآن میں جمع کر دی گئی اور دوسری ان روایات کے اندر ہے (جن کی جمع و تدوین کی کہانی آپ اوپر سن چکے ہیں)۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وحی کے دو حصے کر دینے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر تمام وحی ایک ہی جگہ جمع کر دی جاتی تو قرآن کی ضخامت بہت بڑھ جاتی۔ (شاید آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ بات ہم نے یونہی مزاحاً لکھدی ہے۔ حاشا و کلا۔ ایسا نہیں۔ ان حضرات کی طرف سے فی الواقعہ یہ جواب دیا جاتا ہے)۔

جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر یہ دونوں چیزیں خدا کی طرف سے وحی تھیں اور دین کا غیر متبدل حصہ، تو رسول اللہؐ نے قرآن کی طرح وحی کے اس دوسرے حصے کو بھی محفوظ طریق پر مرتب کر کے امت کو کیوں نہ دیدیا تو اس کا جواب کچھ نہیں دیا جاتا بجز گالیوں کے۔ ایک سال ہوا جب طلوعِ اسلام میں یہ سوال شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ان حضرات میں سے بعض کو تاکیدی خطوط بھی لکھے کہ اس سوال کا جواب مرحمت فرمائیں لیکن آجتک کسی نے کچھ جواب نہیں دیا البتہ اس کے جواب میں، اب منصوبے یہ باندھے جا رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کے خلاف ایک محاذ قائم کیا جائے کیونکہ یہ قرآن کو خدا کی مکمل کتاب کہنے کی

گستاخی کرتا ہے۔ اس مقام پر اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن نامکمل کتاب ہے اور اس کی تکمیل ان روایات کے ذریعے ہوتی ہے جن کا ذکر آپ اوپر سن چکے ہیں۔ (یعنی رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو برس تک تو دین نامکمل رہا۔ کیونکہ اس زمانے میں مسلمانوں کے پاس صرف قرآن ہی مدون شکل میں تھا۔ اس کے بعد بھلا ہو امام بخاریؒ اور دیگر جامعین احادیث کا جن کی کوششوں سے دین کی تکمیل ہو گئی ورنہ مسلمانوں کے پاس دین کا آدھا حصہ ہی رہتا)۔ دین کا جو حصہ رسول اللہ کی وفات کے اتنا عرصہ بعد اس طرح مرتب ہوا ان حضرات کے دعوے کے مطابق، اس کی پوزیشن اب یہ ہے کہ وہ نہ صرف قرآن کے ہم پایہ ہے بلکہ قرآنی احکام کو منسوخ بھی کرتا ہے۔ یعنی اگر آپ دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور حدیث میں اس حکم کے خلاف دوسرا حکم، تو آپ کو ماننا ہوگا کہ قرآن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور اب حدیث کا حکم ہی واجب العمل ہے۔ چنانچہ ہماری موجودہ شریعت میں اس قسم کے کئی احکام ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان احکام کو حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔

یہ ہیں وہ دعاوی جنہیں یہ حضرات طلوع اسلام سے منوانا چاہتے ہیں۔ آپ خود ہی خیال فرمائیے کہ جس شخص کے دل میں خدا کی کچھ بھی عظمت، اس کے رسول کی کچھ بھی حرمت اور اس کے دین کی کچھ بھی عزت ہو وہ کبھی اس قسم کی باتوں کو صحیح تسلیم کر سکتا ہے؟ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ بلا سوچے سمجھے ہماری بات مان لیجئے۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ آپ زیادہ نہیں تو کم از کم حدیث کی کسی ایک کتاب (مثلاً بخاری شریف) کا اردو ترجمہ لیکر ایک دفعہ اسے خود پڑھ جائیے اور اس کے بعد آپ جس نتیجے پر پہنچیں اسے اختیار کر لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ حدیث کے ان مجموعوں میں ایسی ایسی باتیں درج ہیں جنہیں آپ کی غیرت کبھی گوارا ہی نہیں کریگی کہ انہیں ذاتِ رسالتمآب کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ ان چیزوں سے آپ صاف صاف اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اسلام کے دشمنوں نے ان باتوں کو وضع کر کے ان کتابوں میں شامل کر دیا ہے اور یہی کتابیں اب ہمارا دین بن چکی ہیں۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک خاص سازش کے ماتحت کیا گیا تھا اور ہمارا سادہ لوح ملا اس سازش کا شکار چلا آ رہا ہے۔ طلوع اسلام کا مقصد فقط اس قدر ہے کہ اس گہری سازش کا پردہ چاک کر دیا جائے جس کی وجہ سے مسلمان دنیا میں ذلیل اور اس کا دین رسوا ہو رہا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو طلوع اسلام نہ صرف اس جرم کا اقبالی ہے بلکہ اس پر فخر اور ناز بھی کرتا ہے۔

لیکن اس جرم کی تفصیل ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے یعنی طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ

(ا) اللہ کا آخری دین اسلام ہے جو اس کے آخری رسول نبی اکرمؐ کی وساطت سے تمام نوعِ انسان کیلئے قیامت تک کیلئے بطور ضابطۂ حیات ملا اور یہ دین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

(ب) قرآن خدا کی مکمل کتاب ہے اور حرفاً حرفاً وہی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ اس میں قیامت تک کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔

(ج) قرآن کریم میں، بجز چند تفصیلی احکام کے دین کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجتماعی نظام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام (Bye-Laws) خود مرتب کریگا۔ ان احکام کا نام شریعت ہے۔ لہٰذا قرآن کے اصول تو غیر متبدل ہیں لیکن ان کی روشنی میں متعین کردہ جزئی احکام زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ اس طرح یہ دین قیامت تک کیلئے انسانوں کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائیگا۔

(د) قرآن کے علاوہ ہمارے ہاں جو تاریخی اور مذہبی لٹریچر (مثلاً کتب روایات وغیرہ) ہے وہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ ہے جو حضورؐ کے زمانے کے بہت عرصہ بعد مرتب ہوئی۔ اس میں صحیح باتیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ ہمیں چاہیئے کہ قرآن کی روشنی میں اس پورے لٹریچر کو پرکھیں اور جو جو باتیں قرآن کریم یا رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس کے خلاف دکھائی دیں انہیں الگ کر کے باقی حصے سے تاریخی فوائد حاصل کریں۔ اس تاریخ سے سیرتِ نبی اکرمؐ کے بڑے بڑے اہم گوشے ابھر کر ہمارے سامنے آ سکتے ہیں۔ جو ہمارے لئے اس دور کے تقاضوں کا حل دریافت کرنے میں دلیلِ راہ بن سکتے ہیں۔

یہ ہے ہمارے جرم کی تفصیل۔ اگر کوئی شخص اس سے الگ یا اس سے زیادہ کوئی بات ہماری طرف منسوب کرتا ہے تو وہ بہتانِ عظیم ہے۔

کیا طلوع اسلام کے اس "جرم" کو آپ بھی فی الواقعہ جرم سمجھتے ہیں؟ کبھی تنہائی میں اپنے دل سے پوچھئے۔

قانونِ حجب

(محترم تمنا عمادی صاحب)

[یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق مختلف مضامین اشاعتِ سابقہ میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ محترم تمنا عمادی نے بھی زیرِ نظر مقالہ میں، اپنے مخصوص انداز میں اسی نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے کبھی محروم نہیں ہو سکتا۔ یہ بحث فنی ہے اور اس کے مخاطب وہ حضرات ہیں جو قانونِ فرائض کی فقہی بحثوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہمیں مقالہ کے بعض جزئی مقامات سے اختلاف ہے لیکن ان اختلافات کا موضوع زیرِ نظر پر کچھ اثر نہیں پڑتا اسلئے ہم نے ایک آدھ مقام کے علاوہ ان اختلافات کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ اگر "فن وراثت" کے متعلق کبھی تفصیلی بحث کی ضرورت پڑی تو ان مقامات کو بھی سامنے لایا جائے گا۔　طلوعِ اسلام]

قرآن مبین میں کہیں بھی وراثت سے محجوب ہونے والے وارثوں کی کوئی تصریح نہیں اور نہ اس کی ضرورت تھی، جبکہ خود فرما دیا کہ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون (خلاصۂ ترجمہ) باپ ماں اور قریب تر قرابتمندوں نے مرنے کے بعد جو کچھ چھوڑا ہے اس مال متروکہ میں مرد قریب تر وارثوں کیلئے بھی ایک حصہ ہے اور عورت قریب تر وارثوں کیلئے بھی مِمَّا قَلَّ منہ او کثُرَ وہ حصہ کم ہو یا زیادہ۔ یا وہ مال متروکہ کم ہو یا زیادہ (پہلی صورت میں من بیانیہ ہوگا دوسری صورت میں تبعیضیہ) اور فرمایا گیا و لکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم۔ ہم نے ہر ایک (مرنے والے) کے لئے ترکے کے حقدار ورثا بنا دیئے ہیں (وہ کون کون ہیں؟) باپ ماں ہیں، قریب تر قرابتمند ہیں اور وہ ہیں جنھیں تمہارے داہنے ہاتھوں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے (یعنی عقد نکاح کے ذریعے) تو ان ورثا کو ان کا حصہ دیدو (ما ترک پر وقف لازم چاہیئے اور اس کے بعد "الاقربون" پر وقف صحیح نہیں۔ بلکہ "ایمانکم" پر وقف ہونا چاہیئے اور اس سے عہد کے رو سے منہ بولے ورثا مراد لینا صحیح نہیں۔ بلکہ یہ آیت جاہلیت کے اسی رواج کو ختم کر رہی ہے کہ ہم نے تو تمہارے ورثا والدین، اقربون اور ازواج کو بتا دیا، بس انھیں کو ان کے حصے دیدو۔ یعنی پھر اپنی طرف سے منہ بولے وارث بنانے کی کیا ضرورت ہے۔)

غرض والدین و ازواج کے علاوہ اقربون یعنی میت سے زیادہ نزدیک تر وارث جو بھی ہوں ترکہ پانے کے مستحق ہیں۔ اقرب کا لفظ یہ صاف بتا رہا ہے کہ جو زیادہ قریب ہوگا اس کے ہوتے دور کی قرابت والے وارث نہ ہوں گے اسلئے ہر قریب، بعید کا حاجب ہوگا۔ والدین اور ازواج مستقل ورثہ ہیں سا ازواج میں قرب و بعد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر والدین میں قرب و بعد کا سوال اس وقت پیدا ہو جائیگا جب والدین کے والدین بھی ہوں۔ میت کے والدین نہ ہوں مگر اس کے والدین کے والدین ہوں تو وہی اقربین ہوں گے۔ مگر میت کے والدین

بھی ہوں اور والدین کے والدین بھی ہوں تو پھر میت سے قریب تر خاص میت کے والدین ہیں اور اس کے والدین کے والدین بعید ٹھہرے۔

اس اصول[1] نے سمجھا دیا کہ "وارث قریب و بعید کے اعتبار میں شرکت فی النسب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بعید کا خود کوئی حصہ نہ ہو وہ وہی حصہ پائے جو اس سے قریب تر پاتا، اور اس بعید کی قرابت اسی قریب کی وساطت سے میت تک پہنچتی ہو۔" فقہاء نے اس کو شرطِ حجب قرار دے کر اس کا نام اِدلاء رکھا ہے: "ادلاء" کے معنی ازروئے لغت خود فقہاء "انتمار، انتساب اور توسل" لکھتے ہیں۔ "ادلاء" کی تعریف طحطاوی سے صاحب ردالمحتار نے، اور ان سے محشی شریفیہ نے حاشیہ صفحہ ۵۸ میں یوں لکھی ہے: "الادلاء لغۃ ارسال الدلو فی البئر ثم استعمل فی کل شئ یمکن فیہ دلو بطریق المجاز (لغت میں دلی یدلی دلواً لکھکر دلو کے معنی استشفاع، توسل اور طلب لکھے ہیں) فمعنی یدلی الی المیت یرسل قرابتہ الیہ بشخص۔ والباء فیہ للالصاق۔ فالقرابۃ مشترکۃ بین المدلی والواسطۃ۔

اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اصطلاحی "ادلاء" جو یہاں حجب کیلئے شرط ہے اس کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ جو قرابت مدلیٰ بہ یعنی واسطہ کو ہو وہی قرابت میت کے ساتھ مدلی کو بھی ہو۔ جیسے باپ اور دادا۔ کہ "ابوۃ" میں دونوں شریک ہیں۔ مگر دادا کی اُبوۃ میت تک باپ کے واسطہ سے پہنچتی ہے۔ اور بیٹا اور پوتا کہ بُنوۃ میں دونوں شریک ہیں مگر پوتے کی بنوۃ بیٹے کے واسطے سے میت تک پہنچتی ہے۔ جس طرح میت اور میت کے دادا کے درمیان میت کا باپ واسطہ ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح میت اور میت کے پوتے کے درمیان میت کا بیٹا واسطہ ہوتا ہے تو دادا اور پوتے کو مدلی کہیں گے اور باپ اور بیٹے کو مُدلیٰ بہ۔ فرق اس قدر دادا اور پوتے اور باپ اور بیٹے میں ضرور ہے کہ کئی باپ اور کئی دادا نہیں ہو سکتے مگر کئی بیٹے اور کئی پوتے ہو سکتے ہیں۔ قرآن مبین سے ادلاء کا اصول باپ ہی کی وراثت سے مستنبط ہوا ہے، اگر باپ کے نہ ہونے پر باپ کا حصہ دادا نہ پاتا اور اَب میں دادا بھی شمار نہ کیا جاتا تو پھر بیٹے کے نہ ہونے پر پوتے کی وراثت محض قیاسی ہی رہتی، قرآن سے مستنبط نہ ہوتی۔ اور یہ سمجھا گیا کہ جس طرح اَب میں دادا بھی داخل ہے اگر اب نہ ہو تو ابو الاب یعنی دادا ہی اَب کی جگہ لے لیگا۔ اسی طرح ولد میں ولد الولد بھی داخل ہے۔ ولد نہ ہو تو ولد الولد اس کی جگہ لے لیں گے۔ فقہاء نے یہیں پر دھوکا کھایا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ولد کے ہوتے ولد الولد بعید ہو گیا اس لئے کسی بیٹے کے ہوتے کسی پوتے کو بھی ترکہ نہیں ملنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں نہیں ملنا چاہئے۔ مگر اُسی پوتے کو دادا کا ترکہ نہیں ملنا چاہیئے جس پوتے کا باپ زندہ ہے، اسلئے کہ دادا اور پوتے کا درمیانی واسطہ موجود ہے۔ واسطہ یعنی مدلیٰ بہ کے ہوتے مدلی یقیناً بعید ہو گیا قریب نہ رہا۔ جیسے باپ کے ہوتے دادا بعید ہوتا ہے۔ مگر جس پوتے اور دادا کے درمیانی واسطہ یعنی مدلیٰ بہ موجود نہ ہو، وہ پوتا کیوں بعید ہونے لگا۔ جس طرح میت اور اس کے دادا کے درمیان جو واسطہ ہو سکتا تھا وہ میت کا باپ تھا۔ میت کے باپ کے نہ ہونے کی صورت میں میت کا دادا میت کے چچا کی وجہ سے محجوب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میت اور میت کے دادا کے درمیان میت کا چچا کوئی حیثیتِ توسط نہیں رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح میت اور میت کے پوتے کے درمیان واسطہ میت کا وہی بیٹا تھا جو اُس کے اِس پوتے کا باپ تھا۔ جب اس پوتے کا باپ نہ رہا تو میت اور اُس کے اِس پوتے کے درمیان اِس پوتے کا چچا بھی اسی طرح کوئی حیثیتِ توسط نہیں رکھتا۔ تو جب میت کا چچا میت کے دادا کو محجوب نہیں کر سکتا تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پوتے کے چچا اس پوتے کو اپنے

---

[1] قرآن مجید سے مستنبط اصولِ حجب۔

میت دادا کے ترکہ سے محروم کردیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ مورث کا چچا وارث کو محجوب نہیں کرسکتا۔ مگر وارث کا چچا وارث کو محجوب کرسکتا ہے۔ وارث کے چچا کا قیاس مورث کے چچا پر صحیح نہیں۔ ایسا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ چچا اور بھتیجے میں کوئی تعلق بلاواسطہ نہیں ہوتا اور بالواسطہ تعلق والا جو اپنے تعلق میں خود ایک واسطے کا محتاج ہے اتنی قوت نہیں رکھتا کہ جس سے بالواسطہ تعلق حاصل کرتا ہو، اس کا حاجب ہوجائے۔ اور پھر اس طرح کی باتیں ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب وارث کا بیٹا وارث کو محجوب نہیں کرسکتا تو مورث کا بیٹا وارث کو کیوں محجوب کرنے لگا؟ مگر اس طرح کے منطقی مغالطہ آمیز دلائل کی یہاں گنجائش ہی نہیں کیونکہ یہ مسئلہ محض قیاس پر مبنی رہا ہی نہیں۔ اس کی بنیاد جب ایک ایسے اصول پر خود فقہاء رکھ چکے ہیں جو قرآن مبین سے مستنبط ہے اور وہ میزان کا متفق علیہ اصول ہے۔

فتعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم! آپ شرائطِ حجب میں پہلی شرط ادلاء بیان کرچکے۔ اور مدلیٰ اور مدلیٰ بہ میں شرکت فی القرابت ضرور قرار دے چکے ہیں۔ یدلی الی المیت کے معنی خود لکھ چکے ہیں کہ یرسل قرابتہ الیہ بہ مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی نے اس کو اور بھی واضح فرمادیا اور شریفیہ کے ص۳۳ و ص۸۲ میں حاشیہ ۱۵ میں صحیح تحریر فرمایا کہ واما الادلاء فانما یکون سببا للحجب لاجل المشارکۃ بین المدلی والمدلیٰ بہ فی النصیب بأن یکون المدلیٰ شریکاً فی نصیب المدلیٰ بہ۔ یعنی مدلیٰ اور مدلیٰ بہ میں جب تک اشتراک فی النصیب بھی نہ ہو صرف اشتراک فی القرابۃ کی وجہ سے ادلاء سبب حجب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہا اور مولانا عبدالحی رحمہم اللہ یہ لوگ اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا نہ کرسکے۔ اشتراک فی القرابۃ تو صحیح ہے مگر اشتراک فی النصیب کہنا صحیح نہیں بلکہ کہنا چاہئے استحقاق النصیب بالنیابۃ یعنی مدلیٰ حصے کا مستحق ٹھہرے مدلیٰ کی نیابت میں۔ اور ظاہر ہے کہ نیابت جبھی ہوگی کہ منیب موجود نہ ہو۔ منیب کے ہوتے نائب مستحق نہیں ہوسکتا۔ منیب نہ ہوگا تو نائب بیشک مستحق ہوجائے گا۔ چنانچہ مولانا عبدالحیؒ نے اس مفہوم کو خود ادا فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مدلیٰ کا بذاتِ خود کوئی حصہ نہیں بلکہ مدلیٰ بہ ہی کے حصے کو وہ مدلیٰ بہ کے نہ ہونے کی وجہ سے پاتا ہے تو استحقاق بالنیابۃ ہوا نہ کہ اشتراک فی النصیب۔ اشتراک فی النصیب کیلئے ضروری ہے کہ دونوں شریک بیک وقت موجود ہوں ورنہ مورث و وارث دونوں کو شریک فی المال کہنا صحیح ہونا چاہئے۔ اب آپ دیکھئے پدرِ میت کے ہوتے جدِ میت کا کوئی حصہ نہیں مگر پدرِ میت نہ ہو تو جدِ میت پدرِ میت کا نائب و قائم مقام ہوکر پدرِ میت کا حصہ لے لیتا ہے۔ اسی طرح پسرِ میت کے ہوتے حفید یعنی نبیرۂ میت (میت کا پوتا) کسی حصے کا بھی مستحق نہیں۔ مگر پسرِ میت نہ ہو تو نبیرۂ میت اپنے باپ کا نائب و قائم مقام ہوکر اس کا حصہ لے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس دادا پوتے کے درمیان اس پوتے کے چچا آجائیں اور اس کو وہ محجوب کردے۔ یہ پوتا مدلیٰ ضرور ہے مگر اس کا مدلیٰ بہ اس کا باپ تھا جو مر گیا۔ اس کا چچا اس کا مدلیٰ بہ جب نہیں ہے تو پھر غیر مدلیٰ بہ چچا اس کا حاجب کس طرح ہوسکتا ہے؟ فقہاء خود اس اشتراک کے لفظ کو لکھ کر پھر کچھ گھبرائے اس لئے اشتراک قرابت و اشتراک نصیب کی جگہ پھر صرف "اتحادِ سببِ ارث" لکھنے لگے۔

مگر جب ہمارے فقہا نے دیکھا کہ یہ تو ایسا خراب اصولِ حجب بنا کہ اب نہ یتیم پوتے کو اس کے چچا کی وجہ سے دادا کے محجوب و محروم کیا جاسکے گا، نہ بھائی بہن کو باپ کی وجہ سے محروم بھائی کے ترکہ سے محروم کیا جاسکے گا۔ تو فوراً خود اپنے بنائے ہوئے قرآن مبین سے مستنبط اصول کو توڑ ڈالا اور تحریر فرماتے ہیں کہ ثم نقول ھھنا معنیان اتحادِ السبب والادلاء۔ ولکل منہما تاثیر فی الحجب۔ فکما ان

اتحاد السبب اذا انفرد عن الادلاء تعلق به حکم الحجب، کذلک اذا انفرد الادلاء عنہ ثبت بہ الحجب ایضاً یعنی پھر ہم کہتے ہیں کہ یہاں دو معنی ہیں۔ ایک تو اتحادِ سببِ ارث، دوسرے ادلاء۔ اوران میں سے ہر ایک کا کسی وارث کو محجوب کرنے میں ایک مستقل اثر ہے توجس طرح اتحادِ سببِ ارث اگر ادلاء سے خالی ہو، جب بھی اس کی وجہ سے حجب کا حکم کسی وارث کے متعلق ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ادلاء اگر اتحادِ سببِ ارث سے خالی ہو تو اس سے بھی حجب ثابت ہوسکتا ہے (شریفیہ صلا) مگر یہ دونوں معنی کہاں سے پیدا ہوئے؟ ان کا کون سا ماخذ ہے؟ کہاں سے استنباط کیا؟ کچھ نہ لکھا، اور نہ کوئی بتا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراک فی القرابۃ اور استحقاق نصیب بالنیابۃ اصل سبب حجب ہے اور ادلاء اس کی لازمی شرط ہے۔ بغیر ادلاء کے صرف اشتراک فی القرابۃ حاصل ہے اور اتحاد نصیب بھی مگر ادلاء اور استحقاق بالنیابۃ نہیں ہے اسلئے ایک بیٹا دوسرے بیٹے کا اور ایک بیٹی دوسری بیٹی کی حاجب نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح صرف ادلاء بھی سبب حجب نہیں ہوسکتا ورنہ احد الزوجین کو اولاد کا حاجب ہونا چاہئے کیونکہ احد الزوجین (شوہر یا بیوی) اولاد کے لئے مدلی بہ اور واسطۂ قرابت ہیں۔ چنانچہ امام الفرائض سید شریف جرجانی شریفیہ میں تحریر فرماتے ہیں: فان المدلی بہ حینئذٍ یاخذ نصیبہ المستند الی سببہ والمدلی یاخذ نصیباً اٰخر مستند الی سبب اٰخر۔ فلا حرمان۔ کما فی الام واولادہ۔ یعنی ایسی صورت میں مدلی بہ اپنا ذاتی حصہ پاتا ہے جو اس کے اپنے خاص سبب ارث کی وجہ سے ملتا ہے، اور مدلی اپنا حصہ ایک دوسرا پاتا ہے جو پہلے حصے کا مغائر ہے۔ اسی لئے ایک کی وجہ سے دوسرے کو وراثت سے محرومی نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ ماں اور اس کی اولاد کے درمیان باوجود ادلاء کے اولاد محروم عن الارث نہیں ہوتی۔ تو پھر کوئی بتائے کہ یہی صورت تو باپ اور باپ کی اولاد کے درمیان بھی ہے۔ پھر باپ کی وجہ سے باپ کی اولاد کیوں محروم قرار دی جاتی ہے؟ بَیِّنُوْا تُؤْجَرُوْا!

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

کمال تو یہ ہے کہ شریفیہ کے اسی صفحہ ۲۸ پر جس میں صاحب شریفیہ نے دو عجیب وغریب معنی لکھے ہیں باوجود امام الفرائض ہونے کے کہ اتحادِ سبب بغیر ادلاء کے اور ادلاء بغیر اتحادِ سبب کے بھی موجب حجب ہوسکتا ہے مولانا عبدالحئی حاشیہ ۱۲ صفحہ ۴۸ و ۴۹ میں لکھتے ہیں کہ و محصول الحاصل ان الادلاء انما یوجب الحجب اذا کان المدلی بہ عصبۃ مستحقاً بجمیع المال او اتحد فی سبب الارث کما ان ام الام تسقط لوجود الام۔ وابو الاب یسقط لوجود الاب۔ لان سبب الارث ھو الامومۃ والابوۃ۔ فثبت ان الادلاء مطلقاً لیس سبباً للحجب بالحرمان بل الادلاء الخاص سبب لہ۔ یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ ادلاء سبب حجب جبھی ہوگا کہ مدلی بہ عصبہ مستحق جمیع مال کا ہو، یا مدلی بہ اور مدلی دونوں سبب ارث میں متحد ہوں جیسا کہ نانی ماں کے ہونے سے محروم ہوجاتی ہے اور دادا باپ کے ہونے سے محروم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ سبب ارث وہی ماں ہونا اور باپ ہونا ہے۔ (یعنی ماں ہونا، ماں اور نانی میں مشترک ہے۔ اور باپ ہونا، باپ اور دادا میں مشترک ہے) تو ثابت ہوا کہ مطلق ادلاء حجب حرمان کا سبب نہیں ہے بلکہ خاص ادلاء اس کا سبب ہے۔

اس حاشیہ میں اس کا پتہ ملا کہ باپ کو بھائی بہن کا حاجب قرار دینے کیلئے ایک قید اور بڑھائی گئی یعنی مدلیٰ بہ کا عصبہ مستحق جمیع مال ہونا یعنی جب جیسی ضرورت پیش آئی ایک قید بڑھادی گئی۔ چاہے کسی نص قطعی پر مبنی ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ ہر عصبہ مستحق جمیع مال ہوجاتا ہے اگر کوئی دوسرا وارث نہ ہو۔ ورنہ دوسرے ورثاء سے جو باقی بچے گا وہی وہ پائے گا۔ عصبہ کسی وارث کا بھی حاجب نہیں ہوسکتا اور یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی فرائض جاننے والا انکار نہیں کرسکتا۔ اور اگر صرف مستحق جمیع مال ہوجانے کی وجہ سے صرف ادلاء بغیر اتحاد سبب ارث کے موجب حجب ہوسکتا ہے تو ماں بھی بعض وقت مستحق مال ہوجاتی ہے

ہمارے فقہاء نے پہلے اس کو سوچ لیا کہ کس کس کو کس کس کا حاجب بنانا ہے، اس کے بعد اس کے لئے اصول بنانے بیٹھے تو ایک اصول بنایا، کسی جگہ وہ کام دیتا نظر نہ آیا تو ایک قید بڑھادی۔ تیسری جگہ پھر دشواری پڑی تو پھر ایک اور قید کا اضافہ کیا، کہیں علیٰ سبیل الاجتماع، کہیں علیٰ سبیل البدلیۃ۔ یعنی کہیں چند شرطوں میں سے ہر ایک کا پایا جانا ضروری قرار دیا گیا، کہیں یہ کہ یا یہ ہو یا وہ۔ (باپ کو بھائی بہن کے حاجب بنانے کی کوشش صرف کلالہ کے صحیح معنی نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے فقہاء کرتے رہے، جس کی بنیاد ابوجعفر بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں رکھی اور پھر سارے فقہاء و مفسرین اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ میں اس کی بحث آگے کرونگا ابھی شرائط حجب کی بحث جو باقی رہ گئی ہے اس کو ختم کرلینا ضروری ہے۔)

مگر حقیقت یہ ہے کہ باپ ہو یا ماں، لغت کے اعتبار سے یہ مدلیٰ بہ اور بھائی بہن مدلیٰ ضرور ہوجاتے ہیں اسلئے کہ بھائی بہن میت کو قرابت والدین ہی کے واسطے سے ہوتی ہے۔ مگر یہ اصطلاحی ادلاء نہیں ہے جو سبب حجب ہوسکے۔ میں امام طحطاوی کی تحریر رد المحتار کی تصدیق، اور محشی شریفیہ کی توثیق سے یہ ثابت کرچکا ہوں کہ جو ادلاء سبب حجب ہے اس کیلئے مدلیٰ بہ اور مدلیٰ کے درمیان اشتراک فی القرابۃ ضروری ہے اور باپ ماں اور بھائی بہن کے درمیان اشتراک فی القرابۃ نہیں ہے۔ دونوں کی قرابتیں دو طرح کی ہیں۔ پھر اشتراک فی القرابۃ کو بدل کر یا اس کے ساتھ اشتراک فی النصیب کا لفظ رکھا گیا۔ پھر بھی بعض جگہ حجب کی گاڑی چلنے سے رہ گئی۔ تو پھر حجب کیلئے ایک دوسری اصل ٹھہرائی گئی۔

اصل دوم

اصول حجب میں پہلی اصل ادلاء کا حال تو آپ ملاحظہ فرما چکے۔ دوسری اصل الاقرب فالاقرب کی ہے یہ بھی قرآن مبین ہی کے لفظ الاقربون سے مستنبط ہے۔ یعنی قریب ترکے ہوتے صرف قریب، ترکہ نہیں پاسکتے اسلئے ہر قریب اپنے سے بعید کا حاجب ہوگا۔ فقہاء عام عصبات میں تو اس اصول کو مطلقاً مانتے ہیں۔ مگر ذوی الفروض میں اور ذوی... میں بھی اس اصل کو مشروط باتحاد سبب ارث قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ شریفیہ میں قد مرفی باب العصبات انھم یرجحون بقرب الدرجۃ فالاقرب منھم یحجب الابعد حجب حرمان سواء اتحدا فی السبب اولاء۔ ھذا جار فی غیرھم ایضا۔ لکن اذا کان ھنالک اتحاد السبب۔ یعنی عصبہ کے بیان میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ ان میں قرب درجہ کی وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے تو جو قریب ہوتا ہے وہ بعید کو محجوب کردیتا ہے بالکل محروم قرار دے کر چاہے وہ قریب و بعید سبب ارث میں متحد ہوں یا نہ ہوں۔ اور یہ اصول غیر عصبہ میں بھی جاری ہے۔ لیکن غیر عصبہ میں اتحاد سبب ارث بھی ہو جب۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ عصبات میں بھی اتحاد سبب ارث ہی کی وجہ سے ایک عصبہ دوسرے کو محجوب و محروم کرتا ہے۔ کیونکہ عصبات ...سبب ارث صرف عصوبۃ ہے یعنی عصبہ ہونا۔ اور اس میں قریب و بعید یعنی حاجب و محجوب دونوں شریک ہوتے ہیں۔ عصبہ کا ...ئی حصہ معین ہوتا ہی نہیں کہ اتحاد یا اشتراک فی النصیب کا سوال یہاں پیدا ہو۔ باقی رہا اشتراک فی القرابۃ تو ادلاء کے ساتھ بھی الاقرب ...لاقرب کا اصول موجب حجب ہوگا۔ جیسے باپ کے ہوتے دادا اور چچا کے ہوتے چچیرے بھائی محروم و محجوب ہوں گے۔ اگر ادلاء نہ ہو تو صرف ...ب و بعد اشتراک قرابت عمومی و اشتراک عصوبت کی وجہ سے موجب حجب ہوگا۔ جیسے باپ کے ہوتے چچا یا چچیرے بھائی ...ب ہوتے ہیں۔

...عجیب بات

قرآن مبین سے جو الاقرب فالاقرب کا اصول مستنبط ہوتا ہے تو قریب تر وارث کو ان کے مورث کے مال میں سے حصہ دلوانے کیلئے۔ مگر ہمارے فقہاء نے الاقرب فالاقرب کا اصول قائم کیا ہے وارث بعید کو ...ب و محروم کرنے کے لئے۔ بات تو بظاہر دونوں ایک ہی معلوم ہوتی ہے مگر نیت کے فرق کی وجہ سے طریق غور و تدبر اور اس کے نتائج تفاوت پیدا ہو کر رہا۔ الاقرب فالاقرب کے معنی تو یہ ہیں کہ 'الاقرب یستحق ثم الاقرب' نہ کہ 'الاقرب یحجب ثم الاقرب' ...یہ ترکیب الٹی گئی ہے فحوائے قرآن مبین کے خلاف صرف یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب و محروم کرنے ...۔ چنانچہ خود سید شریف جرجانی شارح سراجیہ تحریر فرماتے ہیں۔ وانما لم یکتف المصنف بالاصل الاول لئلا یتوہم ان ولد ...ن ذکراً کان او انثیٰ یرث مع الابن الذی لیس بابیہ فانہ لا یدلی بہ یعنی صاحب سراجیہ نے اصل اول پر اکتفاء نہ کی تاکہ اس کا ...ن نہ ہو کہ پوتا یا پوتی اپنے چچا کے ہوتے دادا کے وارث ہو سکتے ہیں، کیونکہ چچا ان کا مدلی بہ نہیں ہے۔ اس پر مولانا عبدالحی لکھنوی ...یہ میں لکھتے ہیں: ووجہ الوہم لان الاصل الاول للحجب منتف ھھنا۔ لان ولد الابن (المتوفی) لیس بمدلی بھذا ...ن (الحی) فلما ذکر الاصل الثانی ایضاً اندفع (ای ذلک الوہم) لان فی الصورۃ المذکورۃ وان لم یوجد الاصل الاول الاصل الثانی موجود البتہ۔ فحجب ابن الابن (المتوفی) بالابن الاخر (الحی) لقربہ منہ۔ یعنی جس وہم سے سید شریف ...ا اور ان سے پہلے صاحب سراجیہ ڈرے تھے وہ وہم اس طرح پیدا ہوتا تھا کہ حجب کی پہلی اصل یعنی ادلاء پوتے اور اس کے چچا کے ...ا نہیں ہے کیونکہ اس پوتے کی قرابت میت کے ساتھ اپنے متوفی باپ کے واسطے سے قائم ہے نہ کہ اپنے چچا کے واسطہ سے۔ اس لئے ...لی نہ ہوا اور جب مدلی بہ نہ ہوا تو وہ حاجب بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ حاجب وہی ہو سکتا ہے جو مدلیٰ بہ ہو، اور اس مدلیٰ بہ کے ہوتے وہی ...ہوگا جو اس مدلیٰ بہ کا مدلی ہو۔ اسلئے چچا اپنے یتیم بھتیجے کو اس کے دادا کے ترکے سے محروم نہیں کر سکتا۔ مگر جب دوسری اصل ...م کر لی گئی الاقرب فالاقرب والی تو اس کے رو سے چچا اپنے یتیم بھتیجے کو اس کے دادا کے ترکہ سے محروم کردے گا میت سے قریب تر بیٹا ہے، اور بیٹے کے مقابل پوتا بعید ہے اور اس دوسری اصل میں ادلاء کی قید نہیں لگی ہوئی ہے صرف سبب ارث کی شرط لگی ہے۔ اور اتحاد سبب ارث یعنی بنوۃ (ابن ہونا) بیٹے اور پوتے دونوں میں موجود ہے۔ پوتا بھی چونکہ ...بن ہے اس لئے ابن ہی ہے۔ مولانا عبدالحی کے حاشیے کا یہی مطلب ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ قرآن مجید سے جو الاقرب

یستحق الارث فالاقرب کا اصول مستنبط ہوتا ہے اس کو الٹ کر الاقرب یحجب الابعد فالاقرب بنایا گیا صرف یتیم پوتوں کو دادا کے ترکے سے محجوب کرنے کے لئے۔

گمراہ کن اصول

یہ کتنا گمراہ کن اصول ہے کہ پہلے چند مسائل اپنے ذہن میں طے کرلیں کہ ان کے یہ جوابات ہونے چاہئیں اور ان کے جوابوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ناپ ناپ کر اصول بنائے جائیں اور اس کے بعد کہدیا جائے کہ ان اصول کے ماتحت یہ جوابات ان مسائل کے ہیں اور دو، اصول بھی تمام قیود کے ساتھ پہلے نہ بنائے جائیں۔ بلکہ جب ایک نئی ضرورت پیش آئے ایک قید بڑھادی جائے۔

ایک ہی اصل پر اکتفا کیوں نہ کی؟

سراج الملۃ والدین محمد بن عبدالرشید السجاوندی نے سراجیہ میں مسئلہ حجب کی بنیاد دو اصولوں پر رکھی ہے۔ ادلاء اور الاقرب فالاقرب، صرف اصل اول پر اکتفاء کیوں نہ کی؟ اس کی وجہ سراجیہ کے شارح شریفیہ والے علامہ سید شریف جرجانی کی زبانی ابھی آپ سن چکے۔ کہ اصل دوم صرف اسلئے قائم کی گئی کہ یتیم پوتے اپنے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب کردیئے جاسکیں۔ بس اسی ایک ضرورت نے اصل دوم قائم کرنے پر مجبور کیا۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ تو پھر اصل دوم ہی پر اکتفاء کیوں نہ کی تو اس کی وجہ بھی خود تحریر فرماتے ہیں: لئلا یتوھم ان ام الام لا ترث مع الاب ھکذا قیل - وفیہ نظر - لان الاصل الثانی ان اجری مھنا علی ظاھرہ دھوان الاقرب فی الدرجۃ مطلقاً یحجب الابعد لزم منہ حجب ام الام بالاب وحجب ابن الاخ لاب وام بالاخ لام - وان قید بان یکون الابعد مدلیا بالاقرب کان الاصل الثانی بعینہ الاصل الاولی فلا معنیٰ لجعلھا اصلین - وکان الوھم لازماً دھوان اولاد الابن (المتوفی) یرثون مع الابن (الحی) لیس اباھم۔ یعنی اصل دوم پر اسلئے اکتفار نہ کی کہ کہیں یہ وہم نہ پیدا ہو جائے کہ باپ کے ہوتے نانی محجوب ومحروم ہے۔ اسی طرح بات بنائی گئی ہے مگر یہ محل نظر ہے کیونکہ اصل ثانی اگر اپنے ظاہری مفہوم پر جاری کی گئی کہ جو درجۂ وراثت میں مطلقاً قریب ہو وہ بعید کو محجوب ومحروم کردیگا۔ تو اس سے لازم آئیگا کہ نانی کو باپ محجوب کردے اور عینی بھائی کے بیٹے کو اخیافی بھائی محجوب کردے اور ایسا ہے نہیں۔

اور اگر اس اصل دوم میں بھی ادلاء کی قید لگا کر کہا جائے کہ بعید مدلیٰ ہو اور قریب مدلیٰ بہ جب قریب بعید کو محجوب کردے گا تو پھر اصل ثانی بعینہ اصل اول ہو جاتی ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا، اسلئے پھر دو اصلیں قائم کرنا بے سود ہو جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی دشواری یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پہلا وہم جس کو دور کرنے کے لئے یہ اصل دوم بنائی گئی تھی پھر خطرہ بن کر سامنے آجاتا ہے یعنی جب تو یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے اس کے محجوب ومحروم نہ کرسکیں گے کیونکہ چچا اپنے یتیم بھتیجوں کے مدلیٰ بہ نہیں ہیں۔ اور یہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

صاحب شریفیہ نے جو فیہ نظر لکھا ہے اس پر مولانا عبدالحی مرحوم حاشیہ ۲ صفحہ ۵۹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ وحاصل الایراد المصدر بقولہ فیہ نظر، ان الاصل ان اجری علی مایستفاد ظاھراً دھوان الابعد یکون محجوبا بالاقرب سوا

كان مدليا بالاقرب اولا فيلزم حجب ام الام بالاب لانها ابعد منه البتة وان لم تكن مدلئة بها۔ وحجب ابن الاخ العينى بالاخ الاخيافى۔ لان الاول ابعد من الثانى وان لم يكن مدليا به۔ وان اريد ان الابعد المدلى يحجب بالاقرب المدلى به يكون هذا الاصل عين الاصل الاول معنى۔ وتتمة الايراد انه ان اريد ان الابعد الغير المدلى يحجب بالاقرب الغير المدلى به يلزم منه ما يلزم على الاول۔ وان اريد ما سواه فيجب ان يبين۔ یعنی سید شریف نے شریفیہ میں "فیہ نظر" لکھ کر جو اعتراض کیا ہے اس اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ یہ اصل دوم اگر اپنے ظاہری معنی میں لیا گیا کہ بعید قریب کی وجہ سے محجوب ہو جائے گا چاہے بعید مدلیٰ اور قریب مدلی بہ ہو یا نہ ہو، تو اس سے یہ لازم آجائے گا کہ نانی باپ کی وجہ سے محروم ہو جائے کیونکہ باپ کے مقابل ماں کی ماں ضرور بعید ہے۔ اگرچہ نانی مدلیٰ اور باپ مدلی بہ نہیں ہے۔ اسی طرح عینی بھائی کا لڑکا اخیافی بھائی کے مقابل محجوب ہو جائیگا کیونکہ بھائی کے مقابل بھتیجا ضرور بعید ہے اگرچہ یہ بھتیجا جو عینی بھائی کا بیٹا ہے، اخیافی بھائی کا مدلیٰ، اور اخیافی بھائی اس کا مدلی بہ نہیں ہے۔

اور اگر الاقرب فالاقرب سے یہ مراد ہے کہ بعید مدلیٰ محجوب ہو جاتا ہے قریب مدلیٰ بہ کی وجہ سے؟ تو یہ اصل دوم بالکل وہی اصل اول معنوی اعتبار سے ہو جاتی ہے۔ اور اس اعتراض کا تتمہ یہ ہے کہ اگر الاقرب فالاقرب سے یہ مراد ہے کہ بعید غیر مدلیٰ، قریب غیر مدلیٰ بہ کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے، تو اس سے وہی بات لازم آجاتی ہے جو پہلی اصل سے لازم آتی ہے اور اگر اس کے سوا کچھ اور معنی الاقرب فالاقرب کے ہیں تو اس کا بیان کرنا واجب ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے اور یہی مطلب صاحب شریفیہ کا بھی ہے کہ اگر اصل دوم الاقرب فالاقرب میں ادلاء کی قید بھی ضروری ہے تو پھر یہ اصل بیکار ہے صرف پہلی ہی اصل کافی ہے۔ اور اگر بغیر ادلاء کے صرف درجۂ رشتہ مندی میں قرب و بُعد مقصود ہے تو پھر دوسری دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں یعنی باپ کی وجہ سے نانی اور اخیافی بھائی کی وجہ سے عینی بھائی کا لڑکا بھی محجوب ہو جاتا ہے اور ہم فقہاء صرف یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محروم کرنا چاہتے ہیں، اور ایسی کوئی صورت نکلتی نہیں جس سے صرف یہی یتیم پوتے محروم ہوں اور دوسرے جائز وارث محروم نہ ہوں، کیونکہ صورت دو ہی ہیں۔ اقرب و ابعد کے درمیان ادلاء ہو یا نہ ہو، اگر ہو تو یہ پہلی اصل ہو جاتی ہے اور چونکہ یتیم بھتیجے اور چچا کے درمیان ادلاء نہیں ہے اس لئے یتیم بھتیجا اپنے چچا کی وجہ سے محجوب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر بغیر ادلاء کے ہر قریب اپنے سے بعید کو محجوب و محروم کر دے، یہ معنی لئے جائیں تو یتیم بھتیجا اپنے چچا کی وجہ سے محجوب تو ہو جاتا ہے مگر دشواری یہ آپڑتی ہے کہ پھر باپ کی وجہ سے نانی بھی محجوب ہو جاتی ہے اور اخیافی بھائی کی وجہ سے عینی بھائی کا لڑکا بھی محجوب ہو جاتا ہے اور یہ ایسی ڈھرّی ہے جو اٹھائی نہیں جاتی۔ اور اگر کوئی تیسری شکل ایسی ہے جس سے صرف یتیم پوتا ہی اپنے دادا کے ترکہ سے چچا کی وجہ سے محجوب کر دیا جا سکے تو مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ فیجب ان یبین یعنی واجب ہے کہ وہ صورت بیان کی جائے۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ کس پر واجب ہے؟ اور اس واجب کو کون ادا کرے گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ قیامت تک یہ واجب الادا قرض ہمارے فقہاء غفر اللہ لہم پر یوں ہی رہ جائیگا اور کبھی ادا نہ ہوگا۔

یتیم پوتے ناتی[1] غرض فقہا نے جو حجب کی دو اصلیں لکھی ہیں ان دونوں اصلوں میں سے کسی اصل کے رو سے بھی یتیم پوتے اپنے دادا کے اور یتیم ناتی اپنے نانا کے ترکے سے کبھی محروم نہیں ہو سکتے۔

آخر فقہا کو یتیموں سے کیوں عداوت ہو گئی؟ عداوت تو نہیں مگر غلط فہمی ضرور ہوئی اور یہ غلط فہمی دراصل ابن جریر ابو جعفر الطبری صاحب التفسیر کی پیدا کردہ ہے۔ یعنی ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں کلالہ کے معنی یہ لکھے کہ من لا ولد لہ ولا والد یعنی جس کے نہ والد ہو نہ ولد وہی کلالہ ہے۔ اور پھر ایک دشواری ان کی نظر کے سامنے اور بھی تھی وہ یہ کہ کلالہ ہی کے وارثوں میں بھائی بہن کے حصے دو جگہ مذکور ہیں۔ ایک تو سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں جس میں پورا قانون وراثت تفصیل درج ہے۔ یہاں صرف ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ ورنہ ایک سے زیادہ ہوں تو دو سدس یعنی تیسرا حصہ دلوایا ہے۔ اور پھر آخر سورۂ نساء میں یعنی اس سورہ کی ایک سو چھہتر ویں (۱۷۶) آیت میں جب لوگوں نے کلالہ کے بھائی بہن کا حصہ دریافت کیا ہے تو بھائی بہن کو بالکل اپنی اولاد کی طرح حصے دلوائے ہیں یعنی صرف ایک بہن ہو تو اس کو صرف ایک بیٹی کی طرح نصف دلوایا، دو یا دو سے زیادہ بیٹیوں کی طرح بہنیں بھی اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو انھیں دو ثلث دیئے گئے اور بھائی بہن مخلوط ہوں تو بیٹا بیٹی مخلوط کی طرح مرد کو دو عورتوں کے برابر کے حساب سے ملے گا۔ یوں ہی بتایا گیا ہے۔ مفسرین اور فقہا بہت گھبرائے کہ مورث کلالہ کا ذکر دونوں جگہ ہے اور دونوں جگہ کلالہ کے وارث بھائی بہن ہی ہیں مگر ایک جگہ ایک ہو تو صرف ایک سدس ملتا ہے بھائی ہو یا بہن، اور دوسری جگہ کلالہ ہی کے بھائی ہی صرف ہو تو پورا مال، صرف ایک بہن ہو تو نصف مال ایک سے زیادہ صرف بہنیں ہوں تو دو ثلث بھائی بہن مخلوط ہوں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق سارا مال وہی سب لے لیتے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

امام رازی تفسیر کبیر میں سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی تفسیر لکھتے ہوئے جب وَاِن کَانَ رَجُلٌ یُّورَثُ کَلٰلَةً اَوِامْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ الآیہ پر پہنچے ہیں تو لکھتے ہیں کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں اَخٌ اور اَوْ اُخْتٌ سے اخیافی یعنی ماں کی طرف سے اپنے اور باپ کی طرف سے سوتیلے بھائی بہن مراد ہیں جن کی ماں ایک ہو اور باپ دو۔ اور اس اجماع مفسرین کو صحیح ثابت کرنے کیلئے حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی قرارت بھی سند میں پیش کر دی کہ وہ سارے صحابہؓ کے اجماع کے خلاف اس آیت میں ولہ اخ کے بعد من امٍ اور پھر اَوْ اُخْتٌ کے بعد بھی غالباً مِنْ اُمٍّ کے اضافے کے ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ روایت صرف ابن جریر طبری کی من گھڑت ہے جس کو انھوں نے یعلی بن عطاء عن القاسم بن ربیعہ بن عائش عن سعد کرکے روایت کی ہے۔ یہ ہے تو ایک ہی روایت۔ مگر چار طریقوں سے روایت کرکے بزعم خود تعدد طرق بھی دکھلا دیا ہے۔ اگر ابن جریر کی من گھڑت یہ روایت نہیں ہے تو یعلی بن عطاء کا خود ساختہ عطیہ ضرور ہے۔ اگر ابن جریر طبری کو ائمہ رجال نے شیعہ لکھا ہے اور حافظ سلیمانی نے کان

---

[1] یتیم طفل بے پدر کو کہتے ہیں۔ طفل بے مادر پر یتیم کا اطلاق مجازاً ہیں نے پوتے کے ساتھ ناتی کے لئے بھی کر دیا ہے۔ اس کو اطلاق جواری سمجھئے۔ بعض لوگ طفل بے مادر کو یسیر کہتے ہیں۔

یضع للروافض یعنی "یہ رافضیوں کیلئے حدیثیں گھڑا کرتے ہیں" لکھا ہے تو یعلی بن عطا کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کا بھی ترجمہ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ امام فن رجال علی بن المدینی یعلی بن عطار کے متعلق کہتے ہیں کہ له احادیث لم یروها غیره ورجال لم یروعنهم غیره واهل الحجاز لایعرفونه۔ ترجمہ۔ سند تو ہم بواسطہ۔ یعنی ان کی بعض خاص حدیثیں ایسی ہیں جن کی روایت ان کے سوا کوئی بھی نہیں کرتا، اور کچھ ایسے شیوخ بھی ہیں جن سے ان کے سوا کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ اور اہل حجاز ان کو بالکل نہیں پہچانتے۔ واسطہ کے کچھ لوگ ان سے روایت کیا کرتے ہیں۔ ابن جریر نے یعلی بن عطار سے جو چار طرق سے روایت کی ہے ان میں تین طرق میں قرارت کی تصریح نہیں ہے۔ بلکہ وله اخ کی تفسیر میں سعدؓ کا لامہ بتانا مذکور ہے۔ مگر چوتھی روایت جس میں خود سعدؓ کا وله اخ کے بعد من امہ کا لفظ پڑھنا مذکور ہے وہ روایت واسطہ کے ایک شخص ہشیم بن بشیر الواسطی سے مروی ہے جو مشہور مدلس تھے یعنی راویوں کے ناموں میں اور متن حدیث میں الٹ پلٹ قصداً کیا کرتے تھے۔ اسی لئے بعض ائمہ حدیث نے صاف لکھ دیا ہے کہ التدلیس کذب یعنی تدلیس، کذب ہی کا ایک دوسرا نام ہے۔ ان چاروں طرق سے جو سب ایک روایت ابن جریر نے یعلی بن عطار کی لکھی ہے۔ قاسم بن ربیعہ بن عائث سے مروی ہے انھوں نے حضرت سعدؓ کو غالباً دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ان سے کچھ سنا کہاں تک ہوگا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کی وفات سنہ ۵۰ھ میں کوئی لکھتا ہے، کوئی سنہ ۵۴ھ میں اور کسی نے سنہ ۵۸ھ میں لکھا ہے۔ تمام اقوال کو خود مورخین نے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ قاسم بن ربیعہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وقت میں جوان تھے۔ نجاشی مشہور شیعہ محدث نے ان کا سال وفات سنہ ۱۳۹ھ لکھا ہے۔ حضرت سعد کی وفات اور ان کی وفات کے درمیان کم سے کم چوراسی برس کا فاصلہ ہے۔ اگر انھوں نے نوے برس کی عمر بھی پائی تھی تو پانچ چھ برس کی عمر میں حضرت سعد سے ایک مخصوص قرارت جو ان کے سوا کسی صحابی کی نہ تھی سن کر یاد رکھنے کی صلاحیت کب ہو سکتی ہے، خصوصاً اس لئے بھی کہ حضرت سعدؓ وادی عقیق میں رہا کرتے تھے، اپنے آخر زمانے میں وہیں ایک مکان بنالیا تھا، اسی مکان میں وفات پائی لاش مدینہ میں لائی گئی اور بقیعہ میں مدفون ہوئے۔

اور قاسم بن ربیعہ غطفانی تھے، بنی غطفان کا بڑا مرکز تو کوفہ تھا مگر کچھ لوگ بصرہ میں بھی رہتے تھے۔ قاسم بن ربیعہ کوفے میں پیدا ہوئے ان کو پانچ چھ برس کی عمر میں وادی عقیق پہنچکر حضرت سعد سے قرآن سننے کا کس طرح موقع مل سکتا ہے؟ غرض یہ روایت ہی یعلی بن عطار کی ورنہ خود ابن جریر کی من گھڑت ہے۔ اب میں ہر مسلمان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن مجید کی متفق علیہ متواتر قرارت جس کی قطعیت صحت پر عہد نبوی سے لیکر اس وقت تک پونے چودہ سو برس کا ہر صحابی، ہر تابعی، ہر تبع تابعی ہر امام، ہر محدث، ہر قاری، ہر فقیہ، ہر مجتہد اور ہر مسلمان کا مسلسل و متواتر ایمانی و اقراری اجماع چلا آرہا ہے، ایسی قرارت متواترہ کے خلاف ایک خلاف عقل و درایت قرارت جو صاف اللہ کی کتاب میں تحریف کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنہا قاسم بن ربیعہ الکوفی جیسے مدلس سے سن کر یعلی بن عطار الطائفی تنہا روایت کرتے ہیں جو خود نئے نئے لوگوں سے نئی نئی حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں جنھیں ان کے سوا کوئی روایت نہیں کرتا۔ اہل حجاز جن کو پہچانتے تک نہیں اور پھر جس کو ابن جریر جیسا شیعہ اپنی تفسیر میں درج کرتا ہے جس پر رافضیوں کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا الزام حافظ سلیمانی جیسے شیخ المحدثین نے دیا ہے۔ اگر صرف ایسی روایت کی بنا پر قرآن مبین کے عموم نص صریح کے خلاف

تمام مفسرین وفقہاء نے اجماع کرلیا تو وہ چودہ سو برس کا عہد نبوی سے لیکر ساری امت کا اس وقت تک کا اجماع کیا باطل ہو جائیگا؟ کیا قرآن مبین میں ایک لفظ کی کمی تھی جس کو ابن جریر نے یعلی بن عطاء وقاسم بن ربیعہ کی مدد سے پورا کر دیا؟ کیا قرآن مبین کی یہ متواتر قرأت جس کو پونے چودہ سو برس سے آج تک ہر مسلمان پڑھتا چلا آرہا ہے، اپنے مفہوم صحیح کے ادا کرنے سے قاصر وعاجز ہے؟ معاذ اللہ من ذلک!۔ میں اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر سمجھ کر قرآن مجید کی قرارت متواترہ کے خلاف سارے مفسرین وفقہاء کے مجمع علیہ قول کو جو بربنائے قرارت باطلہ ہے انتصاراً للقرآن المجید سرپائے حقارت سے ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہوں، مگر قرآن مجید میں کسی طرح کی تحریف واضافہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کے لئے میرے سر پہ آرہ ہی کیوں نہ چلا دیا جائے۔ اگر کوئی میرے ساتھ مباہلہ کرے تو میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ ولہ اخ کے بعد من ام یا لام یا لامہ وغیرہ کے اضافے جو بعض صحابہ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں غلط ہیں ان صحابہؓ پر اتہام ہے اور یہ تحریف فی کتاب اللہ ہے۔ کسی صحابی کی طرف بھی اس کی نسبت صحیح نہیں۔

بھائی بہن نہیں عہدی وارث بعض حضرات کے دل میں یہ بات کھٹکی اور وہ بھی یہ سمجھے کہ یہ من ام یا لام وغیرہ کا اضافہ یہاں پر صحیح نہیں۔ مگر پھر وہ خلش انہیں بھی پیدا ہوئی جو مفسرین کو پیدا ہوئی تھی کہ اگر عام طور سے ہر قسم کے بھائی بہن یہاں اس بارہویں آیت میں بھی مراد لیں اور پھر آخر سورہ کی ایک سو چھہترویں (۱۷۶) آیت میں بھی تو پھر کہیں تو بھائی بہن کو اتنا کم دلوا یا جائے اور کہیں بالکل اپنی اولاد کی طرح سب کچھ انہیں کو دلوا دیا جائے، اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے اس پر یہ خیال کیا کہ یہاں بھائی بہن کا حصہ ہی مذکور نہیں ہے بلکہ یہاں صرف عہدی وارث مراد ہیں جن سے میت نے عہد کیا تھا کہ تم مرو تو میں تمہارا وارث اور میں مروں تو تم میرے وارث۔ یہاں انہیں لوگوں کا حصہ معین کرکے بتایا گیا ہے۔ بھائی بہن کا ذکر صرف اسلئے آگیا ہے کہ کلالہ ان کے نزدیک بھی بے والد وبے ولد میت کو کہتے ہیں اسلئے والد وولد کا تو یہاں خطرہ ہی نہیں، اگر بھائی بہن ہوں تو کیا بھائی بہن اس عہد ومعاہدہ والے وارث کو محجوب کر دینگے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ بھائی بہن کے ہوتے بھی ان عہدی وارثوں کو اگر ایک ہو تو ایک سدس، ایک سے زیادہ ہوں تو دو سدس ملیں گے۔ غرض باوجود اس کے کہ سورۂ نساء کے اس دوسرے رکوع میں دو دو جگہ بھائی بہن کا ذکر آیا۔ پہلے گیارہویں آیت میں باپ ماں کی وراثت اور حصوں کے ضمن میں کہ وہاں بھائی بہن کی وجہ سے ماں کا حصہ گھٹ کر ایک ثلث سے ایک سدس ہو جائے گا اور باپ کو جو عصوبتہ دو ثلث یعنی چار سدس ملتے وہ بھائی بہن کی وجہ سے پانچ سدس مل جائیں گے۔ گویا بھائی بہن کا وجود صرف ماں کو نقصان اور باپ کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہے۔ مگر خود ان کو اس کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ان کو ایک حبہ بھی مل سکتا ہے۔ اسلئے کہ باپ، بھائی بہن کے لئے حاجب ہے۔ باپ کے ہوتے وہ بالکل محروم الارث ہے۔ بھائی بہن تو صرف کلالہ ہی کے وارث ہوتے ہیں۔ اور کلالہ اسی کو کہتے ہیں جس کا نہ والد ہو نہ ولد یعنی اس باب میں یہ حضرات بھی عامۂ مفسرین وفقہاء کے بالکل ساتھ اور ہم خیال ہیں۔

دوسری جگہ جو بھائی بہن کے ذکر کی یہاں اس بارہویں آیت میں ہے عامہ مفسرین وفقہاء کے نزدیک تو من ام کا لفظ چھوٹا ہوا تھا جس کو ابن جریر نے حاصل کرکے مفسرین وفقہاء کے حوالے کر دیا۔ اس لئے یہاں بھائی بہن تو مراد ہیں مگر اخیافی۔ اور جن حضرات کی طرف

اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی یہاں بھائی بہن کے حصے کا تذکرہ نہیں تسلیم کرتے۔ الغرض قانونِ وراثت کی یہ دونوں آیتیں سورۂ نساء کے دوسرے رکوع کی یعنی گیارھویں اور بارھویں آیتیں اتریں تو ہر قسم کے وارثوں کے حصے بیان کردیئے گئے ادائے قرض وادائے وصیت کا بھی تقسیم میراث سے پہلے کردینے کی تاکید بار بار کی گئی۔ عام مفسرین وفقہا کے نزدیک اخیافی بھائی بہن کے حصے بھی بیان کردیئے گئے اور محولۂ صدر حضرات کے نزدیک تو یہاں بھی صرف ان بدنصیب بھائی بہن کا ذکر ہی فقط آ گیا ان کو کچھ دلوایا نہیں گیا ہے۔ یہاں تک کہ پورا بیان کرکے سلسلۂ بیان ختم کردیا جاتا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ الآیہ یعنی قانونِ وراثت کی آخری حد بقول عامۂ فقہاء ومفسرین صرف اخیافی بھائی بہن کے حصوں پر اور بقول دیگر حضرات صرف عہدی وارثوں کے حصوں پر ختم ہوجاتی ہے اس کے بعد ہر شخص یہی سمجھنے پر مجبور ہے کہ مذکورہ ورثاء کے سوا اور کوئی دوسرا وارث کسی میت کا عنداللہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ کئی مہینے گذر جاتے ہیں، وہ جاڑوں کا موسم جس میں سورۂ نساء کی گیارھویں بارھویں آیتیں ہی اتری تھیں وہ موسم بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اب جب گرمی کا موسم آ گیا تو حسنِ اتفاق سے بعض صحابہؓ کو خیال آگیا کہ سب کا حصہ تو بیان کیا گیا یہاں تک کہ بقول مذکورہ بالا حضرات عہدی وارثوں تک کا حصہ بیان کیا گیا دو دوبار بھائی بہن کا ذکر بھی کیا گیا مگر ان کم نصیبوں کے لئے کچھ بھی ارشاد نہ فرمایا گیا، ہر بھائی بہن کی زبان کہہ رہی ہے کہ

کیا خاک ہو شگفتہ مرا دل کہ یہ کلی ۔۔۔ شاید زیادہ فتنۂ فصلِ بہار ہے

تو ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کلالہ کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ جن کے وارث صرف بھائی بہن ہی ہوں تو فرمایا گیا کہ یستفتونک، قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت الآیہ، لوگ تم سے پوچھتے ہیں، تو کہدو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتوٰی دیتا ہے کہ ایک شخص مرگیا لاولد، اور اس کے ایک بہن ہے الخ۔ لوگ پوچھتے ہیں تو بتادو۔ یہ کہہ کر بتانا صاف بتا رہا ہے کہ اگر لوگ نہ پوچھتے تو نہ بتایا جاتا، یہ آیت آخر سورہ کی ہے اور گنتی میں ایک سو چھتر ویں آیت ہے خیال تو فرمایئے، معوذ باللہ کیا اللہ تعالیٰ بھائی بہن کا حصہ بتانا بھول گیا تھا؟ کہ لوگوں کے پوچھنے سے بتایا اتنے دنوں کے بعد، آخر سورہ میں اس کی وجہ نہ اگلے مفسرین نے بتائی نہ ان کے ہم خیال متاخرین نے۔ حالانکہ وما کان ربک نسیا سب پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ لوگ پوچھتے ہیں تو کہدو جس سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ اگر نہ پوچھتے تو نہ بتایا جاتا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ آیۃ الشّتاء یعنی جاڑے کے موسم میں جو آیت وان کان رجل یورث کللۃ ولہ اخ الآیہ اتری تھی اس میں نہ اخیافی بھائی بہن صرف مراد ہیں نہ عہدی وارث۔ یہاں بھی عام بھائی بہن ہی مراد ہیں جس طرح آخری آیت میں عام بھائی بہن مراد ہیں۔ مفسرین وفقہا جو آیۃ الشتاء یعنی پہلی آیت میں اخیافی، اور آیۃ الصیف یعنی آخری آیت میں عینی وعلاتی مراد لیتے ہیں، یہ قرآن میں تحریف صریح ہے۔ جس کی کوئی دلیل قطعی ان کے پاس نہیں ہے۔ اور دوسرے حضرات جو اس آیۃ الشتاء یعنی پہلی بارھویں آیت میں عہدی بھائی کی وراثت ثابت کرتے ہیں اور ان کان رجل یورث کلالۃ کا ترجمہ فرماتے ہیں "اگر کوئی کسی کلالہ کا وارث بنا دیا جائے یا کوئی عورت، بحالیکہ اس کلالہ کے کوئی بھائی یا بہن ہو تو اس مرد یا عورت میں سے ہر ایک کو ایک

ﮯ "بحالیکہ" کا لفظ تو بتا رہا ہے کہ ان حضرات کے قول کے مطابق عہدی وارثوں کو بھی حصہ مل سکتا ہے کہ اس کلالہ کے بھائی یا بہن ہوں۔ اگر بھائی بہن نہ ہو [illegible] وارثوں کو حصہ تھوڑے ملے گا۔ یہاں ترجمہ میں تو "بحالیکہ" لکھ لیا مگر مفہوم غالباً "اگرچہ" کا، جو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

ایک سدس ملے گا۔" میں نے بہت غور کیا، مگر کسی طرح سے بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اس آیت کا یہ ترجمہ کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کی پوری بحث میری کتاب المنقذ من الضلالۃ میں تفصیل کے ساتھ ہے۔ سردست جو میرا موضوع ہے اس کی بحث اتنی تفصیل کی متحمل نہیں۔ اگر ضرورت سمجھی گئی تو بعد کو مختصر طور سے عرض کر دوں گا۔ مفصل طور سے تو اصل کتاب میں موجود ہی ہے۔ گو کتاب قلمی ہے، چھپی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چھپوا دے۔

اس کے بعد میں بخیال اختصار چند باتیں نمبر وار درج کرتا ہوں، ان نمبروں سے حقیقت امر پر صاف روشنی پڑ جائیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(۱) وان کان رجل یورث کللۃ الآیہ اس جملے کا عطف فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابوہ کے سوا اور کسی جملۂ سابقہ پر نہیں ہو سکتا جس کے وجوہ و دلائل کتاب المنقذ من الضلالۃ میں بالتصریح مذکور ہیں۔

(۲) یورث مجرد ہے۔ باب افعال سے نہیں ہے۔ اور رجل کی صفت ہے۔ رجل یورث موصوف وصفت مل کر کان کا اسم ہے، اور کللۃ، خبر۔ جملے کا ترجمہ صحیحہ یوں ہے "جو شخص موروث ہو رہا ہے اگر کلالہ ہو" غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب تفعیل ہے افعال نہیں۔

(۳) یورث فعل مجہول ہے، اس لئے اس کی نسبت مفعول کی طرف ضرور ہے، مگر آخر اس کا کوئی نہ کوئی فاعل تو ضرور ہوگا۔ پھر یہاں وہ فاعل کون ہو سکتا ہے؟ اس کو ڈھونڈئیے جملہ معطوف علیہا میں۔ جملہ معطوف علیہا میں ہے وَرِثَہٗ اَبَوٰہُ۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رجل یورث میں یورث کے فاعل ابوان ہیں۔ یعنی وہ میت لاولد مرد، جس کے وارث اس کے ابوان ہو رہے ہیں، یا اپنے ابوان کا جو موروث ہو رہا ہے، اگر کلالہ ہو۔

(۴) کلالہ کس کو کہتے ہیں سورۂ نساء کی آخری آیت میں خود بتا دیا ہے "قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ، ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد ولہ اخت (او اخ او کلاھما)" یعنی جس میت لاولد کے وارث بھائی بہن ہوں وہی کلالہ ہے۔ کلالہ کے مفہوم میں صرف دو شرطیں ہیں ایک تو لاولد ہونا، دوسری شرط بھائی بہن کا ہونا۔ لاوالد ہونا شرط نہیں۔ ہو یا نہ ہو۔

(۵) کلالۂ تام، یا کامل وہ ہے جس کے وارث نسبی صرف بھائی بہن ہوں اور کوئی نہ ہو۔ اور کلالہ ناقص وہ ہے جو کسی وارث کے مقابلے میں کلالہ ہو کسی وارث کے مقابلے میں کلالہ نہ ہو۔

(۶) کلالہ کا لفظ وارث کیلئے بھی آتا ہے، موروث کیلئے بھی آتا ہے، اور وراثت کیلئے بھی آتا ہے۔ بھائی بہن وارث کلالہ ہیں جس میت کے وارث بھائی بہن ہوں وہ میت موروث کلالہ ہے۔ اور بھائی بہن کی وراثت، وراثت کلالہ ہے۔

(۷) والدین کے ہوتے اگر بھائی بہن بھی ہوں تو میت صرف بھائی بہن کے مقابل کلالہ ہے۔ یعنی کلالہ موروث بھائی بہن کیلئے ہے اور وہ بھائی بہن کلالہ ہوں گے اور ان کی وراثت کلالہ ہوگی۔ والدین کے مقابل وہ میت کلالہ نہ ہوگا۔ نہ والدین کلالہ وارث ہوں گے نہ والدین کی وراثت کلالہ ہوگی۔ اسی لئے میں نے ایسے میت لاولد کو جس کے والدین بھی ہوں اور بھائی بہن بھی کلالہ ناقص قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ موروث اپنے بعض وارثوں کے مقابل تو کلالہ ہے اور بعض وارثوں کے مقابل کلالہ نہیں ہے۔

ہاں اگر والدین بھی نہ ہوں، صرف بھائی بہن ہی ہوں تو ایسا موروث مستقل طور سے کلالہ کامل ہے۔ اسی لئے قرآن مبین میں جہاں والدین
کے ہوتے بھائی بہن وارث ہوتے ہوں، وہاں یہ طریقۂ بیان اختیار فرمایا کہ وان کان رجل یورث کللۃ یعنی اور اگر وہ شخص جو
والدین کا موروث ہو رہا ہے کلالہ ہو یعنی ولد اخ او اخت اور اس کے بھائی یا بہن بھی ہوں۔ اور جہاں مستقل کلالہ یعنی کلالہ کامل کا
ذکر ہے۔ یعنی جو خود ہمہ تن موروث کلالہ، جس کے کل وارث، وارث کلالہ اور جس کی وراثت بالکل وراثتِ کلالہ ہے، ہر حیثیت سے وہ
کلالہ ہی کلالہ ہے۔ اس کو مستقل کلالہ کی حیثیت سے ذکر کیا۔

حال وتمیز کی ترکیب

اسی بنا پر بعض علمائے نحو نے رجلٌ کو کان کا اسم، یورث کو اس کی خبر اور کللۃً کو یورث کی ضمیر کا حال
یا تمیز قرار دی ہے۔ جس کی وجہ سے ترجمہ یوں ہوگا "اور اگر کوئی مرد موروث ہو رہا ہو درآنحالیکہ وہ کلالہ ہو،
یا کلالہ کی حیثیت سے"۔ —— حال کی ترکیب سے تمیز کی ترکیب زیادہ واضح ہے۔ مغنی اللبیب جلد دوم ص۲۱۷ مع شرح دسوقی میں اس پر
بحث کی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ حال کہئے تو مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص موروث ہو بحالت کلالگی یعنی وہ کلالہ مستقل نہ ہو مگر کسی وقت
کلالہ بن گیا ہو۔ اسی طرح تمیز کی صورت میں بھی مطلب یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی وارث کے مقابل کلالہ کی حیثیت سے موروث ہو یعنی
کلالۂ مستقل نہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح تعلق اوپر سے معلوم نہ کر لینے کی وجہ سے نحویوں کو حال یا تمیز کا شبہ ہوا ورنہ
رجل موصوف یورث صفت، موصوف وصفت مل کر کان کا اسم ہوا اور کللۃ خبر۔ بس یہی اور صرف یہی ترکیب صحیح ہے۔ اس کے سوا
کھینچ تان کے سوا کچھ نہیں۔ اگرچہ حال وتمیز کی ترکیب سے بھی میرے مفہوم کی تائید ہی ہو رہی ہے۔ مگر میں غلط تائید بھی پسند نہیں کرتا۔

(۸) مذکورہ بالا سات نمبروں سے یہ واضح ہو گیا کہ کللۃ اسی لاولد مردے کو کہتے ہیں جس کے بھائی بہن ہوں۔ اگر بھائی بہن بھی
نہ ہوں تو باپ کے ورنہ دادا کے۔ یا ماں کے یا نانا کے بھائی بہن ہوں۔ غرض یہ کہ اپنی اولاد نہ ہو تو اس میت کے قریب تر اصول میں سے کسی
کی اولاد وارث ہو بوجہ انھیں کے اقرب ہونے کے۔ تو وہی کلالۂ کامل ہے۔ جدی اقربین کو مادری اقربین پر ترجیح ہوگی، مگر والدین کے
ہوتے میت کے بھائی بہن کے سوا اور کسی کے بھائی بہن کو وراثت کا حق نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ والدین کے ہوتے والدین کے یا والدین
کے والدین کے بھائی بہن بعید تر ہونے کی وجہ سے ضرور محروم ہو جائیں گے اور والدین ان کے حاجب ٹھہریں گے۔

(۹) اصل توریث جو قرآن ہی سے مستنبط ہے حسب ذیل ہے:-

• اصل وارث میت کی اولاد ہے جن میں مرد کو فوقیت ہے۔ اگر صرف مرد ہو تو کل مال اسی کا ہے۔ صرف ایک عورت یعنی بیٹی ہو تو نصف
مال اس کا ہے۔ ایک سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو دو ثلث مال ان کو ملے گا۔ بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق
بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے۔

اولاد کے ہوتے والدین بھی ہوں تو ہر ایک کو ایک سدس دینے کے بعد باقی مال اولاد پر تقسیم ہوگا۔ اس وقت باپ ماں برابر کے شریک
ہیں، موزون ہونے کی وجہ سے ان کے حصے میں کمی بیشی نہ ہوگی۔ اسلئے کہ ماں کا حق بھی اولاد پر باپ سے کم نہیں ہے۔ باپ درجے میں افضل
ہے مگر حقوق ماں کے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ حملته امه کرها ووضعته کرها وحمله وفصاله ثلثون شهرا۔ اس (بچے) کو اس کی ماں نے

تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے جنا۔ اور اس کے آغازِ حمل سے دودھ بڑھائی تک تیس مہینے ہوتے ہیں (سورۂ احقاف ج ۲۶ رکوع ۲)۔ یہ زحمتیں باپ نے اولاد کے لئے کہاں کھینچیں۔ اسلئے اللہ کی رحمت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ماں کو سدس سے بھی کم یعنی اس کا نصف بارہواں حصہ باپ کے مقابل ملے۔ اور نہ یہ مناسب تھا کہ باپ کو دو سدس دلوا دیا جائے۔ ایسا کیا جاتا تو ڈیڑھ ثلث یعنی نصف مال والدین کو ملتا اور نصف ہی ڈیڑھ ثلث اولاد کیلئے بچتا۔ اولاد جو فطرۃً وراثت کیلئے پیدا ہی کئے گئے ہیں ان کا حصہ دوسروں سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ اولاد کا تو تعدد بھی ہوتا ہے اور والدین میں کسی کا بھی تعدد ممکن ہی نہیں۔ والدین سے میت کا مال پھر میت کی اولاد کے عوض زیادہ امید ہے کہ بھائی بہن تک منتقل ہو جائے۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی مستنبط ہو گیا کہ ورثاء کے ہوتے غیر وارث کے لئے وصیت ثلث مال سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے[1]۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ہوتے دوسرے ورثاء کو ثلث سے زیادہ نہیں دلوایا۔ شوہر کو ربع اور بیوی کو اولاد کے ہوتے ثمن ہی دلوایا۔ باپ ماں کو ربع اور ثمن کا درمیانی حصہ یعنی سدس دلوایا۔ باپ ماں دونوں ہوں تو دو سدس یعنی ایک ثلث مال کا نکل جائیگا اور اولاد کیلئے صرف دو ثلث رہ جاتے ہیں اسلئے ورثاء کے ہوتے غیر وارث کے لئے یا صدقہ و خیرات وغیرہ کیلئے کوئی وصیت کرے تو اس کو ثلث مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کرنی چاہئے۔ رسول اللہ صلعم کا کوئی دینی حکم ایسا نہیں ہو سکتا جو قرآن سے مستنبط نہ ہو۔

اور اگر اولاد نہ ہو، تو والدین اولاد کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ ایک ثلث ماں کو دلوا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد باپ کے حصے کی تعیین کی ضرورت نہ تھی، باقی دو ثلث اب باپ کے سوا کون لے گا؟ اور ہے کون؟ ہاں اگر لا ولد میت کے والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو جو پوزیشن اولاد کے ساتھ والدین کا تھا، وہی پوزیشن والدین کے ساتھ میت کے بھائی بہن کا ہو جائیگا یعنی جس طرح اولاد کے ساتھ ماں باپ میں سے ہر ایک بلا تفریق مرد و زن ایک ایک سدس پاتا تھا۔ بالکل اسی طرح باپ ماں کے ساتھ بھائی بہن بلا تفریق مرد و زن ایک ایک سدس پائیں گے۔ یہ بھائی بہن وارث کلالہ ہوں گے، ان کی وراثت بھی وراثت کلالہ ہو گی۔ اور وہ میت لا ولد بھائی بہن کے مقابل مورثِ کلالہ یا موروثِ کلالہ کہا جائے گا۔

اور اگر والدین بھی نہ ہوں، میت لا ولد و لا والد ہو، تو پھر بھائی بہن ہی اولاد کی جگہ لے لیں گے اور بالکل اولاد ہی کی طرح بھائی بہن کو حصے للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق ملیں گے۔ اگر صرف ایک بہن ہو تو صرف ایک بیٹی کی طرح اس کو نصف مال ملے گا ایک سے زیادہ بہنیں ہوں تو ایک سے زیادہ بیٹیوں کی طرح دو ثلث ان کو ملے گا۔ صرف بھائی ہی ہو تو صرف بیٹے جس طرح کل مال لے لیتے اسی طرح اس وقت سارا مال وہی بھائی ہی لے لیں گے۔ یہ اصول اتنا واضح تھا جو غور کرنے سے سمجھا جا سکتا تھا۔ اور اہل علم صحابہؓ سمجھ رہے تھے۔ مگر جب چند مہینوں کے بعد بعض سطحی عقل والوں نے کلالہ کامل یعنی جس میت کے نہ اولاد ہو نہ والدین اور بھائی بہن ہی

---

[1] سوال یہ نہیں کہ کیا ہونا چاہئے اور کیا نہیں ہونا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ اور بس۔ قرآن نے وصیت کو کہیں مشروط نہیں کیا۔ اسلئے ایسے غیر مشروط بیّن حکم کو اس طرح مقید و مشروط کر دینے کی اجازت کسی انسان کو نہیں مل سکتی۔ اسی لئے ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی روایت رسول اللہ کی نہیں ہو سکتی جس میں دین پر اس طرح اضافہ کیا گیا ہو۔ (طلوعِ اسلام)

صرف ہوں تو بھائی بہن کو کیا ملے گا۔ یہ سوال کر دیا۔ اور جب سوال پیش کر دیا تو جو صحابہ سمجھ رہے تھے وہ بھی خموش ہو گئے کہ اب کچھ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب پوچھا گیا ہے تو پھر جواب آہی جائیگا۔ اسی لئے پہلے طنزیہ انداز میں فرمایا گیا کہ یستفتونك لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ فرما کر کہ جب پوچھتے ہی ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیدیتا ہے۔ یہاں صرف "کلالہ" عام طور سے اس طرح فرمایا گیا ہے کہ کلالۂ موروث، کلالۂ وارث اور وراثتِ کلالہ سب کو شامل ہو۔ مگر کلالہ ہے کون؟ کس کو کلالہ کہتے ہیں اس کو بھی بتادیا ان امرؤ ھلك لیس لہ ولد ولہ اخت (او اخ او کلاھما او امرأۃ کذلك) کہ ایک مرد یا عورت لاولد مرجائے اور اس کے بھائی یا بہن یا دونوں ہوں (خلاصۂ مفہوم آیت) آگے جو صورت بیان فرمائی گئی ہے وہ کلالۂ کامل کی یعنی جس کے وارث صرف بھائی بہن ہی ہیں۔ والدین میں سے کوئی بھی نہیں۔ مگر لیس لہ ولد کے ساتھ ولا والد نہیں فرمایا گیا۔ اسی لئے کہ کلالہ کیلئے لاوالدیت بھی لاولدیت کی طرح لازمی شرط نہ سمجھ لی جائے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں کلالۂ کامل یعنی لاولد ولا والد ہی کا ذکر ہو وہاں بھی صرف لیس لہ ولد کہہ کر رک جانا اور ولا والد نہ کہنا بلاوجہ نہیں ہوسکتا۔ ابن جریر کا ذہن اس طرف نہ گیا ورنہ ایک قرارت یہاں بھی ولا والد کی حضرت سعدؓ نہیں تو حضرت ابی بن کعب یا حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہما میں سے کسی کی طرف ضرور منسوب کر دیتے۔ راویوں کا سلسلہ جوڑ دینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں ولا والد کا مفہوم موجود رہتے ہوئے کلالہ کے معنی بتانے میں ولا والد کا لفظ نہ کہنا اور صرف عنوان بیان سے ولا والد کا مفہوم ادا کر دینا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ولا والد ہونا کلالہ کی تعریف میں شرط لازمی نہیں ہے۔

(۱۰) کلالہ کے معنی چونکہ مفسرین نے غلط روایتوں کی بنا پر من لا والد لہ ولا ولد مان لیا ہے اور اسکی وجہ سے باپ کو بھائی بہن کا حاجب بھی ان کو ماننا پڑا۔ تو اس کے بعد جب شرائط حجب بنانے لگے تو پہلے ادلاء کی شرط لازمی بنائی کہ باپ مدلیٰ بہ ہے اور بھائی بہن مدلی، پھر وہ سب دشواریاں پیش آئی گئیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا۔ جیسے جیسے دشواریاں پیش آتی گئیں قیدیں بڑھاتے گئے۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو دوسری اصل حجب کیلئے بنائی۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو مولانا عبدالحی نے مجبور ہو کر فرمایا کہ دو ہی صورتیں تو تھیں جو دونوں ناکام رہیں اب جو کوئی تیسری صورت اگر ہے فیجب ان یبین تو "واجب ہے کہ بیان کی جائے"۔ دیکھئے اس واجب کو کون ادا کرتا ہے۔

پس اس بھائی بہن کے لپیٹ میں بیچارے یتیم پوتے بھی آگئے۔ ورنہ خاص طور سے یتیموں کو محروم کرنا فقہاء کو مقصود نہ تھا مگر ان کی خطائے اجتہادی کا تیر ایسا چلا جس سے بھائی بہن ہی اپنے مرحوم بھائی کے ترکہ سے باپ کی وجہ سے محروم نہ ہوئے بلکہ غریب یتیم پوتا بھی اپنے دادا کے ترکے سے اپنے چچا کی وجہ سے محروم ہوگیا۔ فقہا نے ایک تیر سے کتنے کلیجے چھلنی کر کے رکھدیئے۔

رکھدیا چھید کے دل، کیا یہ خطا تھوڑی ہے؟ بے خطا کہنے کو صرف نشانہ تیرا

تلك عشرۃ کاملۃ پہلے کی تصریحات اور پھر ان دس نمبروں سے مسئلہ حجب جو فقہاء کا متفق علیہ مسئلہ ہے اس پر کافی روشنی پڑجاتی ہے۔ یہ پوری بحث فقہاء کے متفق علیہ اصول کو ایک حد تک مانتے ہوئے انھیں حدود کے اندر کی گئی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد قانون حجب پر صرف قرآنی تصریحات کے ماتحت روشنی ڈالوں گا۔ مگر علمائے وقت کے خیالات ان معروضات کے متعلق تو ذرا معلوم ہولیں۔

ایک گذارش: جو بزرگ اس مضمون پر موافقت یا مخالفت میں قلم اٹھائیں اور جس پرچے میں وہ مضمون چھپے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ضرور بھیجکر مجھے اس سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ والسلام

(تمنا عمادی مجیبی غفرلہ)

۲۲ عبدالعزیز لین۔ نواب گنج۔ ڈاکخانہ پیل خانہ۔ ڈھاکہ

سلیم کے نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(خدا کا تصور)

ارے بابا! تم تو چاہتے ہو کہ بس اللہ میاں کو تمہارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے تو پھر تمہارا اطمینان ہو۔ غنیمت یہ ہے کہ تم جناب کلیم اللہؑ کی طرح رب ارنی انظر الیك (یا اللہ! مجھے اپنا آپ دکھا کہ تجھ سے نگاہ کامیاب ہوسکے) ہی کہتے ہو، بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہتے کہ لن نؤمن لك حتی نری اللہ جھرۃ (ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو اپنے سامنے نہیں دیکھ لیں گے) یہی فرق ہے ایک قلبِ سلیم اور ذہنِ سرکش میں۔

سلیم! پہلے تو یہ سمجھ لو کہ دنیا جب بھی خدا کے متعلق بات کریگی تو وہ بات درحقیقت خدا کے متعلق نہیں ہوگی بلکہ خدا کے متعلق انسانی تصورات (OUR IDEAS ABOUT GOD) کی بات ہوگی۔ اسلئے کہ مذہب نے خدا کا انفرادی تصور دیا ہے۔ یعنی ہر فرد کے ذہن میں خدا کا الگ الگ تصور۔ اور انفرادی تصور ہمیشہ داخلی (SUBJECTIVE) ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فرد کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ اس قسم کے (SUBJECTIVE GOD) کے تصورات میں حقیقی توحید آہی نہیں سکتی۔ غریب کا خدا اور قسم کا ہوگا، امیر کا اور قسم کا۔ مایوس کا خدا اور قسم کا ہوگا، کامیاب کا خدا اور قسم کا۔ فاتح و منصور کا خدا اور قسم کا ہوگا، مفتوح و محکوم کا اور قسم کا۔ اور آگے بڑھئے تو جیمس جینز (JAMES JEANS) کا خدا اور قسم کا ہوگا، وائٹ ہیڈ کا اور قسم کا۔ حتیٰ کہ ایک ہی فرد کی مختلف حالتوں میں مختلف خدا ہوں گے۔ بیماری کی حالت کا خدا اور قسم کا ہوگا، تندرستی کی حالت کا اور قسم کا۔ صفراوی غلبہ کی حالت میں خدا اور قسم کا ہوگا، بلغمی مزاج میں اور قسم کا۔ افراد سے آگے بڑھئے تو قبائلی خدا (TRIBAL GOD) کی باری آتی ہے۔ ایک جابر و سرکش قوم کا خدا اور قسم کا ہوگا اور مظلوم و مقہور قوم کا خدا اور قسم کا۔ ٹھگوں کا خدا اور قسم کا ہوگا اور کبیر پنتھیوں کا اور قسم کا۔ بنی اسرائیل کے دورِ شوکت و سطوت کا خدا اور قسم کا تھا اور زوال و انحطاط (بیت المقدس کی بربادی اور اس کے بعد "مسیح کی بھیڑوں") کے زمانہ کا خدا اور قسم کا۔

وہ جو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ فلاں قوم کا تمدن کیسا تھا تو یہ دیکھو کہ اس دور میں اس قوم نے اپنی پرستش کیلئے کس قسم کا خدا وضع کر رکھا تھا، یا اسی تفصیل کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔ ذہن انسانی اپنے سے باہر کسی مجرد (ABSTRACT) شے کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ذہنِ انسانی کا تراشیدہ خدا ہمیشہ انسانی جذبات و عواطف کا پیکر ہوتا ہے۔ جس قسم کے امیال و عواطف اور جذبات احساسات، اسی قسم کا خدا۔ کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی شکل پر ڈھالا ہے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کو خود اپنی شکل پر ڈھالتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے ہاتھ پاؤں، سر، آنکھیں، ناک، کان، چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، خدا کے بڑے بڑے

ہوں گے۔ انسان کے دو ہاتھ ہوتے ہیں خدا کے دس ہوں گے، انسان اپنی مٹھی میں ذرا سی چیز دبا سکتا ہے ایشور اپنی مٹھی میں جوالا مکھی پہاڑ لے سکتا ہے۔ انسان دو چار گھونٹ پانی پی سکتا ہے، دیوتا پورے کا پورا سمندر چڑھا لیتے ہیں۔ یا یہ کہ انسان غصے میں آ کر کسی ایک انسان کے تھپڑ مار دیتا ہے، خدا غصے میں آ کر قوم کی قوم کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس قسم کے (SUBJECTIVE GOD) کا تصور کس قدر کمزور بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور کس طرح انسانی تصورات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے جب (ALLAN GRANT) یا اسی قسم کے دیگر مغربی مصنفین یہ کہتے ہیں کہ خدا ذہنِ انسانی کے ارتقائی تصورات کا پیدا کردہ ہے، تو ان کا مطلب اسی قسم کے (SUBJECTIVE GOD) سے ہوتا ہے جس کا تصور مذہب پیش کرتا ہے۔ اس قسم کا خدا چونکہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے اس لئے وہ ذہنِ انسانی کی ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اب آگے بڑھو سلیم! اس قسم کے (ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ) خدا کی صورت میں ایک دقت اور بھی ہوتی ہے۔ تم نے خود ہی یہ قصہ سنایا تھا کہ جب عمر بخش اور خداداد کا مقدمہ چل رہا تھا تو دونوں نماز کے بعد اپنی اپنی کامیابی کی دعائیں مانگا کرتے اور دونوں اس کے حضور منتیں مانا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ تم نے دیکھ لیا، میرا سچا خدا میری کس طرح مدد کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں کا "خدا" ایک ہی تھا تو اس کے لئے یہ مرحلہ کس قدر کشمکش انگیز ہوگا۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس سے مدد مانگ رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ بہرحال ایک ہی کے حق میں ہو سکتا تھا (اور ایک ہی کے حق میں ہوا)۔ اگر یہ فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں اور زیادہ منتیں مانی تھیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں (فریقین) "خدا" کو اپنی اپنی طرف جھکانا چاہتے تھے "خدا" اس کی طرف جھک گیا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں یا زیادہ چڑھاوا چڑھا دیا۔ اس شکل میں سلیم! سوچو کہ معاملہ کی صورت کیا ہوئی! دنیا میں ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں جن کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ بعض اوقات پوری کی پوری قوم دوسری قوم کے خلاف نبرد آزما ہو جاتی ہے اور ہر قوم اپنی کامیابی کے لئے خدا سے دعائیں مانگتی ہے۔ (تمہیں یاد ہوگا کہ گذشتہ جنگ میں ہٹلر بھی خدا کا نام لیکر حملہ کیا کرتا تھا اور چرچل بھی خدا کی مدد سے اس کا جواب دیا کرتا تھا)۔ یعنی ہزاروں، بلکہ لاکھوں انسان بیک وقت "خدا" کو ایک طرف کھینچتے ہیں اور لاکھوں انسان دوسری طرف۔ اسلئے کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس کا "خدا" اس کے ساتھ ہے۔ وہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں (ذہنِ انسانی کا تراشیدہ) خدا کیا کرتا ہے؟ اگر وہ کچھ نہیں کرتا اور دنیا کے معاملات یونہی چلے جا رہے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے "خدا" کے ماننے سے حاصل کیا ہے؟ ہر شخص خدا کو اس لئے مانتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا خدا مشکلوں اور مصیبتوں میں اس کی مدد کرے گا۔ لیکن اگر اس کا خدا اس کی مدد نہیں کرتا تو وہ ایسے خدا کو مان کر کیا کریگا؟ اور اگر خدا مدد کرتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمر بخش اور خداداد (ہٹلر اور چرچل) میں سے کس کی مدد کرتا ہے؟ اگر وہ اس کی مدد کرتا ہے جو سب سے زیادہ منتیں مانتا ہے تو یہ وہی کھینچا تانی کا سلسلہ ہو گیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مذہب (یعنی ذہنِ انسانی کے تراشیدہ خدا) کے سلسلے میں پہلی منزل (FIRST STAGE) یہی منتوں اور چڑھاوؤں کی ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو عصرِ سحر (MAGIC AGE) آتی ہے جس میں خاص قسم کی رسومات، خاص قسم کے ورد اور وظائف (منتر جنتر) سے "خدا" کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اس خاص

شخص کی مرضی کے مطابق کردے "صبح کے وقت ندی میں کھڑے ہو کر سوالاکھ مرتبہ یہ کچھ پڑھو مقدمہ میں کامیابی لازمی ہے" یعنی اگر تم نے ایسا کردیا تو خدا مجبور ہوگا کہ مقدمہ کا فیصلہ تمہارے حق میں کرائے۔ اور اگر یہی کچھ یا اس سے زیادہ زور دار حلیہ فریق ثانی نے کردیا تو "خدا" کو فیصلہ اس کے حق میں کرانا پڑے گا۔

یہ کیفیت ہوتی ہے سلیم! اس وقت جب خدا خود انسانی ذہن کا تراشیدہ (SUBJECTIVE) قرار پاتا ہے۔ مذہب اسی قسم کے خدا کا تصور پیش کرتا ہے اور یہی ہے وہ خدا جس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ محض انسانی تصورات کی تخلیق ہے۔ یعنی یہ اعتراض کہ انسان نے اپنے لئے خود خدا بنا لیا ہے، خدا درحقیقت موجود نہیں ہے۔ لیکن دین (قرآن) خدا کے متعلق ایک جداگانہ تصور عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا، ذہن انسانی کا تراشیدہ نہیں، بلکہ وہ خارج میں (OBJECTIVELY) موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی تصور کرنیوالا ذہن نہیں تھا اور اسوقت بھی موجود ہوگا جب کوئی تصور کرنیوالا ذہن نہیں ہوگا۔ وہ موجود ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اسکی یہ خصوصیات جنہیں صفات — ATTRIBUTES کہا جاتا ہے) مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہیں۔ وہ نہ عمر بخش کی آرزوؤں کے مطابق بدلتی ہیں نہ خدا دا کی تمناؤں کے مطابق ڈھلتی ہیں۔ نہ انہیں شکر کھینچکران کی جگہ سے ہٹا سکتا ہے نہ چرچل۔ لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب (نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہ اہل کتاب کی خواہشات کے مطابق)۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جب خدا، ذہن انسانی کا پیدا کردہ نہیں تو ذہن انسانی اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ ذہن انسانی تو اسی چیز کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے جس کا وہ تصور کر سکتا ہے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس خدا کے متعلق ذریعۂ معلومات کیا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی وہ علم جو ذہن انسانی کا پیدا کردہ (SUBJECTIVE) نہیں بلکہ خارج سے عطا شدہ (OBJECTIVE) ہے۔ اسی کو وحی کہتے ہیں۔ یہ علم خود خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو براہ راست ملتا ہے۔ (یعنی ملتا تھا۔ کیونکہ اب تو سلسلۂ نبوت ختم ہوگیا) اور اس کے ذریعے خدا اپنا تعارف کراتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھو کہ خدا نے اپنے متعلق جس قدر معلومات ہم پہنچانی تھیں، اس خارجی ذریعۂ علم (وحی) کی رو سے از خود ہم پہنچا دیں۔ جس قدر اپنا تعارف کرانا تھا اس کے ذریعہ کرا دیا۔ اب دنیا میں قرآن، اسی تعارف خداوندی کا خریطہ ہے۔ اسی تعارفی تفاصیل کو صفات خداوندی (ATTRIBUTES) کہتے ہیں۔ یعنی حقیقت مطلق (OBSOLUTE REALITY) کے مختلف گوشے (FACETS) انہی کو قرآن کی اصطلاح میں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس خدا سے میرا کیا تعلق ہے؟ میں اسے کیوں مانوں؟ اس پر ایمان کیوں لاؤں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ نہ ماننے والے میں کیا کمی رہ جاتی ہے جو ماننے والے میں پوری ہوجاتی ہے۔ اگر خدا ہے تو ہوا کرے۔ اگر نہیں ہے تو نہ سہی۔ مجھے اس سے کیا واسطہ؟ یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور جب تک ان کا اطمینان بخش اور سکون آفریں جواب وجۂ طمانیت قلب نہیں ہوتا، ایمان کی ضرورت اور اہمیت سمجھ میں آ نہیں سکتی۔ اسلئے اسے ذرا غور سے سنو۔ میں آج تک تمہارے اس سوال کو ٹالتا رہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ موضوع کس قدر مشکل اور دقیق ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے بات شروع کی اور تم بدکے۔ اور اگر بدکے نہیں تو سو ضرور جاؤ گے۔ لیکن اب جو تم نے اسقدر اصرار کیا ہے تو غور سے سنو۔ اس لئے کہ اس کا اثر انسانی زندگی پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔

خدا کا ماننا اور نہ ماننا یونہی ہنسی کی بات نہیں کہ یوں ہوگیا تو کیا اور یوں ہوگیا تو کیا؟ اس یوں اور یوں میں زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ ساری کی ساری کائنات کی بساط الٹ جاتی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی تمام حرکتیں گردش کرتی ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کا یہی مفہوم ہے)۔

لو اب سنو!

دنیا میں ہر شخص کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ہر شخص اپنے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی منزل، کوئی نہ کوئی نمونہ (PATTERN) رکھتا ہے۔ کوئی امیر بننا چاہتا ہے تو اس کے سامنے کسی بہت بڑے دولتمند کا نمونہ ہوگا۔ کوئی صاحب علم بننا چاہتا ہے تو اس کے پیش نظر کسی ذی علم ممتاز ہستی کی مثال ہوگی۔ کوئی بہت بڑا .... (INDUSTRIALIST) بننا چاہتا ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ارباب صنعت و حرفت اور کارخانہ داروں کی زندگی اپنے سامنے رکھے گا۔ کوئی شجاعت اور بہادری میں نام پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے بڑے بڑے فاتح جرنیلوں کے کارنامے ہوں گے۔ لیکن یہ سب مقاصد اضافی (RELATIVE) ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آدمی (MAN) بننا چاہے تو اسے اپنے سامنے کونسا نمونہ (PATTERN) رکھنا چاہئے۔

آدمی کی ایک حیثیت تو وہ ہے جسے حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) کہا جاتا ہے۔ وہی جس کے متعلق تم اکثر اکبر کا مصرع پڑھا کرتے ہو کہ ــــ ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں ــــ اس کی حیوانی زندگی، خالص مادی پیکر آب و گل کی زندگی ہے، جس کا مقصد تحفظ ذات (PRESERVATION OF SELF) اور تولید نسل (PROCREATION) ہے۔ اس کے لئے نہ کسی نصب العین کی ضرورت ہے نہ تمثیلی نمونے کی۔ لیکن جس چیز کو آدمیت کہا جاتا ہے وہ اس حیوانی زندگی سے الگ شے ہے۔ قرآن میں تخلیق آدم کی مختلف کڑیوں پر غور کرو سلیم! پہلے اس کی حیوانی تخلیق کے مختلف مدارج کو گنایا گیا ہے (بدا خلق الانسان من طین۔ تخلیق انسانی کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ یہ ہوئی جمادات کی زندگی۔ ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین۔ پھر اس کی نسل کو بذریعہ تولید آگے بڑھایا۔ یہ حیوانات کا درجہ آگیا۔ ثم سواہ۔ پھر اس میں خاص توازن پیدا کیا۔ یہ حیوانات سے اگلی ارتقائی منزل آئی جہاں اس نے انسان بننا ہے) اس کے بعد کہا کہ ونفخ فیہ من روحہ۔ پھر اللہ نے اس میں اپنی (روح) توانائی کو پھونک دیا۔ اب یہ انسان تخاطب کے قابل ہوگیا۔ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ۔ اس کے بعد تمہیں سماعت، بصارت اور قلب عطا کر دیا۔ غور کرو سلیم! ان تمام مدارج تخلیق میں نفخ روح کا وہ مقام ہے جہاں سے آدمیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات (PERSONALITY) ہے۔ اسی کو اقبال خودی کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا آدمی نام ہے "روح خداوندی" کے مظہر کا۔ یعنی خدائی صفات کا حامل۔ یہ صفات وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ تمام صفات ہر فرزند آدم (ہر آدمی) کے اندر بطور قابل حصول ممکنات زندگی (REALIZABLE POSSIBILITIES) موجود ہیں۔ پیدائشی اعتبار سے ہر انسان میں یہ صفات مستتر (POTENT) ہوتی ہیں۔ ان صفات کو بارز (ACTUALIES) کرنا۔ یا مشہود (MANIFESTED) بنانا مقصود آدمیت ہے۔ اسی کو خودی کی نمو یا تکمیل ذات کہا جاتا ہے۔

خدا کے اندر یہ صفات اپنی انتہائی حقیقی شکل (REALISED FORM) اور مکمل ترین صورت میں موجود ہیں، نہ صرف مکمل ترین صورت میں بلکہ ایسے توازن و تناسب کو لئے ہوئے جس سے بہتر اور مکمل توازن کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے ان صفات (سماء) کو حسنیٰ (بہترین توازن، حسن کارانہ انداز کی حامل) کہا گیا ہے۔ اسی انداز سے اپنی صفات کو تکمیل تک پہنچانا مقصدِ حیاتِ انسانی ہے۔

اب تم خود فیصلہ کر لو سلیم! کہ کسی انسان کو آدمی بننے کے لئے اپنے سامنے کونسا نمونہ (PATTERN) رکھنا ہوگا؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ نمونہ خدا کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلئے کہ انسان جن صفات کا پیکر ہے، انہی صفات کی حامل ذات مطلق اس کی تکمیل ذات کے لئے نمونہ بن سکتی ہے۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (۲/۱۳۸) "اللہ کا رنگ جس کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کوئی نہیں"۔ یہ ہے وہ نمونہ (PATTERN) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے ہر انسان کا مقصودِ حیات ہونا چاہئے۔ اسے کہتے ہیں سلیم! قرآن کی اصطلاح میں "اللہ پر ایمان لانا"۔ یہ ہے وہ ایمان جس کا مطالبہ تمام نوعِ انسانی سے کیا گیا ہے، خواہ وہ پہلے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے "صبغۃ اللہ" کی آیت سے پہلے یہ آیت ہے۔ فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا۔ اگر یہ لوگ اس انداز سے اللہ پر ایمان لائیں جس انداز سے تم ایمان لاتے ہو تو پھر سمجھو کہ یہ زندگی کی صحیح راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔

لہٰذا اللہ پر ایمان کے معنی ہوئے سلیم! صفاتِ خداوندی کے حسین مجموعے (اسماء الحسنیٰ) کو (جن کا تعارف قرآن میں کرایا گیا ہے) اپنی زندگی کا نصب العین بنانا۔ یعنی وہ صفاتِ الٰہیہ جو خود انسان کے اندر مضمر ہیں انھیں مشہود کرتے چلے جانا۔ جس قدر یہ مضمر (POTENTIAL یا LATENT) صفات مشہود (ACTUALISE) ہوتی جائیں گی، انسان "خدا کا مقرب" بنتا جائے گا۔ اور جب یہ تمام صفات اپنی آخری حد تک مشہود ہو جائیں گی تو "انسان اپنے رب تک پہنچ جائے گا"۔ قرآن نے انسانی زندگی کے نصب العین (GOAL) کو انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ وان الی ربک المنتھیٰ (۵۳/۴۲) "منزلِ اکبر یہ ہے"

پھر غور کرو سلیم!

(۱) چونکہ انسان، صفاتِ خداوندی (روحِ خداوندی) کا حامل ہے اس لئے اس کی تکمیلِ آدمیت کے لئے نمونہ صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔

(۲) اور یہ ذاتِ خداوندی، ہر فردِ انسانیہ کے لئے نمونہ ہوگی۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک ہی نمونہ (PATTERN) کیونکہ ہر انسان انہی صفات کا حامل ہے۔

اسے توحید کہتے ہیں۔ یعنی انسانی زندگی کیلئے صرف ایک نمونہ، ایک نصب العین ہونا۔ لا الٰہ الا اللہ۔ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔

اور یہ نصب العین وہی خدا ہو سکتا ہے، جس کا تعارف خود خدا نے وحی کی رو سے کرا دیا ہو (نہ کہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ خدا)۔ اس لئے دنیا کے ہر انسان کیلئے اس خدا پر ایمان لانا (یعنی اسے نصب العین حیات بنانا) ضروری ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے اس لئے کہ وحی اپنی اصلی اور خالص شکل میں قرآن کے سوا اور کہیں موجود نہیں (دنیا کے تمام مذاہب کے متبعین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان کے ہاں

وحی اپنی اصلی اور غیر مخلوط شکل میں موجود نہیں۔ اس تفصیل کو تم معراج انسانیت کے پہلے باب میں خود دیکھ چکے ہو)۔

اور چونکہ قرآن کے علاوہ خدا کا صحیح تعارف و تصور کہیں اور نہیں مل سکتا، اس لئے قرآن کا پیغام تمام دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہے۔ ذہنِ انسانی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس خدا کا تصور پیدا کر سکے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ تم اوپر دیکھ چکے ہو) ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ تصور، انفرادی اور (SUBJECTIVE) ہوتا ہے، موجود فی الخارج (OBJECTIVE) خدا کا تصور نہیں ہوتا۔ کچھ سمجھے؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھو سلیم!

دنیا میں جب کوئی دو انسان، اپنی زندگی کا نصب العین ایک ہی رکھیں یعنی ان کے سامنے نمونہ (PATTERN) ایک ہی ہو تو ان انسانوں میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اسی کا نام وحدتِ فکر و نظر ہے۔ لہٰذا جب تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک ہی نمونہ (PATTERN) ہو تو تمام افرادِ انسانیہ میں وحدت پیدا ہو جائے گی۔ بالفاظِ دیگر، توحید کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے اور وحدتِ انسانیت کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ ان هذه امتكم امة واحدة وانا ربكم فاتقون (۲۳/۵۱)۔

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ جب ہم نے خدا کو اپنے سامنے بطور نمونہ (PATTERN) رکھا ہے تو خدا کی صفات، یا اسماء الحسنیٰ (VARIOUS ASPECTS OF REALITY) کے متعلق ہمیں پوری پوری معلومات ہونی چاہئیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ہم میں کون کون سی صفات نشوونما پا رہی ہیں اور کونسی صفات ہنوز خوابیدہ یا خام ہیں۔ اس کا نام ہے تعلیم الکتاب یعنی قرآن کا علم (یعلمهم الکتاب)۔ علم سے مراد محض کتاب کا پڑھنا نہیں بلکہ اس کے نقوش کو دل کی گہرائیوں میں مرتسم کر لینا ہے۔ اسے کہتے ہیں تدریس (بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون)۔ جب کسی راستہ پر کثرت سے چلنے سے پاؤں کے نشانات پڑ جائیں تو اس راستہ کو طریق مدروس کہتے ہیں۔ یعنی ممارست (مشقِ پیہم) سے دل میں گہرے نقوش پیدا کر لینا تاکہ تعلیم کتاب تحت الشعور میں جاگزیں ہو جائے۔ خود قرآن کے بھی یہی معنی ہیں، سلیم! قراء کہتے ہیں کسی چیز کو سمٹا کر، سنبھال کر حفاظت سے رکھنا (جس طرح اونٹنی اپنے رحم میں تخم اور جنین کو رکھتی ہے) چنانچہ قرءٌ کے معنی ہی حمل کے ہوتے ہیں اور ناقۃ قاریٌ حاملہ اونٹنی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن اس وقت قرآن بنتا ہے جب اس شجرِ طیب کا تخمِ صالحہ، دل کی گہرائیوں میں قرار پذیر ہو جائے۔

اس سے تم سمجھ گئے ہوگے سلیم! کہ دین میں خدا پر ایمان کی اہمیت کیا ہے! یہ وہ بنیاد ہے جس پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور چونکہ دین نام ہی اس اسلوب و انداز کا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کی جائے، اس لئے خدا پر ایمان کے بغیر صحیح زندگی بسر کرنے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ جس قسم کا نمونہ (PATTERN) اسی قسم کی انسانی زندگی۔ جس قسم کا نصب العین اسی قسم کے اعمال۔ اس لئے کہ اعمال نام ہے حصولِ نصب العین کیلئے جدوجہد کا۔ یہاں ذریعہ اور مقصد (MEANS AND ENDS)

میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تمہیں یاد ہے سلیم! اگلے دنوں تم نے (FERDINAND LASSALLE) کا ایک اقتباس نقل کیا تھا جس میں وہ کہتا ہے کہ

ایسا نہ ہو کہ ہمیں نصب العین کا پتہ تو دیدو لیکن اس تک پہنچنے کی راہ نہ بتاؤ۔ [1]
اس لئے کہ دنیا میں ذرائع اور مقاصد اس طرح باہمد گر گتھے ہوئے ہیں کہ اگر ایک کو بدل دیا جائے تو دوسرا خود بخود بدل جاتا ہے۔
ہر مختلف راہ، مختلف منزل کی طرف نشان دہی کرتی ہے۔

اس لئے خدا پر صحیح ایمان ہی صحیح اعمال کا موجب بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے سلیم! کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ اگر خدا پر صحیح ایمان نہیں ہے تو تمہارے اعمال کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ (اولٓئک حبطت اعمالھم)۔ یہ، ہر رنگ کی خدا پرستی میں "نیک عمل" کی راہیں بتانے والے "برہمو سماجی مسلمان" کیا جانیں کہ قرآن کی رو سے "خدا پرستی" کسے کہتے ہیں اور "نیک عمل" کیا ہوتی ہے۔[2] یاد رکھو سلیم! سفر اور آوارگی دونوں میں قدم تو یکساں اٹھتے ہیں لیکن ایک میں ہر قدم جانبِ منزل اٹھتا ہے اس لئے کچھ وقت کے بعد مسافر منزل تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرے میں فقط قدم اٹھتے ہیں، منزل کوئی بھی سامنے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں سوائے تکان اور درماندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اولٓئک حبطت اعمالھم۔

اسی مقام پر اس اہم حقیقت کو بھی سمجھ لو سلیم! کہ انسان کے اندر ان صفاتِ خداوندی کی تربیت، تکمیل اور شہود، معاشرہ (اجتماعی نظام) کے بغیر ناممکن ہے۔ خودی (انسانی ذات، یا انسان کے اندر صفاتِ خداوندی) کی بیداری اور نمود ہوتی ہی اس وقت ہے جب انسان کا واسطہ کسی دوسرے انسان سے پڑے۔ اور یہی وہ محک (کسوٹی) ہے جس پر انسان اس حقیقت کو پرکھ سکتا ہے کہ اس کی خودی کس حد تک بیدار ہو چکی ہے۔ انسانی خودی (PERSONALITY) اپنی ذات میں یکتا (UNIQUE) ہے لیکن اسکی تربیت ہمیشہ اجتماعی نظام میں ہوتی ہے۔ بقول اقبالؔ

زندگی انجمن آرا، ونگہ دارِ خود است   ایکہ در قافلۂ باہمہ رَو بے ہمہ شو

یہ "بے ہمہ شدن" انسانی ذات کی یکتائی ہے، (کیونکہ یکتائی، ہر خودی کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے)۔ اور "باہمہ رفتن" جماعتی زندگی ہے جس کے بغیر تربیتِ خودی ناممکن ہے۔ اسی لئے قرآن انسانی تکمیل ذات کے لئے اجتماعی زندگی کو لاینفک قرار دیتا ہے وہ اس کیلئے ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی خودی کی ربوبیت (پرورش، تکمیل و نمود) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ربانیون پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن کے صرف بدن ہی ایک جگہ نہیں ہوتے بلکہ قلوب باہمد گر پیوست ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں ہر فرد، دوسرے کیلئے جیتا ہے۔ اسے ہر مقام پر اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے۔ ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ (۵۹/۹)

---

[1] اھدنا الصراط المستقیم۔ [2] ہمارا ہمہ اوست کا عجمی تصوف جو "رام اور رحیم" کو ایک ہی بتاتا ہے۔ اور ابوالکلام آزاد جیسا کے انداز کے مفسر جو کہتے ہیں کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی عالمگیر صداقتیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اسی قسم کی آوازیں اب پاکستان کے بعض گوشوں سے بھی اٹھنی شروع ہوئی ہیں۔

اس قسم کے باہمی روابط (یعنی ایسے معاشرے کی تشکیل) بھی صرف اس ایمان کے ذریعہ ممکن ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی اس امر کا یقینِ محکم کہ تمام افرادِ معاشرہ کا نصب العین ایک ہے اور ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت کو اپنا فریضۂ زندگی سمجھتا ہے۔

اس مقام پر تمہارے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہوگا سلیم! کہ کیا خدا کا ہمارے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم نے اسے اپنی زندگی کی تکمیل کے لئے بطورِ نمونہ سامنے رکھا ہے؟ اتنا ہی تعلق نہیں۔ یہ تو اس تعلق کا صرف ایک گوشہ ہے، اب دوسرا گوشہ تمہارے سامنے آتا ہے لیکن دیکھنا کہیں پھر سونہ جانا۔ بات بڑی اہم ہو رہی ہے۔

ذات (PERSONALITY) کی خصوصیتِ کبریٰ (MAIN CHARACTERISTIC) استغنار . . . . . (INDEPENDENCE) اور صمدیت (FREEDOM) ہے۔ خدا جو ذاتِ مطلق ہے وہ انتہائی شکل میں "غنی حمید" اور "صمد" ہے۔ لیکن ہر ذات (PERSONALITY) اپنی نمود کے لئے، خود اپنے اوپر کچھ قیود (SELF-IMPOSED LIMITATIONS) عائد کر لیتی ہے۔ خدا نے بھی اپنے اوپر کچھ "قیود" عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کتب علیٰ نفسہِ الرحمۃ (۶/۱۲) "اللہ نے اپنے اوپر اشیائے کائنات کی ربوبیت و حفاظت فرض کر رکھی ہے"۔ یہ "کتب علی نفسہ" (اپنے اوپر فرض کر لینا) وہی خود عائد کردہ قیود کی مثال ہے۔ ان قیود سے مفہوم یہ ہے کہ حالات کا جس قسم کا تقاضا ہو، اسی قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس مشکل مقام کو سمجھنے کیلئے تم یہ کہہ لو کہ خاص حالات میں خدا کی طرف سے خاص ردِ عمل (RE-ACTION) ہوتا ہے۔ اسے قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی جیسے حالات، اسی کے مطابق صفتِ خداوندی کا ظہور۔ اور چونکہ صفاتِ خداوندی غیر متبدل ہیں اس لئے قانونِ خداوندی بھی غیر متبدل، اٹل اور عالمگیر ہوتا ہے۔ لا تبدیل لکلمات اللہ۔ (قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی)۔ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا (قانونِ خداوندی میں تبدل و تحول ہرگز نہ دیکھو گے)۔ آفاقی کائنات میں خدا کا یہ قانون ہر شے میں از خود جاری و ساری ہے۔ ان اشیاء کو اس میں کسی قسم کا دخل و اختیار نہیں۔ کل لہٗ قانتون۔ (سب اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں)۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے۔ فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر۔ یعنی انسان عمل پر مجبور نہیں۔ جس قسم کا جی چاہے عمل کرے۔ لیکن اس پر اسے اختیار نہیں کہ عمل ایک قسم کا کرے اور نتیجہ دوسری قسم کا پیدا ہو۔ جیسا عمل اسی کے مطابق نتیجہ۔ اس لئے کہ جس قسم کا عمل انسان کی طرف سے ہوتا ہے اسی قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور بطورِ ردِ عمل ہو جاتا ہے، اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ قرآن میں دیکھو۔ ہر مقام پر تمہیں دکھائی دیگا کہ "اگر یوں کرو گے تو خدا یوں کرے گا"۔ یعنی اگر یہ کرو گے تو خدا کا قانون یہ نتیجہ پیدا کر دے گا اور اگر وہ کرو گے تو وہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ تمہارے ہر عمل کے مطابق خدا کی ایک صفت کا ظہور ہوگا۔ مثلاً خدا کی صفت ہادی۔ راہنمائی کرنے والا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری راہ کی تلاش میں جدوجہد کریں گے ہم انھیں اپنی راہوں کی طرف راہنمائی کر دیں گے۔ یعنی اگر کسی کی طرف سے اس کی صفتِ ہدایت کا ظہور ہوگا۔ یا مثلاً ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکٰت من السمآء والارض (۷/۹۶) "اگر بستیوں کے

رہنے والے ایمان لے آتے اور قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رہتے، تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے" یعنی اگر ان کی طرف سے ایسا ہوتا تو خدا کی صفتِ رزاقیت موجیں مارتی ہوئی جلوہ بار ہو جاتی۔ ولکن کذبوا فاخذنٰھم بما کانوا یکسبون (٫٫) "لیکن انھوں نے اس قانون کی تکذیب کی تو ہم نے انھیں ان کے اعمال کی سزا میں پکڑ لیا۔" انھوں نے یہ کیا تو ہم نے یہ کیا۔" یہ ہے قانونِ خداوندی جسے قرآن کی اصطلاح میں "مشیت" کہا جاتا ہے۔ قرآن نے تفصیلاً بتا دیا ہے اور بار بار دہرا کر بتا دیا ہے کہ اگر چاہتے ہو کہ خدا کی فلاں صفت کا ظہور ہو تو اس کے لئے یہ کرو۔

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ جس خدا کا تصور مذہب پیش کرتا تھا (یعنی ذہنِ انسانی کا تراشیدہ خدا) اس میں خدا ہر فرد کی آرزؤں کے مطابق ڈھلتا ہے۔ اس لئے اس "خدا" کو ہر فرد اپنی طرف جھکانا چاہتا ہے۔ عمر بخش اپنی طرف، خداداد اپنی طرف۔ ہر مقدمے میں مدعی اپنی طرف مدعا علیہ اپنی طرف، مستغیث اپنی طرف، ملزم اپنی طرف۔ تم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کھینچا تانی میں "خدا" کا کیا نقشہ بنتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کا تصور ایک عالمگیر، اٹل، غیر متبدل، قانون کا تصور ہے جو اپنی جگہ پر قائم ہے اور کسی کی طرف نہیں جھکتا۔ ہر عمل اسی قانون کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اور نتیجہ ٹھیک ٹھیک عمل کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون (۳/۱۶۰)۔ جو انسان جس قسم کا نتیجہ چاہتا ہے وہ خود اس کے مطابق بن جائے۔ نتیجہ خود بخود مرتب ہو جائے گا۔

رمز باریکے بحرفے مضمر است تو اگر دیگر شوی او دیگر است

قانونِ خداوندی کے ساتھ اس قسم کی ہم آہنگی اور موافقت کو تقویٰ کہتے ہیں۔ جو کسان چاہتا ہے کہ اس کا کھیت سیراب ہو اُسے اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنانا ہوگا اس لئے کہ پانی کا عام قانون، نشیب کی طرف بہنا ہے۔ جس نے اپنے کھیت کو پانی کے عالمگیر قانون سے ہم آہنگ کر لیا، اس کے سامنے جنت تجری من تحتھا الانھار کا منظر آ جائے گا۔ جس نے اسے فراز کی طرف رکھا (یعنی قانونِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی۔ اسے کفر و عصیان کہتے ہیں) وہ سیرابیوں اور شادابیوں سے محروم رہ گیا۔ اس میں نہ کسی کشمکش کی گنجائش ہے نہ کھینچا تانی کا امکان۔ نہ کسی کی سفارش کا کوئی سوال ہے نہ خوشامد کا۔ یہ طے شدہ فیصلے ہیں، جسے قضا کہتے ہیں اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ قضا بدلا نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ دعا سے بھی نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اب تم دعا کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دو گے۔ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو تو کسی دوسرے وقت کی جائیگی۔ سردست تم اتنا سمجھ لو کہ دعا کے معنی "اللہ واسطے" مانگنے کے نہیں۔ اس کے معنی "بلانے" کے ہیں۔ تمہارے سامنے ایک مرحلہ ہے۔ اس کے لئے تمہارے سامنے کئی ایک راہیں کھلی ہیں۔ بہت سے امکانات (POSSIBILITIES) ہیں۔ تم ان امکانات میں سے، بیک وقت، صرف ایک امکان ہی کو اختیار کر سکتے ہو۔ زندگی کی ہر دوراہے پر تم صرف ایک طرف ہی مڑ سکتے ہو۔ تم اپنے دل میں آرزو پیدا کرتے ہو کہ تمہارا یہ امکان (جسے تم اختیار کرو) قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔ یعنی تم اپنے سفرِ زندگی میں قانونِ خداوندی کو بلاتے ہو کہ وہ تمہارا رفیقِ راہ بن جائے۔ اسی کو دعا کہتے ہیں۔ یعنی قانونِ خداوندی کو اپنی رفاقت کے لئے بلانا اپنی جدوجہد (اعمال) کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی آرزو پیدا کرنا۔ اس لئے دعا سے خدا کا قانون (قضا) نہیں بدلتا۔ بلکہ انسان اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے اپنے آپ کو قانونِ خداوندی (قضا) سے

ہم آہنگ کرلیتا ہے۔

یہاں تک سلیم! خدا کے قانون کی محکمیت (غیر متبدل ہونے) کے متعلق گفتگو تھی۔ اب اس کی عالمگیریت پر غور کرو۔ جس طرح عالمِ آفاق میں خدا کا قانون ہر جگہ یکساں طور پر جاری و ساری ہے، اسی طرح عالمِ انسانی میں بھی اس کا قانون ہر مقام پر یکساں نتائج پیدا کرتا ہے۔ آگ، قطبِ شمالی کے اسکیمو کے لئے بھی اسی طرح وجۂ تپش ہے جس طرح افریقہ کے حبشی کے لئے۔ ہوا، ملکۂ برطانیہ کی ناک میں بھی اسی طرح جاتی ہے جس طرح تبت کے چرواہے کی۔ اس میں نہ جغرافیائی حدود و قیود کی کوئی تخصیص ہے، نہ رنگ اور خون کی کوئی تمیز۔ نہ دولت و ثروت کا کوئی لحاظ ہے نہ منصب وجاہ کی کوئی رعایت۔ یہ قوانین نہ قبائلی ہیں نہ قومی۔ نہ وطنی ہیں نہ نسلی۔ اسی طرح خدا کا وہ قانون جو عالمِ انسانیت میں نتیجہ خیز ہوتا ہے، تمام نوعِ انسانی کیلئے یکساں ہے۔ یعنی وہ خدا جس کا تصور اوپر دیا گیا ہے۔ رب العالمین ہے۔ رب الناس ہے۔ ملک الناس ہے۔ الٰہ الناس ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں، کسی قوم، کسی نسل، کسی رنگ کا انسان ہو، جو بھی اس خدا کو اپنا (PATTERN) بنالے گا۔ جو بھی اس کے قانون سے ہم آہنگی اختیار کرلے گا وہی ربّانی بن جائے گا۔ یہ ہے ربانیوں کی وہ جماعت جو قومیت، وطنیت، خون، رنگ، نسل کے اضافی رشتوں سے بالا ہو کر فی الحقیقت ایک ملتِ واحدہ بنتی ہے۔ اسی لئے قرآن اس جماعت کو فقط مومنین کہہ کر پکارتا ہے، کیونکہ ان سب میں وجۂ جامعیت اور سببِ اشتراک، اس قانون پر ایمان ہے۔ یہی ایمان ان کی وحدت کی بنیاد ہے۔ ساری دنیا میں ایک (PATTERN) کے مطابق زندگی بسر کرنے والے۔ ایک رنگ میں رنگے ہوئے۔ ایک قانون کو تسلیم کرنے والے۔ یہ ہیں اس خدا کو ماننے والے افراد جس کا تصورِ دین (قرآن) نے عطا کیا ہے۔ وہ خدا جو ہر فرد سے یکساں فاصلے پر ہے، جس طرح دائرے کا مرکزی نقطہ، محیط کے ہر نقطے سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ جو بھی اسے اپنا (PATTERN) بنانا چاہے، اسے اپنے نزدیک پائے گا۔ اذا سألك عبادی عنی فانی قریب (۲/۱۸۶) "میرے بندے جب میرے متعلق سوال کریں تو میں ان سے قریب ہوں۔ ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب (نحن اقرب الیہ من حبل الورید)۔ جو بھی اس کے قانون کو اپنی زندگی میں راہ نما بنائے گا وہ قانون ہر وقت اس کا ساتھ دے گا۔ وہ جس وقت بھی اس قانون کو پکارے گا، وہ قانون اس کی پکار کا جواب دیگا۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (۲/۱۸۶) "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔ عالمگیر قانون کا یہی خاصہ ہونا چاہیئے۔ پھر وہ قانون جزیں ایسا ہے کہ دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہوں میں پھر جانے والے تصورات تک بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ اس کی نتیجہ خیزی کا یہ عالم ہے کہ قلب و جوارح کی کوئی خفیف سی حرکت بھی ایسی نہیں جس کا اثر مرتب ہونے سے رہ جائے۔ من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ غور کرو سلیم! کہ ایسے خدا پر ایمان (یعنی ایسے قانون کی محکمیت پر یقین) انسان کے دل میں کتنی بڑی خود اعتمادی پیدا کردیتا ہے۔ اگر وہ اس قانون کے مطابق کام کررہا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے دل میں وسوسہ انداز نہیں ہوسکتی کہ اس کی محنت رائیگاں جائیگی یا وہ نتیجہ مرتب نہیں کرے گی جو اس کے پیش نظر ہے۔ دنیا بھر کی مخالفتیں اس کے دل میں یہ خدشہ نہیں پیدا کرسکیں گی کہ وہ ناکام رہ جائیگا۔ اس لئے خوف اس کے پاس نہیں پھٹکے گا، حزن اس کے قریب نہیں آئیگا۔ وہ (بظاہر) بڑی سے بڑی مایوسی کے عالم میں بھی، دل کے پورے اطمینان کے ساتھ، تبسم فشانیوں کے جلو میں کہدیگا کہ لا تحزن ان اللہ معنا۔ "مت گھبراؤ۔ ہمیں ناکامی کیسے ہوسکتی ہے۔ جب کہ ہم قانونِ خداوندی کے مطابق چل رہے ہیں۔ (اسی روش کا نام قرآن

کی اصطلاح میں فی سبیل اللہ ہے یعنی قانونِ خداوندی کی راہ)۔ اگر سفرِ زندگی میں کہیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ گھبرا کر خودکشی نہیں کر لیتا۔ بلکہ وہیں رک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کس مقام سے اس کا قدم قانونِ خداوندی کی راہ سے ہٹ گیا ہے۔ چونکہ قانونِ خداوندی نہایت واضح صورت میں اس کے سامنے ہوتا ہے اس لئے اسے اس امر کے تعین میں کچھ مشکل ہی نہیں ہوتی کہ کہاں سے اس کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ وہ اس غلطی کو متعین کر کے وہاں سے لوٹتا ہے اور پھر اس دوراہے پر آجاتا ہے جہاں سے اس نے صحیح راہ چھوڑی تھی (اسے توبہ کہتے ہیں)۔ اور اس کے بعد پھر قانونِ خداوندی کے صراطِ مستقیم پر چل نکلتا ہے۔

کہو سلیم! (۲) خدا پر ایمان' انسان کے دل میں خدا کی صحیح قدر و قیمت پیدا کرتا ہے یا اس خدا پر ایمان جسے انسان نے اپنے ذہن سے تراشا تھا اور جس کے حضور تمہیں مان مان کر عمر بخش اور خداداد دونوں اپنے اپنے حق میں مقدمہ کا فیصلہ چاہتے تھے۔ وہ "خدا" جب انسان کی مدد نہیں کرتا تو انسان اس خدا ہی سے انکار کر دیتا ہے (اور انکار کرنا بھی چاہئے) لیکن یہ خدا (یعنی دین کا خدائے حقیقی جس کا ہمہ گیر قانون اس محکمیت کے ساتھ کارفرما ہے) اگر کسی کی "مدد نہیں کرتا" تو اس کا ماننے والا اپنے یقین کو اور پختہ کر لیتا ہے کہ اس کے ہاتھوں سے خدا (کے قانون) کا دامن چھوٹ گیا ہے' اس لئے ناکامی ہوئی ہے۔ یعنی اس کی کامیابی اور ناکامی دونوں خدا (کے قانون) پر ایمان میں پختگی پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے سلیم! کہ اس خدا (کے قانون) پر ایمان سے وہ کشمکش بھی ختم ہو جاتی ہے جو ذہنِ انسانی کے تراشیدہ' انفرادی خدا کے ماننے والوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انفرادی خدا کی صورت میں' عمر بخش اور خداداد دونوں اپنی اپنی جگہ خدا کو اپنی طرف کھینچتے ہیں لیکن خدا کے قانون پر ایمان رکھنے کی صورت میں' خدا کی مدد اس کے ساتھ ہو سکتی ہے جو خدا کے قانون سے ہم آہنگ ہو۔ اگر عمر بخش اور خداداد میں باہمی تنازعہ یا مناقشہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ دونوں خدا کے قانون سے الگ ہیں یا ان میں سے (کم از کم) ایک ضرور اس قانون سے مختلف راہ پر گامزن ہے۔ جو شخص خدا کے قانون سے ہم آہنگ نہیں اسے اس قانون کی رو سے مدد مانگنے کا حق نہیں۔ اور اگر وہ زبان سے اس کی مدد مانگتا بھی ہے تو بھی اسے اس کی مدد نہیں مل سکتی۔ اس قانون کی تائید و نصرت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اس قانون سے ہم آہنگ ہو جائے اور اگر وہ بھی اس قانون سے ہم آہنگ ہو گیا تو دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے۔ (تم نے سلیم! اسکول میں جیومٹری کا یہ قاعدہ تو پڑھا ہی ہوگا کہ جو چیزیں کسی ایک چیز کے برابر ہوں وہ آپس میں بھی برابر ہوتی ہیں) عمر بخش قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ تھا لیکن خداداد نہیں تھا۔ اس لئے ان دونوں میں اختلاف و تنازعہ کی صورت تھی۔ جب خداداد بھی اس سے ہم آہنگ ہو گیا تو ان میں کوئی اختلاف یا تنازعہ باقی نہ رہا۔ معاملہ صاف ہو گیا۔

اب تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا سلیم! کہ آفاقی کائنات میں خدا کا یہ قانون نہایت واضح، بین، محکم اور مشہود انداز میں جاری و ساری ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس قانون کی کارفرمائی کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے مثلاً خدا کا قانون یہ ہے کہ لا یفلح الظالمون جو قوم حقوقِ انسانیت میں کمی کرے اس کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظالمین پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں اور حقوق کی رعایت رکھنے والے (دیانتدار اور عدل پسند) لوگ ہر جگہ مات کھاتے ہیں۔ دنیا کا یہی چلن ہے۔

یہ سوال بڑا اہم ہے سلیم! اور بڑی توجہ سے سمجھنے کے لائق۔ اس مقام پر ٹھوکر کھا جانے سے بڑے بڑے ارباب عقل و فکر کے پاؤں میں لغزش آجاتی ہے۔ تمہیں سمجھانے کیلئے مجھے ایک دقت یہ بھی ہوتی ہے کہ تم سے فلسفیانہ اصطلاحات میں گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں میں نے ہزار کہا کہ زیادہ نہیں تو فلسفہ کے مبادیات سے تو واقفیت حاصل کرلو۔ لیکن تم نے ایک نہیں سنی۔ لیکن تم سنو بھی کیوں؟ تمہیں کوئی دقت ہو تو سنو بھی۔ مصیبت تو میرے لئے ہوتی ہے کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ اس لئے جو بات میں چار لفظوں میں بیان کرسکتا ہوں تمہارے لئے چار صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ بہرحال سنو۔ اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

قانونِ کائنات کی بعض موٹی موٹی باتیں ایسی ہیں جنھیں ہم ہروقت کارفرما دیکھتے ہیں۔ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے۔ زمین کی کشش ثقل سے چیزیں نیچے کی طرف گرتی ہیں۔ ہوا سے ہلکی چیز اوپر کی طرف جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس قانون کا وہ حصہ جو ان بدیہیات سے کہیں اہم نازک اور دقیق ہے ایسا ہے کہ جس کے نتائج یونہی دیکھتے دیکھتے سامنے نہیں آجاتے نظریۂ ارتقا (EVOLUTION) کے ماہرین سے پوچھئے۔ وہ بتائیں گے کہ کسی ایک نوع میں، ذرا سی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے قدرت کو کس قدر ہزارہا سال تک کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں۔ ارتقائی مراحل اسقدر سست رفتاری سے طے ہوتے ہیں کہ گھڑی کی گھنٹوں والی سوئی کی طرح ان کی رفتار محسوس ہی نہیں ہوسکتی۔ یہ وہ رفتار ہے جس کے پیمانوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا کا ایک ایک یوم تمہارے حساب وشمار کی رو سے ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے ارتقائی تبدیلیوں کو نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ کسی ایک فرد کا دماغ اسے محسوس کرسکتا ہے۔ ایک فرد کیا، دس دس، بیس بیس نسلوں (GENERATIONS) تک بھی یہ تبدیلیاں محسوس شکل میں سامنے نہیں آتیں۔ تبدل وتحول کے اس قانون کو تدریج و امہال کا قانون کہا جاتا ہے یعنی کسی تبدیلی کی پہلی حالت سے آخری حالت تک کا درمیانی وقفہ۔ تبدیلی تو درحقیقت نقطۂ اولیں سے شروع ہوجاتی ہے لیکن ہم اسے اس وقت محسوس کرتے ہیں جب وہ مکمل ہوکر مشہود و مرئی شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ تمہیں یاد ہے، گذشتہ سردیوں میں جب تم نے پانی چولھے پر رکھا تھا اور میں نے پانچ منٹ کے بعد پوچھا تھا کہ کیا پانی گرم ہوگیا۔ تو تم نے کہا تھا کہ ابھی کہاں؟ اس پر میں نے کہا تھا کہ سلیم! بات سوچ کر کرو۔ اس پانچ منٹ میں پانی یقیناً گرم ہوگیا ہے لیکن تم اس کی گرمی کو محسوس نہیں کررہے۔ تھرمامیٹر رکھ کر دیکھو۔ اس کی گرمی محسوس ہوجائے گی۔ اسی کا نام قانون تدریج و امہال ہے۔ یعنی تبدیلی کا بتدریج واقعہ ہونا۔ عمل سے نتیجہ کے درمیان مُہلت کا وقفہ ہونا۔ اسی کو تاجیل بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی تبدیلی کے ظہور کی مدتِ معینہ۔ وہ میعاد جس میں قطرہ گہر بن جائے۔

جس طرح عالمِ آفاق (PHYSICAL URIVERSE) میں یہ قانون جاری وساری ہے، اسی طرح عالم انسانی (یا عالم معنویات) میں بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان انتظار کا وقفہ لازمی ہے۔ (قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین)۔ اور جس طرح مادی دنیا میں انتظار کے اس وقفے کے پیمانے بہت وسیع ہیں، اسی طرح نتائج اعمال کے یہ وقفے بھی بہت طول طویل ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ ویستعجلونک بالعذاب۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر قانونِ خداوندی کے خلاف چلنے سے تباہی وبربادی آتی ہے، تو کہاں ہے وہ تباہی وبربادی؟ ان سے کہو کہ لن یخلف اللہ وعدہٗ۔ ذرا انتظار کرو۔ اللہ کا قانون اٹل ہے۔ اس کے،

ترتیبِ نتائج میں کبھی کوتاہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے لئے اس کے پیمانے مختلف ہیں۔ وان یوماً عند ربك كالف سنۃ مما تعدون۔ قانونِ خداوندی کے حساب و شمار میں ایک دن، تمہارے ہاں کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ اسی میعاد کو قرآن اجل مسمی اور اجل معدود کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے۔ اس انداز کی "نتائج شماری" کے علم کو تاریخ کہتے ہیں جس پر قرآن بڑا زور دیتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی ہے۔ عالمِ آفاق میں ہر شے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے وہ اس اجل مسمی (مدتِ معینہ) کو گھٹا بڑھا نہیں سکتی۔ یا یوں کہئے کہ وہ قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار میں کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کا بھی امکان ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قانون نام ہے، کسی خاص واقعہ پر، خدا کی ایک خاص صفت کا مشہود ہونا۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ خود انسانوں کے اندر بھی (اپنے پیمانے پر) یہی صفات موجود ہیں۔ اور اگر ان کی تربیت و پرورش ہو جائے تو یہ بھی صفاتِ خداوندی کی طرح مشہود ہوتی اور وہی نتائج پیدا کرتی ہیں۔

اگر انسانوں کا ایسا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں افرادِ معاشرہ کی یہ صفات تربیت پا کر، صفاتِ خداوندی کی طرح، خاص مواقع پر مشہود ہوتی رہیں تو قانونِ خداوندی کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی کی رفتار کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ یعنی جب انسانوں کی صحیح قوتیں، قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں، تو یہ قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بہت تیز رفتار (سریع الحساب) ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم ہے قرآن کی اس آیت کا کہ وان تنصروا اللہ ینصرکم۔ "اگر تم قانونِ خداوندی کی مدد کرو گے تو وہ قانون تمہاری مدد کرے گا"۔ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف (جنگِ بدر میں) ان الفاظ سے اشارہ کیا گیا کہ "تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم خود چلا رہے تھے"۔ کیا بات کہہ گیا ہے غالبؔ کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است ۔۔۔ لیکن کشودِ آں ز کمانِ محمدؐ است

قرآنی معاشرے کے افراد اور قانونِ خداوندی کی اس رفاقت کو قرآن نے "نزولِ ملائکہ" سے تعبیر کیا ہے۔ جنگ بدر میں انہی ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح عام حالات میں بھی جہاں فرمایا کہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ... ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق، اعمال کو نتیجہ خیز بناتی ہیں۔ قرآنی معاشرے میں افرادِ معاشرے کی تربیت یافتہ صفات (روحِ خداوندی) اور ان (ملکوتی) قوتوں میں باہمی توافق ہو جاتا ہے اور اس طرح اس قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور نتائج بہت جلد سامنے آ جاتے ہیں۔ ایسے جلد کہ یہ جماعت، اپنے فریقِ مقابل سے، پوری خود اعتمادی سے کہہ سکتی ہے کہ یقوم اعملوا علیٰ مکانتکم انی عامل۔ "اے میری مخالف قوم! تم جو کچھ کر رہے ہو اپنی جگہ کئے جاؤ۔ میں اپنی جگہ کام میں لگا ہوا ہوں۔ فسوف تعلمون۔ بہت جلد نتیجہ سامنے آ جائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ من تکون لہ عاقبۃ الدار۔ آخر الامر کامیابی کا مقام کس کے لئے ہے۔ اس وقت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ خدا کا یہ قانون کس قدر سچا ہے کہ انہ لا یفلح الظالمون۔ (۶/۱۳۵) ظلم کرنے والوں کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔

یہ ہے طریقہ سلیم! قانونِ خداوندی کے نتائج کو اپنے سامنے مرئی و مشہود دیکھ لینے کا۔ اسے اور واضح الفاظ میں سمجھنا ہو تو دو مثالوں کو سامنے لاؤ۔ کائنات میں خدا کی صفتِ خالقیت کا ظہور ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تم نظریۂ ارتقاء کے ضمن میں (اوپر) دیکھ چکے ہو کہ ان تخلیقی منازل کی رفتار کس قدر سست ہے۔ بایں ہمہ جب ادھر سے انسانوں کی صفتِ خالقیت مشہود ہو کر باہر آتی ہے تو وہی تخلیقی عمل نہ صرف یہ کہ بے حد تیز گام ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ندرت و تنوع بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ دھوپ میں رکھی ہوئی روئی صرف گرم ہوتی ہے، اس میں شعلہ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہی دھوپ (انسان کے ساختہ) "آتشی شیشہ" میں سے گذار دی جاتی ہے تو ایک ثانیہ میں شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ پیامِ مشرق میں تم نے خدا اور انسان کا مکالمہ پڑھا تھا۔ اس میں انسان اپنی انہی شوخ و شنگ ندرت کاریوں کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

توشب آفریدی چراغ آفریدم　　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اب اس کے بعد صفتِ ربوبیت کو لو۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی تم کئی مرتبہ سن چکے ہو۔ کسی شے کا نقطۂ اولیں سے آخری منزل تک بتدریج اوجِ کمال تک پہنچنا، جس طرح بطنِ صدف میں قطرۂ نیساں آہستہ آہستہ بتدریج، تربیت (پرورش) پا کر گہر بن جاتا ہے۔ لیکن یہ عمل بالکل غیر محسوس اور طول طویل ہوتا ہے۔ اسی لئے تو غالب گرفتہ خاطر ہو کر کہتا ہے کہ ــــ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک ــــ اس لئے کہ خدا کے قانون کے مطابق ــــ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک ــــ جس طرح صدف میں قطرے کی تربیت ایک خاص انداز کے مطابق ہوتی ہے اسی طرح جوہرِ انسانیت (خودی) تربیت سے پختگی حاصل کرتے ہیں۔ اگر اس تربیت کو آفاقی قانون کی رفتار پر چھوڑ دیا جائے تو معلوم اس تدبیر کی تکمیل میں کتنی صدیاں لگ جائیں گی۔ (یدبر الامر من السماء الی الارض۔ ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون ۳۲/۵) لیکن اگر انسان اپنی معاشرتی زندگی میں نظامِ ربوبیت قائم کر لیں اور ہر فرد دوسرے فرد کا مربّی (ربوبیت دینے والا۔ ربّانی) بن جائے تو پھر لو چھو سرزمینِ حجاز کے انجم آلا ذرات کو کہ انسانی جوہروں کی تکمیل کس طرح برق رفتاری سے ہوتی چلی جاتی ہے اور "زمین سے آسمان" تک کا یہ سفرِ معراج کس طرح براق کے کندھوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس شکل میں خدا کے آفاقی پروگرام کے ساتھ ان تربیت یافتہ انسانوں کا ارضی پروگرام بھی رفیقِ کار ہو جاتا ہے اور یوں یہ تمام مراحل کلمح البصر طے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس نظامِ ربوبیت کے اندر ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہر فرد کی محنت اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب کرتی چلی جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہونے پاتی۔ (ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون۔ ۳/۱۶۰)

اب ذرا تم سلیم! توحید کے اس پہلو کو انسانی معاشرے کے سامنے لا کر دیکھو کہ اس میں انسانی خوشگواریوں اور ارتقائی ندرت کاریوں کی کتنی جنتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان امن کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہر فرد، ہر گروہ، ہر جماعت، ہر قوم، تلاشِ امن میں مارے مارے

بھری ہے۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہے گا کہ امن نصیب نہیں۔ انسان اپنے ہزارہا سال کے تاریخی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حقیقی امن صرف اس معاشرے میں مل سکتا ہے جس میں زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوتی ہو۔ جس سرزمین میں بے آئینی کا دور دورہ ہو، وہاں شاہنشاہ سے لیکر ایک ادنیٰ مزدور تک کسی کی زندگی امن سے نہیں گذر سکتی۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر کوئی فضا پر امن ہوگی، اسی قدر انسانی صلاحیتوں کے ابھرنے اور نشو ونما پانے کے مواقع زیادہ ہوں گے۔ چنانچہ دنیا کی مختلف قوموں پر غور کر دیکھیں جس ملک میں زندگی آئین کے مطابق بسر ہوتی ہے وہاں کی قومیں دماغی صلاحیتوں میں دوسری قوموں سے آگے ہوتی ہیں۔ آئین کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں کام کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اگر یہ کیا جائے گا تو اس کا مواخذہ یوں ہوگا۔ اگر ان چیزوں کی پابندی کی جائے گی تو ان پر کسی قسم کی کوئی گرفت کوئی سختی، کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ ان کی جان، مال، آبرو سب کچھ محفوظ رہے گا۔ امن کا احساس ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیتا ہے جن میں انسان کے اعصاب جکڑے رہتے ہیں۔ جسقدر زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوگی اسی قدر انسان کو آزادی میسر ہوگی۔ یہ حالت دنیاوی آئین و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے کی ہے جن میں کوئی محکمیت (STABILITY) نہیں ہوتی۔ اگر جمہوری نظام ہے تو اس میں جب بھی اکاون آدمی ایک طرف ہوگئیں قانون بدل گیا۔ اگر شخصی حکومت ہے (خواہ بادشاہت کی ہو خواہ آمریت کی) تو اس میں قانون نام ہی صاحب اقتدار کے مزاج کا ہوتا ہے۔

اب اس کے برعکس اس قانون کو سامنے لاؤ جو توحید کی رُو سے پیدا ہوتا ہے۔ اس قانون سے مفہوم یہ ہے کہ

(i) تمام کائنات میں ایک ہی قانون رائج ہے جو انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

(ii) یہ قانون، ہر دوسرے قوانین پر غالب رہتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون بھی اسے شکست نہیں دے سکتا۔

(iii) یہ قانون اس قدر محکم، اٹل، غیر متبدل اور یقینی طور پر نتیجہ خیز ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی، سہو یا لغزش کا امکان ہی نہیں۔ قانون کی محکمیت کا یہ عالم ہے کہ انسانوں کو تو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کی روش چاہیں اختیار کرلیں لیکن قانون کو یہ اجازت نہیں کہ وہ جس قسم کا چاہے نتیجہ پیدا کردے۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کریں گے قانون مجبور ہے کہ اس کے مطابق نتیجہ برآمد کرے۔

(iv) اس میں ان انسانوں کو بھی کسی ردو بدل کی اجازت نہیں جن کے ہاتھوں سے یہ قانون نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ نہ اس میں کسی کی سفارش چلتی ہے نہ کسی کی رو رعایت ہوتی ہے۔ نہ کسی پر زیادتی ہوتی ہے نہ کوئی بے گناہ پکڑا جاتا ہے۔

اب سوچئے کہ جس معاشرے میں اس قسم کا قانون نافذ ہوگا اس میں امن و سکون کا کیا عالم ہوگا؟ اس معاشرے میں خوف و حزن کا دخل تک نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص جو قانون کی پابندی کرتا ہے ہر قسم کے خوف سے آزاد ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ من تبع هدای فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون۔ جس نے قانونِ خداوندی کی پابندی کرلی وہ خوف و حزن سے مامون ہوگیا۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی ہے یہ ضمانت (SECURITY) جو اس معاشرے میں انسانوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی معاشرے میں انسانوں کو اس قسم کا امن نصیب ہو جائے تو ان کی خوابیدہ قوتیں کس قدر بیدار اور مضمر صلاحیتیں کتنی جلدی مشہود ہو جائینگی۔

انسانی اعصاب سے بے آئینی کے خوف کا بوجھ اتار دیجئے، اس کی صلاحیتیں خود بخود ابھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔

یہ تھا حقیقی سبب، سلیم! اس امر کا کہ نبی اکرمؐ نے اتنی مختصر سی مدت میں، نہ صرف تمدن کی دنیا میں، بلکہ خود انسانی قلوب کی بستیوں میں اس قدر محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ نے اس باب میں کیا کیا تھا! انسانوں تک خدا کا قانون پہنچا دیا اور اس قانون کو اس معاشرے میں نافذ کر دیا۔ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیت خود رسول اللہؐ کی ہو سکتی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے اعلان کر دیا کہ میری حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ قانون کے متبع کی ہے۔ انا اول المسلمین۔ میں خود سب سے پہلے اس قانون کی اطاعت کرتا ہوں۔ اس کے افراد معاشرہ سے کہا کہ ہمیشہ اپنے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب رکھ کہ لاالٰہ الا اللہ۔ قانون صرف ایک خدا کا ہے۔ کسی اور کا نہیں۔ محمدؐ رسول اللہ۔ او تو اور، انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی (محمدؐ) کی پوزیشن بھی اتنی ہی ہے کہ وہ اس قانون کا انسانوں تک پہنچانے والا ہے۔ اسے بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے۔ خدا اپنے قانون میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لا یشرک فی حکمہ احداً۔ جب لوگوں کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ یہاں فی الواقعہ اطاعت قانون کی ہے اور قانون بھی ایسا جس میں کوئی انسان کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا، تو ان کے دل و دماغ سے وہ تمام بوجھ اتر گئے جن کے نیچے وہ دب رہے تھے (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم)۔ جب اس طرح بوجھ اترا تو انسانی روحیں آزاد ہو گئیں اور ان کی قوتوں نے پھولنا، پھلنا اور نشوونما پانا شروع کر دیا اور چند دنوں میں وہی اونٹ چرانے والے، بہترین انسانی صلاحیتوں کے مالک بن گئے۔ لوگ سلیم! تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے ہیں اور پھر بھی سمجھ نہیں پاتے کہ نبی اکرمؐ نے ایسا محیر العقول انقلاب پیدا کس طرح کر دیا۔ بات صرف اسقدر تھی کہ اس معاشرے میں آئینی زندگی کا امن پیدا ہو گیا تھا اور اس امن کا لازمی نتیجہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما تھا۔ انسان کے اندر بے پناہ قوتیں موجود ہیں۔ جب وہ قوتیں اس طرح یک لخت ابھر کر بروئے کار آجائیں تو ان کی رو سے پیدا شدہ انقلاب کا کیا ٹھکانہ ہے؟ جن انسانوں کی صلاحیتیں یوں نمودار ہو جائیں وہ (عام الفاظ میں) انسان نہیں رہتے، کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ ان انسانوں کا مقابلہ وہ لوگ کبھی نہیں کر سکتے جن کی صلاحیتیں دبی ہوئی ہوں۔ ہم —— غلام ابن غلام ابن غلام —— اس کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں سلیم! کہ نشوونما یافتہ صلاحیتیں انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں۔ ہمارے نصیب میں ساری زندگی میں ایک سانس بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ہم کہہ سکیں کہ ہم پر قانونِ خداوندی کے علاوہ اور کسی کی حکومت نہیں۔ یہ وہ اتنی بڑی سعادت اور مزیت تھی کہ جب وادیٔ ضجنان میں حضرت عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ سواری سے اتر کر سجدہ ریز ہو گئے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ یہ کونسا مقامِ سجدہ تھا؟ فرمایا کہ عمرؓ اس میدان میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ ایسا سخت گیر تھا کہ مار مار کر کھال ادھیڑ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے کہ

عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں۔

سلیم! آج سارے روئے زمین پر کوئی ایک فرد بھی ایسا ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر عمرؓ کی ہمنوائی میں کہہ سکے کہ

میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔

یہ تھی وہ حقیقی حریت اور آزادی جو آئین کی سچی پابندی نے ان لوگوں کو عطا کر دی تھی اور اسی آزادی کا نتیجہ تھا کہ اونٹ چرانے والا عمرؓ دنیا کی ممتاز ترین شخصیت قرار پا گیا۔ اور ایک حضرت عمرؓ پر ہی کیا موقوف ہے۔ وہ پورے کا پورا معاشرہ امتِ وسطیٰ (بین الاقوامی تو

کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس حریت بخشی میں خود تربیتِ نبویؐ کا کتنا بڑا حصہ تھا، اس کی تفصیلات تم "معراجِ انسانیت" میں پڑھ چکے ہو۔ اس لئے اس خط میں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ حضورؐ نے اپنی ساری عمر میں، قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے علاوہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی اپنی طرف سے نہیں منوائی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضورؐ کسی سے کچھ فرماتے تو (دنیاوی نقطۂ نگاہ سے) ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی نہایت بے باکی سے، یہ پوچھ لیتا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا آپؐ کی اپنی رائے ہے۔ اور جب آپ فرما دیتے کہ نہیں یہ میری اپنی رائے ہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ دیتا کہ میں اپنے معاملے کو بہتر سمجھتا ہوں اسلئے آپ کی رائے کو نہیں مان سکتا۔ ایسا کہنے پر نہ تو کہنے والے کے دل میں کبھی گمان تک بھی گذرتا کہ اس "عدول حکمی" کا نتیجہ کیا ہوگا اور نہ ہی اس رائے دینے والے کے دل میں اس کا خیال تک بھی آتا کہ اس نے میری بات نہیں مانی۔

یہ ہے سلیم! قرآنی معاشرہ میں توحید کے آئینی پہلو کا عملی اثر!

یہ ہے سلیم! وہ خدا جس پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پھر دہرا لو کہ یہ خدا کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ایک موجود فی الخارج (OBJECTIVE) ذات ہے جسے حقیقتِ مطلق .... (ABSOLUTE REALITY) کہا جاتا ہے۔ اس خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو اس نے خود وحی کے ذریعے بیان کر دی ہیں اور یہ وحی آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ یہ خدا ایک طرف انسان کے لئے زندگی کا نمونہ (PATTERN) بنتا ہے اور دوسری طرف اس کی صفات کا ظہور اس عالمگیر قانون کی صورت میں ہوتا ہے جو رگِ کائنات میں خونِ زندگی کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی وہ خدا ہے جس پر ایمان کا مطالبہ تمام نوعِ انسانی سے کیا جاتا ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ (از خود) خدا کے ماننے کے مدعی ہیں یا نہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت، عرب میں اہلِ کتاب بھی موجود تھے (یہود و نصاریٰ) جو خدا کو ماننے کے مدعی تھے۔ اور ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو بلا مذہبی گروہ بندیوں کے لیبل کے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ (عربوں کی تاریخ میں انھیں حنفاء کے نام سے پکارا جاتا ہے[۵])۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ ہوں، جو مذہبی گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے خدا پر ایمان کے مدعی ہیں، یا بلا گروہ بندی کی تخصیص کے خدا کو ماننے والے۔ ان کا خدا پر ایمان، اس خدا پر ایمان نہیں ہے جسے وحی نے پیش کیا ہے اور جو قرآن کے اندر ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے بھی اسی طرح "قرآنی خدا" پر از سرِ نو ایمان لانا ضروری ہے جس طرح ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو خدا کے منکر ہیں۔ اسلئے کہ جہاں تک "قرآنی خدا" کا تعلق ہے ان ماننے والوں کا ایمان اور نہ ماننے والوں کا انکار یکساں ہے۔ جب تک یہ سب قرآن کے بتائے ہوئے خدا پر ایمان نہیں لائیں گے جوہرِ انسانیت کو تباہ کر دینے والی قوتوں کے اثرات سے محفوظ نہیں ہو سکیں گے۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ

۵۔ اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ یورپ کے اکثر مفکرین اپنے آپ کو کسی مذہب کا پیرو نہیں بتلاتے (نہ ہی وہ کسی مذہب کے پیرو ہیں) لیکن خدا کو (اپنے اپنے انداز کے مطابق) مانتے ہیں یعنی یہ نہ یہودی ہیں نہ نصرانی۔ لیکن (اپنے خیال کے مطابق) خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

ان الذین اٰمنوا۔ والذین ھادوا۔ والصابئون۔ والنصاریٰ۔ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحاً فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ (۵/۶۹)

جو لوگ (بلا مذہبی گروہ بندی کے لیبل کے) خدا کو ماننے کے مدعی ہیں۔ یا جو لوگ یہودی بن چکے ہیں یا صابی یا نصاریٰ (اور اپنے اپنے انداز کے مطابق خدا کو مانتے ہیں۔ ان کا یہ ایمان حقیقی خدا پر ایمان نہیں۔) ان میں سے جو بھی اس خدا پر ایمان لائے گا جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مستقبل کی زندگی پر۔ اور اس کے بعد (قرآنی پروگرام کے مطابق) انسانی صلاحیتوں کو ابھارنے والے کام کریگا۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو خوف و حزن سے محفوظ و مصئون رہیں گے۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرا دیا کہ وان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، پھر ایسا ہو گا کہ ان پر آگے بڑھنے کی راہیں کشادہ ہوں گی۔ جس نے اس خدا کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اس کے قانون کو عالمگیر قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا (کفر) یا خدا کے اس تصور کے ساتھ اپنے تصورات بھی ملا دیئے اور اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کو بھی کارفرما سمجھ لیا (شرک) تو اس پر زندگی کی برومندی کی راہیں نہیں کھل سکتیں۔

یہ ہے سلیم! خدا پر ایمان اور اس سے کفر اور شرک کا مفہوم!

خط بہت لمبا ہو گیا اس لئے تمہارا یہ مطالبہ کہ خدا کی صفات (اسماء الحسنیٰ) کا کچھ اجمالی تعارف کرا دیا جائے اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو گا جن میں ان صفات کی نمود ہو گی، اس معاشرے میں انسانیت کا انداز کیا ہو گا، کسی دوسرے وقت ہی۔

مے باقی و ماہتاب باقیست ما را بتو صد حساب باقیست

والسلام

پرویز

احمدیت اور اسلام و ختم نبوت

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فتنۂ احمدیت کے متعلق بیانات ہیں جو حضرت علامہ مرحوم نے ۳۶-۱۹۳۵ء میں پریس کو دیئے تھے۔ ان تمام بیانات کو کتابی صورت میں جمع کر کے "طلوع اسلام" کی طرف سے شائع کیا گیا ہے کیونکہ احمدیت جیسا کہ ۱۹۳۵ء میں اسلام کیلئے ایک خطرہ تھی آج پہلے سے زیادہ خطرہ ہے۔

ساتھ ہی جناب پرویز کا ایک قابل قدر مقالہ "ختم نبوت" بھی شامل کر دیا گیا ہے جس میں فتنۂ مرزائیت پر قرآن کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ جس سے کتاب کی افادیت کئی گنا بڑھ گئی ہے ـــــ ضخامت ۹۶ صفحات ـــــ قیمت ۱۲ر صرف ـــــ مقامی اصحاب کتب فروشوں سے خرید سکتے ہیں۔ بیرونی حضرات ۱۲ر آنے کے ٹکٹ بھیجکر منگا سکتے ہیں۔ کتب فروشوں کو ۳۳ فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔ جو حضرات مفت تقسیم کرنے کیلئے کم از کم سو کاپیاں خریدنا چاہیں ان کو چالیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا۔

ادارۂ طلوع اسلام کراچی

قتلِ مرتد

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

[قتل مرتد کے متعلق مبسوط مقالہ طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری کا زیرِ نظر مضمون رسالہ جامعہ دہلی بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس کا وہ حصہ حذف کر کے جس کا تعلق قادیانیت سے تھا، باقی مضمون شائع کرتے ہیں۔　　طلوعِ اسلام]

جامعہ کے گزشتہ پرچہ میں کابل میں ایک مرزائی کے سنگسار کرنے کی بابت ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس پر ہمارے رسالہ کے بعض ناظرین نے اس مسئلہ کے متعلق "ہمارا خیال" دریافت کیا ہے۔ اس لئے ہم ضرورت سمجھتے ہیں کہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کر دیں۔ اس کے لئے ہم کو سب سے پہلے قرآن مجید کو دیکھنا چاہئے کیونکہ وہی شریعت کا منبع اور اسلامی قوانین کا سرچشمہ ہے۔ قرآن نے نہایت صاف لفظوں میں یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

دین میں کوئی زبردستی نہیں۔

ہر ہر فرد اپنی اپنی نجات کا ذمہ دار ہے اور اس کو کامل آزادی ہے کہ اپنا ذریعۂ نجات تلاش کرے۔ اس کی اس حریت کو غصب کرنیکا حق کسی کو نہیں ہے۔ اور اس معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں ہو سکتا۔ خود مرتد کے متعلق سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

تم میں سے جو اپنے دین سے پلٹ جائیگا اور کفر کی حالت میں مر جائیگا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہوئے۔

یہاں اللہ نے مرتد کا نتیجہ اور انجام بیان کر دیا لیکن اس کو قتل کر دینے نہ حکم دیا نہ کسی کو یہ حق بخشا بلکہ اس کو اپنی موت سے مرنے مہلت دی۔ سورۂ مائدہ میں بھی ارتداد کا ذکر کیا اور وہاں بھی کوئی سزا نہیں بتائی۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ

مسلمانو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائیگا تو اللہ ایسے لوگوں کو لائیگا جن کو وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہونگے۔

سورۂ آل عمران میں فرمایا کہ کوئی مرتد ہو جایا کرے ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔

وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا

جو اُلٹے پیروں لوٹ جائیگا وہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ سورۂ مائدہ میں اس اصول کی تصریح کردی کہ کوئی گمراہ ہوجایا کرے تمہیں اس کی کیا پڑی ہے۔ تم صرف اپنے نفس کی خبر رکھو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

مسلمانو! تم اپنے نفس کی فکر رکھو۔ جب تم راہ راست پر رہو گے تو جو گمراہ ہوجائیگا وہ تم کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

ایک نہیں ہزار مرتد ہوجائیں اللہ بے نیاز ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ۔

اگر تم کافر ہوجاؤ اور وہ سب لوگ جو زمین پر ہیں پھر بھی اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا

جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوگئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوگئے پھر کفر میں بڑھتے گئے تو اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخشیگا نہ ان کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس میں کسی سزا یا قتل کی اجازت مطلقاً نہیں دی ہے۔ اور اگر قتل کی سزا ہوتی تو ایک بار کافر ہونے کے بعد پھر ایمان اور پھر کفر کا موقع کہاں ملتا۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم جس نے قاتل کا قصاص، باغی، ڈاکو، چور، زناکار اور اس کے جھوٹے گواہوں کے حدود، یہانتک کہ ظہار اور یمین کے کفارے بھی بیان کردیئے وہ مرتد کی اس عظیم الشان سزا یعنی قتل اور رجال کے فتووں کے مطابق سنگساری کے ذکر سے کیوں خاموش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے دین کے معاملہ میں ہر شخص کو حریت کامل عطا فرمائی ہے اور کسی کے عقیدہ پر جبر کرنے کی مطلق اجازت نہیں دی ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہی سب سے بڑا ظلم ہے۔ سورۂ یونس میں ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔

جو تیرا رب چاہتا تو روئے زمین کے سارے آدمی ایمان لاتے۔ کیا لوگوں پر تو زبردستی کرے گا کہ وہ مومن ہوجائیں۔

سورۂ کہف میں نہایت بلند آہنگی سے اعلان ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔

کہدے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر بنے۔

اسی مضمون کو سورۂ یونس میں اور زیادہ واضح کردیا ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا۔

کہدے کہ لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا۔ جو ہدایت اختیار کریگا وہ اپنے لئے اور جو گمراہ ہوگا وہ اپنے لئے۔

قرآن کی تعلیمات سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اسی بات پر جہاد اور قتال کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ دینی عقیدے پر جبر

نہ ہونے دیں۔ سورۂ بقرہ اور انفال دونوں میں حکم موجود ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ

اور کافروں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو۔

فتنے کے معنی ہیں سونے یا چاندی کو آگ میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کرنا۔ مفردات میں راغب اصفہانی نے یہی معنی لکھے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو اس لئے ستانا کہ وہ اپنے عقیدے سے باز آجائے جیسے کفار مکہ مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ یہ جبر قرآن کے نزدیک قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ اور عقیدے پر جبر قتل سے بھی سنگین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان کے ساتھ لڑو تا کہ اس قسم کا فتنہ باقی نہ رہے اور لوگ خالص اللہ کے لئے دین اختیار کریں نہ کہ کسی چیز کے خوف سے۔

اس لحاظ سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس فتنۂ جبر کو دنیا سے مٹائیں نہ کہ الٹے خود ہی اس کو قائم کریں۔ اور قرآن جس بُت کے توڑنے کا حکم دیتا ہے اسی بت کو خود پوجنے لگیں۔ کیونکہ عقیدہ پر اگر جبر باقی رہا تو تبلیغ محال ہوگی۔ اس لئے کہ جملہ قومیں اور اہل مذاہب اپنے اپنے یہاں قتل مرتد کا قانون بنالیں گے پھر اس وقت کسی شخص کا کسی مذہب سے نکل کر دین حق میں داخل ہونا موت کے مرادف ہوگا۔ اور تبلیغ دین بغیر خونریزی کے اور کچھ نہ رہ جائے گی۔ اور اس کا سب سے زیادہ نقصان اسلام کو برداشت کرنا پڑے گا کیونکہ وہی سب سے بڑا تبلیغی دین ہے۔ جب قرآن کریم بالتصریح ہر شخص کو دین کے معاملہ میں آزادی دیتا ہے اور محض تبدیل مذہب پر کسی قسم کی دنیاوی سزا نہیں مقرر کرتا تو یقیناً احادیث صحیحہ اس کے خلاف نہیں جا سکتیں۔ ان میں جن لوگوں کے قتل کر دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل سیاسی مجرم ہیں نہ کہ دینی۔ بخاری شریف میں روایت ہے۔

من بدل دینہ فاقتلوہ

جو اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کر دو۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث کو راوی نے مجمل اور مبہم بیان کیا ہے۔ اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو کافر مسلمان ہو جائے اس کو بھی قتل کر دو۔ اس لئے یہ کسی قانون کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اسی کتاب میں دوسری حدیث اس سے مفصل ہے۔

لا یحل دم امرا مسلم یشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلث۔ النفس بالنفس۔ والثیب الزانی والمارق عن الدین التارک للجماعۃ

مرد مسلمان جو کلمۂ شہادت پڑھتا ہے اس کا خون حلال نہیں ہے بجز ان تین وجوہات کے۔ جان کے بدلے جان، شادی شدہ زناکار اور دین سے خارج ہونے والا جو جماعت کو چھوڑ دے۔

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ مروق عن الدین اور ترک جماعت کا مفہوم اور اس کے حدود کی تعیین کیا ہے۔ مروق عن الدین خود بخاری ہی میں آنحضرتؐ سے خوارج کے متعلق منقول ہے جنھوں نے امت کے ساتھ جدال و قتال عام شروع کر دی تھی اس لئے اس کا مفہوم بجز جماعت مسلمین سے بغاوت اور محاربہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا ہے۔

لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض

میرے بعد کفر کی طرف نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

یعنی ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی گردن مارنا ہی کفر کی طرف لوٹنا اور ارتداد ہے۔ اس لئے مروق عن الدین اور تارک للجماعۃ سے بجز ان لوگوں کے جو جماعت مسلمین کے ساتھ آمادۂ قتال ہو جائیں اور کوئی مراد نہیں لیا جا سکتا۔ وہ خواہ دین سے مرتد ہوں یا پابند اسلام لیکن قتل کئے جائیں گے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ خوارج اسلامی عقائد میں نہایت پختہ اور زہد و عبادت میں اقران سے فائق تھے لیکن باوجود اس کے خلفاء وقت ان سے جہاد کرتے رہے کیونکہ وہ محارب تھے۔ مگر جو شخص صرف دین کو چھوڑے نہ جنگ کرے نہ دنیا میں فساد پھیلائے وہ اس ذیل میں نہیں آ سکتا۔

صحاح میں جسقدر حدیثیں اس مضمون کی ہیں گو ان کے الفاظ رواۃ کی زبان سے مختلف ہو گئے ہیں لیکن مطلب ہر ایک کا یہی ہے در اصل یہ سب کی سب اس آیت کے ذیل میں آتی ہیں۔

اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْا الآیہ

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں انکی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے فتنۂ ردت میں جو جہاد کی تھی وہ بھی اسی بنیاد پر تھی۔ کیونکہ مرتد قبائل جنگ کے لئے تیار اور مسلح ہو گئے تھے۔ اور بعض بعض نے حوالی مدینہ پر حملے بھی شروع کر دیئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کے مرکز کو توڑ دیں تاکہ ہم سے کوئی زکوٰۃ وصول کرنے والا نہ رہے ان کا جرم سراسر سیاسی تھا اور وہ اللہ اور رسول سے باغی اور محارب تھے اسلئے ان کے مقابلہ میں جہاد لازمی تھی۔

دوسرا امر بحث طلب مرتد کی تعریف ہے۔ مرتد در اصل صرف وہ شخص ہے جو خود اپنی زبان سے کہدے کہ میں نے دین اسلام کو چھوڑ دیا دوسرے کسی شخص یا کسی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو کافر یا مرتد کہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ قرآن میں ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا - الآیہ

جو تم کو سلام کرے اس سے یہ مت کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔

ورنہ دنیا میں ایک مسلمان بھی مرتد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر ایک اسلامی فرقہ دوسرے مسلمان فرقوں کو گمراہ اور باطل پرست سمجھتا ہے ایسی حالت میں ہر مسلم بجز اپنی جماعت کے دوسروں کے نزدیک مرتد قرار پائے گا۔

اقبال اور مسئلہ جبر و قدر

(محترم ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی)

[یہ ایک دقیق مسئلہ ہے اور کم آدمی اس پر ذمہ داری سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا شمار شہرہ آفاق سائنسدانوں میں ہوتا ہے، اور آپ ان چند قابل قدر ہستیوں میں سے ہیں جو اس ادق مسئلہ پر سائنس کے جدید ترین انکشافات کی روشنی میں گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ ترجمہ ہے اس انگریزی مقالہ کا جو آپ نے ۲۱ راپریل کی تقریب یوم اقبال کیلئے لکھا مگر پڑھا نہ جا سکا۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر سے مقالہ میں اس مضمون سے انصاف نہیں کیا جا سکتا تھا اور چند اشارات پر ہی اکتفا کیا گیا تھا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے مرہون منت ہیں کہ انہوں نے یہ مقالہ طلوع اسلام کو بغرض اشاعت مرحمت فرمایا۔ ہم قارئین کو یہ خوشخبری بھی سناتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ فرصت نکال کر اس موضوع پر طلوع اسلام کیلئے ایک تفصیلی مقالہ سپرد قلم فرمائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب بیحد مصروف شخص ہیں خدا کرے انھیں اس ایفائے عہد کی بہت جلد مہلت میسر آجائے۔ ان کی گوناگوں مصروفیات دیکھکر خود ہمیں مایوسی ہوتی ہے لیکن ان کا بے پناہ عشق اقبال یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس اہم فریضہ کی بجا آوری کیلئے کسی نہ کسی طرح ضرور فرصت نکالیں گے۔　　مدیر]

تاریخ افکار انسانی میں جبر و قدر کا مسئلہ ہمیشہ سے نمایاں حیثیت کا مالک اور بحث و نزاع کا باعث چلا آرہا ہے۔ جب کہ انسان کا شعور بیدار ہوا ہے اور اس نے تفکر شروع کیا ہے، ارباب مذہب و فلسفہ نے ہر زمانے میں اس پر رائے زنی کر کے آخری فیصلہ دینے کی کوشش کی ہے تاکہ افراد کے لئے ایک ضابطۂ عمل مرتب ہو سکے۔ اگر ہم اخروی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں اور دنیوی زندگی کے اعمال کی اخروی زندگی میں جزا و سزا کے قائل ہیں تو ہمارے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ہم یہ فیصلہ کر لیں کہ آیا ہم اپنے اعمال میں آزاد و خود مختار ہیں، یا کوئی مشیت اعلیٰ ہے جس نے پہلے سے ہی ہمارے لئے سب کچھ مقدر کر دیا ہے اور اب ہم جبراً و قہراً انہی اعمال مقدرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جزا و سزا کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ہم اپنے اعمال کے مختار ہوں اور خیر و شر کا انتخاب کر سکیں۔ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے اس کیلئے کسی انسان کو ذمہ دار و مسئول گردانا انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

جہاں از خود بروں آوردۂ کیست؟　　جمالش جلوہ بے پردۂ کیست؟
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن　　بگو با من کہ او پروردۂ کیست؟

یہ مسئلہ مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے اور آغاز سفر میں ہی تسلی بخش حل کا متقاضی ہے۔ اس کے مناسب حل کے بغیر کوئی ضابطۂ اخلاق مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال نے اس اساسی مسئلہ پر اپنے کلام اور خطبات موسومہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ دونوں میں جابجا اظہار خیال کیا ہے۔ اس مختصر سی صحبت میں یہ ممکن نہیں کہ جو کچھ اقبال نے اس موضوع سے متعلق لکھا ہے اس سب کا کما حقہ جائزہ لیا جا سکے۔

مجھے مجبوراً اس تفصیلی بحث کو کسی آئندہ فرصت پر اٹھا رکھنا ہوگا اور آج صرف اجمالی تبصرہ تک محدود رہنا ہوگا جس میں اقبال کے خیالات کو اس انداز سے حصر و تجزیہ ہو جائے کہ اقبال کے پیش کردہ اہم نکات سامنے آجائیں اور یہ قیاس کیا جا سکے کہ کیا وہ کوئی حتمی جواب دینے میں کامیاب رہے ہیں؟ اس سے پہلے ایک خطبہ میں، میں اقبال کے نظریہ زمان و مکان پر بحث کر چکا ہوں۔ میں نے اس میں بتایا ہے کہ اقبال کے نزدیک زمان و مکان کا مسئلہ مسلمان کیلئے موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ان کی گرتی ہوئی صحت نے ان کو اجازت نہ دی کہ وہ اس اساسی مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر سکتے۔ فرد انسانی کے اقطار السموٰت والارض میں گھرے ہوئے الیغو (EGO) اور مطلق الیغو کا باہمی تعلق بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس پر اقبال کو کھل کر بات کرنے کا موقع مل جاتا تو جبر و قدر کے مابہ النزاع مسئلہ سے متعلق ہمیں بیش بہا معلومات میسر آجاتیں۔ خود علامہ کی طرف سے ایسی واضح اور حتمی بحث کے بغیر ہمیں خطبات کی چند سطور اور متفرق اشعار پر ہی اکتفا کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ ایسی تعلیمات کو جو آقائے نامدار محمد صلعم پر وحی کی گئیں، کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلے اقبال نے علم النفس کی روشنی میں الیغو کی نوعیت کا جائزہ لیا ہے وہ ولیم جیمز کے تصور شعور یعنی نظریہ "بہوتے خیال" پر تنقید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ ہماری ذہنی زندگی کی واضح تشریح ہے لیکن یہ شعور پر جس کا ہم اپنے اندر تجربہ کرتے ہیں منطبق نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک شعور ایک وحدت ہے، اور ذہنی زندگی کا لازمہ۔ شعور ایسے اجزائے شعور کا مجموعہ نہیں جو ایک دوسرے سے ربط قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہم الیغو کے مشاہدہ فیصلہ، انتخاب و ارادہ کا مظاہرہ دیکھتے ہیں۔ قرآن الیغو کے ہدایت کارانہ فریضہ کو یوں واضح طور پر بیان فرماتا ہے:

ویسئلونك عن الروح - قل الروح من امر ربی - ($\frac{۱۷}{۸۷}$)

اقبال قرآنی الفاظ "امر" اور "خلق" کی طرف خصوصی توجہ منعطف کراتے ہیں۔ کیونکہ خالق مطلق کی تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہمارے سامنے انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ لفظ "خلق" خدا اور کائنات کا باہمی تعلق ظاہر کرتا ہے اور "امر" خدا اور انسانی الیغو کا۔ آیہ "الروح من امر ربی" سے پتہ چلتا ہے کہ روح بالفطرت ہادیانہ ہے، کیونکہ اس کا سرچشمہ خدا تعالیٰ کی ہدایت بخش توانائی ہے۔ "ربی" میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال خالی از حکمت نہیں۔ اس سے الیغو کی نوعیت اور مظاہروں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ روح کو منفرد اور خاص سمجھنا چاہئے جس میں اپنی وحدت کے تمام پہلو مثلاً وسعت، توازن اور تاثیر برقرار رہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ، وربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا - ($\frac{۱۷}{۸۶}$)

اقبال پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ انسانی تجربہ سلسلہ اعمال ہے، ہر عمل ایک دوسرے سے منسوب اور سب باہمی طور پر ایک ہدایت کارانہ مقصد (DIRECTIVE PURPOSE) میں منسلک۔ انسان کی حقیقت کا راز ہی مقصد ہادیں ہے۔ انسان ایک بے جان ڈلے کی طرح فضا میں رکھ نہیں دیا گیا۔ نہ وہ سلک زمان میں منسلک تجربات کا مجموعہ ہے۔ انسانی حقیقت کا صحیح مطالعہ اور ادراک انسان کے فیصلوں، اس کے انتخابات، اس کے ارادوں، اس کے مقاصد اور اس کے عزائم کے مطالعہ سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

اقبال قرآن کی روشنی میں الیغو کی نوعیت سے متعلق پہلے سوال کا یہ جواب دیتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال دوسرے سوال کی طرف توجہ دیتے ہیں، یعنی یہ کہ مادہ و مکان کی حدود میں الیغو کے مظاہر کیا ہیں؟ اقبال کو اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے:

ولقد خلقنا الانسان من سللة من طين. ثم جعلنه نطفة في قرار مكين. ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما فكسونا العظم لحما. ثم انشانه خلقا اخر (۲۳: ۱۲-۱۴)

اس آیت سے اقبال دلیل لاتے ہیں کہ "دوسری ہی طرح" کا انسان (PHYSICAL ORGANISM) کی اساس پر نشوونما پاتا ہے اور اس پر ہر آن انائے اعلیٰ نیم اناؤں کے مجموعے کے ذریعے اثر انداز ہوتا رہتا ہے اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ تجربات کی ایک منضبط وحدت قائم کر سکے۔

اقبال ڈیکارٹ کی طرح یہ نہیں مانتے کہ جسم اور روح علیحدہ علیحدہ ہیں، ایک دوسرے سے مختلف مگر کسی ناقابلِ فہم طریق سے ایک دوسرے سے متعلق۔ اقبال ڈیکارٹ کے اس عقیدہ کو کہ مادہ جداگانہ ہستی رکھتا ہے بے دلیل سمجھتے ہیں اور اپنے دعوے کے ثبوت کیلئے انھوں نے چند صفحات وقف کئے ہیں۔ وہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کو لیتے ہیں جس کی رو سے مادہ فضائے مطلق میں بے جان ڈلے کی طرح پڑا ہوا نہیں بلکہ حالات وحوادث کا مربوط سلسلہ ہے۔ تجربات کا یہ سلسلہ یعنی بالفاظ دیگر نفس انسانی یا ایغو اقبال کے نزدیک اعمال کا بھی سلسلہ ہے۔ ایغو کی صفت اختیار ہے اور اعمال جن سے جسم عبارت ہے اپنے آپ کو دہراتے رہتے ہیں۔ جسم (مادہ) نفس انسانی کا مجموعی عمل ہے، بدیں وجہ وہ اس سے علیحدہ نہیں متصور کیا جا سکتا۔ اقبال کے نزدیک مادہ کمتر درجوں کے ایغوؤں کا مجموعہ ہے جس سے بہتر قسم کا ایغو نمودار ہوتا ہے۔

وہ یہ کہہ کر شکوک اور غلط فہمیاں دور کر دیتے ہیں کہ اس حقیقت سے کہ اعلیٰ ایغو ادنیٰ ایغوؤں سے ابھرتا ہے اعلیٰ ایغو کی قدر ومنزلت میں سرمو فرق نہیں آتا۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ابھرنے والے ایغو کا مقام اس کے مبداء کی مناسبت سے پست یا بلند نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقام کا تعین اس کی اہلیت، اس کی اہمیت اور اس کی ممکنات سے ہوتا ہے۔ ذرا عمل ارتقائے حیات کو دیکھئے۔ اگرچہ ابتدائے ارتقا میں ذہن پر جسم کو فوقیت حاصل رہی ہے، یعنی ارتقا زیادہ تر مادی اور جسمانی پہلو کا ہوا ہے، تاہم بتدریج ذہنی پہلو نمایاں ہو گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آخر الامر وہ مکمل طور پر آزاد ہو جائے۔ آخر ایغو جو ابھرنے والے کو ابھارتا ہے کائنات میں جاری وساری ہے۔ اسے قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

الاول، والآخر، والظاھر، والباطن

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ایغو غیر متبدل وجامد نہیں۔ زمان میں یہ اپنی تنظیم کرتا رہتا ہے اور اپنے تجربات سے ہی اپنی تشکیل وانضباط کر لیتا ہے۔ اسباب وعلل کے تحت یہ فطرت سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی۔ اقبال ایک اور سوال پیدا کرتے ہیں کہ آیا ایغو اپنا عمل خود متعین کرتا ہے، اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کی یہ خود مختاری کائنات مادہ کی تعیین سے کس طرح مطابقت کر سکتی ہے؟ وہ (CONFIGURATION PSYCHOLOGY) کی رو سے اس استدلال کو رد کر دیتے ہیں کہ ایغو اور فطرت کی تعیین ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتی نیز یہ کہ سائنسی طریقوں کا اطلاق انسانی عمل پر پوری طرح ہو سکتا ہے۔ اقبال کو ایسی ہی روش اختیار کرنی چاہئے تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ طبیعی علوم کے اصول ونتائج ان کے نہج فکر کے خلاف تھے۔

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ اقبال نے اپنے خطبات ۱۹۲۸ء سے پہلے مرتب کئے۔ ظاہر ہے کہ وہ طبیعی علوم کے ان

انکشافات و معلومات سے استفادہ نہ کر سکے جن کی تقریباً انہی دنوں طرح ڈالی جا رہی تھی جن سے بعد میں مادہ، توانائی اور علت و معلول کے تصورات میں یکسر انقلاب آ گیا۔ اگر انھیں ان تازہ ترین انکشافات کا علم ہوتا تو انھیں فوراً پتہ چل جاتا کہ درحقیقت میکانزم اور جبریت کے عقیدہ کی اساس ہی باطل ہے۔ ان عقائد کے جواز میں جو استدلالات پیش کئے جاتے ہیں ان کا استرداد انہی طبیعی اصولوں میں مضمر ہے جن پر ان کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ میں اسے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

ساری انیسویں صدی اور بیسویں کے ربع اول میں طبیعیات کے مندرجہ ذیل دو اصول مسلمات کا درجہ رکھتے تھے۔ اسوقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مادہ اور توانائی دونوں الگ وجود رکھتے ہیں، ایک دوسرے سے متخالف و آزاد۔ مادہ ٹھوس سمجھا جاتا تھا جو وزن بھی رکھتا تھا اور توانائی کا کوئی وزن نہیں تھا۔ مادہ کی حرکت اس کے ذرات کی حرکت تھی اور توانائی کی حرکت لہروں کی صورت میں تھی۔ مادہ کے قوانین مختلف تھے اور توانائی کے مختلف۔ مادہ کبھی توانائی میں تبدیل نہیں ہو سکتا تھا، نہ توانائی مادہ کی شکل اختیار کر سکتی تھی۔ جبر کا عقیدہ رکھنے والوں نے اس طبیعی اصول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خدا کی ماورائیت کا تصور پیش کیا جس کی روسے وہ مادہ پر خارج سے اثر انداز ہوتا ہے اور جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے اس کا حقیقی خالق ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ وہ ایک آلہ کار تھا جو اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا اور جو کچھ اس کے لئے مقدر کر دیا گیا تھا اس کے ارتکاب میں مجبور محض تھا۔

مخالفین مذہب نے مادہ اور توانائی کے اس اختلاف سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ چونکہ ہر معلول کو اپنی علت سے ایک مشابہت رکھنی چاہئے، لہٰذا عالم طبیعی ایسے خدا کا شرمندۂ تخلیق نہیں ہو سکتا جو بذات خود غیر مادی ہے۔

قدری اور اضافی (RELATIVITY QUANTUM) نظریات نے بلاشائبہ تردید یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، بالکل ایسے جیسے برف اور بھاپ پانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ روشنی بھی مادہ کی طرح ٹھوس ہو گئی ہے اور مادہ کی طرح وزن رکھتی ہے۔ دونوں بعض اوقات ذرات کی طرح حرکت کرتے ہیں اور بعض اوقات لہروں کی صورت میں۔ آئن سٹائن کے ایک فارمولا (MASS-ENERGY RELATION) کے مطابق مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور توانائی مادہ میں۔ یہ فارمولا محض نظری طور پر ہی ثابت نہیں ہو چکا بلکہ (MILIKAN) نے ۱۹۱۲ء میں اور (COCKEROFT & WALTON) نے ۱۹۳۲ء میں اسے سائنسی تجربہ گاہوں میں عملاً ثابت کر دیا۔ ضمناً یہ اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہی وہ فارمولا ہے جو ایٹمی بم کی اساس ہے۔ اس انکشاف نے جبریت و دہریت کے ماننے والوں کے عقیدے کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اس نے ثابت کر کے رکھ دیا ہے کہ خدا جو زمین و آسمان کا نور ہے بلا تکلف کائنات کا پروردگار ہو سکتا ہے۔

اللہ نور السموات والارض

اہل جبر کا دوسرا استدلال طبیعیات کی تعینیت کی رو سے قائم ہوا تھا جسے ۱۹۲۷ تک تسلیم کیا جاتا رہا۔ یہ نیوٹن کے (LAWS OF MECHANICS) کا نتیجہ تھا کہ یہ مان لیا گیا کہ اگر کسی متحرک وجود کا موجودہ مقام و نوعیت معلوم ہو جائے تو اس کے ماضی اور مستقبل کے کسی آن کی حرکت سے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مشینی دنیا میں ان قوانین کی کامیابی نے انسانی نگاہوں میں اسقدر

خیرگی پیدا کردی کہ لوگ ان مشینی اصولوں کا نفسیاتی حوادث تک پر اطلاق کرنے لگ گئے۔ چنانچہ "مشینی دماغ" اس زمانے کی مقبول اصطلاح ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ محض مادی دنیا میں بلکہ انسانی زندگی میں بھی مطلق جبریت کا سکہ رائج ہوگیا۔ ہمارا مستقبل ماضی سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ ہمارا کوئی اختیار نہیں، نہ ہم انتخاب ہی کر سکتے ہیں۔ اگر نیوٹن کے قوانین کو تسلیم کر لیا جائے تو ان نتائج سے واقعی مفر نہیں۔

۱۹۲۷ء میں ہائزن برگ نے ایک نہایت اہم انکشاف کیا اور قدری میکینکس (QUANTUM MECHANICS) کا اصول غیر تعیینیت پیش کیا۔ اس اصول نے نیوٹن کی مشینی جبریت کی عمارت بالکل منہدم کر دی ہے۔ ہائزن برگ نے بتایا کہ ایک اصلی ایٹم کا دائرہ عمل بھی پہلے سے متعین نہیں ہوتا۔ جاحد ایٹمی ذرہ کی لاتعداد عملی ممکنات ہیں جن سے کوئی ایک وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس کا علم وقوع کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور جبھی ہم تجزیہ کرکے بتا سکیں گے کہ ایسے کیوں واقع ہوا۔ تعیینیت (DETERMINISM) اس وقت سے طبیعیات سے بدر کر دی گئی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ کسی ذرے کی پوزیشن جاننے کیلئے ہمیں اس کا مقام اور اس کی رفتار دونوں معلوم کرنے پڑیں۔ چنانچہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مقداریں بیک وقت پوری صحت سے متعین نہیں کی جا سکتیں۔ کسی ذرے کی پوزیشن متعین کرنے کے لئے ہمیں روشنی ڈال کر اس کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے، اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک گیند کو دوسری گیند سے مارا جائے، اس سے پہلی گیند لامحالہ اپنا مقام چھوڑ دیگی۔ مشاہدے کا فعل بجائے خود ذرے سے مداخلت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مقام و رفتار غیر یقینی رہتے ہیں۔

اب نیوٹن کے مشینی اصول کو لیجئے۔ اس کی رو سے اگر حال معلوم ہو تو مستقبل کا مکمل تعین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہائزن برگ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ حال کا تعین ہی ممکن نہیں، لہٰذا مستقبل غیر متعین ہے۔ یہ ہے اصولِ غیر تعیینیت۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے اور حسابی استدلالات کو نظر انداز کر دیا ہے، مگر اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ جبریت و مشینیت کے عقائد کی اساس باطل ہو چکی ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اقبال کو طبیعیات جدیدہ میں بعد کے ان انکشافات کا علم نہیں تھا چنانچہ انھوں نے اور طریقوں سے ان کی دلیلوں کو رد کرنا چاہا۔ ایغو کی آزادی کے متعلق وہ بالکل صحیح نتیجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شعوری عمل کی یہ آزادی قرآن کے اس تصور کی شرمندۂ تخلیق ہے جس میں ایغو کو آزاد گردانا گیا ہے:

وقل الحق من ربکم، فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر (۱۸/۲۹)

ایک اور مقام پر قرآن میں ہے:

ان احسنتم لانفسکم، وان اساتم فلھا (۱۷/۷)

اقبال لکھتے ہیں کہ "اسلام نفسیاتِ انسانی کی ایک اہم حقیقت کو تسلیم کرتا ہے، یعنی آزادانہ عمل کی قوت کا استعمال و عدم استعمال، اور اس آزادیٔ عمل کی قوت کو ایغو کی زندگی میں ایک مستقل اور غیر مختتم عنصر کی صورت میں برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ قرآن کے نزدیک نماز ایغو کو آزادی اور زندگی کے آخری سرچشمہ سے قریب لا کر اس میں حفظ و ثبات پیدا کرتی ہے اور روزانہ نماز کے اوقات میں یہ حکمت ہے کہ ایغو خواب اور کاروبار کے مشینی اثرات سے محفوظ ہو جائے۔ اسلام میں عبادت مشینیت سے آزادی کی طرف فرار کی صورت ہے۔"

اقبال آگے چل کر قرآن کے واقعہ ہبوطِ آدم سے استفادہ کرتے ہیں اور انسانی ایغو کی آزادی کے تصور کو اور وضاحت سے پیش کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اسرائیلی روایات کے برعکس ہبوط، قرآن کی رو سے، اخلاقی گناہ یا جرم کا نتیجہ نہیں۔ یہ دراصل انسان کا شعورِ محض سے شعورِ ذات کی طرف انتقال ہے۔ انسان گویا خواب سے بیدار ہو گیا اور اس نے آئینۂ ایام میں اپنی تصویر دیکھ کر اپنا مقام و منصب پہچان لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ نیکی کسی جبر و اکراہ کا نتیجہ نہیں، بلکہ نفسِ انسانی کی اخلاقی نصب العین سے متعلق یہ خود مختارانہ سپردگی ہے اور یہ آزاد ایغوؤں کے رضاکارانہ تعاون کا نتیجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی ہستی جس کا دائرۂ عمل مشین کی طرح متعین ہو خیر کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آزادیٔ عمل خیر کی ناگزیر شرط ہے۔ قرآن میں ہے:

ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ (۲۱/۳۵)

قرآن میں جہاں انسان کے "امانت" کو قبول کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں بھی واضح ترین اور ناقابلِ تردید ثبوت، ایغو کی آزادی کا ملتا ہے۔

اقبال تسلیم کرتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں صدیوں سے ذلیل ترین تقدیر پرستی کا دور دورہ ہے۔ وہ اس کے لئے ایک حد تک فلسفیانہ خیال آرائیوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں، ایک حد تک سیاسی مصلحتوں کو اور ایک حد تک اس حقیقت کو کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کے قلب میں جو شمع حیات روشن کی تھی اس کا نور بتدریج کم ہوتا گیا۔ قرآن کی تفسیر اس لئے کی گئی کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا مفاد پرستانہ نقطۂ نگاہ سے جواز ڈھونڈا جائے اور مظلومین کو اپنی تقدیر پر قناعت کرنی سکھائی جا سکے۔ اقبال ایسی مشابہت جدید فلسفہ میں بھی دیکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کیسے ہیگل اور آگسٹس کامٹ نے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کیلئے علمی جواز تلاش کیا۔ اقبال اس رسواکن نظریہ قسمت کی شدت سے تردید کرتے ہیں جو اہلِ یورپ اسلام سے منسوب کرتے ہیں۔ قرآن میں اس کیلئے کوئی سند نہیں۔ یہ اسلامی تعلیمات کی صریح تحریف ہے اور قرآنی آیات کی تلبیس۔ اس تلبیس و تحریف کو جاہل عوام پر مسلط کر دیا گیا ہے۔

اپنی شاعری میں بھی اقبال ایغو کی آزادی کا اعلان کرتے ہیں:

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں   نادان جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

سب سے زیادہ زوردار اشعار غالباً یہ ہیں:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے   خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں   تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اس وقت تک خطبات اقبال کے بعض مقامات کی مختصر تحلیل اور تشریح کرتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح قسمت اور تقدیر کے غلط تصور کی بنا پر مسلمانوں کے ذہن اور دل و دماغ پر پچھلی کئی صدیوں سے یاس و قنوطیت کا غلبہ رہا ہے اور اس تمام عرصے میں ان کی حالت ہمیشہ روبہ انحطاط رہی۔ تصوف کے علاوہ مسلم عوام اس معاملہ میں قدیم سائنس کے مادی اور میکانکی نظریوں سے بھی بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے گذشتہ چوتھائی صدی میں طبیعی سائنس کے بنیادی اصول میں انقلاب عظیم رونما ہوا جس نے

نیوٹن کی میکانکس پر کاری ضرب لگائی اور اسی کے ساتھ تعین اور مادیت کے اصول ختم ہو گئے۔ جرمنی کے مشہور پروفیسر ہائی زن برگ نے ۱۹۲۷ء میں ثابت کیا کہ قوانین قدرت "تعینی" (DETERMINI TIC) نہیں بلکہ "اوسطی" (STATISTICAL) ہیں۔ اسی نتیجہ نے اس اصول علیت (CAUSALITY) کا خاتمہ کر دیا جس کو کانٹ نے اقلیدس کے ہندسہ اور نیوٹن کی میکانکس کی بنا پر پیش کیا تھا اور جو حال تک فلسفہ اور سائنس کا بنیادی ستون مانا جاتا تھا۔ اب سائنس کا مروجہ اور مسلمہ قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر متعین نہیں ہے بلکہ وہ کئی ممکنہ حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے۔

اب اگر مادی دنیا کو تعینی یا جبری مانا جائے تو ظاہر ہے کہ انسانی ذہن کو بھی لازماً معین اور مجبور ماننا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی ذہن تو مختار رہے اور مادی دنیا جبری یعنی معین ہو کیونکہ انسان آزادی کے ساتھ دنیا کی حالت کو اس طرح بدل سکتا ہے کہ ہر قسم کی پیشین گوئی بے معنی ہو جائے۔ مثلاً اگر ہم آج یہ پیشین گوئی کریں کہ فلاں مقام پر ایک سال بعد موسم اس طرح کا ہوگا تو یہ ضروری ہے کہ اس مقام کے گرد و پیش کی فضا جس کی بنا پر ہم نے موسم کا اندازہ لگایا ہے ایک سال کے بعد بھی اسی حالت میں رہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اس مقام کے قریب جنگل کو کاٹ دے تو سال بھر بعد اس مقام پر موسم اس طرح کا نہیں ہوگا جس کی ہم نے پیشین گوئی کی ہے۔ اس لئے اگر انسانی ذہن کو مختار مان لیا جائے تو ناممکن ہو جاتا ہے کہ مادی دنیا کو جبری قرار دیا جائے۔

اس کے برعکس یہ بھی ناممکن ہے کہ مادی دنیا کو مختار مان لیں اور انسانی ذہن کو مقید کر دیں کیونکہ ذہن اپنے ارادہ سے جسم اور اشیا کی حرکتوں کو قابو میں رکھتا ہے۔ یہ تصور صریحاً مہمل ہوگا کہ جسم اور اشیا جو ذہن کے قابو میں رہتی ہیں وہ تو مختار اور آزاد ہوں اور خود ذہن جو ان اشیاء کو قابو میں رکھتا ہے مجبور اور مقید ہو جائے۔

اب ایک تیسری صورت یہ غور طلب رہ جاتی ہے کہ انسانی ذہن اور مادی اشیاء دونوں کو مجبور اور مقید سمجھ لیا جائے۔ چند سال قبل تک جبر اور مادیت کے قائل علماء کا خیال تھا کہ جو حرکتیں ہمارے ارادہ کے سبب سے واقع ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ دراصل دماغ کے ذروں کی حرکت کے تابع ہیں چنانچہ اس کیلئے انھوں نے ایک میکانکی دماغ کا تصور کیا جس کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نہ صرف ہماری ارادی حرکتیں بلکہ خود ارادہ کے محرکات اور ارادہ بھی معین ہیں۔ لیکن بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انسانی دماغ پر جس میں شعور بھی پایا جاتا ہے وہ طبیعی قوانین استعمال کئے جا سکتے ہیں جو بے جان مادہ کیلئے وضع کئے گئے ہیں تو پھر بھی یہ استدلال اب تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہائزن برگ کے عدم تعین کے اصول کی بنا پر خود مادی دنیا ہی میں جبر اور تعین کا وجود اب باقی نہیں رہا۔

غرضکہ سائنسی تجربوں، مشاہدوں اور نظریوں کے جدید ترین نتیجے تمام سربرآوردہ ماہرین سائنس کو اب اس نتیجہ کی طرف لا رہے ہیں کہ ہماری دنیا میں۔۔۔ میکانیت اور مادیت کا عقیدہ اب قابل قبول نہیں۔ ہمارے نیم تعلیم یافتہ افراد جب مغرب کے قدیم فلسفہ اور سائنس کے ان اصول کی بنا پر جو اب متروک ہو چکے ہیں اس زمانے میں مادیت اور الحاد کی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں جبکہ مغرب کے سائنسدان خود اس تحریک سے دست بردار ہو رہے ہیں تو مجھے ان کی حالت پر بے اختیار یہ مصرع یاد آ جاتا ہے:-

"میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا"

یہ چیز علامہ اقبال کو ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ تعلیم جو کہ قومی ترقی اور مرفہ حالی کا سرچشمہ ہونا چاہئے تھا وہ اس کے برعکس الحاد و بے دینی کا آلہ کار بن رہی ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کر رہی ہے:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم نے سمجھا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

"تخم دیگر بکف آریم و بکاریم زنو
کانچہ کشتیم زخجلت نتواں کرد درو"

دوسری طرف علامہ اقبال نے جب فلسفۂ عجم پر اپنا علمی مقالہ لکھا اور اس ضمن میں فارسی ادب اور تصوف کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب تقدیر اور قسمت کا وہ عجمی تصور ہے جو ہر کس و ناکس کے دل و دماغ پر مسلط ہے اور جو نفی خودی کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ تقدیر اور توکل کے غلط تصور نے مسلمانوں کی زندگی کو یاس اور قنوطیت سے مملو کر دیا اور ان کو بے عمل کا شکار بنا دیا۔ اس احساس کمتری اور بے عملی کو دفع کرنے کے لئے اقبال نے مسلمانوں کے روبرو خودی اور خود شناسی کا نیا تصور پیش کیا، اور ایک چوتھائی صدی تک مختلف طریقوں سے اس نکتہ کو بار بار دہراتے رہے تاکہ جوہر خودی سے بے خبر اور انسانیت کی حقیقی عظمت سے ناواقف مسلمان اپنی حقیقت کو پہچانیں اور اپنی شخصیت کی تربیت کر کے بعنوانِ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ معرفتِ رب حاصل کریں اور اس طرح نیابت الٰہی کے حقدار بن جائیں۔

اپنے خطبات کے علاوہ منظوم کلام میں بھی وہ جا بجا تقدیر کا صحیح مفہوم پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں انھیں رہ رہ کر یہ بات کھٹکتی ہے کہ لوگوں نے تقدیر کا مفہوم غلط سمجھا اور ابھی تک اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

ارضیاں نقد خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نشناختند

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ — نے خودی الٹے خدا را دیدۂ

قرآن کے متعلق جس کو معمولی سے معمولی واقفیت بھی ہو وہ جانتا ہے کہ اس میں نیک کام کے لئے جزا کے وعدے اور برے کام کے لئے سزا کی وعید کو بار بار دہرایا گیا ہے تاکہ یہ حقیقت ہر مسلم کے ذہن نشین ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ انسان جزا و سزا کا مستحق اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اپنے افعال کا ذمہ دار ہو۔ کسی سوئے ہوئے، بے ہوش یا فاتر العقل شخص سے کوئی فعل سرزد ہو جائے تو اس کو اس فعل کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا اور اسی لئے اس کو کسی جزا یا سزا کا مستحق نہیں ٹھیرایا جاتا۔ لیکن قرآن میں صریحی طور پر مرقوم ہے:۔

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔ لہا ما کسبت وعلیہا ما اکتسبت (۲/۲۸۶)

اللہ تکلیف نہیں دیتے کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں درج ہے :

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلھا ۔

یعنی اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال کی ذمہ داری انسان پر ہے اور اسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے چنانچہ قرآن میں کہا گیا ہے "من عمل صالحاً فلنفسہ" یعنی جس نے نیک کام کیا اپنی ذات کیلئے کیا۔ انسان کو انتخاب اور آزادی کا حق حاصل ہے اور اسی بنا پر حق تعالیٰ نے سورۂ محمد میں فرمایا ہے : نبلوکم حتی نعلم المجاھدین منکم ( ) یعنی ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ ان لوگوں کو جان لیں جو تم میں سے مجاہد ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کو انتخاب کا اختیار نہ ہوتا تو اس کی آزمائش کے کیا معنی ہوتے۔ اس نکتہ کو مولانا روم نے کافی وضاحت سے بیان کیا ہے :-

این کہ فردا آں کنم یا این کنم　　این دلیل اختیار است اے صنم
واں پشیمانی کہ خوردی از بدی　　ز اختیار خویش گردی مہتدی
جملہ قرآں امر و نہی است و وعید　　امر کردن سنگ مرمر را کہ دید؟
ہیچ دانا، ہیچ عاقل این کند؟　　با کلوخ و سنگ خشم و کیں کند؟
غیر حق را گر نہ باشد اختیار　　خشم چوں می آیدت بر جرم دار
ہیچ خشمے آیدت بر چوب سقف؟　　ہیچ اندر کیں او باشی تو وقف

انسان کے اختیار و آزادی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کو نیک عمل کی ترغیب دی گئی ہے اور برے کام کے نتیجوں سے ڈرایا گیا ہے۔ اگر انسان مجبور محض ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس وعدہ اور وعید کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ جبر میں اختیار کے اس پہلو کو اقبال نے مختلف پیرایوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں :-

ارضیاں نقد خودی در باختند　　نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بحرفے مضمر است　　تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو، نذر ہوا سازد ترا　　سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست　　قلزمی؟ پائندگی تقدیر تست

یعنی جو کچھ واقع ہو رہا ہے وہ ہماری فطرت، ہمارے اقتضا، ہماری قابلیت یا قرآنی اصطلاح میں ہماری "شاکلہ" کے مطابق واقع ہو رہا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے "قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ" جب انسان بدلتا ہے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ اگر تم خاک بن جاؤ تو تمہیں ہوا اڑالے جائیگی اور اگر تم سخت پتھر بن جاؤ تو تم سے شیشہ کو توڑنے کا کام لیا جائے گا۔ اگر تم شبنم ہو تو تمہاری تقدیر یہی ہے کہ عاجز اور افتادہ رہو لیکن اگر تم بحر ذخار بن جاؤ تو تمہیں پائندگی ملے گی۔ اسی نکتہ کی مزید توضیح اقبال کے ہاں گلشن راز جدید میں ملتی ہے :

چہ می پرسی چگون است و چگون نیست　　کہ تقدیر از نہاد او برون نیست

چہ گویم از چگون و بے چگونش　　بروں مجبور و مختار اندرونش
چنیں فرمودۂ سلطاں بدر است　　کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است
تو ہر مخلوق را مجبور گوئی　　اسیر بند نزد و دور گوئی
ولے جاں از دمِ جاں آفریں است　　بچندیں جلوہ ہا خلوت نشیں است
زجبرِ او حدیثے درمیاں نیست　　کہ جاں بے فطرت آزاد جاں نیست
شبیخوں برجہان کیف و کم زد　　زمجبوری بہ مختاری قدم زد

اقبال نے مسئلہ کے اس پہلو پر یعنی اختیار و آزادی کے پہلو پر بہت زیادہ زور دیا ہے کیونکہ انھوں نے قوم مسلم کی پچھلی تاریخ اور موجودہ حالت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ چند در چند وجوہات سے یہ قوم قسمت کے چکر میں پھنسی ہوئی قعر مذلت میں گرتی چلی جارہی ہے۔ مسلمانوں کی اس مصیبت کو اقبال نے انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا اور اضطراری طور پر بعض وقت، اس قسم کے شعر بھی کہہ گئے ہیں جو حد ادب سے باہر معلوم ہوتے ہیں:

خود را کنم سجودے دیر و حرم نماندہ　　ایں در عرب نماندہ آں در عجم نماندہ
یا در بیاضِ امکاں یک برگ سادہ نیست　　یا خامۂ قضا را تابِ رقم نماندہ

یعنی مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کی یکسانی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے امکانات ختم ہو چکے اور بیاضِ امکان میں کوئی سادہ ورق باقی نہیں رہا جس پر مزید کچھ لکھا جا سکے۔ یا (نعوذ باللہ) خامۂ قدرت میں اتنی طاقت باقی نہیں رہی کہ کوئی نئی چیز لکھ سکے یا نیا امکان پیدا کر سکے۔" ان کے قلب و دماغ کی یہ کیفیت محض عارضی ہوتی ہے۔ ایمان کی روشنی فوراً ہی انکی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور اس قسم کی آیتوں کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوتا ہے:

انما قولنا لشئ اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون[1] - (نحل - ۴۰)

ہمارا قول کسی چیز کے لئے جب ہم اس کا ارادہ کرتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں "ہو جا" پس وہ ہو جاتی ہے۔

اسی مطلب، کو اقبال اپنے اس شعر میں ادا کرتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

چند سال قبل اقبال کے تصور زمان و مکان پر میں نے جو مضمون لکھا تھا اس میں بتایا تھا کہ اقبال نے آیۂ کریمۂ کل یوم ھو فی شان" کا کیا مطلب لیا ہے۔ تخلیق کا عمل چونکہ مسلسل جاری ہے اس لئے اس کو استعمال کر کے اقبال تقدیر کے مسئلہ کو یوں حل کرتے ہیں:

اے کہ گوئی بودنی ایں بود شد　　کارہا پابند آئیں بود شد
معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ　　نے خودی را نے خدا را دیدۂ
مرد مومن با خدا دارد نیاز　　"با تو ما سازیم تو با ما بساز"

---

[1] میں حضرت عرشی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ان آیات کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔

عزم او خلاق تقدیر حق است
روز ہیجا تیر او تیر حق است

یہ آخری مصرع گویا بعینہ ترجمہ ہے اس آیۂ شریفہ کا کہ:۔

مارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ

اس مسئلہ پر جاوید نامہ میں اقبال نے مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے۔ قسمت کا رونا رونے والے مسلمانوں کی زبان سے تقدیر کے اٹل ہونے کو حکیم مریخ کے روبرو زندہ رود اس طرح پیش کرتا ہے۔

سائل و محروم تقدیر حق است
حاکم و محکوم تقدیر حق است

جز خدا کس خالق تقدیر نیست
چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

اس کے جواب میں حکیم مریخ نے تقدیر کی جو حقیقت بیان کی ہے وہ اس ساری بحث کی جان ہے۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر
خواہ از حق حکم تقدیر دگر

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست
زاں کہ تقدیرات حق لاانتہاست

ارضیاں نقد خودی در باختند
نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بہ حرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو، نذر ہوا سازد ترا
سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا

تا بخود نا ساختن ایمان تست
عالم افکار تو زندان تست

رنج بے گنج است تقدیر ایں چنیں
گنج بے رنج است تقدیر ایں چنیں

اصل دیں ایں است اگر اے بے خبر
می شود محتاج از و محتاج تر

وائے ایں دینے کہ خواب آرد ترا
باز در خواب گراں دارد ترا

سحر و افسون است یا دین است ایں؟
حب افیون است یا دین است ایں؟

پھر اقبال بتاتے ہیں کہ جب انسان نقش حق اختیار کر لیتا ہے تو ساری دنیا اس کے تابع اور تقدیر اس کی تدبیر کے ساتھ ہم رکاب ہو جاتی ہے۔ جس شخص میں قوت تخلیق نہ ہو حق تعالیٰ کے نزدیک وہ کافر و زندیق سے بڑھ کر نہیں۔ جمال حق سے نہ تو وہ بہرہ ور ہوتا ہے اور نہ اس کی زندگی کا کوئی نتیجہ اسے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی دنیا کی تقدیر آپ خود بنائے؛

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست

از جمال ما نصیب خود نہ برد
از نخیل زندگانی بر نخورد

مرد حق! برندہ چوں شمشیر باش
خود جہان خویش را تقدیر باش!

متاخرین مسلمانوں میں جوں جوں تن آسانی اور کاہلی کا روگ سرایت کرتا گیا وہ قسمت اور تقدیر کا غلط مطلب لیکر قوت عمل سے محروم ہوتے

چلے گئے اور اس کو صبر و توکل، تسلیم و رضا کے شاندار الفاظ سے بیان کرنے لگے۔ اقبال نے سمجھایا کہ تسلیم و رضا کے یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ ان سے کاہلی اور بے رنگی نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ وہ تو قوائے عمل کے لئے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ صحاح ستہ میں ایک حدیث نبوی مرقوم ہے جس سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا[1]

یارسول اللہ ارایت ما نعمل فیہ علی امر قد فرغ منہ او امر نبتدا۔ فقال علی امر قد فرغ منہ۔ فقال عمر افلا نتوکل وندع العمل۔ فقال اعملوا فکل میسر لما خُلق لہ

یعنی یا رسول اللہ جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اس کو شروع کیا ہے فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ عمرؓ نے کہا تو پھر کیا ہمیں توکل نہیں کرنا چاہئے اور ترک عمل نہیں کرنا چاہیے۔ رسول اللہ نے فرمایا کام کئے جاؤ۔ ہر شخص کیلئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

کتنی بلیغ حکمت ہے اور عمل کی کیسی اچھی ترغیب۔ اسی مطلب کو اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:۔

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا — پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا — ہر لحظہ ہے دانہ کو جنوں نشو و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند — مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
جراٴت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے — اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

جو لوگ اپنے کئے کی سزا بھگتنے سے بچنے کیلئے تقدیر اور قسمت کا حیلہ ڈھونڈتے ہیں ان کی حالت کو اقبال نے ضرب کلیم میں خدا اور ابلیس کے مکالمہ کے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے بعد ابلیس بارگاہ خداوندی میں یہ عذر داری پیش کرتا ہے کہ اے خدا میں مجبور و معذور ہوں۔ خود تیری مشیت ہی میں میرا انکار مقدر کر دیا گیا تھا اسلئے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ حق تعالیٰ ابلیس سے دریافت فرماتے ہیں کہ تجھ پر مشیت کا یہ بھید کب کھلا، انکار سے پہلے یا بعد۔ تو ابلیس جواب دیتا ہے کہ یہ راز مجھ پر انکار کے بعد فاش ہوا۔ پھر حق تعالیٰ فرشتوں سے مخاطب ہو کر ارشاد فرماتے ہیں:

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے — کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے جبر و قدر کے مسئلہ میں اختیار کے پہلو پر اقبال نے بوجوہاتِ چند بہت زیادہ زور دیا ہے لیکن ان کی نگاہ سے اس مسئلہ کا دوسرا پہلو کبھی مخفی نہیں رہا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ایک مومن کے لئے صحیح راستہ جبر و قدر کے درمیان ہے اور اپنے مندرجہ ذیل شعر میں انھوں نے اس مطلب کے مطابق حدیث نبوی کا حوالہ بھی دیا ہے:

چنیں فرمودۂ سلطان بدر است — کہ ایماں درمیانِ جبر و قدر است

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر ولی الدین۔ مجلۂ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ جلد ہفتم ۱۹۴۳ء اس مضمون میں جن حدیثوں اور شیخ اکبر کے جن مقولوں کو درج کیا گیا ہے وہ اسی مقالہ سے ماخوذ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن کریم میں اس مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کے مطابق آیات ملتی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم نے اب تک بہت سی آیات درج کی ہیں جو انسان کے اپنے اعمال کی ذمہ داری کو پیش کرتی ہیں اور اس طرح اس کے اختیار اور آزادی پر دلالت کرتی ہیں۔

اب ہم چند آیتیں درج کریں گے جو مسئلہ کے دوسرے پہلو یعنی جبر کے پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سورۃ القمر میں فرمایا گیا ہے:۔

انا کل شئ خلقنٰہ بقدر۔ وما امرنا الا واحدۃ کلمح بالبصر۔ (۴۹-۵۰/۵۴)

ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ کے موافق پیدا کیا ہے اور ہمارا حکم ایک تھا پلک جھپکنے کے مانند تیز۔

ایک آیت کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے:

وکل شئ فعلوہ فی الزبر۔ وکل صغیر وکبیر مستطر (۵۲-۵۳/۵۴)

جو کچھ انھوں نے کیا ورقوں میں درج ہے۔ اور ہر چھوٹا اور بڑا عمل لکھا جا رہا ہے۔

ایک آیت تو اس معاملہ میں اس قدر واضح ہے کہ اس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ہماری ذات بلکہ ہمارے اعمال بھی حق تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں:

واللہ خلقکم وما تعملون (۹۶/۳۷)

اللہ نے پیدا کیا تم کو اور جو تم کرتے ہو۔

صحاح میں بھی بعض حدیثیں درج ہیں جو اس مطلب کے موافق ہیں:

لا یومن احدکم حتی یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ۔

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہ تسلیم نہ کرے کہ خیر و شر کی تقدیر حق تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

مشکوٰۃ میں حدیث بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا:

ارایت رقیً نسترقیہا ودواء نتداوی بہ ھل یرد من قدر اللہ تعالیٰ، فقال انہ من قدر اللہ۔

جو فعل کہ ہم کرتے ہیں اور جو دوائیں کہ استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں۔ فرمایا کہ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال نے مسئلہ کے اس پہلو کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

می شناسی طبع ادراک از کجا ست؟ حورے اندر بنگہ خاک از کجا ست؟
طاقتِ فکرِ حکیماں از کجا ست؟ قوتِ ذکرِ کلیماں از کجا ست؟
ایں دل وایں واردات از کیست؟ ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست
ایں ہمہ فیض از بہار فطرت است فطرت از پروردگار فطرت است

اس تمام تفصیل سے ظاہر ہے کہ خدا کے "خالق کل شئ" ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور "شئ" میں انسانی اعمال بھی شامل ہیں۔

یہاں ایک قسم کا تضاد محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف تو کہا جاتا ہے:۔

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم۔ (

تم پر جو کچھ افتاد پڑی ہوئی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہے۔

اس سے انسان کے اختیار اور اس کی ذمہ داری کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری طرف ارشاد ہوتا ہے:

واللہ خلقکم وما تعملون (۹۶/۳۷)

اللہ نے تم کو پیدا کیا اور تم جو کچھ کرتے ہو۔ (یہ جبر کا پہلو ہے)

جبر و قدر کا یہی ظاہری تضاد ہے جو اکثر لوگوں کو الجھن میں ڈالتا ہے۔ الاماشاءاللہ۔ اقبال نے بھی اس تضاد کو مختلف مقامات پر شدومد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مسئلہ زیر بحث کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ اس ظاہری تضاد میں توافق اور ہم آہنگی ثابت کی جائے اور وہ بھی محض جذباتی یا شاعرانہ طرز میں نہیں بلکہ منطقی تحلیل و دلائل کے ساتھ تاکہ لوگوں کی ذہنی اور قلبی الجھن دور ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اس مسئلہ کی تحلیل اور تاویل کے متعلق طرز استدلال سے واقف ضرور ہیں لیکن اپنے قارئین کو اپنے ساتھ لے جانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ جیسا کہ اور دوسرے اہم مسئلوں کے متعلق ان کی عادت ہے۔ خطبات میں ایک نہایت مختصر لیکن بلیغ اشارہ کرتے ہیں اور گذر جاتے ہیں:

AS THE QURAN SAYS :- GOD CREATED ALL THINGS, AND ASSIGNED TO EACH ITS DESTINY. THE DESTINY OF A THING, THEN IS NOT AN UNRELENTING FATE WORKING FROM WITHOUT LIKE A TASK MASTER, IT IS THE INWARD REACH OF A THING, ITS REALISABLE POSSIBILITIES WHICH LIE WITHIN THE DEPTHS OF ITS NATURE AND SOCIALLY ACKNOLIGE THEMSELVES WITHOUT ANY FEELING OF EXTERNAL COMPULSION.

یعنی "جیسا کہ قرآن کریم میں درج ہے" خلق کل شئ وقدرہ تقدیرا۔ تقدیر کوئی قوت قاہرہ نہیں ہے جو خارج سے کسی شے پر جبر کر رہی ہو۔ بلکہ وہ خود شے کی باطنی رسائی ہے اور اس کے وہ قابل تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں مضمر ہیں اور بغیر کسی خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔"

چونکہ یہ خطبات ایک محدود وقت میں سامعین کے روبرو پڑھے جانے کیلئے لکھے گئے تھے اسلئے ظاہر ہے کہ ان میں دلائل اور تفصیلات پیش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ کی وسعت نظر اور پختگی فہم نے بہت ممکن ہے ان چند اشاروں کو کافی سمجھا، یا جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے:

وقت برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام خود تو بگو کجا برم، ہم نفسان خام را

عمداً تفصیل و تشریح سے احتراز کیا گیا ہو۔ بہرحال کوئی وجہ ہو ان کے تمام خطبات اور سارے منظوم کلام کو پڑھنے کے بعد بھی وہی الجھن

رہتی ہے اور تضاد رفع نہیں ہوتا اور پڑھنے والا انہی کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر

لیکن دوسرے مفکرینِ اسلام مثلاً شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اس اہم مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے اور ایک خاص طرز استدلال سے جو علم کلام میں کافی مشہور و معروف ہے اس تضاد کو دور اور الجھن کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور راقم الحروف کے خیال میں یہ کوشش ایک حد تک کامیاب بھی ہے بشرطیکہ ان تنقیحات کو تسلیم کر لیا جائے جو استدلال کے شروع میں بطور اصول مسلمہ (Axioms) پیش کئے گئے ہیں اور جن پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہمیشہ سے موجود اور عالم مطلق ہیں۔ یہ ہمارا بنیادی اصول مسلمہ ہے جس پر سارا استدلال مبنی ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے اقلیدس کا اصول موضوعہ۔ یہ ایمان کا معاملہ ہے۔ جو لوگ اس بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے ان کا راستہ یہیں ہم سے جدا ہو جاتا ہے۔ یہاں صرف انہی لوگوں سے خطاب ہے جو خدا کے وجود اور علم پر ایمان رکھتے ہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ عالم ہیں ان کے علم کیلئے 'معلوم' کی ضرورت ہے۔ یہ معلومات خود حق تعالیٰ کے اپنے ہی افکار و تصورات ہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ ازل ہی سے عالم مطلق ہیں۔ اور علم بغیر معلومات کے کسی وقت بھی ناممکن ہے اسلئے معلومات حق بھی ازلی ہیں۔

علم حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ کسی وقت بھی یہ صفت ان سے معدوم نہیں سمجھی جا سکتی ورنہ حق تعالیٰ کیلئے کسی خاص لمحہ (نعوذ باللہ) جہل لازم آئیگا جو قطعاً ناقابل تصور ہے۔ ان قضایا کی بنا پر ہم اس ناگزیر نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ حق تعالیٰ ازل سے ہیں اور ان کا علم بھی ازلی ہے اس لئے معلومات حق بھی ازلی اور غیر مخلوق ہیں۔ یہ پہلا بنیادی نتیجہ ہے جس کو آئندہ استدلال میں استعمال کیا جائے گا۔ معلوماتِ حق کو علم کلام میں "اعیان ثابتہ"، 'صور علمیہ' یا 'حقائق الممکنات' بھی کہا جاتا ہے۔

ہمارا اس پر بھی ایمان ہے کہ حق تعالیٰ کی تمام صفات کامل ہیں۔ ان میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا کیونکہ تغیر کا لازمی نتیجہ کمی و بیشی کا امکان ہے جو نقص کی دلیل ہے حالانکہ حق تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی قسم کا کوئی نقص ممکن نہیں ہے۔ یہ ہمارا دوسرا مسلمہ اصول (Axiom) ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ کی تمام صفات کامل اور غیر متغیر ہیں اس لئے ان کا علم بھی کامل اور غیر متغیر ہے۔ اسلئے معلومات حق یا اعیان ثابتہ بھی کامل اور غیر متغیر ہیں۔

یہ دوسرا بنیادی نتیجہ ہے جو حاصل ہوتا ہے اور جس کو آئندہ استعمال کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا دونوں نتائج ہمیں بتاتے ہیں کہ معلومات حق یا اعیان ثابتہ (۱) ازلی ہیں اور (۲) غیر متغیر ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ کسی معلوم حق یا عین ثابت کی فطرت اور قابلیت ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی، کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اسلئے مذکورۂ بالا دونوں نتیجوں سے یہ ذیلی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اعیان ثابتہ کی اقتضاآت اور قابلیت بھی ازلی اور غیر متغیر ہیں۔ عین ثابت کی اسی فطرت اور قابلیت کو قرآنی اصطلاح میں "شاکلہ" کہا جاتا ہے یعنی چونکہ اعیان ثابتہ خود مخلوق (حادث) اور تبدیلی پذیر نہیں ہیں۔ اسلئے ان کی اقتضاآت اور قابلیات بھی مخلوق اور متغیر نہیں ہو سکتیں۔

اب عمل تخلیق پر غور کیجئے۔ تخلیق کہتے ہیں معلومات یا تصوراتِ الٰہی کے خارج میں ظہور کو۔ اعیانِ ثابتہ علم الٰہی میں ازل سے موجود ہیں اور جب یہ خارج میں منکشف یا ظاہر ہوتے ہیں تو پھر "اشیاء" کہلاتے ہیں۔ اشیاء دراصل معلومات الٰہی ہیں اور اسلئے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کسی شے کا اقتضا قابلیت یا فطرت بھی ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ 'ماہیت شے' کی تخلیق نہیں ہو رہی ہے، وہ ازل ہی سے موجود ہے۔ 'شے' کی تخلیق البتہ ہو رہی ہے

یعنی خارج میں اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ جبریت کے ماننے والوں کو بس اسی مقام کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اور یہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً اس طرح کا استدلال کرتے ہیں: "فلاں شخص نے گناہ کیا اسلئے کہ اس کی فطرت بری تھی۔ فطرت حق تعالیٰ نے بنائی ہے۔ اس لئے یہ شخص اپنے اعمال بد کا ذمہ دار نہیں ہے۔" یہاں صغریٰ کبریٰ ہی غلط ہیں۔ فطرت حق تعالیٰ نے نہیں بنائی ہے۔ وہ ازل ہی سے موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے اس فطرت کے مطابق اس کو خارج میں ظاہر کیا ہے یعنی اس شخص کو پیدا کیا ہے۔ تمہارا یہ شکوہ عبث ہے کہ "مجھے ایسا کیوں بنایا گیا؟" تمہیں 'ایسا' نہیں بنایا گیا۔ تم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ تمہارے اقتضاآت اور امکانات تمہارے اپنے ہیں اور اسی لئے تم کو اپنے اعمال میں مختار اور ان کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ 'اختیار' کا پہلو ہے۔ ان امکانات کو متشکل کرنا اور خارج میں ظاہر کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے ہے یہ 'جبر' کا پہلو ہے۔ اس طرح یہ دونوں پہلو اپنے اپنے مقام پر صحیح ہیں۔ عالم اسلامی کے بلند پایہ مفکر اور صوفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے اس حقیقت کو صاف طور پر ایک جملہ میں بیان کیا ہے:-

لا یمکن بعین ان یظہر فی الوجود ذاتاً، صفتاً و فعلاً الا بقدر خصوصیتہ واھلیتہ واستعدادہ الذاتی۔

کسی عین ثابت کیلئے خارج میں ذاتاً صفتاً یا فعلاً ظاہر ہونا سوائے اس صورت کے ممکن نہیں کہ وہ اپنی خصوصیت اہلیت و ذاتی استعداد کے مطابق ظاہر ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جبر اور اختیار میں ظاہری تضاد رفع ہو جاتا ہے۔ ہر شے کی تخلیق کا عمل حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے لیکن یہ تخلیق اس شے کی اقتضا یا فطرت کے مطابق ہو رہی ہے اور یہ اقتضا یا فطرت ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ یہیں سے جبری اختیار کا پہلو نکلتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

اٰتاکم من کل ما سالتموہ (۱۴/۳۴)

وہ سب کچھ اس نے تم کو دیا جس کو تم (تمہارے عین) نے (لسانِ استعداد سے) مانگا۔

ایک اور موقع پر بھی اسی طرح ارشاد ہوا ہے:

انا لموفوھم نصیبھم غیر منقوص۔ (۱۱/۱۰۹)

ہم ان کا پورا حصہ ان کو بغیر نقصان کے دیتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے اعمال کی تخلیق حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے لیکن یہ تخلیق ہماری فطرت یا اقتضا کے بالکل مطابق ہو رہی ہے۔ چونکہ کوئی شے ہماری فطرت کے خلاف ہم پر عائد نہیں کی جا رہی ہے اسلئے ہم حقیقی معنوں میں آزاد ہیں جیسا کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے کہا ہے:

ما یحکم علینا الا بنا، بل نحن نحکم علینا بنا

یعنی جو حکم ہم پر لگایا جا رہا ہے وہ ہماری فطرت کے عین مطابق ہے۔ بلکہ ہم خود اپنے ہی اقتضا کے مطابق حکم لگا رہے ہیں۔

اسی لئے کہا گیا ہے:-

القدر انت والحکم لک

مولانا جامیؒ نے اس حقیقت کو ایک دو رباعیوں میں بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں:-

اے عین تو نسخۂ کتاب اول　　مشروع دراں صحیفۂ اسرار ازل
احکام قضا چہ بود دروے درج　　حق کردیا حکام کتاب تو عمل

یعنی ہر شخص کا عین گویا ایک کتاب ہے جس میں اس کی تمام خصوصیات اور اقتضائات درج ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جو تخلیق ہو رہی ہے وہ ان اندراجات کے بالکل مطابق ہو رہی ہے۔

صاحب گلشن راز نے خود حق تعالیٰ کی زبانی اسی مطلب کو یوں ادا کروایا ہے:۔

ہرچہ آں این و ہرچہ شین شماست　　بر سر مقتضائے عین شماست
ہرچہ عین شما تقاضا کرد　　جود فیض من آں ہویدا کرد

اس تفصیل و تشریح کے بعد اب مسئلہ صاف ہو جاتا ہے اور اقبال کے اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے اس کو اور زیادہ واضح طور پر بیان کیا ہے:

ان الحق لا یعطیہ الا ما اعطاہ عینہ

حق تعالیٰ شے کو وہی عطا کرتے ہیں جو اس کا 'عین' اسے دیتا ہے۔

غرض جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؓ نے فرمایا ہے:۔

لا جبر و لا قدر، بل الامر بین الامرین

نہ محض جبر ہے نہ محض قدر بلکہ حقیقت دونوں کے درمیان ہے۔

یہی اس مسئلہ کا صحیح حل ہے۔ جو لوگ اس نکتہ کو سمجھ جاتے ہیں وہ اپنے لئے جبر میں اختیار پیدا کر لیتے ہیں اور اس سے وہ قوت اور طاقت حاصل کرتے ہیں جو انہیں کمال کے بلند ترین مدارج تک لے جاتی ہے۔ جو اس راز کو نہیں پاتے اور جبر کو اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں انہیں سوائے تباہی اور ہلاکت کے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

قاضی محمود بحری کے یہ اشعار اسی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں:

جبر باشد پر و بال کاملاں　　جبر ہم زندان و بند جاہلاں
بال بازاں را سوئے سلطاں برد　　بال زاغاں را بگورستاں برد

اور انہیں معنوں میں اقبال نے اپنے ان اشعار کو استعمال کیا ہے:

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ　　لرزد از نیروئے او ابلیس و مرگ
جبر دین مرد صاحب ہمت است　　جبر مرداں از کمال قوت است
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر　　جبر مرد خام را آغوش قبر

جبر خالد عالمے برہم زند ٭ جبر ما بیخ دہن ما برکند

اس لئے ہمارا طرزِ عمل ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم تقدیر کو زنجیر بنالیں بلکہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب ہم آگے بڑھنے کی ہمت کرتے ہیں تو نئے نئے راستے کھلتے جاتے ہیں اور کائنات کی ساری وسعت ہماری جولانگاہ بن جاتی ہے۔

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر ٭ تہ ایں گنبد گردوں رہے ہست
اگر باور نداری خیز و دریاب ٭ کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست (اقبال)

(ہمارے فاضل دوست، محترم صدیقی صاحب نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ علامہ اقبال نے جبر و قدر کے مسئلہ کو نظریۂ زمان (TIME) کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن، جیسا کہ صدیقی صاحب نے فرمایا ہے" ان کے خطبات محتاج تشریح ہیں۔

محترم صدیقی صاحب نے قدیم علم الکلام سے ابن عربی کو پیش کیا ہے۔ لیکن، جیسا کہ فاضل مقالہ نگار خود جانتے ہیں، ابن عربی کے تصورات "اعیانِ ثابتہ" اور "صورِ علمیہ" نوفلاطونیت کا "عربک ایڈیشن" ہیں۔ اور اب فلسفہ میں خود نوفلاطونیت بھی عہد کہن کا افسانہ بنتی چلی جارہی ہے۔

قرآن کی رو سے، انسان کے سامنے متبادل راستے (ALTER, VATIUES) یا امکانات (POSSIBILITIES) پیش ہوتی ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ وھدینٰہ النجدین (ہم نے اس کے سامنے دو راستے واضح کر کے رکھ دیئے) تو اس سے یہی مفہوم ہے یہ ظاہر ہے کہ متبادل راستے یا امکانات صرف اسی کے سامنے رکھے جا سکتے ہیں جسے ان میں انتخاب کا حق حاصل ہو۔ اپنے لئے دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا، اسی کا نام اختیار ہے۔ ومن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر (جو چاہے ایمان کی راہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ پر چل نکلے)۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہر راہ کی ایک متعین منزل (DESTINATION) ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ اٹل اور پہلے سے طے شدہ ہے۔ اس میں کوئی انسان رد و بدل نہیں کر سکتا۔ یہاں انسان مجبور ہوتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ فرد اسی حد تک صاحب اختیار ہوتا ہے جس حد تک اس کا معاشرہ اس کی اختیاری صلاحیتوں کو برومند ہونے دے۔ تو یہ مسئلہ اجتماعیات سے متعلق ہے جس کی تشریح کا یہ مقام نہیں۔ قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس میں ہر فرد کی اختیاری قوتوں کو کامل طور پر برومند ہونے اور بروئے کار آنے کے پورے پورے مواقع میسر ہوں۔ طلوع اسلام)

جمع قرآن

عجمی عناصر نے اسلام کے خلاف جو مہیب سازش کی تھی اس کا بنیادی پتھر یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں قرآن کی حفاظت کے متعلق شکوک پیدا کر دیئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایسی ایسی روایات وضع کیں جن سے انسان خواہ مخواہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت قرآن کریم مرتب شکل میں کہیں موجود نہ تھا۔ یونہی منتشر بکھرا ہوا ادھر اُدھر پڑا تھا۔ بعد میں صحابہ نے اسے یکجا کیا۔ لیکن اس طرح بھی جو مجموعہ مرتب ہوا اس میں بھی کئی ایک اختلافات تھے۔ کہیں قرأت کے اختلاف، کہیں خود آیات کے۔ کوئی صحابی اسے کسی طرح پڑھتے تھے کوئی کسی طرح۔ ایک کے نزدیک کسی آیت کی شکل ایک طرح تھی، دوسرے کے نزدیک دوسری طرح۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے از سر نو قرآن کو جمع کیا اور اس نسخے کو مرتب کر کے باقی تمام صحف کو جلا دیا۔ چنانچہ ان روایات کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم تو ایک طرف، خود مسلمانوں کی طرف سے بھی یہ آوازیں اٹھتی رہتی ہیں کہ اس بات کا ثبوت نہیں مل سکتا کہ جو قرآن آج ہمارے پاس ہے وہ من وعن وہی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ جب خود قرآن کے متعلق اس قسم کے شبہات دل میں پیدا ہونے شروع ہو جائیں تو دین اسلام کی ساری عمارت منہدم ہو کر نیچے آ گرتی ہے۔ عجم اپنی اس سازش میں بڑا کامیاب رہا ہے۔

اس سازش کا پردہ چاک کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ان روایات کی تنقیدی تحقیق کی جائے جو جمع قرآن کے متعلق اس قسم کا تصور پیش کرتی ہیں۔ یہ کام بڑا اہم اور بڑی دقتِ نظر کا متقاضی ہے۔ لیکن اللہ کا احسان ہے کہ ہمارے دور میں ایک ایسی ہستی موجود ہے جس نے مدت العمر کے تفحص و تجسس کے بعد اس فن میں نمایاں خصوصیت حاصل کر لی ہے۔ یہ ہیں علامہ تمنا عمادی، جن سے قارئین طلوع اسلام بخوبی متعارف ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے ان تمام روایات پر محققانہ تنقید کے بعد بتایا ہے کہ یہ سب روایات غیر معتبر اور ظنی ہیں اور خالص عجمی ٹکسالوں کی وضع کردہ۔ ان کا یہ مقالہ ایک اچھی خاصی تصنیف کی شکل اختیار کر گیا۔ چنانچہ جب اس کی اشاعت کا سوال پیدا ہوا تو ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر جب اسکی کتابت کرائی گئی تو یہ طلوع اسلام کے ۱۰۴ صفحات پر پھیل گیا۔ طلوع اسلام کیلئے یہ مشکل تھا کہ اس کی ایک اشاعت اس ضخامت کی متحمل ہو سکے۔ چنانچہ بصد غور وخوض، فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ (اس سے الگ دیگر عنوانات پر مشتمل) ضروری مقالات شامل کر کے دو مہینوں کا طلوع اسلام یکجا شائع کر دیا جائے۔ یہ مشترکہ پرچہ یکم اگست کو شائع ہوگا اور اگست اور ستمبر کا مشترکہ پرچہ شمار کیا جائیگا۔ اس کی قیمت سوا روپیہ ہوگی۔ اس مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پرچہ کی کچھ زائد کاپیاں چھپوالی جائیں گی۔ اسلئے جو قلمین یا احباب صاحبان اس کے زائد نسخے منگانا چاہیں وہ ہمیں قبل از وقت اطلاع دیدیں۔ اس پرچے کے ختم ہو جانے کے بعد اس قسم کی نادر تصنیف، کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکیگی۔ ہمارا خیال ہے کہ جمع قرآن سے متعلق لٹریچر میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ بڑی دلچسپ۔ بڑی محققانہ۔ اور بڑی مفید۔

قحط الرّجال

چھپے ہوئے کوئی خاص بندے جو ہوں تو مجھ کو خبر نہیں ہے
جو منظرِ عام پر ہیں ان میں کوئی بھی صاحب نظر نہیں ہے

ہے اور شئے علم و قابلیت، ہے دل پہ موقوف آدمیّت
جو ہو گمانِ فسادِ نیت تو عقل بھی معتبر نہیں ہے

جو راہرو بھول جائے رستہ تو ہے بس اک فرد کا بھٹکنا
سبب ہے لاکھوں کی گمرہی کا جو راہبر راہ پر نہیں ہے

فقط شبِ تار کے سہارے چمک رہے ہیں فلک پہ تارے
وہ ایسے تاروں پہ جان وارے جسے امیدِ سحر نہیں ہے

ہماری اصلاح انفرادی اثر مکمّل نہیں دکھاتی
کہ اپنی تنظیمِ اجتماعی اصولِ اسلام پر نہیں ہے

جو ہم کوئی مسئلہ بھی سوچیں تو جمع کرتے ہیں سب کتابیں
ہے صرف قرآن ہی جہاں میں جو اپنے پیش نظر نہیں ہے

اسدؔ ملتانی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

گذشتہ سال کے آخر میں جبکہ بڑھتے ہوئے مالی خسارہ کے پیش نظر طلوع اسلام کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو معارف القرآن (جلد سوم اور جلد چہارم) کی قیمت میں تین ماہ کے لئے رعایت کردی گئی تھی تاکہ خسارہ کی تلافی کی کچھ شکل پیدا ہو جائے۔ اس رعایت سے قارئینِ طلوعِ اسلام نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کے باوجود بہت سے حضرات بروقت کتابیں حاصل نہ کرسکے۔ چنانچہ ان کا اس وقت سے یہی تقاضا چلا آرہا ہے کہ انھیں کتابیں رعایتی قیمت پر دی جائیں۔ یہ تقاضے اب ایسے شدید ہوگئے ہیں کہ ادارہ کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں رہا سوائے اس کے کہ ان کے سامنے سپر ڈال دی جائے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

کی قیمت میں پھر

تین۳ ماہ کیلئے رعایت

کردی جائے۔ یہ رعایت ۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر تک رہے گی۔

اس دوران میں معراج انسانیت

بیس۲۰ روپے کی بجائے بارہ۱۲ روپے میں مہیا کی جائیگی

محصولڈاک -/۲/۱ روپے بذمہ خریدار ــــ دوکانداروں سے بھی یہی قیمت لی جائیگی ان کے ساتھ مزید کوئی رعایت نہ ہوگی ــــ معارف القرآن جلد سوم (تاریخِ رسالت) ختم ہوچکی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام کراچی

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعے سے نئی زبان سکھاتا ہے۔

زبان وہ سیکھئے جو اہلِ زبان بولتے ہیں



نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کیلئے ضروری ہے آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب ولہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں۔ لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری طرح اور بغیر محنت وکوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کیلئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سن کر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقہ تعلیم میں درس وتدریس کے منجمد قواعد وضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھدیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں، یا سیرگاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائیں گے۔ زبان سیکھنے کیلئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈالدیجئے فوراً تفصیلی جواب دیا جائے گا۔

زبان سیکھنے کے لئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی . . . .
عربی	بنگالی	ہندوستانی . . . .
فرانسیسی	روسی	چینی . . . .
اسپینش	اطالوی	ڈچ . . . .
سویڈش	نارویجن	فنش . . . .
زیچ	پولش	لاطینی . . . .
یونانی	ایفک	ملائے . . . .
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی . . . .
جرمن	ترکی	پرتگالی . . . .

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے۔

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض . . . .

نام . . . .

پتہ . . . .

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ۔ کراچی

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جس میں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے / نہیں ہے

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road
KARACHI

BRANCHES :—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY.

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for :—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London.—
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil

High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'





BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : " BENGALI "

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone: Office : 3336 | Mills : 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, ...son Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road Karachi.

طلوعِ اسلام

اگست و ستمبر
۱۹۵۲ء

مقالہ خصوصی

جمع قرآن

(صفحات ۲۷ تا ۱۲۹)

1/4/-

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو، اور

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کرلیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خریدکردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجیے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

پرچون کے لئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

3336

2008

ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

Printed at Adbi Press,
Robeson Road Karachi.

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

اس پرچہ کی قیمت	مُرتّب	بدل اشتراک
ایک روپیہ چار آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
ایک روپیہ آٹھ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵ — اگست و ستمبر ۱۹۵۲ء — نمبر ۷ و ۸

فہرست مضامین

یہ ہمارا خواب تھا

(۱) حضرت عمرؓ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے لئے ذرا دیر سے نکلے۔ منبر پر چڑھے تو لوگوں سے معذرت کی کہ اس تاخیر کا باعث ان کا کُرتا ہے۔ انھوں نے اسے دھوکر سکھانے کے لئے ڈال رکھا تھا اور اس کے سوکھنے میں دیر ہوگئی۔ یہ اس لئے کہ آپ بیت المال سے صرف ایک چادر اور ایک کُرتا لیا کرتے تھے۔

٭

(۲) حضرت عمرؓ اپنے اہل وعیال کے اخراجات کے لئے صرف دو درہم روزانہ بیت المال سے لیا کرتے تھے۔ یہ ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کے برابر تھا۔

٭

(۳) بیت المال میں کہیں سے مشک آئی۔ حضرت عمرؓ کی بیوی نے کہا کہ لائیے اسے ترازو سے تول دوں۔ فرمایا۔ ہاں! اسے تم ترازو میں تولوگی اور جو مشک پلڑے میں لگی رہ جائے گی اسے اپنے کپڑوں سے مل لوگی۔ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ عمرؓ کا نہیں کہ یوں اپنے صرف میں لے آؤ!

٭

(۴) حضرت عمرؓ کسی مقدمہ میں بطور مدعا علیہ حضرت زیدؓ (قاضی مدینہ) کی عدالت میں گئے تو حضرت زیدؓ تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے انھیں ڈانٹا کہ عدالت کی نگاہ میں عمرؓ اور مدعی یکساں ہونے چاہئیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کا جذبہ غیر شعوری طور پر عدل میں مانع ہوجائے۔

یہ خواب کی تعبیر ہے

(۱) جب ہشام بن عبدالملک (خلیفۃ المسلمین) حج کے لئے آیا تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے پہننے کے کپڑے ساتھ تھے۔

✣

(۲) مامون الرشید (خلیفۃ المسلمین) کے دسترخوان کا روزانہ خرچ دس ہزار درہم تھا۔

✣

(۳) ولید (خلیفۃ المسلمین) نے اشعب مسخرے کو بلایا۔ اسے بندر کی کھال پہن کر ناچنے کو کہا۔ اس نے اس طرح ناچ ناچا اور گایا تو ولید نے خوش ہو کر ہزار درہم انعام میں بخش دیئے!

✣

(۴) بغداد کے قاضی حفص نے ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ کے کارندے کے خلاف ڈگری دیدی۔ وہ ہارون الرشید کے سر ہوگئی کہ قاضی کی یہ مجال کہ میرے کارندے کے خلاف فیصلہ دیدے۔ خلیفۃ المسلمین ہارون الرشید نے اس "جرم" کی پاداش میں قاضی کو معزول کردیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

چہ مُلّائی۔ چہ درویشی۔ چہ سلطانی۔ چہ دربانی
فروغِ کارمی جوید، بسالوسی و رزّاقی

دنیا کی پانچویں بڑی مملکت اور مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت، پاکستان کو وجود میں آئے پانچ برس ہو چکے ہیں۔ اس سالگرہ کی تقریب پر، غالب کی ہمنوائی میں، ہماری دعا ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اگر اس پنج سالہ مدت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اسوقت باشندگانِ پاکستان کو بالعموم تین طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ طبقۂ اول وہ ہے جس کی ترجمانی "فٹ پاتھ" پر زندگی بسر کرنے والوں کا گروہ کرتا ہے۔ یہ اصطلاح بڑی جامع اور ہمہ گیر ہے اور اس کا اطلاق ہر اس "سانس لینے والی لاش" پر ہو سکتا ہے جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

مجھ پر گراں ہے آسماں اور ہوں گراں زمیں کو میں

یہی گروہ اکثریت میں ہے۔ اور اگر کسی مملکت یا قوم کی بلندی اور پستی ماپنے کا معیار اس کے عوام قرار پا سکتے ہیں تو ہمیں اپنے صحیح مقام کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ عوام کو (MASSES) کہتے ہیں اور (MASS) کے معنی ہیں وہ بنیادی مسالہ جس سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے عوام درحقیقت وہ بنیادی اجزا ہیں جس سے قوم ترکیب پاتی ہے۔ قوم افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ افراد کو الگ کر لینے سے قوم کا وجود باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا جو حالت کسی قوم کے افراد کی اکثریت کی ہوگی وہی حالت اس قوم کی قرار پائے گی۔ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی خشتِ اول یہی عوام تھے، اسلئے کہ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں ہماری اپنی حکومت ہونی چاہیئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ "مسلمانوں کی اکثریت" کا انحصار تھا انہی عوام کی تعداد پر۔ بنا بریں، دعوئے پاکستان کی سیاسی اور آئینی بنیاد۔ اس کے حصول کی قوت اور اس کے وجود کا تعمیری مسالہ، یہی عوام ہیں جو خون کے دریا پیرتے اور آگ کے شعلوں سے کھیلتے، نگاہوں میں ایک نئی دنیا کا منظر اور دلوں میں ایک جہانِ نو کا تصور لئے، اپنا سب کچھ برباد کر کے یہاں پہنچے تاکہ پاکستان آباد ہو جائے۔ انھوں نے یہاں پہنچکر کچھ نہیں مانگا۔ کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ شہروں میں آئے تو بڑے بڑے سر بفلک محلات کے زیرِ سایۂ دیوار، رہگزاروں (Foot Paths) کے

کنارے، بجری کے فرش اور اینٹ کے تکیے پر۔ اور اگر دیہات کی طرف رُخ کیا تو سڑکوں کے کنارے، درختوں کے سائے میں، یوں اطمینان سے سو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت ان کے حصے میں آگئی۔ ان کے نزدیک پاکستان کی تشکیل فی الواقعہ ہفت اقلیم کی بادشاہت تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ جب ان کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتے کہ یہاں ساری دنیا لوٹ میں مصروف ہے۔ لیکن یہ ان کی طرف کبھی للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتے۔ ان کے تصورات کی رُو سے پاکستان نام تھا دیانت، امانت اور عدل و انصاف کے سائے میں خوش حالیوں اور خوش گواریوں کی زندگی کی ضمانت کا۔ دن گذر گئے اور ان کی امیدوں کی ہر نورانی صبح، یاس انگیز شام کی تاریکیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔ حتی کہ ان "خداداد"[1] محلات کے مکینوں کی نگاہوں میں ان کا "فٹ پاتھ" پر سونا بھی کھٹکنے لگا۔ انھیں اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر ان خاک نشینوں کو کسی دن، فٹ پاتھ کی پستی اور محلات کی بلندی کا تفاوت سچ مچ نظر آنے لگ گیا تو مبادا ان کے دل میں نیچے سے اٹھ کر اوپر جانے کا ولولہ بیدار ہوجائے۔ اس کیلئے انھوں نے ایسا انتظام کیا جس سے وقتاً فوقتاً "خطرے کی گھنٹی" کھٹکا دی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو "فٹ پاتھ" سے اٹھا دیا جائیگا۔ کیونکہ اس سے "صحتِ عامہ" خطرے میں ہے۔ اس آواز کے سنتے ہی ان بچاروں کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں اور یہ بے ساختہ پکارنے لگ جاتے ہیں کہ

ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھائیے۔

چنانچہ "حسنِ تدبیر" کی ان فسوں سازیوں سے ان عوام کو اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ان کی زندگی کے تمام مقاصد، مستقبل کے تمام تصورات، اپنی خوش حالیوں اور خوش گواریوں کے تمام ممکن مطالبات، سمٹ سمٹا کر اس التجا میں مرکوز ہوگئے ہیں کہ "ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھائیے"۔ اب وہ اس سے زیادہ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ غالب نے جب یہ کہا تھا کہ

بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

تو اس میں ایک اندازِ استحقاق پایا جاتا تھا۔ لیکن اب "رہ گذر" پر بیٹھنے کے لئے بھی ہزار التجائیں کرنی پڑتی ہیں اور اس کے بعد بھی "سیاست درباں" کا ڈر اطمینان کا سانس نہیں لینے دیتا۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہمارے عوام کی اکثریت پہنچ چکی ہے۔ طبقۂ اعلیٰ ان کی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے اور بات بات پر ان کے عیوب گنانے شروع کر دیتا ہے۔ یہ جاہل ہیں۔ غلیظ ہیں۔ بدتمیز ہیں۔ "بے ایمان" ہیں۔ کام چور ہیں۔ سہل انگار ہیں ـــــ اور آگے بڑھئے تو ـــــ جرائم پیشہ ہیں۔ بے غیرت ہیں۔ دیوث ہیں۔ پست اخلاق ہیں۔ کمینہ فطرت ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ یہ سب سچ ہے لیکن ان "ناصحینِ مشفق" سے کون پوچھے کہ ان کے ان عیوب و اسقام کا ذمہ دار کون ہے؟ انہیں اس حالت تک پہنچا کس نے دیا ہے؟ ان سے کون کہے کہ

شکریہ پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو!

---

[1] ہمارے ہاں "دولتِ خداداد" کے معنی لئے جاتے ہیں وہ دولت جو کسی کی محنت سے حاصل نہ ہوئی ہو بلکہ بیٹھے بٹھائے چھپر پھاڑ کر مل گئی ہو۔ اقبال کے الفاظ میں ـــــ بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است۔

یہ حضرات، یہ کچھ کہہ لینے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ قوم کی اصلاح ہو گئی اور یہ اپنے اہم فریضہ سے سبکدوش ہو گئے۔ اور نہیں سمجھتے کہ حالات کس نازک مقام تک پہنچ رہے ہیں۔ فضائی علوم کے ماہرین (METEOROLOGISTS) کا کہنا ہے کہ جب گرمی کی شدت سے کسی خاص خطۂ ارض کی ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھ جاتی ہے تو وہاں خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے، دوسرے خطوں کی سرد ہوائیں ہجوم کر کے اِدھر آتی ہیں اور گاہ تند و تیز جھکڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور گاہ بادل بن کر برستی ہیں۔ یعنی کسی خاص مقام کی گرمی کی شدت، دعوت بن جاتی ہے تباہ کار آندھیوں اور سیلاب آور بادلوں کے لئے۔ جو کچھ عالمِ آفاق میں ہوتا ہے وہی کچھ دنیائے انسانیت میں ہوتا ہے۔ ہمارے اس دَور میں عوام کی وہ حالت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، از خود دعوت (INVITATION) بن جاتی ہے، کمیونزم کے اس سیلِ بے پناہ کے لئے۔

جس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اور جس کی طغیانیوں کو مقدس آرزوؤں کی کوئی دیوار اور جذباتی نعرہ آفرینیوں کا کوئی بند روک نہیں سکتا۔ آج اس سیلاب بے پناہ کی موجوں کا شور بہروں کو سنائی دے رہا ہے اور اس کے بہاؤ کی تیز رفتاری اندھوں کو بھی نظر آ رہی ہے۔ لیکن اگر کسی کو نہ یہ دکھائی دیتی ہے نہ وہ سنائی، تو وہ ہمارے اربابِ بست و کشاد ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ ولھم اذان لا یسمعون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔

بوٹا بوٹا، پتہ پتہ، حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے۔ باغ تو سارا جانے ہے

لیکن جہل یا تجاہلِ عارفانہ سے سیلاب رک تھوڑا جایا کرتے ہیں۔ اس کیلئے تو کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک پاکستان سے مفہوم، دولت سمیٹنا اور جاہ و مناصب کی کرسیاں سنبھالنا ہے۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہیں باقی ہنوز ناکام[1]۔ جو کامیاب ہیں وہ اپنی "فتوحات" کی حفاظت کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ جو ناکام ہیں وہ اول الذکر سے ان "فتوحات" کے چھیننے اور جھپٹنے کی ہوس میں آشفتہ و پریشان۔ جو ان "فتوحات" کو سنبھالے بیٹھے ہیں وہ اس متاعِ گراں بہا (دولتِ خداداد) کے تحفظ (یعنی انھیں اپنے تک محدود رکھنے) میں اسلام کی حفاظت، اور اس کی تقویت میں پاکستان کی تقویت قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ ان فتوحات کو ان سے چھیننا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں دوسری پارٹی کے پاس رہیں تو اس سے اسلام سخت خطرے میں اور پاکستان موت کی آغوش میں آ جائیگا۔ برعکس اس کے اگر یہ مال و منال اور جاہ و اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جائے تو پھر اسلام محفوظ ہو جائیگا اور پاکستان مضبوط۔ ان میں سے جو کامیاب ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قائد اعظم مرحوم کے ترکہ کے جائز وارث اور مسلم لیگ کی "قبر" کے متولی ہیں اس لئے اس آستانۂ عالیہ کی سجادہ نشینی ہمارا حق اور "خلافت" ہمارا ورثہ ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ حکمتِ فرعونی کی رُو سے قوت کے استحکام کا راز اس میں ہوتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کو پارٹیوں میں تقسیم

---

[1] ان مختلف طبقات کے مخلص حضرات سے بعد میں تخاطب کیا جائے گا۔ اس وقت ان کی عمومیت مخاطب ہے۔

کر دیا جائے (وجعل اھلھا شیعا) تشکیل پاکستان کے بعد سب سے پہلی آواز جو طلوعِ اسلام کی طرف سے بلند کی گئی تھی یہ تھی کہ اب پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کو ایک جماعت تصور کیا جائے اور ملت کے اندر پارٹی بازی کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔ کیونکہ قرآن کی رُو سے اس قسم کی پارٹی بازی اور گروہ سازی شرک ہے۔ اس مقصد عظیم کے حصول کیلئے پہلا اور مؤثر قدم یہ بتایا گیا تھا کہ مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن اربابِ متعلقہ نے ایسا نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں مختلف پارٹیاں وجود میں آگئیں اور اس طرح ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اب ہر پارٹی (مسلم لیگ سمیت) دوسروں کو فتنہ پرداز، تخریبی عنصر، پاکستان کے دشمن، تفرقہ انگیز، قرار دیتی ہے اور اپنے آپ کو ملک وملت کی بہترین بہی خواہ اور جاں نثار۔ کل حزب بما لدیھم فرحون۔

دوسری آواز جو طلوعِ اسلام کی طرف سے اٹھائی گئی تھی یہ تھی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں کو مٹا کر ایک مرکزی حکومت قائم کر دی جائے تا کہ صوبجاتی تفریق کی لعنت ختم ہو۔ لیکن چونکہ یہ قدم بھی ملت کی وحدت کی طرف منجر تھا۔ (فلہذا اقتدار پرست طبقہ کے مفاد کے خلاف جاتا تھا کیونکہ ان کی قوت کا راز ملت کی تفریق وتقسیم میں ہے) اسلئے اس کی بھی مخالفت کی گئی۔ اس مخالفت کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ برسرِ اقتدار پارٹی کے پاس لوگوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے مناصب مدارج ہی کی تو جاذبیت ہے۔ جسقدر زیادہ اسمبلیاں، وزارتیں، عہدے، مناصب ہونگے اسی قدر زیادہ تعداد برسرِ اقتدار پارٹی کے ساتھ رہے گی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ صوبجاتی تفریق، باہمی نفرت بلکہ عداوت کی حد تک پھیل چکی ہے اور آج پاکستان میں کوئی "پاکستانی" نہیں بستا مختلف صوبوں کے افراد بستے ہیں جن میں باہمی مودت اور ائتلاف تو کجا ہم وطنی تک کے روابط وتعلقات بھی باقی نہیں رہے۔ اس صوبجاتی گروہ بندی کو اسقدر شدید کر دیا گیا ہے کہ ملازمتوں میں بھی صوبجاتی نیابت (PROVINCIAL QUOTAS) مقرر کر دی گئی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے ملازمتوں میں جداگانہ نیابت کا اصول اس بنیاد پر منوایا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جن کے مفاد ایک دوسرے سے متضاد ومتناقض ہیں۔ لہٰذا ملازمتوں میں ان کے نیابتی حقوق بھی الگ الگ ہونے چاہئیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا سوال تو ختم ہو گیا لیکن یہاں مختلف صوبوں میں جداگانہ نیابت کے اصول کو برقرار رکھ کر ملت کو اسی طرح مختلف قوموں میں بانٹ دیا جس طرح ہندوستان میں ہندو اور مسلمان مختلف قوموں میں بٹے ہوئے تھے۔ پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد (بلکہ اصل پوچھئے تو ہمارے دعوئے اسلام کی صداقت) اس اصول پر تھی کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدار جغرافیائی حدود پر نہیں بلکہ دین کی وحدت پر ہے۔ اس دعوے کی بنا پر ہم نے پاکستان کا مقدمہ جیتا اور اسی بنیاد پر ہم مسلمان کہلاتے ہیں لیکن تشکیل پاکستان کے بعد یہ تمام اصول ومعانی، نقش ونگارِ طاقِ مفاد پرستی ہو گئے اور مختلف صوبوں کے مسلمان عملاً مختلف قومیتوں میں بٹ گئے۔ چنانچہ آج یہ امرِ واقعہ ہے (خواہ اس کا تذکرہ کسی قدر دلخراش اور جگر سوز ہی کیوں نہ ہو) کہ ملازمتوں میں جداگانہ نیابت کی بنا پر ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جسقدر بُعد اور عناد تھا پاکستان کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں میں اس سے کم بغض وعناد نہیں۔ حیرت ہے کہ ہم نے ہندوستان میں مختلف صوبوں کے مسلمانوں کیلئے جداگانہ ملازمتی نیابت کا سوال کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن آج یہ سوال ہماری سیاست کی خشتِ اول بن چکا ہے۔

ان سب گروہ بندیوں اور پارٹی بازیوں، صوبجاتی نیابتوں اور متفرق اسمبلیوں اور وزارتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اسوقت ملک میں صرف افراد بستے ہیں، قوم کا کہیں نام ونشان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جسقدر مسائلِ حیات، قومی (یعنی اجتماعی) سطح (LEVEL) پر حل ہوا کرتے ہیں۔

پاکستان میں ان کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی۔ یہ کیفیت حال مفاد پرست گروہ کیلئے تو سازگار رہتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مملکت کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں؟

یہ تو رہی کامیاب گروہ کی حالت۔ ناکام (یعنی مناصب واقتدار کی کرسیاں چھیننے کی ہوس میں رقصاں وکوشاں) پارٹیوں میں سے ایک ایسی ہے جو باقی پارٹیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ خطرناک ہے ـــــ پاکستان اور انسانیت دونوں کیلئے خطرناک ـــــ یوں تو

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

لیکن تاریخ ہی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب زمام اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خدا کے نام (مذہب) کو اپنی ہوسِ اقتدار کا آلۂ بنائیں تو پیا دوار تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ وحشت انگیز، اور انسانیت کُش ہوتے ہیں۔ اسوقت ہر گرگِ خون آشام برّہ معصوم کی اوڑھ کر سامنے آتا ہے اور ہر ابلیس، خدائی فوجدار ہونے کا مدعی ہوتا ہے۔ جبر وقہرمانیت کے اس انداز سیاست ہیں، جسے مذہبی پیشوا ؤں (PRIESTS) کا گروہ "حکومتِ الٰہیہ (THEOCRACY) کے مقدس نام سے لوگوں پر مسلط کرتا ہے، خدا کے نام پر ہر وہ ظلم واستبداد رکھا جاتا ہے جس سے خود ظلم شرمائے اور استبداد کی آنکھوں میں حیا آجائے۔ اہل پاکستان کی بدبختی ہے آج ان "فتوحات" چھیننے والے ہوس کاروں ایک گروہ وہ ہے جو اپنے حصول مقصد کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنا رہا ہے۔ یہی ہے وہ سب سے زیادہ خطرناک گروہ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ا لوگوں کی داستان بڑی دلچسپ (اور معیار انسانیت کے مطابق بڑی افسوسناک) ہے۔ ملک کی دوسری پارٹیاں جو حصولِ اقتدار کیلئے باہمد گر دست ہیں، ان کی پھر بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ حصول پاکستان کی تحریک کے ہم نوا تھے اور اس مقصد کے لئے اس زمانے میں جو کوششیں بھی ہو رہی تھیں ان میں مسلم لیگ کا ساتھ دیتے تھے۔ لیکن مذہب کے نام پر زمام اقتدار حاصل کرنے والے مقدسین کے اس طائفہ کا ماضی یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں یہ جماعت پاکستان کی بدترین دشمن تھی۔ اور چونکہ ان کا اُسوقت بھی یہ دعویٰ تھا (جیسا کہ آج دعویٰ ہے) کہ کسی مسلک سے ان کی موافقت یا مخالفت ذاتی رجحانات کی بنا پر نہیں بلکہ ازروئے شریعت ہوتی ہے اس لئے یہ حضرات اس وقت تحریکِ پاکستان کو شریعت کے خلاف قرار دیتے تھے اور مسلمانوں کو اس "زہریلے حلوے" سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے[۵۷] لیکن پاکستان بن جانے کے بعد ان حضرات کی "شریعت حقہ" نے یہ فتویٰ دیدیا کہ اس مملکت کی حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونے کی کوشش عین جہاد ہے۔ مومن کا مقام تو خیر بہت بلند ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان جس کے دل میں اصول پرستی کا ذرا سا بھی خیال ہو اس قسم کی ننگِ انسانیت روش اختیار کر سکتا ہے؟ (ان سے تو حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، احمد سعید اور حفظ الرحمٰن جیسے لوگ ہزار درجے اچھے ہیں کہ اگر پاکستان کی مخالفت کی تھی تو پھر پاکستان کی طرف رخ نہیں کیا)۔ اس قسم کا مسلک صرف موقع پرستوں (OPPORTUNISTS) کا ہو سکتا ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں منافقت کہا جاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں ہزاروں (لاکھوں) کی تعداد میں وہ مسلمان موجود ہیں جو تحریک پاکستان کے زمانے میں نیشنلسٹ تھے۔ ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ سو اول تو ہم ان کے متعلق بھی یہی کہیں گے کہ کیرکٹر کا تقاضا یہی تھا کہ یہ لوگ بھی ہندوستان ہی میں رہتے۔ لیکن اگر وہاں حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے جن کی رو سے وہاں سے جان بچا کر بھاگ آنا ضروری ہو گیا تھا تو یہ لوگ یہاں پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے

---

۵۷ ان امور کی تفصیلات طلوع اسلام کی سابقہ اشاعتوں میں آچکی ہیں۔

رہ سکتے ہیں۔ اگر ان کا اب بھی یقین (CONVICTION) وہی ہے جو تحریک پاکستان کے زمانے میں تھا تو ان کی مثال پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کی سی ہوگی۔ لیکن اگر اب ان کا وہ یقین بدل چکا ہے تو ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ نہایت دیانتداری سے اس امر کا اعلان کریں۔ اس کے بعد ان کی مثال فتح مکہ کے بعد کے مسلمانوں کی سی ہو جائے گی۔

لیکن اسلامی جماعت کی پوزیشن مذکورہ صدر نیشنلسٹوں سے مختلف ہے۔ ان لوگوں کا محض از روئے سیاست ملکی یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ملکر متحدہ حکومت قائم کریں۔ برعکس ان کے، اسلامی جماعت کا دعویٰ یہ تھا کہ تحریک پاکستان اسلام کی روح کے منافی اور شریعت کے خلاف ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ حالات کے بدل جانے سے شریعت کا فیصلہ بدل سکتا ہے لیکن ہم پوچھتے یہ ہیں کہ حالات میں وہ کونسی تبدیلی واقع ہوئی ہے جس کی بنا پر شریعت کا فیصلہ بدل گیا؟ پاکستان بننے کے بعد بھی یہاں وہی مسلمان بستے ہیں جو پاکستان کا مطالبہ کرتے تھے (اور جنہیں یہ حضرات "پیدائشی مسلمان" کہکر اصل مسلمانوں کے حلقے سے خارج کر دیتے تھے) اور وہی حکومت ہے جس کے قیام کیلئے پاکستان کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ جب یہ دونوں صورتیں اپنی جگہ پر قائم ہیں تو پھر شریعت کا فیصلہ کس طرح بدل گیا؟

ان حضرات کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ مملکت پاکستان قرارداد مقاصد کے پاس کرنے سے "مسلمان ہو گئی ہے" اسلئے اس تبدیلی کی بنا پر شریعت کا فیصلہ بدل گیا ہے۔ قرارداد مقاصد میں صرف اس امر کا اعلان ہے کہ مسلمانان پاکستان اپنا آئین کتاب وسنت کے مطابق مرتب کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں مسلمانوں نے کب کہا تھا کہ اگر ہماری حکومت قائم ہوئی تو اس کا آئین منو سمرتی کے مطابق بنایا جائیگا جو اس وقت پاکستان کی تائید کفر تھی اور اب وہ عین اسلام ہو گئی؟ تحریک پاکستان کی تو بنیاد ہی اس دعوے پر تھی کہ مسلمان اپنا جدا تمدن، جدا تہذیب، جدا معاشرت، جدا تصور زندگی رکھتے ہیں اسلئے یہ اپنی جدا حکومت چاہتے ہیں جس میں اپنی زندگیوں کو اپنے مخصوص تصور کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس حقیقت کو بار بار دہرایا جاتا تھا حتیٰ کہ جب نیشنلسٹ علماء یہ کہتے کہ متحدہ حکومت میں مسلمانوں کا پرسنل لا (شخصی قانون) مذہب کے مطابق ہوگا تو اس کے جواب میں کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کا مذہب پرسنل لا تک ہی محدود نہیں۔ اس کا دائرہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے اسلئے انہیں "مذہبی آزادی" صرف اپنی حکومت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ فرمایئے کہ ان اعلانات میں اور قرارداد مقاصد میں مفہوم کے اعتبار سے فرق کیا ہے کہ اول الذکر کفر تھا اور ثانی الذکر عین اسلام بن گیا؟

اسوقت اسلامی جماعت کا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام کا مقصود "پیدائشی مسلمانوں" کو "اصلی مسلمان" بنانا ہے نہ کہ پیدائشی مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا۔ اسلئے ہم پیدائشی مسلمانوں کو اصلی مسلمانوں میں تبدیل کرنے کی فکر میں ہیں اور یہی اسلام کا منشا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ پیدائشی مسلمان اپنی حکومت قائم کرتے ہیں یا محکوم رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان دونوں صورتوں میں کچھ بھی فرق نہیں حتیٰ کہ ہمارے نزدیک پیدائشی مسلمانوں کا مسلمان رہنا یا نہ رہنا بھی برابر ہے۔ آج وہی پیدائشی مسلمان ہیں اور وہی ان کی حکومت۔ لیکن آج ان علمبرداران شریعت حقہ کے نزدیک سب سے مقدم مسئلہ اس حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہونا ہے۔ پیدائشی مسلمان کو اصلی مسلمان بنانے کا کام "پنڈت نہرو" کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جمہور کا حافظہ (PUBLIC MEMORY) اسقدر کمزور ہوتا ہے کہ انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ جو شخص ہم سے آج یہ کچھ کہہ رہا ہے وہ کل کیا کہہ رہا تھا۔ یہ حضرات عوام کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ماضی اور حال میں اسقدر تضاد ہو

اور جو آج کچھ کہتے ہوں اور کل کچھ۔ وہ کہیں چار آدمیوں کی مجلس میں کھڑے بھی ہو سکتے ہیں ؟

اب دیکھئے کہ ان لوگوں کی تکنیک کیا ہے؟ مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے (اور یہ کیفیت ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جس نے سوچنا چھوڑ دیا ہو) کہ ان کے ہاں کچھ الفاظ وراثتاً (نسلاً بعد نسلٍ) چلے آتے ہیں جو ان کے نزدیک بالکل غیر شعوری طور پر بہت محبوب اور واجب الاحترام ہیں۔ انھوں نے کبھی نہیں سوچا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور ہم انھیں کیوں محبوب سمجھتے ہیں۔ خدا پرستی۔ نیک عملی۔ ثواب۔ تقویٰ۔ تزکیۂ نفس۔ روحانی ترقی۔ وغیرہ اسی قسم کے الفاظ ہیں۔ انہی الفاظ میں "شریعت" بھی شامل ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مسلمانوں کو یہ الفاظ غیر شعوری طور پر اچھے لگتے ہیں اور جس گوشے سے ان الفاظ کی آواز کان میں پڑتی ہے وہ بلا ارادہ اس طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ نہ سوچنے والی قوموں کی یہی روش ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ جن چیزوں کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دیئے ہوئے ہیں وہ بجز ایں نیست کہ اسماءٌ سمیتموھا انتم وآباءکم (کچھ الفاظ ہیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے اختیار کر رکھا ہے)۔ مسلمانوں کی یہی نفسیاتی کیفیت ہے جس سے مفاد پرست گروہ ہمیشہ فائدہ اٹھاتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ ان الفاظ کو بطور سلوگن (SLOGAN) پیش کر دیتے ہیں اور اس کے بعد عوام 'بلا سوچے سمجھے' ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اسے نہایت نیک نیتی سے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند و پاکستان کی گذشتہ پچاس سالہ اجتماعی زندگی پر نیز تی ہوئی نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ اس قسم کی نعرہ بازیوں نے انھیں کس طرح اپنے پیچھے لگا کر تباہ و برباد کیا۔ یہی کچھ ان کے ساتھ آج اسلامی جماعت کر رہی ہے۔ ان کا سلوگن یہ ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ زمامِ حکومت خدا کے صالح بندوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ عوام کو کچھ معلوم نہیں کہ شریعت کسے کہتے ہیں اور صالح بندوں سے مفہوم کیا ہے۔ یہ الفاظ انھیں غیر شعوری طور پر محبوب ہیں اسلئے وہ ان کی طرف بلا ارادہ کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی ایک بات اور بھی ہے جس سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھا لیا۔ موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ بالعموم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو ڈاڑھیاں منڈاتے، سر پر انگریزی بال رکھتے اور سوٹ پہنتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو کلبوں میں جاتے ہیں۔ شراب سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ علاوہ بریں ان کی بیویاں بے پردہ پھرتی ہیں۔ ان حضرات نے عوام کے سامنے ان لوگوں کی تصویر پیش کر کے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ہیں وہ لوگ جو شریعتِ حقہ کی تضحیک کرتے ہیں ان کے برعکس ہمیں دیکھئے کہ ہماری ڈاڑھیاں بھی ہیں اور سر پر پٹھے بھی[1]۔ ہمارے پائجامے ٹخنوں سے اونچے ہیں اور ہماری بیویاں پردہ بھی کرتی ہیں۔ اب کہو کہ خدا کے صالح بندے یہ لوگ ہیں یا ہم؟ عوام کے لئے صالحیت اور غیر صالحیت کا یہ معیار کافی تھا۔ اسلئے وہ ان کے پیچھے ہو لئے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ مغربی جمہوریت کی تکنیک یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ عوام سے مبہم الفاظ میں باتیں کی جائیں اسلئے کہ جب تک الفاظ میں ابہام رہے گا انھیں مختلف معانی پہنائے جا سکیں گے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ رکھا جا سکے گا۔ اگر بات واضح اور متعین الفاظ میں کی جائے تو صرف وہی گروہ ساتھ رہ سکے گا جو اس متعین مسلک میں آپ کا ہم نوا ہو گا۔ اس تکنیک کے پیشِ نظر اسلامی جماعت نے اپنے مطالبہ کو ہمیشہ مبہم رکھا ہے۔ اس کے الفاظ کا مفہوم متعین نہیں کیا۔ مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ انھوں نے (باوجود تقاضوں کے) آج تک یہ نہیں بتایا کہ "شریعت" سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ خوب

[1] واضح رہے کہ خود امیر جماعت اسلامی (سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) نے اس جماعت سازی کے وقت ڈاڑھی رکھ لی تھی اور سر کے بال بھی پٹھوں میں تبدیل کر لئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ (SHAVE) کرتے تھے اور سر پر بال بھی انگریزی وضع کے تھے۔

جانتے ہیں کہ شریعت کا کوئی سا مفہوم بھی متعین کیا جائے، ان کے ساتھیوں کا ایک نہ ایک طبقہ ان کا ساتھ چھوڑ کر مخالفت شروع کر دیگا۔ اسلئے ان کی مصلحت بینی کا تقاضا یہی ہے کہ اس لفظ کو غیر متعین رہنے دیا جائے تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے ساتھ رکھا جاسکے۔ اگر آپ اس کی تصدیق چاہتے ہیں تو ان سے پوچھیے (اور کہئے کہ یہ اس کا دو ٹوک جواب دیں) کہ وہ شریعت جس کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کا آئین مرتب ہو، اہل حدیث کے مسلک کے مطابق شریعت ہوگی یا اہل فقہ کے مسلک کے مطابق۔ اگر اہل فقہ کے مسلک کے مطابق ہوگی تو یہ فقہ حنفی کے مطابق ہوگی یا کسی اور امام کی فقہ کے مطابق۔ اہل حدیث کے مسلک کی صورت میں احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا معیار وہی ہوگا جو اہل حدیث کے ہاں مسلّم ہے یا اس سے الگ معیار ہوگا۔ اگر الگ معیار ہوگا تو اس معیار کی تشریح کیا ہے۔ اہل فقہ کے مسلک کی صورت میں کیا اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوگا یا بند رہے گا۔ اگر کھلا ہوگا تو اس اجتہاد کا اختیار کسے حاصل ہوگا۔ اس شریعت میں قرآن کا مقام کیا ہوگا اور اس کے جزئی احکام کو کس طرح متعین کیا جائے گا۔ کیا قرآنی احکام غیر متبدل ہوں گے یا کوئی دوسری چیز انھیں منسوخ کر سکے گی؟ "شریعت" کا مفہوم متعین کرنے کیلئے ان سوالات کا جواب نہایت ضروری ہے۔ ان سے کہئے کہ ان امور کی تشریح صاف صاف اور واضح الفاظ میں کریں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ "شریعت" سے مراد کیا ہے؟

اکثریت کو اپنے ساتھ رکھنے کیلئے انھوں نے ایک اور تکنیک بھی اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ تو یکسر عوام کا ہے جو اندھی تقلید کے بہاؤ میں بہے چلا جاتا ہے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اگرچہ تعلیم یافتہ کہلاتا ہے لیکن ابتدائی تعلیم و تربیت و ماحول کے اثرات اور اپنی فکری صلاحیتوں کے فقدان کے باعث، مذہب کے معاملے میں بالکل عوام جیسا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کا ظاہر ماڈرن ہے لیکن باطن اسی دقیانوسی ملائیت کا حامل۔ یہی وہ طبقہ تھا جو آج سے کچھ عرصہ پہلے، مرزائیت کے دام تزویر میں گرفتار ہوا کیونکہ انھوں نے بھی ان کے دونوں پہلوؤں کی تسکین کا سامان فراہم کیا تھا۔ اب وہی انداز اسلامی جماعت نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ جماعت دقیانوسی ملائیت کی پیکر ہے لیکن انھوں نے اسلوب نگارش (FORM OF EXPRESSION) اور طریق استدلال ماڈرن رنگ کا اختیار کر رکھا ہے۔ چونکہ یہ طریق، پرانے مولویانہ طریق سے مختلف ہے اسلئے یہ لوگ (محض اسلوب بیان اور طریق استدلال کے فرق کی بنا پر) یہ خیال (IMPRESSION) عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا پیش کردہ مذہب ملائیت سے مختلف ہے۔ اس سے وہ تعلیم یافتہ طبقہ (یعنی سوٹ پہننے والا مُلّا) ان کا ہم نوا ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے ان کی ظاہرا ماڈرن ازم بھی قائم رہ جاتی ہے اور قلبی ملائیت کی بھی تسکین ہو جاتی ہے۔ اس جماعت کی خوش قسمتی سے بعض مولویوں کی طرف سے ان کی مخالفت بھی ہوگئی ہے[1]۔ یہ لوگ اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ دیکھ لو ہم مُلّا نہیں ہیں۔ یہ بھی بہت بڑا دھوکا ہے جو ان لوگوں کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ واضح الفاظ میں بتائیں کہ وہ کون کون سے امور ہیں جن میں یہ دیگر علماء سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بات صاف ہو جائے گی!

اب یہ دیکھئے کہ ان لوگوں نے اپنے قیام کیلئے سہارا کون سا پکڑ رکھا ہے۔ اس دور میں قرآنی تعلیم کے بہت سے گوشے بڑی سرعت سے آشکارا

---

[1] مولویوں میں شروع سے باہمد گر مخالفت چلی آرہی ہے۔ مقلد اور غیر مقلد، حنفی اور شافعی وغیرہ کی باہمی مخالفتیں کسی سے چھپی ہوئی نہیں۔ اسی قسم کی کچھ اصطلاحی سی چیزیں ہیں (مثلاً فقہ میں اجتہاد یا روایات پرکھنے کا معیار) جن کی بنا پر بعض مُلّا مودودی صاحب کی مخالفت کر رہے ہیں۔ کیا اس قسم کی مخالفت سے ایک مُلّا مُلّا نہیں رہتا؟ کیا مقلد مُلّا کی مخالفت سے غیر مقلد مُلّا، مُلّا سے کچھ اور ہو جاتا ہے؟

ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ملوکیت بڑی تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ پیشوائیت کا جنازہ نکل رہا ہے، نسل پرستی کا تصور معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ جغرافیائی حدود کی جگہ عالمگیر انسانی برادری کا خیال افق سے ابھر رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی سرمایہ داری کی لعنت بھی مٹتی چلی جا رہی ہے۔ زمینداری اور جاگیرداری سرمایہ داری کے قدیم ادارے ہیں۔ انھیں بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو اپنا مستقبل سخت خطرے میں دکھائی دے رہا ہے۔ اسلئے اگر انھیں کسی طرف سے تائید کی ذرا سی امید بھی نظر آئے تو یہ اس گوشے کی طرف لپک کر جاتے ہیں۔ اسلامی جماعت نے ان لوگوں کی اس کسمپرسی اور احتیاج تائید کی کیفیت کو بھانپا اور زمینداری کی تائید شروع کر دی۔ چونکہ ہماری روایات کے مجموعے، ہمارے دَورِ ملوکیت میں وضع ہوئے تھے اسلئے ان میں مفاد پرستی اور سرمایہداری کی تائید میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ چنانچہ انہی روایات کی بنا پر اس جماعت نے زمینداری کے مسئلہ (case) کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت پر کوئی حد نہیں باندھی جا سکتی اسلئے زمینداری عین شریعت کے مطابق ہے[1]۔ اسی طرح سرمایہ داری بھی۔ یہ ہے وہ "ارضی" سہارا جس پر یہ "آسمانی" تحریک قائم ہے۔

پروپیگنڈا اس جماعت کا خاص فن ہے۔ گذشتہ انتخابات میں ناکام رہنے کے بعد انھیں پھر پروپیگنڈا کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔ (اپنی مفاد پرستی کے علاوہ) کوئی نصب العین نہیں۔ اسلئے پروپیگنڈا کیلئے نئے حربے کہاں سے آئیں؟ چنانچہ انھوں نے پھر سے اسی پرانے سلوگن کو دہرانا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اب پھر ہر مسجد میں اس کیلئے جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں اور اس سلوگن پر مشتمل ریزولیوشن پاس کر کے حکومت کے پاس بھیجے جا رہے ہیں۔ اب ذرا اس مہم کی حقیقت پر غور کیجئے۔ حکومت کی پاس کردہ قرارداد مقاصد میں یہ اصول موجود ہے کہ پاکستان کا آئین کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ خود اسلامی جماعت کے نزدیک اس قرارداد کی اہمیت اس قدر تھی کہ انھوں نے کہا تھا کہ اس قرارداد کے منظور کرنے سے مملکت پاکستان مسلمان ہو گئی ہے۔ یہ قرارداد ابھی تک اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ نہ اس کوئی ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے نہ رد و بدل۔ اس قرارداد کو بنیاد تسلیم کر کے، حکومت تدوینِ آئین کے کام میں مصروف ہے۔ ان حالات میں یہ ایجی ٹیشن شروع کرنا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ پاکستان کا آئین شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے بے معنی غوغا آرائی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ مطالبہ تو پھر بھی قابل فہم ہو سکتا تھا کہ آئین سازی کا کام جلدی ختم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس پروپیگنڈے سے اس جماعت کا مقصود اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگوں پر ظاہر کیا جائے کہ شریعت کے مطابق آئین سازی کا خیال صرف اسی جماعت کو ہے۔ اس کے بعد اگر آئین ان کی مرضی کے مطابق بن جائے تو پھر ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ یہ سب اسلامی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس طرح انھوں نے اس سے پیشتر ڈھنڈورا پیٹا تھا کہ قراردادِ مقاصد انہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کی بددیانتی اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے آٹھ نکاتی اشتہارات میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ حکومت کی پاس کردہ قرارداد مقاصد میں یہ چیز موجود ہے کہ پاکستان کا آئین کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ اس مطالبے کی تہ میں ہے کیا؟ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ

(۱) شریعت صرف قرآن سے مرتب نہیں ہوتی۔ قرآن مجمل بھی ہے اور نامکمل بھی۔ اس کے اجمال کی تفصیل اور اس کی ناتمامی کی تکمیل "سنت" سے ہوتی ہے۔ سنت سے مراد ہیں روایات کے مجموعے۔

---

[1] دیکھئے رسالہ "ملکیتِ زمین" از سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ اسی قسم کی "شریعت" میرزا بشیرالدین احمد صاحب نے بھی اپنی کتاب میں پیش کی ہے۔

(ب) روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔

(ج) غلط اور صحیح روایات پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جس روایت کے متعلق "مزاج شناس رسولؐ" یہ کہدے کہ وہ صحیح ہے اسے صحیح تسلیم کیا جائے۔ جس کے متعلق وہ کہدے کہ غلط ہے اسے غلط مانا جائے۔[1]

(د) جس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت نہ مل سکے اس کیلئے بھی "مزاج شناس رسولؐ" کہہ سکتا ہے کہ اگر اس وقت رسول اللہؐ موجود ہوتے تو وہ کیا فیصلہ دیتے۔[2]

آپ نے غور فرمایا کہ ان عقائد کی رُو سے شریعت سمٹ سمٹا کر کہاں پہنچ جاتی ہے؟ شریعت محصور ہو جاتی ہے "مزاج شناس رسولؐ" کے فیصلوں میں۔ اسے اپنے ان فیصلوں کی تائید میں نہ کسی سند کی ضرورت ہے نہ مشورے کی۔ نہ دلیل کی حاجت ہے نہ شہادت کی۔ آخری فیصلہ ٹھہرتا ہے اس کی نگاہ پر۔ کیونکہ اس کی نگاہ میں وہ بصیرت ہوتی ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس مقام پر رسول اللہؐ کا فیصلہ کیا ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی رائے کو رسول اللہؐ کے حکم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اسی حیثیت سے اُسے منواتا ہے۔ جو اس سے اختلاف کرتا ہے وہ رسول اللہؐ کے حکم سے اختلاف کرتا ہے اور چونکہ رسول اللہؐ کا حکم درحقیقت خدا کا حکم ہے، اس لئے اس "مزاج شناس رسولؐ" کا حکم دراصل خدا کا حکم قرار پا جاتا ہے۔[3] یہ ہیں وہ خدائی اختیارات جو یہ "مزاج شناس رسولؐ" اپنی ذات میں سمیٹ لیتا ہے اور اس طرح خود خدا بن کر مخلوقِ خدا پر حکومت کرتا ہے یہ ایک ایسی ڈکٹیٹرشپ ہے جس کی مثال دنیا کے مستبد ترین آہنی ڈکٹیٹروں کے ہاں بھی نہیں ملے گی۔ یہ ہے وہ ... "حکومتِ الٰہیہ" (THEOCRACY) کی مطلق العنان آمریت جسے مقدسین کا یہ طائفہ امت پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ان کے اس استبداد کی زد کہاں تک ہوگی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان لوگوں کی طرف سے ابھی سے یہ اعلانات شروع ہو گئے ہیں کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اور مرتد سے مراد وہی شخص نہیں جو اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ بلکہ "شریعت" کی رو سے ہر وہ شخص مرتد ہے جو اسلام کے "مسلمہ عقائد" سے اختلاف رکھے۔ اور عقائد وہی مسلمہ ہو سکتے ہیں جن کی صحت کی تصدیق ان حضرات کی طرف سے ہو۔ ان سے ذرا اختلاف ہوا اور آپ مرتد قرار پائے۔ اس کے بعد آپ کا انجام ظاہر ہے۔ یعنی جن اختلافات کی بنا پر آج یہ حضرات (اختیارات نہ ہونے کی وجہ سے) صرف گالیوں تک اکتفا کرتے ہیں۔ اختیارات حاصل ہونے کے بعد انہی اختلافات کی بنا پر ان کے مخالفین کو حوالۂ دار و رسن کیا جائیگا۔ اور چونکہ یہ سب کچھ کیا جائیگا "خدا کا نام بلند" کرنے کے لئے۔ اس لئے جو شخص ان کے اس استبداد کے خلاف لب کشائی کریگا اس کا مقام بھی پھانسی کا تختہ ہوگا۔ آپ دنیائے مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ جس زمانے میں زمامِ اقتدار مذہبی ملاؤں کے ہاتھ میں آئی ہے انسانیت پر کیا گذری ہے؟ خود مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے زمانے گذر چکے ہیں جب ہر شخص کو اپنی جیب میں "صحتِ عقائد کا

---

[1] جن اختلافات کی بنا پر مولوی صاحبان ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی مخالفت کرتے ہیں، ان میں ایک اختلاف یہ بھی ہے۔

[2] یہ تمام امور بہ تفصیل اس مضمون میں درج کئے جا چکے ہیں جو "مثلہ معہ" کے عنوان سے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔

[3] آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات احادیث کی اطاعت پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں؟ اسلئے کہ احادیث کی اطاعت سے مقصود ہوتا ہے خود ان لوگوں کے فیصلوں کی اطاعت۔ اس طرح یہ لوگ، رسول اللہؐ کے نام کی سپر میں اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین چاہتے ہیں۔

حکایتِ قدِ آں یار دلنواز کنم ۔۔۔ بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

سارٹیفکٹ" رکھنا پڑتا تھا جس کے پاس ایسا سارٹیفکٹ نہ ہوا سے ہر وقت اپنی جان کا خوف رہتا تھا کیونکہ ارتداد کے جرم میں اس کا خون مباح ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جسقدر خونِ ناحق مذہبی پیشواؤں کے خود ساختہ "خدا" کے نام پر بہایا گیا ہے، شیطان کے حصے میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ آج بھی جن "اسلامی ممالک" میں شریعت کا نفاذ ہے وہاں دیکھیئے کہ شخصی استبداد کی گرفت کسقدر آہنی ہے۔ وہاں ملوکیت اسی شریعت کے سایے میں پروان چڑھتی ہے اور ہر ظلم "خدا" کے نام پر روا رکھا جاتا ہے۔ اسی کی کوشش آج پاکستان میں ہو رہی ہے۔ اسوقت یہ لوگ "شریعت" کے نام پر اپنی قوت مجتمع کر رہے ہیں اور سادہ لوح مسلمان کو کچھ معلوم نہیں کہ اس دامِ ہمرنگ زمین کے نیچے کیا ہے؟ جب انھوں نے اس طرح قوت فراہم کر لی تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہاں جو آئین بھی مرتب ہوا اس کے متعلق یہ لوگ اعلان کر دیں گے کہ یہ شریعت کے مطابق نہیں۔ شریعت کے مطابق صرف وہی آئین ہو سکتا ہے جسے "مزاج شناسِ رسول" کی تصویب حاصل ہو۔ اس طرح یہ کوشش کرینگے کہ ان کا مرتب کردہ آئین ملک میں نافذ ہو۔ آئین کسی جامد شے کا نام نہیں کہ ایک دفعہ مرتب ہو چکنے کے بعد قصہ ختم ہو۔ آئین، چند بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی تعبیرات (VNTER PRETATIONS) اور جزئیات کی ترتیب کا کام مستقلاً جاری رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انہی کے سپرد ہو سکے گا جو آئین کی تدوین کے ذمہ دار ہونگے۔ یہ ہے وہ طریق کار جس سے یہ لوگ یہاں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ خود سوچ لیجئے کہ اگر (خدا نکردہ) یہ لوگ اپنے عزائم میں کامیاب ہو گئے تو پاکستان کا حشر کیا ہوگا؟ یہ دوسرا "افغانستان" بن جائیگا۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر طلوعِ اسلام ان حضرات کی، مقدس نقابوں میں چھپی ہوئی اقتدار پرستیوں کی مخالفت کرتا ہے۔ اور یہ ہے وہ مخالفت جس کی وجہ سے یہ لوگ طلوعِ اسلام کو "منکرِ حدیث" ایک "جدید اسلام کا بانی" اور نہ جانے کیا کیا قرار دیکر سزاوارِ دار و رسن قرار دیتے رہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نہ مقامِ رسالت کا منکر ہے نہ مقامِ حدیث کا۔ یہ منکر ہے ان لوگوں کی وسیسہ کاریوں کا جو رسول اور حدیث کے نام پر اپنا اقتدار قائم کر کے پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا وہی استبداد پھر سے لانا چاہتے ہیں جسے مٹانے کے لئے قرآن نازل ہوا تھا اور جس کے ذریعے رسول اللہؐ نے دنیا کو انسانیت ساز اور زندگی بخش پیامِ عدل و ربوبیت دیا تھا۔ طلوعِ اسلام اسی قرآنی اسلام کی تجدید کرنا چاہتا ہے۔

اب ہمارے سامنے تیسرا گروہ آتا ہے اور یہی گروہ درحقیقت ہمارا مخاطب ہے اور انہی سے ہماری توقعات وابستہ ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے تحریکِ پاکستان میں پورے انہماک سے حصہ لیا۔ اس گروہ کے سامنے پاکستان کے حصول سے کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف اسقدر تھا کہ اس خطۂ زمین میں خدا کے اُس نظامِ عدل و ربوبیت کو عملاً نافذ کیا جا سکے جو انسانیت کی نشوونما و ارتقا کا ضامن اور جوہرِ خودی کی برومندی اور ثمرباری کا کفیل ہے۔ یہ گروہ، ان حسین توقعات کو لیکر پاکستان آیا تھا لیکن اس پانچ سال کے عرصے میں جو کچھ انھوں نے دیکھا اس سے یہ سخت شکستہ خاطر ہو گئے اور اب ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہ مستقبل سے ناامید ہو کر، عملی رہبانیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ وہ گروہ تھا جو طلوعِ اسلام کی قرآنی آواز پر شریکِ ہنگامۂ تحریکِ پاکستان ہوا تھا اور اس لئے یہ (ایک مخلص اور شفیق لیکن غم خوردہ دوست کی طرح) طلوعِ اسلام سے اس طرح گلہ سنج ہو رہا ہے کہ یہی ان حالات کا ذمہ دار ہے جو پاکستان میں رونما ہوئے (اور ہو رہے ہیں)۔ طلوعِ اسلام ان کی ان شکایت ہائے رنگیں کو سر آنکھوں پر رکھتا ہے اور اس قلبی تعلق کی بنا پر جو انھیں طلوعِ اسلام سے ہے (اور جس کا اظہار ان محبت آمیز شکووں کی صورت میں ہوتا ہے) ان سے

خصوصی تخاطب چاہتا ہے۔ آؤ! آج ایک مدت کے بعد ذرا جی کھول کر باتیں کریں۔

غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور ۔۔۔ بایں فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور

یہ ایک حقیقت ہے جس سے (ہم میں سے) کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ (i) ایک خطۂ زمین کا حاصل کرنا اور (ii) اس خطۂ زمین میں خالص قرآنی نظام کا رائج کرنا، دو متمیز شقیں تھیں۔ یہ ظاہر ہے کہ شق اول کے حصول کے بغیر شق دوم کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارا اور آپ کا منتہائے نگاہ شق دوم تھی لیکن اس کیلئے پہلا مرحلہ شقِ اول کا حصول تھا۔ ہندوستان میں سیاسی تبدیلیاں اس سرعت سے رونما ہو رہی تھیں کہ اگر ہم اپنی توجہ شق اول سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹا لیتے تو زمانہ ہمیں روند کر آگے بڑھ جاتا اور اس شق کا حصول ناممکن ہو جاتا۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اس وقت تحریک پاکستان کے مخالف مسلمان دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا تھا جو مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور جداگانہ حکومت کے تصور کا مخالف تھا۔ دوسرا گروہ اسلامی جماعت والوں کا تھا جو مسلمانوں کو تحریک پاکستان کے خلاف) یہ کہکر ورغلاتے تھے کہ اصل چیز کسی خطۂ زمین کا حصول نہیں بلکہ پیدائشی مسلمانوں کو اصلی مسلمان بنانا ہے۔ اس "مقدس جہاد" سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی توجہ حصول پاکستان سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف کر دی جائے اور اتنے میں ہندوستان پورے کا پورا ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ یہ سب کچھ اس جذبے کے ماتحت ہو رہا تھا کہ مسلمانوں نے اپنی قیادت کیلئے مرکزی حیثیت محمد علی جناح کو کیوں دیدی ہے، ہمیں قائد اعظم کیوں نہیں بنایا گیا۔ ان دونوں گروہوں کے برعکس طلوع اسلام کی آواز یہ تھی کہ سیاسی حالات نے ایسے تقاضے پیدا کر دیئے ہیں جن کے پیش نظر سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ پورے کے پورے ہندوستان کو ایک مملکت تسلیم کر لیا جائے یا مسلمانوں کو اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کیلئے ایک خطہ ملک الگ دیدیا جائے۔ طلوع اسلام کا کہنا یہ تھا کہ اگر ہم اس وقت اپنی علیحدگی کے مطالبہ میں ذرا بھی چوک گئے تو پھر شق دوم (یعنی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ) ناممکن ہو جائے گی۔ آپ حضرات نے طلوع اسلام کی اس آواز کی تائید کی اور ہندوستان کے بٹوارے میں ایک خطۂ زمین مسلمانوں کی تحویل میں آ گیا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا یہ کامیابی (مفاد پرستانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اس مقصدِ عظیم یعنی شق دوم کے پیش نظر جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) کچھ کم کامیابی تھی؟ کیا یہ تبدیلی ایسی تھی جس پر ہم آج اس طرح شکوہ سنج اور گلہ طراز ہو جائیں؟ کیا آپ کی سعی و عمل کا یہ نتیجہ ایسا تھا جس پر آپ متاسف و پشیمان ہوں؟ اگر یہ تاسف و پشیمانی کا مقام نہیں بلکہ مقام تبریک و تہنیت ہے تو پھر اس سے دل گرفتگی اور شکستہ خاطری کیوں؟ یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے جو تمہیں نصیب ہوئی تھی۔ فلیفرحوا بھا۔

اب لیجئے شق دوم۔ یعنی پاکستان میں قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ کو۔ اس باب میں آپ کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ شق اول (زمین کے حصول) کے بعد شق دوم خود بخود پیچھے پیچھے چلی آئیگی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' یہ دونوں شقیں الگ الگ تھیں اور ان میں باہمی ربط صرف اسقدر تھا کہ شق دوم کے حصول کیلئے شق اول کا حصول ناگزیر تھا، جس طرح مکان بنانے کیلئے زمین کا حاصل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ شقِ اول کے حصول کے بعد شق دوم کے لئے ایک نئے سلسلۂ جدوجہد اور سعی و کاوش کی ضرورت تھی۔ اس جدوجہد کی ذمہ داری آپ کے سر تھی کیونکہ شقِ دوم کا نصب العین صرف آپ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ سوچئے کہ آپ نے اس جدوجہد میں کسقدر حصہ لیا ہے؟

آپ اسلئے مایوس ہوگئے کہ آپ کے نزدیک ہمارے "طبقۂ اعلیٰ" کا کیرکٹر اسقدر پست نکلا؟ لیکن یہ بھی کوئی خلافِ توقع بات نہ تھی جس سے اسقدر مایوسی ہوجاتی۔ پہلی قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ آپ نے انھیں "طبقۂ اعلیٰ" فرض کس طرح کرلیا؟ محض اس بنا پر کہ ان میں سے اکثر لوگ ایک اتفاقی حادثہ (نہ کہ جوہرِ ذاتی) کی بنا پر جاہ ومناصب کے مالک بن گئے؟ اگر اس طرح جاہ ومنصب کے حصول سے کوئی انسان بلند مرتبہ قرار پاسکتا تو اسلام ملوکیت کو کبھی وجہ فسادِ آدمیت قرار نہ دیتا۔ ملوکیت میں یہی ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک اتفاقی حادثہ (بادشاہ کے گھر پیدا ہوجانے) کی بنا پر برسرِ اقتدار آجاتا ہے۔ اس اقتدار کو اپنے ذاتی جوہروں اور بلند صلاحیتوں کی بنا پر حاصل نہیں کرتا۔ اسلئے قرآن اس طرح اقتدار کا وارث بن جانیوالے کو اکرم (واجب التکریم) قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک اکرم (واجب التکریم) وہی ہے جو ذاتی جوہروں کی بنا پر اس مقام کا مستحق قرار پاتا ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم)۔ لہٰذا قرآنی معیار کے مطابق یہ طبقہ "طبقۂ اعلیٰ" قرار ہی نہیں پاسکتا۔

دوسرے یہ کہ اسوقت ہمارے معاشرے میں جسقدر خرابیاں ابھری ہوئی نظر آرہی ہیں، یہ سب پہلے بھی موجود تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے ابھرنے کے مواقع کم تھے یہاں وہ مواقع بکثرت سامنے آگئے اسلئے یہ مستور خرابیاں ابھر کر سطح کے اوپر آگئیں۔ چیچک کا مواد تو بہت پہلے سے جسم میں موجود ہوتا ہے۔ جسوقت خارجی حالات اس سے موافق ہوجاتے ہیں وہ ابھر کر چیچک کے دانوں سے سارے جسم کو داغدار بنا دیتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ پاکستان بننے کے بعد کیرکٹر کی پستی کے مظاہرات کی نوعیت میں فرق آگیا ہے۔ محکومی کے زمانے کے عیوب اور قسم کے ہوتے ہیں اور قوت واقتدار کے ذمائم اور قسم کے۔ ہندوستان میں ہمارے معاشرے کے عیوب ونقائص اول الذکر قسم کے تھے۔ حصولِ اقتدار کے بعد یہ دوسری قسم میں بدل گئے۔ آپ نے یہ بات اکثر سنی ہوگی کہ معلوم نہیں کیا وجہ ہے، جس شخص کے ہاتھ میں اختیار آجائے وہ انہی جیسا ہوجاتا ہے جن کی شکائتیں پہلے وہ خود کیا کرتا تھا! یہ اسلئے کہ پہلے اس کی پستیٔ سیرت کے مظاہرے کے مواقع نہیں تھے اسلئے وہ مستور تھی۔ اختیار ملنے پر وہ مشہود ہوگئی۔ یا یہ کہ پہلے اس کے عیوب اور قسم کے تھے۔ صاحبِ اقتدار ہونے ان کی نوعیت بدل گئی۔

لہٰذا یہ عیوب ہمارے پورے معاشرے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ایک مدت سے چلے آرہے ہیں۔ ان میں نہ ادنیٰ کی تخصیص ہے نہ اعلیٰ کی۔ نہ ہی یہ پاکستان تک محدود ہیں۔ مسلمانوں کے تمام ممالک کا یہی حال ہے! اس لئے یہ چیز بھی وجہ مایوسی نہیں ہونی چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کے دو ہی جواب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بھارت ورش کے ہندوؤں سے کہدیا جائے کہ ہم سے حماقت ہوئی جو تم سے الگ ہوگئے۔ ہماری توبہ۔ ہماری ہفت پشت ہفتاد نسل کی توبہ۔ اس خطۂ زمین کو پھر سے ہندوستان میں شامل کرلیجئے اور ہمیں اپنی غلامی میں قبول فرمالیجئے۔ یہ وہ انداز (ATTITUDE) تھا جسے بنی اسرائیل نے اختیار کیا تھا جب صاحبِ ضربِ کلیم انھیں فرعون کی غلامی سے نکال کر سینا کی وادیوں میں لے آئے تھے تاکہ وہاں انسانوں کی ذلت آمیز غلامی سے نکل کر اپنے خدا کے حیات بخش قانون کے مطابق زندگی بسر کرسکیں وہ قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور نہایت تند وتلخ لہجہ میں کہتے کہ تم نے ہم پر ظلم کیا جو یہاں لے آئے۔ ہم وہیں اچھے تھے۔ اب بھی ہمیں وہیں بھیجدو۔ کس اطمینان اور سکون کی تھی وہ زندگی!

نے تیر کماں میں تھا نہ صیاد کمیں میں ۔ گوشے میں قفس کے ہمیں آرام بہت تھا

ہم پوچھتے ہیں اپنے اس مخاطب گروہ سے کہ کیا آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی آرزوؤں کی آماجگاہ، یعنی سرزمین پاکستان پھر سے ہندوؤں کو لوٹا دی جائے

اور آپ اور آپ کی آنیوالی نسلیں ان کی غلامی میں زندگی بسر کریں؟ ہم نہیں سمجھتے کہ اس گروہ میں سے ایک متنفس بھی ایسا ہوگا جو یہ کہے کہ ہاں میں یہی چاہتا ہوں؟ یہ کچھ تو وہ پاگل کہیگا جس کے نزدیک سر درد کا علاج سر کاٹ دینا ہو۔ وہ جو یہ سمجھتا ہو کہ اگر کسی بچے نے سلیٹ پر غلط الفاظ لکھ دیئے ہوں تو بجائے اس کے کہ انھیں مٹا کر ان کی جگہ صحیح الفاظ لکھ دیئے جائیں، اس سلیٹ ہی کو توڑ دینا چاہئے۔ ہمیں اس کی قطعاً توقع نہیں کہ ہمارے زیرِ نظر گروہ میں کوئی بھی ایسا پاگل ہوگا جو اس قسم کا خیال تک بھی دل میں لائے خواہ حالات کی ظلمت انگیزیوں نے اسے کتنا ہی مایوس کیوں نہ کر دیا ہو!

دوسری صورت لامحالہ یہی ہے کہ اب جبکہ یہ خطۂ زمین حاصل ہو چکا ہے، اس میں قوانینِ خداوندی کے نفاذ کی کوشش کی جائے۔ ہم اپنے اس مخاطب گروہ سے پوچھتے ہیں کہ آپ (اور صرف آپ ہی) وہ تھے جو ایک خطۂ زمین اسلئے چاہتے تھے کہ اس میں نظامِ خداوندی کو رائج کیا جاسکے۔ اب اگر آپ ہی ہمت ہار بیٹھیں تو بتائیے کہ اس نظام کی تنفیذ و ترویج کا کوئی امکان باقی رہے گا؟ آپ کے علاوہ کوئی گروہ ایسا نہیں جو اس نظام کی ترویج سے خوش ہو اسلئے کہ اس نظامِ عدل و ربوبیت میں ہر مفاد پرست گروہ کو اپنی موت نظر آتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوتا اسلئے اس نظام میں حکومت و اقتدار کی ہوس رکھنے والوں کی موت ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق (بذریعہ قانونِ خداوندی) قائم ہوجاتا ہے اسلئے اس میں ملا کی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی موت ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں رزق کے سرچشمے، اللہ کے قانون کے مطابق رزق بانٹنے والوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اسلئے اس میں زمینداروں، جاگیرداروں، زراندوزوں اور سرمایہ پرستوں کی موت ہوتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں ہر فردِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (روٹی، کپڑا، مکان، حفاظت) کی بہم رسانی[1] اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کے نشوو ارتقاء کے اسباب و ذرائع کی فراہمی نظامِ معاشرہ کے ذمے ہوتی ہے اسلئے اس میں ہر اس مفاد پرست کی موت ہے جو دوسروں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر ان کے خون کی رنگینی سے اپنے عشرت کدہ کی تزئین و آرائش کا سامان خریدتا ہے۔ سوچئے کہ ان گروہوں میں سے کوئی گروہ بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے کوشاں ہو؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ اتنے ہی پاگل ہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی خودکشی کا سامان بہم پہنچائیں!

اندریں حالات آپ فرمائیے کہ اگر آپ بھی نامساعدتِ حالات سے مایوس ہو کر رسمِ خانقاہیت اختیار کرلیں اور دنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر، گوشوں اور زاویوں میں روٹھ کر بیٹھ جائیں، تو اس نظامِ ربوبیت کی تنفیذ کیلئے آسمان سے فرشتے آئیں گے؟ اگر وہ سر جن میں ربوبیتِ انسانیہ کو بے حجاب جلوہ فرما دیکھنے کا سودا تھا، اس طرح بارِ دوش ہو جائیں، تو کہئے کہ باطل کے انسانیت سوز کا رگہ شیشہ گراں میں کلوخ اندازی کا "جنون" اپنا مسکن کہاں تلاش کرے؟ اگر وہ دل جن میں ارضی معاشرہ کو سماوی قوانین سے ہم آہنگ کرنے کا ولولہ موج انگیز تھا، فرطِ یاس سے لحدِ سینہ میں ہم آغوشِ موت ہو جائے تو فرمائیے کہ مفاد پرستانہ مہرہ بازیوں کی بساط الٹنے کا جذبہ کونسے قلب کو اپنا مامن بنائے؟ سوچئے اور جواب دیجئے! اس کا جواب آپ کے ذمے ہے کہ اگر اس مقام تک پہنچکر، یوں روٹھ کر بیٹھ جانا تھا تو

مکتبِ عشق میں کیا کام تھا، آیا تھا کیوں؟

---

[1] آجکل، طلوعِ اسلام کی دیکھا دیکھی (اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی خاطر) اسلامی جماعت نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ شریعت کے مطابق آئین کی رو سے، افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، حکومت کے ذمے ہونگی حالانکہ اس سے پہلے ان کے ہاں کبھی اس چیز کا ذکر نہیں آتا تھا۔ اب بھی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جب رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت میں ہوں گے تو نظامِ حکومت، افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا سامان کہاں سے فراہم کریگا تو ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہوتا!

اسوقت حالت یہ ہے کہ استبداد کے پنجۂ آہنی میں جکڑی ہوئی انسانیت، متٰی نصر اللہ متٰی نصر اللہ پکار رہی ہے اور تم، کہ جن کی زبانوں پر ان حالات میں بے ساختہ نحن انصار اللہ کا نعرۂ جاں بخش آجانا چاہئے تھا، نامساعدتِ حالات سے منہ موڑ کر بت بنے بیٹھے ہو؟

وائے سنگے کہ صنم گشت و بہ مینا نرسید!

تم مایوس اس لئے ہوگئے ہو کہ تم نے فرض کر لیا ہے کہ حالات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ ان میں تبدیلی پیدا کرنا ناممکن ہے۔ حالانکہ ذالکم الشیطٰن یخوف اولیاءہٗ۔ یہ ابلیس کا دھوکا ہے جو تمہیں اس طرح موہوم چھلاؤں سے ڈراتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ لفظ ابلیس کا مادہ ابلاس ہے اور ابلاس کے معنی ہی ناامیدی ہیں۔ اسلئے ابلیس کا حربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ناامیدی پیدا کر دے۔ اسوقت آپ مایوس ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ پر ابلیس کا جادو چل گیا ہے اور ابلیس کا جادو سوائے فریبِ نگاہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جن حالات کو آپ اسقدر جبر حوصلہ فرسا اور ہمت شکن خیال کرتے ہیں وہ صرف اسوقت تک ہمت شکن ہیں جب تک آپ مایوسیوں کے ابلیسانہ فریب میں گھرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ ایک دفعہ زندہ امیدوں کا سہارا لیکر اٹھ کھڑے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان نگاہ فریب چھلاؤں کا کہیں وجود تک بھی نظر نہیں آئیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا ست! چونکے اندر قیام آئی فنا ست

یہ "برف کے بت" سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی پگھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ محروم دیانت معاشری نظام (CORRUPT SOCIAL ORDER) خود اپنے بوجھ سے ٹوٹ جایا کرتا ہے۔ تدبیر کی فسوں سازیاں اسے زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ باقی رہی مُلّا کی غوغا آرائی۔ تو (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس کا وجود زمینداری کی تائید پر قائم ہے۔ لیکن جب زمانے کے تقاضے خود زمینداری ہی کو ختم کرنے کے درپے ہیں تو اس شاہ بلوط کے آسرے پر ایستادہ انگور کی بیلیں کب تک قائم رہ سکیں گی؟ اس میں شبہ نہیں کہ ان "مقدس پیشوایانِ ملت" کی کوشش یہ ہے کہ ان کا یہ آسرا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے، لیکن ان کی یہ چارہ سازی اسی قسم کی ہے جس قسم کی تدبیریں پیرانِ کلیسا، جمعیت الاقوام کو زندہ رکھنے کیلئے کیا کرتے تھے اور جن کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں۔ اب اس کا آخری حربہ یہ ہے کہ یہ "ماڈرن ازم" کے نقاب میں سامنے آرہی ہے[1]۔ (جیسا کہ پاکستان میں بڑی طور پر ہو رہا ہے) لیکن یہ بھی اس کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ یہ فریب زیادہ دن چل نہیں سکتا۔ اب دنیا قرآن کے بہت قریب آچکی ہے۔ اب ملوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ پرستی۔ نسلی امتیازات۔ جغرافیائی حدود کی بنا پر انسانوں کی تقسیم، وغیرہ غیر قرآنی تصورات، ایک ایک کر کے مٹ رہے ہیں۔ یہ سب ڈوبنے والے تارے ہیں۔ اس لئے

---

[1] سچائی کی افضلیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خود جھوٹ کو بھی سچائی کا نقاب اوڑھ کر سامنے آنا پڑتا ہے۔ کوئی جھوٹا یہ کہہ کر کامیاب نہیں ہو سکتا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اسے اپنی کامیابی کیلئے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں سچ بولتا ہوں۔ اسلئے خود جھوٹا بھی سچ کی کامیابی کا معترف ہوتا ہے۔

سحر قریب ہے۔ اللہ کا نام لے ساقی

یہ ہے حقیقت مخالف قوتوں کی۔ ان کے برعکس، آپ کے پاس قرآن ہے اور قرآن اور نصرت خداوندی (یعنی قانون خداوندی کی تائید) لازم و ملزوم ہیں۔ اس وقت آپ اس تائید و نصرت سے محروم، فلہذا، مایوس، اس لئے ہیں کہ آپ کو قانون خداوندی کی نصرت کو اپنے ساتھ ملانے کا طریقہ یاد نہیں۔ تائید و نصرتِ قانونِ خداوندی کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ آغاز کار (INITIATIVE) انسانوں کی طرف سے ہونا چاہئے۔ جونہی اِدھر سے آغاز کار ہوا اُدھر سے تائید و نصرتِ قانونِ ایزدی کے "ملائکہ" کا نزول شروع ہو گیا۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ۔ ثم استقاموا ۔ تتنزل علیہم الملائکۃ ۔ جن لوگوں نے اس محکم اصول کو اپنا نصب العین حیات بنا لیا کہ ہماری ربوبیت کا دامن، قانونِ خداوندی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور پھر اپنی قوتوں میں توازن پیدا کر کے اس نظام کے قیام کے لئے مصروف عمل ہو گئے۔ تو کائنات کی وہ قوتیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق اعمال کو نتیجہ خیز بنانے پر مامور ہیں ان کی رفیق کار ہو گئیں۔ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم ابتدا اُدھر سے چاہتے ہیں اور اس کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور جب اس طرح اُدھر سے تائید کی آواز نہیں آتی تو ہم پر نا امیدی کی افسردگی طاری ہو جاتی ہے۔ ہم نہیں سوچتے کہ اس میں قصور خود ہمارا ہی ہے نہ کہ تائید ایزدی کا۔

آپ ان گزارشات کو اپنے سامنے رکھئے اور پھر اپنے سینے کو کرید یئے جو اس وقت، خود آوردہ مایوسیوں اور افسردگیوں سے راکھ کا ڈھیر بن رہا ہے۔ اور دیکھئے کہ اس خاکستر کے نیچے وہ چنگاری باقی ہے جس نے کبھی اس نیستانِ نم خوردہ کو شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا؟ اگر اس میں اُس شررِ نہفتہ کا نشان مل جائے (اور ہمیں یقین ہے کہ اس کا سُراغ ضرور مل جائیگا) تو اسے زندہ رکھنے کی کوشش کیجئے کہ

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ　　　کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور اس کے بعد حالات کی نامساعدت۔ مخالفتوں کے ہجوم اور اپنی بے سروسامانی سے نہ گھبرایئے۔ اسلئے کہ شعلۂ عشق کی یہ چھوٹی سی چنگاری جو آپ کے سینے میں زندہ و تابندہ ہے، ہزار سامانوں پر بھی بھاری ہے کیونکہ یہ اپنی زندگی اور تابندگی کیلئے کسی خارجی قوت کی محتاج نہیں۔ اس کی زندگی خود اس کے سوز دروں سے قائم ہے۔ اس قائم بالذات زندگی کی رمق، صرف تمہارے ہی حصے میں آئی ہے۔ اسلئے حیاتِ مستعار کے پیکرانِ آب و گل، تمہاری اس زندہ قوت کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

نورِ قدیمی! شب را بر افروز　　　دستِ کلیمی! در آستینی!

علاوہ بریں جو کچھ آپ کو اس پروگرام کے مرحلۂ اول میں کرنا ہے اس کیلئے کسی خاص سر و سامان کی ضرورت بھی نہیں۔ طلوعِ اسلام نے اپنے دورِ اول میں جو تحریک پیش کی تھی اس میں آپ نے اتنا ہی کیا تھا کہ اس کے پیش کردہ قرآنی مسلک کی عام نشر و اشاعت کی تھی۔ اسی نشر و اشاعت سے یہ تصورات ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تھے۔ اور اس کے بعد انھوں نے از خود اتنی قوت پکڑ لی تھی کہ مخالفت کی آوازیں (جو شروع میں ایک عجیب ہنگامہ آرائی اور طوفان خیزی سے اٹھی تھیں) سب خاموش ہو گئیں۔ اس کیلئے نہ کسی سے تصادم کی ضرورت پیش آئی نہ تزاحم کی۔ نہ ٹکراؤ کی نہ تصادم کی۔ طلوعِ اسلام کی اس تحریک نے تو ثابت ہی یہ کیا تھا کہ

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشہ دارد تراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

جو کچھ آپ نے اُس وقت کیا تھا، وہی کچھ اب کرنے کی ضرورت ہے۔ طلوعِ اسلام گذشتہ پانچ سال سے قرآنی نظام کے بنیادی خطوط کو نہایت واضح الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔ لیکن ہنوز یہ تصور ایک خاص دائرے کے اندر محدود ہے۔ اس کی اشاعت عام نہیں ہوئی۔ ضرورت یہ ہے کہ اس پیغام کو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا جائے۔

بعض گرم رَو، بیتاب فطرت، احباب کہہ دیتے ہیں کہ کسی پیغام کے عام کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل کام تو انقلاب برپا کرنا ہے۔ لیکن حضرات اپنی گرمجوشی میں اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا (اور اگر وقتی ہنگاموں سے کوئی تبدیلی پیدا بھی کر دی جائے تو وہ پائیدار نہیں ہو سکتی) جب تک پہلے ذہنی انقلاب نہ پیدا ہو جائے۔ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی (زیادہ نہیں تو کم از کم) گذشتہ پچاس سالہ تحریکات پر غور کیجئے ان میں سے ہر تحریک[1] بگولے کی طرح اٹھی، ہزاروں انسانوں کو تباہ و برباد کیا۔ لاکھوں اور کروڑوں روپے کا نقصان ہوا لیکن اس کے بعد آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئی، بایں نمط کہ اس کے بعد (سوائے زخم خوردہ پس ماندگان کے) کسی کو یاد تک بھی نہ رہا کہ کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اسلئے کہ ان تحریکات کو خالص جذبات کے آسرے مشتعل کیا گیا تھا اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ برعکس اسکے، اسلام اپنے آپ کو ایک ایسی تحریک کی صورت میں پیش کرتا ہے جس کا تمام تر مدار ذہنی انقلاب پر ہے۔ جو شخص ذہنی طور پر اس تحریک سے متفق نہیں ہوتا، وہ اسے اپنے حلقۂ رکنیت میں داخل ہی نہیں کرتا۔ ذہنی انقلاب سے مراد ہے، قلب و نگاہ کی تبدیلی۔ اسی کو اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یعنی پورے غور و خوض کے بعد اس تحریک کے پیش کردہ نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دینا۔ اسلام پہلے اس قسم کی جماعت تیار کرتا ہے اور پھر ان کے ذریعے خارجی انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ بلکہ بالفاظِ صحیح خود اس جماعت کی اجتماعی زندگی ایسا معاشرہ متشکل کر دیتی ہے جو اس تحریک کا نصب العین ہے۔ یعنی اس جماعت کا وجود خود انقلاب ہوتا ہے۔ اس قسم کی ذہنی تبدیلی، بڑی سست رفتار، صبر آزما اور وقت طلب ہوتی ہے اسلئے تیز مزاج حضرات اس حصۂ پروگرام کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی حصۂ پروگرام، اصلِ عمل ہوتا ہے۔ اگر یہ حصہ کمزور رہ جائے تو اس سے وہ شجر طیب کبھی نہیں ابھر سکتا جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اصلها ثابت وفرعها فی السماء۔ اس قسم کے ذہنی انقلاب کیلئے ضروری ہے کہ اس پیغام کو عام کیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آور ہستی، حضور نبی اکرمؐ سے بھی سب سے پہلے یہی کہا گیا کہ بلغ ما انزل الیك (جو کچھ تم پر نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ)۔ یہی تبلیغ رسالت (اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا مرحلہ) پیش خیمہ تھا اس پیغام کی عملی تشکیل کا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہم طلوعِ اسلام کے پیش کردہ پیغام سے متفق ہو چکے ہیں اسلئے ہمیں اب بتایا جائے کہ اگلا قدم کیا ہے؟ ان حضرات سے گذارش ہے کہ آپ کے اس پیغام سے متفق ہو جانے سے یہ مراد نہیں کہ یہ پیغام بھی عام ہو چکا ہے۔ آپ دوسروں کا قیاس اپنے آپ پر کر رہے ہیں۔ آپ اپنی طرف نہ دیکھئے۔ دیکھئے یہ کہ آپ کے گرد و پیش کتنے لوگ ہیں جو آپ کی طرح، اس پیغام کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دے چکے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں کتنے ایسے ہیں جو ہنوز اُسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ جس دن آپ مطمئن

---

[1] تحریک پاکستان کی صورت جداگانہ تھی کیونکہ اس کی نوعیت ایک تحریک سے زیادہ، عدالت میں پیش شدہ مقدمہ کی سی تھی۔

ہو جائیں گے کہ ان لوگوں کی اکثریت آپ سے ہم نوا ہو چکی ہے، اس دن ہم بتائیں گے کہ اس سے اگلا قدم کیا ہے۔ اس وقت تو آپ کیلئے اگلا قدم یہی ہے کہ

دیکھا ہے جو خود تم نے، اوروں کو بھی دکھلا دو

یعنی قرآن کے نظامِ ربوبیت کا چرچا عام کرتے جاؤ۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ اس پیغام کو اوروں تک پہنچائیں، پہلے ایک مرتبہ خود دہرا لیجئے کہ اس پیغام کے بنیادی خط و خال کیا ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) دنیا میں ہر فرزندِ آدم کے اندر، اللہ کی طرف سے، انسانیت کے جوہر مضمر کر کے رکھدیئے گئے ہیں۔ یہ جوہر صفاتِ خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کے پرتو ہیں اور انہی کی وجہ سے انسان، بحیثیت انسان، واجب التکریم ہے۔

(۲) مقصودِ حیات یہ ہے کہ ان مضمر جوہروں کی مکمل نشوونما کی جائے تاکہ انسان زندگی کے موجودہ اور آئندہ مراحل کو بحسن و خوبی طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے جو قانونِ ارتقاء کا تقاضا ہے۔

(۳) ان انسانی صلاحیتوں کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے اجتماعی زندگی (معاشرہ کا وجود) ناگزیر ہے۔

(۴) قرآن اس معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں ان صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔

(۵) اس مقصد کیلئے اس نے ایسے ابدی اصول عطا کر دیئے ہیں جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

(۶) مسلمانوں کا اجتماعی نظام ان ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین (BYE-LAWS) مرتب کرے گا۔

ان ابدی اصولوں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین کو شریعت کہتے ہیں۔ یعنی ایک حصہ (اصول) غیر متبدل اور دوسرا حصہ (جزئی قوانین) ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل۔

(۷) قرآنی معاشرے کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایسے سامان و ذرائع فراہم کرے جن سے تمام افرادِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کا نشوونما ہوتا جائے۔ چونکہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے انسان کی طبعی ضروریات کا کماحقہ پورا ہونا بنیادی شرط ہے اسلئے ہر فردِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اس معاشرے کے ذمے ہوگا۔

اس معاشرے کی تشکیل ہی اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی نشوونما (ربوبیت) کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

(۸) ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاشرے کی تشکیل کیلئے رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کی بجائے نظامِ اجتماعی کی تحویل میں ہونگے تاکہ ان سے تمام افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا انتظام ہو سکے۔

(۹) اس معاشرے میں "حاکم و محکوم" کا تصور نہیں ہوگا بلکہ ہر فردِ معاشرہ خدا کے قانون کا پابند ہوگا جو خود معاشرے کے مشورے سے نافذ پذیر ہوگا۔

(۱۰) اس نظام کا نام ہے قرآنی نظامِ ربوبیت۔ یعنی خدا کی صفتِ رب العالمینی کا عملی مظہر۔ اس نظام کو (پہلے اپنے اندر قائم کر کے پھر) تمام دنیا تک پھیلا دینا، ملتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے۔

یہ ہے وہ نظام جس کا قیام طلوعِ اسلام کے پیش نظر ہے۔ اس کیلئے پہلا قدم اس تصور کو عام کرنا ہے اور اسوقت طلوعِ اسلام آپ سے اسی کا خواہاں ہے۔ اس تصور کو عام کرنے کیلئے خود طلوعِ اسلام کے سامنے (جو کچھ ہو رہا ہے اس سے زیادہ کچھ کرنے کیلئے) کیا پروگرام ہے، اس کے متعلق آئندہ اشاعت میں گذارش کیا جائے گا۔

شاید آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اسوقت وہ کونسی ضرورت، بالخصوص لاحق ہو گئی تھی جس کیلئے طلوعِ اسلام نے اس تمام داستان کو اس تفصیل سے دہرایا ہے اور اس کے پیغام کو عام کرنے کیلئے خصوصی اپیل کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی ضرورت تو ہر وقت موجود رہتی ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان لوگوں نے جو پاکستان کے خلاف دل میں عناد لئے ہوئے ہیں، اہلِ پاکستان میں بددلی پھیلانے کیلئے اپنی مذموم کوششوں کو تیز تر کر دیا ہے۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ وہ بستی بستی، قریہ بقریہ، گلی گلی، کوچے کوچے، خلوت میں جلوت میں، سفر میں حضر میں، ہر جگہ (شریعت کی آڑ میں) موجودہ معاشرے کی تمام برائیوں کو ایک ایک کر کے گِناتے ہیں اور اس کے بعد عوام کو یہ کہہ کر و رغلاتے ہیں کہ ان سب برائیوں کا ذمہ دار پاکستان ہے۔ مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ہم تحریکِ پاکستان کی اسی لئے مخالفت کیا کرتے تھے! اس کے بعد وہ یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان تمام خرابیوں کا علاج صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ برسراقتدار طبقہ کو حکومت سے الگ کر کے نظم و نسق "خدا کے صالح بندوں" کے ہاتھ میں دیدو۔ (اور یہ ظاہر ہے کہ "خدا کے صالح بندے" یہ خود ہیں)۔

اس مہم کو ان لوگوں نے آجکل بہت تیز کر رکھا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ عوام میں بددلی اور شکستہ خاطری بڑی سرعت سے پھیل رہی ہے جس کا نتیجہ سوائے انتشار (CHAOS) کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی ملک میں انتشار پھیل جانا، اس ملک کی موت ہوتی ہے۔ (بالخصوص آجکل کے بین الاقوامی حالات میں)۔

یہ ہے صورتِ حالات کا وہ شدید احساس جس کے ماتحت ہم نے اس مخلص طبقہ کی توجہ کو اس طرف منعطف کرانا ضروری سمجھا ہے جو سرزمینِ پاکستان کی حفاظت کو اسلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں اس نظامِ خداوندی کا قیام ہو سکے گا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم، مندرجہ بالا ہر سہ طبقات کے ان تمام مخلص احباب سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جن کے دل میں پاکستان کا سچا درد ہے اور جو چاہتے ہیں کہ یہ خطۂ زمین مستقبل کی خوشگواریوں کا گہوارہ بن جائے۔ ہم طبقۂ اول (عوام الناس) سے کہیں گے کہ اس میں شک نہیں کہ آپ کی بہبودی اور خوشحالی کیلئے اربابِ بست و کشاد کی طرف سے وہ کچھ نہیں ہوا جو کچھ ہونا چاہئے تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ خود پاکستان کی طرف سے بددل ہو جائیں۔ ایک بنیادی چیز کو ہمیشہ یاد رکھئے اور وہ یہ ہے کہ عوام کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے صرف حکومت ہی ذمہ دار نہیں ہوا کرتی خود عوام کا اس میں بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے اسلئے آپ اپنی حالت کو بہتر بنانے کیلئے خود بھی کوشش کیجئے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی اصلاح آپ خود کر سکتے ہیں۔ کم از کم ان کیلئے تو کسی خارجی امداد کا انتظار نہ کیجئے۔

یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان میں "آئینِ شریعت" کا نفاذ ہو گیا تو عوام کی حالت اسی دن سنور جائیگی۔ یہ بھی

ذریعہ ہے اور محض آپ کے ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ۔ اول تو جس قسم کا "آئینِ شریعت" ان لوگوں کے ذہن میں ہے اس میں عوام کی حالت نہ کبھی سدھری تھی نہ سدھر سکتی ہے۔ وہ آئین مفاد پرستی اور سرمایہ داری کا محافظ ہے جس میں عوام کو ہمیشہ لوٹا کھسوٹا گیا ہے۔ اس آئین میں بھی دنیا کی خوشگواریاں مفاد پرست طبقے کے حصے میں آئیں گی اور آپ کو "آخرت میں جنت ملنے کی تھپکیاں دیکر سلا دیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ قوموں کی حالت خالی قوانین کے زور پر نہیں بدلا کرتی۔ اس کیلئے ذہنی تبدیلی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی تبدیلی صرف قرآنی فکر سے پیدا ہو سکتی ہے اور یہی وہ تبدیلی ہے جس سے صحیح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قانون کا کام معاشرہ کے مستثنیات (EXCEPTIONS) یعنی جرائم پسند طبائع کی روک تھام ہوتا ہے۔ نہ کہ صحیح معاشرہ کی تخلیق۔ اسلئے آپ کی اصلاح کا راز بھی صرف قرآنی فکر کے عام ہونے میں ہے۔

اس کے بعد ہم برسرِ اقتدار طبقہ کے مخلص حضرات سے عرض کریں گے کہ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان نئی نئی وجود میں آئی ہے اور اس کے نظم و نسق کو اطمینان بخش سطح تک پہنچنے میں وقت لگے گا لیکن بہت سے کام ایسے بھی ہیں جو آپ حضرات کی تھوڑی سی محنت، فکر اور ایثار سے بہ حسن و خوبی سرانجام پا سکتے ہیں۔ ایسے امور کیلئے یہ عذرات کہ مملکت نئی ہے اور قوم بڑی نااہل ہے، محض اعذارِ بارده ہیں جو زیادہ دیر تک کارگر نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تو کم از کم عوام کی موجودہ بھوک ہی کا کچھ علاج کیجئے۔ اس وقت پاکستان کے بعض علاقوں میں روپے کا ڈیڑھ سیر آٹا ملتا ہے[1]۔ آپ سوچئے کہ کتنے لوگ ہیں جو اس نرخ پہ آٹا خرید کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکتے ہیں؟ یہ حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے اور اس کے نتائج و عواقب بالکل کھلے ہوئے ہیں۔ حکومت اور عوام کا تعلق باپ اور بچوں کا سا سمجھا جاتا ہے۔ جو باپ اپنے بچوں کا پیٹ نہ پال سکے اسے سوسائٹی میں کبھی عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ برسرِ اقتدار افراد کی جگہ دوسرے افراد کے آنے سے حالات سدھر جائیں گے، ہم ان سے عرض کریں گے کہ سوال افراد کا نہیں، پورے کے پورے معاشرے کا ہے۔ ہم نے مختلف صوبوں میں افراد کو بدل بدل کر بھی دیکھ لیا ہے۔ اس سے بھی حالات میں کچھ فرق نہیں پڑا۔ اس لئے آپ اس کوشش کی بجائے عوام کی حالت کو بہتر بنانے کیلئے اور کوششیں کیوں نہیں کرتے؟ بہت سے اصلاحی کام تھے جنہیں ہم نے انگریز کے عہدِ حکومت میں، حکومت کی مدد کے بغیر سرانجام دیا۔ آپ یہی سمجھ لیجئے کہ اسوقت بھی وہی حالات ہیں۔ اس کے بعد ان اصلاحی کاموں کی طرف توجہ دیجئے اور کچھ نہیں تو قوم کی تعلیم کے لئے ہی کچھ کیجئے۔ آپ کی موجودہ رسہ کشی میں قوم کا کچومر نکل رہا ہے۔ اس کی جگہ ان کی بہبودی کی صورتیں سوچئے۔

اب رہے وہ حضرات جو نہایت دیانتداری سے سمجھ رہے ہیں کہ ملک میں "قانونِ شریعت" نافذ ہو جانے سے حالات بدل جائیں گے، سو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ مسلمانوں کے جن ممالک میں اس وقت ملّا کی شریعت کا قانون نافذ ہے ذرا ان ممالک کی حالت پر غور کیجئے (مثلاً سعودی عرب) اور پھر سوچئے کہ کیا ان ممالک کی حالت فی الواقعہ اطمینان بخش ہے اور کیا آپ اسی قسم کے حالات یہاں دیکھنا چاہتے ہیں؟
حقیقت یہ ہے کہ ملا کے نزدیک شریعت کے قوانین سے مراد وہ فقہی قوانین ہیں جو تعزیرات یا شخصی قانون (PERSONAL LAWS)

---

[1] بالخصوص صوبہ سرحد میں غلّے کی گرانی انتہائی شدت اختیار کر چکی ہے اور اکثر علاقوں میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان کے گاؤں میں بجلی کی جگمگاہٹ ان کی بھوک کا علاج نہیں کر سکتی۔

کی حیثیت سے نافذ ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان فقہی جزئیات کو بھی اپنی جگہ اہمیت حاصل ہے لیکن اسلام جس معاشری انقلاب کا مقتضی ہے وہ انقلاب ان تعزیری احکام کے تنفیذ سے برپا نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے اسی قرآنی نہج زندگی کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ چونکہ ہمارے ملا کے نزدیک اسلام نام ہی انہی جزئی احکام کا ہے، وہ انہی پر زور دیتا ہے اور اسی لئے زور دیتا ہے کہ اس سے اس کا اپنا اقتدار قائم رہتا ہے۔ ہم ہزار برس سے "ملا کے اس اسلام" کے نتائج دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ کیا آپ ان تاریخی شواہد کی موجودگی میں پھر اسی تجربے کو دہرانا چاہتے جس نے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو اس پستی کی حالت تک پہنچا رکھا ہے؟

اس کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر اپنے اس مخاطب طبقے کو سامنے لاتے ہیں جس سے اتنا کچھ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ حالات جس حد تک بھی یاس انگیز ہیں، کیا آپ کا اس پر ایمان ہے یا نہیں کہ قرآن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان میں بھی انقلاب پیدا کر سکتا ہے؟ اگر (معاذ اللہ) آپ کا اس پر ایمان نہیں رہا تو پھر آپ سے ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ اور اگر آپ کا اس پر ایمان ہے تو پھر سوچئے کہ کیا آپ پر اس ضمن میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ یاد رکھئے۔ اسوقت، پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا قرآن کے پیغام ربوبیت کے لئے تڑپ رہی ہے۔ کیا آپ اس پیغام کے عام کرنے میں کچھ بھی حصہ نہیں لیں گے؟

اپنے دل سے فیصلہ کرنے کے بعد پرچہ ایک طرف رکھئے؟ کیونکہ آپ کے فیصلے پر ایک عظیم الشان مستقبل کا انحصار ہے۔

(۲)

جمع القرآن | سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ اشاعت حاضرہ میں علامہ تمنا عمادی کی گراں قدر تصنیف "جمع القرآن" پوری کی پوری شائع کی جائیگی۔ وہ تصنیف اشاعت رواں میں شامل ہے۔ علامہ تمنا صاحب کا اسلوب نگارش قدیم طرز کا ہے جس سے قارئین طلوع اسلام زیادہ مانوس نہیں۔ لیکن انھوں نے موضوع پیش نظر پر جس کاوش اور تجسس سے تحقیق فرمائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان کی تصنیف کا بڑے غور سے مطالعہ کیا جائے۔ چونکہ اس تصنیف کا حجم زیادہ تھا اسلئے موجودہ پرچہ، اگست و ستمبر کا مشترکہ پرچہ ہے۔ اس کے بعد ہم یکم اکتوبر کو پھر حاضر ہوں گے۔ ہمیں احساس ہے کہ قارئین طلوع اسلام، اس ایک ماہ کے بُعد کو بہت محسوس کرینگے۔ لیکن وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ ناگزیر تھا۔

ہمارے پاس استفسارات آرہے ہیں کہ مرزائیوں کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک کیا ہے۔ ان حضرات کو ہم فرداً فرداً جواب نہیں دے سکتے۔ وہ براہ کرم طلوع اسلام کا شائع کردہ پمفلٹ "احمدیت اور اسلام" پڑھ لیں۔ اس سے انھیں احمدیت کی حقیقت اور ان کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک نہایت عمدگی سے معلوم ہو جائے گا۔ قیمت مع محصولڈاک ۱۲ر

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ

صحاح کی

احادیث جمع قرآن

اور

ان کی بے لوث تنقید

علامہ تمنا عمادی مدظلہ

فہرست مضامین

معراج انسانیت (معارف القرآن جلد چہارم)

سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام
قرآن کے آئینے میں

قیمت بیس روپے (۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۲ء تک رعایتی قیمت بارہ روپے) محصولڈاک بذمہ خریدار

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم و بہ نستعین
الحمد للہ رب العلمین۔ وسلام علی المرسلین۔ لاسیما علی خاتم النبین۔ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

مُقَدَّمَہ

الحمد للہ کہ میں ایک مسلم ہوں، اور مسلم جینے اور مسلم ہی مرنے کا آرزومند ہوں۔ اللہ، اللہ کے رسول، اور اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتا ہوں سنت رسول و سنت خلفائے راشدین پر عمل کرتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ جو قرآن ہم لوگوں کی تلاوت میں ہے بلفظہٖ لفظاً اور حرفاً حرفاً بالکل اسی طرح ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا اور آپ نے مرتب و مدوّن صحابہ کو دیا تھا۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید ۝ باطل نہ اس کے آگے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے۔ حکمت کے مالک حمد و ستائش کے تنہا مستحق کی طرف سے اترا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا خود وعدہ فرمایا ہے نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۝ ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہمیں اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ان علینا جمعہ وقرآنہ ۝ اس کو جمع کرا دینا اور پڑھوا دینا میرے ذمے ہے یہاں تک کہ لتبین للناس ما نزل الیہم کے مطابق تبیین قرآن کی خدمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تھی اس کے بارے میں بھی فرمایا ثم ان علینا بیانہ یعنی پھر اس قرآن کو تم سے بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ یعنی ہم تم سے صحیح و مکمل تبیین کرا دیں گے۔

ان وعدوں کے ہوتے کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن کا نقطہ بھی اِدھر کا اُدھر ہو جائے؟ ایک حرف بھی بدل جائے؟ اور کوئی نقطہ بھی چھوٹ جائے؟ چہ جائیکہ کوئی آیت غائب ہو جائے؟ معاذ اللہ من ذالک! قرآن مبین میں یہ اعلان واضح بھی موجود ہے کہ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا ۝ اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا یعنی انسانی تصنیف ہوتا، تو اس میں بہت سے اختلاف لوگ پاتے۔ یعنی تقریباً تیئیس برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا مختلف وقتوں اور مختلف احوال اور مختلف زمانوں میں لوگوں کی تعلیم اور حفظ کی سہولت کے خیال سے نازل ہوتا رہا۔ اس وقت بھی جب مسلمان مشرکین مکہ کے مظالم جھیل رہے تھے، اس وقت بھی جب کہ مسلمانوں کی ایک جماعت مشرکین مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر گئی تھی، اس وقت بھی جب کہ صحابہ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے ہجرت کر کے مدینے چلے آئے تھے اور یہاں بھی دشمنوں کے حملہ کی وجہ سے اطمینان و سکون مسلمانوں کو پوری طرح حاصل نہ تھا۔ اور اس وقت بھی جب کہ مسلمان ایک فاتح قوم تھی اور اس کی دھاک سارے عرب میں بیٹھ گئی تھی۔ اتنے مختلف احوال اور مختلف ماحول میں ایک انسان کی باتیں یقیناً مختلف ہی ہوں گی۔ مگر قرآن کی ابتدائی تعلیم، وسطی تعلیم اور آخری تعلیم سب کو ملا کر دیکھئے تو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں نظر آئیں گی اور کسی طرح کی نامناسبت کہیں نہیں معلوم ہوگی، اختلاف کا کیا ذکر ہے۔

مگر جب فرقہ بندی کا دور آیا تو پھر کونسا دینی مسئلہ ہے جس میں ہمارے اسلاف نے اختلاف پیدا نہ کیا۔ اسلامی توحید بھی وحدت وجود وحدت شہود کے اکھاڑے میں پھنس کر اختلافات سے نہ بچ سکی نماز جیسا اہم فریضہ جس کو ہر مسلم مرد، عورت بوڑھا جوان یہاں تک کہ بچے بھی عہد نبوی سے لے کر آج تک ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ مرتبہ پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ چار پانچ طریقہ سے پڑھی جا رہی ہے۔ حالانکہ رسول صلعم کی آخری نماز یقیناً کسی ایک ہی طریقہ کی ہوگی، اور جب بوجہ معذوری آپ خود مسجد نہ جا سکے تو آپ نے فرمایا کہ مروا ابا بکر یصلی بالناس۔ ابوبکرؓ سے کہو کہ وہ لوگوں میں نماز پڑھائیں۔ تو یقیناً حضرت صدیق اکبر نے اسی طرح نماز پڑھائی ہوگی جس طرح رسول صلعم نے آخری نماز پڑھی تھی۔ اور تمام صحابہ نے بھی اسی طرح پڑھی ہوگی۔ پھر بعد وفات نبوی کے حضرت صدیق اکبرؓ تاحیات اسی ایک طریقے سے نماز پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہوں گے اور سب نے اسی ایک طریقے سے برابر پڑھی ہوگی۔ اسی طرح ہر خلیفہ نے اسی ایک طریقے سے ہمیشہ نماز پڑھی اور پڑھائی ہوگی

اور سارے اہلِ مدینہ اسی ایک طریقہ سے نمازیں پڑھتے رہے ہوں گے۔ کوئی وجہ ہی نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کا بھی اختلاف ہو۔ پھر یہ چار پانچ طریقے کی نمازیں کہاں سے آگئیں؟ کوئی ہے جو اس کی صحیح وجہ بتا دے؟[1]

غرض تفسیر اور مطالب میں تو طرح طرح کے اختلافات پیدا ہی کئے گئے الفاظ میں بھی اختلافات پیدا کئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کے ثبوت کے لئے انزل القرآن علی سبعۃ احرف ایسی حدیث پیش کی گئی جس کے صحیح اور قطعی معنی آج تک کوئی نہ سمجھ سکا کہ اَحْرُف سے یہاں کیا مراد ہے۔ اور پھر اختلافات قرات کا طومار لگا دیا گیا۔ اور اس طرح قرآن کے عدم اختلاف کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ دیکھو ہر طرح کا اختلاف لفظاً و معنیً دو چار یا دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں موجود ہیں۔ مگر قرآن کا بھی عجیب اعجاز ہے۔ اس نے بارے میں پہلے ہی کہہ دیا کہ ان الذین اختلفوا فی الکتٰب لفی شقاقٍ بعید ○ جن لوگوں نے اللہ کی کتاب میں اختلاف پیدا کیا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ صدق اللہ۔ ومن اصدق من اللہ قیلا۔

نفسِ قرآن مجید کے بارے میں ایسی ایسی روایتیں ملتی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان روایتوں کو محدثین نے کس طرح اپنی کتابوں میں داخل کر لیا۔ مثلاً

صحیح بخاری جلد اوّل، آخر باب اوّل از کتاب البیوع صفحہ ۲۷۵ میں منقول ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم (بقرہ ع ۲۵) کے بعد فی مواسم الحج کے اضافہ کے ساتھ یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور ابن عباسؓ اسی اضافے کیساتھ پڑھتے تھے۔

۲۔ ترمذی (ب۲ صفحہ ۱۱۱) میں ہے کہ سورہ واللیل میں جو وما خلق الذکر والانثیٰ ہے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ وَالذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى پڑھتے تھے (صحیح مسلم ب۱ ص۲۷۷)

۳۔ اور ترمذی (ب۲ ص۱۱۱) میں یہ بھی ہے کہ سورہ ذاریات میں جو ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین ہے اس کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ انی انا الرزاق الخ پڑھا کرتے تھے۔ (ابو داؤد ب۲ ص۱۹۹)

۴۔ ابن مردویہ کی کتاب سے کنز العمال (ب۱ ص۲۷۱) مؤلفہ ۹۵۷ھ میں منقول ہے کہ ولا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا جو سورہ بنی اسرائیل ع۴ میں ہے اس کو حضرت ابی بن کعبؓ یوں پڑھتے تھے ولا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشۃ ومقتا وساء سبیلا ○ الا من تاب فان اللہ کان غفوراً رحیما ○ حضرت عمرؓ نے[2] ٹوکا تو کہنے لگے کہ میں نے اس کو رسول اللہ صلعم کی زبانِ مبارک سے سیکھا ہے۔ اور تمہارا تو بازار کی خرید و فروخت کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ یہ روایت ابی یعلیٰ میں بھی ہے

۵۔ کنز العمال (۹۵۷ھ تالیف) کے اسی صفحہ میں ہے کہ ابی بن کعبؓ[3] نے کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے سامنے قرآن پڑھوں تو آپ نے لم یکن الذین کفروا کا سورہ پڑھا اور اس میں یہ آیتیں بھی پڑھیں۔ اِنَّ ذَاتَ الدِّیْنِ عِنْدَ اللّٰہِ الْحَنِیْفِیَّۃُ۔ لَا الْمُشْرِكَۃُ وَلَا الْیَھُوْدِیَّۃُ وَلَا النَّصْرَانِیَّۃُ وَمَنْ یَّعْمَلْ خَیْرًا فَلَنْ یُّكْفَرَ لَہٗ۔ اور رسول اللہ صلعم نے ان کے سامنے یہ بھی پڑھا لو کان لابن ادم وادٍ لابتغی الیہ ثانیا۔ ولو اُعطی الیہ ثانیاً لابتغی ثالثاً ولا یملأ جوف ابن ادم الا التراب ویتوب اللہ علی من تاب۔

---

[1] میں نے اپنی کتاب "اقامِ الصلوٰۃ" میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور اس پر روشنی ڈالی ہے کہ اگر مختلف ان کے اصول کی روایتیں صحیح ہیں تو ان کی کیا توجیہ عقلِ سلیم کر سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں۔ ۱۲ منہ عفی اللہ

[2] حضرت عمرؓ جیسے محقق یہ سن کر چپ رہ گئے اور دوسرے صحابہ سے نہ پوچھا کہ ابن مسعودؓ کے سوا اور بھی کسی نے رسول اللہ صلعم سے اس طرح سیکھا یا پڑھتے سنا؟ ۱۲ منہ

[3] ابی بن کعبؓ انصاری ہیں عقبہ ثانیہ میں ایمان لائے لم یکن الذین کفروا کا سورہ مکی ہے اور مکہ کی ابتدائی سورتوں میں سے ابی بن کعبؓ سے زیادہ حضرت عمرؓ واقف تھے۔ اگر یہ اضافہ مدینہ میں ہوا تو حضرت عمرؓ ابی سے سن کر ضرور دوسرے صحابہ سے اسکو پوچھتے چپ نہ رہ جاتے۔ ۱۲

عـ۶ سورہ فتح میں ہے إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۔ کنز العمال (ص۲۷۹ ج ۱) میں بحوالہ نسائی وکتاب المصاحف ابن ابی داؤد و مستدرک و صحیح ابن خزیمہ منقول ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ اس آیت میں حمیۃ الجاھلیۃ کے بعد "وَلَوْ حَمِيتُمْ كَمَا حَمُوا لَفَسَدَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ" کا فقرہ بھی پڑھتے تھے (نفسہٗ کا ضمیر کا مرجع مجھے معلوم نہ ہوا۔ شاید انفسھم ہو) اس اضافہ کے سلسلے میں حسب روایت منقولہ حضرت ابیؓ نے حضرت عمرؓ کے ٹوکنے پر کہا کہ "تم جانتے ہو کہ میں[1] رسول اللہ صلعم کے پاس رہتا تھا، اور وہ ہمیں اپنے سے قریب رکھتے تھے اور تم دروازے پر رہا کرتے تھے۔ اگر تم پسند کرتے ہو کہ میں لوگوں کو قرآن پڑھاؤں اس کے مطابق جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے پڑھایا ہے، تو میں پڑھاؤں گا۔ ورنہ جبتک زندہ رہوں گا کبھی کسی کو کچھ نہیں پڑھاؤں گا۔

عـ۷ حضرت عمرؓ کہیں جارہے تھے ایک لڑکے کو مصحف دیکھ کر قرآن پڑھتے سنا۔ وَالنَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ (سورہ احزاب رکوع اوّل) اور اس کے بعد اس نے پڑھا وَهُوَ أَبٌ لَهُمْ حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا اے لڑکے اس فقرے کو مٹا دو اس لڑکے نے کہا یہ مصحف ابیؓ کا ہے۔ حضرت عمر ابی بن کعبؓ کے پاس گئے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مجھ کو[2] قرآن اپنی طرف مشغول رکھتا تھا، اور تمہیں بازار کی خرید و فروخت اپنی طرف مشغول رکھتی تھی۔ (کنز العمال ج۱ ص۲۷۹ بحوالہ صحیح سعید بن منصور و مستدرک)

عـ۸ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عمرؓ کے پاس پڑھا[3] لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغَى الثَّالِثَ وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ تَابَ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ابن عباسؓ نے کہا کہ مجھ کو ابی بن کعبؓ نے یہ پڑھایا ہے۔ حضرت عمرؓ ابی کے پاس آئے اور پوچھا تو انھوں نے کہا کہ مجھ کو رسول اللہ صلعم نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ (کنز العمال بحوالہ مسند احمد و سعید بن منصور و ابو عوانہ) مگر حضرت عمرؓ نے کسی دوسرے صحابی سے کبھی اس کو دریافت نہیں فرمایا۔ والعجب ہی تعجب ہے۔

عـ۹ صحیح مسلم ج۱ ص۴۶۹ میں ہے کہ "قرآن میں اترا تھا کہ دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ہوجاتی ہے، پھر وہ منسوخ ہوگئی اور پانچ گھونٹ کا حکم آیا۔ یعنی خَمْسُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ کی آیت اتری جو قرآن میں پڑھی جاتی ہے" کوئی ہے جو بتائے کہ قرآن میں یہ عبارت کہاں پر ہے؟ (نسائی ج۲ ص۸۱)

عـ۱۰ سنن ابن ماجہ جو صحاح ستہ میں کی ایک کتاب ہے اس کے ص۱۴۱ باب رضاع الکبیر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف یہ

---

[1] یہ کس زمانے کا واقعہ ہے؟ کہ حضرت عمرؓ دروازے پر رہا کرتے تھے اور رسول اللہ صلعم اپنے حجرے میں ابی کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا کرتے تھے؟ کس رافضی کذاب کا افترا ہے جو اظہر من الشمس ہے ۱۲ منہ

[2] یہ عبارت خود بتلا رہی ہے کہ اس حدیث کا گڑھنے والا کوئی رافضی خبیث تھا۔ حضرت عمرؓ کوئی بہت بڑے تاجر نہ تھے کہ دن رات اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حضرت عمرؓ پر قرآن دانی و قرآن فہمی میں کوئی فضیلت نہ تھی۔ عہد نبوی سے رسول اللہ صلعم کے بعد تمام صحابہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ ہی کو اپنے میں سب سے افضل سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ایسا خلاف واقعہ کلمہ کیوں کہنے لگے یہ ان پر صریحاً اتہام ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

[3] یہ عبارت عـ۵ میں گذر چکی ہے۔ وہ خاص ابی بن کعب سے روایت کرنے والے نے روایت کی ہے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد وہاں کی عبارت اور اس عبارت ملا کر دیکھئے۔ کسقدر فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے، ان حدیثوں کے گڑھنے والوں کو وہ خوب جانتا تھا اس سے پہلے ہی فرما دیا کہ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا جو لوگ ہماری آیتوں میں الحاد کریں گے وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے (حٰم سجدہ ع۲۴) تعجب تو یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کے ایسے ایسے سخت جواب سنکر بھی حضرت عمرؓ جیسا سخت آدمی خموش رہ جائے۔ آپ نے یہ نہ کیا کہ تمام صحابہؓ کو یکجا کر کے سب سے پوچھتے کہ آپ لوگوں نے کبھی اس طرح ان الفاظ کو قرآن کے جز کی حیثیت سے رسول اللہ صلعم سے سنا؟ فوراً حقیقت کھل جاتی۔ حضرت عمرؓ نے کسی سے تحقیق نہ کی اور چپ رہ گئے اس کی کیا وجہ ہے؟

یہ جھوٹی روایت منسوب کی گئی ہے کہ نعوذ باللہ انھوں نے فرمایا کہ آیت رجم اور رضاعت کبیر دس (گھونٹ) والی آیت ایک صحیفے میں تھی میرے تخت کے نیچے۔ تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات فرما گئے تو ہم لوگ اس حادثے میں مشغول ہو گئے تو گھر کی پالتو بکری آ گئی اور اس صحیفے کو کھا گئی (یعنی اسی وجہ سے وہ آیت رجم اور سن رسیدہ آدمی کی رضاعت کے لئے جس آیت میں دس گھونٹ دودھ کی مقدار بتائی گئی تھی قرآن میں داخل نہ ہو سکی۔ اور وہ آیتیں ضائع ہو گئیں) معاذ اللہ من ذالک!

۱۱۔ معوذتان (قل اعوذ برب الفلق و قل اعوذ برب الناس) کے بارے میں حضرت اُبی بن کعبؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھ کو اللہ نے کہا "قُل" یعنی "کہو"، تو میں نے کہا۔ ابیؓ کہتے ہیں کہ میں بھی کہتا ہوں جس طرح رسول صلعم نے کہا۔ (یعنی بغیر لفظ "قل" کے صرف اعوذ برب الفلق الخ اور اعوذ برب الناس الخ وہ پڑھتے تھے) (بخاری ۲ ص ۴۴۷ قبل کتاب الواب فضائل القرآن) آخر تفسیر ابن کثیر میں مسند احمد وغیرہ سے بھی متعدد روایتیں اسی مضمون کی نقل کی ہیں حضرت ابی بن کعبؓ عبداللہ بن مسعودؓ دونوں کے بارے میں اس قسم کی روایتیں ہیں بلکہ مسند احمد کی ایک روایت میں تو صاف ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ صاف انکار کرتے تھے کہ یہ دونوں سورتیں کتاب اللہ سے ہیں ہی نہیں۔ یہ تو صرف جھاڑ پھونک کے لئے بطور افسوں کے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

۱۲۔ اسی سلسلے میں تفسیر ابن کثیر کے آخر میں اس کی روایتیں بھی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصاحف سے معوذتین کو مٹا دیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان دونوں سورتوں کو قرآن میں داخل نہیں سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ حضرت اُبی بن کعبؓ بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ابن کثیر نے بطور خود حسن ظن ظاہر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے تمام صحابہؓ سے الگ ایک راہ اختیار نہیں کی ہوگی (اوّل)۔ یہ ضرور اپنے خیال سے رجوع کر لیا ہوگا۔ مگر رجوع کی کوئی روایت پیش نہیں کی ہے۔

۱۳۔ آیت رجم کے بارے میں ایک روایت تو سنن ابن ماجہ سے ہم ۱۰ میں نقل کر چکے ہیں کہ اس کو بکری کھا گئی۔ اسکے علاوہ اتنی متضاد و متغائر متعدد حدیثیں اس کے متعلق ہیں کہ میرا ایک مستقل رسالہ ہی ان حدیثوں کی تنقید میں بصورت مسودہ موجود ہے۔ قرآن میں داخل نہ ہونے کی وجہ ایک روایت میں یہ ہے کہ جمع قرآن کے وقت جو شخص جو حصہ قرآن لاتا تھا اگر اپنے ساتھ ایک گواہ بھی لایا تو وہ حصہ درج کیا جاتا تھا گواہ نہیں ملتا تو درج نہیں کیا جاتا تھا۔ آیت رجم کو صرف حضرت عمرؓ لائے تھے اور کوئی دوسرا گواہ اسکو نہ ملا اس لئے قرآن میں درج نہ ہو سکی۔ مگر خدا جانے کیوں اس کو صرف منسوخ التلاوۃ مانا گیا اور اس کا حکم باقی رکھا گیا۔ جب قرآن کی آیت نہیں تسلیم کی گئی تو پھر اس کا حکم کیوں باقی رکھا گیا؟

۱۴۔ آخر سورۂ توبہ کی دو آیتوں کے بارے میں حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا کہ اگر یہ تین آیتیں ہوتیں تو ہم ان کو ایک سورہ قرار دیدیتے مگر یہ دو آیتیں ہیں ان کو کسی سورہ کے آخر میں لگا دو۔ (اتقان) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اپنے اختیار سے سورتیں بنا لیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم صرف منتشر آیتیں چھوڑ گئے تھے۔ معاذ اللہ من ذالک

۱۵۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ صلعم فرماتے تھے کہ اس کو کسی ایسی سورت میں لکھ دو جس میں اس قسم کی آیتیں ہوں۔ یہ روایت اتقان وغیرہ متعدد کتابوں میں ہے۔ یعنی آنحضرت صلعم نئی نازل شدہ آیت کا مقام، محل تعین کر کے نہیں بتلاتے تھے

لہ مگر تعجب ہے کہ قل ھو اللہ احد کے بارے میں بھی حضرت ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ نے یہی کیوں نہ کہا۔ یہاں بھی تو ہی ھو اللہ احد کہنے کا حکم ہے۔ اس کو بھی بغیر "قل" ہی کے پڑھتے۔ مگر یہ سب بہتان ہیں ان صحابہ کرام پر۔ ملاحدہ و زنادقہ کی من گھڑت حدیثیں ہیں۔ بغیر "قل" کے پڑھنا صرف حکم کی تعمیل ہوگی تلاوت قرآن نہ ہوگی۔ اور قل کے ساتھ اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے پڑھنا تلاوت بھی ہوگی اور حکم کی تعمیل بھی۔ کیا اکابر صحابہ اتنا نہیں سمجھ سکتے تھے؟ فلعنۃ اللہ علی الکاذبین ۱۲ منہ غفرلہ

ٹہ یہ مضمون ترمذی ۲ ص ۱۳۳ میں بھی ایک طویل حدیث میں ہے جس کا ترجمہ آگے ۱۵ میں آتا ہے ۱۲ منہ غفرلہ

کہ فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد لکھو۔ کاتبین اپنی سمجھ کے مطابق مضمون کی مناسبت دیکھ کر لکھدیا کرتے تھے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم تھا۔ معاذ اللہ!

ع۱۶ حضرت عمرؓ نے کسی آیت کے بارے میں لوگوں سے دریافت کیا۔ تو کہا گیا کہ وہ تو فلاں شخص کے پاس تھی جو جنگ یمامہ میں شہید ہوگئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (اتقان وکنز العمال وغیرہ کے جلد اول صفحہ ۲۸) یعنی وہ آیت دنیا سے ہی نابید ہوگئی۔ ایسی حدیثوں کے بنانے والے تو یقیناً منافق تھے۔ مگر ان روایتوں کو اپنی کتاب میں درج کرنے والوں کو میں کیا کہوں؟

ع۱۷ سورۂ حج کے ساتویں رکوع میں جو فرمایا گیا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ الآیہ اس کی تفسیر میں سرخیل مفسرین ابن جریر الطبری، اور بزار[1] اپنی مسند میں، بیہقی نے دلائل النبوۃ میں، بغوی نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حاتم وغیرہ متعدد محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں اور بہتیرے مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں شیطانی روایت درج کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب رسول اللہ صلعم سورہ نجم پڑھ رہے تھے اور سامعین میں مومنین و مشرکین سب تھے تو جب آپ نے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى پڑھا تو فوراً شیطان نے آپ کی زبانِ مبارک سے ملوا دیا تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى۔ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَجٰى جس کو سنکر مشرکین مکہ بہت خوش ہوئے کہ انھوں نے ہمارے بتوں کی تعریف کی اور جب آخر سورہ نجم پر آپ نے سجدہ کیا تو مسلمانوں کے ساتھ تمام مشرکین نے بھی سجدہ کیا بجز ولید بن مغیرہ کے کہ اس نے صرف ایک مٹھی خاک اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی اور کہا کہ یہی کافی ہے۔ وغیر ذالک من الھفوات متاخرین مفسرین نے اس روایت کو مرسل قرار دے کر ضعیف اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر دبی زبان سے۔ کسی کی یہ ہمت نہیں پڑی کہ صاف صاف کہدیں کہ یہ ملاحدہ وزنادقہ کی گھڑی ہوئی روایت ہے۔ اور منافقین نے اس کو مشہور کر دیا ہے۔

ع۱۸ ترمذی میں عوف بن ابی جمیلہ جس کو تہذیب التہذیب میں قدریہ، رافضی شیطان لکھا ہے، اسی سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ تم لوگوں نے سورہ انفال کو جو "مثانی" میں سے ہے اور سورۂ توبہ جو "مئین" میں سے ہے ساتھ ساتھ کیوں کر دیا؟ اور پھر درمیان میں بسم اللہ[2] بھی نہیں لکھی اور اس کو تم لوگوں نے "سبع طوال" میں قرار دے دیا۔ ایسا کیوں کیا؟ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم پر متعدد سورتیں اترتی تھیں تو جب کوئی آیت اترتی تو کسی کاتب کو آپ بلاتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس آیت کو اس سورت میں رکھو جسمیں فلاں فلاں باتوں کا ذکر ہو۔ اور انفال مدینہ کی سورتوں میں سے اوائل کی سورتوں میں ہے، اور برات آخر قرآن میں ہے، اور اس کا قصہ اس کے قصے[3] سے مشابہ تھا، تو ہم لوگوں نے گمان کیا کہ سورۂ برات سورۂ انفال ہی کا جز ہے۔ رسول اللہ صلعم نے تاوفات[4] اس کے بارے میں ہم لوگوں سے کچھ بیان نہیں فرمایا۔ اس لئے ہم لوگوں نے دونوں[5] کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا، اور درمیان میں

---

[1] احمد بن عمر بن عبد الخالق ابوبکر بزار۔ ایک مشہور جامع حدیث تھے ان کی کتاب المسند الکبیر محدثین میں مشہور ہے مگر نایاب ہے ۲۹۲ھ میں وفات پائی تل تیسی وغیرہ کا تیل نکال کر بیچتے تھے اسی لئے "بزار" کہے جاتے تھے ۱۲ منہ غفرلہ

[2] بسم اللہ ایک پیام رحمت ہے سورۂ برات بیزاری کا اعلان اور عذاب کی دھمکی سے شروع ہوتی ہے جس کو پیام رحمت سے شروع کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ حضرت علیؓ سے بھی اسی قسم کی توجیہ مروی ہے اور صحیح ہے ۱۲ منہ۔

[3] دونوں سورتوں کے قصوں میں کوئی خاص مشابہت نہیں ہے بلکہ آخر انفال و اول برات کو ملا دیا جائے تو دونوں کے مضامین میں بون بعید معلوم ہوگا اور مطلق مناسبت محسوس نہ ہوگی۔ ۱۲ منہ

[4] یعنی تعلیم کتاب جس کیلئے آپ مبعوث ہوئے اس مفوضہ خدمت میں کی ایک بات رہ گئی۔ موت اگر مبعوث کے اختیار کی بات نہ تھی تو باعث کے اختیار میں تو تھی۔ اللہ تعالی نے مفوضہ خدمت کی تکمیل سے پہلے کیوں اپنے رسول کو وفات دیدی۔ یہ الزام تو رسول ہی پر نہیں بلکہ اللہ تعالی پر بھی ہے ۱۲ منہ

[5] یہ بالاتفاق مسلم ہے کہ ہر سورہ کا نام رسول اللہ صلعم نے خود رکھا۔ چاہے توقیفاً چاہے اجتہاداً جو سمجھا جائے۔ تو جلدہ برات اور سورۂ توبہ یہ نام رسول صلعم ہی کے رکھے ہوئے تھے اسی طرح سورہ انفال کا نام بھی آپ ہی نے رکھا۔ تو جب دو سورہ تھے تو دونوں کو الگ الگ رکھنا ہی تھا ہر سورہ کے ساتھ بسم اللہ نازل ہوتی تھی اس لئے لکھی جاتی تھی۔ اس سورہ کے آغاز میں نہیں نازل ہوئی نہیں لکھی گئی۔ لکھنے والے اپنی طرف سے تو بسم اللہ لکھتے نہ تھے ۱۲ منہ غفرلہ

بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سبع طوال میں قرار دیا۔ اس حدیث کا راوی وہی عوف اعرابی ہی فقط ہے جو رافضی شیطان تھا۔ مگر اتقان وغیرہ کتابوں میں یہ حدیث معتبر قرار دے کر برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئی۔ اور مستدرک وغیرہ میں مروی ہے۔

۱۹ سورہ اعراف کے چوبیسویں رکوع میں ہے هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۚ الآیہ اس آیت میں فَلَمَّا تَغَشَّاهَا کے بعد اَحَدُ مِنْكُمْ کا لفظ محذوف ہے اور اسی طرح کے محذوفات قرآن میں اور کلام عرب میں بلکہ ہر زبان میں بہت ہوا کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کو بتائی جائے، ہر عربی داں اتنا خود سمجھ لے سکتا ہے۔ مگر اس کی تفسیر میں ابن جریر، ابن کثیر، مسند امام احمد، مستدرک حاکم، حتےٰ کہ ترمذی تک میں بھی طولاً اور اختصاراً یہ ہے کہ . .
حضرت آدم و حوا کے اولاد جیتی نہ تھی، جو بچہ پیدا ہوا مر گیا، آخر ابلیس نے ان دونوں کو مشورہ دیا کہ اب کے جو بچہ پیدا ہو تو اس کا نام "عبدالحارث" رکھنا وہ بچہ نہیں مرے گا۔ چنانچہ پھر جو بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھا۔ اور "حارث"، نام تھا ابلیس کا اسی پر قرآن میں فرمایا گیا کہ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ جب اللہ نے ان دونوں کو جیتا جاگتا بچہ دیا تو لگے وہ دونوں شرک کرنے۔

فرمایئے۔ صرف ایک شجر ممنوعہ کا پھل کھا لینے سے تو عتاب میں پڑے اور جب تک توبہ نہ کی منصب خلافت نہ ملا اور منصب خلافت ملنے کے بعد شرک کر گئے اور توبہ[1] بھی نہ کی، مگر کچھ نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بالکل چشم پوشی فرمائی۔ صرف شکایتاً قرآن میں ذکر کر دیا۔ حالانکہ اسی قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف کر دے سکتا ہے (بے توبہ کے بھی) مگر شرک کو (بغیر توبہ کے) کبھی معاف نہیں کریگا۔

۲۰ یہ تو بطور نمونہ چند مثالیں ان حدیثوں کی ہیں جن کے ذریعے منافقین و ملاحدہ و زنادقہ نے لفظی و معنوی تحریفیں اور اختلافات پیدا کئے ہیں ورنہ اگر زیر زبر اور نقطوں کے فرق، بعض الفاظ یا حروف کی تبدیلی اور معنوی تحریفوں کی فہرست اگر پیش کروں تو اس کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے۔ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود ع۴) کی جگہ اِنَّهٗ عَمِلَ غَيْرَ صَالِحٍ جیسے مثالوں سے قرات کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ اور ان تمام لفظی تحریفوں کا سرچشمہ وہ حدیث ہے جس کو ابن جریر نے اپنے مقدمہ تفسیر میں متواتر ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور ہر حدیث کی کتاب میں آپ کو متعدد طرق سے مروی ملے گی۔ یعنی انزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف والی حدیث۔ خلاصہ روایت یہ کہ آنحضرت صلعم کو حکم ہوا تھا کہ قرآن ایک ہی حرف پر پڑھا کرو۔ رسول اللہ صلعم نے عرض کیا میری امت ضعیف ہے ایک حرف پر نہیں پڑھ سکتی۔ اس لئے سہولت و عافیت کی التجا ہے۔ تو دو حرفوں پر پڑھنے کا حکم ہوا پھر آنحضرت صلعم نے حضرت جبرئیل کو واپس کیا کہ میری امت ضعیف ہے اس کے لئے اور سہولت بخشی جائے یہاں تک کہ سات حرفوں پر پڑھنے کی اجازت ملی۔ "حرفوں" سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق محدثین ہی نہیں بلکہ بقول راویاں خود اکابر تابعین میں سخت اختلاف ہے یہاں تک کہ صحابہ کے بیانات بھی مختلف ہی بیان کئے گئے ہیں جو درحقیقت صحابہ پر بہتان ہے۔ یہ سات قراتیں جو قرات کی کتابوں میں مذکور ہیں، ان کے بارے میں خود قراء کا اقرار ہے کہ یہ سات قراتیں سبعۃ احرف سے مراد نہیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ یہی لکھتے ہیں کہ ان سے مراد سات لغات ہیں جو فصحائے عرب کے ممتاز لغات ہیں۔ مگر ان سات لغات پر پڑھنے کی اجازت جو رسول اللہ صلعم نے حضرت جبرئیل کو دوڑا دوڑا کر بڑی منت و سماجت سے حاصل کی تھی حضرت عثمانؓ نے ان میں سے چھ حروف کو ملیامیٹ کر دیا۔ اور صرف ایک ہی حرف پر تمام امت کو پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو خدا بھلا کرے اہل کوفہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا کہ عبداللہ بن مسعود کے کہنے کے مطابق اہل کوفہ نے حضرت عثمانؓ کی بات نہ مانی اور عبداللہ بن مسعودؓ و ابی بن کعبؓ کی قراءت محفوظ رکھی۔ بلکہ اور بھی جتنی قراءتیں ان کو جہاں جہاں سے ملیں یا خود یہ پیدا کرتے گئے سب کا ایک انبار لگا دیا کہ آج قراءت کا دفتر ہمارے کتب خانوں میں موجود ہے۔ میری کتاب اعجاز القرآن اور "الاحرف" میں اس موضوع پر مفصل بحث آئیگی انشاءاللہ تعالیٰ۔

ان روایتوں کے دیکھنے کے بعد بے اختیار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے وقت میں جمع قرآن کیوں نہیں کرا دیا تھا۔ قرآن کب جمع ہوا اور کس نے جمع کرایا، اور کس طرح جمع ہوا؟ تو اب جمع قرآن کی روایتوں پر ایک نگاہ ڈال لیجئے بخاری و

[1] اگر یہ کہا جائے کہ آدم و حوا نے اسکے بعد توبہ کر لی ہوگی تو نہ اس کی طرف کوئی اشارہ آیت میں ہے، نہ روایت میں۔ اس لئے ایسا کہنے کا کوئی حق کسی کو نہیں ۱۲ منہ غفرلہ

ترمذی ونسائی والی حدیث جمع قرآن پر تو پوری بحث ہی اصل کتاب میں آپ کے سامنے آتی ہے۔ ان کے علاوہ غیر صحاح میں جو حدیثیں، مجملاً ہی سہی ان کے مضامین بھی آپ کے پیش نظر آجائیں تو بہتر ہے، اس لئے چند مشہور روایتیں جن کو اتقان وغیرہ میں نقل کیا ہے نمبر وار ان کے تراجم بیان کرتا ہوں۔

۱۔ جمع قرآن کی جو اصل روایت ہے جس پر اس وقت تمام لوگوں کا اعتماد ہے وہ تو وہی ہے جو بخاری و ترمذی ونسائی میں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں قرآن کسی کتاب کی صورت میں یکجا مجتمع نہ تھا بلکہ ٹھیکری ہڈی چھال وغیرہ پر متفرق لکھی ہوئی تھیں وہ بھی مختلف جگہ مختلف لوگوں کے پاس۔ بعض لوگوں کو قرآن کی متعدد سورتیں یاد تھیں۔ بڑے بڑے اکابر کو غالباً سورتیں یاد ہوں گی۔ ان حافظوں کی جماعت میں سے ایک بڑی جماعت جنگ یمامہ میں شہید ہوگئی جن کو قرآن کے بہت سے حصے یاد تھے تو حضرت عمرؓ نے قرآن کے ضائع ہو جانے کا خطرہ محسوس کیا اور حضرت ابوبکرؓ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا۔ وہ گھبرائے کہ جس کو رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا وہ کام ہم کس طرح کریں۔ حضرت عمرؓ کے بار بار کہنے سے وہ راضی ہوگئے اور حضرت عمرؓ کے سامنے ہی زیدؓ بن ثابت کو بلوایا اور ان کو جمع قرآن کے لئے کہا۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ جس کام کو رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا وہ کام آپ لوگ کس طرح کرنا چاہتے ہیں؟ مگر سمجھانے سے وہ بھی بمشکل راضی ہوگئے، اور لگے قرآن جمع کرنے۔ تو ٹھیکری، ہڈی، چھال وغیرہ جس جس کے پاس تھا سب سے ملتے ملتے بیٹھے اور منتشر آیتوں کا جوڑ ملاتے ہوئے، اور جن کو جو کچھ یاد تھا اور ان سب سے پوچھتے ہوئے وہ جمع کر رہے تھے۔ سورہ توبہ کے آخر کی دو آیتیں تلاش کرنے کے بعد صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ انصاری کے پاس تو زیدؓ کو ملیں اور انھوں نے ان کو لکھ لیا۔ وہ صحیفے حضرت ابوبکرؓ کی زندگی تک انھیں کے پاس رہے، ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہے۔ حضرت عمرؓ کے بعد (حضرت عثمانؓ کے پاس رہنا چاہئے تھے مگر خدا جانے کیوں) حضرت حفصہؓ کے پاس چلے گئے۔ اس روایت کو صرف ابن شہاب زہری، صرف عبید بن السباق سے اور وہ صرف زیدؓ بن ثابت سے بیان کرتے ہیں۔ مگر محدثین نے اس روایت کو متواتر، یقینی اور قطعی بلا دلیل تسلیم کر لیا ہے۔ اسی روایت پر پوری بحث اس کتاب میں موجود ہے۔

۲۔ حضرت عثمانؓ کے وقت میں حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے عراق سے آکر مسلمانوں کے قرآن میں باہمی اختلافات کا حال بیان کر کے کہا کہ امت کی خبر لیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے قرآن کے صحیفے منگوائے واپس کر دینے کے وعدے پر اور اس کی متعدد نقلیں چار آدمیوں سے کرائیں اور ایک نقل رکھ لی اور ایک ایک مختلف ممالک میں بھیج دی کہ لوگ اپنے اپنے مصحف کو اسی سے ملا ملا کر درست کرلیں اور جو اس سے مختلف لکھے ہوئے اوراق وغیرہ ہوں ان کو جلا دیں۔ لکھنے والوں میں صرف زیدؓ بن ثابت انصاری تھے باقی تین قریشی۔ قریشیوں سے حضرت عثمانؓ نے کہہ دیا تھا کہ زیدؓ سے اختلاف ہو تو لغت قریش کے مطابق لکھنا کیوں کہ قرآن ایک قریشی پر اترا ہے۔ اس روایت کے بعد فوراً دوسری روایت ہے کہ نقل مصاحف کے وقت سورہ احزاب کی ایک آیت یاد آئی وہ بھی صرف زیدؓ کو کہ رسول صلعم سے سنتے تھے ڈھونڈھنے سے خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی من المومنین رجال الآیہ۔ تو اس کو مصحف میں لگا دیا۔ ترمذی میں یہ بھی ہے کہ تینوں کاتبوں میں تابوت اور تابوہ کا اختلاف ہوا تو حضرت عثمانؓ نے تابوت کا فیصلہ کیا۔

۳۔ ابن ابی داؤد کی کتاب سے کنز العمال ج ۱ صفحہ ۲۸۰ میں ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے پورا قرآن خود کاغذ پر لکھ کر جمع کیا تھا، اس پر نظر ثانی کے لئے انھوں نے زید بن ثابت سے کہا۔ زید نے انکار کیا تو حضرت عمرؓ کی سفارش سے زیدؓ بن ثابت نے اس پر نظر ثانی کی۔ تو وہ زیدؓ کی نظر ثانی کی ہوئی کتاب حضرت صدیق اکبرؓ کی زندگی تک ان کے پاس رہی، ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس ان کے بعد حضرت حفصہؓ کے پاس رہی۔ حضرت عثمانؓ نے (اپنے عہد خلافت میں) اس کی نقلیں لینے کے لئے حضرت حفصہؓ سے ان صحیفوں کو مانگ بھیجا تو انھوں نے دینے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ نے واپس کرنے کا عہد کیا تو حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے ان کے پاس بھیج دیئے حضرت عثمانؓ نے چند مصاحف اس سے نقل کرائے اور وہ صحیفے حضرت حفصہؓ کے پاس واپس بھیج دیئے

جو الفین کے پاس برابر رہے۔ اس کے بعد پھر زہری ہی سے روایت ہے کہ مروان (جو ۴۵ھ میں بعہد خلافت امیر المومنین حضرت معاویہؓ والی مدینہ تھے) حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج بھیج کر برابر وہ صحیفے مانگ بھیجتے تھے مگر وہ نہیں دیتی تھیں تو جب حضرت حفصہؓ کی وفات ہوگئی تو مروان نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے شدت کے ساتھ ان صحیفوں کو وصول کرلیا۔ اور صحیفوں کو پھاڑ کر ضائع کر دینے کا حکم دیا اور وہ ضائع کر دیئے گئے۔ مروان نے کہا کہ ہم نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس میں ہے وہ صحیفوں میں لوگوں کے پاس لکھا جاچکا اور محفوظ ہوچکا۔ میں ڈرا کہ زمانہ دراز کے بعد اس مصحف کے بارے میں کوئی شک کرنے والا شک نہ کرے اور کہے کہ اس میں کوئی چیز تھی جو نہیں لکھی گئی اس واقعہ پر بحث اصل کتاب میں آتی ہے۔ دیکھئے فہرست میں "مروان کی دور اندیشی"

۴۔ ابن سعدؒ کی روایت سے اسی صفحہ کنز العمال میں ہے کہ ہشامؒ بن عروہ اپنے والد عروہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں کہ اہل یمامہ کے قتل کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ مسجد کے دروازے پر تم دونوں بیٹھ جاؤ اور جو شخص کوئی حصہ قرآن ایسا لے کر آئے جس کو تم نہ جانو[1] تو اس سے اس پر دو گواہ طلب کرو جب اس کو لکھو۔ اور یہ اس لئے حکم دیا کہ یمامہ میں ان صحابہ کی شہادت ہوگئی تھی جنھوں نے قرآن جمع کیا تھا۔

۵۔ اتقان ص۸۳ میں ہے کہ زہری ہی عبیدؓ بن السباق سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم وفات فرماگئے اور قرآن کسی چیز پر بھی لکھا[3] ہوا نہ تھا۔ اس روایت کو ابن حجر نے فوائد دیر عاقولی سے فتح الباری میں بھی نقل کیا ہے۔

۶۔ اسی صفحے میں عمارہ بن غزیہ سے یہ بھی روایت ہے کہ زید بن ثابتؓ نے کہا کہ مجھ کو ابوبکرؓ نے حکم دیا تو میں نے قرآن کھال اور چھال پر لکھا جب ابوبکرؓ نے وفات پائی اور عمرؓ کا زمانہ آیا تو میں نے ایک صحیفے میں قرآن لکھ ڈالا۔ جو ان کے پاس رہا۔

۷۔ اور پھر یہیں پر موطا امام مالک (بروایت ابن وہب) میں زہری ہی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کاغذ پر قرآن جمع کیا۔ اس میں زید بن ثابتؓ سے مدد چاہی تو انھوں نے انکار کیا تو حضرت عمرؓ سے سفارش کرائی تو زیدؓ نے مدد دی (جیسا کہ ۲ میں گذرا)

۸۔ کنز العمال ج۱ ص۲۸۰ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن جمع کرنے کا ارادہ کیا تو لوگوں میں کھڑے ہو کر کہا کہ جس نے رسول اللہ صلعم سے جو کچھ بھی قرآن سیکھا ہو وہ اس کو ہمارے پاس لائے۔ اور لوگوں نے اس کو مصحف، تختوں اور چھال وغیرہ پر لکھ رکھا تھا۔ اور کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو گواہ اس کی گواہی نہیں دیتے تھے تو حضرت عمرؓ شہید کر دیئے گئے اسی حال میں کہ قرآن ان کے پاس جمع ہو رہا[3] تھا۔ تو حضرت عثمانؓ اٹھے اور انھوں نے اعلان کیا کہ جس کے پاس بھی قرآن کا کوئی حصہ ہو وہ ہمارے پاس لائے۔ اور نہیں قبول کرتے تھے جب تک دو گواہ اس پر گواہی نہ دیں۔ تو خزیمہ بن ثابتؓ الانصاری نے آکر کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگوں نے دو آیتوں کو چھوڑ دیا، نہیں لکھا۔ لوگوں نے کہا وہ کونسی دو آیتیں ہیں؟ خزیمہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے سیکھا تھا لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم آخر سورہ تک۔ تو حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ تو پھر تم ان کو کہاں رکھنا مناسب سمجھتے ہو؟ تو خزیمہؓ نے کہا کہ اسی پر ختم کرو اس سورہ کو جو آخری سورہ قرآن کا ہے۔ تو ان دونوں آیتوں کو آخر سورہ برأت میں رکھ دیا گیا۔ (ابن ابی داؤد و ابن عساکر)

۹۔ اسی کے بعد اسی صفحے میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب ارادہ کیا امام کے لکھنے کا تو صحابہؓ کی ایک جماعت (لکھنے کے لئے) بٹھائی اور کہا کہ اس کو لکھو قبیلہ مضر کی زبان میں۔ کیونکہ قرآن ایک مُضَرِی شخص پر اترا ہے۔ (ابن ابی داؤد)

۱۰۔ اسی کے بعد ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مصاحف کو نہ لکھیں مگر نوجوانان قریش یا نوجوانان ثقیف۔ (ابو عبید و ابن ابی داؤد)

---

[1] قرآن کا ایسا بھی کوئی حصہ ہو سکتا تھا جس کو حضرت عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ نہ جانتے ہوں معاذ اللہ من ذالک ۱۲ منہ

[2] یعنی ہڈی ٹھیکری کھال یا چھال پر بھی نہیں۔

[3] کنز العمال ج۱ ص۲۸۰ میں ابن سعد اور مستدرک سے منقول ہے کہ محمد بن سیرین نے کہا کہ حضرت عمرؓ شہید ہو گئے اس وقت تک قرآن جمع نہیں ہوا تھا۔ ۱۲ منہ

عاا پھر اسی کے بعد ہے کہ ابن شہاب زہری ہی سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ یمامہ کے دن حفاظ قرآن بہت سے کٹ گئے، قریب بارسو اشخاص کے تو زید بن ثابتؓ حضرت عمرؓ سے ملے، اور کہا کہ یہی قرآن ہم لوگوں کے دین کا جامع ہے، اگر قرآن چلا گیا تو ہم لوگوں کا دین بلاگیا۔ اس لئے ہم نے قرآن کے جمع کر لینے کا ارادہ کیا ہے ایک کتاب میں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ٹھہر جاؤ ہم ابوبکرؓ سے پوچھ لیں۔ تو دونوں ضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ جلدی نہ کرو۔ ہم مسلمانوں سے مشورہ کرلیں۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے مجمع کو خطبہ دیا اور لوگوں کو ورت حال اور ضرورت جمع قرآن سے مطلع کیا۔ لوگوں نے جمع قرآن کی رائے کو پسند کیا۔ تو ان لوگوں نے قرآن جمع کیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ ے ایک شخص کو حکم دیا کہ منادی کردے کہ جس کے پاس قرآن کا کچھ بھی حصہ ہو تو اس کو لائے۔ تو حضرت حفصہؓ نے کہا تم لوگ جب افظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ پر پہنچو تو مجھ کو خبر کرو جب یہاں تک لکھنے والے پہنچے اور خبر کی تو حضرت حفصہؓ نے کہا کہ اس کے بعد لکھو وھی صلوٰۃ العصر۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا تمہارے پاس اس کے قرآن ہونے کی کوئی دلیل (گواہ) ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ وحضرت عمرؓ نے فرمایا واللہ قرآن میں نہیں داخل ہو سکتی کوئی ایسی چیز جس کو صرف ایک عورت بلا دلیل و گواہ بیان کرے۔ اور حضرت بداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا کہ لکھو کہ والعصران الانسان لیخسر ہ وانہ فیہ الی اٰخر الدھر ہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہٹاؤ میرے سامنے سے اس بدوؤں جیسی عبارت کو۔ (کتاب المصاحف ابن الانباری) (تعجب ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اس موقع پر حضرت عمرؓ کو نہیں اتا کہ تم بازار کی دوڑ دھوپ میں رہا کرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلعم کے پاس قرآن سیکھا کرتے تھے۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی ڈانٹ س طرح سن کر چپ رہ گئے۔ اور ان کا لایا ہوا حصہ قرآن رد کر دیا گیا پھر بھی وہ کچھ نہ بولے!!)

۱۲ خزیمہ بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ میں لقد جاء کم رسول من انفسکم والی آیت کو عمرؓ بن الخطابؓ اور زید بن ثابتؓ کے پاس لایا وزید نے کہا کہ تمہارے پاس کون گواہ ہے؟ تو میں نے کہا کہ اس کو واللہ میں نہیں جانتا۔ تو خود زیدؓ نے کہا کہ میں اس کی شہادت دیتا ہوں کنزالعمال ۱ صـ۲۸ منقول از ابن سعد)

[illegible] کے دیکھنے کے بعد کمزور ایمان والے تو جانے کن کن شکوک وشبہات میں پڑے ہوں گے اور پڑ سکتے ہیں۔ محدثین کے اکابر بھی قرآن کے متعلق صحیح عقیدہ قائم نہ کرسکے۔ ابن حجر فتح الباری صـ۲۱۲ جز بستم باب جمع القرآن کی پہلی حدیث جمع صدیقی والی روایت کی شرح میں متعدد روایتوں کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ کلام مخصوص طور سے مخصوص صفت کے ساتھ لکھنے میں ہے۔ ورنہ پورا قرآن رسول اللہ صلعم کے زمانے میں لکھا جا چکا تھا لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور لیکن ایک جگہ جمع نہ تھا اور نہ سورتیں مرتب تھیں، یعنی منتشر آیتیں کچھ کسی کے پاس کچھ کسی کے پاس تھیں۔ آیات سے سورتوں کی ترتیب بھی قائم نہ تھی۔ یہ سب کام صحابہ نے اپنی سمجھ سے طور خود کیا۔ معاذاللہ من ذالک

۱۳ اور پھر بخاری میں یہ بھی ہے کہ چار انصاریوں نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کیا تھا ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ اور زیدؓ دوسری روایت میں ابی بن کعبؓ کی جگہ ابودردا، کا نام ہے۔ اس روایت پر بحث اصل کتاب میں آتی ہے۔ اور ابن سعد سے کنزالعمال ۱ صـ۲۸ میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ مبارک میں پانچ انصاریوں نے قرآن جمع کیا تھا۔ معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن صامت، اُبی بن کعبؓ، ابوایوبؓ اور ابودردا۔

۱۴ اور کنزالعمال ۱ صـ۲۸۱ میں ہے کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب جب قرآن جمع کرنے لگے تو انھوں نے صحابہ سے پوچھا کہ مَنْ اَعْرَبُ النَّاس؟ سب سے زیادہ عربیت کا ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ سعید بن العاصؓ۔ پوچھا زیادہ اچھا لکھنے والا کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ زید بن ثابتؓ۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو سعیدؓ لکھوائیں اور زیدؓ لکھیں۔ تو لوگوں نے چار مصحف لکھے جن میں سے ایک مصحف کوفہ ایک بصرہ ایک شام میں بھیجا۔ ایک حجاز کے لئے رکھا (ابن الانباری)

۱۵ کنزالعمال ۱ صـ۲۸۲ میں ابن ابی داؤد اور ابن عساکر کی کتابوں سے منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جماعت صحابہ و تابعین میں

خطبہ دیا اور کہا کہ ابھی رسول اللہ صلعم کی وفات کو تیرہ ہی برس ہوے ہیں کہ تم لوگ قرآن میں اختلاف پیدا کرنے لگے، اور کہتے ہو کہ قراءۃ ابی بن کعبؓ و قراءۃ عبداللہ بن مسعودؓ۔ ایک دوسرے کو کہتا ہے کہ تمہاری قراءت ٹھیک نہیں ہے۔ تو میں تم میں سے ہر شخص پر لازم گردانتا ہوں جسکے پاس کچھ بھی قرآن ہو وہ لے آئے اس کو۔ تو لوگ اوراق پر اور کھال پر لکھے ہوے قرآن لانے لگے تو ان سبھوں کو جمع کیا گیا۔ پھر حضرت عثمانؓ آئے اور سب سے قسم کھلائی کہ اسی طرح انھوں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے؟ اور رسول اللہ صلعم ہی نے انھیں یہ لکھوایا ہے؟ تو وہ کہتے کہ ہاں۔ تو جب حضرت عثمانؓ سب سے ان کے لائے ہوئے مکتوبات پر قسم کھلوا چکے تو لوگوں سے انھوں نے پوچھا کہ کون سب سے زیادہ اچھا لکھنے والا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلعم کے کاتب۔ پھر پوچھا کون عربیت کا سب سے زیادہ ماہر ہے؟ لوگوں نے کہا کہ سعید بن العاصؓ۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ سعیدؓ لکھوائیں اور زیدؓ لکھیں۔ تو زیدؓ نے لکھا، اور اس کے ساتھ چند مصاحف لکھے۔ تو حضرت عثمانؓ نے اس مصحف کو لوگوں میں پھیلایا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے بعض صحابہ کو یہ کہتے سنا کہ کیا اچھا کام کیا حضرت عثمانؓ نے۔ ایک روایت اور بھی اس کے بعد ہے جس میں تیرہ سال کے عوض مذکور ہے کہ "رسول اللہ صلعم کی وفات کو پندرہ برس ہو گئے"! اور اس میں سعید بن العاصؓ کو سب سے زیادہ فصیح لکھا ہے اور آخر میں ہے کہ مصعب بن سعدؓ راوی نے کہا ہے کہ کسی شخص نے بھی حضرت عثمانؓ کے اس فعل کو برا نہ سمجھا۔

۱۶۔ ص۲۸۳ میں کتاب المصاحف ابن ابی داؤد سے منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ان مصاحف کو (جن میں غلطیاں تھیں یا دوسری قرہتیں تھیں) ان کو قبر مبارک اور منبر کے درمیان دفن کرا دیا۔

۱۷۔ اسی صفحے میں ابن ابی داؤد ہی سے ایک روایت اور منقول ہے جس کا خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اختلاف قراءت کی وجہ سے کافر قرار دیتے تھے۔ تو یہ صورت حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوئی۔ انھوں نے بارہ آدمی قریش اور انصار میں سے منتخب کئے جن میں ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور سعید بن العاصؓ بھی تھے، اور وہ پٹاری منگوائی حضرت عمرؓ کے گھر جسمیں قرآن تھا، اور ان لوگوں کی نگرانی کرتے رہے۔ تو لوگ لکھ رہے تھے، اور جس جگہ باہم اختلاف ہوتا تھا، اس کو (بعد کو غور کرنے کے لئے) اٹھا رکھتے تھے۔ غالبًا اس لئے اٹھا رکھتے تھے کہ دیکھا جائے کہ کون قراءت (جبریل کے) عرضۂ اخیرہ کے مطابق ہے تو اس کو لکھیں۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ جو ہر سال ایک بار قرآن کا دور رسول اللہ صلعم سے کرتے تھے، اور سال وفات دو دور کئے ان سب کی خبر تمام صحابہ کو ہو جاتی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور کا ہر سال اعلان فرما دیتے تھے۔ مگر کسی روایت سے ثابت نہیں۔ اور اگر ایسا تھا تو پھر ہر دوسرے دور کے بعد پہلا دور منسوخ ہو گیا ہوتا اور پھر عرضۂ اخیرہ ہی کو تمام صحابہ میں رہنا تھا۔ مد۔ کیا وجہ ہے کہ عرضۂ اخیرہ کی کسی کو خبر نہیں)

۱۸۔ اسی صفحے میں ابن ابی داؤد ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ بنی ہذیل اور بنی ثقیف لکھیں (مگر نہ سعید بن العاصؓ بنی ہذیل سے تھے نہ زید بن ثابتؓ بنی ثقیف سے)

۱۹۔ اسی ص۲۸ کنز العمال میں ابن ابی داؤد اور ابن الانباری کی کتابوں سے منقول ہے کہ جب مصحف لکھ کر لوگوں نے تیار کیا تو حضرت عثمانؓ کے پاس لائے۔ انھوں نے اس پر نگاہ غور ڈالی تو کہا تم لوگوں نے نہایت اچھا اور بہت خوب کام کیا مگر میں اس میں زبان کی کچھ غلطی محسوس کرتا ہوں، جس کو عرب اپنی زبانوں سے درست کرلیں گے۔

۲۰۔ مذکورہ بالا روایت عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر القرشی سے ہے (رجال کی کتابوں میں ان کو قرشی نہیں لکھا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ موالی قریش سے ہوں۔ بصری تابعی لکھے جاتے ہیں) مگر دوسری روایت پہلی روایت کے بعد اسی صفحے میں ابن ابی داؤد اور ابن الانباری ہی سے قتادہ سے بھی مروی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جب مصحف کو دیکھا تو کہا کہ "اس میں عربیت کی کچھ خامیاں ہیں"۔ اہل عرب ان کو اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں گے۔

آخر و نمبر ۱۹ و ۲۰ کے خط کشیدہ الفاظ پر ایمان دار کو میں اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ نگاہ غور ڈالیں کہ جس قرآن کو سب سے زیادہ عربیت کے ماہر حضرت سعید بن العاصؓ سے حضرت عثمانؓ نے املا کرایا اور حضرت زید بن ثابتؓ سے لکھوایا۔ اور اس کی نقلیں کرا کے

تمام ممالک میں بھجوائیں کہ ہر شخص اپنے مصحف کو اسی سے ملالے، اور اس سے ایک حرف ایک نقطے کا بھی فرق نہ کرے، اور اس کے سوا تمام نسخوں کو مٹا دینے اور جلا دینے یا پھاڑ دینے کا حکم دیا، اس نسخے میں بھی حضرت عثمانؓ ہی کے نزدیک عربیت کی خامیاں رہ گئی تھیں۔ وہ خامیاں یقیناً خدا کی طرف سے تو نہیں اتری تھیں۔ ضرور اور بالضرور کچھ ردوبدل ہوا۔ اور قرآن جس طرح اترا تھا بالکل اسی طرح جمع نہ ہوا۔ لیکن حضرت عثمانؓ اور تمام صحابہ نے اسی ناقص قرآن کو جس میں بعض عربیت[1] کی کچھ خامیاں تھیں۔ مجبوراً گوارا کیا۔ یہ بھی نہ کیا کہ ان خامیوں کو نکال دیں اور وہاں کی عبارت درست کر دیں۔ بلکہ حضرت عثمانؓ نے یہ کہہ کر ان خامیوں کو چھوڑ دیا کہ اہل عرب جب پڑھیں گے تو عربی ان کی مادری زبان ہے، روانی میں صحیح ہی عبارت ان کی زبان سے نکلے گی۔ یعنی غلط لکھا ہوا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پڑھنے والے عرب اس کو صحیح پڑھ لیں گے۔ معاذ اللہ من ذالک ثم معاذ اللہ من ذالک۔ کتنا بڑا اتہام ہے حضرت عثمانؓ پر۔ اور کتنا بڑا بہتان[2] ہے قرآن مجید پر اللہ اکبر!

۲۱۔ اسی کے بعد ابن الانباری اور ابن ابی داؤد ہی کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ کے پاس جب مصحف لایا گیا تو انھوں نے اس میں عربیت کی بعض خامی دیکھی تو کہا کہ اگر لکھوانے والا قبیلہ ہذیل کا اور لکھنے والا قبیلہ ثقیف کا ہوتا تو یہ خامی اس میں نہ رہ جاتی۔ (یعنی قریشیوں میں جو سب سے زیادہ عربیت کے ماہر تھے سعید بن العاصؓ وہ بھی قریشی زبان کی خامیاں درست نہ کر سکے۔ تو کس نے منع کیا تھا جو ہذیل و ثقیف سے یہ کام نہ لیا گیا؟)

۲۲۔ کنز العمال اسی صفحے میں ابن سعدؓ سے یہ روایت منقول ہے جو اتقان وغیرہ میں بھی ہے کہ حضرت علی نے وفات نبویؐ کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں دیر کی تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے پوچھ بھیجا کہ کیا آپ نے میرے ہاتھ پر بیعت ناپسند کی؟ تو حضرت علیؓ نے کہلا بھیجا کہ ایسا نہیں ہے، بات یہ ہے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ اپنی چادر نماز کے وقتوں کے سوا اور کسی وقت نہ اوڑھوں گا جب تک قرآن جمع نہ کر لوں گا۔ اور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ ترتیب نزول کے مطابق جمع کر رہے تھے۔ محمد بن سیرین اس حدیث کے راوی کہتے ہیں، کہ کاش کہ میں وہ کتاب پالیتا، اس میں بڑا علم تھا۔ ابن عون نے کہا کہ میں نے عکرمہ (مولیٰ ابن عباس) سے پوچھا تو انھوں اس کے متعلق اپنی واقفیت نہیں بیان کی۔ اس روایت کو ابن حجر نے فتح الباری جزو بستم ص۴۲۱ میں نقل کرتے ہوئے اس روایت کو انقطاع کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے، اور پھر تاویل بھی کی ہے کہ جمع سے مراد حفظ ہوگی۔ پھر لکھتے ہیں کہ اور جو اس حدیث کے بعض طرق میں صاف مذکور ہے کہ "جب تک میں قرآن کو بین الدفتین مجلد جمع نہ کر لوں" حضرت علیؓ نے فرمایا تھا۔ تو ابن حجر نے صاف کہہ دیا کہ یہ راوی کا وہم ہوگا۔ مگر اسی روایت کی بنا پر حضرت علیؓ کے قرآن کے مطابق ترتیب نزول جمع کرنے کا عام طور سے شور مچایا جاتا ہے خصوصاً شیعوں نے اس کو اپنی کتابوں میں بہت اچھالا۔ اس پر بحث اصل کتاب میں آئے گی۔ اگر شیعوں کی کتابوں کو دیکھئے تو اور بھی عجیب و غریب روایتیں ملیں گی۔ جس کا جی چاہے کم سے کم اصول کافی ہی کا مطالعہ کرے۔

۲۳۔ کنز العمال پ۱ ص۲۸۲ میں ابن ابی داؤد کی کتاب سے منقول ہے کہ ابن شہاب زہری نے کہا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ قرآن بہت اترا تھا تو قرآن کے جاننے والے جنھوں نے اس کو حفظ کر لیا تھا یمامہ کے دن مارے گئے، اور ان کے بعد نہیں جانا گیا اور نہ لکھا گیا[3]۔ تو جب ابوبکرؓ

---

[1] پہلی روایت کی اصل عبارت یہ ہے اری شیئا من لحن ستقیمہ العرب بالسنتھا۔ اور دوسری روایت کی عبارت یہ ہے۔ ان فیہ لحنا وستقیمہ العرب بالسنتھا (کنز العمال پ۱ ص۲۸۳) منہ غفرلہ

[2] جو قرآن دنیا بھر کو مقابلہ کا چیلنج دے رہا ہو کہ ایسی ایک سورت بھی بنا کر پیش کرو۔ اس قرآن کے بارے میں ایسی ملحدانہ روایتیں کس طرح محدثین نے اپنی کتابوں میں داخل کیں، اور آج تک علماء ان حدیثوں کے باوجود ان کتابوں کا احترام جزء ایمان سمجھتے ہیں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا ۱۲ منہ

[3] اصلی عبارت یوں ہے ولم یُعْلَمْ بَعْدَھُمْ ولم یکتب۔ یعنی وہ حصہ قرآن جو صرف انھیں لوگوں کو یاد تھا ہمیشہ کے لیے ان حصوں کا کوئی علم کسی کو نہ ہوا اسی وجہ سے مصحف میں وہ لکھے نہ جا سکے ۱۲ منہ غفرلہ

عمرؓ و عثمانؓ نے قرآن جمع کیا، اور ان کے بعد اور قرآن کسی کے پاس نہیں پایا گیا۔ اور یہی اس میں ہے جو ہم تک خبر پہنچی ہے کہ ان لوگوں نے قرآن کی تلاش میں کوشش کی اور اس کو مصحف میں جمع کیا خلافتِ ابوبکرؓ میں اس ڈر سے کہ کہیں اور مسلمان بھی مختلف جگہ مارے جائیں اور ان کے ساتھ (سینوں میں) بہت سا قرآن ہو تو جتنا قرآن جس کے ساتھ ہو وہ اس کو اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اور پھر ان کے بعد وہ کسی دوسرے کے پاس نہ ملے۔ اس لئے اللہ نے حضرت عثمانؓ کو توفیق دی کہ انھوں نے اس مصحف کو مصاحف میں نقل کرایا اور مختلف ملکوں میں ان مصاحف کو بھیجا اور مسلمانوں کے پاس پہنچایا۔[1]

۲۴ اسی کے بعد بغیر کسی حوالے کے اسی صفحے میں ہے کہ حضرت عثمانؓ جب مصاحف نقل کرا رہے تھے تو ابی بن کعبؓ لکھوا رہے تھے، زیدؓ بن ثابت لکھ رہے تھے اور سعید بن العاصؓ اس کی عربیت درست کر رہے تھے (یا اعراب لگا رہے تھے) تو یہ مصحف ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، اور سعید بن العاصؓ تینوں کی قرأت کے مطابق ہے۔

۲۵ ص ۲۸۴ میں ہے بحوالہ مستدرک کہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں پورا قرآن ختم کیا تھا اُن میں عثمانؓ بن عفان۔ علی بن ابی طالبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔

غرض ان روایتوں کو دیکھنے کے بعد بے اختیار ایمانی غیرت نے مجھ کو مجبور کیا کہ میں ان حدیثوں کی چھان بین کروں جن کے ذریعے قرآن مجید کو اختلافات کی جولانگاہ اور مشتبہ بنانے کی مذموم کوشش کی گئی ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ انھیں ذخائر احادیث سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں عام طور سے صحابہؓ کے پاس لکھے ہوئے مصاحف موجود تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلعم صحابہؓ کو مصحف دیکھ کر پڑھنے کی تاکید فرماتے تھے، مصحف لے کر سفر کرنے سے منع فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ مصحف ہی لے کر اور پڑھ کر اپنی بہن کے یہاں متاثر ہوئے اور وہیں سے ایمان لانے کے ارادے سے آنحضرت صلعم کے پاس حاضر ہوئے اور ایمان لائے تھے جس کی تفصیلی بحث اصل کتاب میں آتی ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ان روایات کو دیکھئے جو باہم صد درجہ مختلف و متضاد ہیں تو انگشت بدنداں رہ جایئے۔

اب اگر ان تمام روایتوں کی میں تنقید کرنے بیٹھتا تو اس کے لئے ایک ضخیم دفتر کی ضرورت تھی اور کافی دقت کی بھی۔ اس لئے میں نے ان تمام روایتوں میں سے وہ روایتیں جو سب سے زیادہ مستند و معتبر سمجھی جاتی ہیں یعنی صحیح بخاری کی وہ حدیثیں جو ترمذی و نسائی وغیرہ میں بھی مذکور ہیں تنقید کے لئے منتخب کیں تاکہ اہلِ انصاف غور فرمائیں اور سمجھیں کہ جب وہ حدیثیں جو ازروئے روایت صحیح ترین سمجھی جاتی ہیں اُن کا یہ حال ہے تو جن کو جامعین صحاح نے خود نظر انداز کر دیا، اور اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا، یا ان کے بعد بنائی گئیں، ان کا کیا عالم ہوگا۔ ؎ قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

واضح رہے کہ امام بخاری اور تمام جامعین احادیث کا میں کافی احترام کرتا ہوں۔ اور میرے دل میں ان تمام بزرگوں کی بڑی عظمت ہے ان کو محسنین اسلام میں بلند مرتبہ جانتا ہوں۔ اسی طرح عبداللہ بن سلیمان بن الاشعث السجستانی متوفی ۳۱۶ھ جو ابن ابی داؤد کے لقب سے مشہور ہیں۔ اور ابو بکر محمد بن القاسم بن محمد بن محمد بشار النحوی متوفی ۳۲۸ھ جو ابن الانباری کہے جاتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ جن کی کتاب جمع الجوامع کو شیخ علی متقی متوفی ۹۷۵ھ نے فقہا کے طریقے پر مرتب و مدوّن کر کے اس کا نام "کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" رکھا، ان تمام بزرگوں کا بھی احترام کرتا ہوں ان کے تقویٰ و طہارت دین و دیانت، اور اعلیٰ علمی جلالت و ثقاہت اور تاریخی خدمات اسلام کا قائل ہوں۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی معصوم نہیں سمجھتا۔ جمع احادیث کی تاریخ اور اس کی اہمیت سے میں پوری طرح واقف ہوں میں جانتا ہوں کہ اگر یہ لوگ حدیثیں جمع نہ کر جاتے تو آج جو کچھ بھی پتا سنت نبویہ کا مل سکتا ہے وہ بھی نہ ملتا۔ اس لئے کہ جس طرح اکابر قوم نے محکمۂ ثقافت قبول کر لیے

[1] یہ روایت بھی ابن شہاب زہری ہی سے خدا جانے ان پر اتہام ہے یا واقعی انھوں نے بیان کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ پورا قرآن جمع نہ ہو سکا۔ اس کا کافی حصہ غائب ہو گیا جو کچھ مل سکا وہی جمع کر لیا گیا۔ کیا کہتے ہیں علمائے دین اس روایت کو؟ ۱۲ منہ عفرلہ

بزمانۂ خلافتِ عباسیہ انکار کیا تو کیا مسندِ قضا خالی رہی؟ سیکڑوں نااہلوں نے اس مسند پر جگہ حاصل کرلی۔ اسی طرح اگر یہ اکابر حدیثیں جمع نہ کرتے تو کیا حدیثیں جمع نہ ہوتیں؟ وہی وضاعین وکذابین خود جامعین احادیث بھی بن جاتے۔ اور پھر بعد والوں میں انھیں کی جمع کردہ کتابیں بخاری ومسلم کی جگہ پر ہوتیں۔ نہ وہ اسماء الرجال مرتب کرتے نہ موضاعات کو الگ چھانٹ کر رکھنے کی کوشش کرتے۔

ان جامعین احادیث کا زمانہ ۱۸۰ھ سے لغایۃ ۳۰۰ھ وہ تھا جب کہ فرقہ بندی مضبوط نہیں ہوئی تھی، شیعہ، سنی، خارجی اور تمام فرقے ملے جلے تھے۔ اتنا بھر تو اعتراف خود ابوجعفر محمد بن یعقوب بن اسحٰق الکلینی متوفے ۳۲۹ھ یا ۳۲۸ھ شیعوں کے سب سے بڑے محدث نے بھی اصول کافی ص۳۶۹ میں اعتراف کیا ہے کہ کانت الشیعۃ قبل ان یکون ابو جعفر وھم لا یعرفون مناسک حجھم وحلالھم وحرامھم حتی کان ابو جعفر ففتح لھم وبین لھم مناسک حجھم وحلالھم وحرامھم حتی صار الناس یحتاجون الیھم من بعد ما کانوا یحتاجون الی الناس۔ یعنی شیعے ابوجعفر (باقر محمد بن علی بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب رضی اللہ عنہم) سے پہلے اپنے مناسک حج اور اپنے حلال اور اپنے حرام سے واقف نہ تھے۔ یہاں تک کہ ابوجعفر کا زمانہ آیا تو انھوں نے کھولا اور ان کے مناسک حج اور ان کے حلال وحرام کو بیان کیا۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے محتاج ہوئے اس کے بعد کہ یہ (شیعے) لوگوں کے محتاج تھے۔

حضرت ابوجعفر کی ولادت اسی کتاب کے ص۲۹۵ میں ۵۷ھ لکھی ہے اور سال وفات ۱۱۴ھ اور عمر ۵۷ سال ابوجعفر الکلینی کے بیان سے اتنا معلوم ہوگیا کہ حضرت جعفر نے جب تک شیعوں کے خاص مذہبی مسائل نہیں بتائے تھے اسوقت تک تمام شیعے حتی کہ حضرت ابوجعفر کے والد ماجد حضرت علی بن حسینؓ بھی تمام مسائل میں عام مسلمانوں کے طریقہ پر کاربند تھے۔ اور شیعے سنی میں اسوقت تک عملاً کسی طرح کا اختلاف نہ تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوجعفرؓ اور ان کے صاحبزادے جعفر بن محمدؓ کی طرف ہزاروں من گھڑت حدیثیں ان لوگوں کے ایک صدی یا نصف صدی بعد مشہور کی گئیں، اور تمام ارکان اسلام کے بارے میں ان سے خلاف سنت متواترہ ایک نیا طریقہ منسوب کیا گیا، اور اس نئے طریقے کے ارکان کے متعلق ان بزرگوں کی طرف روایتیں بنائی گئیں، اور پھر چپکے چپکے اپنے حلقے میں انکی اشاعت رفتہ رفتہ کی جاتی رہی، چنانچہ اس کا آغاز اصول کافی وفروع کافی سے ہوا، یعنی تیسری صدی کے اواخر سے۔ مگر عام طور سے شیعے تمام اعمال ظاہری میں عام مسلمانوں کی طرح تھے۔ درس وتدریس وتحدیث وغیرہ میں سب فرقے ایک دوسرے کے شریک وسہیم تھے۔ بعض شیعوں نے اپنے مخصوص عقائد وخیالات کی کوئی کتاب لکھی بھی تو اس کو عام نگاہوں سے بالکل پوشیدہ رکھتے تھے۔ شیعے محدثین اہل سنت محدثین سے حدیثیں لیتے تھے، اور روایت کرتے تھے، اور اہل سنت شیعوں سے۔ اسی طرح خارجی، قدریہ، جہمیہ وغیرہ۔ شیعوں کو تقریباً چھٹی صدی میں قومی ودینی بٹوارہ کر کے عامۃ المسلمین سے کٹ کر الگ ہوجانے کا موقع ملا جب ان کو کسی قدر سیاسی اقتدار حاصل ہوا خصوصاً حکومت ایران پر تسلط جما لینے کے بعد تو پھر انھوں نے اپنی ان مخصوص کتابوں کو جنھیں ان کے اگلے مصنفین نے چپکے چپکے لکھ کر رکھا تھا اور پھر نئی تصنیفات کو اپنے لئے خاص کرلیا، اور زمانۂ اجمال میں جو تصنیفیں خود لکھتے گئے مثلاً مستدرک وغیرہ اور اہل سنت محدثین کی کتابوں میں جو اپنا حصہ رسدی اپنی اور وہ حدیثیں درج کراتے گئے تھے، ان سب سے بالکل اس طرح مستغنی ہوکر بیٹھ گئے جیسے اب ان کو ان حدیثوں سے اور ان کتابوں سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ کوئی بتائے کہ جب بخاری ومسلم کی تدوین ہورہی تھی اس وقت شیعے محدثین اپنی کون سی کتاب جمع کر رہے تھے؟ بخاری ومسلم وغیرہ کو صرف اہل سنت کی کتاب کہنا صریحاً ظلم اور بالکل غلط ہے۔ یہ زمانۂ اجمال کی یادگاریں ہیں جن میں شیعوں کا حصۂ رسدی بھی ہے اور خارجیوں کا حصہ رسدی بھی، قدریوں کا حصہ رسدی بھی ہے اور جہمیوں کا حصۂ رسدی بھی۔ محدثین نے کتنے راویوں کے متعلق اپنے کتب رجال میں لکھا ہے کہ یُکْتَبُ حَدِیْثُہٗ وَلَا یُحْتَجُّ بِہٖ اس کی حدیث لکھ لی جائیگی، مگر سند وحجت نہیں سمجھی جائے گی۔ اس لئے صرف کسی حدیث کا ان کتابوں میں ہونا اس کی سند وحجت ہونے کی ضمانت نہیں۔ اس کے علاوہ ایک جماعت انھیں روافض کی تھی جو اپنے کو اہل سنت بلکہ خارجی تک ظاہر کرتی تھی، اور ان میں کے بعض تو حضرت علیؓ پر نا ملائم کلمات بھی بولا کرتے تھے مگر شیعی خیالات وعقائد کی حدیثیں اہل سنت محدثین سے روایت کرتے تھے اور ان کی کتابوں میں درج کرا دیتے تھے۔ اور بعض کا تو یہ دستور تھا کہ اپنے

اسائذہ اور ساتھیوں کی کتابوں میں جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر داخل کر دیا کرتے تھے۔ امام مالکؒ کے کاتب حبیب بن ابی حبیب کے بارے میں امام ذہبی میزان الاعتدال جلد اوّل صفحہ ۲۱۰ میں اور ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۲ صفحہ ۱۸۱ میں لکھتے ہیں کہ جلد بندی کا کام بھی کرتا تھا محدثین اپنی حدیث کی کتابیں جلد بندی کے لئے دیتے تھے تو ان کی کتابوں میں ردوبدل اور جھوٹی حدیثیں داخل کر دیا کرتا تھا۔ امام مالکؒ کا تو کاتب ہی تھا ان کی کتابوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ ابن وکیع کے وراق نے یہی کیا۔ کتنوں نے خوشنویسی سیکھ کر کتابت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ محدثین اپنے مسودات صاف کرنے کے لئے دیتے تھے ان کے مسودات کے ساتھ بھی یہ لوگ یہی صورت اختیار کرتے تھے، مسودات میں اضافہ ور دوبدل کر کے نقل کرتے تھے۔ میری ایک مستقل کتاب عربی زبان میں ہے البراعیث من الورّاقین و کتّاب الاحادیث جس میں ایک نو دس وراقوں اور کاتبوں کے حالات درج ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سب وراق اور سب کاتب ایسے نہ تھے۔ مگر اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ انھیں وراقوں اور کاتبوں اور راویوں اکا کچا چٹھا ائمہ رجال نے کھولا ہے جن کا راز افشا ہو گیا۔ ان میں کتنے ایسے چالاک اور عیار ہوں گے جن کا راز ائمہ رجال پر نہ کھل سکا اور وہ اپنی ظاہری تزئین کی وجہ سے ثقہ اور معتبر سمجھ لئے گئے، حالانکہ حقیقت میں ان میں کے کتنے بڑے عیار اور جعل ساز تھے۔ امام بخاری و امام مسلم وغیرہ ائمہ حدیث کے وراق یا کاتب یا بعض تلامذہ بھی اگر ایسے عیار ہوں کہ ان کتابوں میں گھٹاؤ بڑھاؤ کر دیا ہو تو یہ کوئی بعید از عقل نہیں ہے۔ بلکہ بہت قرین عقل ہے۔

غرض بخاری و مسلم میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہو سکتا ہے، ہم اس کو تسلیم کرسکتے ہیں، مگر بخاری و مسلم کا بھرم رکھنے کے لئے قرآن مجید میں گھٹاؤ بڑھاؤ گوارا نہیں کر سکتے۔ امام بخاری و امام مسلم اور امام مالک سے ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی موضوع حدیث کو صحیح سمجھ کر اپنی کتاب میں نادانستہ درج کرلیں، مگر قرآن میں ایک نقطہ بھی تنزیل الٰہی کے خلاف داخل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ قرآن سے غائب ہو سکتا ہے۔ امام بخاری و امام مسلم وغیرہ کا کوئی شیخ عوف اعرابی کی طرح رافضی شیطان، اور اسمٰعیل بن ابی اویس کی طرح کذاب ہو سکتا ہے اور ائمہ رجال کے نزدیک ہے۔ مگر حاملین قرآن مہاجرین و انصار اور والذین اتبعوھم باحسان یعنی دوسرے صحابہ و تابعین، صالحین میں کا ایک شخص بھی متہم نہیں ہو سکتا جن کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اور ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان کی خداوندی سند مل چکی ہے وہ کبھی وان الذین اختلفوا فی الکتٰب لفی شقاق بعید کے مصداق نہیں ہو سکتے۔

مختصر یہ کہ میرے سامنے یہی سوال تھا کہ میں بخاری و مسلم وغیرہ میں گھٹاؤ بڑھاؤ و خطا و قصور النساخ کو تسلیم کروں یا قرآن مجید میں۔؟ تو میرے ایمان نے فوراً یہ فیصلہ کیا بخاری و مسلم وغیرہ میں ائمہ حدیث کے سہو و خطا کی بنا پر گھٹاؤ بڑھاؤ اور دشمنوں کی دخل اندازی ہو سکتی ہے، مگر قرآن میں ناممکن ہے لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید ۔ مگر دیکھا کہ علماء کی ایک جماعت بخاری و مسلم وغیرہ کتب حدیث کی حمایت میں قرآن کو مشتبہ ماننے پر تیار ہے تو میری غیرت ایمانی بیتاب ہوگئی، اور مجھکو بخاری کی حدیث جمع قرآن کی تنقید کرنی پڑی، اور چونکہ جمع قرآن کی حدیثوں کے تنہا ذمہ دار صرف ابن شہاب زہری ہیں، بعد کو ان کی تائید کے لئے بعد والوں نے بعض دوسروں سے بھی کچھ روایتیں بنالیں یہ اور بات ہے۔ اسی لئے صحاح کی تمام حدیثیں جو جمع قرآن کے متعلق ہیں وہ سب ابن شہاب ہی کی ہیں تو میں نے پہلے ابن شہاب ہی کا مکمل تعارف لوگوں سے کرا دیا۔ اب جمع قرآن کی حدیثوں کی تنقید ملاحظہ ہو۔

البتہ بعض جگہ امام بخاریؒ یا ترمذی کے متعلق بعض الفاظ قلم سے ایسے ضرور نکل گئے ہیں جو ان بزرگوں کی شان کے خلاف ہیں۔ میں ان بزرگوں کی محترم روحوں سے اس کی معذرت چاہتا ہوں۔ درحقیقت وہ الفاظ امام بخاری و ترمذی وغیرہ کے متعلق نہیں ہیں بلکہ ان کی کتابوں میں ان موضوعات کے داخل کر دینے والوں کے متعلق ہیں۔ کتاب چونکہ ان بزرگوں کی طرف منسوب ہے اس لئے مجبوراً ان بزرگوں طرف وہ الفاظ بھی منسوب ہو گئے۔ امید ہے کہ ناظرین میرے جذبہ حمایت قرآن کو دیکھتے ہوئے ان الفاظ کے متعلق مجھے معاف فرمائیں گے۔ واعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا واستغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔ اللھم اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم والحمد للہ رب العالمین۔

تمنا عمادی مجیبی غفرلہ

[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً

"جمع قرآن بعہدِ حضرت صدیق اکبرؓ"

اور اس کا

جھوٹا پروپیگنڈا

منافقین عجم جو ۴۰ھ سے تقریباً ۳۰۰ھ تک مومنین (تابعین) کے لبادے اوڑھ کر ممالک اسلام میں پھیلے ہوئے تھے اور اسلام کے خلاف ہر ممکن ریشہ دوانی میں ایک منظم، مگر خفیہ سازش کے ماتحت مصروف تھے، اور طرح طرح کی متخالف ومتضاد حدیثیں بنا بنا کر ہر طرف پھیلا رہے تھے، جب ۱۲۰ھ یا ۱۲۵ھ میں مقام ایلہ پہنچ کر ابن شہاب زہری کو جمع احادیث پر آمادہ کر چکے اور وہ حدیثیں لکھ لکھ کر جمع کرنے لگے تو اکابر تابعینؒ نے کتابت احادیث کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ اور وہ حدیثیں لکھنے اور جمع کرنے کی مخالفت شدید کرنے لگے۔ چونکہ ان منافقین میں کچھ اکابر تابعینؒ کے زمانے میں تھے اس لئے ان کو عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں آسانی ہوئی کیوں کہ لوگوں نے ان کو بھی تابعی تصور کر لیا حالانکہ وہ عقیدۃً غیر تابعی عملاً منافق تھے اور تابعین وصالحین سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔

منافقین عجم کے شرکائے کار کوفہ وبصرہ ومصر وطائف وغیرہ مقامات کے ملاحدہ بھی ہو گئے تھے۔ عبید بن السباق بنی ثقیف کے ایک فرد یا اُن کے موالی تھے اور بنی ثقیف کا تعلق زیادہ تر طائف سے تھا۔ عبید کو اسماء الرجال والے مدنی لکھتے ہیں۔ مگر ان کے مدنی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ چونکہ زہری ان سے روایت کرتے ہیں اور زہری کو مدنی مشہور کیا گیا ہے، غالباً اسی لئے ان کو بھی مدنی قرار دے دیا گیا ہے۔ بنی ثقیف کا خاص تعلق مدینہ طیبہ سے کبھی نہیں رہا۔ اور اگر کوئی فرد یا کچھ افراد عہد پاک نبویؐ یا عہد خلفائے راشدینؓ میں مدینہ میں آ بسے بھی ہوں تو ان میں "سباق" نام کا کوئی شخص بھی نہ تھا۔ ان کے دادا پڑدادا کا حال تو مطلق معلوم ہی نہیں۔ ان کے شیوخ میں جن اہل مدینہ کا نام آتا ہے ان سے ان کی بلاواسطہ روایت کا امکان نہیں۔ ان کے تلامذہ میں اسعد بن سہل بن حنیف کا نام لکھتے ہیں مگر یہ ان سے متقدم ہیں اور ان کے شیوخ میں ان کا نام کہیں مذکور نہیں۔ ایک عجیب طرح کی بات بھی ہے کہ جو اکابر صحابہؓ سے روایت کر رہا ہو وہ اپنے سے کم سن کم مرتبہ اور غیر معروف تابعی سے کیوں روایت لینے لگا ہے دے کر ان سے روایت کرنے والے ان کے بیٹے سعید ہیں اور زہری اور بس۔ باقی لوگ عبید بن السباق کے دادا پڑدادا کی طرح بالکل غیر معلوم الحال ہیں جن کا دنیائے رجال میں کہیں نام ونشان نہیں۔ مزید تفصیل ان کے ترجمہ میں آتی ہے۔

غرض عبید بن السباق اور ان جیسے چند اور ذہین وچالاک ملاحدہ قسم کے لوگ ان منافقین عجم کے شریک کار ہو کر جھوٹی جھوٹی متضاد وخلاف درایت حدیثیں بنا بنا کر عامہ مسلمین میں پھیلا رہے تھے۔ اور اکابر تابعینؒ واصاغر صحابہؓ جو اس وقت زندہ تھے ان کی اشاعت وکتابت کی مخالفت کر رہے تھے، تو ان کو دراصل ان اصاغر صحابہؓ واکابر تابعین کی تشفی کرنا تو مقصود تھی نہیں، اور نہ یہ کر سکتے تھے مگر عامہ مسلمین جو بیچارے دور دراز مقامات کے رہنے والے اور صحابہؓ کی صحبت سے محروم تھے ان کو دھوکہ دے کر مطمئن کرنے کے لئے ان منافقین وملاحدہ کی جماعت نے جمع قرآن کا افسانہ نکالا اور عوام میں مشہور یہ کرنا شروع کیا کہ قرآن بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جمع نہیں ہوا تھا۔ آخر آپؐ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے جمع کیا تو جس طرح رسول اللہ صلعم کے بعد قرآن جمع ہوا اسی طرح اگر صحابہؓ کے بعد حدیثیں جمع ہونے لگیں تو

کیا مضائقہ ہے۔ حدیثوں میں آحاد روایتیں ساڑھے ننانوے فی صدی تھیں۔ احاد حدیثوں پر ظنی ہونے کا الزام تھا تو جمع قرآن کے وقت آخر سورہ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق یہ گھڑا کہ یہ دو آیتیں صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ ملیں۔ اور پھر سورۂ احزاب کی بھی ایک آیت لہذا اگر باوجود آحاد ہونے کے یہ آیتیں قطعی ہو سکتی ہیں تو پھر حدیثیں آحاد ہونے کی وجہ سے کیوں ظنی ہو جائیں گی؟ جو لوگ حدیثوں کے پرستار اور روایتوں کے رسیا تھے وہ فوراً جمع قرآن کی ان جھوٹی روایتوں پر ایمان لے آئے۔ اور لگے خود بھی ان منافقین وملاحدہ کے ساتھ ان موضوع حدیثوں کا.. پروپیگنڈا کرنے۔

تو چونکہ جمع قرآن والی حدیث صرف زہری تنہا عبید بن السباق کا اور وہ تنہا زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں اس لئے زہری و عبید کے حالات سے واقفیت ضروری ہے۔ زہری کا حال تو آپ معلوم کر چکے اب عبید بن السباق کو بھی کسی حد تک پہچان لیجئے۔ اس کے بعد جمع قرآن کی حدیث پر بحث وتنقید کی جائیگی۔

عبید بن السباق

یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ ایک مجہول الحال آدمی ہیں۔ ان کے اسلاف کا حال بالکل معلوم نہیں۔ بنی ثقیف کا وطن طائف تھا اس لئے طائفی تھے۔ ان کا ترجمہ طبقات ابن سعد میں صرف ایک سطر کا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "مدنی"، کے بارے میں سہل بن حنیف سے ان کی روایت ہے، اور ابن عباس سے بھی انھوں نے روایت کی ہے"، اور بس۔ تعجب یہ ہے کہ ان سے بخاری میں جو جمع قرآن کی روایت زید بن ثابت سے ہے، اس کا ذکر ابن سعد نے مطلق نہیں کیا۔ ابن عباسؓ سے ان سے کسی روایت کا کہیں پتا نہیں ملتا۔ مسند احمد میں بھی جو مسند ابن عباسؓ ہے اس میں ایک حدیث میں بھی عبید بن السباق کا نام نہیں۔ ابن حجر نے بھی ابن سعد کے اتباع میں لکھ دیا ہے کہ یہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کی وفات بقول صحیح ۶۸ھ یا ۶۹ھ میں ہے ابن سباق کی وفات ۶۸ سال کی عمر میں ۱۱۸ھ میں امام بخاری کی تاریخ کبیر میں مذکور ہے جس کو فتح الباری شرح صحیح بخاری کے حاشیہ پر شارح ابوداؤد مولانا شمس الحق محدثؒ نے اپنے قلم مبارک رقم سے نقل فرمایا ہے اس حساب سے عبید بن السباق کی ولادت ۵۰ھ میں ٹھہرتی ہے۔ تاریخ صغیر میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ تذکرۃ الحفاظ میں بھی ان کا تذکرہ نہیں۔ البتہ ب ص۹۲ میں ترجمہ عبداللہ بن بریدہ ختم کر کے ۱۱۵ھ میں کون کون تابعی زندہ تھے ان کے نام لکھے ہیں جن میں عبید بن السباق کا بھی نام موجود ہے جس سے صرف اسی قدر پتا چلا کہ عبید بن السباق ۱۱۵ھ میں زندہ تھے۔ تو جو شخص ۱۱۵ھ میں وفات پائیگا ۱۱۵ھ میں تو ضرور زندہ ہوگا۔ غرض ان کا ذکر فی الجملہ تفصیل کے ساتھ اگر ہے تو صرف تہذیب التہذیب میں۔ مگر یہ سب کے سب سال ولادت ووفات وعمر کا مطلق ذکر نہیں کرتے کہ کہیں ان کے شیوخ کے سال وفات سے ملا کر کوئی یہ پتا نہ لگالے کہ ان میں سے تو کسی سے بھی ان کی روایت بلا کسی واسطے کے ممکن ہی نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی وفات کے وقت یہ اٹھارہ یا انیس برس کے تو ہوں گے مگر ابن عباسؓ نے اپنی وفات سے کئی سال پہلے ہی سے روایت حدیث ترک کر دی تھی جیسا کہ ہم نے صحیح مسلم سے ص۲۲ میں لکھا ہے اس لئے اس کی امید نہیں ہے کہ انھوں نے ابن عباسؓ کو کوئی حدیث سنی ہوگی۔ عبید بن السباق ابن شہاب زہری سے تقریباً دو برس بڑے تھے، ابن شہاب بھی عبداللہ بن عباسؓ سے بلاواسطہ روایت نہیں کرتے۔ باوجود اس کے کہ وہ مرسل روایت کے بے حد خوگر تھے اور ایسے لوگوں سے بھی روایت کرتے تھے جو ان کی ولادت سے پہلے وفات پا چکے تھے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا۔ غرض عبید بن السباق کی روایت ابن عباسؓ سے نہ کہیں ملتی ہے اور نہ اس کا کوئی قرینہ ہے مسند احمد میں جو مسند ابن عباس ہے اس میں کوئی حدیث عبید بن السباق سے مروی نہیں۔

ابن حجر نے یہ کمال کیا کہ تہذیب التہذیب ترجمہ عبید بن السباق میں یہ بھی لکھ دیا کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ بن حارثہ سے بھی یہ روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ ان سے بھی ان کی ایک روایت بھی نہیں ملتی۔ البتہ "اگر بپرد نتواند پسر تمام کند" کے مطابق سعید بن عبید بن السباق، محمد بن اسامہ بن زید سے صرف ایک روایت کرتے ہیں جو مسند احمد میں بضمن حدیث اسامہ[1] بن زیدؓ ج۵ ص۲۰۱ میں منقول ہے۔ تو اس میں عبید بن السباق

---

[1] ان کی وفات ۵۴ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ہے ۷۵ برس کی عمر میں۔ دمشق کے ایک گاؤں مزہ میں جا کر رہ گئے تھے۔ اخیر وقت میں پھر مدینہ آگئے اور یہیں وفات پائی اور مدفون ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بیس برس کے تھے بعضوں کے نزدیک اٹھارہ برس کے۔ حسن بصری جو ان سے روایتیں کرتے ہیں، وہ سب مرسل ہیں۔ انھوں نے ایک لفظ بھی ان سے نہیں سنا۔ اور نہ اسامہ نے اپنے والد زیدؓ سے کوئی حدیث سنی۔ اسامہ کی وفات حضرت معاویہ کے زمانے میں ... بقول صحیح ۵۴ھ میں ... اور محمد بن اسامہ کی وفات ولید کے زمانے میں [illegible] ۱۲ [illegible] تہذیب التہذیب

اسامہ اور ابن السباق

راوی ہی نہیں ہیں - بلکہ عبید بن السباق کے بیٹے سعید راوی ہیں - اور وہ اسامہ سے نہیں بلکہ اسامہ کے بیٹے محمد بن اسامہ سے روایت کر رہے ہیں اور محمد بن اسامہ اپنے والد اسامہ بن زید سے روایت کرتے ہیں -
اس روایت کا عبید بن السباق سے کوئی تعلق نہیں - اور اس کے سوا اور کوئی ایسی روایت اسامہ بن زید سے منقول نہیں جس میں عبید بن السباق کا نام بھی آیا ہو - ابن حجر نے "سعید بن عبید بن السباق" کا لفظ دیکھ کر دھوکا کھایا اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں - اور درحقیقت اسامہ سے عبید کی روایت ممکن بھی نہیں ہے - کیونکہ اسامہ بن زید کی وفات بچھتر برس کی عمر میں ۵۴ھ میں ہوئی ہے - عبید بن السباق ان کی وفات کے وقت چار سال سے زیادہ کے نہ تھے -

سہل بن حُنیف اور ابن السباق

البتہ سہل بن حنیف سے عبید بن السباق کی صرف ایک ہی روایت ترمذی و ابوداؤد و احمد وغیرہ میں ہے - جو "مذی" کے متعلق ہے وہ یہ کہ سہل بن حنیف نے کہا کہ میں کثرت مذی سے بہت عاجز اور مجھ کو بہت غسل کرنا پڑتا تھا - تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا - آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تمہارے لئے وضو کافی ہے میں نے عرض کیا کہ کپڑے پر جو مذی کا اثر آجاتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں کافی ہے کہ ایک چلو پانی اس پر چھڑک دو جہاں پر مذی لگی ہو اس روایت میں عبید بن السباق متفرد ہیں - ان کے سوا اور کوئی بھی اس مفہوم کی روایت کسی سے بھی نہیں کرتا - اسی لئے ائمہ احناف و شوافع اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہم اکابر فقہاء و محدثین کا فتویٰ اس کے خلاف ہے اور یہ سب لوگ مذی کے باضابطہ دھونے کو ضروری سمجھتے ہیں ایک لیسدار نجاست صرف ایک چلو پانی چھڑک دینے سے دور تو نہ ہوگی بلکہ کچھ دور تک پھیل جائے گی - ایسی روایت جو عقل و درایت کے خلاف ہو عبید بن السباق ہی کر سکتے ہیں -

بہرحال کتابوں میں یہ روایت "عبید بن السباق عن سہل بن حنیف" کر کے ضرور ہے - اس لئے ابن حجر نے اگر عبید کے شیوخ میں سہل کا نام لکھ دیا تو ابن حجر پر چنداں الزام نہیں - جو شخص صرف ابن سعد کی تقلید میں ابن عباسؓ سے ان کی بلا واسطہ روایت لکھ دے، "سعید بن عبید بن السباق عن محمد بن اسامہ بن زید" دیکھ کر نظر کی چوک سے اسامہ بن زید کو عبید بن السباق کا شیخ بتادے اگر ترمذی و ابوداؤد و مسند احمد وغیرہ کی روایت دیکھ کر سہل بن حنیف کو عبید بن السباق کا شیخ لکھ دیا تو کیا مقام تعجب ہے؟

ابن حجر خود سہل بن حنیف کے ترجمے میں ان کی وفات ۳۸ھ میں لکھ رہے ہیں یعنی عبید بن السباق کی ولادت سے تقریباً بارہ برس پہلے سہل کی وفات ہے - تعجب ہے کہ ابن حجر نے اس کا خیال نہ کیا -

ابن السباق اور بعض ام المومنین

اسی طرح ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ عبید بن السباق حضرت ام المومنین میمونہؓ اور حضرت ام المومنین جویریہؓ سے بھی روایت کرتے ہیں - ام المومنین حضرت جویریہؓ کی وفات ۵۰ھ میں ہے (تہذیب التہذیب ج۱۲ ص۴۰۸) اور ام المومنین حضرت میمونہ کی وفات ۴۹ھ (تہذیب التہذیب ج۱۲ ص۴۵۳) اس لئے ان کی پیدائش ان دونوں کی وفات کے بعد ہوئی ہو تو عجب نہیں ورنہ شاید حضرت جویریہؓ کی وفات سے دو چار دن یا دو چار ماہ پہلے ہوئی ہو - اور فی الواقع بھی ان دونوں امہات المومنین رضی اللہ عنہما سے کوئی روایت بھی عبید بن السباق کی کہیں نظر نہیں آتی - شاید کہیں بالواسطہ روایت ہو اور درمیانی واسطہ یہاں بھی سبقت نظر کی نذر ہو گیا ہو -

بالکل اسی طرح حضرت زینبؓ بنت معاویہؓ زوجہ عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی ان کی روایت کا ذکر ابن حجر نے کیا ہے، یہ صحابیہ ہیں - عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کی دوسری شادی تھی، اس لئے ان کی عمر کم نہیں قرار دی جا سکتی - ان سے وہ روایت مروی ہے کہ یہ اپنی ایک ہمنام عورت کے ساتھ جو ان کی ہم مقصد بھی تھیں رسول اللہ صلعم سے پوچھنے گئی تھیں کہ ہم لوگ اپنے شوہر اور (پہلے شوہر سے) یتیم بچوں کو اپنا نکالا ہوا صدقہ (زکوٰۃ) دے سکتے ہیں یا نہیں؟ جس کے جواب میں آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ یہ دوہرا کار خیر ہوگا، ادائے صدقہ (زکوٰۃ) بھی اور ادائے حق قرابت بھی - حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں ہے - ان کی بیوی زینبؓ کی وفات کہیں مذکور نہیں ہے دس پندرہ

بعد بھی ہو تو یقیناً عبید بن السباق کی پیدائش سے دو برس پہلے ہی ان کی وفات ہوئی ہوگی۔ پھر یہ ان سے کس طرح روایت کر سکتے ہیں؟ اور ان کی کوئی روایت اُن سے صحاح میں تو نہیں ہے۔

یہی حال زید بن ثابتؓ سے ان کی روایت کا ہے۔ زید بن ثابتؓ سے جمع قرآن بعہد حضرت صدیق اکبرؓ کی روایت تو مسند احمد، نسائی، ترمذی اور بخاری وغیرہ متعدد کتب حدیث میں ضرور ہے۔ اور اس روایت کا خوب ڈھول پیٹا گیا اور پیٹا جاتا ہے۔ خصوصاً صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ مگر زید بن ثابتؓ کی وفات خود ابن حجر نے بقول صحیح ۴۵ھ اور بعضوں کے نزدیک ۴۸ھ میں لکھی ہے، اور ۵۱ھ و ۵۵ھ وغیرہ اقوال کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ اس لئے عبید بن السباق، زید بن ثابتؓ کی وفات کے بعد ہی پیدا ہوئے لیکن سب سے زیادہ ضعیف بھی قول کو معتبر قرار دے دیجئے تو زید بن ثابتؓ کی وفات کے وقت یہ چار پانچ برس سے زیادہ کے نہیں ہو سکتے ہیں۔ تو ان کی روایت زید بن ثابتؓ سے بلا واسطہ صحیح نہیں ہو سکتی۔

ابن السباق کے سات مروی عنہم

غرض حسب بیان ابن حجر، عبید بن السباق تین عورتوں اور چار مردوں سے روایت کرتے ہیں جن میں صرف سہل بن حنیفؓ اور زید بن ثابتؓ ہی ہیں جن سے صرف ایک ایک روایت انکی صحاح میں ملتی ہے۔ اور دونوں غلط۔ اور باقی پانچ یعنی حضرت ام المومنین میمونہؓ، حضرت ام المومنین جویریہؓ، حضرت زینبؓ زوجہ عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ سے ان کی ایک روایت بھی نظر نہیں آتی۔ یہ تو ان کے شیوخ کا مرحلہ ہوا۔ اب تلامذہ کا حال سنئے۔

عبید بن السباق کے تلامذہ

ابن حجر اس سلسلے میں ابوامامہ اسعد بن سہل بن حنیف کا نام سب سے پہلے لکھتے ہیں۔ واقعی ان کی شخصیت ہے بھی بہت اہم، مگر تعجب یہ ہے کہ ابوامامہ عمر میں عبید بن السباق سے بہت بڑے تھے۔ خود ایک جلیل القدر صحابی کے صاحبزادے تھے اور اپنے والد ماجد کا کافی وقت پا چکے تھے، چنانچہ یہ اپنے والد ماجد سے اور بعض دوسرے اکابر صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ان کو کون سی ایسی ضرورت پڑی تھی کہ ایک گمنام شخص جس کے دادا پردادا کا نام تک کسی کو معلوم نہیں، جو تابعیوں سے ہی روایت کرتا ہو جن کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہو یا جن کی وفات کے وقت گھٹنوں کے بل چلتا ہو جس کے پاس جمع قرآن بعہد صدیقی کی جھوٹی روایت اور مذی والی خلاف عقل و درایت حدیث کے سوا کوئی اور حدیث مروی ہی نہیں ہے۔ تو پھر ابوامامہ نے کون سی حدیث عبید بن السباق سے روایت کی؟ اور کہاں روایت کی؟ وہ حدیث کس کتاب میں ہے؟

ابن حجر ان کے تلامذہ میں دو نئے نام اور بھی لکھتے ہیں، یزید بن جعدبہ اور مسلم بن مسلم بن معبد۔ یہ دونوں ایسے مجہول الحال ہیں جن کا دنیائے رجال میں کہیں نام و نشان نہیں۔ نہ امام ذہبی کہیں ذکر کرتے ہیں نہ ابن حجر نہ ابن سعد۔

تو اب لے دے کر ان کے تلامذہ میں صرف دو شخص رہ جاتے ہیں زہری اور خود انھیں کے بیٹے سعید بن عبید بن السباق۔ جمع قرآن والی حدیث تو ان سے زہری روایت کرتے ہیں، اور مذی والی حدیث اُن کے بیٹے سعید۔ اَلَا اَلَا خیر سَلَّا بس یہی ہے حقیقت عبید بن السباق کی۔ اور صرف انھیں سے جمع قرآن بعہد صدیقی کی روایت ہے جس کو صرف یہی زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے نقل کرنے والے تنہا زہری ساری دنیا پر اس کو ایک خبر متواتر کی طرح قطعی ثابت کر دینے میں صرف بخاری کی مدد سے کہا جا رہا ہے [illegible] ۔

یہ دنیا ہی کہ اتنی بات پھیلی داستاں ہو کر۔

ایک قابل داد دلیری

یہ ہے کہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۴ صفحہ ۴۵ ترجمہ سعید بن عبید بن السباق میں سعید کے شیوخ میں حضرت ابوہریرہؓ کا نام بھی لکھتے ہیں۔ حالانکہ حضرت ابوہریرہؓ کا سال وفات بقول صحیح حسب تصریح ابن حجر ۵۷ھ ہے۔ یعنی اس وقت عبید بن السباق سات برس کی عمر رکھتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والے ہزاروں عبید کے وقت میں موجود تھے۔ اس لئے یہ خوب جانتے تھے کہ ان کے سال وفات سے عام طور سے لوگ واقف ہیں۔ اس لئے خود عبید اور زہری

کو بھی یہ ہمت نہ پڑی کہ ابوہریرہؓ سے بلا واسطہ روایت کریں۔ ہزاروں آدمی جھٹلانے والے کھڑے ہو جاتے کہ تم نے ان کا وقت کب پایا، مگر "اگر بیدر نتر اند پسر تمام کند" کے طور سعید بن عبید نے اگرحدثنا ابوھریرۃ کہنا شروع کیا تو سعید کی یہ دلیری ضرور قابل داد ہے۔

تو اب آپ زہری اور زہری کے گرد عبید بن السباق دونوں سے پوری طرح واقف ہو گئے۔ یہی زہری ہیں جن کی روایت اسی عبید بن السباق سے عبدالکریم الدیرعاقولی نے اپنی کتاب الفوائد میں درج کی ہے جس سے ابن حجرؒ نے فتح الباری پ ۲۰ ص ۱۱ میں نقل فرمائی ہے کہ "رسول اللہ صلعم وفات فرما گئے اور قرآن کسی چیز پر بھی لکھا ہوا نہ تھا" یعنی ہڈی تختی چھال اور کھال ان سب سے بھی انکار۔ ابن حجر یہیں پر یہ بھی لکھتے ہیں کہ عبید بن السباق سے بس یہی ایک روایت جمع قرآن کی بخاری میں ہے جو باب جمع قرآن کے علاوہ کتاب الاحکام و کتاب التوحید وغیرہ مقامات میں باربار دہرائی گئی ہے۔ اس ایک روایت کے سوا کوئی دوسری روایت ان سے پوری صحیح بخاری میں کہیں نہیں ہے۔ اور نہ صحیح مسلم یا موطا میں ان سے کوئی روایت ہے۔ تو زہری اور عبید بن السباق سے واقف ہو لینے کے بعد اب جمع قرآن کی حدیث پر غور فرمائیے۔

جمع قرآن کی اصل روایت

امام بخاری موسیٰ بن اسمٰعیل سے، وہ ابراہیم بن سعد سے، وہ ابن شہاب زہری سے، وہ عبید بن السباق سے اور وہ زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے میرے پاس مقتل اہل یمامہ بھیجا (مطلب یہ ہے کہ اہل یمامہ کے واقعۂ قتل کے بعد میرے پاس مجھے بلانے کے لیے کسی کو بھیجا، تو جب میں ان کے پاس پہنچا) تو عمر بن الخطابؓ انکے پاس تھے۔ ابوبکرؓ نے کہا کہ میرے پاس عمرؓ نے آکر کہا کہ یمامہ کے دن حفاظ قرآن کے قتل کا بازار بہت گرم رہا اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر حفاظ کے قتل کا بازار (اسی طرح مختلف) مقامات میں گرم رہا تو قرآن کا بہت حصہ جاتا رہے گا۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم قرآن کو جمع کر ڈالو۔

---

[1] ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں خود تصریح کرتے ہیں کہ ثم استخرج ثانیا. . . . . من امھات المسانید والجوامع والمستخرجات والاجزاء والفوائد بشرط الصحۃ او الحسن فیما اوردہ من ذلک۔ یعنی پھر میں مسانید اور جوامع وغیرہ سے ان احادیث کو نقل کروں گا جو صحیح ہوں گی یا حسن (رسالہ اہل حدیث امرتسر ۲ فروری ۱۹۲۸ء ص ۱۹ مضمون مولوی ابوالقاسم البنارسی بجواب مولوی عبداللطیف الفارسی ثم البنگلوری) ابن حجر کی تصریح اور مولوی ابوالقاسم صاحب کے اس سے استدلال سے یہ ثابت ہوگیا کہ ابن حجر نے فتح الباری میں جو حدیثیں پیش کی ہیں وہ ان کے نزدیک صحیح یا حسن ہیں اور علمائے اہل حدیث کے نزدیک بھی فتح الباری میں پیش کی ہوئیں حدیثیں مستند ہیں ۱۲ منہ غفرلہ

[2] اسمائے صحابہ شہدائے جنگ یمامہ تاریخ کامل ابن اثیر جزری صفحہ ۱۷۷ سے صفحہ ۱۸۰ تک صحابۂ شہدائے جنگ یمامہ کے نام لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

عباد[1] بن بشیر الانصاری البدری۔ عباد[2] بن الحرث الانصاری الاُحُدی۔ عمیر[3] بن اوس بن عتیک الانصاری الاُحدی۔ عمارۃ[4] بن حزم الانصاری البدری۔ عاصم[5] بن ثابت بن سلمہ الانصاری۔ علی[6] بن عبیداللہ بن الحرث بن عامر بن موسیٰ۔ عائذ[7] بن ماعص الانصاری۔ فروۃ[8] بن النعمان الانصاری الاُحُدی۔ قیس[9] بن الحرث بن عدی الانصاری۔ یعنی براء بن عازب کے چچا۔ سعد[10] بن حماز الانصاری الاُحدی۔ ابودجانۃ[11] الانصاری البدری۔ سلمۃ[12] بن مسعود بن سنان الانصاری۔ سائب[13] بن عثمان بن مظعون الجمحی مہاجر حبشہ بدری۔ سائب[14] بن العوام۔ حضرت زبیر کے علاتی بھائی۔ طفیل[15] بن عمرو الدوسی۔ زرارۃ[16] بن قیس الانصاری۔ مالک[17] بن عمرو السلمی حلیف بنی عبدشمس البدری۔ مسعود[18] بن سنان الاسود حلیف بنی غانم احدی۔ مالک[19] بن امیۃ السلمی۔ مالک[20] بن عوس بن عتیک الانصاری الاحدی۔ معن[21] بن عدی بن الجد البلوی حلیف الانصاری البدری۔ نعمان[22] بن عصر بن الربیع البلوی البدری۔ ("عصر" بکسر العین وسکون الصاد وقیل بفتحھا) صفوان[23] بن عمرو السلمی البدری۔ مالک[24] بن عمرو السلمی البدری۔ ضرار[25] بن الازور الاسدی۔ عبداللہ[26] بن الحرث بن قیس بن عدی السہمی۔ عبداللہ[27] بن مخرمہ بن عبدالعزیٰ العامری البدری۔ عبداللہ[28] بن عبداللہ بن ابی بن سلول البدری۔ عبداللہ[29] بن عتیک الانصاری البدری۔ شجاع[30] بن ابی وہب الانصاری البدری۔ ہریم[31] بن عبداللہ المطلبی القرشی۔ جنادۃ[32] بن عبداللہ المطلبی القرشی۔ ولید بن عبدشمس بن المغیرہ المخزومی حضرت خالد کے چچیرے بھائی۔ ورقہ[33] بن ایاس بن عمرو الانصاری البدری۔ یزید[34] بن اوس حلیف بن عبدالدار۔ ابوحبۃ[35] بن غزیۃ الانصاری الاحدی۔ ابوعقیل[36] البلوی حلیف الانصاری۔ بدری۔ باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ

(ابوبکرؓ نے کہا کہ) میں نے عمرؓ سے کہا کہ تم ایسا کام کس طرح کروگے جس کو رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا؟ عمرؓ نے کہا کہ بخدا یہ کار خیر ہے۔ (اس کے لئے) عمرؓ بار بار میرے پاس آتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میری شرح صدر اس کے لئے کردی۔ اور میں بھی وہی مناسب سمجھا جو عمرؓ سمجھ رہے تھے۔ زیدؓ نے کہا کہ ابوبکرؓ نے (مجھ سے) کہا کہ تم ایک جوان آدمی ہو، عاقل ہو تم پر ہم لوگ (کسی طرح کی) تہمت نہیں پاتے اور تم رسول اللہ صلعم کے لئے وحی لکھا کرتے تھے، تو قرآن (کے حصوں) کو تلاش کرو اور اس کو جمع کرو (زید کہتے ہیں) خدا کی قسم اگر یہ لوگ مجھ کو پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی تکلیف دیتے تو جس جمع قرآن کے کام پر مجھے مامور کیا اس سے زیادہ میرے لئے گراں نہوتا۔ (پھر زید کہتے ہیں کہ) میں نے (ابوبکرؓ و عمرؓ سے) کہا تم لوگ ایسا کام کس طرح کروگے جس کو رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا ہے؟ (ابوبکرؓ نے) کہا کہ خدا کی قسم یہ کار خیر ہے۔ پھر ابوبکرؓ مجھ سے بار بار کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میری شرح صدر اس کام کے لئے کردی جس کے لئے ابوبکرؓ و عمرؓ کی شرح صدر اس نے کردی تھی۔ تو میں قرآن (کے حصوں) کو ڈھونڈنے لگا اور جمع کرنے لگا لکڑی کی چھلیوں اور ٹھیکریوں سے اور لوگوں کے سینوں سے یہاں تک آخر سورہ توبہ (کی دو آیتوں) کو ابوخزیمہ انصاری کے ساتھ پایا، اور کسی کے ساتھ اس کو نہیں پایا۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ خاتمہ سورہ براۃ تک۔ تو یہ (جمع کردہ) صحیفے ابوبکرؓ کے پاس ان کی زندگی تک رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وفات دی۔ پھر عمرؓ کے پاس ان کی زندگی تک رہے پھر (ام المومنین) حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس رہے۔ (باب جمع القرآن بخاری)۔ اس حدیث کی اصل متن حسب ذیل ہے:۔

اصل حدیث جمع قرآن بعہد صدیق اکبرؓ باب جمع قرآن بخاری

حدثنا موسی بن اسمعیل عن ابراهیم بن سعد قال حدثنا ابن شهاب عن عبید بن السباق ان زید بن ثابت قال ارسل الی ابوبکر مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عنده. قال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقرّاء القرآن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن وانی اری ان تامر بجمع القرآن قلت لعمر کیف تفعل شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال عمر هذا والله خیر. فلم یزل یراجعنی حتی شرح الله صدری لذلك ورأیت فی ذلك الذی رای عمر. قال زید قال ابوبکر انك رجل شاب عاقل لا نتهمك وقد کنت تکتب الوحی لرسول الله صلی الله علیه وسلم فتتبع القرآن فاجمعه فوالله لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی به من جمع القرآن قال قلت کیف تفعلون شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال هو والله خیر فلم یزل ابوبکر یراجعنی حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر ابی بکر وعمر فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت آخر

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ابوقیسؓ بن الحرث بن قیس بن عدی السہمی مہاجر حبشہ اُحدی۔ یزیدؓ بن ثابت الانصاری۔ زید بن ثابتؓ کے بھائی غرض ایک کم چالیس صحابہ کے نام ابن اثیر نے شہدائے جنگ یمامہ میں نقل کئے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ایسا نتھا جس کی مہارت یا کتابت قرآن دوسرے صحابہ سے ممتاز ہو۔ جن کی مہارت فی القرآن کا ذکر حدیثوں میں ہے۔ جن کے بارے میں رسول اللہ صلعم نے دوسروں کو قرآن سیکھنے کا حکم فرمایا۔ ان میں سے ان شہداء میں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان انتالیس صحابہ کی شہادت سے یہ خطرہ ہو کہ قرآن دنیا سے مفقود ہو جائیگا۔

استیعاب میں حضرت رباح بن الربیع حنظلۃ الکاتب کے بھائی کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ وہ بھی جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے۔ ان کے نام میں اختلاف ہے کوئی رباح بائے حطی سے کہتا ہے کوئی ریاح بائے ابجد سے۔ اگر یائے حطی ہی صحیح ہے تو ان کے سوا اور کسی صحابی کا نام ریاح یائے حطی سے نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ استیعاب کو بالاستیعاب دیکھا جائے تو چند نام اور بھی شہدائے جنگ یمامہ میں صحابہ کے نکل آئیں۔ اس لئے انتالیس ۳۹ نہیں چالیس سہی۔ چالیس نہیں پچاس بلکہ پورے سو سہی اتنے قرآن دانوں اور قرآن خوانوں کی شہادت سے قرآن کے مفقود و معدوم ہو جانے کا خطرہ بعید از عقل و ہوش ہے۔

سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حتی خاتمة براءة فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہ ثم عند حفصة بنت عمر۔ یہی حدیث ذرا ذرا سے اختلافِ الفاظ متن کے ساتھ کتاب التفسیر میں بضمن تفسیر سورۂ توبہ بھی مذکور ہے جس میں امام بخاری ابوالیمان سے اور وہ شعیب (کاتب الزہری) سے اور وہ زہری سے روایت کر رہے ہیں اور زہری عبید بن السباق سے، وہ زید بن ثابت سے، جو حسب ذیل ہے (ترجمہ وہی سابق ہی کافی ہے)۔

حدیث جمع قرآن کتاب التفسیر بخاری

حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال اخبرنی ابن السباق ان زید بن ثابت الانصاری، وکان ممن یکتب الوحی قال ارسل الی ابوبکر مقتل اھل الیمامہ وعندہ عمر فقال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بالناس وانی اخشی ان یستحر القتل بالقراء فی المواطن فیذھب کثیر من القراٰن الا ان تجمعوہ وانی لاری ان یجمع القراٰن قال ابوبکر قلت لعمر کیف افعل شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عمر ھو واللہ خیر فلم یزل عمر یراجعنی فیہ حتی شرح اللہ لذلك صدری ورایت الذی رای عمر قال زید بن ثابت وعمر عندہ جالس لا یتکلم فقال ابوبکر انك رجل شاب عاقل ولا نتھمك کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتتبع القراٰن فاجمعہ فواللہ لو کلفنی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی بہ من جمع القراٰن قلت کیف تفعلان شیئا لم یفعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ابوبکر ھو واللہ خیر فلم ازل اراجعہ حتی شرح اللہ صدری للذی شرح اللہ لہ صدر ابی بکر وعمر فقمت فتتبعت القراٰن اجمعہ من الرقاع والاکتاف والعسب وصدور الرجال حتی وجدت من سورة التوبة ایتین مع خزیمة الانصاری لم اجدھما مع احد غیرہ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ الی اخرھا وکانت الصحف التی جمع فیھا القراٰن عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حتی توفاہ اللہ ثم عند حفصة بنت عمر۔ تابعہ عثمان بن عمر و واللیث عن یونس عن ابن شھاب وقال اللیث حدثنی عبد الرحمٰن بن خالد عن ابن شھاب وقال مع ابی خزیمة الانصاری وقال موسیٰ عن ابراھیم حدثنا ابن شھاب مع خزیمة وتابعہ یعقوب بن ابراھیم عن ابیہ وقال ابوثابت حدثنا ابراھیم وقال مع خزیمة او ابی خزیمة فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔ امام بخاریؒ نے متابعتوں کی تصریح صرف اسی جگہ کی ہے۔ ترجمۂ حدیث تو وہی سمجھئے جو اوپر گزرا۔ متابعات کا ترجمہ حاشیہ میں دیکھئے۔ [1]

پھر کتاب الاحکام ج ۲ ص ۱۰۶۷ میں اسی حدیث کو امام بخاری محمد بن عبید اللہ ابوثابت سے وہ ابراہیم بن سعد سے وہ ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں اور وہ عبید بن السباق سے وہ زید بن ثابت سے۔ جو یوں ہے:۔ (یہاں بھی ترجمہ کی ضرورت نہیں وہی پہلا ترجمہ کافی ہے)

حدیث جمع قرآن اور کتاب الاحکام بخاری

حدثنا محمد بن عبید اللہ ابوثابت حدثنا ابراھیم بن سعد عن ابن شھاب عن عبید بن السباق عن زید بن ثابت قال بعث الی ابوبکر لمقتل اھل الیمامہ وعندہ عمر فقال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقراء القراٰن وانی اخشی ان یستحر القتل بقراء القراٰن فی المواطن کلھا فیذھب قراٰن کثیر وانی اری ان تامر بجمع القراٰن قلت کیف افعل شیئا لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عمر ھو واللہ خیر فلم یزل عمر یراجعنی فی ذلك حتی شرح اللہ صدری

---

[1] یعنی اس (خزیمہ والی حدیث) کی متابعت عثمان بن عمرو، اور لیث نے کی ہے جس کو یہ دونوں یونس اور ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں۔ اور لیث نے کہا کہ مجھ سے عبد الرحمٰن بن خالد نے ابن شہاب سے مع ابی خزیمة الانصاری کی روایت کی ہے اور موسیٰ نے ابراہیم سے انھوں نے ابن شہاب سے مع ابی خزیمة کہا (یعنی باب جمع القرآن والی روایت) اور اس کی متابعت یعقوب ابراہیم نے بھی کی ہے جس کو وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ابوثابت نے کہا کہ ہم سے ابراہیم نے حدیث بیان کی اور کہا مع خزیمة او ابی خزیمة۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ یعنی آخر سورۂ براءۃ کی صرف ایک ہی آیت۔ ۱۲ منہ غفرلہ

للذی شرح له صدر عمر ورایت فی ذالك الذی رای عمر قال زید قال ابوبکر وانك رجل شاب عاقل لانتهمك قد کنت تکتب الوحی لرسول الله صلی الله علیه وسلم فتتبع القرآن واجمعه قال زید فوالله لوکلفنی نقل جبل من الجبال ماکان باثقل علی مما کلفنی من جمع القرآن قلت کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ابوبکر هو والله خیر فلم یزل یحب مراجعتی حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر ابی بکر وعمر ورایت فی ذلك الذی رایا فتتبعت القرآن اجمعه من العسب والرقاع واللخاف وصدور الرجال فوجدت آخر سورة التوبة لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ الی آخرها مع خزیمة او ابی خزیمة فالحقتها[2] فی سورتها وکانت الصحف عند ابی بکر حیاته حتی توفاه الله ثم عند عمر حیاته حتی توفاه الله ثم عند حفصة بنت عمر قال محمد بن عبید الله اللخاف یعنی الخزف۔

ان حدیثوں کو ملاکر دیکھئے تو تین حدیثوں میں الفاظ کے متعدد اختلاف نظر آئیں گے۔ جن میں بعض اہم بھی ہیں۔ مگر اختلافوں سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو یہ فرق ضرور بیحد قابل غور ہے کہ کتاب التفسیر کی حدیث جس کو امام بخاری موسیٰ بن اسمٰعیل سے وہ ابراہیم بن سعد سے اور وہ زہری سے روایت کررہے ہیں۔ اس میں آخر سورۂ توبہ کی دو آیتوں کے ملنے کا ذکر ابوخزیمہ انصاری کے ساتھ ہے۔ اور کتاب التفسیر میں ہے یہی حدیث جس کو امام بخاری ابوالیمان سے وہ شعیب (کاتب الزہری) سے وہ زہری سے روایت کرتے ہیں مگر اس میں آخر سورہ توبہ کی ان دو آیتوں کے ملنے کا مذکور خزیمہ انصاری کے ساتھ ہے۔ اور کتاب الاحکام میں جو پھر یہی حدیث امام بخاری ابوثابت محمد بن عبیداللہ سے وہ انھیں ابراہیم بن سعد سے روایت کرتے ہیں جن سے باب جمع القرآن والی حدیث کو موسیٰ بن اسمٰعیل نے روایت کیا تھا اور یہ ابراہیم یہاں بھی زہری ہی سے روایت کررہے ہیں تو اس میں آخر سورۂ توبہ کی صرف ایک ہی آیت کے ملنے کا ذکر ہے اور وہ بھی خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ معلوم نہیں یہ شک اس حدیث میں ابوثابت کی طرف سے ہے یا ابراہیم بن سعد کی طرف سے یا زہری کی طرف سے[1] واللہ اعلم۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ اس آخری حدیث میں ایک ٹکڑا ایسا ہے جو پہلی دونوں حدیثوں میں نہیں ہے۔ یعنی فالحقتہا فی سورتہا (تو میں نے آخر سورہ توبہ کی اس آیت کو اس کے سورہ میں لگادیا۔

---

[1] (صفحہ ۲۸ کتاب التفسیر والی روایت، جو اس سے پہلے آپ نے ملاحظہ فرمائی اسمیں متابعتوں کی جو تفصیل مذکور ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ان ... متابعتوں کی روایتوں کو ملاکر آپ دیکھیں گے تو دو جگہ نہایت واضح اختلاف پائیں گے۔ ایک تو اسی کتاب الاحکام والی حدیث میں، اور دوسری باب کتاب النبیؐ کتاب الاحکام والی حدیث میں دو دو اختلافات ہیں۔ ایک تو یہ کہ متابعت میں مذکور ہے کہ ابوثابت ابراہیم سے اور وہ زہری سے جو روایت کرتے ہیں تو آخر سورہ توبہ کی صرف ایک آیت فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ کے خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ پائے جانے کی۔ اور یہاں دوسری روایتوں کی طرح دونوں آیتوں کے بارے میں ہے یعنی لقد جاءکم سے آخر تک دوسرے یہ کہ اس روایت میں ایک اضافہ ایسا ہے جو کسی دوسری روایت میں کہیں نہیں۔ وہ فالحقتہا فی سورتہا کا ٹکڑا ہے۔

اور باب کاتب النبی میں لیث کی روایت یونس سے اور یونس کی زہری سے، متابعت میں تو مع خزیمۃ کی ہے، اور یہاں مع ابی خزیمۃ کی اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام بخاری کی تصریح متابعت کے خلاف بعد والوں نے ان حدیثوں میں ترمیم و تنسیخ کی ہے۔

اور یہ جو فالحقتہا فی سورتہا کا اضافہ اس آیت، میں ہے یہ صاف بتا رہا ہے کہ زید بن ثابتؓ اور دوسرے صحابہؓ اور وہ خزیمہ یا ابوخزیمہ جو بھی ہوں یہ سب ان دونوں آیتوں کے بارے میں خوب جانتے تھے کہ یہ دونوں آیتیں آخر سورہ توبہ کی ہیں اور اپنے علم و واقفیت کے مطابق انھوں نے ان آیتوں کو ان کی محل پر لگادیا۔ تو وہ روایت کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تین آیتیں ہوتیں ہم ان کو ایک سورہ قرار دیدیتے، مگر چونکہ دو ہی آیتیں اس لئے انکو کسی سورہ کے آخر میں رکھ دو" کس قدر غلط اور حضرت فاروق اعظمؓ پر کیسا ناروا بہتان ہے۔ جیسے صحابہ اپنے اختیار سے جس آیت کو جہاں مناسب سمجھتے تھے رکھ دیتے تھے۔ اس روایت میں جو الحقتہا فی سورتہا کا لفظ ہے، یعنی زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت ابوخزیمہ کے پاس ملی تو ہم نے اس کو اس کی جگہ اس کی سورۃ میں لگادیا اور رکھدیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ زیدؓ کو اس آیت کی جگہ پہلے سے معلوم تھی۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہ آیت سورہ توبہ کے آخر کی ہے اس لئے انھوں نے سورہ توبہ کے آخر میں لگایا، اسلئے وہ حضرت فاروق اعظمؓ پر بہتان والی روایت یقیناً غلط اور حضرت فاروق اعظم پر سفید بہتان ہے۔ اور یقیناً یہ افتراء کسی شیعے کا ہے جس نے فاروق اعظمؓ پر بہتان لگایا اور قرآن مجید کو بھی مشتبہ کرنیکی ناپاک کوشش کی۔ اِن الذین یلحدون فی آیٰتنا لایخفون علینا۔

[2] یہ اضافہ صرف اسی روایت میں ہے۔

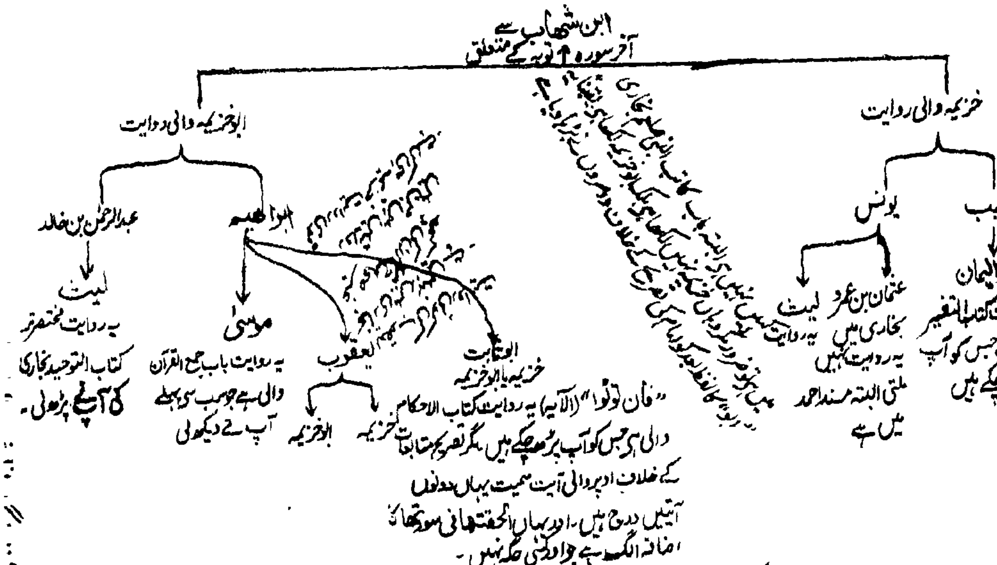
حدیث جمع قرآن از باب کاتب النبی بخاری

ان تین مقامات میں تو یہ حدیث کچھ فرق الفاظ رکھتے ہوئے مگر ایک ہی انداز بیان میں اور ایک ہی عنوان کی تفصیل کے ساتھ لائی گئی ہے لیکن محض مختصر طور سے دو جگہ اور بھی مذکور ہے۔ ایک تو بخاری صـ۷۴۶ ج۲ باب کاتب النبی صلعم میں یوں ہے:- حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنا اللیث عن یونس عن ابن شہاب ان ابن السباق قال۔ ان زید بن ثابت قال ارسل الی ابوبکر فقال انک کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتبع القرآن۔ فتتبعت حتی وجدت اٰخر سورۃ التوبۃ اٰیتین مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھما مع غیرہ لقد جاءکم الی اٰخرہ۔ یعنی یحیی بن بکیر لیث سے، وہ یونس سے، وہ ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ ابن السباق نے کہا کہ زید بن ثابتؓ نے بیان کیا کہ میرے پاس ابوبکرؓ نے بھیجا تو کہا کہ تم لکھتے تھے وحی رسول اللہ صلعم کے لئے تو ڈھونڈھو قرآن کو، تو میں ڈھونڈھنے لگا یہاں تک کہ میں نے پایا آخر سورہ توبہ کی دو آیتوں کو ابوخزیمہ انصاری کے ساتھ۔ نہیں پایا میں نے ان کو ان کے سوا کسی کے بھی ساتھ لقد جاءکم آخر تک۔

اور دوسری جگہ کتاب التوحید ج۲ صـ۱۱۰۴ میں جو یوں ہے: حدثنا موسی عن ابراھیم قال حدثنا ابن شہاب عن عبید بن السباق ان زید بن ثابت حدثہ۔ح وقال اللیث حدثنی عبد الرحمن بن خالد عن ابن شہاب عن ابن السباق ان زید بن ثابت حدثہ۔ قال ارسل الی ابوبکر فتتبعت القرآن حتی وجدت اٰخر سورۃ التوبۃ مع ابی خزیمۃ الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ حتی خاتمۃ براءۃ یعنی امام بخاری موسیٰ (بن اسمٰعیل) سے، وہ ابراہیم (بن سعد) سے، وہ ابن شہاب زہری سے اور وہ عبید بن السباق سے روایت کرتے ہیں۔ اور پھر اسی حدیث کا دوسرا طریق روایت یہ ہے کہ امام بخاری لیث سے وہ عبدالرحمٰن بن خالد سے، اور وہ ابن شہاب زہری سے اور پھر وہ عبید بن السباق سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ نے بیان کیا کہ "میرے پاس ابوبکر نے بھیجا تو میں قرآن ڈھونڈھنے لگا۔ یہاں تک کہ میں نے آخر سورہ توبہ کو ابوخزیمہ انصاری کے ساتھ پایا۔ ان کے سوا کسی دوسرے کے پاس نہیں پایا۔ لقد جاءکم رسول من انفسکم خاتمہ براءۃ تک"۔ یہ روایت پہلی مختصر روایت سے بھی مختصر تر ہے۔ اور اس قدر مختصر کہ معتمی ہو کر رہ گئی جس کی نظر ان روایتوں پر نہ ہو وہ اس حدیث کا صحیح مطلب تک نہیں سمجھ سکتا۔ یہ دونوں مختصر روایتیں اپنی ہیأت کذائیہ کی زبان سے صاف صاف خود ظاہر کر رہی ہیں کہ یہ دونوں روایتیں در اصل اس لئے بنائی گئی ہیں کہ پہلی تینوں مفصل روایتوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ کر دیں اور یہ معلوم ہو جائے کہ باب جمع القرآن والی حدیث کے مطابق آخر سورہ براءۃ کی دو آیتوں کا ابوخزیمہ انصاری ہی کے ساتھ ملنا صحیح ہے اس لئے کہ یہ دو مختصر روایتیں بھی اس کی تائید کر رہی ہیں۔

خزیمہ یا ابوخزیمہ

کتاب الاحکام میں جو شک خزیمہ یا ابوخزیمہ کا راوی کو ہو گیا ہے اس کا تصفیہ بھی ان دونوں حدیثوں ہی سے ہو جائے گا، اس کے بعد پھر تین تین روایتیں اور تحویل یعنی آخری روایت کے طریق ثانی کو بھی ملا لیجئے تو چار روایتوں سے ابوخزیمہ والی روایت کی بظاہر تائید ہو جاتی ہے۔ پھر تو صرف ایک ہی روایت خزیمہ کی رہ جائے گی جس کو راوی کی غلطی یا بھول چوک پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ راوی نے ابوخزیمہ کو خزیمہ کہدیا۔ اسی لئے امام بخاری نے متابعتوں کی تصریح نہ باب جمع القرآن والی حدیث کے بعد کی نہ کتاب الاحکام والی حدیث کے بعد۔ بلکہ کتاب التفسیر ہی والی حدیث کے بعد تمام متابعتوں کی تصریح اس طرح فرمائی کہ غور کرنے والے کو "ابوخزیمہ" ہی والی روایت کی صحت کا یقین ہو جائے۔ ان متابعتوں کو ایک نقشہ بنا کر اس طرح سمجھا دیتے ہیں۔ اس نقشے کو کتاب التفسیر والی حدیث سے ملا کر دیکھئے جہاں تصریح متابعات ہے



مسند احمد میں بعض متابعات | ابن حجر لکھتے ہیں کہ عثمان بن عمر کی متابعت مسند احمد و اسحٰق میں مذکور ہے۔ ہے تو ضرور مگر ناقص یعنی اس میں خزیمہ یا ابوخزیمہ کسی کا ذکر ہی نہیں، نہ آخر سورہ توبہ کا کوئی تذکرہ۔ یہ روایت ہی مقتضب ہے، دیکھیے مسند احمد ج ۱ صـ۱۳ حدثنا عبد اللہ حدثنی ابی ثنا عثمان بن عمر قال اخبرنا یونس عن الزہری قال اخبرنی ابن السباق قال اخبرنی

سلہ ماہنامہ البیان لاہور بابت جنوری ۱۹۵۲ء میں میرا ایک مضمون "ظن کے اصطلاحی معنی" کے عنوان سے چھپا تھا جس پر لمبی لمبی دو دو تنقیدیں اخبار الاعتصام گوجرانوالہ (مسلک اہل حدیث کے ترجمان) میں بانساط چھپی تھیں پہلی تنقید تو بڑی طویل و عریض شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل صاحب خطیب جامع گوجرانوالہ کی ۳ر ۱۰ر ۱۷ر ۲۴ر اور ۳۱ر مارچ ۵۲ء کے پانچ نمبروں میں لمبے چوڑے ساڑھے دس صفحوں پر چھپی جس کا تعلق میرے اصل مضمون سے تھا۔ میں نے اس کا جواب ماقلّ وعلّ البیان میں اشاعت کے لئے بھیجدیا تھا۔ البیان کا ادارہ بدل گیا۔ مگر امید ہے کہ عنقریب وہ جواب چھپ جائے انشاء اللہ تعالیٰ عہ

میرے اس مضمون میں جمعِ قرآن کی حدیث کا بھی ذکر ضمناً آگیا تھا۔ جس میں میں نے لکھوا تھا کہ صحاح میں جمعِ قرآن بعہد صدیقی کی روایت صرف زہری صرف عبید بن السباق سے عبید صرف زید بن ثابت سے کر رہے ہیں اس لئے یہ روایت آحاد در آحاد در آحاد ہے۔

میرے اسی حصہ مضمون کی تنقید مولانا ابو محمد عبد اللہ بن عنایت اللہ صاحب لائل پوری نے اسی اخبار الاعتصام مورخہ ۲۱ر ۲۸ر اپریل ۵۲ء کے طویل و عریض یعنے چار صفحوں پر شائع کی ہے۔ میں نے اس کے جواب کی ضرورت محسوس نہیں کی تین وجہوں سے ۱۔ مولانا لائل پوری کا لب و لہجہ تیز ہے۔ اس لئے خموشی ہی بہتر نظر آئی ۲۔ تنقید میں کھلی ہوئی ہٹ دھرمی سے کام لیا گیا ہے، اور دھوکا دیا گیا ہے۔ اور ہٹ دھرمی کا جواب سکوت سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ ۳۔ اہلِ علم پر مولانا لائل پوری کا دجل نہیں چل سکتا۔ وہ خود تنقید کی نوعیت کو سمجھ لیں گے۔ اب جب کہ یہ صحاح کی تمام احادیث جمعِ قرآن کی تنقید شائع ہو رہی ہے تو اس سے بڑھ کر مولانا لائل پوری کا اور کیا جواب ہو سکتا ہے فبای حدیث بعدہٗ یؤمنون

مولانا لائل پوری نے دھوکا یہ دیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ زہری صرف عبید بن السباق ہی سے نہیں بلکہ خارجہ بن زید سے بھی روایت کر رہے ہیں۔ ایسے زید بن ثابت سے روایت کرنے والے صرف عبید بن السباق ہی نہیں ہیں بلکہ خارجہ بن زید بھی ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں فتح الباری ج ۶ صـ۱۸ کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ خارجہ بن زید سے صرف آیت سورہ احزاب کے نہ ملنے اور پھر خزیمہ بن ثابت الانصاری کے ساتھ پائے جانے کی روایت ہے جو حدیث نقل مصاحف بعہد عثمانی کے بعد بخاری میں مذکور ہے۔ اس کا اس روایت میں کوئی ذکر نہیں کہ سورہ احزاب والی آیت کا واقعہ جمعِ صدیقی کے وقت کا ہے یا نقل مصاحف بعہد عثمانی کے موقع کا؟ نہ خارجہ کی کسی روایت کا جو صحاح میں مذکور ہے جمعِ صدیقی یا نقل مصاحف بعہد عثمانی میں سے کسی کا بھی کوئی ذکر ہے۔ اس لئے یہ صدیقی کی حدیث کے راوی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے زیادہ تر لوگ اس کو نقل مصاحف کے وقت کا واقعہ بتاتے ہیں اور یہی منشا امام بخاری کا بھی ہے اسی لئے انھوں نے اس کو نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث کے بعد باب جمع القرآن میں درج کیا اور پھر کتاب التفسیر ص ۱۲۸ اور کتاب الجہاد ص ۳۹۴ …

زید بن ثابت ان ابا بکر ارسل الیہ مقتل اہل الیمامۃ فاذا عمر عندہ فقال ابو بکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر باہل الیمامۃ من قراء القرآن من المسلمین وانا اخشی ان یستحر القتل بالقراء فی المواطن فیذھب قرآن کثیر لا یوعی وانی اری ان تامر بجمع القرآن فقلت لعمر وکیف افعل شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ھو واللہ خیر فلم یزل یراجعنی فی ذالک حتی شرح اللہ صدری ورایت فیہ الذی رای عمر قال زید وعمر عندہ جالس لا یتکلم. فقال ابو بکر انک رجل شاب عاقل لا نتہمک کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلعم فاجمعہ. قال زید فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان باثقل علی مما امرنی بہ من جمع القرآن فقلت کیف تفعلون شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلعم۔ بس یہیں تک حدیث عثمان ابن عمر سے مروی ہے۔ البتہ اس میں

"لا یوعیٰ" کا اضافہ خطرناک

ایک خطرناک اضافہ ہے جو کسی روایت میں نہیں "لا یوعیٰ" کا لفظ جس کے مطلب یہ ہیں کہ قرآن کے وہ حصے جو قلمبند و محفوظ نہیں ہو سکے کچھ اس کو یاد ہیں کچھ اُس کو وہ ضائع ہو جائیں گے۔ جس راوی نے یہ ناپاک اضافہ کیا ہو۔ اس کی فطرت کا اندازہ اس اضافے سے لگا لیجئے۔

مسند احمد کی ایک اور روایت

ہاں ایک اور روایت بھی مسند احمد ج ۵ ص۱۸۸ میں ہے، ابو کامل (مظفر بن مدرک) سے وہ ابراہیم بن سعد سے وہ ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں مگر یہ بھی پہلی حدیث کی طرح مقتضب ہی ہے کہتے ہیں۔ عن عبید ابن السباق عن زید بن ثابت قال ارسل الی ابو بکر مقتل اہل الیمامۃ فاذا عمر عندہ جالس وقال ابو بکر یا زید بن ثابت انک غلام شاب عاقل لا نتہمک قد کنت تکتب الوحی لرسول اللہ صلعم فتتبع القرآن فاجمعہ قال زید فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی بہ من جمع القرآن فقلت اتفعلان شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلعم قال ھو واللہ خیر فلم یزل ابو بکر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری بالذی شرح لہ صدر ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ یہ روایت بھی یہیں تک ہے اس میں بھی نہ آخر سورہ براۃ کا ذکر ہے، نہ خزیمہ کا نہ ابو خزیمہ کا۔ غالباً اسی لئے تو امام بخاری نے ابو کامل کی متابعت کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔ اور عثمان بن عمر کی متابعت کا ذکر کیا بھی تو اس کو کہیں نقل نہیں کیا۔

باقی رہی لیث کی روایت یونس سے، تو ابن حجر فتح الباری ج ۱۹ ص۲۰۹ میں لکھتے ہیں کہ اس کو مؤلف یعنی امام بخاری نے باب فضائل القرآن اور کتاب التوحید میں نقل کیا ہے، ابن حجر سے یہاں تسامح ہو گیا ہے جو کتاب التوحید کا بھی ذکر یہاں کر دیا۔ یہ روایت صرف فضائل القرآن باب کاتب النبی صلعم میں ہے۔ کتاب التوحید میں لیث کی روایت یونس سے نہیں ہے، بلکہ عبدالرحمٰن بن خالد سے ہے جس کی تصریح میں نقشے میں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اسی طرح گول مول ہے کہ یہ پتا نہ لگے کہ یہ واقعہ کس وقت اور کس زمانہ کا ہے۔

اس لئے جمع قرآن بعہد صدیقی کی روایت تنہا عبید بن السباق ہی سے ہے اور نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت تنہا انس بن مالک ہی سے۔ اور ہر حدیث کے تنہا راوی زہری ہی ہیں۔ پوری بحث آیت احزاب و سورہ توبہ کے بیان میں اسی رسالے میں آ ئی ہے۔ اور مولانا لائلپوری کی ہر بات کا جواب میری اس کتاب میں موجود ہے۔

زہری سے روایت کرنے والے شعیب[۱]، یونس[۲]، ابراہیم[۳] اور عبدالرحمٰن[۴] چار آدمی ہم نے امام بخاری کے متابعات کے مطابق دکھلائے تھے۔ مولانا لائلپوری نے بخاری سے ایک نام اور بھی پیش کیا ہے۔ یعنی زہری سے سلیمان بن ابی بلال ان سے ان کے بھائی ابو بکر عبدالحمید، ان سے اسماعیل بن ابی اویس۔ ان سے امام بخاری۔ مگر مولانا لائلپوری کو یہ تحویل پیش کر کے پچھتانا پڑے گا۔ اس لئے کہ تحویل میں امام بخاری کے شیخ اسمٰعیل بن ابی اویس کا حال شاید ان کو معلوم نہیں ہے۔ سنیئے ابن حجر تہذیب التہذیب میں کیا فرماتے ہیں؟ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام ائمہ رجال کا ان کے ضعیف غیر ثقہ اور ناقابل اعتبار ہونے پر اتفاق ہے اور متعدد ائمہ رجال نے تو ان کو کذاب جیسے ممتاز لقب سے یاد کیا ہے۔ بعضوں نے حدیثیں گھڑنے کا بھی الزام دیا ہے۔ دیکھئے تہذیب التہذیب ج ۱ ص۳۱۰ سے ص۳۱۲ تک۔ ایسے ہی قسم کے فضائل و مناقب بھرے ہوئے ہیں۔

مگر واضح رہے کہ یہ تحویل بھی امام بخاری نے صرف سورہ احزاب والی آیت کے متعلق ذکر کی ہے جو خارجہ سے مروی ہے۔ باب جمع القرآن یا کتاب التفسیر میں یہ تحویل مذکور نہیں ہے کتاب الجہاد میں مذکور ہے اور اس میں جمع قرآن یا نقل مصاحف کے واقعے کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں۔ میں نے آخر سورہ توبہ و آیت احزاب پر بحث کرتے ہوئے اس کتاب میں اس تحویل پر بھی بحث کی ہے مگر مولانا لائلپوری نے ناظرین الاعتصام کو دھوکا دینے کے لئے ان باتوں کو حدیث جمع قرآن بعہد صدیقی سے تعمداً غلط متعلق کر دیا۔

المشتکی الی اللہ ۱۲ منہ

کر دی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ صحیح بخاری کے موجودہ نسخوں میں اگر دیکھئے تو باب کاتب النبی صلعم میں وہ لیث والی روایت جو یونس سے ہے ضرور ملے گی مگر خزیمہ کا نام نہیں ملے گا بلکہ ابوخزیمہ کا نام ملے گا، اس لئے یہ حدیث کتاب التفسیر والی حدیث کی متابعت میں نہیں پیش کی جاسکتی بلکہ باب جمع القرآن والی حدیث کی متابعت اس سے ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری کی اس پیش کردہ متابعت سے صاف ظاہر ہے کہ باب کاتب النبی صلعم والی حدیث میں خزیمہ کا نام امام بخاری نے لکھا تھا مگر ان کے کسی چالاک شاگرد نے اس کو ابوخزیمہ بنا دیا۔ ورنہ اس روایت کو امام بخاری خود کتاب التفسیر والی روایت کی متابعت میں کبھی پیش نہ کرتے۔ وہ تو خود "ابوخزیمہ" والے قول کے موید تھے وہ اس روایت کو عبدالرحمٰن بن خالد ودموسیٰ کی متابعت میں پیش کرتے۔

اور یعقوب والی روایت بھی بخاری میں نہیں ہے بلکہ صحاح کی کسی کتاب میں نہیں ہے ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوبکر بن ابی داؤد نے اس کو اپنی کتاب المصاحف میں نقل کیا ہے اور ابویعلی نے بھی مختصراً لکھا ہے۔ مگر خود ابن حجر ہی لکھتے ہیں کہ یعقوب والی روایت کو ذہلی نے الزھریات میں بھی نقل کیا ہے، تو انھوں نے خزیمہ ہی کا نام یعقوب سے نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح جوزقی نے بھی۔ تو یعقوب جو اپنے باپ ابراہیم سے روایت کرتے ہیں تو وہ بھی بروایت قوی خزیمہ ہی کی روایت کرتے ہیں اور بروایت ضعیف ابوخزیمہ کی۔ واللہ اعلم

ابراہیم بن سعد ہی کی روایت میں تمام اختلافات ہیں

غرض سارے اختلافات ابراہیم بن سعد ہی کی روایت میں ہیں۔ صرف انھیں سے باب جمع القرآن والی حدیث ہے جس میں ابوخزیمہ ہے اور انھیں سے ثابت والی حدیث جو کتاب الاحکام میں مروی ہے جس میں خزیمہ اَو ابوخزیمہ ہے (شک کے ساتھ) اور آخر سورہ توبہ کی دو آیتوں کے عوض صرف ایک ہی آیت کے ملنے اور پھر خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ ملنے کا ذکر ہے۔ اور پھر انھیں سے ان کے بیٹے یعقوب بھی روایت کرتے ہیں جو الزھریات میں اور جوزقی کے یہاں ہے تو خزیمہ کے نام کے ساتھ ہی اور ابن ابی داؤد اور ابویعلی کے یہاں ابوخزیمہ کے نام کے ساتھ۔ ادنیٰ غور و تامل سے یہ صاف پتا چل جاتا ہے کہ ابراہیم سے جتنی روایتیں منقول ہیں ان کے اضطراب کے ذمہ دار خود ابراہیم ہی ہیں کہ کسی سے کچھ کہا اور کسی سے کچھ۔ اور ابراہیم کو ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۱ ص۱۲۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ زہری کی حدیثوں میں بہت ضعیف سمجھے جاتے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ۱۱۰ھ کی ہے۔ یہ زہری کی وفات کے وقت پندرہ سولہ برس کے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پندرہ سولہ برس کی عمر بھی روایت حدیث کے لینے کے کافی ہوسکتی ہے ممکن ہے کہ کافی ہو مگر یہاں تو ابراہیم بن سعد کی لقا ہی زہری سے مشتبہ ہے بلکہ یقین ہے کہ دونوں میں ملاقات ہی نہ ہوئی ہو یا بہت کمسنی میں ابراہیم نے زہری کو دیکھا ہو۔ کیونکہ زہری مقام ایلہ میں رہتے تھے شام و حجاز کی سرحد پر۔ . . . . . اور ابراہیم بن سعد مدینہ طیبہ میں مقیم تھے۔ مدینے کے محدثین زہری سے روایتیں لینے کو ایلہ پہنچکر۔ ابراہیم بن سعد کا پندرہ برس یا سولہ برس کی عمر میں مدینے سے زہری کے پاس ایلہ جانا حدیثیں سننے کے لئے بالکل مستبعد ہے۔ اور کسی نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے کہ جس طرح ماجشون وغیرہ مدینے سے ایلہ جاکر زہری سے حدیثیں لیتے تھے اسی طرح ابراہیم بن سعد بھی گئے تھے۔ اس لئے۔ ابراہیم کی روایت زہری سے یقیناً مرسل و منقطع ہے۔ محدثین انقطاع کا تو ذکر نہیں کرتے ہیں مگر ضعف کا اعتراف ضرور کرتے ہیں اور انقطاع کا ذکر نہیں کرتے ہیں صرف بخاری کا بھرم رکھنے کے لئے چونکہ

---

[1] تعجب ہے کہ امام بخاری نے عبدالرحمٰن بن مہدی جیسے جلیل القدر محدث کی متابعت کا کوئی ذکر نہ کیا جسکو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن مہدی بھی ابراہیم بن سعد ہی سے روایت کرتے ہیں اور آخر سورہ برأت کے خزیمہ بن ثابت (مع تصریح ولدیت) ہی کے پاس پائے جانے کا ذکر کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے امام بخاری نے اس متابعت کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ آخر سورہ برأۃ کے ملنے کو ابوخزیمہ کے ساتھ رکھیں اور آیت سورہ احزاب کے ملنے کو خزیمہ کے ساتھ تاکہ دو واقعہ دو دفتیوں کا دو شخصوں کے ساتھ ثابت ہوسکے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی وقت کا ایک ہی واقعہ سمجھا جائے اور صرف آیتوں کے متعلق راویوں کا اختلاف قرار دیا جائے۔ اسی سے سورہ احزاب کی آیت والی روایت کو امام بخاری نے بالکل الگ سے منقطع طور پر روایت کیا کہ اب سمجھنے والا جو سمجھ لے جائے عہد نقل مصاحف بزمانہ عثمانی کا واقعہ یا جمع صدیقی ہی کے وقت کا، اور اس کو راویوں کا اختلاف قرار دے۔ ترمذی نے تو خزیمہ و ابوخزیمہ کا اختلاف آیت سورہ احزاب کے متعلق عبدالرحمٰن بن مہدی سے روایت کیا ہے اور انھوں نے ابراہیم بن سعد سے ہے۔ اس پر دوبارہ بحث تو کتاب میں حدیث نقل مصاحف بعہد عثمانی کی تنقید میں آئیگی۔ ۱۲ منہ غفرلہ

بخاری کی شرط تھا محدثین میں مشہور ہو گئی ہے۔ مگر یہ شیعوں کی کتب رجال میں خاص طور سے ممدوح اور ثقہ نظر آتے ہیں۔ غرض ان کی روایت جو ابو خزیمہ کی ہے وہ اپنے اضطرابات اور ضعف کی وجہ سے ضرور اعتبار سے ساقط ہے۔ باقی رہ گئی عبدالرحمٰن بن خالد والی روایت تو یہ شیعوں کے یہاں تو ضرور حجت اور ثقہ ہیں مگر اہل سنت ائمہ رجال ان کو منکر الحدیث لکھتے ہیں۔ اس لئے ان سے جو لیث ابو خزیمہ کی روایت کرتے ہیں وہ یقیناً ناقابل التفات ہے خصوصاً جبکہ امام بخاری کے نزدیک لیث عثمان بن عمرو کے ساتھ دو آدمی یونس سے خزیمہ کی روایت کر رہے ہیں۔ اور یونس زہری کی حدیثوں میں ابراہیم اور عبدالرحمٰن دونوں سے زیادہ قابل قبول ہیں۔ اور شعیب تو زہری کے کاتب ہی تھے۔ اسی لئے دوسروں سے بہت زیادہ یہ زہری کی حدیثوں میں قوی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بھی روایت خزیمہ ہی کی کر رہے ہیں۔ خود ابن حجر فتح الباری ج ۲۰ ص ۲۲۳ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو طبرانی نے جو مسند الشامیین میں نقل کیا ہے تو خزیمہ بن ثابت الانصاری بتصریح ولدیت لکھا ہے اور یہ روایت ابوالیمان ہی سے ہے جو شعیب سے روایت کرتے ہیں اور وہ زہری سے۔ پھر ترمذی میں بھی آخر سورہ توبہ و آیت احزاب دونوں ہی کے ملنے کا ذکر خزیمہ بن ثابت ہی کے ساتھ ہے بہ تصریح ولدیت۔ اس لئے ہر چند بظاہر ابو خزیمہ کی متابعتیں بخاری میں زیادہ نظر آتی ہیں۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ زہری سے روایت یہاں خزیمہ ہی کی صحیح ہے جس طرح آیت سورہ احزاب کے بزمانہ نقل مصاحف نہ ملنے اور پھر خزیمہ کے ساتھ پائے جانے کی روایت خارجہ بن زید سے زہری کر رہے ہیں۔ اسی طرح سورہ براۃ کی دو آیتوں کے نہ ملنے اور خزیمہ ہی کے ساتھ پائے جانے کی روایت زہری عبید بن السباق سے کرتے ہیں۔ بعد والوں نے سورہ براۃ والی آیت کے لئے خزیمہ کو ابو خزیمہ بنا دیا تاکہ دونوں آیتوں کا تعلق ایک ہی شخص سے باعث اشتباہ ہو کر ایک روایت کو غلط نہ ثابت کر دے۔

اظہارِ اصل حقیقت مگر حقیقت یہ ہے کہ روایت بنانے والوں نے دونوں روایتوں یعنی سورہ براۃ والی آیت اور سورہ احزاب والی آیت دونوں کے نہیں ملنے اور پھر خزیمہ کے ساتھ ملنے کی دو حدیثیں ایسے عنوان بیان و لخست الفاظ کیا تھا بنائیں کہ یہ دونوں واقعے الگ تسلیم کئے جائیں۔ یا واقعہ تو ایک ہی قرار دیا جائے مگر راویوں کا اختلاف سمجھا جائے کہ کسی نے سورہ براۃ کی آیتوں کے متعلق کہا اور کسی نے سورہ احزاب کی آیت کے متعلق یہ دونوں صورتیں ممکن ہوں۔ غرض یہ تھی کہ آگے چل کر جیسا موقع ہوگا ویسا مطلب نکالا جائیگا۔ ہم اس حقیقت واضحہ پر حدیث آخر سورہ توبہ و آیت احزاب پر مفصل بحث کرنے کے وقت پوری طرح بحث کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ یہاں مختصراً اتنا ہی کہدینا کافی ہے

یہ متابعات بالکل غیر مفیدہیں جو لوگ فن حدیث سے مناسبت رکھتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ کسی حدیث کی اگر ایک راوی روایت کر رہا ہو اور پھر دوسرے نے بھی اس کی روایت کی تو اس کو متابعت کہتے ہیں اور اس سے پہلی روایت کی تقویت ہوتی ہے بشرطیکہ دوسرا راوی پہلے راوی سے ضعیف نہ ہو۔ اور ایسی متابعتیں وہاں مفید تقویت ہوا کرتی ہیں جہاں مروی عنہ یعنی جس سے وہ دونوں راوی روایت کر رہے ہیں، ثقہ اور حجت و سند ہو۔ ورنہ اگر اصل مروی عنہ ہی مجروح اور ناقابل استناد ہے تو ایک دو کیا پچاس ساٹھ متابعتیں بھی ہوں تو بے سود ہیں۔ اگر مروی عنہ اور راوی سب کم و بیش مجروح ہیں تو ایسی متابعتوں کے لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے۔ ان متابعتوں کے دیکھنے سے معلوم ہو گیا کہ یہ ساری متابعتیں صرف زہری ہی تک پہنچتی ہیں، اور زہری کا حال آپ کو بتفصیل تمام معلوم ہو چکا۔ زہری سے چار آدمی روایت کرتے ہیں، شعیب، یونس، ابراہیم اور عبدالرحمٰن۔ یونس اور یونس سے زیادہ عبدالرحمٰن منکر حدیث روایت کرنے میں بدنام ہیں۔ ابراہیم زہری کی حدیثوں میں خصوصیت کے ساتھ ضعیف سمجھے جاتے ہیں لے دے کر بس صرف شعیب ہی ان میں ایک ثقہ راوی ہیں۔ مگر خود زہری ہی کی وثاقت جب قابل قبول نہیں تو غریب شعیب ثقہ ہوئے بھی تو کیا۔ مگر یہاں بھی ابوالیمان کی

سلہ صحت کے یہاں یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ واقعہ جو زہری روایت کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ واقعہ تو قطعاً غلط اور کذب و افتراء ہے۔ مگر زہری نے خزیمہ ہی دونوں جگہ بیان کیا ہے۔ اس کو بعد والوں نے ایک جگہ خزیمہ اور دوسری جگہ ابو خزیمہ بنایا ہے۔ صحت کا یہاں یہی مطلب ہے منہ عفی عنہ

روایت شعیب سے محل نظر ہے۔ اس لئے کہ شعیب سے بذات خاص ابوالیمان نے شاید ہی کوئی حدیث[1] سنی ہو . . . غرض کسی طرح کا فائدہ تقویت ان متابعتوں سے اس روایت کو نہیں پہنچ سکتا۔ خصوصاً زہری جب اس حدیث کی روایت میں متفرد ہیں۔ اور پھر زہری سے اوپر عبید بن السباق بھی علم تفرد بلند کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کے بعد تو صرف زید بن ثابت ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ اور بس ان کے سوا تو کسی اور صحابی کو واقعہ جمع قرآن کا علم ہی نہ تھا، جو کسی سے کوئی بیان کرتا۔

زہری اور زہری سے اُوپر یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح تنہا زہری عبید بن السباق سے روایت کر رہے ہیں، اسی طرح تنہا عبید بن السباق اس کو زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں اور زید بن ثابت سے عبید کی روایت کسی طرح بھی متصل نہیں ہو سکتی۔ یا تو عبید نے زید بن ثابت پر یہ افترا کی ہے یا درمیان کے کسی راوی کا نام قصداً چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ عبید بن سباق کی ولادت تقریباً ۴۶ھ کی ہے اور زید بن ثابت کی وفات ۴۵ھ یا ۴۸ھ میں اور بقول ضعیف ۵۲ھ میں ہوئی۔ اگر قول ضعیف ہی صحیح ہو تو عبید زید کی وفات کے وقت دو برس سے زیادہ کے نہ تھے۔ یہ عالم تو اس حدیث کے اسناد کا ہے۔ اب اصل متن حدیث کا عالم بھی ملاحظہ فرمائیے تاکہ دونوں عالم کی سیر کا سا لطف حاصل ہو۔

تنقید متن حدیث اصل حدیث اس مضمون سے شروع ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس اہل یمامہ کے قتل کی خبر بھیج کر ان کو بلا بھیجا اور حضرت عمر فاروق کی رائے جمع قرآن کے متعلق بیان کر کے ان کو جمع قرآن پر آمادہ ہونے کے لئے کہا اور وہ بار بار کے اصرار کے بعد جمع قرآن پر راضی ہوئے۔ اور جمع قرآن کا کام انھوں نے شروع کر دیا۔

جمع قرآن کا کام تخلیہ میں کیوں ہوا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اتنے بڑے کام کو حضرت ابوبکرؓ سے بالکل تخلیہ میں ہوں کہا؟ اور پھر حضرت ابوبکرؓ نے صرف زید بن ثابتؓ ہی کو کیوں بلایا؟ کاتب وحی اور بھی صحابہؓ تھے جو علم قرآن میں زید سے کہیں زیادہ تھے اور کتابت میں بھی زید سے ان کے کم ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے زید بن ثابتؓ اور نفس کتابت وحی پر تھوڑی تفصیلی بحث کی ضرورت ہے سنیئے:-

زید بن ثابتؓ متوفی ۴۵ھ یا ۴۸ھ ہجرت کے وقت گیارہ[11] برس کے تھے قرآن مجید کی کچھ سورتیں یاد کرلی تھیں اس لئے جب آنحضرت صلعم مدینے پہنچے تو آنحضرت صلعم کے سامنے پیش کئے گئے اور آنحضرت صلعم ان کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ ۲ھ میں . . اسارائے جنگ بدر سے کتابت سیکھنا شروع کی تھی۔ یقیناً مشق کتابت و مہارت املا میں تین چار سال سے کم نہیں لگے ہوں گے۔ تیرہ[13] سال تک مکہ مکرمہ میں دوسرے ہی لوگ کتابت وحی کرتے رہے تھے، اور پھر ہجرت کے بعد زید بن ثابتؓ کی تعلیم کتابت و مشق مہارت املا تک بھی دوسرے ہی لوگ کتابت وحی کرتے رہے۔ جب ان کو مشق کتابت و مہارت املا حاصل ہو چکی تو غالباً ۶ھ یا ۷ھ ہجری یا اس کے بھی بعد سے زیادہ سے زیادہ آخری تین چار سال کی مدت میں جو کچھ بھی وحی آئی اس کو زید بن ثابتؓ نے بھی لکھا ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی دوسرے سے اس مدت میں کتابت وحی کا کام لیا ہی نہیں گیا جہاں زید بن ثابتؓ اس مدت میں لکھنے والے تھے وہاں اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ کیونکہ ان سے پیشتر کے لکھنے والے بالکل معزول نہیں کر دیئے گئے تھے اور نہ ان پر ان کو کوئی وجہ ترجیح پیدا ہو گئی تھی۔ بلکہ کتاب نیل الاوطار جلد ۸ ص ۱۳۸ میں ہے فی حدیث زید بن ثابت ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرہ فتعلم کتاب الیھود۔ وقال کنت اکتب للنبی صلی اللہ علیہ وسلم کتبہ واقرأ لہ کتبھم۔

---

[1] اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابوالیمان بہرانی قبیلہ کے غلام تھے یہ قبیلہ حمص کا ایک مشہور قبیلہ تھا۔ یہ کو آزاد کر دیئے گئے تھے۔ مگر یہ برابر حمص میں اور شعیب زہری کے کاتب تھے زہری کے ساتھ ایلہ میں رہتے تھے اگرچہ وہ بھی حمصی تھے مگر ابوالیمان کی پیدائش کے پہلے سے ایلہ میں مقیم تھے۔ اور شعیبؒ روایت کرنے میں بہت بخیل تھے۔ یہ بھی خیال رہے شعیب کی وفات ۱۶۲ھ میں ہے اور ابوالیمان کی بقول امام بخاری وغیرہ ۲۲۲ھ میں بماہ ذی الحجہ دونوں کی وفات کے درمیان ساٹھ برس کا تفاوت ہے۔ محمد بن المصطفٰی حمصی نے جو مشہور مدلس تھے کوشش کی ہے کہ کسی طرح ابوالیمان کی روایت شعیب سے صحیح ثابت کی جائے اور ابوالیمان کی وفات ۲۲۲ھ میں ۹۳ سال کی عمر میں بتائی۔ مگر امام بخاری وغیرہ نے ۲۲۲ھ میں سال وفات لکھ کر سارا پول کھول دیا۔

اذا کتبوا الیہ۔ رواہ احمد والبخاری ... یعنی زید بن ثابتؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا، تو انھوں نے یہودیوں کی (زبان سُریانی کی قرات اور) کتابت سیکھی۔ زید بن ثابت نے کہا کہ یہاں تک (میں نے اس بات میں مہارت پیدا کرلی) کہ میں لکھتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسلات (سُریانی زبان میں ترجمہ کرکے سُریانی رسم خط میں) اور آپؐ کے سامنے پڑھتا یہودیوں کے مراسلات جب وہ بھیجتے تھے آپؐ کے پاس۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اور امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ اس کے کچھ بعد علامہ شوکانی لکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو آنحضرت صلعم نے زید بن ثابت کو دیکھا اور کمسنی ہی میں ان کی ذہانت، حفظ کا اندازہ لگایا تو اسی وقت ان کو سریانی زبان اور رسم خط سیکھنے کے لئے فرمایا تھا، اور انھوں نے چھ مہینے میں اس حد تک سیکھ لیا کہ مراسلات کا کام کرنے کے قابل ہوگئے۔ اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ سریانی زبان عبرانی زبان کے علاوہ ایک دوسری ہی زبان ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ زید بن ثابتؓ نے عبرانی زبان و رسم خط نہیں سیکھی تھی۔ بہرحال اس سے یہ معلوم ہوا کہ زید بن ثابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مراسلات تھے اور یہودیوں کے مراسلات کے متعلق خاص کاتب تھے۔ نہ کہ وحی کی کتابت میں ان کی کوئی خاص خصوصیت تھی۔ بلکہ مختلف طرح کی کتابت میں خلط ملط کا خطرہ ہوسکتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ جس وقت کوئی اور کاتب وحی موجود نہ رہتا ہو اس وقت رسول اللہ صلعم ان سے وحی لکھوا لیتے ہوں۔ زید بن ثابت کا مخصوص اور سب سے زیادہ اہم کاتب وحی ہونا صرف بخاری کی حدیث کی وجہ سے مشہور ہوگیا اور اس حدیث کو قوت پہنچانے کے لئے مشہور کیا گیا ہے۔ ورنہ در اصل ان کو اس سلسلے میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی اور نہ ہوسکتی ہے۔ اس لئے اس روایت کی وجہ سے پیدا شدہ شہرت کو ان کی خصوصیت کے ثبوت میں پیش کرنا کھلا ہوا مصادرہ علی المطلوب[1] ہے۔ جو کسی صاحب انصاف و دیانت کے نزدیک جائز نہیں۔ محدثین نے اسی روایت سے ان کو وحی کا کاتب قرار دینے کے لئے بہت زور لگایا ہے۔ اور بعض روایتیں بھی اس کی تائید میں بنالی گئی ہیں مگر درایت صاف بتا رہی ہے کہ یہ سب صرف روایت جمع قرآن کی کھوکھلی دیوار کیلئے ٹھوکھلے پشتے ہیں اسکے سوا کچھ نہیں۔

استیعاب ج ۱ ص ۲۷ ترجمہ ابی بن کعب میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کے مدینے تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے جس نے وحی کی کتابت کی وہ حضرت ابی بن کعبؓ تھے۔ اور یہ سب سے پہلے شخص ہیں کہ جو کتاب لکھ کر خاتمۂ کتاب پر "وکتب فلان" یعنی اپنی کتابت کا ذکر اپنے نام کے ساتھ لکھ دیا کرتے تھے جب ابی بن کعبؓ ہوتے تو زید بن ثابت بلائے جاتے۔ مگر یہ بھی ہجرت کے تین چار سال بعد سے ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اول تو زید بن ثابتؓ کم سن تھے ہجرت ۲۷ صفر ۱ھ میں ہوئی ہے۔ زید اس وقت گیارہ برس کے تھے، اور لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔[2] ۲ھ میں جنگ بدر ہوئی۔ فتح کے بعد جو قریشی قیدی اپنا فدیہ ادا نہ کرسکے ان کا فدیہ یہی قرار دیا گیا کہ وہ دس انصاری لڑکوں کو کتابت کی پوری تعلیم کردیں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انصار میں قریشی رسم خط اور طرز املا کا رواج ہو جائے اور قرآن لکھنے والے انصاری بھی اسی رسم خط

---

[1] مصادرہ علی المطلوب" علم مناظرہ کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو دعویٰ ہو اسی کو گھما پھرا کر دلیل میں پیش کیا جائے۔ جس کو دعویٰ ہی قبول نہیں وہ اسی دعوے یا اسی کے کسی حصے کو دلیل میں کس طرح قبول کرسکتا ہے؟ ۱۲ منہ غفرلہ

[2] طبقات ابن سعد حصہ اول ص ۱۴ میں ہے کہ "فتح جنگ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے ستر آدمی گرفتار کئے اور بقدر حیثیت ان سے فدیہ (تاوان جنگ) وصول کیا جن سے فدیہ وصول ہوا ان کو رہا کردیا اور اہل مکہ کتابت کا فن جانتے تھے اور اہل مدینہ نہیں جانتے تھے۔ تو کفار مکہ میں سے جن قیدیوں کے پاس مال نہ تھا ان کا فدیہ یہی مقرر کیا گیا کہ وہ مدینے کے دس لڑکوں کو کتابت سکھا دیں۔ تو جس نے دس لڑکوں کو کتابت سکھادی اور فن کتابت کی پوری تعلیم کردی، وہ فراغت کے بعد رہا کردیا گیا۔ انھیں لڑکوں میں زید بن ثابتؓ بھی تھے۔ غرض ان قیدیوں میں جو خوشنویس اور کتابت کے ماہر تھے ان کے لئے یہی فدیہ مقرر کیا گیا کہ وہ دس لڑکوں کو کتابت کی تعلیم پوری طرح دے دیں۔"

تمنا غفرلہ عرض کرتا ہے کہ ابن سعد نے جو یہ لکھا ہے کہ اہل مدینہ کتابت نہیں جانتے تھے بالکل غلط ہے۔ خود ابن سعد ہی نے دوسری جگہ اس کے خلاف لکھا ہے۔ اہل مدینہ کے حالات میں طبقات ابن سعد کی ایک خاص جلد ہے اس میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے۔ مدنی صحابہ جو زمانہ جاہلیت سے کتابت اچھی طرح جانتے تھے بہت تھے۔ جن میں سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو، اسید بن حضیر، رافع بن مالک، عبداللہ بن زید بن ثعلبہ، اوس بن خولی، عبداللہ بن رواحہ، سعد بن الربیع، ابوعبس بن جبر، ابودرداء، حنظلۃ الکاتب وغیرہم۔ اور ابی بن کعب کا ذکر پہلے آچکا ہے ان میں سے کوئی بھی جنگ بدر کے قیدیوں کا شاگرد نہیں

سے قرآن لکھیں جس رسم خط سے قریشی لکھا کرتے ہیں۔ انھیں انصاری لڑکوں میں زید بن ثابتؓ بھی تھے جنھوں نے ان قریشی قیدیوں سے کتابت سیکھی تھی۔ ہجرت کے تقریباً ایک برس آٹھ مہینے کے بعد زید بن ثابت نے کتابت سیکھنا شروع کی، مشق و مہارت کے لئے کم سے کم تین چار سال کا تو وقت ضرور رکھنا چاہیئے تو یہ ۶ھ ہجری میں کہیں اس قابل ہوئے ہوں گے کہ خط و کتابت کر سکیں۔ وحی لکھنے والے اگر کم ہوتے تو ایک نو مشق ہی سے کام لیا جاتا۔ مہاجرین تقریباً سب کے سب کتابت کے ماہر قریشی رسم خط کے ماہر تھے۔ انصار[۱] میں بھی کتابت کے ماہر بیسوں بلکہ سیکڑوں تھے ابی بن کعبؓ بھی تو انصاری ہی تھے اور اسلام لانے کے پہلے سے کتابت کے ماہر تھے، اور چونکہ قریش کے حلیف تھے، قریشیوں سے دیرینہ تعلقات رکھتے تھے اس لئے قریش کے لغات و محاورات اور رسم خط و املا سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی لئے ہجرت کے بعد انصار کی دل دہی کے لئے آپ نے فوراً ایک انصاری کو کتابت وحی کے لئے منتخب فرمایا مگر ایسے ہی انصاری کو جو قریشیوں ہی کی طرح لکھتا ہو۔ ممکن ہے کہ وفات نبوی سے سال دو سال قبل زید بن ثابت نے بھی کتابت وحی کا کچھ کام کیا ہو۔ مگر ان کو رسول اللہ صلعم کا کاتب خصوصی اور کتابت وحی کا خاص ذمہ دار قرار دینا، بخاری کی روایت جمع قرآن کی کھوکھلی دیوار پر پشتہ لگانے کے لئے ہے مگر میں حضرت زید بن ثابت کی مہارت کتابت سے انکار نہیں کرتا۔ ان کو مہارت ضرور ہوئی ہوگی مگر ۸ھ یا ۹ھ تک اس وقت وہ کتابت وحی بھی کر لیتے ہوں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اخیر زمانے میں یہی زیادہ لکھتے ہوں۔ مگر یہ قریشیوں کے شاگرد تھے اسی لئے قریشی ہی رسم خط جانتے تھے۔ پھر قریشی مہاجرین اور رسول اللہ صلعم کی خدمت میں دن رات رہتے تھے قریش کے لغات و محاورات سے بھی پوری طرح واقف ہو گئے تھے، ان کے قرآن لکھنے میں اور کسی قریشی کے لکھنے میں کسی فرق کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انھوں نے کوئی غیر معمولی مشق خطاطی اور حسن کتابت میں حاصل کر لی ہو، تو محض کتابت قرآن کے لئے تو البتہ ان کا انتخاب ان کے حسن کتابت و خطاطی کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ مگر جہاں ضرورت جمع و تدوین آیات و سوَر کی ہو وہاں تو ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ابتدائے نزول سے آخر تک شریک کتابتِ وحی رہے ہوں اور تمام آیات و سُوَر کے مواقف و مواقع نزول سے واقف اور پورے قرآن کے حافظ ہوں۔ قرّاء[۲] یعنی حفاظ قرآن میں چاروں خلفائے راشدینؓ ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے اسمائے گرامی خود محدثین بڑے تعلق سے لیا کرتے ہیں۔ عام قرّاء یعنی حفاظ قرآن کی اکثریت اپنے قرآنی اسناد کا سلسلہ عموماً حضرت ذوالنورینؓ تک پہنچایا کرتی ہے۔ خود بخاری کتاب فضائل القرآن میں باب القرّاء من اصحاب النبی صلعم بھی ہے جس میں یہ حدیث موجود ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قرآن حاصل کرو چار شخصوں سے، عبداللہ بن مسعودؓ، سالمؓ، معاذؓ، اور ابی بن کعبؓ۔ پھر اسی باب میں یہ بھی ہے کہ عہد نبوی میں چار انصاریوں نے قرآن جمع کیا تھا، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، اور ابوزید۔ دوسری روایت میں ابی بن کعبؓ کی جگہ ابوالدرداءؓ کا نام ہے۔ اگر

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) یہ سب اسلام لانے سے پہلے ہی سے کتابت کے ماہرین میں تھے۔ باقی رہی کفار قیدیوں سے انصاری لڑکوں کو کتابت سکھلانے کی وجہ میں متن میں لکھ چکا ہوں کہ انصار میں بھی قریشی رسم خط جاری ہو جائے ۱۲ منہ غفرلہ

[۱] حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم مدینے پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ اہل مدینہ دو دو تین تین سال کے بعد قیمت ادا کرنے کے وعدے پر چھوارے بیچ رہے ہیں۔ تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ وزن، قیمت اور وقت معین کر کے بیچو اسی پر آخر سورہ بقرہ میں یہ حکم آیا ہے کہ یا ایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین فاکتبوہ۔ (آخر رکوع تک) جس میں قرض ادھار اور بیع وغیرہ کے معاملے کو لکھ لینے اور ان پر گواہیاں کرا لینے کا حکم اس طرح ہے کہ اس کے فرض ہونے کا گمان ہو سکتا ہے صرف روزمرہ کی خرید و فروخت کے بارے میں ہے اگر اس کو نہ لکھو تو کوئی گناہ نہیں ہے یہاں تک کہ سفر کی وجہ سے اگر کاتب نہ ملے یا سامان کتابت نہ ہو تو کسی چیز کو گرو رکھنے کا حکم ہے۔ مگر باہمی اعتماد و اعتبار اگر ہو تو کوئی چیز گرو رکھنا بھی ضروری نہیں۔ اس حکم سے جو ہجرت کے چند ہی دن بعد اترا یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مہاجرین و انصار میں لکھنے والے پڑھنے والے کافی تعداد میں تھے جبھی تو کاروبار اور آپس کے لین دین کو لکھ لینے اور ان پر گواہیاں ثبت کر لینے کا حکم آغاز سال ہجری میں آیا۔ خرید و فروخت کی ضرورت کس کو نہیں پڑتی ہے۔ ایسا حکم ایسی جماعت کیلئے عام طور سے نہیں آسکتا جس جماعت میں لکھنے پڑھنے والے بہت کم ہوں۔ فافہم ۱۲ منہ غفرلہ

[۲] "قرّاء" قاری کی جمع ہے چار پانچ صدی بلکہ کچھ اور بعد تک "قاری" حافظ قرآن کو کہتے تھے اور محدثین کا زمانہ آیا تو جس کو حدیثیں بہت سی یاد ہوا کرتی تھیں اسکو "حافظ" کہنے لگے۔ جب حدیثوں کے حفظ کا زمانہ ختم ہو گیا۔ تو حافظ قرآن ہی کو حافظ کہنے لگے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

زیدبن ثابت بھی حافظ ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔حقیقت تو یہ ہے کہ تمام مہاجرینؓ و انصارؓ بلا استثنا سب کے سب پورے قرآن کے حافظ تھے اور نہ فقط حافظ تھے بلکہ سب کے سب لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور سب کے پاس پورا قرآن کتابی صورت میں بین الدفتین لکھا ہوا مجموع و مرتب موجود تھا اور حسب فرمان نبویؐ تمام مہاجرینؓ و انصارؓ کتاب دیکھ کر تلاوت کرنے کے عادی تھے مہاجرینؓ و انصارؓ ہی نہیں بلکہ آفاقیوں میں سے بھی اکثر صحابہؓ رفتہ رفتہ پورے قرآن کے حافظ ہو چکے تھے ۔ اور فرضیت تحصیل علم کا فرمان نبویؐ سن کر سب کے سب لکھنا پڑھنا بھی سیکھ چکے تھے ۔کیونکہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی دلالۃ النص کتابت کی تعلیم حاصل کرنے کی انھیں تاکید کر رہی تھی اور ہر صحابیؓ کے گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے کامل و مکمل موجود تھے جن میں وہ خود اور ان کے اہل و عیال پڑھتے تھے ۔ اور یہ کیوں نہ ہوتا، آخر صحابہؓ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو دیکھتے تھے کہ وہ اپنے پاس ایک کتاب اللہ رکھتے ہیں جن کتابوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے ۔ ان کی تلاوت کتاب اللہ کا بھی تذکرہ قرآن میں وہ دیکھتے تھے کہ یتلون ایٰت اللہ اٰناء الیل ۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ صحابہؓ کے دلوں میں بھی یہ حسرت پیدا نہ ہوتی کہ ہمارے پاس بھی کتاب اللہ کتاب کی صورت میں مدون و مرتب ہوتی اور ہم لوگ بھی اس کی تلاوت کرتے رہتے ۔

ہر صحابی کے گھر میں قرآن کے مکمل نسخے موجود تھے اور مہاجرین و انصار میں سب کے سب حافظ تھے ازواج مطہرات اور دیگر عورتیں بھی قرآن کی حافظہ تھیں

اللہ تعالیٰ نے ضرور پورے قرآن کو رسول اللہ صلعم کی وفات سے بہت پہلے مکمل کر کے رسولؐ و صحابہؓ ہی کے ہاتھوں سے اس کو مرتب و مدون کرا دیا تھا ۔ اور ہر گھر میں قرآن کے متعدد نسخے موجود تھے اور صحابہؓ نے حفظ بھی کر لیا تھا ۔جب ہی تو قرآن کے متعلق فرمایا گیا ۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (پ۲۱ سورہ عنکبوت ع ۵) بلکہ وہ (قرآن کی) واضح آیتیں ہیں جن کو (دین کا) علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ ہیں) یعنی علم دین والوں نے ان آیات قرآنی کو حفظ کر لیا ہے ۔ اور صحابہؓ میں کون تھا جو علم دین نہیں رکھتا تھا ۔ایک کو دوسرے پر کسی قدر فضیلت ہونا اور بات ہے ۔ مگر صحبت نبویؐ میں روحانی تربیت پانے والوں میں کا ایک معمولی فرد بھی بعد والے علمائے دین سے کہیں افضل و اعلیٰ درجہ علم دین میں رکھتا تھا ۔ مردوں کے علاوہ عورتوں میں بھی حافظات قرآن کی کافی جماعت ہر جگہ موجود تھی ۔ ازواج مطہراتؓ میں سب کی سب لکھنا پڑھنا جان گئی تھیں اور سب کی سب پورے قرآن کی حافظہ تھیں اس لئے کہ ان کو تو خاص طور سے تلاوت و حفظ قرآن کا حکم تھا[1] وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اور تم لوگ یاد کرتی رہو آیات اللہ اور حکمت کی باتوں کو جو تمہارے گھروں میں تلاوت ہوتی رہتی ہیں (احزاب پ۲۲ ع ۴) ۔ اور ہر ایک کے پاس کتابی صورت میں پورا قرآن لکھا ہوا بھی موجود تھا ۔صحابہؓ میں کاتبین کی ایک بڑی جماعت تھی جو قرآن لکھا کرتی تھی ۔ بعض صحابہؓ کتابت قرآن پر اجرت بھی لیتے تھے جس کی ان کو اجازت تھی[2] ۔ ان براہین قاطعہ کے باوجود کیا اس کا گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن عہد نبویؐ ہی میں جمع نہیں ہوا تھا اور حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت ابوبکرؓ ایک اتنے بڑے اہم کام پر آمادہ ہوئے تھے جس میں خود ان کو جھجک تھی اور انھوں نے صرف زید بن ثابتؓ کو بلا بھیجا اور اتنا بڑا اہم ترین کام صرف انھیں کے سپرد کر دیا ؟ اور دوسرے کسی صحابیؓ سے مشورہ تک نہ کیا ؟ ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور سالم بن معقل مولےٰ ابی حذیفہؓ جن سے قرآن سیکھنے کے لئے آنحضرت صلعم لوگوں سے کہا کرتے تھے ان کو بھی نہ بلوایا اور مشورہ جمع قرآن میں شریک نہ کیا ؟

صرف انصار کیوں ؟

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں صرف چار پانچ انصاری صحابیوں کے قرآن جمع کرنے کی روایت اور پھر رسول اللہ صلعم کا یہ حکم کہ قرآن ان چار شخصوں سے سیکھو ، ان چار میں چار تو خالص انصاری ہی ہیں، صرف ایک مہاجر ہیں تو وہ بھی ایرانی الاصل ، ایک قریشی کے غلام آزاد کردہ ، جن کی مادری زبان بھی عربی نہ تھی ، ؟ آخر مہاجرین کے جمع قرآن کا ذکر کیوں

---

[1] وَاذْكُرْنَ فرمایا گیا وَاحْفَظْنَ نہیں کہا گیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ صرف زبانی یاد کر لینا ہی تمہارا فریضہ نہیں ہے بلکہ یاد ہونے سے پہلے جس طرح تم پڑھتی رہیں یہاں تک کہ پورا قرآن تمہیں یاد ہو گیا تو یاد کر لینا ہی صرف مقصود نہیں ہے بلکہ اب برابر زبانی بھی اور کتاب دیکھ کر بھی پڑھتی ہی رہا کرو یہی تمہاری ڈیوٹی ہے یہ مفہوم واذکرن ہی سے نکل سکتا ہے ۔اسی لئے وَاقْرَءْنَ یا وَاتْلِيْنَ نہیں کہا گیا ۱۲ منہ غفرلہ

[2] یہ حدیث صحیح بخاری میں ابن عباسؓ سے مروی ہے ۔ دیکھو تیسیر الوصول جلد ۱ ص ۲۴۶

تھا؟ ان کو تو انصار سے زیادہ قرآن سیکھنے کا موقع ملا تیرہ سال ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہے، آغاز نزول ہی سے قرآن کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لکھنے کا بھی رواج پہلے ہی سے تھا، رسول اللہ صلعم کا حکم تحصیل علم اس قدر تھا کہ اس کو فرض قرار دیا، قرآن نے وعَلَّمَ بِالْقَلَمِ کہہ کر بتا دیا کہ علم قلم یعنی کتابت ہی کے ذریعے آسکتا ہے۔ اس لئے یقیناً تمام مہاجرین فریضۂ تحصیل علم بذریعہ قلم ہی میں منہمک ہوں گے اور سب نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہوگا۔ ہر صحابی کتابت قرآن میں مصروف ہوگا۔ جیسے جیسے قرآن اترتا جاتا ہوگا لوگ رسول اللہ صلعم کی تعلیم کے مطابق لکھتے جاتے ہوں گے اور حفظ کرتے جاتے ہوں گے جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ابھی انتالیس ہی آدمی مسلمان ہوئے تھے کہ ایک مصحف لئے ہوئے حضرت خباب بن الارت[1] حضرت سعید بن زیدؓ (حضرت عمرؓ کے چچیرے بھائی اور اپنے بہنوئی اور اپنے سالے) اور حضرت فاطمہؓ بنت الخطاب (حضرت عمرؓ کی بہن) کے یہاں آیا کرتے تھے اور قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے حضرت سعیدؓ اور ان کی بیوی فاطمہؓ دونوں ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن بار خبر پا کر حضرت عمر اپنے اسلام لانے سے پہلے آئے تو حضرت عمر نے اپنے بہنوئی اور بہن کو قرآن مصحف میں پڑھتے دیکھا۔ حضرت عمر نے تشدد کیا اور کسی قدر مارپیٹ کی حضرت فاطمہؓ نے کہا تم مار ڈالو جب بھی ہم لوگ اس دین سے نہیں پھرنے کے۔ آخر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اچھا لاؤ، ذرا ہم دیکھیں کہ وہ کیا چیز ہے جس پر تمہارا ایمان ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ تم کافر ہو، ناپاک ہو، تمہاری ظاہری طہارت کا بھی اعتبار نہیں یہ ایسی کتاب ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ اس کو پاک لوگوں کے سوا کوئی بھی نہیں چھو سکتا۔ تم غسل کر لو تو ہم یہ کتاب تمہیں دیں۔ حضرت عمر نے غسل کیا اور کتاب لے کر سورہ طٰہٰ پڑھنے لگے۔ جب لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى پر پہنچے تو بولے "کیا اچھا اور پاکیزہ کلام ہے" پھر سورہ تکویر پڑھنے لگے جب عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ پر پہنچے تو پھر وہی کلمے دہرائے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ پہلے وہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے متاثر ہوئے۔ پھر سورہ حدید پڑھنے لگے تو سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ سے شروع کیا اور فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ پر پہنچے تو بے اختیار بول اٹھے أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (روض الانف ج ۱ ص ۲۱۷ سے ۲۱۸ تک)۔

(مگر سورہ حدید مدنی ہے اور باعتبار تعداد چورانوےواں[2] سورہ ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ آغاز سورہ کی سات آیتیں آغاز زمانہ اسلام ہی میں اتری ہوں۔ جیسا کہ مضمون آیات سے بھی اس کا قرینہ معلوم ہوتا ہے ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ دوسری روایت موضوع اور غلط ہے۔ تمنا عفی عنہ)

بہرحال یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ آغاز اسلام ہی میں مسلمان صحابہ اور صحابیات میں لکھنے پڑھنے کا رواج شروع ہو گیا تھا اور اسی وقت سے قرآن مصحف کی شکل میں کتابی صورت میں صحابہ لکھ لکھ کر جمع کر رہے تھے۔ اور ہجرت کے قبل مہاجرین نے قرآن کی وہ سب سورتیں اور آیات جن کا نزول مکہ میں ہو چکا تھا کتابی صورت میں لکھ لکھ کر اپنے اپنے پاس رکھ لی تھیں اور وہ سب مصاحف ہجرت کے موقع پر اپنے ساتھ لائے تھے۔ انصار میں بھی جو لوگ ہجرت سے پہلے دونوں عقبوں کے موقع پر مکہ جا جا کر ایمان لاتے گئے تھے وہ بھی کتابی صورت ہی میں قرآن ضرور مکہ سے اپنے ساتھ لائے تھے، اس لئے کہ محض چند دنوں میں وہ تمام مکی سورتوں کو جن کی تعداد ۸۶ کہی جاتی ہے کس طرح یاد کر لیتے اور پھر گھر آکر عورتوں بچوں کو کس طرح تعلیم دیتے۔ ہجرت سے پہلے انصار میں کتابت کے جاننے والے بہت کافی تھے سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو، اسید بن حضیر، رافع بن مالک وغیرہم ماہرین کتابت تھے۔ اور زمانۂ جاہلیت سے کتابت جانتے تھے۔ ان میں بعض شریک عقبہ بھی تھے۔ اس لئے ضرور قرآن مکہ سے لکھ کر لائے ہوں گے۔ اور خود اس میں یاد کرتے ہوں گے اور اپنے بچوں اور عورتوں کو قرآن کی تعلیم اسی میں دیتے ہوں گے چنانچہ رسول اللہ صلعم جب ہجرت کر کے مدینے پہنچے تو بعض کم سن لڑکے پیش کئے گئے کہ انھوں نے اتنی سورتیں یاد کر لی ہیں، جس سے آپ خوش ہوئے۔ اور یہ سب قرآن کے بغیر کتابی شکل میں لکھے ہوئے بہت دشوار تھا۔

---

[1] حضرت خبابؓ کی وفات استیعاب میں ابن عبد البر ۳۷ھ لکھتے ہیں اور عمر ۷۳ سال۔ اور پھر ان کو سابقون الاولون من المہاجرین بھی لکھتے ہیں اور بہت سابق الاسلام مانتے ہیں۔ مگر اس حساب سے یہ حضرت عمر کے اسلام کے وقت بہت کم سن ٹھہرتے ہیں اس لئے وہی پر وہ دوسرا قول استیعاب میں لکھا ہے کہ ان کی وفات ۱۹ھ میں حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ خلافت میں ہوئی اور حضرت عمرؓ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی یہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔ ۱۲ منہ عفی عنہ

[2] یہ واقعہ ۶ بعثت نبوی کا ہے۔ (الفاروق ص ۱۰ حصہ اول)

مکہ مکرمہ میں بھی پڑھے لکھے بہت کافی لوگ تھے اور مدینہ طیبہ میں بھی۔ میں نے ان کی فہرست مختصر سی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں درج کی ہے۔ مگر اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں جو لوگ مالی فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے ان سے فدیہ میں انصار کے لڑکوں کو کتابت کی تعلیم کا کام لیا گیا۔ مگر اس سے یہ سمجھنا کہ مدینے کے لوگ کتابت نہیں جانتے تھے مکے کے قیدیوں ہی سے کتابت سیکھ کر اس سے واقف ہوئے تاریخ سے بے خبری کی دلیل ہے۔ مدینے کے لوگ مکے والوں سے کم کتابت کے ماہر تھے مگر مطلب یہ تھا کہ انصار کے یہ لڑکے قریش کے رسم خط سے واقف ہو جائیں۔ قریشی مہاجرین کے ساتھ رہنے سے قریشی زبان اور محاورہ ولغت سے واقفیت ہوگی ہی، قریشیوں سے کتابت سیکھ کر قریشی رسم خط اور املا سے بھی آگاہ ہو جائینگے۔ پھر ان کو قرآن کی تلاوت وکتابت وحفظ میں قریشیوں ہی کی طرح سہولت ہوگی۔ اور پھر ان نادار قیدیوں کو ادائے فدیہ میں بھی آسانی ہوگئی۔

مگر یہ سوال پھر ضرور باقی رہتا ہے کہ جب مہاجرین، انصار کے اعتبار سے بہت پہلے سے قرآن یاد کر رہے تھے اور ہر ایک کے پاس مصحف میں قرآن لکھا ہوا بھی موجود تھا، پھر قرآن ان کی مادری زبان میں اترا تھا انھیں کے محاورے اور لغات کے مطابق قرآنی عبارتیں تھیں، اور یہ سب باتیں انصار کو میسر نہ تھیں پھر بھی رسول اللہ صلعم نے لوگوں سے فرمایا کہ خذوا القرآن من اربعۃ قرآن چار آدمیوں سے سیکھو۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے، سالم (مولے ابن حذیفہؓ) سے، معاذ بن جبلؓ سے، اور ابی بن کعبؓ سے (بخاری)

(۱) سالمؓ اگرچہ مہاجر تھے۔ مگر عجمی ایرانی الاصل تھے، حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام آزاد کردہ تھے ابو حذیفہؓ کی بیوی انصاریہ تھیں، اور یہ دراصل انھیں کے موالی میں سے تھے۔ ان کو انھیں نے حضرت ابو حذیفہ سے کہہ کر آزاد کر دیا تھا۔ اس لئے انصار سے بھی بحیثیت ایک انصاریہ کے ایک غلام آزاد کردہ ہونے کے ان کے تعلقات تھے اور پھر حضرت حذیفہؓ نے ان کی آزادی کے بعد ان کو متبنیٰ کر کے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا اور انھیں کے ساتھ یہ رہے اس لئے مہاجرین میں ایک مہاجر بھی تھے۔ غرض یہ ایرانی الاصل تھے اس لئے ایک عجمی تھے۔ مگر انصاریوں میں انصاری اور مہاجرین میں ایک مہاجر بھی تھے۔ چونکہ ایک قریشی کے ساتھ سالہا سال رہے اس لئے قریش کی زبان، قریش کے لغات ومحاورات سے قریش کی رسم خط اور املا سے پوری طرح واقف تھے۔

(۲) عبداللہ بن مسعودؓ بن غافل بن حبیب بن شمخ بن فار بن مخزوم بن صاہلہ بن کاہل بن الحارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر۔ یہ ہذلی کہے جاتے ہیں ان کی والدہ بھی ان کی ہم نسب ہذلیہ تھیں حضرت ام عبد انصاریہ۔ (میں نے یہ سلسلہ نسب استیعاب سے نقل کیا ہے۔ مگر نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب میں "ہذیل بن مدرکہ بن الیاس" خزیمہ کے نام کو حذف کر کے لکھا ہے۔ اور اسی طرح ابن خلدون میں بھی ہے۔ ابن خلدون میں خزیمہ کو ہذیل کا بھائی بتایا ہے۔ خزیمہ ان کے نزدیک مدرکہ کے بیٹے ہیں۔ اور کنانہ کے باپ۔ اور کنانہ سے قریش کا سلسلۂ نسب چلتا ہے یعنی ہذیل کے بھتیجے سے۔ غرض بنی ہذیل قریشیوں کے ہم جد تھے) بہرحال قریش ہذیل دونوں بنی مضر ہیں ہم جد ہیں اسی لئے عبداللہ بن مسعودؓ کے تعلقات قریشیوں سے بہت تھے اور یہ قریش کی زبان، محاورے اور لغات سے پوری طرح واقف تھے قریشی رسم خط اور املا خوب جانتے تھے۔ اگرچہ انصاری تھے چونکہ ان کی ننہال انصاریوں میں تھی۔

(۳) معاذ بن جبلؓ بن عمرو بن اوس بن عائذ بن عدی بن کعب بن عمرو بن ادی بن سعد بن علی بن اسد بن ساردہ بن تزید بن جشم بن الخزرج۔ انصار کے مشہور قبیلہ بنی خزرج سے تھے۔

(۴) ابی بن کعبؓ بن قیس بن عبید بن زید بن معاویہ بن عمرو بن مالک بن النجار۔ وہو تیم اللات بن ثعلبہ بن عمرو بن الخزرج الاکبر المعاوی الجدیلی۔ بنو معاویہ کو بنو جدیلہ کہا کرتے تھے۔

معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعب دونوں قریش کے حلیف تھے اور دونوں کے دیرینہ تعلقات قریش[1] سے تھے۔

---

[1] مدینے کے دو قبیلے اوس اور خزرج بہت بڑے بڑے قبیلے اور بہت ممتاز تھے۔ ابن خلدون ج ۲ صفحہ ۲۹۰ کان بینھم وبین قریش اخاء قدیم وصھر۔ یعنی قریش اور اوس وخزرج کے درمیان پرانا بھائی چارہ اور شادی بیاہ کے تعلقات تھے۔ اس لئے ان قبائل کے بہتیرے افراد کو قریشی لغات ومحاورات ورسم خط واملا پر کافی عبور تھا۔ ۱۲ منہ عفی عنہ

(۵) زید[1] بن ثابت بن الضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبد عوف بن غنم بن مالک بن النجار۔ ان کی والدہ نوار بنت مالک بن بن عدی بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار تھیں۔ یہ دادیہال ننہال ہر طرف سے نجاری تھے

(۶) ابوزید بن النضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن النجار بن ثعلبہ بن عمرو بن الخزرج بن الحارث بھی نجاری تھے۔ اور جتنے نجاری ہیں سب خزرجی ہیں۔

یہ ابوزید حضرت انس بن مالک خادم رسول اللہ صلعم کے حقیقی چچا تھے۔ لاولد تھے۔ اس لئے حضرت انسؓ ہی ان کے وارث

(۷) ابودردا۔ ان کا نام عویمر تھا۔ عویمر بن عامر بن مالک بن زید بن قیس۔ بعضوں نے لکھا ہے عویمر بن قیس بن زید بن امیہ نے عویمر بن عبداللہ بن زید بن قیس بن ربیعہ بن عامر بن عدی بن کعب بن الخزرج بن الحارث بن الحارث بن الخزرج لکھا۔ ابودردا کا نام بعضوں نے عامر بن مالک بتایا ہے اور لکھا ہے عویمر لقب تھا۔ ان کی ماں محبّہ بنت واقد بن عمرو بن الاطنابہ تھیں۔ یہ خزرجی ہی تھے جن کے برادرانہ تعلقات قریشیوں سے تھے۔

تعلیم قرآن کے متعلق ان پہلے چار شخصوں کو تمام مہاجرین و انصار میں سے رسول اللہ صلعم نے اس لئے چنا کہ ان میں ایک عجمی الاصل تھے، لیکن وہ مہاجرین میں مہاجر اور انصاریوں میں انصاری تھے، مگر قریشیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے لغات و محاورات و رسم و خط و املائے قریش سے پوری طرح واقف تھے۔

انصاریوں میں سے تین صحابہ کو منتخب کیا۔ اور تینوں خزرجی۔ بنی خزرج عموماً اور خاص کر کے ان تینوں کے تعلقات قریش سے بہت زیادہ تھے۔ لغات و محاورات و رسم خط و املائے قریش سے یہ تینوں پوری طرح باخبر تھے۔ زبان ان کی بالکل قریشیوں ہی کی طرح تھی۔ قرآن بالکل اسی لب و لہجہ سے پڑھتے تھے۔ تاریخ ابن خلدون جلد دوم حصہ اول صفحہ ۹ میں ہے اوس و خزرج کے ذکر کے بعد وکان بینھم و بین قریش اِخَاءٌ قدیمٌ وصِھرٌ۔ یعنی خزرج و اوس مدینہ کے دونوں قبیلوں اور قریش کے درمیان پرانا بھائی چارہ اور بیاہ کا تعلق تھا۔ مگر اوس سے زیادہ خزرج سے یہ تعلقات تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود کی نانی قریشیہ، حارث بن زہرہ بن کلاب القرشی کی بیٹی تھیں۔ اور یہ خود ہذیلی تھے، اور ہذیل اور قریش دونوں مضر ہی کی دو شاخیں ہیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ خزاعی تھے۔ اور بنی خزاعہ مکی الاصل تھے۔ مکہ سے منتقل ہونے کے بعد بھی قریش کے حلیف رہے۔ اور نسب کے اعتبار سے بنی خزاعہ بھی مضری ہی تھے جیسا کہ نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب صفحہ ۲۲ میں لکھا ہے۔ اس لئے یہ بھی لغات محاورات و رسم خط و املائے قریش سے اچھی طرح واقف تھے اور قریشیوں ہی کے لب و لہجہ میں پڑھتے تھے۔

غرض رسول اللہ صلعم نے غیر قریشی صحابہ کی تحریص و ترغیب کے خیال سے غیر قریشی ہی چار ایسے آدمیوں کو منتخب کیا جو باوجود غیر قریشی ہونے کے قریشی لغات و محاورات سے پوری طرح واقف تھے اور قریشی لب و لہجہ بھی رکھتے تھے، اور قرآن بالکل قریشیوں ہی کی طرح پڑھتے تھے تاکہ ان سے دوسرے غیر قریشی صحابہ بھی قرآن سیکھ کر قریشی لغات و محاورات اور قریشی لب و لہجہ سیکھنے میں دشواری محسوس نہ کریں اور سمجھیں کہ جب یہ غیر قریشی ہونے کے باوجود قریشیوں کی طرح قرآن سمجھتے اور پڑھنے میں تو ہم ان کی طرح سیکھ کر ہم بھی قریشیوں کی طرح سمجھ سکتے اور پڑھ سکتے ہیں۔ اگر انصاریوں کو قریشیوں یا مہاجرین مکی الاصل سے قرآن سیکھنے کے لئے کہا جاتا تو یہ بات نہ ہوتی، اور

---

[1] زید بن ثابت کے بارے میں استیعاب ج ۱ صفحہ ۱۹۹ میں ہے کہ ان کو رسول اللہ صلعم نے سریانی زبان سیکھنے اور لکھنے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے حکم دیا۔ انھوں نے بیس دن سے کم مدت میں زبان اور رسم خط دونوں سیکھ لئے اور رسول اللہ صلعم کے پاس جو خطوط سریانی زبان میں آتے تھے اسکو پڑھ کر ترجمہ کر دیتے تھے اور ان کا جواب جو بتایا جاتا تھا لکھا کرتے تھے بعضوں نے سریانی زبان اور رسم خط کے عوض عبرانی زبان اور رسم خط لکھی ہے۔ [illegible] عبرانی [illegible] عربی زبان اصل ہے اس لئے عربی اور عبرانی زبان اور رسم خط میں تھوڑا سا فرق ہو۔ مگر تعجب ہے کہ ان کو تو سریانی یا عبرانی سیکھنے کو کہا مگر دوسرے عام [illegible] عربی زبان کی کتابت سیکھنے کا حکم تو کیا مشورہ تک نہ دیا؟ وانا وکلا! آپ نے ضرور ہر شخص کو کتابت سیکھنے کی تاکید فرمائی جبکہ طلب علم کو ہر زن و مرد پر فرض بتایا [illegible] منہ

انصاری کہہ سکتے تھے کہ ان کا مادری لب ولہجہ ہم کہاں سے لا سکتے ہیں۔ ہم سے اس طرح تلفظ ادا نہ ہو سکے گا۔ مگر جب دیکھیں گے کہ یہ لوگ بھی تو انصاری ہی ہیں، غیر قریشی ہی ہیں اور ایک تو عجمی الاصل ہیں۔ جب ان لوگوں سے قریشی لب ولہجہ اتر سکتا ہے تو پھر ہمارے لئے یہ کیوں دشوار ہوگا۔ ہم بھی کوشش کریں۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کی تعلیم باعتبار تلفظ ولہجہ اور باعتبار رسم خط و املا اور باعتبار لغات ومحاورات کی ضرورت اہل مکہ اور قریشیوں کو نہ تھی کیوں کہ ان کی تو زبان ہی میں قرآن اترا تھا۔ اس کی اگر ضرورت تھی تو کسی قدر ان انصار کو جن کے تعلقات مکہ اور قریشیوں سے نہیں رہے تھے۔ یا آفاقی صحابہ کو۔ اسی لئے مہاجرین کے لئے نہ معلم مقرر کرنے کی ضرورت تھی، نہ مہاجرین کو معلم مقرر کرنا مقتضائے مصلحت تھا۔ اسی لئے ان چار صحابہ کو رسول اللہ صلعم نے انصاریوں اور آفاقیوں کے لئے قرآن کا معلم مقرر فرمایا۔ اور انھیں انصاریوں اور آفاقیوں کو آپ نے فرمایا تھا کہ جسکو قرآن اسی طرح پڑھنا ہو جس طرح اترا ہے وہ عبداللہ بن مسعودؓ کے پڑھنے کے مطابق پڑھے۔ یعنی انھیں کا لب ولہجہ اتارے یعنی وہ بالکل قریش ہی کے لب ولہجہ سے ادا کرتے ہیں اور قرآن قریش ہی کی زبان میں اترا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عبداللہ بن مسعود کے سوا کوئی قریشی بھی ان کے برابر نہیں پڑھ سکتا۔ آنحضرت صلعم نے انصاریوں کی سہولت کے خیال سے ایک صحیح پڑھنے والے انصاری ہی کا نام بتادیا۔

جمع قرآن باقی رہی جمع قرآن والی دو روایتیں جو حضرت انس سے بخاری میں مروی ہیں، کہ جن لوگوں نے عہد نبوی میں قرآن جمع کیا وہ سب انصاری ہی تھے۔ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید۔ دوسری روایت میں انس بن مالک ہی سے دہیں پر ہے کہ حضرت انس نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم وفات فرما گئے اور چار آدمیوں کے سوا کسی نے قرآن نہیں جمع کیا۔ ابو درداء معاذ بن جبل، زید بن ثابت، اور ابو زید۔ اور ابو زید نے جو جمع کیا تھا اس کے وارث ہم ہوئے۔ پہلی روایت ہمام بن یحییٰ بن دینار الازدی العوذی البروکی سے ہے جو کسی ازدی کے غلام آزاد کردہ تھے بذات خود تو لوگ ان کو ثقہ اور سچا لکھتے ہیں، مگر حافظہ ان کا خراب تھا اس لئے یحییٰ بن سعید ان کی حدیثیں روایت نہیں کرتے تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ غلطی کر جاتے تھے۔ ابو حاتم نے بھی ان کے حافظہ کی شکایت کی ہے۔ ابوبکر البرہکی نے ان کو لا یحتج بہ یعنی نا قابل استناد کہا ہے۔ اور قتادہ تو پرانے حاطب اللیل مشہور مدلس مرسل روایت کرنے کے خوگر اور قدریہ مذہب کے داعی تھے۔ معلوم نہیں اس روایت میں قتادہ کی تدلیس کا کہاں تک دخل ہے اور ہمام کے ضعف حافظہ کا کہاں تک اثر ہے؟ اور یہ تو آپ یہیں پر خود دیکھ رہے ہیں کہ دونوں روایتیں حضرت انس ہی کے متعلق ہیں مگر دوسری روایت پہلی روایت کی صاف تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں حصر کے ساتھ ہے کہ ابو درداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید کے سوا کسی نے حیات نبوی میں قرآن جمع ہی نہیں کیا۔ مگر پہلی روایت میں ابو درداء کا نام ہی نہیں۔ ان کے عوض معاذ بن جبل کا نام ہے۔ دوسری روایت معاذ بن جبل کے عہد نبوی میں قرآن جمع کرنے سے انکار کر رہی ہے۔

اور دوسری روایت عبداللہ بن المثنیٰ سے ہے جو ضعیف الحدیث، منکر الحدیث وغیرہ سب کچھ ہیں۔ پھر اس روایت کا کیا کہنا ہے۔ اس لئے یہ حدیث تو ضرور یا تو سرے سے موضوع ہے یا کتر بیونت کرکے دونوں حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ عہد نبوی میں اتنے مہاجرین میں سے کسی نے بھی قرآن جمع نہ کیا ہو جن کو ابتدائے نزول سے ۱۳ برس تک انصار سے پہلے دن رات کا واسطہ رہا ان میں سے کسی نے بھی قرآن جمع نہ کیا؟ اور صرف انصار ان میں سے بھی فقط چار یا پانچ ہی سہی، پانچ نے جمع کیا؟ اگر واقعی حضرت انس نے کہا ہوگا تو یہ کہا ہوگا کہ قبیلہ بنی اوس کے مقابلے میں بنی خزرج میں سے ان چار نے سب سے پہلے عہد نبوی میں قرآن جمع کیا۔ ورنہ صحاح ہی کی روایت سے اور متعدد صحابہ کا عہد نبوی میں قرآن کا جمع کر لینا ثابت ہے۔ خود حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے فرمایا تھا کہ جس نے عہد نبوی میں سب سے پہلے قرآن جمع کیا وہ میں تھا۔ دیکھئے تاریخ الخلفاء ترجمہ حضرت عثمانؓ۔ اس لئے حضرت انسؓ کی وجہ سے ان روایتوں کا اعتبار کرنا درحقیقت صحابہ کی قرآنی خدمات اور ان کے قرآنی انہماک سے انکار اور تمام صحابہ پر ظلم ہے۔

کتاب الامام یا کتاب الام واسطوانۂ مصحف کا ذکر

کتابت وحی کا کام رسول اللہ صلعم نے کبھی کسی ایک شخص معین کے سپرد نہیں کیا تھا بلکہ مہاجرینؓ و انصارؓ جیسے معتمد و معتبر لوگوں میں سے جو شخص بھی وقت پر موجود رہا اس سے آپ اسی وقت کی نازل شدہ آیات کو اس کتاب میں جس کا نام امام اور ام تھا جو پہلے مسجد نبوی بننے کے بعد اس کے ایک ستون کے پاس ایک صندوق میں محفوظ رہتی تھی لکھوا دیا کرتے تھے اسلئے اس ستون کو "اسطوانۂ مصحف" کہتے تھے اسی ستون کے پاس بیٹھ کر صحابہ قرآن یاد کیا کرتے تھے، اور کتاب الامام سے قرآن اپنے اپنے صحیفوں میں نقل کیا کرتے تھے، جیسا کہ خود زید بن ثابت ہی سے مروی ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ کنا عند رسول اللہ صلعم نؤلف القرآن من الرقاع۔ یعنی زید بن ثابت فرماتے تھے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس (بیٹھکر) رقعوں سے یعنی اوراق سے قرآن جمع کیا کرتے تھے (مستدرک حاکم، اتقان ج ۱ ص۵۸ و فتح الباری) غرض اسی ستون کے پاس آنحضرت صلعم کے پیش نظر صحابہؓ کتاب الام سے اپنے اپنے مصاحف نقل کرکے جمع کیا کرتے تھے۔

جب منافقین کی ریشہ دوانیاں بڑھیں تو ان کے دست برد سے بچانے کے لئے وہ صندوق مسجد سے اٹھا کر ام المومنین حضرت حفصہؓ کے کے یہاں بھیج دیا گیا اور مصحف الامام اس وقت سے حضرت حفصہؓ کی زندگی تک برابر حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔

تو جب کوئی تازہ وحی نازل ہوتی تو پہلے زمانہ میں اسطوانہ کے پاس سے صندوق نکال کر اور بعد کو حضرت حفصہؓ کے یہاں سے کتاب الام منگوا کر اس میں آنحضرت صلعم خود اپنے سامنے حاضر الوقت کاتب وحی سے اس نازل شدہ وحی کو لکھوا دیتے تھے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر ایک ہی کاتب ہوتا تو اس کی صحت کی ذمہ داری صرف اسی ایک شخص پر ہوتی۔ دوسرے کو خبر نہ ہوتی کہ کیا لکھوایا گیا اور لکھنے والے نے کیا لکھا۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب متعدد لکھنے والے تھے تو ہر لکھنے والے نے پہلے کی لکھی ہوئی آیت پر بھی نظر ڈال لی اور پڑھ لیا۔ اوپر کی چند آیت ہی سہی کہ پہلے شخص نے کیا لکھا ہے۔ صرف لکھا ہوا تو ہوتا نہ تھا۔ بلکہ جو لکھا جاتا تھا اس کو پھر ہر شخص تک پہنچا دیا بھی جاتا تھا اور پھر ہر شخص اس کو یاد بھی کر لیتا تھا۔ اور ہر شخص اپنی کتاب میں نقل بھی کر لیتا تھا۔ جو آیت نازل ہوئی یا جو سورہ نازل ہوا اس کو ایک کاتب وحی نے تو اس کتاب الامام میں سب سے پہلے لکھ دیا پھر ہر حاضر شخص نے کسی پرزے، لکڑی، ہڈی، ٹھیکری یا چھال پر یعنی اس وقت جو چیز اس کو ایسی میسر آئی جس پر لکھ سکے اس پر لکھ لیا اور پھر گھر آکر اپنی کتاب میں اس نے نقل کر لیا۔ مگر وہ پرزہ یا لکڑی یا ہڈی یا ٹھیکری یا چھال جس پر وہ لکھ کر لایا تھا اس کو بھی اس نے ضائع نہ کیا بلکہ کسی مٹکے یا دوسرے ظرف میں یا کسی کپڑے میں لپیٹ کر محفوظ رکھ لیا کہ آخر اس پر قرآن کی آیت لکھی ہوئی ہے، ضائع اور پامال نہ ہو سے

یہ وہ شے ہے لکھا جاتا ہے جس پر نام اس گل کا — اٹھائے آدمی گر راہ میں پائے پڑا کاغذ

غرض کتاب الامام میں جس وقت جو نئی نازل شدہ آیت لکھی گئی وہ نقل در نقل ہو کر تمام صحابہؓ تک جلد از جلد پہنچ گئی، اور پھر ہر شخص کے سینے اور سفینے دونوں ہی میں محفوظ کر لی گئی۔ یہ بات روایت صحیح سے ثابت ہے کہ جو آیت اترتی تھی اس کو آنحضرت صلعم لکھنے والے سے وہیں پر لکھواتے تھے جو اس کا محل ہوتا تھا۔ یعنی لکھنے کے وقت بتا دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد لکھو جیسا کہ صحیح حدیثوں میں موجود ہے۔ اس لئے کتاب الامام کی طرح ہر شخص کے صحیفے میں ہر نئی آیت آپ کی ہدایت کے مطابق اپنے محل پر ہی لکھی جاتی تھی، اور پھر اسی کے مطابق لوگ یاد بھی کر لیتے تھے۔ چونکہ کتابت اور حفظ دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری تھا اور کتابت و حفظ کے بعد ہر شخص اپنے مصحف میں تلاوت روزانہ کا بھی پابند تھا۔ اس لئے اعراب اور نقطے کتابت میں رکھنے کی ضرورت نہ تھی یعلمون جہاں بصیغۂ جمع غائب ہے وہاں باوجود نقطے نہ ہونے کے "ی" ہی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ اور جہاں بصیغۂ جمع حاضر ہے وہاں باوجود نقطے نہ ہونے کے "ت" ہی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ ہر لکھنے والے نے خاص رسول اللہ صلعم یا کسی ماہر قرآن صحابی سے سنکر ہی لکھا تھا اور زبانی تلقین کے مطابق حفظ بھی کر لیا تھا۔ کتاب دیکھ کر پڑھنے کی تاکید[1] اسی لئے تھی کہ لوگ بسبب حفظ کے کتاب سے

---

[1] حدیث میں وارد ہے اعطوا اعینکم حظها من القرآن یعنی قرآن میں جو تمہاری آنکھوں کا حصہ ہے وہ ان کو دیا کرو یعنی مصحف دیکھ کر۔ باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ

کتاب دیکھ کر پڑھنے کا حکم اور تاکید

مستغنی تھے اور زبانی ہی پڑھنے پر اکتفا کرتے تھے لیکن کتاب دیکھ کر پڑھنے سے دونا ثواب پانے کی بشارت سن کر بلا ضرورت کتاب دیکھ کر پڑھتے تھے۔ مگر ہرچند نظر تو کتاب کی سطروں پر دوڑتی تھی لیکن زبان سے وہی نکلتا تھا جو زبانی یاد تھا چنانچہ اس وقت بھی حفاظ قرآن سامنے کھلا رکھ کر پڑھتے ہیں اور ہر مسلمان ان سورتوں کو جو اسکو یاد ہیں جب قرآن دیکھ کر پڑھتا ہے تو اسی طرح پڑھتا ہے۔

غلطی کتابت سے کوئی حافظ غلط نہیں پڑھ سکتا بلکہ غلطی کی تصحیح کریگا

اگر کسی کتاب میں کاتب کی غلطی سے نقطے یا اعراب غلط بھی لگے ہوں، کوئی حرف یا لفظ چھوٹ بھی گیا ہو تو عموماً اس پر نظر نہیں پڑتی اور اپنی یاد کے مطابق حافظ صحیح ہی پڑھ جاتا ہے، کبھی غلطی کتابت پر نظر پڑ گئی تو فوراً قلم لے کر اس غلطی کی تصحیح کر لیتا ہے بعض وقت ایسا بھی ممکن ہے کہ جس لفظ پر نظر پڑی وہاں رک گیا اور جو لکھا ہوا دیکھ رہا ہے اس کے متعلق مشتبہ ہوا کہ جو لکھا ہوا ہے وہ صحیح ہے یا جو مجھ کو یاد ہے وہ صحیح ہے۔ ایسے وقت میں وہ کسی دوسرے نسخے یا کسی دوسرے حافظ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس نسخے کی یا اپنی یاد کی تصحیح کر لیتا ہے۔ اس دور اوّل میں نقطے یا اعراب مصاحف میں نہیں تھے تو اس کی وجہ سے پڑھنے والوں میں کسی طرح کا بھی اختلاف ممکن نہ تھا یعنی نہیں ہو سکتا تھا کہ یعلمون کو کوئی تعلمون یا تحسبون کو یحسبون پڑھ دے۔ اس لئے کہ قرآن کا اصل تعلق زبانی تلقین سے تھا نہ کہ کتابت سے۔ اور زبانی تلقین کا آخری سلسلہ ہر پڑھنے والے کا خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تک منتہی ہوتا تھا۔ اور وہ تلقین صرف ایک ہی بار نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صحابہ کرامؓ بار بار نمازوں میں تو ضرور اور نمازوں سے باہر بھی رسول اللہ صلعم سے قرآن کی سورتیں سنا کرتے تھے۔ اس لئے زبانی تلقین پر تلقین ہوتی رہتی تھی۔ پھر صحابہؓ بھی آپس میں دور کیا کرتے تھے۔ ہر سال ماہ رمضان میں حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلعم کے پاس آتے تھے اور پورے قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں یہ روایت موجود ہے۔ اس لئے

بقیہ حاشیہ (از صفحہ گذشتہ) پڑھا کرو اور مشکوٰۃ میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قراءة الرجل فی غیر المصحف الف درجة وقراءته فی المصحف تضعف علی الفی درجة یعنی قرآن غیر مصحف میں (زبانی) پڑھنا ہزار گنا ثواب کا درجہ رکھتا ہے اور مصحف میں دیکھ کر پڑھنا دوگنا ہو کر دو ہزار گنا ثواب کا درجہ رکھتا ہے (مشکوٰۃ باب فضائل القرآن ص۱۸۳ آخر صفحہ)۔

حاشیہ صفحہ ہذا) باب کان جبرئیل یعرض القرآن علی النبی صلعم وقال مسروق عن عائشۃ عن فاطمۃ اسر الی النبی صلعم ان جبرئیل کان یعارضنی بالقرآن کل سنة وانه عارضنی العام مرتین ولا اراه الا حضر اجلی یعنی بخاری کی کتاب ابواب فضائل القرآن میں ایک باب ہی مستقل ہے کہ حضرت جبرئیلؑ آنحضرت صلعم کے سامنے قرآن مجید عرض کیا کرتے تھے۔ اس باب میں یہ حدیث ہے کہ مسروق حضرت ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہراؓ سے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے مجھ سے راز کے طور سے فرمایا کہ جبرئیلؑ ہر سال ایک بار مجھ سے قرآن کا دور کرتے تھے مگر امسال انھوں نے دو بار مجھ سے قرآن کا دور کیا۔ اس سے میں اور تو کچھ نہیں سمجھتا بجز اس کے کہ میرا وقت آگیا (بخاری ج ــ ص ــ) اور مشکوٰۃ باب الاعتکاف (صفحہ ۱۷۵ میں) ہے عن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس بالخیر وکان اجود ما یکون فی رمضان ... جبرئیل یلقاہ کل لیلة فی رمضان یعرض علیه النبی صلعم القرآن فاذا لقیه جبرئیل کان اجود من الریح المرسلة (متفق علیہ) ... عن ابی ہریرة قال کان یعرض علی النبی صلعم القرآن کل عام مرة فعرض علیه مرتین فی العام الذی قبض وکان یعتکف کل عام عشرا ... اعتکف عشرین فی العام الذی قبض رواہ البخاری یعنی عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم بھلائی میں سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں تو اور بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔ جبرئیلؑ رمضان کی ہر رات کو آپ کے پاس آتے تھے اور رسول اللہ صلعم ان کو قرآن سناتے تھے۔ تو جب آپ کے پاس ... آتے تھے تو آپ بھلائی میں خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ تیز ہوتے تھے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ... رسول اللہ صلعم کے سامنے قرآن پیش کیا جاتا تھا (یعنی جبرئیلؑ پڑھ کر سناتے تھے) ایک بار مگر جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال دو دو ہوئے۔ اور آنحضرت صلعم ہر سال (رمضان میں) دس دن اعتکاف فرماتے تھے، مگر جس سال آپ کی وفات ہوئی بیس دن اعتکاف فرمایا۔ یہ حدیث بخاری میں ہے۔

ضرور پورے قرآن کا دور ہوتا تھا اور اسی بنا پر نازل شدہ آیات کا محل و مقام رسول اللہ صلعم کو معلوم ہوتا تھا۔ اور آپ کاتب وحی کو کو بتا دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد لکھو۔ اگرچہ بعض روایتوں میں یہ بھی وارد ہے کہ حضرت جبرئیل امین ؑ جب وحی لے کر آتے تھے تو وہ بھی رسول اللہ صلعم کو یہ بتا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورہ کی ہے اس کو فلاں آیت کے بعد لکھوائیے، مگر یہ محض بسبیل احتیاط و از قبیل یاد دہانی تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ آپ بطور خود جس آیت کو جس سورہ میں جہاں پر آپ مناسب سمجھتے لکھوا دیتے۔ آخر جب حضرت جبرئیل ؑ کے ساتھ دور ہوتا تھا تو اس میں آیات کی اور پھر سورتوں کی کوئی ترتیب تو ضرور ہوتی تھی۔ تو یقیناً اسی ترتیب کے مطابق آپ نے آیات و سور کو لکھوایا۔ اس میں کون سی بات ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور خواہ مخواہ ترتیب[1] نزول کا نام لے لے کر اس کی ایک غلط اہمیت بیان کر کے ترتیب توقیفی جو حضرت جبرئیل ؑ کی قراءت کے مطابق حسب حکم فاذا قرأنٰہ فاتبع قرآنہ موجودہ ترتیب آیات و سور خود رسول اللہ صلعم کی قائم کردہ ہے اور عہد نبوی سے آج تک بے مثل تواتر کے ساتھ قائم ہے ایسی قطعی چیز کی اہمیت گھٹائی جاتی ہے۔ افسوس! و اللہ المستعان علیٰ ما یصفون ٥

ترتیب نزول کی پرفریب اہمیت

آنحضرت صلعم توقیف کیمطابق آیات و سور کی ترتیب قائم کر کے مصحف الامام میں لکھواتے تھے

باقی رہی وہ روایت کہ آنحضرت صلعم کاتب وحی کو فرماتے تھے کہ فلاں سورہ میں ایسی جگہ لگا دو جہاں پر اس اس قسم کی آیتیں ہوں یعنی آپ اپنے کاتب وحی کو مجاز بنا دیتے تھے

---

[1] اگر ترتیب نزول کی عند اللہ و عند الرسول کوئی اہمیت ہوتی تو یقیناً ترتیب نزول کے مطابق ہی رسول اللہ صلعم قرآن کو لکھواتے، اور حضرت جبرئیل ؑ کو اس کی ضرورت نہ پڑتی کہ آیات کا محل و مقام آ آ کر بتاتے، اور اللہ تعالیٰ حسب وعدہ قرآنی ترتیب نزول کے مطابق ہی قرآن کو جمع کرتا اور اس کو محفوظ رکھتا۔ اگر ترتیب نزول کے مطابق ترتیب جمع و تدوین مناسب ہوتی تو اس میں دشواری کیا تھی۔ آسانی تو اسی میں تھی جیسے جیسے سورتیں آیتیں اترتی جاتیں آپ لکھواتے جاتے اور لوگ لکھتے جاتے۔ مگر چونکہ ترتیب نزول کے مطابق جمع و تدوین منشائے الٰہی کے مطابق نہ تھی اس لئے لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق جس طرح حضرت جبرئیل ؑ کے ساتھ رسول اللہ صلعم دور فرمایا کرتے تھے۔ اور جس طرح حضرت جبرئیل بتاتے تھے آنحضرت صلعم نے اس کے مطابق جمع و تدوین رکھی، اور اسی کے مطابق تلاوت و حفظ اور کتابت و قراءت کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۲ منہ غفرلہ

[2] استیعاب ج ۱ صد ۳۳۳ میں بضمن ترجمہ حضرت امیر المومنین اعظم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ خلف بن قاسم عبد اللہ بن عمر سے وہ احمد بن محمد بن الحجاج سے وہ یحییٰ بن سلیمان سے وہ اسمٰعیل بن علیہ سے وہ ایوب السختیانی سے وہ محمد بن سیرین سے روایت کرتے ہیں کہ ابن سیرین نے کہا کہ جب حضرت صدیق اکبر کے ہاتھ پر سب لوگوں نے بیعت کر لی تو حضرت علی ؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں دیر کی اور گھر میں بیٹھ رہے تو حضرت ابوبکر ؓ نے ان کے پاس کسی کو بھیج کر پچھوایا کہ کس بات نے آپ کو روک رکھا؟ کیا آپ میرے امیر منتخب کئے جانے کو ناپسند کرتے ہیں؟ تو حضرت علی ؓ نے کہلوا بھیجا کہ میں آپ کی امارت کو ناپسند نہیں کرتا۔ لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اپنی چادر نہیں اوڑھوں گا بجز نماز کے لئے جب تک میں قرآن جمع نہ کر لوں۔ ابن سیرین نے کہا کہ حضرت علی ؓ نے لکھا ترتیب نزول کے مطابق۔ اگر یہ کتاب مل جاتی تو اس میں بہت سا علم مل جاتا۔ اس حدیث کے پہلے راوی خلف بن قاسم بالکل مجہول ہیں دوسرے صاحب کون ہیں اس کا بھی پتا نہیں اس نام کے متعدد راوی ہیں۔ باقی رہے تیسرے احمد بن محمد بن الحجاج بن رشدین بن سعد ابو جعفر المصری ابن حجر لکھتے ہیں قال ابن عدی کذبوہ و انکرت علیہ اشیاء محدثین نے ان کو جھوٹا قرار دیا ہے اور ان کی بعض حدیثوں سے انکار کیا ہے۔ اس کے بعد و من اباطیلہ (ان کی باطل حدیثوں میں سے) کہہ کر بعض حدیث نقل کی ہے ۲۹۲ھ میں مرے علامہ فہمولی نے کہا کہ ان کے باپ دادا پردادا سب ضعیف الحدیث تھے ان کے شیخ احمد بن صالح بھی ان کو کذاب کہتے تھے۔ (لسان المیزان جلد اول صـ ۲۵۷) یہ روایت اتقان جلد اول صـ ۵۹ میں ہے ہودہ خلیفہ سے اور وہ عون سے وہ ابن سیرین سے مگر ہودہ بن خلیفہ منکر الحدیث اور غیر ثقہ تھے اور عون نام کا کوئی شخص ایسا نہیں جو ابن سیرین سے روایت کرتا ہو اسلئے یہ طریق روایت بھی ناقابل اعتبار ہی ہے اور تقیہ کی علامت ق بھی ان کے نام کے بعد موجود ہے دیکھ لیجئے کتب رجال شیعہ۔

اسمٰعیل بن علیہ سے حدیثوں کی روایت نہیں ہے۔ البتہ ان کے صاحبزادے ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ سے روایت ہے مگر ابن حجر لسان المیزان میں ان کو جہمی، خبیث، ملعون لکھتے ہیں اور ان کو کوئی ثقہ نہیں لکھتا۔ اپنے باپ سے صرف یہی تنہا روایت کرتے ہیں اور بس۔ اور ایوب السختیانی سے ابن علیہ تو ضرور روایت کرتے ہیں مگر ابن علیہ ابراہیم ہی کو کہتے ہیں جیسا کہ لسان المیزان ج ۲ صـ ۳۵ میں لکھا ہے یہ "ابناء" کی تفصیل اور کوئی بھی "ابن علیہ" نہیں کہا جاتا۔ اسی لئے اسمٰعیل بن علیہ کا ذکر نہ تہذیب التہذیب میں ہے نہ لسان المیزان میں نہ تقریب میں نہ میزان الاعتدال میں ———

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

تھوڑا سا اشارہ بتا کر، اور وہ اس اشارے کے مطابق اپنی سمجھ سے اس آیت کے لئے کسی سورہ میں ایک جگہ متعین کر لیا کرتا تھا، ......
محض افتراء اور رسول اللہ صلعم و کتاب اللہ دونوں پر بہتان ہے، جس کی شہادت بزبانِ حال خود اس روایت کی نشست الفاظ دے رہی ہے

عوف اعرابی رافضی شیطان تھا

اس کے علاوہ اس حدیث کا راوی عوف اعرابی ہے جس کو ابن حجر نے تہذیب التہذیب ج۸ ص۱۶۷ میں کان قد ریا رافضیا شیطانا لکھا ہے۔ یہ روایت ترمذی ج ۲ ص۱۳۲ اور مسند احمد ج ا ص۵۷ میں ہے دیکھ لیجئے۔ اور عوف اعرابی کی جسارت اور محدثین کی سادہ لوحی دیکھ کر عبرت حاصل کیجئے۔ مسند امام احمد ج ۴ ص۲۱۸ حدیث عثمان بن العاص کے آخر میں ایک اور روایت موجود ہے جس کا مختصر ترجمہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ابھی میرے پاس جبرئیل آئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیہ کو فلاں سورہ میں فلاں جگہ پر رکھو۔ مختصر کنز العمال جلد ۲ ص۴۰ میں بھی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جبرئیل آئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں جگہ رکھو۔ اور ظاہر ہے کہ سورہ نام ہی ہے مجموعۂ آیات کا، اور آیت نام ہے مجموعۂ کلمات کا۔ قرآن میں آیت اور سورہ دونوں کا ذکر موجود ہے۔ جس چیز کا نام موجود ہے یقیناً اس کا مسمّیٰ بھی ضرور موجود ہے۔ کفار سے کہا جاتا ہے کہ ایسی دس سورتیں بھی بنا کر لاؤ اور ایک سورہ کے متعلق بھی کہا گیا ہے۔ اگر سورتوں کی، آیات کی کوئی ترتیب ہی نہ تھی تو سورتوں کا وجود کہاں سے آیا؟ جس خدا نے جس فرشتے کی معرفت قرآن مجید نازل فرمایا، اسی خدا نے اسی فرشتے کی معرفت آیات کی ترتیب اور سورتوں کی تحدید ضرور بتادی، اور جب جو سورہ مکمل ہوگیا تو اس کی تکمیل کی اطلاع بھی ضرور دے دی۔ یہ حدیث جو عثمان بن العاص سے مروی ہے یہ بھی ضرور ناقص ہے۔ کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ پہلے اتر چکی تھی اور معلق تھی نہ یہ معلوم تھا کہ یہ کس سورہ کا جزء ہے۔ رسول اللہ صلعم حیران تھے کہ اس کو کہاں رکھیں یا آپ بالکل خالی الذہن تھے کہ اچانک غیر متوقع طور سے جبرئیل نے آکر اس کا محل بتادیا، حالانکہ یہ بالکل خلاف عقل ہے۔ جو آیت جس وقت اترتی اُسی وقت اس کا موقع و محل بتا دیا گیا، اور اسی وقت وہ آیت اپنے محل پر لکھوا دی گئی۔ اور جو بتایا بھی گیا وہ محض مبنی بر احتیاط تھا۔ ہر سال جبرئیل جو آکر آپ کے ساتھ قرآن کا دَور کیا کرتے تھے اس وجہ سے آپ کو خود ہر آیت کا موقع و محل معلوم تھا اور پورا قرآن آپ کو حفظ ہو گیا تھا۔

زید بن ثابت کی کتابت وحی میں کوئی خصوصیت نہ تھی

اسی تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ زید بن ثابتؓ کی کوئی خصوصیت نہ تھی کہ جمع قرآن جیسے اہم کام کے لئے حضرت صدیق اکبرؓ صرف انھیں کو دوسرے کاتبینِ وحی میں سے منتخب فرماتے اور بالفرض اگر کوئی خصوصیت ان کے نزدیک تھی بھی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ زید بن ثابتؓ اس وقت موجود تھے جبکہ آخری مرتبہ

زید بن ثابت کی عرضۂ آخیرہ میں شرکت

حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلعم کے ساتھ قرآن کا دور کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ خلاف عقل ہے اور ہرگز کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں مگر بالفرض مان بھی لیا جائے تو اتنا بڑا اہم کام ہرگز ہرگز تنہا زید بن ثابتؓ کے ذمے چپکے سے حضرت ابوبکرؓ سپرد نہیں کر سکتے تھے۔ یقیناً اس کے لئے حضرت صدیق اکبرؓ تمام مہاجرینؓ و انصارؓ کو مدعو کرتے اور حسب معمول خطبہ دیتے جس میں حمد و ثنا کے بعد اس مہم پر ہر شخص کی رائے طلب کرتے، اور ہر وہ شخص جس کو قرآن کا کچھ حصہ بھی یاد ہو یا کوئی حصہ بھی رسول اللہ صلعم کے سامنے کا لکھا ہوا ہو سب کے بلوانے کیلئے نفیرِ عام[۱] کرتے۔ متعدد لکھنے والے ہوتے اور ایک ایسا معتمد علیہ شخص تمام زبانی و

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) محمد بن سیرین کی ولادت حضرت عثمان کی شہادت سے دو برس پہلے ہوئی انھوں نے حضرت علی کو دیکھا نہ حضرت ابوبکر کو یہ واقعہ حضرت ابوبکر کی ابتدائے خلافت کا آخر کس سے سنا؟ - ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۲۱۵ میں لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کی خلافت کے جب دو برس رہ گئے تھے تو یہ پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ در حقیقت یہ روایت احمد بن یحییٰ الحجاج یا یحییٰ بن سلیمان کی من گھڑت ہے۔ اسی روایت کی بنیاد پر لوگ حضرت علیؓ کے جمع قرآن مطابق ترتیب نزول کا ڈھول پیٹا کرتے ہیں جو در اصل حضرت علیؓ پر مخالفت رسول و مخالفت جبرئیل بلکہ مخالفت منشائے الٰہی کا بہتان ہے۔ معاذ اللہ من ذلک۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] متاخرین نے بخاری کی اس روایت میں یہ خامی محسوس کی اور پھر نئی نئی روایتیں بنا بنا کر اور بعضوں نے بطور شرح اپنی طرف سے لکھ لکھ کر نفیر عام وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر متاخرین کی یہ ترمیم اس حدیث کے نقص کا اور بھی بانگ دہل اعلان کر رہی ہے ۱۲ فافہم

زید بن ثابت نے واقعہ جمع قرآن عبید بن سباق کے سوا اور کسی سے کبھی بیان نہیں کیا۔

تحریری شہادتیں لے لے کر املا کراتا جو آغاز نزول وحی سے قرآن کی ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت سے واقف تھا اور باقی ودیگر لوگ جو علم قرآن میں اس کے ہم پلہ تھے، اس کے شریک املا ہوتے، دیکھتے اور سنتے رہتے۔ اور اس طرح یہ کام اہل علم صحابہؓ کے مجمع میں پورے حزم واحتیاط کے ساتھ ہوتا۔ جس کا سلسلہ یقیناً مہینوں تک جاری رہتا۔ نہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا اور حضرت ابوبکرؓ نے صرف حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر چپکے سے کہہ سن کر آمادہ کر لیا۔ اور بس اسی دن یا دوسرے دن پورا قرآن جمع ہو گیا۔ جس کی خبر زید بن ثابتؓ کے سوا اور کسی اور کو نہ ہو سکی۔ اور پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کبھی اس واقعہ جمع قرآن کا ذکر بھی کسی سے نہ کیا۔ اِنَّ ھٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ المؤمن۔ زید بن ثابتؓ بھی اپنی پوری زندگی میں اس واقعہ جمع صدیقی کو کسی شخص سے بھی نہیں کہتے ہیں، اگر کہتے ہیں تو صرف عبید بن السباق سے جو ان کی وفات کے کئی برس بعد پیدا ہونے والا ہے یا شاید ان کی وفات کے وقت صرف دو برس کا تھا۔ زید بن ثابتؓ کے بیٹے خارجہؓ ان کو خبر ہے تو صرف نقل مصاحف بعہد عثمانی کی، یا شاید اس کی بھی نہیں کیونکہ یہ تو صرف آیت احزاب کی گم شدگی و بازیابی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو مشتبہ ہے۔ نہ معلوم جمع صدیقی کے وقت یا نقل مصاحف بعہد عثمانی کے وقت۔ حضرت انسؓ بن مالکؓ بھی جانتے ہیں تو اسی نقل مصاحف بعہد عثمانی کو مگر ان کو کسی آیت کے بھی گم ہونے اور کسی کے پاس ملنے کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ جمع قرآن بعہد صدیقی کی اطلاع ان لوگوں کو بھی معلوم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ورنہ یہ لوگ عبید بن السباق سے زیادہ حقدار تھے کہ اس کی روایت کرتے۔

انس بن مالک خادم النبی صلعم کو جمع صدیقی کی کوئی خبر نہ تھی

انس بن مالکؓ تو خود ایک انصاری صحابی تھے۔ زید بن ثابتؓ سے عمر میں یہ صرف ایک ہی برس تو چھوٹے تھے۔ وہ جمع قرآن بعہد صدیقی میں شریک ہونگے۔ اگر املا و کتابت میں شریک نہ ہونگے تو شہادت زبانی و تحریری تو ضرور ہو گی، اس کے کیا معنی ہیں کہ نقل مصاحف بعہد عثمانی کی تو یہ روایت کرتے ہیں، مگر جو اس سے زیادہ اہم واقعہ جمع قرآن بعہد صدیقی کا تھا۔ اس کا مطلق ذکر کسی سے بھی نہیں کرتے۔ نقل مصاحف والی روایت میں کہتے ہیں کہ "حضرت عثمانؓ نے حضرت ام المومنین حفصہؓ کے پاس کسی کو بھیجا کہ آپ صحیفے بھیج دیجئے۔ ہم لوگ مصاحف میں انکو لکھ لیں گے، اور پھر یہ صحیفے آپ کے پاس واپس کر دینگے"، مگر اس کا مطلق ذکر نہیں کرتے کہ وہ صحیفے جو حضرت ام المومنین حفصہؓ کے پاس تھے، وہ کیسے تھے، اور کب کے لکھے ہوئے تھے جیسے یہ کوئی مشہور بات تھی، سارے مسلمان اس سے واقف تھے۔

انس بن مالک کو اسکی مطلق خبر نہ تھی کہ حضرت حفصہ کے پاس جو صحیفے ہیں وہ کیسے ہیں

اگر یہ کہا جائے کہ جمع صدیقی کے واقعے سے سب لوگ واقف تھے اور ان صحف صدیقی کے حضرت حفصہؓ کے پاس ہر پھر کر چلے آنے کی خبر سب کو معلوم تھی، اس لئے اس عہد عثمانی کے نقل مصاحف والی روایت کے موقع پر اسکی تصریح نہ کی کہ وہ صحیفے جو حضرت حفصہؓ کے پاس تھے کیسے تھے اور کب کے لکھے ہوئے تھے، تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ کے وقت جمع صدیقی کی روایت بنی ہی نہ تھی کہ ان کو اس کی اطلاع ہوتی۔ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ نے صرف زید بن ثابت کو چپکے چپکے جمع قرآن کا کام انجام دینے کو کہا اور وہ چپکے چپکے انجام دیتے رہے۔ مِن صدورِ الرجال یعنی لوگوں کو جو کچھ قرآن یاد تھا وہ بھی ایک ایک سے پوچھتے تھے تو معلوم نہیں ان لوگوں کو اس کی اطلاع بھی دیتے تھے یا نہیں کہ ہم کس لئے پوچھ رہے ہیں اور تختی اور ٹھیکری وغیرہ پر بقول ہمارے جو کچھ لوگوں کے پاس آیتیں تھیں وہ بھی جو ان سے لے لے کر لاتے تھے تو کیا کہہ کر ان سے لیتے تھے یہ بھی خدا کو معلوم، اس لئے کہ زید بن ثابتؓ کے سوا کسی سے بھی جمع صدیقی کی روایت نہیں ملتی۔ تنہا زید جو خود جامع قرآن تھے وہی اس کی روایت کرتے ہیں، وہ بھی ایک ایسے شخص سے جو ان کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ دو برس کا تھا۔ اور وہ بھی تنہا ہی اس کی روایت کرتا ہے تو صرف زہری سے۔

زید بن ثابت کا اقرار ایک طرف تو بخاری کی یہ روایت ہے۔ دوسرے طرف خود زید بن ثابت رضہ ہی کا یہ اقرار موجود ہے کہ وہ فرماتے تھے کنا عند رسول اللہ صلعم نؤلف القرآن من الرقاع یعنی زید بن ثابت رضہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس (بیٹھ کر) رقعوں سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔ اس حدیث کو حاکم نے مستدرک جلد ۲ ص ۶۱۱ میں، جلال الدین سیوطی نے اتقان جلد ۱ ص ۵۸ میں اور ابن حجر نے فتح الباری جلد ص [illegible] میں نقل کیا ہے، اور سب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرطوں کے مطابق ہے۔ اور صحیح ہے۔ ذہبی رح نے بھی تلخیص المستدرک میں حاکم کی تائید کی ہے۔ تو پھر زید بن ثابت اور ان کے رفقائے کار رقعوں یعنی رق کے اوراق سے کس چیز پر عہد نبوی میں رسول صلعم کے سامنے قرآن نقل کیا کرتے تھے؟ اس حدیث کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ کسی لکھنے والے یا چند لکھنے والوں نے پہلے غیر شیرازہ بند غیر مرتبہ اوراق پر قرآن لکھا تھا۔ زید بن ثابت وغیرہ ان اوراق پر سے کسی شیرازہ بند کتاب ہی پر آنحضرت صلعم کے پیش نظر قرآن نقل کیا کرتے تھے۔ اور غالباً نہیں بلکہ یقیناً نقل کر کر کے ہر صحابی اپنے گھر اپنا نسخہ لے جاتا تھا، جب ہی تو ہر صحابی کے پاس لکھا ہوا قرآن کتابی صورت میں موجود تھا۔ اور آپ صحابہ کو کتاب دیکھکر پڑھنے کی تاکید فرماتے تھے۔ اور سفر میں کتاب ساتھ لیجانے سے منع فرماتے تھے۔ اور وہ اوراق (رقاع) رق منشور کے تھے جن پر آنحضرت قرآن لکھواتے تھے۔ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں بعض

عہد نبوی میں پیشہ ور کاتبین مصاحف فقرائے صحابہ رضہ جو کتابت کے فن قریشی رسم خط و املا کی مہارت رکھتے تھے کتابت قرآن کا کام کرتے تھے اور اس کی اجرت سے بسر اوقات کرتے تھے۔ بعض لوگوں کو اس کمائی کے حلال ہونے پر شبہ ہوا تو یہ مسئلہ حضور کے حضور میں پیش ہوا جس پر آپ نے فرمایا کہ احق ما اخذتم علیہ اجراً کتاب اللہ تعالیٰ یعنی جن کاموں پر تم اجرت لیا کرتے ہو ان میں اجرت لینے کی زیادہ حقدار چیز کتاب اللہ ہے۔ اس حدیث کو ابن عباس سے امام بخاری ہی نے روایت کیا ہے (تیسیر الوصول ج ۲ ص ۲۶۳) صاحب تیسیر الوصول اسی حدیث کو لکھکر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس سے کتابت مصحف کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کاتبین مصاحف، تو مصور ہیں (یعنی پہلے لکھے ہوئے حروف کی تصویر اتارتے ہیں یا تلفظ و آواز کے لئے جو صورتیں مقرر کی گئی ہیں ان صورتوں کو اتارتے ہیں) وہ لوگ تو اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے ہیں۔ خیر یہ تو ابن عباس رضہ کا قول ہے بخاری کی روایت ہے تو ہمارے پاس رسول اللہ صلعم کا ارشاد موجود ہے فبای حدیث بعدہ یؤمنون ٥ بخاری کی جمع قرآن والی حدیث کی رکاکتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضہ نے زید بن ثابت رضہ کو اس کام کے لئے جو منتخب کیا تو اس کی چار وجہیں بیان فرمائیں جن میں سے ۱۔ جوان ہونا ۲۔ عاقل ہونا ۳۔ غیر متہم ہونا۔ غور فرمائیے کہ یہ تین باتیں کیا زید بن ثابت رضہ کے لئے وجہ ترجیح ہو سکتی ہیں؟ کیا انس بن مالک رضہ وغیرہ صحابیوں میں یہ تین

زید بن ثابت کے وجوہ انتخاب پر بحث باتیں اسی حد تک نہ تھیں جو زید بن ثابت رضہ میں تھیں؟ باقی رہی چوتھی وجہ یعنی کاتب وحی ہونا۔ تو ان سے کہیں زیادہ مدت تک اور کہیں زیادہ حصہ قرآن لکھنے والے دوسرے صحابہ رضہ موجود تھے، جو آغاز نزول سے کتابت وحی کر رہے تھے۔ اور تمام صفات میں زید سے افضل تھے۔ اس صفت میں بھی زید کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جو شخص آغاز نزول سے آخر تک تمام آیات و سُوَر اور ان کے مواقع نزول وغیرہ سے واقف ہو، پورا قرآن رسول اللہ صلعم کو سنا چکا ہو یا آپ سے سن چکا ہو

۱۔ یہ حدیث اس واقعہ کو بتا رہی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے وقت میں جو کتاب الامام رق منشور کے رقاع یعنی اوراق پر لکھا جاتا تھا ان رقاع سے ہر لکھا پڑھا صحابی اپنے اور اپنے اہل و عیال کے پڑھنے کے لئے قرآن نقل کر کر کے لے جایا کرتا تھا۔ جب کوئی وحی آتی سب سے پہلے کتاب الامام میں لکھی گئی اس کے بعد صحابہ اس کتاب الامام کے اوراق سے اپنے اپنے لئے لکھ لکھ کر لے جایا کرتے تھے۔ اسی مضمون کو زید بن ثابت خود جمع متکلم ماضی استمراری کے ساتھ بیان کرتے ہیں، کہ ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس بیٹھکر رقاع سے قرآن جمع کرتے تھے، تو اتنی احتیاط ملحوظ رہتی تھی کہ اس نقل کے کام کو بھی رسول اللہ صلعم کے پیش نظر ہی انجام دیا جاتا تھا۔ صحابہ کا تو قرآن کے ساتھ اسقدر محتاط معاملہ تھا۔ مگر ان راویان احادیث موضوعہ نے کس طرح صحابہ کو بلکہ خود رسول کو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کو قرآن کی طرف سے بے پروا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ صحیح حدیثوں کو [illegible] یا تو غلط عنوان بیان سے روایت کیا، یا اگر کسی قدر صحیح الفاظ رہے تو انھیں موضوع روایتوں کی بنا پر محدثین نے ان صحیح حدیثوں کے بھی غلط معنی لئے۔ جیسا کہ اس زیر بحث حدیث کے ساتھ ہوا۔

[ا]ن کا حفظ قرآن مسلّم ہو اور قوی الحافظہ ہو، اوقاف و خواتم و فواصل آیات سے پوری طرح باخبر ہو، پھر زبان قریش پر اس کو عبور ہو کیونکہ قرآن [ز]بان قریش میں اترا ہے۔ اور قریش کی رسم خط و طریق املا میں جس کو مہارت تامہ ہو اور خطاطی و خوشخطی میں بھی کمال حاصل ہو۔ تو ان میں سے ایک بات کو بھی زید بن ثابتؓ میں ثابت نہیں کیا گیا۔ اور دوسرے کاتبین وحی متعدد ایسے تھے جن میں یہ سب باتیں یقیناً زید بن ثابتؓ سے [ز]یادہ تھیں۔ مگر افسوس کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں کو منتخب تو کہاں تک کرتے زید بن ثابتؓ کا کسی کو شریک مشورہ تک نہیں بنایا۔

حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے زید پر بھروسہ کر لیا اور حضرت عثمانؓ نے زید پر بھروسہ نہ کیا

حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابتؓ ہی کے لکھے ہوئے صحیفوں کی نقل کرنے کے لئے تو زید بن ثابتؓ کے ساتھ عبداللہ بن الزبیر سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام تین تین قریشی کاتبوں کو یہ کہتے ہوئے ساتھ لگا دیا کہ جہاں زیدؓ سے اختلاف ہو تو زید کی بات نہ ماننا کیونکہ وہ قریشی نہیں ہیں اور تم لوگ قریشی ہو۔ قریش ہی کی زبان اور رسم خط کا اتباع کرنا۔ اور بالکل آغاز کار میں ایک غیر قریشی کے سپرد سارا کام جمع [آ]یات و سورہ کا حضرت ابوبکرؓ سپرد کر دیتے ہیں ایک عجیب و غریب بات ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی اور کو بھی زید کا شریک کار بنا دیا تھا جیسا کہ سیوطی وغیرہ کی بعض روایتوں میں یہ بتا کے اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ بخاری کی روایت اس کی متحمل نہیں۔

واضح رہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ راوی نے صرف زید بن ثابتؓ کا نام بیان کیا ہے، مگر حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ کے ساتھ دوسرے کاتبین وحی حافظین قرآن کو بھی ضرور زید بن ثابتؓ کا شریک و معاون بنایا ہوگا اور زید بن ثابتؓ نے ہرگز تنہا یہ کام محض اپنی ذمہ داری پر نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ دوسروں کی مدد و معاونت بھی ضرور ان کے ساتھ ہوگی۔ بعض متاخرین نے یا تو دیکھ کر ایسی روایتیں بنائی ہیں [م]گر بخاری کے پرستار ایسا نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ اس روایت میں ہر جگہ زید بن ثابتؓ اپنے لئے واحد متکلم یا واحد حاضر کی ضمیر لا رہے ہیں۔ پوری روایت [پو]رے پڑھ جائیے۔ اَرْسَلَ اِلَیَّ۔ اِنَّکَ رَجُلٌ شَابٌّ۔ لَا نَتَّهِمُکَ۔ وَکُنْتَ تَکْتُبُ۔ فَتَتَبَّعِ الْقُرْاٰنَ۔ فَاجْمَعْهُ۔ لَوْ کَلَّفُوْنِیْ لَکَانَ [اَثْ]قَلَ عَلَیَّ۔ اَمَرَنِیْ بِهٖ۔ قُلْتُ یُرَاجِعُنِیْ۔ صَدْرِیْ۔ فَتَتَبَّعْتُ۔ اَجْمَعُهٗ۔ وَجَدْتُّ۔ لَمْ اَجِدْهَا۔ اگر ایک شخص بھی کوئی دوسرا ان کا شریک کار ہوتا تو یقیناً جمع متکلم یا حاضر یا تثنیہ کی ضمیر لاتے۔ جس طرح حدیث نقل مصاحف میں حسب ضرورت لائے ہیں۔

عرضۂ آخیرہ میں زید کی شرکت

کہا جاتا ہے کہ زید بن ثابتؓ پورے قرآن کے حافظ تھے اور عرضۂ آخیرہ یعنی جبرئیلؑ کے ساتھ جو رسول اللہ صلعم ہر سال ماہ رمضان میں پورے قرآن کا دور کیا کرتے تھے اور سال وفات میں دو بار آپؐ کے پاس جبرئیل اسی غرض [سے] آئے، تو آخری عرضہ یعنی آخری دور میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی موجود تھے۔ اگرچہ یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ ایسے موقع پر آنحضرت صلعم نے حضرت ابوبکرؓ [کو] شریک کیا نہ حضرت عمرؓ کو نہ حضرت عثمانؓ کو نہ حضرت علیؓ کو۔ آخر زید بن ثابتؓ میں کون سی ایسی خصوصیت تھی کہ آنحضرت صلعم اور جبرئیل دونوں نے ان کو [او]ر صرف ان کو شریک دور بلا وجہ کر لیا۔ اور اگر واقعی یہ شرف خصوصیت ان کو حاصل تھا تو حضرت ابوبکرؓ کو تو سب سے پہلے یہی کہنا تھا کہ تم حافظ قرآن ہو [او]ر قرآن مجید تم کو یاد ہے۔ اور پھر تم کو ایک ایسی خصوصیت کا شرف حاصل ہے جو کسی کو بھی نہیں، وہ یہ کہ تم عرضۂ آخیرہ میں آنحضرت صلعم کے ساتھ رہے۔ [ا]س لئے تم سے بڑھ کر اور کون جمع قرآن کا اہم کام انجام دے سکتا ہے! جو اہم ترین خصوصیت حضرت زیدؓ کی تھی وہ تو نہ کہی اور کہا کہ تم نوجوان [و] عاقل ہو ہم لوگ تم پر کوئی تہمت نہیں لگاتے۔ ان میں سے کوئی بات بھی کیا اس انتخاب کی وجہ ہو سکتی ہے؟ رہی کتابت وحی تو ان سے زیادہ مدت [د]وسرے لوگ کر چکے تھے۔ یہ عرضۂ اخیرہ کی شرکت کا مضمون بعد والوں نے بخاری کی اس روایت پر پشتہ باندھنے کیلئے گھڑا ہے۔

آخر سورہ براءۃ کے واقعے پر غور

اب وہ آخر سورہ براءۃ والے واقعے پر غور فرمائیے۔ خزیمہ اور ابوخزیمہ کا اختلاف تو اپنی جگہ پر ہے۔ جس کی بحث متابعات کے سلسلے میں ہو چکی۔ مگر یہاں لفظ مَعَ کا اختیار کیا گیا ہے کہ اس مَعَ سے آپ سمجھ جائیں [یا] سمجھ لیں۔ مَعَ اَبِیْ خُزَیْمَۃَ سے یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے پاس لکھا ہوا تھا۔ اور یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو یاد تھا۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھیں کے پاس لکھا ہوا تھا مگر یاد دوسروں کو بھی تھا۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یاد انھیں کو تھا۔ مگر لکھا ہوا دوسرے کے پاس بھی تھا۔ اور پھر ظاہر عنوان بیان کے مطابق

بھی سمجھ سکتے ہیں کہ صرف انھیں کے پاس لکھا ہوا تھا۔ ورنہ یاد کسی کو بھی نہ تھا۔ ایک صحیح کے لفظ سے کتنے پہلو پیدا ہو گئے۔ اب حدیث کا پڑھنے والا جس پہلو سے مطمئن ہو اسی پہلو کو سمجھ لے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس آیت کا محل ان کو کس طرح معلوم ہوا کہ اس کو آخر سورۂ توبہ قرار دیا۔ زید بن ثابت یہ نہیں فرماتے ہیں کہ یہ آیتیں مجھکو یاد تھیں اسلئے میں نے ان کو بہت ڈھونڈھا مگر لکھی ہوئی ان کو ابوخزیمہ کے سوا اور کسی کے پاس نہیں پایا۔ یا مجھے چھوڑ کر ابوخزیمہ کے سوا اور کسی کو یاد نہ تھیں۔ نہ انھوں نے یہ کہا کہ میں ان آیتوں کو رسول اللہ صلعم سے سنا کرتا تھا اس لئے ان کو ڈھونڈنے لگا۔ جیسا کہ سورۂ احزاب والی آیت کی روایت میں ہے۔ ممکن ہے کہ زید بن ثابت نے ان دونوں آیتوں کو آخر سورہ توبہ اس روایت کے اعتبار سے کہا ہو یعنی جو دو آیتیں اس وقت سورۂ توبہ کے آخر میں ہیں۔ کیونکہ ابن ابی داؤد اور امام احمد بطریق محمد بن اسحٰق عبداللہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ تین آیتیں ہوتیں تو ہم ان کو ایک مستقل سورہ ہی قرار دے دیتے۔ مگر یہ تو دو ہی آیتیں ہیں اس لئے ان کو کسی سورہ کے آخر میں لگا دو۔ غرض ان دونوں آیتوں کو محض حضرت عمرؓ کے اس حکم کے مطابق کرنے ہی سے خود زید بن ثابت نے سورۂ توبہ کے آخر میں بلا کسی مناسبت اور بغیر کسی دلیل کے اٹکل پچو لگا دیا تھا۔ مگر اس کے بعد پھر یہ آیتیں آخر سورہ توبہ کی آیتیں ہو گئیں۔ اس روایت میں ان کو آخر سورۂ توبہ کہا گیا۔ مگر ابن ابی داؤد کی اس روایت میں نہ خزیمہ کا نام ہے نہ ابوخزیمہ کا بلکہ حرث بن خزیمہ کا نام ہے کہ وہ تنہا یہ دو آیتیں لے کر خود آئے جو کسی دوسرے کے پاس لکھی ہوئی تھیں اور نہ کسی اور کو یاد تھیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے شہادت دی اور قسم کھائی کہ انہوں نے ان آیتوں کو رسول اللہ صلعم سے سنا ہے۔ غرض حرث بن خزیمہ اور حضرت عمرؓ دو گواہوں کی شہادت پر یہ دونوں آیتیں قرآن میں داخل کر دی گئیں۔ مگر ان کا محل و مقام کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ یونہی اٹکل پچو سورۂ توبہ کے آخر میں ان کو لگا دیا گیا۔ لیجئے نہ خزیمہ نہ ابوخزیمہ بلکہ حرث بن خزیمہ۔ نہ الّا الذی نہ الّا الذی بلکہ اقرأ باسم ربک الذی۔ بعض محدثین نے بات یوں بنانی چاہی کہ ابوخزیمہ ہی کا نام حرث تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ ابوخزیمہ بن اوس تھے اور یہاں حرث بن خزیمہ ہیں مگر تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ کتاب الاحکام والی حدیث میں فالحقتھما فی سورتھا کا اضافہ ہے۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ جب آخر سورۂ توبہ کو میں نے خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ پایا تو اس کو انہیں کے سورہ میں لگا دیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ زید بن ثابت کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ یہ ایک یا دو آیت جو خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملی ہے یہ آخر سورہ توبہ ہی کی ہے۔ اس لئے زید نے اس کو اس کی جگہ یا آخر سورۂ توبہ میں لگا دیا۔ اس بخاری والی حدیث کے سامنے اب وہ ابن ابی داؤد وغیرہ کی روایت کو کیونکر سچی روایت کی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ تین آیتیں ہوتیں تو ہم ان کو ایک سورہ بنا دیتے۔ مگر یہ تو دو ہی آیتیں ہیں اس لئے ان کو کسی سورہ کے آخر میں لگا دو کون ایمان دار ہے کہ بخاری کی حدیث میں فالحقتھما فی سورتھا دیکھنے کے بعد ابن ابی داؤد وغیرہ کی اس روایت کو جھوٹی اور منافقوں کی من گھڑت نہ کہے گا؟ مگر داد دیجئے محدثین کی روایت پرستی کی کہ ان کے نزدیک یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ کتاب الاحکام والی حدیث وہی ہے جس کا ذکر کتاب التفسیر میں بسلسلہ تصریح متابعات امام بخاری نے درج فرمایا ہے۔ وہاں ابوثابت کی جو روایت ابراہیم بن سعد سے ہے اس میں خزیمہ یا ابوخزیمہ شک کے ساتھ لکھتے ہوئے ان کے پاس صرف خاتمۂ توبہ...

ایک شریر گر ذہین لڑکے کے پڑھانے کے لئے ایک مولوی صاحب مقرر ہوئے۔ لڑکے نے باپ سے کہا کہ ہم مولوی صاحب کا امتحان لیں گے اگر وہ پاس کر گئے جب تو ان سے پڑھیں گے ورنہ انھیں کو ہم سے پڑھنا ہوگا۔ باپ نے ہنس کر کہا کہ اچھا مولوی صاحب سے کچھ پوچھو۔ لڑکے نے پوچھا کہ بتلائے الّا الذی صحیح ہے یا الّا الذی؟ مولوی صاحب نے کہا کہ الّا الذی صحیح۔ لڑکے نے کہا کہ غلط ہے نہ الّا الذی نہ الّا الذی بلکہ قرآن میں ہے اِقرأ باسم ربک الذی اسی واقعہ کے بعد سے مشہور ہے کہ الّا الذی نہ الّا الذی یعنی ایسی بات جس کے دو ہی پہلو عقلاً نکلتے ہوں اور ان میں سے ایک صحیح ہو مگر کوئی اس کے دونوں پہلوؤں سے انکار کر دیتا ہے کہ الّا الذی نہ الّا الذی" یعنی دونوں غلط ہیں تم دونوں کے ماننے سے انکار کرتے ہو۔ ۱۲ منہ غفرلہ

والی ایک ہی آیت کے پائے جانے کا ذکر ہے اور اسی نے یہاں کتاب الاحکام میں، اس حدیث میں فالحقتھا فی سورتھا ضمیرِ واحد اور مونث کے ساتھ آیا ہے تاکہ ایک آیت کی طرف پھرے۔ اگر ابوثابت ابراہیم بن سعد سے خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ دو آیتوں کے پائے جانے کی واقعی روایت کرتے تو واحد کی ضمیر کے عوض تثنیہ کی ضمیر لاتے اور فالحقتھما فی سورتھما روایت کرتے۔ اسلئے صاف پتا چل رہا ہے کہ اس حدیث میں متابعت کے مطابق آخر سورۂ توبہ کی صرف ایک ہی آیت مذکور تھی مگر یاران طریقت نے باب جمع القرآن و کتاب التفسیر سے اختلاف مٹانے کے لئے یہاں دونوں آیتیں لکھ ڈالیں یہ اس کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ صحیح بخاری میں بعد کو لوگوں نے روایتوں میں گھٹاؤ بڑھاؤ کیا ہے۔ اتنے واضح اور روشن ثبوت کے بعد بھی بخاری کو اصح الکتب کہنا اور اس کے ہر لفظ کو قطعی الصحت سمجھنا درحقیقت دین و ملت پر ظلم ہے اور قرآن مجید کے ساتھ کھلا ہوا شرک۔

تعجب اور سخت تعجب

ایک اور تعجب کی بات یہ بھی ہے کہ نقل مصاحف بعہد عثمانی کی حدیث میں آخر میں یہ کہا گیا کہ حضرت عثمانؓ نے چند مصاحف لکھوا لینے کے بعد اس کے علاوہ جو مصاحف لوگوں کے پاس تھے ان سب کو جلا دینے کا حکم دیا۔ مگر یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر نے جب زید بن ثابت سے لکڑیوں پتوں چھالوں اور ٹھیکریوں پر نقل کرا کر کے صحیفے مرتب کرلئے تو پھر ان ٹھیکریوں پتوں چھالوں اور لکڑیوں کو کیا کیا؟ سب کو جلا ڈالا یا کہیں دفن کر دیا یا جو شخص جو چیز لایا تھا اس کو واپس کر دیا۔ اگر ماسوا کا ضائع کر دینا ضروری تھا تو سب سے پہلے صحف صدیقی کے مرتب ہو جانے کے بعد ماسوا کو ضائع کر دینا تھا۔ کہ اب آیات و سُوَر کی ایک ترتیب ان صحیفوں میں قایم ہو گئی۔ اور ان چیزوں پر غیر مرتب آیات و سور لکھے ہوئے تھے۔ اس لئے ان چیزوں کی وجہ سے تو سخت اختلاف کا خطرہ تھا اسلئے ان سبھوں کا تو ضائع کر دینا سب سے پہلے ضروری تھا۔ ورنہ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آخر وہ کیا ہوئے؟ اور پھر مقام تعجب یہ ہے کہ یہ اہم سوال کہ جمع صدیقی کے بعد پھر وہ ہڈی، ٹھیکری، پتے چھال، کھال وغیرہ کیا ہو گئے؟ اسکو نہ زہری نے عبید بن السباق سے پوچھا نہ عبید نے زید بن ثابت سے اور نہ زہری سے زہری کے تلامذہ نے اور نہ جناب امام بخاری نے اپنے شیوخ سے کبھی پوچھا اور نہ آج تک کسی محدث نے اس کا کھوج لگایا۔

نفسیاتِ مطہرہ صحابہؓ کا سفاکانہ قتلِ عام

یہ روایت ایسی ظالمانہ ہے کہ اس کے بنانے والے نے محدثین کی روایت پرستانہ نفسیات کا اس قدر گہرا مطالعہ کیا تھا کہ اس روایت کو وضع کر کے محدثین سے اس کو ان کے جذبہ روایت پرستی کے ماتحت سند مقبولیت دلوا کر سارے صحابہ کرامؓ خصوصاً مہاجرینؓ و انصارؓ و ازواج مطہراتؓ سب کی نفسیات طاہرہ کا نہایت بیدردی سے قتل عام کر دیا۔

باللہ العظیم جس وقت آخر سورۂ توبہ کی یہ دو آیتیں اتری ہونگی لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ الخ صحابہ کا بچہ بچہ اور ننھی ننھی لڑکیاں اس آیت کو پڑھتی ہونگی اور خدا جانے کس والہانہ وفدیانہ جوش محبت میں جھومتی اور پڑھ پڑھ کر وجد کرتی رہتی ہونگی۔ اس وقت کون سا انسان ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہو اور اس آیت کے نزول کے بعد اس آیت کا ایک ایک حرف اس کے دل میں نگینے کی طرح جاگزیں نہ ہو گیا ہو۔ یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلعم مامور تھے ہر وحی کو لوگوں تک پہنچا دینے پر۔ اس لئے جس وقت یہ آیتیں اتری تھیں آپ نے ضرور ان کو تمام صحابہؓ تک پہنچا دیا۔ اور حسب معمول و حسب الحکم حاضرین نے غائبین تک پہنچا دیا۔ اور اس آیت کے ہر ہر حرف میں جو مقناطیسی کشش ہے میں کہہ چکا۔ بس ایک بار سن لینے کے بعد کون ہوگا جس کو یہ آیتیں یاد نہ ہو گئی ہونگی۔ ایسی آیت کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ بجز خزیمہ یا ابوخزیمہ یا حرث بن خزیمہ کے اور کسی کے پاس نہ ملیں، جس سے یہ ثابت ہو کہ اگر خزیمہ یا ابوخزیمہ یا حرث کے پاس کوئی ٹھیکری یا تختی جس پر یہ آیتیں لکھی تھیں نہ ملتی یا وہ لے کر نہ آتے تو کسی کو یہ آیتیں یاد بھی نہ آتیں، صحابہؓ کی اس والہانہ شیفتگی اور فدویانہ گرویدگی کا جو ان کو رسول اللہ صلعم کے ساتھ تھی کیسی بے رحمانہ خون ریزی ہے۔ اے اللہ! جھوٹی حدیثیں بنانے والے منافقین سے تو سمجھ!!

ؔ (ترجمہ) تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے تمہاری تکلیف جس پر سخت گراں ہے یعنی وہ تمہیں تکلیف اور مصیبت میں دیکھ نہیں سکتا۔ جس کو تمہاری بھلائی کا ہوکا ہے۔ ایمان والوں کے لئے نہایت شفیق اور مہربان۔ افسوس کہ ترجمے میں وہ مقناطیسی اثر کسی طرح نہیں لایا جا سکتا جو ان عربی اور خاص خداوندی الفاظ میں ہے۔ ۱۲ منہ

اب اس حدیث کا آخری فقرہ بھی سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ زید بن ثابتؓ نے یوں دو چار گھنٹے نہ سہی، دو چار دن یا ہفتے یا چند مہینے ہی سہی اکیلے پورا قرآن جمع کر ڈالا۹ - اور اپنے ہی سے جس طرح مناسب سمجھا آیتوں کی ترتیب قائم کر لی۔ اس لئے کہ ٹھیکریوں تختیوں وغیرہ پر نمبر دیئے ہوئے تو تھے نہیں کہ اس کے مطابق ترتیب آیات قائم کر لی جاتی۔ کتنی آیتیں جو بعض خاص خاص لوگوں کو یاد تھیں۔ وہ ان لوگوں کے جنگ یمامہ میں شہید ہو جانے سے ضائع ہو چکیں تو اب اگر وہ کہیں ہیں تو انہیں ٹھیکریوں اور تختیوں ہی پر ہیں جس میں آگے پیچھے کی کوئی علامت نہیں۔ تو اب ترتیب آیات بھی کتنی جگہ زید بن ثابتؓ کو ہی بطور خود صرف اپنی ہی سمجھ پر اعتماد کر کے کرنا پڑی۔ اتنی بڑی ذمہ داری میں کوئی اور تو شریک کار ان کو دیا نہیں گیا تھا۔ اور نہ یہ کہا گیا تھا کہ دوسرے معتبر لوگوں سے مشورہ لے کر کام کرنا۔ حضرت عثمانؓ کو محض نقل مصاحف کے وقت یہ خیال

حضرت عثمانؓ نے لغت قریش کا خیال کیا مگر حضرت ابوبکرؓ نے کچھ خیال نہ کیا

ہوا کہ زید بن ثابتؓ غیر قریشی ہیں اور قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے، اس لئے صرف ایک لکھی ہوئی کتاب اور خود زید بن ثابت ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب کے نقل کرنے میں یہ احتیاط برتی کہ تین تین قریشیوں کو ان پر متعین کیا کہ اگر تم لوگوں میں اور زید بن ثابت میں اختلاف ہو تو زید کی بات نہ ماننا، قریش کی زبان و رسم خط اختیار کرنا۔ مگر بالکل آغاز کار میں انہیں صحیفوں کی جمع و تالیف کے موقع پر جن کی صرف نقل کرنے میں یہ احتیاط برتی گئی تھی، فقط زید بن ثابتؓ پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں ہی نے پورا بھروسہ کر لیا۔ اور اس کا کچھ خیال نہ کیا کہ یہ غیر قریشی ہیں اور قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے یہ پورے قرآن کو غیر قریشی زبان اور غیر قریشی رسم خط میں لکھ کر غیر قریشی بنا دینگے۔

حضرت ابوبکرؓ نے صحیفے لکھوائے وہ ان کی ذاتی ملکیت تھے یا بیت المال کی ملکیت؟

بہرحال زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ "وہ صحف جو تیار و مرتب ہوئے وہ حضرت ابوبکرؓ کی زندگی تک تو انہیں کے پاس رہے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہنے لگے اور ان کی حیات تک رہے۔ ان کے بعد امّ المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہنے لگے"۔

سوال یہ ہے کہ یہ صحیفے جو حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے زید بن ثابتؓ نے مرتب کئے اگر حضرت ابوبکرؓ کی ذاتی ملک ہو گئے تھے تو ان کے بعد ان کے ورثہ کو ملنا تھے۔ اور اگر بحیثیت خلیفہ کے انہوں نے اس کام کو انجام دلوایا تھا تو صحیفے بیت المال میں رہتے، مگر نہیں رہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے نزع کے وقت حضرت عائشہؓ سے فرمایا تھا کہ "اے بیٹی میں خلیفہ بنایا گیا، میں نے بیت المال سے روپیہ نہیں لیا، مگر بقدر موٹا کھانے موٹا پہننے کے، اور اب میرے پاس بیت المال کا سوا اس ایک غلام حبشی کے اور پانی پلانے یا کھینچنے والی اس اونٹنی اور اس ایک پرانی چادر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میرے بعد ان سب کو عمرؓ کے پاس بھیج دینا۔" اگر زید بن ثابت کے جمع کردہ صحیفے بھی ہوتے تو ان صحیفوں کا ذکر بھی اس وصیت میں ضرور ہوتا۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد صحیفے حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو پھر حضرت عمرؓ کے بعد یہ صحیفے حضرت حفصہؓ کے پاس کیوں چلے گئے؟ ان کو تو حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے پاس رہنا تھا۔ اگر حضرت حفصہؓ نے مستعار مانگ بھیجا تھا تو ان کو پھر واپس کرنا تھا، یا حضرت عثمانؓ کو بیت المال کی چیز حاصل کر لینا تھی، نقل مصاحف کے وقت مستعار نہ مانگنا تھا اور جب منگوا لیا تھا تو نقل کے بعد واپس نہ کرنا تھا۔ صاف کہدینا تھا کہ یہ صحیفے بیت المال کے ہیں، بیت المال سے بلا وجہ باہر نہیں رہ سکتے۔

یہی زبردست گرہ اس حدیث میں ہے جس کے کھولنے کی کوئی کوئی شارح حدیث ہمت نہیں کرتا اور اس بھاری پتھر کو سب نے آہستہ سے چوم کر چھوڑ دیا۔

---

۹ جنگ یمامہ ۱۱ھ کے اوائل میں ہوئی تھی۔ جمع قرآن کا واقعہ کو صحیح مان لیجئے، تو ۱۱ھ کے اواخر میں مانا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ جنگ یمامہ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ اور آپ کو اطمینان نہیں ہو گیا تھا بلکہ اہل بحرین، مرقد بن حطم و یمن و حضرموت وغیرہ سے نپٹنا ابھی باقی تھا، حضرت خالدؓ یمامہ وغیرہ سے فارغ ہو کر ۱۲ھ میں مدینہ پہنچے ہیں (آغاز جلد چہارم) اور جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ ہڈی ٹھیکری وغیرہ سے قرآن کے اجزاء کو مرتب کرنا زید بن ثابتؓ کا کتنے دنوں میں ہو سکتا ہے؟ کس کس کے پاس کیا کیا لکھا ہوا ہے کس کو کتنا یاد ہے ان سب کا ایک ایک صحابی سے پوچھنا کیا کھیل ہے کہ چند دن کیا اگر سال دو سال میں بھی تنہا کسی صحابی سے بخیر انجام پا سکتا ہے؟ غرض اس سات آٹھ ماہ کی مدت میں سے چند ماہ ایسے بھی رکھئے جن میں زید کے ترتیب دیئے ہوئے نہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رکھے رہے ہوں تو مطلب یہ ہوا کہ زید نے تین چار ماہ میں پورا کام جمع قرآن کا انجام دیدیا۔ ۱۲منہ ——— ۵ تاریخ الخلفاء بحوالۂ ...

غریب ابوجعفر ابن جریر طبری نے اس دشواری کو محسوس کیا۔ اس لئے انھوں نے اپنی تفسیر کے آغاز میں جو بحث جمع قرآن کی کی ہے، اور اس میں حدیثیں جمع کی ہیں۔ ان میں یوں بات بنائی کہ قرآن رسول اللہ صلعم کے وقت تک کسی چیز پر لکھا ہوا نہ تھا۔ صرف لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ حضرت ابوبکر نے زید سے ہڈی چھال کھال وغیرہ پر لکھوایا اور پھر حضرت عمر نے اس کو زید ہی سے ان ہڈیوں چھالوں کھالوں سے صحیفوں میں لکھوایا تو وہ صحیفے حضرت عمر نے لکھوائے تھے اسلئے حضرت عمر کے بعد ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ کے پاس رہنے لگے۔ غریب ابن جریر نے جو بخاری والی روایت سے بہتر طریقے سے ایسی صاف بات بنائی جس سے وہ کانٹا بالکل نکل جاتا ہے۔ مگر محدثین و مورخین کو خلش خار ہی پسند ہے اسکو کیا کیا جائے کہ سب کے سب صحیح بخاری والی روایت پر ایمان لائے ہوئے ہیں جو ایک خارزار سے کم نہیں۔ اور غریب ابن جریر نے جو کانٹوں کو کاٹ چھانٹ کر ایک لہلہاتا گلشن پیش کیا ہے۔ اسکی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔

صحف نبویؐ یا صحف حفصہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب بھی آپؐ پر وحی آتی تھی تو آپؐ کاتبین وحی میں سے کسی حاضر موجود کاتب کو نازل شدہ آیات و سُوَر کے لکھ لینے کا حکم فرماتے تھے اور وہ آیتیں یا سورتیں کچھ اوراق پر لکھی جاتی تھیں۔ جب چند اوراق پر ایک سورہ مرتب ہوگیا تو وہ ایک صحیفہ ہوگیا۔ چھوٹی چھوٹی متعدد سورتیں ایک صحیفے میں درج کرلی گئیں اسی طرح متعدد صحیفوں میں پورا قرآن عہد نبوی میں مرتب ہو چکا تھا البتہ دوسرے حاضر الوقت صحابہؓ اپنے یاد کرلینے کے لئے وقتی طور سے کسی دوسری چیز پر بھی لکھ لیا کرتے ہوں یہ ممکن ہے۔ مختصر یہ کہ آنحضرت صلعم جو نازل شدہ آیات و سُوَر لکھواتے تھے وہ ہرن کی جھلی کے اوراق پر ہی لکھواتے تھے اور اس مجموعہ کو آنحضرت صلعم ہجرت کے قبل تک زمانہ قیام مکہ خود اپنی حفاظت میں رکھتے تھے۔ ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں مسجد نبوی کے ستون سے لگا کر اس مصحف کو ایک صندوق میں مقفل رکھا جاتا تھا تاکہ حفظ کرنے والے اپنے شبہوں کو اس کو دیکھ کر رفع کرلیں اور نقل کرنے والے نقل کرسکیں اسی لئے اس ستون کا نام ہی "اسطوانۃ المصحف" پڑ گیا۔ مگر جب مدینہ طیبہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں تو پھر یہ مصحف ان کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کے خیال سے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس آنحضرت صلعم رکھوانے لگے۔ کیونکہ وہ ازواج مطہراتؓ میں سب سے زیادہ لکھی پڑھی تھیں ان کو شفا بنت عبداللہ بن عبد شمس بن خلف نے کتابت کی تعلیم دی تھی جیساکہ ابوداؤد کی ایک حدیث ج ۲ ص ۱۸۶ کتاب الطب باب الرقی اور تہذیب التہذیب ج ۱۲، ص ۴۲۸ سے ظاہر ہے۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ مرد ہی نہیں عورتوں میں بھی لکھنے پڑھنے کا عرب میں رواج موجود تھا۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ حضرت شفاء سے کتابت سیکھنے کے بعد حضرت حفصہ نے دوسری ازواج مطہرات کو بھی کتابت کی تعلیم دے دی ہو۔ ورنہ حضرت شفاء ہی نے دوسری ازواج مطہرات کو حضرت حفصہؓ کے بعد کتابت کی تعلیم دی ہوگی۔ کیونکہ جب طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ خود رسول اللہ صلعم فرماتے تھے تو ناممکن ہے کہ اپنی ازواج مطہرات کو تعلیم نہ دلوائی ہو۔ اور تعلیم کا دار و مدار لکھنے پڑھنے پر ہے۔ قرآن مجید میں ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ اس لئے تعلیم بغیر کتابت کی تعلیم کے کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں حضرت حفصہ کی تعلیم کتابت کا ذکر ضمناً ہی حصر کے ساتھ نہیں اس لیے یقیناً آنحضرت صلعم نے حضرت حفصہ کو کتابت کی تعلیم دلوائی تو دوسری ازواج مطہرات کو بھی ضرور دلوائی۔ مگر زیادہ قوی گمان یہی ہے کہ حضرت حفصہؓ ہی نے دوسری ازواج کو تعلیم دی ان کی مہارت چونکہ دوسروں سے زیادہ تھی۔ اس لئے صحیفہ نبوی کی امین یہی بنائی گئیں۔ رسول اللہ صلعم نے چونکہ اپنی حیات مبارک ہی میں حضرت حفصہ کو اس قرآن کا (جس کا نام آپ نے امام رکھا تھا اور اس کو اُم بھی کہا جاتا تھا) امین بنایا تھا اس لئے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد بھی وہ "مصحف امام"، حضرت حفصہؓ کی زندگی تک حضرت حفصہ ہی کے پاس رہا خلفائے راشدینؓ نے یہ مناسب نہ سمجھے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد امانت "مصحف امام"، کا یہ منصب اب حضرت حفصہ سے اپنی طرف منتقل کرلیا جائے۔ تو حضرت حفصہؓ کے پاس وہی مصحف تھا جو کاتبین وحی سے نزول آیات کے وقت رسول اللہ صلعم کے سامنے لکھوایا جاتا تھا۔ اس نسخہ مصحف کے اس شرف کو لوگوں کے ذہنوں سے نسیاً منسیا کر دینے کے لئے جمع قرآن بعہد صدیق اکبرؓ کا ایک فرضی واقعہ گھڑا گیا اور اس کی ایک محض جھوٹی روایت بنا کر حضرت زید بن ثابتؓ کی طرف منسوب کرکے عبید بن السباق کے ذریعے زہری تک پہنچا دی گئی۔ زہری نے اس کو خدا جانے اپنے کن کن شاگردوں کے سامنے پیش کیا۔ مگر زہری کے سیکڑوں شاگردوں میں سے صرف چار نے اس روایت کو

کو قبول کیا۔ شعیب بن ابی حمزۃ الحمصی تو زہری کے کاتب یعنی پرائیوٹ سکریٹری تھے اس کی روایت سے کس طرح انکار کرسکتے تھے۔ ان کے علاوہ ابراہیم بن سعد جو زہری کے انتقال کے وقت تقریباً پندرہ برس کے تھے خدا جانے بالغ بھی ہوئے تھے یا نہیں اس کے سننے کے وقت تو اور بھی کم سن ہونگے اس لئے ان کو عام طور سے زہری کی حدیثوں میں کمزور شیخ سمجھا جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے زہری کو شاید دیکھا بھی نہ ہو اس لئے کہ ایلہ میں رہتے تھے جو مصر کے قریب ایک موضع تھا اور ابراہیم مدینہ طیبہ میں رہتے تھے اپنی کم سنی کی وجہ سے زہری کی زندگی میں ایلہ گئے بھی نہ ہونگے البتہ شیعوں کے یہاں یہ ثقہ اور حجۃ ہیں۔ اور یونس بن یزید جو زہری کے ہم وطن یعنی ایلہ کے رہنے اور زہری سے منکر حدیثیں روایت کرنے میں خاص طور سے مشہور ہیں جن کو ابن سعد نے لا یحتج بہ لکھا ہے اور عبدالرحمٰن بن خالد جو ابراہیم بن سعد کی طرح شیعوں کے نزدیک تو ثقہ ہیں مگر اہل سنت محدثین ان کو منکر الحدیث لکھتے ہیں۔ بس انھیں لوگوں نے اس حدیث کا پروپیگنڈا کیا۔ اگر اس حدیث کو صحیح بخاری میں جگہ نہ مل جاتی تو شاید ہی کوئی صاحب عقل ایسی خلاف عقل جھوٹی روایت کو قبول کرتا۔ چاہے امام بخاری نے خود محض حمایت حدیث کی مصلحت کے ماتحت اس روایت کو قبول کرلیا ہو چاہے امام بخاری کے کسی شاگرد نے یہ پورا "باب جمع القرآن" بنا کر ان کی کتاب میں ان کے بعد داخل کر کے پھر اسکے مختلف مقامات میں اس حدیث کو کسی آدمی کہیں پوری ٹھونس دی ہو ——— بہرحال صحیح بخاری میں جب یہ حدیث بعد والوں کو نظر آئی تو پھر بعد والے بخاری پرستوں پر اس کی حمایت فرض ہوگئی۔ اور ترمذی اور نسائی وغیرہ نے بھی اس کو اپنی کتاب میں درج کرلیا۔ اور مسند احمد کی تکمیل تو بہت بعد کو خاص منافقین کے ہاتھوں ہوئی ہی ہے۔ جیسا کہ میرے رسالے التاریخ المستند للمسند الامام احمد میں روز روشن کی طرح ثابت کردیا گیا ہے[2]۔ اس میں اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو تعجب ہوتا۔ امام مسلم ضرور اس حقیقت کو تاڑ گئے تھے، اسی لئے انھوں نے جمع قرآن کے مسئلے ہی کو نہیں چھیڑا۔

موطا امام مالکؒ میں جمع قرآن کی کوئی حدیث نہیں

امام مالک کو امام احمد بن حنبل زہری کے شاگردوں میں سب سے زیادہ قابل وثوق قرار دیتے ہیں غالباً اسی لئے زہری کی یہ ہمت نہ پڑی کہ ان کے سامنے جمع قرآن بعہد صدیقی ونقل مصاحف بعہد عثمانی اور سورہ توبہ وسورہ احزاب کی آیتوں والی حدیثیں پیش کرسکیں یا پیش کی بھی ہونگی تو انھوں نے ان موضوع حدیثوں کو یقیناً رد کردیا ہوگا۔ جب ہی تو مؤطا میں ان میں سے کوئی حدیث نہیں ہے۔ یا شاید مؤطا و مسلم میں بخاری کی طرح لوگوں کو اس حدیث کے داخل کرنے کا موقع نہ ملا۔

قرآن کی شہادت

کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے وقت میں قرآن کسی چیز پر بھی جمع نہیں کیا گیا تھا اور اگر لکھا بھی گیا تھا تو ٹھیکری تختی اور پتھر وغیرہ پر۔ مگر قرآن میں ہے رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ کیا ٹھیکریوں تختیوں اور پتھروں ہی کو صحف فرمایا گیا ہے؟ پھر قرآن پاک کو صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ بھی فرمایا۔ رسول اللہ صلعم نے سبع طوال یعنی سات پہلی بڑی بڑی سورتیں۔ اور مئین سو سو آیتوں کی سورتیں اور طوال مفصل وقصار مفصل یہ سب سورتوں کے مجموعے خود مرتب فرما کر اسی حساب سے قرآن کے متعدد صحیفے قرار دئے تھے۔ اسی لئے قرآن کے پورے مجموعے کے متعلق فرمایا گیا فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ اور پورے قرآن کو کُتُبٌ اور صُحُفٌ جمع کے صیغے سے تعبیر کیا گیا۔ اور ان صحف یعنی صحیفوں کے پورے مجموعے کو مصحف بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں مصحف[3] کا لفظ موجود ہے۔

---

[1] قال صالح جزرة حدیثہ عن الزہری لیس بذاک لانہ کان صغیراً حین سمع الزہری۔ یعنی ابراہیم بن سعد کی حدیث زہری سے کچھ بھی نہیں۔ چونکہ زہری سے سننے کے وقت کم سن تھے ۱۲ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۲۲ ترجمہ ابراہیم بن سعد)

[2] یہ رسالہ "رسالۃ البیان" امرتسر مورخہ ماہ اکتوبر و ماہ نومبر ۱۹۲۶ء کے دو پرچوں میں دو قسط کر کے چھپ کر شایع ہوچکا ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

[3] عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم ان مما یلحق الموتی من عملہ وحسناتہ بعد موتہ علماً علمہ ونشرہ۔ وولداً صالحاً ترکہ او مصحفاً ورثہ او مسجداً بناہ او بیتاً لابن السبیل بناہ او نہراً اجراہ او صدقۃ اخرجہا من مالہ فی صحتہ وحیاتہ تلحقہ من بعد موتہ۔ یعنی حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مرد مؤمن کے مرنے کے بعد اس کے اعمال وحسنات میں سے جو ایسے ہیں جن کے ثواب اس کو پہنچتے رہتے ہیں وہ اس کا علم ہے جس کی تعلیم اس نے دوسروں کو کی اور اس کو پھیلایا یا اولاد صالح ہیں جن کو وہ چھوڑ گیا۔ (باقی صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

سورتوں کے مختلف مجموعوں کی تقسیم اور ان کے نام

خالد الحذّاء ابو قلابہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تورات کی جگہ میں "سبع طوال" دیا گیا۔ اور زبور کے عوض مجھکو "مثانی"، ملے اور انجیل کے بدلے "مئین" میں دیا گیا۔ اور مفصل مجھکو فاضل ملے۔ اور واثلہ بن الاسقع سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ توراۃ کی جگہ مجھکو "سبع طوال" ملے۔ زبور کے بدلے "مئین" اور انجیل کے عوض "مثانی"، اور مفصل مجھکو فاضل ملے۔ (معانی القرآن ابو جعفر طبری ص)

"سبع طوال"، سورۂ فاتحہ کے بعد سات بڑی سورتوں کو کہا گیا۔ یعنی بقرہ، آل عمران، نسآء، مائدہ، انعام، اعراف اور انفال۔ "مثانی"، کے بارے میں محدثین، شراح حدیث و اہل لغت لکھتے ہیں کہ وہ سورتیں جن میں سو سے کم آیتیں ہوں مگر "مفصل"، سے بڑی ہوں۔ مگر ان کو مثانی کیوں کہتے ہیں اس پر پوری طرح کسی نے روشنی نہیں ڈالی جو وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں وہ دل کو لگتی نہیں۔ میرے نزدیک ایک وجہ ان کے مثانی کہنے کی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلعم بعض سورتوں کو نمازوں میں اس طرح پڑھتے تھے کہ ہر رکعت میں دو دو سورتیں۔ سنن ابو داؤد میں بیس سورتوں کے نام درج کئے ہیں۔ یہ روایت اگرچہ کوفے کے ٹکسال میں گھڑی گئی ہے اور سورتوں کی متواتر ترتیب کے خلاف مقدم و موخر کر کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ ترتیب عبداللہ بن مسعود کے مصحف کی ہے۔ اور کوفیوں ہی نے تمام اختلافات قرارت اور عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کے مختلف مصاحف کا ڈھونگ رچایا ہے اس لئے زیادہ گمان اس روایت کے موضوع ہی ہونے کا ہے۔ مگر موضوع روایت بھی عموماً کسی بنیاد ہی پر بنائی جاتی ہے۔ اس لئے اتنا پتا اس سے ملا کہ رسول اللہ صلعم اکثر یا کبھی کبھی ہر رکعت میں دو دو سورتیں پڑھتے تھے سورہ نجم سے عم یتساءلون تک کو اور ممکن ہے ابو داؤد میں صرف بیس ہی سورتوں کا ذکر ہے اور یوں بیس سورتیں ہوتی ہیں۔ اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ آپ اس کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ جس سورہ کے بعد جو سورہ ہو وہی پڑھا جائے۔ یا مقدم و موخر کا لحاظ نہیں فرماتے تھے یا اس وقت تک ترتیب تقدیم و تاخیر کا لحاظ ضروری نہ تھا اس سے ایک مستقل ترتیب قرآن کی قائم کر لینا صحیح نہیں۔ قرآن کی ترتیب وہی صحیح ہے جو رسول اللہ صلعم کے حکم سے آپ کے سامنے قائم ہوئی اور ہر صحابی کے گھر میں اسی ترتیب کے مطابق قرآن مصحف کی صورت میں مرتب و مدوّن رہا کرتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود یا حضرت ابی بن کعب کیوں تمام صحابہ سے اختلاف کر کے ایک نئی ترتیب سے قرآن مرتب کرتے، یہ سب کوفیوں کے اتہامات ہیں جس پر مفصل بحث میری کتاب اعجاز القرآن میں ان شاء اللہ آئیگی۔ واللہ الموفق وعلیہ التکلان۔

"مئین"، ان سورتوں کو کہتے ہیں۔ جن میں کم و بیش سو آیتیں ہوں۔ "مفصل"، چھوٹی سورتوں کو کہتے ہیں۔ مفصل کی بھی تقسیم ہے "طوال مفصل" یعنی چھوٹی سورتوں میں بڑی ہیں۔ "اوساط مفصل"، جو نہ بڑی ہیں نہ چھوٹی اور "قصار مفصل" آخر قرآن کی چھوٹی سورتیں۔

طوال مفصل کو بعضوں نے حجرات سے بعضوں نے سورہ قاف سے بعضوں نے سورہ فتح سے، اور منیہ میں ہے کہ سورہ محمد سے سورہ بروج تک طوال اور سورہ بروج سے لم یکن الذین کفروا تک اوساط اور اس کے بعد سے آخر تک قصار،

یا مصحف ہے جس کو اس نے میراث میں چھوڑا یا مسجد ہے جو اس نے بنائی یا مسافر خانہ ہے جو اس نے بنایا یا نہر ہے جس کو اس نے جاری کیا یا صدقۂ جاریہ ہے جس کو اس نے اپنی صحت و حیات میں اپنے مال سے نکالا۔ ان سب کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی برابر پہنچتا رہے گا۔ اس حدیث کو مشکوۃ کتاب العلم فصل ۳ صفحہ ۲۸ میں نقل کیا ہے ابن ماجہ اور شعب الایمان بیہقی سے عن ابی سعید قال قال صلعم اعطوا اعینکم حظها من العبادۃ النظر فی المصحف والتفکر فیہ والاعتبار من عجائبہ الحکیمۃ یعنی ابو سعید خدری رض روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اپنی آنکھوں کا جو حصہ عبادت میں ہے وہ ان کا دا کرو یعنی مصحف پر نگاہ ڈالنا اور اس میں غور کرنا اور اس کے پر حکمت عجائبات سے عبرت حاصل کرنا۔ بیہقی نے اس کو شعب الایمان میں لکھا ہے مختصر کنز العمال ج ص ۳۵ عن عثمان بن عبداللہ بن اوس الثقفی عن جدہ قال قال رسول اللہ صلعم قراءۃ الرجل القرآن فی غیر المصحف الف درجۃ وقراءتہ فی المصحف تضعف علی الفی درجۃ۔ یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قرآن کو غیر مصحف میں زبانی پڑھنا ایکہزار درجہ ثواب کا رکھتا ہے اور مصحف میں دیکھکر پڑھنا مضاعف ہو کر دو ہزار گونہ درجہ کا ثواب رکھتا ہے۔ (مشکوۃ باب فضائل القرآن ص ۱۸۰) غرض مصحف کا وجود ہی عہد نبوی میں نہ تھا تو پھر ان حدیثوں میں مصحف کا ذکر کہاں سے آیا؟ اور وراثت میں کوئی مصحف کس طرح چھوڑتا۔ کوئی دیکھ دیکھ کر کسی چیز کو پڑھتا رہا۔ ۱۲ منہ غفرلہ

مگر اس طرح "بحرو بشانی" کے بارے میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ سورہ فاطر سے حجرات تک مثانی سمجھئے اعراف کے بعد سے سورہ فتح تک مئین اور سورہ قاف سے آخر تک مفصل واللہ اعلم بالصواب۔

بہرحال ان روایتوں کے ماننے والوں کو یہ تو بہرحال ماننا پڑیگا کہ سورتیں سب کی سب عہد نبوی میں مرتب ہو چکی تھیں اور ہر سورہ کا نام خود حضور نے رکھا تھا اور برابر نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ کیا کوئی سچا مسلمان ہے جو اس کا انکار کرے؟ اگر ہے تو ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ اگر سچے ہو تو میرے سامنے ثبوت پیش کرو۔

تحزیب القرآن (یعنی تلاوت روزانہ کے لئے قرآن کی مقدار تلاوت کی تعیین) رسول اللہ صلعم نے اپنے لئے روزانہ بطور ورد تلاوت قرآن کے لئے ایک مقدار مقرر فرمائی تھی۔ اور اس مقدار کو "حزب" کہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو وقت مقررہ پر پڑھنے کا موقع نہ ملا تو دوسرے وقت آپ نے اپنا حزب پورا کر لیا جب حجرے سے باہر تشریف لائے (ابو داؤد جلد ۱ صفحہ ۲۰۵) پھر اسی حدیث کے بعد اسی جگہ ابو داؤد میں ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت اوس بن حذیفہ الثقفی جن کو اوس بن ابی اوس بھی کہتے ہیں جو خود صحابی تھے اور مذکورہ بالا حدیث وہی رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہیں جس کا ایک ٹکڑا ہم نے ترجمہ کر کے اوپر نقل کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اصحاب رسول اللہ صلعم یعنی اکابر صحابہ سے پوچھا کیف تحزبون القرآن قرآن کا حزب آپ لوگ کس طرح مقرر کرتے ہیں؟ تو سبھوں نے کہا تین اور پانچ اور سات اور نو اور گیارہ اور تیرہ اور مفصل کا پورا ایک حزب۔ یعنی بقرہ آل عمران، اور نسا کا پہلا حزب۔ مائدہ، انعام، اعراف، انفال اور توبہ یعنی سورہ براءت کا دوسرا حزب۔ یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم حجر اور نحل کا تیسرا حزب۔ بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج، مومنون، نور اور فرقان کا چوتھا حزب۔ شعراء، نمل، قصص، عنکبوت روم، لقمان، سجدہ، احزاب، سبا، فاطر اور یٰسین کا پانچواں حزب۔ والصافات، صٓ، زمر، مومن، حٰم سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان جاثیہ، احقاف، محمد، فتح، اور حجرات کا چھٹا حزب اور سورہ قاف سے آخر تک ساتواں حزب انھیں ساتوں احزاب کو سات منزل کہتے ہیں اور پہلی منزل سورہ فاتحہ سے شروع کرتے ہیں "فمی بشوق" کے حساب سے تلاوت کو اسی لئے مسنون سمجھتے ہیں۔ یعنی ف سے فاتحہ، م سے مائدہ، ی سے یونس، ب سے بنی اسرائیل۔ ش سے شعراء، و سے والصافات اور ق سے سورہ قاف ہر منزل کی پہلی سورتوں کے پہلے حروف کے مجموعے سے "فمی بشوق" کا لفظ لوگوں نے بنا لیا ہے۔

جس سے یہ صرف معلوم ہو گیا کہ سورتوں کی تحدید ان کی تعیین، ان کی ترتیب اور ان کی گنتی جس طرح رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک سے چلی آرہی ہے اسی طرح آج تک بلا کم و کاست و بلا تقدیم و تاخیر ساری دنیائے اسلام میں ہر ملک ہر شہر ہر قریہ اور ہر دیہات میں بلکہ ہر مسلمان کے گھر میں کتابی صورت میں بغیر کسی اختلاف کے چلی آرہی ہے اور آج تک ہر مسلمان کی تلاوت میں ہے چاہے اب ایک منزل روزانہ کے پڑھنے والے کم ہی کیوں نہ ہوں مگر منزلیں انہیں سات احزاب کے مطابق آج تک لکھی ہوئی موجود ہیں اور قیامت تک موجود رہینگی۔

اس تحزیب کے حساب سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سورہ قاف سے آخر تک مفصل کا حساب ہے۔ ۱۲

کتابتِ وحی کی شہادت قرآنیہ کاتبین وحی جو کتابت قرآن کیا کرتے تھے کفار طعن سے کہتے تھے کہ یہ تو اگلوں کی داستانیں ہیں جن کو انھوں نے لکھوا لیا ہے اور صبح شام ان کے سامنے لکھا جاتا ہے وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ واصیلا (سورہ فرقان ع ۱ ج ۱۸) یہ آیت کتابت وحی کا ثبوت ثابت کرنے کے لئے نص قطعی ہے۔ املی علیہ کے معنی ہیں کہ کسی کے ڈکٹیشن کرانے سے زبانی بتلانے سے اس کے بتاتے ہوئے کو کسی نے لکھا۔

کاتبینِ وحیعہ سورہ عبس ج ۳۰ میں ہے کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝ یہ بیشک ایک نصیحت ہے قابل تکریم صحیفوں میں، برتر پاک سافروں (ماہرین فن الکتابت) کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی۔ جو بزرگ اور نیک کار ہیں۔

عہ۔ کاتبین وحی کی تعداد کتاب تراتیب الاداریہ کلتانی مطبوعہ مراکش جلد اول صفحہ ۱۱۶ میں ان سب کے اسمائے گرامی کے ساتھ بیالیس مذکور ہے۔ ۱۲۔ منہ

"سفارت" کے معنی اہل لغت "کتابت" کے لکھتے ہیں۔ مگر کتابت و سفارت میں ذرا فرق ہے۔ کتابت عام ہے۔ مگر سفارت اس کتابت کو کہتے ہیں جو حسنِ خط اور تنقیط، اصول املاء اور قواعد انشاء کے ساتھ ہو۔ تو فرمایا جاتا ہے کہ ان قرآنی صحیفوں کے کاتب محض کاتب ہی نہیں ہیں، بلکہ سافر ہیں یعنی خطاط بھی ہیں اور فن املاء و انشاء کے بھی ماہر ہیں۔ اس لئے ان سے نہ بدخطی ہو سکتی ہے نہ غلطی املاء و انشاء اور یہ کاتبین صحف قرآنیہ ہر خاص و عام کے نزدیک بزرگ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیک کار ہیں یعنی عند الناس و عند اللہ ہر جگہ معتمد علیہ اور ہر حیثیت سے قابل وثوق ہیں۔ کاتبین وحی کی ایسی صریح و واضح منقبت اور خاص قرآن مبین میں، بھلا یہ منافقین عجم کب دیکھ سکتے تھے اور شیعے تو اس کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ حضرت امیر المومنین معاویہ بھی کاتب وحی رہ چکے تھے۔ پس فوراً ایک حدیث بنا ڈالی کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ سفرۃ سے مراد یہاں فرشتے ہیں۔ امام بخاری کو اس کی تفسیر میں کوئی روایت تو نہ ملی مگر جو دوسرے مفسرین سُدی و کلبی جیسے وضاعین و کذابین کہتے تھے یہ بھی بغیر کوئی روایت نقل کئے لکھ گئے اور لکھا تو کیا لکھا کہ سَفَرَۃٌ کے معنی اَصْلَحْتُ بَیْنَھُمْ ہیں وَجُعِلَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ اِذَا نَزَلَتْ بِوَحْیِ اللّٰہِ وَتَادِیَتِہٖ کَالسَّفِیْرِ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ الْقَوْمِ یعنی فرشتے جب اللہ تعالیٰ کی وحی لے کر آتے تو ان کی حیثیت سفیر کی ہوئی جو قوم کے درمیان صلح کراتا ہے کس قدر یہ لغو تمثیل ہے صلح کسی جنگ اور مصالحت کسی فساد کے بعد ہوتی ہے۔ کیا نعوذ باللہ خدا اور رسول کے درمیان کوئی جنگ تھی کہ فرشتے خدا کی طرف سے پیغام صلح لیکر آتے تھے؟ حالانکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے خود سفارت کے معنی کتابت کے بتلائے ہیں اور سَفَرَۃٌ کا ترجمہ کَتَبَۃٌ ہی کیا ہے جو سافر کی جمع ہے اور کَتَبَۃٌ کاتب کی۔ جیسا کہ تمام مفسرین متقدمین و متاخرین سب لکھتے آئے ہیں۔ مگر یاران طریقت نے اس کے بعد یہ اضافہ کر دیا کہ مراد فرشتے ہیں جو لوح محفوظ سے کتاب اللہ نقل کیا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کہیں اس آیت سے اصل مطلب اور صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے اور وہ صحابہؓ جو کاتبین وحی تھے کہیں ان کی عظمت اس سے نہ معلوم ہو جائے۔ یہاں تو کوشش یہ کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلعم کو پہلے سے یہ ثابت ہی کیا گیا ہے کہ آپ تادم وفات اَن پڑھ ہی رہے۔ کاتبین وحی کے متعلق بھی جھوٹی جھوٹی روایتیں بنا بنا کر اگر ان میں سے بعض کو منافق یا مرتد یا غیر معتبر ثابت کر دیا گیا تو پھر یہ امکان باقی ہے گو کہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلعم نے لکھوایا ہو کچھ اور لکھنے والے نے لکھ دیا ہو کچھ اور اس طرح یہ قرآن اپنی صحت میں یقینی نہ رہے اسی ایک مقصد کے ماتحت بعض روایتیں بنا کر شائع کی گئیں چنانچہ مشکوٰۃ باب المعجزات ص ۵۳۲ میں ایک حدیث منقول ہے کہ "حضرت انسؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلعم کے لئے کتابت کرتا تھا تو وہ مرتد ہو گیا اسلام سے اور مشرکین سے جا ملا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اس کو زمین قبول نہیں کرے گی تو (حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ) مجھ کو ابوطلحہؓ نے خبر دی کہ وہ اسی سرزمین پر پہنچے جہاں وہ مرا تھا تو اس (کی لاش) کو باہر پھینکا ہوا پایا۔"

؎ سفارت و سفیر جو عرف عام میں مشہور ہے۔ یعنی حکومتوں کی طرف سے ایک دوسرے کے سفیر دوسرے ممالک میں رہا کرتے ہیں جو وہاں رہ کر اپنے ملک کی نمائندگی اور اپنے ملکی حقوق کی نگاہ بانی کرتے ہیں اور پھر وہاں کے حالات صحیح سے اپنے ملک کے بادشاہ، والیان دولت کو خبر کرتے رہتے ہیں تو یہ اصطلاح بھی اس معنی کے اعتبار سے قائم ہوئی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص جس ملک میں سفیر بنا کر بھیجا جاتا ہے اس کو اس ملک کی زبان رسم خط املاء و انشاء وغیرہ سے پوری واقفیت ہونی ضروری ہے۔ تو جو شخص جس ملک کا سفیر ہو سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس ملک کی زبان رسم خط اور اصول املاء و انشاء سے پوری طرح واقف ہے یہ سمجھنا کہ وہ دو ملکوں کے درمیان صلح و امن قائم کرتا ہے اس لئے اس کو سفیر کہتے ہیں۔ صحیح نہیں ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

؎ کتاب "النثر الفنی"، جلد اول ص میں اس کے مصنف ڈاکٹر زکی مبارک مصری نے لکھا ہے کہ وکان ابن فارس یری ان معرفة القدماء من الصحابة بالکتابة المصحف علی النحو الذی یعلله النحویون فی ذوات الواو والیاء والهمزة والمد والقصر تدل علی فهمهم لاصول اللغة وقواعد الکتابة۔ وهو علی الجملة یری ان العلوم العربية كانت معروفة قبل الاسلام۔ یعنی ابن فارس کو اس کا یقین ہے کہ صحابہ کو کتابت قرآن میں جو واقفیت تھی ان باتوں سے جن میں علمائے نحو فرق کرتے ہیں لغات واوی و یائی و مہموز اور مد و قصر وغیرہ میں اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اصول لغت اور قواعد کی کافی سمجھ رکھتے تھے۔ اور اس سے اس کا پتا ملتا ہے کہ علوم عربیہ اسلام کے قبل ہی سے ایک مدت تک لوگوں میں متعارف تھے۔

تو ابو طلحہؓ نے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ ہم لوگوں نے اس کو دفن تو کیا، مگر زمین اس کو قبول نہیں کرتی“۔ اول تو اس حدیث کا مضمون ہی اس کے موضوع ہونے کی شہادت دے رہا ہے، بالفرض اگر مان بھی لی جائے تو اس کاتب کا کاتب وحی ہونا کیوں تسلیم کر لیا گیا، ہو سکتا ہے کہ مراسلات وغیرہ کے سلسلے میں کتابت کا کام اس سے کبھی لیا گیا ہو۔ کیونکہ وحی کی ایسی اہم چیز کی کتابت کا کام رسول اللہ صلعم کبھی کسی غیر معتبر آدمی سے نہیں لے سکتے تھے۔

مذکورہ روایت کے بنانے والے نے اتنی سی گنجایش رکھی ہے کہ اس کاتب کو کاتب وحی نہ قرار دیا جا سکے۔ بلکہ عام مراسلات کا کاتب سمجھا جائے بعض منافقین نے تو ایسی ایسی حدیثیں بھی گھڑی ہیں جو خاص کاتب وحی سے متعلق ہیں اگرچہ وہ صحاح میں نہیں ہیں، مگر پھر حدیث کی کتابوں میں تو ہیں بہرحال مجھ کو اس بحث کو خواہ مخواہ طول دینا مقصود نہیں۔ جب وہ حدیثیں صحاح میں نہیں ہیں تو ان کے صحیح نہ ہونے کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اصحاب صحاح نے ان کو قابل اعتبار قرار نہیں دیا۔ مثلاً عبد اللہ بن ابی سرحؓ کے ارتداد کی روایت جس کو شیعوں نے گھڑا اور مشہور کیا حقیقت یہ ہے کہ ان کے ارتداد کی روایت محض کذب وافترا ہے میں نے رسالہ اعجاز القرآن میں اس پر مفصل بحث کی ہے جو زیر تصنیف ہے۔ بخاری میں ایک روایت جو ایک کاتب نصرانی کی منقول ہے کہ وہ کاتب نبوی تھا مرتد ہو کر نصرانی ہو گیا۔ اگرچہ وہ روایت بھی الحاقی ہے، مگر اس میں بھی اس کی تصریح نہیں ہے کہ وہ کتابت وحی کیا کرتا تھا۔ بلکہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو وہ ضرور اہل کتاب سے مراسلات لکھنے کیلئے مقرر کیا گیا ہوگا۔ مگر دراصل وہ روایت ہی صحیح نہیں۔

قرآن کے نزول اوّلی کا مقام اور کس چیز پر قرآن لکھا جاتا تھا

سورۂ طور کا آغاز پڑھئے۔ وَالطُّوْرِ ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ ”طور“ کے معنی پہاڑ ہیں۔ یہ جو بعضوں نے لکھ دیا ہے کہ جس پہاڑ پر حضرت موسیٰؑ کے لئے تجلی ہوئی تھی اسی پہاڑ کا نام طور تھا۔ یہ غلط ہے اس کو طُورِ سِینَآء کہتے ہیں یہ اضافت عام بسوئے خاص ہے جیسے کوہ ہمالیہ، ”وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ“ میں طور کے معنی عمومی ہی مراد ہیں نہ کہ طور سَینَاء غرض یہاں الطور پر الف لام عہد کا ہے اس سے مراد کوہ حراء ہے جو مکہ کا ایک پہاڑ ہے مشہور کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم قبل بعثت اس کے ایک غار میں یاد الٰہی کے لئے جایا کرتے تھے۔ بہرحال اسی پہاڑ پر پہلے پہل حضرت جبرئیلؑ آپ کے پاس کتاب اللہ لے کر تشریف لائے تھے اور کہا تھا اِقْرَأْ یعنی پڑھئے۔

۱؎۔ تفسیر فتح البیان جلد ۹ صفحہ ۲۶۵ میں بھی ہے کہ کتاب مسطور جو رق منشور پر لکھی ہوئی یہاں مذکور ہے اس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔ ۱۲ منہ

۲؎ و ۳؎۔ بخاری کا سب سے پہلا باب جو بسم اللہ کے بعد ہی شروع ہوا ہے اس مضمون کا ہے کہ کیف کان بدء الوحی الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعنی آغاز وحی کس طرح ہوا۔ اس باب کی تیسری حدیث محدثین کے مشہور استاد ابن شہاب زہری سے ہے جن کو وہ عروہ بن الزبیر سے اور وہ حضرت عائشہ صدیقہ سے حسب بیان زہری روایت کرتے ہیں۔ میں ترجمہ زہری میں تہذیب التہذیب کی عبارت اور دلائل سے ثابت کر چکا ہوں کہ ابن شہاب زہری کا سماع حدیث عروہ سے بلکہ لقاء بھی بعض سماع ثابت نہیں ہے، اور زہری کے آغاز کا جمع احادیث سے پہلے عُروہ کی وفات ہو چکی تھی۔ بہرحال روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلعم سچے خواب دیکھنے لگے جو بات کو دیکھتے دن کو وہ پورا اترتا۔ پھر خلوت پسندی مزاج میں آگئی۔ اور غار حرا میں خلوت نشینی کرنے لگے۔ اور راتوں کو عبادت کرتے، کئی رات گذار کر اپنے گھر آتے اور چند دنوں کے کھانے پینے کا سامان اپنے ساتھ لے جاتے، اور پھر کچھ دنوں کے بعد آتے اور حضرت خدیجہ کے پاس سے کچھ سامان لے جاتے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس حق[۴] آگیا درحالیکہ آپ غار حرا ہی میں تھے۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ کے پاس فرشتہ پہونچا اور اس نے کہا کہ اقرأ“ یعنی پڑھیے آپ نے کہا کہ ما انا بقارئ میں پڑھ سکنے والا نہیں ہوں یعنی پڑھنا نہیں جانتا۔ تو اس فرشتے نے آپ کو پکڑ کر خوب بھینچا۔ پھر چھوڑ دیا پھر کہا کہ اقرأ۔ پھر آپ نے کہا کہ ما انا بقارئ۔ پھر اس نے دوبارہ پکڑا اور بھینچا اور پھر چھوڑ دیا اور پھر کہا کہ اقرأ اور پھر آپ نے فرمایا ما انا بقارئ۔ پھر اس نے سہ بارہ پکڑ کر بھینچا پھر چھوڑ دیا (باقی بر صفحہ آئندہ)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۴؎۔ حق سے مراد وحی ہے قرآن کا ایک نام حق ہے لقد جاءک الحق من ربک (یونس) یا ایھا الناس قد جاءکم الحق من ربکم (یونس) آخر سورہ

قرآن مجید میں اسی پہاڑ کی اور اسی کتاب کی جو ستارہ قّ منشور پر لکھی جا رہی تھی اور بیت معمور یعنی خانہ کعبہ کی، پھر سقف مرفوع یعنی آسمانوں کی اور بحر مسجور یعنی سمندر کی قسمیں کھائی گئیں۔ یعنی ان کی شہادت پیش کی گئی ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور کہا کہ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۔ تو رسول اللہ صلعم اپنے کانپتے ہوا حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور فرمایا کہ مجکو اوڑھاؤ مجکو اڑھاؤ۔ یہاں تک کہ آپ سے وہ خوف کا اثر جاتا رہا۔ تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے پورا واقعہ بیان فرمایا۔ اور کہا کہ مجکو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم آپ کو اللہ کبھی رسوا نہیں کریگا۔ آپ صلۂ رحم کرتے ہیں لاوارثوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں پھر حضرت خدیجہ آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ اور عبرانی زبان میں کتاب لکھتے تھے اور انجیل میں سے کچھ عبرانی یا عربی میں لکھتے تھے اور بہت بوڑھے آنکھوں سے معذور تھے۔ تو ان سے حضرت خدیجہ نے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے تم اپنے بھتیجے سے (یعنی رسول اللہ صلعم سے) ان کا حال سنو۔ تو ورقہ آپ کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا کہ اے بھتیجے کیا حال ہے؟ تو رسول اللہ صلعم نے پورا حال کہہ سنایا۔ تو ورقہ نے کہا کہ یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ نے موسیٰ پر اتارا تھا کاش میں اس وقت جوان ہوتا کاش کہ میں اس وقت زندہ ہوتا جس وقت تمہیں تمہاری قوم گھر سے نکال دے گی۔ تو آپ نے پوچھا کیا وہ لوگ میرے نکالنے والے ہونگے؟ ورقہ نے کہا کہ ہاں۔ تمہارے جیسا کوئی نہیں آیا مگر اس سے عداوت کی گئی اگر تمہارا زمانہ مجھے ملا تو میں تمہاری مدد کرونگا۔ زبردست مدد سے۔ پھر کچھ ہی زمانے کے بعد ورقہ نے وفات پائی اور وحی موقوف ہوگئی۔ ابن شہاب نے کہا کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے مجھے خبر دی کہ جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا فَتْرَةُ الْوَحْي (وحی کے رکے رہنے کے زمانے) کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی حدیث میں۔ یعنی رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہوئے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ راہ چل رہا تھا کہ میں نے ایک آسمانی آواز سنی۔ تو اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو وہی فرشتہ مجکو نظر آیا جو کوہ حرا پر نظر آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا۔ تو میں اس سے مرعوب ہوگیا۔ تو گھر واپس پلٹا اور کہا کہ مجھکو اڑھاؤ مجکو اڑھاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۔ پھر سلسلۂ وحی شروع ہوگیا اور پے درپے وحی آنے لگی۔ زہری سے اس حدیث کو مختلف راویوں نے تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ راویت کیا ہے۔ مگر یہ پوری روایت زہری ہی سے ہے۔ البتہ صحاح سے باہر یہ روایت بعض دوسروں سے بھی ملتی ہے۔ اگر ان سب روایتوں کو یکجا کرکے غور کیا جائے تو بہت کافی اختلاف لفظ اور مفہوم کا ملیگا۔ دلائل النبوۃ میں بھی حافظ ابو نعیم الاصبہانی نے متعدد روایتیں آغاز وحی کی درج کی ہیں۔ جن میں ایسے اختلافات ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا کہ کون صحیح ہے کون غلط بہت مشکل ہے۔ جو صحیح معلوم ہوسکتی ہے اس کا عنوان بیان صحیح نہیں ہوتا اس حدیث کے متعلق ایک لمبی چوڑی بحث ہے۔ جسکو ہم نے اپنی کتاب اعجاز القرآن کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مگر اتنا ضروری ہے کہ یہ حدیث بہت مخدوش ہے۔ اس میں متعدد فتنے پوشیدہ ہیں۔ آخر زہری ہی کی روایت ہے خصوصاً ورقہ ابن نوفل کی داستان۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم جو فراست نبویہ کے مالک تھے، نبوت کے لئے منتخب کئے گئے۔ محض بھولے بھالے بچے تھے اور اتنی سمجھ بھی نہیں رکھتے تھے جتنی کہ حضرت خدیجہؓ عورت رکھتی تھیں معاذ اللہ من ذالک۔ اسلئے اس روایت میں بہت سارے اضافے ہیں جو منافقین عجم میں سے کسی کی طرف سے بڑھے۔ زہری نے درمیان کا ایک راوی چھوڑ بلا واسطہ عروہ بن الزبیر سے اسکی روایت کردی۔ بہرحال اب اس پر غور فرمائیے کہ حضرت جبرئیل نے جب کہا کہ اقرأ پڑھیے تو آپ نے جواب میں فرمایا مَا أَنَا بِقَارِئٍ میں پڑھ سکنے والا نہیں۔ یعنی پڑھنا نہیں جانتا۔ یہ جواب جبھی صحیح ہوسکتا ہے کہ حضرت جبرئیل نے آنحضرت کے سامنے کوئی لکھی ہوئی چیز۔ کوئی کتاب پیش کی ہو۔ ورنہ یہ جواب کبھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے قسطلانی بخاری کی اسی حدیث کی شرح میں مرسل عبید بن عمیر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا أَتَانِي جِبْرَائِيلُ بِنَمَطٍ مِنْ دِيبَاجٍ فِيهِ كِتَابٌ فَقَالَ اقْرَأْ ۔ قُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ ۔ جبرئیل میرے پاس ایک ریشمی رومال لائے جس میں ایک کتاب تھی، پھر کہا کہ پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ یعنی پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اگر اس ٹکڑے کو بھی بخاری کی روایت میں ملائیے تو مضمون واضح ہو جاتا ہے۔ ورنہ چالیس برس کے افصح العرب والعجم، فراست نبویہ کے مالک، نبوت و رسالت کے لئے جن کا انتخاب ہوا، ان سے اتنا نہیں ہوسکتا تھا کہ تین چھوٹی چھوٹی آیتیں جن کو جبرئیل ادا کر رہے تھے آپ بھی سن کر دہرا دیتے؟ اور جب جبرئیل صرف اسی قدر چاہتے تھے کہ جو وہ اپنی زبان سے کہہ رہے تھے اسکو رسول اللہ صلعم اپنی زبان سے دہرا دیتے، تو آپ مَا أَنَا بِقَارِئٍ نہیں فرماتے بلکہ مَاذَا أَقْرَأُ یا لِمَا أَقْرَأُ فرماتے۔ یعنی پوچھتے کہ میں کیا پڑھوں؟ یہ جواب کہ میں پڑھنا نہیں جانتا

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کوہِ حراء پر پہلے پہل شب قدر ماہِ رمضان میں پورے قرآن کا کتابی صورت میں آپؐ کے سامنے نزول ہوا، اس لئے اس پہاڑ کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ کتاب جس کو حضرت جبرئیل لائے تھے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ خانۂ کعبہ کی اہمیت روزِ روشن کی طرح ہے — پھر

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تو جبھی دیا جائیگا کہ کوئی لکھی ہوئی چیز پیش کی جائے جیسا کہ عبید بن عمیر کی روایت میں ہے۔ غیر صحاح کی روایتوں میں اسکو درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ما انا بقارئ کی جگہ ابو الاسود نے اپنے مغازی میں کَیْفَ اَقْرَأُ کا لفظ رکھا ہے یعنی کیسے پڑھوں؟ مگر یہاں بھی وہ کسر موجود ہے اور ابن اسحٰق نے موقع کی نزاکت سمجھ کر ماذا اقرأ ہی لکھا ہے۔ مگر حضرت جبرئیل کو اِن آیتوں کو اپنی زبان سے ادا کر دینا تھا، نہ کہ تین تین بار بھینچنا تھا۔ بار بار جبرئیل کا پکڑ پکڑ کر بھینچنا صاف بتا رہا ہے کہ اس کے اثر سے کوئی غیر معمولی بات رسول اللہ صلعم میں پیدا ہوئی۔ ورنہ صرف سن کر چھوٹی چھوٹی آیتوں کو دہرانے کے لئے بار بار پکڑ پکڑ کر بھینچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبید بن مرسل کی روایت گو مرسل ہے مگر صحیح ہے۔ اور حضرت جبرئیل ایک کتاب ہی لائے اور آنحضرت صلعم کے سامنے پیش کی اور کہا کہ اِقْرَأْ آپ پڑھنا جانتے ہی نہ تھے اس لئے کہا کہ ما انا بقارئ۔ جبرئیل کے تین بار پکڑ پکڑ بھینچنے سے آپ میں پڑھنے کی صلاحیت آگئی۔ اور جہاں سے جبرئیل نے پڑھنے کو کہا تھا آپ نے پڑھ دیا۔ اور پھر آپ کو پڑھنا آگیا۔ اسی لئے سورہ عنکبوت ۵ میں ہے وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ اس سے پہلے تم کوئی کتاب تلاوت نہیں کر سکتے تھے اور نہ لکھتے ہو اپنے ہاتھ سے۔ اگر تم پہلے سے لکھے پڑھے ہوتے تو باطل پرست لوگ تمہارے بارے میں شک و شبہہ کرتے رہتے ۝ من قبلہ کی ضمیر قرآن کی طرف پھر رہی ہے۔ یعنی اس قرآن کے نزول سے پہلے۔ یہ آیت صاف اعلان کر رہی ہے کہ بعثت کے ساتھ ساتھ آپکو لکھی ہوئی چیزوں کے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی اگر ایسا نہیں ہے تو پھر من قبلہ کے لفظ کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ یہ کہنا کہ یہاں تلاوت سے مراد زبانی پڑھنا ہے اور مقصود یہ ہے کہ تم قرآن سے پہلے کسی کتاب کو زبانی نہیں پڑھتے تھے بالکل لایعنی ہے۔ خصوصاً جب آگے وَلَا تَخُطُّهٗ کا لفظ موجود ہے "لکھنے" کے ذکر کے ساتھ "پڑھنے" کا جب ذکر آئے گا تو کتاب دیکھ کر ہی پڑھنا مراد ہوگا۔ اس لئے اس آیت سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد فوراً ہی آپ کو پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور آپ یقیناً کسی پڑھنے والے سے کم پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ عبید بن عمیر والی مرسل روایت یقیناً صحیح ہے اور بخاری کی روایت سے اتنا حصہ نکلا ہوا ہے یا نکالا گیا ہے۔

رسول اللہ صلعم کو ان پڑھ ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ کتابتِ وحی کے متعلق اکمل اشتباہ باقی رہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلعم نے لکھوایا وہ صحیح طور سے لکھا بھی گیا یا نہیں؟ اس کا علم عین الیقین کے مطابق آپ کو نہ تھا۔ بلکہ کاتبینِ وحی کے ایمان و دیانت کے اعتماد پر آپ سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہم نے بتایا ہے وہی ان لوگوں نے لکھا ہوگا۔ اور پھر انہیں منافقین عجم نے کاتبین میں سے کسی کو منافق کسی کو مرتد بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلئے جب کاتبوں پر اعتماد قطعی طور سے نہیں۔ اور لکھوانے والے خود پڑھنے والے نہیں تو پھر کس نے کیا لکھ دیا اس کے بارے میں لکھوانے والے کو کیا خبر ہو سکتی ہے۔ یہ تو کسی روایت میں ہے نہیں کہ آپ جو لکھواتے تھے اسکو دوسروں سے پڑھوا کر سن بھی لیتے تھے۔ غرض یہ سمجھنا کہ رسول اللہ صلعم کو پڑھنے کی صلاحیت نہ تھی بالکل غلط ہے اور وہ کتاب جو حضرت جبرئیل لائے تھے وہ وہی لوحِ محفوظ اور کتابِ مکنون تھی جس کی صفت بیان کی گئی ہے کہ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ ۲۵ امنہ

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] سورہ فرقان کی آیت وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ ہو کر۔ اسی طرح اتارا۔ تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل۔ اور پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر (ترجمہ شیخ الہند مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ) بعض لوگ اس آیت سے دھوکا کھاتے ہیں اور پہلے پہل پورے قرآن کے نزول سے اور ہر سال عرضِ جبرئیلی کے موقع پر پورے قرآن کے عرض سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں کذلک کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس کا تعلق اوپر سے ہے اور اوپر جو بات بیان کی گئی ہے اسکی موافقت میں یہ لفظ آیا ہے مطلب یہ ہے کہ کذلک انزلنا یعنی ہم نے اسی طرح جیسا کہ تم کہتے ہو جملۃً واحدۃً ہی اس کو نازل کیا ہے۔ تاکہ اسکو تمہارے دل میں ثابت و جاگزیں کر دیں یعنی پوری کتاب آپ کو حفظ ہو جائے۔ مگر پھر ترتیل کا طریقہ ٹھہر ٹھہر کر اتارنے کا اختیار کیا وہ اس لئے کہ تمہیں جو تثبیتِ قلب حاصل ہو گئی۔ یعنی اسکو ہم تمہارے دل میں ثابت و محفوظ تو کر دیا۔ مگر تمہیں مسائل کے جواب کی تلاش میں زحمت نہ ہو (باقی بر صفحہ آئندہ)

پھر آسمان جو اوپر سے بلکہ ہر طرف سے ساری دنیا کو محیط ہے اور سمندر جو حلقہ کی صورت میں زمین کو آغوش میں لئے ہوئے ہے، کون ہے جو ان دونوں آیات اللہ کی اہمیتوں سے انکار کر سکتا ہے۔ جس طرح آسمان ہر طرف سے دنیا کو محیط ہے اسی طرح یہ کتاب اللہ اپنے احکام و ہدایات و حِکَم کے اعتبار سے تمام اہل دنیا پر محیط ہے اور جس طرح سمندر اپنی آغوش میں دنیا کو لئے ہوئے ہے اسی طرح خانہ کعبہ کی مرکزیت تمام دنیا پر حاوی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو کتابی صورت میں رقِ منشور پر لکھی ہوئی اتار کر رسولؐ کو یہ بھی بتا دیا کہ قرآن کی جو آیت اور جو سورہ بھی جب جب اترے اس کو اسی طرح رقِ منشور کے اوراق پر ہی لکھوا یا جائے چنانچہ آنحضرت صلعم نے برابر رقِ منشور کے اوراق ہی پر نازل شدہ آیات و سُوَر کو لکھوایا اور جب کوئی بڑا سورہ مرتب ہو گیا تو وہ ایک مستقل صحیفہ قرار دیا گیا۔ اوسط درجہ کی دو تین سورتوں کا ایک صحیفہ اور چھوٹی چھوٹی متعدد سورتوں کا ایک صحیفہ بنایا گیا۔ اس لئے کتاب اللہ کے مجموعے کے متعلق صحف مکرمۃ۔ کتب قیمہ بصیغۂ جمع فرمایا گیا اور مجموعے کو کتٰب، قرآن فرقان، حق، ذکر وغیرہ ناموں سے یاد کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وکتٰب مسطور میں قسم اسی کتاب کی مقصود ہو جس کو آنحضرت صلعم نے صحابہؓ سے لکھوایا تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ رسول اللہ صلعم اپنی زندگی میں پوری کتابُ اللہ کو کتابی صورت میں اپنے سامنے مُدَوَّن و مرتب نہ کرا دیتے اور آپؐ کی حیات مبارک ہی میں صحابہ کے ہاتھوں میں پورے قرآن کی جلدیں نہ ہوتیں، جس طرح یہود کے پاس توراۃ کی جلدیں اور عیسائیوں کے پاس انجیل کی جلد

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) ہر مسئلہ کے موقع پر اسکے مناسب آیت کے نزول سے تمہیں غور و خوص اور آیات کی جستجو نہ کرنی پڑے۔ غرض رسول اللہ صلعم کے ذاتی علم کے لئے ایک بارکمل نزول شروع شروع ہوا اور ہر سال ایکبار ہو جایا کرتا تھا اور وفات کے سال دو بار ہوا مگر تعلیم و تبلیغ کے لئے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت نزول ہوتا رہا۔

یہاں کذٰلک بالکل اسی طرح ہے جس طرح سورہ مریم کے شروع میں حضرت زکریا کے سلسلہ ذکر میں ہے قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا۔ قَالَ کَذٰلِکَ۔ قَالَ رَبُّکَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُکَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَیْئًا۔ حضرت زکریا نے کہا کہ اے میرے رب مجھے لڑکا کہاں سے ہوگا درحالیکہ میری بی بی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے سے اکڑ چکا ہوں۔ اللہ نے کہا کہ ایسا ہی ہے (یعنی تمہاری بی بی بانجھ بھی ہے اور تم بہت بوڑھے بھی ہو) مگر ایک بانجھ عورت کو بوڑھے مرد سے بچہ دینا میرے لئے آسان ہے۔ ہم نے اس سے پہلے خود تمہیں پیدا کیا کہ تم کچھ بھی نہ تھے۔

حضرت مریم کے بارے میں بھی ہے کہ انھوں نے کہا کہ مجھے کہاں سے لڑکا ہوگا۔ کسی بشر نے مجھے چھوا نہیں اور میں بدکار بھی نہیں۔ جواب میں کہا گیا کذٰلک۔ ایسا ہی ہے کہ تمہیں کسی مرد نے چھوا ہے اور نہ تم بدکار ہو مگر تمہارے رب نے کہا ہے کہ مجھ پر یہ آسان ہے۔ مفسرین نے اپنے معتقدات کے ماتحت جو کذٰلک" کی تفسیر میں یہاں اسے کذٰلک انزلنٰہ مفرقاً لکھدیا ہے۔ یہ کسی قاعدہ ادب عربی سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ صاحب کشاف لکھیں یا کوئی بھی لکھدے کذٰلک کا اشارہ اُسی امر کی طرف ہوگا جس کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اور یہاں تنزیل قرآن جملۃً واحدۃً ہی کا ذکر پہلے ہوا ہے اسلئے کذٰلک کا اشارہ اسی طرف ہوگا۔ نہ کہ کسی ایسی بات کی طرف جو مذکور ہی نہیں ہوئی۔

امام رازی تفسیر کبیر جلد ۳ ص۱۱ سورہ آل عمران رکوع ۷، آیت فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم الایہ۔ کی تفسیر میں لکھتے ہیں و روی عن بعض الصحابۃ انہ قال لقد احسن اللہ الینا کل الاحسان۔ کنا مشرکین فلو جاءنا رسول اللہ بھذا الدین جملۃً وبالقراٰن دفعۃً لثقلت ھذہ التکالیف علینا فما کنا ندخل فی الاسلام ولکنہ دعانا الی کلمۃ واحدۃ فلما قبلناھا وعرفنا حلاوۃ الایمان قبلنا ما وراءھا کلمۃً بعد کلمۃٍ علی سبیل الرفق الی ان تم الدین وکملت الشریعۃ۔ یعنی بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں پر پورا پورا احسان کیا۔ ہم لوگ مشرک تھے۔ اگر ہم لوگوں کے پاس اللہ کے رسول اس دین کو مکمل ایک بار اور قرآن کو ایک دفعہ سارے کا سارا لے کر آتے یہ دینی و شرعی تکلیفیں ہم لوگوں پر بہت گراں گذرتیں۔ اور ہم لوگ اسلام میں داخل نہ ہوتے۔ لیکن اللہ کے رسول نے ہم لوگوں کو پہلے صرف ایک کلمہ (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کی طرف بلایا۔ تو جب ہم لوگوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور ایمانی حلاوت جان لی تو اس کے بعد اسکے ماسوا بھی ایک بات کے بعد دوسری رفتہ رفتہ مانتے چلے گئے یہاں تک کہ دین تمام ہو گیا اور شریعت مکمل ہو گئی۔ ۱۲ منہ غفرلہ

قرآن میں حکم کتابت

سورہ بقرہ جو مدینہ طیبہ میں اترنے والی سورتوں میں پہلی سورت ہے اسکے آخری رکوع سے پہلے ۳۹ میں مسلمانوں کو آپس کے لین دین اور خرید و فروخت والے معاملوں کو لکھ لینے کا حکم تاکیدی ہے۔ یایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ۔ آخر رکوع تک پڑھ جائیے۔ کیا ایسی قوم جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو، جس کے پاس لکھنے پڑھنے کے سامان نہوں۔ کاغذ تک نہ ملتا ہو، اس قوم کے ہر فرد کو یہ حکم دیا جا سکتا ہے کہ کسی سے قرض کا لین دین کرو، یا آئے دن کی معمولی خرید و فروخت کے علاوہ جو بیع و شری کا معاملہ کرو تو اسکو لکھ لیا کرو یا لکھوا لیا کرو؟ کیا یہ ضرورتیں ایسی ہیں جو ناگہانی طور سے ہزار دو ہزار میں کبھی کسی کو پیش آتی ہونگی؟ ایسی ضرورت تو زندگی میں بار ہا تقریباً ہر شخص کو پیش آتی ہے۔ کاتب اور سامان کتابت کے نملنے کا امکان وضو کے لئے پانی نہ مل سکنے کے امکان کی طرح صرف سفر ہی میں تصور کیا جا سکتا ہو جسکے لئے رہن کا حکم ہو۔

سورہ بقرہ کا یہ رکوع اس بات کا شاہد عادل ہے کہ ہجرت کے وقت تک صحابہ میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج ہو چکا تھا اور کاغذ وغیرہ لکھنے پڑھنے کا سامان کافی حد تک ان کے پاس موجود رہتا تھا۔ یعنی زید بن ثابت کے کتابت سیکھ لینے سے پہلے ہی یا ان کی مہارت کتابت کے زمانے تک ہزار دس صحابہ فن کتابت سے واقف ہو چکے تھے، اور ان کے پاس کاغذ بھی برابر مہیا ہوتا رہتا تھا۔ کیونکہ سورہ بقرہ کا نزول زید بن ثابت کی مہارت کتابت سے پہلے ہی ہو چکا تھا، اور مسلمانوں کو لین دین وغیرہ کے معاملات کے لکھ لینے کا حکم زید بن ثابت کی مہارت کتابت سے پہلے مل چکا تھا۔

تعجب تو یہ ہے کہ جس رسول پر سب سے پہلے وحی جو اتری اس میں عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کا جملہ بیان فرما کر یہ ثابت کر لیا گیا کہ تعلیم قلم ہی کے ذریعے ہوتی ہے جس رسول نے ہر مرد و عورت مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہو اس رسول کے بارے میں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا کہ ایسے رسول کی امت میں لکھنے پڑھنے کا رواج اس قدر کم تھا کہ قرآن جیسی کتاب جو ساری قوم کا سرمایہ ایمان تھا اسکو بھی اس نے کتابی صورت میں مرتب و مدون نہ کیا تھا؟ امت تو امت تھی خود رسول اللہ صلعم نے بھی مرتب کر کے نہ لکھوایا۔ آخر یہود و نصاریٰ کے پاس یہ لوگ تورات و انجیل کتابی صورت میں کاغذ پر لکھی ہوئی دیکھتے تھے۔ دوسروں کی کتابوں کو دیکھکر بھی یہ ولولہ نہ پیدا ہوا کہ ہم لوگ بھی اپنی کتاب کو اسی طرح کتابی صورت میں مدون کر ڈالیں؟

ابو داؤد جلد دوم آغاز ص ۱۲۹ (مطبع مجتبائی دہلی) ایک حدیث ہے جس سے ظاہر ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت اہل صُفّہ کو قرآن کے پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دیا کرتے تھے اور اسوقت رسول اللہ صلعم اسی دنیا میں تشریف فرما تھے اور عبادہ بن صامت مدنی انصاری خزرجی صحابی تھے۔

عبداللہ بن سعید بن العاص کے بارے میں بھی استیعاب ج ا ص ۳۸۱ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے انہیں حکم دیا تھا کہ مدینے میں جو لوگ لکھنا نہیں جانتے ہیں ان کو لکھنے کی تعلیم دیں۔

اور یہ وہ لوگ ہیں جو اساران جنگ بدر کے علاوہ مستقل طور سے تعلیم کتابت پر مامور تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہ میں تعلیم کتابت کی ترویج کی کتنی کد رسول اللہ صلعم کو تھی۔ اور یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بس اتنے ہی لوگ تعلیم کتابت پر مامور تھے۔ ان کے علاوہ بھی یقیناً بہت لوگ مامور ہونگے اور کتنے لوگ بطور خود سکھاتے ہونگے اور کتنے لوگ بطور خود سیکھتے ہونگے۔ اور کتابت سیکھنے کے بعد سب سے زیادہ محبوب مشغلہ اور مرغوب کام ہر شخص کا قرآن ہی لکھنا ہوگا۔ کون سا شخص ہوگا جس نے کتابت سیکھی ہو اور قرآن نہ لکھا ہو۔ اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے اور اپنے اعزہ و ہم جوار کے لئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک میں قرآن جمع نہو سکنے کی غیر معقول وجہ یہ کہی جاتی ہے

قرآن کریم کا نزول چونکہ نجماً نجماً تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا اس لئے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ہر اس حصۂ قرآن جو اترا لکھوا یا تو ضرور۔ مگر غیر مطمئن طور سے اس لئے کہ آپ کو خود یہ معلوم نہ تھا کہ سلسلۂ نزول کب ختم ہوگا۔ اور درمیان سے کون سی آیت کب منسوخ کر دیجائیگی، اور اس کے عوض کون سی آیت اتریگی اور کب؟ ۔ ترتیب نزول کے مطابق بھی اگر آپ جمع کراتے تو ہو سکتا تھا کہ جیسے جیسے آیتیں اترتی جاتیں آپ لکھواتے چلے جاتے اور پھر آخری آیت پر قرآن ختم ہو جاتا۔ مگر آپ جمع کرا رہے تھے ترتیب نزول کے خلاف لوح محفوظ کے مطابق۔ اور مجمع الزوائد میں طبرانی کی اوسط سے تو روایت ہے کہ عن ام سلمۃ رضی اللہ عنہا قالت کان جبرئیل علیہ السلام یُملِی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن لکھواتے تھے یعنی کاتبین وحی جب لکھتے تھے تو خود رسول اللہ صلعم

بتاتے جاتے تھے مگر جبرئیل علیہ السلام وحی پر بیٹھے سنتے رہتے تھے کہ لکھوانے میں کسی طرح کی بھول چوک بمقتضائے بشریت نہو جائے۔ مجمع الزوائد جلد ۸ ص۱۵۷ مجمع الزوائد جلد اول ص۶۰ میں غالباً اسی بنا پر زید بن ثابت سے یہ بھی مروی ہے کہ فان کان فیہ سقط اقامہ اگر اس میں لکھنے سے کچھ چھوٹ گیا تو اسکو اسکی جگہ پر لکھدیا یا غلطی ہو گئی تو اسکو صحیح کر دیا۔ ثم اخرج بہ الی الناس اس کے بعد تبلیغ و اشاعت کے لئے اس نازل شدہ وحی کو لوگوں تک پہونچا دینے کے لئے نکالتے تھے وقت وفات تک بعض آیات کے نزول کا امکان موجود تھا۔ بدیں وجہ آپ نے قرآن کو کتابی صورت میں مرتب و مدون نہیں فرمایا، نہ آپ کے وقت میں کسی صحابی نے کے لئے بطور خود اپنے جی سے یا آپ کی اجازت سے اتری ہوئی آیتوں کو مرتب و مدون کرنے کا امکان تھا۔ اسلئے عہد نبوی میں قرآن مرتب و مدون نہو سکا۔ چونکہ آپ نزول آیات کے بعد کاتبین وحی سے فرماتے تھے اس آیت یا ان آیات کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد لکھو، اس لئے کسی سورت کے متعلق بھی وفات نبوی کے وقت تک یہ یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ سورہ مکمل ہے کیونکہ ممکن تھا کہ دو ایک آیت ایسی اتر جائے کہ اس سورہ کے اول یا آخر یا درمیان میں داخل کر دینے کا حکم ہو۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی نازل شدہ آیات منسوخ بھی کر دی جاتی تھیں بعض کے احکام اور بعض کی تلاوت نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو جاتی تھی۔ اس لئے آنحضرت کو اس کا احتمال ہمیشہ لگا رہتا تھا کہ شاید کوئی آیت تلاوۃً منسوخ ہو جائے تو پھر کتاب میں داخل کرنے کے بعد اس کا نکالنا بے موقع اور مشکل ہوگا

لہ۔ اگرچہ یہ قول بخاری وغیرہ کی حدیثوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ عہد نبوی ہی میں بعض صحابہ کے قرآن جمع کرنے کی روایت بخاری وغیرہ میں موجود ہے جس کا ذکر اوپر کر چکے ہیں

لہ۔ منسوخ الحکم آیتیں تو خطابی اور ان کے ہم عقیدہ علماء کے نزدیک آج تک قرآن میں موجود ہی ہیں ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں بلکہ سینکڑوں مگر بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث ، صرف پانچ۔ منسوخ التلاوۃ کا تو پتا ہی نہیں، خدا جانے کتنی آیتیں ہونگی۔ یہی راویان حدیث کہتے ہیں کہ سورہ احزاب پہلے اتنی بڑی تھی کہ سورہ بقرہ سے بھی زیادہ آیتیں اس میں تھیں، مگر اس حدیث کے راوی بڑے چالاک تھے ایسے عنوان سے کہہ گئے جس سے کوئی تو یہ سمجھا کہ وہ بہت سی آیتیں جو اب سورہ احزاب میں نہیں ہیں منسوخ ہو گئیں جن کا حکم بھی منسوخ ہے اور تلاوت بھی۔ اور کوئی یہ سمجھا کہ وہ سب آیتیں شہدائے جنگ یمامہ کو یاد تھیں، مگر وہ تو شہید ہو گئے۔ اس وجہ سے قلمبند نہو سکیں۔ اور غائب ہو گئیں۔ جس کا الزام رسول اللہ صلعم پر ہی بلکہ خود خدا پر۔ کہ قبل اس کے کہ قرآن مرتب مدون ہو جائے رسول کو کیوں اٹھا لیا۔؟ اور ان حفاظ کو کیوں شہید کرا دیا گیا؟۔ اور کوئی یہ سمجھے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے زید بن ثابت سے کہہ کر ان آیات کو نکلوا دیا۔ کیونکہ ان آیات میں حضرت علیؓ اور ان کے اہل بیت کی منقبت تھی۔ غرض اس قسم کی منسوخ آیتوں کے متعلق جن کے احکام اور جن کی تلاوت دونوں ان علماء کے نزدیک منسوخ تھی کیا بتایا جا سکتا ہے کہ کتنی تھیں۔ البتہ ایک آیت ان کے نزدیک ایسی بھی عجیب و غریب ہے جس کا حکم تو باقی ہے مگر صرف تلاوت منسوخ ہے اس کا حکم چونکہ باقی ہے اس لئے وہ حدیثوں کی بدولت بعید و مابعد محدثین و فقہا میں رائج و سائر ہے، جس کو یہ لوگ آیۃ الرجم کہتے ہیں الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ الخ جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ بوڑھا اور بڑھیا اگر زنا کریں تو ان کو سنگسار کرو ضرور۔ یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے۔ مگر کہا یہ جاتا ہے کہ بوڑھے سے مراد یہ ہے کہ مرد بیوی والا اور عورت شوہر والی خواہ نوجوان ہی کیوں نہو ں۔ اگر واقعی یہ آیت ہے اور اس کا حکم باقی ہے تو پھر اس کی تلاوت کیوں منسوخ ہو گئی؟ اور کس نے منسوخ کی؟ اور کہاں ایسی کوئی روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہو کہ یہ ہے تو قرآن کی آیت۔ اور اس کا حکم باقی رہیگا۔ مگر اس کو قرآن میں داخل کر کے اس کی تلاوت نہ کرنا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ جمع کے وقت ہر صحابی قرآن کے وہ حصے جو اس کے پاس لکھے ہوئے یا زبانی یاد کی صورت میں تھے لے کر آتا تھا اور اس پر اس سے دو گواہ طلب کئے جاتے تھے۔ یعنی کا ایک گواہ تو وہ خود لانے والا ہوتا تھا اور ایک اور کسی کو وہ لے آتا تھا۔ جب وہ حصہ قرآن میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ اور جس کے لئے لانے والے کے پاس کوئی گواہ نہو تا وہ حصہ قرآن میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت خزیمہ بن ثابت الانصاری آیت سورۂ احزاب یا آخر سورۂ توبہ لے کر آئے تو وہ چونکہ ذوالشہادتین تھے یعنی ان کی ایک شہادت دو مردوں کی دو شہادتوں کے برابر قرار دے دی گئی تھی۔ اس لئے قبول کر لی گئی۔ مگر آیۃ الرجم کو صرف حضرت عمرؓ لے کر آئے تھے ان کے سوا کسی دوسرے نے اس کی شہادت نہیں دی اس لئے یہ آیت الرجم قرآن میں داخل نہیں کی گئی اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو چونکہ حضرت عمرؓ کا سچا ہونا تو یقیناً اس روایت پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک بھی مسلم ہوگا اس لئے وہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن ناقص رہ گیا اور یہ آیت قرآن میں داخل ہونے سے جماعت محروم رہ گئی مگر اس سے یہ تو نہیں سمجھا جائیگا کہ یہ آیت منسوخ التلاوۃ ہو گئی۔ اور اگر بہکا جائے۔ اور اللہ تعالے نے وہ آیت یا کیسے صحیح نقل دی کر صحابہ امہ

خطابی کا عذر لنگ

اور اس سے زیادہ بے موقعگی کا احتمال اس وقت کے لئے تھا کہ لوگوں سے کہا جاتا کہ تم نے فلاں سورہ جو یاد کیا ہے اس کی فلاں آیت منسوخ التلاوۃ ہے اس لئے اب بھول جاؤ اُسؔ کو چھوڑ کر اب پڑھا کرو نعوذ باللہ من تلک الھفوات۔

چنانچہ خطابی کا قول اتقان صہ۸ میں منقول ہے کہ قال الخطابی انما لم یجمع القران صلعم فی المصحف لما کان یترقب منؔ ورود ناسخ لبعضؔ احکامہؔ او تلاوتہ۔

صحیح مسلم کتاب التفسیر اور صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن کے پہلے ہی باب میں ایک حدیث ابن شہاب زہری ہی سے مروی ہے کہ حضرت انس نے زہری سے کہا کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلعم کے پاس آپ کی وفات کے قبل پے درپے وحی کرتا رہا۔ اور زیادہ وحی اس دن ہوئی جس دن آپنے وفات فرمائی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ تَابَعَ الْوَحْيَ عَلَى رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ وَفَاتِهٖ وَاَكْثَرُ مَا كَانَ الْوَحْيُ يَوْمَ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ یہ حدیث امام نوادی کے نسخہ صحیح مسلم میں نہیں ہے۔ اسی لئے انھوں نے اس حدیث کو چھوا تک نہیں۔ ایک لفظ بھی اس روایت کے متعلق نہ لکھا۔ مگر متن میں موجود ہے۔

اگر وحی غیر تشریعی یعنی غیر قرآن ہی مراد لی جائے جن کا تعلق احکام و حلال و حرام سے نہیں۔ تو ہو سکتا ہے۔ ورنہ خود صحاح ہی کی روایتوں میں موجود ہے کہ آخری آیت جو نازل ہوئی . . . وہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ والی آیت ہے جو حجۃ الوداع میں عرفات میں جمع کے دن نازل ہوئی وفات نبوی سے تقریباً تین ماہ پہلے ۔ کے بعد پھر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اسلئے کہ تکمیل دین کے بعد پھر کوئی دینی مسئلہ نہیں پیدا ہو سکتا اور آخری آیت کے بعد پھر کوئی آیت کس طرح اتر سکتی ہے۔

مگر اس روایت میں ایک پہلو مُبہم ایسا رکھا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وحی کا سلسلہ جب وفات کے وقت تک جاری تھا تو پھر قرآن کس طرح آپ جمع فرماتے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وفات کے وقت بھی کوئی کاتب وحی آپ کے سامنے بیٹھا وحی لکھا رہتا اور آپ بتاتے جاتے۔ مگر ایسا تو کسی روایت میں بھی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا تھا تو نعوذ باللہ خود رسول اللہ صلعم جن پر قرآن نازل ہوا جو قرآن کی تعلیم و تبیین و تبلیغ کے لئے مبعوث ہوئے ان کو بھی پوری زندگی میں ایک منٹ کے لئے بھی پورے قرآن تو کیا کسی پوری سورت سے بھی آشنا ہونے کا موقع نہ ملا۔ دم وفات تک آپ نعوذ باللہ ہر سورۃ کو غیر مکمل ہی سمجھتے رہے اور غیر مرتب۔ الا بات ہی قرآن پڑھتے پڑھاتے رہے، اپنی پوری حیات مبارک میں جو تلاوت قرآن آپ نے فرمائی خدا جانے کس طرح فرمائی۔ صحابہؓ کو جو آپ تعلیم فرماتے تھے اور خود نمازوں میں پڑھتے تھے تو ان میں آیات کی کوئی ترتیب ہوتی تھی یا نہیں؟

عقل و دیانت والے اتنا کیوں نہیں سمجھتے

اہل عقل و دیانت اتنا کیوں نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اسی لئے مبعوث کیا کہ وہ اس کی کتاب دوسرے تمام انسانوں تک پہنچادیں اس کی تعلیم و تبیین کر دیں۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کہاں اس کی رسالت ہونی چاہئے اور کس طرح اور کب تک۔ تو اس غرض کے ماتحت جب اس نے رسول کو مبعوث فرمایا تو ان پر کتاب بھی اتارو ۔ ۔ ۔ رفتہ رفتہ تھوڑی تھوڑی اسی لئے اتاری کہ رسولؐ کو اس کی تعلیم و تبیین و تبلیغ اور جملہ متعلقہ فرائض کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ آیت قرآن سے نکل جائے اور تلاوت میں داخل نہ ہو اور اس طرح اسے منسوخ کر دیا تو یقیناً اس کا حکم بھی منسوخ کر دیا۔ پھر اس کے حکم کے باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کاتب وحی کے نزدیک جب اس آیت کی قطعیہ ۔ ۔ ۔ نہ ہو سکی تو جس طرح اس کا ایک آیت قرآنی ہونا ثابت نہ ہو سکا اس طرح اس کے حکم کا حکم الٰہی ہونا بھی ثابت نہ ہو سکا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے الفاظ تو قرآن سے خارج ہیں اور اس کا حکم دین میں داخل رہے۔ مزید بحث میرے رسالہ ایۃ الرجم میں مذکور ہے اس میں دیکھئے ۔ ۔ منہ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ مولانا شمس الحق محدث بہاری رحمہ اللہ نے غایۃ المقصود شرح سنن ابو داؤد کے مقدمہ میں شارحین سنن ابی داؤد میں خطابی کا ترجمہ ابن خلکان کی وفیات الاعیان سے نقل کیا ہے مختصر یہ ہے کہ ابو سلیمان احمد بن محمد ابن ابراہیم بن الخطاب الخطابی البستی کی وفات ۳۸۸ھ ربیع الاول میں ہوئی ہے ۔ ۔ منہ

۲؎ کیف یصح منہ صلعم ھذا الترقب بعد یوم نزل فیہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی؟ فماذا النسخ بعد التکمیل وکیف بعد الاتمام التغییر والتبدیل ؟ ۳؎ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ ۔ میں دیکھئے۔ ۴؎ ما یصح نسخ الاحکام فی الکتابۃ؟ فانہم ما یعتقدون النسخ فی آیات القرآن الی یومنا ھذا ۔ ۔ منہ

ادا کاری میں تثبیت قلب و سکون و طمانیت کے ساتھ یکسوئی حاصل ہو، اور وہ اپنی زندگی میں اپنے تمام مفوضہ فرائض متعلقہ کتاب اللہ کو پوری طرح انجام دے سکیں، اور یہ رسول بھی ایسے کہ ان کے بعد اب کوئی رسول یا نبی آنے والا نہیں اور نہ اس کتاب کے بعد اب کوئی کتاب تا قیامت اترنے والی ہے۔ رسول کی زندگی میں اور پھر رسول کے بعد قیامت تک یہی کتاب ذریعہ ہدایت رہنے والی ہے۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کی تکمیل کا وقت آپ کی وفات سے کافی پہلے ہی رکھا تاکہ خود رسول اللہ صلعم کی زندگی مبارک ہی میں پورا قرآن مکمل اور مرتب و مدوّن ہو جائے۔ ورنہ جو چیز غیر مرتب و غیر مدوّن ہو جس کی تکمیل مشتبہ ہو کہ خدا جانے یہ چیز مکمل ہو گئی یا ابھی اس کا کوئی اور حصہ نازل ہونے کے لئے باقی ہے جو احکام آگئے وہ اب مکمل دین کی صورت میں قیامت تک کے لئے آگئے یا ابھی اس میں نسخ و تبدیل و تغیر کا امکان باقی ہے۔ تو پھر ایسی ناقص چیز کی تعلیم تبیین و تبلیغ بھی یقیناً ناقص اور مشتبہ ہی ہوگی۔ الیوم اکملت لکم دینکم الآیہ، اور وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا کے نزول کے بعد تو پھر کسی آیت احکام کے نزول کا یا کسی طرح کے نسخ و تبدیل و تغیر کا امکان نہیں ہے جس دن یہ آیت تکمیل کی بشارت لے کر نازل ہوگی اسی دن نہ فقط رسول اللہ صلعم کو بلکہ تمام صحابہؓ کو یہ معلوم ہو گیا کہ اب نزول قرآن کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب کوئی آیت احکام نہیں اترے گی اور اب کسی طرح کا رد و بدل احکام میں نہ ہوگا۔ اس آیت کے نزول کی تاریخ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کا دن بتایا جاتا ہے۔ یعنی وفات نبوی سے تقریباً پونے تین ماہ قبل۔ مگر یہ روایت بھی میرے نزدیک مشتبہ ہی ہے۔ یقیناً یہ آخری آیت وفات نبوی سے کم از کم ڈیڑھ دو سال پیشتر ہی نازل ہوئی تھی۔ اور نزول وحی قرآنی کا سلسلہ وفات نبوی سے بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ جس کا علم رسول اللہ صلعم کو حاصل تھا۔ جب ہی تو ختم قرآن کے متعلق احکام حدیثوں میں مذکور ہیں اور آپ سے صحابہؓ پوچھتے تھے کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کریں۔

رسول کی حیات و موت اللہ کے اختیار میں تھی

اللہ کے اختیار میں رسول کی حیات و موت تھی۔ یہ کوئی محض انسانی کاروبار تو تھا نہیں کہ کوئی انسان نہیں جانتا کہ ہم اپنا کام ختم کر کے مریں گے یا ناتمام چھوڑ کر۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب و مدوّن رسول اللہ صلعم کے ہاتھوں سے کرائے بغیر رسول کو وفات دے دی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات اللہ تعالیٰ کے بس کی بات نہ تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ یہ آخری نبی اور رسول ہوں گے اور قرآن آخری کتاب ہوگی نہ ان کے بعد کوئی رسول آئیں گے نہ کوئی دوسری کتاب اترے گی تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے قرآن کو رسول اللہ صلعم ہی سے مرتب و مدوّن کرا دیا تھا۔

مصحف کہئے یا قرآن، یہ مجموعہ ہے ایک سو چودہ[۱۱۴] سورتوں کا اور ہر سورہ کم و بیش آیتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ہر آیت کم و بیش کلموں سے مرکب ہے۔ اور ہر کلمہ کچھ حروف سے بنا ہے۔ قرآن میں آیت و آیات اور سورۃ و سور کے الفاظ موجود ہیں جن کے یہ معنی ہوئے کہ کتنے کلموں سے کون سی آیت مرکب ہے۔ اور کتنی آیتوں کا مجموعہ کون سا سورہ ہے۔ یہ سب منجانب اللہ ہی معین و مقرر ہوا اور یقیناً ہر سورہ کو رسول نے خود توقیفی طور سے مرتب و مدوّن فرمایا اور ہر سورہ کا نام بھی خود رسول اللہ صلعم نے ہی رکھا۔ آپ سورتوں کی تلاوت نمازوں میں اور نماز کے باہر فرمایا کرتے تھے۔ سورتوں کی تعلیم فرماتے تھے جو سورہ جب مکمل ہو گیا تو آپ کو اس کا علم بھی وحی لانے والے فرشتہ ہی کے ذریعے ہو جاتا تھا کہ اب یہ سورہ مکمل ہو گیا اس لئے ہرگز ہرگز آپ کو کسی سورہ کے متعلق بھی اشتباہ کبھی نہ رہا کہ خدا جانے یہ سورہ مکمل ہو گیا یا ابھی اس کی کوئی آیت نازل ہونے کیلئے باقی ہے یا نہیں؟ جس سورہ کی تمام آیتیں اتر گئیں اور وہ مکمل ہو گیا

سورتوں اور آیتوں کی تحدید توقیفی ہے

تو پھر عام صحابہؓ کے حفظ و کتابت اور قراءت و تلاوت میں داخل ہو کر رفتہ رفتہ بہت جلد ساری دنیائے اسلام تک پہنچ جاتا تھا۔ فلیبلغ الشاهد الغائب۔ کے حکم نبوی کے مطابق ہر حاضر صحابیؓ دور والوں تک ہر سورہ کو پہنچا دیا کرتے تھے۔ اس لئے یہ کسی طرح ممکن ہی نہ تھا کہ قرآن کی کوئی آیت بھی ایسی ہو جو صرف کسی خزیمہ یا ابوخزیمہ یا حرث بن خزیمہ کے پاس نکلے اور دوسرے صحابہؓ اس سے بالکل بے خبر ہوں یا اظہار ملا نہیں ہو سکے کہ بعد زید بن ثابت کو یاد آئے کہ میں اس آیت کو رسول اللہ صلعم کو پڑھتے سنتا تھا۔ وہاں تو جو آیت اترتی تھی فوراً لکھ لی گئی۔ اور پھر نقل در نقل ہو کر کتابۃً اور حفظ و تعلیم کے سلسلے سے قراءۃ و تلاوۃً تمام حاضر و غائب

قرآن کی کوئی آیت صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس نہیں رہ گئی تھی

سے توقیف یعنی اقامت و تعلیم تبیین یہاں مراد تعلیم آلٰہی سے ہے یعنی منجانب اللہ تعلیم معین کیا گیا آیات و سور کی ترتیب رسول اللہ صلعم ان ہی ۲ [illegible]

صحابہؓ میں پہنچ گئی ۔ اور پھر ہر سینے میں محفوظ اور ہر صحیفے میں مکتوب ہو کر پوری دنیائے اسلام میں شایع و ذائع ہو کر رہی۔ ان حالات میں جن آیات کی قطعیت و یقینیت کالشمس فی نصف النہار ہے۔ اُن کے متعلق ایسی ایسی روایتیں پیش کرنا کہ فلاں آیت صرف فلاں کے پاس تھی اور فلاں آیت فقط فلاں لائے، وہ بھی وفات نبوی کے بعد آفتاب پر خاک ڈالنا نہیں تو اور کیا ہے ؟۔

آخر سورۂ توبہ و آیت احزاب کی حدیثوں اور خزیمہ والو خزیمہ پر مفصل بحث۔

جمع صدیقی والی حدیث کی روایت زید بن ثابتؓ ان سے عبید بن السباق اور ان سے زہری نے کی ہے اس کی بحث گذر چکی اس میں آخر سورہ توبہ کی روایتوں کے جمع قرآن کے وقت خزیمہ یا ابو خزیمہ کے سوا اور کسی کے بھی پاس نہ ملنے کا ذکر اسی حدیث کے جزو کی حیثیت سے مذکور ہے۔ اس حدیث کے بعد باب جمع القرآن میں نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث حضرت انسؓ بن مالکؓ سے ہے جس کو بلا واسطہ ان سے ابن شہاب زہری ہی روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث میں تو کسی آیت کے نہ ملنے اور پھر کسی کے پاس پائے جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر اس حدیث کو ختم کرتے ہی امام بخاری نے ایک دوسری حدیث بغیر اپنے شیخ اور شیخ کے شیخ کا نام لئے۔ قال ابن شہاب سے شروع کی ہے جو صرف یہ مضمون ظاہر کرتی ہے کہ مصحف لکھنے کے وقت زید بن ثابت کو یاد آگیا کہ سورۂ احزاب کی ایک آیت تھی جس کو میں رسول اللہ صلعم سے اکثر سنا کرتا تھا، تو اس کو انھوں نے ڈھونڈھنا شروع کیا۔ آخر خزیمہ بن ثابت الانصاری کے ساتھ ملی۔ وہ آیت من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللّٰہ علیہ الخ۔ تو انھوں نے اس آیت کو مصحف میں لگا لیا۔

خارجہ بن زید سے جمع قرآن یا نقل مصاحف کے واقعے کی روایت نہیں ہے صرف آیت سورۂ احزاب کے متعلق روایت ہے

اس حدیث کو زہری انسؓ بن مالکؓ سے نہیں بلکہ خارجہ بن زید سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد زید بن ثابتؓ سے۔ اس باب جمع القرآن میں تو امام بخاری نے اپنے شیخ اور شیخ کے شیخ کا نام نہیں لکھا ہے مگر کتاب التفسیر میں بضمن تفسیر سورۂ احزاب اسی حدیث کو صحیح بخاری ہی میں پورے اسناد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال اخبرنا خارجۃ ان زید بن ثابت الخ البتہ دونوں روایتوں میں تھوڑا فرق ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ دونوں جگہ کی حدیث یہاں میں نقل کر دوں۔ تاکہ ماہرین حدیث غور فرمائیں کہ دونوں جگہ ایک ہی حدیث ایک ہی اسناد والی لکھی جاتی ہے مگر الفاظ میں پھر بھی کافی فرق ہے۔ کیا یہ فرق صرف اس وجہ سے پیدا ہو گیا کہ ایک جگہ امام بخاری اپنے شیخ اور شیخ کے شیخ کے نام لکھتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں لکھتے۔ یا کوئی اور وجہ ہے یہ فرق تو یقیناً خاص امام بخاری کی طرف سے ہے اور بلا وجہ ہے، کوئی معقول سبب اس فرق کا نہیں مل سکتا۔ بہرحال دونوں جگہ کی عبارتیں حسب ذیل ہیں۔

باب جمع قرآن والی روایت

قال ابن شہاب واخبرنی خارجۃ بن زید بن ثابت انہ سمع زید بن ثابت قال فقدت آیۃ من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول اللہ صلعم یقرأ بہا فالتمسناھا فوجدناھا مع خزیمۃ بن ثابت الانصاری من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فالحقناھا فی سورتھا فی المصحف۔

تفسیر سورۂ احزاب والی روایت

حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری قال اخبرنا خارجۃ بن زید بن ثابت قال لما نسخنا الصحف فی المصاحف فقدت آیۃ من سورۃ الاحزاب کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأھا لم اجد مع احد الا مع خزیمۃ الانصاری الذی جعل رسول اللہ صلعم شہادتہ شہادۃ رجلین من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ۔"

کتاب الجہاد والی روایت

پھر کتاب الجہاد میں بھی یہی حدیث بعینہٖ اسی اسناد سے ایک تحویل کے ساتھ مذکور ہے جو حسب ذیل ہے:

حدثنا ابو الیمان انا شعیب عن الزھری ح وحدثنا اسمٰعیل ثنی اخی عن سلیمان اراہ عن محمد بن ابی حسن عن ابن شہاب عن خارجۃ بن زید ان زید بن ثابت قال نسخت الصحف فی المصاحف ففقدت آیۃ من الاحزاب کنت اسمع رسول اللہ صلعم یقرأ بہا فلم اجدھا الا مع خزیمۃ الانصاری الذی جعل رسول اللہ صلعم شہادتہ شہادۃ رجلین وھو من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ

ابن حجر تحویل کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اسمٰعیل سے مراد اسمٰعیل بن ابی اویس ہیں اور ان کے بھائی ابوبکر عبدالحمید ہیں۔ اور سلیمان سے مراد ابن بلال ہیں۔ اور اُسْرَاہُ عن محمد بن ابی عتیق یہ قول اسمٰعیل کا ہے۔ یہ اس لئے کہ باوجود لقا کے ان کا بلاواسطہ زہری سے روایت کرنا محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۶ میں لکھتے ہیں کہ لقی الزھری ولکنه یروی کثیر حدیث عن قدماء اصحابه مگر اس کی وجہ ابن حجر نے نہیں لکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سلیمان بن بلال موالی قریش سے تھے مدینہ میں برابر رہے۔ اسی لئے مدنی کہے جاتے ہیں۔ زہری ایلہ کے رہنے والے تھے ایلہ میں برابر رہے۔ تحصیل حدیث کے لئے شہر شہر ضرور گھومے۔

زہری کے مدنی ہونے کی ایک اور دلیل

اس سلسلے میں مدینہ بھی آئے۔ جمع حدیث کے مشغلہ سے پہلے حضرت علی بن حسین کی خدمت میں کچھ دنوں رہے تھے تو اس وقت روایت حدیث کا چرچا ہی نہ تھا۔ جب یہ خود حدیثیں روایت کرنے لگے تو یہ اپنے کاروبار کی وجہ سے اپنے وطن ایلہ میں رہے لوگ ایلہ ہی پہنچ کر ان سے حدیثیں لیتے تھے۔ جیسا کہ ان کے ترجمے میں مذکور ہوا۔ سلیمان بن بلال کو ایلہ جانے کا موقع نہ مل سکا کہ ان سے حدیثیں لیتے اور مشغلۂ روایت حدیث سے پہلے جب زہری مدینہ آئے تھے تو ملاقات ہوگئی ہوگی سلیمان کا سال وفات ۱۷۲ھ اور بروایت امام بخاری ۱۷۷ھ ہے مدینہ میں اگر انھوں نے زہری کو دیکھا بھی ہوگا تو بچپن میں۔

باقی رہے اسمٰعیل بن ابی اویس ان کا اصل نام اسمٰعیل بن عبداللہ بن عبداللہ بن اویس ہے جو اس حدیث میں بخاری کے شیخ ہیں ان کا ترجمہ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۱۰ میں مفصل ہے۔ ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے اور النسائی وغیرہ نے ان کو غیر ثقہ لکھا ہے اور یحییٰ ابن معین وغیرہ ان کو کذّاب لکھتے ہیں، امام مالکؒ کے بھانجے تھے۔ ان سے ایسی ایسی عجیب وغریب حدیثیں انہوں نے روایت کی ہیں جن کو کسی نے نہیں سنا۔ اس لئے ان کی تحویل سے اس حدیث کو کوئی تقویت متابعت حاصل نہیں ہو سکتی۔

تو اسمٰعیل بن ابی اویس کی متابعت سے قطع نظر ہی کرنا صحیح ہے۔ اور یہ ماننا پڑیگا کہ یہ حدیث صرف ایک ہی سلسلہ اسناد سے ہر جگہ مروی ہے یعنی ابوالیمان عن شعیب عن الزھری۔ اور ہم لکھ چکے ہیں کہ ابوالیمان، حکم بن نافع البہرانی الحمصی جو موالی میں سے تھے۔ ان کی روایت شعیب سے منقطع ہے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۴۱ میں لکھا ہے قال الآجری لم یسمع ابوالیمان من شعیب الاکلمة شعیب سے ابوالیمان نے ایک آدھ کلمہ سے زیادہ کبھی کچھ نہیں سنا۔ بہرحال اس حدیث کو ابوالیمان ہی تنہا شعیب سے روایت کر رہے ہیں۔ اور شعیب زہری سے۔ اور اسی سلسلۂ اسناد سے یہ حدیث تین جگہ مروی ہے۔ ایک جگہ ابوالیمان و شعیب کا نام حذف کر کے زہری ہی سے شروع کی گئی۔ یعنی باب جمع القرآن میں۔ مگر یہاں اسمٰعیل بن ابی اویس کا سلسلہ غالباً محذوف نہیں ہے۔

ایک ہی حدیث تین جگہ مگر بیان کا عنوان مختلف

اب ان تینوں جگہوں کی عبارتوں پر نگاہِ غور ڈالئے۔ سب سے پہلے تو جمع قرآن والی حدیث میں ایک واو عطف کا اضافہ آپ کو نظر آئیگا کہ قال ابن شہاب واخبرنی خارجة، اور تفسیر سورہ احزاب میں قال اخبرنا خارجة اور کتاب الجہاد میں صرف عن خارجة ہے۔ نی اور نا کا فرق تو جانے دیجئے سوال یہ ہے کہ وہاں یہ واو کیسا ہے؟ اور اس کا عطف کس پر ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عطف اس سے پہلے والی حدیث پر ہے۔ جس میں نقل مصاحف بعہد عثمانؓ والا واقعہ حضرت انسؓ بن مالکؓ سے زہری روایت کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابن شہاب سے انسؓ بن مالکؓ نے تو صرف نقل مصاحف کا حال بیان کیا۔ مگر اس موقع پر جو سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی اور ڈھونڈھنے کے بعد خزیمہ بن ثابت الانصاری کے پاس ملی اس کا ذکر انسؓ بن مالکؓ نے نہیں کیا، اس کمی کو خارجہ بن زید نے پورا کر دیا۔ اسی لئے یہ واو عطف قصداً لایا گیا۔ یعنی انسؓ بن مالکؓ نے تو اسی قدر بیان کیا باقی بات جو ان سے رہ گئی تھی اس کو خارجہ نے بیان کر دیا۔ اہل ادب وصل و فصل کے قاعدے سے واقف ہیں؟ کہ یہ واو عطف اپنے ماسبق سے ہی ایک تعلق ظاہر کرنے کے لئے ہی لایا گیا ہے۔ وہ ماسبق قریب کا ہو یا بعید کا، گر قریب اصولاً اس تعلق کا بعید سے زیادہ مستحق ہے۔

اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں۔ اس کا عطف اس پہلی جمع صدیقی والی حدیث میں جو حتیٰ وجدت آخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری کا جملہ ہے، اس پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عبید بن السباق زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ جمع صدیقی کے وقت آخر سورۂ توبہ کی دو

آیتیں ابوخزیمہ انصاری کے سوا اور کسی کے ساتھ نہ ملیں اور خارجہ بن زید کہتے ہیں کہ سورہ احزاب کی آیت نہیں مل رہی تھی جس کو ڈھونڈھا گیا تو خزیمہ بن ثابت الانصاری کے ساتھ ملی البتہ اندازِ بیان میں اتنا فرق ہے کہ عبید کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زید نے جمعِ قرآن کا کام جب شروع کیا تو ایک ایک آیت حافظوں سے زبانی پوچھتے تھے اور تحریر طلب کرتے تھے تو آخر سورہ توبہ پر جب پہونچے تو یہ ابوخزیمہ کے سوا اور کسی کے ساتھ نہیں پائی گئی، غالباً لکھی ہوئی۔ مگر خارجہ کے بیان سے یہ پتا ملتا ہے کہ سورہ احزاب کی ایک آیت کسی کے پاس ملتی ہی نہ تھی۔

سلہ اور تفسیر ابن کثیر میں مسند امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ عبداللہ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ حرث بن الخزیمہ آخر سورہ براۃ کی ان دونوں آیتوں کو لے کر (جمع قرآن کے وقت) حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ مگر میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے ان کو رسول اللہ صلعم سے سنا ہے اور ان کو لکھ رکھا ہے اور یاد کر لیا ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں (بھی) قسم کھاتا ہوں کہ میں نے ان کو رسول اللہ صلعم سے سنا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ تین آیتیں ہوتیں تو میں ان کو ایک علیحدہ سورہ بنا دیتا، تو پھر قرآن کا کوئی سورہ دیکھو اور ان کو اس میں رکھ دو۔ تو لوگوں نے ان کو سورہ براۃ کے آخر میں رکھ دیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۹۵) تفسیر ابن کثیر میں اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی کا نام علی بن محمد بن سلمہ لکھا ہوا ہے جو اس حدیث کو محمد بن اسحق سے اور وہ یحییٰ بن عباد سے وہ اپنے والد عباد بن عبداللہ سے، وہ اپنے والد عبداللہ بن الزبیر سے روایت کرتے ہیں۔ مگر علی بن محمد بن سلمہ کوئی راوی حدیث ہی نہیں ہے۔ مسند احمد میں صحیح نام علی بن مجاہد بن مسلم ہے جس کا ترجمہ ابن حجر نے تہذیب التہذیب ج ۷ صفحہ ۳۷۹ میں لکھا ہے یہ شخص محمد بن اسحق سے بھی روایت کرتا ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ یہ شخص حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ ایک کتاب المغازی بھی اس نے تصنیف کی تھی۔ جس کی ہر روایت کے لئے اپنی طرف سے اسناد بنا لیتے تھے۔ اور یحییٰ بن الغریس وغیرہ نے اس کو کذاب کہا ہے۔ اس حدیث کو ابن حجر نے فتح الباری میں ج ۲ صفحہ ۲۲۳ میں بھی نقل کیا ہے۔ مگر اس کا ذکر ہی نہیں کیا کہ محمد بن اسحق سے اس کو کون روایت کرتا ہے۔ ایک حدیث اور بھی تفسیر ابن کثیر ج ۵ صفحہ ۹۵ میں ہے اور وہ بھی مسند احمد ہی سے ہے۔ کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ خلافت ابی بکرؓ میں لوگ قرآن جمع کرنے لگے مصاحف میں تو کچھ لوگ لکھتے تھے مگر لکھواتے تھے ابی بن کعب، تو جب سورہ براۃ کی (آخری آیتوں میں سے) اس آیت پر پہنچے ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبھم الآیہ تو لوگوں نے گمان کیا کہ یہ قرآن کا آخری حصہ ہے جو نازل ہوا۔ تو ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ اس کے بعد مجھ کو رسول اللہ صلعم نے دو آیتیں پڑھائی تھیں لقد جاءکم رسول من انفسکم آخر سورہ تک اور کہا کہ یہ قرآن کا آخری حصہ ہے۔ جو نازل ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ختم کیا اسی چیز سے جس سے شروع کیا

آخر سورہ والی آیت ابی بن کعب کے پاس تھی،

اللہ الذی لا الٰہ الا ھو اور وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔ (انبیاء ۲ ج ۱۷)

اس حدیث کے راوی بھی بعض مجہول بعض مجروح اور شیعے ہیں چنانچہ ربیع بن انس جو اس حدیث کو ابوالعالیہ سے اور وہ ابی بن کعبؓ سے روایت کرتے ہیں شیعے تھے اور شیعیت میں غلو رکھتے تھے۔ اور یہ بھی نہ کھلا کہ سورہ انبیاء کے دوسرے رکوع کی پندرھویں آیت سے ابتدا کس شے کی اور آخر سورہ توبہ پر ختم کس چیز کا ہوا؟ کیا سب سے پہلی آیت وہی تھی؟ یا سورہ توبہ کے شروع میں بھی راوی کے نزدیک ابی بن کعب کے عندیے میں یہ آیت تھی جو حذف ہو گئی؟ معاذ اللہ کیا کیا حدیثیں ہیں؟ تعریف کیجئے ان حدیثوں کو اپنی کتابوں میں درج کرنے والوں کی امانت و دیانت کی۔

ترمذی میں عبداللہ بن مسعود کی ناگواری

اور ترمذی جلد دوم صفحہ ۱۳۸ میں ہے کہ ابن شہاب زہری نے کہا کہ مجھ کو عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے کہا کہ زید بن ثابتؓ کا کتابت مصاحف کے لئے انتخاب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ناگوار گذرا اور انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے جماعت مسلمین! میں تو کتابت مصاحف سے معزول کیا جاؤں! اور اس کا ذمہ دار ایک معمولی آدمی ہو! خدا کی قسم میں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب کہ وہ ایک کافر کی پشت میں تھا ان کی مراد زید بن ثابت سے تھی۔ اور اسی لئے عبداللہ بن مسعودؓ نے اہل عراق سے کہا کہ (باقی بر صفحہ گذشتہ)

سلہ۔ کنز العمال ج ۱ صفحہ ۲۴۹ میں مسند احمد اور طبرانی سے منقول ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ آخری آیت جو اتری وہ لقد جاءکم رسول من انفسکم الخ ہے۔

جب اس کی تلاش ہوئی تو خزیمہ بن ثابت کے ساتھ ملی۔ غالباً یہاں بھی یہی مراد لیا جائیگا کہ لکھی ہوئی نہیں ملتی تھی، تلاش کے بعد خزیمہ کے پاس لکھی ہوئی ملی۔ البتہ عبید و خارجہ دونوں کے انداز بیان سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کے نہیں ملنے کا احساس صرف زید بن ثابت کو ہوا۔ اور صرف انھیں نے پایا بھی۔ جمع صدیقی کے وقت تو تنہا زید بن ثابت تھے ہی، کوئی دوسرا تو شریک کار ان کا تھا ہی نہیں۔ نقل مصاحف بعہد عثمانی کے موقع پر ہر چند ان کے تین اور شرکائے کار تھے مگر صرف وہ لکھنے میں شریک تھے، اسی لئے نسخنا میں جمع متکلم کا صیغہ لایا گیا۔ مگر آیت احزاب صرف انھیں کو یاد آئی کیونکہ صرف یہی اس کو رسول اللہ صلعم سے سنا کرتے تھے اسی لئے فقدت اور کنت اسمع بصیغۂ واحد متکلم لاتے گئے۔ البتہ تلاش کرنے میں سب شریک تھے۔ اسی وجہ سے فالتمسناھا میں جمع متکلم کی ضمیر پھر لے آئی گئی۔ پھر جب سب نے ڈھونڈھا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اہل عراق تم لوگ اپنے اپنے مصاحف کو پوشیدہ اور "مغلول" رکھو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (جو شخص "غلول" کریگا جس چیز کے ساتھ غلول کریگا اس کو لیئے ہوئے قیامت کے دن آئیگا (سورۂ آل عمران ع ۱۷ ح ۳) تاکہ اللہ تعالیٰ سے ان مصاحف کے ساتھ مصافحہ کرو۔" اس روایت کے راوی بھی زہری ہی ہیں۔ تعجب ہے کہ تفسیر ابن کثیر اور مسند امام احمد میں تو ہے کہ ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ کے زمانے میں جمع قرآن کے وقت میں ہی بتاتا جاتا تھا اور لوگ لکھ رہے تھے۔ اور بخاری و ترمذی و نسائی وغیرہ میں ہے کہ صدیق اکبرؓ نے صرف زید بن ثابتؓ کے ذمے جمع قرآن کا کام سپرد کیا۔ ان صحاح کی

عبداللہ بن مسعود کو شکایت اور ان کا غصہ

کتابوں میں ابی بن کعب کا کہیں نام نہیں اور یہاں ترمذی میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود کو شکایت تھی کہ کتابت مصاحف کا کام ایک کم سن چھوکرے کے سپرد کیا گیا اور ہمیں نہیں پوچھا گیا! اگر یہ شکایت نقل مصاحف بعہد عثمانی کے وقت کے متعلق ہے (جیسا کہ ترمذی کی حدیث سے کچھ پتا چلتا ہے) تو غصہ بیجا تھا۔ اس وقت تو ان کے ایک ہم پلہ ابی بن کعبؓ کو لکھے ہوئے صحیفوں کی فقط نقل کا کام کرنا تھا۔ اگر اس میں ان کو نہیں رکھا گیا تو کون سی جلنے کی شکایت تھی۔ بہرحال سب سے زیادہ مقام تعجب تو یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت میں نعوذ باللہ تحریف معنوی کی گئی۔ پوری آیت یوں ہے:۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ "اور کسی نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ چھپا رکھے۔ اور جو کوئی چھپائے گا وہ لائے گا اپنی چھپائی چیز کو دن قیامت کے پھر پورا پائیگا ہر کوئی جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ) اہل لغت کے نزدیک بالاتفاق غَلَّ يَغُلُّ خیانت اور

غلول کا حکم

بنیت خیانت کسی چیز کے چھپانے کے معنی میں مستعمل ہے۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں کہ کسی نبی کی شان یہ نہیں کہ وہ کوئی بات یا کوئی چیز بنیت خیانت کسی سے چھپائے۔" کیونکہ جو ایسا کریگا وہ اس بات یا اس چیز کے ساتھ جس کو اس نے بنیت خیانت چھپایا تھا قیامت میں آئے گا۔ تو پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اہل عراق سے کہنا کہ تم اپنے مصاحف کو بنیت خیانت چھپائے رکھو تاکہ قیامت کے دن ان مصاحف کے ساتھ جن کو تم نے بنیت خیانت چھپایا تھا حاضر ہو سکو۔ کس قدر قابل اعتراض ہے اور یہ کتنا بڑا اتہام و افترا حضرت عبداللہ بن مسعود پر ہے۔ اور کوفے ہی کی گھڑی ہوئی ایک

عبداللہ بن مسعود پر ایک اور بہتان

روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں سے کہتے تھے کہ مجھے کس کی قراءت پڑھنے کیلئے کہتے ہو؟ زید بن ثابت کی قراءت؟ میں نے رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے ستر سے کچھ اوپر سورتیں سیکھی ہیں۔ جس وقت زید لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے، یہ روایت اعمش کوفی سے ہے۔ گویا عبداللہ بن مسعود سمجھتے تھے کہ زید بن ثابت نے بطور خود جو چاہا لکھدیا۔ جس کو دو دو خلیفۂ راشدین نے لکھوایا۔ پھر حضرت عثمان نے حسب روایت بخاری تین قریشی صحابیوں کی نگرانی میں صاف کرایا اور نقل کرایا۔ اور خود بھی اس پر نظر رکھی تمام صحابہ نے جس پر مہر تصدیق ثبت کی اس سے تنہا ان کا اختلاف کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ دوسرے اکابر صحابہ و خلفائے راشدین نے بھی تو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے قرآن سنا اور سیکھا تھا۔ انھوں نے تو صرف ستر سے کچھ اوپر سورتیں سیکھی تھیں۔ کتنوں نے پورا قرآن رسول اللہ صلعم سے سنا اور سیکھا تھا۔ مگر در اصل یہ سب بہتان ہے عبداللہ بن مسعودؓ پر۔ اعمش کی روایتیں نسائی جلد دوم صفحہ ۲۷۶ میں ہیں ۱۲ منہ غفرلہ۔

توسب نے پایا بھی، اسی لئے دَجَدُنَا بھی جمع لایا گیا۔

غرض یہ واو عطف اس حدیث کو اس باب جمع القرآن میں نقل مصاحف بعہد عثمانی کے واقعہ کے ساتھ بھی جوڑ رہا ہے۔ اور پھر جمع صدیقی والے واقعہ کی طرف بھی غمازی کر رہا ہے۔ جس کا جدھر جی چاہے نکال لے۔ البتہ امام بخاری نے یہاں اپنے شیخ اور شیخ کے شیخ کا نام اڑا کر اور اس حدیث کو نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث کے بعد لکھ کر اور پھر ایک واو اپنی طرف سے بڑھا کر تاکہ اس کا عطف قریب پر کرنا زیادہ قرین قیاس سمجھا جا سکے۔ اس کی پوری کوشش فرمائی ہے کہ اس حدیث کو نقل مصاحف بعہد عثمانی ہی سے متعلق ثابت کیا جائے

امام بخاری کی کوشش

اور پھر اس کی زبردست تائید مزید یوں بھی کی کہ اس حدیث کو جب تفسیر سورہ احزاب میں لکھنے لگے تو وہاں اس مضمون کو کچھ الفاظ بڑھا کر اور واضح فرما دیا۔ اور اسی طرح کتاب الجہاد میں بھی۔ کیونکہ وہاں تو اس سے پہلے نقل مصاحف بعہد عثمانی والی روایت کے ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہاں بھی ایک واو عطف بڑھا کر اس حدیث کا تعلق عہد عثمانی سے بذریعہ عطف قائم کر دے سکیں اس لئے یہاں یہ مقصد کچھ الفاظ بڑھائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہاں تو صرف حین نسخنا المصحف لفظ تھا۔ یہاں لما نسخنا الصحف فی المصاحف کا لفظ لائے۔ اس لئے کہ صحف صدیقی کو بھی مصحف کہہ سکتے ہیں، اور بعض روایتوں سے اس کا پتا ملتا بھی ہے کہ ایک مصحف میں حضرت صدیق اکبرؓ نے قرآن مدوّن کرایا تھا۔ اس لئے صحف کا مصاحف میں لکھا جانا صاف طور سے کہا جائے گا جب تو اس واقعہ کو قطعیت کے ساتھ عہد عثمانی ہی کا کہا جائے گا۔ پھر وہاں صرف خزیمہ بن ثابت الانصاری تھا، یہاں یہ تصریح ہے کہ وہ خزیمہ جن کی ایک شہادت کو رسول اللہ صلعم نے دو شہادتوں کے برابر قرار دیا تھا اس لئے کہ سورۂ توبہ کے ملنے کا ذکر وہاں باب جمع قرآن میں ابوخزیمہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور اسی کتاب التفسیر میں خزیمہ کے ساتھ ہے۔ تو جب کتاب التفسیر میں آخر سورہ توبہ و آیت احزاب دونوں کے ملنے کا ذکر خزیمہ ہی کے ساتھ ہوگا تو یقیناً یا تو لوگوں کو شبہہ ہوگا یا ایک واقعہ کو غلطی روایت پر محمول کیا جائے گا

ایک شہادت دو شہادت کے برابر

اس لئے کتاب التفسیر اور کتاب الجہاد میں آیت احزاب والی حدیث میں خزیمہ کے ساتھ الذی جعل رسول اللہ صلعم شہادتہ شہادۃ رجلین کہہ کر صاف کر دیا گیا تاکہ آخر سورہ توبہ والی حدیث جو کتاب التفسیر میں ہے اور اس میں بھی خزیمہ ہی کا نام ہے تو یا تو یہ کوئی اور خزیمہ سمجھے جائیں یا غلطی روایت قرار دی جائے اور راوی ہی سمجھا جائے۔ اگرچہ خود امام بخاری نے یہ حدیث خزیمہ بن ثابت کے ذوالشہادتین ہونے کی کہیں اپنی کتاب الصحیح میں درج نہیں فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے خزیمہ بن ثابت الانصاری کی ایک شہادت کو دو مردوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا۔ یہ حدیث یقیناً امام بخاری کو نہیں ملی تھی، یا ملی تھی تو ان کے شرائط کے مطابق قابل وثوق ذریعے سے نہیں ملی۔ اس لئے ان کو رد کر دینا پڑی۔ مگر اس قابل رد روایت کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ذو الشہادتین ہونے کی روایت بخاری میں نہیں

بہرحال ان کے ذوالشہادتین ہونے کی حدیث پر بحث آگے آتی ہے۔ ابھی اس حدیث کو تین جگہ نقل کر کے جو امام بخاری نے متنِ حدیث میں فرق کیا ہے اور اس کی کوشش کی ہے کہ آیت احزاب والا واقعہ عہد عثمانی ہی سے متعلق کیا جائے اس پر غور فرمائیے۔ یہاں بس اسی قدر سمجھ لیجئے کہ ذوالشہادتین بنانے کی روایت بخاری میں

---

۵۷ - **ابن شہاب سے جمع قرآن کی ایک اور روایت**

ابن شہاب ہی سے مغازی موسیٰ بن عقبہ میں مروی ہے کہ لما اصیب المسلمون بالیمامۃ فزع ابوبکر وخاف ان یھلک من القرآن طائفۃ فاقبل الناس بما کان معھم وعندھم حتی جمع علی عھد ابی بکر فی الورق فکان ابوبکر اول من جمع القرآن فی المصحف (اتقان ص ۲۰ مطبوعہ مطبع احمدی) یعنی جب جنگ یمامہ میں مسلمانوں پر مصیبت آئی تو حضرت ابوبکرؓ گھبرائے اور ڈرے کہ کہیں قرآن کا ایک حصہ برباد نہ ہو جائے تو جس کے پاس یا جس کے ساتھ جو کچھ تھا لے آیا یہاں تک کہ اوراق میں قرآن عہد ابی بکرؓ میں جمع ہو گیا تو ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن مصحف میں جمع کیا۔ یہ روایت بھی نہیں ابن شہاب سے ہے یاد رہے کہ امام غفرا

امام بخاری نے جمع صدیقی والی حدیث باب جمع القرآن میں اس اسناد سے شروع کی ہے۔ حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل عن ابراھیم بن سعد قال حدثنا ابن شہاب الخ۔ اور کتاب التفسیر میں اس اسناد سے حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری۔ اور یہ آیت سورہ احزاب والی حدیث بھی کتاب التفسیر وکتاب الجہاد میں بعینہٖ اسی دوسرے اسناد سے ہے یعنی حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری کتاب التفسیر میں دونوں حدیثوں کے اسناد بالکل ایک ہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں امام بخاری ابو الیمان سے وہ شعیب سے وہ زہری سے اور وہ عبید بن السباق سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے کہا کہ الخ۔ اور یہاں امام بخاری انھیں ابو الیمان سے وہ انھیں شعیب سے وہ انھیں زہری سے اور وہ خارجہ سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے کہا الخ فرق صرف عبید بن السباق اور خارجہ بن زید کے ناموں کا ہے اور بس۔ یہ تو صرف اسناد کا فرق ہوا مضمون کا فرق یہ ہے کہ عبید بن سباق والی روایت میں جمع قرآن کے پورے واقعے کا ذکر ہے۔ اور خارجہ والی روایت میں اس پورے واقعہ جمع قرآن کا کوئی ذکر نہیں۔ آگے چلئے تو زہری نے عبید سے سن کر بقول ابو الیمان وشعیب کہا کہ جمع صدیقی کے وقت آخر سورہ توبہ کی دو آیتیں خزیمۃ الانصاری کے ساتھ ملیں ان کے سوا اور کسی کے ساتھ نہ تھیں۔ اور خارجہ سے بقول ابو الیمان وشعیب زہری نے سن کر کہا کہ نسخ مصحف (حسب حدیث باب جمع القرآن) یا نسخ مصحف در مصاحف (حسب حدیث کتاب التفسیر وکتاب الجہاد) کے وقت سورۂ احزاب

عبید بن سباق اور خارجہ بن زید دونوں کی روایتوں کا فرق

کی ایک آیت نہیں ملتی تھی تلاش کرنے سے خزیمہ بن ثابت الانصاری کے ساتھ ملی جن کی تنہا شہادت کو رسول اللہ صلعم نے دو مردوں کی شہادتوں کے برابر قرار دیا تھا (حسب حدیث کتاب التفسیر وکتاب الجہاد) غرض کتاب التفسیر میں آیت توبہ وآیت احزاب دونوں کے متعلق خزیمہ ہی کا لفظ ہے کہیں بھی ابو خزیمہ نہیں ہے۔ دونوں حدیثوں کے اسناد کی وحدت بتا رہی ہے کہ ایک ہی موقع کا ایک ہی واقعہ ہے مگر عبید اور خارجہ میں صرف اختلاف آیت کا ہے۔ لیکن "نسخ مصحف" اور پھر "نسخ صحف فی المصاحف" کا لفظ دونوں کو دو واقعہ بتانے کی غمازی کر رہا ہے۔ کس خوبصورتی سے ان حدیثوں کے بنانے والوں نے الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہیں۔

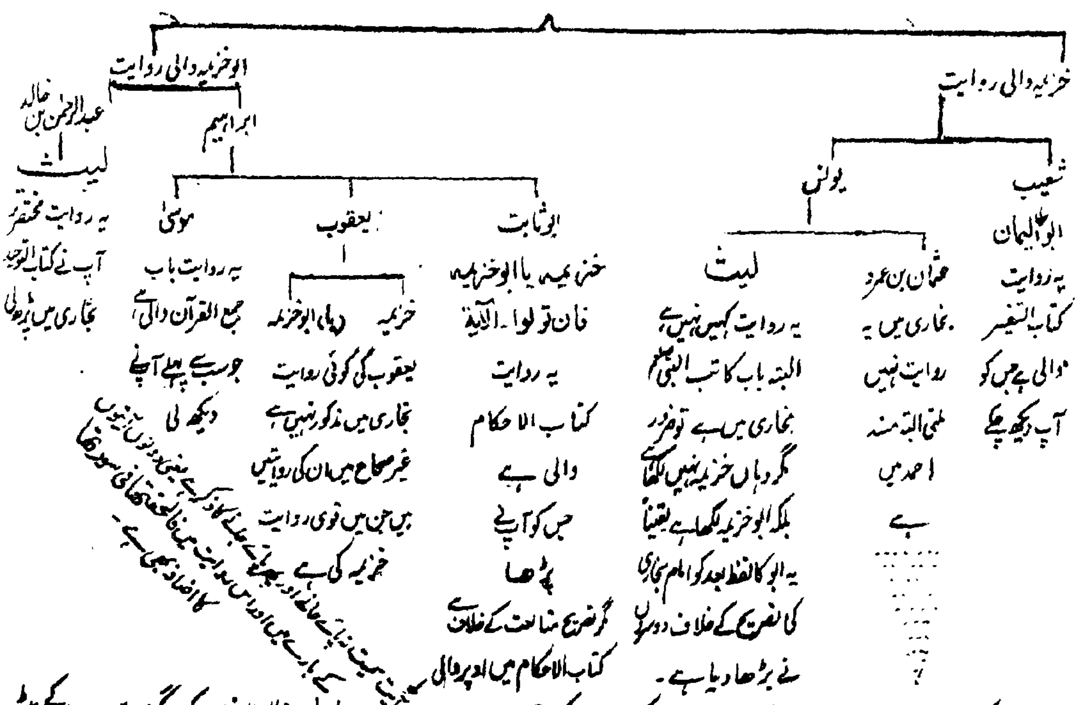
امام بخاری نے ابو الیمان وشعیب والے اسناد کی حدیث کو باب جمع قرآن میں نہیں لکھا کہ ان دونوں کی وحدت اسناد اور پھر دونوں میں خزیمہ ہی کا نام دونوں آیتوں کے نہ ملنے اور پھر پائے جانے کو ایک ہی واقعہ جمع صدیقی سے متعلق کر دے گا۔ اور ایک روایت غلط ضرور ثابت ہو کر رہیگی اس لئے ابو الیمان وشعیب والی حدیث متعلق جمع صدیقی کو تو کتاب التفسیر میں رکھا اور یہاں باب جمع القرآن میں موسیٰ بن اسمٰعیل عن ابراہیم بن سعد کی روایت سے حدیث جمع صدیقی درج کی، باوجود اس کے کہ ابراہیم سے زہری کی حدیثوں کی روایتیں عامۃ محدثین کے نزدیک ضعیف سمجھی جاتی ہیں تاکہ اختلاف اسناد اور خزیمہ وابو خزیمہ کے فرق سے دونوں آیتوں کی حدیثوں کو دو واقعوں سے متعلق کرکے دونوں کو صحیح ثابت کر دیا جا سکے، حقیقت یہ ہے کہ یہاں شیخ اور شیخ کے شیخ کا نام حذف کر دینے نے اور قال ابن شہاب کہ کر یہاں اس حدیث کو شروع کرنے نے۔ اور پھر اصل متن حدیث میں ایک داد غطفہ بڑھا دینے نے بڑا کام کیا جس نے اس حدیث کو بخاری میں اس دوراندیشی کے ساتھ داخل کیا ہے بڑا ادیب اور نکتہ سنج تھا۔

باب جمع القرآن اور کتاب التفسیر دونوں جگہ کی عبارتوں میں ایک معمولی سا فرق یہ بھی ہے کہ باب جمع القرآن میں فالتمسناھا فوجدناھا بصیغۂ جمع متکلم لایا گیا ہے تاکہ ڈھونڈھنے والوں اور پانے والوں کی جماعت ثابت ہو سکے، اور چونکہ نقل مصاحف کے وقت بقول راویان حدیث زید بن ثابت کے ساتھ تین قریشی کاتب بھی تھے اس لئے یہ خیال کیا جا سکے کہ اسی موقع پر ان کے ساتھ ایک جماعت شریک کار تھی جو آیت احزاب کی تلاش اور پھر پانے میں زید بن ثابت کی شریک رہی۔ مگر کتاب التفسیر کے موقع پر اتنی باریک بینی پیش نظر نہیں رہی اس لئے وہاں فالتمسناھا فوجدناھا کا لفظ حدیث میں بڑھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ صرف نسخنا الصحف فی المصاحف کہ کر وہاں نقل مصاحف عہد عثمانی کے واقعے کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ اور ایک ہی صیغۂ جمع سے کام نکال لیا گیا۔ اسی طرح فالحقناھا فی سورتھا فی المصحف" بھی باب جمع القرآن میں ایک اضافہ مفیدہ ہے ایک تو الحقنا کی ضمیر جمع متکلم نسخنا، التمسنا، اور وجدنا کی طرح متعدد شرکائے کار کا ثبوت دے رہی ہے اور پھر الحاق فی المصحف" کا لفظ بھی دو پہلو ہے یعنی وہ مصاحف جو نقل کئے جا رہے تھے اس میں الحاق کیا گیا، بایں طور کہ ہر شخص نے

الحاق فی المصحف کا لفظ دو پہلو ہے | اپنے اپنے مصحف میں اس آیت کا اس کی جگہ پر الحاق کر لیا یا یہ مطلب لیجئے کہ پہلے مصحف صدیقی ہی میں الحاق کر لیا گیا۔ پھر یہ کہنے کی ضرورت نہ رہی کہ نقلوں میں بھی الحاق کیا گیا' وہ تو یقیناً ہوا ہی۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیثیں گھڑنے والے اپنے فن کے بڑے ماہر تھے اور کافی غور و خوض کے بعد ایک جماعت وضاعین حدیث ایک ایک لفظ پر باہم بحث و تمحیص کر کے موضوع حدیثوں کی عبارتیں مرتب کرتی تھی، جب ہی تو بڑے بڑے محدثین دھوکا کھائے بغیر نہ رہتے تھے۔ البتہ تعجب یہ ہے کہ ان وضاعین وکذابین کے ساتھ رہتے رہتے اکابر محدثین بھی حدیثوں کی تطبیق میں بہت کافی حد تک تدلیس فی المتن والاسناد کے مرتکب ہو جاتے تھے جیسا کہ امام بخاری کی اس ایک حدیث میں کئی طرح کی تدلیس آپ نے دیکھی۔ اور تدلیس بھی ایسی جس کو بدترین تدلیس کہنا چاہئے۔ مگر کتاب الجہاد میں ہر جگہ ضمیر واحد متکلم ہی کی رہی صرف صحف و مصاحف کے دو لفظوں کو وہاں کافی سمجھا گیا اس لئے کہ یہاں تو یہی ایک حدیث تھی کسی دوسری حدیث سے تشابہ کا کوئی ڈر نہ تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا دامن اس تدلیس سے پاک ہے، الزام ہے ان حدیثوں کو ان کی کتاب میں داخل کر دینے والوں پر۔

خزیمہ یا ابوخزیمہ | اس کی بحث کسی قدر تفصیل کے ساتھ اوپر گذر چکی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نقشہ بھی بنا کر دکھا دیا گیا۔ میں وہ نقشہ پھر دوبارہ یہاں پیش کر دیتا ہوں تاکہ ناظرین کو ورق اُلٹنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

ابن شہاب زہری سے
آخر سورۂ توبہ کے متعلق



مختصر یہ ہے کہ شعیب اور یونس ابن شہاب سے خزیمہ کی روایت کرتے ہیں اور ابراہیم و عبدالرحمن ابن خالد ابوخزیمہ کی، مگر ابراہیم سے ان کے بیٹے یعقوب ایک اور روایت خزیمہ کی بھی کرتے ہیں۔ ابوثابت کو شک ہے کہ ہم سے ابراہیم نے "خزیمہ" کہا یا "ابوخزیمہ"۔ اور پھر یہ آخر سورہ توبہ کی دو آیتیں نہیں بلکہ صرف ایک ہی آخری آیت کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ابراہیم کی روایت میں سخت اضطراب ہے اور یہ زہری کی حدیثوں میں بہت ضعیف سمجھے بھی جاتے ہیں، اور پھر شیعوں میں ان کا رسوخ بھی ان کو کچھ مشتبہ کرتا ہے۔ باقی رہ گئے عبدالرحمن بن خالد۔ یہ تو ائمہ رجال کے نزدیک منکر حدیث ہی ہیں اور پھر شیعوں میں کافی حد تک ممدوح اور ثقہ و حجۃ ہیں۔ اس لئے ابوخزیمہ کی روایت بحیثیت نقد رواۃ کے

بے حد کمزور ہے۔

امام بخاریؒ سے ایک سوال

اگر امام بخاریؒ زندہ ہوتے، یا میں ان کے وقت میں موجود ہوتا تو ان سے ضرور یہ پوچھتا کہ آپ نے آیت احزاب کے ملنے کو تو خزیمہ بن ثابت کے متعلق کیا اور تنہا ان کی شہادت سے آیت احزاب کا قرآن میں داخل کر دیا جانا ان کے ذوالشہادتین ہونے کی وجہ سے اپنے نزدیک صحیح ثابت کر دیا۔ باوجود اس کے کہ آپ ان کے ذوالشہادتین ہونے کی حدیث خود پیش نہیں فرماتے، مگر آخر سورۂ توبہ کے ملنے کو جو تنہا ابوخزیمہ سے متعلق فرما رہے ہیں اور انھیں کی اکیلی شہادت پر ان دونوں آیتوں کے داخل قرآن کر دئے جانے پر اصرار فرما رہے ہیں، خدا کے لئے ان کے ساتھ ایک اور گواہ کا تو نام یہاں پر بڑھا دیجئے یا کم از کم ان کو بھی ذوالشہادتین لکھ دیجئے آخر آپ کے بعد والوں نے اس نقص کو محسوس کیا، چنانچہ ترمذی نے بروایت عبدالرحمٰن بن مہدی عن ابراہیم بن سعد عن الزہری جمع صدیقی کی حدیث میں آخر سورۂ توبہ کے ملنے کا ذکر بھی خزیمہ بن ثابت ہی کے ساتھ کیا ہے۔ بتصریح ولدیت، پھر نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث بھی اسی سلسلے سے ہے اور اس کے بعد آپ ہی کا تتبع کرتے ہوئے قال الزھری سے شروع کرکے آیت احزاب والی حدیث نقل کی ہے۔ جس میں زہری کے بعد والے شیوخ کا نام چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس آیت کے ملنے کا ذکر خزیمہ بن ثابت یا ابوخزیمہ کے متعلق لکھ دیا ہے تاکہ گنجائش ہر طرح کی رہے۔ آپ نے متابعت میں آخر سورۂ توبہ میں یہ علطف تردید رکھا تھا، ترمذی نے اس کو آیت احزاب میں رکھ دیا۔ اور بعضوں نے حدیث کے الفاظ میں کچھ رد و بدل کرکے حضرت عمرؓ کی بھی ایک اور شہادت داخل حدیث کر لی، مگر وہ تو صحاح سے باہر کی روایتیں ہیں۔ جناب کی روایت کے رو سے صرف ابوخزیمہ کی اکیلی شہادت آخر سورۂ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق کس طرح قبول کر لی گئی؟ میرے نزدیک راوی سے بھول ہو گئی آخر سورۂ توبہ کو ذوالشہادتین کے پاس ملنا تھا۔ ان کی اکیلی شہادت سے وہاں کام نکل جاتا۔ اور آیت احزاب زید بن ثابت کو یاد ہی تھی۔ صرف ایک ہی گواہ کی تو اور ضرورت تھی وہ ابوخزیمہ ہو جاتے۔ یہاں تو ذوالشہادتین کی کوئی ضرورت تھی ہی نہیں۔ کاش اس وقت بھی آپ کے پرستار لوگ آپ کی کتاب میں اتنا رد و بدل کر لیں۔

مجھ کو زیدؓ بن ثابت سے بھی ایک سوال کرنا تھا

کہ آپ کو نسخ مصاحف کے وقت یہ یاد آیا کہ سورۂ احزاب کی ایک آیت آپ رسول اللہ صلعم سے سنتے تھے۔ واحد متکلم کے صیغے کے ساتھ آپ کُنْتُ اَسْمَعُ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں۔ بخاری کے بعض نسخوں میں کثیراً کا لفظ بھی ہے یعنی آنحضرت صلعم کو یہ آیت پڑھتے ہوئے بہت مرتبہ آپ نے سنا اسی لئے یہ آیت آپ کو یاد تھی۔ تو آپ خود سورہ احزاب پڑھتے تھے تو اس آیت کو پڑھتے تھے یا نہیں؟ اگر نہیں پڑھتے تھے تو کیوں؟ جب یہ ایک سورۂ قرآن کی درمیانی آیت تھی اور آپ برابر رسول اللہ کو پڑھتے سنتے بھی تھے۔ تو پھر خود کیوں نہیں پڑھتے تھے؟ اور خود بھی پڑھتے تھے تو آپ کو فقط کُنْتُ اَسْمَعُ نہیں کہنا تھا۔ بلکہ اس کے بعد وانا اقرءُ بھی کہنا تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم برابر پڑھا کرتے تھے تو تنہا آپ ہی کیوں سنتے تھے جو واحد متکلم کی ضمیر کے ساتھ کُنْتُ اَسْمَعُ فرمایا۔ اور یہ تو فرمایئے، سورہ احزاب کی یہ آیت آپ کو جمع صدیقی کے وقت یاد آئی تھی یا نقل مصاحف بعہد عثمانی کے وقت؟ اگر جمع صدیقی کے وقت، تو آپ کو آخر سورۂ توبہ بھی جمع صدیقی ہی کے وقت یاد آئی اور صرف خزیمہ بن ثابت الانصاری ہی کے پاس ملی اور آیت احزاب بھی جمع صدیقی ہی کے وقت ملی، تو وہ بھی انھیں خزیمہ ہی کے پاس ملی یا ابوخزیمہ کے پاس؟ یا تو عبید و خارجہ میں سے ایک کی روایت غلط ہے، آپ کو فقط آخر سورۂ توبہ یاد آئی تھی جو صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملی یا صرف آیت احزاب یاد آئی تھی جو فقط خزیمہ کے پاس ملی۔ اصل واقعہ کیا ہے خدا کے لئے بتا کر تشفی فرمایئے۔

اور اگر جمع صدیقی کے وقت آخر سورۂ توبہ صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملی اور نقل مصاحف کے وقت آیت احزاب آپ کو یاد آئی جو صحف صدیقی میں نہ تھی تو آپ نے فوراً خزیمہ کو پکارا کہ آج سے اٹھارہ برس پہلے تمہارے ہی پاس آخر سورۂ توبہ بھی ملی تھی۔ اب کے آیت احزاب نہیں مل رہی ہے یہ بھی یقیناً تمہارے ہی پاس ملیگی۔ چنانچہ انھوں نے نکال کر پیش کر دی۔ یا آخر سورۂ توبہ تو ابوخزیمہ کے پاس ملی تھی۔ اب کے آیت احزاب [illegible] کر لئے آپ [illegible] ابوخزیمہ [illegible] ابوخزیمہ اور آیت احزاب لیکر پہنچ گئے۔ بہرحال یہ تو کہئے کہ آپ نے صحف صدیقی [illegible]

احزاب کی اس آیت سے خالی جمع کیا تھا، تو آپ کے جمع کے مطابق اٹھارہ برس تک تمام صحابہؓ کیا اسی طرح بغیر اس آیت کے ہی سورۂ احزاب پڑھتے رہے؟ اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اگر سہ بارہ بھی آپ کوشش فرماتے تو پھر کوئی آیت ضرور کسی ابن خزیمہ کے پاس مل جاتی۔ اس لئے آپ نے پھر ایک بار قرآن پر نظر ثالث کیوں نہ فرمائی؟ اور ہم کیونکر یقین کرلیں کہ اب یہ قرآن مکمل ہے؟

خلاصۂ بحث ناظرین کو جمع صدیقی کی مذکورہ بالا حدیثوں اور آخر سورۂ توبہ و آیت سورۂ احزاب و خزیمہ و ابو خزیمہ کے روایاتی اختلافات کے معائنے کے بعد یہ بخوبی معلوم ہوگیا ہوگا کہ درحقیقت یہ ساری حدیثیں منافقین عجم کی من گھڑت ہیں جن کا دو مقصد تھا۔ ایک تو قرآن مجید کی قطعیت و لاریبیت کے آفتاب روشن کو غبار اشتباہ میں چھپا دینے کی ناکام کوشش۔ دوسرے احادیث موضوعہ روایات مکذوبہ پر جو لوگ معترض ہوں، ان کو انھیں روایات جمع قرآن و آخر سورۂ توبہ و آیت احزاب وغیرہ کی مثال پیش کرکے خموش کردینا۔ اور سیدھے سادے مسلمانوں کو مصادرہ علی المطلوب کا مغالطہ دے کر قرآن و حدیث دونوں ہی کے متعلق صحیح عقیدے پر قائم نہ رہنے دینا۔ ائمہ محدثین جنھوں نے انھیں منافقین عجم سے زیادہ تر حدیثوں کے ذخیرے حاصل کئے اور وہ ان کو تابعی و تبع تابعی سمجھ کر ان سے حسن عقیدت رکھتے تھے، اس لئے ان کی منافقانہ چال بازیوں کو مطلق نہیں سمجھتے تھے اور ان کی من گھڑت جھوٹی جھوٹی حدیثوں کو اپنے دفاتر میں درج کرکرکے ان کی اور اشاعت کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی متضاد روایتوں کی تاویلیں کرکرکے سب کو صحیح ثابت کیا کرتے تھے۔ اس جمع قرآن کی خلاف قرآن و مخالف عقل و درایت حدیثوں کو جن کا ایک ایک لفظ خلاف واقعہ اور محض جھوٹ ہے صرف مانعین کتابت و جمع احادیث کی زبان بندی کے خیال سے اپنی کتابوں میں درج کرتے گئے، اور چونکہ ان حدیثوں کے اضطرابات و اختلافات کا مٹانا ممکن نہ تھا اس لئے محض بذریعہ حمایت روایات کے ماتحت خود بھی تدلیس کے مرتکب ہوتے گئے تدلیس بھی ایسی جو صرف اسناد ہی تک محدود نہ رہی۔ بلکہ متن حدیث میں بھی تدلیس سے باز نہ آئے جیسا کہ آیت سورۂ احزاب و آخر سورۂ توبہ والی دونوں حدیثوں کی تنقید کے سلسلے میں واضح طور سے آپ نے ملاحظہ فرمائی۔

اعجب العجائب و عجب العجائب امام بخاریؒ ج ۲ ص۔۔۔ میں فرماتے ہیں حدثنی محمد بن بشار قال حدثنا محمد بن عبد اللہ الانصاری قال حدثنا ابی عن ثمامۃ عن انس بن مالک قال نری ھذہ الایۃ نزلت فی انس بن النضر من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ۔ یہاں تو یہ حدیث مختصر طور سے مروی ہوئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ امام بخاری سے محمد بن بشار نے، ان سے محمد بن عبد اللہ الانصاری نے ان سے ان کے والد نے ان سے ثمامہ بن عبد اللہ بن انس نے اور ان سے ان کے دادا حضرت انسؓ بن مالکؓ نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت انس بن النضر ابن ضمضم بن زید کے متعلق وارد ہوئی ہے من المومنین رجال الآیہ۔ یہی حدیث پوری تفصیل کے ساتھ بخاری ج ص میں حمید الطویل کے طریق سے مروی ہے جس کو بخوف طوالت یہاں میں نقل نہیں کرتا ہوں۔ یہ انس بن النضر، حضرت انس بن مالک بن النضر کے حقیقی چچا تھے اور جنگ احد میں شہید ہوئے۔ اس حدیث کے بعد ماننا پڑیگا کہ یہ آیت کم سے کم حضرت انس بن مالک کو تو ضرور یاد ہوگی۔ اور حضرت زید بن ثابت سے زیادہ حضرت انس خدمت نبوی میں حاضر باش رہتے تھے اس لئے کہ یہ خادم نبوی تھے۔ زید بن ثابت سے زیادہ ان کو رسول اللہ صلعم سے قرآن سننے کے مواقع رہتے تھے۔ زید سے یہ صرف ایک ہی برس چھوٹے تھے۔ اس حدیث کا بنانے والا اگر خزیمہ بن ثابت کے عوض انس بن مالکؓ کا نام یہاں لیتا اور اس واقعہ آیت احزاب کو انس بن مالک والی حدیث نقل مصاحف کا ایک جزو بنا کر اس میں داخل کر دیتا، جس طرح جمع صدیقی والی حدیث میں آخر سورۂ توبہ کا واقعہ داخل ہے تو یہ حدیث بھی بہت زبردست طور سے صحیح مان لی جاسکتی تھی۔ یہ کیا کہ آیت اترے انسؓ بن مالکؓ کے چچا کی شان میں اور ان کو یہ اچھی طرح معلوم بھی تھا مگر جب یہ آیت ڈھونڈھی جاتی ہے تو یہ خموش بیٹھے رہتے ہیں اور اس کو لے کر تنہا خزیمہ بن ثابت تشریف لاتے ہیں۔ اور ان کی اکیلی شہادت سے کام نہ نکل سکے تو پھر ان کے ذوالشہادتین ہونے کی ایک حدیث گھڑنی پڑتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آیت احزاب والے واقعے کے گھڑنے والے کو حضرت انس کی یہ حدیث معلوم ہی نہ تھی، دوسرے یہ کہ خزیمہ بن ثابت کو ذوالشہادتین ثابت کرنا بھی اس ضمن میں مقصود تھا جس سے دوسرا کام نکالنا تھا۔ اسی لئے ذوالشہادتین والی حدیث عمارہ بن خزیمہ سے مروی ہے۔ اور النوری، مالکہؓ کی اکثر احادیث سے بہتر

واقف نہ تھے۔

ذوالشہادتین ابو داؤد، نسائی اور زہریات میں محمد بن یحییٰ الذہلی بطریق ابن شہاب زہری عمارہ بن خزیمہ سے اور وہ اپنے چچا سے جو صحابی تھے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلعم نے ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا تو وہ اعرابی آنحضرت صلعم کے پیچھے پیچھے چلا (یعنی یہ معاملہ راہ میں یا کسی جگہ پر ہوا کہ آنحضرت صلعم اپنے گھر سے کچھ دور تھے اور قیمت آپؐ کے پاس موجود نہ تھی مگر معاملہ طے ہو چکا تھا۔ آپ اس اعرابی کو گھوڑے کی قیمت دینے کے لئے اپنے ساتھ لے چلے اور وہ آنحضرت صلعم کے ساتھ ہو لیا) تاکہ آنحضرت صلعم سے گھوڑے کی قیمت لے لے (روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ وہ گھوڑا اس وقت کہیں گھاس چر رہا تھا یا نخاس پر، یا اعرابی کے گھر پر تھا۔ یا معاملہ طے ہونے کے وقت سامنے موجود تھا اور وہ اعرابی اس کی باگ تھامے ہوئے تھا۔ جب معاملہ طے ہو چکا تو آنحضرت صلعم نے گھوڑے کی باگ اپنے دست مبارک میں لے لی ہوگی اور گھوڑے پر قبضہ کر لیا ہوگا کیونکہ جب خرید لیا تھا اور معاملہ ہو چکا تھا تو رسول اللہ صلعم کو گھوڑے پر قبضہ کر لینا تھا۔ اور خود گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر گھر کی طرف چلنا تھا۔ مگر فحوائے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا جس طرح اعرابی کے قبضہ میں تھا اسی طرح گھوڑے کی باگ اعرابی ہی کے ہاتھ میں رہی غرض) تو رسول اللہ صلعم نے رفتار تیز کی (تاکہ جلد گھر پہنچکر قیمت ادا کر دیں) مگر اعرابی سست رفتاری کر رہا تھا۔ راہ میں کچھ لوگ اعرابی کو چھیڑنے اور گھوڑے کا دام ساٹھ کرنے لگے یہاں تک کہ رسول اللہ صلعم سے جو قیمت طے ہو چکی تھی اس سے بعض لوگ زیادہ دینے لگے اور ان لوگوں کو اس کا علم نہ تھا کہ آنحضرت صلعم سے معاملہ طے ہو چکا ہے، اس کے بعد اس اعرابی نے آنحضرت صلعم کو (چونکہ آپ تیز رفتاری کی وجہ سے آگے بڑھ چکے تھے) پکار کر کہا کہ آپ خریدنا چاہتے ہیں یا ہم اس گھوڑے کو دوسرے کے ہاتھ بیچ دیں)۔ اس کی یہ آواز سن کر آپ نے (قریب آکر) فرمایا کہ تم تو گھوڑا میرے ہاتھ بیچ چکے (اب تو تم میرے ساتھ قیمت لینے کو چل رہے ہو، یہ پوچھنا کیسا کہ خریدتے ہو یا نہیں)۔ اس اعرابی نے (معاملہ بیع کی تکمیل سے) انکار کیا اور رسول اللہ صلعم سے گواہ طلب کیا کہ اگر ہم تمہارے ہاتھ اس کو بیچ چکے ہیں تو اس کا گواہ لاؤ۔ (آنحضرت صلعم حیران تھے کہ گفتگو کے وقت تو کوئی اور موجود نہ تھا، ہم گواہ کس کو لائیں) مگر آپ بار بار فرما رہے تھے کہ ہم تجھ سے خرید چکے ہیں اور تو بیچ چکا ہے" اور وہ ہر مرتبہ گواہ مانگ رہا تھا مسلم حاضرین اس اعرابی سے کہہ رہے تھے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں جھوٹ نہیں بول سکتے جو یہ کہہ رہے ہیں یقیناً یہی سچ ہے تو کیوں غلط اصرار کر رہا ہے۔ لیکن وہ بار بار گواہ مانگے ہی جا رہا تھا مگر کوئی گواہ ہو جب تو آئے اتنے میں خزیمہ بن ثابت الانصاری بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے یہ صورت حال دیکھی تو اعرابی سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اسکی گواہی دیتا ہوں کہ تو نے اس گھوڑے کو ان کے ہاتھ بیچا ہے۔ ان پر رسول اللہ صلعم نے ان سے پوچھا کہ تم تو اس وقت موجود نہ تھے، تم شہادت کس طرح دے رہے ہو؟ تو انھوں نے کہا کہ آپ کی تصدیق کی بنا پر (یعنی چونکہ آپ کو اللہ کا رسول سمجھتا ہوں اور اس پر ایمان ہے کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں حق ہی فرماتے ہیں اس لئے میں نے یہ گواہی دی مگر پھر بھی یہ ایک ہی شہادت ہوئی اور ایک گواہ کی ضرورت باقی تھی اور اس اعرابی کا پھر بھی یہ مطالبہ رہ جاتا تھا کہ ایک گواہ اور لاؤ اس لئے) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خزیمہ کی ایک شہادت دو مردوں کی شہادت کے برابر ہے اور اس اعرابی کو (نعوذ باللہ) شکست دے دی (اور جو قیمت اس سے طے ہوئی تھی ادا کر کے گھوڑا اس سے لے لیا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے خزیمہ سے فرمایا کہ پھر ایسی ہمت نہ کرنا۔ مگر حافظ ابن حجر کے نزدیک یہ اضافہ معتبر نہیں۔ ورنہ پھر آیت احزاب والی شہادت کا کیا حشر ہوگا۔ اور ایک دوسرا مفاد جو ان کے ذوالشہادتین ہونے میں ہے وہ بھی حاصل نہ ہو سکے گا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ طبرانی اور ابن شاہین نے بھی اس حدیث کو بطریق زید بن الحباب عن زرارہ بن خزیمہ عن عمارۃ بن خزیمہ عن ابیہ مختصراً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے سوار بن الحرث (اس اعرابی کا نام تھا) سے ایک گھوڑا خریدا پھر اس نے (معاملہ بیع سے) انکار کر دیا خزیمہ بن ثابت نے آنحضرت صلعم کی طرف سے گواہی دی۔ رسول اللہ صلعم نے خزیمہ سے پوچھا کہ تم تو موجود نہ تھے پھر یہ شہادت کیسی؟ تو انھوں نے عرض کیا آپ کی تصدیق کی وجہ سے، آپ جو کچھ بولتے ہیں حق ہی بولتے ہیں، تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ خزیمہ جس کے موافق یا مخالف گواہی دیں تو بس (صرف ان کی تنہا گواہی) کافی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۹ ص ۲۹۰ میں ان روایات کو نقل کر کے اس کی توجیہ یہ لکھی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس اعرابی کے خلاف فیصلہ کیا اپنے علم کی بنا پر، اور خزیمہ کی گواہی محض ایک تاکید کی حیثیت میں تھی جس سے آپؐ نے اپنے مخالف پر غلبہ استدلال

حاصل فرمایا، تو آنحضرت صلعم کا ذاتی علم، اور خزیمہ کی شہادت مل کر دو گواہیاں ہوگئیں، اس لئے فیصلہ ایک گواہی پر نہیں بلکہ دو گواہی پر ہوا اس موقع پر ابن حجر نے ایک گواہی کو جو حقیقت میں گواہی بھی نہیں کہی جاسکتی، دو گواہیاں بالکل اسی منطقی طریق سے ثابت کیا ہے جس طرح کسی منطقی نے ایک انڈے کو دو انڈے ثابت کر دئے تھے۔ مگر یہ توجیہ آیت احزاب والی شہادت اور ایک اور موقع جس کا ذکر آگے آتا ہے جہاں صحابی سے معاملہ کے وقت تو ان کے ذوالشہادتین ہونے کو ختم کر دیگا

ذوالشہادتین والی حدیث کے راوی

سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ خزیمہ بن ثابت حضرت علیؓ کے حمائتیوں میں تھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ کوفہ چلے آئے تھے اور کوفہ ہی میں رہے۔ جنگ صفین ۳۷ھ میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے اور مارے گئے۔ باہمی خانہ جنگیوں میں حضرت علیؓ کے برسرِحق ہونے کے لئے جہاں حضرت عمار بن یاسرؓ کے لئے تقتلك الفئة الباغية والی حدیث اور

الفئة الباغیة والی حدیث

وہ حدیث کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت عائشہؓ سے کہا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم علیؓ کے خلاف برسرپیکار ہوگی اور اس وقت علیؓ حق پر ہونگے جس کی بعض علامتیں حضرت عائشہ کی درخواست پر آپ نے بتا دی تھیں اور جنگ جمل میں وہ سب علامتیں نمایاں نظر آئیں، وغیرہ گھڑی گئیں وہاں خزیمہ کے ذوالشہادتین ہونے کی بھی یہ حدیث گھڑی گئی کہ یہ ایسے شخص ہیں کہ جس کے موافق یا مخالف تنہا گواہی بھی دے دیں تو ان کی اکیلی گواہی دو مردوں کی گواہی کے برابر ہے، پھر حضرت علیؓ کی موافقت میں اور ان کے مخالفین کے خلاف ان کی شہادت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ یہ حضرت علیؓ کے حمایتی رہے اور اسی حمایت میں جان تک دے دی۔

ذوالشہادتین والی حدیث کے راوی بھی زہری ہی ہیں

بہرحال اس حدیث کے راویوں کا حال ملاحظہ فرمایئے۔ ابن شہاب زہری سے بعد والوں کو تو میں چھوڑتا ہوں۔ زہری اس حدیث کو روایت کرتے ہیں عمارہ بن خزیمہ سے اور وہ اپنے چچا سے جن کے بارے میں زہری کا بیان ہے کہ وہ صحابی تھے مگر زہری کو ان کا نام معلوم نہ تھا اور وہ عمارہ بن خزیمہ کے چچا بذات خود اس حدیث کو چشم دید واقعہ کی نوعیت میں بیان کرتے ہیں۔ تو آپ زہری سے پوری طرح واقف ہوچکے ہیں، زہری کے بعد یہاں خزیمہ بن ثابت الانصاری جن کے ذوالشہادتین ہونے کو، کہ ان کی ایک گواہی دو مردوں کی گواہی کے برابر ہے، صرف ان کے بیٹے ہی کی اکیلی گواہی سے ثابت کیا جارہا ہے غالباً ذوالشہادتین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے یہ خود بھی ذوالشہادتین ہوگئے۔ اور یہ ذوالشہادتین کے صاحبزادے بھی اس کو صرف اپنے ایک چچا سے سنتے ہیں، اور کسی سے نہیں اور وہ چچا بھی ایسے جن کا نام کسی دوسرے کو یہاں تک کہ خود ان کو بھی شاید معلوم نہ تھا ورنہ نام ضرور بتا دیتے۔ ذوالشہادتین کے گمنام بھائی بھی اس راز کو صرف ذوالشہادتین کے بیٹے ہی سے کہتے ہیں اور کسی سے نہیں۔ ان ذوالشہادتین کے گمنام بھائی کا نام بجز ابن مندہ کے اور کسی کو معلوم نہ ہوسکا۔ ابن مندہ محمد بن اسحٰق بن محمد بن یحییٰ بن مندہ کی ولادت ۳۱۶ھ کی ہے اور وفات ۳۹۵ھ میں تقریباً تین سو برس تک کسی کو بھی عمارہ بن خزیمہ کے چچا کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ معلوم ہوا تو تین سو برس کے بعد ابن مندہ کو کہ ان کا نام عمارہ بن ثابت تھا۔ اور زہری کہتے ہیں کہ عمارہ بن خزیمہ کے چچا صحابی تھے۔ مگر استیعاب وغیرہ میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ یعنی زہری کے سوا کسی نے صحابی نہیں جانا بلکہ ان کی شخصیت ہی نامعلوم تھی

عمارہ بن خزیمہ

ابن حجر تو عمارہ بن خزیمہ کے ترجمہ (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۱۲) میں لکھتے ہیں کہ یہ اپنے والد خزیمہ بن ثابت سے بھی روایت کرتے تھے تو پھر یہ روایت خزیمہ ہی کی طرف کیوں نہ منسوب کر دی گئی۔ ایک گمنام برادر خزیمہ کے سر کیوں تھوپی گئی؟۔ اگر اس کا خیال تھا کہ خزیمہ بن ثابت کے ذوالشہادتین ہونے کو خود انھیں کی روایت سے ثابت کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا تو پھر ان کے بھائی اور وہ بھی گمنام بھائی کی وساطت سے خود انھیں کے صاحبزادے سے روایت کرنا کب اچھا معلوم ہوتا ہے؟۔

قرینہ یہ ہے کہ یہ روایت پہلے تو یونہی مرتب کی گئی کہ عمارہ بن خزیمہ نے اس کو بلاواسطہ اپنے والد خزیمہ بن ثابت ہی سے سنا۔ مگر جب بعض واقف کاروں نے اعتراض کیا کہ عمارہ نے ۱۰۵ھ میں پچھتر سال کی عمر پاکر وفات پائی تھی، اور ان کے والد خزیمہ بن ثابت ۳۷ھ میں بسلسلہ جنگ صفین مارے گئے تھے۔ اس حساب سے اپنے والد کی وفات کے وقت عمارہ سات برس سے زیادہ کے نہ تھے۔ اس عمر میں اپنے والد سے ان کا کوئی حدیث سننا اور اس کا اسی طرح یاد رکھنا اور جوانی میں روایت کرنا وہ بھی صرف زہری ہی سے بالکل مستبعد ہے۔ اس اعتراض کے بعد

عن ابیہ کو عن عمہ بناکر اس حدیث کو عمارہ کے باپ سے نہیں بلکہ چچا سے مروی قرار دے دیا گیا۔ سننے والے تو یہ گمان کر کے کہ شاید ان کے کوئی چچا ہوں گے چپ ہو رہے، مگر یہ روایت کرنے والے تو جانتے تھے کہ ہم نے محض رجماً بالغیب عن عمہ بنا دیا ہے ان کو بھی معلوم نہ تھا کہ ان کے کوئی چچا تھے یا نہیں اور اگر تھے تو ان کا کیا نام تھا، اس لئے نام نہ بتانا ہی قرین مصلحت سمجھے۔ تین سو برس کے بعد ابن مندہ پر وحی آئی کہ عمارہ بن خزیمہ کے چچا کا نام بھی عمارہ ہی تھا۔ یہ عمارۃ بن خزیمہ تھے، وہ عمارہ بن ثابت۔ مگر اس کا کیا علاج ہے کہ زہری عن عمہ کے بعد یہ بھی فرما چکے تھے کہ وکان من اصحاب النبی صلعم۔ وہ کیا جانتے تھے کہ ایک ہی صدی کے بعد تقریباً تمام صحابہؓ کی فہرست مرتب ہو جائیگی اور اس فہرست صحابہؓ میں ثابت بن الفاکہ بن ثعلبہ کے صرف ایک ہی بیٹے خزیمہ کا نام آئمہ تاریخ و رجال لکھیں گے۔ عمارۃ بن ثابت یا کسی اور ابن ثابت ابن فاکہ بن ثعلبہ کا کہیں نام نہیں ہوگا۔ اگر وکان من اصحاب النبی صلعم کی جگہ عن عمہ کے بعد صرف خزیمہ کا لفظ بڑھا دیا جاتا تو اتنی دشواری نہ پیدا ہوتی اور اس حدیث کا راز اس حد تک نہ کھلتا۔

ابن مندہ دور کی کوڑی لائے

ان عمارۃ بن خزیمہ شیخ الزہری کی روایت اپنے باپ اور چچا سے جس قسم کی ہے اس کا تو پتا آپ کو مل گیا۔ بعض اور لوگوں سے بھی ان کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں۔ مگر وہ روایتیں ذوالشہادتین والی حدیث کی نہیں ہیں، وہ دوسری حدیث ہیں مثلاً سَبُرہ بن الفاکہ یا ابن الفاکہ یا ابن ابی الفاکہ یا ابن ابی الفاکہ۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو شرف صحبت حاصل تھا۔ صرف عمارۃ بن خزیمہ اور سالم بن ابی الجعدان سے روایت کرتے ہیں۔ غرض یہ سبرہ کچھ مجہول الحال سے معلوم ہوتے ہیں عبدالرحمٰن بن ابی القراد الانصاری ان کو بھی عبدالرحمٰن بن الفاکہ ہی کہا گیا ہے یعنی ابو قراد کنیت تھی اور فاکہ ان کے والد کا نام تھا۔ یہ بلاواسطہ رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے بھی صرف عمارہ بن خزیمہ اور حارث بن نفیل روایت کرتے ہیں مگر ابوالفتح الازدی کہتے ہیں کہ ان سے صرف عمارۃ ہی روایت کرتے ہیں یہ بھی غیر معروف ہی صحابی ہیں (تہذیب التہذیب)

کثیر بن السائب الحجازی ان سے بھی عمارۃ ہی تنہا روایت کرتے ہیں۔ کثیر بن السائب نام کے اور بھی تین آدمی ہیں۔ اور سب کے ایک ہونے کا بھی گمان کیا گیا ہے۔ اگر تعدد ہی مانا جائے جب بھی اس نام کے غیر معروف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ تفصیل تہذیب التہذیب جلد ۸ صفحہ ۴۱۵ میں دیکھئے غرض اگر واقعی عمارہ ہی کی روایتیں ان لوگوں سے اور ان کے باپ اور چچا سے ہیں تو یہ مرسل اور مجاہیل سے روایتیں کرنے کے خوگر رہے مگر قرینہ غالب یہی ہے کہ عمارہ کا قصور نہیں ہے، قصور ان لوگوں کا ہے جن لوگوں نے ان سے روایت کی ہے یا اور بعد والوں کا، واللہ اعلم

ذوالشہادتین والی روایت درایت کی روشنی میں

یہ عالم تو ذوالشہادتین والی حدیث کا از روئے روایت ہے۔ اب ذرا درایت کی عینک بھی لگا کر دیکھئے مگر خود دیکھئے، میں آپ کو دکھلانے کی کوشش نہیں کرونگا، اور خدا کے لئے ہر وہ شخص جو رسول اللہ صلعم کے خلق عظیم سے کچھ بھی واقف ہے ذرا ایمان سے کہے کہ یہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس اعرابی سے ایک گھوڑے کی خریداری پر اس طرح کا مناقشہ فرمایا ہوگا؟ اور پھر اپنے ہی ایک ماننے والے کی ان دیکھی گواہی پر جس کو فریق نے ہرگز قبول نہ کیا ہوگا، اور نہ کوئی منصف غیر جانبدار شخص اس ان دیکھی گواہی کو قبول کر سکتا ہے، محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر اپنے حق میں خود ڈگری لے کر اس اعرابی کو شکست دے دی ہوگی؟ اور خزیمہ کو اس طرح کی ان دیکھی گواہی پر چشم نمائی کرنے کے عوض ان کو ذوالشہادتین کا درجہ مرحمت فرما کر اور ان کی ہمت افزائی کی ہوگی؟ کلا واللہ! ماقدروا الرسول حق قدرہ۔

غالباً یہی روایتی کمزوریاں ایسی نمایاں تھیں کہ امام بخاری و مسلم نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں داخل نہیں فرمایا حتیٰ کہ ترمذی نے بھی اس کو قبول نہیں کیا۔ البتہ یہ مقام تعجب ضرور ہے کہ جب ذوالشہادتین والی حدیث امام بخاری اور ابو عیسیٰ الترمذی کے نزدیک قابل قبول نہ تھی تو پھر آیت احزاب کے ملنے پر ابو خزیمہ کو ذوالشہادتین کس بنیاد پر تسلیم کر لیا؟ یہ ایک دلیل ہے اس بات کی، کہ جمع قرآن کی حدیثیں بخاری و ترمذی میں داخل کر دی گئی ہیں امام بخاری و امام ترمذی نے اپنی کتاب میں ان حدیثوں کو ہرگز درج نہیں کیا، واللہ اعلم

تو اب دیکھئے کہ صرف زہری ہی سے تنہا عمارۃ بن خزیمہ نے اپنے باپ کے ذوالشہادتین بنائے جانے کی حدیث فقط اپنے ایک گمنام مجہول الحال

اسکی ایک دلیل کہ جمع قرآن سے متعلق تمام حدیثیں بخاری و ترمذی وغیرہ میں داخل کردی گئی ہیں۔ ان جامعین نے خود نہیں درج کیں

چچا سے سن کر بیان کی۔ اور بس صرف اسی ایک ضعیف ترین آحاد حدیث کی بنیاد پر۔ زہری اور پھر امام بخاری اور تمام محدثین و مؤرخین آیت احزاب والی حدیث کو اور بعض روایتوں کی بنا پر آخر سورۂ توبہ والی حدیث کو بھی خزیمہ بن ثابت کی اکیلی شہادت سے قطعی یقینی ثابت کر کے سمجھتے ہیں کہ دین کی بہت بڑی خدمت انجام دے دی۔

ہر پھر کر زہری

جمع قرآن صدیقی کی روایت زہری سے۔ نقل مصاحف بعہد عثمانی کی روایت زہری سے آیت احزاب و آخر سورۂ توبہ کی زہری سے۔ خزیمہ بن ثابت کے ذو الشہادتین ہونے کی حدیث زہری سے۔ اور صحاح کے احاطے سے باہر نکل کر دیکھئے اسی جمع قرآن سے متعلق کیا کچھ نہیں آپ کو زہری سے ملے گا۔ جن میں سے اکثر روایتیں تو ایسی ہی ہونگی جن میں زہری متفرد ہیں۔ خصوصاً متأخرین کی کتابوں میں متاخرین نے زہری کی تائید کے لئے بعد کو بعض حدیثوں کی متابعتیں ان کے دوسرے ہمعصروں سے بھی بنالیں، مگر ان متابعتوں کے راویوں کی حیات گذائی ہی ان کی موضوعیت کی گواہ بن جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی شہادت تو یہی ہے کہ اگر واقعی یہ حدیثیں بعد کو بنائی گئیں ہوتیں اور حقیقتہً اگلوں سے ان کی روایت صحیح ہوتی تو پھر اگلے جامعین احادیث ان روایتوں کو نظر انداز نہ فرماتے۔ اور صحاح میں یہ حدیثیں بھی ضرور ہوتیں۔

حضرت حفصہؓ کے پاس سے وہ صحیفے پھر کیا ہو گئے

یہ ایک ایسا اہم سوال ہے جو ہر صاحب عقل کے دماغ میں ضرور پیدا ہو کر رہتا ہے مگر افسوس کہ حسب روایت بخاری و ترمذی و نسائی، ابن شہاب بس یہاں تک کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ وہ صحیفے جن کو حضرت صدیق اکبرؓ نے زید بن ثابتؓ سے جمع کرایا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کو ملے اور حضرت عمرؓ کے بعد حضرت ام المومنین حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس چلے آئے اور انھیں کے پاس برابر رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کو جب نقل مصاحف کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان صحیفوں کو حضرت حفصہؓ کے پاس سے انھوں نے مستعار منگوا کر اور ان کی متعدد نقلیں کرالینے کے بعد پھر ان صحیفوں کو حضرت حفصہؓ ہی کے پاس واپس کردیا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ان کو بیت المال میں یا ہمارے پاس بحیثیت خلیفہ کے رہنا چاہئے آپ کے پاس ان کے رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بہر حال تو پھر وہ صحیفے حضرت حفصہؓ کے بعد کیا ہو گئے؟ آسمان پر اٹھا لیے گئے یا زمین ان کو نگل گئی؟ نہ زید بن ثابتؓ نے اس کو عبید بن السباق سے کہا نہ عبید نے زید سے پوچھا، نہ عبید نے ابن شہاب سے کہا نہ ابن شہاب نے اپنے چاروں شاگردوں سے کہا نہ ان میں سے کسی نے ابن شہاب سے پوچھا، یہاں تک کہ امام بخاری کو اپنے شیوخ سے اس کے پوچھنے کی ضرورت مطلق محسوس نہ ہوئی۔

شیعہ مجتہد علی نقی لکھنوی

اپنی کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" کے صفحہ ۱۳۲ میں لکھتے ہیں کہ "کتاب التعریف بالنبی و القرآن مطبوعہ مصر ۱۳۰۸ھ میں حسب ذیل الفاظ موجود ہیں فکتبوا المصحف واستعرضوہ عرضۃ بعد اخری فلما لم یجد و اشیئاً ارسل عثمان الی ام المومنین حفصۃ یسألھا ان ترسل الیہ المصحف لعرض المصحف علیہا وحلف لھا لیردنھا الیھا بعد مقابلۃ المصحف بھا فاعطتہ ایاھا، فعرض علیہا المصحف فلم یختلفا فی شئ فردھا الیھا وطابت نفسہ بما فعل وامر الناس ان یکتبوا مصاحف۔ فلما ماتت حفصۃ ارسل عثمان الی عبد اللہ بن عمر یطلب الصحف منہ وشدد فی طلبھا فاعطاہ عبد اللہ ایاھا فغسلھا غسلا۔ مجتہد صاحب ترجمہ یوں لکھتے ہیں" ان صحابہ نے مصحف کو لکھا اور چند

ے حضرت فاروق اعظمؓ کی وفات ماہ ذی الحجہ ۲۳ھ میں ہوئی اور حضرت ام المومنین حفصہؓ کی وفات ۴۵ھ میں جس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریباً پندرہ برس تک یہ صحیفے بقول زہری حضرت حفصہؓ کے پاس بلا وجہ اور بلا استحقاق رہے۔ اس درمیان میں صرف اتنے ہی دنوں تک حسب روایت زہری یہ مصاحف نقلین مصاحف بعہد عثمانی کے پاس رہے جب تک ضرورت نقل داعی رہی، نقل کے بعد پھر حضرت حفصہؓ کے پاس واپس چلے گئے۔ تعجب یہ ہے کہ نہ جمع صدیقی والی حدیث میں یہ مذکور ہے کہ کتنے دنوں میں کام ہوا نہ نقل مصاحف بعہد عثمانی والی روایت میں مدت کا اندازہ قائم کرنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ اس میں چوری پکڑی جا سکتی تھی اور جھوٹ کھل جا سکتا تھا۔ منہ

مرتبہ اس پر نظر کی گئی، جب کوئی غلطی نہ ملی تو عثمان نے ام المومنین حفصہ کے کہلوا بھیجا کہ وہ اجزائے قرآن بھیج دیجئے (صحف کا ترجمہ اجزائے قرآن معلوم نہیں کیوں کیا گیا؟) "ان صحیفوں کو بھیج دیجئے تا بالکل صحیح ترجمہ یہی تاکہ مصحف کا مقابلہ ان کے ساتھ ہو جائے۔ اور قسم کھائی کہ میں مقابلہ کے بعد واپس کر دونگا۔ چنانچہ حفصہؓ نے ان کو بھیج دیا اور مصحف کا ان سے مقابلہ کیا گیا ذرا سا بھی اختلاف دونوں میں نہ نکلا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کو اطمینان حاصل ہوا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس مصحف کے نقول تحریر کریں۔ جب حفصہؓ کا انتقال ہوا تو حضرت عثمانؓ نے عبد بن عمر کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ ان اجزاء (پھر صحف کا ترجمہ اجزاء کیا گیا) کو بھیج دیں۔ اور بڑی سختی کے ساتھ ان سے مطالبہ کیا۔ اس وقت انھوں نے مجبور ہو کر وہ اجزاء ان کو بھیجے ا بھیج دئے اور حضرت عثمانؓ نے ان کو پانی سے بالکل دھو ڈالا" اس کے بعد مجتہد العصر والزمان صاحب نے خوب جلے دل کے پھپھولے پھوڑے کہ دنیائے علم و تمدن و تہذیب تو اصل نسخوں کی حفاظت کرتی ہے اور حضرت عثمانؓ کے یہ ظلم کیا کہ قرآن کا اصل نسخہ جس کو خلیفہ اول نے بمشکل زید بن ثابتؓ سے جمع کرایا تھا اس کو ضائع کر دیا مگر مصنف کذاب تحریر جس طرح واقعی دروغ باف تھا اسی طرح یہ مجتہد صاحب بھی دروغ کو فروغ دینے والے ہی نکلے، آخر یہ بھی تو مجتہد ہی ہیں۔ سفید جھوٹ کوئی بولے تو ایسا بولے۔ سیر و تاریخ کے مبتدی بچے بھی جانتے ہیں کہ حضرت ام المومنین حفصہؓ سے تقریباً پندرہ برس پہلے عثمانؓ کی شہادت ہو چکی تھی۔ حضرت عثمان کی شہادت وسط ایام تشریق ۳۵ھ ہجری میں ہوئی اور حضرت حفصہؓ کی وفات ۵۰ھ ہجری میں ہے۔ پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد عبداللہ عمرؓ سے صحیفوں کو حضرت عثمانؓ کا زور منگوا کر دھلوا دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ مگر افسوس کہ سفید جھوٹ لکھ کر چھاپ دینے میں بھی کچھ شرم نہیں محسوس ہوئی۔ غنیمت ہے کہ مجتہد صاحب کی نظر تفسیر ابن جریر پر نہ پڑی ورنہ وہ تفسیر ابن جریر کا بھی حوالہ اس روایت کے نقل کرنے کے وقت ضرور دیتے اس میں بھی یہ روایت موجود ہے مگر ابن جریر بھی آخر شیعہ ہی تھے۔ حضرت عثمان اور حضرت حفصہؓ کے سنین وفات ان کو بھی یاد نہ رہے اور لکھ مارا۔ درحقیقت اس روایت کو ابن جریر ہی نے گھڑا ہے پھر ان سے دوسرے شیعوں نے لیا۔

البتہ کنز العمال میں ہے | قال الزهري اخبرني سالم بن عبد الله ان مروان كان يرسل الى حفصة يسألها الصحف التي كتب فيها القرآن فتابى حفصة ان تعطيها اياه - فلما توفيت حفصة ورجعنا من دفنها ارسل مروان بالعزيمة الى عبد الله بن عمر ليرسل اليه بتلك الصحف فارسل بها اليه عبد الله بن عمر فامر بها مروان فشققت وقال مروان انما فعلت هذا لان ما فيها قد كتب وحفظ بالمصحف فخشيت ان طال بالناس زمان ان يرتاب في شان هذا المصحف مرتاب او يقول قد كان فيها شئ لم يكتب (رواه ابن ابي داؤد) یعنی زہری کہتے ہیں کہ مجھے سالم بن عبداللہ نے خبر دی کہ مروانؓ حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیجا کرتے تھے ان صحیفوں کو مانگنے کے لئے جس میں قرآن لکھا گیا تھا۔ تو حضرت حفصہؓ ان کو اس کے دینے سے انکار کرتی تھیں۔ تو جب حضرت حفصہؓ وفات پا گئیں اور ہم لوگ ان کے دفن سے واپس آئے تو مروان نے پورے ارادے کے ساتھ عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ ان صحیفوں کو ان کے پاس بھیج دیں۔ تو انھوں نے ان کے پاس وہ صحیفے بھیج دئے۔ تو مروان نے اس کو پرزے پرزے کر دینے کا حکم دیا

لہ مجتہد صاحب کمال میں قرآن کی عداوت اس قدر راسخ ہو گئی ہے کہ ایک دوسرے شیعہ ہی مجتہد کی عربی کتاب کی عبارت کا بھی بعض جگہ قصداً صحیح ترجمہ نہیں کرتے جس طرح "صحف" کا ترجمہ ہر جگہ اجزاء کیا ہے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ حضرت حفصہؓ کے پاس بھی پورا قرآن نہ تھا بلکہ قرآن کے کچھ اجزاء تھے اسی طرح یہاں بھی والله عن حفصة بعدی اخری کا ترجمہ اتنا لکھ دیا کہ اور مصحف کا ان سے مقابلہ کیا گیا۔ حالانکہ صحیح ترجمہ یوں کرنا تھا کہ "اور صحابہ نے بار بار مصحف کا ان صحیفوں سے مقابلہ کیا" بار بار مقابلہ کا اقرار اپنے قلم سے ہندی مجتہد صاحب نہ کر سکے اسلئے ترجمہ میں تحریف سے کام لینے پر مجبور ہوئے مگر اس روایت کا ماخذ مصری مجتہد صاحب نے بتایا نہ ہندی مجتہد نے اس کا پتہ لگایا۔ کتاب التعریف والے تمہ ہندی کے مجتہد ہی یا نور اسقدم یہ تیرہ سو برس کے بعد یہ نئی بات ایک مجتہد شیعہ ہی کہہ سکتا ہے۔ اس میں صحیفوں کے نقل کرنے کا ذکر ہی نہیں بلکہ پہلے صحابہ نے قرآن جمع کر لیا اسکے بعد مقابلہ کرنے کیلئے حضرت حفصہؓ کے یہاں سے صحیفے منگوائے گئے۔ ۱۲ [illegible]

لہ مروان بن الحکم بن ابی العاص ۴۲ھ میں حضرت معاویہؓ کے حکم سے والی مدینہ طیبہ تھے اور معاویہ بن یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ۶۴ھ میں شام کے لوگوں نے انہیں کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ مگر حرمین شریفین اور پورے حجاز میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت رہی کہ بعد تسلیم کر لی گئی تھی۔

اور کہا کہ میں نے ایسا اس لئے کیا کہ جو کچھ اس میں ہے وہ لکھا جاچکا اور مصحف میں محفوظ ہو چکا۔ تو میں ڈرا کہ لوگوں پر زمانہ جب دراز ہوئے تو کوئی شکی مزاج اس مصحف کی شان میں (جو لوگوں کے پاس ہے) شک نہ کرنے لگے یا کہے کہ ان صحیفوں میں کوئی چیز تھی جو نہیں لکھی گئی۔ (کنز العمال جلد ا صفحہ ۲۸۰)

حضرت حفصہؓ کے صحیفوں کا حال زہری جانتے تھے

دیکھئے ان صحیفوں کا حال زہری کو معلوم تھا۔ ان کے چار شاگردوں میں جو جمع صدیقی والی حدیث ان سے روایت کرتے ہیں یا وہ جو نقل مصاحف والی حدیث نقل کر رہے ہیں اگر پوچھتے کہ آخر حضرت حفصہؓ کے بعد وہ صحیفے کیا ہوگئے تو وہ ضرور بتا دیتے مگر ان لوگوں کو خدا جانے کیا ہوگیا تھا ان میں سے کسی نے بھی یہ ضروری بات زہری سے نہیں پوچھی۔ شعیب جو کاتب زہری تھے ان کو بھی افسوس کہ یہ توفیق نہ ہوئی کہ اتنا پوچھ لیں۔ بہرحال مگر اس روایت کا آخری ٹکڑا "کہ میں ڈرا کہ زمانہ دراز گذرنے پر کوئی شکی مزاج یہ شک نہ پیدا کرے کہ موجودہ مصاحف میں کوئی چیز ایسی نہیں لکھی گئی جو ان صحیفوں میں تھی، اس لئے ہم نے ان صحیفوں ہی کو ضایع کر دیا" کس قدر غلط توجیہہ قصداً اس قول کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ شک نہیں کر رہے ہیں تو اس روایت کو پڑھ کر شک کریں۔ حالانکہ یہ مصحف "امام" جو حضرت حفصہؓ کے پاس عہد نبوی سے چلا آرہا تھا اور عہد خلفائے راشدینؓ تک برابر رہا۔

مروان کی دور اندیشی

مروان غریب نے اپنے زمانے میں منافقین عجم کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ کر یہ محسوس کیا اور صحیح محسوس کیا کہ آگے چل کر یہ مصحف نبویؐ معلوم نہیں کس کے ہاتھ لگے اور کب ان منافقین کو اس میں کچھ کمی بیشی کا موقع مل جائے۔ اور پھر یہ اصل مصحف نبویؐ میں تحریف کر کے عامۃ مسلمین کے پاس جو مصاحف ہیں ان صحیفوں کی محرّف آیات و سور کو دکھا کر سب کو برباد کر دیں اس لئے ان کا ضایع کر دینا ہی عین مصلحت ہے، ان کے بعد پھر تمام مصاحفِ عالم کی حیثیت یکساں رہ جاتی ہے۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مروان بن حکم کی یہ نہایت پر حکمت دور اندیشی تھی فللّٰہ درہ ثم للّٰہ درہ وجزاہ اللّٰہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔ مگر افسوس کہ ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد | عیب نماید ہنرش در نظر

ذکر متابعات، فریضۂ محدث احادیث جمع صدیقی، اور صحیح بخاری

ایک حدیث جو کسی خاص سلسلۂ اسناد سے روایت کی گئی ہے، اگر وہ کسی دوسرے اسناد سے بھی مروی ہے تو دوسری روایت کو پہلی روایت کی متابعت یعنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث کے ایک سلسلۂ اسناد کی تائید متعدد سلاسل اسناد سے ہو جب تو وہ حدیث بہت کافی حد تک قوی الروایت عموماً سمجھی جاتی ہے اگرچہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کیونکہ وضاعین وکذابین ایسا بھی کرتے تھے کہ ایک حدیث گھڑ کر اس کی چند متابعین بھی بنالیں اور پھر ان سلاسل اسناد کو آپس میں تقسیم کر کے مختلف مقامات میں جاجا کر پھیلانے لگے۔

بہرحال محدث کا یہ فرض ضرور ہے کہ جس حدیث کی متابعتوں کا وہ ذکر کرے ان متابعتوں کو یا تو تفصیل اسناد وہیں پر نقل کر دے یا اپنی اسی کتاب میں کسی دوسری مناسب جگہ پر درج کر دے، اور اگر اس سے متقدم کسی محدث نے اپنی کسی کتاب میں ان متابعتوں کو درج کیا ہے تو اس متقدم محدث کا اس کی اس تصنیف کے نام کے ساتھ جس میں وہ متابعتیں مذکور ہیں پورا پتا بتا دے۔ کسی محدث کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی حدیث کی کسی متابعت کا تو ذکر کرے، مگر اس متابعت والی حدیث کو اپنے بعد والوں کے لئے چھوڑ دے کہ جو لوگ آئندہ پیدا ہونگے اور حدیث کی کوئی کتاب لکھیں گے تو اس متابعت کو اپنی کتاب میں درج کر لیں گے۔

امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں جمع صدیقی والی حدیث لکھ کر جن متابعتوں کی تصریح فرمائی ہے ان میں کی متعدد متابعتیں صحیح بخاری میں نہیں ہیں۔ مثلاً یعقوب بن ابراہیم اور عثمان بن عمرو کی کوئی متابعت بھی بخاری میں مذکور نہیں بلکہ صحاح کی کسی کتاب میں ان کی متابعتیں درج نہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی متابعتیں امام بخاریؒ اور دوسرے مؤلفین صحاح کے نزدیک قابلِ اعتبار نہ تھیں، جب تو ان کی متابعتوں کا حال جانتے ہوئے بھی کسی نے ان کو اپنی کتاب میں درج نہ کیا تو پھر ایسی ناقابل اعتبار متابعتوں کا

ذکر ہی کیا ہے۔؟

اور بعض جگہ امام بخاری ذکر متابعت میں تو کچھ لکھتے ہیں اور متابعت والی اصل حدیث میں کچھ اور مثلاً لیث کی متابعت جو یونس سے مروی ہے ذکر متابعت میں خزیمہ والی حدیث کا اس کو متابع ظاہر فرماتے ہیں مگر باب کاتب النبی میں جب یہ لیث والی حدیث لکھتے ہیں تو اس میں ابوخزیمہ لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح ابوثابت کی متابعت میں خزیمہ یا ابوخزیمہ سے آخر سورۂ براۃ کی ایک ہی آیت کا ملنا نقل کرتے ہیں۔ مگر کتاب الاحکام میں جب ابوثابت والی حدیث لکھتے ہیں تو آخر سورۂ براۃ کی دونوں آیتوں کے خزیمہ یا ابوخزیمہ کے ساتھ ملنے کی تصریح فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں ان متابعتوں میں یہ مخالفتیں خود امام بخاری کی طرف سے ہیں یا راویان صحیح بخاری کی یہ تحریف و تصحیف ہے۔ مجھ کو تو یقین ہے کہ باب جمع القرآن اور جمع قرآن کے متعلق تمام حدیثیں بعض راویان صحیح بخاری نے اصل کتاب میں داخل کر دی ہیں۔ جیسا کہ حدیث کی اکثر کتابوں کے ساتھ بعض تلامذہ محدث یا کاتبین و وراقین (یعنی جلد بندوں) نے کیا ہے۔ اگر یہ تسلیم نہ کیا گیا تو پھر یہ ماننا پڑیگا کہ امام بخاری خود منافقین عجم کے دام تزویر میں پھنسے اور ان کی من گھڑت جھوٹی حدیثوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے تدلیس اور بدترین تدلیس تک کے مرتکب ہوئے، مگر میں امام بخاریؒ کے متعلق ایسا گمان نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال آخر میں اتنا ضرور میں کہونگا کہ قرآن پاک کو مشتبہ کہنے کے لئے صحابہ پر اتہام، اور ایسا اتہام جس کی لپیٹ میں رسول اللہ صلعم بلکہ اللہ تعالےٰ کی ذات پاک بھی آجائے۔ کوئی معمولی گناہ نہیں ہے، جس نے جان بوجھ کر اس پہاڑ جیسے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ہم آپ نہ سہی اللہ تعالےٰ ان لوگوں سے خوب واقف ہے۔ لکل امرئ منہم ما اکتسب من الاثم والذی تولی کبرہ منہم له عذاب الیم۔

حدیث نقل مصاحف بعہد ذی النورین | باب جمع القرآن صحیح بخاری میں بالکل ایک سلسلہ اسناد سے دو حدیثیں ابن شہاب زہری سے مروی ہیں۔ ایک تو حدیث جمع صدیقی جس کی مفصل بحث آپ ملاحظہ فرما چکے، دوسری حدیث نقل مصاحف بعہد عثمانی والی۔ جو اس وقت آپ کے زیر غور و بحث آرہی ہے۔ اگرچہ اس پر بھی مجملاً کچھ بحث حدیث جمع صدیقی کے ضمن میں اوپر گذر گئی ہے مگر یہ مجلس چونکہ خاص اسی پر بحث و تمحیص کی ہے اس لئے اس موقع پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس حدیث پر بحث کر دینا ضروری ہے۔ تاکہ مجلس سونی نہ رہے پہلے پوری حدیث معہ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اصل حدیث | حدثنا موسی۔ قال حدثنا ابراهيم قال حدثنا ابن شهاب ان انس بن مالك حدثه ان حذيفة بن اليمان قدم على عثمان وكان يغازي اهل الشام في فتح ارمينية واذربيجان مع اهل العراق فافزع حذيفة اختلافهم في القراءة۔ فقال حذيفة لعثمان يا امير المومنين ادرك هذه الامة قبل ان يختلفوا في الكتب اختلاف اليهود والنصارى۔ فارسل عثمان الى حفصة ان ارسلي الينا بالصحف ننسخها في المصاحف ثم نردها اليك۔

جمع صدیقی و نقل مصاحف دونوں حدیثیں امام بخاری جو روایت کرتے ہیں تو زہری تک تو دونوں کے اسناد ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ جمع صدیقی والی حدیث زہری عبید بن السباق سے سنتے ہیں اور وہ زید بن ثابت سے، اور نقل مصاحف والی حدیث زہری بلاواسطہ انس بن مالک سے سنتے ہیں جمع صدیقی والی حدیث کو امام بخاری پانچ جگہ پوری کتاب میں مطولاً و مختصراً نقل کرتے ہیں اور ایک جگہ اس کی متابعتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان متابعتوں میں سے بعض تو ان کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ اور بعض صحاح کی کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔ صحاح سے باہر مسند احمد وغیرہ میں ملتی ہیں وہ بھی ناقص طور سے اور بعض متابعتوں کے خلاف حدیث خود انہیں کی کتاب میں موجود ہے مگر یہ ساری متابعتیں زہری کے بعد کی ہیں۔ اس لئے بالکل غیر مفید۔ غرض زہری تک حدیث جمع صدیقی بالکل آحاد در آحاد رہتی ہے۔ اور یہ نقل مصاحف والی حدیث تو زہری کے شاگرد ابراہیم بن سعد ہی کی روایت زہری سے خود محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ اور تحقیق کے بعد تو پتا چلتا ہے کہ ابراہیم کا زہری سے سماع حدیث ہی ممکن نہیں۔ بس انہیں ابراہیم تک یہ نقل مصاحف والی حدیث آحاد در آحاد رہتی ہے۔ جس کی کوئی متابعت امام بخاری کو نہ مل سکی۔ ابراہیم کے بعد والی متابعت بھی امام بخاری کو نہ مل سکی ورنہ ضرور دیکھتے۔ غالباً اس وقت تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ یا بڑی لمبی یہ نقل مصاحف والی حدیث بخاری میں داخل کی گئی اتنا وقت نہ ملا کہ دو ایک متابعتیں بھی بنا کر لگا دی جاتے۔ واللہ اعلم ۱۲

فارسلت بہا الی عثمان ۔ فامر زید بن ثابت وعبد اللہ ابن الزبیر وسعید بن العاص وعبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام فنسخوہا فی المصاحف. وقال عثمان للرھط القرشیین الثلثۃ اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیء من القراٰن فاکتبوہ بلسان قریش۔ فانما نزل بلسانھم، ففعلوا۔ حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصۃ۔ وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا۔ وامر بما سواہ من القراٰن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق۔ قال ابن شھاب واخبرنی خارجۃ بن زید ابن زید ابن ثابت، قال فقدت ایۃ من الاحزاب حین نسخنا المصحف قد کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرؤھا۔ فالتمسناھا فوجدناھا مع خزیمۃ بن ثابت الانصاری "من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ" فالحقناھا فی سورتھا فی المصحف (باب جمع القراٰن بخاری) (ترجمہ) امام بخاری سے موسیٰ (بن اسمٰعیل) نے اور ان سے ابراہیم (بن سعد) نے، ان سے ابن شہاب زہری نے حدیث بیان کی کہ ان سے انس بن مالک نے حدیث بیان فرمائی کہ حذیفہ بن الیمان (صحابی) حضرت عثمان کے پاس آئے۔ اور وہ اہل عراق کے ساتھ فتح ارمینیہ و آذربایجان میں اہل شام سے جہاد کر رہے تھے۔ تو حذیفہ کو اہل عراق کے اختلافات قرات نے گھبرا دیا۔ حذیفہ نے حضرت عثمان سے کہا کہ اے امیر المومنین اس امت کی اس سے پہلے خبر لیجئے کہ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح کتاب اللہ میں اختلاف پیدا کر دیں۔ تو حضرت عثمان نے حضرت (ام المومنین) حفصہؓ کے پاس (خدا جانے کس شخص کو) بھیجا کہ صحیفے ہم لوگوں کے پاس بھیج دیجئے تاکہ ہم لوگ مصحفوں میں نقل کر لیں۔ پھر ہم لوگ اسکو آپ کے پاس واپس کر دیں گے۔ تو حضرت عثمان کے پاس حضرت حفصہؓ نے وہ صحیفے بھیج دیئے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت، عبد اللہ بن الزبیر، سعید بن العاص اور عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا۔ تو ان چاروں نے ان صحیفوں کو مصحفوں میں لکھ ڈالا اور حضرت عثمان نے تینوں قریشیوں سے کہا کہ جب تم لوگ زید بن ثابت سے قرآن سے متعلق کسی چیز میں اختلاف کرو تو، اس کو لکھو قریش کی زبان میں۔ کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے تو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک کہ صحیفوں کو مصاحف میں لکھ چکے تو حضرت عثمان نے ان صحیفوں کو حضرت حفصہؓ کے پاس واپس بھیجدیا۔ اور ہر افق میں ایک مصحف بھیجدیا جو لکھا گیا تھا، اور اسکے ماسوا جو قرآن بھی صحیفوں یا مصحفوں میں ہو۔ اسکے بارے میں حکم کیا کہ جلا دیا جائے۔ ابن شہاب نے کہا کہ اور خارجہ بن زید بن ثابت نے مجھے خبر دی کہ انھوں نے زید بن ثابت سے سنا کہ انھوں نے کہا کہ جس وقت ہم لوگ مصحف لکھ رہے تھے سورہ احزاب کی ایک آیت میں نے نہیں پائی۔ جس کو میں رسول اللہ صلعم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ تو ہم لوگوں نے اس کو ڈھونڈھا، تو اس کو پایا خزیمہ بن ثابت الانصاری کے ساتھ (وہ آیت یہ ہے) من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (الخ) تو ہم لوگوں نے اسکو اس سورہ میں مصحف کے اندر داخل کر دیا (بخاری باب جمع القراٰن)

یہی حدیث ابو عیسیٰ الترمذی اپنی سنن میں محمد بن بشار (معروف بندار) سے اور وہ عبد الرحمٰن ابن مہدی سے اور وہ ابراہیم بن سعد سے اور وہ زہری سے روایت کرتے ہیں، بالکل اسی طرح دونوں حدیثوں کو یعنی جمع صدیقی والی حدیث کو بھی اور نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث کو بھی۔ جمع صدیقی والی حدیث کی متابعات کے سلسلے میں اس ترمذی والی روایت کا جو عبد الرحمٰن بن مہدی سے ہے ذکر تو آچکا ہے مگر نقشہ متابعات میں اسکا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ نقشے میں انہیں متابعوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے۔ نقشہ نکال کر دیکھ لیجئے۔ اور نقل مصاحف والی حدیث کا بھی ذکر آخر سورہ توبہ و آیت سورہ احزاب و خزیمہ و ابو خزیمہ کی بحث میں آچکا ہے، نفس حدیث تو وہاں مذکور نہیں ہے مگر مجملاً ترجمہ ضرور پیش کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے صفحہ (۱۰۳) مگر ترمذی نے آخر حدیث میں ایک نئی بات لکھی ہے جس کی خبر امام بخاری یا ان کے شیخ موسیٰ بن اسمٰعیل کو زہری سے یا کسی دوسرے سے نہیں ملی عبد الرحمٰن بن مہدی سے بندار

ے۔ یہ روایت ابو الیمان عن شعیب عن الزہری عن انس "فامر عثمان سے ففعلوا" تک (باب نزل القراٰن بلسان قریش والعرب الخ) میں بخاری میں ہے مگر امام بخاری نے اسکو خود متابعت میں شمار نہیں کیا۔ اس لئے کہ اول و آخر کے ٹکڑے بالکل غائب ہیں۔ درمیان کا صرف ایک ٹکڑا مروی ہے تو جب خود امام بخاری نے اسکو متابعت نہیں قرار دیا تو ہم بھی اسکو متابعت نہیں قرار دیتے ہیں۔ اور جب متابعت نہیں تو پھر بحث ہی کیا ہے؟ ابو الیمان اور شعیب کے متعلق آپ کو جمع صدیقی والی روایت پر جرح میں معلوم ہو چکا ہے کہ ابو الیمان نے شعیب سے ایک آدھ کلمے کے سوا کچھ نہیں سنا۔ اسلئے یہ روایت بھی منقطع ہے۔ درمیانی راوی کا حال معلوم نہیں ۱۲ منہ غفرلہ

یعنی محمد بن بشار نے اگر یہ بات سنی تھی تو صرف ترمذی ہی نے محمد بن بشار سے کیوں سنی؟ خود امام بخاری بھی تو محمد بن بشار سے بہتیری حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں محمد بن بشار سے دو سو پانچ حدیثیں مروی ہیں، اور صحیح مسلم میں چار سو ساٹھ حدیثیں، امام مسلم کو تو نہ جمع صدیقی کی کوئی حدیث ملی، نہ نقل مصاحف بعہد عثمانی کی؛ یہ ترمذی والی نئی بات انہیں کہاں سے مل سکتی۔ اصل یہ ہے کہ یارانِ طریقت کو بخاری و ترمذی میں اپنی طرف سے جمع و نقل کی حدیثیں بنا کر داخل کر دینے کا موقع مل گیا۔ مگر صحیح مسلم میں اس کا موقع نہ مل سکا اس لئے صحیح مسلم جمع قرآن و نقل مصاحف کی حدیثوں سے خالی رہی۔ اور جس نے بخاری میں یہ حدیثیں بنا کر داخل کی تھیں اس کو یہ نئی بات نہیں سوجھی تھی، یا اس وقت نہیں سوجھی تھی۔ ترمذی امام بخاری سے متاخر ان کے شاگرد ہیں۔ بخاری کی تالیف کے برسوں بعد ترمذی مرتب و مدون ہوئی ہے۔ اس لئے ترمذی میں یہ حدیثیں داخل کرنے کے وقت اس اضافے کا بھی خیال آ گیا۔ اور یہ مضمون بخاری میں داخل ہونے سے رہ گیا۔ بہرحال وہ ترمذی کا نیا اضافہ بھی سن لیجئے

اضافہ ترمذی

پوری روایت لکھنے کے بعد ابو عیسیٰ ترمذی تحریر فرماتے ہیں۔ بغیر اسنا و قبل و بعد کے؟: قال الزهري. فاختلفوا يومئذ في التابوت والتابوه. فقال القرشيون التابوت وقال زيد التابوه فرفع اختلافهم إلى عثمان فقال اكتبوه التابوت فإنه نزل بلسان قريش - یعنی زہری نے کہا، کہ تو اس دن ان کاتبوں نے اختلاف کیا "تابوت" اور "تابوه" میں۔ قریشیوں نے کہا کہ "تابوت" اور زید نے کہا کہ تابوہ، تو ان لوگوں کا اختلاف حضرت عثمان کے سامنے پیش ہوا۔ حضرت عثمان نے فرمایا "تابوت" لکھو کیونکہ وہ قریش کی زبان میں اترا ہے۔

واضح رہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تلفظ "تابوت" اور "تابوہ" کا ایک ہی تھا فرق صرف رسم خط کا تھا۔ زید بھی تلفظ "ت" ہی کا کرتے تھے، مگر لکھنا چاہتے تھے "ۃ" سے بشکل ہائے ہوز۔ اسلئے کہ "لسان" کا تعلق تلفظ سے ہے، نہ کہ کتابت سے۔ اور کسی متقدم نے یہ لکھا بھی نہیں ہے کہ اختلاف صرف رسم خط کا تھا۔ بہرحال مجھکو اس پر خواہ مخواہ اصرار بھی نہیں، اگر کوئی صرف رسم خط پر اصرار کرے تو میں تسلیم کر دونگا۔ کہ اچھا صرف رسم خط ہی کا اختلاف سہی۔

مگر اس کا پتا نہیں ملا۔ کہ زہری نے یہ کہا تو کہاں سے کہا؟ کس سے سن کر کہا؟ ترمذی کو یہ خبر کس سے ملی کہ زہری نے ایسا کہا؟ ہر موقع پر تو یہ لوگ سلسلۂ اسناد لکھدیا کرتے ہیں، یہاں اسکو خلاف معمول و خلاف دستور نظر انداز یا قلم انداز کیوں کر دیا؟۔ اصل یہ ہے کہ اگر سلسلۂ اسناد وہی پہلا اس قول کے متعلق بھی لکھدیا جاتا تو سلسلۂ اسناد کی ضرورت ہی نہ تھی یہ اضافہ بغیر "قال الزهري" کے اسی حدیث نقل مصاحف کے سلسلہ میں مذکور ہوتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ یہ اضافہ ترمذی تک پہنچا تو تھا اسی اسناد سے، مگر بیک جلسہ و بیک مجلس نہیں۔ اس لئے محض تفریق مجلس کو ظاہر کر دینے کے لئے الگ کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ اگر ایسا ہی تھا جب پہلے اسناد لکھ دینا ضروری تھا، تاکہ یہ اشتباہ نہ رہے کہ زہری کی یہ بات کسی اور غیر معلوم ذریعے سے ان تک پہنچی، جیسا کہ اس وقت یہ اشتباہ ہو رہا ہے۔ اور اگر کسی دوسرے سلسلۂ اسناد سے پہنچی ہے۔ جب تو اس کو واضح کر دینا ضروری فرض تھا کہ کسی حدیث کا بغیر اسناد کے اپنی کتاب میں درج کر دینا ایک مؤلفِ سنن کے لئے کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ کچھ پتا نہیں ملتا کہ ترمذی نے کس سے سنا کہ زہری نے ایسا کہا۔ اور کچھ خبر نہیں کہ زہری نے حضرت انس ہی سے سنا یا عبید بن السباق سے یا خارجہ سے یا کسی اڑتی ہوئی خبر تھی زبانی طیور کی۔

اصل یہ ہے کہ اگر وہی "عن محمد بن بشار عن عبد الرحمٰن بن المهدي" یہاں بھی لکھدیا جاتا، تو ہم لکھ چکے ہیں کہ محمد بن بشار سے امام بخاری دو سو پانچ حدیثیں اپنی کتاب صحیح بخاری میں روایت کر رہے ہیں۔ امام بخاری بیک واسطہ اس حدیث کو ابراہیم بن سعد سے بذریعہ موسیٰ بن اسمٰعیل روایت کر رہے تھے خواہ مخواہ بدو واسطہ کیوں روایت کرتے اس لئے شاید انھوں نے اس روایت نسخ مصاحف کو محمد بن بشار سے نہیں لیا کہ اس سلسلے سے وہ دو واسطے سے ابراہیم بن سعد تک پہنچتے۔ اس لئے نقل مصاحف والی حدیث اس سلسلہ سے نہیں نقل کی۔ اور نہ جمع صدیقی والی حدیث اس سلسلے سے لی۔ مگر اتنا اضافہ اگر ان کو اسی سلسلۂ اسناد سے مل جاتا تو اس اضافہ کی وجہ سے امام بخاری ضرور اس سلسلے سے بھی نقل مصاحف والی حدیث کو لکھ لیتے۔ اور موسیٰ بن اسمٰعیل کی متابعت اسکو قرار دیدیتے۔ ورنہ کتاب التفسیر میں اس کا ذکر

ذکر کرتے - قرآن مبین میں تابوت کا لفظ دو ہی جگہ ہے - ایک تو سورۂ بقرہ کے تینتیسویں رکوع میں، دوسرے سورہ طٰہٰ کے دوسرے رکوع میں مگر امام بخاری نے کہیں بھی "تابوت"، "تابوہ" کے اختلاف کا ذکر نہیں فرمایا - جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام بخاری کو اس اختلاف کی مطلق خبر نہ تھی، اور نہ درحقیقت محمد بن بشار غریب کو اسکی خبر تھی ورنہ وہ جہاں دو سو پانچ (۲۰۵) حدیثیں امام بخاری کو دے چکے تھے، اس سے کبھی اغماض نہ کرتے - اس لئے اسکو مطلقاً لکھا ہی نہیں کہ ترمذی کو یہ کس طرح معلوم ہوا اسی طرح زہری کا کس سے سنا، اس کا بھی ذکر نہ کیا کہ اگر یہ کہدیا جائے کہ زہری نے انس بن مالک ہی سے یہ بھی سنا، تو پھر زہری سے جس نے سنا اس کو بھی واضح کر دینا ضروری ہو جاتا، اور زیادہ کھولنے ہی میں جھوٹ پکڑا جاتا ہے، چونکہ یہ اضافہ بخاری میں درج نہیں ہو سکا ہے - اس لئے اسناد کو کھا بیٹا اور گول مول چھوڑ دینا ہی بہتر نظر آیا - کہ بظاہر وہی اسناد جو اوپر والی حدیث کے ہیں، اس قول کے بھی سمجھ لئے جائیں گے - اگر کوئی کرید کریگا تو کہدیا جائے گا کہ ممکن ہے کہ دوسرے اسناد ہوں - اور امام بخاری نے اس اضافہ کے اسناد نہیں ملنے ہی کی وجہ سے محمدؐ بن بشار سے جمع صدیقی و نقل عثمانی کی روایت ہی نہ لی چونکہ آخر میں یہ اضافہ بغیر تصریح اسناد کے تھا - مگر یہ تصریح اسناد تو ترمذی نے یہاں چھوڑ دی ہے، محمد بن بشار نے تو چھوڑی نہیں، اگر محمد بن بشار اپنے اوپر کے اسناد اور زہری کے بعد کا نام چھوڑ دیتے تو ترمذی اپنی سماعت تو محمد بن بشار سے ضرور لکھدیتے - اس لئے امام بخاری کا اس وجہ سے اس سلسلہ اسناد کو چھوڑ دینا صحیح نہیں ہو سکتا - غرض یہ کہ یہ قال الزھری کو تو دیکھکر میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اپنے صوبہ کے مشہور استاد حضرت شادؔ کے شعر کو تھوڑی ترمیم کے ساتھ یوں پڑھوں!

سنی روایت زہری تو درمیاں سے سنی ؎ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اس اضافے کے متعلق باقی بحث نفس حدیث کی تنقید میں آتی ہے، متن حدیث کی تنقید کے بعد

نفسِ روایت کی تنقید — یہ تو میں جمع صدیقی کے سلسلے میں بیان کر چکا ابراہیم بن سعد زہری کی وفات کے وقت کمسن تھے اور زہری سے ان کی تعادٔ سماع بالکل غیر متوقع ہے - اس لئے ان کی روایت جو زہری سے آتی ہے وہ محدثین کے یہاں ضعیف سمجھی جاتی ہے اس لئے کہ زہری سے ان کا سماع حدیث ہی مشتبہ اور نامتوقع الصحۃ ہے - ان کا سن سماع حدیث کا زہری کی وفات تک نہیں سمجھا جاتا ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ ابراہیم بن سعد کمسنی کی وجہ سے اس وقت اپنے وطن مدینہ طیبہ ہی میں رہتے تھے - اور ابن شہاب زہری اپنے وطن اور اپنے کاروبار کی جگہ مقام اَیلہ میں اپنے انتقال سے بہت پہلے سے یہ اَیلہ میں مقیم ہو کر ہی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، اور یہیں آ آ کر لوگ ان سے حدیثیں لیا کرتے تھے - ہم زہری کے تذکرے میں لکھ چکے ہیں عبدالعزیز الماجشون وغیرہ ایلہ ہی جا جا کر زہری سے حدیثیں سنا کرتے تھے ..... غرض چونکہ زہری کی وفات کے زمانے میں ابراہیم بن سعد پندرہ سولہ برس کے تھے اور دونوں کی جائے اقامت میں بہت کافی دوری تھی - آمد و رفت اسوقت بہت دشوار تھی - اتنی کمسنی میں اَیلہ جا کر ابراہیم کا زہری سے حدیثیں لینا بالکل خلاف عقل ہے اس لئے یقیناً ان سے زہری کی ساری روایتیں ضعیف ہی نہیں بلکہ منقطع اور صحت کے اعتبار سے سخت مشتبہ ہیں - یہ نہیں کہ انھوں نے جھوٹی حدیث بنائی، بلکہ یہ کہ ان پر اس حدیث کا وضاعین حدیث نے افترا کیا اور اپنی من گھڑت حدیثوں کو ان کی طرف منسوب کر کے زہری تک ان کی وساطت سے پہنچایا - غرض ابراہیم بن سعد سے مروی ہونے کی وجہ سے بخاری و ترمذی کی جمع صدیقؓ و نقل عثمانی والی دونوں حدیثیں روایۃً مشتبہ غیر متوقع الصحۃ اور بقول محدثین ضعیف ہیں - یہ حال تو روایت کی عینک لگا کر اس حدیث کو دیکھئے

حدیث پر ایک نظر — فارسل عثمان الی حفصۃ ان ارسلی الینا بالصحف یعنی تو عثمان نے حفصہ کے پاس بھیجا کہ ہمارے پاس صحیفے بھیجدیجئے "کس کو بھیجا" اور حضرت حفصہ نے کس کے ہاتھ صحیفے بھیجے، اس کا کوئی ذکر حدیث میں نہیں، نہ قرینے سے سمجھا جا سکتا ہے -

حضرت حفصہ نے حضرت عثمان سے واپس کر دینے پر قسم لیکر صحیفے مستعار دیئے — ان صحیفوں کی اہمیت معلوم ہے کیونکہ بعض روایتوں میں تو ہے کہ حضرت عثمانؓ سے حضرت حفصہؓ نے واپس کرنے پر قسم لی جب حضرت عثمانؓ نے

قسم کھا کر واپس کرنے کا وعدہ فرمایا تب حضرت حفصہ نے وہ صحیفے جو ان کے پاس تھے حضرت عثمان کے پاس بھیجے۔ تو یقیناً کوئی معتبر شخص کئی بار حضرت عثمان کی طرف سے حضرت حفصہ کے پاس آیا اور گیا۔ اور حضرت حفصہ نے کسی معتمد علیہ ہی شخص کے ہاتھ وہ صحیفے حضرت عثمان کے پاس بھیجے ہونگے۔ اس لئے جس کو حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے پاس بھیجا تھا، اور جس کے ہاتھ حضرت حفصہ نے صحیفے حضرت عثمان کے پاس بھیجے تھے اس کا نام بتانا ضروری تھا۔ یہ کیا؟ کہ جمع صدیقی والی حدیث میں بھی زید بن ثابت سے روایت کی جاتی ہے کہ ارسل الیّ ابوبکر یعنی میرے پاس ابوبکر نے بھیجا، کسکو بھیجا یہ نہیں بتایا جاتا ہے۔ ابن حجر فتح الباری ج ۲۰ ص ۲۱ میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لم اقف علی اسم الرسول الیہ۔ یعنی جسکو زید بن ثابت کے پاس حضرت ابوبکر نے بھیجا تھا اس کے نام سے میں واقف نہ ہوا۔ وہاں تو خیر کسی اہم

جمع صدیقی والی حدیث میں زید بن ثابت نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت ابوبکر نے انکو بلانے کیلئے کس کو بھیجا تھا۔ اور نقل مصاحف والی حدیث میں بھی حضرت انس نے نہیں بتایا کہ حضرت عثمان نے کس کو حضرت حفصہ کے پاس صحیفے لانے کیلئے بھیجا تھا۔

شخصیت کی ضرورت نہ تھی، صرف زید بن ثابت کو بلانا تھا۔ کسی کو بھیجکر بلوایا ہوگا۔ مگر یہاں تو صحیفوں کا لانا تھا پھر بار بار آنا جانا ایک اہم معاہدہ اور قسم کے ساتھ۔ مگر یہاں بھی وہی خالی اَرْسَلَ! جس سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں روایتوں کا بنانے والا ایک ہی شخص تھا، جس نے مبہم چھوڑ دینے ہی کو دونوں جگہ قرین مصلحت سمجھا، اور شخصیت کی تعیین میں گھبرایا کہ کس کا نام لکھیں، کہیں جھوٹ کھل نہ جائے۔ یہ روایتیں ۱۰۱ھ کے بعد بنیں، اگلوں یعنی عہد صدیقی و فاروقی و عثمانی کے لوگوں کے سنین وفات اس وقت تک قلمبند تو ہوئے نہ تھے اور نہ عام طور سے لوگوں کو معلوم تھے اگر ایسے شخص کا نام لکھدیا گیا جو اس وقت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے، تو پھر بڑی مشکل ہو جائیگی۔ جھوٹی حدیثوں کی ٹکسال کوفہ میں تھی اور یہ سارے واقعات مدینے کے تھے۔ وہاں کو نہ مدینہ کے اکابر ہی کے سنین وفات سے اس وقت مطلع تھے۔ اصاغر متوسطین کے سنین وفات سے پوری اطلاع کی ان کو کوئی وجہ نہ تھی۔ جبھی تو دھوکا کھا کر کتاب التعریف کی حدیث کے راوی نے اور ابن جریر نے بھی لکھ مارا کہ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کی وفات کے بعد ان صحیفوں کو جلوا دیا۔ حالانکہ حضرت عثمان کی وفات حضرت حفصہ کی وفات سے پندرہ برس پہلے ہے۔ اسکی مفصل بحث ص ۱۱۴ و ۱۱۶ کے درمیان پہلے گذر چکی ہے۔ غرض اسی ڈر سے فقط اَرْسَلَ دونوں روایتوں میں لکھا، اور جسکو بھیجا، اس کا نام نہیں بتایا۔ حدیث گھڑنے والے بڑے ہوشیار تھے۔

ارسلی الینا بالصحف ننسخہا فی المصاحف۔ حضرت حفصہ سے درخواست کی گئی ہے کہ ہم لوگوں کے پاس صحیفے بھیج دیجئے کہ ان کو ہم لوگ مصاحف میں نقل کریں۔ وہ صحیفے آخر کسی ایک ہی رسم خط میں لکھے ہوئے ہونگے۔ اور کسی ایک ہی لغت کے مطابق اعراب اور نقطے ان صحیفوں میں اگر نہ تھے تو ان مصاحف میں کب دئے جا رہے تھے۔ اس لئے اس نقل میں تو لسان قریش و غیر قریش کا سوال ہی نہ تھا پھر زید بن ثابت ہی کے ہاتھ کے بقول زہری وہ صحیفے لکھے ہوئے تھے، جن کو حضرات صدیق و فاروق دو دو راشد بلکہ ارشد خلیفے قبول اور پسند کر چکے تھے اگرچہ یہ صحیفے لکھے جانے کے بعد سے نقل مصاحف کے لئے باہر نکالے جانے کے قبل تک تقریباً ۱۵ برس تک کبھی کسی مصرف میں نہ آئے، بلکہ فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون کے مصداق بنے ہوئے تمام صحابہ تک کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے، حضرت حفصہ اور شاید دوسری ازواج مطہرات ہی ان سے مستفیض ہوتی رہی ہوں جن کی شان میں آیہ تطہیر اتری ہے۔ اور اس طرح لا یمسہ الا المطہرون صادق آرہا ہو۔

زید ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفوں کی نقل میں زید سے اختلاف کا خطرہ کیوں؟

تو آخر ان صحیفوں میں زید بن ثابت نے جس رسم خط سے قرآن لکھا تھا۔ جس کو حضرت عثمان سے پیشتر کے دو جلیل القدر خلیفے قبول اور پسند کر چکے تھے اس کی نقل کرنے میں کاتبوں کے درمیان قریشی و غیر قریشی ہونے کی وجہ سے اختلاف کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اُسی زید سے جس کے لکھے ہوئے یہ صحیفے ہیں یہ نئے کاتبین کیوں اختلاف کرنے لگے؟

٭ یہ روایت اتقان میں موجود ہے۔ ۱۲ منہ

لسانِ قریش یا مُضَر

اہل ادب ولغت عربی جانتے ہیں کہ سارے بنی مُضَر کی ایک زبان، ایک لغت اور ایک محاورہ تھا۔ بنی مضر میں بنی قریش بھی تھے، قریشی بنی مضر اور غیر قریشی بنی مضر کے محاورہ ولغت میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور قرآن مضر ہی کی زبان میں اترا ہے۔ چنانچہ مختصر کنز العمال ج ۲ ص ۴۶ (برحاشیہ مسند احمد) میں یہ روایت بھی ہے کہ عن عبد اللّٰہ بن فضالہ۔ قال لما اراد عمر ان یکتب الامام اقعد لہٗ نفرًا من اصحابہ وقال اذا اختلفتم فی اللغۃ فاکتبوھا بلغۃ مُضَر۔ فان القران نزل علی رجل من مُضَر۔ یعنی عبد اللہ بن فضالہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب حضرت عمرؓ نے کتاب الامام کے لکھنے (یعنی لکھوانے) کا ارادہ کیا تو اس کے لئے اپنے اصحاب میں کچھ اشخاص کو انہوں نے بٹھایا، اور کہا کہ اگر تم باہم مختلف ہو لغت کے متعلق تو اسکو لکھو مُضَر کی لغت میں، کیونکہ قرآن اترا ہے مضر کے ایک آدمی پر" اس روایت میں حضرت عثمانؓ کے عوض حضرت عمرؓ کا نام ہے معلوم نہیں طباعت کی غلطی ہے یا راوی کی۔ یا شاید حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی بعضوں نے روایت بنائی ہو۔ بہرحال روایتیں تو جمع قرآن کے متعلق سب کے سب موضوع ہی ہیں، اس لئے اس سے بحث نہیں، یہ حدیث صرف اس ثبوت میں پیش کی گئی ہے کہ لغت قریش ولغت مُضَر دو لغت نہ تھے۔ ورنہ جھوٹی روایت بنانے والے ایسی فاحش غلطی نہ کرتے۔ وہ جانتے تھے قریش بھی بنی مضر ہی ہیں۔ اور عبد اللہ بن مسعود بھی بنی مضر ہی تھے۔ ان کی نانی حارث بن زہرہ کی بیٹی تھیں اس لئے زہریہ تھیں ان کے والد حلیف بنی زہرہ تھے۔ اس لئے یہ قریشی بھی ننہال کی طرف سے تھے۔ ان کی زبان۔ ان کا محاورہ ولغت رسول اللہ صلعم اور دوسرے قریشیوں سے ہرگز مختلف نہ تھا۔ اس لئے ان کی قرات دوسرے قریشیوں کی قرات سے مختلف کیوں ہوگی؟ جو ان کے تلامذہ کوفے میں قرآن کا سب سے الگ اسکول کھول کر قرات میں تمام مسلمانوں سے ان کا نام لیکر اختلاف کرنے لگے اور اپنے من گھڑت اختلافات قرات کو ان کے سر تھوپنے لگے؟ یہ ایک نہایت اہم نکتہ اور قابل غور بات سوچنے اور سمجھنے کی ہے کہ۔ اس نکتے سے اہل کوفہ کا الحاد فی آیات اللہ صاف کھل جاتا ہے،

چار معلمینِ قرآن

رسول اللہ صلعم نے جو انصاریوں اور عجمیوں اور غیر مُضَری دوسرے قبائل والے چار شخصوں سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے فرمایا تھا عبد اللہ بن مسعود ہذلی تھے اور بنی ہذیل مضر ہی کی ایک شاخ تھی۔ ہذیل بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر سے چلی تھی۔ اس طرح معاذ بن جبل خزاعی تھے اور بنی خزاعہ بھی بنی مضر ہی تھے۔ "خزاعہ" نام نہیں ہے بلکہ لقب ہے عمرو بن لحی بن قمعہ بن الیاس بن مضر کا۔ بنی خزاعہ پہلے سب کے سب مکہ ہی میں تھے اور خانہ کعبہ کے متولی یہی لوگ تھے ابو غسان الخزاعی نے جو متولی تھے اسکی تولیت قصی بن کلاب کے ہاتھ بیچ ڈالی صرف ایک مشک شراب پر یہ بنو خزاعہ بھی مُضَری تھے۔ البتہ ابی کعب کو نسبی کوئی تعلق تو بنی مضر یا قریش سے مذکور نہیں ہے مگر یہ قریش کے حلیف تھے مکہ سے ان کے تعلقات بہت زیادہ رہے اس لئے قریش کی زبان سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی لئے مدینہ آنے کے بعد رسول اللہ صلعم نے کاتب وحی انہیں کو قرار دیا۔ اور پہلے کاتب وحی مدینہ میں یہی ہیں۔ جب یہ موجود نہیں ہوتے تو زید بن ثابت کو بلایا جاتا تھا۔ وہ بھی جب زید نے کتابت سیکھ لی اور پوری مشق بہم پہونچالی۔ اور سالم مولیٰ ابن حذیفہ تو برابر مکہ ہی میں رہے ابو حذیفہ قریشی تھے ان کے آزاد کردہ غلام تھے اور پھر متبنیٰ ہوئے۔ غرض تعلیم قرآن کے لئے انہیں لوگوں کو رسول اللہ صلعم نے منتخب کیا جو لوگ اپنے اپنے قبیلے میں یا عجمیوں میں تعلیم قرآن کریں مگر لغت ومحاورات قریش ومضر کی نگہداشت کرتے ہوئے اسی کے مطابق جتنی باتیں میں عرض کر چکا ہوں، حدیث نقل مصاحف بعہد حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کے موضوع اور سرے سے جھوٹی ہونے کو ثابت کرنے کے لئے ایک منصف صاحب عقل سلیم اور ایماندار آدمی کے لئے بہت کافی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ بھی چند اہم باتیں اور بھی ہیں جو میرے دعوے کے ثبوت میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لئے میں ان باتوں کو حسب ذیل نمبروں میں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ بنگاہ غور وبنظر انصاف ملاحظہ ہوں۔

حضرت عثمانؓ جانتے تھے کہ حضرت حفصہؓ کے پاس صحف نبوی ہیں

(۱) یہ حدیث اس بات کو صاف ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت عثمانؓ یہ خوب جانتے تھے کہ حضرت حفصہؓ کے پاس جو صحیفے ہیں وہی ہیں جو عہد نبوی سے ان کے پاس بطور امانت محفوظ چلے آرہے ہیں اس لئے کہ جمع صدیقی کا واقعہ فی الواقع ہوا ہوتا اور یہ صحیح ہوتا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہد خلافت میں

حضرت عمرؓ کے مشورے سے زید بن ثابت ؓ سے ان صحیفوں کو جمع کرایا تھا اور یہ صحیفے حیاتِ صدیقؓ تک حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس اور پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہے تھے۔ تو پھر حضرت عمرؓ کے بعد ان صحیفوں کے حضرت حفصہ کے پاس رہنے کو حضرت عثمانؓ کبھی گوارا نہ کرتے اور جب منگوایا تھا تو واپس بھیجنے کا وعدہ نہ کرتے اور ہرگز واپس نہ کرتے۔

حضرت حفصہ کے پاس لکھے ہوئے صحیفے زید بن ثابت کے لکھے ہوئے نہ تھے

اگر حضرت عثمانؓ کو یہ علم ہوتا کہ یہ صحیفے جن کی نقلیں حاصل کرنے کے لئے ہم نے انھیں حضرت حفصہؓ کے پاس سے منگوایا ہے اس کو عہدِ صدیقی میں تنہا زید بن ثابت ہی نے مرتب و مدوّن کر کے لکھا ہے تو وہ ان کی صرف نقل حاصل کرنے کے وقت زید بن ثابتؓ کے ساتھ تین تین قریشی کاتبوں کو ہرگز نہ بٹھاتے اور یہ نہ کہتے کہ جہاں تم لوگوں سے اور زید بن ثابتؓ سے اختلاف ہو وہاں قریش کی زبان ورسم خط کا اتباع کرنا، یعنی زید بن ثابتؓ کی بات نہ ماننا۔ اس لئے کہ منقول عنہ تو زید بن ثابتؓ ہی کا بقول راوی لکھا ہوا تھا جس کو پہلے دونوں خلیفہ پسند و قبول کر چکے تھے۔

ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ قال الزهري فاختلفوا يومئذ في "التابوت والتابوه" فقال القرشيون "التابوت" وقال زيد "التابوه" فرفع اختلافهم الى عثمان فقال اكتبوه "التابوت" فانه نزل بلسان قريش۔ یعنی زہری نے کہا کہ اس نقل مصاحف کے دن تابوت اور تابوہ میں (ان چاروں کاتبوں کے درمیان) اختلاف پیدا ہوا (تینوں) قریشی کہتے تھے "تابوت"، اور زید بن ثابتؓ کہتے تھے تابوہ" تو یہ اختلاف حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ "تابوت" لکھو کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں اترا ہے۔ اگر ان صحیفوں کو جن کی صرف نقلیں کرنے کے لئے یہ چاروں کاتب بیٹھے تھے۔ زید بن ثابتؓ نے ہی لکھا تھا تو پھر زید نے ان صحیفوں میں "تابوہ" لکھا تھا یا تابوت"؟ اگر "تابوت" لکھا تھا تو پھر اس وقت زید نے "تابوہ" پر اصرار کیوں کیا؟ کہ یہ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کرنا پڑا؟ اور اگر "تابوہ" لکھا تھا تو جب حضرت عثمانؓ کے پیش رو دو خلیفوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی تو حضرت عثمانؓ کبھی اپنے پیش رووں کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر کرتے تو پھر دوسرے اکابر مہاجرینؓ و انصارؓ سے اس میں استصواب کر لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرتے۔ فوراً قلم برداشتہ ایسا فیصلہ کبھی نہ کرتے جو صرف زید بن ثابتؓ کے بلکہ ان کے پیش رو دو خلفائے راشدینؓ کے بھی خلاف پڑ رہا تھا۔

ثالث حضرت زید بن ثابت نے کتابت کا فن اساراے جنگ بدر یعنی مکیوں اور قریشیوں سے سیکھا تھا۔ اور وہ قریشی ہی رسم خط جانتے تھے۔ اس لئے دوسرے قریشیوں سے یہ رسم خط میں کسی طرح کا اختلاف نہیں کر سکتے تھے اگر تابوت اور تابوہ میں صرف رسم خط کا اختلاف روایت میں مراد ہے اور "ت" اور "ہ" کے تلفظ کا بھی فرق روایت میں مقصود ہے تو آخر رسول اللہ صلعم سے انھوں نے کس تلفظ کے ساتھ سنا تھا اور کس تلفظ کے ساتھ سیکھا تھا؟ یہ ناممکن ہے کہ جس لفظ کا جو تلفظ وہ خود رسول اللہ صلعم سے سن چکے تھے اس کے خلاف تلفظ ادا کرتے اور اس پر اصرار کرتے اور اسقدر اصرار کہ اس جھگڑے کو امیر المومنین کے پاس پیش کر کے وہاں سے فیصلہ حاصل کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ اور وہ فیصلہ ان کے خلاف ہی صادر ہو۔

حضرت عثمان نے تمام مسلمانوں کو حرف واحد پر مجتمع کر دیا اس کا پروپیگنڈا

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے تمام مسلمانوں کو حرف واحد یعنی قرأۃ واحدہ پر مجتمع کر دیا چنانچہ سیوطی اتقان ج ۱ صفحہ ۸۵ میں لکھتے ہیں۔ قال ابن التين وغيره ان الفرق بين جمع ابى بكر وجمع عثمان ان جمع ابى بكر لخشية ان يذهب من القرآن شئ بذهاب حملته لانه لم يكن مجموعا فى موضع واحد فجمعه فى صحف من الآيات سوره على ما وقفهم عليه النبى صلعم وجمع عثمان كان لما كثر الاختلاف فى وجوه القراءات حين قرأوا بلغاتهم على اتساع اللغات فادى ذلك بعضهم الى تخطئة بعض فخشى من تفاقم الامر فى ذلك [illegible] تلك الصحف فى مصحف واحد مرتبا لسوره من سائر اللغات الى لغة قريش محتجا بانه نزل بلغتهم [illegible] بلغة غيرهم رفعا للحرج والمشقة فى ابتداء الامر فرأى ان الحاجة الى ذلك انتهت۔ فجمعهم على حرف واحد اى على حرف قريش

(وفی الصفحہ ۱۸۶) وقال المحاسبی المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان رضؓ ولیس کذلک۔ انما حمل عثمان الناس علی القراءة
بوجه واحد علی اختیار وقع بینه وبین من شهده من المهاجرین والانصار لما خشی الفتنة عند اختلاف اهل العراق
الشام فی حروف القراءات فاما قبل ذلک فقد کان المصاحف بوجوه من القراءات المطلقات علی الحروف السبعة التی
انزل بها القرآن۔ فاما السابق الی جمع الجملة فهو الصدیق رضؓ وقد قال علیؓ لو ولیت لعملت بالمصاحف التی عمل عثمان
(وفی ص۹۵) قال علی لا تقولوا فی عثمانؓ الا خیرا فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الا عن ملأ منا۔ قال فما تقولون
هذه القراءات فقد بلغنی ان بعضهم یقول ان قراءتی خیر من قراءتک وهذا یکاد یکون کفرا۔ قلنا ما تری فی ذلک قال ا
ان نجمع الناس علی مصحف واحد فلا یکون فرقة ولا اختلاف قلنا فنعم ما رأیت۔ یعنی ابن التین وغیرہ (محدثین ومورخینؒ) نے
جمع ابوبکرؓ وجمع عثمانؓ میں فرق یہ ہے کہ عہد صدیقیؓ میں جمع قرآن کا کام اس خطرے کے ماتحت ہوا کہ حاملین قرآن کے دنیا سے اٹھ جا
کی وجہ سے قرآن کا کچھ حصہ کہیں غائب نہ ہو جائے۔ کیونکہ قرآن کسی ایک جگہ مجموعی صورت میں نہ تھا۔ تو قرآن رسول اللہ صلعم کی تعلیم
مطابق آیات و سُوَر کی ترتیب کے ساتھ ایک مصحف میں ابوبکر صدیقؓ نے جمع کیا۔ (یعنی ان کے حکم سے زید بن ثابتؓ نے جمع کیا)
اور جمع عثمانیؓ کا کام اس غرض کے ماتحت تھا کہ لوگوں میں قراءتوں کے اختلافات بہت پیدا ہو گئے تھے کیونکہ جہاں تک ان کے لغتو
وسعت تھی لوگ اپنے اپنے لغتوں کے مطابق پڑھنے لگے تھے۔ اور یہ اختلافات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ ایک دوسرے کو برسر خطا قرار دینے
یہ دیکھ کر حضرت عثمانؓ موقع کی نزاکت سے ڈرے اور ان صحیفوں کو (جن کو حضرت صدیق اکبرؓ نے زید بن ثابت سے مرتب و مدون کرا
تھا) ایک مصحف میں لکھوایا، سورتوں کی ترتیب قایم کی، اور تمام دوسرے لغتوں کو چھوڑ کر صرف لغت قریش کی مطابقت کا التزام کی
اس دلیل سے کہ قرآن قریش ہی کے لغت میں اترا ہے اگرچہ اس میں وسعت غیروں کے لغت میں پڑھنے کی بھی حرج و مشقت دور کرنے کے ل
شروع میں رکھی گئی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے دیکھا کہ اب اس کی حاجت باقی نہ رہی اس لئے ایک ہی لغت پر اکتفا کی۔
اور محاسبی نے کہا کہ لوگوں میں مشہور یہ ہے کہ جامع قرآن حضرت عثمانؓ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حضرت عثمان نے لوگوں کو صرف ایک
طریقے سے قراءت کرنے پر مجبور کیا۔ جس طریقے کو تمام مہاجرینؓ و انصارؓ جو اس وقت موجود تھے سب کے مشورے سے اختیار کیا گیا
کیونکہ وہ اہل عراق و اہل شام کے اختلافات دیکھ کر فتنے سے ڈرے اور اس سے پہلے قرآن مختلف طرح کی قراءتوں میں تھا۔ ان حروف
سبعہ کے مطابق جن پر قرآن اترا۔ تو تمام قراءتوں کو یکجا کر لینے کی طرف جس نے سبقت کی وہ صدیق اکبرؓ تھے۔
اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا اگر میں والی یعنی خلیفہ ہوتا تو میں بھی ان مصاحف کے ساتھ وہی کرتا جو عثمانؓ نے کیا۔ اور حضرت علیؓ نے
یہ بھی فرمایا کہ عثمانؓ کے بارے میں بجز کلمۂ خیر کے کچھ نہ بولو۔ اللہ تعالیٰ کی قسم جو کچھ انھوں نے مصاحف کے ساتھ کیا وہ ہم لوگوں کی ایک بڑی
جماعت کے مشورے سے کیا۔ حضرت علیؓ نے (معترضین سے) پوچھا کہ ان قراءتوں کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ کیونکہ مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ بعض
لوگ (آپس میں) کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے اچھی ہے اور یہ کفر کے قریب ہو جاتا ہے تو ان لوگوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا
کہ تو پھر آپ اس بارے میں کیا مناسب سمجھتے ہیں (یعنی ان معترضین نے بھی اختلافات قراءت کی خرابیوں کو محسوس کیا) حضرت علیؓ نے
فرمایا کہ ہم تو یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو ایک مصحف پر مجتمع کر دیں تاکہ پھر نہ فرقہ پیدا ہو نہ اختلاف واقع ہو۔ تو سب مسلمانوں نے کہا کہ
بہت بہتر رائے قایم فرمائی"
اتقان کی یہ عبارت صاف بتا رہی ہے کہ ابن التین وغیرہ محدثین و مورخین اور خود جلال الدین سیوطی وغیرہ کے نزدیک پورا قرآن نہ کتابی

؎ کسی مورخ نے کہا کہ؟ ابو جعفر طبری اور ابن اثیر تو نہ جمع صدیقی کا ذکر کرتے ہیں نہ نقل مصاحف بعہد عثمانی کا۔ ابن خلدون میں عہد صدیقی کے ذکر میں جمع قرآن
کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ عہد عثمانی کے ذکر میں ایک الحاقی بیان ہے جس میں نقل مصاحف کا ذکر کرکے ضمناً جمع صدیقی کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو یقیناً
اس کتاب میں ایک نمایاں الحاق ہے۔ اب بعد والے متاخرین لکھدیں تو اور بات ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

پورا قرآن محدثین کے نزدیک کبھی بھی کسی کے پاس بھی مجتمع نہ تھا

صورت میں کہیں مجتمع تھا نہ زبانی کسی کو یاد تھا اور نہ ہڈی لکڑی چھال یا کھال وغیرہ پر آیات منتشرہ ہی کی صورت میں پورا قرآن کسی جگہ بھی لکھا تھا۔ کوئی سورہ کسی کو یاد تھا کوئی کسی کو کچھ آیتیں کسی کو حفظ تھیں کچھ کسی کو۔ لکھی ہوئی بھی بعض آیتیں یا سورتیں ایسی تھیں جو صرف ایک ہی شخص کے پاس تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ سے لکھوا کر اکٹھا کرا کے منتشر آیات سے سورتیں مرتب کرالیں اور متعدد صحیفوں میں ان سب سورتوں کو لکھوا لیا اور لکھوا کر تبرکات کی طرح اس کو اپنی پوری زندگی تک مقفل بند رکھا۔ نہ اس کی متعدد نقلیں کرا کے مختلف اطراف و جوانب میں بھیجیں۔ نہ عام مسلمانوں، نہ خاص مہاجرینؓ و انصارؓ ہی کو اس کا حکم دیا کہ اب ان صحیفوں سے ہر کتابت جاننے والا نقلیں کر کے اپنی تلاوت کے لئے اپنے پاس رکھ لے۔ غرض جمع صدیقیؓ سے حضرت عمرؓ کے بعد تک یعنی نقل مصاحف بعہد عثمانیؓ سے قبل تک کسی شخص نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ خود حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بلکہ زید بن ثابتؓ کا بھی ان صحیفوں میں تلاوت کرنا یا اس سے کچھ فائدہ اٹھانا ثابت نہیں ہوتا۔ تقریباً اٹھارہ سال تک یہ صحیفے بے کار مقفل رکھے رہے۔ اٹھارہ برس کے بعد پہلے پہل جو ان صحیفوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے تو یہی کہ حضرت عثمانؓ نے اس کی چند نقلیں کر کے مختلف اطراف و جوانب میں بھیجیں۔ تو نقل مصاحف عثمانیؓ سے پہلے تک تو جس طرح آیات قرآنی منتشر اور سورتیں بالکل غیر مرتب تھیں اور پورا قرآن کسی ایک کے بھی سینے یا سفینے میں مرتب و مدون محفوظ نہ تھا بالکل اسی حال میں نقل مصاحف بعہد عثمانیؓ سے قبل تک قرآن پاک رہا۔ اور لوگ نمازوں میں، تلاوتوں میں اور بعہد حضرت عمرؓ تراویح میں غیر مرتب اور ناقص ہی قرآن پڑھتے رہے۔ اس لئے کہ جمع صدیقیؓ والے صحیفوں کے سوا پورا قرآن تو کسی ایک شخص کے پاس بھی موجود نہ تھا۔ نہ کسی کے سینے میں نہ کسی کے سفینے میں۔ اور وہ جمع صدیقی والے صحیفے بھی حضرت صدیق اکبرؓ ان کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ اور ان کے بعد ام المومنین

جمع صدیقی والے صحیفے بھی مقفل ہی رکھے گئے ان سے کبھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا نقل مصاحف کے قبل تک

حضرت حفصہؓ کے پاس مقفل "کتاب مکنون" کے مصداق بنے ہر شخص کی نظر سے پوشیدہ رکھے رہے۔ تو کیا کسی صاحب عقل و ہوش کی عقل و دیانت یہ تسلیم کر سکتی ہے کہ عہد نبوی و عہد صدیقی و عہد فاروقیؓ اور آغاز عہد عثمانیؓ یعنی نقل مصاحف سے قبل تک کسی فرد مسلم نے پورا قرآن ایک مصحف کی صورت میں اول سے آخر تک نہ کبھی دیکھا تھا، نہ کبھی پڑھا تھا؟ اور نہ کوئی شخص پورے قرآن کا حافظ تھا؟

حضرت صدیق اکبرؓ نے ساتوں قراءتوں کو جمع کر دیا تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہے

یہ کہنا کہ قرآن سات مختلف قراءتوں میں اترا تھا اور حضرت صدیق اکبرؓ نے ان ساتوں قراءتوں کو جمع کرایا تھا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کو کوئی عقل قبول نہیں کر سکتی۔ میں بطور نمونہ چند مثالیں اختلافات قراءت کی یہاں پیش کرتا ہوں، اور ارباب عقل و دیانت سے پوچھتا ہوں کہ کیا کتابت کا کوئی طریقہ ایسا ہو سکتا ہے جو ان تمام صورتوں کا جامع ہو؟ ملاحظہ ہو۔

نقشہ اختلافات قراءت در تلفظ و رسم خط ہر دو مندرجہ کتاب التیسیر للدانی

نام سورہ	رکوع	پارہ	قراءت صحیحہ متواترہ	قراءت اہل خلاف
بقرہ	۳۲	۲	وَاللہ یقبض ویبصط	واللہ یقبض ویبسط
"	"	"	بسطة	بصطة
"	۱۶	۱	ووصی بھا إبرٰھمُ	واَوصٰی بھا ابرٰھمُ
آل عمران	۱۹	۴	بالبینٰت والزبر والکتٰب المنیر	بالبینٰت وبالزبر وبالکتٰب المنیر
اعراف	۱۰	۸	قال الملاء الذین استکبروا	وقال ۔۔۔۔ الخ
"	۹	"	[illegible]	بسطة

بنی اسرائیل	۱	۱۵	لِیَسُوْٓءٗا وجوھکم	لِیَسُوْٓءَ وجوھکم
انبیاء	۳	۱۷	اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	اَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا
نمل	۲	۱۹	وَادِ النَّمْلِ	وَادِی النَّمْل
قصص	۴	۲۰	وَقَال موسٰی	قَال موسٰی
زخرف	۷	۲۵	مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ	مَا تَشْتَھِی الانفس
حدید	۳	۲۷	فان اللہ ھو الغنی الحمید	فان اللہ الغنی الحمید
"	۱	"	وکلاً وّعد اللہُ الحُسْنٰی	وکُلٌّ وّعد اللہ الحسنی۔
مرسلات	۱	۲۹	اُقِّتَتْ	وُقِّتَتْ
تکویر	۱	۳۰	بِضَنِیْنٍ	بِظَنِیْنٍ

اس نمونہ اختلافِ قرارت کو دیکھ کر کوئی صاحبِ عقل و دیانت، کتابت کا کوئی ایسا طریقہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ لکھنے والا یَبْصُطُ اور بَسْطَۃً لکھے اور پڑھنے والا ان دونوں لفظوں میں سے ہر لفظ کو "صاد" کے تلفظ سے بھی ادا کر سکے اور "سین" کے تلفظ سے بھی؟ وَصّٰی لکھے اور اَوْصٰی بھی پڑھا جا سکے؟ وَالزُّبُرِ وَالْکِتٰبِ کو اس طرح سے لکھدے کہ اس کو وبالزُّبُرِ وَبِالْکِتٰبِ بھی پڑھنے والے پڑھ سکیں قَالَ کو وَقَالَ اور تَشْتَهِیْهِ کو تَشْتَھِی اور اللہُ ھُوَ الْغَنِیُّ کو اَللہُ الْغَنِیُّ اور کُلًّا کو کُلٌّ اور اُقِّتَتْ کو وُقِّتَتْ جس کا جی چاہے پڑھ لے اور ضَنِیْنٍ بتلفظ ظَنِیْنٍ بھی ادا ہو سکے؟ جو لوگ ناواقفیت سے یا باوجود واقفیت کے ناواقفوں کو دھوکا دینے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ ساتوں قرارتوں میں رسم خط کا فرق نہیں ہے، رسم خط ایک ہی ہے صرف حرکتوں اور نقطوں یا مد و قصر وغیرہ کا اختلاف ہے وہ اس کا جواب دیانت کو مدنظر رکھتے ہوئے دیں؟

یہ نمونہ اختلافات تو صرف ابو عمرو الدانی کی کتاب التیسیر سے پیش کیا گیا ہے جو سات قراءتوں کی سب سے قدیم تر اور صحیح تر کتاب مانی جاتی ہے اور تمام قاریوں اور مقریوں کی مستند و معتمد علیہ ہے۔ اگر حدیث کی کتابوں میں سے صرف صحاح سے اختلافِ قرارت کے نمونے پیش کئے جائیں تو عقلِ ایمانی انگشت بدنداں رہ جائے۔

قرارت کی مبسوط کتابوں اور حدیث کی روایتوں میں ایسے سیکڑوں اختلافات[1] مذکور ہیں جن کو ایک رسم خط کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتی۔ اس لئے یہ کہنا کہ جمع صدیقی ان تمام اختلافات کی جامع تھی عقل و دیانت کی آنکھوں میں ابلہ فریبی کی خاک جھونکنا ہے۔

اتنا لکھ لینے کے بعد میرے نزدیک اب اس موضوع پر مزید خامہ فرسائی کی کوئی ضرورت نہیں نظر آتی، البتہ یہ مناسب مقام نظر آتا ہے کہ اتقان کی مذکورہ بالا عبارت جو ترجمہ کے ساتھ اوپر مذکور ہوئی ہے اس کی تھوڑی سی تشریح کر دوں تاکہ عامۂ ناظرین کی بصیرت میں اضافہ اور اہل علم کے لئے باعث تذکیر ہو۔

عبارتِ اتقان کی تشریح "ابن التین" اور ان کی اتباع میں جلال الدین سیوطی صاحب اتقان کا یہ اعتراف ہے کہ وان کان قد وسع قراءۃ بلغۃ غیرھم رفعا للحرج والمشقۃ فی ابتداء الامر یعنی "اگرچہ قرآن کی قرارت میں بخیال رفع حرج و رفع مشقت ابتدائے امر میں غیر قریشی لغات کی بھی وسعت رکھی گئی تھی۔ مگر حضرت عثمان نے رایٰ ان الحاجۃ الی ذلک انتھت فاقتصر الی لغۃ واحدۃ تو یہ محسوس فرمایا کہ اب اس وسعت کی حاجت ختم ہو گئی تو پھر ایک لغت پر قرآن کو مرتب کر ڈالا۔

---

[1] اختلافات قرارت کی مکمل بحث میری کتاب اعجاز القرآن میں تفصیل کے ساتھ آئیگی انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس میں اور بہت سے نمونے قرارت کی کتابوں اور صحیحوں سے مع تنقید احادیث آئینگے۔ ناظرین اس کی تکمیل کے منتظر رہیں واللہ المستعان ۱۲ منہ

یہ کس قدر خلاف عقل بات ہے۔ شروع عمر ہی میں اگر تمام قبائل کو ایک طریقے سے پڑھنے کیلئے کہا جاتا تو ہر شخص تھوڑا خیال رکھکر یاد کرتا، اور پھر شخص کی زبان عادی ہو جاتی اور مشق ہو جانے کی وجہ سے کسی کو بھی کسی طرح کی دشواری محسوس نہ ہوتی۔ مگر جب تمام قبائل کے بوڑھے، بچے، مرد اور عورت، سب کے سب جس قدر یاد کر سکے اپنے محاورہ لغت کے مطابق زبانی یاد کر چکے، اور ناظرہ بھی ان کو مشق ہے تو اپنے ہی لغ کے مطابق، جس نے مصحف کی صورت میں لکھ رکھا ہے تو اپنے ہی محاورے کے مطابق۔ اب کہا جاتا ہے کہ تم سب کے سب جتنے غیر قریشی ہو اپنا یاد کو بھلا دو، اپنی مشق کو ترک کر دو، اور اپنی کتابوں کو جلا دو۔ اور سب کے سب اب نئے سرے سے دوسرا مصحف لغت قریش کے مطا ہر شخص اپنے لئے لکھوائے۔ انصاف سے کہئے۔ حرج و مشقت کا سامنا اب ہوا یا آغاز امر میں تھا؟ اور جو کتاب، سات قراءتوں پر اللہ کی طرف سے اسکے رسول کی التجا و اصرار کے مطابق (جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم و ترمذی و ابو داود وغیرہ تمام صحاح و غیر صحاح ساری حدیث میں مذکور ہے۔ نازل ہوئی تھی، اس کی چھ قراءتوں کو منسوخ و ممنوع کر دینے کا حق حضرت عثمان کو کہاں سے حاصل ہو گیا تھا؟ اور اسلام یعنی آغاز کار کا زمانہ کب تک رہا؟ پورا عہد نبوی، بلکہ حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم کا زمانہ بھی آغاز کار ہی کا زمانہ قرار دیا کیسی پوچ اور لچر تاویل ہے جو علامہ ابن التین کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اس کو جلال الدین سیوطی نے کس طرح اتقان میں لکھ تعجب ہی تعجب ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ پورا ایران فتح ہو چکا ہے، کہاں کہاں اسلام پھیل چکا ہے، اور کہاں کہاں حفاظ قرآن پھیلے ہوئے ہیں، نہ جانے کتنے لاکھ قرآن کے نسخے مصحف کی صورت میں تمام ممالک اسلامیہ میں موجود ہیں کسی مسلمان کا گھر مصحف سے خالی نہ ہوگا، بلکہ ہر گھر میں متعدد مصحف ہونگے تاکہ گھر کا ہر فرد تلاوت کر سکے۔ اگر واقعی عہد نبوی سے سات قراءتیں مروج تھیں تو یقیناً قراءۃً، تلاوۃً، کتابۃً اور ساتوں قراءتوں کا ساری دنیائے اسلام میں پھیلنا ضروری تھا، کہیں کوئی قراءت پڑھی ہوگی کہیں کوئی قراءت، اس وقت یہ حکم دینا کہ پوری دنیائے اسلام کے تمام مسلمان چھ قراءتوں کو بالکل ترک کر دیں اور صرف ایک قراءت پر سب کے سب متحد ہو جائیں کتنی بڑی تکلیف

پوری دنیائے اسلام میں سات قراءتیں مروج ہوں اس کے بعد سبکو ایک قراءت کا پابند بنا دینا محال ہے

مالا یطاق ہے اور کس قدر دشوار ہے بلکہ عقلاً محال ہے کہ سارے عالم اسلامی کے مسلمان جو مختلف قراءتوں کے بچپن یا اپنے آغاز اسلام سے خوگر ہو چکے ہیں اب ایک نئی قراءت کو اختیار کریں اور اپنی پہلی مشق شدہ قراءت کو چھوڑ دیں، یہ جانتے ہوئے کہ یہ سب قراءتیں بھی صحیح ہیں اور رسول اللہ صلعم نے ان ساتوں قراءتوں کو بڑی التجاؤں کے ساتھ امت کی سہولت و عافیت کے لئے بارگاہ الٰہی سے حاصل کیا ہے۔ (بقول روایاں احادیث کے)

صرف ایک مصحف بھیجدینا کافی نہ تھا

صرف ایک مصحف لکھوا کر بھیجدینا تو کافی نہ تھا کیونکہ حضرت عثمان نے ان مصاحف پر نہ اعراب دلوائے نہ نقطے، تابوت اور تابوہ ہی جیسا اختلاف تو تھا نہیں تحسبُ اور تحسِبُ اور یجمعون و تجمعون جیسے اختلافات بھی تو بہت ہیں۔ جن میں صرف صیغوں کا فرق ہے حاضر و غائب یا معروف و مجہول کا اختلاف ہے جن میں کسی خاص لغت و محاورہ کی تخصیص نہیں ہے۔ تو جب ایک ہی قراءت رکھی گئی اور باقی چھ قراءتوں کے ترک کا حکم ہوا تو ایسے غیر منقوط بے اعراب دئے ہوئے مصحف سے اس قسم کے زبر و زیر اور نقطوں کے اختلافات کو کس طرح مٹایا جا سکتا تھا، جب تک کہ ہر ملک بلکہ ہر قریہ اور ہر محلے میں ایک قریشی قاری بھی نہ بھیجا جائے تاکہ وہ کم سے کم ہر قریہ میں ایک شخص کو لغت قریش کے مطابق قرآن پڑھاتا اور اس ایک شخص سے اس قریہ کے باقی لوگ تعلیم حاصل کریں۔ ایک قریشی قاری کے بغیر غیر منقوط و بے اعراب والے قرآن سے تو کبھی کوئی غیر قریشی عربی لغت قریش کے مطابق قرآن کسی طرح بھی پڑھ نہیں سکتا تھا، جو یحسب کی سین کو زبر دیکر پڑھ رہا تھا وہ اس مصحف معرا میں بھی زبر ہی دیکر پڑھیگا، اور جو سین کو زیر دیکر پڑھ رہا تھا وہ اس میں بھی زیر ہی دیکر پڑھیگا، اسی طرح جو یجمعون کو یائے تحتانیہ کے ساتھ پڑھ رہا تھا وہ یائے تحتانیہ ہی سے پڑھتا رہے گا۔ اور جو تائے فوقانیہ سے پڑھ رہا تھا وہ تائے فوقانیہ ہی سے اس میں بھی

مصحف معجمی

پڑھا سے گا۔ ایسے مصحف معجمٰے سے پوری امت کبھی ایک قرارت پر مجتمع نہیں ہو سکتی ہے۔ صرف حروف وکلمات اختلاف تو مٹینگے، مگر حرکات و الفاظ کے اختلاف کبھی نہیں مٹ سکتے۔

صفائی کی گواہی

کوفی راویوں نے جہاں حضرت عثمان پر یہ تہمت لگائی کہ انھوں نے ان کوفیوں کی مزعومہ سات قرارتوں میں۔ چھ قرارتوں کو اٹھا پھینکا اور صرف ایک قرارت پر جو قریش کے لغت کے مطابق تھی اسی پر تمام امت کو مجتمع کر، اور دوسری قرارتوں کے تمام مصاحف کو جلوا ڈالا، تو بظاہر حضرت عثمان کی حمایت بھی کرنا ضروری تھی تاکہ اس کو کوئی شیعیانہ حملہ نہ تصور کرے۔ چنانچہ ایک روایت گھڑ کر سوید بن غفلۃ الکوفی کے سر تھوپ دی کہ انھوں نے کہا کہ حضرت علی مرتضیٰ رض فرماتے تھے کہ عثمان متعلق بجز کلمہ خیر کے کچھ نہ کہو، کیونکہ انھوں نے مصاحف کے بارے میں جو کچھ کیا وہ محض اپنی رائے سے نہیں کیا، بلکہ ہماری ایک بڑ جماعت کے مشورے سے کیا۔" (اتقان ص۸۵) (بحوالہ ابن ابی داود بسند صحیح) درحقیقت یہ حضرت عثمان کے لئے صفائی کی گواہی نہیں بلکہ ساری دنیائے اسلام سے چھ قرارتوں کے اٹھ جانے اور صرف ایک قرارت کے عام شیوع اور فقط کو ذہن میں دوسری قرارتوں۔ وجود کا جو سبب یہ بیان کرنا، اور ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس بیان و دعویٰ کا وہ مزید ثبوت اس روایت سے ہم پہنچا رہے ہیں، اس لئے کہ حضرت عثمان پر حملے اہل سنت کے تو ہیں نہیں، ان پر شیعے حملے کرتے ہیں، اور شیعوں کی تشفی ایسی روایتوں سے کب ہو سکتی۔ اول تو وہ اس روایت ہی کو صحیح نہیں تسلیم کریں گے کہ حضرت علی مرتضیٰ نے ایسا فرمایا تھا۔ اور اگر اسناد کی صحت دیکھکر مان بھی لیں تو کہ دیں گے کہ حضرت علی نے تقیۃً ایسا کہدیا تھا۔ غرض یہ ہے کہ حضرت عثمان پر جو حملے کر رہے ہیں وہ حملے کرتے ہی رہیں گے، مگر ان کا مقصد اس روایت سے پورا ہو گیا۔ یعنی دنیائے اسلام میں آغاز خلافت عثمانی تک سات قرارتوں کے رواج کا ثبوت اس روایت کے ذریعہ پیش کر دیا گیا۔

اتقان میں یہیں پر یہ بھی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ نے معترضین سے پوچھا کہ سب قرارتیں جو مروّج ہیں، تم ان سب کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ایک قرارت والا دوسرے کی قرارت کے متعلق کہتا ہے کہ ہماری قرارت تمہاری قرارت سے بہتر ہے۔ اور یہ کفر کے قریب ہو جاتا ہے۔ تو معترضین نے کہا کہ تو آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا، کہ ہماری رائے تو یہی ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک قرارت پر مجتمع کر دیں، تاکہ نہ فرقے پیدا ہوں، نہ اختلاف باقی رہے۔ تو معترضین نے کہا کہ آپ کی رائے نہایت خوب ہے۔" اس سلسلے میں بھی اسی کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے، کہ پہلے متعدد قرارتیں مروّج تھیں تو حضرت علی نے پوچھا کہ "تم ان سب قرارتوں کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ جو مروّج تھیں اسکے بعد عقلی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا کہ ایک قرارت کو رکھکر باقی کو ختم کر دینا ہی مقتضائے مصلحت تھا اس لئے ایسا کیا گیا۔ اگرچہ بقول راویان حدیث رسول کی بڑی محنت سے حاصل کی ہوئی امت کیلئے سہولت و عافیت ضائع کر دی گئی۔

رسول، جبرئیل اور اللہ تعالےٰ سب کی غیر مآل اندیشی نعوذ باللہ من ذٰلک

صحیح مسلم ج ۱ ص۲۷۳ میں حضرت ابی بن کعب رض کی یہ حدیث مروی ہے کہ ابی بن کعب نے فرمایا کہ میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص آ کر نماز پڑھنے لگا۔ اور ایسی قرارت سے اس نے قرآن پڑھا جو مجھکو ممنوع نظر آئی۔ پھر دوسرا شخص آیا تو اس نے اس پہلے آنے والے سے مختلف قرارت سے قرآن پڑھا۔ تو جب ہم سب لوگ نماز ادا کر چکے تو سب کے سب رسول اللہ صلعم کے حضور میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ اس نے ایک ایسی قرارت

ے مصحف پر نقطے تو سب سے پہلے یحیےٰ بن یعمر البصری نے لگائے جیسا کہ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص۳۰۵ ترجمہ یحیےٰ بن یعمر میں لکھا ہے۔ ان کے سال وفات میں اختلاف ہے کہ کوئی ۱۲۹ھ کہتا ہے کوئی ۱۲۰ھ اور ابن جوزی ۸۹ھ فرماتے یہ علم نحو میں ابوالاسود الدیلی البصری متوفی ۶۹ھ کے شاگرد تھے۔ تو انہوں نے بھی جو نقطے لگائے تھے تو اپنے مصحف پر یا اپنے تلامذہ و احباب و اعزہ یا قرب و جوار کے مصاحف پر لگائے ہونگے، اور جس قرارت کے یہ خوگر تھے اسی کے مطابق لگائے ہونگے، اعراب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حجاج بن یوسف کے حکم سے ابوالاسود الدیلی نے قرآن پر اعراب لگائے۔ مگر یہ سب غلط ہے اعراب کا حکم تو خود رسول اللہ صلعم نے دیدیا تھا۔ اعراب اور نقطوں کی بحث میری کتاب اعجاز القرآن میں ہے۔ یہاں اسکے تفصیل کا موقع نہیں۔ منہ غفرلہٗ

سے قرآن پڑھا جو مجھکو ممنوع نظر آئی پھر یہ دوسرا آیا تو اس نے اس پہلے سے بھی مختلف قرات پڑھی۔ تو رسول اللہ صلعم نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا۔ اور دونوں کی قرات کو سراہا۔ تو میرے دل میں تکذیب کا ایسا جذبہ پیدا ہوا جو جاہلیت (یعنی حالت کفر) میں بھی نہ تھا تو جب رسول اللہ صلعم نے میری کیفیت کو محسوس فرمایا تو میرے سینے میں ایک ٹھوکا لگایا، تو میں پسینے پسینے ہو گیا، اور ایسا معلوم ہوا کہ میں گویا اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ رہا ہوں۔ پھر رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اے اُبیؓ! میرے پاس پیغام بھیجا گیا کہ میں قرآن کو ایک حرف (یعنی ایک قرات) پر پڑھا کروں۔ تو میں نے واپس کیا اور درخواست کی کہ میری امت کیلئے سہولت عطا فرمائی جائے تو دوبارہ حکم آیا کہ میں قرآن کو دو قراتوں میں پڑھوں پھر میں نے واپس کیا اور عرض کیا کہ میری امت کیلئے آسانی کی جائے تو سہ بارہ میرے پاس حکم آیا کہ میں سات قراتوں میں پڑھوں، اور ہر واپسی پر جو میں نے تمہارے پاس اس کو واپس کیا[1] کوئی ایک چیز مانگنے کا تمہیں حق ہو۔ تو میں نے دو بار کہا کہ اے اللہ میری امت کو بخشدے اور تیرے سوال کو اس دن کے لئے اٹھا رکھا ہے کہ ساری مخلوق حتےٰ کہ ابراہیم علیہ السلام بھی میری طرف راغب ہونگے۔"

یہ حدیث فی الجملہ اختلاف کے ساتھ دوسرے طرق سے بھی مروی ہے اور حضرت فاروق اعظم کے ساتھ بھی تقریباً اسی قسم کا واقعہ مروی ہے اور صرف اس قدر کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ سے بھی صحاح میں مروی ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث اس مضمون کی موطا میں بھی ہے غرض حدیث کی کوئی کتاب اس مضمون سے خالی نہیں ہے۔

اگرچہ ان تمام حدیثوں کو اور ان کے تمام طرق کو یکجا کیا جائے تو سیکڑے ننانوے طرق ایسے ہی ملیں گے جن کے اسناد میں کوئی نہ کوئی وضاع یا کذاب یا شیعہ ضرور ہوگا۔ یا وہ روایت مرسل ہوگی جیسے موطا کی روایت یعنی درمیان سے ایک راوی کا نام روایت میں غائب کر دیا گیا[2] اس حدیث پر بہت مفصل بحث میرے رسالہ قرات اور کتاب اعجاز القرآن میں آرہی ہے اس لئے یہاں اس پر زیادہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ حدیث مذکورہ کی چند رکاکتوں کو واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس سے ناظرین یہ سمجھیں کہ محدثین درایۃ کو کس طرح پس پشت ڈال کر مخدوش حدیثوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اللہ بُرا کرے جذبۂ روایت پرستی کا۔

۱۔ وہ زمانہ آجکل جیسا نہ تھا کہ جو مسجد میں آیا تنہا نماز پڑھکر چلا گیا۔ بلکہ آج بھی عموماً جماعت کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں الگ الگ مسجدوں میں آآکر نمازیں پڑھنے کا دستور ہی نہ تھا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فرض نماز نہ تھی، کوئی نفل ہوگی۔ کیونکہ اول تو نفلیں گھروں میں پڑھتے تھے۔ مسجدوں میں نفلیں نہیں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ قرات جہری نفلوں میں نہیں ہوا کرتی ہے۔ یہ تین تین آدمی الگ الگ فرض پڑھ گئے، بالکل خلاف عقل ہے

۲۔ یہ عجب طرح کا اتفاق ہے کہ جو سورہ پہلے شخص نے پڑھا، وہی سورہ دوسرے شخص نے بھی۔ ورنہ ان دونوں کی قراتوں کا باہمی اختلاف کس طرح حضرت ابی بن کعبؓ کو معلوم ہو سکا؟ یا یہ کہا جائے کہ دونوں نے سورہ فاتحہ ہی مختلف طریقے سے پڑھا؟ تو یہ کسی روایت میں مذکور نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ضرور مذکور ہوتا۔

۳۔ رسول اللہ صلعم کو جو ایک قرات سے پڑھنے کا حکم ہوا تو آپ نے قرآن کا ایک قرات سے پڑھنا امت کیلئے دشوار کیوں محسوس فرمایا؟ اگر امت میں مختلف قبائل کے لوگ تھے۔ اور سب کے لغات الگ الگ اور باہم مختلف تھے تو آپ اسکی اجازت مانگتے کہ ہر قبیلے کو اپنے محاورے اور لغت کے مطابق پڑھنے کی اجازت ہو نہ کہ سات حرفوں پر قناعت کر لیتے۔ قبائل تو سیکڑوں تھے۔ بلکہ امت تو عرب و عجم سب تھے۔ اس سہولت سے آپ نے عجمی امت کو کیوں محروم رکھا، جو نا واقفیت زبان کی وجہ سے عرب سے زیادہ مستحق رحم تھی۔ ان کو تو ادائے مخارج حروف

---

[1] یا تم نے ہمارے پاس ہمارا پیام واپس کیا، جیسا کہ بعض نسخوں میں ہے۔ مگر واپس کیا رسول اللہ صلعم نے نہ کہ اللہ تعالیٰ نے۔ اللہ نے تو ہر بار نیا حکم بھیجا۔ ۱۲ منہ

[2] واضح رہے کہ سات قراتوں پر قرآن کے نازل ہونے کی حدیث بھی ابن شہاب زہری ہی سے مروی ہے۔ اس کے اصل راوی یہی ہیں۔ البتہ انکے شاگردوں نے ان کی تائید کے لئے دو ایک روایت ان کے بعض ہمعصروں سے بھی بنا ڈالی ہیں۔ ۱۲ منہ

اور تجوید کی مشقت سے نجات دلائی جاتی ؟۔

اول الامر و آخر الامر میں دو بین تفاوت ہے از کجاست تا بکجا

ملہ وہ سہولت جو اس وقت بقول ابن التین و بتصدیق جلال الدین سیوطی اَوّلُ الْاَمر (آغاز کار) میں آنحضرت صلعم کو نعوذ باللہ غیر مآل اندیشی کی وجہ سے واجب الحصول نظر آتی تھی کہ بار بار حکم ربانی کو واپس کر کر کے حاصل کی گئی۔ آخر الامر یعنی زمانہ عثمانی میں امت کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ یعنی باعث تفریق و اختلاف ثابت ہوگئی اس کو اگر جامہ بشریت میں رہنے کی وجہ سے رسول اللہ صلعم نہ سمجھ سکتے تھے تو حضرت جبریل تو رسول اللہ صلعم کو منع فرماتے، کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں، یہ متعدد قراتیں باعث سہولت نہ ہونگی۔ بلکہ باعث مصیبت ہو جائینگی اگر جبریل کو بھی آنے والے زمانے کی خبر نہ تھی اتنی مآل اندیشی کی عقل نہ تھی تو خود اللہ تعالیٰ تو اپنے رسول کو اس کے نتیجے سے مطلع فرما دیتا۔ بل ھو الانسان للشر دعاءہ بالخیر کے مصداق نہ ہو۔ تم جو ایک قرارت کے مطابق ساری امت کا پڑھنا دشوار سمجھتے ہو غلط ہی یہی سہل ہے۔ اگر متعدد قراتوں کی اجازت دے دی جائیگی تو امت میں سخت اختلاف پیدا ہو جائے گا، اور ہر غلط قرآن پڑھنے والا اپنی غلط قرارت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اسکو عثمان بن[ملہ] ابی شیبہ کی طرح سے سات قراتوں میں سے ایک کہدیگا۔ آج جو حذیفہ بن یمان عثمان بن عفان و علی بن ابی طالب اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس اختلاف قرارت کی وجہ سے قرآن کی بربادی اور امت کی تباہی نظر آ رہی ہے اسکو اگر غلط اندیشی کی وجہ سے معاذ اللہ من ذلک رسول نہ سمجھ سکے علم غیب نہ رکھنے کی وجہ سے جبریل نہ سمجھا سکے تو اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب والشہادہ ہے اس نے کیوں رسول کی ایسی خطرناک درخواست قبول کرلی۔ قبول ہی نہیں، بلکہ اس درخواست پر خوش ہو کر انعام دیا۔ اور پھر ایسی حکم پر ایک سوال کرنے کا حق عطا فرمایا ؟

تین سوالوں کا حشر

تین سوالوں کا حق جو رسول اللہ صلعم کو ملا تھا تو اگر ایک سوال قیامت کے لئے آپنے اٹھا رکھا تھا تو دو سوال پر دو چیزیں تو مانگتے۔ دو سوال کے موقع کو ایک سوال کی تکرار کر کے ایک موقع سوال کو آپ نے ضائع کیوں فرما دیا ؟ اگر مغفرت امت ہی کا سوال دونوں مرتبہ کرنا تھا تو ایک سوال دنیا میں مغفرت کے لئے ہوتا دوسرا آخرت کی مغفرت کے لئے۔ دوسرا موقع سوال تو تکرار لاطائل کر کے قصداً ضائع کر دیا گیا، جسکو ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے۔

ان پانچ باتوں کے علاوہ ہر صاحب فراست ایمانیہ اس حدیث بلکہ اس مضمون کی ہر حدیث کی کمزوریوں اور رکاکتوں کو پہلی نظر میں جو محسوس کر سکتا ہے، بشرطیکہ روایت پرستی اور ایمان بالرواۃ کی پٹی ایمان باللہ و ایمان برسول اللہ و ایمان بکتاب اللہ کی آنکھوں پر بندھی نہ ہو۔

نقل صحف مصاحف کی تاریخ

ابن خلدون لکھتے ہیں حذیفہ بن الیمان غزوہ رے سے فارغ ہو کر سنہ۳۰ھ میں عبدالرحمن بن ربیعہ کی مدد کیلئے غزوہ الباب میں پہنچے اور آذربایجان میں اپنی جگہ پر سعید بن ربیعہ کو رکھ دیا تھا۔ مگر عبدالرحمن کی شہادت کے بعد وہ واپس آگئے۔ سعید بن ربیعہ نے ان کی غیبت میں جو شہر والوں سے اختلافات قرارت سنے تھے اس سے انہوں نے حذیفہ کو مطلع کیا۔ حذیفہ کو یہ بات بہت اہم معلوم ہوئی۔ انھوں نے لوگوں کو قرآن میں اختلاف پیدا کرنے سے ڈرایا جتنے صحابہ و تابعین وہاں موجود تھے سب نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ بجز عبداللہ بن مسعود کے کوفی شاگردوں کے، ان لوگوں نے اختلافات پر قایم رہنے کے لئے اصرار کیا، تو سعید بن ربیعہ کو غصہ آگیا اور انھوں نے ان کوفیوں کو ڈانٹا، اس کے جواب میں عبداللہ بن مسعود بھی پر خفا ہوئے اور اپنے شاگردوں کی پالائش کرنے لگے تو سعید غضبناک ہو کر اس مجلس سے اٹھ آئے اور مجلس منتشر ہوگئی۔ حذیفہ خود

ملہ عثمان بن ابی شیبہ بڑے بھاری محدث ہیں بخاری میں ان سے ۵۲ حدیثیں اور مسلم میں ۱۳۵ حدیثیں مروی مگر قرآن میں بہت تحریف کیا کرتے تھے۔ کوئی ٹوکتا تو کہتے تھے کہ میں عاصم کی قرارت سے۔ قرآن نہیں پڑھتا۔ حالانکہ جو یہ پڑھتے تھے وہ کسی بھی قرارت نہیں ہوتی تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۵۱) —— ملہ حاشیہ ہذا صفحہ آئندہ کے حاشیہ میں ملاحظہ کیجیے۔

حضرت عثمان کے پاس چلے آئے اور اختلاف قرارت کے فتنے سے ان کو آگاہ کیا۔ حضرت عثمان نے صحابہ کو مجتمع کرکے مشورہ کیا۔ تمام صحابہ نے بالاتفاق خذیفہ بن الیمان کی تائید کی۔ تو حضرت عثمان نے ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس سے صحیفے منگواکر ان کی متعدد نقلیں لوگوں سے مصاحف کی شکل میں کرا کے ایک مصحف ہر علاقے میں بھیجدیا، کہ اسی نسخے پر اعتماد کیا جائے اور اس سے اختلاف رکھنے والے جتنے نسخے، صحیفوں کی شکل میں ہوں سب کو جلا دیا جائے۔ حضرت عثمان کے حکم کو سب نے مان لیا بجز عبداللہ بن مسعود کے، انہوں نے اپنے شاگردوں (اہل کوفہ) کو مصحف عثمانی کی اتباع سے منع کردیا (اور اپنے مصاحف پر قائم رہنے کی تاکید کردی) مگر یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر بہتان عظیم ہے) وکفی باللہ شہیدا۔

ابن حجر کی غلطی

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری ج ۲۰ ص ۲۲۴ میں تحریر فرماتے ہیں کہ قصہ سنہ ۳۰ کا نہیں ہے بلکہ سنہ ۲۵ کا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے دوسرے یا تیسرے سال کا۔ ثبوت میں لکھتے ہیں کہ ابن ابی داؤد نے مصعب بن سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے کہ حضرت عثمان نے (مجمع صحابہ و تابعین میں) خطبہ دیا، اور فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت عثمان کا ایک خطبہ

وفات پاگئے جس کو پندرہ سال ہوئے۔ اور تم لوگوں نے قرآن کی قراءتوں میں اختلافات پیدا کرنا شروع کردئے۔۔۔۔ الخ اور یقیناً حضرت عثمان کی خلافت حضرت عمر کی شہادت کے بعد ہوئی، اور حضرت عمر کی شہادت ماہ ذی الحجہ سنہ ۲۳ میں ہوئی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تیرہ برس بعد۔ تو خطبہ میں حضرت عثمان کا پندرہ برس کہنا۔ اگر پورے پندرہ برس کا حساب کرکے تھا تو یہ واقعہ نقل مصاحف یا خطبہ خلافت عثمانیہ سے دو برس تین ماہ بعد کا ہے۔ لیکن ایک دوسری روایت میں ہے جو ابن ابی داؤد کی ہے جس میں پندرہ کی جگہ تیرہ برس مذکور ہے۔ تو اگر کسر کو درمیان سے حذف کردیا جائے تو دونوں روایتوں میں تطابق کیا جاسکتا ہے کہ ایک روایت میں مہینوں کا اعتبار کرلیا جائے اور دوسری میں مہینوں کا حساب نہ کیا جائے۔ تو اس طرح یہ واقعہ ان کی خلافت کے ایک سال بعد کا ہوگا، یعنی اواخر سنہ ۲۴ کا یا اوائل سنہ ۲۵ کا اور یہی وہ وقت ہے کہ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں ارمینیہ فتح ہوا، اور یہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے حضرت عثمان کی طرف سے والی کوفہ مقرر کئے جانے کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اور ہمارے بعض معصروں نے جو سنہ ۳۰ کا واقعہ اس کو لکھدیا ہے۔ یہ ان کی غفلت ہے"

تطابق کی سعی ناکام

حافظ ابن حجر نے جو پندرہ اور تیرہ برسوں کی دونوں روایتوں میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بالکل خلاف عقل ہے اس لئے تیرہ چودہ پندرہ کا تفرقہ ہوتا تو مہینوں کی کسر کو ادھر ادھر کرنے سے تطابق ممکن تھا۔ تیرہ اور پندرہ کے درمیان تو مہینوں کی کسر ادھر ادھر کرنے پر بھی بیچ میں ایک برس ضرور پھڑکنے لگے گا۔ اس کے علاوہ حضرت عمر کی شہادت باختلاف روایت ۲۶/ یا ۲۷ ذیحجہ کو بدھ کے دن ہوئی سنہ ۲۳ھ میں۔ اختلاف دن اور سنہ میں نہیں ہے، صرف تاریخ میں ہے۔ اور بالکل آغاز سنہ ۲۴ میں حضرت عثمان کی خلافت قایم ہوئی۔ اور اسکو تو ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات سنہ ۱۱ ماہ ربیع الاول میں ہوئی اس لئے آنحضرت صلعم کی وفات سے تیرہ برس نو مہینے بعد حضرت عثمان کی خلافت ٹھہرتی ہے۔ اگر ٹھیک خلافت ہی کے سال کا واقعہ فتح ارمینیہ کہا جائے تو نصب خلافت کے ساتھ کا واقعہ تو کہا نہیں جاسکتا۔ تین چار مہینے بعد بھی کہئے تو آنحضرت صلعم کی وفات سے پورے چودہ برس بعد ہوگا۔ اس لئے تیرہ برس والی دوسری روایت تو کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی باقی رہی پندرہ برس والی روایت تو یہ قرین عقل ہے، اور صحیح ہوسکتی ہے اگر یہ خطبہ خذیفہ والے واقعے سے پیشتر کا کہا جائے۔ اور یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ مدینہ و حوالی مدینہ میں اختلاف قرارت کے اثرات تھے اور ان کو دیکھکر یا لوگوں سے سن کر حضرت عثمان نے صحابہ و تابعین میں یہ خطبہ دیا تھا۔ اور اس صورت میں تیرہ برس والی روایت بھی صحیح ہوسکتی ہے، مگر دو میں سے ایک قول کو ضرور غلط ماننا پڑیگا۔ دونوں کا جمع و تطابق ناممکن ہے۔

سنین پر بحث

مگر حافظ ابن حجر نے اس خطبے کو حذیفہ بن الیمانی کی شکایت کا نتیجہ قرار دیکر ابن ابی داؤد کی روایتوں کے دو متن سنین پر فتح ارمینیہ اور واقعہ حذیفہ دنقل مصاحف کی بنیاد رکھدی، اور جن لوگوں نے اس واقعہ کا سال ۳۰ھ لکھا اسکو غلط قرار دے کر ابن حجر ۲۵ھ کو صحیح لکھ گئے۔ اور اسی بنیاد پر لکھ گئے کہ یہ واقعہ ولید بن عقبہ کے ولایت کوفہ کے آغاز کا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ولید بن عقبہ کا تقرر ضرور آغاز خلافت عثمانی میں ہوا۔ مگر پانچ برس کے بعد یہ معزول کر دئے گئے (ابن خلدون جلد ۲ حصہ ۲ ص ۱۳۴) اور ان کے بعد سعید بن العاص والی کوفہ ہوئے اور یہ واقعہ سعید بن العاص کی ولایت کوفہ کا ہے۔ چنانچہ سعید اور اصحاب ابن مسعود کا اختلاف قرارت پر مناقشہ اور عبداللہ بن مسعود کا اپنے شاگردوں کی پالائش کرنا اور سعید پر خفا ہونا اور سعید کا غضبناک ہوکر مجلس سے اٹھکر چلا آنا اور اسی موقع پر حذیفہ کا حضرت عثمان کے پاس اختلاف قرارت کی شکایت لیکر آنا اور ابن خلدون کے حوالے ہی سے مذکور ہو چکا ہے۔ ولید بن عقبہ آغاز، خلافت عثمانی یعنی ۲۴ھ میں والی کوفہ مقرر ہوئے اور پانچ برس کے بعد یعنی ۲۹ھ میں معزول ہوئے اور اسی ۲۹ھ میں سعید بن العاص والی کوفہ ہوئے اور اس کے کچھ ماہ بعد ۳۰ھ میں حذیفہ بن الیمان حضرت عثمان کے پاس اختلاف قرارات کی شکایت لیکر آئے۔ اگر یہ سب واقعات واقعی سچے ہیں تو اس طرح بتائے جا سکتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سارے واقعات محض ترتیبی ہیں، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حضرت عثمان کا ایک اور خطبہ

ابو یعلی الموصلی اپنی مسند کبیر میں اپنے اسناد کے ساتھ لکھتے ہیں۔ کہ ان عثمان بن عفان قام خطیبا علی المنبر فقال انشد اللہ امرءً سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف۔ فقام الصحابۃ من کل جانب حتی ما احصی عددھم وکل واحد یقول انا سمعتہ یقول ذلک۔ فقال عثمان وانا سمعتہ یقول ذلک۔ اس روایت کو نقل کر کے قاری محمد نظر صاحب امروہی اپنی کتاب تسہیل البیان فی رسم نظم القرآن کے صفحہ ۳ میں لکھتے ہیں ومن ثم قال ابو عبید وغیرہ من حفاظ الحدیث انہ من الاحادیث المتواترۃ الخ قاری صاحب ممدوح نے اپنی کتاب کے ساتھ دوسرے کالم میں اردو ترجمہ بھی شائع فرمایا ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ انہیں کا ترجمہ نقل کر دوں (ترجمہ) ابو یعلے موصلی نے اپنی مسند کبیر میں کہا ہے کہ عثمان بن عفان نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ "میں ہر اس شخص کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ سنا ہے"، چنانچہ ہر جانب سے صحابہ کھڑے ہوگئے یہاں تک کہ انکی تعداد کوئی گن نہیں سکتا اور ہر شخص کہتا تھا کہ میں نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا۔ تو حضرت عثمان نے بھی کہا کہ میں نے بھی سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہتے ہوئے سنا "اس کے بعد قاری صاحب اپنی عبارت کا ترجمہ لکھتے ہیں کہ) اور یہیں سے ابو عبید اور ان کے علاوہ دوسرے حفاظ حدیث نے لیا ہے، کہ یہ حدیث احادیث متواترہ میں سے ہے ... الخ

---

[1] ابو یعلی موصلی۔ ان کا پورا نام احمد بن علی بن مثنی ابو یعلے الموصلی ہے۔ ان کی وفات ۳۰۷ھ میں ہوئی انکی کتاب "المسند الکبیر" قاضی شوکانی کے خاص ہاتھ کی لکھی ہوئی جرمنی کے کتب خانے میں اس وقت موجود اور ان کا ترجمہ تذکرۃ الحفاظ جلد سوم ص ۲۴۸ میں موجود ہے۔ ان سے ایک روایت بھی منقول ہے۔ جسکو ابو یعلی محمد بن ابی بکر المقدمی سے وہ یوسف بن مزید سے وہ ابراہیم بن عمر بن آبان سے وہ زہری سے اور زہری اپنے باپ سے۔ زہری کے باپ عبدالرحمن بھی ہوں سے روایت کرتے ہیں یہی ایک روایت ہے جس میں زہری کا اپنے باپ سے روایت کرنا مذکور ہے۔ ورنہ ان کے باپ کا ذکر سلسلہ روایت میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ذہبی اس روایت کو غریب قرار دیتے ہیں اور ابراہیم بن عمر بن آبان کو ضعیف یعنی اس حدیث کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔ ۱۲ منہ

[2] یہ حدیث بالکل موضوع اور محض اختراع ہے۔ میں نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں اس پر پوری بحث کی ہے۔ منافقین عجم نے صرف قرآن کو مشتبہ کرنے کے لئے یہ حدیث بناکر مشہور کی اور اسکی بنیاد پر تمام اختلافات قرارت کی سر بفلک عمارت رفتہ رفتہ کھڑی کر دی۔ میرا ایک مستقل رسالہ بھی ان احادیث کی تنقید میں ہے۔ جس کا نام ہے الزحرف فی سبعۃ احرف ۱۲ منہ غفرلہ۔

علمائے حدیث سے استفسار علمائے حدیث سے استفسار ہے کہ ان دونوں خطبوں میں سے کون سا خطبہ صحیح ہے؟ ابو یعلی کی روایت والا خطبہ تو بتا رہا ہے کہ اختلاف قرارت میں کسی کو شبہہ تھا لوگ اسکی مخالفت کر رہے تھے۔ اس لئے حضرت عثمان نے تمام صحابہ کو قسم دیکر سب سے سبعۃ احرف والی حدیث کی تصدیق کرائی اور خود بھی قسم کھاکر تصدیق کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حذیفہ بن الیمان کی شکایت سن کر ہی صحابہ کو مجتمع کیا گیا۔ اور خطبہ دیکر سب سے تصدیق کراکر اختلاف قرارات کی بنیاد کو مستحکم کیا گیا۔ اس لئے اس کے بعد یہ توقع کہ تمام قراءتوں کو حضرت عثمان نے ختم کرا دیا، اور صرف ایک لغۃ قریش والی قرارت کو روا رکھا صحیح ماننے کے بعد کتنی متضاد توقع ہے۔ ابو یعلی موصلی جن کی وفات چوتھی صدی کے آغاز میں ہے ان کو تو اس خطبہ کی روایت مل جاتی ہے مگر صحاح کے مولفین میں سے کسی کی نظر کے سامنے یہ حدیث کبھی نہیں آئی۔ اور کسی کو اس خطبے کا واقعہ معلوم نہ ہوا۔ تعجب ہی تعجب ہے ناظرین خود ابن ابی داود والا خطبہ جس کو ہم نے فتح الباری ج ۲۰ ص ۲۲ سے ترجمہ کی صورت میں نقل کیا ہے اور یہ خطبہ ابو یعلے والا دونوں کے مفہوم کو ملا کر دیکھ لیں۔ ابن ابی داود کو اگرچہ محدثین نے بہت کچھ سراہا ہے، مگر ان کے والد بزرگوار انکو کذاب ہی کہتے رہے۔ ابراہیم الاصبہانی نے بھی ان کو کذاب کہا ہے (لسان المیزان جلد ۳ ص ۲۹۴) ۳۱۶ھ میں ان کی وفات ہے اس لئے ابو یعلے الموصلی سے یہ بالکل ہمعصر ہیں۔ ابو یعلے نے ان سے نو برس پہلے ۳۰۷ھ میں وفات پائی ہے۔ ان کی ولادت ۲۳۵ھ کی ہے اسلئے ۸۱ برس عمر ہوتی ہے۔ ابو یعلی کی عمر معلوم نہ ہو سکی اور نہ سال ولادت مل سکا۔ ابن حجر نے تو ان کا ذکر ہی نہیں کیا نہ ثقات میں نہ ضعفا میں بہر حال دونوں ہمعصر ہیں اور عجب کیا ہے کہ ہمسن بھی ہوں۔ تو ایک زمانے کے دو محدث اپنی اپنی کتاب میں ایک ایک خطبہ حضرت عثمان کی طرف منسوب کر کے روایت کرتے ہیں ایک کے خطبے سے اختلافات قراوت کی جڑ کاٹی جاتی ہے اور دوسرے کے خطبے سے اختلافات کی بنیاد محکم کی جاتی ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے خطبے کی کوئی خبر نہیں۔

دونوں خطبوں پر تبصرہ ابو یعلی موصلی والا خطبہ تو صاف جعلی معلوم ہو رہا ہے کہ سبعۃ احرف والی حدیث کو متواتر ثابت کرنے کے لئے گھڑا گیا ہے، اور بہت بعد تیسری صدی کے اواخر میں گھڑا گیا۔ اسی لئے ابو یعلے کی سند کے سوا اور کسی کتاب میں یہ روایت نہیں ملتی۔ اور اس خطبے کی روایت حضرت عثمان کی طرف کی گئی کہ اگلوں نے ابن ابی داود والا خطبہ گھڑ کر حضرت عثمان کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ اور پھر نقل مصاحف بعہد عثمانی والی حدیث بنا کر اور اسکو مشہور کر کے اس مضمون کی پوری طرح اشاعت کی تھی کہ پہلے ساتوں قراءتیں جاری تھیں مگر حضرت عثمان نے تمام صحابہ کے مشورے سے چھ قراءتوں کو موقوف و معدوم کر دیا اور صرف ایک قریش والی قراءت کو قائم رکھا۔ حضرت عثمان سے صرف عبداللہ بن مسعود نے اختلاف کیا اس لئے ابن مسعود کے تلامذہ یعنی اہل کوفہ نے اختلاف قراءت کی حفاظت کی اور ان کو قائم رکھا، اور کوفے سے باہر کے تمام لوگ حضرت عثمان کے فرمان کے بموجب ایک قراءت کے سوا دوسری ساری قراءتوں کو چھوڑ بیٹھے، بھول گئے اور دوسری قراءتوں کے صحیفوں اور مصحفوں کو سب نے جلا دیا تو اس روایت کی شہرت کے اثر سے حدیث سبعۃ احرف کے متعلق شبہہ پیدا ہوا تھا کہ اگر واقعی قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا تھا تو پھر حضرت عثمان نے اور ان کے ساتھ تمام صحابہ نے چھ حرفوں کو برباد کیوں کرا دیا۔ اس لئے حضرت عثمان ہی کی طرف سے ایک دوسرا خطبہ اور پھر تمام صحابہ سے حضرت عثمان کا قسم لیکر پوچھنا اور سب کا سبعۃ احرف والی حدیث کے صحیح ہونے پر قسم کھانا اس پہلے خطبے کی روایت بننے کے۔۔۔ تقریباً دو صدی کے بعد اس خطبے کی روایت وضع کر کے یہ ثبوت بہم پہونچایا گیا کہ ہاں حضرت عثمان نے اور ان کے ساتھ تمام صحابہ نے جو کچھ کیا بتقاضائے مصلحت کیا مگر اس سبعۃ احرف والی حدیث پر ساری صحابہ کا ایمان اور سب کو اسکی صحت کا اعتراف تھا۔ جو کچھ ان لوگوں نے کیا اس حدیث کی صحت سے واقف رہتے ہوئے کیا۔ غلط کیا یا صحیح کیا، ایسا کرنے کا حق تھا یا نہیں یہ سوال خود بخود دلوں میں پیدا ہو اور لاجواب رہے۔ یہی بہتر ہے

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ ساری داستان متعلق جمع قرآن بعہد صدیق اکبر و نقل مصاحف بعہد حضرت عثمان، اول سے آخر تک

بالکل کذبِ افترا اور بہتان عظیم ہے۔ نہ عہد صدیقی میں قرآن جمع ہوا، نہ عہد عثمانی میں اختلافات قرارت تھے، نہ انکے مٹانے کے لئے کوئی کوشش کی گئی، نہ اس زمانے میں کہیں بھی کوئی سبعۃ احرف کے لفظ سے آشنا تھا۔ یہ ساری حدیثیں اور روایتیں ایک صدی کے بعد گھڑی جانے لگیں اور اسی زمانے سے اختلافات قرارت کے فتنے کی ابتدا کی گئی، جسکے لئے انزل القرآن علیٰ سبعۃ احرف کی حدیث گھڑ کر اسکو رفتہ رفتہ پہلے مشہور کیا جانے لگا۔ قرآن پاک کی کتابت عہدی نبوی ہی سے ہر لکھا پڑھا صحابی اپنے لئے اپنے اہل وعیال کے لئے اپنے اعزہ واقران اور پڑوسیوں کے لئے نقل پر نقل کر رہا تھا۔ آنحضرت صلعم لوگوں کو کتاب دیکھکر تلاوت کرنے کی برابر ترغیب فرماگئے تھے۔ اس پر دونا ثواب کی بشارت دیا کرتے تھے اسی لئے حفاظ قرآن بھی کتاب دیکھکر ہی پڑھتے تھے۔ البتہ سفر میں مصحف ساتھ لیکر چلنے کی ممانعت تھی کہ کہیں دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ ازواج مطہرات حسب حکم واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ (احزاب ۳۴ جلد ۲۲) پورا قرآن یاد کر چکی تھیں اور ہر ایک کے پاس قرآن مصحف کی صورت میں لکھا ہوا موجود تھا۔ ان کے مصاحف کے کاتبوں کے نام تک کتابوں میں مذکور ہیں اور وہ سب خود بھی لکھنا پوری طرح جانتی تھیں پھر صحابہ آنحضرت صلعم سے پوچھتے تھے کہ قرآن کتنے دنوں میں ختم کریں۔ آپ نے تین دن سے کم مدت میں ختم کرنے کی اجازت نہ دی۔ غرض اگر قرآن مرتب و مدون ہی نہ تھا تو ختم کرنے کا سوال کیوں اٹھتا تھا؟ اور پورا قرآن لکھا ہوا مصحف کی شکل میں صحابہ کے پاس نہ تھا تو کتاب دیکھکر پڑھنے کا عام حکم کیا معنی رکھتا ہے؟ اور سفر میں قرآن ساتھ لیکر چلنے کی ممانعت کے کیا معنی ہیں؟ میں نے ص۹۲ میں بھی اس مضمون پر کچھ روشنی ڈالی ہے بضمن تذکرہ زید بن ثابت اس لئے مزید خامہ فرسائی یہاں ضروری نہیں سمجھتا۔ اتنا اس لئے لکھدیا کہ قرآن کی آیتیں قرآن کی سورتیں سب مرتب و مدون اور پورا قرآن مصحف کی شکل میں ترتیب کے ساتھ جس میں مرتب سورتیں تھیں اور ترتیب سور کے ساتھ جو مصحف تھا ہزاروں کی تعداد میں موجود تھا۔ حضرت صدیق اکبر کے وقت میں جمع قرآن کی ضرورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی اور جنگ یمامہ میں ستر حفاظ قرآن کی شہادت سے ضیاع قرآن بلکہ کسی ایک حرف کے بھی ضایع ہونے کا خطرہ نہیں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اسوقت صحابہ وتابعین میں ستر ہزار سے زیادہ پورے قرآن کے حافظ موجود تھے، اور ہزاروں نسخے مصحف کے لکھے ہوئے تھے اور تقریباً ہر روز ایک مصحف کا اضافہ ہو رہا تھا اس لئے حفظ وکتابت دونوں کا غیر منقطع سلسلہ عہد نبوی سے جاری تھا اور جس طرح ہر روز چند حافظ فارغ التکمیل ہوتے تھے اسی طرح ہر روز چند نسخے قرآن مبین کے مکمل الکتابت ہوتے تھے۔ اور بفضلہ تعالےٰ یہ سلسلہ اس وقت سے اس وقت تک غیر منقطع تسلسل وتواتر کے ساتھ قایم ہے اور انشا اللہ قیامت تک قایم رہیگا۔ اور چونکہ ہر مصحف اس پہلے مصحف کی بعینہ نقل تھا جس کو خود رسول اللہ صلعم نے لکھوایا تھا۔ اور جس کی امین حضرت ام المومنین حفصہ قرار دی گئی تھیں جس کا نام الامام یا الام تھا، اس لئے ہر مصحف میں وہی رسم خط تھی جو الامام کی تھی اور چونکہ ہر صحابی کی قرارت خاص تلقین نبوی تک منتہی ہوتی تھی، اس لئے تلفظ میں بھی باہم اختلاف ناممکن تھا۔ اگر کسی صحابی کو بھول چوک بھی ہو تو رسول اللہ صلعم کی بار بار کی تلاوت نمازوں میں اور نماز سے باہر سن سن کر ہر بھولنے والے کی یاد دہانی ہوتی رہتی تھی، اور صحابہ خود آپس میں بھی دور کیا کرتے تھے۔ اپنے اہل وعیال کے ساتھ بھی دور کیا کرتے تھے۔ اس لئے کسی طرح کے اختلاف قرارت کا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود وحضرت ابی بن کعب وغیرہ کی الگ الگ قرارتیں اور ان کے الگ الگ مصاحف ایک دوسرے سے مختلف محض منافقین عجم کے فتنے تھے جس کو انہوں نے کوفہ میں بیٹھکر بعض کوفی منافق طینتوں کو اپنا شریک کار بنا کر کھڑا کیا تھا۔

منافقین عجم کا تمام اسلامی ممالک میں سازشی جال

اس وقت ان منافقین عجم کی ایک بہت بڑی جماعت خلافت بنی امیہ کے خلاف تمام ملک اسلامی میں سازش کرتی پھرتی تھی جس کا اصلی مرکز خراسان تھا اور دوسرا مرکز کوفہ اور دوسری جماعت جھوٹی جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر اصل دین کی تخریب میں لگی ہوئی تھی۔ صرف جھوٹی حدیثوں سے دین کی پوری

تخریب ہوتی نظر آتی تو پہلی صدی ختم ہونے کے بعد اس جماعت مفسدین نے نفس قرآن میں ہاتھ لگایا اور انزل القران علی سبعة احرف کی حدیث بنا کر پہلے اس کو مشہور کیا، اس وقت جمع احادیث کا ایک ہو گا ابن شہاب زہری اور ان کے توابع اور بعض جعفر کو تھا بقول ابن حجر کے کلما سمعوا شیئًا علقوہ جو کچھ سنا ٹانک لیا۔ یہ سبعہ احرف والی حدیث بھی یاروں نے لکھی اور پھر ان سے ان کے تلامذہ نے لی ان سے ان کے تلامذہ نے۔ روایت کو درایت پر مقدم سمجھنے کا اصول ان منافقین راویان حدیث نے ان بھولے بھالے جامعین کے پوری طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔

بنی امیہ کی خلافت کا خاتمہ اور حکومت بنی عباس کے دور کا آغاز

پھر جب بنی امیہ کا آخری خلیفہ مروان الحمار ماہ صفر ۱۳۲ھ کے اواخر ایام میں مارا گیا اور بنی عباس کا پہلا خلیفہ سفاح یعنی عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ ۳ ربیع الاول ۱۳۲ھ کو زمام خلافت کے مالک ہوئے تو چونکہ بنی عباس اور منافقین ایران میں خفیہ سمجھوتا ہو چکا تھا اور بنی عباس ان کو منافق تو جانتے نہ تھے بلکہ اپنا محسن سمجھتے تھے کہ انھیں کی جدوجہد اور کوششوں سے ان کو خلافت ملی اس لئے ان سے بڑی حد تک حسن سلوک و حسن معاملہ رکھنے لگے۔ اور ان منافقین نے اکثر سے بھی زیادہ مخرب دین روایتیں بنا بنا کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب کر کر کے مشہور کرنا شروع کر دیں۔ اسی سلسلہ میں اختلاف قرارت کی روایتیں بھی بنائیں اور چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود ایک مدت دراز تک کوفے میں رہے تھے اس لئے اختلاف قایم رکھنے کا بہتان انہیں پر باندھا۔ اور مشہور یہ کیا کہ عہد نبوی سے عہد شیخین تک بلکہ فتح ارمینہ سے قبل تک تمام مسلمان ہر جگہ مختلف ہی قرارتوں سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ حذیفہ بن الیمان کی شکایت پر حضرت عثمان نے صحابہ کے مشورے سے تمام امت کو ایک قرارت پر جمع کر دیا۔ ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ صرف چند نسخے لکھوا کر اور مختلف ممالک میں بھیج کر وہ بھی بغیر اعراب اور نقطوں کے مصاحف کے ذریعے حضرت عثمان کبھی تمام دنیا سے اختلاف قرارت کو مٹا نہیں سکتے تھے۔ نقطوں اور اعراب کے اختلافات جو سیکڑوں کی تعداد میں قرارت کی کتابوں میں بھرے ہوئے ہیں ان کو بے نقطے اور بے اعراب کا مصحف کس طرح مٹا سکتا تھا۔ جب تک ہر مصحف کے ساتھ حضرت عثمان

ہر مصحف کے ساتھ ایک قریشی قاری بھی ہر ملک میں حضرت عثمان کو بھیجنا تھا

ایک قریشی قاری یعنی حافظ قرآن بھی ہر شہر میں نہ بھیجدیتے جو نقطوں اور اعراب کے اختلاف کو مٹا دیتا، اور لب و لہجہ کے فرق کو بتاتا۔ غرض یہ ہے کہ اگر ایک صاحب عقل سلیم رسول اللہ صلعم کی زندگی، صحابہ کی زندگی اور قرآن کی اہمیت پر غور کر لینے اور سمجھ لینے کے بعد ان حدیثوں پر منصفانہ نگاہ تنقید ڈالے اور راویان و جامعین احادیث کی سطوت سے مرعوب نہ ہو تو فوراً ان ساری حدیثوں کو جو جمع قرآن کے متعلق مروی ہیں بلا تأمل موضوع و کذب و افترا کہدیگا۔ مگر جامعین احادیث کی سطوت ہمارے

جامعین احادیث کا بھرم رکھنے کیلئے اللہ، رسول اور قرآن کسی کی پروا نہ کرنا

علمائے کرام پر اس قدر غالب ہے کہ یہ قرآن کو مشتبہ و مختلف فیہ مان لینے کے لئے تیار ہیں مگر صحیح بخاری و صحیح مسلم کی کسی حدیث کو بھی موضوع ماننے کے لئے تیار نہیں۔ قرآن مشتبہ ہو تو ہو۔ رسول پر الزام آئے تو آئے صحابہ پر تہمت لگے تو لگے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ کا وعدۂ حفاظت جمع قرآن جھوٹا ٹھیرے تو ٹھیرے، مگر ان دفاتر کی کوئی حدیث جھوٹی نہ ثابت ہو اس کا کیا جواب ہے۔ سب سے زیادہ تعجب تو یہ ہے کہ ان حدیثوں کی کمزوریاں ان کو کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔ اور جو نظر بھی آتی ہیں تو ان کی رکیک سے رکیک تاویل کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں، ورنہ صاف کھا جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ علمائے محدثین اگلے ہوں یا پچھلے انہوں نے ان راویان حدیث کو جو اولاد السبایا یا خود سبایا میں سے تھے اور ان میں سے کتنے موالی صحابہ ہونے کی وجہ سے ان کے قبائل کی طرف منسوب تھے۔ کتنے مدنی بن بیٹھے تھے اور پھر تابعین میں شمار کئے جاتے تھے اس لئے یہ جامعین احادیث ان تابعین کو اگر مشتبہ قرار دیتے تو پھر سارا ذخیرہ احادیث مشتبہ ہو جاتا۔ اور ان کو جو جمع احادیث کا شوق اور ولولہ تھا اس کا بالکل خون ہو جاتا۔ اور چونکہ ان منافقین کو بھی

یہ لوگ منافق نہیں سمجھتے تھے اس لئے تابعیؒ ثقہ کی سرٹیفکیٹ دے کر ان کی ہر جھوٹی سچی روایات کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ہی ایسے نکلے جن کا کذب و افترا ظاہر ہوگیا۔ تو بعد والوں نے جب کافی شہادتیں پالیں تو ان کو غیر معتبر قرار دیا ورنہ اگر کسی نے کچھ الزام لگایا بھی تو دوسرے نے ثقہ کہکر سنبھال لیا۔ اس لئے آج اس قسم کی ہزاروں حدیثیں صحاح و غیر صحاح میں نظر آرہی ہیں، اور اختلافات قرارت پر توضخیم ضخیم کتابیں مستقل طور سے شائع ہو چکی ہیں اور ہمارے علمائے کرام کے لئے ذخیرۂ ایمان بنی ہوئی ہیں

مورخین کی خموشی سب سے بڑھکر تعجب کی بات یہ ہے کہ امام المورخین ابو جعفر الطبری اور امام ابن اثیر نے اپنی اپنی کتابوں میں جمع صدیقی و نقل مصاحف بعہد عثمانی کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ جیسے ان لوگوں کے نزدیک دنیائے اسلام میں اتنے بڑے اہم واقعوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ یا ان لوگوں کے وقت تک یہ روایتیں بن کر بخاری و ترمذی وغیرہ میں داخل نہیں کی گئی تھیں، اور یہ حدیثیں اس وقت تک گھڑی نہیں گئی تھیں۔ ابن خلدون ان سب سے متاخر ہیں۔ انھوں نے بھی حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد مبارک کے ذکر میں تو جمع قرآن کا کوئی ذکر نہ کیا۔ مگر حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ کے سلسلہ ذکر میں ایک عنوان مستقل قایم کرکے نقل مصاحف والے واقعہ کو بیان کیا اور اسی ضمن میں جمع قرآن بعہد صدیقی کا حال بھی لگے ہاتھوں لکھ گئے۔ کوئی نکتہ سنج اگر غور کی نگاہ سے دیکھے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ عنوان (غزو خذیفة الباب وامر المصاحف) اور اسکے تحت میں ساری عبارتیں (جو دو سطر کی تمہید اس غرض سے اپنے ساتھ رکھتی ہیں کہ اوپر سے مضمون بالکل بے تعلق نہ ہو جائے) صرف واقعہ نقل مصاحف کی تصریح کے لئے ہیں۔ حضرت عثمان نے نقل کرانے کیلئے جو صحیفے حضرت حفصہ کے یہاں سے منگوائے تھے وہ صحیفے کس کے اور کب کے لکھے ہوئے تھے؟ اسکو ثابت کرنے کے لئے اس سلسلے میں واقعہ جمع قرآن بعہد صدیقی کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ یعنی نقل مصاحف کا ذکر ابن خلدون کے نزدیک زیادہ اہم تھا جس کے لئے ایک مستقل عنوان قایم کرکے تقریباً پورے صفحے کا دو ثلث حصہ سیاہ کیا گیا۔ مگر اصل وہ صحیفے جن کی نقلیں لی گئیں ان کے جمع و تدوین کے ذکر کے لئے اس زمانے کے واقعات میں جس زمانے کا یہ واقعہ تھا کوئی ذکر نہ کیا۔ اور یہیں پر مختصر طور سے لکھدیا۔ کیا یہ ابن خلدون جیسے صاحب قلم و امام اصول تاریخ نویسی سے ممکن ہے؟ کہ جس واقعے کو جہاں لکھنا چاہیئے وہاں تو نہ لکھے اور دوسری جگہ محض ضمناً لکھدے۔ اور اہم واقعے کو غیر اہم بنا دے اور غیر اہم کو اہم؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ عنوان اور اسکے ماتحت کی پوری عبارت جعلی ہے جو تاریخ ابن خلدون میں داخل کر دی گئی ہے۔ دونوں واقعات کی عبارت الگ الگ ہر ایک کی جگہ پر داخل کرنا مشکل تھا اسلئے بعد والے واقعہ کو اصل واقعہ قرار دیکر پہلے کا ذکر ضمناً کرکے بزعم خود دونوں کے ذکر سے سبکدوشی حاصل کی گئی

علمائے وقت سے باادب معذرت میں نے جو کچھ بھی عرض کیا ہے ایک دکھے دل کی آواز ہے۔ مجھکو نہ اسلاف سے عداوت کی کوئی وجہ نہ موجودہ علمائے کرام سے خواہ مخواہ مخالفت کرنے کا کوئی سبب۔ میرے معلومات سارے کے سارے انہیں اسلاف کی تصانیف کے رہین منت ہیں بالکل یہ غزل ؎

بندۂ ہمت اسلافم و آن سفلہ نیم کہ خورم من نمک و باز نمکدان شکنم

مگر افسوس یہ ہے کہ میں مجبور ہوا اور مجبور ہوں کہ اسلاف جیسے اپنے محسنین اور اپنے اساتذہ و شیوخ کی غلطیوں کو ایماناً و دیانتہً غلطیاں کہوں ان کی لغزش کو لغزشیں مانوں، ان کی صحیح رہنمائیوں کا اتباع کروں اور ان کی خطاؤں کے خطا ہونے کا جب علم الیقین ہو جائے تو اس کا کبھی اتباع نہ کروں اور غلط تاویل کرکے ان خطاؤں کو صواب نہ ثابت کروں۔ میں ایک مسلم حنیف ہوں اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله کا مصداق بننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ میں مسلم ہوں، مسلم رہنا چاہتا ہوں۔ اور مسلم ہی مرنا چاہتا ہوں۔ ان شاء الله المستعان۔ کتب رجال کی میں نے کافی چھان بین کی ہے، راویان احادیث سے خوب واقف ہو گیا ہوں، حدیث کی کتابوں میں کس کس طرح جھوٹی جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر عالی اسناد کے ساتھ ملاحدہ نے داخل کر دی ہیں۔ ان سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ کاتبوں اور وراقوں کی دخل اندازیوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں اس موضوع پر اور نیز رجال شیعہ و متصوفین وغیرہ پر میری تالیفیں ہیں

اس لئے میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ ایماناً اور احتساباً اپنا ایک فریضہ سمجھکر عرض کر دیا ہے۔ بعض جگہ سبقت قلم سے کچھ تیز الفاظ ضرور نکل گئے ہیں مگر وہ محض جذبۂ حمایت قرآن و ذب عن کتاب اللہ کے غایت جوش میں نکلے ہیں ان کی وجہ سے علمائے ناظرین مجھکو جتنا چاہیں برا کہلیں۔ مگر میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اسکو دیانتہً و احتساباً ہی ملاحظہ فرمائیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں مجھے بھی حاضر ہو کر ان تحریروں کا حساب دینا ہے اور ناظرین کو بھی اسکے مطالعے اور رد و قبول کا حساب دینا ہوگا؛ اور اسلاف سے بھی ان کی غلطیوں اور لغزشوں کے متعلق ضرور سوال ہوگا۔ اور وضاعین و کذابین بھی ضرور عرصۂ قیامت میں حاضر کئے جائینگے وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ اس کے بعد ہم ان تمام اسلاف علما و محدثین و مفسرین کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کی غلطیوں اور لغزشوں سے درگذر فرمائے اور ان کی حسنات کا اجر مضاعف در مضاعف عطا فرمائے اور پھر اپنے لئے بھی خواستگار عفو و مغفرت ہوں کہ ما ابری نفسی مجھسے بھی جو غلطیاں اور لغزشیں اپنی جہالت و قصور فہم وغیرہ کی وجہ سے ہوئی ہوں اللہ تعالےٰ معاف فرمائے اور پھر تمام ناظرین کے لئے بھی دعائے توفیق انصاف و قبول حق و رد باطل کے ساتھ ساتھ دعائے مغفرت و عفو و درگذر کرتا ہوں۔

اللھم اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤف رحیم ہ واغفر لجمیع المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منھم والاموات انک سمیع مجیب الدعوات برحمتک یا ارحم الراحمین

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد والہ و صحبہ وبارک وسلم واٰخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

گذشتہ سال کے آخر میں جبکہ بڑھتے ہوئے مالی خسارہ کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو معارف القرآن (جلد سوم اور جلد چہارم) کی قیمت میں تین ماہ کے لئے رعایت کردی گئی تھی تاکہ خسارہ کی تلافی کی کچھ شکل پیدا ہو جائے۔ اس رعایت سے قارئینِ طلوعِ اسلام نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کے باوجود بہت سے حضرات بروقت کتابیں حاصل نہ کرسکے۔ چنانچہ ان کا اس وقت سے یہی تقاضا چلا آرہا ہے کہ انہیں کتابیں رعایتی قیمت پر دی جائیں۔ یہ تقاضے اب ایسے شدید ہوگئے ہیں کہ ادارہ کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں رہا سوائے اس کے کہ ان کے سامنے سپر ڈال دی جائے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

کی قیمت میں پھر

تین ماہ کیلئے رعایت

کردی جائے۔ یہ رعایت ۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر تک رہے گی۔

اس دوران میں معراجِ انسانیت

بیس روپے کی بجائے بارہ روپے میں مہیا کی جائیگی۔

محصولڈاک -/۲/۲ روپے بذمہ خریدار ——— دوکانداروں سے بھی یہی قیمت لی جائیگی ان کے ساتھ مزید کوئی رعایت نہ ہوگی۔

معارف القرآن جلد سوم (تاریخِ رسالت) ختم ہو چکی ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

باہتمام علم الدین کیمپ ادبی پریس میں چھپکر دفتر طلوعِ اسلام کراچی سے شائع کیا

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

کے

چند عنوانات

آنحضرتؐ کا بچپن — اسوۂ محمدیہ پر ایک نظر — گنبدِ خضرا — حضرت ابوذر غفاریؓ —

حضرت اویس قرنیؓ — مثنوی اسرار خودی — پیام مشرق — جاوید نامہ —

ضرب کلیم — اسباب زوالِ امت — عربی خط — نابینائی —

سفرِ حج — میری طالب علمی —

بڑا سائز — ضخامت ۴۰۰ صفحات — قیمت مجلد چار روپے — محصول ڈاک نو آنے —

احمدیت اور اسلام

و

ختم نبوت

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فتنۂ احمدیت کے متعلق بیانات ہیں جو حضرت علامہ مرحوم نے ۳۴-۱۹۳۵ء میں پریس کو دیئے تھے ان تمام بیانات کو کتابی صورت میں جمع کرکے "طلوع اسلام" کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ کیونکہ احمدیت جیسا کہ ۱۹۳۵ء میں اسلام کیلئے ایک خطرہ تھی آج پہلے سے زیادہ خطرہ ہے۔

ساتھ ہی جناب پرویز کا ایک قابل قدر مقالہ "ختم نبوت" بھی شامل کردیا گیا ہے جس میں فتنۂ مرزائیت پر قرآن کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت کئی گنا بڑھ گئی ہے — ضخامت ۹۶ صفحات — قیمت ۱۲ؔ صرف — مقامی اصحاب کتب فروشوں سے خرید سکتے ہیں بیرونی حضرات ۱۲ؔ آنے کے ٹکٹ بھیجکر منگا سکتے ہیں۔ کتب فروشوں کو ۳۳ فیصدی کمیشن دیا جائیگا جو حضرات مفت تقسیم کرنے کیلئے کم از کم سو کاپیاں خریدنا چاہیں ان کو چالیس فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

ادارہ طلوع اسلام کراچی

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

[یہ سوال پہلی مرتبہ جون ۱۹۵۱ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ لیکن ہمیں آج تک اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ نہ کوئی ایسا جواب ہماری نظر سے گذرا جو کہیں اور شائع ہوا ہو۔ حال ہی میں ہمیں جمعیت اہلِ حدیث کراچی کی طرف سے اس ضمن میں جو کچھ موصول ہوا ہے اسے ہم بلا تبصرہ سامنے کے صفحے پر شائع کر رہے ہیں۔

یہ سوال جسے ہم دوبارہ شائع کر رہے ہیں، آج بھی ویسا ہی قابلِ جواب ہے جیسا وہ پہلی اشاعت کے وقت تھا۔

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

طلوعِ اسلام]

کہا جاتا ہے کہ دین کے دو اجزا ہیں ایک قرآن اور دوسرے حدیث۔ دونوں خدا کی طرف سے وحی ہیں اور قیامت تک کیلئے واجب الاتباع۔

رسول اللہ خدا کا دین انسانوں تک پہنچانے کیلئے تشریف لائے تھے۔ حضورؐ نے قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لکھوایا۔ ایک چھوڑ قریب چھبیس کاتب اس مقصد کیلئے متعین فرمائے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں اصحابؓ کو قرآن حفظ یاد کرایا۔ ان کا حفظ کردہ بار بار سُنا، انھیں خود بھی سنایا۔ اس طرح قرآن کو کتاب کی شکل میں بھی محفوظاً کیا اور الحمد سے والناس تک ایک ایک لفظ زبانی یاد بھی کرایا۔ چنانچہ اپنی وفات سے قبل، حجۃ الوداع میں لاکھوں مسلمانوں سے اس امر کا اقرار لیا کہ قرآن ان تک پہنچا دیا گیا ہے اور ان کے اقرار کے بعد اس پر خود اللہ کو شاہد قرار دیا کہ میں نے یہ قرآن ان سب تک پہنچا دیا ہے۔

یہ دین کے ایک حصہ کے متعلق ہوا۔

اس کے برعکس، دین کے دوسرے حصے (یعنی حدیث) کے متعلق یہ ہوا کہ ان کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہؐ نے خود مرتب کرایا، نہ کسی اور کو ایسا کرنے دیا، نہ کسی کو کوئی حدیث حفظ یاد کرائی نہ کسی کی حفظ کردہ سنی، نہ اس کی تصدیق فرمائی۔ چنانچہ رسول اللہ کی وفات کے وقت امت کے پاس کوئی مجموعۂ احادیث موجود نہ تھا۔ نہ رسول اللہؐ نے دیا نہ صحابہؓ نے خود مرتب کرکے اس کی تصدیق رسول اللہؐ سے کرائی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں دین کے اجزا تھے تو رسولؐ اللہ نے جس طرح اہتمام اور التزام کے ساتھ قرآن کو محفوظ شکل میں امت کو دیا اُسی طرح اپنی احادیث کا کوئی مستند مجموعہ امت کو کیوں نہ دیا؟

اگر دنیا کے تمام مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی اس سوال کا جواب دے سکتا ہے تو طلوع اسلام کے صفحات اس کے لئے کھلے ہیں۔ جواب صرف اس سوال کا ہونا چاہئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

از مولانا محمد یوسف صاحب ـــــ صدر جمعیۃ اہل حدیث کراچی

ہم انشاء اللہ ادھر ادھر کی باتوں میں ہرگز وقت ضائع نہ کرینگے صرف تمہیدی اور بنیادی حل کرانا چاہتے ہیں تاکہ آئندہ چل کر یہ مضمون تمام دنیا کے سامنے ایسا حل ہو جائے ـــــ کہ آئندہ کسی سائل کو نوبت ہی نہ پہنچے اور جتنے شبہات احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیدا کئے جاتے ہیں سب کا جواب ہو جائے اور دنیا دیکھ لے کہ جس طرح قرآن مجید واجب الاتباع ہے اسی طرح احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی امت پر واجب الاتباع ہیں۔

سوالات: احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم دین کا ایک حصہ یا جزو دین آپ کے نزدیک کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا؟

(۱) کیا اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کا مجموعہ کتابی شکل میں قوم کے حوالہ نہیں کیا؟

(۲) کیا اسلئے کہ صحابہ کرامؓ کو حفظ کرنے کا حکم نہیں دیا؟

(۳) کیا اسلئے کہ کسی کو حدیث کے لکھنے کا حکم نہیں دیا؟

(۴) کیا یہ ضروری ہے کہ ہر نبی اپنی امت کو علاوہ کتاب کے اپنی احادیث بھی کتابی شکل میں مدون کرائے؟

(۵) کیا یہ لازم ہے کہ ہر نبی صرف کتاب اللہ ہی کے احکام پیش کرے اور اس کے رموز و تفاسیر و مطالب و متعلق احکام خود بیان نہ کرے جسکو ہم آج کی اصطلاح میں

(۶) کیا قوم کی ہدایت صرف کتاب اللہ سے ہی ہوتی ہے یا پیغمبر بغیر کتاب اللہ کے اور بھی خدائی وحی سے (جسکو الہام یا القاء یا وحی کہتے ہیں) ہدایت کرتا ہے؟

(۷) کیا اختلاف احادیث جو ظاہری طور پر کسی حدیث میں نظر آتا ہو یہ مانع ہے قبول حدیث سے؟

(۸) کیا یہ سبب رواۃ حدیث کہ فلاں صحیح ہے فلاں ضعیف ہے یا فلاں مجروح ہے یا فلاں میں تشیع ہے یا فلاں کاذب تھا یا فلاں کو نسیان تھا وغیرہ ذالک یہ احادیث کے رد کی وجہ سے ہے؟

(۹) کیا وہی اعتراض جو احادیث پر وارد ہوتے ہیں خواہ کوئی بھی اور کیسا بھی ہو وہی اعتراض اگر قرآن مجید پر منکر قرآن پیش کرے یا آپ کا خصم بطور الزام پیش کرے تو قرآن پاک کو رد کیا جائے گا؟

(۱۰) کیا جس مجموعۂ مستند کا آپنے ذکر کیا ہو کہ قرآن مجید کو کتابی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یہ موجودہ قرآن وہی ہے؟

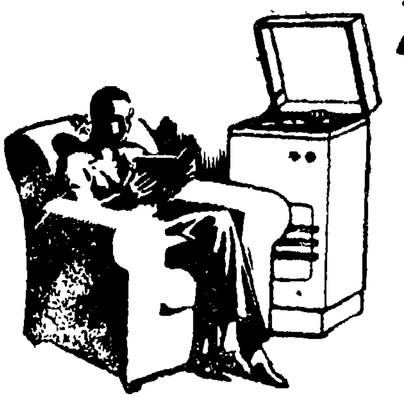
(۱۱) کیا جو حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن مجید کے تمام نسخے جلا دیئے تھے صرف ایک رکھا تھا۔ کیا یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستند اور کتابی شکل میں صحابہ کو دیا تھا یا جو جلا دیئے گئے تھے ان میں سے کوئی تھا یا وہ کل نسخے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف زبانوں اور مختلف لغات میں صحابہ کو دیئے تھے۔ آخر وہ کیوں جلائے گئے اور کیوں ایک نسخہ رکھا گیا اور وہ کون سی لغت و زبان صحیحہ کی بنا پر رائج الوقت قرار دیا گیا ہے؟

(۱۲) پھر اس کا کیا ثبوت کہ موجودہ قرآن پاک یہ وہی ہے اور ہو بہو وہی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کے سامنے بطور تلاوت پیش کیا تھا یا جبرئیل نے حضورؐ پر اس کو پیش کیا تھا؟

جب تک ان بارہ سوالات کا مفصل جواب نہ دیا جائیگا اس وقت تک آپ کے سوال کا حل نہیں ہوگا۔

میں یقین اور پورے وثوق سے کہونگا کہ میری تسلی اگر آپ کر دینگے تو پھر ہر ایک حدیث یا مجموعۂ احادیث یا مطلق احادیث کے دینی حصہ ہونے کا ثبوت قرآن ہی سے پیش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعے سے نئی زبان سکھاتا ہے۔



زبان وہ سیکھئے
جو اہلِ زبان بولتے ہیں

نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کیلئے ضروری ہے آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب و لہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں۔ لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کیلئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سن کر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقۂ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھ دیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں یا سیر گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائیں گے۔ زبان سیکھنے کیلئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے۔ مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے فوراً تفصیلی جواب دیا جائے گا۔

زبان سیکھنے کیلئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی . . . . .
عربی	بنگالی	ہندوستانی . . .
فرانسیسی . . .	روسی	چینی . . . . .
اسپینش . . .	اطالوی . . .	ڈچ . . . . .
سویڈش . . .	نارویجن . . .	فنش . . . . .
نیچ	پولش	لاطینی . . . .
یونانی . . .	ایفک	ملائے . . . .
ہوسا	آئس لینڈک . .	سواحلی . . . .
جرمن	ترکی	پرتگالی . . . .

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (X) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے۔

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض . . . .

نام . . . .

پتہ . . . .

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ۔ کراچی

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جس میں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے۔ بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے/نہیں ہے

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road
KARACHI

BRANCHES:—

BANGKOK.
SINGAPORE.
BOMBAY.
KUALA LUMPUR.
PENANG.

Agents for :—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London.—
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

Regd. No. S. 1084.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS

BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil



High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'



BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3336
Mills : 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Gibson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road Karachi.

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ:-

(۱) تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو روشنی کی۔

(۲) یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اسلئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳) حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

(۴) حضور نبی اکرمؐ، انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی [illegible] انسانیت [illegible] ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی [illegible] سیرت [illegible] خود قرآن کریم ہے۔

(۵) قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان، ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۶) اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انھیں قوانین شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

(۷) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی "تمام نوعِ انسانی کی پرورش" سے تعبیر کیا جاتا ہے)

(۸) ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تا کہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اسطرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں "قرآنی نظام ربوبیت" نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح

"زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے!

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ	محمد یونس	دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۹ — اکتوبر ۱۹۵۲ء — جلد ۵

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اواخر اگست میں پاکستان کے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب نے ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کراچی کو مخاطب کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی تھی اس کا وہ حصہ جو اسلام سے متعلق ہے ان حضرات کے لئے قابلِ فکر و توجہ ہے جو پاکستان کے مستقبل سے سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں انھوں نے فرمایا:۔

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں مذہب کو بہت زیادہ دخیل کر رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام ایک جامد مذہب کا نام ہے جو ارتقاء انسانیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ گذشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں اسلام نے استبداد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ہوا یہ کہ ان مستبد حکمرانوں نے اسلام کو بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا۔ مفاد پرست گروہ ان کے ساتھ تھا اور مذہبی پیشوا (علماء) ملوکیت اور مفاد پرستی کے منشاء کے مطابق اسلام کی تاویلات کرتے جاتے تھے اور چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہی لوگ مذہب کے واحد ٹھیکہ دار ہیں اسلئے جو کچھ یہ کہتے ہیں وہی مذہب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر شخص خواہ وہ کوئی مولوی ہو یا سرکاری دفتر کا ملازم بلا کسی روک ٹوک کے از خود پڑھ سکتا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں نہ ہی ہمارے ہاں کوئی پنڈتوں کا گروہ ہے اور نہ ہی اس قسم کا تصور کہ اس گروہ کے باہر باقی لوگ ذہنی طور پر اچھوت ہیں۔ میں اس پلیٹ فارم سے پوری جرأت اور وضاحت کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے اور آپ کے تصور سے کہیں زیادہ مساوات کا حامی ہے۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ اس ہزار سالہ عرصہ میں اسلام مستبد ملوکیت اور مفاد پرستانہ پیشوائیت کے جس ملبہ کے نیچے دب چکا ہے اُسے وہاں سے نکالا جائے۔ جب وہ اسلام سامنے آئیگا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا پیغام کس قدر صاف اور واضح انسانی حریت فکر اور تصورِ جمہوریت کے مطابق اور دنیا کے بلند ترین تصورات سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام صحیح ہے جو آج ہم میں مروج ہے اور جو ہزار سالہ استبداد اور مفاد پرستی کی تخلیق ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اس قسم کے ملوکیت کی استبداد یا پیشوائیت کی خدائی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم حریت فکر و نظر کے قائل ہیں اور تمام انسانوں کیلئے زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں مواقع بہم پہنچانے کے حامی ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں ان بلند اقدار کی روح پھونک دیں جنھیں قرآن پیش کرتا ہے اور جن کے بغیر کوئی قیادت اخلاقی اور روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔

(ڈان — ۲۹ر اگست ۱۹۵۲ء)

جس دلخراش اور جگر سوز حقیقت کی طرف اوپر کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے طلوع اسلام اسے مسلسل اور متواتر پانچ برس سے دہراتا چلا آرہا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر غلط عقیدت مندیوں اور ابلہ فریب مفاد پرستیوں کی ہزار چادریں بھی پردہ نہیں ڈال سکتیں کہ جو اسلام اسوقت پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں مروج ہے اسے اس اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں جسے اللہ نے نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے نازل کیا اور جسے رسول اللہ صلعم نے انسانوں تک پہنچایا۔ آج کا اسلام ان عجمی سازشوں کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو ان کی قوت کے حقیقی سرچشمہ ــــ قرآن کریم ــــ سے بیگانہ بنانے کیلئے ہمارے دور ملوکیت میں بروئے کار آئیں اور جنھوں نے پورے کے پورے اسلام کو غیر اسلامی تصورات سے بدل دیا۔ یہ اسلام 'پیشوائیت (ملائیت) کی مفاد پرستی کے سہارے قائم ہے اور ان کے پاس اس کے سچا ہونے کی دلیل اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ہمیں ہمارے اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے۔ ذرا اس دلیل پر غور کیجئے۔ مثلاً ہمارے دور کے "علماء حضرات" اپنے پیش کردہ اسلام کی حقانیت کی کوئی ایسی دلیل اپنے پاس نہیں رکھتے جسے فی ذاتہ دلیل کہا جا سکے۔ لیکن یہی علماء جن کی تہی دامنی کا یہ عالم ہے آئندہ آنے والی نسل کیلئے "اسلاف" بن جائیں گے اور بطور سند اور دلیل پیش کئے جائیں گے۔

محترم غلام محمد صاحب نے یہ تو فرما دیا کہ ہمیں اصل اسلام کو اس غیر اسلامی ملبہ کے نیچے سے نکالنا ہوگا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے نکالنے کی شکل کیا ہوگی۔ ہمارے سامنے یہ مقصد عظیم تشکیل پاکستان سے بہت پہلے سے تھا۔ تحریک پاکستان سے ہماری وابستگی کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ اس خطۂ زمین میں حقیقی اسلام کو از سر نو ایک زندہ قوت بنانے کے مواقع میسر آجائیں۔ ہم دیکھتے تھے کہ باقی ممالک اسلامیہ میں ملوکیت اور پیشوائیت کی مفاد پرستانہ قوتیں اس قدر جڑ پکڑ چکی ہیں کہ وہاں حقیقی اسلام کے احیاء کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کو ایک جدید مملکت بننا تھا اس لئے اس میں یہ امکانات تھے کہ ہم جس انداز کی حکومت چاہیں قائم کر سکیں۔ لیکن پاکستان میں کچھ اور ہی نقشہ بنتا دکھائی دے رہا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحبان کی ایک کثیر تعداد ہندوستان سے پاکستان کی طرف آگئی۔ پاکستان کی مساجد اور مکاتب پہلے ہی سے آباد تھے اس لئے اس نووارد جماعت کیلئے معاش کا مسئلہ بڑا پیچیدہ بن گیا۔ اس اہم شق کی طرف نہ حکومت نے توجہ کی نہ قوم نے۔ نتیجہ یہ کہ جس طرح پختہ ساحل نہ بنانے کی وجہ سے نہریں اور دریا اپنا رخ آپ متعین کر لیتے ہیں اس نووارد سیلاب نے بھی اپنی معاش کے راستے خود پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ ممکن ہے اس سیلاب کا رخ مسجدوں اور مکتبوں کی طرف ہی رہتا لیکن کچھ حالات اس قسم کے پیدا ہوگئے جن کی وجہ سے ان کی نگاہیں مسجد کے منبروں سے اٹھ کر حکومت کی کرسیوں تک جا پہنچیں۔ سب سے پہلے مسٹر اسد لیوپولڈ نے اپنے دستوری خاکے میں یہ تجویز پیش کی کہ مملکت پاکستان میں علماء کی ایک سپریم کونسل (مجلس اعلیٰ) بنائی جائے جن کے اختیارات مقننہ اور انتظامیہ دونوں سے بلند اور وسیع ہوں۔ اس کے بعد اسلامی جماعت کے ارباب حل و عقد نے اس مصرعہ کو اٹھایا اور زمام حکومت قیادت صالحین" کے ہاتھوں میں دینے کی تحریک کا آغاز کیا۔ ان کی بات ارباب شریعت کے دل کو بھی لگتی تھی۔ ہر طرف سے اس کی تائید میں آوازیں بلند ہونی شروع ہوگئیں۔ "اسلامی شریعت کا نفاذ" ایک ایسا سلوگن تھا جو عوام کو اپنی طرف کھینچ لینے کی بڑی جاذبیت اپنے اندر رکھتا تھا چنانچہ انھوں نے ایک طرف تو عوام کو اس طرح اپنے پیچھے لگایا اور دوسری طرف ارباب حل و عقد کی کلبوں کی زندگی اور ان کی

بیگمات کی بے پردگی کی داستانوں کو سرعام دہرا دہرا کر انھیں (Demoralise) کرنے کی مہم شروع کردی۔ اور اس مہم میں اتنی شدت اور تیزی پیدا کردی کہ ان کے حریف سچ مچ (Demoralised) ہونا شروع ہوگئے۔ اور انھوں نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ عوام کی ہمنوائی میں یہ کہدیا جائے کہ پاکستان کا دستور شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا۔ حالانکہ ان کے ذہن میں اس امر کا کوئی تصور نہیں تھا کہ اسلامی شریعت کسے کہتے ہیں اور وہ کن عناصر پر مشتمل ہے۔ اسی گھبراہٹ کا نتیجہ تھی وہ قرارداد مقاصد جو ان کی پریشان خیالیوں کی خود آئینہ دار ہے۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ پاکستان کی کانسٹی ٹیوشن شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوگی لیکن جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے نہ کانسٹی ٹیوشن سے کوئی تعلق ہے نہ اسلامی شریعت سے۔ لیکن ان کی یہ بدحواسی فریق مقابل کی یقینی کامیابی ثابت ہوگئی۔ انھوں نے اس قرارداد اور اس کے بعد ذمہ دار ارباب حکومت کے مختلف بیانات و اعلانات کو مضبوط پکڑ لیا اور اس طرح ارباب بست و کشاد پر خود ان ہی کے حربوں سے نئے حملے شروع کردیئے۔

ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کی دستور سازی میں جو تاخیر واقع ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی کشمکش تھی۔ دستور بنانے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس پیچیدگی کا حل کیا ہو۔ وہ اپنے ہاتھوں سے دی ہوئی گرہ کو اپنے دانتوں سے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے ہیں اور غالباً مُلّا کے سامنے غیر مشروط ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ذمہ دار ارکان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں مذہب پرست کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی مذہبیت بعینہ وہی ہے جسے مُلّا پیش کر رہا ہے وہ مروجہ مذہب کے پابند ہیں اور اسی کو صحیح اسلام سمجھ رہے ہیں اس لئے ان کے نزدیک مُلّا کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں یہ دشواری نظر آتی ہو کہ اس قسم کا شرعی نظام موجودہ زمانے کے سیاسی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن اس کا حل بھی چنداں مشکل نہیں۔ ہماری شریعت خود ہمارے بادشاہوں کی پیدا کردہ ہے جس کی رو سے شریعت کا دائرہ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ تک محدود رہتا ہے اور امور سلطنت سے اسے کچھ واسطہ نہیں ہوتا جس طرح انھوں نے اپنے ساتھ علماء کی جماعت کو رکھ چھوڑا تھا اسی طرح اب بھی کیا جاسکتا ہے یعنی علماء کی ایک کونسل بنالی جائے اور مساجد، مکاتب، اوقاف، زکوٰۃ وغیرہ کے محکمے ان کی تحویل میں دیدیئے جائیں۔ اور شخصی قانون (پرسنل لاء) سے متعلقہ امور میں ان سے فتوے لیلئے جایا کریں۔ باقی رہے امور سلطنت سو اس کے لئے حکومت موجود رہے گی۔ یہی انداز باقی اسلامی ممالک میں رائج ہے اور اس کے لئے ہمارے پاس اسلاف کی سند بھی موجود ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں مختلف فرقوں کے علماء بھی متفق ہوجائیں گے۔ (کیونکہ اس میں معاشی مشکلات کا حل بھی مل جاتا ہے اور ان کے نزدیک شریعت سے مقصود بھی فقط اتنا ہی ہے) اور حکومت کو بھی اس سے آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ علماء کا بند عوام کا سیلاب تھامنے کیلئے ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ اب جو یہ کہا جا رہا ہے کہ دستور پاکستان بہت جلد مرتب ہوجائے گا تو اس کی غالباً یہی وجہ ہے کہ اس دشواری کا حل تجویز کرلیا گیا ہے جو تدوین دستور کی راہ میں حائل تھی اور یہ حل اغلباً وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

اگر ہمارا یہ اندازہ صحیح ہے تو آسمان کو چاہیئے کہ اس پر جتنا بھی رونا چاہتا ہے رولے کیونکہ اسلامی ممالک میں صحیح اسلام کے احیاء کی جو مدھم سی کرن نظر آتی تھی وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاہلیت کے ان دبیز پردوں کے پیچھے چھپ جائے گی اور اس کے ساتھ ہی

اہل پاکستان کو بھی اپنا سر پیٹ لینا چاہئے کہ ان کی حالت بھی چند دنوں کے بعد ویسی ہی ہو جائے گی جیسی افغانستان، عراق اور دیگر اسلامی ممالک کی ہے۔ قرآن نے یہودیوں کے متعلق کہا تھا کہ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَھُمْ بِاَیْدِیْھِمْ کہ وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں سے تباہ کر رہے ہیں۔ آج یہی چیز کس طرح پاکستان کے مسلمانوں پر صادق آ رہی ہے۔ خدا نے انھیں ایک آخری موقعہ دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو زندگی کی خوش گواریوں اور شادابیوں سے معمور کر لیں لیکن یا ویلتا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے کاشانوں کو ویرانوں میں تبدیل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآور وایں قیامت درمیان خلق بیں

لیکن ان قرآئن و شواہد کے بالکل برعکس محترم غلام محمد صاحب کی وہ تقریر ہے جس کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے۔ محترم موصوف پاکستان کے گورنر جنرل ہیں اسلئے ہمیں باور کرنا چاہئے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے پوری پوری ذمہ داری سے فرمایا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ پاکستان کا گورنر جنرل یہ نہیں چاہتا کہ جو کچھ آج اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے وہ مملکت پاکستان کا دستور اور قانون بن جائے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ صحیح اسلام کو اس غیر اسلامی ملبہ کے نیچے سے نکالا جائے اور اسی کو پاکستان کا آئین اور قانون بنایا جائے۔ جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے یہ اسلام قرآن کے اندر ہے اور ہمارے پاس قرآن اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اسلئے پاکستان کے دستور اور قانون کو صحیح اسلامی بنیادوں پر متشکل کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ بات بالکل آسان ہے۔ قرآن کے اصولوں کو سامنے رکھئے اور ان کی روشنی میں اپنے لئے دستور اور قانون خود مرتب کیجئے۔ یہی منشائے خداوندی ہے اور یہی صحیح اسلام کا مقصود ہے اس میں نہ کسی پیشوائیت کی گنجائش ہے نہ غیر اسلامی عناصر کے راہ پانے کا کوئی امکان ہے۔ ایسا کرنے کیلئے فقط اس جرأت کی ضرورت ہے جو صحیح ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ اب پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس خیال کے مؤید ہیں کہ صحیح اسلامی دستور اور قانون کی تدوین کی وہی صورت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ ہم ان لوگوں سے درخواست کریں گے کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب کی تقریر کے حوالہ سے انھیں لکھیں کہ وہی دستور اور قانون اسلامی ہو سکتا ہے جسے پاکستان کے اہل الرائے حضرات باہمی مشاورت سے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں خود مرتب کریں۔ اس کیلئے کسی مولوی کی ضرورت نہیں۔ یہ وقت ہے کہ اس آواز کو بلند کیا جائے ورنہ اگر ایک دفعہ ملائیت اپنی تنگ نظریوں کو لئے ہوئے کسی طرح بھی اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہو گئی تو پھر قرآن کا نام لینا آسان نہیں رہے گا۔ یہ بہت بڑا خطرہ ہے جو پاکستان کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اگر اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے اس وقت چارہ جوئی نہ کی گئی تو اس کے بعد اس کا استیصال بہت مشکل ہو جائے گا۔ غور کیجئے کہ یہ خطرہ اس خطرہ سے کم نہیں جو باہر کی قوتوں کی طرف سے پاکستان کو مٹانے کیلئے ہر وقت گھات میں لگا رہتا ہے۔

لیکن جو لوگ قرآن کی صداقت اور ابدیت پر محکم ایمان لا چکے ہیں ان کیلئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ خطرہ بیشک بڑا ہے لیکن ایمان کا امتحان بھی تو خطروں ہی میں ہوا کرتا ہے۔ اگر انھوں نے تھوڑی سی بھی ہمت کر لی تو قرآن کی داخلی قوت جس کی تائید انھیں حاصل ہے باطل کی ان عنکبوتی دیواروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیگی۔ صاحب ضرب کلیمؑ کا ایک عصا ساحروں کی ہزاروں نگاہ فریب رسیوں پر بھاری ہوتا ہے۔

خطرات کی ان گھٹاٹوپ تاریکیوں میں دور کی ایک آواز ہے جو بار بار ہمارے کانوں میں کہہ رہی ہے کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں کو برباد کرنا ہی مقصود ہوتا تو پاکستان کبھی وجود ہی میں نہ آتا۔ اتنی بڑی مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان کی تشکیل خود اس امر کی دلیل ہے کہ اسے حقیقی اسلام کی تجربہ گاہ بننا ہے اور ایسا ہو کر رہے گا ولو کرہ المشرکون۔ تمام ممالک اسلامیہ میں صرف پاکستان ہی وہ خطہ ہے جہاں اس وقت قرآن کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ ملوکیت اور پیشوائیت کو خود زمانہ کے تقاضے مٹا رہے ہیں۔ پاکستان میں اس کی حرکت مذبوحی اسے کتنے دنوں تک زندہ رکھ سکے گی۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے قرآن کو از سرِ نو ایک زندہ قوت بنانے کیلئے کیا کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کے امتحان کا وقت قریب تر آ رہا ہے۔

قرآنی دستور کا ذکر آنے سے ذہن اُس بحث (Conterovers y) کی طرف منتقل ہو گیا جو آج کل کراچی کے اخبار "ڈان" میں چل رہی ہے اور جس میں کراچی کے ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ قرآن کی ایسی آیات پیش کر دیں جن کے مطابق پاکستان کا دستور مرتب کیا جا سکتا ہے تو وہ انہیں پانچ ہزار روپیہ انعام دیں گے۔ ہمیں نہ تو اس اخباری بحث سے دلچسپی ہے اور نہ اس پانچ ہزاری چیلنج سے لیکن قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے بعض حضرات نے ہمیں لکھا ہے کہ ہمیں اس چیلنج کا جواب دینا چاہئے کیونکہ ہم ہی قرآنی دستور کے طالب اور داعی ہیں۔ یہ سطور محض ان حضرات کے استفسار کے جواب میں سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

ویسے تو طلوعِ اسلام قرآن کی روشنی میں دستورِ اساسی کے متعلق شروع سے لکھتا چلا آ رہا ہے لیکن اس نے نومبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں حکومتِ پاکستان کی قراردادِ مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر ایک تفصیلی تبصرہ کیا تھا اور اس کے بعد قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک پورے دستور کا خاکہ مرتب کر کے حکومت کو بھی بھیجا تھا اور طلوعِ اسلام فروری ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع کر دیا تھا۔ قارئین طلوعِ اسلام میں سے جنہیں کچھ شبہ ہو یا جو مزید وضاحت چاہتے ہوں وہ ہم سے پوچھ لیں کہ اس دستوری خاکہ کی فلاں شق کی تائید میں قرآن کی کونسی آیت ہے۔ اس طرح ان کا اطمینان ہو جائیگا کہ دستورِ پاکستان کس طرح قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب ہو سکتا ہے۔

اور اگر کوئی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا بحث کو کسی آخری نتیجہ تک پہنچائیں تو اس کے لئے صحیح فکری طریق یہ ہے کہ پہلے مستفسر سے یہ کہا جائے کہ وہ اس کی وضاحت کرے کہ کانسٹی ٹیوشن کسے کہتے ہیں، اس کے حدود و فرائض کیا ہیں اور وہ کن مسائل سے بحث کرتی ہے؟ جب وہ اس قسم کی وضاحت کر دیں (اور انہیں ہر تفصیل کے لئے سند بھی دینی ہوگی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کانسٹی ٹیوشن کا یہ تصور خود ان کے اپنے ذہن کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا متعین کردہ ہے جو اس موضوع پر Authority سمجھے جاتے ہیں) اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ کانسٹی ٹیوشن کی ان تفاصیل کے متعلق قرآن کریم سے کوئی رہنمائی مل سکتی ہے یا نہیں اور اگر مل سکتی ہے تو وہ کیا ہے۔ بحث کو کسی نتیجہ تک پہنچانے کے لئے یہی صحیح اور سنجیدہ طریق کار ہے۔

لبّیک

پرویز

از نہانخانۂ دل خوش غزلے می خیزد
سرِ شاخے ہمہ گویم بہ قفس نتواں گفت

قریب بیس سال کا عرصہ ہو گیا جب میں نے اپنی قرآنی فکر کو اربابِ بصیرت کے سامنے پیش کرنے کی ابتدا کی تھی۔ شروع شروع میں ایسا محسوس ہوتا تھا گویا یہ آواز یکسر صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔ فضا نامساعد، ماحول ناسازگار، کان اس آواز سے ناآشنا اور طبائع اس سے نامانوس۔ ہر سوچنے والے دماغ کے لئے یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز ہے کہ مسلمان قرآن پر اپنا ایمان رکھتے ہیں لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری زندگی کا نصب العین یہی قرآن ہے تو اس آواز کی اس شدت سے مخالفت ہوتی ہے گویا کوئی انھیں گمراہی اور بیدینی کی طرف بلا رہا ہے اور ان کی متاعِ دین و ایمان ان سے چھینی جا رہی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو قرآنی فکر کی طرف دعوت دینا بڑا صبر آزما اور ہمت شکن مرحلہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ قوم میں جو غیر قرآنی تصورات صدیوں سے متوارث چلے آ رہے ہیں اور اسطرح ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکے ہیں۔ انھیں اعماقِ قلب سے نکال کر ان کی جگہ قرآنی تصورات کو جاگزیں کرانا، ایک دن کا کام نہیں۔ اسلئے میں نے، محض بتوفیقِ ایزدی، اس آواز کو جاری رکھا۔ مبدارِ فیض کی عاجز نوازیوں نے میری اس حقیر سی کوشش کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور رفتہ رفتہ کان اس آواز سے مانوس اور قلوب اس سے آشنا ہونے شروع ہو گئے۔ یہ محض اُس کا کرمِ بے پایاں ہے جس نے آج مجھے یہ کہنے کے قابل بنا دیا ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں   یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیرا۔

یہی نہیں کہ کان اس آواز سے مانوس ہو گئے بلکہ اب ایک عرصہ سے کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ مجھے چاروں طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ قرآنی فکر کی عام اشاعت کا وسیع پیمانے پر انتظام ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی اس فکر کو عملی شکل دینے کے لئے بھی کوئی پروگرام بنانا چاہئے۔ اس وقت ان تقاضوں کی شدت کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی ڈاک ایسی ہو جس میں دو چار خطوط اس موضوع پر نہ ملتے ہوں اور شاید ہی کوئی ملنے والا ایسا ہو جس کی ملاقات کم و بیش انہی الفاظ پر ختم نہ ہوتی ہو۔ یہی ہیں وہ تقاضے جن کی ترجمانی محترم عرشی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں کی ہے جس میں (میرے مضمون "اسبابِ زوالِ امت" کا تعارف کراتے ہوئے) انھوں نے لکھا ہے کہ

اب تصنیفوں، تقریروں اور ماضی وحال کی حسرتناک یادوں اور ماتم انگیز سینہ کوبیوں سے آگے بڑھ کر قرآن پسند لوگوں کی ایک مجلس عاملہ مرتب کرنی چاہیئے جو اپنا تعلیمی اور علمی لائحہ مرتب کرے اور اپنا ایک مرکزی مقام تجویز کرکے وہاں سے آغاز کار کرے۔

اور اس کے بعد مجھ سے تخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

قوم کا روشن فکر طبقہ اس وقت ایک نئے سر سید کے لئے بیتاب ہے جو بغیر کسی دعوے کے اٹھے اور ان کے ایثار وعمل سے کام لے کر ایک بالکل نئی قرآنی نسل تیار کردے۔ (البیان - اپریل ۱۹۵۲ء)

[عرشی صاحب نے اپنے مقالہ میں میرے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ یہ بھی درحقیقت اللہ کا احسان ہے کہ وہ کسی کے متعلق اس کے رفقاء کے دل میں نیک خیالات پیدا کردے] اس تذکرہ سے مقصود یہ بتانا تھا کہ مختصر الفاظ میں تقاضا یہ ہے کہ مجھے اب اپنا پورا وقت اس مقصد کی تکمیل کے لئے وقف کردینا چاہیئے جسے میں اسوقت تک ضمناً کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تقاضوں نے اب ایسی نوعیت اختیار کرلی ہے کہ اس موضوع پر مجھے ذرا کھل کر گفتگو کرنی چاہیئے۔

سب سے پہلے میں اس "راز" کا افشا کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تقاضے مجھے باہر ہی سے موصول نہیں ہورہے بلکہ ایک عرصہ سے خود میرے اپنے اندر سے بھی یہی تقاضے اٹھ رہے ہیں۔ اور ان داخلی تقاضوں کی شدت، خارجی تقاضوں سے کچھ کم نہیں۔ لہذا آج کی گفتگو کا جذبۂ محرکہ خارجی تقاضوں کے علاوہ، یہ جانسوز کیفیت بھی ہے کہ

از سینہ تا بچند بر آرم فرو برم　　　این نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

مجھے ملازمت کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے پچیس تیس برس کا عرصہ ہوگیا اور قریب قریب اتنی ہی مدت میری قرآنی فکر کی ہے۔ اس پورے پچیس تیس سال کے عرصہ میں (جو زندگی کا بیشتر حصہ ہے) میری کیفیت مسلسل یہ رہی ہے کہ (علامہ اقبال کے الفاظ میں)

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں　　　کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ وتاب رازی

اس میں کوئی شبہ نہیں (اور اسے محض بطور تحدیث نعمت عرض کررہا ہوں) کہ میں نے جب بھی کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا یا کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی تو سوائے ایک اللہ کی قوت کے کسی دوسری طاقت کا (خوف تو ایک طرف) خیال تک بھی میرے سامنے نہیں آیا۔ لیکن بایں ہمہ، یہ دونوں زندگیاں (حصول معاش کی پابندیاں اور قرآنی فکر کی جولان گاہیں) ایسی تھیں جن میں نباہ پیدا کرنے کے لئے ایک مسلسل کاوش درکار رہی اور یہ احساس قدم قدم پر سامنے رہا کہ "جام وسنداں باختن" کے لئے فی الواقعہ بڑی جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس زندگی کی ہر صبح کا آغاز اس جانکاہ احساس سے ہوتا کہ

جانم در آویخت بار وزگاراں　　　جوئے است نالاں در کوہساراں

اور ہر شام کا اختتام اس آرزو کے ساتھ کہ

طبعے بلند دادہ بند ز پائے من کشا　　　تا بہ پلاس می وہم خلعت شہر یار را

سب سے شدید احساس جو اس دوران میں باعث سوہانِ روح بنا رہا یہ تھا کہ اگر وہ تمام وقت جو حصولِ معاش کے لئے صرف کرنا پڑتا ہے پیش نظر مقصد کے لئے وقف ہو سکتا تو یہ کام کتنی جلدی تکمیل تک پہنچ جاتا۔ لیکن یہ تمام پابندیاں میری خود عائد کردہ تھیں اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ میں نے شروع ہی سے اپنے سامنے ایک اصول رکھا تھا اور وہ یہ کہ میں اپنی قرآنی فکر کو اپنا ذریعۂ معاش نہیں بناؤں گا۔ اس پچیس تیس سال کے عرصہ میں جس قدر کشاکش رہی اسی اصول کی وجہ سے رہی۔ ایسے کئی مواقع آئے جہاں جذبات کی رَو اس قدر تیز ہو گئی کہ جی چاہا کہ ان بندھنوں کو توڑ کر پورا وقت اسی مقصد کے لئے وقف کر دوں۔ لیکن ان مقامات پر میرا دامن جس خیال نے پکڑ لیا وہ بھی اپنی اہمیت اور عبرت آموزی کے لئے کچھ کم دقیع نہ تھا۔ بہت سے احباب ایسے تھے جن کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ انھوں نے نہایت اخلاص اور دیانت کے ساتھ اپنے آپ کو "ملی مقاصد" کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن چونکہ ان کے ذریعۂ معاش کی کوئی الگ صورت موجود نہ تھی (اور ہماری قوم نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی کہ جو لوگ اس قسم کے اجتماعی مقاصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں انھیں روٹی کی بھی ضرورت ہوتی ہے)۔ اس لئے ان میں سے بعض کی صورت تو یہ ہو گئی کہ وہ سچ مچ بھوکوں مر گئے۔ اور جو بھوک کو برداشت نہ کر سکے انھیں محض روٹی کی خاطر وہ کچھ کرنا پڑا جس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔

بنابریں (اس احساس کے باوجود کہ میری زندگی کا ایک خاصا حصہ دفتر نے لے لیا) میرا قلب مطمئن ہے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر دوسروں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ ہماری قوم کے موجودہ حالات کے پیش نظر جن میں ان لوگوں کی معاش کا کوئی اجتماعی انتظام نہیں جو اپنے آپ کو اجتماعی مفاد کی خاطر وقف کر دیں، کسی شخص کو اجتماعی مفاد کے میدان میں نہیں آنا چاہئے جب تک اس کی معاش کا اطمینان بخش ذریعہ الگ موجود نہ ہو۔ جو ایسا کرے گا یا تو خودکشی پر مجبور ہو جائیگا یا دین فروشی پر۔

یہ تو تھا اس سوال کا جواب کہ میں نے اپنی زندگی کا اتنا حصہ ملازمت میں ضائع کیوں کر دیا۔ پورا وقت قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے عملی نظام کی تشکیل میں کیوں صرف نہیں کیا۔ اب رہا مستقبل کے متعلق۔ سو صورت یہ ہے کہ ایک تو میری صحت ایسی نہیں رہی کہ زیادہ وقت تک اس دُہرے بوجھ کو اٹھا کر چل سکوں۔ اور دوسرے یہ کہ اب میں ملازمت میں اس مقام تک آ پہنچا ہوں جہاں مجھے اتنی پنشن مل سکتی ہے کہ باقی عمر معاش کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔ لہذا اب میں اپنی عمر کا باقی حصہ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم علیہ توکلت والیہ انیب۔

مستقبل کے لئے میرے سامنے حسب ذیل امور ہیں۔

(۱) **قرآنی فکر کی عام اشاعت** | اس وقت تک میری قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ مجلۂ طلوعِ اسلام رہا ہے۔ لیکن یہ ایک محدود ضخامت کا ماہوار رسالہ ہے اور زندگی کے مسائل اسقدر گوناگوں اور حالات کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ایک ماہوار مجلہ اس ضرورت کو پورا کر ہی نہیں سکتا۔ اس کیلئے کم از کم ہفتہ وار جریدہ تو ہو۔

نیز اس وقت تک اس فکر کی اشاعت صرف اردو داں طبقہ تک محدود رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ انگریزی زبان (اور اس کے ساتھ اسلامی ممالک کو بھی شامل کر لیا جائے تو عربی اور فارسی) میں بھی اس کی اشاعت کی جائے۔ دنیا میں اس وقت قرآن کی آواز کہیں سے بھی بلند نہیں ہو رہی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی، دیکھنے والی نگاہیں یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ دنیا اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نظامہائے زندگی سے تنگ آکر ایک ایسے نظام کی تلاش میں دیوانہ وار پھر رہی ہے جو صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔ اس لئے اگر اس وقت دنیا کے سامنے قرآنی نظام پیش کیا جا سکے تو اس کی بڑی توقع ہے کہ کاروانِ انسانیت صحیح راستے پر چل نکلے۔ اس کیلئے ایک مرکز کی ضرورت ہے جہاں سے یہ فکر ساری دنیا میں پھیلائی جا سکے۔

رسائل اور جرائد کے علاوہ اس کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ قرآنی فکر سے متعلق عام لٹریچر شائع کیا جائے اور اسے گھر گھر پہنچایا جائے۔

ان مقاصد کے لئے ایک پبلشنگ ہاؤس (ادارۂ نشر و اشاعت) کی اشد ضرورت ہے۔

(۲) معارف القرآن کی تکمیل اس وقت تک معارف القرآن کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں (لیکن اس کی پہلی تین جلدیں اس وقت ملتی نہیں)۔ پانچویں جلد زیر تسوید ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ (i) زندگی کے مسائل کیا ہیں۔ (ii) کیا ان مسائل کو تنہا عقلِ انسانی حل کر سکتی ہے؟ اور (iii) اگر عقل انسانی انھیں حل نہیں کر سکتی تو قرآن ان کا حل کیا تجویز کرتا ہے یعنی اس میں ان کوششوں کا تذکرہ بھی ہے جو انسانی فکر، زندگی کے مسائل حل کرنے میں آج تک کر چکی ہے اور اس کے بعد قرآن کی طرف سے پیش کردہ حل بھی۔

اس کے بعد (اگلی جلد میں) اسلامی نظام (سیاسی۔ معاشرتی۔ معاشی وغیرہ) کی تفصیل اور اس کا مقابلہ دیگر نظامہائے عالم سے ہوگا۔

اس کے بعد کی جلد میں، فقہ قرآنی ہوگی۔ یعنی قرآنی قوانین وضوابط کا تفصیلی تذکرہ۔

اور آخری جلد میں آخرت کا قرآنی تصور، اخروی زندگی اور اس کے تضمنات۔ موت۔ برزخ۔ قیامت۔ اعراف۔ بہشت۔ دوزخ۔ زندگی کی ارتقائی منازل و منتہیٰ کا قرآنی تصور۔

یہ ہے میرے پیش نظر اس قرآنی انسائیکلوپیڈیا کا نقشہ۔

(۳) قرآن کا لغت اور ترجمہ میں اس حقیقت کا اظہار کئی بار کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں کی قرآنی تفاسیر اور تراجم، عجمی تصورات کے ترجمان ہیں۔ قرآن کو سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے معانی اس عربی زبان کی رو سے متعین کئے جائیں جو زمانۂ نزولِ قرآن میں مروج تھی۔ بدقسمتی سے اس قسم کی کوئی کوشش اس سے پہلے نہیں ہوئی، اسی لئے قرآن نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس کے لئے ہمیں خود قرآن کریم اور زمانۂ نزولِ قرآن کے تمام لٹریچر کو کنگھالنا ہوگا جو کسی ایک جگہ مدون نہیں۔ اس طرح مفرداتِ قرآن کے معانی متعین کر کے، ایک لغت مرتب کیا جائے، اور ان معانی کے مطابق قرآن کریم کا ترجمہ کیا جائے۔ یہ لغت اور ترجمہ صحیح قرآن سامنے لے آئیگا اور ذہن کو ان تمام غیر قرآنی تصورات سے پاک اور صاف کر دیگا جو ہماری تفاسیر نے اس طرح عام کر رکھے ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن اس کے نتائج اس سے بھی بڑے ہوں گے۔

(۴) اسلام کی تاریخ مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ۔ یعنی اس امر کی تاریخ کہ رسول اللہؐ نے کونسا اسلام پیش کیا اور

اسلام کس طرح اس اسلام میں تبدیل ہوگیا جو آج ہمارے ہاں مروج ہے اور جسے اصلی اسلام سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے لئے یہ بتانا ہوگا کہ یہ غیر اسلامی عناصر کہاں کہاں سے چل کر اسلام میں داخل ہوگئے اور انھیں کن کن کوششوں سے اسلام میں داخل کیا گیا۔

(۵) نصابِ تعلیم | ایک ایسے نصاب کی تدوین جس سے بچوں کے قلب و نگاہ کی تعمیر صحیح قرآنی بنیادوں پر ہوسکے اور وہ زندگی کے مسائل کا عملی حل قرآن کی روشنی میں دریافت کرنے کے قابل ہوسکیں۔

ظاہر ہے کہ ان امور کی تکمیل کے لئے ایک تحقیقاتی ادارہ (قرآنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کی ضرورت ہوگی جس میں قرآنی فکر رکھنے والے صاحبانِ علم و تحقیق مل کر کام کریں گے۔

(۶) قرآنی بستی | میرے پیش نظر یہ بھی ہے کہ ایک ایسی بستی بسائی جائے جس میں قرآنی نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے کے متمنی حضرات آکر بسیں۔ یہ بستی خود کفیل اور خود مکتفی ہو اور اس نظام کی جھلک پیدا کرے جو قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے تجویز کرتا ہے۔

(۷) قرآنی درسگاہ | اور سب سے آخر یہ کہ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں قرآن اور علوم حاضرہ کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ اس کے فارغ التحصیل طالب علم نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے قرآنی نظامِ زندگی کو مشرق اور مغرب دونوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوں۔ یعنی سرسید نے ہمیں اس قابل بنا دیا تھا کہ ہم دنیا کے سامنے اپنی بات پیش کرنے کے قابل بن جائیں۔ اور ہم آئندہ نسلوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ دنیا کے سامنے قرآن کی بات پیش کرسکیں۔

یہ ہیں میرے نزدیک کرنے کے کام۔ اس پروگرام کو دیکھنے کے بعد جو لوگ یہ کہہ کر مسکرا دیں کہ "یہ سب ایک خیالی انسان (IDEALIST) کے ناممکن الحصول تصورات ہیں" ان سے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ لیکن جو حضرات یہ سمجھیں کہ یہ تصورات وہ ننھے ننھے بیج ہیں جن سے بڑے بڑے تناور درخت پیدا ہوسکتے ہیں، وہ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ کام نہ میرے اور نہ کسی اور کے تنہا کرنے کے ہیں۔ ان کے لئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ میں اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنی زندگی وقف کرسکتا ہوں ——— چہ کند بے نوا ہمیں دارد ——— لیکن میرے زندگی وقف کر دینے سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو جائے گا۔ اس کیلئے تو بڑے سامان کی ضرورت ہوگی۔ زمین، مکانات، پریس، لائبریری، کام کرنے والوں کی جماعت۔ اور ان سب کے لئے سرمایہ۔

اب سوال ہے ان حضرات سے جو اس قرآنی فکر سے ہم آہنگ اور اس لائحہ عمل سے اصولاً متفق ہیں، کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کرسکتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ جس حد تک یہ اجتماعی کوشش نتیجہ خیز ہوگی اسی حد تک یہ پروگرام عمل میں لایا جاسکیگا اس لئے ان حضرات کے لئے یہ لمحہ بڑے اہم فیصلے کا ہے۔ نہ صرف ان حضرات کے لئے بلکہ خود قرآنی نظام کی تحریک کے لئے بھی یہ لمحہ بڑا اہم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی سے ایک ایسے نقطہ کا آغاز ہو جائے جو آخر الامر ساری دنیا میں قرآنی فکر کو عام کرنے اور قرآنی نظام کے قائم کرنے کا محیط افزا دائرہ بن جائے۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء۔ اور اس طرح آپ وہ

السابقون الاولون بن جائیں جن کے پیچھے پیچھے کاروانِ انسانیت، رشد و سعادت کی اس راہ پر چل پڑے جو کامرانیوں اور خوشگواریوں کی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔

اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا جواب متعین۔ واضح اور غیر مشروط ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مجھے انہی جوابات کی روشنی میں اس پروگرام کے متعلق آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔

میرے مخاطب تو صرف وہی حضرات ہیں جنھیں مجھ پر اعتماد ہے۔ لیکن میں نے اس گفتگو کو نجی طور پر اپنے احباب تک ہی اس لئے محدود نہیں رکھا کہ مقصد پیشِ نظر، صرف میرا یا میرے ذاتی احباب کا مقصد نہیں۔ یہ مشترکہ مقصد ہے ان تمام حضرات کا جو قرآنی فکر و نظام کے عام کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ (اور اس اعتبار سے میرے احباب بھی درحقیقت یہی حضرات ہیں) انہی کی خاطر میں اس گفتگو کو منظر عام پر لے آیا ہوں تاکہ کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس میں اُسے شرکت کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

پرویز

پتہ: ۲۳ فاؤلر لائن۔ نیپئیر بارکس۔ کراچی

معاملہ کی باتیں

(۱) خط و کتابت میں اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ فرمائیے۔

(۲) رسالہ ہر ماہ پانچ تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو بروقت پرچہ نہیں ملا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا پرچہ محکمۂ ڈاک کی غفلت سے ضائع ہوگیا۔ اسلئے پندرہ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیجئے۔

(۳) ڈاک خانہ کی طرف سے رسالہ کی روانگی کے لئے ۵، ۱۰، ۲۰، ۳۰، تاریخیں مقرر ہیں، ان تاریخوں کے علاوہ ہم دوسری کسی تاریخ میں پرچہ نہیں بھیج سکتے اگر آپ نے دفتر کو کوئی شکایت تحریر فرمائی ہے تو تعمیل کے لئے ان تاریخوں کا انتظار فرمائیے۔

(۴) اگر آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے تو دفتر سے آپ کو ایک جوابی کارڈ بھیجدیا گیا ہے اس کا فوری جواب دیجئے۔ اگر آپ جواب نہیں دے رہے تو آئندہ پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی حاضر ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے۔

(۵) ادارۂ طلوعِ اسلام ایک تبلیغی ادارہ ہے۔ وی پی منگا کر واپس کر دینا اخلاقی جرم کے علاوہ ایک تبلیغی ادارہ کو نقصان بھی پہنچانا ہے۔

(۶) اگر آپ رسالہ کے ایجنٹ ہیں اور آئندہ آپ رسالہ کی ایجنسی جاری رکھنا نہیں چاہتے تو یکم تاریخ سے پہلے پہلے ادارہ کو اطلاع دیجئے اور بلاوجہ ادارہ کو نقصان نہ پہنچائیے۔

آپ کا مخلص منیجر

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

قانونِ حجب

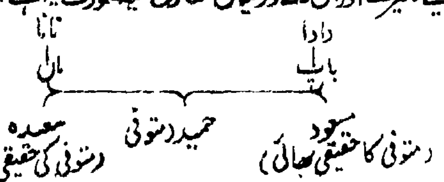
(علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

جولائی کے رسالہ طلوعِ اسلام میں مولانا تمنا صاحب کا مضمون عنوان بالا سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اگرچہ میرا نام نہیں لیا ہے مگر اعتراضات میرے ہی اوپر کئے ہیں۔ میں نے سورۂ نساء کی آیت ۱۲ — وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً الآیہ — کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہ فرائض میں اس آیت سے جو اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفروض قرار دیا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں عہدی وارثوں کے حصے بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۳۳ میں ہے۔

والذین عقدت ایمانکم فآتوھم نصیبھم

جن سے تمہارا عہد ہو گیا ہو ان کو ان کے حصے دو

مولانا تمنا نے یہاں تک تو مجھ سے اتفاق کیا ہے کہ اس میں اخیافی بھائی بہن کے حصے جو فقہا نے قرار دیئے ہیں صحیح نہیں ہیں مگر اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ یہ عہدی ورثہ کے حصے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ باپ ماں کی موجودگی میں یہ مطلق بھائی بہن کے حصے ہیں مگر دلیل اس پر سوائے اپنے قیاس کے اور کچھ نہیں دیتے۔ میرے اور ان کے درمیان متنازع فیہ صورت یہ ہے:



حمید نے وفات پائی۔ باپ کو چھوڑا اور دادا کو۔ ماں کو چھوڑا اور نانی کو۔ اور اپنے باپ ماں کی ایک بیٹی سعیدہ اور ایک بیٹے مسعود کو چھوڑا جو اس کے حقیقی بہن بھائی ہیں۔ مولانا تمنا باپ کو دادا کا حاجب قرار دیتے ہیں اور ماں کو نانی کا۔ یعنی باپ کی موجودگی کی وجہ سے دادا کو وراثت نہیں ملے گی اور ماں کی موجودگی کی وجہ سے نانی کو۔ مگر یہی باپ اور ماں ان کے نزدیک اپنی بیٹی سعیدہ اور بیٹے مسعود کے حاجب نہیں ہو سکتے۔ مولانا ان کو حصہ دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں ان سے چند سوالات کرنے ضروری ہیں۔

(۱) آپ باپ ماں کی موجودگی میں بھائی بہن کو کس قرآنی دلیل سے حصے دیتے ہیں؟

(مولانا موصوف نے دراصل یہاں قیاس سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں باپ ماں کی موجودگی میں بھائی اور بہن، ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ سے $\frac{1}{6}$ کر دیتے ہیں مگر ان کو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ان کو ایک حبہ مل سکتا ہے۔ اس لئے مولانا صاحب نے رحم کھا کر ان کے بھی حصے مقرر فرما دیئے۔ لیکن یہ نہ سوچے کہ بلا قرآنی سند کے یہ حصے دیئے کیسے جائیں گے۔)

(۲) سورۂ نساء کی آخری آیت میں بھائی بہن کے حصے اولاد کی طرح (نر کو مادہ سے دگنا) رکھے گئے ہیں مگر اس بارہویں آیت میں تو مذکر اور مونث کے حصے مساوی ہیں۔ اگر بقول مولانا تمنا صاحب یہاں بھی بھائی اور بہن ہی کے حصے ہیں تو تقسیم میں فرق کیوں ہے؟

(۳) قرآن نے پورے قانون وراثت کو صرف پانچ آیتوں میں بیان فرما دیا ہے۔ ان میں کلالہ کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ آپ نے کس دلیل سے ایک جگہ کلالہ ناقص اور دوسری جگہ کلالہ کامل مراد لیا ہے۔ ایسے نازک اور مختصر قانون سازی کے موقع پر ایک ہی لفظ کے دو معانی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال رکھئے کہ آپ کا قیاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۴) آیت ۳۳ میں آپ نے عقدت ایمان کا ترجمہ عقد نکاح کیا ہے۔ یہ ثبوت طلب ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ بارہویں آیت میں میاں اور بیوی کے حصے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آیت ۳۳ میں پہنچکر یہ فرمانا کہ جن سے تم نے عقد نکاح باندھا ہے ان کو ان کے حصے دیدو کیا معنی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب اس آیت سے بھی سرسری گزر گئے ہیں انھوں نے یہ سوچا نہیں کہ یہ کس ضرورت سے یہاں لائی گئی اور کیا فائدہ دیتی ہے جو اس سے پہلے ہم کو حاصل نہیں تھا۔

(۵) آپ نے فرمایا ہے کہ غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب افعال نہیں بلکہ باب تفعیل ہے۔ اس پر کوئی سند نہیں دی۔ نہ قرآن کی کوئی آیت پیش کی جس میں یہ لفظ باب تفعیل سے لایا گیا ہو۔ بخلاف اس کے متعدد آیات میں اس کا استعمال باب افعال ہی سے ہوا ہے۔ مثلاً سورہ شعراء میں ہے اورثناھا بنی اسرائیل۔ سورۂ احزاب میں ہے واورثکم ارضھم ودیارھم۔ سورۂ فاطر میں ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہ خود ساختہ قاعدہ مولانا نے اپنی غلطی کی حمایت کیلئے وضع فرمایا ہے مگر یہ نہ صرف عربی زبان بلکہ قرآن پر ظلم ہے۔

ان سب غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ مولانا تمنا نے قرآنی وراثت سمجھنے میں جو پہلا قدم رکھا وہی غلط رکھا۔ قرآن نے نسبی رشتہ داروں کی وراثت کا سب سے پہلا بنیادی قاعدہ جو بتایا ہے وہ یہ ہے: للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون - وللنساء نصیب مما ترك الوالدان والاقربون —— مردوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے۔ یعنی نسبی رشتہ دار باپ، ماں اور اقرب کے سوا اور کسی کے ترکہ سے حصہ نہیں پاتا۔ اقرب کا مفہوم میں نے اپنے رسالہ محجوب الارث میں جو اس سے پہلے طلوع اسلام میں چھپ چکا ہے واضح کر دیا ہے کہ مورث اقرب اس کا ہوگا جس سے بلا واسطہ اس کا رشتہ ہے اور اگر بواسطہ ہے تو بروقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ مفقود ہو۔ میں نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے سوا اقرب کا کوئی دوسرا مفہوم ہو نہیں سکتا۔

اب صورت متنازع فیہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ حمید متوفی سعیدہ اور مسعود کا نہ باپ ہے نہ ماں، نہ اقرب ہے۔ کیونکہ اس کا رشتہ ان دونوں بھائی بہن کے ساتھ بذریعہ باپ اور ماں کے ہے جو دونوں موجود ہیں۔ پھر یہ دونوں حمید کے ترکہ سے حصہ کیسے پا سکتے ہیں؟ مولانا نے یہ پہلا قدم غلط رکھا اس لئے اس کے بعد جتنے قدم رکھے سب غلط در غلط ہوتے گئے۔

اثرِ بہار

فقط انقلاب موسم کو میں کیا کہوں بہاراں　　جو اثر پذیر اس سے نہ ہوا مزاجِ یاراں
نہ کسی نے جام اٹھایا، نہ پیا نہ کچھ پلایا　　ہوا کیا جو ابر آیا بہ مرادِ مے گساراں
یہ سہی چمن کا نقشہ، ہے مگر چمن یہ کیسا　　نہ تبسّم اس میں گُل کا نہ ترنّمِ ہزاراں
ہیں طیور وقفِ شیون، گُل و لالہ چاک دامن　　ہے یہ بزمِ اہلِ گلشن کہ ہجومِ سوگواراں
مرے دل نے کیوں نہ مانا کہ بدل گیا زمانہ　　وہی شاخِ آشیانہ وہی برق و بادو باراں
ہیں بلند جن کے دعوے کہوں کیا کہ ہیں وہ کیسے　　کوئی نے سوار جیسے کرے نقلِ شہسواراں
یہ جو رنگ زُہد کا ہے میں بتا تو دوں کہ کیا ہے　　مگر اس سے روکتا ہے ادبِ بزرگواراں
اثرِ بہار پیدا دلِ زندہ ہی کرے گا　　نہ نشیبِ دشت و دریا نہ فرازِ کوہساراں

دلِ مطمئن ملا ہے تو یہ نعمتِ خدا ہے
تجھے کیا خبر کہ کیا ہے تب و تابِ بیقراراں

اسد ملتانی

دستور پاکستان

(فقہ حنفی)

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

ہم نے طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ جو لوگ مذہب کو اپنی انتخابی مہموں کی آڑ بنا کر پاکستان میں نظام شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی ٹکنیک یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اکثریت کو اپنے ساتھ رکھیں کیونکہ دور حاضرہ کے جمہوری قاعدوں کی رو سے انتخاب میں وہی جماعت کامیاب ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اکثریت ہو۔ اس مہم میں اسلامی جماعت سب سے پیش پیش ہے۔ یہ جماعت آج تک کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کو اسلامی دستور کا مدار علیہ قرار دیتی چلی آ رہی تھی۔ ان کے اس دعوے میں قرآن کا نام تو محض برائے بیت ہوتا تھا، اصل زور حدیث پر دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ حدیث کو وحی غیر متلو قرار دیکر اسے قرآن کے ہم پایہ ٹھہراتے تھے اور اس کا مسلسل اعادہ کرتے چلے آتے تھے کہ قانون صرف کتاب و سنت کے اندر ہے چنانچہ سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا:

کبھی تجدید ملت کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی تنہا ماخذ تھیں

> لہذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کیلئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس راہ نمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہ عمل تعمیر کرنے کیلئے ایسی مستقل قوت اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو۔ اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔
>
> (ترجمان القرآن ص ۳۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء)

اسی طرح وہ اپنے پمفلٹ "اسلامی قانون" میں لکھتے ہیں کہ

> اسلامی قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ (۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں۔ (۲) اصولی احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ (۳) حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادئ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں ...... اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدود اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت کو متعین کرتا ہے۔ (ص ۲۲)

حتیٰ کہ وہ تفہیمات حصہ اول میں لکھتے ہیں کہ

تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول اللہ روشن ہوجائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (ص ۳۲۵)

آج اکثریت کا فیصلہ ہی تنہا ماخذ ہے

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جبکہ پورا برعظیم ہند انگریز کے پنجۂ استبداد میں جکڑا ہوا تھا اور انھیں اپنا منتہائے ارتقا امامت و مجددیت (مذہبی پیشوائیت) میں نظر آرہا تھا جبکہ پاکستان کے وجود پذیر ہوجانے اور امیرالمؤمنین بن سکنے کا انھیں وہم و خیال بھی نہیں تھا جس کے لئے جمہوری نقطۂ نظر سے انتخابی مہمیں لڑنے کی ضرورت تھی۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جبکہ انھوں نے انتخابی مہمیں لڑنے کا فیصلہ کیا اور اب جو اکثریت کو ساتھ رکھنے کی ضرورت پیش آگئی تو "دین" میں ضروری تبدیلی کرلی گئی چنانچہ اب (ترجمان القرآن بابتہ جون جولائی ۱۹۵۲ء میں) اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں کونسا قانون شریعت نافذ ہوگا یہ لکھ دیا گیا ہے کہ

اگر شریعت کو ملک کا دستور اور قانون بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرات نہیں کرسکتا) تو جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور قانون کی شکل اختیار کریگی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے اور اگر ان کے ساتھ اہل حدیث کو بھی شمار کیا جائے تو مجموعی تعداد نوے فیصدی سے بھی زیادہ نکلیگی اس صورت میں لامحالہ دستور تو شریعت کی اس تعبیر کے مطابق ہی بنے گا جس پر حنفی اور اہلحدیث متفق ہوں اور لازماً ملکی قانون حنفی تعبیر شریعت پر مبنی ہوگا۔ (ص ۱۲-۱۳)

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس نئے مسلک میں کس سادگی اور پرکاری سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ سردست اہلحدیث کو بھی ساتھ چپکائے رکھا جائے۔ اس کے لئے ارشاد ہے کہ مسلک کے دستور کی تعبیر تو حنفیوں اور اہل حدیث کے اتفاق سے طے پائے گی لیکن ملکی قانون فقہ حنفی کے مطابق ہوگا۔ حالانکہ دستور اور قانون کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ کسی مملکت کا دستور ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا قانون اس اصول کے تابع وضع ہوتا ہے۔ دستور میں اس امر کی صراحت کی جاتی ہے کہ ملک کے قانون کا ماخذ یا منبع کیا ہوگا۔ قانون کے مسئلہ میں حنفیوں اور اہلحدیث کا اختلاف جزئی مسائل میں نہیں بلکہ اصول میں ہے۔ باندریں حالات یہ کس طرح ممکن ہے کہ پاکستان کا دستور تو حنفی اور اہلحدیث کی متفق علیہ تعبیر کے مطابق بنے اور اس کا قانون خالص فقہ حنفی کے مطابق ہو۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کرنے کی جرأت اسلئے کرلیتے ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ بیچارے مولویوں میں کون ہے جو دستور اور قانون کے اس قسم کے باریک فرق کو محسوس کرسکیگا۔

جمہوریت کا اصول مسلم ہے

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جمہوریت کا اصول مسلم ہے۔ یعنی کسی مملکت کا آئین اور قانون وہی ہونا چاہئے جو اس مملکت کی اکثریت فیصلہ کرے۔ ظاہر ہے کہ اکثریت کا منشا معلوم کرنے کیلئے نظام جمہوریت میں ایک مشینری موجود ہوتی ہے جس کی روسے مملکت کے نمائندے ایک جگہ بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ ایسے مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس مجلس کے فیصلے (جو کثرت آراء سے طے پاتے ہیں) مملکت کا قانون بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کی مجلس قانون ساز (کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی) آج بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ آئین جمہوریت کے مطابق وہی قانون پاکستان کا ملکی قانون قرار پائے گا جسے یہ مجلس منظور

کریگی. جب مودودی صاحب کی جماعت کے نزدیک جمہوریت کا قاعدہ مسلم ہے تو انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ شور مچاتے پھریں کہ ملک کا قانون فلاں قسم کا ہونا چاہیئے اور اگر اس قسم کا قانون نہ بنا تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ ایک طرف جمہوریت کے قاعدہ کو مسلم ماننا اور دوسری طرف جمہوریت کو مجبور کرنا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق قانون بنائے ایک ایسا مسلک ہے جسے کسی جمہوری نظام میں بھی مناسب تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں حیرت ہے کہ جمہوریت کے قاعدہ کو ایک ایسا شخص مسلم قرار دے رہا ہے جو ایک ایسی جماعت کا امیر ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لئے وجود میں آئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جمہوریت کا قاعدہ مغرب کی لادینی سیاست کی تخلیق ہے جن کے پاس غلط اور صحیح اور حق و باطل کے پرکھنے کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ ان کے نزدیک اگر اکیاون ۵۱ اراکین یہ فیصلہ کردیں کہ خدا کا وجود نہیں ہے تو انچاس اراکین کو ماننا پڑے گا کہ خدا نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اسلامی جماعت کے امیر سے کہ کیا اسلام بھی اسی قسم کے قاعدہ کو مسلّم تسلیم کرتا ہے؟ اگر محترم امیر جماعت اسلامی اجازت دیں تو ہم اُنھیں اتنا یاد دلانے کی جرأت کریں کہ آئینِ پاکستان کا جو مسودہ خود انھوں نے مرتب فرمایا ہے اس میں یہ شق موجود ہے:

> امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ یا اقلیت کے ساتھ اتفاق کرے اور امیر کو یہ حق بھی ہوگا کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (دو دستوری خاکے ص ۱۶)

کیا اصول جمہوریت اسی کو کہتے ہیں؟ اب جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا وہ وزن کہاں چلا گیا جس کے زور پر حنفیت کو پاکستان کا قانون بنانے کی کوشش کی جارہی ہے؟ حیرت ہے کہ یہ حضرات دین کے اصولی امور میں بھی اس قسم کی متضاد باتیں کہہ دیتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کے سر پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے حد ہمدردی کے قابل ہے وہ قوم جس میں اس قسم کے لوگ دینی امور میں سند بن کر بیٹھ جائیں۔

دین میں اکثریت کا وزن

مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ ملک کا قانون فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہیئے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ملک کی اکثریت حنفی ہے۔ پہلے اس دلیل پر غور کیجئے۔ لیکن اس کے لئے پہلے ایک بنیادی نکتہ تمہیداً سمجھنا ضروری ہے۔ ایک مملکت (Secular State) کہلاتی ہے۔ اس کا اصول تقنین یہ ہوتا ہے کہ جس بات کو مفید سمجھا جائے اُسے اختیار کرلیا جائے جسے نقصان رساں سمجھا جائے اسے چھوڑ دیا جائے۔ ان کے نزدیک غلط اور صحیح کا معیار اکثریت کی رائے ہوتی ہے۔ نہ کہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے غیر متبدل اصول۔ دوسری اسٹیٹ دینی کہلاتی ہے جس میں مملکت کے فیصلے ہمیشہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے غیر متبدل اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مملکت دینی مملکت ہونی چاہیئے۔ ایک مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے تو اس کا مواخذہ ہوگا۔ جب مسلمانوں کی مملکت کے قانون کا سوال سامنے آئے گا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ قانون خدا کے حکم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ مودودی صاحب یہ نہیں فرماتے کہ فقہ حنفی کو اس لئے اختیار کیا جائے

کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ اس فقہ کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ ملک کی اکثریت اس کی متبع ہے۔ آپ سوچئے کہ یہ مسلک ایک سیکولر اسٹیٹ کا ہو سکتا ہے یا دینی مملکت کا؟

یہ تصور کہ اکثریت ہمیشہ حق پر ہوتی ہے انسان کی بہت بڑی غلط نگہی پر مبنی ہے اور قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں اس کی تردید فرمائی ہے۔ جب رسول اللہ صلعم سے فرمایا:

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔ (۶/۱۱۵)

اے رسول! اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرلو جو دنیا میں اکثریت میں ہیں تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

دین میں اکثریت و اقلیت کوئی معیار ہی نہیں۔ جب رسول اپنی آواز کو بلند کرتا ہے تو اس کے حق میں صرف اس کا اپنا ووٹ ہوتا ہے اور پوری قوم کی اکثریت اس کے خلاف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود رسول حق پر ہوتا ہے اور قوم کی اکثریت باطل پر۔

اکثریت کے وزن کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات

ہمیں اس اصول کے متعلق زیادہ تفصیل سے کہنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ مودودی صاحب نے متعدد مقامات پر اسے صحیح تسلیم کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم میں "اقلیت و اکثریت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کیلئے پیدا ہوتا ہے جماعتوں کے لئے نہیں جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لیکر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ (ص۵۶)

یہاں تک تو صرف ایک اصولی بات کہی گئی اس کے بعد خود مسلمانوں کے متعلق سنئے جن کی عظیم اکثریت کے وزن پر آج حنفیت کو قانونِ مملکت بنانے کی کوشش فرمائی جا رہی ہے۔ وہ عظیم اکثریت کس وزن کی حامل ہے سنئے۔ فرماتے ہیں:

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے اسلامی اغراض کیلئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ (ص۵۸)

آگے چلکر لکھتے ہیں:

بعض لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلعم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلعم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (ص۵۸)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:

یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نو سو ننانوے فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور

باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور نہ ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اسلئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دیکر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔ (ص۳۳)

دین کا خود کوئی تصور نہیں ذاتہ حق ہے نہ باطل

مودودی صاحب کے یہ ارشادات اس زمانے کے ہیں جب ہندوستان میں مسلم لیگ کی تحریک زوروں پر تھی اور یہ حضرت اس تحریک اور اس کے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ قوم کی اکثریت اس راہ پر چل رہی ہے اسلئے آپ بھی اس کا ساتھ دیجئے۔ اس وقت آپ یہ فرماتے تھے کہ اس قوم کی اکثریت کا وزن کیا ہے؟ اور آج وہی مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ پاکستان میں فقہ حنفی اس لئے رائج کرنا چاہئے کہ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت اسے صحیح تسلیم کرتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی یہ اکثریت اُنہی افراد پر مشتمل ہے جو بقول مودودی صاحب کے پیدائشی طور پر مسلمان پیدا ہوئے ہیں اور جنھوں نے فقہ حنفی کو کسی غور و فکر کے بعد اختیار نہیں کیا بلکہ وہ محض اسلئے حنفی ہیں کہ حنفی ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مگر یہی وہ اکثریت ہے جس کے مسلک کے متعلق آج یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اسے ایک دینی مملکت کا دستور اور قانون بنا چاہئے۔ محض اس دلیل کی بنا پر کہ یہ اکثریت کا مذہب ہے۔ یعنی یہاں اتفاق سے حنفی اکثریت میں ہیں تو حنفیوں کا مذہب عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔ اگر اہلحدیث اکثریت میں ہوتے تو ان کا مسلک عین اسلام قرار پا جاتا۔ اگر شیعہ اکثریت میں ہوتے تو اسی دلیل کی بنا پر ان کا مذہب، مذہب حق قرار دیا جاتا اور اگر کل کو کمیونسٹ اکثریت میں ہو جائیں تو ان کا مسلک ملک کا قانون قرار پا جانا چاہئے۔ یہ ہے دین کا وہ تصور جو جماعت اسلامی کے امیر کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی دین کا کوئی خاص تصور یا فیصلے فی ذاتہ نہ حق ہیں نہ باطل۔ حق وہ ہے جسے کسی زمانہ اور کسی ملک کی اکثریت اختیار کرلے اور باطل وہ جو اس دور کی اقلیت کا مسلک ہو۔ اس دلیل کی بنا پر معلوم نہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب آویزش کربلا کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے کیونکہ وہاں تو امام حسینؓ اور ان کے ساتھی بالکل اقلیت میں تھے اور مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت یزید کے ہاتھ پر بیعت کر چکی تھی۔

فقہ حنفی کیا ہے؟

آیئے اب مختصراً یہ دیکھیں کہ فقہ حنفی کسے کہتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہ (اس سے پہلے) خود مودودی صاحب اس فقہ کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم (بجز چند مستثنیات کے) اصولی احکام دیتا ہے۔ ان اصولی احکام کی جزئیات اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جاتی تھیں۔ سب سے پہلے ان جزئیات کو رسول اللہ صلعم نے متعین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ کسی اصول سے جزئیات کے فیصلے تک پہنچنے کے لئے غور و فکر، رائے اور قیاس کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام تفقہ فی الدین (دین میں غور و فکر کرنا) ہے اور اس طرح مستنبط کردہ احکام کا نام فقہ ہے۔ رسول اللہ کے بعد اسلامی مملکت میں وسعت ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی جدید مسائل سامنے آتے گئے جن کے لئے نئے نئے فیصلوں کی ضرورت لاحق ہوتی رہی۔ صحابہؓ نے سنت رسول اللہؐ کی

اتباع میں (یعنی قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام کے تعین کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے) ان جدید مسائل کے لئے نئے نئے احکام نافذ فرمائے۔ ظاہر ہے کہ حالات کے بدلنے سے اس قسم کے فیصلوں میں بھی تبدیلی ہو سکتی تھی۔ نیز خود فیصلہ کرنے والے کی رائے کی تبدیلی سے بھی اس کے متخرجہ نتائج میں تبدیلی کا امکان تھا۔ چونکہ فقہ کا مدار خارجی حالات اور مجتہد کی عقل و فکر پر تھا اس لئے اس قسم کے اختلافات میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی تھی چنانچہ خلافت راشدہ میں بعض فیصلے ایسے ہوئے جو رسول اللہ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور اس کیلئے دلیل یہی دی گئی کہ جن حالات میں رسول اللہؐ نے ایسا فیصلہ دیا تھا اب وہ حالات بدل چکے ہیں اس کے بعد خود ایک خلیفہ نے اپنے پیشرو خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف بھی فیصلے دیئے اور خود ایک ہی خلیفہ بھی مختلف حالات میں اپنے فیصلوں کو خود ہی بدلتا رہا۔ (ان امور کی مثالیں کتب سیر و تواریخ میں عام طور پر مل سکتی ہیں) خلافت راشدہ کے بعد دین میں لامرکزیت پیدا ہوگئی لیکن نئے نئے مسائل ہر روز سامنے آتے تھے، ان مسائل کا فیصلہ کرنے کیلئے دو قسم کے مکتب خیال پیدا ہوگئے بعض لوگ اس خیال کے پیرو تھے کہ جو فیصلے رسول اللہؐ نے کئے ہیں وہی فیصلے ہمیشہ کے لئے اٹل ہیں اور اب کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ اپنے قیاس (عقل و فکر) سے نئے احکام مستنبط کرے۔ یہ لوگ اہلحدیث کے نام سے متعارف ہوئے۔ رسول اللہ صلعم اپنے فیصلوں کا کوئی مستند مجموعہ امت کو دیکر نہیں گئے تھے (اسلئے کہ یہ منشائے رسالت تھا ہی نہیں کہ حضورؐ کے فیصلے جو لامحالہ اپنے زمانے کے احوال و ظروف کے مطابق دیئے گئے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹل اور قطعی تصور کرلئے جائیں) لیکن مندرجہ بالا ضرورت کے ماتحت ان فیصلوں کو جمع کرنا شروع کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام کتب روایات ہے جنھیں لوگوں سے سن سنا کر جامعین حدیث نے جنھیں قابل قبول سمجھا انھیں رکھ لیا اور جنھیں ایسا نہ سمجھا انھیں مسترد کر دیا۔ ان روایات کے متعلق اہلحدیث نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ یہ قرآن کے ہم پایہ ہیں اور خدا کی طرف سے وحی شدہ۔ لہٰذا ان ہی کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جس نے کہا کہ جو مسائل ہمارے سامنے آئیں گے ہم ان میں خود غور و فکر کریں گے اور اپنی رائے سے کسی فیصلہ پر پہنچیں گے ان لوگوں کو اہل الرائے کہا جاتا ہے ان اہل الرائے حضرات میں امام ابوحنیفہؒ بہت زیادہ مشہور ہیں۔ آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۵۰ھ ہجری میں وفات پاگئے۔ امام صاحب نے اپنی فقہ کو تنہا اپنی رائے سے مرتب نہیں فرمایا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور اشخاص منتخب کئے اور ان پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی۔ ان میں قاضی ابویوسف اور امام محمد خاص طور پر مشہور ہیں۔ (حنفیوں کے ہاں انھیں صاحبین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اس طرح قریب تیس برس کی مدت میں فقہی احکام کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا لیکن وہ مجموعہ اب کہیں موجود نہیں (اور نہ ہی امام صاحبؒ کی کوئی اور تصنیف موجود ہے) امام صاحبؒ کے مسائل کا جو ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ درحقیقت امام محمدؒ اور قاضی ابویوسفؒ کی تالیفات ہیں۔ انھوں نے کئی مسائل میں خود امام صاحبؒ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ قاضی ابویوسفؒ خلفائے عباسیہ کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے اس طرح یہ فقہ حنفی خود عباسی حکومت کا قانون قرار پاگئی اور رفتہ رفتہ دیگر ممالک میں بھی پھیل گئی۔ کچھ وقت تک تو یہ مسئلہ رہی کہ ایک فقیہ کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اپنے پیشرو فقہاء کے فیصلوں سے اختلاف کرے لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بدلتا گیا اور جب امت پر ہر طرف سے جمود اور تعطل طاری ہوگیا تو اس خیال کی جگہ اس عقیدہ نے لے لی کہ جو کچھ ائمہ سابقہ نے کر دیا ہے اس میں

ردوبدل کی گنجائش نہیں۔ اس طرح استنباط مسائل میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس مسلک کو تقلید کا مسلک کہتے ہیں یعنی کسی خاص فقہ کی بلا چون وچرا اور بلا غور وفکر پیروی کرنا[1]۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کے مقلدین کی ہے ان کے برعکس اہلحدیث کو غیر مقلد (یا وہابی) کہا جاتا ہے (حالانکہ یہ نسبت ہر اہلحدیث کی طرف درست نہیں ہے) قرآن اور حدیث کے متعلق حنفی حضرات کا عقیدہ کیا ہے؟ اس کے متعلق فقہ حنفی کے پیشوا اور مسلم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤوّل ہے یا منسوخ ہے اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔ (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۱۲۱)

یعنی دین میں سند فقہ حنفی کے ائمہ ہیں اور ہر وہ آیت یا حدیث جو ان کے فیصلوں کے خلاف جاتی ہو اس کی یا تو ایسی تاویل کی جائیگی جس سے وہ ان فیصلوں کے مطابق ہو جائے اور اگر وہ کسی تاویل سے بھی ان کے مطابق نہ بیٹھے تو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ وہ منسوخ ہے۔

فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کی رائے

یہ ہے وہ فقہ جس کے متعلق مودودی صاحب کی تجویز یہ ہے کہ اسے مملکت پاکستان کا قانون بنا دیا جائے۔ اس فقہ میں حدیث کا جو مقام ہے اس پر امام کرخیؒ کا مذکورہ بالا قول واضح ہے یعنی ان کے نزدیک اتباع اپنے امام کے فیصلے کی ہے نہ کہ حدیث کی لیکن مودودی صاحب خود ہی یہ لکھ چکے ہیں کہ

> جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (تفہیمات حصہ اول ص۳۲۵)

فقہ حنفی میں کتنے ایسے احکام ہیں جو صاف صاف حدیثوں کے خلاف ہیں اس کے متعلق تفصیل سے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں مقلدوں اور غیر مقلدوں کے آئے دن کے مناظرے اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ خود مودودی صاحب فرماتے ہیں:

> امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ (رسائل و مسائل ص۲۴۳-۲۴۵)

تقلید کے متعلق لکھتے ہیں:

> میرے نزدیک ایک صاحب علم آدمی کیلئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل ص۲۴۴)

دوسرے مقام پر ہے:

> اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہؐ کے اور کسی کی نہیں اور رسول اللہؐ کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے اور عمل کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ (رسائل و مسائل ص۲۳۶)

---

[1] تفاصیل کیلئے دیکھئے تاریخ الفقہ الاسلامی از علامہ محمد الخضری اور سیرۃ النعمان مولفہ علامہ شبلی نعمانی۔

مجتہد کی صحیح پوزیشن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اسلئے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کیلئے مناسب ہوتے ہیں مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو زمان اور مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا نہ اسکی نظر تمام ازمنہ و احوال پہ وسیع ہوسکتی ہے لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم ص۲۲۶)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کرسکتا ہے اور کرجاتا ہے۔ (تفہیمات حصہ اول ص۳۲۴)

وہ خود بعض مسائل میں فقہ حنفی سے اختلاف رکھتے ہیں چنانچہ رسائل و مسائل کے صفحہ ص۲۴۱ پر لکھتے ہیں۔

نماز جمعہ میں شرطِ مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔

انھوں نے بڑی شد و مد سے لکھا ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی ذہنیت بڑی افسوسناک ذہنیت ہے چنانچہ وہ رسائل و مسائل کے ص۲۸۲ پر رقم طراز ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ فقہیات[1] کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑے کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کیلئے ملکر کام کرنا غیر ممکن ہوگیا ہے وہی ذہنیت بار بار بروئے کار آتے چلے جا رہی ہے۔

غور فرمایئے اب یہی مودودی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کا قانون فقہ حنفی ہونا چاہیئے۔ یعنی جس ذہنیت کا رونا آجتک رویا جارہا تھا اسی ذہنیت کو اب پوری کی پوری قوم پر بطور ملکی قانون مسلط کرنے کے مشورے دیئے جارہے ہیں۔ یہ وہی فقہ ہے جسے وہ "منجمد شاستر" کی اصطلاح سے تعبیر کرچکے ہیں چنانچہ وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں لکھتے ہیں کہ اسلام کے حق میں جو چیز شدید تر رکاوٹ ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جارہا ہے اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ

اس میں اسلامی شریعت کو ایک "منجمد شاستر" بناکر رکھدیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (ص۳۶)

یہ ہے وہ "منجمد شاستر" جس کے متعلق اب تجویز فرمایا جارہا ہے کہ اسے ملک کا قانون بنا چاہیئے (تاکہ اکثریت ان کے ساتھ رہے)۔

ایسا پرانا قانون اب کیسے چل سکیگا

آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک وہ فقہ جس پر مسلمان اس وقت کاربند ہیں کس طرح ایک "منجمد شاستر" کی حیثیت رکھتا ہے اور اس فقہ کو دین سمجھنے والی ذہنیت کس طرح دین کی راہ میں شدید ترین رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ لیکن جب یہی اعتراض ان پر کیا جاتا ہے کہ اس قدر پرانے زمانے کے فقہی احکام آج کے حالات میں کس طرح کام دے سکتے ہیں تو وہ فوراً اپنا رخ بدلتے ہیں اور ایک رعد آسا کڑک کے ساتھ فرماتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ یہ قانون پرانا ہوچکا ہے، تفصیل انہی کی زبان سے سنئے اور ورطۂ حیرت میں ڈوب جایئے کہ جس فقہی قانون کے متعلق ابھی ابھی یہ کچھ کہا جارہا تھا اس کے متعلق اب کیا ارشاد ہوتا ہے: فرماتے ہیں،

[1] فقہیات اصل دین نہیں ہیں۔ یہی بات اگر ہم کہدیتے ہیں تو منکرِ حدیث اور منکرِ فقہ کا لیبل ہم پر چسپاں کردیا جاتا ہے مگر ان لوگوں کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض (کہ صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کیلئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے) پیش کیا جاتا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انھوں نے کہیں سے بس یہ اڑتی اڑتی خبر سن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے اس کے بعد یہ بات انھوں نے بطورِ خود فرض کر لی کہ اس وقت سے یہ قانون جوں کا توں اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انھیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنا لے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کیلئے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیئے گئے تھے ان پر اسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر[1] و قیاس و استحسان و اجتہاد کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقا اول روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل چکا تھا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں ان سب[2] کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ پھر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کیلئے بھی نہیں رکا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی اور فوجداری قانون جاری رہا۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رکا رہا۔ لیکن اول تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کے فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ (اسلامی قانون ص۲۵-۲۶)

یعنی ابھی ابھی مودودی صاحب فرما رہے تھے کہ چوتھی صدی ہجری سے علماء نے اجتہاد کو حرام قرار دے رکھا ہے جس کی وجہ سے اسلامی قانون منجمد شاسترین کر رہ گیا ہے لیکن اب فرماتے ہیں کہ بارہ سو سال سے مسلسل ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے متعلق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رکا۔ ان دونوں باتوں میں سے بہرحال ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں جتنی ریاستیں بھی مسلمانوں نے

---

[1] ملاحظہ فرمایئے اول روز ہی سے یعنی جناب رسالتماب صلعم کے عہد باسعادت ہی سے اس قانون کا ارتقاء شروع ہو گیا تھا اور وہ ارتقاء وحی غیر متلو کے ذریعے سے نہیں بلکہ تعبیر، قیاس، استحسان و اجتہاد کے ذریعے سے شروع ہوا تھا۔ اسی حقیقت کا اظہار جب ہم کرتے ہیں تو ہمیں منکرِ حدیث کہا جاتا ہے۔

[2] لہٰذا اس دور کی تمام لعنتیں مثلاً بادشاہت و ملوکیت۔ جاگیرداریت وغیرہ بھی سب اسی قانون کی برکات ہوں گی جن کے ساتھ خلفائے بنو امیہ و بنو عباس و دیگر امراء کی عیاشیوں کی شرمناک داستانیں میشی اور معاشرتی ناہمواریاں، باہمی خونریزیاں اور مظالم و مفاسد کی لرزہ خیز داستانیں بھی شامل کر لیجئے۔ اور پھر یہ بھی کہ امام حسینؓ، محمد ابن النفس الذکیہ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، مجدد سرہندیؒ وغیرہ اکابرینِ ملت نے اسی قانونی نظم و نسق کے خلاف جہاد کرنے کے جرم میں قتل و قید کے مصائب برداشت کئے ہوں گے جو پہلا کا پورا اسی قانونِ شریعت پر مشتمل تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ یعنی بنو امیہ، بنو عباس، آل عثمان، حتیٰ کہ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تک پورا نظم و نسق اسلامی قانون ہی کے مطابق تھا۔ ہندوستان میں صرف ایک سو سال تک اس ارتقاء کا سلسلہ کا رہا جسے نہایت آسانی سے پورا کیا جا سکتا ہے، یعنی ان کے ارشاد کے مطابق اسلامی قانون وہ تھا جو مغلوں کے آخری دور میں ہندوستان میں رائج تھا اور جو آج بلا انقطاع افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر اور حجاز وغیرہ میں نافذ العمل ہے۔ یہی وہ اسلامی قانون ہے جسے مودودی صاحب پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات کو تو چھوڑیئے۔ ہم پاکستان کے سنجیدہ طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک بھی اسلام کا منشا و مقصود یہی کچھ تھا جو سو سال پہلے تک ہندوستان میں پورا ہوتا رہا ہے اور جو آج باقی اسلامی ممالک میں پورا ہو رہا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ اسلام کا منشا اسی قسم کی صورت حالات پیدا کرنا تھا تو بسم اللہ پاکستان میں وہی قانون نافذ کر دیجئے اور اپنی حالت ویسی ہی بنا لیجئے جیسی غدر کے زمانے تک تھی یا جیسی آج افغانستان عرب عراق کی ہے اور اگر سمجھتے ہیں کہ یہ صورت حالات تو قطعاً ایسی نہیں جس پر (مسلمان تو ایک طرف) ایک عام انسان بھی فخر کر سکے گا تو پھر سوچئے کہ یہ جدید قسم کی ملاازم آپ کو کدھر لئے جا رہی ہے۔

حضرت عمرؓ کے بعد ہی اسلام کے تمام شعبوں پر جاہلیت چھا چکی تھی

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس بارہ سو سال میں جتنی ریاستیں بھی مسلمانوں نے قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسلامی قانون پر چلتا رہا لیکن ذرا سنئے کہ اس سے پہلے وہ خود کیا ارشاد فرما چکے ہیں۔ وہ اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" میں اسلامی نظام حکومت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اس کام کو تکمیل تک پہنچا دیا اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اس کام کو اسی جامعیت کے ساتھ جاری رکھا۔

> پھر زمام قیادت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتدائی چند سال تک وہ نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ نے قائم کیا تھا مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کار عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں اسلئے جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دیکر اس خطرہ کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا، ان کے بعد حضرت علیؓ آگے بڑھے اور انھوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا اور ملک عضوض (TYRANT-KINGDOM) نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔ (ترجمان القرآن ص ۲۲-۲۵ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء)

یعنی مودودی صاحب یہ فرما رہے تھے کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی اپنی ریاستیں قائم کیں اس کا پورا نظم و نسق اسلامی نظام پر چلتا رہا اور اب یہ فرما رہے ہیں کہ اول تو حضرت عثمانؓ کے زمانہ ہی میں لیکن کامل طور پر حضرت علیؓ کے بعد حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہو گئی۔ اب یہ سنئے کہ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اس جاہلیت نے اسلام کے ساتھ کیا کیا فرماتے ہیں۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زور حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برا ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو مورد الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات بد روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

یہ تین قسم کی جاہلیتیں مودودی صاحب کے نزدیک جاہلیت خالصہ، جاہلیت مشرکانہ اور جاہلیت راہبانہ تھیں۔ جاہلیتِ خالصہ نے اسلامی نظام کو کس طرح متاثر کیا اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

جاہلیت خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کیلئے اسلام آیا تھا۔ بادشاہ کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اسلئے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانہ سے وہی مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہل لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبیعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہو اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب و مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پرزے نکالنے لگا اور "عقائد" کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔

یعنی مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق جب حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جاہلیت خالصہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی نظام پر مسلط ہوئی ہے تو رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ ان کی تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اسلامی بنیادوں پر قائم رہ گیا ہو اور اس نے

جاہلیت راہبانہ کے ساتھ مل کر سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دیکر سست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کرکے رکھ دیا۔" (ایضاً ص۳۲) اس کے ساتھ جاہلیت مشرکانہ نے "پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کیں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی، اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام میں نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں"۔ (ایضاً ص۳۳) اس کے بعد انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ایک مجدد کا کام یہ ہوگا کہ وہ احیائے نظام اسلامی کرے جس کے معنی ہیں:

"جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے

صاحب شریعت نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ (ایضاً ص۴۲)

یعنی رسول اللہؐ نے حکومت کو اسلامی نظام پر قائم کیا۔ یہ نظام اپنی اصلی شکل میں حضرت عمرؓ کے دور تک قائم رہا اس کے بعد اس میں جاہلیت نے راہ پانا شروع کر دی اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اس پورے نظام کی جگہ نظام جاہلیت نے لیلی جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشہ پر مسلط ہو گئی اور یہی نظام جاہلیت آج تک قائم ہے اور اب ایک مجدد کا کام یہ ہے کہ اس نظام جاہلیت کو الٹ کر از سر نو نظام حکومت کی بنیاد اسی منہاج پر رکھے کہ جس پر اسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ مودودی صاحب نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۴۱ء میں فرمایا تھا لیکن آج وہی مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ "اس بارہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے جتنی ریاستیں بھی قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے" اور اب کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اسی نظام کو (جو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا) پاکستان میں رائج کر دیا جائے۔ اس طرح پاکستان صحیح اسلامی مملکت بن جائے گا۔

یہ تضاد کیوں؟ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ایک ہی شخص اسلام کی اصل و اساس کے متعلق اسقدر متضاد باتیں کس طرح کہہ سکتا ہے لیکن حالات پر نگاہ رکھنے والوں کے لئے اس کی وجہ معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں "حکومت کی مسندیں" مودودی صاحب کے تصور تک میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ اس وقت ان کے سامنے مسلم لیگ کے مقابلہ میں اپنی جماعت سازی اور اس کی قیادت کے مقابلہ میں اپنی امارت کا خیال تھا چنانچہ وہ اپنے مذکورہ صدر مضمون میں مجددین سابقہ کی ناکامیوں پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان سے پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ

> تجدد دین کیلئے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب المآخذ ہے یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ یا ان سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے اس وقت کے کام سے عہدہ برآ ہونے کیلئے کافی نہیں ہے۔ (ایضاً ص۹۷-۹۸)

لیکن اب سوال حکومت کی کرسیوں کا آگیا اور ان کے حصول کا طریقہ اصول جمہوریت کے مطابق یہی ہے کہ اکثریت کو ساتھ رکھا جائے

اب مسلمانوں سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمہارے آبا و اجداد بارہ سو برس سے نظامِ جاہلیت پر کاربند چلے آ رہے تھے اب ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس بارہ سو سال میں تمہارے آبا و اجداد نے جہاں جہاں بھی ریاستیں قائم کیں ان کا پورا نظم و نسق اسلامی قانون کے عین مطابق تھا اور وہی نظم و نسق میں رائج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس بارہ سو سال میں اسلام اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہا اور مسلمانوں کی سلطنتوں کا نظم و نسق اسلامی نظام کے مطابق نہیں تھا (اور نہ ہی آج ہے) یہ سب فتنہ پرداز ہیں خدا اور رسول کے منکر اور تمہارے اسلاف کی توہین کرتے ہیں۔

اصل حقیقت اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہدِ مبارک کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اسلام اپنی اصلی پٹڑی سے اتر گیا تھا اور اس کے بعد اس میں رفتہ رفتہ تمام غیر اسلامی عناصر داخل ہو گئے تھے۔ ہمارا تمام لٹریچر اسی دور کا پیدا شدہ ہے جس میں اسلام غیر اسلامی (عجمی) عناصر سے ملا جا چکا تھا۔ ہماری تاریخ، ہماری احادیث، ہماری تفاسیر سب اسی دور کی تخلیق ہیں۔ یہی حالت ہمارے قانون (فقہ) کی بھی ہے۔ اس کی تو تدوین ہی خالص ملوکیت کے زمانہ میں ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد آج اس کا بھی علم نہیں کہ جناب امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں نے کیا فیصلے کئے تھے اور آج جس چیز کا نام فقہ حنفی ہے وہ کون کون سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ اندریں حالات ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی یہ فرض کر لینا کہ وہ بالکل اسلام کے مطابق ہے بنیادی غلطی ہے۔ اس تمام طومار میں صرف اللہ کی کتاب ایسی ہے جو اپنی اصلی شکل میں اس وقت تک قائم ہے اور چونکہ مطاعِ حقیقی صرف خدا ہے اس لئے ہمیں اس تمام ذخیرہ پر قرآن کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہئے اور اس طرح کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دینا چاہئے۔ کسی انسان کے قول یا اس کی طرف منسوب شدہ اقوال کو تنقید کی حد سے بالاقرار دیدینا قرآن کے بنیادی ذہن کے خلاف ہے۔ یہی وہ مسلک تھا جو خود امام اعظمؒ نے اختیار کیا۔ چنانچہ اور تو اور وہ تو صحابہؓ کے متعلق بھی یہ کہتے ہیں کہ میں ان کے اقوال میں سے جس کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ باقی رہے دیگر مجتہدین تو ان کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ

> جب ابراہیم شعبی، حسن، ابن سیرین (اور بھی کئی مجتہدین کے نام لئے ہیں) تک معاملہ پہنچتا ہے تو مجھے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا ہے اسی طرح میں بھی کروں۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۳۲۲)

لہٰذا خود امام اعظمؒ کی "تقلید" بھی اسی میں ہے کہ جس طرح انہوں نے خود اجتہاد کیا تھا ہم بھی خود اجتہاد کریں۔ جس طرح ان کے دور میں نئے نئے حالات پیش آتے تھے اور ان کے لئے انہیں نئے نئے استنباطات کرنے پڑتے تھے اسی طرح ہمارے دور میں بھی نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی ان کے متعلق خود فیصلے کرنے چاہئیں لہٰذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم (ہم سے مراد ہے ہر دور کے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ) قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں۔ ان جزئیات کے تعین میں ہم ان کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے جو اس سے پہلے اسی نہج و اسلوب پر ہوتی رہی ہیں ان میں جو چیزیں ایسی ہوں گی جن میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے گا دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کئے جائیں گے۔ اور اس ساری کوشش کی اصل و بنیاد یہ ہو گی کہ کوئی شے قرآن کریم کے اصول سے نہ ہٹے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح۔ یہی رسول اللہؐ نے کیا تھا اسی کے مطابق اس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علیٰ منہاج النبوۃ قائم تھی اور اسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں نے جتنی جلدی اس حقیقت کو سمجھ لیا اتنی ہی جلدی ان کا قدم راہِ مستقیم پر اٹھ جائے گا

جماعت کے انضباط کے لئے [illegible] ضروریات کی اور جس کا موجودہ حالات کا بیان اور ہر مستقبل کی رہنمائی ہے۔

مُلّا کی قرآن فہمی

بعض لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ مُلّا کو قرآن سے اسقدر ضد کیوں ہے اس کی بہت سی وجوہات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن مُلّا کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا اسلئے وہ جب بھی قرآن کے قریب جاتا ہے اسے اس میں اس قدر الجھاؤ، جھول، تناقض اور اشکال نظر آتے ہیں کہ وہ اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ خود بھی اسی پرانی ڈگر پر چلا جائے اور لوگوں کو بھی اس پر چلنے کی تلقین کرتا رہے۔ یہ بات نہیں کہ قرآن کوئی ایسی مشکل کتاب ہے جس کے سمجھنے میں اسقدر دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ قرآن تو خود روشنی ہے لیکن جس طرح سے روشنی سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے اسی طرح قرآن کی روشنی سے بھی وہی شخص راہنمائی حاصل کر سکتا ہے جو قرآن کے سمجھنے میں عقل اور فکر سے کام لے۔ مُلّا کے نزدیک مذہب کو عقل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ جو ہوتا چلا آرہا ہے اس پر آنکھیں بند کرکے چلتے رہنا صحیح راہِ نجات ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مُلّا اور عقل دو متضاد چیزیں بن کر رہ گئی ہیں اسلئے جب مُلّا اپنی آنکھوں پر تقلید کی پٹی باندھ کر قرآن کی طرف بڑھتا ہے تو اسے وہاں سے (قرآن کی مثال کی رو سے) اُسی طرح آتشین کوڑے پڑتے ہیں جس طرح آسمانی خبریں لانے کے مدعی کاہنوں کو پڑا کرتے تھے۔ اس سے پہلے مُلّا کو ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ قرآن کی طرف رُخ کرے لیکن چونکہ اس دور میں قرآن کا چرچا عام ہو رہا ہے اسلئے مُلّا کو بھی مجبوراً قرآن کے حوالے[1] دینے پڑتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں وہ کس قسم کی قلابازیاں کھاتا ہے اس کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو آپ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ مضمون پڑھئے جو "ایک نیا فتنہ" کے عنوان سے اپریل و مئی ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے۔

یہ مضمون کسی مابعد الطبیعاتی موضوع سے متعلق نہیں جس میں مودودی صاحب کے فہم کو دشوار گزار گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا۔ موضوع تھا "روزہ کے احکام" جو قرآن نے ایسے واضح اور سہل انداز میں بیان کئے ہیں کہ ان میں کسی الجھاؤ یا پریشانی کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے جب انسان کی آنکھوں پر تقلید کی پٹی بندھی ہو تو قرآن کی روشنی اسے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

یہ مضمون کسی صاحب کے غلط استدلال کے جواب میں ہے اسلئے مودودی صاحب نے تمہیداً یہ لکھا ہے: "روزوں کے بارہ میں قرآن سے جو غلط استدلال انھوں نے کیا ہے اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، لکھ دیئے گئے تم پر روزے جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر، تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چُنے دنوں کا۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہئے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں

---

[1] طلوعِ اسلام کی یہ کامیابی بھی کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ فالحمد للّٰہ علیٰ احسانہ ۱۲

اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضاکارانہ بجالائے نیکی تو وہ بہتر ہے اُسی کے لئے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم علم رکھتے ہو۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بناکر انسانوں کیلئے اور روشن آیات لئے ہوئے ہدایت اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہئے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہئے شمار دوسرے دنوں سے۔

آیات قرآنی کا مندرجہ صدر ترجمہ دینے کے بعد مودودی صاحب جو تنقید فرماتے ہیں وہ غور سے دیکھنے کے قابل ہے اس لئے ہم اقتباسات کے بجائے ان کی پوری کی پوری عبارت نقل کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

اس عبارت کو جو خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی تو اس میں پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لئے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے؟ آخر یہ کیا انداز بیان ہے کہ پہلے کہا " روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا " پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے، پھر بتایا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اس کام کیلئے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ اس مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کئے گئے ہیں اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اسلئے یہ فرض روزے تم اس مہینے میں رکھو۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہوگا کہ اس سلسلۂ عبارت میں جب پہلے یہ فقرہ آچکا تھا کہ " جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہئے شمار دوسرے دنوں سے " تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دُہرانے کی کیا حاجت تھی؟ اور اگر فی الواقع اُس کا دُہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دُہرایا گیا کہ " جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا " حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی۔ لیکن ایک کو دہرانا اور دوسرے کو نہ دہرانا تو ایک معما سا محسوس ہوتا ہے؟

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ " ماہ رمضان وہ ہے " سے پہلے کی عبارت اور اس کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دیدے، لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا ہو جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دیگا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے شایان شان کیسے ہو سکتا ہے۔

پہلے دو سوالات تو صرف سوالات ہی ہیں لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اور

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لیے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے۔ جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں ان سے پوچھئے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

مندرجہ بالا تنقید میں جناب مودودی صاحب (اور تو اور) خود اللہ تعالیٰ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ جس ترتیب سے اللہ نے یہ احکام دیئے ہیں (معاذ اللہ) "شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا" اس کے علاوہ انھیں ان آیات میں صریحاً تناقض نظر آرہا ہے اور اس کے بعد وہ بہ کمالِ شانِ امارت فرماتے ہیں "ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے" آخر میں ان کی تنقید کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ ـــــ قرآن پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ صرف حدیث سے رفع ہو سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ قرآن جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے وہ اس قسم کا ہے کہ اگر اسے خارجی سہارے نہ دیئے جائیں تو وہ (معاذ اللہ) اناڑیوں کی سی باتیں کرتا ہے۔ متضاد اور متناقض احکام صادر کرتا ہے اور اس قسم کا قانون دیتا ہے جس کی توقع ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے انسان سے بھی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے ان تمام عیوب و اسقام کو رفع کرنے کے لئے ہمیں اور گوشوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور وہ گوشے ہیں روایات کے مجموعے[1]۔

قبل اس کے کہ ہم قرآن کی زیرِ نظر آیات کو (مودودی صاحب کے الفاظ میں نہیں بلکہ) خود قرآن کے الفاظ میں پیش کر کے یہ بتائیں کہ وہ احکام کس قدر صاف اور واضح ہیں ہم قارئین کی توجہ اس اہم حقیقت کی طرف مرکوز کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دیکھیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک خالص قرآن کی پوزیشن کیا ہے۔ کیا قرآن کے متعلق اسلام کے بدترین دشمن ـــــ مسیحی مشنریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں ـــــ نے اس سے کچھ مختلف کہا ہے جو مودودی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں؟

بہرحال مودودی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ قرآن کے اس تناقض و تعارض کا حل حدیث سے ملتا ہے وہ حل کیا ہے اس کے متعلق وہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

اب دیکھئے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو "اے لوگو" سے شروع ہو کر "اگر تم علم رکھتے ہو" پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا، اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے

[1] خدا بھلا کرے محدثین کا جنھوں نے روایات کے مجموعے جمع کر کے (معاذ اللہ) خدا کی بگڑی ہوئی بات کو بنا دیا اور اس کے ان تمام نقائص کو دور کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔ ورنہ رسول اللہ نے تو لا تکتبوا عنی سوی القرآن (مجھ سے قرآن کے سوا اور کوئی بات قلمبند نہ کرو) کا ناعاقبت اندیشانہ حکم صادر فرما کر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کتاب اللہ کا بیڑا ہی غرق کر دیا تھا۔ آپ مودودی صاحب کا شکریہ ادا کیجئے کہ انھوں نے ایک انوکھی تحقیق سے امتِ اسلامیہ کو نوازا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بمصداق "دروغ گو را حافظہ نباشد" ترجمان القرآن کے اسی پرچہ میں صرف بارہ صفحے کے بعد ص۱۰۲ پر مودودی صاحب اس غلط تحقیق انیق کی یوں تردید فرماتے ہیں "یہ کسی مفصل بحث کے بجائے آپ کی تشفی کیلئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کیلئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے" اب مودودی صاحب سے پوچھئے کہ ان دونوں میں سے کونسی بات صحیح ہے ص۹۰ والی بات یا ص۱۰۲ والی؟ سچ ہے وما قدروا اللہ حق قدرہ۔

بلوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کردیا گیا، البتہ مسافر اور مریض کے لئے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان سے نہ صرف یہ کہ سارے اشکالات رفع ہوگئے بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس نعمت کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ حدیث کی رو سے ہمیں حل کیا ملا؟ حل یہ ملا کہ:

(۱) پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر

(۲) دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کردیا گیا۔

ذرا آپ سوچئے کہ اس سے اس قانون ساز کے متعلق جسے ہم عالم الغیب کہتے ہیں کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس نے جب پہلے سال روزے فرض کئے تو یوں حکم دیا کہ تم پر روزے فرض ہیں لیکن جو تم میں سے روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں وہ روزے کے بجائے فدیہ دیدیں یعنی بالفاظِ دیگر جو روزہ رکھ سکنے کی طاقت رکھیں وہ تو فدیہ دیں اور روزہ وہ رکھیں جنھیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو۔ حکم قرآنی کی اس تشریح کو جو مودودی صاحب نے خیر سے حدیث کی مدد سے کی ہے کسی سلیم العقل انسان کے سامنے رکھئے اور پھر اس سے پوچھئے کہ قرآن کے متعلق وہ کیا اندازہ قائم کرتا ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے ہی سال اللہ تعالیٰ نے اس رعایت کو منسوخ کردیا یعنی ایک ہی سال کے تجربہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے محسوس کرلیا کہ میں نے کس قسم کا حکم دیدیا تھا۔ وہ معاذ اللہ معاذ اللہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور اپنے پہلے حکم کو واپس لے لیا۔

لیکن مودودی صاحب اس عمل تنسیخ کی "حکمت" بھی بیان فرماتے ہیں۔ وہ محدثین و مفسرین کی تشریح کے مطابق لکھتے ہیں کہ "نماز اور روزہ دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ . . . . . جب نبی صلعم مدینہ تشریف لائے تو آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلادے اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے جائیں اور تندرست مقیم آدمی کیلئے فدیہ کی رعایت منسوخ کردی"[1]

مودودی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ اس عمل تنسیخ کی حکمت یہ تھی کہ روزہ کے احکام بتدریج نازل ہوئے تھے یعنی پہلے کچھ رعایتیں دی گئیں اور جب لوگ آہستہ آہستہ اس کے عادی ہوگئے تو پھر وہ رعایتیں منسوخ کردیں۔ روزے سنہ ۲ھ میں فرض ہوئے تھے جب تمام [illegible]

---

[1] مودودی صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ فدیہ کی رعایت تندرست اور مقیم کے لئے منسوخ ہوئی۔ مریض اور مسافر کیلئے باقی رہی۔ کیا ہم ان سے اتنا پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن میں مریض اور مسافر کیلئے فدیہ کی رعایت کہاں ہے؟ قرآن ان کے لئے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کردینے کا حکم دیتا ہے۔ فدیہ کی رعایت کہیں نہیں دیتا۔ ۔ح

مسلمانوں کی تعداد تین چار سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ان مسلمانوں کے لئے اس رعایت کو ضروری سمجھا گیا اور وہ بھی صرف ایک ہی سال کے لئے لیکن اس کے بعد خود رسول اللہ کی زندگی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلام لائے لیکن ان کے لئے تدریج کی حکمت ضروری نہ سمجھی گئی۔ ان میں سے ہر شخص کو وہ روزے رکھنے پڑے جن میں رعایت منسوخ ہو چکی تھی معلوم نہیں ان تین چار سو مسلمانوں کے لئے اس رعایت کی کیا ضرورت تھی اور بعد والوں کے لئے اسے کیوں نہ ضروری سمجھا گیا۔ اگر مقصود یہ تھا کہ لوگ آہستہ آہستہ روزوں کے عادی ہو جائیں تو ہر نو مسلم کے لئے اس رعایت کی ضرورت تھی اور اگر یہ لاکھوں مسلمان ایمان لانے کے بعد پہلے سال کے روزے بلا رعایت رکھ سکتے تھے تو ۲ھ والے مسلمان ایسا کیوں نہیں کر سکتے تھے؟

احکام خداوندی پر اعتراضات کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عبارت میں "پہلے ہی یہ کیوں نہ کہدیا گیا کہ ماہ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اسلئے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہئے کہ وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ آخر یہ کیا انداز بیان ہے کہ پہلے کہا کہ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا۔ پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے پھر بتایا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں" اسی انداز بیان کو مودودی صاحب نے "اناڑی پن" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس اشکال کا جو حل حدیث نے دیا ہے اس سے مودودی صاحب کے الفاظ میں "یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی" مودودی صاحب کی اس تشریح سے بات یہ بنی کہ

(۱) پہلے سال روزوں کا حکم دیتے ہوئے رمضان کے مہینہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن

(۲) دوسرے سال کے احکام میں رمضان کا ذکر کیا گیا اور یہ ذکر اس لئے کیا گیا کہ رمضان میں قرآن نازل ہوا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ یا تو پہلے سال کے روزے رمضان کے مہینے میں فرض نہیں ہوئے تھے اور رمضان کی تخصیص دوسرے سال کی گئی اور اگر پہلے سال بھی روزے رمضان میں تھے تو اس وقت ابھی قرآن نازل نہیں ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔ خود مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے سال بھی رمضان ہی میں روزے فرض ہوئے تھے اور اس سے بھی غالباً انھیں انکار نہیں ہوگا کہ جس رمضان (۲ھ ہجری) میں روزے فرض ہوئے ہیں قرآن اس سے پہلے نازل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے ہی سال کے حکم میں تمہید اس سے کیوں نہ اٹھائی گئی کہ روزے رمضان کے مہینے کے فرض ہیں اور رمضان کے مہینے کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن نازل ہوا۔

سب سے بڑا اعتراض جو مودودی صاحب کے ذہن میں گھوم رہا ہے کہ قرآن نے پہلی آیات میں مسافر، مریض اور طاقت رکھنے والے سے متعلق رعایات کو بیان کیا ہے لیکن اگلی آیات میں مریض اور مسافر کی رعایات کو تو دہرایا گیا ہے لیکن طاقت رکھنے والے کی رعایت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لہذا یہ تناقض احکام ہیں اور ان میں تطبیق کی صورت یہی ہے کہ طاقت رکھنے والے کی رعایت کو منسوخ تصور کیا جائے۔

بالفاظ دیگر مودودی صاحب اصول یہ متعین فرماتے ہیں کہ اگر ایک مقام پر قرآن نے کسی معاملہ کی پانچ جزئیات کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ تین جزئیات کا تو اس سے سمجھنا یہ چاہیئے کہ باقی ماندہ دو جزئیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ مثلاً دین کی بنیاد ایمان پر ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح فرمادی ہے کہ ایمان کے اجزاء پانچ ہیں یعنی اللہ، ملائکہ۔ کتب۔ رسل اور یوم آخرت (مثلاً $\frac{4}{136}$) پر ایمان لانا ——— لیکن دوسرے مقامات پر کہیں صرف اللہ اور رسول پر ایمان کا ذکر ہے۔ ($\frac{4}{152}$) کہیں صرف اللہ اور آخرت پہ ایمان کا ($\frac{5}{69}$) اور کہیں فقط اللہ پر ایمان کا ($\frac{2}{256}$) مودودی صاحب کے مندرجہ بالا اصول کے مطابق ایمان کے وہ اجزاء جن کا ذکر قرآن کی دیگر آیات میں نہیں سب منسوخ ہیں۔ ایمان کے بعد دین کا بنیادی مسئلہ حرام اور حلال ہے۔ اس کے متعلق سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں جن چیزوں کو حرام کہا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اَلْمَيْتَةُ (مردار)۔ (۲) وَالدَّمُ (خون)۔ (۳) وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ (خنزیر کا گوشت)۔ (۴) وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ (جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ (۵) وَالْمُنْخَنِقَةُ (گلا گھونٹ کر مارا ہوا) ۔ ۔ ۔ (۶) وَالْمَوْقُوْذَةُ (چوٹ لگ کر مرا ہوا)۔ (۷) وَالْمُتَرَدِّيَةُ (اوپر سے گر کر مرا ہوا) (۸) وَالنَّطِيْحَةُ (سینگ لگ کر مرا ہوا)۔ (۹) وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ (جسے درندوں نے کھایا ہو بجز ان کے جنہیں تم نے ذبح کر لیا ہو)۔ (۱۰) وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (اور جسے بتوں کے تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو) (۱۱) وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ (اور جسے تم پانسوں سے تقسیم کرو)۔ لیکن سورۂ انعام اور سورۂ بقرہ دونوں میں صرف چار چیزوں کا ذکر ہے یعنی مردار، بہتا ہوا خون۔ خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے ناموں کی طرف منسوب ($\frac{6}{146}$ و $\frac{2}{173}$) علاوہ ازیں سورۂ مائدہ اور سورۂ بقرہ میں صرف دَم (خون) کا لفظ آیا ہے لیکن سورۂ انعام میں دم مسفوح (بہتا ہوا خون) بیان ہوا ہے۔ نیز سورۂ انعام اور سورۂ بقرہ میں حرام چیزوں کے بیان کے بعد یہ بھی ارشاد ہے فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ (یعنی جو شخص مجبور ہو جائے اور اپنی خواہش اور خلاف ورزئ قانون کی نیت سے ایسا نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں) لیکن سورۂ مائدہ میں اس رعایت کا کوئی ذکر نہیں۔ مودودی صاحب کے اصول کے مطابق یہ رعایت تو ضرور منسوخ سمجھی جانی چاہیئے کیونکہ اس کا ذکر سورۂ مائدہ میں نہیں آیا۔ نیز خون کے ساتھ مسفوح کی شرط بھی منسوخ سمجھی جانی چاہیئے کیونکہ سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں خالی خون کا ذکر ہے۔

قرآن سے اسی قسم کی اور بھی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مشکل یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس کا بھی پتہ نہیں کہ قرآن کا انداز بیان کیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ کہیں ایک ہی چیز کا ذکر اجمالاً کرتا ہے کہیں اس کی تفصیل دیتا ہے کہیں اس تفصیل کے کوئی اجزاء بیان کرتا ہے کہیں کوئی اور اجزاء۔ اور اس طرح "تصریف آیات" (آیات کو بار بار لانے) سے مکمل حکم سامنے لے آتا ہے۔ احکام تو ایک طرف انبیاء سابقہ کے تذکار جلیلہ اور امم سابقہ کے قصص کے بارہ میں بھی اس کا یہی انداز ہے۔ مودودی صاحب اور ان جیسے اور حضرات چاہتے یہ ہیں کہ قرآن کا اسلوب اس قسم کا ہونا چاہیئے تھا جس قسم کا اسلوب انھیں پسند ہے۔ اگر قرآن کا اسلوب بیان ویسا نہیں ہے تو یہ اناڑی پن کی دلیل ہے کیونکہ اس سے تضاد لازم آتا ہے۔ اس اناڑی پن کو دور کرنے کے لئے روایات کی تلاش ہوتی ہے اور تضادات کو رفع کرنے کیلئے آیات کو منسوخ بنایا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم یہ باتیں کس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ انھیں خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں۔

مودودی صاحب کو یہ بھی اعتراض ہے کہ چند ملحقہ آیات میں ایک ہی چیز کو دہرایا کیوں ہے۔ روزہ کے احکام دوسرے پارہ میں ہیں۔ اسی پارہ کے شروع میں تحویلِ قبلہ سے متعلق آیات ہیں جن میں کہا یہ گیا ہے کہ تم اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیرو۔ ان آیات میں دیکھئے کہ اس حکم کو "کہ تم اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیرو" کتنی بار اور کتنی متصل آیات میں دہرایا گیا ہے۔ پہلی آیت ۱۴۴ میں فرمایا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شَطْرَهٗ۔

اس کے بعد آیت ۱۴۹ میں فرمایا:

ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام

اور اس کے بعد انہی الفاظ کو اس سے اگلی آیت یعنی ۱۵۰ میں پھر دہرایا کہ

ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام

اور اس کے ساتھ ہی فرمایا:

وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره۔

اگر (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) ایک حکم کو مسلسل آیات میں دہرانا "اناڑی پن" ہے تو معلوم نہیں وہ مندرجہ بالا آیات کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے؟

مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق ان تمام اعتراضات و اشکالات کا حل (جو ان کے ارشاد کے مطابق قرآن پر وارد ہوتے ہیں) یہ ہے کہ طاقت رکھنے والے کی رعایت سے متعلق حکم کو منسوخ مانا جائے۔ یعنی انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کریم میں ایسے احکام بھی ہیں جو صرف پڑھنے کے لئے رکھے گئے ہیں (تاکہ ان سے تلاوت کا ثواب حاصل ہو) لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ کیا وہ بتائیں گے کہ ناسخ اور منسوخ کے اس عقیدہ کی قرآنی سند کونسی ہے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ اس کی سند سورۂ بقرہ کی یہ آیت ہے:

ما ننسخ من اٰية او ننسها نات بخير منها۔ الآیہ۔ ($\frac{2}{106}$)

تو یہ جواب خود ان کی اپنی اس تفسیر کے خلاف جاتا ہے جو وہ تفہیم القرآن میں لکھ چکے ہیں۔ اس کے متعلق انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ

> یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیئے گئے ہیں ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ص $\frac{101}{1}$)

یعنی مودودی صاحب کی اس تفسیر کی رو سے (اور قرآن کا یہی صحیح مفہوم بھی ہے کہ) قرآن کریم نے کتب سابقہ کے بعض احکام کو منسوخ کیا ہے اور اسی امر کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کی آیات ناسخ ہیں اور کتب سابقہ کے متعلقہ احکام منسوخ۔ یہ نہیں کہ قرآن ہی کے اندر بعض آیات منسوخ ہیں اور بعض آیات ناسخ۔ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ خدا اور اس کے کلام پایانِ محکم کی ساری عمارت کو مسمار

کردیتا ہے اور دراصل اسی مقصد کے لئے اسے عجمی سازشوں نے وضع کیا تھا۔ بہرحال جب خود مودودی صاحب کو اقرار ہے کہ قرآن کی مذکورہ صدر آیت (بابت ناسخ و منسوخ) کتب سابقہ کے منسوخ احکام سے متعلق ہے نہ کہ خود قرآن کے احکام سے۔ تو وہ براہ کرم بتائیں کہ اس عقیدہ کی قرآنی سند کیا ہے کہ روزوں کے احکام سے متعلق ایک آیت دوسرے سال منسوخ کردی گئی؟

مودودی صاحب نے جو اللہ میاں کو اناڑی، عقل و خرد سے بے بہرہ، متضاد اور متناقض احکام کا صادر کرنے والا، بے ربط اور بے ترتیب آیات نازل کرنے والا قرار دیا ہے اس کی بنیاد صرف اس قدر ہے کہ وہ عربی کے ایک لفظ (یطیقونہ) کا صحیح مطلب سمجھ نہیں سکے۔ اور اپنی اس جہالت کی بنا پر خدا اور قرآن کو وہ کچھ قرار دیدیا ہے جس کی جرأت کوئی زومیر یا دیانند ہی کرسکتا تھا۔ اگر انھیں اتنی سی عربی آتی کہ وہ اس لفظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتے تو انھیں خدا اور قرآن کے متعلق اس قدر گستاخیوں کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور اس غلطی کی وجہ بھی وہی اندھی تقلید ہے کہ جو روایتوں اور تفسیروں میں لکھا ہوا پایا اُسے صحیفۂ خداوندی سے بڑھ کر مستند اور مقدس سمجھ لیا گیا۔ دیکھئے کہ بات کسقدر صاف ہے۔ روزے کے احکام یہ ہیں:

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے مسلمانو! جس طرح ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تم پر بھی فرض کردیا گیا ہے تاکہ تم تقویٰ شعار بن سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کیلئے اجازت ہے کہ دوسرے دنوں میں روزے رکھکر روزہ کے دنوں کی گنتی پوری کردے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۔

(۴) اور جو لوگ ایسے ہوں کہ وہ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں تو ان کیلئے روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔ پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ کرے، تو یہ اس کیلئے مزید اجر کا موجب ہوگا لیکن اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۵) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ .... فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔

(۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا پس جو کوئی تم میں سے اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پورے کردے۔

ان آیات سے ظاہر ہے:۔

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں۔

(۲) روزے اس کیلئے ہیں جو اس مہینے میں اپنے گھر میں موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض صحتیاب ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر روزوں کی گنتی پورے کردے۔

(۳) اب ایک مشکل اور باقی رہ جاتی ہے جو نہ مریض ہے (عام عرفی معنوں میں) اور نہ مسافر ہے مگر کسی وجہ سے اُسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ روزہ بمشکل رکھ سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ لے اسلئے کہ جتنے دن گذرتے جائیں گے بڑھاپا زیادہ غالب آتا جائیگا۔ اس کیلئے اس کے سوا کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں کہ اسے روزے معاف کرکے اس سے کچھ فدیہ لے لیا جائے۔ قرآن نے یہی حکم دیا ہے۔

غور کیجئے تو اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہوگئے اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔ فرمائیے کہ اس میں کون سے اعتراضات تھے جن کے حل کرنے کیلئے مودودی صاحب کو قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کی ضرورت پڑی۔

ہم نے "وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ" کا ترجمہ کیا ہے ——— "وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں"۔ اور مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے ——— "اور وہ لوگ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں" ——— سوال یہ ہے کہ "یطیقونہ" کا کونسا ترجمہ صحیح ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں لفظ طاقت کا جو مفہوم ہے عربی میں اس کا وہ مفہوم نہیں۔ مودودی صاحب نے اردو کے مفہوم کو سامنے رکھکر آیت کا ترجمہ کردیا جس سے قرآن کا سارا مطلب ہی خبط ہوگیا۔ "طاقت" کا عربی مفہوم سمجھنے کے لئے عربی لغت کو دیکھئے۔ محیط المحیط (جلد دوم ص۱۳۲۴) میں ہے:

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا۔ لیکن یہ ایک ایسی مقدار کا نام ہے جسے انسان بہ مشقت کرسکے اور دراصل یہ اس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے جو کسی چیز کو محیط ہو چنانچہ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کے مشہور لغت لسان العرب (ج۱۲ ص۱۰۳) میں ہے کہ

> طاقت، اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کیلئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار (ج۲ ص۱۵۵) میں لکھتے ہیں۔

> الطاقۃ دراصل مُکنت اور قُدرت کے ادنیٰ درجہ کا نام ہے چنانچہ عرب لوگ اطاق الشیٔ صرف اس وقت کہتے ہیں جبکہ اس کی قدرت انتہائی ضعیف ہو یعنی دشواری کے ساتھ اس کو برداشت کرسکے چنانچہ یطیقونہ سے مراد بوڑھے، ضعیف، اور اپاہج لوگ ہیں جنکی بیماریوں کے اچھا ہونے کی توقع نہ ہو اور وہ لوگ ہیں جو ان کے مثل ہوں مثلاً وہ کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھی ہے . . . . . اسی بنا پر امام راغب نے کہا ہے کہ طاقت اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا کسی انسان کیلئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے:

> طاقت کے معنی وہ کام ہیں جنھیں بہ تکلف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں

ہیں جن کیلئے روزہ نہ رکھکر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص۲۵۵ ج۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں "الوسع" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور "طاقت" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیر نظر کے) معنی یہ ہونگے کہ "اوران لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ (روح المعانی ص۵۹ ج۲)

آپ نے دیکھ لیا کہ "طاقت" کا عربی زبان میں کیا مفہوم ہے اور مودودی صاحب اس کا کیا ترجمہ کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مُلاّ کی یہ پرانی عادت ہے کہ یہ اول خود ہی غلط مفروضہ قائم کرتا ہے اور پھر اس غلط مفروضہ پر غلطیوں کا ایک انبار جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی کچھ اس آیت کے مفہوم کی تحریف میں مودودی صاحب نے کیا ہے کہ اول تو خود ہی آیت کا غلط ترجمہ کیا اور پھر خود ہی اعتراضات کے طومار جمع کرتے چلے گئے جن کے سامنے نہ (معاذاللہ) خدا کی کوئی حیثیت رہی نہ اس کی کتاب کی۔

جیسا کہ طلوع اسلام میں ہمیشہ لکھا جاتا ہے قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے چنانچہ "علی الذین یطیقونہ" میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں)۔ اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جاچکی ہیں اور ان پر اب بھی غور وخوض کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ القرطبی کی کتاب جامع احکام القرآن (ص۲۶۸ و ۲۶۹ ج۲) میں ہے کہ

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں ان کیلئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے اتنا کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو یہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس ابن السائبؓ اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمے فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہؒ) امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی اُمّ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا اپنے بچہ کو دودھ پلاتی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ تیرے ذمہ فدیہ ہے۔ قضاء نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہؒ نے اس فہرست میں اور بھی اضافہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"الذین یطیقونہ" سے یہاں مراد بوڑھے ضعیف لوگ ہیں اور وہ اپاہج لوگ ہیں جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو اور ایسے ہی ان کے مثل جو لوگ ہوں مثلاً مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش خدا نے ہمیشہ پر مشقت کاموں میں رکھدی ہے جیسے کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور ان ہی میں وہ مجرم بھی داخل ہیں جن کو قید خانوں میں مشکل کاموں کا حکم دیا جاتا ہو۔ اور ان پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ . . . .

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہونے کی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا

سبب بار بار مکرر ہوتا رہتا ہو جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کیلئے جائز ہے کہ وہ روزہ کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلادیں اتنا کھانا جو ایک درمیانی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار ج ۲ ص۱۵۵ و ص۱۵۷)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

(۱) بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت

(۲) حاملہ عورت

(۳) دودھ پلانے والی عورت

(۴) اپاہج

(۵) پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔

(۶) ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر کمزوری پیدا ہوئے ہوں۔

(۷) وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پر مشقت کاموں میں ہو۔

(۸) وہ مجرم جنہیں جیل خانوں میں مشقت کے کام کرنا پڑتے ہوں۔

آپ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے معاملہ میں کسقدر رعایت رکھی تھی لیکن مُلّا نے اس رعایت کو منسوخ کر کے کسقدر دشواریاں پیدا کر دی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے تھے روزے رکھ کر ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات ان کی جان تک لے لیتے ہیں اور اگر وہ روزہ چھوڑتے ہیں تو مُلّا ان کے پیچھے ڈنڈا لیکر اس بری طرح سے پھرتا ہے کہ ان پر زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ یہ ہے فرق خدا کی طرف سے عطا کردہ دین اور مُلّا کے خود ساختہ مذہب میں۔ دین تمام انسانی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر احکام صادر کرتا ہے اور مُلّا کا مذہب اندھے کی لاٹھی ہے۔

مُلّا کی خود ساختہ [illegible] یوں کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ رفتہ رفتہ مذہب ہی سے برگشتہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ ان کے سامنے خدا کا دیا ہوا [illegible] قرآن کی اصولی تعلیم اور اس کی روشنی میں عقل انسانی کی رو سے طے کردہ جزئیات) پیش کیا جائے تاکہ وہ علی وجہ البصیرت دیکھ سکیں کہ دین کی بندشیں ایسی نہیں جن سے اس طرح بھاگا جائے۔

طلوعِ اسلام ڈیرہ غازیخاں میں

مسٹر اللہ بخش خاں صاحب نیوز ایجنٹ۔ نزد اڈا پنجاب ٹرانسپورٹ سروس

ڈیرہ غازی خان سے خریدیں۔

ایک عام اعتراض

(نوجوانوں کے دل کی دھڑکن)

اس خط کو ملاحظہ فرمائیے!

محترمی ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام۔ کراچی۔ تسلیم! طلوع اسلام کافی عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کا طرز استدلال اور اجتہاد قابل داد ہے۔ اور آپ کی روشن دماغی مسلّم۔ قرآن فہمی میں آپ کو جو ملکہ حاصل ہے وہ شاید ہی کسی کو ہو۔ مگر آپ کی یہ ذہانت اور استدلال اسلام کے راستہ کی مشکلات کو رفع نہیں کر سکتا۔ چونکہ جو واقعات صدیوں سے صفحۂ تاریخ پر ثبت ہیں وہ طلوع اسلام کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتے۔ اور اگر آپ آج پونے چودہ سو سال کے بعد اُن واقعات کو نوچ نوچ کر اُن کے گھناؤنے پن کو دُور کرنا چاہیں تو میرا خیال ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہو گی۔

آپ ہر بار اسلامی نظام کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ کی طرح خوش عقیدہ اور لوگ نہیں ہو سکتے کیونکہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق بار بار یہ دُہرا رہا ہے کہ اسلامی نظام صرف ایک واہمہ ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ امرا اور حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں ایک ایسا سحر ہے جس سے وہ جس وقت چاہیں عوام کو سُلا سکتے ہیں اور اُن کی آنکھوں سے اس کا اثر زائل ہونے ہی نہیں دیتے۔ اس کے سوا اگر کوئی اور اسلامی نظام ہے تو ممکن ہے کہ وہ آپ کے یا اور کسی کے ذہن میں موجود ہو تو ہو مگر نہ تو آج تک تاریخ نے اس نظام کی کبھی جھلک دیکھی اور نہ ہی آئندہ وہ دیکھ سکے گی۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کی طرح یہ مفروضہ نظام کچھ عرصہ زندہ رہ کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اور خدا کی مشیت بھی یہی ہے کہ کوئی نظام پائیدار نہ ہو۔ کیونکہ انسان ارتقائی منازل طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مستقل نظام اس پر مسلط کر دیا گیا تو اس کا ارتقا رُک جائے گا۔ جو سراسر خلاف قانون قدرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نظام خواہ وہ انسان کا بنایا ہوا ہو یا اُسے خدا کا بنایا ہوا کہا جائے وہ روئے زمین پر کہیں بھی متواتر رائج نہیں رہ سکتا۔ اس میں تغیر و تبدل زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

آپ کے مبینہ نظام اسلام نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اس وقت جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رحلت فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ نے کیا کچھ کیا۔ خلیفہ اول کو کس نظام نے تلوار کی گھاٹ اتارا[۱]۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو کس نظام نے موت کی گھاٹ اتار دیا۔ حضرت عثمانؓ پر کیا بیتی۔ حضرت علیؓ کا حشر کیا ہوا۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کس قربانگاہ پر بھینٹ چڑھے۔ اس کا حشر کیا ہوا۔ اور اس کے بعد آج تک کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا وہ کونسا صفحہ، صفحہ نہیں سطر، بلکہ وہ کونسا لفظ ہے

---

[۱] خلیفہ اول کو کسی نے تلوار کی گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ طلوع اسلام

جو بے گناہوں کے خون سے نہ لکھا گیا ہو۔ خیر اس پر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام خلافت راشدہ تک ہی قائم رہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے اسلام بری الذمہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو کیوں قتل کیا گیا اور ان کے قاتل کو کیوں سزا نہ دی گئی اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے امیر معاویہ نے نیزوں پر قرآن لٹکا کر کیوں علیؓ کی فوج کو لڑنے سے روک دیا اور کہا کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ قرآن کو درمیان میں رکھکر بذریعہ ثالثی کیا جائے اور پھر ثالثی فیصلہ کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس جنگ میں دونوں اطراف سے صحابہؓ عشرہ مبشرہ موجود نہ تھے۔ وہ صحابہؓ موجود نہ تھے جنھوں نے رسول پاکؐ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ کیا وہ اسلامی نظام سے واقف نہ تھے۔ پھر کیوں خونریزی ہوئی اور وہ بھی اس وقت جبکہ حضور پاکؐ کو رحلت فرمائے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا اور ان کے فیض سے براہ راست مستفیض ہونے والے صحابہ کرام اسلامی نظام کو ہم اور آپ سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے۔ وہ دوبارہ اسلامی نظام کو کیوں نہ زندہ کر سکے۔ کیا خدائی نظام ایسا ہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں صرف چند سال اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا نظام ہزارہا سال تک چلتا رہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں سے تو اس کے بندے ہی زیادہ سمجھدار ہیں کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو اللہ میاں کے نظام کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوتا ہے اور زیادہ عرصہ چلتا ہے۔

محترم مدیر صاحب یاران سبکسار تو محل تک جا پہنچے ہیں اور آپ اپنی قوم کے دامن کو پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دور وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں۔

آپ کس نظام کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آجتک اس کی کوئی باقاعدہ تشکیل ہوئی۔ آئین اسلامی کی کوئی کتاب چھپی یا ویسے آئین کا مجموعہ تیار کیا گیا۔ جہانتک میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ آپ سے پوچھا جائے اسلامی آئین کیا چیز ہے۔ آپ قرآن کی ایک دو آیات پڑھ کر تفسیر کرنے لگیں گے۔ کسی حنفی سے پوچھا جائے وہ بخاری، مشکوٰۃ یا فقہ کی کتاب کا حوالہ دیدیگا۔ شیعہ سے دریافت کیا جائے تو وہ مجتہدین کے اقوال کے حوالے دینے لگے گا۔ اور باقی فرقوں کے لوگوں سے پوچھنے پر بھی اسی قسم کا جواب ملیگا مگر آجتک نہ ہی کسی فرقہ کے علمانے آئین کی کتاب مرتب کی ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر تمام فرقوں کے علمانے کوئی آئین بنا کر پیش کیا ہے۔ آئین کے مطابق جو استدلال کیا جاتا ہے وہ کسی ایک شخص کی رائے تو ہو سکتا ہے مگر اسے قرآن، حدیث یا فقہ کا منشا نہیں کہا جا سکتا۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارا آئین زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ لائنوں پر وضع کیا جائے تاکہ ہم دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ مادی ترقی کر سکیں اور اس عالم اسلام پر جو ذلت اور نحوست چھائی ہوئی ہے اس سے نجات دلا سکیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کا کوئی مبینہ اسلامی نظام قائم کر دیا گیا تو اس کا حشر معلوم۔ کیونکہ بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی صدیوں کی کشمکش کی تاریخ شاہد ہے۔ اور یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی جائے گی۔ یہ مرزائی ہے۔ اسے وزارت خارجہ سے الگ کر دو۔ اور مرزائیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دو۔ یہ شیعہ ہے اسے وزارت یا سفارت سے نکال دو۔ کیونکہ یہ کافر ہے صحابہؓ پر سب و شتم کرتا ہے۔ یہ وہابی ہے یہ فقہ کو نہیں مانتا اُسے بھی نکال دو۔ اور یہ اہل قرآن ہے اُسے بھی کراچی سے شہر بدر کر دو۔ کیونکہ یہ محدثین کی عرق ریزی کی جمع کی ہوئی احادیث کا منکر

اسلئے کافر ہے۔اور یہ . . . .

آپ کونسا اسلامی نظام قائم کریں گے۔ کیا آپ بقول شیعہ حضرات حق خلافت سادات کو تفویض فرمائیں گے۔ اگر نہیں تو شیعہ حضرات آپ سے کیسے تعاون کریں گے کیا آپ خلیفہ ثانی مرزا محمود احمد کو خلیفہ اول پاکستان تسلیم کریں گے۔ نہیں تو پھر مرزائی صاحبان کیوں ایسے نظام کو تسلیم کرینگے۔ اسی طرح دوسرا کونسا فرقہ ہوگا جو اسلامی آئین کی تشکیل میں آپ کا ساتھ دے

آپ میرا یہ طویل خط جس کیلئے میں معافی چاہتا ہوں۔ پڑھ کر مجھے گمراہ کہہ سکتے ہیں۔ کافر کہہ سکتے ہیں۔ کمیونسٹ یا اور جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ مگر خدارا حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔ قوم کو تباہی اور بربادی کے غار میں نہ دھکیلیں۔ بار بار اسلامی آئین کی رٹ نہ لگائیں یہ ایک واہمہ ہے، خوش اعتقادی ہے، ہٹ دھرمی اور ضد ہے جس کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی آئین بھیجا ہوتا تو یقیناً وہ اس کے نفاذ کے لئے حالات پیدا کردیتا اور اپنے ہمہ گیر آئین سے کبھی بھی اپنے بندوں کو محروم نہ کرتا۔ اس کا آئین یہی ہے جو چل رہا ہے اور زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا۔ اس میں حالات کے مطابق ترامیم و تنسیخ بھی ہوں گی۔ یا ایک آئین کو ختم کرکے دوسرا بہتر آئین نافذ کردیا جائے گا۔ یہی مشیت ربی اور سنت اللہ ہے جو ازل سے ابد تک چلی جائے گی۔

یہ عریضہ بے ربط سہی یا محض جذباتی ہی سہی مگر میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ آپ صحابہ عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ نہیں بن سکتے۔ اگر یہ بھی نہیں بن سکتے تو اسلامی آئین کیسے نافذ کریں گے جس نظام کو پہلے دو خلفا نے مضبوط کیا وہ عثمانؓ اور علیؓ کے دور خلافت میں کیوں روبہ انحطاط ہوگیا۔ آپ اس بارے میں غور فرمائیں کیا یہی مشیت الٰہی نہیں تھی کہ وہ نظام ختم ہوکر ایک اور نظام جنم لے اور پھر ایک اور، اور، اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔

میں پھر اس طویل خط کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ اسے مطالعہ کرکے جو بھی سخت سے سخت الفاظ میرے لئے استعمال کریں گے۔ انھیں میں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو بہت بڑی ٹھیس پہنچائی ہے۔ اور اگر اس ٹھیس سے کوئی آواز پیدا ہو۔ تو مجھے یہ برداشت کرنا پڑے گی۔

اچھا۔ زیادہ آداب

اس خط کو ہم نے اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ صرف مراسلہ نگار کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار نہیں بلکہ ترجمانی کر رہا ہے ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں کے عام خیالات کی جو اسلام کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو کر ذہنی انتشار کا باعث، اور انھیں اسلام کی طرف سے متنفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہمارے پاس اس قسم کے خطوط عام طور پر آتے رہتے ہیں ان کے علاوہ اکثر نوجوانوں کی طرف سے زبانی گفتگو میں بھی اسی قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ بنابریں اسے زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کا جواب انفرادی نہیں بلکہ عمومی حیثیت سے بذریعہ طلوع اسلام دیا جائے۔ اس خط میں بہت سی تلخیاں اور بہت کچھ غلطیاں بھی ہیں لیکن ہم ان جزئیات سے صرف نظر کرکے صرف اصولی جواب پر اکتفا کریں گے۔

مراسلہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام چند دنوں کے لئے قائم ہوا اس کے بعد ختم ہوگیا۔ اگر یہ نظام

مبنی بر صداقت تھا اور اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی تو یہ ہمیشہ کے لئے قائم کیوں نہ رہا۔ چونکہ یہ نظام نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی آج کہیں قائم ہے اسلئے اس نظام کے احیاء اور از سر نو قیام کی دعوت اور کوشش ایک مقدس آرزو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس خوش عقیدگی سے دامن چھڑا کر اسی قسم کا نظام قائم کر لینا چاہیئے جس قسم کے نظام دنیا کی اور قوموں میں قائم ہیں۔

معترضین کے نزدیک کسی اصول یا نظام کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس پر تمام انسان یا کم از کم انسانوں کا کوئی گروہ ہمیشہ کاربند رہے اور اسی طرح وہ اصول یا نظام مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ دلیل بڑی کمزور اور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب سے انسانی شعور بیدار ہوا ہے یہ حقیقت بطور مسلمہ تسلیم کی گئی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان نہیں جو اس اصول سے انکار کرتا ہو اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس اصول سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام انسانی تاریخ میں (سوائے جستہ جستہ لمحات کے) کوئی دور بھی ایسا نہیں آیا جس میں انسانوں نے کوئی ایسا نظام قائم کیا ہو جو خالص سچائی پر مبنی ہو۔ آپ گذشتہ تاریخ کو تو چھوڑیئے خود اپنے زمانے پر نگاہ ڈالئے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے لیکن (قریب قریب) ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا دلیل کو صحیح مانا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ چونکہ انسانوں نے ہمیشہ سچ نہیں بولا اور آج بھی کوئی نظام ایسا نہیں جو سچائی پر مبنی ہو اس لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا۔ چونکہ تمام انسان جھوٹ بولتے ہیں اس لئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ جھوٹ کو محکم اصول تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی کا نظام بنا لیا جائے۔ اللہ میاں نے یہ کہہ کر کہ جھوٹ بری چیز ہے ایک تجربہ کیا تھا جو (معاذ اللہ) ناکام ثابت ہوا اس کے مقابل میں انسانوں کا نظام جو جھوٹ پر مبنی ہے اچھا بھلا چلتا رہا ہے اس لئے یہی راہ صواب کی ہے۔

اسے بھی چھوڑیئے۔ روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ ہر ذیابیطس کا مریض اچھی طرح جانتا ہے کہ میٹھا کھانا اس کے لئے موجب ہلاکت ہے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے (کہ چند مستثنیات کے علاوہ) ہر مریض میٹھا کھا لیتا ہے اور پھر چیختا چلاتا ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے اور میٹھے سے سخت پرہیز بتاتا ہے۔ مریض تین چار دن تک اس پر عمل کرتا ہے اور پھر میٹھا کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کی مندرجہ بالا دلیل کی رو سے یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ عام مریض پرہیز شکن واقع ہوئے ہیں اور ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود میٹھے سے باز نہیں آتے اسلئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ میٹھا ذیابیطس کے مریضوں کیلئے مہلک ہے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ ذیابیطس کے مریض خوب میٹھا کھائیں۔

اب آیئے اس شبہ کی طرف جو اسلام کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے اور جس کا اظہار اوپر کے خط میں کیا گیا ہے اس شبہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کو ایک فرض کر لیتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے زندگی کے کچھ اصولوں کو اپنایا اور اس سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قوم قعر مذلت میں گر گئی اور اس میں وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ اصول اس قسم کے تھے کہ ان سے ہنگامی طور پر اچھے نتائج پیدا ہو سکتے تھے لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مستقل طور پر ان نتائج کو برآمد کرتے رہتے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک قوم نے ان اصولوں کو ضابطۂ زندگی بنایا اور

زندگی کی کامیابیاں حاصل کرلیں۔ اسوقت کے بعد اس قوم نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا اور ان نتائج سے محروم ہوگئی جو ان اصولوں پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ فرمائیے کہ اس میں ان اصولوں کا کوئی قصور ہے؟ آپ کہتے یہ ہیں کہ چونکہ اس قوم نے ان اصولوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ نہ رکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصول اس قابل تھے ہی نہیں کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیسکتے۔ لیکن یہ مفروضہ بالبداہت غلط ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ اصول زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے چل رہے ہیں یا دنیا انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس خاص قوم نے تو ان اصولوں کو چھوڑ دیا لیکن انسانیت بحیثیت مجموعی غیر شعوری طور پر انہی اصولوں کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے اس کا ثبوت ذیل کی تصریحات سے ملے گا۔

(۱) نزولِ قرآن کے وقت (یعنی چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بادشاہت (Monarchy) ایک ایسا مسلمہ نظامِ حکومت تھا جس کے غلط ہونے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور خود خداوند سمجھا جاتا تھا۔ ہر گردن اسکے حقوق خداوندی (Divine Rights) کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ ملوکیت وجہ فسادِ آدمیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ نہ ہی کوئی انسان پیدائشی طور پر یہ حکم لیکر دنیا میں آتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھا جائے۔ بڑائی کا معیار جوہر ذاتی ہے نہ کہ نسبی انتساب۔ انسانوں کے باہمی معاملات عدل اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پانے چاہئیں۔ ایک قوم نے اس اصول کو اختیار کیا اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے بہرہ یاب ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے اس اصول کو چھوڑ دیا لیکن ذرا یہ دیکھئے کہ اس تیرہ سو سال میں عام انسانیت کا قدم اس اصول کی طرف اٹھتا گیا ہے جو قرآن نے پیش کیا تھا یا اس اصول کی طرف جسے نزولِ قرآن سے پہلے ایک مسلمہ اصول مانا جاتا تھا۔

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت غیر شعوری طور پر اسی راستہ پر بڑھتی چلی آرہی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور اس راستہ کو چھوڑ چلی ہے (یا چھوڑتی جا رہی ہے) جسے انسانوں نے اس سے پہلے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ دنیا سے بادشاہتوں کے نام مٹ چکے ہیں اور شاہوں کے تاج آئے دن فضا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سمجھدار ہیں وہ از خود اس اصول کو اختیار کئے جا رہے ہیں جو از خود نہیں چھوڑتے ان سے زمانہ کے تقاضے مار مار کر تخت و تاج چھین رہے ہیں۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جو یہ کہے کہ ملوکیت صحیح نظامِ حکومت ہے۔

ہم اپنے بھائی سے پوچھتے یہ ہیں کہ کیا دنیا قرآن کے تجویز کردہ نظام کو قبول کر رہی ہے یا اس نظام کو جو اس سے پہلے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا دیا ہوا اصول صرف چند دنوں کے لئے چلا تھا یا تیرہ سو سال سے برابر آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔

(۲) نزولِ قرآن کے وقت ایک مسلمہ اصول یہ تھا کہ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ انھیں مذہبی پیشوا یا (Preists) کہا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ زلزلہ انگیز آواز بلند کی کہ خدا اور بندے کا تعلق (اس کے ہمہ گیر قانون کی رو سے) براہ راست ہے اور پیشوائیت مفاد پرست انسانوں کا خود ساختہ تصور ہے۔ ایک قوم نے اس اصول کو اپنایا اور ان کے تغلوب واذہان ان

زنجیروں سے آزاد ہو گئے جو پیشوائیت کی عقیدت مندیاں وضع کئے چلی آرہی تھیں اس کے بعد انھوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور پاپائیت کی لعنت پھر سے ان کے دل ودماغ پر مسلط ہو گئی۔ لیکن آپ دیکھئے کہ آج انسانیت کا رخ اس تصور کو مٹانے کی طرف ہے یا اسے مستحکم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج انسان پیشوائیت سے بیزار ہو چکا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

(۳) نزول قرآن سے پہلے دنیا کے انسان قبیلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے تھے اور نسل وجغرافیائی امتیازات انسان اور انسان کے درمیان حد فاصل بن رہے تھے۔ قرآن نے آکر ان تمام خود ساختہ حدود بندیوں کو مٹایا اور انسانوں کو اس اصل عظیم سے روشناس کرایا کہ تمام انسانوں کی پیدائش نفس واحدہ سے ہوئی ہے اسلئے تمام انسان بلاتمیز نسب ووطن ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ ایک خطۂ زمین میں اس اصول کو اپنایا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح مختلف نسلوں اور مختلف وطنوں کے انسان ایک امت بن گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ اصول فراموش کر دیا گیا اور وہ قوم پھر خود ساختہ گروہ بندیوں میں بٹ گئی۔ لیکن آپ سوچئے کہ آج انسانیت کا قدم ان گروہ بندیوں اور حدود سازیوں کو مستحکم کرنے کی طرف ہے یا ان کو مٹا کر ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج ہر اہل فکر اسی کوشش میں ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر لینے کا نظام قائم کیا جائے۔ کہئے کہ انسانیت اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو اپنا رہی ہے یا اس اصول کو جسے انسانوں نے خود وضع کیا۔

(۴) نزول قرآن سے پہلے سرمایہ داری اور مفاد پرستی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا۔ صاحب اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتے تھے اور اس طرح زیردست انسانوں کا خون چوستے تھے۔ قرآن نے یہ انقلاب آفریں اصول پیش کیا کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے جو نظام اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اسے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے اس اصول کو اپنایا اور وہ زمین اور آسمان کی برکتوں سے مالامال ہو گئی اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا اور پھر سرمایہ داری اور مفاد پرستی کے جذام میں مبتلا ہو گئی لیکن دیکھئے یہ کہ اس تیرہ سو برس میں عام انسانیت کا رخ سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی طرف رہا ہے یا اسے انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا جا رہا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ خود پاکستان میں زمین پر افراد کی ملکیت کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی زمینداروں کے گھروں سے ان کی زمینوں کی پیداوار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر برآمد کیا جاتا ہے اور اُسے نظام اجتماعی کی تحویل میں دیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرے جو زمیندار اپنے غلہ کی مقدار سے حکومت کو مطلع نہیں کرتا یا غلہ کی برآمدگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اس قسم کے زمیندار ہر شخص کی نگاہ میں سوسائٹی کے بدترین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف زمین پر ان کا حق ملکیت بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زمین کی پیداوار کو اپنی ملکیت میں رکھ سکیں حتیٰ کہ اب یہ بھی تجویز ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دیا جائے کہ زمینداروں کو اس کی اجازت نہ ہو کہ اپنی زمینوں میں جو کچھ جی میں آئے کاشت کریں انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زمین میں وہ کچھ کاشت کریں جس کی اہل ملک کو ضرورت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے

تقاضے کس طرح بار بار کر انسانی نظام کو قرآنی اصولوں کی طرف لا رہے ہیں۔ کہئے کہ انسان خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کو اختیار کر رہا ہے یا اپنے خود ساختہ نظام کو۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پیش نظر مقصد کے لئے اتنی مثالیں ہی کافی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ قرآنی اصول اپنی اندرونی قوت سے از خود انسانی معاشرہ کی بنیادیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کے اس طرح نافذ العمل ہونے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان انھیں مختلف تجربوں کے بعد اختیار کرتا ہے جس میں بہت زیادہ وقت بھی صرف ہوتا ہے اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں سے اس کی بہت سی قوتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان وحی پر ایمان لا کر ان اصولوں کو بلا تجربہ اختیار کر لے تو ان کے نتائج کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے اور ان میں زیادہ قوت بھی صرف نہیں ہوتی۔

اب مراسلہ نگار کے خط کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ اسلامی نظام کے اصولوں سے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کے اصولوں میں یہ قوت موجود تھی کہ وہ ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے لیکن یہ اصول جب انسانی ہاتھوں سے قائم ہوئے تھے تو انسانی ہاتھوں سے ہی آگے بڑھ سکتے تھے۔ اگر انسانی ہاتھوں نے انھیں آگے نہ بڑھایا بلکہ ان کو چھوڑ دیا تو یہ انسانی ہاتھوں کا نقص ہے نہ کہ قرآنی اصولوں کا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کیا گذری، بنو امیہ اور سادات میں کیا آویزش ہوئی۔ دمشق اور بغداد کے مناقشات نے کیا شکل اختیار کی، مسلمانوں کی جماعتیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئیں یہ تمام حصہ ایک قوم کی تاریخ سے متعلق ہے نہ کہ قرآنی اصولوں سے۔ اس کے متعلق قرآن کا صرف ایک فیصلہ ہے اور وہ یہ کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)

یہ ایک قوم تھی جو گذر چکی جو کچھ انھوں نے کیا اس کے نتائج ان کے لئے تھے اور جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لئے ہیں۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔

اسلئے آج ہمارے لئے اس بحث میں الجھنا ہی بیکار ہے کہ انھوں نے کیا کیا اور کیوں ایسا کیا۔ طلوع اسلام سے کبھی یہ "سعی لاحاصل" سرزد نہیں ہوئی کہ "آج پونے چودہ سو سال کے بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرے" وہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ جو چیز فی الحقیقت گھناؤنی نہ تھی لیکن جسے بعد کی سازشوں نے خواہ مخواہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا اسے اس گھناؤنے پردہ کو چاک کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ ولو کرہ المشرکون۔

اب رہا یہ سوال کہ ہماری یہ کوشش ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآنی نظام پھر سے قائم ہو جائے کیونکہ ہم "اصحاب عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے"۔ سو عرض یہ ہے کہ قرآنی نظام کسی "خاص عشرہ مبشرہ" کا محتاج نہیں۔ اسے ہر زمانہ میں قائم

کیا جاسکتا ہے اور جن انسانوں کے ہاتھوں سے اس کا قیام عمل میں آئے گا وہی بشر ہی بن جائیں گے۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں قائم نہ رہا تو ہم اُسے کس طرح قائم کرسکتے ہیں لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوگیا تھا تو وہی نظام آج بھی قائم ہوسکتا ہے۔ عمرؓ کو عمرؓ اس نظام کی برکتوں نے بنا دیا تھا نہ یہ کہ عمرؓ نے اس نظام میں وہ برکتیں پیدا کردی تھیں۔ وہ نظام اپنی تمام ممکنات کو لئے ہوئے آج بھی اسی طرح موجود ہے جو انسان چاہیں اس سے اسی قسم کی برکات حاصل کرکے وہی کچھ بن سکتے ہیں جو کچھ اس نے اس سے پہلے بنایا تھا۔ قرآن کے محفوظ رکھنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ نظام ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں نافذ العمل ہوسکتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے عام مسلمانوں کی توجہ اس وقت مبذول کرائی تھی جب رسول اللہ صلعم کی وفات سے ان کے ذہنوں میں اس خدشہ کے پیدا ہونے کا امکان نظر آتا تھا کہ اب یہ نظام آگے نہیں چل سکے گا۔ عین اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا تھا کہ یہ نظام کسی خاص شخصیت کے سہارے سے وابستہ نہیں۔ یہ زندہ خدا کا دیا ہوا زندہ نظام ہے۔ جو ان تمام انسانوں کے ہاتھوں سے قائم رہ سکتا ہے جو اسے قائم رکھنا چاہیں اور اس پر انھوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل - افإن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔

محمدؐ صرف ایک رسول تھے جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مرگئے یا قتل ہوگئے تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟

آپ لکھتے ہیں کہ اس نظام کو ختم کرنے سے اللہ کا منشا یہ تھا کہ ایک آئین کو ختم کرکے دوسرا بہتر آئین نافذ کردیا جائے گا۔ سو اول تو یہ دیکھئے کہ آپ خود اس کا رونا رو رہے ہیں کہ اسلام کا بہترین نظام ختم ہوا تو اس کے بعد اس قوم نے وہ نظام اختیار کرلیا جو تمام برائیوں کا منبع تھا اور اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی مشیت یہ تھی کہ اس نظام کو ختم کرکے اس سے بہتر نظام قائم کردیا جائے۔ ان دونوں چیزوں میں جو تضاد ہے وہ واضح ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظام ایک جامد (Rigid) نظام ہے جو انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا اسلئے ضرورت ہے کہ ایک نظام کو ختم کرکے اس کی جگہ دوسرا نظام دیا جائے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے چلتا رہے۔ ذرا یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ دنیا میں بعض اصول ایسے ہیں جو ابدی طور پر قائم رہتے ہیں مثلاً عدل کا اصول، دیانتداری کا اصول۔ آپ یقیناً اس سے متفق ہوں گے کہ یہ اصول ایسے نہیں ہیں کہ ایک نظام ان کے مطابق قائم کیا جائے اور کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے جو ظلم اور بددیانتی کے اصولوں پر استوار ہو۔ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے عدل اور دیانت کے اصول اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ اسی قسم کے اصولوں کو مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے کچھ اصول دیئے ہیں جو غیر متبدل ہیں اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں ظاہر ہے کہ وہ غیر متبدل اصول جن کی طرف اوپر اشارہ

کیا گیا ہے، ہمیشہ برقرار رہیں گے اور ان کی روشنی میں وضع کردہ نظام انسانیت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا جائے گا۔ اب آپ فرمائیے کہ اس قسم کے نظام میں آپ کو کونسی چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اور اسے آپ کس طرح سے ناقابل عمل تصور کرتے ہیں۔ کہ جو صرف ایک مرتبہ قائم ہوسکا اور اس کے بعد دوبارہ قائم نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں مُلّا کا پیش کردہ نظام شریعت ہوتا ہے جو یکسر قرآنی نظام کی نقیض ہے۔ یہ تمام اعتراضات جو آپ نے اسلامی نظام پر وارد کئے ہیں مُلا کے نظام شریعت پر وارد ہوتے ہیں جس کی تمام جزئیات ناقابل تغیر و تبدل قرار دی جاتی ہیں۔ آپ اس قرآنی نظام کو سامنے رکھئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پھر فرمائیے کہ آپ کے اعتراضات میں سے کونسا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام شیعہ سنی، وہابی۔ مرزائی۔ چکڑالوی میں سے کس کے مطابق ہوگا اور اس میں باقی فرقوں کو کیا کیا جائے گا۔ آپ کو غالباً اس کا علم نہیں کہ شیعہ سنی وغیرہ کے اختلافات ملا کی شریعت کے پیدا کردہ ہیں۔ قرآن میں جاکر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف ہماری خوش عقیدگی ہی نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے جسے ہم ہر وقت ثابت کرسکتے ہیں۔ قرآن پر مسلمانوں کے ہر فرقہ کا ایمان ہے اس لئے ہر مسلمان کے لئے قدر مشترک (Common factor) بن سکتا ہے۔ قرآن کے اصولوں میں بھی کسی کو اختلاف نہیں لہٰذا اس حد تک بھی تمام مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہوسکتے ہیں۔ اب رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گی تو اس کیلئے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عقل و فکر کی رو سے طے پائیں گی لہٰذا جو چیز باہمی مشاورت سے طے پا جائے اس میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب صرف یہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بنیادی نقطہ پر کس طرح لایا جائے کہ ان کا نظام قرآن کے اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پائے گا یہی وہ چیز ہے جس کے لئے طلوع اسلام کوشش کر رہا ہے۔ جو احباب اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں ان کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی اس کوشش میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔

آخر میں ہم اپنے بھائی سے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی وجہ سے ہم آپ کے خلاف کوئی سخت الفاظ استعمال کرنا نہیں چاہتے اس لئے کہ ان خیالات کے ذمہ دار آپ خود نہیں ہیں، ان کا ذمہ دار ہے اسلامی نظام کا وہ تصور جو ملا نے پیش کر رکھا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف اس قسم کے خیالات پیدا ہوں۔ نوجوان بیچارے معذور ہیں ایک طرف انہیں کالجوں میں ہیگل کا فلسفہ اور آئن سٹائن کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے مذہب کا وہ تصور پیش کیا جاتا ہے جس سے عقل ربا کرے اور علم شرمائے۔ اگر اس کے بعد ان کے دل میں مذہب کی طرف سے نفرت اور اس کے تصورات کی طرف سے سرکشی کے جذبات نہ پیدا ہوں تو اور کیا ہوگا۔ اس لئے ہمارا نوجوان طبقہ قابل نفرت نہیں مستحق ہمدردی ہے اور اسی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ہم ان سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ وہ ملا کے پیش کردہ مذہب کے بجائے قرآن کے دیئے ہوئے دین کے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس باب میں جتنی حقیر سی کوشش طلوع اسلام کرسکتا ہے وہ اس سے کبھی دریغ نہیں کرے گا کیونکہ اس کا حقیقی مخاطب طبقہ نوجوانوں ہی کا گروہ ہے۔

حقائق وعبر

(۱) نبوتِ جدیدہ

دین میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں حجت صرف سند کو حاصل ہے۔ حجت کے معنی ہیں ایسی دلیل جس سے آپ انکار نہ کر سکیں۔ اور سند سے مراد ہے قرآن کریم یعنی جب آپ یہ کہیں کہ فلاں معاملہ میں دین کا حکم یہ ہے تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ اس حکم کے لئے آپ کے پاس قرآن کی کونسی سند ہے۔ ایسی کسی سند کے بغیر کسی کا کوئی قول دین میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

قرآن سے نیچے اترے تو بعض لوگوں نے حدیث کو بھی اسی قسم کی سند تصور کر لیا چنانچہ ان لوگوں کا مسلک یہ قرار پایا کہ جب کوئی یہ کہے کہ اسلام میں فلاں معاملہ کے متعلق یہ حکم ہے تو اس سے قرآن کے بعد یہ بھی پوچھا جا سکے گا کہ اس کی سند میں تمہارے پاس کونسی حدیث ہے۔

اور آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے قرآن (یا قرآن وحدیث) کے اصولی احکام سے جزئی احکامات مستنبط کئے اور اس استنباط میں اپنے قیاس سے کام لیا اسے فقہ کہتے ہیں۔ لیکن جب اہل فقہ سے بھی پوچھا جائے تو انھیں بھی یہ بتانا ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی مسئلہ کے متعلق اس حکم کو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث پر قیاس کر کے مستنبط کیا ہے۔ یعنی سند سے یہ گروہ بھی بے نیاز نہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے ان فقہا کے فیصلوں کو دین میں سند تسلیم کر لیا چنانچہ جب ان سے پوچھا جائے کہ تم کس طرح کہتے ہو کہ فلاں بات میں اسلام کا فیصلہ یہ ہے تو وہ اپنے قول کی تائید میں کسی نہ کسی امام کا فیصلہ بطور سند کے پیش کریں گے۔ لیکن اس نقطۂ خیال کا بھی اگر تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کارفرما نظر آئے گا کہ ہمارا امام یا ہمارا مجتہد اپنی طرف سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے، وہ قرآن وحدیث ہی کو سامنے رکھکر کہتا ہے۔ چنانچہ آپ ہر فقیہ سے یہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے امام کے اس فیصلہ کی کیا سند ہے جس پر وہ فقیہ آپ کو قرآن یا حدیث سے اپنے امام کے اس فیصلہ کی سند پیش کر دے گا۔ چنانچہ فقہ کی کتابیں ان کے ان دلائل سے بھری پڑی ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے معاملہ میں چودہ سو سال سے آج تک سند ضروری رہی ہے۔ آپ کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے کہ دین میں فلاں چیز (حدیث۔ یا قیاس۔ یا کسی امام کا قول) سند ہو سکتا ہے یا نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دین میں سند کا ہونا لاینفک ہے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے سے یہ کہے کہ دین کا یہ حکم یوں اسلئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔

یہ ہے وہ اصل عظیم جس پر دین کی بنیاد قائم ہے یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا قول بطور دینی حکم کے منوائے۔ اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر دوسرے شخص سے یہ پوچھ لے کہ جس بات کو تم دین کا حکم کہتے ہو اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے؟

حتیٰ کہ ایک نبی اور رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سے یوں کہہ سکے کہ دین کا یہ حکم یوں اس لئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔ اس کو بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ دین کا یہ حکم اسلئے ہے کہ خدا کا ایسا ہی حکم ہے۔

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتٰب وبما کنتم تدرسون - (۳/۷۸)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسان کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ **لوگوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ** (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیئے کہ ربانی انسان (یعنی خلق اللہ کے مرشد و مربی) ہو۔ اسلئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔[1]

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے ہر حکم کے لئے رسول کو بھی خدا کی طرف اپنی سند بیان کرنی پڑتی ہے یعنی اسے بھی یہ کہنا پڑتا ہو کہ چونکہ خدا کا یہ حکم ہے اسلئے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔

البتہ نبی کا صرف ایک دعویٰ ایسا ہوتا ہے جہاں سند یا دلیل طلب نہیں کی جا سکتی اور یہ اس کا دعوائے نبوت ہوتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ کہ خدا نے اسے ایک ایسی چیز عطا کی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اس دعوے کے لئے درحقیقت رسول کا اپنا دعویٰ ہی سند ہوتا ہے یہی وجہ ہو کہ ہمیں رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول یہ کہے کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو کہ خدا نے واقعی یہ حکم دیا ہے یعنی رسول کا وہ حکم اُسے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے۔

بہرحال دین میں ایک مقام نبوت ہی ایسا مقام ہے جہاں سند کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ نکتہ یاد رہے کہ سند کا یہ مطالبہ صرف اس امر میں نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حکم اس کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے۔ اور بس۔

یہاں سے آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اگر کوئی شخص آج اس قسم کا ادعا کرتا ہے کہ اس کا حکم دین میں اسلئے واجب التعمیل ہے کہ وہ ایسا کہتا ہے تو در اصل وہ اپنے لئے مقام نبوت کا دعویدار ہے بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر کیونکہ اس ادعا کا حق تو ایک نبی کو بھی حاصل نہیں ہے بلکہ اسے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے اسلئے میں ایسا کہتا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ باب نبوت بند ہو گیا اس لئے اب رسول اللہ کے بعد کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ بلا سند کوئی بات دین کی حیثیت سے کسی سے منوا سکے۔ یہ ایک ایسی حقیقت کبریٰ ہے جس سے آج تک کسی کو اختلاف کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔

البتہ صوفیہ میں سے بعض حضرات نے ضرور یہ کہا ہے کہ مجھے فلاں فلاں بات کشف یا الہام کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے اور کشف یا الہام ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کی جا سکتی مگر سب کو معلوم ہے کہ آج تک کشف و الہام

---

[1] واضح رہے کہ یہ ترجمہ ہمارا نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمہ ہے۔

دین میں کسی نے بھی حجت قرار نہیں دیا حتیٰ کہ خود صاحب کشف اپنے کشف کو خود اپنے لئے بھی دینی حجت نہیں مانتا۔

بہر حال تیرہ سو برس سے امت میں یہ مسلک متفقہ طور پر چلا آرہا تھا یعنی یہ مسلمہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں اپنی بات کو بغیر سند کے منوا سکے یعنی وہ یہ کہے کہ جس بات کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جس بات کو میں غلط کہوں وہ غلط ہے۔ تیرہ سو سال کے بعد اس مسلمہ کو مرزا غلام احمد قادیانی نے توڑا۔ کس طرح توڑا؟ یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔ مرزا غلام احمد نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں قرآن اور حدیث کو نہیں مانتا بلکہ وہ اپنے ہر دعوے کے لئے کتاب وسنت اور قرآن وحدیث کے الفاظ دہراتا رہتا تھا۔ اس کی تمام تصانیف ان الفاظ سے بھری پڑی ہیں لیکن اس نے ایک ایسا چور دروازہ کھول لیا جس کی رو سے قرآن اور حدیث سند بننے کے بجائے خود مرزا صاحب کے فیصلوں کے تابع ہو جائے اس کے لئے صغریٰ اور کبریٰ کی ضرورت تھی۔ صغریٰ تو ملّا کے مذہب نے گھڑا گھڑایا اس کے لئے پہلے سے تیار رکھ چھوڑا تھا۔ یعنی وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو اور دوسرے غیر متلو۔ دونوں ہم پایہ ہیں اور دین میں دونوں کی حیثیت ایک ہے۔ لیکن چونکہ وحی غیر متلو (حدیث) قرآن کی تشریح کرتی ہے اس لئے اگر ان دونوں میں کہیں اختلاف نظر آئے تو حدیث کو راجح تسلیم کرنا ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ اس طرح قرآن کو ایک طرف بالائے طاق رکھا جا چکا تھا اور دین کی اصلی سند حدیث قرار پا گئی تھی۔ اس کے بعد مرزا صاحب کو صرف کبریٰ اپنی طرف سے لگانا تھا۔ اس کبریٰ کے بھی دو جزو تھے۔ پہلا جزو یہ تھا حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ کبریٰ کے اس جزو میں بھی ملا کا مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا کیونکہ اس کے ہاں خود اس موضوع پر بے شمار ذخیرہ کتابوں میں مدون موجود تھا فرق مختلفہ اور پھر مذاہب اربعہ کے اختلافات نے احادیث کی تصحیح و تغلیط کا پہلے ہی بازار گرم کر رکھا تھا۔ سنیوں کے نزدیک شیعوں کی حدیثیں غلط اور موضوع تھیں اور شیعوں کے ہاں سنیوں کی۔ یہی حال جبریہ قدریہ معتزلہ جہمیہ فرقوں کے ساتھ تھا پھر سنیوں میں بھی ایک حدیث حنفیوں کے ہاں صحیح تھی تو شافعیوں کے ہاں غلط تھی۔ دوسری حدیث مالکیوں کے ہاں صحیح تھی تو حنبلیوں کے ہاں ضعیف اور موضوع تھی۔ اسلئے ملا کا مذہب گیارہ سو سال سے جس اکھاڑے کو جمائے چلا آرہا تھا آج اس سے انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مرزا صاحب کو کبریٰ کا صرف ایک آخری جزو وضع کرنا پڑا۔ یعنی جب یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح حدیثیں کونسی ہیں اور غلط کونسی تو انھوں نے کہدیا کہ جس حدیث کو میں صحیح کہوں وہ حدیث صحیح ہے اور وہی دین میں سند ہے اور جسے میں غلط کہدوں وہ غلط ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن وحدیث پر کس طرح بجر بٹّو گھمایا گیا ہے اور اپنے فیصلوں کو دین کی سند بنا دیا گیا ہے جس کے لئے کسی دوسری سند کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کا نام درحقیقت نبوت تھا مگر احتیاطاً اسے ظلّی نبوت سے تعبیر کیا گیا اس فرق کے ساتھ کہ اصل کی حیثیت محض سائے کی رہ جائے اور سایہ ہی اصل قرار پا جائے۔ احادیث کا ذخیرہ ایک بے پناہ جنگل تھا جس میں سے ہر مسلک کے لئے چسپاں ہو جانے والی روایات چھانٹی جا سکتی تھیں چنانچہ مرزا صاحب نے ان ہی احادیث کی مدد سے اپنی ظلی اور بروزی نبوت کہیں مسیحیت موعودہ اور کہیں مجددیت ومہدویت کے مختلف ڈھونگ رچائے اور ملّا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ چلّایا بھی تو صرف یہ چلّایا کہ مرزا صاحب یہ حدیثیں تو موضوع ہیں۔ ضعیف ہیں۔ غلط ہیں۔ ان کے مقابلہ میں دوسری صحیح حدیثیں موجود ہیں جن سے ان تمام باتوں

کی تردید ہوتی ہے مگر مرزا صاحب نے کمال حقارت کے ساتھ للکار کر اس کا منہ بند کر دیا کہ

> جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پاکر رد کر دے (تحفۂ گولڑویہ ص۱۰)

یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کی سند خود مرزا صاحب کا وہ علم ہے جو انھوں نے خدا کی طرف سے پایا۔ لہٰذا ذخیرہ احادیث میں سے جو بقول قادیانیت

> حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کی پٹاری کی ہے۔ جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔ (الفضل قادیان بابت ۱۵ جولائی ۱۹۳۲ء)

مرزا صاحب نے جو چاہا نکال لیا اور صحیح قرار دیدیا۔ کون تھا جو ان کی زبان پکڑ سکتا تھا۔ حدیث کے پردہ میں مرزا صاحب نے اپنا سکہ چلا دیا اور مجددیت، مہدویت اور ظلی اور بروزی نبوت منوانے چلے گئے۔ یہ تھیں وہ سیڑھیاں جن سے مرزا صاحب نبوت کے بام بلند تک پہنچ گئے۔

آج بعینہ انہی سیڑھیوں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی مشق نبوت فرما رہے ہیں۔ مودودی صاحب نے بھی پہلے ہی کہا کہ وحی دو قسم کی ہے۔ ایک کا مجموعہ قرآن ہے اور دوسری کا مجموعہ حدیث۔ پھر یہ کہا کہ حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ صحیح حدیثیں وہ ہیں جنھیں مزاج شناس نبوت صحیح کہدے اور غلط وہ جنھیں وہ غلط ٹھہرا دے۔ اس طرح کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کی رٹ لگاتے ہوئے وہ اسی مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں قرآن اور حدیث خود ان کے فیصلوں کے تابع ہو جائے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:-

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین نبوت کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم ﷺ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو

لہ مرزا صاحب کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں نے رسول اللہ کی ایسی اطاعت کی ہے کہ اس سے میرے اندر ایسا علم پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر میں اسناد سے بے نیاز ہو کر خود معیار بن گیا ہوں، اور اسی کو ملکۂ نبوت کہتے ہیں۔ ۱۲

قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اسلئے کہ اس کی روح، روح محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد[1] ہوجاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل۔ غیر شاذ متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات حصہ اول صفحہ ۳۲۳، ۳۲۴)

آپ مرزا صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس اور مودودی صاحب کی ان تصریحات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے اور سوچئے کہ مودودی صاحب کا یہ مسلک کسی طرح بھی مرزا صاحب کے اس مسلک سے مختلف ہے؟ "مزاج شناسیٔ نبوت" اور "بصیرت نبوی" ایسی چیزیں ہیں جن پر کوئی دلیل یا سند نہ پیش کی جا سکتی ہے نہ مانگی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کسی ایک کا اتنا کہدینا ہی کافی ہے کہ میری مزاج شناسیٔ نبوت یا بصیرت نبوی کا یہی فیصلہ ہے۔ اور اس کا یہ فیصلہ بیک جنبش ابرو "دین" بن سکتا ہے۔ "بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا"۔ یہ وہ مقام ہے جو صرف ایک نبی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بات کو بحیثیت دین کے بغیر کسی سند و دلیل کے منوا سکتا ہے۔ چودہ سو سال سے امت میں آجتک کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ امت میں بڑے بڑے اولوالعزم خلیفہ۔ بادشاہ۔ امام۔ فقیہ۔ اولیاء اللہ ہو چکے ہیں مگر مرزا صاحب اور مودودی صاحب سے پہلے کسی نے اپنے لئے یہ پوزیشن حاصل کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ان دونوں میں فرق اتنا ہی ہے کہ اول الذکر اپنی اس پوزیشن کو ظلی اور بروزی نبوت سے تعبیر کرتا ہے اور ثانی الذکر "مزاج شناسیٔ نبوت" یا "بصیرت نبوی" بلکہ "اپنی روح کو روح محمدی میں گم" ہوجانے اور "اپنی نظر کو بصیرت نبوی کے ساتھ متحد" ہوجانے سے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض تعبیرات کا فرق ہے۔ اس تعبیری فرق سے حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔ اس تفصیل کے بعد ہم ناظرین سے پوچھتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان دونوں مدعیوں میں کیا فرق ہے۔ کیا دونوں کا مطمح نظر اور منزل مقصود ایک ہی نہیں ہے؟

طلوع اسلام بار بار متنبہ کرتا رہا ہے اور اب پھر ملت کو متنبہ کرتا ہے کہ خدا کے لئے ان چور دروازوں کو بند کرو۔ دین کی بنیاد صحیح قرآن اور فقط قرآن ہے جو ابدالآباد تک کے لئے واجب العمل ہے۔ روایات اس عہد مبارک کی تاریخ ہیں کہ رسول اللہ صلعم والذین معہ نے اپنے عہد میں قرآنی اصول کو کس طرح متشکل فرمایا تھا۔ یہ اس عہد مبارک کی شریعت ہے۔ قرآنی اصول کی روشنی میں کسی فرد واحد کو جزئیات مستنبط کرکے اپنے عہد کے لئے شریعت بنا دینے کا حق نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اتباع محمدی (بقول مرزا) یا کتنا ہی مزاج شناسیٔ رسول (بقول مودودی) کا دعویدار کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ حق صرف صحیح قرآنی خطوط پر قائم شدہ مرکز ملت اور اس کی مجلس شوریٰ کا ہے کہ وہ قرآنی اصول کی روشنی میں صرف ان جزئیات کو مرتب و مدون کرسکے جن کی قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی۔ پھر یہ جزئیات

---

[1] مرزا صاحب نے اسی کا نام ظلی اور بروزی نبوت رکھا ہے۔ ۱۲

ہر زمانہ میں ضرورت پڑنے پر تبدیل کی جاسکتی ہیں۔ یہی اپنے زمانہ کے لئے شریعت ہیں۔

مرزا صاحب کی نبوت نے جو فتنہ برپا کیا تھا اس وقت اس کے خلاف ملت کی طرف سے بڑی سختی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ جتنے عرصہ میں وہ اس پرانی نبوت کے فتنہ کا استیصال کریں گے اس وقت تک پنجاب کی یہ نئی نبوت اپنے شباب تک پہنچ چکی ہوگی۔ مسلمانوں نے نہ اس پرانی نبوت کے خلاف بروقت آواز اٹھائی اور نہ وہ اب اس نئی نبوت کا کچھ احساس کر رہے ہیں۔ پرانی نبوت کا مدعی بھی شروع میں شریعت محمدی کے احیاء کا مدعی تھا اور مسلمان اسی دھوکہ میں اس کے اصلی عندیہ سے بے خبر رہے۔ یہ نئی نبوت بھی نظام شریعت کے قیام کی آڑ میں مضبوط ہوتی چلی جارہی ہے اور ملّت کو اس کا اس وقت احساس ہوگا جب یہ پوری طرح اپنی جڑیں پکڑ چکے گی۔ یہ نبوت اس پہلی نبوت سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی اس لئے کہ اس نبوت نے اپنی نشر و اشاعت محض نجی طور پہ کی تھی لیکن یہ نبوتِ جدیدہ حکومت کا اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ سوچئے کہ اگر زمام اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آجائے جو یہ کہے کہ صحیح وہ ہے جسے میری نگاہ صحیح کہدے اور غلط وہ جسے میں غلط قرار دیدوں تو کیا اس کے بعد یہاں قرآن اور حدیث کی کوئی حقیقت بھی باقی رہ جائیگی؟

چھوڑیئے طلوع اسلام کو کہ وہ تو ان لوگوں کے نزدیک منکر حدیث ہے مگر ہم پوچھتے ہیں حامیانِ حدیث سے کہ کیا اس نظریہ کے بعد ان کی حدیث کی بھی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ طلوع اسلام تو اتنا ہی کہتا ہے کہ صحیح اور غلط کا معیار قرآن ہے صحیح وہ ہے جسے قرآن صحیح کہدے اور غلط وہ جو اس کے ہاں سے غلط قرار پا جائے اُسے تو آپ منکر حدیث کہتے ہیں لیکن اس کے برعکس ایک شخص یہ کہتا ہے کہ تمہارے اپنے معیاروں کے مطابق صحیح قرار دیئے ہوئے احادیث کے مجموعے صحیح نہیں قرار دیئے جاسکتے جب تک ان کی صحت کے متعلق میری بارگاہ سے فتویٰ نہ صادر ہو جائے۔ ان ذخیروں میں سے جس کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جسے میں غلط قرار دیدوں وہ غلط ہے تو اس شخص کو آپ سب سے بڑا حامئ حدیث اور محی السنۃ قرار دے رہے ہیں۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق

لہٰذا ختم نبوت کے محافظین اور حامیانِ حدیث دونوں کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ یہ نیا فتنہ انھیں کہاں تک پہنچائے گا۔ نیز وہ لوگ جو پاکستان میں نظام شریعت کے قیام کے متمنی ہیں سوچیں کہ نظام شریعت کے قیام کی آڑ میں یہاں کس قسم کی مستبد ڈکٹیٹرشپ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ ڈکٹیٹرشپ جس میں ڈکٹیٹر کا فیصلہ ایک انسانی حکم نہیں ہوگا بلکہ خدا اور رسول کا حکم قرار دیا جائیگا اور جس سے سرتابی دنیا میں پھانسی کے تختے اور آخرت میں نار جہنم کی مستوجب ہوگی!

۲۔ وہی مرچی وہی عنبری

قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ اپنی قوم سے کہتے کہ جو کچھ ان کے خدا نے ان کی طرف نازل کیا ہے اسے ضابطۂ زندگی بنائیں تو وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہمارے نزدیک صحیح مسلک وہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے ہم اسے چھوڑ کر تمہاری بات ماننے کیلئے تیار نہیں۔ وہ لوگ رسول کو تو یہ جواب دیتے اور دوسرے لوگوں کو رسول کی بات نہ سننے کے لئے کہتے کہ اس کے پاس نہ جانا یہ تو رجل مسحور (یعنی مخبوط الحواس) ہے۔ قرآن نے ان کی اس

روش کا بار بار ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ غور کرو کہ کسی مسلک کے سچے یا جھوٹے ہونے کی یہی دلیل ہو سکتی ہے جو وہ لوگ پیش کیا کرتے۔ قرآن نے حضرت نوحؑ سے یہی کہا اور رسول اللہ صلعم تک تمام اقوام سابقہ کی مذکورہ صدر روش کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت سے لیکر آج تک بھی وہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے جو اس سے پہلے ہوتا تھا۔ آج بھی جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن میں یہ حکم دیا ہے تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ کیا جو کچھ تیرہ سو برس سے ہوتا چلا آیا ہے وہ سب غلط ہے؟ اور دوسروں سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کی طرف بلانے والے سب مخبوط الحواس ہیں۔ طلوع اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو سکتا اس کے جواب میں منکرین قرآن کی طرف سے جو جواب شائع ہوا وہ ملاحظہ فرمائیے:

> میں نے پوتے کی وراثت کے معاملہ میں تمام دلائل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ صرف اختصار کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ اس مسئلے میں جذبات کی بنا پر فیصلہ کرنے کے بجائے اگر معقول اصولوں کی بنا پر غور کیا جائے تو جو کچھ فقہا نے بالاجماع رائے قائم کی ہے وہی سراسر معقول معلوم ہوتی ہے۔ میرے بیان کردہ دلائل پر مزید بہت سے دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ جو بات اس معاملہ میں سب سے زیادہ وزنی ہے وہ یہ ہے کہ سلف سے لیکر خلف تک تمام امت کے اہل علم اس پر متفق رہے ہیں۔ ایسے متفق علیہ مسائل کا متفق علیہ ہونا ہی بجائے خود اپنے اندر اتنا وزن رکھتا ہے کہ کوئی معقول آدمی ان سے اختلاف کی اسوقت تک جرأت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے پاس دلائل کی کوئی بڑی غیر معمولی طاقت نہ ہو۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اختلاف کی جرأت کی ہے ایک طرف تو ان کے دلائل ایسے قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر امت کے ایک متفق علیہ مسئلے میں تغیر کیا جا سکے اور دوسری طرف وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اپج کی بات نکالا کرتے ہیں ان کی بات اگر مانی جائے تو ہمیں گویا یہ ماننا پڑیگا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لیکر آج تک ساری امت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے۔ اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟
>
> (سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۵۲ء)

دیکھئے اس جواب میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ قرآن کی رو سے فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط۔ کہا وہی گیا ہے جو اس سے پیشتر کہا جاتا رہا ہے یعنی یہ کہ صحیح وہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد کے وقت سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور وحی خداوندی کی طرف بلانے والے مخبوط الحواس ہیں۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

---

(۳) مذہبی جنون | مرحوم لیاقت علی خاں کی واردات قتل کے سلسلہ میں جو تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا تھا اس نے اپنی رپورٹ میں ایک ایسی بات لکھی ہے جو گہرے غور اور فکر کی محتاج ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سید اکبر نے وزیرِاعظم کو شاید اسلئے قتل کر دیا ہو کہ مقتول قاتل کے معیار کے مطابق پکا مسلمان نہ ہو۔ اگر اس میں کوئی شائبۂ صداقت ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کی مقتضی ہے کہ ہم رُک جائیں اور سوچیں اور دلوں کی گہرائیوں تک دیکھیں اسلئے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طبقہ سے سید اکبر متعلق تھا ان کے نزدیک مذہبی تصور ہر وقت اس امر کا محرک ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو اس لئے قتل کر دے کہ اس کے مذہبی تصورات دوسرے شخص سے مختلف ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس قسم کے عقیدہ میں یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی غلطی موجود ہے ورنہ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ اس ملک میں جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایک اسلامی مملکت ہے کسی مخلص مسلمان کے لئے کسی دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانا اسی طرح ممکن ہے جس طرح کسی باؤلے کتے یا سانپ سے ڈسا جانا۔ اس قسم کے عقیدہ کا امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مذہب اسلام کو جس پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے نہایت غلط طور پر سمجھا جا رہا ہے اور نگاہیں اصل اور بنیاد پر نہیں بلکہ ظواہر اور جزئیات پر ہیں۔ اگر یہ عقیدہ کہ ایک شخص جو مذہب کے ظواہر کا پابند ہے اسے حق پہنچتا ہے کہ ہر اس شخص کو جو اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا قتل کر دے اور یہ سمجھے کہ اس سے اس نے ایک بہت بڑا فریضۂ خداوندی ادا کیا ہے جس کا اسے ثواب ملیگا تو اس سے مملکت اور معاشرہ دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ (ڈان۔ ۱۰ اگست ۱۹۵۲ء)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ کمیشن نے جس انسانیت کُش اور ہلاکت انگیز غلط مذہبیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہر اس شخص کے لئے اپنے اندر دعوت غور و فکر رکھتی ہے جس کے دل میں انسانی زندگی کا تھوڑا سا بھی احترام ہے۔ اگر انسان محض اختلاف عقیدہ کی بنا پر قتل ہونے لگ جائیں تو وہ سوسائٹی یا سلطنت درندوں کا بھٹ بن جائیگی لیکن اس بدبختی کا کیا علاج ہے کہ ہمارے عجمی اسلام میں جس کی علمبردار ہمارے ملاؤں کی جماعت ہے یہ عقیدہ موجود ہے کہ مرتد واجب القتل ہے اور مرتد سے مفہوم صرف وہی شخص نہیں جو ترک اسلام کا اعلان کر کے کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے بلکہ ہر وہ مسلمان مرتد ہے جس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ انگریزوں کے عہد میں مُلّا کے پاس قوت نہیں تھی ورنہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی مسلمان باقی رہ جاتا اس لئے کہ یہاں کوئی فرقہ اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے خلاف دوسرے فرقے یا جماعت نے کفر کے فتوے نہ لگائے ہوں۔ آپ اصول اور فروع اور روح اور ظواہر پرستی میں امتیاز کر رہے ہیں اور مُلّا کے نزدیک کیفیت یہ ہے کہ "یارسول اللہ" کہہ دینے والا بھی (ایک فرقہ کے نزدیک) کافر ہو جاتا ہے۔ جہاں اس قسم کی جزئیات پر کفر کے فتوے لگ سکتے ہوں وہاں کس شخص کی زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس باب میں قدیم اور جدید کا کوئی فرق نہیں۔ مرتد کو قتل کر دینے کے بارہ میں ماڈرن مُلّا بھی ایسا ہی سخت ہے جیسا پُرانا مُلّا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حال ہی میں امیر جماعت اسلامی کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں لکھا گیا تھا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ طلوع اسلام میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ عقیدہ مُلّا کے وضع کردہ اسلام کا ہے اور یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ لہذا جس ہلاکت انگیز رجحان کی طرف کمیشن نے توجہ دلائی ہے اس کا سرچشمہ مُلّا کا اسلام ہے جسے وہ فاشزم کے انداز کے پروپیگنڈا کے زور پر پاکستان میں بطور قانونِ مملکت نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اسلام اپنے حقیقی خدوخال میں قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ قرآنی نظام کو نافذ کر دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اس قسم کی جنون انگیزیوں کا کس طرح سدباب کر دیتا ہے۔

باب المراسلات

جمع القرآن

میرپورخاص سے بشیر احمد صاحب سوی جالندھری رقمطراز ہیں:

رسالہ طلوعِ اسلام کے اگست و ستمبر ۱۹۵۲ء کے خصوصی مقالہ "جمع قرآن" میں حضرت علامہ تمنا عمادی مدظلہ نے ایک ایسا خیال قرآن مجید کے نزول کے متعلق ارشاد فرمایا ہے جس کی تائید قرآن و حدیث سے نہیں ہوتی۔ حضرت موصوف فرماتے ہیں کہ وہ حرا پر پہلے پہل شب قدر ماہِ رمضان میں پورے قرآن کا کتابی صورت میں آپ کے سامنے نزول ہوا (صفحہ ۸۸) اس قول کی تشریح حاشیہ میں اس طرح فرمائی ہے:-

> مطلب یہ ہے کہ کذٰلک انزلنا یعنی ہم نے اسی طرح جیسا کہ تم (کفار) کہتے ہو جملۃً واحدۃً ہی اس کو نازل کیا ہے، تاکہ اس کو تمہارے دل میں ثابت و جاگزیں کر دیں۔ یعنی پوری کتاب آپ کو حفظ ہو جائے مگر پھر ترتیل کا طریقہ ٹھہر ٹھہر کر اتارنے کا اختیار کیا وہ اس لئے کہ تمہیں "تثبیتِ قلب تو حاصل ہو گئی یعنی اس کو ہم نے تمہارے دل میں ثابت و محفوظ تو کر دیا۔ مگر تمہیں مسائل کے جواب کی تلاش میں زحمت نہ ہو ہر مسئلہ کے موقع پر اس کے مناسب آیت کے نزول سے تمہیں غور و خوض اور آیات کی جستجو نہ کرنی پڑے۔ غرض رسول اللہ صلعم کے ذاتی علم کیلئے ایک بار مکمل نزول شروع شروع ہوا اور ہر سال ایک بار ہو جایا کرتا تھا اور وفات کے سال دو بار ہوا مگر تعلیم و تبلیغ کیلئے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت نزول ہوتا رہا۔ (حاشیہ صفحہ ۸۸ - ۸۹)

اس تشریح کے مطابق حضرت علامہ موصوف کے نزدیک مکمل قرآن کا نزول دو دفعہ ہوا۔ ایک دفعہ بعثت کے ساتھ ہی عرضِ جبرئیلی کے موقع پر اور پھر اس کے بعد پورے قرآن کا اعادہ ہر سال ہو جاتا تھا۔ دوسری دفعہ نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت بغرض تبلیغ و تعلیم ہوا، جو ۲۳ سال میں مکمل ہوا۔

حضرت موصوف کا یہ خیال نیا معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین و محدثین صرف اس قدر کہتے ہیں کہ شب قدر میں ایک دفعہ سارا قرآن لوحِ محفوظ سے اول آسمان (یا آسمانِ دنیا) پر نازل ہوا پھر حسب موقع مناسب حصہ حضرت جبرئیل آنحضرت صلعم کے پاس لاتے رہے۔ یہاں تک کہ قرآن کا نزول مکمل ہو گیا۔ مگر حضرت علامہ کے عقیدہ کی رو سے یہ ماننا پڑیگا کہ آنے والے ۲۳ سال کے واقعات جو قرآن میں مذکور ہیں ان کا علم تفصیلی قبل از وقت آنحضرت صلعم کو بعثت کے ساتھ ہی دیدیا گیا تھا اور حضرت نبی اکرمؐ کی حیثیت ان واقعات کے وقوع کے وقت بالکل منفعلانہ تھی۔ چند مثالیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) آنحضرتؐ کا ایک حرم محترم کے کہنے پر حلال چیز کا حرام کر لینا اور اللہ تعالیٰ کی اس فعل پر تنبیہ۔ یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک (تحریم) قبل از وقت حفظ قرآن نے کیا فائدہ دیا؟

(۲) حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا معاملہ۔ واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس (احزاب) کیا آپؐ کا حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکنا (معاذ اللہ) ریاکارانہ تھا جبکہ آپ کو نتیجہ پہلے ہی معلوم تھا۔

(۳) عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ وما یدریک لعلہ یزکّیٰ (عبس)

(۴) عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکٰذبین (توبہ) ایک شخص کو ایک واقعہ کا علم ہو اور وہ جان بوجھ کر انجان بنے یا لغزش کھائے تو یہ صورت اس کے سیرت کی بلندی کو ظاہر نہیں کرتی۔

(۵) قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ واللہ یسمع تحاورکما ان اللہ سمیع بصیر۔ الذین یظٰھرون منکم من نسائھم ما ھن امھٰتھم الخ (مجادلہ) اس سے لازم آتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قبل از وقت قرآن کا علم رکھنے کے باوجود ظہار کے معاملہ میں عرب کے جاہلانہ رواج کے مطابق فتوٰی دیا۔ (نعوذ باللہ)

کفار کے قول "سارا قرآن کیوں نہ ایک بار اتارا" کے جواب میں کذٰلک کا کلمہ ان کے قول کو صحیح قرار دیتا ہے یعنی "بات یونہی ہے تمہاری توقعات کے خلاف سارا قرآن ایک بار نہیں اتارا گیا۔ ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کر دی گئی لنثبت بہ فوادک ورتلنٰہ ترتیلا (فرقان)

حضرت علامہ نے جمع قرآن عہد نبوی میں نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اگر ان کی متذکرہ صدر دلیل نظر انداز بھی کر دی جائے تو باقی دلائل کی قوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ واللہ اعلم بالصواب

نوٹ:- ہم محترم بشیر احمد صاحب سے متفق ہیں کہ یہ خیال درست نہیں کہ قرآن پہلے پورا کا پورا ایک مرتبہ رسول اللہ کو دیدیا گیا تھا اور پھر وہی قرآن نجماً نجماً ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوتا رہا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے لئے کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک خدا۔ جبریلؑ وحی اور قلب محمدیؐ کا صحیح صحیح تصور سامنے نہ آئے اس قسم کی گفتگو مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔ محترم پرویز صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ جب وہ معارف القرآن میں "قرآن" کے متعلق لکھیں گے تو ان عنوانات پر گفتگو کریں گے۔

علامہ تمنا صاحب کا خاص موضوع تنقید روایات اور اسماء رجال ہے اور اسی نہج سے ان کا مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ مضمون کے باقی حصوں میں کئی ایک گوشے ایسے ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

(طلوع اسلام)

نقد و نظر

(۱) اسلام کی بنیادی حقیقتیں

جیسا کہ طلوعِ اسلام میں کئی بار لکھا جا چکا ہے اس وقت ہماری تہی دامنی (بلکہ یوں کہئے کہ ذہنی انتشار اور فکری پراگندگی) کا یہ عالم ہے کہ تمام عالمِ اسلامی میں کسی زبان میں کوئی کتاب ایسی نہیں (ہمارا مطلب انسانی تصنیف سے ہے) جسے ہم یہ کہہ کر کسی کے سامنے پیش کر سکیں کہ اسلام وہ ہے جو اس میں لکھا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ کسی ایسی کتاب کی کس قدر ضرورت ہے جو یہ بتا سکے کہ اسلام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسی کتاب سننے میں آتی ہے جس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ اسلام کو پیش کرتی ہے تو ہم والہانہ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ لاہور میں ایک ادارہ ہے (INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE) یعنی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ اس کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "اسلام کی بنیادی حقیقتیں"۔ اس سے پہلے اسی ادارہ کی طرف سے (خود ادارہ کے ڈائرکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی) ایک کتاب ...... "ISLAMIC IDEOLOGIES" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ جس پر طلوعِ اسلام میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ وہ کتاب ایسی مایوس کن تھی کہ اس کے بعد اس ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کوئی کتاب بھی ہمارے لئے وجہِ جاذبیت نہیں ہو سکتی تھی لیکن چونکہ زیرِ نظر کتاب ادارہ کے چار ارکان کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھی اسلئے اسے دیکھ لینا ضروری سمجھا گیا۔ اور ہمیں افسوس سے کہنا پڑا کہ اس نے ہماری مایوسی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ کتاب کا عنوان ہے "اسلام کی بنیادی حقیقتیں" لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ بنیادی حقیقتیں تو ایک طرف، ان ہر چہار ارکان میں سے کسی کی ایک بات دوسرے سے نہیں ملتی۔ ان میں سے ایک صاحب نے کسی گرجا کی عمارت پر لکھا دیکھا کہ (GOD IS LOVE) "خدا محبت ہے" تو انھوں نے اپنی تحقیق کا نتیجہ ان الفاظ میں ثبت فرما دیا کہ

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء کی تعلیم کا ماحصل یا روح یا نچوڑ کیا تھا۔ تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ

محبت

اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ (ص۷)

ایک دوسرے محقق (ALLAN GRANT) کی کتاب (EVOLUTION OF THE IDEA OF GOD)

"خدا کے تصور کے ارتقائی مدارج" سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے تحریر فرما دیا مذہب بھی ابتداءً کائنات کے ناقص تصورات اور توجیہ اور تعلیل کے غیر حکیمانہ طریقوں سے شروع ہوا ...... پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی ...... یہاں تک کہ جب انسانیت سنِ رشد کو پہنچی تو اس کا مذہب بھی ایک ترقی یافتہ نظامِ فکر کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس طرح انسانی شخصیت کے کمال پر اس واقعہ سے کوئی حرف نہیں آسکتا کہ اس کی ابتداء ایک قطرۂ خون سے ہوئی اور اسے شعور کی ادنیٰ ترین منزلوں سے گذرنا پڑا اسی طرح مذہب

کی صداقت پر اس امر سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ اس کا آغاز نہایت خام اور ناقص تصورات سے ہوا تھا۔

غور فرمایا آپ نے کہ محقق صاحب نے اسلام کی کس قدر بنیادی حقیقت کا کھوج نکالا ہے لیکن ان کے تیسرے ساتھی اپنے حصۂ مضمون میں فرماتے ہیں کہ

> قرآن کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آفرینش سے دین اصل میں ایک ہی ہے اور کل انبیاء اور رسل کا یہی دین رہا ہے۔ لوگوں نے کچھ تو جہالت سے کچھ باہمی بغض وحسد سے باتباع نفس اس میں شاخسانے نکالے۔

پوری کتاب پر تبصرہ ہمارے بس کی بات نہیں اس لئے کہ اونٹ کی طرح اس کی کوئی کَل سیدھی نظر نہیں آتی۔ بنابریں ادارہ کے رکن اعلیٰ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے مقالہ بعنوان "اساس اسلام" کے چند نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں

> مسلمان جس چیز کو ازلی اور ابدی اسلام سمجھے ہوئے ہیں اس میں کئی قسم کی چیزوں کی آمیزش ہے۔ اس میں اسلام کے ازلی اصول بھی ہیں اور تغیر پذیر فروع بھی۔ قرآن کریم میں بھی کچھ وسیع اور بنیادی اصول ہیں جو ازلی اور ابدی دین ہے اور کچھ وقتی اور جزئی احکام ہیں۔

لیجئے خلیفہ صاحب کی تحقیق کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے ایک حصہ سے تو چھٹی پائی جو ان کے نزدیک وقتی احکام پر مشتمل ہے۔ اس کی تفسیر میں خلیفہ صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

> اسلام اسی حالت میں ایک زندۂ جاوید اور عالمگیر مذہب رہ سکتا ہے کہ اس میں اصول کو اوامر سے الگ کر کے دیکھا جائے۔

یعنی ان کے نزدیک قرآن کے اصول تو زندۂ جاوید اور عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے اوامر (احکام) وقتی تھے جو مدت ہوئی ساقط العمل ہو چکے ہیں اور اب محض تبرکاً قرآن میں موجود ہیں۔

اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ اصول کون سے ہیں جو ازلی اور ابدی دین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سو اس کی تشریح بھی سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

> حال ہی میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے؟ اور اس نظریۂ حیات پر کس طرح ایک ترقی پسند اور مہذب و متمول مملکت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے کہا کہ میں موحد ہوں اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں۔ مغرب کی مادیت و دہریت اور مادی اشتراکیت سے بیزار ہوں۔ میں نے اس کو اسلام کا نقطۂ نظر علم و عمل اور جماعت و مملکت کے بارہ میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو سن کر اس نے کہا کہ ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کے اصول وہی ہیں جن کی رو سے یورپ کے ایک عیسائی اور مسلمان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا تو پھر ان اصولوں کی تحقیقات کے لئے ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ضرورت کیا ہے۔ یورپ کے عیسائی، عیسائیت کے اصولوں کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور وہ اپنا لٹریچر ہر جگہ بانٹتے پھرتے ہیں۔ آپ بھی اسی لٹریچر کی نشر و اشاعت میں ان کا ہاتھ بٹائیے۔ بات بالکل

واضح ہے کہ اگر اسلام کی فکر مکمل وہی ہے جس کی علمبرداری کا دعویٰ ایک معمولی عیسائی بغیر قرآن کا مطالعہ کئے بغیر عیسائیت سے کنارہ کش ہوئے اور بغیر مغربی تمدن و طرز حکومت و معاشرت سے اعلان بغاوت کئے ہوئے کر سکنے کا مجاز ہے تو ــــ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ــــ پھر وہ کونسی بات ہے جس کے لئے خواہ مخواہ مسلمانوں کے ممالک اور مغربی اقوام میں کشمکش چلی آرہی ہے، کرنے کا کام تو صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ یورپ کی عیسائیت عین اسلام ہے اسلئے عیسائیت اختیار کر لینے میں تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس سے دنیا میں امن قائم ہو جائے گا اور نوعِ انسانی کے اس محسن کو نوبل پرائز مل جائے گا۔

معلوم نہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں بھی (معاذ اللہ) اتنی سی بات کیوں نہ آئی اور وہ کیوں عمر بھر اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اور ان سے کہتے رہے

ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً لن یقبل منہ

جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرے وہ ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

دین کے متعلق خلیفہ صاحب کی ایک تحقیق یہ ہے کہ

اسلام دین کو فطرت قرار دیتا ہے اور فطرت اس کو کہتے ہیں جو ہر جگہ اندر اور باہر جاری و ساری ہو۔ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، لیکن خدا جو حقیقت کلی ہے وہ فرماتا ہے کہ میں ہی ظاہر ہوں اور میں ہی باطن۔ چونکہ خدا کی ذات و صفات میں کوئی تضاد نہیں ہے اسلئے ظاہر و باطن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ فطرت کی مذکورہ بالا تفسیر کے لئے قرآن کی کونسی سند ہے اور دین فطرت سے مراد کیا ہے؟ ہزاروں حقائق کائنات کی رگ و پے میں پیوست ہیں کیا ان سب کا نام قرآن نے دین رکھا ہے؟

کتاب میں جا بجا آدم کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" لکھا ہے اور اس طرح لکھا ہے گویا قرآن کی آیت نقل کر رہے ہیں۔ کیا ہم استفسار کر سکتے ہیں کہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے الفاظ قرآن میں کسی ایک جگہ بھی آئے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب لفظ خلیفہ کے معنی ہی نہیں سمجھے ورنہ وہ خلیفۃ اللہ جیسی بے معنی ترکیب کبھی نہ لکھتے۔ لفظ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کے پیچھے آنے والا ــ جانشین (Successor) اسی لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ الرسول کہا جاتا تھا۔ بنا بریں خلیفۃ اللہ کے معنی ہوئے "خدا کا جانشین"۔

ایک مقام پر جبر و قدر کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر ہے

مسلمانوں کی دینیات، علم کلام اور ادبیات میں دورانِ انحطاط میں جبر کا عقیدہ مسلمات میں تسلیم کیا جانے لگا۔

کیا اس دعوے کے اثبات میں کوئی تاریخی ثبوت بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ جبر کا عقیدہ مسلمانوں کے دور انحطاط کی یادگار ہے اور وہ بھی مسلمہ کی حیثیت سے؟ باقی رہا؟ مسئلہ جبر و قدر سو اس کے متعلق مقالہ نگار نے قرآن سے صرف ایک دو ایسی آیات نقل کر دی ہیں جو ان کے مطلب کے مطابق تھیں اور ان آیات کا ذکر ہی نہیں کیا جو ان کے منشاء کے خلاف جاتی تھیں تحقیق کا طریقہ یہ تھا کہ ان تمام آیات کو بھی سامنے لایا جاتا جن سے جبر کے قائل اپنے مطلب کو صحیح ثابت کرتے ہیں اور ان آیات کی آیات قدر سے تطبیق کی صورت بتائی جاتی۔

یہ ہیں بہرحال چند نمونے اس کتاب کے جسے "اسلام کی بنیادی حقیقتیں" کہہ کر منظر عام پر لایا گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیفات سے اسلام کا کیا سنورتا ہے اور ملت کا کونسا بگڑا ہوا کام بنتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اگر اسلام کی بنیادی حقیقتیں یہی ہیں جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں تو کیا اس اسلام کو یہ دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ میری تعلیم دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہے؟

---

(۲) خوشحال خاں خٹک

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں دو ایک مقامات پر خوشحال خاں خٹک کا تذکرہ کرکے ہر صاحب ذوق کے دل میں یہ آرزو پیدا کردی کہ وہ خٹک کے متعلق کچھ زیادہ معلوم کرسکے۔ لیکن اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے کسی کی یہ آرزو پوری ہوجاتی۔ دوست محمد خاں صاحب کامل (ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ایڈوکیٹ پشاور) نے چارسو سے زائد صفحات کی زیرِ نظر کتاب میں خوشحال خاں خٹک کا تفصیلی تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

خٹک کی سیاسی زندگی تو اتنی ہی ہے کہ وہ سرحد کے علاقہ میں شاہجہاں کے عہد میں منصب دار تھا۔ اس کے بعد جب اورنگزیب تخت نشین ہوا تو اس نے کابل کے گورنر کی رپورٹ پر خٹک کو قید کردیا۔ قید سے رہائی کے بعد خٹک نے باقی ساری عمر اورنگزیب کے خلاف جنگ و پیکار میں گذار دی اور اس کے لئے وہ افغانوں کو مغلوں کے خلاف اُبھارتا رہا۔ لہٰذا اس کی تمام تگ و تاز کا محرک جذبہ کوئی بلند مقصد نہ تھا بلکہ ذاتی انتقام تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا اور اس کی ذات پر جو ظلم ہوا تھا اس کا بدلہ اورنگ زیب سے لینا چاہتا تھا چنانچہ وہ بار بار لکھتا ہے کہ اگر اورنگ زیب اس کے ساتھ یہ کچھ نہ کرتا تو وہ مغلوں کی خدمت گزاری میں اسی طرح اپنی زندگی وقف کئے رکھتا جس طرح اس نے شاہجہاں کے وقت میں وقف کی تھی۔ اس لئے ہم اس باب میں محترم مصنف کی اس رائے سے متفق نہیں ہوسکتے کہ خوشحال خاں خٹک کا

> نسلی برتری کے احساس اور اس کے نتائج کو مٹانے کے لئے سرگرم عمل ہونا اپنی اور اپنی قوم کی عزت و شان کے تحفظ اور حصول آزادی کیلئے لڑنا ایک ایسا اولوالعزمانہ کارنامہ ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ وہ ایک مسلمان بادشاہ سے اس لئے برسرپیکار ہوا تھا کہ اس کی مملکت میں بعض ظالم صوبیداروں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ وہ مسلمانوں کی مملکت میں عدل اور اسلام کی روشنی دیکھنا چاہتا تھا۔

حالانکہ وہ خود ہی دوسری جگہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ

> خوش حال خاں ایک دنیادار آدمی تھا اور دنیوی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ابًا عن جدٍ بادشاہانِ مغلیہ کی خدمت کرتا چلا آرہا تھا۔

یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی۔ خٹک کی حقیقی عظمت اس کے علمی کارنامے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خٹک نے اپنے گاؤں ہی کے کسی مکتب میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک منصب دار کا بیٹا تھا اور اس کی تمام عمر جنگ و پیکار میں گذر گئی لیکن جب ہم اس کی شاعری پر نگاہ ڈالتے

ہیں تو اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ فی الواقعہ ایک فطین (Jenius) شخصیت تھی اسے اس قدر بلند نگاہ اور ملکہ شاعری مبدأ فیض کی طرف سے بطور موہبت عطا ہوا تھا کہ بعض مقامات پر وہ اقبال کا پیش رو دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً وہ ایک قطعہ میں کہتا ہے :

جہان کوئی تھوڑے نہیں — مگر اے نادان تو انھیں دیکھ نہیں رہا
دیکھ ایسی کئی زمینیں ہیں اور ایسے کئی آسمان — جو سب تیرے دل میں سمائے ہوئے ہیں
اے عرش سے بزرگ تر انسان !

ایک غزل کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

آئینہ سکندر ہو کہ جام جم — درویش کے دل کو نہیں پہنچتے۔
درویش کے آگے بادشاہی کا سر نیچا نہیں — آسمان کی گردن بھی اس کے آگے جھکی ہوئی ہے۔
درویش کا علم درس اور مکتب کا نہیں — اس کی نظر ہمیشہ لوح و قلم پر ہوتی ہے۔

اور دیکھئے۔ کہتے ہیں۔

درویش کے لوح دل پر ساری کتاب لکھی ہوئی ہے — اگرچہ زبان سے اس نے عربی لغات نہیں سیکھ رکھے۔
اگر دیکھو تو عشق وہ عظیم بادشاہ ہے — کہ اس کے بھکاری سلاطین سے بھی زیادہ محتشم ہیں
شاہسواران عشق کو حقیر نظروں سے نہ دیکھو — کہ وہ بے زر و لشکر جاہ جمشید رکھتے ہیں۔

اسی ضمن میں کچھ منتشر اشعار بھی سن لیجئے۔ کہتے ہیں،

کہتے ہیں آسمان پر چڑھنے کا راستہ نہیں — میں ہنر سے تیرے لئے یہ راستہ پیدا کردوں گا۔
پہلے اڑنے کے لئے اچھا اور مضبوط شہپر پیدا کرو — اور اس کے بعد آسمان کی طرف پرواز کرو
زمانہ میں طلب کے موافق حصہ ملتا ہے — بلکہ اس سے بھی بڑھ کر

ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے :

یہ سریلا گلا۔ نغمے اور چہکار بلبل کا حصہ ہیں — انھیں باز کی جانے بلا
باز کب مردہ لاشوں کی ہوس کرتا ہے — یہ تو کوے اور گدھ کا کام ہے
گندی جھوٹی ناپاک ہڈیاں — کتے گیدڑ بھیڑیئے اور سنڈار کھاتے ہیں
شیر کا کام تو — اپنا مارا ہوا شکار کھانا یا صبر کرنا ہے
مارنا، کھانا اور کھلانا بازوئے شاہیں کی شان ہے — اور بل کے اندر لے جانا چیونٹی اور چوہے کا کام ہے
شاہباز کی بلندی پرواز باشے کو کب نصیب ہو سکتی ہے — اگرچہ وہ بھی اپنے ساتھ پیدائشی پر و بال رکھتا ہے۔

غور کیجئے یہ ایک پٹھان سپاہی کے خیالات ہیں۔ ذرا اس نظم کو دیکھئے اور سوچئے کہ یا ایران کے لالہ زاروں میں لکھی جا سکتی تھی یا سرحد کے کوہساروں میں

پھر یہ بہار کہاں سے آئی — جس نے ہر طرف ملک کو ایک گلزار بنا دیا
سوسن و ریحان و ارغوان — یاسمن و نسترن اور نرگس و گلنار
اور دوسرے کئی گلہائے رنگارنگ موسم بہار میں کھل رہے ہیں — لیکن سرخ لالہ ان سب میں نمایاں ہے
لڑکیاں مٹھیاں بھر بھر کر پھول گریبانوں میں ڈال رہی ہیں — اور جوانوں نے اپنی پگڑیوں کو گلدستوں سے مزین کر رکھا ہے۔
اے مغنی تو سارنگی پر کمان چڑھا — اور ہر ہر تار سے گوناگوں نغمے نکال
اے ساقی آ اور مجھے بھر بھر کر پیالے دے — کہ میں مستئ مے میں سرشار ہو جاؤں۔

اس تشبیب کے بعد گریز ملاحظہ کیجئے۔

افغان نوجوانوں نے پھر اپنے ہاتھوں کو سرخ کر لیا — جیسے باز اپنے شکار سے پنجے سرخ کیا کرتا ہے۔
سفید تلواریں انھوں نے لہو سے گلگوں کر لیں — اور اساڑھ کے مہینے میں لالہ زار کھل گیا

شاعری سے ہٹ کر عقائد کی طرف آئیے تو وہاں بھی حیرت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں

میں نے قرآن کو مانا ہے جو آسمان سے نازل ہوا — اور مقالات یونانی کو اوروں کے حوالے کر دیا ہے

ایک دوسرا شعر ہے،

یہ شیخ لوگ جو نمازوں اور روزوں کے بدلے جنت مانگتے ہیں — تو مجھ خوش حال نے مزدوری کی یہ عبادت نہیں سیکھ رکھی۔

ملا کے متعلق کہتے ہیں؛

جو کوئی کنز قدوری پڑھ لے ملا بن بیٹھتا ہے — اور ہر حلال و حرام کو اپنے لئے جائز قرار دے لیتا ہے
حالانکہ نہ تو کنز کے دقائق سے واقف ہوتے ہیں — اور نہ ہی قدوری میں بصیرت رکھتے ہیں
کتابیں سر پر اٹھا کر ملا بن جاتے ہیں — اور گاؤں گاؤں محلہ محلہ پھرتے اور چوری ٹھگی کرتے ہیں
رشوتیں لے لے کر شریعت کی جڑیں کاٹتے ہیں — جھوٹی روایتیں گھڑتے اور اپنے تئیں قاضی جتاتے ہیں۔
مسجد میں آ کر پانچ وقت اذان دیں گے — لیکن اگر زکوٰۃ اور صدقۂ فطر نہ لے تو مسجد کو ڈھا دیں گے۔

جی تو یہ چاہتا تھا کہ ان کا سارے کا سارا کلام نقل کر دیا جائے جو کامل صاحب نے بکمال نوازش اپنی کتاب میں دے رکھا ہے لیکن افسوس کہ عدم گنجائش اس سے مانع ہے لیکن آخر میں ہم اس سیاسی نکتہ کو درج کئے بغیر نہیں رہ سکتے جو خٹک نے اپنے عمر بھر کے تجربہ کے بعد ہمیں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

کابل اور کشمیر — سب تلوار کی کمائی ہیں
بھروسہ یا خدائے واحد کا ہے یا تلوار کا — کانفرنسوں اور ڈیپوٹیشنوں سے کبھی کام نہیں بنتا

کتنی بڑی حقیقت ہے جو آج بھی اسی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہے جس طرح تین سو سال پہلے تھی جب یہ خوشحال خاں کے قلم سے لکھی گئی تھی اور کتنی دور رس تھی اس شخص کی نگاہ جس نے تین سو سال پہلے ہمارے لئے ایسی پتہ کی بات کہدی کہ جس سے وہی قوم انکار کر سکتی ہے جو اپنی بے ہمتی کو مصلحت کوشی کے فریب میں چھپانے کی کوشش کرے۔

ہم محترم کامل صاحب کے تہ دل سے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہمیں خوشحال خاں کے ان بلند خیالات سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا اب تو جی چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح پشتو سیکھ ہی لی جائے کیونکہ اب یہ حقیقت کھلی کہ پشتو میں کے کنستر میں روڑے ڈال کر کھڑکھڑانے کی آواز ہی کا نام نہیں بلکہ یہ بلند افکار کی حامل بھی ہے۔

ہم کامل صاحب سے درخواست کرینگے کہ وہ خٹک کے پورے کلام کا انتخاب اردو ترجمہ کے ساتھ الگ شائع کریں کس قدر مقام تاسف ہے کہ انگریزوں نے تو اس کلام کو اپنے ہاں منتقل کر لیا ہوا اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمان ابھی تک اس سے بے بہرہ ہیں ۔۔۔ کتاب مجلد ہے اور ادارۂ اشاعت سرحد پشاور سے ساڑھے سات روپے میں مل سکتی ہے۔

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

گذشتہ سال کے آخر میں جبکہ بڑھتے ہوئے مالی خسارہ کے پیش نظر طلوعِ اسلام کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو معارف القرآن معراج انسانیت جلد چہارم) کی قیمت میں تین ماہ کے لئے رعایت کردی گئی تھی تاکہ خسارہ کی تلافی کی کچھ شکل پیدا ہو جائے۔ اس رعایت سے قارئین طلوعِ اسلام نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کے باوجود بہت سے حضرات بروقت کتابیں حاصل نہ کرسکے۔ چنانچہ ان کا اسوقت سے یہی تقاضا چلا آرہا تھا کہ انھیں کتابیں رعایتی قیمت پر دی جائیں۔ یہ تقاضے اسے شدید ہوگئے تھے کہ ادارہ کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں رہا سوائے اس کے کہ ان کے سامنے سپر ڈال دی جائے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

کی قیمت میں پھر

تین ماہ کے لئے رعایت

کردی جائے۔ یہ رعایت ۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر تک رہے گی۔

اس دوران میں معراج انسانیت

بیس (۲۰) روپے کی بجائے بارہ (۱۲) روپے میں مہیا کی جائے گی۔

پیکنگ و محصولڈاک ایکروپیہ چھ آنے بذمہ خریدار

دوکانداروں سے بھی یہی قیمت لی جائے گی ان کے ساتھ مزید کوئی رعایت نہ ہوگی۔

اب چونکہ اس میعاد میں صرف پندرہ روز باقی رہ گئے ہیں اسلئے ضرورتمند حضرات پہلی فرصت میں آرڈر دیدیں۔ ۱۵ر اکتوبر کے بعد اصلی قیمت عـــہ (۲۰) روصول کی جائیگی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی

تفسیر القرآن :- جو وحی اور اُس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کر کے دل کی گہرائیوں میں سما جائے ۔

معارفِ حدیث :- جو دین و اخلاق کی حقیقتوں اور صداقتوں کو اجاگر کر کے قرآنی طرز انقلاب کی راہیں صاف کر دیں ۔

بیانِ تصوف :- جو روحانی بصیرت پیدا کر کے اُجڑے ہوئے دلوں کی بستی کو آباد کر دے ۔

تاریخی حقائق اور واقعاتِ عالم } جن سے حیات افروز ماضی کی بنیادیں روشن ہوں اور عصر حاضر کے تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات سامنے آجائیں ۔

ادبِ صالح : جو فسق و فجور اور الحادی ادب پر برقِ سوزاں بن کر گرے ۔

اگر آپ ان حیات افروز تجلیوں اور زندگی بخش علوم و معارف سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ۔ تو

ماہنامہ **فیض الاسلام** کا مطالعہ کیجئے

جو انجمن **فیض الاسلام** کے ماتحت چار سال سے پابندیٔ وقت اور بڑی آب و تاب سے اسلامی علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے ۔

قیمت سالانہ پانچ روپے ۔ فی پرچہ آٹھ آنے

بھارت سے سالانہ چندہ چھ روپے آٹھ آنے ۔ فی کاپی دس آنے

پتہ :- مینیجر ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی (پاکستان)

بھارت والے حسب ذیل پتہ پر چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر کے ہمیں منی آرڈر کی رسید بھیجدیں ہم رسالہ جاری کر دینگے ۔

بھارت کا پتہ : میسرز بشیر احمد اینڈ سنز کین مرچنٹ ۔ لودھی ٹولہ ۔ پرانا شہر ۔ بریلی ۔ بھارت

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعے سے نئی زبان سکھاتا ہے۔

زبان وہ سیکھئے جو اہلِ زبان بولتے ہیں



نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کیلئے ضروری ہے آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب و لہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہلِ زبان کام میں لاتے ہیں۔ لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشیں ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کیلئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سن کر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقۂ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھ دیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں یا سیرگاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہارِ خیال کر لینے پر قادر ہو جائیں گے۔ زبان سیکھنے کے لئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے۔ مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے فوراً تفصیلی جواب دیا جائے گا۔

زبان سیکھنے کے لئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی ....
عربی	بنگالی	ہندوستانی ....
فرانسیسی	روسی	چینی ....
اسپینش	اطالوی	ڈچ ....
سویڈش	نارویجن	فنش ....
زیچ	پولش	لاطینی ....
یونانی	ایفک	ملائے ....
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی ....
جرمن	ترکی	پرتگالی ....

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے۔

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض۔ ....

نام ....

پتہ ....

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کراچی

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جس میں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے/نہیں ہے۔

طلوعِ اسلام

ماہ نومبر
۱۹۵۲



-/10/-

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

(۱) تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح **وحی** کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو روشنی کی۔

(۲) یہ **وحی** اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اسلئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳) حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

(۴) حضور نبی اکرمؐ، انسانی سیرت وکردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

(۵) قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان، ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۶) اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انھیں قوانینِ شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

(۷) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فردِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی "تمام نوعِ انسان کی پرورش" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

(۸) ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں، قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح

"زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے۔

قرآن نے کیا کہا؟

مہاتما بدھ نے دیکھا کہ دنیا مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر طرف دُکھ ہی دُکھ ہے۔ ہزاروں انسان بھوک سے مر رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مریض، درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں اور کوئی غمخوار نہیں۔ غریب سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں۔ غرضیکہ زندگی نام ہے مسلسل تکلیفوں اور پیہم مشقتوں کا۔

انسان کی مصیبتوں سے مہاتما بدھ کا دل، خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ نکلا۔ انھوں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ دنیا کی مصیبتوں کا کوئی علاج نہیں بجز اس کے کہ انسان دنیا کو چھوڑ دے۔ ہر آرزو تکلیف کا پیش خیمہ ہے اس لئے آرام اور سکون صرف ترکِ آرزو میں ہے۔

مہاتما بدھ کے یہ رقیق جذبات، فلسفۂ حیات بن گئے۔

(۲) ہندومت نے کہا کہ نہیں۔ انسان اس دنیا میں اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے۔ اس لئے دنیاوی مصائب کا کوئی علاج بجز مرگ نہیں۔ انسان کو یہاں رہنا ہے اور مصیبتیں بھگتنا ہے۔ یہ تصور، مذہب بن گیا۔

(۳) عیسائیت نے کہا کہ نہیں، دنیا میں ہر انسان اس گناہ کی سزا بھگت رہا ہے جو اس کے پہلے ماں باپ (آدم اور حوا) نے کیا تھا۔ اس گناہ کا کفارہ حضرت یسوع مسیح کی صلیب تھا۔ لہذا دنیا کی مصیبتوں کا علاج حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لانے میں ہے۔ یہ عقیدہ بھی ایک مذہب بن گیا۔

لیکن

(۴) قرآن نے کہا کہ یہ سب غلط ہے۔ نہ دنیا جیل خانہ ہے نہ انسان اس میں قیدی کی حیثیت سے سزا بھگت رہا ہے۔ انسان کی تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی ضروریات کی چیزوں (رزق) کی تقسیم غلط ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو گئے ہیں اور باقی انسان بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان تمام مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ رزق کی تقسیم صحیح خطوط پر ہو جائے۔ اللہ نے رزق، تمام انسانوں کی پرورش (نشوونما) کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے رزق کے سرچشمے کسی فرد کی ملکیت میں نہیں رہ سکتے انھیں تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ یہ ہے انسان کی مصیبتوں کا حل!

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)	محمد یونس	سالانہ چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) " غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵	نومبر ۱۹۵۲ء	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ پاکستان پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو صرف اتنا ہوا تھا کہ زمین کا ایک ٹکڑا مسلمانوں کو مل گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ اختیارات کہ اس میں جو جی میں آئے کرو۔ جب تک انڈیا ایکٹ کے مطابق اس ملک میں کاروبار حکومت چلتا رہیگا اس وقت تک محض آقاؤں کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔ پاکستان درحقیقت اس دن وجود میں آئیگا جب اس کی اپنی کانسٹی ٹیوشن مرتب ہوگی۔ کانسٹی ٹیوشن سے مراد یہ ہے کہ ہم وہ نقشہ تیار کرلیں گے جس کے مطابق اس سرزمین پر عمارت بنائی جائے جس قسم کا یہ نقشہ ہوگا اسی قسم کا پاکستان متشکل ہو جائے گا۔ یہ چھٹا سال گذر رہا ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمارے ہاتھوں میں آئی تھی ہم اس وقت تک اس کا نقشہ نہیں تیار کر پائے۔ لیکن یہ تاخیر اتنی تاسف انگیز اور دلخراش نہیں جس قدر جگر سوز یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے اس عمارت میں زندگی بسر کرنی ہے نہ تو ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ یہ عمارت کس قسم کی ہونی چاہئے نہ ہی انھیں بتایا جاتا ہے کہ تمہاری عمارت کا نقشہ کس قسم کا تیار ہو رہا ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ خود پاکستان کے لوگوں کو بھی اس میں کچھ دلچسپی نہیں ہے کہ جو عمارت ہمارے اور ہماری نسلوں کے رہنے کیلئے تیار ہوگی اس کا نقشہ کس قسم کا بن رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ پاکستانیوں کی اکثریت اتنی بےحس ہو چکی ہے کہ اسے پاکستان کے مستقبل سے کچھ دلچسپی ہی نہیں رہی بلکہ جیسا کہ ہم نے اگست و ستمبر کے لمعات میں لکھا تھا حسن تدبیر کی فسوں سازیوں سے ہمارے عوام کو اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ان کی زندگی کے تمام مقاصد، مستقبل کے تمام تصورات اپنی خوش حالیوں اور خوش گواریوں کے تمام ممکن مطالبات سمٹ سمٹا کر اس التجا میں مرکوز ہو گئے ہیں کہ "ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھائیے"۔ وہ اب اس سے زیادہ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی پاکستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں۔ ہندوستان میں جن حالات میں یہ اسمبلی وجود میں آئی تھی ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں، اس زمانہ میں نہ تو پاکستان کے مسائل درپیش تھے نہ کسی کو ان کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ قائد اعظم مرحوم کی ذات پر قوم کو پورا پورا بھروسہ تھا۔ وہ اگر کہتے کہ "بجلی کے کھمبوں کو ووٹ دیدو" تو لوگ اتنا پوچھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتے کہ یہ کھمبا ہمارے کس کام آئے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں یہ اسمبلی وجود میں آئی۔ اس کے بعد اس اسمبلی کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ نہ رہا حتی کہ آج بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس اسمبلی کے ممبر کون کون ہیں۔ اس قماش کی نمائندہ اسمبلی نے اپنے میں سے ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہ تھا کہ وہ تجویز کرے کہ پاکستان کے دستور کے بنیادی اصول اور مملکت کے باشندوں کے بنیادی حقوق کیا ہونے چاہئیں ایک مدت کے غور و خوض کے بعد اس کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کیں۔ وہ سفارشات ایسی تھیں کہ مملکت میں چاروں طرف سے ان کی مخالفت ہوئی حتی کہ گورنمنٹ کو وہ سفارشات واپس لیکر کہنا پڑا کہ ملک کے ارباب فکر و نظر دستور سے متعلق اپنی اپنی تجاویز کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے پاس بھیجیں۔ یہ تجاویز ۳۱ جنوری ۵۱ء تک حکومت کے پاس بھیجدی گئیں۔ اس کے بعد حکومت نے اتنا بتلانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہ تجاویز کیا تھیں اور ان کا کیا حشر ہوا۔ اب یہ خبر اخبارات میں گشت لگا رہی ہے کہ وزیر اعظم صاحب ۲۲ نومبر ۵۲ء

کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی جدید سفارشات اسمبلی کے سامنے پیش کریں گے۔ اگر کوئی زندہ قوم ان مراحل میں سے گذر رہی ہوتی یعنی ان کے سامنے پہلی یہ سوال آتا کہ اپنے ملک کا دستور کس قسم کا بنایا جائے تو ساری قوم کی توجہات اسی ایک مسئلہ پر مرکوز رہتیں لیکن یہاں کسی کو احساس تک بھی نہیں کہ ملک میں ہو رہا ہے اور ان کے مستقبل کا نقشہ کس انداز سے بن رہا ہے۔ قوم کا ہر طبقہ اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا ہے اور لے دیکر صرف وہ چار آدمی جن کے سپرد تشکیل دستور کا کام کر دیا گیا ہے وہ خود ہی کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ اسکی ایک وجہ تو وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ قوم کے اندر ہنوز حکومت کی صلاحیتیں نہیں ہوئی تھیں کہ انھیں حکومت مل گئی۔ ہمیشہ ہوتا یہ رہا ہے کہ قوم نے پہلے اپنے اندر جہانبانی کی صلاحیت پیدا کی اور ان صلاحیتوں کے نتیجہ میں انھیں حکمرانی مل گئی لیکن یہاں ہوا یہ کہ حکومت پہلے مل گئی اور حکومت کی صلاحیتوں کا سوال اب پیدا ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ حکمران اور رعایا دونوں اپنی اپنی جگہ سخت ناکام ہو رہے ہیں اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مشکل کا حل کیا ہے۔ ملک میں آئین سازی کے مسئلہ سے اگر کسی کو دلچسپی ہے تو ان لوگوں کو ہے جو آئندہ آئین میں اپنے لئے جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں اس باب میں اسلامی جماعت سب سے پیش پیش ہے۔ یہ ایک خالص سیاسی جماعت ہے لیکن اس نے اپنی سیاست کو مذہب کے نقاب میں چھپا رکھا ہے ان کا انداز جرمنی کی نازی پارٹی کا سا ہے اور ان کا مقصد بھی اپنی ڈکٹیٹر قائم کرنا ہے۔ ان کی ٹیکنک یہ ہے کہ عوام کے سامنے مبہم الفاظ میں باتیں کی جائیں مبہم نعرے بلند کئے جائیں اور کبھی بھی اپنے الفاظ کی تشریح نہ کی جائے ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق ان کے الفاظ کا مطلب سمجھتا رہے اور اپنے دل میں خوش ہوتا رہے اس طرح ملک کی اکثریت ان کے پیچھے لگی رہے اور وہ عوام کے ا ہڑ بونگ سے حکومت کو مرعوب کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ ان کا سلوگن یہ ہے کہ ملک کا نظام اسلامی شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہ ایسا مبہم سلو ہے کہ اس کے اندر ہر تفصیل اور ہر تاویل کی گنجائش موجود ہے۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ اسلامی شریعت کہتے کسے ہیں تو وہ پوچھنے والے کا مذاق اڑا کر جواب دیتے ہیں کہ ہزار برس سے مسلمانوں کے سامنے اسلامی شریعت کے الفاظ آرہے ہیں کبھی کسی نے اتنا نہیں پوچھا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ ہم آج بھی لاکھوں مسلمانوں کے مجمعوں میں اسلامی شریعت کی دعوت دیتے ہیں لیکن یہ سوال کہیں سے پیدا نہیں ہوتا کہ اسلامی شریعت کسے کہتے ہیں، اسلئے اس قسم کا سوال کرنے مخبوط الحواس ہیں، انتشار پھیلانیوالے ہیں، کافر ہیں۔ ملت اسلامیہ میں ان کیلئے کوئی مقام نہیں۔ وغیر ذلک۔ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر اسلامی شریعت اتنی عام فہم چیز ہے تو وہ اسکی تشریح و توضیح کرتے ہوئے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔ اگر کوئی شخص سنجیدگی سے سوچے تو یہ سوال سب سے پہلے پیش آتا ہے کہ جس شریعت مطابق مملکت کا دستور بنے گا وہ کونسی شریعت ہے اسلئے کہ اس حقیقت سے کون ناواقف ہے کہ مسلمانوں کے بہتر فرقے ہیں اور ہر فرقہ کی شریعت جدا ہے۔ ہر فر اپنی شریعت کو شریعت حقہ کہتا ہے۔ ان شریعتوں کو انفرادی دوائر تک محدود رکھنے کی حد تک تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ شریعت سے ان کی مراد کیا ہے لیکن جب آپ پوری مملکت کیلئے ایک متفق علیہ دستور بنائینگے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس شریعت سے مراد کیا ہے جسکے مطابق یہ قانون بنایا جائیگا۔

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مملکت پاکستان کے مختلف فرقوں کے اکتیس[۳۱] علماء نے متفقہ طور پر مطالبہ پیش کیا تھا لہذا جو دستور اس مطالبہ کے مطابق مرتب ہوگا وہی تمام فرقوں کیلئے قابل قبول نظام ہوگا۔ یہ دلیل بظاہر بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اسے ذرا سا کرید کر دیکھیں تو سطح کے نیچے وہی اختلاف و افتراق دکھائی دیگا جو مختلف فرقوں میں موجود ہے۔ مثلاً اس متفقہ مطالبہ کی بنیاد یہ ہے کہ دستور پاکستان کتاب و سنت کے مطابق ہونا چاہیئے اگر ہم ان الفاظ کی سطحیت سے ذرا بھی نیچے جائیں گے تو یہ سوال سامنے آئیگا کہ سنت سے مراد کیا ہے؟ سنیوں کے ہاں سنت کچھ اور ہے شیعوں کے ہاں کچھ اور اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ ان دونوں کے ہاں سنت کی کوئی تعبیر و تفسیر متفق علیہ ہو۔ اس متفقہ مطالبہ میں یہ بھی درج ہے کہ دستور پاکستان منکر سے روکے اور معروف

حکم دے لیکن کتنی ایسی چیزیں ہیں جو شیعوں کے ہاں عین معروف ہیں اور سنی اسے منکر ہی نہیں بلکہ شرک قرار دیتے ہیں۔ پھر سنیوں کے اندر مختلف فرقوں میں کتنی چیزیں ایسی ہیں جو ایک کے نزدیک معروف ہیں اور دوسرے کے نزدیک منکر۔ لہذا یہ کہنا کہ ملک کے اکتیس علما نے ایک متفقہ اصول بیان کر دیا ہے جس کے مطابق پاکستان کا دستور مرتب ہو جانا چاہئے بہت بڑا دھوکہ ہے۔ یہ وہی ابہام ہے جس سے عوام کو تو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے مگر پڑھے لکھے لوگوں کو بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس مطالبہ کو عملی شکل میں تشکیل کرتے وقت قانون بنانے والوں کے سامنے سب سے پہلے یہ سوالات آئیں گے کہ سنت کسے کہتے ہیں۔ سنیوں کی سنت یا شیعوں کی سنت، بخاری مسلم اور ترمذی نسائی والی سنت یا کافی والی سنت۔ جب تک یہ اکتیس علماء متفقہ طور پر ان امور کی تشریح نہ کر دیں اسوقت تک محض سنت کے مبہم مفہوم پر ان کا متفق ہو جانا ایک بے معنی چیز ہے۔ اس کے بعد یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ معروف کون کون امور ہیں اور منکر کیا کیا ہیں۔ تعزیہ بنانا، تعزیوں کا جلوس نکالنا، ماتم کرنا، خلفاء پر سب وشتم کرنا۔ بزرگوں کی قبروں پر عرس کرنا، قوالیاں کرنا، مولود کے جلوس نکالنا، فاتحہ خوانی کرنا، قبروں پر چڑھاوے چڑھانا، قبروں سے مرادیں مانگنا، پیروں کو اور پیروں کی قبروں کو سجدے کرنا وغیرہ وغیرہ امور معروف کی فہرست میں شامل ہونگے یا منکر کی فہرست میں۔ قانون سازی میں ان تمام امور کی تشریح وتعیین ضروری ہے۔ قانون کی زبان مولویوں کے وعظ کی زبان نہیں ہوتی۔ اس کیلئے ان تمام امور کو متعین کر کے دینا ہوگا۔ علاوہ بریں حال میں امیر جماعت اسلامی نے دستور سے متعلق اپنے جداگانہ مطالبات کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ خود ان اکتیس [۳۱] علما میں شامل تھے جن کی طرف سے متفقہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ اگر اسی متفقہ مطالبہ کو دستور پاکستان کا بنیادی اصول بنانا مقصود تھا تو امیر جماعت اسلامی کے یہ جدید مطالبات کیا معنی رکھتے ہیں۔ اس متفقہ مطالبہ کی موجودگی میں اگر ہر جماعت کے اپنے اپنے الگ الگ مطالبے بھی باقی ہیں تو متفقہ مطالبہ کیا ہوگا۔ اس کا ڈھنڈورہ پیٹنا ہی فضول ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں حکومت نے یہ اعلان کر کے کہ دستور پاکستان کتاب وسنت کے مطابق ہوگا دوہری مصیبت مول لی ہے۔ ایک اندرونی اور ایک بیرونی۔ اندرونی یہ کہ اول تو سنت کی کوئی متفقہ علیہ تعبیر ہی نہیں ہو سکے گی اور دوسرے یہ کہ اسکی تعبیر کیلئے حکومت کو بہر حال مُلّا کا دست نگر ہونا پڑیگا اور یہی ملا کا منشا ہے۔ ہم اس حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر حکومت نے یہ مسلک اختیار کر لیا یعنی وہ تدوین دستور کے مسئلہ میں ملا کی دست نگر ہو گئی تو چند سالوں کے اندر اندر پاکستان دوسرے اسلامی ممالک مثلاً افغانستان، عراق، حجاز وغیرہ کی سطح پر آجائیگا اور یہاں مذہب کے نام پر اسقدر استبداد ہوگا جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بیرونی مصیبت یہ ہے کہ ہم ہزار برس سے دنیا کو کہتے چلے آئے ہیں کہ نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل اسلامی نظام میں ہے۔ اب ساری دنیا انتظار میں ہے کہ دیکھیں وہ اسلامی نظام کس قسم کا ہوتا ہے جسے نوع انسانی کی تمام مشکلات کا حل بتایا جا رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر پاکستان کا دستور مُلّا کے مشورہ سے مرتب ہوا تو وہ اس قابل بھی نہیں ہوگا کہ وہ عام انسانی حکومتوں کی سطح تک بھی آسکے۔ اور اگر یہ دستور اسلام کو چھوڑ کر خالص فکری نقطۂ نگاہ سے مرتب کیا گیا تو یہ زیادہ سے زیادہ دنیا کی دوسری مملکتوں کا مقابلہ کر سکے گا۔ اس صورت میں بھی یہ نظام دیگر نظامہائے عالم سے افضل نہیں ہوگا لہذا جب ہمارا دستور دنیا کے سامنے جائیگا تو اس سے مملکت پاکستان ہی کی سُبکی نہیں ہوگی بلکہ دنیا کی نگاہوں میں خود اسلام ذلیل ہو جائیگا۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا غم جو ہمیں کھائے جا رہا ہے اور جسکے پیش نظر ہم مسلسل پانچ برس سے برابر پکارتے چلے جا رہے ہیں کہ ان مشکلات کا حل اس خدا سے پوچھو جس کے نام پر تم یہاں حکومت قائم کرنا چاہتے ہو، خدا نے اسکا حل اپنی کتاب کے اندر بتا دیا ہے۔

قرآن کی رو سے ایک اسلامی مملکت کی دستور سازی کا مسئلہ بڑا آسان ہے۔ وہ ایسے اصول بیان کرتا ہے جو قیامت تک غیر متبدل رہتے ہیں ان اصولوں کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے اس طرح سے مرتب کردہ جزئی قوانین کا نام شریعت ہوتا ہے۔ حالات کے بدلنے سے شریعت (جزئی قوانین) بدلتے رہتے ہیں لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں۔ اس باب میں قرآن کا اصل الاصول یہ ہے کہ اسلامی مملکت کو خدا کی ان صفات کا حامل اور مظہر ہونا چاہیے جنہیں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر جس صفت خداوندی سے قرآن کی پہلی آیت شروع ہوتی ہے وہ "رب العٰلمین" ہے۔ (الحمد للہ رب العٰلمین) انسانوں کی دنیا میں رب العٰلمین کے معنی یہ ہیں کہ وہ حکومت جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے تمام افرادِ مملکت کی پرورش (ربوبیت) یعنی ان کی کامل نشوونما کی ذمہ دار ہے۔ ربوبیت کے اندر صرف روٹی کپڑا، مکان اور حفاظت ہی نہیں آتی بلکہ انسان کی ان تمام صلاحیتوں کی نشوونما بھی آجاتی ہے جو اسے مبدا فیض کی طرف سے ملیں لہٰذا خدا کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کا اولین اور بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہو اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کے اسباب و ذرائع سب کیلئے یکساں طور پر فراہم کرے۔ جو مملکت اس فریضہ کو ادا کریگی وہ حمدیت کے لائق (یعنی قابل ستائش) ہوگی اور اسی کو یہ حق ہوگا کہ وہ قانون شکنی پر مواخذہ کرسکے (مالک یوم الدین)۔ اگر وہ افراد کی پوری پوری معاونت نہیں کرتی تو افراد اسکی اطاعت کیلئے مکلف نہیں ہیں اسلئے کہ حکومت کی اطاعت مشروط ہے اسکی طرف سے پوری پوری معاونت کے ساتھ (ایاک نعبد و ایاک نستعین) یہی وہ سیدھی راہ ہے (الصراط المستقیم) جس سے پہلے لوگوں نے بھی خدا کے انعامات حاصل کئے اور جس سے ہم بھی آج نعمائے خداوندی کے مستحق بن سکتے ہیں۔ یہی وہ دستور ہوگا جو ہمیں خدا کے غضب سے بچا سکیگا جس میں آج باقی دنیا گرفتار ہے۔ اگر ہم نے یہ روش اختیار نہ کی تو ہمارا شمار بھی ان گم کردہ راہ اقوام میں ہوجائیگا جو از انسو رانده وازیں سو درمانده۔ ماری ماری پھر رہی ہیں (غیر المغضوب علیھم ولا الضالین)۔

جو مملکت ربوبیت عامہ (یعنی تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے ذرائع کی بہم رسانی) اپنے ذمہ لیتی ہے ظاہر ہے کہ اس کے پاس اتنے ہی وسیع ذرائع بھی ہونے چاہئیں۔ یہ ہے وہ مقصدِ عظیم جس کیلئے قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہدیا ہے کہ رزق کے سرچشمے (الارض واقواتھا ـــــ زمین اور اسکی پیداوار) تمام ضرورتمندوں کیلئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں (سواء للسائلین)۔ یہ ہے وہ بنیادی نقشہ جس کے اوپر اسلامی دستور کی پوری کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔

لیکن اس آواز کی مخالفت تمام منکرین قرآن کی طرف سے ہوگی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مختلف فرقوں کے وہ علماء جو کل تک ناف پر یا چھاتی پر ہاتھ باندھنے کے اختلاف پر باہمد گر دست و گریباں ہوا کرتے تھے قرآن کی اس آواز کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوگئے ہیں اگرچہ اس محاذ کی صورت وہی ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ

تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتّٰی

تم بظاہر سمجھو گے کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

اسلئے کہ ان سب میں قدر مشترک قرآن سے انکار اور انداداً من دون اللہ پر ایمان ہے۔ قرآن پر ایمان لانے سے ان کی مقدس پیشوائیت چھن جاتی ہے۔ اسلئے وہ اس تصور کو برداشت ہی نہیں کرسکتے۔ ان ہی کے ساتھ مفاد پرستوں کا گروہ بھی شامل ہوجاتا ہے کیونکہ قرآنی نظام میں ان کی زمینداریاں جاگیرداریاں، سرمایہ داریاں سب ختم ہوجاتی ہیں۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد منکرین قرآن اور مترفین کی اس متحدہ مخالفت کے

تسور سے خائف ہوجائینگے اور اسکی وجہ سے اسکی جرأت نہیں کر پائیں گے کہ وہ قرآن کے ان اصولوں کو دستور پاکستان کی بنیاد بنائیں نتیجہ اسکا ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ـــــ ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

گزشتہ صفحات میں اسلامی نظام کے متعلق جو اشارات آپ کے سامنے آئے ہیں ان کی تفصیل ان مضامین میں گزر چکی ہے جو طلوع اسلام میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں چونکہ دستور سازی کا مسئلہ ملک میں خاص اہمیت حاصل کر رہا ہے اور یہ سوال بھی ایسا ہے جو ہر سوچنے والے کیلئے کافی غور و خوض محتاج ہے اسلئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان مضامین کو دو کتابچوں کی شکل میں یکجا شائع کر دیا جائے ایک کا عنوان ہے "اسلامی نظام" اور دوسرے کا عنوان ہے "قرآنی دستور پاکستان" ان کتابوں کو ہم جلدی شائع کر دیتے لیکن اس میں ایک امر مانع ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے ۲۲ر نومبر کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی جدید رپورٹ اسمبلی میں پیش ہونیوالی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس رپورٹ پر طلوع اسلام کا تبصرہ بھی سابقہ مضامین کے ساتھ شامل کر دیا جائے تاکہ یہ سلسلہ مکمل شکل میں سامنے آجائے۔ اندریں حالات ان کتابوں کو شروع دسمبر میں شائع کیا جا سکے گا۔

اسی ضمن میں ایک اور امر بھی قابل گذارش ہے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ ۲۲ر نومبر کو شائع ہوگی۔ طلوع اسلام ہر مہینے کے شروع میں شائع ہو جاتا ہے لیکن اگر ہمیں وہ رپورٹ ۲۲ر نومبر کو ملی تو اتنا وقت نہیں ہوگا کہ دسمبر کے پرچہ میں اس پر تبصرہ شائع ہو سکے۔ اگر اس تبصرہ کو آئندہ پرچہ پر ملتوی کر دیا گیا تو اس میں کافی وقفہ پڑ جائیگا اور تبصرہ کی افادیت ضائع ہو جائیگی اسلئے ارادہ یہ ہے کہ اس تبصرہ کو دسمبر ہی کے پرچہ میں شائع کیا جائے خواہ اس کیلئے اس پرچہ کو کچھ دنوں کی تاخیر ہی سے کیوں نہ شائع کرنا پڑے۔ اس اطلاع کو قبل از وقت ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ آپ کو دسمبر کے ابتدائی دنوں میں پرچہ کیلئے زحمت کش انتظار نہ ہونا پڑے۔

---

(۲) اواخر ستمبر میں منٹگمری میں ایک ایسا اجتماع ہوا جس سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ملتان ڈویژن کے تمام زنانہ اسکولوں کی معلمات اور انسپکٹرسز کا سالانہ ریفریشر کورس تھا۔ وہاں کی ڈویژنل انسپکٹرس محترمہ ڈاکٹر چٹھا صاحبہ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور محترم پرویز صاحب کو مدعو کیا کہ وہ اس اجتماع میں قرآن پر توسیعی لکچر دیں۔ چونکہ پرویز صاحب اپنی قرآنی فکر اور قرآنی پیغام کا اولیں مخاطب آنیوالی نسلوں کو سمجھتے ہیں اور ان تک پیغام پہنچانے کا یہ موقعہ نہایت عمدہ تھا اس لئے انھوں نے باوجود ناسازئ طبیعت اس دعوت کو منظور کر لیا اور اس اجتماع میں چار لکچر دیئے۔ حاضرات نے ان لیکچرز میں خاص دلچسپی لی جو اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ اگر قرآن کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا جائے تو دور حاضر کا تعلیم یافتہ طبقہ (خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں) اسے اپنی کھوئی ہوئی متاع سمجھ کر دل میں جگہ دیتا ہے۔ ہم محترمہ چٹھا صاحبہ کو ان کی اس سعی جمیلہ پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں انھوں نے اس اجتماع سے فی الواقعہ ایک نہایت عمدہ طرح ڈالی ہے جو خوشگوار نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ اگر ملک کی دوسری درسگاہیں بھی اپنے اپنے ہاں اس قسم کا سلسلہ شروع کر دیں تو یہ کوشش ہماری آنے والی نسلوں کے قلب و دماغ کی صحیح تعمیر میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم سر دست اپنی درسگاہوں کا نصاب بدلنے پر قادر نہیں تو اس کمی کو کسی حد تک اس قسم کے توسیعی لیکچروں سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

سعدیک

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟

احباب کا تقاضائے شوق مصر ہے کہ انھیں اطلاع دیتا رہوں کہ میرے "لبیک" کا ردِ عمل کیا ہوا؟ یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ دعوتِ خداوندی کو سب سے پہلے ہمیشہ ان لوگوں نے قبول کیا جن کے پاس ایک دلِ دردمند کے سوا اور کوئی متاعِ حیات نہ تھی۔ میرے "لبیک" کے جواب میں بھی یہی ہوا۔ مجھے اس وقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں سب کے سب ان ہمرہانِ کاروانِ جذب و شوق کی طرف سے ہیں جن کے جیب خالی ہیں، لیکن سینے تپشِ اخلاص و محبت اور جذباتِ ایثار و قربانی سے معمور ہیں۔ میرے لئے ان کی متاعِ خلوص و محبت بڑی گراں مایہ اور ان کے "دل اور جان" کی پیشکش بڑی واجب الاحترام اور وجۂ تقویت ہے۔

مریضِ غم کو تسلیوں سے کہیں سوا دے رہا ہے تسکیں
وہ اک چمکتا ہوا سا آنسو جو دیدۂ چارساز میں ہے

ان احباب کے خطوط کا فرداً فرداً جواب دینا میرے لئے دشوار ہے اس لئے وہ انہی سطور کو اپنے خطوط کی رسید اور جواب تصور فرمالیں۔ انھوں نے اس طرح اپنا تعارف کراکر میری تنہائیوں کو انجمن میں بدل دیا۔

جذبات بیشک ایک قیمتی متاع ہیں لیکن اس متاع کے صَرف کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ جو اسکیم میرے پیشِ نظر ہے (اور جس کا اعلان طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں کیا جاچکا ہے) ظاہر ہے کہ وہ خالی جذبات سے عمل پیرا نہیں ہوسکتی۔ بہرحال میں نے اپنے اعلان سے اس حجت کا اتمام کردیا ہے جو میرے بعض احباب کے نزدیک مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اب میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے لئے آزاد ہوں۔ بایں ہمہ، جہانتک میری اپنی ذات کا تعلق ہے میں اب بھی وہیں ہوں جہاں اس سے پہلے تھا۔ یعنی

بے دست و پانیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

خدا حافظ

۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۲ء

پرویز

قرآن کریم

(روایات کے آئینہ میں)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

دین کا مدار تمام تر یقین پر ہے۔ یہی وہ اصل و بنیاد ہے جس پر اس کی پوری کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔ یقین اس امر کا۔ کہ جس بات کو ہم دینی کہتے ہیں وہ بلاشک و شبہ خدا کی طرف سے ہے۔ اگر اس بنیاد میں ذرا سا بھی تزلزل پیدا ہو جائے تو دین کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے اس میں تھوڑے اور بہت کا سوال ہی نہیں۔ مثلاً ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر اپنی وحی نازل کی اور اصل و بنیاد کے اعتبار سے انھیں بھی وہی "دین" عطا کیا جو قرآن میں ہے۔ آج یہود اور نصاریٰ دونوں اس کے مدعی ہیں کہ ان کے پاس تورات اور انجیل موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان کتابوں کو دین نہیں مانتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ ان کتابوں میں تغیر و تبدل ہو چکا ہے اور ہم آج یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ان میں موجود ہے وہ وہی ہے جو ان انبیاء کی طرف نازل ہوا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کچھ باتیں تو ایسی ہوں گی جن میں ردوبدل نہیں ہوا۔ ان باتوں کو تو دین ماننا چاہئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں کچھ باتیں ایسی ضرور ہوں گی لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دین کے جس معاملہ میں ذرا سا بھی شک اور شبہ پیدا ہو جائے وہ دینی نہیں رہ سکتا۔ اسلئے تورات و انجیل دینی کتابیں تسلیم نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے برعکس قرآن کریم کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ یہ لفظاً لفظاً حرفاً حرفاً "الحمد" سے "والناس" تک بعینہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم پر وحی کیا اور جسے رسول اللہ صلعم نے امت کو دیا۔ اب سوچئے کہ اگر کسی کے دل میں اس چیز کے متعلق ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو اس کے نزدیک قرآن دین کا ضابطہ نہیں بن سکتا۔ اس کی حیثیت بھی وہی ہو جائے گی جو انجیل اور تورات کی ہے۔

عجمی سازشوں نے جہاں حقیقی اسلام کی جگہ ایک بالکل نیا اسلام وضع کر کے مسلمانوں میں عام کر دیا اس کے ساتھ ہی انھوں نے چپکے ہی چپکے ایسی کوششیں بھی کیں جن سے ہر شخص کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہا۔ یہ اس سازش کا اتنا بڑا حربہ تھا جس نے فی الواقعہ دین کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے قرآن کی جمع و تدوین کے متعلق عجیب و غریب داستانیں وضع کیں اور انھیں روایات کے مجموعوں میں بھر دیا۔

عجمی سازشیں کیوں؟

سیاسی میدان میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد جب اہل عجم نے دیکھا کہ ان کی فرعونی افواج قاہرہ اور طاغوتی اسلحۂ جنگ مسلمانوں کے کوہ آسا عزم و یقین (ایمانی طاقت) کو متزلزل کرنے میں

کامیاب نہیں ہوسکے تو انھوں نے بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں کو ان کے سرچشمۂ عزم ویقین (قرآن) ہی سے محروم کردینے کی ٹھان لی، جو اُن کی قوت کا اصل منبع تھا۔ اس کیلئے ان کی دشواری یہ تھی کہ مسلمان "حسبنا کتاب اللہ" کا مدعی تھا۔ یعنی اس کا ایمان تھا کہ اس کی قوتوں کا راز دین کی اتباع میں ہے جو قرآن کے اندر ہے اور قرآن کریم ہر طرح محفوظ ہوچکا تھا اس لئے اس کا کوئی لفظ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹایا جاسکتا تھا۔ اندریں حالات عجمی سازش نے یہ سوچا کہ مسلمان کو قرآن سے ہٹانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انھیں اپنے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو والہانہ عشق ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور رسول اللہ صلعم کا نام لے کر "مثلہ معہ"[1] کا عقیدہ پیدا کرکے مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن کے متبادل ایک دوسرا دین دیدیا جائے۔ چنانچہ عجم کے سازشی اپنی ان کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ مسلمانوں کی اکثریت اس فریب میں بہہ نکلی مگر کچھ خدا کے بندوں نے اس سیلاب کا راستہ روکنا چاہا (کتاب الام میں امام شافعیؒ سے ان لوگوں کے مباحث اور مناظروں کا تذکرہ موجود ہے) عجم کے ان سازشیوں کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ پڑتا تھا کہ اگر احادیث وروایات بھی دین تھیں تو رسول اللہ صلعم نے قرآن کریم کی طرح ان کا بھی کوئی مستند مجموعہ لکھوا کر امت کو کیوں نہ دیدیا اور قرآن کریم ہی کی طرح ان کو بھی یاد کراکر محفوظ کیوں نہیں کردیا۔ اگر قرآن متن تھا اور حدیث اس کی شرح تھی۔ اگر قرآن اجمال تھا اور حدیث اس کی تفصیل تھی۔ اگر قرآن ایک ایسی کتاب تھی جو احادیث سے منسوخ بھی ہوسکتی تھی اور اس طرح حدیث ہی فیصلہ کن چیز تھی تو قرآن سے زیادہ احادیث کو محفوظ اور مستند صورت میں امت کو حوالہ کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ اتنا بڑا اعتراض تھا جس سے گلوخلاصی آسان نہیں تھی۔ انھوں نے اس مشکل کا حل یہ سوچا کہ خود قرآن کے متعلق ہی یہ خیال پھیلا دیا جائے کہ رسولؐ نے اسے بھی محفوظ شکل میں امت کو نہیں دیا تھا اسے بھی بعد میں آنے والوں نے مرتب اور مدون کیا تھا اور جس طرح احادیث کے بیانات میں آپ کو اختلافات نظر آتے ہیں ایسے ہی (معاذاللہ) قرآن کریم میں بھی صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں کافی اختلافات موجود تھے۔ جس طرح روائتیں خبر واحد ہیں کہ کسی ایک صحابی نے بیان کی ہیں اسی طرح قرآن کی آیتیں بھی ایک ایک دو دو آدمیوں کے بیان پر جمع کرلی گئی ہیں وغیر ذالک من الخرافات۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے احادیث وضع کیں اور ان کی عام تشہیر کردی۔ یہ روایات احادیث کے مجموعوں میں آج بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں حافظ ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد سلیمان ابن اشعث سجستانی کی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب المصاحف" ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں قرآن کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یکجا جمع کردیا گیا ہے۔ یہ روائتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر موجود ہیں۔

کتاب المصاحف

یہ کتاب ابوبکر عبداللہ بن ابی داؤد کی تصنیف ہے جن کا سنہ پیدائش ۲۳۰ھ اور سنہ وفات ۳۱۶ھ ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (جن کی کتاب سنن ابوداؤد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے) کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی کتاب المصاحف علمائے حدیث کے ہاں بہت مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے چنانچہ اکثر متقدمین کی کتابوں میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ امام ابن الجزریؒ نے ان کو "ثقۃ کبیر مامونؒ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

---

[1] اس کے معنی یہ ہیں کہ دین صرف قرآن کے اندر ہی نہیں بلکہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے جسے روایات کہتے ہیں۔

کتاب المتفقین میں ہے کہ عبداللہ بن سلیمان ثقہ ہیں اگرچہ ان کے باپ نے بعض حدیثوں میں ان کی تکذیب کی ہے لیکن اکثر متقدمین نے ان کی توثیق ہی کی ہے۔ ابن شاہین کا بیان ہے کہ ابن ابی داؤد حافظ حدیث تھے۔ نابینا ہو جانے کے بعد منبر پر بیٹھ جاتے تھے اور منبر کے نچلے درجہ پر ان کے بیٹے ابو معمر ہاتھ میں کتاب لیکر بیٹھ جاتے تھے۔ ابو معمر بتاتے جاتے تھے کہ فلاں حدیث اور ابن ابی داؤد حافظہ سے اپنے شاگردوں کے سامنے حدیثیں بیان کرتے جاتے تھے۔ ان کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ عمرابن اللیث (مشہور محدث) کے زمانہ میں بغداد سے ابن ابی داؤد سجستان گئے تو آس پاس کے تمام محدثین جمع ہو کر ان کے پاس پہنچے اور حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی۔ ابن ابی داؤد نے بہت انکار کیا کہ میں اپنے ساتھ کتاب لیکر نہیں آیا مگر لوگوں نے نہیں مانا اور کہا کہ امام ابوداؤد کا بیٹا اور کتاب کا محتاج ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر انھیں حافظہ ہی سے حدیثیں بیان کرنا پڑیں۔ جب یہ بغداد واپس آئے اور اہلِ بغداد کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ سجستان والوں سے مذاق کر آئے ہیں، آخر کچھ کاتبوں کو سجستان بھیجا گیا جو وہ حدیثیں سجستان سے نقل کر کے لائیں جو ابن ابی داؤد وہاں بیان کر آئے تھے۔ یہ احادیث جب بغداد کے حفاظ حدیث کے سامنے پیش کی گئیں تو انھوں نے صرف چھ حدیثوں میں ان کی تغلیط کی۔

یہ بغداد میں امام العراق کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، عوام اور حکومت میں ان کا بڑا احترام تھا اور مسجد بغداد میں سلطانِ وقت نے ان کے لئے ایک منبر نصب کرا دیا تھا جس پر بیٹھکر یہ حدیثیں بیان فرماتے تھے۔ عراق کے عامۂ مشائخ نے ان سے حدیثیں لکھیں اور ان سے تحصیل علم کی، لیکن کوئی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔

مصنف کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم آپ کو کتاب المصاحف کے جستہ جستہ مقامات سے روشناس کراتے ہیں۔ سنتے جایئے اور سر دھنتے جایئے۔

قرآن کو حضورؐ نے جمع نہیں کیا بلکہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جمع کرایا

(۱) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہل یمامہ کا قتل ہوا ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیجکر بلایا۔ وہاں عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابوبکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہوگئی ہے، مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہؐ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارہ میں مجھ سے برابر کہتے رہے حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرح صدر کر دیا تھا میرا بھی شرح صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہوگئی جو ان کی تھی۔ ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقل مند آدمی ہو اور رسول اللہ صلعم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زید بن ثابت کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لیجانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے چنانچہ ابوبکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے حتیٰ کہ جس امر کے لئے ان دونوں کو

ح صدر ہو چکا تھا مجھے بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی میری رائے بھی ہو گئی جو ان دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے
ۓ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت
میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی یعنی لقد جاء کم رسول من انفسکم (الآیہ) چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا
آخر خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا۔"

صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قرآن کیونکر جمع کیا گیا

(۲) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عروہ ابن زبیر سے نقل کرتے ہیں کہ جب بہت سے قاری قتل ہو گئے تو ابوبکرؓ کو یہ خوف ہوا کہ اس طرح تو قرآن ہی ضائع ہو جائے گا۔ آخر انھوں نے عمرؓ اور زید ابن ثابتؓ سے کہا کہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص کتاب اللہ کے متعلق کسی چیز پر دو گواہ پیش کر دے اس کو قرآن میں لکھ لو۔

(۳) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبد خیر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ مصاحف کے بارہ میں سب سے بڑا ثواب ابوبکرؓ کو ملے گا۔ خدا ابوبکر پر رحم فرمائے وہی پہلے شخص ہیں جس نے قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کر دیا۔

قرآن صدیق اکبرؓ نے خود جمع کیا اور حضرت زیدؓ نے نظر ثانی فرمائی

(۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ سالم اور خارجہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کو کاغذات میں جمع کر لیا تھا مگر زید بن ثابتؓ سے درخواست کی تھی کہ ان کو ایک نظر دیکھ لیں۔ زید ابن ثابتؓ نے اس سے انکار کر دیا حتیٰ کہ انھوں نے عمرؓ سے مدد چاہی کہ وہ زید بن ثابت کو راضی کرا دیں چنانچہ عمرؓ نے انھیں راضی کرا دیا اور نظر ثانی کر دی۔ یہ کتابیں ابوبکرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں پھر عمرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر حفصہ اہلیہ رسول اللہ صلعم کے پاس رہیں۔ عثمانؓ نے انھیں منگایا تو حفصہؓ نے ان کو دینے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ عثمانؓ سے عہد لیا کہ وہ انھیں واپس کر دیں گے اور اس شرط کے ساتھ بھیج دیں چنانچہ عثمانؓ نے ان کو مصحف میں لکھ کر حفصہ کو وہ کتابیں واپس کر دیں اور وہ ان ہی کے پاس رہیں حتیٰ کہ مروان نے اپنے زمانے میں انھیں لیکر جلا دیا

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسے اہم واقعہ کے متعلق ایک بیان دوسرے سے کس طرح ٹکراتا جا رہا ہے لیکن باایں ہمہ یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن رسول اللہؐ نے مرتب کر کے نہیں دیا تھا بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔

جمع قرآن کا کام صدیق اکبرؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے شروع کیا اور عثمانؓ نے تکمیل کی

(۵) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ یحییٰ بن عبد الرحمٰن بن حاطب سے نقل کرتے ہیں کہ عمر ابن الخطابؓ نے قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کیلئے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا جس شخص نے رسول اللہؐ سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو اسے ہمارے پاس لے آئے۔ لوگوں نے قرآن کو کاغذات پر، لکڑی کی تختیوں پر اور کھجور کے پٹھوں پر لکھ رکھا تھا اور عمرؓ کسی شخص سے کوئی چیز اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دیں۔ اسی اثنا میں عمرؓ شہید ہو گئے تو عثمان ابن عفانؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ جس کے پاس کتاب اللہ کا کچھ حصہ ہو وہ ہمارے پاس لے آئے اور یہ بھی اس وقت تک کوئی چیز قبول

نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دیدیں۔ چنانچہ خزیمہ ابن ثابت آئے اور کہنے لگے کہ میں دیکھ رہا ہوں تم نے دو آیتیں لکھنے سے چھوڑ دی ہیں پوچھا گیا وہ کونسی دو آیتیں ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے خود رسول اللہ صلعم سے یہ دو آیتیں حاصل کی تھیں لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم؛ آخر سورت تک۔ اس پر عثمانؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ پھر عثمانؓ نے خزیمہ سے پوچھا "بتاؤ ان آیتوں کو کہاں رکھیں" خزیمہ نے جواب دیا کہ قرآن کی جو سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہو اسے ان آیتوں ہی سے ختم کردو۔ چنانچہ سورۂ برأۃ کو ان ہی دو آیتوں سے ختم کردیا گیا۔

لیجئے! اب بات یہانتک پہنچا دی گئی کہ قرآن کو نہ تو رسول اللہؐ نے مرتب فرمایا نہ ہی یہ عہد صدیقی میں مرتب ہوا۔ اس کی ابتداء حضرت عمرؓ نے کی اور وہ بھی اسے ادھورا چھوڑ کر شہید ہوگئے۔ اب آگے پڑھئے:

عہد عثمانی میں قرآن میں اختلافات

(٦) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ یزید بن معاویہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں ولید بن عقبہ کے زمانہ میں مسجد میں اس حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت حذیفہؓ (مشہور صحابی) بھی تشریف فرما تھے۔ مسجد میں اس وقت روکنے والے اور پولیس کے سپاہی وغیرہ موجود نہیں تھے کہ یکایک کسی پکارنے والے نے پکار کر اعلان کیا جو شخص ابو موسیٰ (اشعریؓ) کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو ابواب کندہ کے پاس ہے اور جو شخص عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو عبداللہ کے گھر کی طرف ہے اور وہاں دو آدمیوں میں سورۂ بقرہ کی ایک آیت کے بارہ میں اختلاف ہوا تھا۔ ایک پڑھتا تھا "واتموا الحج والعمرۃ للبیت" اور دوسرا پڑھتا تھا کہ واتموا الحج والعمرۃ للہ" حضرت حذیفہؓ کو غصہ آگیا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ انھوں نے فوراً اپنے کرتہ کو سمیٹ کر بغل میں کیا اور مسجد ہی میں کھڑے ہوگئے۔ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا ہے اور فرمانے لگے یا تو امیرالمومنین میرے پاس آئیں یا میں امیرالمومنین کے پاس جاؤں۔ (تو میں اس کے متعلق ان سے کہوں) کیونکہ تم سے پہلی امتوں نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے خدا نے محمد صلعم کو مبعوث فرمایا انھوں نے مومنین کو ساتھ لیکر منکرین سے قتال کیا حتی کہ خدا نے اپنے دین کو غالب کردیا۔ پھر خدا نے محمد صلعم کو اٹھالیا تو لوگوں نے بے لگام گھوڑے کی طرح ہر طرف دوڑ لگانی شروع کردی۔ پھر خدا نے عمرؓ کو خلیفہ بنایا تو وہ اسلام کے عین وسط میں اترے (اور اس کو اعتدال پر قائم کرنا چاہا) پھر خدا نے ان کو بھی اٹھالیا تو لوگوں نے پھر منہ زور گھوڑے کی طرح ہر طرف جادہ پیمائی شروع کردی۔ اس کے بعد خدا نے عثمانؓ کو خلیفہ بنایا اور واللہ کی قسم وہ وقت قریب ہے کہ لوگ اسلام میں وہ جادہ پیمائی کریں جو اپنی تمام پچھلی جادہ پیمائیوں کو پیچھے چھوڑ جائیے۔

زید بن ثابتؓ کے انتخاب پر عبداللہ بن مسعودؓ کی ناگواری

(٧) امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ جب (عثمانؓ نے اپنے مرتب کردہ قرآن کے علاوہ) باقی تمام مصاحف کو پھاڑ ڈالنے کا حکم دیا تو عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا "لوگو! اپنے قرآنوں کو چھپالو۔ کیونکہ جو شخص کچھ چھپا کر رکھے گا قیامت کے روز

اسے اپنے ساتھ لیکر آئے گا اور بہترین چھپانے کی چیز قرآن ہی ہے جسے تم میں سے کوئی قیامت کے روز اپنے ساتھ لیکر آئے۔

(۸) نیز امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے زید ابن ثابت کیلئے قرآن لکھنے کو ناپسند کیا اور کہنے لگے: اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے تو قرآن لکھنے کے کام سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری ایک ایسے شخص نے لی ہے کہ بخدا میں اسلام لایا تو وہ ابھی اپنے کافر باپ کی صلب میں موجود تھا (یعنی پیدا بھی نہیں ہوا تھا)

غور فرمایا آپ نے کہ جمع قرآن کی مذعومہ کوششوں کے سلسلہ میں صحابہ کا ردعمل کیا بتایا جارہا ہے اور ان کے باہمی تعلقات کو کس رنگ میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۹) نیز امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زر بن حبیش سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: میں نے حضورؐ کے دہن مبارک سے ستر سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور زید بن ثابت ابھی بچہ تھے جن کے سر پر دو زلفیں لہراتی رہا کرتی تھیں (ب۹) نیز شقیق سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے کہا: من یغلل یأت بما غل یوم القیمۃ" عثمانؓ مجھے کس کی قرأت پر قرآن پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ میں نے خود رسول اللہ صلعم سے ستر سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور محمد صلعم کے اصحاب جانتے ہیں کہ میں ان میں کتاب اللہ کا سب سے بڑا جاننے والا ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جانتا ہے تو میں سفر کرکے بھی اس کے پاس جاتا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

(۱۰) نیز امام ابن ابی داؤد ابن شہاب زہری کی اسی روایت کو نقل کرنے کے بعد جو اوپر گذر چکی ہے ابن شہاب زہری ہی کی روایت سے انس ابن مالک انصاری سے یہ اضافہ نقل کرتے ہیں کہ آذربائیجان اور آرمینیہ کے غزوہ میں اہل شام اور اہل عراق جمع ہوئے اور آپس میں انھوں نے ایک دوسرے کو قرآن سنایا تو اس میں بڑا اختلاف ہوا اور قریب ہوگیا کہ ان میں کوئی فتنہ برپا ہوجائے جب حذیفہ ابن الیمان نے قرآن کے بارہ میں ان کے یہ اختلافات دیکھے تو وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا لوگ قرآن کے بارہ میں بڑا اختلاف کررہے ہیں حتیٰ کہ بخدا مجھے یہ اندیشہ ہورہا ہے کہ وہ بھی اسی اختلاف میں مبتلا نہ ہوجائیں جس میں یہود اور نصاریٰ مبتلا ہوچکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ بہت گھبرائے اور انھوں نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیجکر وہ صحیفہ نکلوایا جو ابوبکرؓ کے حکم سے زید بن ثابتؓ نے جمع کیا تھا اور اس سے کئی مصحف لکھوائے اور ان کو ملک کے گوشوں میں بھیجدیا۔ جب مروان مدینہ کا امیر ہوا تو اس نے حضرت حفصہ کے پاس آدمی بھیجکر وہ صحیفے منگائے

مروان نے حضرت حفصہؓ کے صحیفے جلادیئے

تاکہ انھیں جلادے۔ اُسے یہ اندیشہ تھا کہ لکھنے والے ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرنے لگیں مگر حضرت حفصہ نے انکار کردیا۔ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے سالم بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ جب حضرت حفصہؓ کا انتقال ہوا تو مروان نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کے پاس سختی کے ساتھ کہلا کر بھیجا کہ ان صحیفوں کو اس کے پاس بھیجدیں چنانچہ جوں ہی لوگ حضرت حفصہؓ کے جنازہ سے فارغ ہوکر لوٹے عبد اللہ ابن عمرؓ نے وہ صحیفے مروان کے پاس بھیجدیئے۔ مروان نے ان کو الگ الگ کرکے جلادیا اس اندیشہ سے کہ ان صحیفوں میں کوئی چیز اس کے خلاف نہ ہو جو حضرت عثمانؓ نے لکھا تھا۔

عہد عثمانؓ میں قرآن کیسے جمع کیا گیا

(۱۱) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ایوب سے اور وہ ابوقلابہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ایک معلم کسی شخص کی قرارت کے مطابق تعلیم دیتا تھا اور دوسرا معلم دوسرے شخص کی قرارت کے مطابق۔ بچے قرآن پڑھتے اور آپس میں اختلافات کرتے حتی کہ یہ اختلافات معلمین تک بلند ہو گئے اور لوگوں نے ایک دوسرے کی قرارت پر تکفیر تک شروع کر دی۔ حضرت عثمانؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے خطبہ دیا اور کہا تم لوگ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی قرآن میں اختلاف کرتے ہو اور دوسروں کی تغلیط کرتے ہو جو لوگ دوسرے شہروں میں مجھ سے دور ہیں ان کی غلطیاں اور اختلافات تو اور بھی سخت ہیں۔ اے اصحابِ محمد اتفاق سے کام لو اور لوگوں کیلئے ایک (متفقہ) امام (کتاب اللہ) لکھدو۔ ابوقلابہ کہتے ہیں کہ مجھ سے مالک بن انسؒ نے بیان کیا (یہ امام مالک بن انسؒ کے دادا ہیں) کہ میں ان لوگوں میں شریک تھا جنھوں نے ان کو قرآن لکھوایا۔ اگر کسی آیت کے بارہ میں اختلاف ہوتا تھا اور کوئی ایسا آدمی یاد آجاتا تھا جس نے اس آیت کو خود رسول اللہ صلعم سے سیکھا تھا اور بعض مرتبہ وہ شخص موجود نہیں ہوتا تھا یا کسی دیہات میں ہوتا تھا تو اس سے آگے اور پیچھے کی آیتیں لکھ لیتے تھے اور اس آیت کی جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ حتی کہ وہ شخص خود آجاتا یا اس کو بلوالیا جاتا تھا اور اس سے پوچھکر وہ آیت لکھ لی جاتی تھی) جب مصحف لکھنے سے فراغت ہوگئی تو حضرت عثمانؓ نے تمام شہروں میں لکھ دیا کہ میں نے ایسا ایسا کام کیا ہے اور جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اس کو مٹا دیا ہے لہذا جو کچھ (اس قرآن کے خلاف) تمہارے پاس ہو تم بھی اس کو مٹا دو۔

(۱۲) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ مصعب ابن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کو تم سے جدا ہوئے ابھی تیرہ سال ہی گذرے ہیں مگر تم قرآن میں شک کرنے لگے ہو۔ کہتے ہو کہ یہ ابی (بن کعبؓ) کی قرارت ہے اور وہ عبداللہ (بن مسعودؓ) کی قرارت ہے۔ خدا کی قسم تو اپنی قرارت ٹھیک نہیں پڑھتا۔ لہذا میں تم میں سے ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی کتاب اللہ میں سے کوئی چیز ہو وہ بالضرور اسے میرے پاس لے آئے۔ چنانچہ کوئی کاغذ کا ورق لیکر آتا کوئی چمڑے کا ٹکڑا لیکر آتا جس میں قرآن لکھا ہوا ہوتا حتی کہ اس طرح بہت کچھ جمع ہو گیا۔ پھر حضرت عثمانؓ اندر آگئے اور ایک ایک آدمی کو بلا بلا کر قسم دے دیکر انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تم نے اس کو رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے۔ کیا رسول اللہ صلعم نے تمہیں یہ کچھ لکھوایا تھا؟ وہ شخص اقرار کرتا۔ حضرت عثمانؓ اس سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے پوچھا تم میں سے بہترین کاتب کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ کے کاتب زید بن ثابتؓ۔ پھر انھوں نے پوچھا تم میں لغت عربی کا بہترین ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ سعید بن العاصؓ۔ تو حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے۔ سعید لکھوائیں اور زید لکھتے جائیں۔ چنانچہ زید ابن ثابتؓ نے قرآن لکھا اور کئی قرآن لکھے اور ان قرآنوں کو عثمان نے لوگوں میں پھیلا دیا۔ ابوقلابہ کہتے ہیں کہ میں نے بعض اصحابِ محمد کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ عثمانؓ نے بہت اچھا کام کیا۔

(۱۳) امام ابن ابی داؤد اپنی دوسری سند سے مصعب ابن سعد ہی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ابی (ابن کعبؓ) اور عبداللہ (بن مسعودؓ) اور معاذ (ابن جبلؓ) کی قرأت کو سُنا تو لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا ابھی تمہارے نبی کی وفات کو پندرہ سال ہوئے ہیں اور تم قرآن میں اختلاف کرنے لگے ہو۔ میں ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی قرآن میں سے کچھ ہو جسے اس نے

خود رسول اللہ صلعم سے سنا ہو اُسے میرے پاس لے آئے چنانچہ لوگ لکڑی کی تختیاں، ہڈی کے ٹکڑے، کھجور کی چھالیں جن میں قرآن لکھا ہوا تھا لانے لگے۔ جو شخص لیکر آتا اس سے حضرت عثمانؓ پوچھ لیتے کہ کیا اس نے یہ کچھ رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے؟ پھر انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں فصیح ترین شخص کون ہے؟ لوگوں نے سعید بن العاص کا نام لیا۔ پھر پوچھا کہ بہترین ماہر کتابت کون ہے؟ لوگوں نے زید بن ثابت کا نام لیا۔ آپ نے فرمایا اچھا زید لکھیں اور سعید لکھوائیں چنانچہ کئی مصحف لکھے گئے اور ان کو مختلف شہروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس نے عثمانؓ کے اس فعل پر عیب چینی کی ہو۔

(۱۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ محمد (ابن ابیؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور نوبت یہانتک آگئی تھی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہتا تھا کہ جو کچھ تو پڑھتا ہے اس سے تو کافر ہوگیا۔ اس کی اطلاع عثمان بن عفانؓ کو کی گئی تو ان کے دل پر بڑی گرانی ہوئی اور انھوں نے قریش اور انصار کے بارہ آدمیوں کو جمع کیا جن میں ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ بھی تھے اور ان سب کو اس صحن میں اکٹھا کر دیا جو حضرت عمرؓ کے مکان میں تھا۔ اسی مکان میں قرآن رہتا تھا۔ حضرت عثمانؓ بھی ان لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ محمد (ابن ابیؓ) کہتے ہیں کہ مجھ سے کثیر ابن افلح نے بیان کیا جو ان لوگوں کے لئے قرآن لکھنے والوں میں سے ایک تھے کہ اکثر ان بارہ آدمیوں میں اختلاف ہو جاتا تھا تو اس اختلافی آیت کو وہ موخر کر دیا کرتے تھے۔ محمد کہتے ہیں کہ میں نے کثیر سے پوچھا کہ تم لوگ اس کو موخر کیوں کر دیا کرتے تھے تو انھوں نے بتایا کہ یہ مجھے معلوم نہیں۔ محمد کہتے ہیں کہ میں نے اس بارہ میں ایک گمان بنایا ہے تم لوگ اسے یقین نہ بنا لینا۔ میرا گمان یہ ہے کہ جب ان میں کسی آیت کے متعلق اختلاف ہوتا تھا تو وہ اسے اسلئے موخر کر دیتے تھے کہ دیکھیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو حضورؐ کے ساتھ آپ کے آخری دور میں شریک رہا ہو تو اس آیت کو اس کے قول کے مطابق لکھ لیں۔

قرآن کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے قائم کی تھی۔

(۱۵) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عثمانؓ سے کہا کہ تم نے سورۂ انفال کو جو مثانی میں سے ہے سورۂ برأت کے ساتھ کیوں رکھدیا حالانکہ وہ مئین میں سے ہے اور پھر ان دونوں کو سبع طوال میں رکھدیا ہے۔ ایسا تم نے کیوں کیا۔ عثمانؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلعم پر مختلف زمانوں میں مختلف عدد والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب آپ پر کچھ وحی نازل ہوتی تو کسی کاتب کو آپ بلا کر فرما دیتے کہ اس آیت کو ایسی ایسی سورۃ میں رکھدو جس میں ایسا ایسا تذکرہ آیا ہے۔ سورۂ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو ابتداءً مدینہ میں نازل ہوئیں اور سورۂ برأت بالکل آخر میں نازل ہوئی ہے مگر دونوں کا قصہ ایک سا ہے۔ مجھے خیال گذرا کہ سورۂ برأت سورۂ انفال ہی کا حصہ ہے۔ حضور صلعم کا انتقال ہوگیا اور ہمیں آپ نے یہ بتایا نہیں کہ آیا واقعی یہ اسی کا حصہ ہے بھی یا نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے دونوں کو یکے بعد دیگرے لکھدیا ہے اور دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمن الرحیم کی سطر نہیں لکھی اور دونوں کو سبع طوال میں رکھدیا۔

یہانتک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں مرتب ہوا۔ لیکن یہ قرآن کس قسم کا تھا اس کی بابت بھی سُن لیجئے۔

قرآن میں غلطیاں رہ گئیں

(۱۶) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہوگئے اور انھوں نے اسے دیکھا تو فرمایا تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر اس میں کچھ غلطیاں مجھے نظر آتی ہیں جنھیں عرب لوگ اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں گے۔

لیجئے! قرآن عہد عثمانی میں مرتب تو ہوا لیکن اس میں بھی غلطیاں رہ گئیں۔ ان غلطیوں کو حضرت عثمانؓ نے درست نہیں کیا بلکہ علیٰ حالہ رہنے دیا کہ عرب خود اپنی زبان سے درست کرلینگے اور آگے بڑھئے۔

(۱۷) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عکرمہ طائی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ کے پاس مصحف لایا گیا تو اس میں انھیں کچھ غلطیاں نظر آئیں۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا بنو ہذیل کا اور لکھنے والا بنو ثقیف کا کوئی آدمی ہوتا تو اس میں یہ غلطیاں نہ پائی جاتیں۔

(۱۸) سعید ابن جبیر سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا قرآن میں چار حرف غلط ہیں۔ ۱- الصابئون (۵/۶۹) ۲- والمقیمین (۴/۱۶۲) ۳- فاصّدّق واکن من الصلحین (۶۳/۱۰) اور ۴- ان ھٰذانِ لساحران (۲۰/۶۳)

(۱۹) زبیر ابو خالد کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان سے پوچھا کہ آیت والراسخون فی العلم منھم والمومنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوۃ والموتون الزکوٰۃ الآیہ کیسے ہوگیا۔ آگے اور پیچھے رفع لایا گیا ہے اور المقیمین پر نصب ہے۔ ابانؓ نے جواب دیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ پچھلا حصہ لکھ چکا تھا۔ اس نے پوچھا آگے کیا لکھوں۔ لکھوانے والے نے کہا المقیمین الصلوۃ لکھو۔ اس نے جو کچھ کہا گیا لکھدیا۔

(۲۰) عروہ کہتے ہیں کہ قرآن کی غلطیوں کے متعلق میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا۔ ان ھذان لساحران۔ اور۔ والمقیمین الصلوۃ والموتون الزکوٰۃ۔ اور۔ والذین ھادوا والصابئون کے متعلق سوال تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا بھتیجے! یہ کاتبوں کا کام ہے کہ انھوں نے لکھنے میں غلطی کر ڈالی۔

حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف لکھوائے ان میں سے مدینہ منورہ کے تمام مصحف خود امام یعنی ان کے مصحف سے مختلف تھے

(۲۱) خالد ابن ایاس بن صخر ابن ابی الجہم بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے مصحف کو پڑھا ہے اور انھوں نے ان کے مصحف کو اہل مدینہ کے مصحفوں سے بارہ حرفوں میں مختلف پایا ہے (آگے ان اختلافات کی تفصیل دی ہے) جو مندرجہ ذیل نقشہ میں واضح کردیئے گئے ہیں۔

نمبر شمار	امام (یعنی مصحف عثمانؓ)		مصاحف اہل مدینہ
۱	ووصّٰی بھا ابرٰھیم	۲/۱۳۲	ووصّٰی بھا ابراھیم
۲	وسارعوا الی مغفرۃ		سارعوا الی مغفرۃ

۳	ویقول الذین اٰمنوا	۰	یقول الذین اٰمنوا
۴	یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتدَّ منکم		یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتدد منکم
۵	والذین اتخذوا مسجدا		الذین اتخذوا مسجدا
۶	لاجدن خیرا منھا منقلبا		لاجدن خیرا منھما منقلبا
۷	وتوکل علی العزیز الرحیم		توکل علی العزیز الرحیم
۸	اوان یظھر فی الارض الفساد		وان یظھر فی الارض الفساد
۹	من مصیبۃ فبما کسبت		من مصیبۃ بما کسبت
۱۰	وفیھا ما تشتھی الانفس		وفیھا ما تشتھیہ الانفس
۱۱	فان اللہ ھو الغنی الحمید		فان اللہ الغنی الحمید
۱۲	ولا یخاف عقبٰھا		لا یخاف عُقبٰھا

مختلف شہروں کیلئے جو مصحف لکھے گئے تھے ان میں باہمی اختلاف تھا

(۳۲) اس کے بعد امام ابن ابی داؤد نے ایک مستقل باب میں اپنی سندوں کے ساتھ وہ اختلافات نقل کئے ہیں جو ان مصاحف میں موجود تھے۔ جو مختلف شہروں کیلئے لکھے گئے تھے۔ یہ باب کافی طویل ہے بہ نظر اختصار ان اختلافات کو بھی ہم ایک نقشہ سے ظاہر کئے دیتے ہیں جس سے آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف شہروں کے لئے جو مختلف مصاحف لکھوائے تھے اور جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ مصاحف کے اختلافات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے وہ مقصد بھی پورا نہ ہو سکا اور ان تمام کوششوں کے باوجود مختلف شہروں کے مصاحف میں کافی اختلافات باقی رہ گئے۔

نمبر شمار	آیت		مصحف	آیت	مصحف
۱	واَوْصٰی بھا ابراھیم	(۲/۱۳۲)	مدینہ	ووصّٰی بھا	کوفہ و بصرہ
۲	سارعوا الی مغفرۃ من ربکم	(۳/۱۳۳)	۰	وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم	۰
۳	من یَرْتَدِدْ	(۵/۵۴)	۰	من یرتدَّ	۰
۴	لئن اَنْجَیْتَنَا	۶/۶۳	مدینہ و بصرہ	لئن انجانا	کوفہ
۵	الذین اتخذوا مسجدا ضرارا	۹/۱۰۷	مدینہ	والذین اتخذوا مسجدا	کوفہ و بصرہ
۶	خیرا منھما منقلبا	۱۸/۳۶	۰	خیرا منھا منقلبا	۰
۷	فتوکل	۲۶/۲۱۷	۰	وتوکل	۰
۸	وان یظھر فی الارض	۴۰/۲۶	۰	اوان یظھر	۰

نمبر شمار	آیت		مصحف	آیت	مصحف
٩	وما اصابکم من مصیبۃ بما کسبت	(٤٢/٣٠)	مدینہ	فبما کسبت	بصرہ وکوفہ
١٠	فیہا ما تشتھیہ الانفس	(٤٣/٧١)	•	ما تشتھی الانفس	•
١١	ومن یتول فان اللہ الغنی الحمید	(٥٧/٢٤)	•	فان اللہ ھو الغنی الحمید	•
١٢	فلا یخاف عقبٰہا	(٩١/١٥)	•	ولا یخاف	;
١٣	قل ربی یعلم	(٢١/٤)	مدینہ بصرہ	قال ربی یعلم	کوفہ
١٤	قل انما ادعو ربی	(٧٢/٢٠)	•	قال انما ادعو ربی	•
١٥	لِلّٰہ - لِلّٰہ - لِلّٰہ	(٢٣/ ٨٩-٨٧-٨٥)	مدینہ وکوفہ	للہ - اللہ - اللہ	بصرہ
١٦	ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا	(٤٦/١٥)	کوفہ	ووصینا الانسان بوالدیہ حسنا	مدینہ وبصرہ
١٧	وما عملت	(٣٦/٣٥)	•	وما عملتہُ ایدیھم	•
١٨	فھل ینظرون الا الساعۃ ان تأتیھم بغتۃ	(٤٧/١٨)	مکہ وکوفہ	ان تأتیھم	•
١٩	وسیعلم الکافر	(١٣/٤٢)	مدینہ	وسیعلم الکفار	عراق
٢٠	جاؤا بالبینات وبالزبر	(٣/١٨٤)	شام وحجاز	جاؤا بالبینات والزبر	•
٢١	ما فعلوہ الا قلیلا	(٤/٦٦)	شام	ما فعلوہ الا قلیل	•
٢٢	زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم	(٦/١٣٧)	شام وحجاز	زین لکثیر من المشرکین قتل اولادِھم شرکائھم	•
٢٣	واذ انجاکم من اٰل فرعون	(٧/١٤١)	•	وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ	•
٢٤	ثم کیدون فلا تنظرون	(٧/١٩٥)	•	ثم کیدونِ	•
٢٥	ما کان للنبیّ	(٨/٦٧)	شام	ما کان لنبیّ	•
٢٦	ھو الذی ینشرکم فی البر والبحر	(١٠/٢٢)	•	ھو الذی یُسَیِّرُکُمْ	•
٢٧	کانوا ھم اشد منکم	(٤٠/٢١)	شام وحجاز	کانوا ھم اشد منھم	•
٢٨	والحب ذا العصف	(٥٥/١٢)	•	والحب ذو العصف	•
٢٩	تبارک اسم ربک ذو الجلال	(٥٥/٧٨)	•	ذی الجلال	•
٣٠	وکل وعد اللہ الحسنیٰ	(٥٧/١٠)	•	وکلا وعد اللہ الحسنیٰ	•
٣١	فامنوا باللہ ورسولہ	(٤/١٧١)	مکہ	ورسلہ	بصرہ
٣٢	تجری من تحتھا الانھر	(٩/١٠٠)	•	تجری تحتھا الانھر	

نمبر شمار	آیت		مصحف	آیت	مصحف
۳۳	وما عملت ایدیھم	(۳٦/۳۵)	کوفہ	وما عملتہ ایدیھم	بصرہ
۳۴	ولئن انجانا من ھذہ	(٦/٦۳)	"	ولئن اَنْجَیْتَنَا	"
۳۵	قال سبحٰن ربی	(۱۷/۹۳)		قل سبحن ربی	"
۳٦	قال ربی یعلم القول فی السماء	(۲۱/۴)	"	قل ربی یعلم القول فی السماء	"
۳۷	قال رب احکم بالحق		"	قل رب احکم بالحق۔	"

نوٹ: فہرست طویل ہوجانے کے خوف سے واؤ، فاء، اَوْ وغیرہ کے اختلافات کو ہم نے قصداً نظر انداز کر دیا ہے۔

حجاج ابن یوسف نے مصحفِ عثمانی میں گیارہ موقعوں پر تبدیلی کی

(۲۳) امام ابن ابی داؤد نے اپنی سندوں کے ساتھ عوف ابن ابی جمیلہ سے (ص۴۹ و ص۱۱۷) میں نقل کیا ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی نے اپنے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں گیارہ جگہ پر تبدیلیاں کیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

نمبر شمار	مصحف عثمانی رضی اللہ عنہ		حجاج ابن یوسف کی تبدیلی
۱	لَمْ یَتَسَنَّ وانظر	(۲/۲۵۹)	لَمْ یَتَسَنَّہْ وانظر
۲	شریعۃ ومنھاجا	(۵/۴۸)	شرعۃ ومنھاجا
۳	ھوالذی ینشرکم	(۱۰/۲۲)	ھوالذی یسیّرکم
۴	انا اُنبّئکم بتاویلہ	(۱۲/۴۵)	اَنَا اُنَبِّئُکُمْ بتاویلہ
۵	سیقولون للہ للہ للہ	(۲۳/۸۵-۸۷-۸۹)	سیقولون للہ اللہ اللہ
٦	من المخرجین	(۲٦/۱۱٦)	من المرجومین
۷	من المرجومین	(۲٦/۱٦۷)	من المخرجین
۸	نحن قسمنا بینھم معایشھم	(۴۳/۳۲)	معیشتھم
۹	من ماء غیر یاسن		من ماء غیر اٰسن
۱۰	فالذین اٰمنوا منکم واتقوا	(۵۷/۷)	فالذین اٰمنوا منکم وانفقوا
۱۱	وما ھو علی الغیب بظنین	(۸۱/۲۴)	وما ھو علی الغیب بضنین۔

کبار صحابہؓ کے مصاحف ایک دوسرے سے مختلف تھے

اس کے بعد امام ابن ابی داؤد نے ایک مستقل باب میں متعدد مختلف سندوں کے ساتھ بڑے بڑے صحابہ کے مصاحف کے باہمی اختلافات واضح کئے ہیں جو روایات کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں

ان تمام روایتوں کو بیان کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ روایات کو دیکھنے کے لئے آپ خود کتاب المصاحف ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں ہم مختصراً صرف اختلافات کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

مصحف عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف فاروقی میں
۱	صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ۰ (۱/۷)	صراط من انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم وغیر الضالین۔
۲	آلٓمٓ ۰ اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم ۰ (۳/۲)	الم ۰ اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیام
۳	فی جنّٰت یتساءلون عن المجرمین ما سلککم فی سقر (۷۴/۴۰-۴۲)	فی جنات یتساءلون ۰ یا فلان ما سلکک فی سقر۔

مصحف علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف حیدریؓ میں
۱	اٰمن الرسول بما انزل علیہ من ربہ والمؤمنون	اٰمن الرسول بما انزل علیہ واٰمن المومنون

مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف ابی بن کعبؓ میں
۱	واحل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسٰفحین ۰ فما استمتعتم بہ منھن فاٰتوھن اجورھن فریضۃ ۰ (۴/۲۴)	. . . . فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمّی فاٰتوھن اجورھن فریضۃ ۰ [1]
۲	للذین یؤلون من نسائھم تربص اربعۃ اشھر (۲/۲۲۶)	للذین یقسمون تربص اربعۃ اشھر
۳	فلاجناح علیہ ان یطّوّف بھما (۲/۱۵۸)	فلاجناح علیہ ان لایطوف بھما
۴	فمن لم یجد فصیام ثلٰثۃ ایام ۰ ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم (۵/۸۹)	فمن لم یجد فصیام ثلٰثۃ ایام متتابعات فی کفارۃ الیمین۔

مصحف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ میں
۱	ان اللہ لایظلم مثقال ذرۃ (۴/۴۰)	ان اللہ لایظلم مثقال نملۃ

[1] آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے مصحف میں بھی اسی طرح ہے معلوم نہیں ہمارا ملا شیعوں کے متعہ نکاح سے اسقدر ناراض کیوں ہے جبکہ اس کی روایات کے مطابق متعہ کا جواز خود قرآن سے ثابت ہے اور وہ بھی دو دو جلیل القدر صحابیوں کے قرآن سے۔ متعاود

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ میں
۲	یٰمریم اقنتی لربک واسجدی وارکعی مع الراکعین (۳/۴۲)	یٰمریم اقنتی لربک وارکعی واسجدی مع الساجدین۔
۳	لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم ۔ (۲/۱۹۸)	(۱) لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم فی مواسم الحج۔ (۲) لاجناح علیکم ان تبتغوا فضلا من ربکم فی مواسم الحج فابتغوا حینئذ۔
۴	بل یداہ مبسوطتان (۵/۶۴)	بل یداہ بسطان
۵	وتزودوا فان خیر الزاد التقوٰی (۲/۱۹۷)	وتزودوا وخیر زاد التقوٰی۔
۶	من بقلہا وقثاءہا وفومہا وعدسہا۔ (۲/۶۱)	من بقلہا وقثاءہا وثومہا وعدسہا۔
۷	والعصر ان الانسان لفی خسر ۰ الا الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ (۱۰۳/۱-۳)	والعصر ان الانسان لفی خسر وانہ فیہا الی اٰخر الدہر الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالصبر۔
۸	اولٰئک لہم نصیب مما کسبوا (۲/۲۰۲)	اولٰئک لہم نصیب مما اکتسبوا
۹	ولکل وجہۃ ہو مولیہا۔ (۲/۱۴۸)	ولکل جعلنا قبلۃ یرضونہا
۱۰	واتموا الحج والعمرۃ للہ (۲/۱۹۶)	واقیموا الحج والعمرۃ للبیت
۱۱	وحیث ما کنتم فولوا وجوہکم شطرہ۔ (۲/۱۴۴)	وحیث ما کنتم فولوا وجوہکم قبلہ
۱۲	ولا تجہر بصلاتک ولا تخافت بہا	ولا تخافت بصوتک ولا تعال بہ
۱۳	فازلہما الشیطٰن عنہا فاخرجہما مما کانا فیہ (۲/۳۶)	فوسوس الشیطٰن عنہا فاخرجہما مما کانا فیہ
۱۴	ولا یقبل منہا شفاعۃ۔ (۲/۴۸)	لا یوخذ منہا شفاعۃ
۱۵	ان البقر تشابہ علینا۔ (۲/۷۰)	ان البقر متشابہ
۱۶	وان یاتوکم اُسٰرٰی تُفٰدوہم (۲/۸۵)	وان یؤخذوا تفدوہم
۱۷	واذ یرفع ابرٰہیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا۔ (۲/۱۲۷)	واذ یرفع ابرٰہیم القواعد من البیت واسمٰعیل یقولان ربنا تقبل منا۔
۱۸	واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ (۲/۸۳)	. . . . لا یعبدون الا اللہ
۱۹	ثم تولیتم الا قلیلا منکم (۲/۸۳)	ثم تولوا الا قلیلا منہم
۲۰	ومن تطوع خیرا۔ (۲/۱۵۸)	فمن تطوع خیرا۔
۲۱	لیس البر ان تولوا وجوہکم۔ (۲/۱۷۷)	لا تحسبن انہ البر۔

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ میں
۲۲	هل ينظرون الا ان يأتيهم الله فى ظلل من الغمام والملٰئكة (۲/۲۱۰)	هل ينظرون الا ان يأتيهم الله والملٰئكة فى ظلل من الغمام ـ
۲۳	الا ان يخافا الا يقيما حدود الله ـ (۲/۲۲۹)	الا ان يخافوا الا يقيما حدود الله
۲۴	وان طلقتموهن من قبل ان تمسوهن ـ (۲/۲۳۷)	...... من قبل ان تجامعوهن ـ
۲۵	قال اعلم ان الله على كل شئ قدير ـ (۲/۲۵۹)	قيل اعلم ان الله على كل شئ قدير ـ
۲۶	ما ننسخ من اٰية او ننسها ـ (۲/۱۰۶)	ما ننسك من اٰية او ننسخها ـ
۲۷	يسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه (۲/۲۱۷)	يسئلونك عن الشهر الحرام عن قتال فيه
۲۸	لمن اراد ان يتم الرضاعة ـ (۲/۲۳۳)	لمن اراد ان يكمل الرضاعة
۲۹	حافظوا على الصلوات والصلوٰة الوسطى (۲/۲۳۸)	حافظوا على الصلوات وعلى الصلوٰة الوسطى ـ
۳۰	فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فى الحج ـ (۲/۱۹۷)	فلا رفثٌ ولا فسوقٌ ولا جدالٌ فى الحج ـ
۳۱	الله لا اله الا هو الحى القيوم ـ (۳/۲)	.... الحى القيام
۳۲	وما يعلم تأويله الا الله ـ (۳/۷)	وان حقيقة تأويله الا عند الله
۳۳	ويقتلون الذين يأمرون بالقسط (۳/۲۱)	وقاتلوا الذى ....
۳۴	فنادته الملٰئكة وهو قائم يصلى فى المحراب ان الله يبشرك بيحيٰى (۳/۳۹)	وناداه الملٰئكة يا زكريا ان الله يبشرك بيحيٰى ـ
۳۵	فاما الذين اٰمنوا وعملوا الصلحت فيوفيهم اجورهم (۳/۵۷)	.... فاُوَفِّيهم اجورهم
۳۶	ومن اهل الكتٰب من ان تامنه بقنطار يؤده اليك ومنهم من ان تامنه بدينار لا يؤده اليك ـ (۳/۷۵)	.... بقنطار توفه اليك .... بدينار لا يوفه اليك ـ
۳۷	اذ قالت الملٰئكة يمريم ان الله يبشرك ـ (۳/۴۵)	وقالت الملٰئكة يا مريم ان الله ليبشرك
۳۸	ويعلمه الكتٰب والحكمة ـ (۳/۴۸)	ونعلمه الكتب والحكمة
۳۹	والله بما تعملون بصير ـ (۳/۱۵۶)	والله بصير بما يعملون
۴۰	وان الله لا يضيع اجر المؤمنين ـ (۳/۱۷۱)	والله لا يضيع اجر المؤمنين ـ
۴۱	ونقول ذوقوا عذاب الحريق ـ (۳/۱۸۱)	ويقال لهم ذوقوا عذاب الحريق ـ
۴۲	ان الذين يأكلون اموال اليتمٰى ظلما انما يأكلون فى بطونهم نارا ط وسيصلون سعيرا ـ (۴/۱۰)	ومن ياكل اموال اليتامٰى ظلما فانما ياكل فى بطنه نارا وسوف يصلى سعيرا ـ

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ میں
۴۳	او یغلب فسوف نؤتیہ اجراً عظیماً ۔ (۴/۷۴)	او یغلب نؤتہ اجراً عظیماً
۴۴	فاذا برزوا من عندک بیّت طائفۃ منہم (۴/۸۱)	.... بیّتَ مبیّت منہم
۴۵	وسوف یؤت اللہ المؤمنین اجراً عظیماً (۴/۱۴۶)	وسیوتی اللہ المومنین ....
۴۶	فسوف نؤتیہ اجراً عظیماً ۔ (۴/۱۱۴)	فسیؤتیہ اجراً عظیماً
۴۷	اولئک سوف یؤتیہم اجورہم وکان اللہ غفوراً رحیماً ۔ (۴/۱۵۲)	اولئک سنؤتیہم اجورہم وقد انزل علیکم فی الکتاب وکان اللہ غفوراً رحیماً ۔
۴۸	قال اللہ انی منزلہا علیکم ۔ (۵/۱۱۵)	قال سأنزلہا علیکم
۴۹	ان تعذبہم فانہم عبادک	ان تعذبہم فعبادک
۵۰	ثم لم تکن فتنتہم الا ان قالوا (۶/۲۳)	ما کان فِتنتَہُمْ الا ان قالوا
۵۱	حتی اذا جاء احدکم الموت توفتہ رسلنا ۔ (۶/۶۱)	...... الموت یتوفاہ رسلنا
۵۲	ان الحکم الا للہ یقص الحق ۔ (۶/۵۷)	.... یقضی بالحق
۵۳	کالذی استہوتہ الشیٰطین (۶/۷۱)	کالذی استہوتہ الشیطٰن
۵۴	لقد تقطع بینکم وضل عنکم ۔ (۶/۹۴)	لقد تقطع ما بینکم ......
۵۵	کانما یصّعّد فی السماء (۶/۱۲۵)	کانما یتصعّد فی السماء
۵۶	ولیقولوا درست (۶/۱۰۵)	لَیقولُوا دَرَسَ
۵۷	ان ھذا صراطی مستقیماً (۶/۱۵۳)	وھذا صراطی مستقیماً ۔
۵۸	قالوا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا ۔ (۷/۲۳)	قالوا ربنا الا تغفر لنا وترحمنا
۵۹	اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک والہتک (۷/۱۲۷)	... لیفسدوا فی الارض وقد ترکوک ان یعبدوک والہتک
۶۰	والذین یمسّکون بالکتٰب ۔ (۷/۱۷۰)	ان الذین استمسکوا بالکتاب
۶۱	وان اللہ مع المؤمنین (۸/۱۹)	واللہ مع المؤمنین
۶۲	ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا ۔ (۸/۵۹)	ولا یحسبُ الذین کفروا سبقوا
۶۳	وما منعہم ان تُقبَلَ منہم نفقٰتہم (۹/۵۴)	..... ان تَتَقَبَّلَ منہم نفقٰتہم
۶۴	قل اذن خیر لکم یؤمن باللہ (۹/۶۱)	قل اذن خیر ورحمۃ لکم یؤمن باللہ
۶۵	الا ان تقطع قلوبہم (۹/۱۱۰)	ولو قطّعت قلوبہم

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ میں
۶۶	اولا یرون انھم یفتنون (۹/۱۲۶)	اولم تروا انھم یفتنون
۶۷	من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم (۹/۱۱۷)	من بعد ما زاغت قلوب طائفۃ منھم
۶۸	حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم ۔ (۱۰/۲۲)	. . . . وجرین بکم
۶۹	ولقد ارسلنا نوحاً الی قومہ انی لکم نذیر مبین (۱۱/۲۵)	ولقد ارسلنا نوحاً الی قومہ فقال یقوم انی لکم نذیر مبین ۔
۷۰	ان کنت علی بینۃ من ربی واٰتٰنی رحمۃ من عندہ فعمیت علیکم (۱۱/۲۸)	ان کنت علی بینۃ من ربی فعمیت علیکم
۷۱	ولا تضرونہ شیئاً (۱۱/۵۷)	ولا تنقصونہ شیئاً
۷۲	فاسر باھلک بقطع من الیل ولا یلتفت منکم احد الا امرأتک ۔ (۱۱/۸۱)	فاسر باھلک بقطع من اللیل الا امرأتک
۷۳	قل افاتخذتم من دونہ اولیاء (۱۳/۱۶)	قل اَفَتَّخَذْتُمْ . . . . . .
۷۴	وَسَیَعلم الکُفّٰرُ لمن عقبی الدار (۱۳/۴۲)	وسیعلم الکافرون لمن عقبی الدار
۷۵	ولا یلتفت منکم احد (۱۵/۶۵)	ولا یلتفتن منکم احد
۷۶	وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ۔ (۱۶/۱۲)	وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والریاح بامرہ ۔
۷۷	الذین تتوفٰھم الملٰئکۃ (۱۶/۲۸)	الذین توفاھم الملئکۃ
۷۸	ولنجزین الذین صبروا اجرھم (۱۶/۹۶)	ولیوفین الذین صبروا اجرھم
۷۹	فلنحیینہ حیٰوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم (۱۶/۹۷)	. . . . . حیٰوۃ طیبۃ ولیوفینھم اجرھم
۸۰	اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلٰھما فلا تقل لھما اف (۱۷/۲۳)	اما یبلغان عندک الکبر اما واحد اما کلاھما فلا تقل لھما اف
۸۱	تسبح لہ السمٰوٰت السبع والارض (۱۷/۴۴)	سبحت لہ الارض وسبحت لہ السمٰوٰت
۸۲	لٰکنا ھو اللہ ربی (۱۸/۳۸)	لکن ھو اللہ ربی
۸۳	یوم یقول نادوا شرکاءی (۱۸/۵۲)	یوم یقول لھم نادوا شرکاءی
۸۴	قبل ان تنفد کلمٰت ربی (۱۸/۱۰۹)	قبل ان تُقْضیٰ کلمات ربی
۸۵	قول الحق الذی فیہ یمترون (۱۹/۳۴)	قال الحق الذی فیہ یمترون
۸۶	تکاد السمٰوٰت یتفطرن منہ (۱۹/۹۰)	تکاد السمٰوٰت لتتصدع منہ
۸۷	فاُولٰئک یدخلون الجنۃ (۱۹/۶۰)	فاولٰئک سیدخلون الجنۃ
۸۸	ءَ اِذا ما مت لسوف اُخرج حیا (۱۹/۶۶)	ءاذا ما متُّ سأخرج ۔ ۔

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ بن مسعودؓ میں
۸۹	ان کل من فی السمٰوٰت و الارض الا اٰتی الرحمٰن عبدًا (۱۶/۹۳)	...... والارض لما اتی الرحمٰن عبدا
۹۰	انما صنعوا کید سٰحِرٍ (۱۶/۶۹)	..... کید سحرٍ
۹۱	قد انجینٰکم من عدوّکم (۱۶/۸۰)	قد انجیتکم من عدوکم
۹۲	ومن الشیٰطین من یغوصون له ویعملون عملاً دون ذلک وکنا له حٰفظین۔ (۱۷/۸۲)	ومن الشیٰطین من یغوص له ویعمل وکنا لهم حٰفظین۔
۹۳	اذن للذین یقٰتلون بانهم ظلموا۔ (۱۷/۳۹)	اذن للذین قاتلوا بانهم ظلموا
۹۴	سورة انزلنٰها وفرضنٰها (۱۸/۱)	سورة انزلنٰها وفرّضنٰها
۹۵	فی بیوت اذن الله ان ترفع ویذکر فیها اسمه یسبح له فیها بالغدو والاٰصال (۱۸/۳۶)	.... ویذکر فیها اسمه یسبحون له فیها رجال بالغدو والاٰصال۔
۹۶	لا تحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض (۱۸/۵۷)	اَیَحسِبُ الذین کفروا معجزین فی الارض
۹۷	وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا۔ (۲/۲۱۴)	فزلزلوا ثم زلزلوا ویقول الرسول والذین اٰمنوا۔
۹۸	ان الله لا یظلم مثقال ذرة (۵/۴۰)	ان الله لا یظلم مثقال نملة
۹۹	وهو الذی ارسل الریٰح بشرًا۔ (۱۹/۴۸)	...... الریاح مبشرات
۱۰۰	انسجد لما تأمرنا (۱۹/۶۰)	..... لما تامرنا به
۱۰۱	وجعل فیها سِرٰجًا (۱۹/۶۱)	...... فیها سُرُجًا
۱۰۲	هب لنا من ازواجنا وذریٰتنا (۱۹/۷۴)	...... ازواجنا وذریّتنا
۱۰۳	فمکث غیر بعید (۱۹/۲۲)	فیمکث غیر بعید
۱۰۴	تکلمهم ان الناس (۲۰/۸۲)	تکلمهم بان الناس
۱۰۵	الا یسجدوا لله (۱۹/۲۵)	هلا یسجدون لله
۱۰۶	قالوا سحرٰن تظٰهرا (۲۰/۴۸)	قالوا سحران تظاهرا
۱۰۷	فعمیت علیهم الانباء (۲۰/۶۶)	وعُمّیت علیهم الانباء
۱۰۸	لولا ان منّ الله علینا لخسف بنا (۲۰/۸۲)	..... علینا لانخسف بنا
۱۰۹	وقال انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیٰوة الدنیا (۲۰/۲۵)	انما اتخذتم من دون الله اوثانا وتخلقون افکا انما مودة بینکم فی الحیٰوة الدنیا۔

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ بن مسعودؓ میں
۱۱۰	لیکفروا بما اٰتینٰھم ولیتمتعوا (۲۹/۶۶)	لیکفروا بما اٰتاھم قل تمتعوا
۱۱۱	ھدی ورحمۃ للمحسنین (۳۱/۳)	ھدی وبشری للمحسنین
۱۱۲	فلا تعلم نفس ما اخفی لھم (۳۲/۱۷)	فلا تعلمن نفس ما یخفی لھم
۱۱۳	لما صبروا۔ (۳۲/۲۴)	بما صبروا
۱۱۴	من یقنت منکن للہ ورسولہ وتعمل صالحا (۳۳/۳۱)	من تعمل منکم من الصٰلحٰت وتقنت للہ ورسولہ
۱۱۵	یرضین بما اٰتیتھن کلھن (۳۳/۵۱)	یرضین بما اُوتین کلھن
۱۱۶	وَالعنھم لعنا کبیرا (۳۳/۶۸)	والعنھم لعنا کبیرا
۱۱۷	وھم فی الغرفٰت اٰمنون (۳۴/۳۷)	وھم فی الغرفۃ اٰمنون
۱۱۸	قل ان ربی یقذف بالحق علام الغیوب (۳۴/۴۸)	۔۔۔۔۔۔ بالحق وھو علام الغیوب
۱۱۹	فی ظِلٰل علی الارائک متکئون (۳۶/۵۶)	فی ظُلَل علی الارائک متکئین
۱۲۰	فی شغل فٰکِھون (۳۶/۵۵)	۔۔۔۔ فکِھین۔
۱۲۱	سَلٰمٌ علی اِلْ یاسین (۳۷/۱۳۰)	سلام علی ادراسین
۱۲۲	اللہَ رَبّکم وربَّ اٰبائکم الاولین (۳۷/۱۲۶)	رَبّکم اللہ وربّ اٰبائکم الاولین
۱۲۳	ان یبدل دینکم اوان یظھر فی الارض الفساد (۴۰/۲۶)	ان یبدل دینکم ویظھر فی الارض الفساد
۱۲۴	کذالک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار (۴۰/۳۵)	یطبع اللہ علی کل قلب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۱۲۵	تکاد السمٰوٰت یتفطرن (۴۲/۵)	۔۔۔۔۔۔ ینفطِرنَ
۱۲۶	اَشَھِدُوا خلقھم (۴۳/۱۹)	ما شَھِدَ خلقھم
۱۲۷	فلولا القی علیہ اَسْوِرَۃٌ (۴۳/۵۳)	لولا القی علیہ اَسَاوِرمُ
۱۲۸	وعندہ علم الساعۃ (۴۳/۸۵)	وانہ علیم للساعۃ
۱۲۹	ان وعد اللہ حق والساعۃ لاریب فیھا (۴۵/۳۲)	ان وعد اللہ حق وان الساعۃ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۱۳۰	فھل ینظرون الا الساعۃ ان تاتیھم بغتۃ (۴۷/۱۸)	۔۔۔۔۔۔ الا الساعۃ تاْتیھم بَغتۃً
۱۳۱	فسیؤتیہ اجرا عظیما (۴۸/۱۰)	فسیؤتیہ اللہ اجرا عظیما
۱۳۲	ان اراد بکم ضرا او اراد بکم نفعا (۴۸/۱۱)	۔۔۔۔۔۔ او اراد بکم رَحْمَۃً
۱۳۳	ان یبدلوا کلٰمَ اللہ (۴۸/۱۵)	ان تبدلوا کلِمَ اللہ

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ بن مسعودؓ میں
۱۳	لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (۲۶/۱۳)	لتعارفوا وخیارکم عند اللہ اتقاکم
۱۳	خشّعًا ابصارھم (۵۴/۷)	خاشعۃً ابصارھم
۱۳۰	فلا اقسم بمواقع النجوم (۵۶/۷۵)	. . . . . بموقع النجوم
۱۳	وجاء فرعون ومن قبلہٗ (۶۹/۹)	. . . . . ومن قَبَلَہ
۱۳۰	فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر (۸۸/۲۴)	فانہ یعذبہ . . . .

مندرجہ بالا تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ ایک سو اڑتیس [۱۳۸] موقعوں پر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قرآن ہمارے موجودہ قرآن سے مختلف تھا۔ اور ایک سو اڑتیس موقع بھی اس لئے ہیں کہ ہم نے اختصاراً زبر زیر پیش اور واو فاء اور آؤ وغیرہ کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا ہے ورنہ کل اختلافات کی تعداد ایک سو پچاس تک پہنچتی ہے۔

مصحف عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ ابن عباسؓ میں
۱	فلا جناح علیہ ان یطوف بہما۔ (۲/۱۵۸)	. . . . . . ان لا یطوف بہما
۲	لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلًا من ربکم فاذا افضتم (۲/۱۹۸)	لا جناح علیکم ان تبتغوا فضلًا من ربکم فی مواسم الحج فاذا افضتم
۳	انما ذٰلکم الشیطٰن یخوف اولیاءہ (۳/۱۷۵)	. . . . . یخوفکم اولیاءہ
۴	اولٰئک لہم نصیب مما کسبوا (۲/۲۰۲)	. . . . . مما اکتسبوا
۵	واتموا الحج والعمرۃ للہ (۲/۱۹۶)	واقیموا الحج والعمرۃ للبیت
۶	وشاورھم فی الامر۔ (۳/۱۵۹)	وشاورھم فی بعض الامر
۷	وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی۔ (۲۲/۵۲)	. . . . ولا نبی محدَّث
۸	یٰحسرۃً علی العباد (۳۶/۳۰)	یا حسرۃَ العباد
۹	کاَنّکَ حفیٌّ عنہا (۷/۱۸۷)	. . . . حفیٌّ بہا
۱۰	وان عزموا الطلاق۔ (۲/۲۲۷)	وان عزموا السراح
۱۱	وما یعلم تاویلہٗ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون اٰمنا بہ (۳/۷)	وما یعلم تاویلہ ویقول الراسخون اٰمنا بہ
۱۲	فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ (۲/۱۳۷)	فان اٰمنوا بالذی اٰمنتم بہ " بما اٰمنتم بہ
۱۳	حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطٰی (۲/۲۳۸)	. . . . . والصلوۃ الوسطٰی وصلوۃ العصر

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ ابن عباسؓ میں
۱۴	فما استمتعتم بہ منھن فاتوھن اجورھن (۴/۲۴)	فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی فاتوھن اجورھن۔[1]
۱۵	طیبٰت احلت لھم (۴/۱۶۰)	طیبٰت کانت احلت لھم
۱۶	اذا جاء نصر اللہ والفتح (۱۱۰/۱)	اذا جاء فتح اللہ والنصر

مصحف حضرت عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ

نمبر شمار	مصحف عثمانیؓ میں	مصحف عبداللہ ابن الزبیرؓ میں
۱	لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم۔ (۲/۱۹۸)	لاجناح علیکم ان تبتغو فضلا من ربکم فی مواسم الحج۔
۲	وکذلک نصرف الاٰیٰت ولیقولوا درست (۶/۱۰۵)	...... ولیقولوا دارست
۳	فی جنّٰت یتسائلون ٭ عن المجرمین ٭ ما سلککم فی سقر (۷۴/۴۰-۴۲)	فی جنت یتساءلون ٭ یا فلان ما سلکک فی سقر
۴	فیصبحوا علٰی ما اسروا فی انفسھم ندمین (۵/۵۲)	فیصبح الفساق علی اسرو...
۵	ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولٰئک ھم المفلحون۔ (۳/۱۰۴)	ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویستعینون باللہ علٰی ما اصابھم واولٰئک ھم المفلحون۔
۶	صراط الذین انعمت علیھم۔ (۱/۷)	صراط من انعمت علیھم

مصحف عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ابوبکر بن عیاش سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے شعیب بن شعیب بن محمد بن عبداللہ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ میرے اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی۔ انھوں نے فرمایا کیا میں تمہیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا مصحف دکھلاؤں چنانچہ انھوں نے مجھے وہ مصحف دکھایا تو اس میں بہت سے الفاظ ہمارے مصحف کے الفاظ سے مختلف تھے۔ ابوبکر بن عیاش کہتے ہیں کہ انھوں نے مجھے ایک سیاہ جھنڈا بھی دکھایا جو موٹے کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں ایک دستہ اور دو گھنڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ یہ جھنڈا رسول اللہ صلعم کا ہے جو حضرت عمرو بن العاص کے پاس تھا۔ امام ابن ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس حدیث میں میرے والد (یعنی امام حدیث ابوداؤد صاحب سنن) نے محمد بن العلاء کے واسطہ سے ابوبکر بن عیاش ہی سے یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ مصحف خود ان کے دادا عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ کا لکھا ہوا تھا۔

---

[1] یہی کچھ ابی ابن کعبؓ کے مصحف کے حوالہ سے بھی پہلے گزر چکا ہے جس سے شیعوں کے متعہ نکاح کا ثبوت ٭ روایات کی رو سے مرتب شدہ قرآن ٭ سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے۔ ۱۲۔ طلوع اسلام

مصحف حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا

نمبر شمار	مصحف عثمانی میں	مصحف عائشہ صدیقہؓ میں
۱	حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ (۲۳۸/۲)	حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ وصلوۃ العصر۔
۲	ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ (۵۶/۳۳)	ان اللہ وملئکتہ یصلون علی النبیؐ والذین یصلون الصفوف الاول۔ یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔

مصحف حضرت حفصہ وام سلمہ امہات المومنین رضی اللہ عنہما

ان دونوں امہات المؤمنین کے مصاحف میں بھی آیت ۲۳۸/۲ میں و صلوۃ العصر کا اضافہ موجود تھا۔

مصاحف تابعینؒ

آپ کو مبادا یہ خیال گزرے کہ صحابہ کے دور میں، جمع عثمانی سے پہلے ممکن ہے مختلف صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مصاحف میں اختلافات ہوں گے لیکن جمع عثمانی کے بعد وہ تمام اختلافات دور ہو گئے ہوں گے۔ یہ بات نہیں۔ ہمارے مجموعہ ہائے روایات میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ قرن ثانی یعنی عہد تابعین تک میں یہ اختلافات موجود تھے۔ چنانچہ امام ابن ابی داؤد نے اپنی کتاب المصاحف میں عہد صحابہ کے بعد عہد تابعین کے ان مصاحف کا تذکرہ بھی کیا ہے جو ان روایات کے مطابق ہمارے موجودہ قرآن سے مختلف تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان تمام مصاحف کے اختلافات کو بالتفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ہم صرف مختصراً ان تابعین کے اسماء گرامی کے تذکرہ پر یہاں اکتفاء کرتے ہیں جن کے مصاحف مصحف عثمانی سے مختلف بیان کئے جاتے ہیں۔ امام ابن ابی داؤد نے اس سلسلہ میں مصحف عبید بن عمیر لیثی مصحف عطاء ابن ابی رباح مصحف عکرمہ مولی ابن عباس مصحف مجاہد بن جبر مخزومی مصحف سعید بن جبیر مصحف اسود بن یزید نخعی مصحف علقمہ ابن قیس نخعی مصحف طلحہ ابن مصرف ایامی مصحف سلیمان بن مہران اعمش کوفی رحمۃ اللہ علیہم کا تذکرہ فرمایا ہے۔

آج ہمارے پاس حجاج ابن یوسف کا اصلاح کردہ مصحف ہے

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا حجاج ابن یوسف نے گیارہ مقامات پر حضرت عثمانؓ کے قرآن میں تبدیلی کی اور ان روایتوں کے مطابق یہی تبدیل شدہ قرآن ہے جو آج امت کے پاس موجود ہے۔ بالفاظ دیگر جو قرآن آج امت کے پاس موجود ہے وہ نہ من وعن رسول اللہ صلعم کا دیا ہوا ہے نہ صحابہ کا مرتب کردہ بلکہ یہ وہ قرآن ہے جس میں حجاج ابن یوسف نے تبدیلیاں کر دی تھیں۔ عجم کی سازش اس سے کہنا یہ چاہتی ہے کہ قرآن کریم میں پہلی صدی کے آخر تک تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب احادیث کی تدوین شروع ہوئی تھی یعنی امام مسلم ابن شہاب زہری کا زمانہ۔ لہذا اس وقت تک قرآن وحدیث دونوں ہی غیر محفوظ شکل میں تھے۔ ہمارے پاس قرآن بھی ایک تابعی کا ہے اور احادیث بھی تابعین ہی کی جمع کردہ ہیں۔ لہذا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ قرآن ایک ایسے تابعی کا ہے جو ظلم وستم اور فسق وفجور میں آج تک ضرب المثل ہے اور حدیث امام زہری کی ہے جو ائمہ حدیث کے نزدیک نہایت ہی متقی پرہیزگار اور خداترس آدمی تھے۔

قرآن کے اختلافات قرات اور لب و لہجہ کے اختلافات نہیں تھے

عہد صحابہ اور عہد تابعین میں قرآن کے اندر جو اختلافات تھے وہ قراتوں اور لب و لہجہ کے اختلافات نہیں تھے۔ عہد صحابہؓ کے اختلافات کو ہم نے بالتفصیل آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اسی نمونے کو سامنے رکھکر تابعین کے اختلافات کو بھی قیاس کر لیجئے۔ ان نقشوں میں ہم نے مصحف عثمانی اور دیگر مصاحف کے اختلافات کو پہلو بہ پہلو پیش کر کے بتا دیا ہے کہ یہ اختلافات تلفظ لب و لہجہ کے اختلافات نہیں تھے۔ بعض جگہ آیتیں کی آیتیں اور اکثر الفاظ کے الفاظ ایک دوسرے سے بدلے ہوئے یا کم و بیش ہیں۔ ان اختلافات کو کسی طرح بھی لب و لہجہ کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔ لب و لہجہ کا اختلاف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک لفظ کو کسی خاص ہیئت سے ادا کرتا ہے تو دوسرا شخص اسی لفظ کو دوسری ہیئت سے ادا کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ دونوں شخصوں کے وطن اور قبیلے مختلف ہوں۔ ایک ہی خاندان اور ایک ہی مقام کے دو شخصوں کے تلفظ اور طرز ادا میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ مگر ان اختلافات کی صورت یہ تھی کہ ایک ایک قبیلہ اور خاندان اور ایک ایک مقام کے لوگوں کے قرآن پڑھنے میں زبردست اختلافات موجود تھے۔ اس کے ثبوت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سنئے۔ یہ روایت کتاب المصاحف کے علاوہ خود صحیح بخاری میں بھی ص ۲۴۲ ج ۲ پر موجود ہے۔ روایت کا لفظی ترجمہ درج ذیل ہے۔

> مسور ابن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن عبد قاری حضرت عمرؓ سے سن کر بیان کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسول اللہ صلعم کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے ان کا پڑھنا سنا تو وہ بہت سارے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہ صلعم نے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر بیٹھوں مگر میں نے بمشکل صبر کیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہی کی چادر میں انھیں کس لیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنی ہے تمہیں کس نے پڑھائی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تو رسول اللہ صلعم نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم نے خود مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو تو پڑھ رہا تھا اور میں اس کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلعم کی طرف لے چلا اور میں نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ میں نے اس کو سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "انھیں چھوڑ دو۔ ہشام! پڑھو" چنانچہ ہشام نے اسی طرح رسول اللہ صلعم کے سامنے پڑھ دیا جیسا کہ میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلعم نے فرمایا "یونہی تو نازل ہوئی ہے" پھر فرمایا۔ عمر! اب تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مجھے پڑھائی تھی میں نے پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا "یوں بھی نازل ہوئی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے لہٰذا جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی قریشی ہیں اور مکہ کے رہنے والے ہیں اور ہشام ابن حکیم بھی قریشی اور مکی ہیں دونوں کی زبان ایک ہے دونوں کا لب و لہجہ ایک ہے۔ ایک خاندان اور ایک ہی مقام کے دونوں آدمی سورۂ فرقان کو اسقدر اختلاف کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں بمشکل نماز ختم ہونے تک صبر کرتے ہیں

اور نماز کے بعد انہی کی چادر میں کس کر گھسیٹتے ہوئے رسول اللہ صلعم کے پاس لاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم دونوں سے وہ سورت سنتے ہیں ہشام بن حکیمؓ سے سن کر بھی کہتے ہیں کہ ہاں یوں ہی تو نازل ہوئی ہے اور پھر حضرت عمرؓ سے سن کر بھی فرما دیتے ہیں کہ ہاں یوں بھی نازل ہوئی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے جس طرح آسان ہوا کرے پڑھ لیا کرو۔ ا روایات کی بناء پر علامہ سیوطیؒ تفسیر اتقان میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

بہت سے عوام جو یہ نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد سات قراتیں ہیں یہ بہت ہی بری جہالت ہے۔

اس پر اتقان کا محشی لکھتا ہے۔

کیونکہ ساتوں قراتیں سب کی سب ایک ہی حرف میں ہو سکتی ہیں اور وہ لغت قریش ہی تو ہے۔

بخاری کی اس حدیث پر علامہ عینی رحمتہ اللہ علیہ شرح بخاری میں لکھتے ہیں

اس حدیث سے ان لوگوں کے قول کی تقویت ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حروف سے مراد مرادف الفاظ کے ساتھ معنوں کا ادا کر دینا ہے خواہ وہ ایک ہی لغت سے کیوں نہ ہو کیونکہ یہاں ہشام کا لغت قریش ہی کی زبان تو ہے اور ایسے ہی عمرؓ کا لغت بھی۔ اور اس کے باوجود دونوں کے پڑھنے میں اختلاف ہو رہا ہے۔ ابن عبدالبرؒ نے ایسا ہی کہا ہے اور اکثر اہل علم سے یہی منقول ہے کہ سات حرفوں سے مراد یہی ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۲۱ ج ۲)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ یہ اختلافات صرف لب و لہجہ اور قراءتوں کے اختلافات نہیں تھے بلکہ مرادف الفاظ کے ساتھ مطلب اور معنی ادا کر دینے کے اختلافات تھے۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ قرآن کے معنی اور مضمون کو اپنے الفاظ میں جس طرح چاہے بیان کر دے۔

قرآن بھی روایت بالمعنیٰ ہے

روایات پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ جو کچھ روایتوں میں بیان کیا جا رہا ہے یہ حضور اکرم کے الفاظ نہیں ہیں روایت بالمعنیٰ ہے۔ یعنی راوی رسول اللہؐ کے مطالب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے اس لئے معلوم نہیں آپؐ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اپنے الفاظ میں اس کو کس طرح نقل کر دیا ہے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے عجم کی سازش نے قرآن کریم کو بھی بالکل اسی سطح پر لا کر رکھ دیا ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ قرآن کے معنی اور مضمون کو اپنے الفاظ میں جن مرادف الفاظ کے ساتھ چاہے بیان کر دے۔ مختصراً یہ کہ ان روایات کی رو سے موجودہ قرآن حضور اکرم صلعم نے مرتب نہیں کیا تھا نہ اس کو لکھوایا تھا۔ صحابہؓ کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے۔ عمرؓ نے عثمانؓ نے۔ یا زید ابن ثابتؓ نے اسے لکھا اور مرتب کیا جس میں غلطیاں بھی رہ گئیں۔ حجاج ابن یوسف نے اپنے زمانے میں گیارہ مقامات پر اصلاح کی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ جو قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے وہ قرآن کے معنی اور مضمون کی وہ تعبیر ہے جو حضرت عثمانؓ نے اپنے الفاظ یا دیگر صحابہ کے الفاظ میں دی تھی اور حجاج ابن یوسف نے اس کی اصلاح کی تھی۔

ذرا اپنے دلوں کو ٹٹولئے

کتاب المصاحف ایک سو پچانوے صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے۔ پوری کتاب کو نقل کرنا

ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ جن حضرات کو شوق ہو وہ روایات کے اس عظیم الشان خزانے کو خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے ان ناظرین سے جن کے دل میں ایمان اور احترامِ قرآن کی ایک ننھی سی چنگاری بھی روشن ہو مندرجہ بالا اقتباسات کو پیش کرنے کے بعد صرف اتنا سوال کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ذرا اپنے دلوں کا جائزہ لیکر اتنا بتائیں کہ ان اقتباسات کو پڑھنے کے بعد قرآن کریم کے متعلق ان کے دلوں میں کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کیا ایسی کتاب جسکے متعلق آپنے یہ کچھ پڑھا ہے خدا کی کتاب کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟ اور کیا اسکے متعلق یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی طرف سے ہے اور وہ آجتک محفوظ ہے اور یہ وہی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور جسے رسول اللہ صلعم نے خدا کی طرف سے امت محمدیہ کو دیا تھا۔

سوچئے۔ ذرا ٹھنڈے دل کو سوچئے اور بتائیے کہ آخر اس کتاب اور تورات و انجیل میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔

تورات، انجیل اور دیگر مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کے خلاف آپ سب سے بڑا اعتراض یہی وارد کرتے ہیں (اور اسی کی بنا پر آپ انھیں غیر یقینی قرار دیتے ہیں) کہ ان کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حرفاً حرفاً وہی ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں نے اپنی امت کو دی تھیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان روایات نے کس طرح قرآن کو بھی اسی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں دیگر مذاہب کی کتابیں تھیں؟ دیکھ لیجئے کہ عجم کی یہ سازش کس طرح کامیاب ہوئی؟ چنانچہ آج غیر مسلم مستشرقین انہی روایات کو سامنے لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی روشنی میں بتائیے کہ تم قرآن کی حفاظت کا دعویٰ کس طرح ثابت کرسکتے ہو؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہی "کتاب المصاحف" جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، شائع کس طرح سے ہوئی ہے؟ ایک فاضل مستشرق ہے (ARTHUR JEFFERY)۔ اس نے کیا یہ ہے کہ قرآن کے متعلق جسقدر اختلافات ہماری کتب روایات میں پائے جاتے ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرکے شائع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام ہے[1] (MATERIALS FOR THE HISTORY OF THE TEXT OF THE QURAN) اس کے ساتھ ہی اس نے، اس خیال سے کہ مبادا یہ نہ کہدیا جائے کہ ایک غیر مسلم (عیسائی) نے معاندانہ طور پر "غیر مستند چیزوں" کو جمع کر دیا ہے، امام ابن ابی داؤد کی "کتاب المصاحف" کو من و عن شائع کر دیا ہے جس میں وہ تمام احادیث موجود ہیں جو ان اختلافات کی سند ہیں۔ اور اس طرح ساری دنیا پر ظاہر کر دیا کہ یہ ہے اس کتاب کی حقیقت جس کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے۔

یہ ہیں عجم کی وہ سازشیں جن کی بنا پر اس نے خود قرآن ہی کے متعلق یہ خیال عام کر دیا کہ یہ کونسی محفوظ کتاب ہے؟ انہی سازشوں کا اثر ہے کہ آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر احادیث دین کا غیر متبدل جزو تھیں تو رسول اللہ کو چاہئے تھا کہ انھیں بھی قرآن کی طرح محفوظ شکل میں امت کو دیکر جاتے، تو مُلّا کی طرف سے جواب یہ دیا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) قرآن کونسا محفوظ تھا جو تم احادیث کے خلاف ایسا اعتراض وارد کرتے ہو؟ توبہ! توبہ!! پناہ بخدا۔ آج مسلمان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے متعلق اعلان کرتا ہے کہ وہ بھی محفوظ شکل میں امت کو نہیں ملا تھا ع

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

---

[1] یہ کتاب (E.J. BRILL) پبلشرز لنڈن سے مل سکتی ہے۔

غور فرمایا آپ نے کہ عجم کی محولہ بالا سازش کس قدر گہری تھی اور اس کا اثر کس قدر دور رس ہے! اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ملا جوان روایات کا پاسبان اور اس طرح عجم کی سازش کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے حامل دینِ متین اور محافظِ شرعِ مبین قرار پا رہا ہے۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا سے ڈرو۔ اور اس قسم کی اسلام سوز باتیں رسول اللہ کی طرف تو منسوب کرو! اسے ملحد، بے دین، مرتد اور نہ جانے کیا کیا کچھ ٹھہرا دیا جاتا ہے؟ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج (غیر مسلموں کی طرف سے نہیں بلکہ خود) مسلمانوں (اور مسلمانوں میں سے بھی ان کے دین کے محافظ، علماء کرام) کی طرف سے یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ ہم ثابت کریں کہ قرآن واقعی محفوظ کتاب ہے!! اور یہ مطالبہ اس طرح سے کیا جاتا ہے، گویا ان کا قرآن سے کوئی رشتہ یا تعلق نہیں۔ قرآن کا رشتہ صرف طلوع اسلام سے ہے۔ اس لئے اس کی ذمہ داری طلوع اسلام پر ہے کہ وہ ثابت کرے کہ قرآن محفوظ کتاب ہے اور ملا یہ ثابت کرے گا کہ قرآن محفوظ کتاب نہیں!! جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی بتائیے کہ

آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

بایں ہمہ اگر یہ ہمارا ذمہ ہے کہ ہم ثابت کریں کہ قرآن، اللہ کی محفوظ کتاب ہے، تو ہم اس ذمہ داری سے ہچکچاتے نہیں بسر و چشم اپنے سر لیتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ہمارا ایمان

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم جو کچھ ثابت کرینگے خود قرآن سے ثابت کریں گے۔ اس پر اگر ملا نے کہدیا کہ ہم قرآن کی شہادت تسلیم ہی نہیں کرتے تو اس کا کیا جواب ہوگا؟ لیکن ہمارا یقین ہے کہ دین کے معاملے میں اس حد تک صرف ملا ہی جا سکتا ہے۔ عام مسلمان جن کے دل میں خدا اور قرآن کی کچھ بھی عظمت ہے کبھی ایسا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اسلئے ہمارا مخاطب عجم کی سازش کا علمبردار ملا نہیں بلکہ متلاشیٔ حق مسلمان ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس یقین کو پیدا کرنے کے لئے کہ رسول اللہ صلعم نے قرآن کو مکتوب اور محفوظ شکل میں امت کو دیا تھا کیا کچھ کہا ہے۔

غیر مکتوب چیز یقینی نہیں ہو سکتی

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم کی دنیا میں یقینی شے اسی کو کہا جا سکتا ہے جو قید کتابت میں آجائے۔ چنانچہ خود عربوں کے ہاں یہ ضرب المثل موجود ہے "العلم صید والکتابۃ قید" (علم ایک وحشی شکار کی طرح ہے اس کو لکھکر ہی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ رسول اللہ نے قرآن کو لکھی ہوئی شکل میں امت کو دیا تھا یا نہیں۔

کتابت قرآن کی نگاہ میں

قرآن نے لکھنے پڑھنے پر کتنا زور دیا ہے یہ محتاج بیان نہیں حضورؐ پر جو سب سے پہلے وحی آئی ہے اس میں آپ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے۔

اقرأ وربك الاكرم ۞ الذى علم بالقلم ۞ علم الانسان ما لم يعلم ۞ (96)

اے پیغمبر! پڑھ۔ تیرا پروردگار نہایت ہی کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا (اور اس طرح) انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

دوسری جگہ

ن والقلم وما یسطرون ۰ (۶۸/۱)

ن: ہم شہادت پیش کرتے ہیں قلم کی اور اس کی جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔

فرما کر کتابت و تحریر کی اہمیت کو واضح تر کر دیا۔ قرآن نے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی لکھ لینے کو ضروری قرار دیا ہے کیونکہ جو بات لکھی ہوئی نہ ہو بلکہ محض لوگوں کی زبانی نقل در نقل ہوتی آ رہی ہو وہ نہ خدا کے نزدیک صحیح تر ہے نہ ہی شہادت کے لئے استوار تر۔ بلکہ محل شک و شبہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ حکم ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمًی فاکتبوہ ـــــ ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیرا اوکبیرا الی اجلہ ذٰلکم اقسط عند اللہ واقوم للشہادۃ وادنیٰ الا ترتابوا۔ (۲/۲۸۲)

اے پیروان دعوت ایمانی! جب کبھی آپس میں قرض کا لین دین کسی وقت مقررہ تک کرو تو اس کو لکھ لیا کرو ـــــ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کو اس کی میعاد تک لکھ لینے میں سستی نہ کیا کرو۔ کیونکہ لکھ لینا ہی اللہ کے نزدیک صحت کی بڑی ضمانت اور گواہی کے لئے بڑی استواری کا باعث اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔

ظاہر ہے کہ قرض کا لین دین محض ایک باہمی معاملہ کی بات ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کا معاملہ بالکل دین کا بلکہ دین کی بنیاد کا معاملہ ہے۔ اگر چھوٹا یا بڑا قرضہ دستاویز نہ لکھنے کی وجہ سے خدا کے نزدیک صحت سے دور، شہادت کے لئے نا استوار اور محل شبہ قرار پا سکتا ہے تو قرآن کا نہ لکھا جانا اور محض زبانی نقل پر اکتفا کر لینا کیسے جائز ہو سکتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کو پہلی ہی وحی میں قرأت اور قلم کی طرف متوجہ کر دیا گیا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت پر فائز ہونے تک لکھنے پڑھنے سے ناآشنا تھے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اس رہنمائی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ شبہ کرنا بھی بہت بڑی جسارت ہے کہ آپ نے حق تعالیٰ کی اس رہنمائی سے خود فائدہ نہیں اٹھایا ہوگا۔ اس رہنمائی کے بعد یقیناً آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھا ہوگا۔ بہرحال اتنی بات تو یقینی ہے کہ منصب رسالت پر فائز ہو جانے کے بعد آپ امی نہیں رہے تھے آپ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ سورہ عنکبوت میں ہے:۔

وما کنت تتلو من قبلہ من کتٰب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون ۰ (۲۹/۴۸)

اور اے پیغمبر! تم قرآن کے نازل ہونے سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے (اگر ایسا ہوتا) پھر تو باطل پرست لوگ ضرور شبہ کر سکتے تھے۔

یہاں قرآن کریم نے کتابیں پڑھ سکنے اور اپنے ہاتھ سے لکھ سکنے کی نفی صرف نزول قرآن سے پہلے زمانہ کے لئے کی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد آپ بخوبی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ورنہ "من قبلہ" کے لفظ سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ لفظ بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ما کنت تتلو من کتٰب ولا تخطہ بیمینک کافی تھا۔ معلوم نہیں یہ خیال کہاں سے پیدا کر لیا گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ [illegible]

ہفتہ بھر میں عبرانی جیسی ایک غیر زبان سیکھ کر عبرانی زبان میں خطوط لکھنے پڑھنے کے قابل ہو سکتے ہوں مگر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ذہین شخص جس کی ذہانت یقیناً حضرت زیدؓ سے بڑھ کر تھی اس کے متعلق یہ خیال کر لیا جائے کہ وہ تادم وفات ان پڑھ ہی رہا۔

قرآن کی اس واضح شہادت کے بعد ہم اس غلط خیال کیلئے کوئی وجہ جواز نہیں دیکھتے قرآن اتنا ہی نہیں کہتا بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ وحی نازل ہونے کے بعد اول آپؐ کو خود قلم بند فرما لیا کرتے تھے اور اس کے بعد دوسرے صحابہ کو لکھوا دیا کرتے تھے۔ اور ایسا عموماً بالالتزام ہوتا رہتا تھا۔ ملاحظہ ہو:

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملیٰ علیہ بکرۃ واصیلا۔ (۲۵/۵)

مشرکین کہتے ہیں (قرآن اس کے سوا کیا ہے کہ) پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس (محمدؐ) نے خود لکھ لی ہیں اور وہی اس کے سامنے صبح و شام لکھوائی جاتی رہتی ہیں۔

اِکْتَتَبَ کے معنی ہیں کہ انسان خود لکھے بلکہ یہ بھی کہ کوئی دوسرا بول رہا ہو اور یہ خود لکھ رہا ہو۔

واکتتب الکتاب خطہ واستملاہ۔ (محیط المحیط ص ۱۷۸۵ ج ۲)

اور اکتتب الکتاب کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کتاب کو خود لکھا اور دوسرے سے املاء کرانے کی خواہش کی۔

املاء کے معنی (DICTATE) کرانے کے ہیں یعنی ایک بولتا جائے اور دوسرا لکھتا جائے۔ تملیٰ علیہ سے پہلے اکتتب کے معنی بجز اس کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ پہلے آپ خود لکھ لیتے تھے۔ پھر تملیٰ علیہ پر ایک فاء آ رہی ہے جو تعقیب کیلئے آتی ہے لہذا دونوں فعلوں کا ایک زمانہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو عطف تفسیری قرار دیدیا جائے۔ لہذا اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ وحی کو رسول اللہ پہلے خود لکھ لیا کرتے تھے اور اس کے بعد صحابہ کو لکھا دیا کرتے تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ آیت مکی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مکہ ہی میں یہ عادت شریفہ تھی کہ وحی نازل ہونے کے بعد پہلے خود قلم بند فرما لیا کرتے تھے پھر دوسرے صحابہؓ کو لکھوا دیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ التزاماً جاری رہتا تھا۔

لفظ کتاب کی لغوی تحقیق

قرآن کریم نے جا بجا اپنے آپ کو کتاب کہا ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن شروع ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

الٓمٓ ۞ ذلک الکتاب لاریب فیہ ۞ (۲/۱-۲)

الم - یہ الکتاب ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔

ہمیں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ کتاب کہتے کسے ہیں۔ کتاب کی لغوی تحقیق حسب بیان علماء لغت یہ ہے کہ کتاب دراصل اس لوہے کے چھلے کو کہتے ہیں جو تحفظ نسل کیلئے اونٹنیوں کی شرمگاہوں پر ڈال دیا جاتا تھا کہ وہ ہر قسم کے اونٹ سے حاملہ نہ ہو سکیں پھر اس کے بعد اونٹنی کے تھنوں کو ملا کر ان میں ایسا ہی چھلا پہنا دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے بچہ کو نہ سونگھ سکے اور اس طرح اپنے بچہ کو دودھ نہ پلا دے۔ پھر اس کے بعد چند چیزوں کو ملا کر چھلا ڈال دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ چونکہ کتاب میں بھی اس کے

اوراق کو ملا کر چھلا ڈالا جاتا تھا (یا جیسا کہ آجکل چھلے کے بجائے دھاگا ڈالدیا جاتا ہے) اسلئے کتاب عرفی پر بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا۔ اس کے بعد اس میں مزید وسعتیں ہوتی چلی گئیں (ملاحظہ ہو محیط المحیط ۱۷۸۹/۲ج اور دیگر مبسوط لغات عربی)

بہرحال اس تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کتاب کے مفہوم میں چند چیزوں کو ملا کر مجتمع کردینا ضروری ہے۔ لہذا کتاب کا اطلاق اصل لغت کے لحاظ سے اسی مجموعۂ اوراق پر کیا جاسکے گا جس کی شیرازہ بندی کسی کرڑے یا دھاگے سے کردی گئی ہو۔ قرآن کریم اپنے آپ کو ایک دو جگہ نہیں سینکڑوں جگہ "کتاب" کے لفظ سے یاد کرتا ہے کہیں صرف کتاب کہتا ہے ملاحظہ ہو

۲/۲-۷۸-۷۹-۱۰۱-۱۵۱-۲۳۱ ۳/۷-۲۳-۱۸۴ ۴/۱۱۳-۱۲۷-۱۳۶-۱۴۰ ۶/۹۲ ۷/۲-۱۹۶ ۱۴/۱ ۱۵/۱ ۱۶/۶۴ ۲۱/۱۰ ۲۸/۸۶ ۲۹/۴۷-۵۱ ۳۹/۱ ۴۰/۲ ۴۵/۲ ۴۶/۲-۱۲ ۶۲/۲

کہیں اپنے آپ کو کتٰب مبین کہتا ہے۔ ملاحظہ ہو ۵/۱۵ ۱۲/۱ ۲۶/۱ ۲۷/۱ ۲۸/۲ ۳۶/۶۹ ۴۳/۲ ۴۴/۲

کہیں اپنے آپ کو الکتٰب بالحق کہتا ہے۔ دیکھئے ۲/۱۷۶ ۳/۳ ۴/۱۰۵ ۵/۴۸ ۱۳/۱ ۱۶/۳۲

کہیں الکتاب مفصلاً کہتا ہے۔ دیکھئے ۶/۱۱۴

کہیں کتاب انزلنٰہ مبارک کہتا ہے۔ دیکھئے ۶/۱۵۵ ۳۸/۲۹

کہیں الکتٰب الحکیم کہتا ہے۔ دیکھئے ۱۰/۱ ۳۱/۱-۲

کہیں الکتٰب لاریب فیہ کہتا ہے۔ دیکھئے ۲/۲ ۱۰/۳۷ ۳۲/۲

کہیں کتٰب احکمت اٰیٰتہٗ کہتا ہے۔ دیکھئے ۱۱/۱ ۴۱/۲

کہیں کتٰب عزیز کہتا ہے۔ دیکھئے ۴۱/۴۱

کہیں نزلنا علیک الکتٰب تبیاناً لکل شئ کہتا ہے۔ دیکھئے ۱۶/۸۹

کہیں احسن الحدیث کتاباً متشابہاً مثانی کہتا ہے۔ دیکھئے ۳۹/۲۳

غرضکہ مختلف عنوانوں اور مختلف صفات کے ساتھ وہ اپنے آپ کو کتاب کہتا ہے۔ ان مختلف عنوانات و صفات سے بحث کرنے کیلئے اس وقت نہ گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔ آپ صرف بہن وقت اتنا دیکھئے کہ قرآن اپنے کو کتاب کہتا ہے (کتاب کا صحیح مفہوم اپنے ذہن میں رکھئے) جس میں شیرازہ بندی کا مفہوم داخل ہے لہذا یقیناً نزول قرآن ہی کے وقت سے قرآن کریم ایسی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا جس پر کتاب کا لفظ صادق آسکے۔ پھر وہ اپنے آپ کو ایک ایسی کتاب کہتا ہے جس میں شک اور شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور ہم آپ کو پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن کی نگاہ میں اگر کوئی چیز لکھی ہوئی نہ ہو چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، تو خدا کے نزدیک نہ وہ صحیح تر ہے نہ شہادت کیلئے استوار تر ہے اور نہ ہی شک و شبہ سے بعید تر۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن اپنے لئے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اس میں شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اور خود ہی یہ اصول بھی بیان کیا ہے کہ شبہ سے بالاتر وہی چیز ہو سکتی ہے جسے لکھ لیا جائے تو لامحالہ اسے خود اپنے اصول کے مطابق کہیں لکھا ہوا ہونا چاہئے۔ نہ صرف منتشر اوراق پر لکھا ہوا بلکہ مجموعی (شیرازہ بند) اوراق پر، تاکہ اس کو کتاب کہنا صحیح ہو۔

قرآن اور کتاب اس مجموعہ کا نام ہے جس میں بہت سی سورتیں ہیں -

قرآن اپنی حقانیت پر استدلال کرتے ہوئے دنیا کی تمام قوموں کو تحدی (چیلنج) کرتا ہے اور کہتا ہے :-

ام یقولون افترٰیہ ، قل فأتوا بسورۃ مثلہ (۱۰/۳۸)

کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ محمدؐ نے قرآن کو جھوٹ بنا لیا ہے۔ ان سے کہدو قرآن کی طرح کی کوئی سورت بنا لاؤ۔

دوسری جگہ وہی تحدی (چیلنج) اس صورت میں پیش کرتا ہے -

ام یقولون افترٰیہ ، قل فأتوا بعشر سور مثلہ مفتریٰت - (۱۱/۱۳)

کیا وہ کہتے ہیں کہ محمدؐ نے قرآن کو جھوٹ بنا لیا ہے۔ ان سے کہدو کہ تم ذرا اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنا کر دکھا دو -

تیسری جگہ اسی تحدی کو اس صورت میں پیش کرتا ہے۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا ۔ (۱۷/۸۸)

اے پیغمبر! کہدو کہ اگر سارے انسان اور جن (شہری اور بدوی لوگ) بھی اس پر اکٹھے ہو کر کوشش کریں کہ اس قرآن جیسا ایک دوسرا قرآن بنا لائیں تو اس جیسا قرآن بنا کر نہیں لا سکتے اگرچہ وہ سارے ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

ان تینوں آیتوں کو سامنے رکھ کر سوچئے اور غور کیجئے کہ کہیں وہ یہ چیلنج کرتا ہے کہ قرآن جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ۔ کہیں کہتا ہے کہ دس سورتیں بنا لاؤ۔ کہیں کہتا ہے کہ اس جیسا قرآن بنا لاؤ۔ ان تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے قرآن کے متعلق ذہن انسانی میں جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب کا نام ہے جس میں بہت سی سورتیں ہیں کہ کبھی اس پورے قرآن جیسا قرآن بنانے کا چیلنج کیا جاتا ہے اور کبھی اس جیسی صرف دس سورتوں کا اور کبھی صرف ایک ہی سورت کا۔

قرآن لکھا جاتا تھا اور دیکھ کر اس کی تلاوت کی جاتی تھی

مگر اس کے باوجود جب کفار و مشرکین اپنے اسی عناد پر قائم رہتے ہیں تو قرآن کریم بطور استعجاب سوال کرتا ہے۔

ام عندھم الغیب فھم یکتبون - (۵۲/۴۱)

کیا ان کے پاس بھی علم غیب ہے جسے وہ لکھ لیتے ہوں ؟

اور

ام لکم کتٰب فیہ تدرسون (۶۸/۳۷)

کیا تمہارے پاس کوئی دوسری کتاب ہے جس میں دیکھ کر تم پڑھتے ہو ؟

یہ سوالات قرآن کے انکار پر کئے جا رہے ہیں جن کا مطلب یہی ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو وحی ہونے کے بعد فوراً لکھ لی جاتی ہے اور محمد رسول اللہ والذین معہٗ اس کو دیکھ دیکھ کر پڑھتے اور تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ اے کفار و مشرکین! کیا تمہارے پاس بھی ایسی کتاب ہے جو عالم غیب سے بطور وحی کے آتی ہو اور اسی طرح فوراً لکھ لی جاتی ہو نیز تم لوگ بھی اس کتاب کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے صحابہ کی طرح دیکھ دیکھ کر پڑھتے ہو؟ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم وحی کے بعد فوراً لکھ لیا جاتا تھا اور حضور اکرمؐ

اور تمام صحابہ اس کتاب کو دیکھ دیکھ کر اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

اوپر آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن اس مجموعۂ کتاب کا نام تھا جس میں بہت سی سورتیں تھیں۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ وہ وحی کے فوراً بعد لکھ لیا جاتا تھا اور اس کو دیکھ دیکھ کر اس کی تلاوت کی جایا کرتی تھی۔ لامحالہ اس کتاب میں یہ تمام سورتیں آگے پیچھے کسی خاص ترتیب ہی سے لکھی ہوئی ہوں گی۔ کیونکہ مختلف سورتوں کو یوں لکھ لینے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی سورت کسی سورت سے نہ آگے ہو نہ پیچھے۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ قرآن کریم کی ایک خاص ترتیب بھی تھی اور وہ ترتیب نزول قرآن کے ساتھ ساتھ ہی قائم ہوتی جا رہی تھی۔

قرآن کریم ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا موجود تھا

اس کے بعد قرآن کریم ہمیں نہایت زوردار الفاظ کے ساتھ بتاتا ہے کہ وہ ایک بہت ہی محفوظ کتاب میں لکھا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو

فلا اقسم بمواقع النجوم۝ وانہ لقسم لو تعلمون عظیم ۝ انہ لقرآن کریم ۝ فی کتاب مکنون ۝ لا یمسہ الا المطھرون ۝ تنزیل من رب العلمین ۝ (۵۶/۷۵)

ستاروں کے مواقع اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اور اگر تم سمجھو تو یہ شہادت ایک بہت بڑی شہادت ہے۔ کہ یقیناً یہ قرآن بڑی تعظیم و تکریم کا مستحق ہے جو ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے جسے ان لوگوں کے سوا جو پاک صاف ہوں کوئی نہیں چھوتا یہ کتاب تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ کسقدر تاکید اور شہادتوں کے ساتھ قرآن کریم اپنے متعلق یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے جسے وہی لوگ ہاتھ لگاتے ہیں جو ہر طرح پاک وصاف ہوتے ہیں، اس کتاب کے محفوظ ہونے کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ وہ خود رسول اللہ صلعم کی اپنی حفاظت میں رہتی ہے جس پر خدا۔ اس کے فرشتوں اور اس کے بندوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اس عظیم الشان حقیقت کو کتنی زبردست تاکیدوں اور شہادتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قرآن کا یہ خاص اسلوب ہے کہ وہ عالم نفس پر آفاقی قوانین سے استشہاد کرتا ہے۔ یہاں چونکہ قرآن کو یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن کریم ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے اس کے استشہاد میں وہ آفاقی حقائق کو شہادت میں پیش کرتا ہے کہ دیکھو ان ستاروں کے وجود پر غور کرو۔ جو جگہ جس ستارے کیلئے مقرر کر دی گئی ہے وہ ایک انچ بھی اپنے مقام سے نہیں ہٹتا حتیٰ کہ تم دریائی اور صحرائی سفر میں ان ستاروں ہی سے راستے معلوم کرتے ہو۔ ان ستاروں کی ایسی حفاظت کون کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ خدا ہی کر رہا ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ جس چیز کی حفاظت خدا اپنے ذمہ لے لیتا ہے وہ کتنی محفوظ رہتی ہے۔ لہذا یہ کتاب جس کی ذمہ داری بھی خدا نے لے لی ہے کسقدر محفوظ رہنی چاہئیے۔ مگر ہمارے مفسرین نے ان ساری شہادتوں اور تاکیدوں کو بیکار کر دیا۔ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ مواقع النجوم کو شہادت میں پیش کرنے سے کیا مطلب ہے اور قرآن کیا کہنا چاہتا ہے ملا کی عادت ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے اسے وہ نہایت آسانی کے ساتھ دوسرے جہان پر چپاں کر کے چھٹی حاصل کر لیتا ہے چنانچہ یہاں بھی مفسرین نے کہہ دیا کہ یہ اس دنیا جہان کی بات ہی نہیں یہ تو دوسرے جہان کی بات ہے۔ کتاب مکنون سے مراد لوح محفوظ ہے اور مطہروں سے مراد فرشتے ہیں۔ چلئے چھٹی ہوگئی۔ آیات کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے جسے فرشتے ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں

مگر دوسری طرف یہی مفسرین جب یہ حکم لگاتے ہیں کہ قرآن پاک کو جنابت اور حدث کی حالت میں چھونا جائز نہیں ہے۔ قرآن کو وضو کرکے پاک صاف ہو کر ہاتھ لگانا چاہیئے تو پھر اسی مطہرون سے مراد فرشتوں کے بجائے انسان ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم رق منشور میں لکھا ہوا ہے

دوسری جگہ قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ محفوظ کتاب جس کا اوپر ذکر آچکا ہے کس چیز پر لکھی ہوئی ہے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی ہے، کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی ہے، ہڈی کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی ہے، یا کسی کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔ آخر کس چیز پر لکھی ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ ان میں سے کسی چیز پر بھی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ رق منشور پر لکھی ہوئی ہے یعنی ہرن کی جھلی کے بڑے بڑے کاغذوں (PARCH MENT) پر۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

والطور ٥ وکتاب مسطور ٥ فی رق منشور ٥ والبیت المعمور ٥ والسقف المرفوع ٥ والبحر المسجور ٥
ان عذاب ربك لواقع

متعین و معلوم پہاڑ (حرا) اور یہ کتاب (قرآن) جو لکھی ہوئی ہے بڑے بڑے کشادہ جھلی[1] کے کاغذوں پر اور بیت معمور (کعبہ) اور بلند چھت (آسمان) اور پرجوش سمندر اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ تیرے پروردگار کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے۔

ان آیات میں قرآن کریم نے چند چیزوں پر روشنی ڈالی ہے (۱) قرآن ایک کتاب ہے (۲) وہ کتاب لکھی ہوئی ہے (۳) اور ہرن کی جھلی کے کشادہ کاغذوں پر لکھی ہوئی ہے۔

یہاں تک ہمیں قرآن کی ان تصریحات سے یہ معلوم ہو گیا کہ قرآن لکھا ہوا تھا ایک کتاب میں لکھا ہوا تھا۔ اور ایک خاص ترتیب کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ نیز یہ کہ وہ ہرن کی جھلی کے کشادہ کاغذوں پر لکھا ہوا تھا۔ اب صرف ایک چیز باقی رہ گئی کہ لکھنے والے کون تھے اور وہ کیسے لوگ تھے۔ قرآن کریم کہتا ہے:

کلا انها تذکرة ٥ فمن شاء ذکره ٥ فی صحف مکرمة ٥ مرفوعة مطهرة ٥ بایدی سفرة ٥ کرام بررة ٥ (عبس ۱۱-۱۶)

یوں نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے۔ پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے، لکھا ہوا ہے عزت کے ورقوں میں۔ اونچے رکھے ہوئے۔ نہایت ستھرے ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں۔

یہ ترجمہ ہم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا نقل کر دیا ہے۔ اگرچہ اس ترجمہ کے بعض الفاظ سے ہمیں اختلاف ہے مگر ہمیں دکھانا یہ ہے کہ سَفَرَةٍ کے معنی لکھنے والوں کے ہیں اور یہ سَافِرٌ کی جمع ہے جس کے معنی خوشنویس اور ماہر کتابت کے آتے ہیں نہ کہ سفیر کی جیسا کہ بعض دوسرے مفسرین نے امام بخاریؒ سمیت ظاہر کیا ہے۔ اس کے حاشیہ پر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم رقمطراز ہیں۔

یعنی وہاں فرشتے اس کو لکھتے ہیں۔ اسی کے موافق وحی اترتی ہے اور یہاں بھی اوراق میں لکھنے والے اور جمع کرنے والے دنیا کے بزرگترین پاکباز نیکوکار اور فرشتہ خصلت بندے ہیں جنہوں نے ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیل سے اس کو پاک رکھا ہے (ملک ترجمہ شیخ الہند)

جیسا کہ قرآنی شہادت سے اس سے پہلے ہم آپ کو بتا چکے ہیں حضور اکرم صلعم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ وحی نازل ہونے کے بعد اول آپ

---

[1] الرق جلد رقیق یکتب فیہ ۱۲ محیط المحیط صفحہ ۱۲ اس زمانے میں نرم کھال (جھلیوں) کے بنے ہوئے کاغذ لکھنے میں استعمال ہوا کرتے تھے۔

اس کو خود قلمبند فرمالیا کرتے تھے اور اس کے بعد کاتبینِ وحی اور صحابہ کرام کو لکھوادیا کرتے تھے اور یہ سلسلہ التزاماً (صبح و شام) جاری رہتا تھا۔ آیت مندرجہ بالا میں قرآن کریم نے ان تمام لکھنے والوں کی پاکبازی۔ دیانت، نیکوکاری اور بزرگی کی شہادت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب خود رسول اور اس قسم کے پاکباز انسانوں کے ہاتھوں ضبط تحریر میں لائی جارہی ہو اس کے متعلق کسی قسم کا بھی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن کتابی شکل میں تمام مسلمانوں کے گھروں میں موجود تھا

اسوقت تک خود قرآن کی شہادتوں سے آپ دیکھتے آرہے ہیں کہ قرآن کریم نازل ہوتا تھا تو اسے فوراً لکھ لیا جاتا تھا۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ موجود نہیں تھا جو رسول اللہ صلعم کے پاس محفوظ رہتا ہو بلکہ وہ نسخہ تو اصل نسخہ تھا (جسے روایات میں امام یا الامام کے نام سے یاد کیا گیا ہے) اس نسخہ سے صبح و شام دوسرے کاتبین وحی اور اہل علم صحابہ اپنے اپنے لئے نقل کرتے رہتے تھے اور خود حضورؐ کی موجودگی میں یہ نقلیں کی جاتی تھیں۔ خود حضور اکرم صلعم لکھواتے تھے اور یہ دوسرے لوگ لکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کے نسخے اس زمانے میں عام طور پر لکھے جاتے تھے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا جس کتاب پر مسلمانوں کا ایمان تھا۔ جو ان کی زندگی کا ضابطۂ عمل تھی۔ جو ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی تھی۔ ہو نہیں سکتا کہ اس کتاب کے نسخے ان کے پاس موجود نہ ہوں۔

اگر کتاب کے ساتھ حافظوں میں بھی محفوظ کردیا جائے تو حفاظت اور بھی محکم ہوجاتی ہے

قرآن کریم کو لکھ لینے کا کس قدر بلیغ اہتمام کیا گیا ہے یہ تو آپ گذشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ خود قرآن لکھ لینے پر کتنا زور دیتا ہے اور یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ رسول اکرم صلعم اور حضرات صحابہؓ نے اس کی کس طرح تعمیل کی۔ لیکن اگر تاریخ عالم اور دنیا کے انقلابات پر آپ کی نظر ہے تو آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی کتاب کو لکھوا دینے کے ساتھ ساتھ اگر حفظ یاد بھی کرادیا جائے تو اس کی حفاظت اور بھی محکم ہوجاتی ہے۔ اسلئے کہ ایسے حادثات بھی آتے ہیں جو اسے اپنے مکتوب علمی خزانوں سے محروم کردیتے ہیں۔ امم سابقہ پر یہی کچھ بیت چکی تھی۔ یہود کے پاس الواح میں لکھی ہوئی تورات موجود تھی۔ عیسائیوں کے پاس بھی انجیل مکتوب صورت میں موجود تھی۔ تورات کی حفاظت کا یہودیوں نے کچھ کم انتظام نہیں کیا تھا۔ ایک تابوت میں اس کو مقفل رکھا جاتا تھا اور اس تابوت کی بہت تعظیم اور عزت کی جاتی تھی۔ عقیدت مندیوں کی بڑی سے بڑی داستانیں اس کے ساتھ وابستہ تھیں مگر بخت نصر کے ایک حملے نے اور رومیوں کے ایک سیلاب نے دونوں قوموں کو ان کی کتابوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محروم کردیا۔ مصری قوم تہذیب و تمدن میں تمام اقوام عالم کی پیشرو تسلیم کی گئی ہے۔ ان کے تاریخی مکتشفات آج بھی علمائے عالم کو ورطۂ حیرت میں گم کئے ہوئے ہیں مگر ان کا تمام علمی اور تاریخی سرمایہ بیرونیوں کے ایک حملہ کو برداشت نہ کرسکا۔ اسکندریہ کی عظیم الشان لائبریری یوں نذر آتش کردی گئی کہ اس کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا۔ لہٰذا کسی علمی سرمایہ کو ہمیشہ ہمیشہ محفوظ کرنے کیلئے جہاں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ انسانوں کے حافظوں پر اعتماد کیا جائے بلکہ اس کو لکھ لینا بھی ضروری ہے وہاں صرف لکھ لینا بھی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو انسانی حافظوں میں بھی محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ان دونوں گوشوں سے کسی چیز کو محفوظ نہیں کیا جائیگا اسوقت تک وہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ حفاظت کے یہ دو بازو ہیں۔ اگر کسی کتاب کے یہ دونوں بازو سلامت ہیں تو وہ رخشِ حیات کے ساتھ ساتھ پرواز کرتی چلی جائیگی لیکن جہاں اس کا کوئی سا ایک بازو

بھی ٹوٹ گیا وہیں وہ گر پڑے گی۔

قرآن کریم کوانسانی سینوں میں بھی محفوظ کیا گیا

جو کتاب سینہ اور سفینہ دونوں میں محفوظ ہو وہی ہمیشہ محفوظ رہ سکتی ہے۔ قرآن کریم نے اپنی حفاظت کے ایک گوشے کو کس طرح محفوظ کیا ہے وہ آپ دیکھ چکے ہیں اسلئے اب حفاظت کے دوسرے گوشہ کو بھی دیکھ لیں۔ قرآن کریم نے ابتداء رسالت ہی میں خود حضور اکرمؐ کو یہ تاکید فرمادی تھی:

یاایھا المزمل قم اللیل الا قلیلاہ نصفہ او انقص منہ قلیلاہ او زد علیہ ورتل القرآن ترتیلاہ (۲۹/۱-۴)

اے تزمیل کرنیوالے! شب کے قلیل حصہ کو چھوڑ کر (کہ اس میں تم سو سکتے ہو) زیادہ تر رات کو قیام کیا کرو یعنی آدھی رات اسی شغل میں گذارو کبھی ضرورۃً تھوڑا سا کم کردو یا بڑھادو تو مضائقہ نہیں ہے۔ اور اس رات کے قیام میں ترتیل کے ساتھ القرآن کی تلاوت کرو۔

یہاں لفظاً خطاب اگرچہ نبی کریم صلعم ہی کو تھا مگر معناً اس میں تمام مسلمان مخاطب تھے چنانچہ ہر مسلمان اپنے اپنے گھر میں رات کا زیادہ تر حصہ قیام لیل ہی میں گذارتا تھا اور اس میں برابر تلاوت قرآن کی جاتی تھی اور ہر رات کو قرآن کا وہ حصہ جو اس وقت تک نازل ہو چکا تھا ختم کرلیا جاتا تھا لیکن آئندہ چل کر قرآن جوں جوں نازل ہوتا جا رہا تھا اس کے حجم میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا حتیٰ کہ ہجرت کے بعد حضورؐ کی آخری عمر میں قرآن کریم کا حجم اتنا ہو چکا تھا کہ ایک رات میں پورے قرآن کا ختم کرلینا آسان کام نہیں رہا تھا۔ سونا اور آرام کرنا بھی فطرۃً ضروری تھا۔ مملکت کے دوسرے مشاغل کی وجہ سے جو دن بدن بڑھتے جا رہے تھے رات کی نیند کی کمی دن میں پوری نہیں کی جا سکتی تھی اسلئے اس حکم میں تخفیف ہوگئی۔ چنانچہ اس سورت کی آخری آیات میں ہے؛

ان ربک یعلم انک تقوم ادنیٰ من ثلثی اللیل ونصفہ وثلثہ وطائفۃ من الذین معک۔ واللہ یقدر اللیل والنھار علم ان لن تحصوہ فتاب علیکم فاقرؤا ما تیسر من القرآن ہ (۲۹/۲۰)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کو معلوم ہے کہ تم تقریباً دو تہائی رات۔ آدھی رات اور تہائی رات تک کھڑے رہتے ہو اور ان لوگوں کی ایک جماعت بھی (رات کا بیشتر حصہ قیام اللیل ہی میں گذارتی ہے) جو آپ کے ساتھ ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ مقرر فرماتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ تم اس کو ہمیشہ پورا نہیں کر سکو گے لہذا اپنی عنایات تم پر منعطف کرتا ہے اور یہ سہولت عطا کرتا ہے کہ آئندہ (دو تہائی۔ آدھی یا ایک تہائی رات کی تقیید نہیں ہے) جسقدر سہولت سے ہو سکے قرآن پڑھ لیا کرو۔

مگر تاریخی روایات شاہد ہیں کہ اس تخفیف کے بعد بھی بعض حضرات صحابہ رات بھر میں پورا قرآن ختم کرنے کے عادی تھے حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ اور حضرت عثمان بن عفان خلیفہ سوم رضی اللہ عنہم کے نام اس سلسلہ میں زیادہ مشہور ہیں یہ حکم کہ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے صرف مردوں ہی کو نہیں تھا بلکہ اس میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ حضور اکرم صلعم کی ازواج مطہرات کے متعلق قرآن کریم میں یہ صریح حکم موجود ہے؛

واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من اٰیٰت اللہ والحکمۃ (۲۲/۳۴)

اور اے ازواج نبی! خدا کی آیتیں اور حکمت کی باتیں تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی رہتی ہیں ان کو پیش نظر رکھا کرو۔

اس تعامل اور معمولات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مرد اور عورتوں کے حافظوں میں بھی قرآن کریم محفوظ ہو گیا حتیٰ کہ قرآن کریم نے یہ اعلان کر دیا کہ

بل ھو اٰیٰت بیّنٰت فی صدور الذین اوتوا العلم (۲۹/۴۹)

بلکہ قرآن کریم واضح آیات کا ایک مجموعہ ہے جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ان نتائج کو دہرا لیجئے جو قرآن کریم کی داخلی شہادتوں سے اب تک ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

(۱) قرآن لکھنے پڑھنے کو انتہائی اہمیت دیتا ہے۔

(۲) جو چیز لکھی ہوئی موجود نہ ہو نہ اس کی صحت کی کوئی ضمانت ہو سکتی ہے نہ شہادت کیلئے استوار ہو سکتی ہے اور نہ ہی شکوک و شبہات سے بالاتر ہو سکتی ہے۔

(۳) منصب رسالت پر فائز ہونے کے بعد آپ لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے اور اس کے بعد آپ امی نہیں رہے تھے۔

(۴) وحی نازل ہونے کے بعد اول حضور اکرم صلعم اسکو خود لکھ لیتے تھے اور پھر صحابہ کو لکھوا دیا کرتے تھے اور ایسا بالالتزام ہوتا رہتا تھا۔

(۵) قرآن نے اپنے کو بار بار کتاب کہا ہے اور کتاب کہتے ہی اسکو ہیں جسکی شیرازہ بندی کی جا چکی ہو۔

(۶) قرآن اس مجموعہ کا نام ہے جس میں بہت سی سورتیں ہیں۔

(۷) قرآن کریم عموماً مسلمانوں کے پاس لکھا ہوا موجود تھا اور لوگ اس میں دیکھ دیکھ اسکی تلاوت کرتے تھے۔

(۸) قرآن کریم مکتوب شکل میں موجود تھا اور اس کے لکھنے کیلئے ہرن کی جھلی کے کشادہ بڑے بڑے اوراق استعمال کئے جاتے تھے۔

(۹) قرآن کریم کو لکھنے والے لوگ نہایت پاکباز، نیکوکار اور فرشتہ خصلت ماہرین کتابت تھے۔

(۱۰) قرآن کتابی شکل میں مسلمانوں کے گھروں میں موجود تھا۔

(۱۱) رسول اللہ صلعم والذین معہٗ راتوں کو پورا قرآن ختم فرمایا کرتے تھے۔

(۱۲) عورتوں کو بھی قرآن کریم کو یاد کرنے کا حکم تھا۔

(۱۳) عہد رسالت میں اہل علم مردوں اور عورتوں کے سینوں میں قرآن کریم محفوظ ہو چکا تھا۔

ان تصریحات کی روشنی میں ذرا آگے بڑھئے اور حق تعالیٰ کے ان حتمی اعلانات اور وعدوں پر بھی غور فرمایئے جو اس نے قرآن کریم کی حفاظت اور جمع کرنے اور زیغ باطل سے ہمیشہ کیلئے اس کی نگہداشت کرنے کے بارہ میں فرمائے ہیں اور غور کیجئے کہ نزول قرآن سے آج تک کس طرح حق تعالیٰ کے وہ تمام اعلانات اور وعدے حرف بحرف پورے ہوئے۔ قرآن کریم کا اعلان ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحٰفظون ۰ (۹/۱۵)

یہ واقعہ ہے کہ الذکر (قرآن کریم) کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ بھی ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ (۱) قرآن کریم کو ہم نے نازل کیا ہے اور نیز یہ کہ قرآن کی حفاظت ہم نے اپنے ذمہ لی ہے۔ گذشتہ اوراق میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس نے اسی حقیقت کی شہادت میں عالم آفاق سے ستاروں کی شہادت پیش فرمائی تھی کہ دیکھو خدا جس

چیز کی حفاظت کا ذمہ لے لیتا ہے وہ کس طرح محفوظ رہتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال قرآن کریم کی حفاظت کا ہے۔ کہ خدا نے اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری قبول فرمائی تو آج تک اس میں ایک نقطہ اور شوشہ تک کی کمی یا زیادتی نہیں ہو سکی۔

یہ تو کتاب کی حفاظت کے متعلق تھا مگر کتاب کی حفاظت تو کتاب کی جمع و تدوین کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ کتاب کی جمع و تدوین کی ذمہ داری بھی خدا نے خود ہی لے لی ہو۔ قرآن کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ اسکی ذمہ داری بھی خدا نے خود اپنے ہی ذمہ رکھی ہے ملاحظہ ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔

لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہٖ ان علینا جمعہ وقرانہ۔ فاذا قرأنٰہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ ۰ (۷۵ / ۱۶-۱۹)

اے پیغمبر! تم اپنی زبان کو جلدی جلدی پڑھ لینے کیلئے حرکت نہ دو۔ (اطمینان رکھو) یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی جمع و تدوین اور اسکو پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ لہٰذا جب ہم قرآن کو پڑھیں (یعنی وحی کریں) تو تم اس پڑھنے کی پیروی کرو۔ اسکے بعد اسکی توضیح و بیان ہمارے ہی ذمہ ہے۔

ان آیت کریمہ میں قرآن کریم نے تین عظیم الشان حقیقتوں کا اعلان کیا ہے جو صحیح ایمان کی بنیاد ہیں (۱) قرآن کی جمع و تدوین بھی حق تعالیٰ ہی کے ذمہ ہے۔ (۲) قرآن کو پڑھانا بھی حق تعالیٰ ہی کے ذمہ ہے۔ (۳) اور اس کے بعد اس کے معانی و مطالب کی توضیح و تشریح کیلئے بھی کسی قسم کے خارجی سہاروں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اس کی ذمہ داری بھی خدا نے اپنے ذمہ ہی رکھی ہے جو خدا ہی کی طرف سے پوری ہونی چاہئے۔ قرآن اپنی شرح خود اپنے آپ کرتا ہے اور تصریف آیات سے وہ اپنے معانی و مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کتاب مبین (۱۵/۱) ہے، اس کی آیات بینٰت ہیں (۲۴/۱) وہ النور ہے، (۸/۶۴) ہے وہ خود ایک ایسی روشنی ہے جس کیلئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب قرآن کریم کے اس عظیم القدر اعلان کو سامنے لائیے جس میں فرمایا ہے کہ

وانہ لکتاب عزیز۔ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ، تنزیل من حکیم حمید۔ (۴۱ / ۴۱-۴۲)

اور یہ حقیقت واقعہ ہے کہ قرآن بلاشبہ بڑی عزت والی کتاب ہے کہ باطل اس پر نہ سامنے سے حملہ کر سکتا ہے نہ اسکے پیچھے سے حملہ کر سکتا ہے (اور وہ ہمیشہ کیلئے دونوں طرف سے محفوظ ہے) یہ اس پروردگار کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے جو بڑی حکمت والا ہے اور ہر تعریف کا مستحق ہے۔

آپ نے دیکھا کہ باطل کی سرگرمیوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کس طرح قفل ڈال دیئے گئے ہیں کہ باطل اس پر کسی جہت سے بھی حملہ آور ہو سکے گا۔ اس میں نہ کوئی شخص کبھی کسی ایک لفظ، ایک شوشہ اور ایک نقطہ کا اضافہ کر سکے گا اور نہ ہی کمی کر سکے گا۔

ان آیات مندرجہ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج ہمارے سامنے آگئے۔

(۱) قرآن، خدا نے نازل کیا ہے۔

(۲) قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے ذمہ لی ہے۔

(۳) قرآن کی جمع و تدوین اور اس کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی خدا نے اپنے ہی ذمہ رکھی ہے۔

(۴) قرآن کے بیان و توضیح کی ذمہ داری بھی خدا نے خود اپنے ہی ذمہ لی ہے لہٰذا قرآن کی تشریح و توضیح کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۵) قرآن پر باطل کی ہر ممکن سرگرمی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بند کر دیئے گئے ہیں اس لئے کوئی طاقت اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں کر سکتی۔

غیر مسلم مورخین کا اعتراف

یہ واقعہ کہ قرآن کریم حرفاً حرفاً وہی ہے جسے رسول اللہؐ نے امت کو دیا تھا ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کا اعتراف ان غیر مسلم مورخین کو بھی کرنا پڑا جنھوں نے عقیدتمندانہ نظر سے نہیں بلکہ مورخانہ انداز سے اس امر کی تحقیق کی ہے اور اس تحقیق پر روایات کو اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ نمونہ کے طور پر ہم یہاں صرف چند شہادتوں پر اکتفا کرینگے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مخالفین قرآن بھی قرآن کے ان بلند بانگ اعلانات کے متعلق کس قسم کے اعترافات پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی مشہور مستشرق (Baroness Margarate von Stein) قرآن کریم کے متعلق رقمطراز ہے۔

اگرچہ تمام مذہبی صحائف خدا کی طرف سے نازل ہوئے تاہم صرف قرآن ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردوبدل نہیں ہوا اور وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا مستشرق (Hortwing Hirschfeld) اپنی کتاب (New Researches in to the Composition and exegeses of the Quran) میں بالفاظ ذیل اس اٹل حقیقت کا اعتراف کرتا ہے؛

عہد حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخہ کا ہو بہو عکس ہیں جسے (حضرت) زید (ابن ثابتؓ) نے لکھا تھا اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جسے محمد (صلعم) نے (لکھا کر) دیا تھا۔

اتنا ہی نہیں انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کا مصنف "قرآن" کے زیر عنوان یہ اقرار کرتا ہے؛

یورپ کے محققین کی وہ تمام کوششیں جو قرآن کے اندر بعد میں اضافات وغیرہ ثابت کرنے کیلئے کی گئی تھیں قطعاً ناکام رہی ہیں۔

سر ولیم میور اپنی کتاب (Life of the Mohammad) میں بدیں الفاظ اس مذکورہ بالا حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں؛

ورنہ اس کیلئے داخلی اور خارجی ہر قسم کی ضمانت موجود ہے کہ ہمارے پاس قرآن کا بعینہٖ وہی متن موجود ہے جو خود محمد (صلعم) نے (امت کو) دیا تھا اور خود استعمال کیا تھا۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کے وہ دعاوی اور ان کی صداقت صرف ہمارے نزدیک ہی مسلم نہیں ہے بلکہ اپنے تو اپنے بیگانے بھی ان دعووں کی صداقت پر آج تک انگلی نہیں رکھ سکے اور متعصب سے متعصب معاندین بھی اپنی تمام کوششوں کی ناکامیوں کے بعد ان عظیم حقیقتوں کے اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں کہ

(۱) قرآن کریم اور صرف قرآن کریم ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردوبدل نہیں ہوا اور وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔

(۲) عہد حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس نسخہ کا ہو بہو عکس ہیں جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا کر دیا تھا۔

(۳) یورپ کے محققین کی وہ تمام کوششیں قطعاً ناکام ہو رہی ہیں جو قرآن کے اندر بعد کے زمانہ میں کسی اضافہ وغیرہ ثابت کرنے کے لئے کی گئی تھیں۔

(۴) قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جو حضور اکرم صلعم نے امت کو دیا تھا اور جو خود آپ کے استعمال میں رہتا تھا۔

قرآن کی اپنی ان داخلی شہادتوں اور مخالفین و معاندین اسلام کے ان اعترافات کے بعد کون بدبخت مسلمان ہوگا جو قرآن کریم کے متعلق اپنے حاشیۂ خیال میں شک و شبہ کا وہم و خیال بھی لا سکے گا۔

قرآن اپنے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ بھی ہمارے سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ان غیر مسلم مؤرخین کی شہادات بھی ہمارے سامنے آگئیں جنھوں نے روایات کو اپنی تحقیق پر اثر انداز نہیں ہونے دیا[۱]۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ان روایات کو بھی دیکھ لیا جن کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن یکسر غیر محفوظ کتاب ہے جس میں بے شمار اختلافات موجود تھے۔ ان تصریحات کے بعد آپ ہم سے نہیں اپنے دل سے پوچھئے کہ قرآن واقعی خدا کی محفوظ کتاب ہے یا نہیں۔ اور کیا قرآن کریم کو اس کی موجودہ صورت میں خود رسول اللہؐ نے امت کو دیا تھا یا رسول اللہ اسے یونہی غیر مرتب و غیر محفوظ شکل میں چھوڑ گئے تھے!

اے مسلماں پوچھ اپنے دل سے، مُلّا سے نہ پوچھ

---

[۱] اس کے ساتھ ہی اگر آپ یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ قرآن کے کون کون سے اصل نسخے دنیا میں آج بھی موجود ہیں تو طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۰ء اور دسمبر ۱۹۵۰ء کا باب المراسلات ملاحظہ فرمائیے۔ وہاں یہ امور تفصیل سے مل جائیں گے۔

سوچئے

رسول اللہؐ نے آخری خطبۂ حج میں فرمایا:

"میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں اگر تم نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو پھر کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ خدا کی کتاب ہے۔"

(رحمتِ عالم ص۱۳۸ مصنفہ سید سلیمان ندوی)

لیکن روایت پرست فرماتے ہیں:

قال الامام الشعرانی۔ اجمعت الائمۃ علی ان السنۃ قاضی علی کتاب اللہ۔

امام شعرانی کا قول ہے کہ اس پر ائمہ کا اجماع ہے کہ سنت، کتاب اللہ پر قاضی (حاکم) ہے۔

(اشاعۃ السنۃ ج۲ ص۳۸)

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

قریب ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا "طلوع اسلام" میں ایک سوال شائع کیا گیا تھا کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں دین کے اجزا ہیں اور دونوں کو قیامت تک کیلئے غیر متبدل اور امت کیلئے واجب الاتباع رہنا ہے تو رسول اللہ صلعم کا فریضہ تھا کہ آپ نے جس طرح قرآن کو محفوظ شکل میں امت کو دیا ہے اسی طرح سے اپنی احادیث کا ایک مجموعہ بھی محفوظ شکل میں امت کو دے جاتے کیونکہ آپ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کرکے امت کو نہیں دیا اس سے لامحالہ دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) یا تو (معاذ اللہ) رسول اللہ صلعم سے منصب رسالت میں کوتاہی ہوئی اور دین کا آدھا حصہ ویسے ہی چھوڑ دیا گیا۔

(۲) یا رسول اللہ صلعم نے دانستہ ایسا کیا جس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم کا منشا ہی نہیں تھا کہ ان کی احادیث دین کا مستقل حصہ بنیں۔

احادیث کو دین ماننے والوں سے سوال یہ تھا کہ مذکورہ صدر باتوں میں سے کونسی بات صحیح ہے۔ ہمیں اس سوال کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ البتہ دو ماہ قبل جمعیتہ اہلحدیث کراچی کے صدر علامہ محمد یوسف صاحب کی طرف سے ایک مطبوعہ پمفلٹ موصول ہوا۔ اس پمفلٹ میں بجائے اس کے کہ وہ مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے انھوں نے اُلٹے سوالات کر دیئے اور طلوع اسلام سے کہا کہ وہ پہلے ان سوالات کا جواب دے۔ ان میں اہم سوال یہ تھا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ موجودہ قرآن پاک وہی ہے جو رسول اللہ پر وحی ہوا تھا۔

مرزائیوں کی یہ عام روش ہوا کرتی تھی (اور شاید اب بھی ہو) کہ جونہی کسی نے مرزا صاحب کی زندگی کے کسی واقعہ پر اعتراض کیا انھوں نے جھٹ سے کہدیا کہ "معاذ اللہ رسول اللہ بھی تو ایسے ہی تھے"۔ علامہ یوسف صاحب کا سوال بعینہ اسی نوعیت کا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک مسلمان دوسرے سے یہ کہے کہ تم یہ تو ثابت کرو کہ ہمارا قرآن وہی ہے جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا تو اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پیٹ لے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ جس شخص کو اعتراض کرتے وقت اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اس کی زد کہاں جاکر پڑتی ہے اس کے جواب میں بھلا کیا کہا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے علامہ یوسف صاحب کے سوالات کو تو درخور اعتنا نہ سمجھا البتہ طلوع اسلام کی اسی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کر دیا جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ تمام شکوک و شبہات خود ان روایات ہی کے پیدا کردہ ہیں ورنہ خود قرآن کی رو سے یہ حقیقت کس قدر روشن ہے کہ قرآن کریم امت کے پاس بالکل محفوظ شکل میں چلا آرہا ہے۔

علامہ یوسف صاحب کے سوالات کے جواب میں علامہ تمنا عمادی نے ایک مقالہ لکھکر بھیجا ہے جسے ہم علامہ تمنا کے اصرار کے پیش نظر شائع کر رہے ہیں ورنہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہم کسی ایسے مسلمان کے اس سوال کو قابل توجہ نہیں سمجھتے جسے قرآن کے محفوظ ہونے میں شبہ ہو سکے کہ مسلمان اسی صورت میں مسلمان ہوتا ہے جب وہ قرآن کے اس دعویٰ پر ایمان رکھے کہ "اسے اللہ نے نازل کیا ہے اور وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے" البتہ اگر کوئی غیر مسلم یہ سوال کرے کہ قرآن کس طرح محفوظ ہے تو اس کا جواب اسکی زبان میں اور طرح سے دیا جائیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ علامہ یوسف صاحب ایک غیر مسلم کی حیثیت سے یہ سوال نہیں پوچھ رہے۔ علامہ تمنا عمادی صاحب کا مضمون درج ذیل کیا جاتا ہے۔

علامہ پرویز سلمہ اللہ تعالیٰ نے روایت پرستوں سے حدیثوں کے متعلق ایک سوال کیا تھا جس کے جواب میں مولانا محمد یوسف صاحب صدر جمعیۃ اہلحدیث کراچی نے اُلٹے بارہ سوالات علامہ ممدوح ہی سے کردیئے اور اصل سوال کے جواب کو ان بارہ سوالوں کے جوابات پر موقوف رکھا۔

مولانا محمد یوسف صاحب نے سوال کی صورت میں کچھ حملے قرآن مجید پر بھی کردیئے ہیں، اسلئے ان کے سوالوں کا جواب میں کیوں دوں، یا علامہ پرویز کیوں دیں؟ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ ۔ خود قرآن مبین ہی سے پوچھنا چاہیئے کہ مولانا محمد یوسف کے سوالوں کے جوابات کیا ہیں۔ میں نے دریافت کیا تو مجھے حسب ذیل جوابات ملے۔ سوالوں کے نمبروں کے مطابق جوابی آیتوں پر نمبر لگا دیئے ہیں۔ سوال و جواب کے نمبر ملا کر ناظرین ملاحظہ فرمائیں:-

مولانا محمد یوسف صاحب کے تین سوالات جو ۱ و ۲ و ۳ پر مشتمل ہیں وہ ان کے ایک ہی سوال کی تین شاخیں ہیں۔ اصل سوال درحقیقت ایک ہی ہے۔ اسلئے ان تین نمبروں کا ایک ہی جواب قرآن مبین نے پہلے ہی سے دے رکھا ہے، وہی قرآنی جواب میں ان تینوں نمبروں کے متعلق پیش کردیتا ہوں۔

(پہلا سوال) مولانا یوسف پوچھتے ہیں "احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم دین کا ایک حصہ یا جزء دین آپ کے نزدیک کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا؟

(۱) کیا اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کا مجموعہ کتابی شکل میں قوم کے حوالے نہیں کیا؟ — (قرآنی جواب) ہاں

(۲) کیا اسلئے کہ صحابۂ کرامؓ کو حفظ کرنے کا حکم نہیں دیا؟ — (قرآنی جواب) ہاں

(۳) کیا اسلئے کہ کسی کو حدیث کے لکھنے کا حکم نہیں دیا؟ — (قرآنی جواب) ہاں

ان تینوں سوالوں کے جوابات میں جو تین "ہاں" لکھی گئی اور ان کو قرآنی جواب قرار دیا گیا یہ کن آیات قرآنیہ سے مستنبط ہیں؟ اب وہ آیتیں ملاحظہ فرمائیے

۱۔ ما آتٰكم الرسول فخذوه وما نهٰكم عنه فانتهوا ( )

جو کچھ تمہیں رسول نے دیا ہے وہ لیلو اور جس سے تمہیں باز رکھا ہے اس سے باز رہو۔

یہ آیت مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق اتری تھی۔ مگر محدثین و علمائے دین اس کے مورد کو خاص مانتے ہوئے حکم کو عام قرار دیتے ہیں کہ یہی اصول ہے، اسلئے "ما آتٰكم" جو کچھ تمہیں رسول نے دیا" میں حدیثوں کو بھی وہ داخل سمجھتے ہیں اور اسی آیت سے حدیثوں کا واجب القبول ہونا ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا مناظرہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے خصم پر اسی آیت سے حدیثوں کا واجب الاتباع ہونا ثابت کیا تھا واللہ اعلم۔ مورد خاص ہو جب بھی حکم عام رہتا ہے۔ مجھکو اس اصول سے اختلاف نہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس آیت سے حدیثوں کے متعلق کیا حکم نکلتا ہے۔ حدیثیں ما آتٰكم الرسول میں داخل ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں امت کو دی ہیں، یا ما نهٰكم عنه میں داخل ہیں یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے امت کو باز رکھا تھا۔؟

مولانا محمد یوسف صاحب کے تینوں سوالات ہی سے ظاہر ہے کہ

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثوں کا کوئی مجموعہ کتابی شکل میں اپنی امت کے حوالے نہیں فرمایا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابیوں کو احادیث کے حفظ کرنے کا حکم نہیں دیا۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حدیثوں کے لکھنے کا حکم نہیں دیا۔

اسلئے مولانا کے سوالات ہی بتارہے ہیں کہ احادیث ما نھٰکم عنہ میں داخل ہیں، کسی طرح بھی ما اٰتٰکم میں داخل نہیں ہوسکتیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب اس حدیث کو جانتے اور مانتے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ جس نے کچھ حدیثیں لکھی ہوں وہ ان کو محو کردے مٹادے۔ لاتکتبوا عنی سوی القرآن والی حدیث سے ہر طالب العلم واقف ہے۔ اس ممانعت سے دو باتیں نکل رہی ہیں:

(۱) کچھ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حدیثیں لکھنا شروع کردی تھیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دینی امر ونہی اپنی طرف سے، اپنے جی سے نہیں فرماتے تھے یقیناً کوئی آیت اس کے بارے میں اتری جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا۔

قرآنی آیات میں تدبر کرنے سے کون سی دینی گتھی ہے جو سلجھ نہیں جاتی۔ سورۂ یونس کے چھٹے رکوع میں دیکھئے یہ دو آیتیں آپ کو ملیں گی۔

یاایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی ورحمۃ للمومنین ۰ قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا۔ ھو خیر مما یجمعون ۰

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک موعظت اور سینوں کی بیماریوں کیلئے ایک نسخۂ شفاء اور ایمان والوں کیلئے ہدایت ورحمت آچکی ہے۔ کہدو (اے رسول!) کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (یہ ہوا ہے) تو چاہیئے کہ لوگ اسی (کتاب اللہ قرآن) کی بدولت خوشیاں منائیں۔ وہ ان چیزوں سے بہتر ہے جن کو لوگ جمع کررہے ہیں۔

یہاں سوال یہ ہے کہ وہ لوگ کیا جمع کررہے تھے جن کے پاس قرآن آیا تھا؟ اس آیت کے الفاظ پر غور فرمائیے۔ قرآن کو موعظت، شفاء لما فی الصدور ہدایت اور رحمت فرمایا گیا ہے یعنی یہ سب باتیں قرآن میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، تو یقیناً جو لوگ جمع کررہے تھے وہ مال ودولت نہیں جمع کررہے تھے بلکہ سامان موعظت وشفاء، ہدایت ورحمت ہی جمع کررہے تھے اور وہ کونسی چیز قرآن کے علاوہ ہوسکتی ہے جس کو وہ اپنے لئے سامان موعظت وشفاء، ہدایت ورحمت بطور خود سمجھ سکتے تھے۔ یقیناً وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ہی ہوسکتی ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں یعنی حدیثیں جو کچھ لوگ بطور خود جمع کررہے تھے تو انھیں اپنے لئے موعظت وشفاء و ہدایت ورحمت ہی سمجھ کر جمع کررہے تھے ان لوگوں کو فرمایا گیا کہ تم کیا بطور خود جمع کررہے ہو۔ تمہارے پاس تو موعظت وشفاء وہدایت ورحمت تمہارے رب کے پاس سے قرآن کی شکل میں آہی چکی ہے جو اس سے کہیں بہتر ہے جس کو تم بطور خود جمع کررہے ہو۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد صحابہ کو منع فرمایا کہ مجھ سے سن کر قرآن کے سوا بطور خود اور کچھ نہ لکھو اور جس نے کچھ لکھ رکھا ہو اس کو وہ محو کردے مٹادے۔

اگر کوئی شخص مما یجمعون سے مال ودولت کا جمع کرنا مراد لے، خلاف سیاق عبارت، تو کوئی صاحبِ عقل سلیم مفسرین کی اس بے جوڑ تفسیر کا پابند نہیں ہوسکتا۔

غرض یہ آیت بھی بتارہی ہے اور صاف بتارہی ہے کہ حدیثیں ما نھٰکم عنہ میں داخل ہیں، ما اٰتٰکم الرسول میں کبھی داخل نہیں ہوسکتیں۔

اور پھر لا تکتبوا عنی سوی القرآن والی حدیث تو حدیثوں کے ما نحن کم عنہ میں داخل ہونے کیلئے سند قطعی ہے خصوصاً اہلحدیث اور تمام روایات پرستوں کے لئے۔

سوال ۵۳ اور اس کا قرآنی جواب | (سوال از مولانا محمد یوسف صاحب) "کیا یہ ضروری ہے کہ ہر نبی اپنی امت کو علاوہ کتاب کے اپنی احادیث بھی کتابی شکل میں مدون کرائے؟"

(قرآن مبین کا جواب)

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتب لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (۲)

لوگ (پہلے) ایک ہی امت تھے (پھر اختلاف میں پڑکر فرقے فرقے ہوگئے) تو اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جو فرمانبرداروں کو خوشخبری دینے والے ہوں اور نافرمانوں کو ڈرانے والے اور انکے ساتھ کتاب اتاری جو لوگوں میں ان کے دینی اختلافات کا فیصلہ کردیا کرے

یہ آیت صاف بتارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بشارت دینے کیلئے اور ڈرانے کیلئے بھیجا اور جو کتاب ان کے ساتھ بھیجی وہی کتاب لوگوں کے دینی اختلافات کا فیصلہ کرتی ہے۔ نبی کی تبشیر و تنذیر و تذکیر سب کچھ اسی کتاب ہی سے ہوگی، کتاب سے باہر وہ دین میں کچھ بھی بول نہیں سکتے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ہوا کہ قل اللہ شھید بینی وبینکم واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ( ) (کہدو اے رسول! کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہی قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی (نتائج نافرمانی سے) ڈراؤں اور جس کے پاس یہ قرآن پہنچ جائے (اس کو بھی) — اور فرمایا گیا وذکر بالقرآن من یخاف وعید ( ) (اور جو شخص میری دھمکی کا ڈر رکھتا ہے اس کو اس قرآن کے مطابق نصیحت و موعظت کرو۔)

حدیثوں کا تو کہیں ذکر ہی نہیں۔ کیا کسی نبی کو کتاب ناقص ملی تھی جس کی تکمیل انھوں نے اپنی حدیثوں سے کی؟ اگر کسی نبی کو ناقص کتاب ملی ہوگی اور اس کا دین بغیر اس کی حدیثوں کے صرف کتاب اللہ سے مکمل نہ ہوتا ہوگا تو بیشک اس کا فرض ہوا ہوگا کہ اس نے کتاب اللہ کے ساتھ اپنی حدیثیں بھی مدون کرکے اپنی امت کو دی ہوں گی۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسی کامل و مکمل کتاب ملی ہے جسکو تبیانا لکل شیٔ "دین کی ہر بات کا واضح بیان" ( ) کہا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ ما فرطنا فی الکتب من شیٔ ( ) "ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے"۔ اس لئے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ آپ کتاب اللہ میں اپنی حدیثوں کا پیوند لگاتے۔ آپ نے تو صحابہؓ کو حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا، جن لوگوں نے لکھ لکھ کر کچھ جمع کیا تھا آپ نے اسکے محو کردینے مٹادینے کا حکم دیا۔ آپ کا یہ فرض کیونکر ہوسکتا تھا کہ آپ اپنی حدیثیں خود مدون کرکے کتابی صورت میں اپنی امت کو دے جاتے؟ یہ تو آپ کیلئے جائز بھی نہ تھا، آپ کا فرض کہاں تک ہوتا۔

لے جو لوگ حدیثوں کو جزو دین و حصہ دین و حجت فی الدین نہیں ملتے ان کے سامنے صرف کوئی حدیث، کوئی روایت پیش کرکے ان سے منوایا نہیں جاسکتا مگر جن کے نزدیک "جس طرح قرآن مجید واجب الاتباع ہے اسی طرح احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی واجب الاتباع ہیں" اور صحاح ستہ خصوصاً صحیحین کی حدیثیں قرآن کے ساتھ مثل معہ بن کر منجانب اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھیں ان کیلئے تو کم سے کم صحاح کی ہر حدیث واجب التسلیم و واجب الاتباع ہے۔ اسلئے ہم اگر کوئی حدیث پیش کریں تو اہلحدیث کے پیروؤں پر اس کا ماننا واجب ہے مگر یہ ہمارے سامنے صرف کوئی حدیث نہیں پیش کرسکتے۔ جبتک اس کی تائید میں کوئی قرآنی آیت بھی پیش نہ فرمائیں۔ ۱۲ منہ

سوال ۵ اور اس کا قرآنی جواب

(مولانا یوسف کا سوال) کیا یہ لازم ہے کہ ہر نبی صرف کتاب اللہ ہی کے احکام پیش کرے اور اس کے رموز و تفاسیر و مطالب و مغلق احکام خود بیان نہ کرے جس کو ہم آج اصطلاح میں حدیث رسول کہتے ہیں؟

(جواب از قرآن مبین) اس کا جواب کچھ تو ۴ کی پیش کردہ آیتوں کے ضمن میں ہو چکا۔ اور سنئے:

انا انزلنا التورٰىة فیها هدی و نورٌ یحکم بها النبیون الذین اسلموا۔ ( )

ہم نے تورات اُتاری جس میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق اسلام پر چلنے والے نبی لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے رہے۔

خود ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ تم لوگوں سے کہدو کہ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے اور وہ وحی کون سی چیز کی گئی ہے؟ ۴ میں آیت لکھی جا چکی کہ اوحی الیّ ھذا القران[1] میری طرف یہی قرآن وحی کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے پوری طرح واضح ہے کہ اگلے انبیاء و مرسلین علیہم السلام بھی صرف اپنی کتاب اللہ ہی کے متبع تھے اور اسی کے مطابق تبشیر و تنذیر و تذکیر فرماتے تھے اور ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی دین کی ہر بات میں اور سارے مفوضہ خدمات میں صرف قرآن مبین ہی کے پابند رہے۔

اب میں مولانا یوسف کے اس سوال ۵ کا تجزیہ کر کے ہر جزو کا جواب جو آیات مذکورہ بالا سے مستنبط ہے عرض کرتا ہوں۔

(سوال ۵ کا پہلا ٹکڑا) "کیا یہ ضروری ہے کہ ہر نبی صرف کتاب اللہ ہی کے احکام پیش کرے؟"

(جواب) ہاں۔ کتاب اللہ سے باہر احکام غیر اللہ ہی کے ہوں گے اور انبیاء علیہم السلام غیر اللہ کے احکام کی تبلیغ و تعلیم نہیں کر سکتے۔

(سوال ۵ کا دوسرا ٹکڑا) "اور اس (کتاب اللہ) کے رموز و تفاسیر و مطالب و مغلق احکام خود بیان نہ کرے؟"

(جواب) (۱) رموز و تفاسیر و مطالب تو قرآن سے باہر نہیں ہو سکتے۔ جو باتیں قرآن ہی سے مستنبط ہوں وہ قرآن سے باہر نہیں کہی جا سکتیں مگر رموز و تفاسیر و مطالب بیان کرنے میں نئے نئے احکام اور نئے نئے حلال و حرام جن کو قرآن سے کوئی تعلق نہیں کہاں سے آجائیں گے!

باقی رہے "مغلق احکام" تو قرآن مبین میں کوئی حکم "مغلق" نہیں ہے۔ البتہ آپ جیسے علماء اور آپ کے اور ہمارے اسلاف نے پورے قرآن ہی کو مغلق بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر ہر آیت اور ہر حکم کے متعلق مختلف و متضاد تفسیری روایتیں سدی و کلبی جیسے وضاعین و کذابین سے ابن جریر جیسے شیعی مفسر روایت نہ کرتے جن کے بارے میں حافظ سلیمانی کا قول ہے کہ کان یضع للروافض یعنی ابن جریر رافضیوں کی حمایت میں حدیثیں گھڑ کر ذکر کرتے تھے تو احکام قرآنی میں کبھی اغلاق پیدا نہ ہوتا اور یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں نہ سدی و کلبی اور ان کے ہم مشرب راویانِ تفسیر پیدا ہوئے تھے۔ نہ ابن جریر وغیرہ تولد ہوئے تھے اور نہ یہ مختلف و متضاد تفسیری حدیثیں

---

[1] جس طرح ان اتبع الا ما یوحیٰ میں حصر ہے اسی طرح یہاں بھی ھذا القران میں حصر کا مفہوم ہے اگر حصر کا مفہوم نہ ہوتا تو فقط اوحی الیّ القران لکھنا کافی تھا۔ الف لام عہد کا بھی موجود ہی تھا۔ غرض ھذا یہاں مفہوم حصر ہی کیلئے ہے۔ ۱۲ منہ

گھڑی گئی تھیں اسلئے اسوقت قرآنی احکام میں کوئی اغلاق تھا ہی نہیں جس کے دور کرنے کی ضرورت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتی قرآن اپنی معجزانہ فصاحت وبلاغت کے ساتھ بلسان عربی مبین اترا تھا اور رسولؐ وصحابہؓ کی مادری زبان میں اترا تھا۔ جس کی ہر آیت کو ہر صحابی بطور خود بقدر ضرورت سمجھ لیتا تھا۔ بجاآوری احکام میں ہر صحابی سنتِ نبوی کا متبع تھا یعنی جس طریقے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس حکم کو انجام دیتے تھے تمام صحابہؓ بالکل اسی طرح انجام دیتے تھے اور اسی کا نام سُنّت ہے اسی کو قرآن مبین نے اسوۂ حسنہ فرمایا ہے مگر اس کو حدیثوں نے عشاق کے دلِ گم کردہ کی طرح ایسا کھودیا کہ نہ ان کا تعامل ہی امت میں ایک طریقے پر رہا نہ روایتیں ہی ایک طرح کی ملتی ہیں پھر سنت کے متعلق مختلف ومتضاد حدیثیں اس قدر ہیں کہ سنت صحیحہ ثابتہ کا پتہ لگانا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے اور یہ پتا لگانا بھی روایت پرستوں اور رُوات پرستوں کا کام نہیں بلکہ ہم جیسے قرآن مبین کے کامل اور مکمل ماننے والوں ہی سے ہو سکتا ہے۔

کون نہیں سمجھ سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری نماز جماعت صحابہؓ کی امامت فرماتے ہوئے جس طرح پڑھی تھی اس جماعت کے ہر صحابی نے بھی بالکل اسی طرح پڑھی تھی جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھی اور اس نماز باجماعت کے بعد جب آپ کے حکم سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جماعت صحابہؓ کی امامت کی تو بالکل اسی طرح نماز پڑھائی تھی جس طرح رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی تھی اور پھر تا زندگی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بالکل اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔ آپ کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی بالکل اسی طرح نمازیں پڑھیں اور پڑھائیں۔ پھر حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے بھی بالکل اسی طرح نمازیں پڑھیں اور پڑھائیں۔ پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی بالکل اسی طرح پڑھیں اور پڑھائیں۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی مجال نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس آخری نماز سے کسی بات میں ذرا سا بھی اختلاف کرتا، نہ کسی صحابی کی مجال تھی۔ اگر ایک شخص بھی کسی رکن، کسی بات میں ذرا سا بھی اختلاف رسول صلعم کی آخری نماز سے کرتا تو کوئی صحابی اس کے پیچھے کبھی نماز نہ پڑھتا۔ اسلئے نماز کا طریقہ مسنونہ بلکہ مفروضہ تو وہی تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نماز کا طریقہ تھا اور جو خلفائے راشدین کا طریقہ مطابق طریقہ نبوی تھا۔

اگر حدیثیں ابقائے سنت نبویہ کے لئے ہوتیں تو حدیثوں میں وہی ایک طریقۂ نماز مذکور ہوتا اور ساری امت اسی ایک طریقہ سے نماز پڑھتی مگر کیا حدیثوں سے کوئی شخص بھی اس طریقۂ مسنونہ کا پتا لگا سکتا ہے جو آخری طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور پھر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا تھا؟ محدثین نے اتنی مختلف ومتضاد حدیثیں اپنے دفاتر میں بھر دیں کہ بعد والوں نے حدیثوں کے مطابق مختلف نمازیں تصنیف کر ڈالیں۔ آج منکرینِ حدیث پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن سامنے رکھکر اپنی سمجھ کے مطابق نیا دین تصنیف کر رہے ہیں مگر یہی کام محدثین اور ان کے متبع فقہاء نے کیا تھا کہ مختلف ومتضاد حدیثوں کو سامنے رکھکر ہر فقیہ مجتہد نے ایک نیا دین تصنیف کر ڈالا اس کے بعد فاما الذین اورثوا الکتب من بعدھم لفی شك منه مریب ہ کے مطابق بعد والوں کو اس کا پتہ لگانا سخت دشوار ہو گیا کہ واقعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین کا طریقۂ نماز وطریقہ ادائے زکوٰۃ وطریقۂ صوم وطریقہ حج کیا تھا اور فصلِ خصومات وہ کس طرح فرماتے تھے؟

تو جو متضاد ومتخالف حدیثیں سنت صحیحہ ثابتہ کو ضائع اور برباد کرنے کیلئے گھڑی گئیں اور محدثین نے نادانستہ یا دانستہ ہر طرح ک

رطب ویابس روایتوں کو جمع کرکے رکھدیا۔ آج مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ ان کو بھی قرآن مجید ہی کی طرح واجب الاتباع سمجھو۔ جامعین احادیث کو انبیاء و رسل سمجھو اور راویوں کو جبرئیل امین ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا　　کارِ ملّت تمام خواہد شد

رسوال ۵ کا آخری ٹکڑا) " جس کو ہم آج کی اصطلاح میں حدیث رسول کہتے ہیں؟"

(جواب) حدیث رسول ہی نہیں بلکہ اس کو قرآن کے ساتھ مثلہٗ معہٗ منزّل من اللہ اور وحی غیر متلو مانتے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ مثلہ معہ والی حدیث موضوع و مکذوب صحاح کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ حدیثیں بھی وحی منزّل من اللہ ہوتیں تو یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلعلك تارك بعض ما یوحی الیك ( ) تو شاید تم بعض باتیں جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہیں ان کو چھوڑ دینے والے ہو" کے نزول کے بعد کبھی ان حدیثوں کو بالکل چھوڑ نہ دیتے بلکہ جس طرح قرآن مجید لکھوا رہے تھے حدیثیں بھی لکھواتے۔ یہ سمجھنا کہ حدیثیں اسلئے نہیں لکھوائیں کہ قرآن کے ساتھ مخلوط نہ ہوجائیں اور وحی متلو و غیر متلو کا فرق باقی نہ رہے محض ایک فریب ہے۔ آپ لکھنے والوں کی دو جماعتیں الگ الگ معین فرما دیتے ایک جماعت صرف قرآن لکھتی اور دوسری جماعت صرف حدیثیں۔ قرآن کے بارے میں آپ فرما دیتے کہ یہ وحی متلو ہے نمازوں میں ان کی قرأت کا حکم ہے اور حدیثوں کے بارے میں آپ فرما دیتے یہ وحی غیر متلو ہیں ان کا پڑھنا نمازوں میں جائز نہیں۔ اسی طرح دونوں کے باہم مخلوط ہونے کا خطرہ مٹ جاتا۔ آخر مختلف و متعدد چھوٹی بڑی ایکسو چودہ[۱۱۴] سورتیں اتریں اور لکھنے والے ان کو لکھتے رہے۔ کیا ایک سورت کی آیتیں دوسرے سورہ کی آیتوں سے خلط ملط کبھی ہوئیں؟ جب ایک ہی مجموعے کی آیتیں باہم خلط ملط نہ ہوئیں تو دو مجموعوں کی عبارتیں جن کے کاتبین بھی الگ الگ ہوتے کیوں باہم مخلوط ہوجاتیں۔

آپ لوگوں نے تو ہر قولِ منسوب بر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث رسول و واجب الاتباع مثل قرآن مجید مان لیا ہے وما انزل اللہ بھا من سلطان۔ آپ لوگ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا راوی عوف اعرابی جیسا شیطان خبیث ہے یا اسمٰعیل بن اویس جیسا کذاب و وضّاع۔ آپ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ امام بخاری کی کتاب میں یہ حدیث ہے اور جب صحیح بخاری میں ہے تو آپ کے نزدیک اس کا قولِ رسول ہونا قطعی و یقینی ہے۔ اور امام بخاری سے صحابی مروی عنہ تک کے درمیان جتنے نام آتے ہیں وہ سب فرشتے تھے ان میں ہر ایک بجائے خود ایک جبرئیل تھا۔ اس طرح کا ایمان روات پرستوں ہی کو مبارک ہو۔ ہم لوگ تو ہر حدیث منسوب بر رسول کو فاعرضوہ علی کتاب اللہ حکم نبوی کے مطابق قرآن مبین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ ارشاد نبوی کے موافق جو حدیث قرآن مبین کے مطابق ہوتی ہے اس کو قبول کر لیتے ہیں، جس کو قرآن مبین کے خلاف پاتے ہیں اس کو رَدّ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ دراصل حدیث رسول ہی نہیں ہے۔ جو بات حدیث رسول نہ ہو اس کو حدیث رسول کہنا درحقیقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بہتان باندھنا ہے اور من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعدہٗ من النار۔ (آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جو مجھ پر جھوٹی بات لگائے جان بوجھ کے وہ اپنی جگہ دوزخ میں ٹھہرا رکھے۔) اس حدیث کا اپنے کو مصداق بنانا ہے اسلئے کہ جو بات قرآن مبین کے خلاف ہے وہ کبھی قول رسول نہیں ہوسکتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی ایسی حدیثوں کو جو قرآن کے خلاف ہیں حدیث رسول کہے جانا اور ان کو قرآن کی طرح واجب الاتباع ماننا اور ان کو

صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیات کی تاویل یا تنسیخ کی کوشش کرنا، جان بوجھکر مخالف قرآن جھوٹی بات کی تہمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگانا ہے۔

چھٹا سوال اور اس کا قرآنی جواب

(مولانا یوسف کا سوال ۶) "کیا قوم کی ہدایت صرف کتاب اللہ ہی سے ہوتی ہے؟ یا پیغمبر بغیر کتاب اللہ کے اور بھی خدائی وحی سے (جسکو الہام یا القاء یا وحی کہتے ہیں) ہدایت کرتا ہے؟"

(جواب از قرآن مبین) اس کا جواب ۲ و ۵ کے ضمن میں قرآنی آیات کے ساتھ مذکور ہو چکا۔

اولم یکفہم انا انزلنا الیک الکتٰب یتلیٰ علیہم ( )

کیا ان کیلئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اسی کتاب کو اتار دیا ہے جو برابر ان کے سامنے تلاوت کی جاتی ہے۔

کیا مولانا محمد یوسف صاحب بتا سکتے ہیں کہ کونسی وہ ہدایت ہے جس سے قرآن مبین خالی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام یا القاء یا غیر قرآنی وحی کے ذریعے حاصل ہوئی؟ اگر کسی حدیث صحیح میں واقعی ہدایت کی کوئی بات ہے تو یقیناً اس کا ماخذ قرآن مبین ہی ہے۔ وہ ہدایت ہرگز قرآن سے باہر نہیں۔ اور اگر وہ بات قرآن مبین سے مستنبط نہیں تو وہ ہدایت کی بات ہی نہیں ہے۔ یقیناً گمراہی و ضلالت ہے جو تزئین شیطانی کی وجہ سے ہدایت معلوم ہوتی ہے اور وہ حدیث یقیناً موضوع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا و بہتان ہے۔

جو قرآن تبیاناً لکل شئ اترا ہو یعنی دین کی ہر بات بیان کر دینے ہی کیلئے نازل کیا گیا ہو اس سے اگر کوئی ہدایت کی بات چھوٹ گئی تو وہ تبیاناً لکل شئ کہاں رہا؟ اور ما فرطنا فی الکتٰب من شئ ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے یہ دعوٰی کہاں صحیح ٹھہرا اسلئے ناممکن ہے کہ الہام و القاء وغیرہ سے ہدایت کی کوئی ایسی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی ہو جو قرآن سے بالکل باہر ہو اور اگر ایسی کوئی حدیث ہو تو وہ یقیناً کسی ملحد کی من گھڑت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھلا ہوا بہتان اور افترا ہے اور جو بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ ہرگز ہدایت کی بات نہیں۔

ساتواں سوال اور اس کا قرآنی جواب

(مولانا یوسف کا سوال ۷) "کیا اختلاف احادیث جو ظاہری طور پر کسی حدیث میں نظر آتا ہو، یہ مانع ہے قبول حدیث سے؟"

(سوال ۷ کا قرآنی جواب)

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً ( )

اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوا ہوتا تو اس میں لوگ ضرور بہت اختلافات پاتے۔

اس لئے حدیثوں کے باہمی اختلافات بے شک اس کی دلیل ہیں کہ یہ من جانب اللہ نہیں ہیں۔

حدیثوں کے اختلافات کا کیا پوچھنا ہے کونسا ایسا دینی مسئلہ ہے جس میں مختلف اور متضاد حدیثیں نہ ہوں۔ روایت پرستوں کو یہ سارے اختلافات محض ظاہری معلوم ہوتے ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ باطن سب متحد و متفق ہیں۔ حالانکہ اختلاف و اتحاد ایسی باتیں نہیں جن کا فرق معلوم نہ ہو مگر عقیدتمندوں کو دونوں چیزیں ایک ہی معلوم ہوتی ہیں۔

جو دستِ اہلِ تقویٰ میں گیا ساغر تو مے ساقی عقیدت کی نظر میں انگبیں معلوم ہوتی ہے

آپ کا یہ سوال یقیناً اس معارضہ کی پیش بندی کا ہے جو آپ آئندہ پیش کریں گے۔ کہ اگر اختلافات کی وجہ سے حدیثیں قابل رد ہیں تو قرآن میں بھی تو معنوی اختلافات بہت کافی ہیں جیسا کہ تفسیروں سے ظاہر ہے اور لفظی اختلافات بھی کم نہیں جیسا کہ اختلاف قراءت سے، اسلئے اختلافات کی وجہ سے قرآن کو بھی رد کر دیجئے۔ تو یہ معارضہ صحیح نہیں کیونکہ معنوی اختلافات جو مفسرین اور فقہاء نے پیدا کئے ہیں ان اختلافات کا ذمہ دار قرآن مبین نہیں ہے بلکہ فرقہ بند مفسرین و فقہاء خود ہیں۔ ہر مفسر اور ہر فقیہ نے اپنے فرقہ کے مسلک کے مطابق کھینچ تان کی ہے۔ سارے معنوی اختلافات کی ذمہ داری مفسرین و فقہا کی فرقہ بندی پر ہے۔ قرآن مبین میں کوئی اختلاف نہیں۔

اسی طرح اختلاف قراءت ایرانی و کوفی منافقین کا محض افترا ہے قراءت متواترہ کے خلاف ساری روایتیں دوسری قراءت کی موضوع و مکذوب ہیں۔ قراءت متواترہ جو ساری دنیا میں مروج ہے اس کے سوا جو اور چھ قراءتوں کو متواتر کہا جاتا ہے ان میں سے کسی ایک کو متواتر ثابت کرکے کوئی دکھائے تو میں جانوں۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکٰفرین ٥ تو اگر تم نہ کر سکو اور کبھی نہ کر سکوگے، تو بچو اس آگ سے جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے۔

سوال ۵ اور اس کا قرآنی جواب

(مولانا یوسف کا سوال ۵) کیا یہ سبب رواۃ حدیث کہ فلاں صحیح[۱]، فلاں ضعیف، فلاں مجروح ہے، فلاں میں تشیع ہے، یا فلاں کاذب تھا یا فلاں کو نسیان تھا وغیرہ یہ احادیث کے رد کی وجہ ہے؟

(سوال ۵ کا قرآنی جواب)

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا جآءکم فاسق بنبإٍ فتبینوا ( )

اے ایمان والو جب تمہارے پاس کوئی بدکار کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو۔

راویانِ احادیث میں اکثریت مشتبہ ہی لوگوں کی ہے۔ جن کے بارہ میں ائمہ جرح و تعدیل کو کوئی بات قابل جرح معلوم ہو سکی تو انھوں نے رجال کی کتابوں میں لکھدی، نہیں معلوم ہوئی تو پھر

ہر کہ را جامہ پارسا بینی پارسادان و نیک مرد انگار

پر عمل کرکے ثقہ اس کے متعلق لکھدیا۔ اگر امام بخاری و امام مسلم و امام مالک نے اس سے روایت لی ہے تو پھر ان ائمہ محدثین کا بھرم رکھنے کیلئے ثقہ کے ساتھ حجۃ اور ثبت بھی لگا دیا۔ جو حدیثیں ان راویوں سے مروی ہیں ان کی معنوی نوعیتوں پر کبھی غور نہیں کیا۔ بہر حال جن پر جرحیں مذکور ہیں اور اکثر محدثین کا یہ متفقہ اصول ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے تو پھر مجروحین کی روایتوں کو رد کر دینا چاہیے۔ شیعوں کا حال شیعوں کی کتابیں ہی دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کم سے کم اصول کافی ہی بغور مطالعہ کر لیا جائے۔

---

[۱] غالباً فلاں قوی فلاں ضعیف مولانا لکھنا چاہتے ہونگے ورنہ راوی کیا صحیح ہوگا؟ روایت البتہ صحیح ہوتی ہے ۱۲۔

جنکے یہاں تقیہ وکتمان دین کا جزو اعظم ہو اُسکے ظاہری زہد و تقویٰ سے دھوکا کھانا کیسی مہلک غلطی ہے۔ تفسیری روایتوں کو سدی وکلبی نے جس طرح گھڑ گھڑ کر پھیلایا اور باوجود اس کے کہ سارے ائمہ رجال ان دونوں کو کذاب لکھ رہے ہیں مگر تمام مفسرین ان کی روایتوں پر امنّا و صدقنا کہے جاتے ہیں اور یہی حال تقریباً احادیث احکام کا ہے کہ ان کے راوی بھی کتنے سدی وکلبی کے ہمرنگ ہی ہیں۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے لوگ زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے ہیں جو ایسے متعدد لوگوں سے روایتیں بیان کرتے ہیں جن سے صرف وہی روایت کرتے ہیں دوسرا روایت نہیں کرتا جو ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جن کو ان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا یہ سب مشتبہ اور مخدوش لوگ ہیں۔ اگر آپ فرمائیں گے تو انشاءاللہ میں ایسے مفسدین احادیث کے اسماء گرامی لکھ کر پیش کر دونگا۔ مولانا! اہلحدیث ہونا حدیث کی کتابیں پڑھ لینا بلکہ پڑھاتے رہنا اور باتیں ہیں اور حدیث کے فن کا جاننا کچھ اور ہی چیز ہے۔

نویں سوال کا قرآنی جواب

(مولانا یوسف کا سوال ۹) "کیا وہی اعتراض جو احادیث پر وارد ہوتے ہیں خواہ کوئی بھی اور کیسا بھی ہو وہی اعتراض اگر قرآن مجید پر منکر قرآن پیش کرے، یا آپکا خصم بطور الزام پیش کرے تو قرآن پاک کو رد کیا جائے گا"؟

(سوال ۹ کا قرآنی جواب)

ان الذین یلحدون فی اٰیٰتنا لا یخفون علینا الآیہ

ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ الآیہ

اگر تمہیں کچھ شک ہو اس کتاب کے بارے میں جسے ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کے مثل ایک سورہ ہی بنا کر پیش کرو۔

مولانا! جو اعتراضات حدیثوں پر ہوتے ہیں ان میں کا ایک اعتراض بھی قرآن مجید پر وارد نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ حدیثوں پر آپ کے سامنے اعتراضات پیش کر رہے ہیں وہ ایماناً اور دیانۃً پیش کر رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بول رہے ہیں یا لکھ رہے ہیں اس کے متعلق قیامت کے دن ان کو حساب دینا ہوگا مگر آپ قرآن مجید پر کوئی اعتراض بھی ایماناً و دیانتاً نہیں کر سکتے۔ اگر کر سکتے ہیں تو کیجئے مگر قیامت کی بازپرس کا خیال رکھتے ہوئے۔

باقی رہے منکرین قرآن۔ یا شیعہ حضرات جو قرآن مجید میں تحریف ثابت کرتے رہتے ہیں چونکہ وہ اس قرآن کے محفوظ من اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے تو ان کے اعتراضات کی بنیاد آپ ہی کی حدیثوں پر ہوا کرتی ہے۔ ان کے جو اعتراضات ملاحدۂ عجم اور منافقین کوفہ و شام و عراق وغیرہ کی من گھڑت روایتوں کی بنیاد پر ہیں ان کا جواب تو روات پرستوں ہی کو دینا چاہیئے۔ منکرین احادیث موضوعہ ان جھوٹی حدیثوں کو مانتے ہی کب ہیں وہ صاف کہدینگے کہ یہ حدیثیں منافقین کی من گھڑت ہیں ہم انھیں مانتے۔

اور جو عقلی اعتراضات وہ اپنی بے عقلی کی وجہ سے کریں گے، ان کے جوابات عقلی دلائل قاطعہ سے دیئے جائیں گے اور جب عقلی اعتراضات ہوئے ہیں تو ان کے عقلی جوابات ضرور دیئے گئے ہیں اور دندان شکن جوابات دیئے گئے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ جو اعتراضات حدیثوں پر ہیں ان میں کا ایک اعتراض بھی قرآن مجید پر وارد کر کے دیکھئے، کیا شافی جواب ملتا ہے مگر ذرا سوچ سمجھ کر میدان میں اتریئے گا۔

دسواں سوال اور اس کا قرآنی جواب (مولانا یوسف کا سوال ۱۰) "کیا جس مجموعہ مستند کا آپ نے ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید کو کتابی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا یہ موجودہ قرآن وہی ہے؟"

(سوال ۱۰ کا قرآنی جواب)

ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ (۲/۲)

یہ کتاب، اس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

قل اللہ شہید بینی و بینکم واوحی الی ھذا القراٰن ( )

کہدو اے رسول کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہی قرآن وحی کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کا معجزانہ تواتر جو عہد نبوی سے لیکر آج تک کتابۃً، تلاوۃً، قراءۃً، تعلیماً، تعلّماً، حفظاً ہر طرح سے غیر منقطع تسلسل کے ساتھ ساری دنیائے اسلام میں چلا آرہا ہے وہی اس سوال کا منہ توڑ جواب دینے کیلئے کافی ہے۔ مجھکو کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔

گیارہواں سوال اور اس کا قرآنی جواب (مولانا یوسف کا سوال ۱۱) "کیا جو حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن مجید کے تمام نسخے جلادیئے تھے؟ صرف ایک رکھا تھا؟ کیا یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستند اور کتابی شکل میں صحابہ کو دیا تھا، یا جو جلادیئے گئے تھے ان میں سے کوئی تھا، یا وہ کل نسخے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف زبانوں اور مختلف لغات میں صحابہ کو دیئے تھے آخر وہ کیوں جلائے گئے اور کیوں ایک نسخہ رکھا گیا، اور وہ کونسی زبان و لغت صحیحہ کی بناء پر رائج الوقت قرار دیا گیا ہے"؟

(سوال ۱۱ کا قرآنی جواب)

لولا جاءو علیہ باربعۃ شہداء ۚ فاذلم یأتوا بالشہداء فاولٰئک عند اللہ ھم الکٰذبون ۝

کیوں نہیں اس بہتان پر چار گواہ لائے؟ تو جب وہ گواہوں کو نہ لاسکے تو وہی لوگ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔

کسی پر تہمت لگانا کسی پر بہتان باندھنا کھیل نہیں ہے۔ یہ زنا اور بدکاری کی تہمت سے زیادہ سخت اور سنگین تہمت ہے جو حضرت عثمان ذالنورین رضی اللہ عنہ پر لگائی گئی ہو۔ کیا مولانا یوسف کم سے کم چار صحابہؓ اور چار تابعی اور چار اتباع تابعین یعنی ہر دور کے چار گواہ اس روایت مکذوبہ پر لاسکتے ہیں؟

میرے دوست مولانا یوسف صاحب نے اپنے اس گیارہویں سوال کے ضمن میں حسب ذیل سوالات کئے ہیں:

(۱) حضرت عثمان غنی نے قرآن مجید کے تمام نسخے جلادیئے تھے؟ صرف ایک رکھا تھا؟

اس کا جواب ضرور ہمارے ذمے ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ نہیں، ایسا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا تھا۔ نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی نسخہ جلایا تھا نہ صرف ایک نسخہ رکھا تھا۔ قرآن ہر صحابی کے گھر میں تھا، سب کے سب قرآن دیکھ دیکھ کر پڑھتے تھے اور زبانی بھی پڑھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیوں کسی نسخے کو جلانے لگے اور اگر ایسا کرتے تو کیا کوئی صحابی بھی اس کو برداشت کرسکتا تھا؟

(ب) کیا یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستند اور کتابی شکل میں صحابہ کو دیا تھا ؟

(ج) یا جو جلا دیئے گئے تھے ان میں سے کوئی تھا ؟

(د) یا وہ کل نسخے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف زبانوں اور مختلف لغات میں صحابہ کو دیئے تھے ؟

(ہ) آخر وہ کیوں جلائے گئے ؟

(و) اور کیوں ایک نسخہ رکھا گیا ؟

(ز) اور وہ کون سی لغت و زبان صحیحہ کی بنا پر رائج الوقت قرار دیا گیا ؟

یہ (ب) سے لیکر (ز) تک چھ سوالات ہم جیسوں سے پوچھنا تو بالکل غلط ہے جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعض نسخہائے قرآن کے جلانے کے واقعہ ہی کو محض جھوٹ بہتان اور افترا جانتے اور مانتے ہیں، نہ ان سے یہ چھ سوالات کئے جا سکتے نہ وہ ان کے جوابات کے ذمہ دار ہیں۔

البتہ مولانا یوسف صاحب کو لازم ہے کہ یہ چھ سوالات بلکہ ساتوں سوالات امام بخاریؒ سے کریں یا ابن شہاب زہری سے جو تنہا اس روایت مکذوبہ کے راوی ہیں۔

اگر کسی صوفی سے کشف قبور کا طریقہ سیکھ کر اور اس کی مشق بہم پہنچا کر میرے دوست مولانا محمد یوسف صاحب امام بخاری اور ابن شہاب زہری کی قبروں پر جا کر مراقب بیٹھ جائیں تو نہایت آسانی کے ساتھ دونوں سے یہ ساتوں سوالات کر سکتے ہیں بلکہ ایک آٹھواں سوال میری طرف سے بھی کر کے اس کا جواب بھی پوچھیں کہ

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صرف ایک نسخہ قرآن رکھ کر باقی سب نسخوں کو جلانے لگے تھے اسوقت کسی صحابی کے دل میں بھی حمایتِ قرآن کا جذبہ پیدا نہ ہوا تھا ؟ کم سے کم حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو ذوالفقار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے کہ ہم کتاب اللہ کو کبھی جلانے نہ دینگے ؟ آخر تمام صحابہؓ کو کیا ہو گیا تھا کہ قرآن کے نسخے جلتے ہوئے چپ چاپ دیکھتے رہے اور حضرت عثمانؓ کو اس کار بد سے روک ٹوک نہیں ؟

جب ان سوالوں کے جوابات امام بخاری و ابن شہاب زہری کی روحوں سے مل جائیں تو ان کو ازراہِ کرم اس رسالہ طلوع اسلام میں بھی شائع فرما کر ہم لوگوں کو بھی مستفیض ہونے کا موقع دیں۔

ورنہ ایک جھوٹی روایت کی بنیاد پر جو گمراہ کن سوالات پیدا ہوں ان کے جوابات ان لوگوں سے کیوں پوچھے جائیں گے جو اس روایت ہی کو جھوٹی اور اس واقعہ ہی کو بالکل غلط اور ناشدہ یقین کرتے ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب کا بارہواں اور آخری سوال اور اس کا قرآنی جواب

(مولانا یوسف کا سوال ۱۲) پھر اس کا کیا ثبوت کہ موجودہ قرآن پاک یہ وہی ہے اور ہو بہو وہی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیلؑ کے سامنے بطور تلاوت پیش کیا تھا یا جبرئیلؑ نے حضورؐ پر اس کو پیش کیا تھا ؟

(سوال ۱۲ کا قرآنی جواب) نحن نزلنا الذکر و انا له لحٰفظون ( )

ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم بیشک ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں

لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه۔ تنزیل من حکیم حمید ( )

باطل نہ اسکے آگے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے یہ حکمت وحمد کے مالک کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے۔

یہ مذکورہ بالا دو آیتیں اس ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ موجودہ قرآن پاک جو معجزانہ تواتر کے ساتھ تقریباً پونے چودہ سو برس سے چلا آرہا ہے اور ساری دنیائے اسلام میں مروج ہے، ہر مسلم گھر میں ہر زمانے میں عہد نبوی سے لیکر آج تک موجود ہے اور موجود رہا۔ یہ وہی قرآن ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا، جسکو آپ تلاوت فرماتے تھے اور تمام صحابہ تلاوت کرتے تھے ہو بہو وہی ہے وکفی باللہ شھیدا۔ اور مجھکو یقین ہے مولانا یوسف کا ایمان بھی اسی عقیدے پر ہے

میں نے بعونہ تعالیٰ وبفضلہ عزوجل اپنے دوست جناب محترم مولانا محمد یوسف صاحب صدر جمعیت اہلحدیث کراچی کے بارہ سوالات کے جوابات قرآن مجید کی آیتوں سے دیدیئے۔ امید ہے کہ مولانا تعصب اور غلو سے کام نہ لیں گے اور ٹھنڈے دل سے ان جوابات پر غور فرمائیں گے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں ان حدیثوں کو جو قرآن مبین کے مطابق ہیں اور اسی وجہ سے ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہو سکتی ہے قرآن مجید کی تفسیر سمجھتا ہوں اور ان کی دینی اہمیت پوری طرح جانتا اور مانتا ہوں۔ میں خود قرآن کی تفسیر اپنی سمجھ کے مطابق کروں مجھکو اس کا حق ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن مجید کی تبلیغ وتعلیم وتبیین ہی کیلئے مبعوث ہوئے ان کو قرآنی آیات کی تفسیر بیان فرمانے کا کوئی حق نہ تھا؟ کوئی صاحب عقل سلیم ایسا نہیں سمجھ سکتا۔ مگر تفسیر کو متن قرآن کے سیاق وسباق کے مطابق اصول ادب عربی کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید کی مصداق ہو؟ جب کوئی حدیث صحیح یعنی مطابق قرآن مجھے مل جاتی ہے تو میں اس سے سرتابی کفر سمجھتا ہوں۔

لیکن نہ رواۃ حدیث کو جبرئیل امین سمجھتا ہوں نہ محدثین کو پیغمبر۔ اسلئے میں صحاح ستہ یا بخاری ومسلم کا پرستار نہیں ہوں۔ تدبر فی القرآن کی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے اور نقد احادیث کی ایک حد تک صلاحیت بھی۔ فن رجال کی کوئی گھاٹی غالباً مجھ سے چھوٹی نہیں ہے۔ اس فن میں میری خود متعدد تصنیفیں ہیں۔ غرض احادیث کی متن واسناد سب پر کافی غور کرکے ان کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کرتا ہوں اور دیانتہً فیصلہ کرتا ہوں۔ میں کسی فرقے کا آدمی نہیں صرف مسلم ہوں اور میرا دین صرف اسلام، اسی کے قریب پہنچ چکا ہوں مرنے کے دن قریب ہیں قیامت کی بازپرس سے بہت ڈرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھائے، آمین ثم آمین لیکن میں بھی انسان ہوں مجھ سے بھی غلطی اور غلط فہمی ہو سکتی ہے اور باوجود اس تحدیث نعمت کے جوابھی کی مجھکو اپنے جہل کا اعتراف ہے اسلئے جو شخص مجھکو میری غلطیوں سے مطلع کردے میں اس کا شکر گزار رہوں گا۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ

تمنا عمادی مجیبی پھلواروی

طلوع اسلام | ہم نے علامہ تمنا کی تمنا کے مطابق ان کے جوابات شائع کر دیئے ہیں۔ اگر ہم خود اس موضوع پر قلم اٹھاتے تو ہم علامہ یوسف صاحب حدیث سے صرف اتنی بات پوچھتے،

(الف) آپ یہ مانتے ہیں یا نہیں کہ جو قرآن اسوقت مسلمانوں کے پاس ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلعم پر وحی کیا اور جسے رسول اللہ صلعم نے محفوظ شکل میں امت کو دیا؟

(ب) کیا حدیث کی کوئی کتاب بھی ایسی ہے جس کے متعلق امت نے یہ تسلیم کیا ہو کہ اسے بھی رسول اللہ صلعم نے محفوظ شکل میں امت کو دیا تھا اور وہ حرفاً حرفاً اسی طرح آج تک محفوظ ہے؟

"تین بڑے بڑے منکرین حدیث"

امام ابوحنیفہؒ۔ شاہ ولی اللہؒ۔ اور علامہ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ نے (خطباتِ تشکیلِ جدید میں) اپنے چھٹے خطبہ کا عنوان رکھا ہے "اسلامی نظام میں اصولِ حرکت" اس میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام ایک تحریک ہے اور تحریک کیلئے ضروری ہے کہ وہ کسی خاص زمان یا مکان کے ساتھ مخصوص اور اس کی چار دیواری میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس باب میں انھوں نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت کیلئے غیر متبدل سرچشمہ قوانین میں ہے اور احادیث سے مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنے زمانے کیلئے ان اصولوں کی تفصیل کس طرح مرتب فرمائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کیلئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کیلئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کیلئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کیلئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ

انھوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبال ص۱۶۴-۱۶۳)

طلوع اسلام اسی مسلک کی دعوت دینے کے جرم میں "منکر حدیث" فلہذا "مرتد اور ملحد" قرار دیا جا رہا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ اس معاملہ میں کتنے کتنے بڑے "منکرین حدیث" اس کے ساتھ شامل ہیں۔

حسبنا کتاب اللہ کہنے والے کافر

جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار رکن محترم امین احسن صاحب اصلاحی نے حسب ذیل فتویٰ صادر فرمایا ہے :-

بعض لوگ اسلامی شریعت کے اختلافات کا حوالہ دیکر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا تو کوئی امکان نہیں ہے البتہ قرآن کے اصولوں پر اس ملک میں حکومت قائم کرو۔ اگر مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ شریعت نہیں ہے تو یہ صریح کفر ہے اور بالکل اسی طرح کا کفر ہے جس طرح کا کفر قادیانیوں کا ہے بلکہ کچھ اس سے بھی سخت اور شدید ہے۔ قادیانیوں نے رسول اللہؐ کی خاتمیت کا انکار کیا ہے اور یہ رسول اللہؐ کے شارع اور واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہونے کے منکر ہیں۔ اگر یہ عقیدہ رکھنے والے کچھ افراد مسلمانوں کے اندر موجود ہیں تو ان پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہئے کہ ایسے افراد کے لئے امت مسلمہ کے اندر کوئی جگہ نہیں ہے۔

روزنامہ تسنیم لاہور ص۱۱

۱۵ر اگست ۱۹۵۲ء

باب المراسلات

حدیث کی حیثیت | لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ

اس میں شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلعم نے احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔ نہ ہی کسی کو اپنی احادیث حفظ یاد کرائیں لیکن اتنا تو ماننا پڑے گا کہ احادیث کی موجودہ کتابوں میں غلط اور صحیح دونوں قسم کی حدیثیں موجود ہیں۔ صحیح حدیثوں کا معیار یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے مطابق ہوں اس لئے آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ان کتابوں میں جو حدیثیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں چھانٹ کر الگ کر لیجئے اس مجموعہ کو رسول اللہ کی حدیثیں تسلیم کر لیا جائے۔ اس طرح قرآن اور اس کے ساتھ اس کی وہ تشریح جو رسول اللہؐ نے فرمائی تھی ہمارے سامنے آجائے گی۔ ان ہی کا نام اسلامی شریعت ہوگا۔

طلوع اسلام | آپ نے لکھا ہے کہ جو حدیثیں قرآن کے مطابق ہوں انھیں الگ کر لیا جائے اور اس منتخب مجموعہ کو رسول اللہ صلعم کی صحیح حدیثیں تصور کر لیا جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اصل حقیقت تک نہیں پہنچے۔ غلط حدیثوں سے قطع نظر جنھیں آپ صحیح حدیثیں قرار دیتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہوں گی۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ عدل کرنا ضروری ہے کسی حدیث میں ایک واقعہ ملتا ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس معاملہ میں عدل فرمایا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح ہوگا کیونکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قرآن کے حکم کے مطابق عدل کیا' یہ آپ کی تجویز کردہ حدیثوں کی ایک قسم ہوگی لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس سے ہمیں اپنے معاملات میں کوئی ایسی راہنمائی نہیں ملے گی جو قرآن میں موجود نہ تھی۔ عدل کا حکم قرآن میں موجود ہے اسی پر رسول اللہ صلعم نے عمل کیا اسی پر ہم عمل کریں گے۔

جس مقام پر حدیث کی اصل ضرورت بتائی جاتی ہے وہ اور ہے۔ قرآن میں اکثر و بیشتر احکام صرف اصولی طور پر دیئے گئے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ ان اصولی احکام کی جو تشریح رسول اللہ صلعم نے فرمائی وہ تشریح قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہے اور ہر زمانہ کے مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے آتوا الزکوٰۃ (زکوٰۃ دو) یہ اصولی حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ کے معنی ہیں اڑھائی فیصدی۔ اس اڑھائی فیصدی کو نہ دو فیصدی کیا جا سکتا ہے نہ تین فیصدی۔ گویا قرآن کے حکم آتوا الزکوٰۃ سے مراد ہے اڑھائی فیصدی اس میں ردو بدل کرنے سے دین کی نفی ہو جاتی ہے۔

آپ فرمائیے کہ اس حدیث کے متعلق کس طرح سے فیصلہ کیا جائے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ آپ کہتے ہیں کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح مان لیا جائے لیکن یہاں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ "اڑھائی فیصدی" قرآن کے مطابق یا اس کے خلاف ہے۔ اب فرمائیے کہ ہمارے پاس وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط کیونکہ آپ نے اس کا معیار یہ بتایا تھا کہ

جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دیا جائے۔

اسی نکتہ کو ذرا اور وضاحت سے سن لیجئے۔ نصاب زکوٰۃ کے بعد سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کس کس چیز پر فرض ہے مثلاً یہ کہ جو زیور روزمرہ کے پہننے کا ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔ بہت سی احادیث ہیں جن میں آیا ہے کہ ان میں زکوٰۃ نہیں اس کے برعکس بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن میں آیا ہے کہ ان پر زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔ دونوں قسم کی حدیثیں حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں موجود ہیں اور دونوں کے راوی اولوالعزم صحابہؓ ہیں۔ اب فرمائیے کہ ان میں سے کس حدیث کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ قرآن کے مطابق ہے اور کس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔

یا فرض کیجئے کہ اس معاملہ میں ایک ہی مضمون کی حدیثیں ہوتیں تو بھی اس کا فیصلہ کس طرح سے ہو سکتا تھا کہ وہ قرآن کے مطابق ہے یا مخالف۔

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ حدیثوں کے پرکھنے کے معاملہ میں یہ اصول بھی کام نہیں دے سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں درحقیقت اقرار اور انکار حدیث کا سوال پیدا ہوتا ہے یعنی اقرار حدیث والے کہتے ہیں کہ قرآن کے اصولی احکام کی وہی جزئیات شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں جو رسول اللہؐ نے بیان فرما دیں ان میں ذرا سا رد و بدل بھی دین کی نفی ہے۔ انکار حدیث والے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا ہے ہی نہیں جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ فلاں جزئیات فی الواقعہ رسول اللہ صلعم نے متعین فرمائی تھیں۔

اقرار حدیث والوں کا متشدد طبقہ یہ کہتا ہے کہ ائمہ احادیث نے جن حدیثوں کو صحیح قرار دیدیا ہے ان کے متعلق یہ ماننا ہوگا کہ وہ یقینی طور پر رسول اللہ صلعم کی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ دین کے معاملہ میں ہمارے ایمان کا دارومدار ائمہ کے فیصلوں پر رہ گیا۔ دوسرا طبقہ معتدلین کا ہے (جس میں آپ بھی شامل ہیں) ان کا خیال ہے کہ ہمیں خود انتخاب کرنا چاہئے کہ کونسی حدیثیں صحیح ہیں اور کونسی غلط۔ یعنی اس صورت میں امت کے ایمان کا مدار ہمارے فیصلوں پر ہوگا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ائمہ احادیث کو یا آج ہمیں یہ کیا حق حاصل ہے کہ ہم یہ فیصلہ کر دیں کہ فلاں حکم رسول اللہ صلعم کا ہے اور فلاں نہیں۔

اب آپ یقیناً کہیں گے کہ قرآن کا حکم (اٰتوا الزکوٰۃ) محض اصولی ہے جس پر عمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کی جزئیات متعین نہ کی جائیں۔ اللہ نے جزئیات متعین نہیں کیں اور رسول اللہ صلعم کی متعین کردہ جزئیات کے متعلق یہ دشواری ہے کہ ہم یقینی طور پر کہہ نہیں سکتے کہ رسول اللہؐ نے کیا بات کہی تھی اور کیا بات نہیں کہی تھی تو اس حکم پر عمل کرنے کی صورت کیا ہو؟

یہ تھی وہ الجھن جس کے پیش نظر ایک گروہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن میں ہر حکم کی تفصیلی جزئیات بھی موجود ہیں۔ اسی غلط تصور کے ماتحت وہ لگے قرآن میں کھینچا تانی کرنے۔ اس گروہ کو اہل قرآن یا چکڑالوی کہا جاتا ہے۔

دوسرے گروہ نے اس الجھاؤ سے نکلنے کی یہ صورت سمجھی کہ جو باتیں امت میں تواتر سے چلی آتی ہیں (یعنی مسلسل اور متواتر چلی آ رہی ہیں) ان کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ وہ رسول اللہ صلعم نے متعین کی تھیں۔ یہ وہ گروہ ہے جو اہل حدیث اور اہل قرآن کے بین بین

چلتا ہے لیکن اگر تواتر کو یقین کا مرتبہ دیدیا جائے تو اس باطنی علم کے متعلق کیا کہا جائے گا جسے ایک پیر نام گنا گنا کر مسلسل اور متواتر رسول اللہ صلعم تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے ہر مرید کو یہ شجرۂ نسب زبانی یاد ہوتا ہے جسے وہ ہر صبح وظیفہ کے طور پر دہراتا ہے اور اسم خانقہی کو مسلسل و متواتر رسول اللہ صلعم تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔

اور تیسرا گروہ منکرین قرآن کا ہے جو اس کا اعلان کرتا ہے کہ قرآن ناقص کتاب ہے جس کی تکمیل رسول اللہ کی تشریح کے بغیر ناممکن تھی۔ رسول اللہ صلعم کی یہ تشریحات احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ احادیث کے ان مجموعوں میں تو ایسی احادیث بھی ہیں جو قرآن کے خلاف جاتی ہیں تو وہ کہدیتے ہیں کہ حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ بھی کر سکتی ہے اور جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ جب حدیث کے بغیر قرآن اس طرح ناقص (بلکہ ناقابلِ عمل) رہ جاتا تھا تو کیا رسول اللہ کے لئے لازم نہیں تھا کہ وہ ان احادیث کا ایک مستند اور مصدقہ مجموعہ مرتب کر کے اسی طرح امت کو دے جاتے جس طرح قرآن دیا گیا تھا تو یہ منکرین قرآن انتہائی بے باکی اور جہالت سے یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ اس کا بھی کیا ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے امت کو قرآن محفوظ شکل میں دیا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے جس طرح احادیث کو غیر محفوظ چھوڑا تھا اسی طرح قرآن کو بھی غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا۔ قرآن کو بھی بعد میں مسلمانوں نے خود مرتب کیا اور حدیث کو بھی۔ اسلئے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد نہ قرآن ہی قابلِ یقین رہتا ہے نہ احادیث اور یہی ان منکرین قرآن کا مقصود تھا انھیں خطرہ تھا کہ جب مسلمانوں کو یہ پتہ چل گیا کہ حدیث محفوظ نہیں تھی تو وہ قرآن کی طرف رجوع کر جائیں گے۔ اس خطرہ سے مامونیت کا یہی طریقہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا کر دیا جائے کہ قرآن بھی محفوظ نہیں ہے۔

ان گروہوں کے برعکس طلوعِ اسلام نے یہ بتایا کہ

(۱) اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوتا کہ شریعت کی جزئیات بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہنی چاہئیں تو وہ قرآن کے اصولی احکام کے ساتھ ان کی جزئیات بھی خود ہی متعین کر دیتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا منشا یہ تھا کہ قرآن کے اصول تو غیر متبدل رہیں لیکن اس کی جزئیات غیر متبدل نہ رہیں۔

(۲) برسبیل تنزل اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ خدا کا یہ منشا تھا کہ اصولی حکم خدا خود دے اور اس کی جزئیات رسول اللہ صلعم متعین کریں اور یہ جزئیات قیامت تک کیلئے غیر متبدل رہیں تو رسول اللہ پر یہ فرض تھا کہ وہ ان جزئیات کو محفوظ شکل میں امت کو دیکر جاتے تاکہ ان میں قیامت تک کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو سکتی چونکہ رسول اللہ صلعم نے بھی ایسا نہیں کیا اس سے ظاہر ہے کہ خدا اور رسول کا منشا یہ نہیں تھا کہ رسول اللہ صلعم کی متعین کردہ جزئیات غیر متبدل رہیں۔

(۳) خدا کا منشا یہی تھا کہ دین کے اصول جو قیامت تک کیلئے غیر متبدل رہیں قرآن میں دیدیئے جائیں اور اس قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا جائے۔ ان اصولوں کی جزئیات قرآنی نظام قائم کرنے والی امت اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے عقل و فکر کی روشنی میں خود متعین کرتی رہیں۔

(۴) سب سے پہلے ان جزئیات کو خود رسول اللہ صلعم نے متعین کیا لیکن اُنھیں نہ خود مرتب کیا نہ کسی کو مرتب کرنے دیا تاکہ آنے والی نسلیں کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ جزئیات بھی قرآن کی طرح غیر تبدل ہیں۔

(۵) رسول اللہ صلعم کی اسی سنت (طریق عمل) پر آپ کے خلفاء نے عمل کیا یعنی جو جزئیات ایسی تھیں جن میں ان کے زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے مقتضی نہیں تھے انھیں علیٰ حالہ رہنے دیا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت تھی ان میں بلا تامل تبدیلی کردی (چنانچہ جب حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ طلاق کے معاملہ میں جو فیصلہ آپ نے کیا ہے وہ رسول اللہؐ کے فیصلے کے خلاف ہے تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہؐ کے زمانے کے حالات کا تقاضا وہی تھا اور ہمارے زمانے کے حالات کا تقاضا یہ ہے) اور جو نئے معاملات پیش آئے ان میں اسی طرح سے خود نئے فیصلے کئے۔

(۶) آج بھی منشائے خداوندی اور سنت رسول اللہ صلعم باقتدائے صحابہؓ یہی ہے کہ ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے حالات اور زمانہ کے تقاضہ کو خود پرکھیں جو جزئیات ایسی چلی آرہی ہیں جن میں کسی ردو بدل کی ضرورت نہیں انھیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے اور جن میں کسی ردو بدل کی ضرورت ہے ان میں ضروری ردو بدل کر لیا جائے۔

یہ ہے اللہ کی متعین کردہ صحیح راہ عمل اور یہی ہے وہ مسلک جس کی طرف طلوعِ اسلام دعوت دیتا ہے۔

حدیث کی بحث کیوں؟ | کراچی سے ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ:-

> آپ نے اکتوبر کی اشاعت میں طلوع اسلام کے جو اغراض و مقاصد بیان کئے ہیں ان سے واضح ہے کہ طلوع اسلام کا بنیادی مقصد قرآنی نظام ربوبیت کو نافذ کرنا ہے۔ یہ مقصد ایسا ہے کہ جس میں کسی مسلمان کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن طلوع اسلام جب حدیثوں کے متعلق بحث چھیڑ دیتا ہے تو اس سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا اثر اس کے مقصد پر پڑتا ہے۔ طلوع اسلام کو چاہئے کہ وہ حدیثوں کی بحث میں نہ اُلجھے۔

طلوع اسلام | آپ کا یہ خیال ہے کہ حدیثوں کی بحث محض نظری بحث ہے جس کا تعلق اس مقصد سے کچھ نہیں جو طلوع اسلام کے پیش نظر ہے۔ معاملہ کو سطحی طور پر دیکھنے سے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے لیکن اگر آپ ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ بحث نظری نہیں۔ عملی اور بنیادی ہے۔ مثلاً اسی نظام ربوبیت کو لے لیجئے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ معاشرہ (مملکت یا حکومت) کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے مملکت کے ذرائع پیداوار معاشرہ کی اجتماعی تحویل میں ہونے چاہئیں۔ اگر یہ ذرائع افراد کی ذاتی ملکیت قرار دیدیئے جائیں تو حکومت کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اسی لئے قرآن کریم میں واضح الفاظ میں کہدیا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی وہ "سواءً للسائلین" ہے۔

یہ اصول اسی صورت میں قانون کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اسلامی نظام (دین) کے غیر متبدل اصول صرف قرآن میں ہیں اس کے برعکس اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ روایات میں بیان شدہ احکام بھی قیامت تک کیلئے غیر متبدل ہیں تو آپ محولہ بالا اصول کو کبھی قانون بنا ہی نہیں سکتے اس لئے کہ روایات کی رو سے زمین اور دیگر ذرائع پیداوار پر افراد کو ملکیت کا حق حاصل ہے۔ اور اس ملکیت کیلئے کوئی حدبندی نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس چیز کو دین تسلیم کر لیا جائے تو آپ کسی طرح زمینداروں سے زمین نہیں چھین سکتے حتیٰ کہ آپ ان کی مرضی کے خلاف زمین کی پیداوار کو بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ نہ قیمت دیکر نہ ویسے۔

اس ایک مثال سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ بحث کہ روایات میں بیان شدہ احکام قیامت تک کیلئے غیر متبدل ہیں یا امت کو ان میں تغیر و تبدل کا حق حاصل ہے، نظری بحث نہیں۔ اس کا تعلق ہمارے تمام عملی مسائل سے ہے۔ روایات ہمارے اس دور کی پیدا کردہ ہیں جس میں ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام اپنے پورے استبداد کے ساتھ مسلط تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ روایات سازی کی ضرورت ہی اسلئے پیش آئی تھی کہ قرآن سے اس مفاد پرستانہ ذہنیت کا جواز مل ہی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا جب تک یہ عقیدہ قائم رہے گا کہ یہ روایات دین کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس لئے قیامت تک کیلئے واجب الاتباع ہیں۔ آپ سرمایہ داری کی مفاد پرستانہ ذہنیت اور ملوکیت و پیشوائیت کے استبداد سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اگر آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ دین صرف قرآن کے اندر محصور ہے تو پھر آپ ربوبیت عامہ اور حریتِ انسانیہ کا صحیح خداوندی نظام قائم کر سکتے ہیں۔

یہ وجہ ہے کہ طلوع اسلام روایات کے دین ہونے اور نہ ہونے کی بحث کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار اسی ایک مسئلہ کے صحیح حل پر ہے۔

۳۔ انفرادی مفاد پرستی | کراچی سے ایک طالب علم کا سوال ہے:۔

کیا قرآنی نظام میں انفرادی مفاد (Individual Enterprise) کی گنجائش ہوگی۔؟

طلوع اسلام: "انفرادی مفاد" سے مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ذاتی سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار کرے اور اس کاروبار کے منافع کا مالک سمجھا جائے۔ اس سوال کے جواب کیلئے روپیہ کے متعلق قرآن کا نظریہ سامنے رکھ لیجئے۔ بات خود بخود صاف ہو جائے گی — قرآن کی رو سے:

(الف) زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں اسلئے فاضلہ روپئے سے زمین نہیں خریدی جا سکتی۔

(ب) جب زمین نہیں خریدی جا سکتی تو ظاہر ہے کہ جائیداد کی غرض سے مکانات بھی نہیں بنائے جا سکتے۔ قرآن کی رو سے معاشرہ پر لازم ہے کہ وہ تمام افراد کے لئے سکنی مکانات مہیا کرے اس لحاظ سے بھی مکانات کرایہ پر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) روپیہ کو جمع نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآن کی رو سے چاندی اور سونے کا اکتناز منع ہے اور دولت جمع کر کے گنتے رہنے والوں کے

خلاف بڑی تہدید آئی ہے۔

(د) کوئی شخص بلاضرورت روپیہ صرف نہیں کرسکتا۔ اسے تبذیر کہتے ہیں جس کی قرآن میں سخت ممانعت ہے۔

(ھ) نہ ہی کوئی شخص ضرورت سے زیادہ خرچ کرسکتا ہے اسے اسراف کہتے ہیں اور قرآن کی رو سے اسراف بھی منع ہے۔

اب فرمائیے کہ ایک شخص ذاتی کاروبار سے منافع حاصل کرکے اس روپیہ کو کریگا کیا۔ وہ روپیہ تو اس کیلئے وبال جان ہو جائے گا۔ اس کے پاس اس روپیہ کو رکھنے کیلئے کہیں جگہ نہ ہوگی۔ وہ تو اسے جمع رکھ سکے گا نہ خرچ کرسکے گا۔ اندریں حالات قرآنی نظام میں (Individual Enterprise) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی ذاتی ملکیت کا تصور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب مسلمانوں میں ملوکیت پیشوائیت اور سرمایہ داری آچکی تھی۔ اگرچہ اس دور کے مفاد پرستانہ استبداد نے عہد رسالت مآبؐ کے صحیح واقعات ہم تک پہنچنے نہیں دیئے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی کرن نظر آجاتی ہے کہ اس دور میں روپیہ پاس رکھنے کا تصور تک بھی نہیں آتا تھا۔ خود رسول اللہ صلعم کے متعلق اس قسم کے واقعات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں کہ آپ کے پاس جو کچھ آتا تھا آپ اُسے رات سے پہلے پہلے تقسیم کردیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند لمحات پہلے آپ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھ لیا کہ گھر میں کوئی روپیہ تو نہیں رکھا۔ جو چند درہم موجود تھے جب تک اُنھیں بھی ضروریاتِ عامہ کیلئے نہیں دیدیا اطمینان نہیں ہوا۔ کتب تاریخ میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی باقی رہ گیا ہے کہ انبیاء کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا کرتی یعنی ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ربوبیت عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں کتب روایات میں موجود ہیں لیکن ہمارا مُلّا رسول اللہؐ کی اس سنت کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتا وہ صرف یہی بتاتا ہے کہ میٹھا کھانا سنت ہے۔ یا اس قسم کی روایات بیان کرتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے پاس اتنے لاکھ دینار تھے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس مال و متاع کے لدے ہوئے اتنے اونٹ تھے۔ ایسا بیان کرنے میں وہ کبھی نہیں سوچتا کہ ایک طرف تو صحابہ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ رسول اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے (جو رنگ درحقیقت قرآن کا رنگ ہے) اور دوسری طرف وہ یہ بتاتا ہے کہ روپے پیسے کے معاملہ میں رسول اللہؐ کا عمل وہ تھا اور ان صحابہ کا عمل یہ۔ ہمارے نزدیک رسول اللہؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے عمل کے پرکھنے کا صحیح معیار قرآن ہے۔ کتب روایات میں ان بزرگوں کی طرف جسقدر ایسے واقعات منسوب کئے گئے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں وہ سب وضعی ہیں اور اس ملوکیت اور سرمایہ داری دور کی پیداوار ہیں جسے اپنی زراندوزی اور جاگیرداری کے نظام کے لئے اس قسم کی سندات کی ضرورت تھی۔

احمدیت اور اسلام و ختم نبوت | علامہ اقبالؒ کے فتنۂ احمدیت کے متعلق بیانات ہیں جو حضرت علامہ مرحوم نے ۳۵-۱۹۳۴ء میں پریس کو دیئے تھے۔ ساتھ ہی جناب پرویز کا ایک قابل قدر مقالہ ختم نبوتؐ بھی شامل کردیا گیا ہے جس میں فتنۂ مرزائیت پر قرآن کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ۱۲ار۔ ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

صالحین کی زبان

اسلامی جماعت کے اخبار تسنیم (لاہور) کے استقلال نمبر میں امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "کونسی شریعت" جس میں زبان کا انداز اس قسم کا ہے :-

اس کے اندر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ سے ذہنی اور قلمی قحبہ گری کے پیشہ میں مبتلا رہے ہیں۔

اسی طرح کے ذہنی عصمت فروشوں کی ایک ٹولی بھی ہمارے اندر پہلے سے موجود تھی۔

جب ملک میں شریعت کا نظام نافذ ہوگا اور زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ زبان (جس کا نمونہ اوپر دیا گیا ہے) پاکستان کی سرکاری زبان قرار دی جائے گی۔

معاملہ کی باتیں

ان تمام امور کی سختی سے پابندی کیجئے۔

(۱) خط و کتابت میں اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ فرمائیے۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ بھیجئے۔

(۳) رسالہ ہر ماہ پانچ تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو بروقت پرچہ نہیں ملا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا پرچہ محکمۂ ڈاک کی غفلت سے ضائع ہو گیا اس لئے پندرہ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیجئے۔

(۴) ڈاکخانہ کی طرف سے رسالہ کی روانگی کیلئے ۵، ۱۰، ۲۰، ۳۰ تاریخیں مقرر ہیں، ان تاریخوں کے علاوہ ہم دوسری کسی تاریخ میں پرچہ نہیں بھیج سکتے۔ اگر آپ نے دفتر کو کوئی شکایت تحریر فرمائی ہے تو تعمیل کیلئے ان تاریخوں کا انتظار فرمائیے۔

(۵) اگر آپ کا چندہ ختم ہو گیا ہے تو دفتر سے آپ کو ایک جوابی کارڈ بھیجدیا گیا ہے اس کا فوری جواب دیجئے اگر آپ جواب نہیں دے رہے تو آئندہ پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی حاضر ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے۔

(۶) ادارۂ طلوع اسلام ایک تبلیغی ادارہ ہے وی پی منگا کر واپس کر دینا اخلاقی جرم کے علاوہ ایک تبلیغی ادارہ کو نقصان بھی پہنچانا ہے۔

(۷) اگر آپ رسالہ کے ایجنٹ ہیں اور آئندہ آپ رسالہ کی ایجنسی جاری رکھنا نہیں چاہتے تو ۲۰ تاریخ سے پہلے پہلے ادارہ کو اطلاع دیجئے اور بلاوجہ ادارہ کو نقصان نہ پہنچائیے۔

آپ کا مخلص مینجر

ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن ـــــ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرتِ صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔
فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب
پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی
تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات
جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے
مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور
سج بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس۲۰ روپے۔ محصولڈاک وپیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز

ضخامت چار سو صفحات　　قیمت چار روپے　　محصولڈاک نو آنے

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

Bengal Oil Mills Ltd.

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS
BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil



High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'



BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

"BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3336
Mills : 2008

Only Title Printed at Abb[illegible] Art Press [illegible]

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

(۱) تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت۔ جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

(۲) یہ **وحی** اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے اسلئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳) حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

(۴) حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

(۵) قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۶) اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انھیں قوانین شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

(۷) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوجاتی ہے اور کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی "تمام نوعِ انسانی کی پرورش" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

(۸) ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ملتا رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں، قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہوجائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پاسکیں اور اس طرح

"زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے۔

قرآن نے کیا کہا؟

ہندومت نے کہا کہ غریب اس لئے غریب ہے کہ وہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اور امیر اس لئے امیر اور صاحبِ اقتدار ہے کہ وہ برہما (خدا) کے سر سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے جسے برہما نے غریب پیدا کیا ہے وہ غریب رہے گا۔ اسے برہما کے فیصلہ پر شاکر رہنا ہوگا۔ اس نے غریب سے یہ کہا اور امیر سے کہا کہ تم دان (صدقہ خیرات) کے کچھ ٹکڑے غریبوں کی جھولی میں ڈال دیا کرو۔ یہ پُن (ثواب) کا کام ہے۔

عیسائیت نے کہا کہ دنیا کی بادشاہت امیروں کے لئے ہے اور غریب خدا کے پیارے ہیں اس لئے ان کی بادشاہت آسمان پر ہے غریبوں کو امیروں پر رشک نہیں کرنا چاہئے بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انہیں دولتمند نہیں بنا دیا ورنہ وہ آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکتے۔

زرتشت والوں نے کہا کہ امیری اور غریبی سب مقدر سے ملتی ہے۔ قسمت کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ غریب کی تقدیر میں غریبی ہے اور امیر کی تقدیر میں امیری۔ اس لئے غریب کو اپنی قسمت پر قانع رہنا چاہئے اور امیروں کو چاہئے کہ اپنی دولت کی مَیل غریبوں کو دیدیا کریں۔

لیکن

قرآن نے کہا کہ یہ جہانِ سعی و عمل ہے اس لئے یہاں تقدیر اور قسمت کا کوئی سوال نہیں، جس شخص کو جو کام دیا جائے وہ اسے پوری محنت سے کرے۔ جو شخص زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اپنی کمائی میں سے صرف اتنے کا حقدار ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب دوسروں کا حق ہے اس لئے کہ زیادہ کمانے کی صلاحیت ہم نے دی ہے اس لئے تمہارے معاشرے کا اصول یہ ہونا چاہئے کہ

کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے، اور کسی کے پاس
ضرورت سے زیادہ نہ رہے۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوع اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی) بارہ آنے (ہندوستانی)	محمد یونسؔ	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی) غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵　　　　دسمبر ۱۹۵۲ء　　　　نمبر ۱۲

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

آپ نے پرانے بادشاہوں یا ریاستوں کے قصے سنے ہوں گے، ان کے ہاں ایک خاص طبقہ ہوتا تھا جنہیں مصاحب کہا جاتا تھا۔ مصاحب کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے آقا کی تعریف کرتا رہے، صبح سے شام تک اس کی مدح وستائش میں قصیدہ خواں رہے، اس کی کوئی کمزوری اس کے سامنے نہ آنے دے۔ اس کا کوئی عیب یا نقص اس سے بیان نہ کرے، اسے ہمیشہ معصوم اور منزہ عن الخطا ثابت کرے، وہ خواہ کاٹ کا اُلّو ہو لیکن مصاحب اس سے یہی کہے کہ حضور! دنیا میں آدھی عقل آئی تھی۔ آدھی ساری دنیا کو ملی اور پوری ایک آپ کو عطا کی گئی۔ وہ خواہ کسی قسم کی طفلانہ حرکتیں کرے اس کی ہر حرکت پر سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کے غلغلہ انداز نعرے بلند کئے جائیں۔ اس کی بیہودہ سے بیہودہ بات کو آسمان پر چڑھا دیا جائے اور یہ بات اس کے ذہن میں مسلسل اور پیہم بٹھا دی جائے کہ دنیا آج تک اس سے زیادہ صاحب عقل وشعور، مدبر، سلیقہ شعار، شریف، خلیق، بہادر، نیک اور عادل پیدا نہیں کر سکی۔ اس کی بٹیر کو شاہباز بنا کر دکھایا جائے اور اس کے مرغ کو عنقا۔ ان کے متعلق اس قسم کی باتیں عام مشہور ہیں کہ آقا نے مصاحب سے کہا کہ "بھینس کی سواری بھی کیا عجیب چیز ہے"۔ مصاحب نے فوراً جواب دیا کہ "کیا بات ہے حضور! کیا بات ہے حضور بھینس کی سواری کی۔ بیٹھے جائیے، لیٹے جائیے، لکھتے جائیے، پڑھتے جائیے۔ پیٹ کا پانی نہیں چھلکتا"۔ اس نے کہا کہ "ذرا اتنی سی بات ہے کہ باگ پرائے ہاتھ ہوتی ہے"۔ جھٹ سے کہا کہ "لعنت بھیجئے سرکار! سواری کیا ہے چلتا جنازہ ہے۔ بس کلمہ پڑھنے کی دیر ہے"۔ یا مثلاً آقا نے کہا کہ "بینگن کی ترکاری بھی کیا عجیب ہے"۔ فوراً عرض کیا کہ "سبحان اللہ سرکار! بینگن کو تو حضرت آدم جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے، خالی پکاؤ تو لذیذ، گوشت میں ڈالو تو لذیذ، ایک روٹی کھانی ہو، چار روٹیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ترکاری کیا ہے ایک ٹانگ کا تیتر ہے"۔ اس نے کہا لیکن ذرا گرم اور خشک ہوتا ہے۔ فوراً جواب دیا کہ "لعنت بھیجئے سرکار! چالیس دن کھائے تو آدمی کوڑھی ہو جائے"۔ اگر آقا کی طبیعت ذرا مذہب پرست واقع ہوئی ہو تو مصاحب کے لئے میدان اور بھی وسیع ہو جاتا تھا۔ ہارون رشید ایک دن کبوتر اڑا رہا تھا کہ اتنے میں قاضی وہب آ گئے۔ ہارون نے پوچھا کہ کبوتر بازی کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس نے فوراً جواب دیا کہ

> مجھ سے ہشام ابن عروہ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ہشام سے ان کے والد عُروہ روایت کرتے تھے کہ عائشہ صدیقہؓ نے ان سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلعم بھی کبوتر بازی فرماتے تھے۔

یہ تھی مصاحبت کی وہ (Institution) جس نے بادشاہوں کو برباد اور سلطنتوں کو تباہ کیا۔ مصاحبوں کا طبقہ بادشاہ کو اپنے نرغہ میں رکھتا

اور ملک و رعایا کے صحیح حالات ان تک کبھی پہنچنے نہ دیتا۔ رعایا بھوکوں مرتی لیکن مصاحب بادشاہوں سے یہی کہتے کہ "حضور! رعیت بڑی خوشحال ہے اور سرکار کی جان و مال کو دعائیں دے رہی ہے"۔ مملکت کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتیں لیکن وہ آخری وقت تک بادشاہ سے یہی کہتے رہتے کہ "حضور کی یہ سلطنت جو ہفتاد پشت سے ثریا بوس چلی آرہی ہے ابدالآباد تک قائم و دائم رہے گی۔ جو شخص اسکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا اس کی آنکھ پھوڑ دی جائیگی۔ دشمن آپ کی ہیبت سے لرزہ براندام ہے۔ اس کے لشکر و سپاہ آپ کی تیغ ذوالفقار کے تصور سے نیم جاں ہوجاتے ہیں"۔ وہ اپنے آقاؤں کو اسی طرح بسم اللہ کے گنبد میں بند رکھتے تا آنکہ دشمن مملکت کے قریوں اور شہروں کو روندتا ہوا سر پر آپہنچتا اور شہنشاہ اور اس کی شہنشاہیت دونوں کا خاتمہ ہوجاتا۔

ہم ان قصوں کو پڑھتے ہیں اور یہ کہہ کر ہنس دیتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگ بھی کیسے بیوقوف تھے۔ لیکن نہیں سوچتے کہ یہ باتیں اگلے وقت کے لوگوں کی نہیں ہیں بلکہ خود ہماری اپنی ہیں۔ آج بھی اسی قسم کے آقا موجود ہیں اور اسی قسم کے مصاحب۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس مصاحبت کا کام پریس (اخبارات) نے لیلیا ہے۔ روح وہی ہے صرف پیکروں کی تبدیلی ہوئی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

ان اخبارات کو اٹھا کر دیکھئے اور پھر سوچئے کہ ان میں اور پینس کی سواری اور بیگن کی ترکاری والے مصاحبوں میں کوئی بھی فرق ہے؟ ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی اسکیم، کوئی تجویز ارباب اقتدار کی طرف سے آئے۔ ابھی آدھا فقرہ ان کی زبان میں ہوگا کہ ان کی طرف سے سبحان اللہ اور مرحبا کا شور اس طرح بلند ہونا شروع ہوجائیگا جیسے شاعروں میں کسی استاد کے شاگرد اس کے آدھے مصرعہ پر تحسین و آفرین کا شور مچاتے ہیں۔ ان کی تقریروں کا ایک ایک فقرہ آسمان تک اچھالا جائے گا اور خواہ اس میں زبان تک کی غلطیاں بھی کیوں نہ ہوں انھیں وحی آسمانی کی طرح بے مثل و بے نظیر قرار دیا جائے گا۔ خواہ ساری دنیا انھیں گالیاں دے رہی ہو لیکن یہ انھیں ملت کا محبوب ترین لیڈر کہہ کر پکاریں گے۔ کہیں ان کا جلوس نکلے گا تو اس کے ساتھ خواہ بھرتی کے خدمت گزار اور حاشیہ بردار پابجولاں، کشاں کشاں کیوں نہ جارہے ہوں، ان کی رپورٹ سے معلوم ہوگا کہ از فرش تا عرش ملائکہ قطار در قطار ان کے جلوس میں چلے جارہے تھے۔ کسی کانفرنس میں خواہ حاضرین نے انھیں تقریر کے لئے اٹھنے تک نہ دیا ہو، رپورٹ بتائے گی کہ دو لاکھ کے مجمع نے فلک بوس نعروں میں ان کا استقبال کیا اور اس سکوت سے ان کی تقریر سنی کہ گویا ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ افراد مملکت خواہ فاقوں مر رہے ہوں، ان اخبارات میں ارباب اقتدار کے حسن تدبر کی شان میں قصیدوں پر قصیدے لکھے جائیں گے۔ اگر ایک شخص اقتدار کی کرسی پر متمکن نہیں ہوا تو انھیں اس میں کوئی قابل ذکر خوبی دکھائی نہیں دیگی لیکن جونہی وہ سریرآرائے حکومت ہوا اور ان کی طرف سے شور اٹھا کہ ـــ

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

ایک طرف ان کی مسلمہ قابلیتوں کے غلغلے بلند ہوں گے اور دوسری طرف ارباب حل و عقد کے اس حسن انتخاب کی داد دی جائے گی جب تک وہ برسر اقتدار رہے گا "سب تعریفیں" اس کے لئے مختص ہوں گی اور اگر ایسا ہوا کہ اس سے اقتدار کی کرسی چھن گئی تو دوسرے ہی دن اس کی ایک ایک برائی چن چن کر سامنے لائی جائے گی اور اس جنازہ خوانی کے بعد اسے پھر اسی لحد کے

خاموش گوشے میں سلا دیا جائیگا جہاں وہ پہلے پڑا تھا۔ ارباب اختیار کا ہر فیصلہ عدل نوشیروانی کو مات کرنے والا اور ان کا ہر عمل حاتم طائی کو شرمندہ کرنیوالا دکھایا جائیگا۔ پرائیویٹ سکرٹری ان اخبارات کے تراشے نہایت حسن تدبیر کے ساتھ کشتی میں رکھکر ہر صبح آقائے نعمت کے حضور پیش کرے گا اور اس طرح کوشش کی جائے گی کہ اس کی کوئی کمزوری اس پر کھلنے نہ پائے۔ وہ کبھی اپنے آپ پر تنقید نہ کر سکے وہ اپنے انتظامات کے اسقام و نقائص سے باخبر نہ ہونے پائے۔ اور اسے کبھی معلوم نہ ہو سکے کہ

کہتی ہے اس کو خلق خدا غائبانہ کیا

اگر کوئی شخص (اپنی بدبختی سے) اتنا کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ فلاں معاملہ میں فلاں کمزوری نظر آتی ہے تو مصاحبوں کا یہ ٹولہ چاروں طرف سے قینچیاں ہاتھ میں لئے یورش کر کے آگے بڑھتا ہے کہ ایسا کہنے والے کی زبان کاٹ لی جائے، کوئی اسے غدار وطن قرار دیتا ہے اور کوئی اسلام کا دشمن۔ اس کے خلاف یوں ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے اور آقائے نعمت کو یہ کہکر پھر فریب نفس میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ آپ ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کیجئے۔ آپ ملت کی آنکھ کا تارا ہیں اور پوری کی پوری قوم آپ کے قدموں پر جان قربان کرنے کے لئے سر بکف منتظر حکم کھڑی ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی مصاحب ہیں جن کی وجہ سے افراد تباہ ہوتے ہیں اور قومیں ڈوبتی ہیں۔ اس کی اصطلاح میں مصاحب کا نام قُرَنَاءُ (جمع قرناء) ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قرناء کرتے یہ ہیں کہ

فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۴۱/۲۵)

ان کے آگے اور پیچھے ہر شے کو حسین اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

اور اس طرح وہ قوم اسی طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہے جس طرح ان سے پہلے وہ قومیں برباد ہو گئیں جنھیں ان کے مصاحبوں نے فریب نفس میں مبتلا رکھا۔

وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم۔ (۴۱/۲۵)

اور ان کے حق میں خدا کا قانون اُسی طرح پورا ہو جاتا ہے جس طرح ان سے پہلی قوموں کے حق میں ہوا۔

ان مصاحبین (قُرَنَاء) کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے ایسے جاذب نگاہ پردے لٹکائے جائیں جن سے صحیح راستہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور وہ غلط راستے پر چلتے رہیں لیکن انھیں قدم قدم پر باور یہی کرایا جائے کہ وہ بالکل صحیح راہ پر چل رہے ہیں۔

وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ۝ (۴۳/۳۷)

وہ انھیں صحیح راستے سے روکتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل صحیح راستہ پر چل رہے ہیں

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ان مصاحبوں کی رفاقت صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک یہ شخص اقتدار و اختیار کی کرسی پر متمکن رہے۔ جونہی اس پر کوئی گردش آئے وہ اس سے فوراً الگ ہو جاتے ہیں اور اس کے تمام جرائم سے اپنے آپ کو اس طرح بری الذمہ قرار دے لیتے ہیں گویا انھیں اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ سورۂ قٓ میں ہے کہ جب اس قسم کا آقائے نعمت سزا میں ماخوذ ہوتا ہے۔ تو

قَالَ قَرِیْنُہٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُہٗ وَلٰکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ (۵۰/۲۷)

اس کا مصاحب جھٹ سے کہدیتا ہے کہ اے میرے پروردگار! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا تھا یہ تو خود ہی غلط راہوں پر اتنی دور نکل گیا تھا۔

یہی مصاحب جو پہلے اس کے ہر گناہ کو ثواب اور ہر لغزش کو حسن عمل کہہ کر پکارا کرتے تھے کہنا شروع کر دیں گے کہ ہم نے اس سے کبھی نہیں کہا کہ اس قسم کی غلط روش اختیار کرو۔ ہم ہمیشہ خود بھی قانون وضوابط کے پابند رہے ہیں اور اسے بھی اسکی پابندی کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

کَمَثَلِ الشَّیْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اکْفُرْ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۰ (۵۹/۱۶)

شیطان کی طرح کہ وہ پہلے انسان سے کہتا ہے کہ خدا کے قانون سے انکار کرو۔ اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو پھر کہدیتا ہے کہ میں تو اس سے بے تعلق ہوں۔ میں تو ہمیشہ خدائے رب العالمین سے ڈرتا رہتا ہوں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب ارباب اقتدار کو اس طرح بہم فریب میں رکھنے سے قوموں پر تباہی آتی ہے تو اسوقت ان مصاحبوں کا یہ کہنا کہ ان کے جرائم کے ہم ذمہ دار نہیں انھیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ آقا اور اس کے مصاحب دونوں ہلاکت کے جہنم میں جھونک دیئے جاتے ہیں۔

فَکَانَ عَاقِبَتَہُمَآ اَنَّہُمَا فِی النَّارِ خَالِدَیْنِ فِیْہَا وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ (۵۹/۱۷)

سو ان دونوں کا انجام یہ ہوگا کہ وہ ہلاکت کی آگ میں ڈال دیئے جائیں گے اور جو اندھیرے میں رہے اور دوسروں کو اندھیرے میں رکھے ان کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اتنے بیوقوف نہیں ہوتے کہ وہ دیکھ نہ سکیں کہ یہ مصاحبین انھیں کس طرح دھوکہ میں رکھ رہے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ فریب نفس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جلسہ میں لوگوں نے ہماری تقریر نہیں سُنی لیکن جب دوسری صبح اخبار کی یہ رپورٹ ان کے سامنے آتی ہے کہ جلسہ گاہ میں فتنہ پردازوں کی ایک جماعت گھس آئی تھی جو دشمنانِ ملت کے ایجنٹ تھے اور انھوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی تو یہ بھی اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ قوم ہم سے ناخوش نہیں یہ صرف دشمنوں کی سازش ہے جو اس قسم کے مظاہرے کراتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ عاد و ثمود تباہ ہوئے اسلئے کہ (زین لھم الشیطٰن اعمالھم) شیطان نے ان کے اعمال ان کے سامنے نہایت خوشنما شکل میں پیش کئے ہیں (فصدھم عن السبیل) اور اس طرح سیدھی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دی (وکانوا مستبصرین ۲۹/۳۸) حالانکہ وہ صحیح راہ کو دیکھنے کی بصیرت رکھتے تھے۔

لیکن اس کا احساس اُنھیں اس وقت ہوتا ہے جب انکی ناعاقبت اندیشیوں کے نتائج مرتب ہو کر انھیں اور ان کے ساتھ پوری کی پوری قوم کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ وہ اسوقت تباہیوں اور بربادیوں کے اس سیلاب بلا انگیز کو دیکھتا ہے اور نہایت حسرت سے کہتا ہے۔

یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا

اے کاش میں نے اس مصاحب کو اپنا رفیق نہ بنایا ہوتا کیونکہ اس نے مجھے راہِ راست سے بھٹکا دیا۔

لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ (۲۵/۲۸-۲۹)

قانون اور ضابطہ تو میرے پاس آ چکا تھا لیکن اس کمبخت نے مجھے بہکا دیا۔

آقا اپنے مصاحبوں کو موردِ الزام قرار دیتا ہے کہ ان کمبختوں نے حقیقت حال کو میرے سامنے بے نقاب نہ ہونے دیا اور مجھے ہمیشہ دھوکہ میں رکھا ورنہ میں ایسا کیوں کرتا جس سے قوم کی قوم پر ایسی تباہی آجاتی۔ مصاحب آقا کو مجرم قرار دیتے ہیں کہ یہ جانتا بوجھتا سب کچھ کر رہا تھا ہم بھلا اسے کس طرح اس راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے جو اس پر اور اس کے ساتھ ہم پر اور اتنا ہی نہیں بلکہ ساری کی ساری قوم پر اس طرح بربادی کا سیلاب لے آتا۔ وہ اسے الزام دیتے ہیں اور وہ انھیں ملزم ٹھہراتا ہے لیکن قرآن ان دونوں سے ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجرم نہ تنہا وہ ہے اور نہ یہ، مجرم درحقیقت پوری کی پوری قوم ہے جس نے دیدہ و دانستہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔

وقال الرسول یٰرب ان قومی اتخذوا ھٰذا القراٰن مھجورا۔ (۲۵/۳)

خدا کا پیغامبر یہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار اصل بات یہ ہے کہ اس قوم نے قرآن کو ترک کر رکھا تھا۔

اگر یہ قوم ضابطۂ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتی تو نہ ہی ان مصاحبین کی مجال تھی کہ اہلِ حل و عقد کو اس طرح فریب میں مبتلا رکھتے اور نہ ہی ان اربابِ اقتدار کو اس کی جرأت ہوتی کہ وہ اس طرح فریب نفس میں مبتلا ہو جاتے۔ اس وقت قوم کا ہر فرد ارباب اقتدار کی ہر نقل و حرکت کا محاسب ہوتا اور جونہی اس کا کوئی قدم قرآن کے راستے سے اِدھر اُدھر ہونے لگتا چاروں طرف سے خبردار اور ہوشیار کی آواز آتی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ جب حضرت عمرؓ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو ایک جنگل میں شب بسری کیلئے ڈیرہ ڈالا۔ حضرت عمرؓ اپنے معمول کے مطابق باہر نکلے کہ اگر یہاں مملکت کے کوئی افراد بستے ہیں تو معلوم کریں کہ ان کی حالت کیا ہے۔ دیکھا کہ ایک جھونپڑی میں ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی ہے پوچھا کہ تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ حال کیا بتاؤں۔ جب سے نیا خلیفہ آیا ہے کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی پریشانی کی اطلاع خلیفہ تک پہنچائی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر خلیفہ کے لئے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایک فرد کے حالات سے باخبر رہے اور اس کی تکلیفوں کا ازالہ کر سکے۔ بڑھیا نے کہا کہ اگر عمرؓ میں اس کی صلاحیت نہ تھی تو وہ خلیفہ کیوں بن گیا عمرؓ آبدیدہ واپس آگئے اس کے بعد حضرت عمرؓ ساری عمر اس واقعہ کو دہرایا کرتے تھے اور ہمیشہ اشک آلود آنکھوں سے کہا کرتے تھے کہ عمرؓ کو اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔

جب تک اربابِ حل و عقد حضرت عمرؓ کی طرح راتوں کو بھیس بدل بدل کر اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھیں گے کہ قوم کی حالت کیا ہے اور اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے کہ ——— کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا ——— اور جب تک قوم کا ہر فرد اس بڑھیا جیسی جرأت اپنے اندر نہیں رکھے گا کہ وہ اربابِ حل و عقد کو بتا سکے کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ اسوقت تک مصاحبین اربابِ اختیار کو برابر فریب میں مبتلا رکھیں گے اور اربابِ اختیار دیکھتے بوجھتے برابر فریب کھاتے چلے جائیں گے۔ اسلئے کہ فریب میں بڑی لذت ہوتی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کیلئے بڑے بلند کیرکٹر کی ضرورت ہے۔

ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ محترم وزیراعظم کے اعلان کے مطابق مجلس آئین ساز کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ ۲۲ نومبر کو اسمبلی میں پیش کی جائے گی۔ چنانچہ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اس رپورٹ پر اپنی تنقید دسمبر کے پرچہ میں شائع کر دیں خواہ اس کیلئے پرچہ

کی اشاعت میں کچھ دنوں کی تاخیر ہی کیوں نہ ہو لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وہ رپورٹ ابھی پیش نہیں کی جائے گی اس لئے اس کے متعلق اشاعت رواں میں کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اس ضمن میں البتہ دو ایک چیزیں ایسی سامنے آئیں جن کا تذکرہ اس وقت ضروری ہے۔

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں ملک کے مختلف حصوں کے مولوی صاحبان کراچی میں جمع ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرات محترم وزیر اعظم کی دعوت پر تشریف لائے ہیں کیونکہ وہ ان سے مذکورہ بالا رپورٹ کے سلسلہ میں کچھ بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ہمارے اس خدشہ کی تائید ہو گئی جس کا اظہار ہم گذشتہ اشاعتوں میں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی حکومت اس ہنگامہ سے مرعوب ہو چکی ہے جو آجکل ملک میں نظامِ شریعت کے نام پر برپا کیا جا رہا ہے اور اس لئے چاہتی ہے کہ مولوی صاحبان سے مفاہمت کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی صورت پیدا کی جائیگی کہ یا تو علماء حضرات کا ایک الگ محکمہ قائم کر دیا جائے اور یا ان کی مشاورت کی مجالس، مجالسِ مقننہ کے ساتھ قائم کر دی جائیں اور شرعی امور میں ان سے استصواب کیا جائے۔ کوئی شکل بھی ہو حکومت اس اصول کو تسلیم کر لے گی کہ شریعت کا علم مولوی صاحبان کی اجارہ داری ہے اور برہمنوں کے اس طبقہ کے باہر نہ کوئی قرآن سمجھ سکتا ہے اور نہ اس سے فقہی استنباط کر سکتا ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہوئی جب اسلام میں دین اور سیاست کی ثنویت پیدا ہوئی۔ سیاسی امور اربابِ حکومت کے سپرد کئے گئے اور مذہبی امور علماء کے حصہ میں آگئے۔ یعنی وہی تقسیم جو عیسائیت میں خدا اور قیصر سے تعبیر کی جاتی تھی اور ہندوستان میں کھشتری اور برہمن کے دائروں کی تقسیم سے۔ ہماری ہزار سالہ تباہیوں کا راز اسی تقسیم میں ہے۔

طلوع اسلام مسلسل پانچ برس سے اس خطرہ کا اعلان کرتا چلا آرہا ہے لیکن اب اسے نظر آرہا ہے کہ پاکستان اس خطرہ سے بچ نہیں سکتا۔ ہماری بدقسمتی سے ہمارے اربابِ حل و عقد میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو نگاہوں میں اتنی بصیرت رکھے کہ اسے یہ خطرہ صاف صاف نظر آجائے اور اس کے بعد اس میں اتنی جرأت اور ہمت ہو کہ وہ ہنگامہ خیزیوں اور غوغا آرائیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ملک کو اس تباہی سے بچا لے۔ اگر یہاں بھی اقتدار مولوی کے ہاتھ میں دیدیا گیا تو چند سال کے عرصہ میں پاکستان اسی سطح پر آجائیگا جہاں اسوقت (ترکی کو چھوڑ کر) دیگر ممالک اسلامیہ ہیں۔ ہم ملک کے ہوشمند طبقہ سے اپیل کرینگے کہ وہ کوشش کرے کہ پاکستان اس تباہی سے بچ جائے۔ اسلامی دستور کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن کریم کے محکم اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہم اپنے قوانین آپ وضع کریں۔ اس کیلئے نہ تو کسی خاص گروہ کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کے ان روایاتی قوانین کی جو سینکڑوں برس پہلے کے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق مدون ہوئے اور جو کسی صورت میں بھی ہمارے زمانے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ لوگ اس طرح حکومت کیلئے ایک مستقل مصیبت بن جائیں گے۔ اس کا اندازہ ایک چھوٹی سی مثال سے لگائیے۔ اسلامی جماعت نے جو اپنا مطالبہ پیش کیا ہے اس میں ایک شق یہ بھی ہے کہ حکومت تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے کی ذمہ دار ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب وسائل پیداوار (Means of Production) خود حکومت کے ہاتھ میں ہوں۔ اگر افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو اور وسائل پیداوار لوگوں کی ذاتی ملکیت میں ہوں تو سوچئے کہ حکومت اپنی اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ اسلامی جماعت نے حکومت سے یہ مطالبہ کر دیا کہ افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا ان کے ذمہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ فتویٰ بھی دیدیا کہ وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں گے اور اس پر کوئی حدبندی عائد نہیں کی جا سکے گی۔ آپ غور کیجئے کہ

جس حکومت کے سامنے یہ دونوں چیزیں بطور احکام شریعت پیش کی جائیں گی اس حکومت کا حشر کیا ہوگا۔ ذاتی ملکیتوں کا تو آج بھی یہ نتیجہ ہے کہ اس پانچ سال کے عرصہ میں چند لاکھ مہاجرین کیلئے مکانات کا انتظام نہیں ہو سکا اور ذاتی ملکیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان جیسا ملک غلّہ تک کیلئے دوسروں کا محتاج ہو گیا۔ ہمارے ارباب شریعت ذاتی املاک کو تو چھونے نہیں دیں گے کیونکہ یہ ان کی شریعت کے خلاف ہے لیکن حکومت سے برابر مطالبہ کئے جائیں گے کہ وہ تمام افراد مملکت کے لئے مکانات بھی فراہم کرے اور ان کی روٹی کا انتظام بھی کرے۔ بہرحال اس وقت پاکستان میں نظام شریعت کی آڑ میں جو کھیل کھیلا جا رہا ہے اور جس طرح خدا اور رسولؐ کے نام پر عوام کو اپنے پیچھے لگایا جا رہا ہے یہ ایک اتنے بڑے خطرہ کا آغاز ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ملک کا کوئی ہوشمند طبقہ پاکستان کو اس تباہی سے بچانے کیلئے آمادہ ہو سکے تو خیر ورنہ یہ چیز ہمارے موجودہ ارباب حل و عقد کے توبس کی نہیں۔ ملک کو ضرورت ہے ایک مصطفےٰ کمال کی جس کے ہاتھ میں قرآن، سر میں عقل، جگر میں ہمت اور بازوؤں میں قوت ہو۔

ہم آخر میں پھر دہرائے دیتے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت کے دستور کا حدود اربعہ یہ ہے کہ

(۱) ملت کے نمائندگان، قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے قانون آپ وضع کریں۔ قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان جزئی قوانین میں حسب ضرورت تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔

(۲) ایک اسلامی مملکت کا وجود اسلئے عمل میں آتا ہے کہ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں نہ صرف تمام افراد معاشرہ کی طبعی ضروریاتِ زندگی ہی پوری ہوں بلکہ ان افراد کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کے سامان بھی میسر ہوں۔

(۳) اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ملک کے تمام وسائل پیداوار انفرادی ملکیت، کی بجائے مملکت کی تحویل میں ہوں تاکہ رزق کی تقسیم ضروریات کے اعتبار سے یکساں طور پر ہو سکے۔

(۴) اس معاشرہ کا آغاز پاکستان کی سرزمین سے ہو اور پھر اسے آگے بڑھاتے بڑھاتے تمام نوع انسانی تک پہنچا دیا جائے۔

یہ ہے اسلام کا منشا۔ اس سے پاکستان بچ سکتا ہے اور اسی میں نوعِ انسانی کی نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر ملک کا ہوشمند طبقہ پاکستان بچانا چاہتا ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ منظم طور پر کوشش کرے کہ پاکستان کا دستور مندرجہ بالا حدود اربعہ کے مطابق مرتب ہو۔ ان امور کی تفاصیل طلوع اسلام میں ایک عرصہ سے بیان ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ ہم نے بغرض سہولت انہیں دو چھوٹی چھوٹی کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ ایک کا نام ہے "اسلامی نظام" اور دوسری کا نام ہے "قرآنی دستور پاکستان" یہ کتابیں اس کوشش میں کافی راہنمائی کر سکتی ہیں۔

"قرآنی دستور" میں قرارداد مقاصد اور دستور کے وہ مسوّدات بھی شامل ہیں جنہیں طلوع اسلام نے خالص قرآن کی روشنی میں مرتب کر کے حکومت کے پاس بھیجا تھا۔

طلوعِ اسلام کا نیا پروگرام

قرآنی فکر کو عام کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانے کیلئے طلوع اسلام نے اپنا نیا پروگرام شروع کر دیا ہے۔

اس پروگرام کا اولین قدم یہ ہے کہ طلوع اسلام کے لٹریچر کو چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں شائع کر کے ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا جائے۔ اس کام کو تکمیل تک پہنچا دینا آپ حضرات کی توجہ اور کوشش کا متقاضی ہے۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے شہر کے کتب فروشوں اور اپنے ایسے احباب کو اس کے لئے تیار کریں جو ان کتابوں کو فروخت کریں۔ اس کے لئے انھیں ۳۳ ½ فی صدی کمیشن دیا جائے گا۔ شرط اس قدر ہوگی کہ ان حضرات کو کتابیں مطلوبہ تعداد میں وی پی بھیجی جائیں گی اور دو ماہ کے بعد جس قدر کتابیں ان کے پاس باقی بچ جائیں گی، ادارہ انھیں واپس لے لیگا۔ کاروباری نقطۂ نگاہ سے ضروری ہے کہ ادارہ کے پاس خود ان حضرات کی طرف سے تحریری آرڈر آئیں، ان کی طرف سے کسی اور کا لکھ دینا کافی نہیں ہوگا۔ نیز جو کتابیں واپس کی جائیں ان کے متعلق بھی یہ احتیاط ضروری ہے کہ وہ خراب حالت میں نہ ہوں۔

چونکہ اس وقت تدوین دستور کا مسئلہ پیش پیش ہے اسلئے سب سے پہلے "اسلامی نظام" اور "قرآنی دستور پاکستان" کی الگ الگ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔

ان کے علاوہ محترم پرویز صاحب کا انقلاب آفریں مقالہ "اسباب زوال امت" الگ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے علاوہ بریں ایک کتاب "قتل مرتد، غلام اور لونڈیاں، اور یتیم پوتے کی وراثت" پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں حسب ذیل کتابوں کی کتابت ہو رہی ہے۔

(۱) سلیم کے نام خطوط
(۲) محترم پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ "فردوس گم گشتہ"
(۳) مقام حدیث
(۴) زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق "قرآن کیا کہتا ہے"۔

ان کے بعد رفتہ رفتہ اور کتابیں بھی شائع ہوتی رہیں گی۔

واللہ المستعان،

سلیم کے نام ....

(قرآنی نظام ربوبیت)

پرویز

قرآنی نظامِ ربوبیت اور اشتراکی نظام میں فرق

غنیمت ہے سلیم! تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ قرآنی نظامِ ربوبیت، اشتراکی نظام سے بہتر ہی نہیں بلکہ کہیں آگے ہے۔ لیکن اس کی دلیل عزیز وہی نہیں جو تم نے لکھی ہے کہ

اشتراکی نظام صرف روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے اور قرآنی نظام ربوبیت روٹی کے مسئلہ کے حل کے بعد، ہر ابنِ آدم کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عملی نتیجہ کے لحاظ سے ان دونوں نظاموں میں یہ فرق بھی بہت اہم ہے۔ یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت وہ سب کچھ بھی دیتا ہے جس کا دعویٰ اشتراکی نظام کرتا ہے اور اس کے بعد انسانی معاشرہ کو اس سے کہیں آگے لے جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں نظاموں میں ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ اشتراکی نظام کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں اور قرآنی نظام ربوبیت ایسی محکم بنیادوں پر قائم ہے "لاانفصام لہا" جو کبھی منہدم نہیں ہو سکتیں۔

تمام انسانوں میں مساوات کیوں؟

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اُسے آج پھر دہراتا ہوں کہ مارکس یا مارکسٹ اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا کہ غریبوں کی مدد کیوں کی جائے؟ کیوں تمام انسانوں میں مساوات پیدا کی جائے؟ وہ شخص جو بہت زیادہ کماتا ہے اپنی محنت کا ماحصل اس شخص کو کیوں دیدے جو کمانے کے قابل نہیں؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا تھا کہ کمزوروں کی مدد کرنا انسان کا "اخلاقی فریضہ" ہے لیکن جس نظریۂ زندگی میں اخلاق (MORALS) کا تصور ہی نہ ہو اس میں ان امور کا جواب کیا مل سکتا ہے؟

اس کیوں کا جواب اسلام ہی دے سکتا ہے

میں اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں کہ "کیوں" کا جواب صرف وہی شخص دے سکتا ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھتا ہو اور یہ مانتا ہو کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اخلاقیات کی ساری عمارت انہی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور جو فلسفہ ان بنیادوں ہی سے انکار کردے اس میں اس سوال کا جواب کیسے مل سکتا ہے؟

یہ اس سوال کا ایک پہلو تھا۔ اب دوسرا پہلو دیکھو۔

پہلے یہ سمجھ لو سلیم! کہ اخلاق کہتے کسے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ "سچ بولنا بہرحال اچھا ہے" یعنی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں' سچ بولنا بہر حیث و بہر کیف اچھا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے . . کہ سچ کی قیمت حالات کے اعتبار سے اضافی (RELATIVE) نہیں۔ بلکہ اس کی قیمت اس کی ذات کے اندر (INTRINSIC) ہے جو ہر حالت میں قائم رہتی ہے۔ اسے مستقل قدر (PERMANENT VALUE) کہتے ہیں۔ اس تصور کا نام اخلاقیات ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ سچ اور جھوٹ اپنی ذاتی قیمت کچھ نہیں رکھتے۔ ہر شے حالات کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ ان میں سچ بولنا فائدہ مند ہے تو سچ بولنا چاہیئے اگر حالات بدل جائیں اور سچ بولنے میں نقصان ہو تو جھوٹ بولنا چاہیئے۔ یہ دوسرا تصورِ حیات ہے جس میں کوئی شے مستقل قدر نہیں رکھتی۔

اشتراکیت میں کوئی تصورِ حیات مستقل قدر نہیں رکھتا

مارکس (MARX) کے نزدیک دنیا میں کوئی نظریہ' کوئی تصورِ حیات' مستقل قدر نہیں رکھتا وہ بھی افلاطون اور ہیگل کے تتبع میں یہی مانتا ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے لیکن یہ تغیر ایک خاص تسلسل کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نظام قائم ہوتا ہے اس کے بعد زمانے کی رَو اُس نظام کو اُلٹ کر اس کی جگہ ایک دوسرا نظام مسلط کر دیتی ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں زمانے کی اس رو کا نام تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہے۔ یعنی تاریخ کی اندھی قوت جو ہمیشہ اس نظام کو الٹ دیتی ہے جو موجود (PRESENT) ہو اور اس کی جگہ اس کی ضد دوسرا نظام لے آتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت' مارکس نے کہا کہ یورپ کا موجودہ سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ تاریخی وجوب اس نظام کی بساط کو الٹ کر اس کی جگہ ایک ایسا نظام مسلط کریگا جو اس کی ضد ہوگا یعنی محنت کشوں کا اشتراکی نظام۔ اس میں نہ کسی جذبے کا داخل ہے نہ عقیدے کا۔ نہ ہی اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ وجہ جواز تلاش کرنے کی حاجت۔ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے کہ ایسا ہو کر رہے۔ انسان کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔

تاریخی وجوب کا ڈرامہ

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے ماتحت' یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اچھا ہے یا بُرا۔ اُسے علیٰ حالہ رکھنا چاہیئے یا بدلنا چاہیئے۔ نہ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام کے برعکس محنت کشوں (مزدوروں اور کسانوں) کے اشتراکی نظام میں کیا خوبیاں ہیں۔ وہ نوع انسانی کے لئے اچھا ہے یا برا۔ اس کے نظریے کے ماتحت ہر موجودہ نظام الٹ کر رہے گا، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ اور اس کی جگہ دوسرا نظام آئیگا (جو پہلے نظام کی ضد ہوگا) خواہ وہ نظام نوع انسانی کے لئے اچھا ہو یا برا۔ اس کے بعد یہ آنے والا نظام بھی ایک دن اسی طرح الٹ جائیگا جس طرح موجودہ نظام الٹ رہا ہے۔ خواہ وہ نظام نوع انسانی کیلئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔ تاریخی وجوب کے نزدیک "اچھا اور برا" سب یکساں ہے۔ پھر جس طرح آج انسانوں کی کوئی

مجبور تماشائی

قوت اس پر قادر نہیں کہ آنے والے انقلاب کو روک کر موجودہ نظام کو برقرار رکھ سکے' اسی طرح جب (اپنے وقت میں) اشتراکی نظام کے الٹنے کا وقت آئے گا تو انسان کی کوئی قوت اس انقلاب کو بھی نہیں روک سکے گی۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق زمانے کی رو کے مقابلے میں انسان بے بس و مجبور ہے۔ اس نظریہ کو "تاریخی جبر" . . . .

(HISTORICAL DETERMINISM) کہتے ہیں۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے مطابق کسی نظام کے اچھے یا برے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اسلئے کسی اخلاقی قدر کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کائنات کے اسٹیج پر تاریخی وجوب ایک ڈرامہ کھیل رہی ہے جسے انسان ایک مجبور تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ اس ڈرامے کا موجودہ سین یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بساط الٹ کر (اسکی ضد) اشتراکی نظام کو مسلط کر دیا جائے۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو بھی چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد دوسرا سین آئیگا جس میں "تاریخی وجوب کا عفریت" اشتراکی نظام کو الٹ کر اس کی جگہ (اس کا ضد) سرمایہ دارانہ نظام پھر سے لے آئیگا۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو دیکھنے پر بھی مجبور ہوگا۔ اسلئے مارکس کے نظریے کے مطابق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام سے بہتر ہے یا نہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی نظام

اشتراکی نظام کے حق میں اخلاقی جواز کا سوال ہی نہیں

کے حق میں اخلاقی جواز تلاش کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے زمانہ حاضر کا مشہور اشتراکی (L. LAURAT) اپنی کتاب (MARXISM AND DEMOCRACY) میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

> مارکس اور انجلز نے اشتراکی آرزوؤں کی بنیاد تمدنی ترقی کے معاشی قانون پر رکھی۔ ایسا کرنے میں انھوں نے اپنی اشتراکی آرزوؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا۔ بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت، تاریخی وجوب کا تقاضا ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی کہ مارکس یا مارکسسٹ کیوں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام کیوں قائم کرنا چاہئے؟ "کیوں" کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان صاحب اختیار و ارادہ ہو۔ لیکن جس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور محض ہو اور کوئی خارجی قوت (اسے "تاریخی وجوب" کہہ لیجئے یا کچھ اور) از خود ایک نظام کو مٹا دے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے آئے۔ اس میں "کیوں" کی گنجائش کہاں ہے!

آرزوؤں پر اشتراکی نظام کی تعمیر ہوئی تھی

مسٹر (LAURAT) کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس سے ایک تو یہ امر واضح ہو گیا کہ مارکس اور انجلز نے اپنے معاشی نظریہ کی بنیاد اخلاقیات پر نہیں رکھی بلکہ اسے "تاریخی وجوب" کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے لیکن یہ اقتباس اس سے الگ ایک اور اہم حقیقت کی بھی غمازی کر رہا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے (اور یاد رکھو کہ کہنے والا ایک ممتاز اشتراکی ہے) کہ مارکس اور انجلز کے دل میں اشتراکی نظام کی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہو جائے لیکن انہیں اس نظام کے جواز (Justification) کے لئے اخلاقی بنیادیں نہیں ملتی تھیں۔ اسلئے انھوں نے اسکی بنیاد تاریخی وجوب کے نظریہ پر رکھ دی۔

غریبوں سے کام لینے کی یہی صورت ہے کہ ان کو محتاج رکھا جائے

میرا بھی یہی خیال ہے سلیم! کہ مارکس اپنے سینے میں ایک درد مند دل رکھتا تھا جو غریبوں کی مصیبت پر کڑھتا اور مزدوروں کی حالت دیکھ کر دکھتا تھا۔ اس کے زمانے میں یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں اور غریبوں کی جو حالت کر رکھی تھی اس کے پیش نظر

اس قسم کے دلِ دردمند میں جوشِ انتقام کا موجزن ہو جانا مستبعد نہیں تھا۔ (DEFOE) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر غریبوں کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے۔ اور اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو اس کا ا پرائیویٹ کارخانہ داروں پر پڑیگا۔ اسلئے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں[1]۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (Mandevillee) نے اپنی مشہور کتاب (Fable of the Bees) شائع کی تھی جس کا ملخص یہ تھا کہ

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کردینا حماقت ہے۔ سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور غریب رہے۔

بھوک کا کوڑا وحشی سے وحشی جانور کو رام کر دیتا ہے

اٹھارویں صدی کے اخیر میں برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہاتی آبادی کو کس طرح مجبور کیا جا کہ وہ شہروں میں آ کر کارخانوں میں مزدوری کریں۔ اس باب میں WILLIAM TOWNSEND) نے (۱۷۸۵ء میں) اپنی کتاب DISSERTATION ON THE POOR LAWS) میں لکھا کہ

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند سے تند جانور کو بھی رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اسلئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک۔ بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

غریبوں کی زبوں حالی کی ذمہ دار عیسائیت کی تعلیم ہے

یہ تھی وہ فضا جس میں مارکس نے آنکھ کھولی۔ ایسے حالات میں غریبوں اور مزدوروں کی امداد کے عام طور پر لوگوں کے اخلاقی جذبات ہی کو اپیل کیا جاتا ہے لیکن جب مارکس نے صورتِ حال کا نظر سے جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ غریبوں اور کمزوروں کی اس حالت کا ذمہ دار وہی ضابطۂ اخلاق ہے جو یورپ میں رائج تھا۔ اس ضابطۂ اخلاق کی عمارت عیسائیت کی ان بنیادوں پر استوار تھی جن کی رو سے دنیا کی بادشاہت امیروں کے لئے تھی اور غریبوں کے حصے میں "آسمان کی بادشاہت" آئی تھی۔ اس ضابطہ اخلاق میں غریبوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ اگر کوئی زبردست ہاتھ ان کا کوٹ اتار لے، تو انہیں چاہئے کہ اپنی واسکٹ خود اتار کر اسے دیدیں۔ ان کہا جاتا تھا کہ اگر چور اُن کا اتنا زیادہ مال باندھ لے جو اس سے اٹھ نہ سکے تو چاہئے کہ وہ خود گٹھڑی اٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئیں لہٰذا اس ضابطۂ اخلاق کے رُو سے امیروں اور بالادستوں سے کس طرح کہا جاتا کہ وہ غریبوں کو موقعہ دیں کہ وہ ابھر کر امیروں کی سطح پر آ جائیں! حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ BRIFFAULT نے لکھا ہے) گذشتہ دو ہزار سال میں غریبوں اور مظلوموں

---

[1] دیکھو (E. H. Carr) کی کتاب "The New Society"

جسقدر انسانیت سوز مظالم ہوئے ہیں، ان کی ذمہ دار عیسائیت کی تعلیم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نیٹشے کو اس عیسائیت کے "خون سے اپنے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا"۔ یہی وہ تعلیم تھی جس نے یورپ میں مذہب کے خلاف جذباتِ منافرت و انتقام کو مشتعل کر دیا اور پھر اس آگ کے شعلے ساری دنیا میں پھیل گئے۔ اگر مارکس ایسے مذہب کو غریبوں کیلئے "افیون" نہ کہتا تو کیا کرتا؟ (اور ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے سلیم! ساری دنیا کے مذاہب جو درحقیقت انسانی ذہن کے وضع کردہ ہیں لیکن ان کی نسبت آسمانی کتابوں اور خدا کے فرستادوں کی طرف کردی گئی ہے اسی ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ اسی زمرے میں مسلمانوں کا موجودہ مذہب بھی شامل ہے۔ جو ان کے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حامل ہے وہ دین نہیں جو قرآن میں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مروجہ مذہب!)

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت، مارکس کے لئے مشکل رہی نہیں بلکہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی "اشتراکی آرزوں" کو اخلاقی بنیادوں پہ مشہود کرتا۔ اس مشکل کے پیش نظر اُسے اخلاقیات کو چھوڑ کر دوسرے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ چونکہ اس کی ذہنی افتاد فلسفیانہ اور مورخانہ واقعہ ہوئی تھی اسلئے اس نے اس کیلئے فلسفہ اور تاریخ کو سہارا بنایا اور تاریخ کا ایک نیا فلسفہ وضع کیا اور اس کا نام "تاریخی وجوب" رکھا۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) یہ سہارا بڑا کمزور ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ سہارا سہارا ہی نہیں۔

اشتراکی نظام افراد کیلئے جذبۂ محرکہ کو مہیا نہیں کرتا

اشتراکیت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ عائد کیا جاتا ہے کہ جب تمام افراد کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر پہ لے لے اور اس طرح افراد معاشرہ اپنی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں تو وہ کونسا جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) ہوگا جس کی رو سے یہ افراد کام کرنے پر آمادہ کئے جاسکیں گے۔ نہ صرف کام کرنے پر بلکہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور معاشرہ کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کرنے پر آمادہ اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی بہبود میں صرف کرنے کے لئے تیار (اور بہ طیب خاطر تیار) کئے جاسکیں۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب مارکس یا مارکسزم کے پاس کچھ نہیں۔ نہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی ہے وہ بنیادی فرق جو قرآنی نظام ربوبیت کو اشتراکی نظام سے بہت بلند لے جاتا ہے اسلئے کہ (Prof: HAWTREY) کے الفاظ میں:

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (Quoted by Carr)

قرآنی نقطۂ نگاہ سے ہر نظریہ فنا پذیر نہیں

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ مارکس کے نظریہ "تاریخی وجوب" کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ کائنات میں کوئی تصور کوئی نظریہ، کوئی نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ ہر نظریہ تغیر پذیر اور ہر نظام فنا آمادہ ہے اور یہ سلسلۂ تغیرات مسلسل چلا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس قرآن یہ تصور پیش کرتا ہے کہ بعض نظریاتِ زندگی ایسے ہیں جن میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور بعض ایسے جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی استعداد اور جوہر رکھتے ہیں (یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت)۔۔۔ تغیر و ثبات (فنا اور بقا) ایک خاص قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کی اصل و بنیاد اس تغیر پذیر دنیا کائنات سے ماوراء ہے (وعندہٗ

ام الکتاب (۱۳/۳۸) اس قانونِ "محو و ثبات" (فنا و بقا) کی تفصیل تو طول و طویل ہے لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو ایک بنیادی نقطہ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو

وامّا ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اس تصور یا نظام کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ ہے وہ بنیادی قانون جس کے مطابق، نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات کی فنا اور بقا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کیلئے منفعت بخش ہو۔ جو ایسا نہ ہو مٹ جاتا ہے۔

"ما ینفع الناس" کے الفاظ پر غور کرو سلیم! بس اس میں سارے مسئلہ کا حل پوشیدہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنے اپنے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔ یہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جو اُسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ کوئی شخص ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس میں اسے اپنا فائدہ دکھائی نہ دے۔

ہر شخص کا اپنا فائدہ ——————　یہ ہے عام اصول۔

وہی نظام باقی رہ سکتا ہے جس میں نوعِ انسانی کا فائدہ ہو

لیکن قرآن نے کہا ہے کہ بقا اس نظریہ یا نظام کے لئے ہے جس میں "نوعِ انسانی کا فائدہ" ہو۔ اسلئے قرآنی قانون کی رُو سے،

(۱) وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیشِ نظر اپنا ذاتی فائدہ ہو، باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس

(۲) وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیشِ نظر "نوعِ انسانی کا فائدہ" (ما ینفع الناس) ہو، باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

متاعِ دنیا اور متاعِ آخرت کی قرآنی اصطلاح

قرآن یہ کہتا ہے کہ دوسری قسم کے نظام میں بھی "ہر فرد کا ذاتی فائدہ" موجود ہوتا ہے لیکن یہ فائدہ فوراً، براہِ راست (IMMEDIATELY) سامنے نہیں آتا بلکہ بالواسطہ (INDIRECTLY) ذرا آگے چل کر (IN THE LONG RUN) سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس، پہلی قسم کے نظام میں ہر شخص اپنا ذاتی فائدہ فوراً سامنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے مفادِ عاجلہ (فوراً سامنے آجانے والا نفع) کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نفع پیش پا افتادہ (قریب تر) ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے قرآن نے متاع الدنیا (قریبی منافع) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے برعکس جو فائدہ افراد تک پوری نوعِ انسانی کے اندر گردش کرتا ہوا پہنچتا ہے اسے مآلِ کار، آخر الامر یا مستقبل کا فائدہ کہا گیا ہے جس کے لئے قرآن میں آخرۃ (مستقبل) کی اصطلاح آئی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ذاتی منفعت، سود خویش یا انفرادی زندگی کو "حیوٰۃ الدنیا" کہا گیا ہے اور کلی منفعت سودِ ہمہ یا نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی کے لئے (جس میں موت کے بعد زندگی کا تصور بھی شامل ہے) "حیوٰۃ الآخرۃ" کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ قرآن کے نزدیک ذاتی منفعت کی انفرادی زندگی کا نظریہ غلط ہے اور کلی مفاد کی اجتماعی زندگی کا نظریہ صحیح۔ اس حقیقت کو قرآن ایک "اندھے عقیدے" کے طور پر نہیں منواتا (وہ کسی دعوے کو کبھی اندھے عقیدے کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ہر دعوے

انسانی سطح کی زندگی حیوانی سطح سے بلند ہونی چاہیئے

کے لئے دلیل لاتا ہے) وہ کہتا ہے کہ اگر تمہاری زندگی حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) پر ہوتی تو پھر یہ تصور درست تھا کہ ہر فرد اپنا اپنا منافع دیکھتا۔ کسی کو کسی دوسرے سے کچھ واسطہ نہ ہوتا۔ جس طرح ایک حیوان کو کسی دوسرے حیوان سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ (ان الذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام۔ ۔ ۔) لیکن زندگی کی انسانی سطح (HUMAN LEVEL) میں زندگی کے تقاضے حیوانی سطح سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس میں زندگی صرف طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) نہیں ہوتی بلکہ اس سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ طبعی زندگی کا تعلق انسانی جسم سے ہے جو قوانینِ طبعی (PHYSICAL LAWS) کے مطابق ہر آن تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ برعکس اس کے

انسانی جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے

انسان میں "کچھ اور بھی ہے" جو ان تمام تغیرات میں غیر متغیر رہتا ہے۔ اس کا نام انسانی ذات (Personality) یا خودی (Self) یا انا (IAMNESS) یا ایغو (Ego) ہے۔ قرآن میں اس کے لئے " روحِ خداوندی" کی اصطلاح آئی ہے یعنی انائے مطلق (Absolute Ego) کی قوت۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے، جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ، اس ذات یا انا کی تربیت (Development) نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی طبعی زندگی کا نام نہیں۔ طبعی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے لیکن انسانی زندگی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش تو مفادِ عاجلہ (متاع الدنیا) کی انفرادی زندگی سے ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کا رشتہ نوعِ انسانی کی نشوونما کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسلئے اس کے لئے پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جسمانی پرورش

طبعی زندگی کا انحصار "لینے" (TO RECEIVE) پر ہے مگر انسانی زندگی کی پرورش دینے سے ہوتی ہے

(حیوانی سطحِ زندگی) "لینے" سے ہوتی ہے (کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کو کچھ نہیں دیتا) اس کے برعکس انسانی زندگی کی پرورش "دینے" (TO GIVE) سے ہوتی ہے۔ جس خلاقِ فطرت نے جسمانی زندگی کے لئے وہ قاعدہ مقرر کیا ہے اسی نے انسانی زندگی کے لئے یہ آئین مقرر کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں زندگیاں بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔ اور ان کے نتائج بالکل واضح۔ دیکھو، سورۂ واللیل میں اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے جب فرمایا کہ ان سعیکم لشتیٰ۔ تمہاری کوششیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھو کہ فاما من اعطیٰ واتقیٰ۔ جس نے "دینا" سیکھا اور اس طرح اپنی زندگی کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیا۔ وصدق بالحسنیٰ۔ اور معاشرے میں توازن پیدا کر کے اس حقیقت کو سچ کر دکھایا۔ فسنیسرہ للیسریٰ۔ تو اس کے لئے نشوونما کی راہیں آسان ہو گئیں۔ اس کے برعکس، واما من بخل۔ جس نے صرف "لینا" سیکھا اور سب کچھ خود اپنے ذاتی مفاد کے لئے سمیٹ لیا۔ واستغنیٰ اور سمجھ لیا کہ یہ کچھ میری پرورش کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ معاشرہ کی نہ دیگر افرادِ انسانیہ کی۔ وکذب بالحسنیٰ اور اس طرح معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیا۔ فسنیسرہ للعسریٰ۔ سو اس کے لئے نشوونما کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے اس نے سمجھا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کیا ہے اور اس کی نشوونما کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔

اس کے سامنے یہ حقیقت اس وقت نمایاں ہو گی جب اس کی یہ روش معاشرہ میں انقلاب پیدا کر دیگی اور اس وقت وہ دیکھے گا کہ اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہیں آیا۔ (وما یغنی عنہ مالہٗ اذا تردیٰ) اس نے یہ روش اس لئے اختیار کی تھی کہ اس نے سمجھا کہ وہ زندگی کی نشوونما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ اس کی زندگی کی نشوونما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر نہیں کئے جا سکتے۔ ان قوانین کا سرچشمہ وہی ہے جو خود زندگی کا سرچشمہ ہے۔ (ان علینا للھدیٰ) اس لئے کہ عقل انسانی کے پیش نظر فقط فرد متعلقہ کے مفاد (یعنی مفاد عاجلہ) کی نگہداشت ہوتی ہے اور قانون خداوندی کے سامنے مفاد عاجلہ اور مستقبل کے مفاد دونوں ہوتے ہیں۔ (وان لنا للاٰخرۃ والاولیٰ) خدا کا قانون انسان کو اس انداز زندگی کی ہلاکت سامانیوں سے متنبہ کرتا ہے جو انسانی زندگی کی برومندیوں کو جھلسا دیتی ہے۔ (فانذرتکم ناراً تلظیٰ)۔ اس تباہی اور ہلاکت کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو انفرادی زندگی (الگ الگ رہنے اور ذاتی مفاد پیش نظر رکھنے کی زندگی) کو نصب العین حیات بنا لیتے (لا یصلٰھا الا الاشقیٰ) یعنی وہ لوگ جو معاشرہ کے توازن کو بگاڑ کر اپنے دعوے انسانیت کی عملی تکذیب کرتے ہیں اور اس طرح صحیح راہ حیات سے گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ (الذی کذب وتولیٰ) اس ہلاکت سے وہ لوگ بچ سکتے ہیں جو اپنی زندگی کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھتے ہیں (وسیجنبھا الاتقی) یعنی وہ لوگ جو "دینا" سیکھتے ہیں اور اس طرح اپنی اور تمام نوع انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ (الذی یؤتی مالہٗ یتزکیٰ)۔

انسانی نشوونما کا راز دینے میں ہے

ان آیات کبریٰ سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہو گی سلیم! کہ قرآن کی رو سے، انسانی زندگی کی نشوونما کا راز "دینے" میں ہے۔ (EINSTEIN) کے الفاظ میں:

انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ وہ کس قدر "دیتا ہے"۔ نہ یہ کہ اس میں "لینے" کی استعداد کس قدر ہے۔

(Out of My Later Days P. 35)

"دنیا" اور "آخرت" کا یہ مفہوم اس سے پہلے بھی تمہارے سامنے آچکا ہے۔ میں نے اسے دہرایا اس لئے ہے کہ یہ حقیقت بڑی لطیف لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی اہم ہے اور جب تک اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیا جائے قرآن کے متعلقہ مباحث سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر سورۂ حدید کی ان آیات کو دیکھو جن کے سمجھنے میں تمہیں دشواری پیش آرہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اعلموا

یہ نظریۂ حیات کہ زندگی فقط مفاد عاجلہ حاصل کرنے کا نام ہے لعب ہے

انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو۔ یہ نظریہ حیات کہ زندگی فقط مفاد عاجلہ حاصل کرنے کا نام ہے، کیا ہے؟ یہ لعب ہے۔ لعب کے عام معنی تو کھیل تماشے کے ہیں لیکن اس کا اطلاق ایسی کوشش پر ہوتا ہے جس میں حرکت (Movement) تو ہو لیکن وہ حرکت انسان کو منزل مقصود تک نہ پہنچائے۔ اسی لئے کہتے ہیں لعب بنا الموج۔ دریا کی لہریں ہم سے کھیلتی رہیں۔ یعنی انہوں نے ہماری کشتی کو حرکت میں تو رکھا لیکن ساحل مقصود کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ اور لھو کہتے ہیں ہر اس جاذبیت کو جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور اس طرح اسے اس کام سے غافل کر دے جو اس کے پیش نظر تھا۔ (جس طرح تمہارے چھوٹے نوکر "عبدو" کی عادت ہے

اسے دہی لینے کے لئے بھیجو تو راستے میں بندریا کا تماشا دیکھنے میں ایسا محو ہوتا ہے کہ دہی لانا تو ایک طرف کٹورہ بھی گم کر دیتا ہے۔) لہذا صرف ذاتی مفاد کا نظریۂ زندگی ایسا ہے جس میں حرکت اور کوشش تو ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اسے منزلِ مقصود کی طرف نہیں جانے دیتی۔ کیونکہ منزلِ مقصود تھی **انسانی زندگی** کی نشوونما اور یہ صرف جسمانی پرورش ہی میں الجھ کر رہ گیا۔ مفادِ عاجلہ (یعنی منفعتِ خویش کا نظریہ) اپنے اندر ایسی کشش وجذب (لھو و زینۃ) رکھتا ہے کہ انسان کی نگاہوں سے اس کی انسانی زندگی کا نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے۔ (لعب ولھو)۔ اس منفعتِ خویش کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ (تفاخر بینکم۔ باہمی تفاخر۔ فخر گائے یا بکری کے ایسے باکھ (udder) کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بڑا نظر آئے لیکن اس میں دودھ بہت کم ہو۔ لہذا محض جسمانی زندگی میں باہمی تفاخر کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی حیاتِ خارجی (جسمانی پرورش کے سازوسامان) تو بہت بڑے دکھائی دیں لیکن حیاتِ داخلی (جوہرِ انسانیت) بہت کم ہو۔ (تکاثر فی الاموال والاولاد۔ اس زندگی کا مقصد فقط اس قدر ہوتا ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ دولت اور قوت میں دوسروں سے بڑھ جائے۔

مفادِ عاجلہ کی زندگی کی حقیقت متاعِ فریب سے زیادہ نہیں

یہ ہے مفادِ عاجلہ کی زندگی کی حقیقت۔ اس کی مثال اس بارش کی سی ہے (کمثل غیث) جو اس قسم کی سبزی پیدا کرے جو ایک ہی چھینٹے سے اُگ آتی ہے۔ اس قسم کی سبزی کی جڑیں اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں، نیچے نہیں جاتیں۔ اس سے کسان خوش تو ہو جاتا ہے، (اعجب الکفار نباتہ) لیکن ذرا دھوپ پڑی اور وہ خشک ہوئی اور زرد پڑ گئی اور دوہی دن میں چورچور ہو کر بکھر گئی (ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما) اس قسم کی کھیتی کی زندگی دو چار دن کی ہوتی ہے اور اس لئے اس کی خوشی بھی ایسی ہی ناپائیدار۔ آخر کار اس کا نتیجہ افسردگی اور پژمردگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا (وفی الاخرۃ عذاب شدید) اس مایوسی اور افسردگی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوششوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرے اور اس طرح اس نظام کی محافظت میں آجائے جو اس قانون کی رو سے تشکل ہوتا ہے (ومغفرۃ من اللہ ورضوان)

مذکورہ بالا امثال سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مفادِ عاجلہ کی زندگی متاعِ فریب کے سوا کچھ نہیں (وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور) (غرور اس باکھ کو کہتے ہیں جو دکھائی تو بڑا دے لیکن دودھ سے خالی ہو۔)

باہمی منافست کے جذبہ کیلئے دوسرا میدان ہے

اس کے بعد ارشاد ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ باہمی منافست کا جذبہ انسان کے اندر موجود ہے۔ ہم اس جذبہ کو کچلنا نہیں چاہتے البتہ اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتے ہیں۔ تم مسابقت کرنا چاہتے ہو تو مسابقت کرو اس نظام کے قیام میں جو خدا کے قانونِ ربوبیت کی رو سے عمل میں آتا ہے اور جس میں انسانی زندگی ان تمام ہلاکتوں اور تباہیوں سے محفوظ رہتی ہے جو مفادِ عاجلہ کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ (سابقوا الی مغفرۃ من ربکم) اس نظام کا نتیجہ خوشگواریوں کی ایسی جنت ہوتا ہے جو زمان ومکان کی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور ساری کائنات کو محیط ہوتی ہے (وجنۃ عرضھا کعرض السماء والارض) اور یہ نتیجہ ہوتا ہے اس نصب العین حیات کا جسے انسان وحی خداوندی کے مطابق اپنے لئے متعین کرتا ہے (اعدت للذین اٰمنوا باللہ ورسلہ) اس قسم کی خوشگواریاں اور کامرانیاں کسی خاص گروہ یا افراد تک محدود

نہیں ہوتیں بلکہ ہر اس جماعت کے حصہ میں آسکتی ہیں جو انہیں حاصل کرنا چاہے یعنی اپنے اندر ان کے حصول کی صلاحیت پیدا کرلے ۔ (ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم)

کم استعداد لوگ بھی محروم نہیں رکھے جا سکتے

اوپر کہا گیا ہے کہ یہ معاشی خوش حالیاں اسے مل سکتی ہیں جس میں ان کے حاصل کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص میں کسی داخلی یا خارجی حادثہ کی وجہ سے اس استعداد میں کمی واقعہ ہو جائے یا وہ بالکل ہی سلب ہو جائے (مثلاً بعض پیدائشی کمزوریاں یا بعض بیماریوں کے عواقب یا باہر کی دنیا کے حادثات) تو کیا ایسی صورت میں وہ شخص ان خوش حالیوں سے محروم رہ جائے گا؟۔ بالکل نہیں۔ خدا کے قانونِ ربوبیت میں اس قسم کے حوادث کے لئے پہلے ہی سے (Provision) کردی گئی ہے اسلئے کہ ایسے معاشرہ میں جس میں ہر فرد کا نصب العین حیات دوسروں کی ربوبیت (نشوونما) ہو اس قسم کی (Provision) از خود موجود ہوتی ہے۔ (ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔ ان ذلک علی اللہ یسیر)

اس معاشرہ میں اس قسم کے حوادث، انسان کو سامانِ نشوونما سے محروم نہیں رکھتے اسلئے کہ اس میں جن افراد کو زیادہ استعداد میسر ہوتی ہے وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس کے ماحصل کو اپنے ہی تک محدود نہیں رکھتے (لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم) اس قسم کی دشواریاں تو اس معاشرہ میں پیش آتی ہیں جہاں ہر شخص دوسرے کی گھات میں اس طرح رہتا ہے جس طرح شکاری چپکے چپکے دبے پاؤں شکار کی طرف جاتا ہے اور اسے پکڑ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ (واللہ لا یحب کل مختال فخور) اس قسم کے "شکاری"

گریز کی راہیں نکالنے والے قانونِ خداوندی کو متاثر نہیں کرسکتے

معاشرہ میں اربابِ حل و عقد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر کرتے رہتے ہیں اور اس خیال سے کہ لوگ ان کی اس روش پر گرفت نہ کرسکیں ایسے قوانین وضع کردیتے ہیں جن سے اس قسم کی انفرادی مفاد پرستیاں "قانوناً" جائز قرار پا جائیں۔ (الذین یبخلون ویأمرون الناس بالبخل) یہ لوگ قانونِ ربوبیت سے علانیہ سرکشی کی جرأت تو نہیں کر پاتے البتہ اس قسم کی قانون سازیوں سے اپنے لئے گریز کی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ ان گریز کی راہیں نکالنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے خدا کا قانون ذرا بھی اثر پذیر نہیں ہوتا۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے۔ اور یہی اس کے قابل ستائش ہونے کی دلیل ہے۔ (ومن یتول فان اللہ ھو الغنی الحمید)۔

صحیح معاشرہ قائم کرنے کیلئے رسول بھیجے گئے

اس قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے انتظام یہ کیا گیا تھا کہ خدا کے فرستادہ اس نظام کے اصول و ضوابط لیکر آئیں جن کے ذریعے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہے (لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط)

انفرادی مفاد پرستوں کیلئے شمشیرِ خارا شگاف نازل کی گئی

لیکن اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ انفرادی مفاد کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے والے گروہ محض وعظ و نصیحت سے ایسا معاشرہ قائم نہیں

ہونے دینگے اس لئے اس نے نوعِ انسانی کی نفع بخشی کیلئے ضوابطِ قانون کے ساتھ شمشیر خاراشگاف بھی نازل کی۔ (وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس)

لیکن اس نظام کے قیام کے لئے سب سے مقدم ضرورت اس جماعت کی ہے جو مفادِ عاجلہ کی جاذبیتوں سے صرفِ نظر کر کے اس نظام کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھے اور اسے اس کا یقینِ محکم ہو کہ یہ نظام اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے جس سے یہ مخالفت کی تمام قوتوں پر غالب آکر رہے گا۔ ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (۲۵/۵۷)

وہی نظام قائم رہ سکتا ہے جو نوعِ انسانی کیلئے سودمند ہو

تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ دونوں معاشرے کس طرح نکل کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک معاشرہ وہ جو اس نظریہ پر قائم کیا گیا ہو کہ اس کا وجود نوعِ انسانی کی منفعت (ربوبیت عامہ) کے لئے ہے اور دوسرا معاشرہ وہ جو "بخل" کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ بخل کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ یا قوم سب کچھ اپنے مفاد کے لئے سمیٹ لے اور اسے دوسروں کی منفعت کیلئے عام نہ ہونے دے (اسے Arrested Interests کا معاشرہ کہئے اس سے بخل کے معنی واضح ہو جاتے ہیں) قرآن نے مختلف مقامات پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جو نظام اس نظریہ پہ قائم ہوگا وہ باقی نہیں رہ سکتا اس کی جگہ ایسا نظام لے لیگا جو اس کے مخالف نظریہ پر قائم ہوگا۔ یعنی نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے۔ اس کے لئے بخل کے مقابلے میں، انفاق کی اصطلاح آتی ہے جسے (Open Interests) کا معاشرہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سے انفاق کے معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی وہ میانی جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ سورۂ محمدؐ میں ہے کہ "تمہارا نصب العین حیات یہ ہونا چاہیئے کہ تم اپنی محنتوں کا ماحصل نوعِ انسانی کی منفعت کیلئے صرف کرو۔ (ھا انتم ھؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ) لیکن تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم اس کے برعکس سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹنے لگ جاتے ہو۔ فمنکم من یبخل) تم بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہو کہ تم

اگر تم بخل کرو گے تو اجتماعی حیثیت سے مٹ جاؤ گے اور کوئی دوسری قوم تمہاری جگہ لے لیگی

اس طرح دوسرے انسانوں کو سامانِ نشوونما سے محروم کر دو گے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم خود ہی اس سے محروم رہ جاؤ گے (ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ) جو معاشرہ قانونِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہوتے ہو۔ (واللہ الغنی وانتم الفقراء) اب یہ دونوں راہیں تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم بخل والا معاشرہ قائم کرو گے تو اسے بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تم اجتماعی حیثیت سے مٹ جاؤ گے۔ تمہاری جگہ ایک ایسی قوم آجائے گی جو تمہاری جیسی ذہنیت نہیں رکھے گی اور اس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہو جائے گا جو نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہوگا۔ (وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم ۳۸/۴۷) یعنی خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ بقا اسی نظام کے حصہ میں آسکتی ہے جس کا مطمحِ نگاہ نوعِ انسانی کی منفعت ہو (واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض ۱۳/۱۷)

قرآنی معاشرہ صفتِ ربّ العٰلمینی کا مظہر ہوتا ہے

میں نے تمہیں اپنے سابقہ خط میں بتایا تھا کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق قائم ہو اسے صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ قرآن اس ضابطہ کا نام ہے جس کے مطابق یہ معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ اس ضابطہ کی ابتداء ہی اس محکم اصول سے ہوتی ہے جس پر اس معاشرہ کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے وہ ... بنیادی اصول ہے الحمد للہ رب العالمین جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ مستحق تعریف و ستائش ہوگا جو ربّ العٰلمینی (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔ اس نظام کو قائم کرنے والوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے ان پر کچھ تنگی ہی کیوں نہ آجائے (یؤثرون علیٰ انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ) اسلئے کہ وہ جانتے ہیں کہ انسانی ذات کی نشوو ارتقاء کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے۔ ومن یوق شح نفسہ فاولئٰک ھم المفلحون ۵۹/۹ شح کے لفظ پر غور کرو، انفرادی مفاد پر مبنی معاشرہ کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔

بخل و انفاق کی ذہنیتوں میں فرق

ذرا سامنے لاؤ اس منظر کو کہ گرمی کی شدت ہے۔ کسی ایک جگہ تھوڑا سا پانی ہے اور اس کے اردگرد پیاسوں کا ہجوم۔ ایسے میں ہر پیاسے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی پی لے۔ اس قسم کے منظر کو کہتے ہیں "تشاحا الماء" شح نفس اسی قسم کی ذہنیت کا نام ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ میں اس معاشرے کی پوری کی پوری ذہنیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے جس میں ہر فرد اپنے مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو بخل (مفادِ خویش) کی ذہنیت پر استوار ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس دوسرا معاشرہ وہ ہے جو انفاق (مفادِ کلی) کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ جس میں ہر پیاسے کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی پہلے پانی پی لے۔ تم نے پروفیسر (HAWTREY) کا یہ قول اوپر دیکھا ہے کہ معاشی نظاموں میں وجۂ تفریق صرف یہ ہوتی ہے کہ ان میں لوگوں کے کام کرنے کیلئے جذبۂ محرکہ کیا ہوتا ہے۔ تم غور کرو سلیم! کہ جس معاشرہ میں افراد کی ذہنیت میں اس انداز کی تبدیلی پیدا کردی جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کی محکمیت اور افضلیت میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

قرآن اس ذہنیت کو بھی اندھے عقیدہ کی بناء پر نہیں منواتا

قرآن اس ذہنیت کو بھی یونہی اندھے عقیدے کی بنا پر پیدا نہیں کرتا۔ وہ اس کے لئے بھی دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف افرادِ معاشرہ میں اکتسابی صلاحیتیں (Earning Capacities) مختلف ہوتی ہیں۔ جس شخص میں اکتسابی استعداد زیادہ ہوتی ہے (اور وہ اس استعداد کو کام میں بھی لاتا ہے) وہ زیادہ کماتا ہے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔ اسلئے میں اس کمائی کا مالک ہوں۔ میں اسے کسی دوسرے کو کیوں دیدوں؟

مفاد پرستانہ ذہنیت کا نمائندہ "قارون"

قرآن میں قارون کو مفاد پرستانہ ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس سے کہا جاتا کہ وہ اپنی اس روش کو

چھوڑ کر جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں وہ روش کیوں نہیں اختیار کرتا جس سے انسانی مساوات کا نظام قائم ہو جائے۔ (ولا تبغ الفساد فی الارض۔ ان اللہ لا یحب المفسدین ﴿۲۸﴾) تو وہ اس کے جواب میں کہتا کہ جو کچھ میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے اسے دوسروں کو کیوں دیدوں؟ (قال انما اوتیتہ علی علم عندی) یہ ذہنیت کسی خاص "قارون" کی نہیں۔ ہر دور کا "قارون" (سرمایہ دار) اپنی روش کے جواز میں یہی دلیل پیش کرتا ہے ﴿۲۸/۷۸﴾۔

تمہاری ہنرمندی میں تمہارا حصہ کتنا ہے؟

قرآن کہتا ہے کہ سوچو کہ جس چیز کو تم اپنی "ہنرمندی" (علم عندی) قرار دیتے ہو اس میں خود تمہارا حصہ کتنا ہے اور کتنا حصہ تمہیں "مفت" ملا ہے۔ استعداد کا اختلاف پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد اس بچے کا ابتدائی ماحول، تربیت اور تعلیم اثرانداز ہوتی ہے۔ پھر مواقع (opportunities) کا سوال سامنے آتا ہے۔ اب سوچو کہ ان تمام مراحل میں خود تمہاری ذاتی "ہنرمندی" کا کس قدر دخل ہوتا ہے اور معاشرے کا کتنا حصہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سامنے آجاتی ہے کہ استعداد و صلاحیت کی بنیادیں ان عوامل (Factors) پر قائم ہوتی ہیں جن میں یا تو تمہارا دخل ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔

اس کے بعد اُس مرحلے میں آجاؤ جس میں تم اپنی استعداد کو عمل میں لا کر (یعنی محنت کر کے) روپے کماتے ہو۔ اس میں بھی دیکھو کہ تمہاری ہنرمندی کا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور کتنا حصہ آفاقی قوتوں (Universal Forces) کا ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ مجرد حقائق (Abstract Realities) کو محسوس مثالوں (Concrete Examples) کے ذریعے ذہن نشین کراتا ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کھیتی کی مثال پیش کرتا

کھیتی کی مثال

ہے اور اس کے ساتھ ہی ان عوامل و عناصر کو بھی سامنے لاتا ہے جن پر ہماری روزمرہ کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غور کرو کہ اس غلے کی پیدائش میں جسے تم آخرالامر اپنی ملکیت سمجھ کر سمیٹ بیٹھتے ہو، تمہاری "ہنرمندی" کا کتنا حصہ ہے اور کتنا حصہ "ہمارا" ہے۔ وہ کہتا ہے کہ افرءیتم ما تحرثون ﴿۵۶/۶۳﴾ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ غلہ پیدا کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیز ہر روز تمہارے سامنے آتی ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا تمہیں علم نہ ہو یا جس کا علم حاصل کرنے کیلئے تمہیں کہیں دور دراز جانا پڑے۔ یہ تو تمہارے ہر روز کے مشاہدے کی چیز ہے (افرءیتم؟) دیکھو کہ غلے کی پیداوار میں تمہارا کس قدر حصہ ہوتا ہے؟

زمین کس کی ہے؟

پہلے تو یہ دیکھو کہ خود زمین، جس سے کھیتی اُگتی ہے وہ تمہاری پیدا کردہ نہیں۔ لہٰذا اس کاروبار میں راس المال (Principal investment) بھی تمہارا نہیں۔ اب آگے بڑھو اس زمین میں تم اتنا ہی کرتے ہو کہ ہل جوت کر بیج ڈال دیتے ہو۔ (ما تحرثون) اب سوچو کہ مٹی میں دبے ہوئے بیج سے کونپل کون پیدا کرتا ہے؟ "حرث" کو

حرث کو زراعت میں کون تبدیل کرتا ہے

"زراعت" میں کون تبدیل کرتا ہے؟ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو یا خدا کا آفاقی قانون کرتا ہے؟ (ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون)۔ اگر اس میں ہمارا (یعنی خدا کا قانون) کارفرما نہ ہو تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف، تمہارے بیج کے دانے بھی مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں اور اس طرح تمہاری محنت بھی رائیگاں جائے

اور ساتھ مفت کی چٹی بھی پڑ جائے (لونشاء لجعلنہ حطاماً فظلتم تفکھون۔ انا لمغرمون۔ بل نحن محرومون) اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ۔

پانی کس نے پیدا کیا ہے؟

اور آگے بڑھو اور سوچو کہ یہ صاف اور شفاف پانی، جس پر تمام کھیتی کا دارومدار اور خود تمہاری زندگی کا انحصار ہے، تمہاری "ہنرمندی" سے پیدا ہوتا ہے؟ (افرءیتم الماء الذی تشربون) وہ کون ہے جو پانی کو سمندر سے اٹھا کر بادلوں کے مشکیزے میں بھرتا ہے اور اسے تمہاری ضرورتوں کے مطابق جگہ جگہ تقسیم کرتا ہے۔ زائد پانی کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے حوضوں (Reservoirs) میں جمع کر دیتا ہے اور اسے آہستہ آہستہ، ندی نالوں میں بہاتا ہوا تمہارے کھیتوں اور مکانوں تک لے آتا ہے۔ (ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچو کہ یہ کس کا انتظام ہے کہ سمندر کے پانی کے تمام نمک (جس سے وہ پانی نہ پینے کے قابل رہتا ہے نہ زراعت کے کام آسکتا ہے) وہیں رہ جاتے ہیں اور کشید کردہ مقطر پانی، تمہاری صراحیوں اور کھیتوں تک پہنچ جاتا ہے۔ (لونشاء جعلنہ اجاجاً فلولا تشکرون)۔

تمازت و حرارت کس کی پیدا کردہ ہے؟

اور آگے بڑھو اور سوچو کہ تمازت اور حرارت جس پر نشوونما اور ہست و بود کا انحصار ہے کس کے قانون سے تپش آمادہ رہتی ہے؟ کیا اس کی حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے؟ (افرءیتم النار التی تورون۔ ءانتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشئون)۔ غور کرو اور بتاؤ کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون　　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار　　　خاک یہ کس کی ہے. کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب　　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

اب سوچو کہ تمہارا اور ہمارا یہ مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں دیکھو کہ تمہارا حصہ کس قدر ہے اور ہمارا حصہ کسقدر؟ جس نسبت سے تمہارا اور ہمارا حصہ ہے اسی نسبت سے اس کاروبار کا منافعہ (یعنی پیداوار) تقسیم کر لو۔ تم اپنا حصہ آپ لیلو اور ہمارا حصہ وہاں پہنچا دو جہاں ہم کہتے ہیں۔ یہ حصہ ان ضرورت مندوں کا ہے جن میں اکتسابی استعداد کم ہے یعنی وہ معاشرہ کے دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں یا جن کی استعداد کسی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔ ہم نے اس حصہ کو انہی کے لئے مختص کر رکھا ہے۔ (نحن جعلنٰھا تذکرۃ ومتاعاً للمقوین) مقوین کے معنی ہیں بھوکے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ربوبیت اعلیٰ کا انتظام ہو سکے گا۔ پس تمہیں چاہئے کہ اس نظام ربوبیت کے قیام کے لئے کوشاں رہو (فسبح بحمد ربك العظیم - ۵۶/۶۳-۷۴)

سلیم! تم نے دیکھا کہ قرآن کس بلیغ انداز سے اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ جس ماحصل کو انسان اپنی ہنرمندی اور کاری گری کا نتیجہ قرار دیتا ہے اس میں خود انسان کا کتنا حصہ ہوتا ہے اور کس قدر حصہ ان عناصر و عوامل کا ہوتا ہے جن کے پیدا کرنے یا بروئے کار لانے میں اسے کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ عناصر یا تو اس معاشرہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس میں وہ فرد پرورش پاتا ہے (مثلاً صحت اور غذا

استعداد اور صلاحیت کی زیادتی کا نتیجہ تمہاری ملکیت نہیں

کا انتظام تعلیم و تربیت کے ادارے۔ سازگار ماحول اور مساعد فضا وغیرہ وغیرہ)۔ یا کائنات میں بکھری ہوئی نعمتیں جو بلا محنت و مشقت

حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا، روشنی، گرمی وغیرہ۔ اسی لئے قرآن دوسری جگہ کہتا ہے کہ تمہارا یہ **خیال غلط ہے کہ جو چیز تمہاری استعداد و صلاحیت کی زیادتی کا نتیجہ ہے اس پر تمہیں حقِ ملکیت حاصل ہے۔** سورۂ نحل میں ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ تم میں سے بعض افراد کو دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ اکتسابی قوتیں حاصل ہیں، لیکن یہ استعداد تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ قانونِ خداوندی کی عطا فرمودہ ہے۔ (واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق (۱۶/۷۱)) لہٰذا جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس استعداد کا ماحصل تمہاری ذاتی ملکیت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس ماحصل کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ کم استعداد کے لوگ جو چھوٹے چھوٹے کاموں پر مامور ہیں اس سے ان کی ضروریاتِ زندگی کا سامان مہیا کیا جائے۔ (فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم) قرآن کہتا ہے کہ تم اس تقسیم کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سے زیادہ اور کم استعداد والے لوگ سب برابر ہو جائیں گے۔ (فھم فیہ سواء)

قوت و استعداد خدا کا عطیہ ہے جو تمہاری ملکیت نہیں

وہ کہتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تمہیں جو قوت اور استعداد خدا کی طرف سے بطور بخشائش ملی ہے تم اسے اپنی ملکیت تصور کرتے ہو اور اس کے عطیہ خداوندی ہونے سے انکار کرتے ہو (افبنعمۃ اللہ یجحدون) وہ کہتا ہے کہ یہ اندازِ نگاہ بالکل غلط ہے کہ تم عطایائے خداوندی کو سمیٹ کر اپنی ہی ذات کے لئے مختص کر لو۔ جب ہم نے اپنے **عطیات** (سامانِ پرورش) **میں حد بندیاں نہیں کیں تو کسی انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ انھیں محدود اور مقید کر کے رکھ لے۔** (وما کان عطاء ربك محظورا (۱۷/۲۰))۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کریم کس طرح اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ مفاد پرستانہ گروہ (یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت) کی یہ دلیل کہ جس دولت کو ہم اپنی ہنرمندیوں سے پیدا کرتے ہیں اسے دوسروں کو کیوں دیدیا جائے، کس قدر تنگ نگاہ کا فریب اور حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ **انسان جس چیز کو اپنی ہنرمندی قرار دیتا ہے اس میں اسکا اپنا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے باقی سب کچھ فطرت کے عطایا ہوتے ہیں۔** اور فطرت نے ان قوتوں اور نعمتوں کو عطا اس لئے کیا ہے کہ اس طریق سے نوعِ انسانی کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچ سکے۔ قرآن اس حقیقت کو ایمان کی

دونوں راہوں میں علم و بصیرت کی راہ کونسی ہے؟

حیثیت سے تسلیم کرانا چاہتا ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں راستے تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ تم سوچو کہ ان میں سے کون سی راہ علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی راہ ہے۔ اگر تم اس دعوے سے متفق ہو جاؤ کہ صحیح علم و بصیرت کی راہ وہی ہے جس کا نتیجہ نوعِ انسانی کی منفعت ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے اس راستہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ اب سوچو کہ جو قوم اس حقیقت کو اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنے سفرِ حیات کی منزلِ مقصود قرار دے لے۔ کیا ان کے دل میں کبھی یہ خیال تک بھی آئیگا کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم دن رات محنت کرتے رہیں اور اس محنت کا ماحصل دوسروں کی

پرورش اور تربیت کے لئے صرف کر دیا جائے؟ ان کا تو دعویٰ یہ ہوگا کہ ہمارا نصب العین زندگی یہ ہے کہ ہم خدا کی صفت رب العلمینی کا مظہر بنیں اس لئے ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرے گی (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ قرآن نے اس جماعت کا نام ربانیون کی جماعت رکھا ہے۔ اس کی تعلیم کا مقصد ہی اس قسم کی جماعت پیدا کرنا تھا۔

ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں!

اب تم خود سوچو سلیم! کہ قرآن کی تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس تعلیم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زرِ فاضلہ کس کے پاس رہے اور ذرائع پیداوار کس کی ملکیت ہیں۔ اسکی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ قدرتی پیداوار اور انسانوں کی محنت کا ماحصل سب کے سب نوعِ انسانی کی پرورش (ربوبیت) کیلئے صرف ہوں۔ اور ہر فرد اپنی زندگی کا یہی نصب العین قرار دے۔ لہذا جب منتہائے نگاہ پوری انسانیت کی پرورش و تربیت ٹھہرے تو اس ذاتی ملکیت کا سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس میں ماحصلِ پیدائش و محنت، کسی ایک فرد یا چند افراد کی ذات کیلئے محدود و مختص ہو کر رہ جائیں۔

میرے فہمِ قرآن کی رو سے سلیم! قرآن کی غائت اس قسم کا نظام قائم کرنا ہے جس میں پوری کی پوری انسانیت کی پرورش (ربوبیت) ہو سکے اور تمام افرادِ انسانیہ خدا کی معاشی سہولتوں سے یکساں طور پر متمتع ہو سکیں۔ یہی اسلام کا منتہیٰ ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مجھے تمہاری تجویز سے پورا اتفاق ہے سلیم! کہ قرآنی نظامِ ربوبیت (Quranic Socialism) کے متعلق اس طرح منتشر طور پر، متفرق مضامین اور خطوط میں لکھنے کی بجائے، ایک مختصر سی کتاب میں، جامع طور پر، سب کچھ ایک جگہ لکھ دیا جائے تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی رہے۔ تمہارے خط ملنے پر میں نے اسے کتابی شکل میں ترتیب دینا شروع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جلدی تم تک پہنچ جائیگی۔ تمہارا تقاضا ٹالا نہیں جا سکتا۔

میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ میں نے تمہیں آج تک جتنے خطوط لکھے ہیں انھیں یکجا شائع کر دیا جائے۔ کیوں؟ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟

اچھا۔ خدا حافظ

پرویز

ایجنٹ صاحبان متوجہ ہوں

• نظام اسلام" • قرآنی دستور پاکستان" اور • اسباب زوال امت" کی کسقدر کاپیاں آپ کو مطلوب ہیں، جلد مطلع فرمائیے

(اشتہار صا۱۲ اور ملا پر ملاحظہ فرمائیے)

مقامِ حدیث

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نظر میں

اگر آپ کو مذہب اور مذہبیات سے کچھ دلچسپی ہے تو آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آجکل فضا میں ایک خاص آواز گونج رہی ہے اور وہ ہے طلوع اسلام کی مخالفت۔ شاید ہی کوئی محراب و منبر ایسا ہو جہاں سے یہ آواز نہ بلند ہوتی ہو کہ طلوع اسلام دورِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس نے ایک نیا اسلام وضع کر رکھا ہے۔ یہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ جو کچھ یہ کہتا ہے تیرہ سو سال میں کبھی سننے میں نہیں آیا۔ اس سے اسلام کا طلوع نہیں بلکہ غروب مقصود ہے۔ کہیں ان "منکرِ حدیث" ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے اور کہیں اس سے آگے بڑھ کر "منکرِ محکمات" تک اتر آیا جاتا ہے۔ اسے کھلے بندوں گالیاں دی جاتی ہیں۔ گردن زدنی اور کشتنی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے جاتے ہیں۔ اور اس روزِ سعید کا انتظار کیا جا رہا ہے جب پاکستان میں شریعت اسلامی کا راج ہوگا اور اس قسم کے مرتدین کو حوالۂ دار و رسن کیا جائے گا۔ گوئرنگ نے کہا تھا کہ کسی جھوٹی بات کو سو مرتبہ دہرایئے وہ سچ بن کر دکھائی دینے لگے گی۔ طلوع اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈے کو بھی گوئرنگ کے اصول کے ماتحت عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس لئے اس سے ان لوگوں کا متاثر ہو جانا کچھ بعید نہیں جو طلوع اسلام کا مسلسل مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ

طلوعِ اسلام کا مسلک

(۱) طلوع اسلام کیا کہتا ہے؟

(۲) یہ جو کچھ کہتا ہے کیا وہ کوئی نئی بات ہے؟

یا

ہمارے بزرگوں میں سے بھی کسی نے وہی کچھ کہا ہے؟

(۳) ایسا کہنے والوں کی مخالفت بھی کوئی نئی چیز ہے یا ان بزرگوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے؟

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام کا جرم کیا ہے؟ **طلوع اسلام کی دعوت** یہ ہے کہ قرآن کریم وہ ضابطۂ زندگی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل کر دی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کا رد و بدل ہو سکتا ہے نہ نسخ و اضافہ۔ انسانی زندگی کے لئے جس قدر رہنمائی کی ضرورت تھی اسے اصولی طور پر قرآن میں دیدیا گیا ہے اور اس کے بعد قرآن پر ایمان رکھنے والوں سے کہدیا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضہ کے مطابق اجتہادی طور پر جزئی قوانین مرتب کر لیں۔ یہی کچھ رسول اللہؐ نے کیا تھا۔ یہی خلفائے راشدین نے کیا اور ان کے بعد ایسا ہی ہر دور کے مسلمانوں کو کرنا چاہئے تھا۔ ہمیں بھی آج ایسا ہی کرنا چاہئے۔

بس یہ ہے "ہمارا جرم" اب یہ دیکھئے کہ کیا یہ جرم ہمارا ہی ہے یا اس جرم میں ہمارے ساتھ اور لوگ بھی شریک ہیں۔ اور اگر شریک ہیں تو وہ کون ہیں؟

رسول اللہ صلعم نے قرآن کے سوا کچھ نہیں چھوڑا

عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقل حضرت ابن عباسؓ کے پاس گئے تو شداد نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلعم نے اپنے بعد کچھ چھوڑا تھا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بجز اس قرآن کے جو دفتین میں محفوظ ہے آپ نے اور کچھ نہیں چھوڑا۔ اسی طرح ہم دونوں محمد بن الحنفیہ کے پاس گئے اور ان سے بھی ہم نے یہی سوال کیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ نے اس قرآن کے سوا جو دفتین میں محفوظ ہے اور کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص۷۵۱)

میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں جسکو قرآن نے حرام کیا ہے

امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب تنقید سیر الاوزاعی میں تحریر فرماتے ہیں:-

> جو چیز قرآن کے مخالف ہو گو اس کی روایت کی جائے لیکن وہ رسول اللہ صلعم کی حدیث نہیں ہے۔ ہم سے معتبر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں جس کو قرآن نے حرام کیا ہے، خدا کی قسم وہ لوگ کسی چیز سے مجھ پر تمسک نہ پکڑیں الخ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۶)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہؓ کو روایت حدیث سے منع کیا

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مراسیل ابن ابی ملیکہ سے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ صلعم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔ تو رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۱۶)

حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہؓ کو روایت حدیث سے منع فرمایا

حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ شعبہ وغیرہ نے بیان سے اور بیان نے شعبی سے اور شعبی نے قرظہ بن کعبؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب ہم کو عراق کی طرف روانہ فرمایا تو ہمارے ساتھ خود بھی چلے اور فرمایا تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں تمہاری مشایعت کر رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا ہاں ہماری عزت افزائی کیلئے۔ بولے اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ تم ایسی آبادی کے لوگوں کے پاس جاتے ہو جو شہد کی مکھیوں کی طرح گنگنا گنگنا کر قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ تم احادیث کی روایت کرکے ان کی تلاوت قرآن میں رکاوٹ نہ پیدا کرنا صرف قرآن مجید پر بس کرو اور رسول اللہ صلعم سے روایت کم کرو، اور اس میں میں بھی تمہارا شریک ہوں۔ چنانچہ جب قرظہؓ آئے تو لوگوں نے روایت حدیث کی خواہش کی، انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو حضرت عمرؓ نے اس کی ممانعت کی ہے۔ (ایضاً ص۱۲۳)

حضرت علیؓ رسول اللہ صلعم کی حدیث قبول نہیں کرتے تھے

امام ابویوسفؒ نے سیرالاوزاعی کی تنقید میں جو کتاب لکھی ہے جسے امام شافعیؒ نے کتاب الام میں روایت کیا ہے۔ اس میں امام ابویوسفؒ تحریر فرماتے ہیں :-

اور اگر کتاب طویل نہ ہو جاتی تو میں تمہارے لئے بسند حدیث بیان کرتا کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہی کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۶۷)

حضرت امیر معاویہؓ بھی حضرت عمرؓ کے مسلک کے متبع تھے

ابن علیہ نے رجاء بن ابی سلمہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم کو یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ یہ کہا کرتے تھے کہ تم لوگ بھی حدیث کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کرو جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جاری تھا کیونکہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایتِ حدیث کرنے کے متعلق لوگوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ (ایضاً ص۱۶۲-۱۶۳)

ان حضرات کا احادیث کو رد کرنا حدیث کی دینی حیثیت نہ رکھنے کی دلیل ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت صدیق اکبر حضرت فاروق اعظم، حضرت علی مرتضیٰ، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا فیصلہ احادیث کے متعلق کیا ہے۔ اس کے ساتھ ذرا اس نکتہ پر بھی غور فرمائیے کہ احادیث رسول کے متعلق ان حضرات کا یہ فیصلہ کیوں تھا؟

ظاہر ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اور علی مرتضیٰؓ اور امیر معاویہؓ کے عہد سعادت عہد میں امام بخاریؒ اور امام مسلم حدیثیں بیان کرنے کیلئے نہیں ہوتے تھے بلکہ حضرات صحابہؓ ہی حدیثیں بیان کرنے والے ہوسکتے تھے جن کے درمیان اور رسول اللہ صلعم کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سند کے متعلق صحیح اور ضعیف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ روایتیں بیان کرنے والے وہ اصحاب رسول اللہ صلعم ہی تو ہیں جن کے متعلق خود ائمۂ حدیث کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ "اصحابی کلھم عدول بایھم اقتدیتم اھتدیتم" (میرے سارے اصحاب ثقہ اور عادل ہیں۔ ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرلوگے ہدایت پالوگے) مگر اس کے باوجود بھی یہ حضرات وہ کچھ فرما رہے ہیں جو آپ ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ ان حضرات کے نزدیک حدیث کی وہ حیثیت ہی نہیں ہوتی تھی جو آج اس کو حیثیت دی گئی ہے وہ حضرات جانتے تھے کہ خود رسول اللہ صلعم کا منشا بھی یہ نہیں تھا کہ آپ کے یہ ارشادات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امت کا دستور العمل بنا دیئے جائیں۔ وہ بقول حضرت صدیق اکبرؓ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ "جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف خدا کی کتاب ہے، اسی کے حلال کئے ہوئے حلال اور اسی کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔" (حضرت صدیق اکبرؓ) وہ اس حقیقت کو بھولے نہیں تھے کہ جن امور کی تفصیل قرآن میں نہیں ہوتی تھی ان کے متعلق رسول اللہؐ اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور جو رائے بہتر نظر آتی اسے اختیار کرلیا جاتا اور وہی شریعت کا حکم قرار پاجاتی تھی۔ لہٰذا وہ جانتے تھے کہ دین میں غیر متبدل چیز صرف قرآن ہے باقی احکام عندالضرورت بدلے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود رسول اللہ کے صادر کئے ہوئے

فیصلوں میں بھی ردّ و بدل کیا۔ اس دور میں یہی مسلک رائج رہا اور کبھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ احادیث رسول اللہؐ کو بھی قرآن کی طرح

صحابہؓ نے حدیث کے متعلق غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی تھی۔

تحریر میں لاکر محفوظ کرلیا جائے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں یہ کام سب سے آسان تھا۔ یہی نہیں کہ انھیں اس کی طرف خیال نہیں آیا۔ ان کے سامنے یہ سو اور وہ غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی ضرورت نہیں چنانچہ سیو تنویر الحوالک شرح مؤطا امام مالک میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے احادیث کو لکھوانے کا خیال کیا اور اس کی صحابہؓ سے مشورہ کیا تو عام صحابہؓ نے بھی ان کے خیال کی تائید کی لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ اس معاملہ میں مزید غور و فکر کر رہے اور قریب ایک مہینہ کے بعد انھوں نے یقینی رائے قائم کرلی اور فرمایا کہ جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے میں نے تم سے حدیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے اس میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت لوگوں نے کتاب اللہ کے اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہوگئے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتا کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کروں گا۔ اس لئے انھوں نے تحریر احادیث کا ارادہ ترک کردیا۔ یہی وجہ کہ اس دور میں ہمیں نہ کہیں حدیث کی کوئی کتاب نظر آتی ہے نہ اہل حدیث کا کوئی فرقہ۔

امام اعظمؒ نے تدوین فقہ میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی

قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں جزئیات مرتب کرنے کو فقہ کہتے ہیں۔ دور صحابہ فقہ کے کوئی خاص اصول مدوّن نہیں ہوئے تھے۔ اس باب میں سب سے پہلی اور نہا کامیاب کوشش امام ابوحنیفہؒ کی ہے جو امت میں امام اعظمؒ کے لقب سے متعارف ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحیح مقام بھی یہی تھا۔ وہ فن فقہ کے امام تھے اور بہت بڑے امام۔ ان کی فقہ پر آج تک عمل ہوتا چلا آر اور اس وقت بھی دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت اسی فقہ کی تقلید کرتی ہے۔ اس حقیقت سے ہر صاحب علم واقف ہے کہ امام اعظم فقہ کا مدار قیاس پر ہے۔ قیاس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے جزئیات مرتب کریں۔ اہل علم حضر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ امام اعظمؒ نے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے بہت کم مدد لی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھ حدیثیں مل نہیں سکتی تھیں وہ ایک قول کے مطابق سنہ ۶۱ھ میں اور دوسرے قول کے مطابق سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۰ھ تک زندہ اس دور میں حدیثوں کا جمع کرنا اس زمانہ سے زیادہ آسان تھا جس میں امام بخاریؒ (متوفی سنہ ۲۵۶ھ) نے یہ کام کیا۔ جہاں تک احادیث کی پہچان کا تعلق ہے محمد بن سماعہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابویوسفؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں اکثر احادیث کی طرف مائل ہوگیا ہوں مگر واقعہ ہے کہ ابوحنیفہ کو صحیح حدیث کی پہچان مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ (تاریخ خطیب بغدادی صفحہ ۳۴/۱۳)

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ تو حدیث کو وحی الٰہی کی طرح غیر متبدل سمجھتے تھے اور نہ ہی شک و شبہ سے بالا۔ وہ دین کی بنیاد سرتا یقینیات پر قائم سمجھتے تھے اور یقینی دین صرف کتاب اللہ کے اندر محصور تھا۔ چنانچہ علی ابن المدینی، عبدالرزاق سے نقل کرتے ہیں کہ میں معمر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ عبداللہ ابن المبارک آگئے تو ہم نے معمر کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ میں ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں

حنیفہؒ سے زیادہ بہتر طور پر فقہ میں کلام کر سکے اور عقل و قیاس سے کام لے سکے اور مخلوق کے لئے فقہ میں نجات کی راہ کو نمایاں کر سکے اور خدا کے دین میں شک و شبہ کی کوئی بات داخل کرنے سے ابوحنیفہ سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۹) وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورہ سے فقہ کی تدوین کرتے۔ اس کے بعد اگر کوئی یہ کہتا کہ یہ فیصلہ رسول اللہؐ کی حدیث کے خلاف ہے تو وہ اس کے جواب میں یہی کہتے جو حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ کا فیصلہ اس زمانہ کیلئے تھا اب حالات بدل چکے ہیں اسلئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ یا وہ حضرت عائشہ رضؓ صحابہؓ کے اتباع میں یہ کہتے کہ کیا معلوم رسول اللہؐ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اسے کیا سمجھا۔ ہم کتاب اللہ کی آیتوں میں اس قسم کی غیر یقینی چیزوں کو دین کا حصہ نہیں قرار دے سکتے۔ چونکہ وہ اس حقیقت کو واضح طور پر نمایاں کر دینا چاہتے تھے کہ احادیث رسول اللہؐ نہ تو یقینی ہیں اور نہ غیر متبدل اسلئے وہ بعض اوقات حدیث کے رد میں شدت تک بھی اختیار کر لیتے تھے۔

ابوحنیفہؒ احادیث کو ناقابل تبدیل نہیں سمجھتے تھے ورنہ پڑنے پر سختی کے ساتھ رد کر دیا کرتے تھے

امام سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ سے زیادہ کسی کو اللہ پر جرات کرنے والا نہیں دیکھا۔ وہ رسول اللہ صلعم کی احادیث کے لئے مثالیں گھڑتے اور ان کو رد کر دیا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کو معلوم ہوا کہ میں یہ حدیث نقل کرتا ہوں "ان البیعان بالخیار مالم یتفرقا (بائع اور مشتری جبتک علیحدہ نہ ہو جائیں انھیں معاملہ کو فسخ کر دینے کا اختیار رہتا ہے) ابوحنیفہؒ کہنے لگے "ذرا بتاؤ تو سہی اگر دونوں کسی ایک کشتی میں سفر کر رہے ہوں، اگر دونوں قید خانہ میں ایک ساتھ ہی قید ہوں، اگر دونوں ایک ساتھ ہی کسی سفر میں ہوں تو کس طرح جدا ہوں گے، اور کیونکر ان کا معاملہ تکمیل پذیر ہوگا) مفضل بن موسیٰ سینانی کہتے ہیں کہ میں نے خود ابوحنیفہؒ کو کہتے سنا ہے کہ میرے اصحاب میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دو قلے پیشاب کر دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے نبی صلعم کی اس حدیث کو کہ "پانی اگر دو قلے ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا" کو رد کرتے ہوئے ایسا فرمایا تھا (خطیب ج ۱۳ ص ۳۸۹)

امام اعظمؒ نے چار سو سے زیادہ احادیث کو رد کیا

ابوصالح فراء کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "امام ابوحنیفہؒ نے رسول اللہ صلعم پر چار سو بلکہ چار سو سے بھی زیادہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے"۔ میں نے یوسف سے پوچھا۔ اے ابومحمد! آپ کو وہ حدیثیں معلوم ہیں کہنے لگے ہاں معلوم ہیں۔ میں نے کہا تو مجھے کچھ حدیثیں بتائیے۔ یوسف بن اسباط نے کہا کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "مال غنیمت میں گھوڑے کے دو حصے اور پیادہ آدمی کا ایک حصہ ہے"۔ مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ میں ایک جانور کا حصہ ایک مومن کے حصہ سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ حضور اکرم صلعم اور آپ کے اصحاب نے برابر قربانی کے جانوروں پر نیزہ مار کر نشان کیا ہے مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ "ایسا کرنا ایک جاندار کی صورت کو بگاڑنا ہے"۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ "جبتک فروخت کرنے والا اور خریدار جدا نہ ہوں ان کو بیع فسخ کر دینے کا اختیار رہتا ہے مگر ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ جب معاملہ ہو چکا تو پھر کوئی اختیار نہیں رہتا"۔ رسول اللہ صلعم کہیں

سفر میں تشریف لیجاتے تو ہمراہ لیجانے کیلئے ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ اندازی فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے اصحابؓ کا بھی اسی پر عمل رہا مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ قرعہ اندازی خالص قمار اور جُوا ہے۔

ابو سائب کہتے ہیں کہ میں نے (حدیث کے مشہور امام) وکیع کو کہتے ہوئے سنا کہ ہم نے ابو حنیفہؒ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے پایا ہے"۔ عبدالاعلیٰ بن حماد اپنے والد حماد بن سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے رسول اللہؐ کی حدیثیں آتی تھیں مگر وہ اپنی رائے سے ان کو رد کر دیا کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی مؤمل کے واسطہ سے حماد بن سلمہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ (خطیب ج۱۳ ص۳۹۰-۹۱)

انکارِ حدیث میں امام ابو حنیفہؒ کا تشدد

ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں ابو حنیفہ کے پاس جا کر مسائل جہاد کے متعلق سوالات کیا کرتا تھا ایک دن میں نے ایک مسئلہ پوچھا۔ ابو حنیفہؒ نے اس کا جواب دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اس بارہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد تو اس طرح ہے۔ ابو حنیفہؒ نے کہا "ہمیں اس سے معاف رکھو"۔ ایسے ہی ایک اور دن میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا جس کا انھوں نے جواب دیا میں نے پھر کہا کہ اس بارہ میں رسول اللہ صلعم سے تو ایسا ایسا منقول ہے۔ تو ابو حنیفہؒ نے کہا "اسے لیجا کر خنزیر کی دم پر رگڑ دو"[1]۔ ابو اسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں نے بادشاہِ وقت کے خلاف خروج (بغاوت) کے ناجائز ہونے پر ابو حنیفہؒ کے سامنے ایک حدیث بیان کی تو ابو حنیفہؒ کہنے لگے کہ یہ حدیث، خرافات میں سے ہے۔ علی ابن عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے ابو حنیفہؒ کو رسول اللہ صلعم کی حدیث سنائی تو ابو حنیفہ نے کہا کہ میں اسے قبول (تسلیم) نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے، ابو حنیفہؒ نے پھر کہا۔ ہاں ہاں میں اس کو قبول نہیں کرتا۔ (خطیب ج۱۳ ص۳۸۷)۔

بشر بن المفضل کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ سے بیان کیا کہ نافعؒ ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی صلعم نے ارشاد فرمایا۔ بائع اور مشتری (فروخت کنندہ اور خریدار) جب تک جدا نہ ہو جائیں انھیں فسخ بیع کا اختیار رہتا ہے۔ ابو حنیفہؒ نے کہا یہ تو محض ایک رجز (جنگی گیت) ہے۔ میں نے کہا کہ قتادہؒ حضرت انسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا تو رسول اللہ صلعم نے بھی اس یہودی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا۔ ابو حنیفہؒ نے کہا کہ یہ محض بکواس (ہذیان) ہے۔ عبدالصمد اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے سامنے رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا (افطر الحاجم والمحجوم) سینگی لگوانے والے اور لگانے والے، دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ابو حنیفہؒ نے کہا یہ محض قافیہ بندی ہے۔ ایسے ہی ان کے سامنے ولاء کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا گیا تو ابو حنیفہؒ نے کہا یہ کسی شیطان کا قول ہے۔ عبدالوارث نے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ یحییٰ ابن آدم کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے "وضوء آدھا ایمان ہے"۔ ابو حنیفہؒ کہنے لگے پھر تو دو مرتبہ وضو کر ڈالو تا کہ تمہارا ایمان مکمل ہو جائے۔ اسی طرح ابو حنیفہؒ کے سامنے یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ "لا ادری" (میں نہیں جانتا) کہدینا بھی آدھا علم ہے"۔ ابو حنیفہؒ کہنے لگے کہ "بس پھر تو دو مرتبہ لا ادری کہدینا چاہیئے تا کہ علم مکمل ہو جائے۔

[1] امام اعظمؒ کے اصل عربی الفاظ یہ ہیں فقال حك هذا بذنب خنزير (خطیب ج۱۳ ص۳۸۷ سطر۱۲)

یہ احکام گذر چکے اور ختم ہو چکے

بشر ابن السری کہتے ہیں کہ میں ابو عوانہ کے پاس گیا اور میں نے ان سے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ کے پاس ابو حنیفہؒ کی کوئی کتاب ہے۔ ذرا اسے نکال دیجئے (میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں) ابو عوانہ کہنے لگے بیٹا! تم نے خوب یاد دلایا۔ چنانچہ وہ ایک صندوق کی طرف اٹھکر گئے اور ایک کتاب نکالی اور ریزہ ریزہ کرکے اسے پھینکدی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ کہنے لگے "میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ ——— اس نے کہا امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرالیا ہے۔ اس کے بارہ میں کیا حکم ہے؟ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا "تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ مجھ سے یحییٰ بن سعید (قطان) نے بیان کیا ہے، انھوں نے محمد بن حبان سے، انھوں نے رافع بن خدیج سے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچئے ورنہ امیر کے ہاں اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا" یہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا" چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ ایسے آدمی کی کوئی کتاب میرے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۰-۹۱)

عقیقہ کرنا جاہلیت کے اعمال میں سے ہے

ابو بکر اثرم کہتے ہیں کہ ابو عبد اللہ احمد بن حنبلؒ نے ہمارے سامنے عقیقہ کے باب میں رسول اللہ صلعم کی بہت سی حدیثیں، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بیان کئے۔ پھر بطور تعجب کے مسکراتے ہوئے فرمانے لگے "مگر ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ یہ جاہلیت کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔ محمد بن یوسف بیکندی کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ نکاح سے پہلے بھی طلاق دی جاسکتی ہے۔ امام احمد کہنے لگے مسکین ابو حنیفہ، گویا وہ عراق میں تھے ہی نہیں، گویا انھیں علم سے کچھ مس تھا ہی نہیں، اس باب میں رسول اللہ صلعم، صحابہ اور تیس کے قریب کبار تابعین، سعید بن جبیر۔ سعید بن المسیب، عطار، طاؤس اور عکرمہ وغیرہ کے ارشادات اور اقوال موجود ہیں کہ نکاح سے پہلے طلاق نہیں پڑ سکتی۔ ابو حنیفہؒ ایسا کہنے کی جرأت کیونکر کرتے ہیں کہ طلاق پڑ جاتی ہے۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۱)

آپ نے دیکھا کہ حدیث کے متعلق فقہ اسلامی کے سب سے بڑے امام کا مسلک کیا ہے۔ ان کی مدوّن فرمودہ یا ان کی طرف منسوب کردہ فقہ مسلمانوں کی اکثریت میں رائج ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نہ تو امام اعظمؒ کو منکرِ حدیث کہا جاتا ہے اور نہ ہی حنفی مسلمانوں کو حالانکہ جس تشدد سے انکارِ حدیث امام ابو حنیفہؒ کے ہاں پایا جاتا ہے کسی "منکرِ حدیث" کے ہاں کم ہی ایسا پایا جاتا ہوگا۔ کم از کم طلوعِ اسلام میں ایسا تشدد آپ کو کبھی نظر نہیں آئیگا۔ لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث قرار دیکر کافر ٹھہرا دیا جاتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ ایسا کہنے والے خود اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں اور فقہ حنفی کو بطور قانونِ مملکت پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ لوگ عوام کی جہالت سے کسقدر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر میں رسول اللہؐ کے عہد میں ہوتا تو آپ بھی میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے

امام اعظمؒ نے اپنے اس مسلک کی تائید میں دلائل میں بھی پیش کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ تعیین جزئیات (تدوینِ فقہ) میں

صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی تھی اسے اختیار فرما لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہوتا تو میں بھی اس مجلس مشاورت میں شریک ہوتا اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے چنانچہ

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سُنا کہ امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے اور ابو اسحٰق کو میں نے کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبی صلعم کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کیا کرتے۔ (تاریخ خطیب ج ۱۳ ص۳۸۷)

یوسف بن اسباط سے ابوصالح الفرا نے بھی اسی قول کو نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانہ میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (ایضاً ج ۱۳ ص۳۹۰)

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی طلوع اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ مرکز ملت نمائندگان امت کے مشورہ سے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو فیصلے کرے وہ شریعت اسلامی کہلاتے ہیں اور یہ فیصلے زمانے کے حالات کے ساتھ ساتھ قابل تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ جناب امام ابوحنیفہؒ اس عقیدہ کو رکھتے ہوئے متبع سنت قرار پائیں اور طلوع اسلام کو اسی عقیدہ کی بنا پر کافر ٹھہرا دیا جائے۔

جس چیز کا مدار نقل در نقل روایت پر ہو وہ دین نہیں بن سکتی

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ طلوع اسلام اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس آسمان کے نیچے یقینی چیز اللہ کی کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اس نے خود لے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کی حیثیت تاریخ کی ہے۔ اور تاریخ یقینی نہیں بلکہ ظنی چیز ہوتی ہے۔ تاریخی امور میں اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور انکار بھی۔ اس اختلاف و انکار سے نہ دین پر حرف آتا ہے اور نہ ایسا کرنے والا کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس باب میں امام ابوحنیفہؒ کا کیا مسلک ہے "کعبہ" مکۂ مکرمہ میں ہے اور محمد رسول اللہ صلعم کا مزار مقدس مدینۂ منورہ میں واقع ہے۔ کیا کسی مسلمان کو بھی اس میں شبہ ہو سکتا ہے؟ حضور اکرم صلعم کے عہد سعادت مہد سے لیکر آج تک اس تسلسل اور تواتر کے ساتھ یہ دونوں باتیں نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں کہ شاید ہی کوئی چیز نقل ہوئی ہو مگر بایں ہمہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا مدار نقل در نقل روایات پر ہے۔ سنئے اس کے متعلق امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد کیا ہے:۔

حمزہ بن حارث بن عمیر اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے مسجد حرام میں ایک آدمی کو سنا جو امام ابوحنیفہؒ سے ایک شخص کے متعلق سوال کر رہا تھا جو یوں کہتا ہے کہ میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ کعبہ حق ہے مگر میں یہ نہیں جانتا کہ آیا کعبہ وہی ہے جو مکہ میں ہے یا کوئی اور ہے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ یہ شخص سچا مومن ہے۔ پھر اسی آدمی نے ایک ایسے شخص کے متعلق سوال کیا جو یوں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن عبداللہ، اللہ کے نبی ہیں مگر میں یہ نہیں جانتا کہ آیا یہ وہی ہیں جن کی قبر مدینہ میں ہے یا کوئی اور

ہیں تو امام ابو حنیفہؒ نے کہا یہ شخص بھی سچا مؤمن ہے۔ حمیدی کہتے ہیں لیکن جو شخص ایسے کہتا ہے ہمارے نزدیک وہ کافر ہو جاتا ہے۔ (خطیب ج ۱۳ صفحہ ۳۷۰-۱)

محمد بن محمد باغندی کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا کہ میں عبداللہ بن الزبیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس امام احمد بن حنبلؒ کا خط آیا کہ مجھے امام ابو حنیفہؒ کا کوئی شنیع ترین قول لکھ کر بھیجو۔ تو عبداللہ ابن الزبیر نے حارث بن عمیر کی روایت سے یہ مسئلہ لکھ کر بھیجا کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ کا ایک گھر ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ مکہ میں ہے یا کہیں اور ہے۔ تو کیا یہ شخص مومن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا "ہاں مومن ہے"۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص یوں کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ نبی صلعم کا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ مدینہ میں دفن کئے گئے ہیں یا کہیں اور۔ تو کیا ایسا شخص مومن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا "ہاں مومن ہے"۔ (خطیب ج ۱۳ صفحہ ۳۷۱)

دوسرے مقام پر ہے:-

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ ہم سے عباد بن کثیر نے بیان کیا کہ میں نے ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ ایک آدمی ہے جو یوں کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ کعبہ حق ہے اور وہ اللہ کا گھر ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ مکہ میں ہے یا خراسان میں ہے۔ کیا یہ شخص مومن ہے؟ امام ابو حنیفہؒ نے کہا "ہاں مومن ہے"۔ پھر میں نے پوچھا ایسے آدمی کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں جو یوں کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ محمد صلعم اللہ کے رسول ہیں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ وہی ہیں جو مدینہ میں تھے اور قریش کے خاندان سے تھے یا کوئی دوسرے محمد ہیں۔ تو کیا یہ شخص مومن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ ہاں مومن ہے۔ مؤمل کہتے ہیں کہ یہ قول نقل کرنے کے بعد سفیانؒ نے کہا۔ اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص اس بات میں شک کرے وہ کافر ہے (ایضاً ج ۱۳ صفحہ ۳۷۲)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ اور دین کا فرق کس قدر نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں امام اعظمؒ کی بالغ نظری، جزرسی اور حقائق شناسی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ حدیث کی دینی حیثیت کے متعلق صحابہؓ کا کیا مسلک تھا اور اس باب میں امام ابو حنیفہؒ نے کس طرح اس مسلک کی اتباع کی۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں اس زمانہ تک کوئی ایسا گروہ نمایاں طور پر سامنے نہیں آتا جو اس مسلک کے خلاف کسی دوسرے مسلک کا حامل ہو اور حدیث کو قرآنی احکام کی طرح غیر متبدل مانتا ہو۔ جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے، اس مسلک کے سب سے

ہر صحیح حدیث کا واجب التعمیل اور ناقابل تبدیل ہونا امام شافعیؒ کا مذہب ہے

پہلے اور بڑے داعی امام شافعیؒ ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حدیث قرآن کی تکمیل کرتی ہے اور اسی لئے قرآنی احکام کی طرح واجب الاتباع ہے۔ امام شافعیؒ سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے (یعنی اسی سال جب امام اعظمؒ کی وفات ہوئی) اور انہوں نے سنہ ۲۰۴ھ میں مصر میں وفات پائی۔ یہ خاندانِ عباسیہ کی عظمت کا دور تھا چنانچہ امام موصوف نے ہارون الرشید، امین اور مامون الرشید کا زمانہ پایا۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ امت میں دو گروہ سامنے آتے ہیں۔ ایک وہ جو صحابہؓ اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا پابند تھا

نی جو احادیث کو غیر متبدل نہیں مانتا تھا اور دوسرا گروہ جو امام شافعیؒ کے مسلک کا پابند تھا اور حدیث کو ہمیشہ کے لئے واجب الاتباع بال کرتا تھا۔ اب اول الذکر گروہ کو (جو ابتک صرف مسلمان کے لقب سے ملقب تھا) اصحاب الرائے کے نام سے مشہور کیا گیا اور دوسرا روہ اصحاب الحدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ امام شافعیؒ نے پہلے گروہ کے مسلک کی تردید اور اپنے مسلک کی تائید میں بہت کچھ لکھا اور ہ اپنے مخالفین کے ساتھ مناظرے بھی کرتے رہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب "الام" کے ساتویں حصہ میں ایک باب باندھا ہے جس کا نوان ہے۔

"اس جماعت کے اقوال بیان کرنے کا باب جس نے حدیثوں کو رد کر دیا"

ن کے بعد انھوں نے اس جماعت کے مسلک اور ان کے استدلال کو انہی میں سے ایک شخص کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:-

نکارِ حدیث کے متعلق متکلمین راصحاب الرائے کے دلائل

"تم عربی ہو اور قرآن ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا ہے جن میں تم خود ہو اور تم کو وہ خوب یاد ہے اور اس میں خداوند تعالیٰ نے اپنے چند فرائض نازل کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص جس پر قرآن مشتبہ ہو گیا ہو اس کے ایک حرف میں بھی شک کرے تو تم اس سے توبہ کا مطالبہ کروگے اور اگر اس نے توبہ کر لی تو بہتر ہے ورنہ تم اس کو قتل کر دوگے۔ قرآن مجید کے بارہ میں خود خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے "تبیانا لکل شئ" یعنی وہ ہر چیز کی وضاحت کر ایسی حالت میں تمہارے یا اور کسی شخص کے نزدیک یہ کیونکر جائز ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جس چیز کو فرض کر دیا اس کی نسبت کبھی یہ کہے کہ یہ فرض عام ہے۔ کبھی یہ کہ وہ خاص ہے، کبھی یہ کہ اس امر میں فرضیت ہے اور اس امر میں استحباب ہے اور اس قسم کے فرق اور بھی بہت سے ہیں۔

تمہارے پاس ایک حدیث یا دو حدیث یا تین حدیثیں ہوتی ہیں جن کو تم ایک آدمی سے پھر دوسرے سے پھر تیسرے سے روایت کرکے رسول اللہ صلعم تک پہنچاتے ہو اور میں نے تم کو اور تمہارے ہم مذہب لوگوں کو پایا ہے کہ تم نے جس سے ملاقات کی اور حفظ و صداقت میں اس کو مقدم سمجھا اور تمہارے ملنے والوں میں سے خود جس سے ملا تم ان میں سے کسی کو حدیث میں غلطی اور بھول چوک سے بری نہیں کرتے بلکہ میں نے تم کو ان میں سے متعدد اشخاص کی نسبت یہ کہتے ہوئے پایا ہے کہ فلاں نے اس حدیث میں اور فلاں نے اس حدیث میں غلطی کی۔ اور میں نے تم کو یہ کہتے ہوئے پایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی حدیث کی نسبت جس کے ذریعہ سے تم نے کسی چیز کو حلال و حرام بتایا ہے (انکار کر دے، اور) کہے کہ یہ علم خاصہ سے ہے، رسول اللہ صلعم نے اس کو نہیں فرمایا ہے۔ صرف تم نے یا اس شخص نے غلطی کی ہے جس نے تم سے اس حدیث کو بیان کیا اور (یوں کہے کہ) تم نے جھوٹ کہا ہے، یا اس شخص نے (جھوٹ کہا ہے) جس نے تم سے اس حدیث کی روایت کی ہے تو تم اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کرتے اور اس سے زیادہ اس کو نہیں کہتے کہ "تم نے کس قدر برا کہا" تو کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کے احکام اور اس کے ظاہر میں ایسے شخص کے نزدیک تفریق کرے جس نے اسکو ایسے شخص سے سنا ہے جس کی حالت وہ ہے جس کو تم نے بیان کیا ہے۔ اور ان کی احادیث کو تم کتاب اللہ کے قائم مقام قرار دیتے ہو اور ان سے حلال و حرام کرنے میں مدد لیتے ہو لیکن جب تم نے ان کی

احادیث کو قبول کر لیا اور ان میں ایسے لوگ ہیں جن کی احادیث کو قبول کرنے کی نسبت تمہارا معاملہ وہ ہے جس کو میں نے بیان کیا اور جس شخص نے ان کو رد کر دیا ان کی نسبت تمہاری کیا حجت ہے؟ میں ان احادیث میں سے کسی کو قبول نہیں کرتا جبکہ ان میں وہم کا امکان ہے اور میں صرف اس کو قبول کرتا ہوں جس کے ذریعہ سے خدا پر گواہی دوں، جیسا کہ اس کی کتاب پر گواہی دیتا ہوں جس کے ایک حرف میں بھی کسی کو شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ ایک چیز کو حاوی قرار دیا جائے اور وہ اسکی سزاوار نہ ہو۔ (تاریخ فقہ اسلامی صفحہ ۲۵۸-۶۰)

فتنۂ خلق قرآن نے کیونکر پانسہ پلٹ دیا

ممکن ہے کہ اس نئے گروہ کا مسلک (جس کے موجد امام شافعیؒ تھے) محض نظری مباحث تک ہی محدود رہتا لیکن بدقسمتی سے ماضی قریب میں ایک ایسا سیاسی فتنہ اٹھ کھڑا ہوا جو عرصۂ دراز تک قائم رہا اور جس نے اس نزاع میں فریقین کا پانسہ پلٹ دیا اور اس کے بعد امت قرآن اور عقل دونوں کی برکتوں سے محروم ہو گئی۔ اس زمانہ میں ایک خالص نظری مسئلہ پیدا ہوا کہ کلام اللہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ ظاہر ہے کہ یہ خالص علم کلام کا مسئلہ تھا جو نظری بحث ہی کا موضوع بن سکتا تھا۔ لیکن چونکہ یہی مسئلہ امت کے فکر و عمل میں ایک بہت بڑے انقلاب کا موجب بن گیا اس لئے ضروری ہے کہ آپ اس کی تدریجی تاریخ کو سامنے لے آئیں۔

خونِ ناحق کی ندیاں

تاریخ کے اوراق سے پوچھئے کہ اس ایک سوال نے خونِ ناحق کی کس قدر ندیاں بہا دیں؟ دوسری صدی ہجری میں جعد بن درہم نے قرآن کے مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کی پیروی میں جہم بن صفوان نے اس کا اعلان کیا۔ کچھ علماء نے اس قول کو اسلام کے خلاف قرار دیا اور اس عقیدہ کے حاملین کو مرتد ٹھہرا دیا۔

امام ابو حنیفہؒ خلق قرآن کے قائل تھے

عقیدۂ خلق قرآن کے مؤیدین وہی لوگ تھے جو دین میں قرآن اور اجتہاد کے پابند تھے۔ ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ بھی ان ہی کے ہم نوا تھے بلکہ بعض شہادات سے تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی یہ کہا قرآن مخلوق ہے چنانچہ امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ

اول من قال ان القرآن مخلوق ابو حنیفۃ

سب سے پہلے جس شخص نے یہ اعلان کیا کہ قرآن مخلوق ہے وہ امام ابو حنیفہؒ ہیں۔

اس کی تائید بہت سی دوسری شہادات سے بھی ہوتی ہے جن کا تفصیلی ذکر خطیب نے اپنی تاریخ جلد ۱۳ صفحہ ۳۷۹-۳۸۰ میں کیا ہے۔

یہ حضرات اپنے خیال کی تائید میں قرآن اور عقلی دلائل پیش کرتے تھے فریق مخالف کے نزدیک اس کا توڑ یہی ہو سکتا تھا کہ لوگوں میں یہ مشہور کیا جائے کہ خود رسول اللہ صلعم قرآن کو غیر مخلوق مانتے تھے اور اس طرح لوگوں کے جذبات کو ابھار کر فریق مخالف کو شکست دیدی جائے۔ چنانچہ اس مضمون کی متعدد حدیثیں کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق مختلف پیرایوں میں رسول اللہ صلعم سے روایت کی گئیں اور لوگوں میں پھیلائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حدیثیں قطعاً وضعی تھیں اسلئے کہ خلق اور قدم قرآن کا مسئلہ خالص علم کلام کا مسئلہ ہے

اور رسول اللہ صلعم کے زمانے میں عقائد پر علم کلام کی رو سے بحث ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ مسلمانوں میں علم کلام بہت بعد میں آیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے زور پر ان لوگوں نے عوام میں اپنے آپ کو اس قدر مقبول ضرور بنا لیا تھا کہ رائے عامہ کے دباؤ سے وہ حکومت کو بھی متأثر کر سکتے تھے اور اپنے مخالفین کو بھی جا و بیجا طور پر مرعوب کر سکتے تھے۔ سلطنت کے مصالح کچھ اس قسم کے تھے کہ اس نے بھی اس گروہ کی مخالفت اور دوسرے گروہ کی ہمنوائی کی چنانچہ خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق نے جعد کو عید الاضحیٰ کے دن بطور قربانی کے ذبح کیا اور جہم کو سلمہ بن احوز نے مرو میں قتل کر ڈالا۔ اس طرح قتل و غارت

امام ابوحنیفہؒ کو بار بار توبہ کرنا پڑی

کا وہ بازار گرم کیا کہ امام ابوحنیفہؒ جیسے صاف گو اور جری شخص کو بھی دو تین مرتبہ اس خیال سے توبہ کرنا پڑی۔ چنانچہ خطیب نے اپنی تاریخ میں یحییٰ ابن حمزہ، سعید بن عبدالعزیز، یزید ابن زریع، سفیان ثوری، عبداللہ ابن ادریس اور اسد بن موسیٰ کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ امام صاحب نے دو مرتبہ اس عقیدہ سے توبہ فرمائی اور سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ تین مرتبہ توبہ فرمائی حتیٰ کہ ان لوگوں کے نام بھی نقل کئے ہیں جنھوں نے امام صاحب کو توبہ کرائی تھی۔ اس سلسلہ میں خالد بن عبداللہ قسری والیٔ عراق۔ یوسف بن عمر اور شریک بن عبداللہ قاضیٔ کوفہ کے نام نقل کئے گئے ہیں۔ (خطیب ص ۳۸۰-۸۳) اس مذہبی جنون و استبداد کی تفصیلات سے ہماری تاریخ کے صفحات آج تک رنگین ہیں۔

انقلاب رنگین

مامون الرشید کے عہد میں حالات نے پلٹا کھایا اور وہ خود اور اس کے درباری قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہو گئے۔ اب دوسرے گروہ پر جن کا لقب اب اصحاب الحدیث قرار پا گیا تھا کفر کے فتوے لگنا شروع ہوئے اور وہ جرم ارتداد کی سزا میں قتل ہونے لگے۔ اکثر علماء نے مجبوراً قرآن کو مخلوق کہہ کر اپنی جانیں بچائیں۔ لیکن اکثر اپنے عقیدہ پر قائم رہ کر سخت ترین اذیتیں جھیلتے اور موت کے گھاٹ اترتے رہے۔ انہی میں امام احمد بن حنبلؒ جیسی شخصیت بھی تھی۔ امام صاحب کو جس طرح قید و بند کے عذاب میں مبتلا رکھا گیا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ انھیں دربار میں بلا کر کوڑوں سے پٹوایا جاتا تھا اور جب وہ بیہوش ہو جاتے تو پھر قید خانہ میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ایک دن، دو دن نہیں بلکہ پورے اڑھائی سال تک جاری رہا۔ معتصم (مامون الرشید کا جانشین) ان سب لوگوں کو قتل کر دیا کرتا تھا جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے معتصم کے جانشین واثق نے بھی خون کی ان ندیوں میں اضافہ کیا حتیٰ کہ احمد بن نصر کو اسی عقیدے کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے قتل کر کے "ثواب عظیم" کا مستحق بنا۔ احمد کے جسم کو سامرا میں سولی پر چڑھایا گیا اور اس کے سر کو بغداد بھیجا گیا۔ کان میں ایک رقعہ لٹکایا گیا جس میں لکھا تھا:

> یہ احمد بن نصر مشرک اور گمراہ کا سر ہے جس کو امیر المومنین نے بغرض تقرب الٰہی اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔

پھر دوسرا انقلاب

جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے تمام صوبوں میں حکم بھیجا کہ کوئی شخص آئندہ قرآن کو مخلوق نہ کہے اس سے پھر پلڑا ایکبارگی محدثین کی طرف جھک گیا۔ اب محدثین نے متکلمین اور اصحاب الرائے سے انتقام لینا شروع کیا۔ متوکل نے محدثین کی مدارات کے لئے انھیں سامرا میں بلا کر انعامات دیئے۔ جب سلطنت کی طرف سے بھی اس قسم کی

سرپرستی ہوئی تو عوام میں پھر ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی چنانچہ ان لوگوں نے ایک طرف متوکل کی اس قدر تعریف کی کہ اس بدتدبیر اور عیاش بادشاہ کو جس کے محل میں بقول ابوبکر خوارزمی بارہ ہزار حرم تھیں خلفائے راشدین کے ہم رتبہ قرار دیا اور دوسری طرف

متکلمین اور اصحاب الرائے کو بالکلیہ ختم کردیا گیا اور امت قرآن وبصیرت سے محروم ہوگئی

احتساب کو اپنے ہاتھ میں لیکر متکلمین اور اصحاب الرائے کا تعاقب شروع کردیا اور جوش انتقام میں وہ مظالم روا رکھے گئے کہ چاند اور سورج کی آنکھ جن سے شرما جائے مختصر یہ کہ چن چن کر متکلمین اور اصحاب الرائے کے سربرآوردہ حضرات کو قتل کیا گیا اور یہ سیلاب اس زور سے اُمڈا کہ ان غریبوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا کہ وہ اپنی جماعتی حیثیت کو ختم کرکے اپنے آپکو محدثین میں جذب کردیں اس طرح قرآن واجتہاد کا وہ مسلک جو صحابہ کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور جسے امام ابوحنیفہ ؒ کے مجتہدانہ تفقہ نے اسقدر بلند کردیا تھا خالص روایت پرستی میں تبدیل ہوگیا اور اس طرح امت عقل وبصیرت اور قرآن دونوں ہی سے محروم ہوگئی۔ عباسی حکومت کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ علمی سردبازاری بھی شروع

اصحاب الرائے شافعی بن گئے

ہوچکی تھی اس لئے علمائے حنفیہ میں پھر کسی کو یہ جراءت نہ ہوئی کہ امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کو علانیہ پیش کرسکے۔ شکست خوردگی کا یہ عالم ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی حنفیت کے بقاء کیلئے شافعیت کے اصول میں پناہ لی اور اصولِ شافعیت کے مطابق فریق مقابل کی احادیث کو بلاوجہ ضعیف قرار دینے اور اپنے مسلک کے لئے موید حدیثوں کو صحیح قرار دینے پر سارا زور صرف کرڈالا حتی کہ بعض اوقات ضعیف اور موضوع روایتوں کے آسرے اپنے مذہب کو روایات ہی سے ثابت کرنے کی کوشش شروع کردی۔ چنانچہ علامہ محمد الخضری اسکی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> لیکن جب شراح، حامیان اور نکتہ چینانِ مذاہب کا گروہ پیدا ہوا تو انھوں نے ان اصول کی طرف جن کو ان کے ائمہ نے اختیار کیا تھا توجہ نہیں کی اور اپنے مخالفین پر ہر صحیح السند حدیث کی مخالفت کا گو وہ ان کی شرائط کی جامع نہ ہو جن کو اس شخص نے شرط قرار دیا ہے جس پر وہ نکتہ چینی کررہے ہیں الزام دینے لگے۔ اسی طرح وہ لوگ ہر حدیث کو جس کو ان کے امام نے قبول نہیں کیا اس کی سند پر نکتہ چینی کرکے یا اور کسی دوسرے ماخذ کے ذریعہ سے ضعیف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کہدینا آسان تھا کہ امام نے اس حدیث کو اس لئے قبول نہیں کیا کہ حدیث پر عمل کرنے کیلئے جس شرط کو اس نے اپنا اصول قرار دیا ہے وہ اس حدیث میں موجود نہ تھی۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۲۷۵)

خلق قرآن کا مسئلہ تو ختم ہوگیا مگر اس کے زیر سایہ حدیث کے اقرار وانکار نے اپنی مستقل حیثیت پیدا کرلی۔ اب چونکہ محدثین کو بڑی تقویت حاصل ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے امام ابوحنیفہ ؒ کو منکر حدیث قرار دیکر انھیں طرح طرح سے مطعون کرنا شروع کردیا۔ یہ پروپیگنڈا اس شدومد اور اس انداز سے کیا گیا کہ اصحاب الرائے کا مذہب شاید خالص الحاد اور زندقہ کا مسلک تھا۔ آپ ملاحظہ کیجئے کہ اس عہد کے مُلّا نے امام ابوحنیفہ ؒ کے خلاف بعینہ وہی کچھ کہا جو آج طلوع اسلام کے خلاف کہا جارہا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ پر محدثین کا طعن و تشنیع

امام مالک بن انسؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کا فتنہ اس امت کیلئے ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں ہے۔ دونوں باتوں میں عقیدۂ ارجاء میں بھی اور احادیث رد کرنے میں بھی۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھتا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۶) سلیمان بن حسان حلبی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ امام اوزاعی کو کہتے سنا ہے کہ ابوحنیفہ

امام ابوحنیفہؒ اسلام کے ایک ایک دستہ کو گن گن کر توڑ رہے تھے

نے اسلام کے ایک ایک دستہ کو گن گن کر توڑا ہے۔ ایسے ہی جب امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا خدا کا شکر ہے وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں سفیان ثوری کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ امام ابوحنیفہ کے انتقال کی خبر آئی تو سفیانؒ نے کہا خدا کا شکر ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اس سے نجات دی۔ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعی دونوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ اسلام میں ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت ترین پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ کہا ہے۔ قیس بن الربیع سے ابوحنیفہؒ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ماضی (روایات آثار) کا جاہل ترین اور مستقبل (استنباط احکام) کا عالم ترین شخص ہے (ایضاً ج ۱۳ ص ۳۹۸)

امام ابوحنیفہؒ کی مخالفت ہی حق ہے

عمرو بن قیس کا قول ہے کہ جو شخص حق کو معلوم کرنا چاہے اسے کوفہ جا کر ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے قول کو دیکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ان اقوال کے خلاف کرنا چاہیئے (کیونکہ وہی حق ہے) عمار بن زریق کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی مخالفت کرو، تم حق کو پالوگے۔ بشری کہتے ہیں کہ تم اگر ابوحنیفہ کی مخالفت کروگے تو حق کو پالوگے۔ ابن عمار کہتے ہیں کہ جب تمہیں کسی بات میں شک ہو تو دیکھ لو کہ ابوحنیفہؒ نے کیا کہا ہے بس اس کی مخالفت کرو کہ حق وہی ہوگا، یا یوں کہا کہ اسکی مخالفت ہی میں برکت ہے۔ (ایضاً ج ۱۳ ص ۴۰۸)

مسجد میں امام ابوحنیفہ کا نام لینا جرم تھا

ابوعبید کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ اس بارہ میں ابوحنیفہ ایسا ایسا کہتے ہیں تو اسود نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور مسجد میں ابوحنیفہ کا نام لے دینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک پھر مجھ سے کلام نہیں کیا۔ (ایضاً ج ۱۳ ص ۴۰۹)

سفیانؒ نے ہشام بن عروہ سے انھوں نے اپنے والد سے یہ حدیث نقل کی کہ بنی اسرائیل کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ ان میں لونڈی بچوں کا غلبہ ہوگیا جنھوں نے دین میں رائے کو دخل دیا۔ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کردیا۔ اس کے بعد سفیانؒ نے کہا کہ اسلام میں بھی لوگوں کا معاملہ اعتدال پر قائم تھا حتیٰ کہ اسے ابوحنیفہؒ نے کوفہ میں، عثمان بتی نے بصرہ میں اور ربیعہ ابن ابی عبدالرحمٰن نے مدینہ میں بدل ڈالا۔ ہم نے غور کیا تو ان سب کو ہم نے لونڈی بچے ہی پایا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۹۴)

فقہ حنفی دجّالوں کا کلام ہے

حمدویہ بن مخلد کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ مدنی سے پوچھا گیا "کیا وجہ ہے کہ ابوحنیفہؒ کی رائے سارے شہروں میں گھس گئی ہے مگر مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہوسکی؟" محمد بن مسلمہ نے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ مدینہ منورہ کی ہر گلی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو مدینہ میں دجال کو داخل ہونے سے روکے گا۔ اور یہ بھی چونکہ دجّالوں ہی کا کلام ہے اسلئے وہاں داخل نہیں ہوسکا۔ (الف ج ۱۳ ص ۳۹۶)

امام ابوحنیفہؒ حدیث میں یتیم اور گونگے تھے

ابن اسحق ترمذی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن المبارک نے کہا ابوحنیفہ حدیث میں بالکل یتیم تھے۔ سریج بن یونس نے ابوقطن سے نقل کیا ہے کہ اگرچہ ابوحنیفہؒ نے ہم سے حدیث بیان کی ہے مگر وہ حدیث میں گونگے تھے۔ ابن نمیر کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو اس پر متفق پایا ہے کہ وہ رائے تو رائے ابوحنیفہؒ کی حدیث پر بھی اعتماد نہیں کرتے تھے۔ حجاج بن ارطاۃ کہتے ہیں کہ "ابوحنیفہؒ کون تھا؟ ابوحنیفہؒ کی بات کون قبول کرتا ہے؟ ابوحنیفہؒ تھا ہی کیا؟"۔ علی ابن المدینی کہتے ہیں کہ یحییٰ ابن سعید قطان کے سامنے ابوحنیفہ کا ذکر آگیا اور ان سے ابوحنیفہؒ کی حدیث کے متعلق سوال کیا گیا تو یحییٰ نے کہا "وہ حدیث والے تھے ہی کب؟" محمد بن حماد مقری کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معین سے ابوحنیفہ کے متعلق سوال کیا تو یحییٰ نے کہا "ان کے پاس حدیثیں تھی ہی کتنی کہ تم ان کے متعلق پوچھتے ہو؟" ابوبکر ابن شاذان کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوبکر ابن ابی داؤد نے کہا کہ ابوحنیفہؒ نے کل ایک سو پچاس حدیثیں نقل کی ہیں۔ اس میں سے بھی آدھی حدیثوں میں غلطی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نہ ثقہ تھے نہ مامون

مؤمل کہتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ کے سامنے ابوحنیفہ کا ذکر آیا۔ سفیان ثوریؒ اس وقت حطیم کعبہ میں تھے (یعنی طواف کررہے تھے) سفیان نے کہا کہ ابوحنیفہ نہ ثقہ تھے نہ مامون تھے اور وہ اپنے ان الفاظ کو برابر دہراتے رہے تا آنکہ ان کا طواف ختم ہوگیا۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۵-۱۷)

مندرجہ بالا آراء کو سامنے رکھئے اور غور کیجئے کہ یہ کن لوگوں کی رائیں ہیں اور کس کے متعلق ہیں۔ ان میں کا ہر شخص علم حدیث اور علم رجال کا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان اساتین سنت کا یہ کچھ فیصلہ تو خود امام ابوحنیفہؒ کے متعلق تھا۔ اب دیکھئے کہ امام ابوحنیفہ رح کے دونوں اولوالعزم شاگرد (امین رشید) یعنی حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے متعلق یہ حضرات کیا رائے رکھتے ہیں۔ مگر آگے بڑھنے سے پہلے اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ فقہ حنفی میں خود امام ابوحنیفہؒ کی کوئی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ ان ہی دونوں حضرات صاحبین کی وساطت سے پہنچا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کے متعلق ائمۂ رجال کی رائے

عبدالرزاق بن عمر کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن المبارک کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے آکر عبداللہ بن المبارک سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ عبداللہ نے اس کو فتویٰ دیا۔ وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے یہی مسئلہ ابو یوسف سے بھی پوچھا تھا مگر انھوں نے آپ کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ عبداللہ ابن المبارک نے کہا "اگر تو نے ابو یوسف کے پیچھے کچھ نمازیں پڑھی ہوں جو تجھے یاد ہوں تو جا کر فوراً ان نمازوں کو دہرالو۔" (خطیب ج ۱۴ ص ۲۵۷)

ابو یوسف جھوٹے اور فاسق تھے

عبدہ بن عبداللہ خراسانی کہتے ہیں کہ کسی نے عبداللہ ابن المبارک سے پوچھا کہ ابو یوسف اور محمد میں زیادہ سچا کون ہے؟ عبداللہ ابن المبارک نے کہا یوں نہ کہو بلکہ یوں پوچھو کہ زیادہ جھوٹا کون ہے؟ اس آدمی نے کہا اچھا یوں ہی بتائیے۔ عبداللہ نے کہا کہ ابو یوسف! (ایضاً)

عبداللہ ابن ادریس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ ایک گمراہ اور گمراہ کن شخصیت تھے اور ابو یوسف فاسقوں میں سے ایک فاسق تھے (ایضاً)

امام ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ پر جھوٹ باندھے

محمد بن اسماعیل بخاریؒ (صاحب الصحیح) فرماتے ہیں کہ ہم سے نعمان (امام ابو حنیفہؒ) کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کو یعقوب (امام ابو یوسف) پر تعجب کیوں نہیں آتا۔ اس نے مجھ پر اسقدر جھوٹ باندھ دیئے ہیں جو میں نے کبھی نہیں کہے۔ (ایضاً ج ۱۳ ص۲۵۸)

ابو نعیم فضل بن دکین کہتے ہیں کہ میں نے خود ابوحنیفہؒ کو ابو یوسف سے یہ کہتے سنا ہے "تمہارا ستیاناس ہو، ان کتابوں میں تم لوگ مجھ پر کتنا جھوٹ باندھ رہے ہو جو میں نے کبھی نہیں کہا۔ (ایضاً)

ابن ابی شیبہ اور ابن الغلابی یحیی بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ ابو یوسف قاضی کو حدیث کی کوئی پہچان نہیں تھی تاہم وہ ثقہ تھے (ایضاً ص ۲۵۹)

احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے سب سے پہلے ابو یوسف ہی سے حدیثیں لکھی ہیں مگر میں ان کی حدیثیں بیان نہیں کرتا۔ نیز فرمایا کہ اگرچہ ابو یوسف سچے ہیں مگر ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں سے کسی سے بھی احادیث بیان نہیں کرنی چاہئیں۔

ابوالحسن (امام) دارقطنی سے ابو یوسف کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ محمد بن الحسن کی نسبت زیادہ قوی ہیں مگر اندھوں میں کانے ہیں۔ امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کہتے ہیں کہ یعقوب بن ابراہیم ابو یوسف قاضی کو محدثین نے ترک کردیا۔ (خطیب ج ۱۴ ص ۲۵۹-۲۶۰)

امام محمد بن الحسن کے متعلق ائمہ رجال کی رائے

امام احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ یعقوب ابو یوسف تو حدیث کے ساتھ موصوف تھے مگر ابوحنیفہ اور محمد بن الحسن دونوں احادیث نبوی کے مخالف تھے۔ ان دونوں کی رائے بڑی ہی خراب تھی یعنی ابوحنیفہ اور محمد بن الحسن کی۔ (خطیب ج ۲ ص ۱۷۹)

امام محمد کذاب تھے

یحیٰی بن معین سے محمد بن الحسن کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ "محمد بن الحسن کذاب ہے" ایسے ہی ایک مرتبہ یوں کہا کہ "ضعیف ہے"۔ کبھی فرمایا "وہ تو کچھ بھی نہیں ہے اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی

امام ابوداؤد سجستانی کہتے ہیں کہ محمد بن الحسن شیبانی کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ (ایضاً ج ۲ ص ۱۸۱)

امام ابوالحسن دارقطنی کہتے ہیں کہ محمد بن الحسن شیبانی صاحب ابوحنیفہؒ کو یحیی بن معین اور امام احمد بن حنبل نے کذاب کہا ہے مگر میرے نزدیک وہ بالکل ہی چھوڑ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ (ایضاً ج ۲ ص ۱۸۱)

امام محمد نے امام ابو یوسف پر جھوٹ باندھے

بشر بن الولید کہتے ہیں کہ ابو یوسفؒ نے کہا "ذرا اس کذاب یعنی محمد بن الحسن سے پوچھو کہ جو کچھ وہ مجھ سے نقل کرتا ہے وہ کبھی اس نے مجھ سے سنا بھی ہے؟ (ایضاً ج ۲ ص ۱۸۱)

یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ میرے سامنے محمد بن الحسن سے پوچھا گیا کہ کیا ان کتابوں کو جنھیں تم نقل کرتے ہو تم نے ابو یوسف سے سنا ہے؟ تو محمد نے جواب دیا کہ "نہیں، خدا کی قسم میں نے ان کو ابو یوسف سے نہیں سنا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ میں ان کتابوں کو سب لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں۔ اور میں نے تو ابو یوسف سے صرف جامع صغیر سنی ہے۔ (ایضاً)

حنفی کیونکر اہلحدیث بن گئے

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ حدیث کے معاملہ میں امام ابو حنیفہؒ کا کیا مسلک تھا اور اس مسلک کی بنا پر انھیں اور ان کے اصحاب کو روایت پرست حضرات کی بارگاہ سے کیا کیا القاب عطا ہوئے تھے۔ نیز یہ حقیقت بھی کہ ان کے مسلک کے پیرو حضرات کو کس طرح روایت پرست حضرات کے طوفانِ مخالفت اور مذہبی استبداد بلکہ جنون سے تنگ آ کر خود انہی کے سایہ میں پناہ لینی پڑی اور حنفی فقہ کی جزئیات کو خود مخالفین کے اصول کے مطابق کھینچ تان کر کے خواہ موضوع اور ضعیف روایات سے ہی کیوں نہ ہی مگر روایات ہی سے ثابت کرنا پڑا۔ ان کیلئے زبانی اہل حدیث بنے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا تھا ورنہ متکلمین کی طرح اصحاب الحدیث کے ہاتھوں ان لوگوں کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی جانوں یا اپنے مسلک سے ہاتھ دھو لینے پڑتے۔

فقہ حنفی کی مقبولیت

لیکن اس تمام طوفان بدتمیزی کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت کی اکثریت کا مسلک فقہ حنفی ہی کے مطابق رہا اور حنفی مسلمان اس وقت تک اہلحدیث سے الگ فرقہ کی حیثیت سے موجود چلے آتے ہیں اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ اکثریت میں ہیں اور اس فقہ کا اس وقت تک بھی ایسا اثر ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو سب سے بڑے متبع سنت اور مؤید حدیث قرار دیتے ہیں وہ بھی آج اس قسم کی کوشش کر رہے ہیں کہ ملک کا قانون فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہئے اور اہلحدیث کا گروہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لا سکتا —— کہیں تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا تو نہیں رہی — کہ اہل حدیث نے جو کچھ واثق باللہ کے زمانہ کے بعد حنفیوں کے ساتھ کیا تھا اب حنفیوں کی طرف سے اس کے جواب کا موقعہ آیا ہے؟ — ہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آج بھی یہ حقیقت ہر جاننے والے پر واضح ہے کہ اگرچہ اہلحدیث اور حنفی اپنے آپ اہلسنت والجماعت کہتے

حدیث کا زبانی اقرار مگر عملاً انکار

کہتے ہیں لیکن حدیث کے معاملہ میں احناف کا مسلک باوجود علماء حنفیہ کی مداہنت اور کم ہمتی کے اہل حدیث سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ احناف، حدیث کے معاملہ میں ظاہراً طور پر اپنی فقہ کے مؤسس امام اعظم ابو حنیفہ کے مسلک کے متبع نہیں رہے لیکن حدیث کو قبول کرنے کیلئے خود ان کی اصول کی کتابوں میں جو شرائط مذکور ہیں وہ اہل حدیث کی شرائط سے بالکل مختلف ہیں۔ فرق یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے حدیث کے رد میں اپنے مسلک کا کھلم کھلا اعلان کیا لیکن آج ان کے متبعین اگرچہ عملاً اپنی فقہ میں حدیث کو وہی حیثیت دیتے ہیں لیکن اپنی زبان سے وہ کچھ کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے جو امام ابو حنیفہؒ کہہ گئے ہیں۔ یہ زبان سے حدیث کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ جب حدیث پر عمل کرنے کا سوال سامنے آئے تو یا تو کوئی حدیث ان کی شرائط پر پوری ہی نہ اترے اور یا ضعیف اور موضوع حدیثوں کی آڑ لے لی جائے۔ یہ لوگ اس حربہ سے منکرین حدیث بننے کے الزام سے تو بچ جاتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ جس امام کی طرف یہ اپنے آپ کو منسوب

کرتے ہیں یہ روش ان کی روش کے کسقدر خلاف جاتی ہے۔ طلوع اسلام حرفاً حرفاً اس مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے جو درحقیقت امام
کا مسلک تھا لیکن جس مسلک کے علانیہ اقرار کی جرأت آج امام ابوحنیفہؒ کے متبعین اپنے اندر نہیں پاتے۔

صحیح حدیث کی قسمیں

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ صحیح حدیث کی چار قسمیں ہیں خبرِ واحد[1] جسکو روایت کرنے والا کسی زمانہ میں صرف ایک آدمی رہ جائے۔ خبرِ عزیز[2] جسے روایت کرنے والے کسی زمانہ میں صرف دو آدمی مل سکیں۔ خبرِ مشہور[3] نقل کرنے والے کسی زمانہ میں کم از کم تین آدمی رہ جائیں۔ خبرِ متواتر[4] جسے عام طور پر لوگ عام طور پر لوگوں سے روایت کریں اور وہ روایت کر اتنے کثیر التعداد ہوں کہ عقل ان کے جھوٹ بولنے پر اتفاق کرنے کو ممکن تصور نہ کرے۔

مجموعہ ہائے روایات زیادہ تر اخبارِ آحاد پر مشتمل ہیں

خبرِ متواتر کے متعلق محدثین میں خود اختلاف ہے کہ آیا اس کا وجود ہے بھی یا جو لوگ اس کے وجود کے مدعی ہیں وہ بھی اس کی تعداد ایک[1] یا دو[2]— زیادہ نہیں بتاتے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے انما الاعمال بالنیات والی روایت، اور کچھ لوگوں نے مسح علی الخفین کی روایت متعلق تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ اور بس۔ مشہور احادیث بھی گنتی کی ہیں زیادہ تر ہمارے مجموعہ ہائے روایات میں اخبارِ آحاد ہی ہیں۔

حنفیہ کے ہاں صرف متواتر حدیث ہی اصولاً قابلِ قبول ہے

حنفیہ کے ہاں حسب تصریح علمائے اصول صرف متواتر حدیث قابلِ قبول ہے۔ متواتر کے علاوہ اور کوئی حدیث قابلِ قبول نہیں ہے۔ علامہ محمد الخضری رقم طراز ہیں:-

> بعض لوگوں کا قول ہے کہ رسول اللہ صلعم سے کوئی روایت صرف اس صورت میں قبول کی جاسکتی ہے (۱) جبکہ اس کو عام طور پر لوگ عام طور پر لوگوں سے روایت کریں۔ اور (۲) فقہائے امصار متفقاً اس پر عامل ہوں۔ اور اس نے پہلی وجہ پر ایک تیسری وجہ کا ایک اضافہ اور یہ کیا ہے کہ (۳) جب رسول اللہ صلعم سے آپ کا کوئی صحابی آپ کے کسی فیصلہ کی روایت کرے اور کوئی دوسرا صحابی اس کی مخالفت نہ کرے تو ہم اس سے دو باتوں پر استدلال کرینگے۔ ایک تو یہ کہ اس نے صحابہ کی جماعت میں اس حدیث کی روایت کی۔ دوسری یہ کہ اسکی مخالف کسی دوسری حدیث سے انھوں نے اس لئے نہیں کی کہ وہ جانتے تھے کہ یہ حدیث ویسی ہی ہے جیسے کہ وہ روایت کرتا ہے۔ اسلئے وہ عام صحابہ کی حدیث قرار پائیگی۔
> فقہائے عراق یعنی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا رجحان اسی طریقہ کی طرف ہے۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۲۶۵)

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس رائے کا ماحصل اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ اس رائے کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلعم سے کوئی روایت صرف اسی صورت میں قبول کی جاسکتی ہے۔

(۱) جبکہ اسے عام طور پر لوگ عام طور پر لوگوں سے روایت کریں۔

(۲) فقہائے امصار متفقۃً اس پر عامل ہوں۔

(۳) جو صحابی اس کو بیان کر رہا ہو وہ صحابہ کے مجمع میں اس کو بیان کرے اور کوئی صحابی اس کی مخالفت نہ کرے حتیٰ کہ وہ عام صحابہ

کی حدیث قرار دی جاسکے۔

کیا حضرات علمائے حنفیہ تکلیف فرما کر بتائیں گے کہ ان شرائط کے مطابق ان کے مجموعہ ہائے روایات میں کتنی حدیثیں ہیں؟

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم پھر علامہ محمد الخضری کے اقتباس پر آتے ہیں اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"امام ابو یوسف ؒ نے سیر الاوزاعی ؒ کی تنقید میں جو کتاب لکھی ہے اور امام شافعی ؒ نے "کتاب الام" میں جس کی روایت کی ہے، اس کے باب "سوار اور پیادہ کے حصۂ مال غنیمت میں" اسی معنی کی توضیح کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "**تم صرف اس حدیث کو لو جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو**، اور شاذ حدیث کو (جسے صرف چند آدمی روایت کریں) چھوڑ دو۔ کیونکہ ہم سے ابن ابی کریمہ نے ابو جعفر سے اور انھوں نے رسول اللہ صلعم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ نے یہود کو بلایا اور انھوں نے آپ سے حدیث بیان کی یہانتک کہ حضرت عیسیٰ پر جھوٹ باندھا اس کے بعد رسول اللہ صلعم منبر پر چڑھ گئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا کہ **عنقریب مجھ سے حدیث پھیلے گی تو میری جو حدیث قرآن کے مطابق تم کو ملے وہ تو میری حدیث ہے لیکن جو قرآن کے مخالف ہو وہ میری حدیث نہیں**۔ مسعر بن کدام اور حسن بن عمارہ نے عمرو بن مرہ سے، انھوں نے بختری سے اور انھوں نے علی بن ابیطالب سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جب تمہارے پاس رسول اللہ صلعم کی حدیث آئے تو یہ خیال کرو کہ وہ بہت زیادہ ہدایت کرنے والی، بہت زیادہ صاف اور بہت زیادہ زندہ کرنیوالی ہے۔ اشعث بن سوار اور اسمٰعیل بن ابی خالد نے شعبی سے اور انھوں نے قرظہ ابن کعب انصاری ؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ہم انصار کے ایک گروہ میں کوفہ کی طرف چلا تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے پا پیادہ ہماری مشایعت کی یہانتک کہ ہم ایک مقام پر جس کا انھوں نے نام بتایا پہنچے تو انھوں نے فرمایا کہ اے گروہ انصار! تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں پا پیادہ آیا؟ ان لوگوں نے کہا "ہاں، ہمارے حق کی وجہ سے"۔ بولے "تمہارا حق یہی ہے لیکن تم ایسی قوم کے پاس جاتے ہو جن کے ہاں شہد کی مکھیوں کی طرح قرآن کی گنگناہٹ ہے۔ تو تم رسول اللہ صلعم سے بہت کم روایت کرو اور میں تمہارا شریک ہوں"۔ قرظہ ؓ نے کہا کہ "**میں کبھی رسول اللہ صلعم سے روایت نہ کرونگا**"۔ ہم کو روایات سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمر ؓ دو گواہوں کے بغیر رسول اللہ صلعم سے حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اور اگر کتاب طویل نہ ہو جاتی تو میں تمہارے لئے بسند حدیث بیان کرتا۔ حضرت **علی بن ابیطالب ؓ رسول اللہ صلعم کی حدیث ہی کو قبول نہیں کرتے تھے**۔ روایتیں بہت زیادہ بڑھتی جاتی ہیں اور ایسی روایتیں نکلتی آتی ہیں جو نامعلوم ہیں۔ اہل فقہ ان کو نہیں جانتے اور وہ کتاب و سنت کے موافق نہیں ہیں۔ تو تم شاذ[1] حدیث سے (جسے چند آدمی نقل کرتے ہوں) احتراز کرو اور وہ حدیث لو

[1] یہاں شاذ اور مشہور حدیث کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے جیسا کہ خود علامہ محمد الخضری کو دھوکہ ہو گیا ہے۔ اس وقت تک محدثین کی ان اصطلاحات کا ظہور ہی نہیں ہوا تھا اسلئے وہ مشہور کے لفظ کو اپنے عام معنوں میں استعمال کرتے تھے نہ کہ اصطلاحی معنوں میں لہٰذا شاذ سے مراد وہ احادیث ہیں جنھیں صرف چند لوگ بیان کریں اور مشہور سے مراد یہاں حدیث متواتر ہی ہے یعنی خود امام ابو یوسف کے الفاظ میں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو یعنی جسے عام طور پر لوگوں نے عام طور پر لوگوں سے روایت کیا ہو اور جس پر جماعت کا اتفاق عام ہو اور اس کو فقہا جانتے

جس پر جماعت کا اتفاق عام ہو اور اسکو فقہاء جانتے ہیں۔ تو اور چیزوں کو اسی پر قیاس کرو۔ اور جو چیز قرآن کے مخالف ہو گو اس کی روایت کی جائے لیکن وہ رسول اللہ صلعم کی حدیث نہیں ہے۔ ہم سے معتبر لوگوں نے رسول اللہ صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ میں صرف اس چیز کو حرام کرتا ہوں جس کو قرآن نے حرام کیا ہے اور مشہور حدیث[1] کو تمہارا رہنما اور امام بناتا ہوں اسکا اتباع کرو اور قرآن و حدیث میں جسکی توضیح نہ کی گئی ہو وہ اگر پیش آئے تو اسی پر قیاس کرو۔ الخ۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۲۶۵-۶۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ حدیث کو قبول کرنے کیلئے امام ابو یوسف کی کیا شرطیں ہیں۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق امام احمد بن حنبل کا یہ قول پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ ابو یوسف تو موصوف بالحدیث تھے مگر ابوحنیفہ اور محمد بن الحسن دونوں احادیث نبوی کے مخالف تھے۔ ان دونوں کی رائے بڑی خراب تھی یعنی ابوحنیفہؒ اور محمد بن الحسن کی (خطیب ج ۲ ص ۱۷۹) نیز عمرو الناقد کا ارشاد ہے کہ میں اصحاب الرائے میں سے کسی سے بجز ابو یوسف کے روایت کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ ابو یوسف صاحب سنت تھے (ایضاً ج ۱۴ ص ۲۵۳) اور بقول امام دارقطنی کے اندھوں میں کانے ہیں۔ (ایضاً ج ۱۴ ص ۲۶) صرف ان اقوال کو سامنے رکھ کر بھی حقیقت تک پہنچ جانا اور امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا صحیح مسلک معلوم کر لینا آپ کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے تاہم جیسا کہ علامہ محمد الخضریؒ نے کوشش فرمائی ہے اگر بر سبیل تنزل یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تمام اصحاب کا یہی مسلک تھا جو بروایت امام شافعیؒ امام ابو یوسف نے مصرح طور پر بیان کیا ہے تب بھی حضرات حنفیہ کے نزدیک ایک دو حدیثیں ہی قابل قبول ہو سکتی ہیں وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ ان حضرات نے کہیں بعض محدثین کے اس فیصلہ کو صراحۃً تسلیم کیا ہو کہ ایک یا دو متواتر حدیثیں موجود ہیں اور ان کا وجود عنقا کے وجود کی طرح عالم خیال ہی کی پیداوار نہیں ہے۔

فقہ حنفی ابدالآباد تک کیلئے ناقابل تغیر نہیں تھا

اب ایک آخری بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ کیا امام اعظمؒ کا یہ منشا تھا کہ وہ اپنی فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دیں؟ ظاہر ہے کہ جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ خود رسول اللہ صلعم کے فیصلے بھی قیامت تک کیلئے غیر متبدل قرار نہیں دیئے جا سکتے وہ کبھی خود اپنے فیصلوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ انھیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل سمجھا جائے؟ اس باب میں بھی تاریخی شہادات موجود ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس بات کو بھی شدت سے رد کیا کہ ان کے اجتہادات کو ابدی حیثیت دیدی جائے۔ چنانچہ:

فقہ حنفی کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کی تصریحات

نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کیلئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا "ہاں"۔ اس پر امامؒ نے فرمایا "خیال رکھنا تم بہت بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔" (خطیب ج ۱۳ ص ۴۰۲) مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتوے دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا "بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد بن الحسن بھی

[1] گذشتہ صفحہ کا حاشیہ دیکھئے

ہوتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابویوسف سے فرمایا "یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں کل میری کچھ رائے ہوتی ہے اور پرسوں میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابویوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا (فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دیدو جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳۵۲/۱۴۲) حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکے ہیں جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہو گی۔ (ایضاً)

ظاہر ہے کہ امام موصوف کی ان تصریحات کے بعد کہ وہ خود بھی اپنی فقہ کو شک و شبہ سے بالا اور غلطی و خطا سے مبرا نہیں سمجھتے تھے ہمارے لئے کہاں تک یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ ہم انکی آراء کو وحی الٰہی کا مقام دیدیں اور خطا و غلطی سے بری قرار دیکر قیامت تک کیلئے امت کا دستور العمل بنا دیں۔

تصریحات بالا کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ تھا کہ:-

(i) دین میں غیر متبدل صرف قرآن کے احکام اور اصول ہیں اور یہی کتاب ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔

(ii) روایات تاریخی حیثیت کی حامل ہیں جن سے اجتہاد میں مدد تو لی جا سکتی ہے مگر مستقل دین کی حیثیت سے ان کو ناقابل تبدیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(iii) قرآن کے اصول کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے فقہ مرتب کرنی چاہیئے لیکن یہ اجتہادات بھی قیامت تک کیلئے غیر متبدل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

بعینہٖ یہی وہ مسلک ہے جسکی دعوت طلوع اسلام دیتا چلا آ رہا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام کے اس مسلک کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے ہدف طعن و تشنیع بناتے ہیں، ذرا سوچیں کہ ان کی اس طعن و تشنیع کی زد کہاں تک پہنچتی ہے؟

اسکے بعد ذرا یہ بھی سوچیئے کہ طلوع اسلام جس مسلک کی دعوت دے رہا ہے آیا حضرات صحابہ اور اجلہ تابعین خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا یہی مسلک تھا یا طلوع اسلام کوئی نیا دین پیش کر رہا ہے۔ اگر ان تصریحات کے بعد بھی ہمارے ملا کو اصرار ہے کہ طلوع اسلام پھر بھی ایک نیا دین ہی تصنیف کر رہا ہے تو اس کے جواب میں ہم صرف امام احمد بن حنبلؒ کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں:-

ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ نے علم میں ایسی بہت سی چیزیں داخل کر دی ہیں جن سے خالی پانی کو جانا زیادہ اچھا ہے۔ میں نے ایک روز ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ تو بالکل ہی ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۳)

وکفٰی بہ اسوۃً۔

اتنا اور واضح رہے کہ ہم خدانخواستہ اپنے مسلک کو اسلئے صحیح نہیں سمجھتے کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے بلکہ خود امام ابوحنیفہؒ کے مصرحہ بالا مسلک کو اسلئے صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ مسلک قرآن کے مطابق ہے کہ یہی اس آسمان کے نیچے غلط اور صحیح کا معیار ہے۔

بے حجابی

جو صورتیں نظر آتی ہیں نوعِ انساں کی — کھچی ہیں جذبِ زن و مرد سے یہ تصویریں
بقائے نسل کا باعث ہے اس کشش کا وجود — اسی اساس پہ ہیں زندگی کی تعمیریں
جب اختلاطِ زن و مرد عام ہو جائے — تو ٹوٹ جاتی ہیں جذب و کشش کی زنجیریں
زیانِ جذب یقینی ہے بے حجابی میں — الگ ہیں دل کی خطائیں نظر کی تقصیریں
جب اس کشش میں کسی طرح سے کمی آجائے — تو کرنی پڑتی ہیں اس کی کچھ اور تدبیریں
تھیٹر اور سنیما، شراب و رقص و سرود — ہوس فروز فسانے، برہنہ تصویریں
جو سُرخرو نظر آتے ہیں بے حجابی میں — ملے گا خونِ تمنا جو اُن کا دل چیریں
معاشرت میں ہیں اُن کی خرابیاں جتنی — ہیں بیشتر اسی بے پردگی کی تاثیریں

خوشی سے کیجئے مغرب کی پیروی لیکن
رہیں نگاہ میں فطرت کی سخت تعزیریں

اسد ملتانی

حدیث

مثل معہ

کی حقیقت

(مولانا علامہ تمنا عمادی)

[قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نبی اکرم صلعم کو وحی کے ذریعے دیا تھا وہ قرآن کے اندر محفوظ و مصئون ہے۔ اور قرآن کے باہر خدا کی وحی کہیں نہیں۔ لیکن مولوی صاحبان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ قرآن کے ہم پایہ کچھ اور بھی ہے اسے روایات کا مجموعہ کہتے ہیں۔ اس عقیدہ کے متعلق "طلوع اسلام" بابتہ جنوری ۱۹۵۱ء میں (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے جواب میں) تفصیلی بحث کی جا چکی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ عقیدہ خالص عجم کی سازش کی پیدا کردہ ہے اور اس سے دین کی اصل و بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے۔ علامہ تمنا عمادی نے زیر نظر مضمون میں اس حدیث پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے جس کی بنا پر یہ عقیدہ قائم کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ حدیث عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔ عمادی صاحب کی تحقیقات فنی اعتبار سے بڑی درخور ستائش ہوتی ہیں اور یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔　　　(طلوع اسلام)]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

و

بعد حمدہ

حَدِیْثُ مِثْلُہٗ مَعَہٗ وَمَنِ اخْتَلَقَہٗ وَوَضَعَہٗ

قرآن مبین سے باہر دین کا کوئی حکم نہیں ہے

قرآن مبین کا یہ دعویٰ ہے کہ ما فرطنا فی الکتٰب من شیٔ "اس کتاب میں ہم نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے"۔ اور ارشاد ہے ونزلنا علیک الکتٰب تبیانا لکل شیٔ (۱۶/۹) "ہم نے اس کتاب کو تم پر اتارا ہے دین کی ہر بات کو واضح طور سے بیان کردینے کیلئے" تبیان کے معنی ہیں کسی بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا۔ احکام دین اور اوامر و نواہی کے لئے کتاب اللہ کی صاف و صریح آیتیں ہی رکھی گئیں جو حضرت جبرئیل امین کے ذریعے رسول تک پہنچتی رہیں۔ ابتدائے نزول سے ختم نزول تک جن کی کتابت، جن کے حفظ اور روزانہ کی تلاوت اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ بلاناغہ رات دن تمام صحابہ میں رہا۔ اسی طرح ان آیات کا ایک ایک حرف ہر طرح محفوظ رہا۔ کتاب اللہ کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ (۱۵/۹) "ہم ہی نے نصیحت کی کتاب کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" تو اس سے مراد اوراق یا حروف و نقوش کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اصل دین کی حفاظت کا وعدہ مقصود ہے۔ اگر دین ہی محفوظ نہ رہا تو کتاب رہی تو کیا اور نہ رہی تو کیا کتاب تو دین ہی کی تعلیم کیلئے آتی ہے اسلئے کتاب کی حفاظت کے معنی ہی یہ ہیں کہ دین

ہر طرح محفوظ رہے۔ اسی لئے دین کے تمام احکام، سارے اوامر ونواہی اسی کتاب میں محصور رکھے گئے اور اسی کتاب کو "تبیاناً لکل شیءٍ" فرما گیا۔ اگر قرآن سے باہر حدیثوں میں بھی بعض ایسے احکام، بعض ایسے اوامر ونواہی، اور بعض ایسے حلال وحرام ہیں جن کا تعلق قرآن سے کچھ نہیں یعنی قرآن مبین ان کے متعلق اثبات ونفی دونوں حیثیت سے بالکل خموش ہے۔ تو پھر قرآن کا یہ دعوٰی کہ یہ کتاب تبیاناً لکل شیءٍ دین کی ہر بات بیان کرنے کیلئے اتری ہے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہیں چھوڑی گئی" یہ دونوں دعوے غلط ہو جاتے ہیں۔ معاذ اللہ من ذلک ومن اصدق من اللہ قیلاً۔ اللہ سے بڑھکر بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟

وحی تشریعی صرف قرآن ہے

وہ وحی جس کا تعلق احکام شریعت دینی اوامر ونواہی اور حلال وحرام سے یا تبشیر وتنذیر سے ہو وہ صرف قرآن مبین اور اس کی آیتیں ہیں۔ جیسا کہ خود قرآن ہی میں فرمایا گیا ہے کہ قل اللہ شهید بینی و بینکم واوحی الی هذا القرآن لانذرکم به ومن بلغ (۶/۱۹) "کہدو (اے رسول) کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اور میری طرف یہی قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ہم تمہیں (نتیجۂ کفر سے) ڈرا دیں، اور جس کے پاس یہ پہنچ جائے اس کو بھی"۔ اور فرمایا گیا آخر سورۂ ق میں وذکر بالقرآن من یخاف وعید (۵۰/۴۵) "جو میری دھمکیوں سے ڈرتا ہو اس کو قرآن کے ذریعے نصیحت کرو" تو خیال کیجئے کہ تذکیر وتنذیر تک میں قرآن ہی کا پابند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا گیا اسلئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں بھی لوگوں کو دینی باتیں سمجھاتے ہوں گے تو قرآنی ہی مضامین بیان فرماتے ہوں گے۔ کیونکہ آپ کو قرآن ہی کی تبلیغ وتبیین اور قرآن ہی کے مطابق تنذیر وتذکیر کا حکم تھا۔ تو جب تبیین وتنذیر وتذکیر میں قرآن کی پابندی تھی تو پھر قرآن سے باہر اوامر ونواہی اور حلال وحرام بیان کرنے کی اجازت کب ہو سکتی ہے؟ اور کہاں سے ہو سکتی ہے؟

صحیح حدیثیں

اسی لئے حدیثوں کی صحت کا اصلی اور قطعی معیار مطابقت قرآن مبین ہے اسلئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قرآن میں کچھ فرمایا جائے اور حدیث میں کچھ اور وارد ہو۔ جس رسول پر قرآن کا اتباع فرض ہو وہ قرآن کے خلاف کس طرح بول سکتے ہیں؟ اور قرآن سے باہر دینی احکام کیا اپنے جی سے بیان فرمائیں گے؟ جبکہ دینی احکام قرآن سے باہر ہو ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوه علی کتاب اللہ فما وافقه فاقبلوه وما خالفه فردوه۔ "میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی تو جو حدیث میری طرف منسوب کرکے تمہارے سامنے روایت کی جائے۔ اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ اگر اس کے موافق ہو تو قبول کرو اور اگر اس کے خلاف ہو رد کرو۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں پہلے موجود تھی، بعد کو یاران طریقت نے دیکھا کہ اس حدیث سے تو سینکڑوں حدیثیں غلط اور قابل رد ٹھہر جائیں گی، اسلئے اس حدیث کو بخاری کے نسخے سے نکال پھینکا مگر قدیم کتابوں میں بخاری کے حوالے سے یہ حدیث موجود ہے۔ چنانچہ توضیح وتلویح جو اصول فقہ حنفی کی نہایت مشہور ومعروف کتاب ہے اور تقریباً تمام عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اس میں بخاری کے حوالے سے یہ حدیث مذکور ہے۔ اس پر علامہ تفتازانی نے کچھ خفگی کا بھی اظہار کیا ہے مگر بخاری کی روایت اعتراف کرتے ہوئے۔ پھر سید السندؒ نے علامہ تفتازانی کا جواب بھی اپنے حاشیہ میں دیا ہے، اور اس حدیث کی صحت کیلئے اسی کو کافی

بتایا ہے کہ اس کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں درج فرمایا۔ غرض اُن بزرگوں کے وقت تک یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود تھی۔ صحیح بخاری کے علاوہ مسند امام احمد میں، جاحظ کی کتاب البیان ج ۲ صفحہ ۱۴ میں، تفسیر ابن جریر طبری ج ۲۵ صفحہ ۶ میں، ملا جیون کی تفسیر احمدی میں، اور شیعوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مستند کتاب حدیث "اصول کافی" میں بھی موجود ہے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے فرق کے ساتھ۔[1]

اسلئے صحیح حدیثیں وہی ہیں جو قرآن کے مطابق ہوں جو حدیث بھی خلاف قرآن ہو چاہے وہ کیسے ہی قوی سے قوی اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسناد سے کیوں نہ مروی ہو اور کتنے ہی طرق سے اسکی روایتیں آئی ہوں یقیناً اس کے وہ تمام طرق موضوع ومکذوب ہیں۔

سکوتِ قرآن | کہا جاتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے موافق ہو تو وہ تو فریقین کے نزدیک صحیح ہے اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ فریقین کے نزدیک غلط اور موضوع۔ مگر تیسری قسم کی ایسی حدیث بھی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین پر مشتمل ہو جن سے قرآن خاموش ہے اسلئے ایسی حدیثیں اگر قرآن کے موافق نہیں ہیں تو مخالف بھی تو نہیں ہیں۔

مگر یہ سخت دھوکا ہے۔ اگر وہ حدیثیں دینی احکام، شرعی اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے متعلق نہیں ہیں یعنی غیر تشریعی ہیں اور درایت کے بھی خلاف نہیں تو غیر تشریعی ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ تو غیر تشریعی حدیثیں ہمارا موضوع بحث نہیں ہیں۔ اور اگر دینی احکام اور حلال و حرام سے ان کا تعلق ہے اور ایسے احکام اور ایسے حلال و حرام بیان کر رہی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے تو ایسی حدیثیں ضرور قرآن کے خلاف ہیں۔ ایک موٹی بات تو یہی ہے کہ قرآن جس مسئلے میں خاموش ہے حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو اس کو بھی خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ ایسی جگہ حدیث کا زبان کھولنا ضرور قرآن کی مخالفت ہے۔[2]

مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان حدیثوں کو قرآن کے اس دعوے سے انکار ہے کہ قرآن دین کی تمام باتوں کو بیان کر دینے کیلئے اُتارا گیا ہے۔ اور یہ کہ دین کی باتوں میں قرآن نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اگر وہ احکام جن کے متعلق قرآن خاموش ہے اور حدیث بیان کر رہی ہے اگر دینی احکام ہیں تو ضرور قرآن میں ان احکام کی کمی رہ گئی اور تمام دینی باتوں کو قرآن نے بیان نہیں کیا اس لئے ایسی حدیثیں بھی ضرور قرآن کے خلاف ہی سمجھی جائیں گی۔ کیونکہ یہ حدیثیں دراصل قرآن کو ناقص ثابت کرنے کیلئے اور اس کے دعویٰ جامعیت کو غلط قرار دینے کیلئے منافقین وملحدین نے گھڑی ہیں۔ ایسی ناپاک باتیں نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تو کیا ہونگی کسی سچے ایماندار مومن کا بھی قول نہیں ہو سکتیں۔ محدثین اپنی روایت پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ان حدیثوں کے معنوی فساد اور اندرونی فتنوں کو نہ سمجھ سکے اور ان کو اپنے جذبۂ روایات پرستی کے لئے بزعم خود سند و حجت سمجھتے ہوئے ان کو اپنی کتابوں میں درج کرنے لگے۔ اور باوجود ان کے راویوں کی مجروحیت مضامین کے اضطراب اور قرآن مبین کی صریح مخالفت کے ان کو اپنے استدلال واستنباط کیلئے غنیمت اور بہت غنیمت سمجھنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "کفایہ" کے شروع میں اس قسم کی تقریباً تمام حدیثیں جو ان کو ملیں ان کے تعدد طرق کے ساتھ سب جمع کر دی ہیں۔ بہت مناسب ہے اگر میں اس جگہ ان سب حدیثوں کی تنقید نہایت دیانتداری کے ساتھ کر کے دکھا دوں اور یہ بھی بتا دوں کہ ان جھوٹی حدیثوں کو کہاں کہاں کے وضاعین وکذابین ومنافقین نے گھڑا اور کہاں کہاں سے اور کن کن جگہوں سے ان کی اشاعت ہوئی۔

---

[1] الحمد للہ علیٰ ذلک التحقیق۔ [2] سبحان اللہ ایدک اللہ بروح منہ۔

منافقین کے مراکز

منافقینِ عجم نے جھوٹی اور مفسدانہ حدیثیں گھڑنے کیلئے اور اسلام کے خلاف مسلسل جدوجہد جاری رکھنے کے جو مراکز بنا رکھے تھے ان میں سب سے پہلا مرکز تو خراسان تھا۔ پھر دوسرا مرکز کوفہ اور تیسرا مرکز شام بنا۔ ایر ملکوں میں نیشاپور بھی ایک وقت میں اچھا خاصہ مرکزان منافقین کا رہا ہے مگر آخر میں مستقل اور سب سے بڑا مرکز کوفہ ہو گیا۔ اور حلقۂ شام و عراق کے قصبے اور سیستان عراق میں واسط اور بصری کوفہ کے بعد۔ اور خراسان میں مرو، موصل اور شام کے درمیان نصیبین۔ شہ کے شہروں میں حمص س میں بہت پیش پیش رہا اور پھر دمشق، قیساریہ، فلسطین اور مصیصہ وغیرہ ان منافقین کی خاص خاص اشاعت گاہیں تھیں۔ قدیمی ٹکسال تو خراسان اور اس کے مشہور قصبے مثلاً مرو وغیرہ تھے اور نیشاپور، بخارا اور پھر کوفہ، بعد کو ٹکسال بنتے گئے مگر کوفہ چونکہ اس طبقے کے اکابر کا آخر میں مرجع بن گیا اس لئے سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن کر رہا۔ مگر شام کے علاقہ میں حمص، مصیصہ دمشق وغیرہ میں بھی ٹکسال کا انتظام ضرور تھا۔ ٹکسالوں میں جھوٹی جھوٹی حدیثیں باہمی صلاح و مشورہ سے گھڑی جاتی تھیں اور اشاعت گاہوں سے ان کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا جاتا تھا۔ یہ ایک زبردست سازش کے ماتحت سلسلۂ جدوجہد تھا جس میں ہزاروں آدمی کام کر رہے تھے۔ خاص منافقینِ عجم تو تابعین کے زمرے میں داخل ہو کر عامۂ مسلمین میں اپنا کافی رسوخ پیدا کر چکے تھے جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی۔ مگر ان کے تلامذہ و ذریات جو تبع تابعین سمجھے جاتے تھے وہ شام و عراق و مصر میں بہت کافی پھیلے ہوئے تھے جن میں منافقین کی تعداد تو کم تھی مگر وہ منافقین کے تربیت یافتہ تھے اسلئے منافقین عجم کے برابر آلۂ کار بنے رہے اور ان کی گھڑی ہوئی حدیثوں کو صحیح سمجھ کر ان کی اشاعت ایک دینی خدمت سمجھ کر تا زندگی کرتے رہے۔

حدیث مثلہ معہ

ابوبکر خطیب بغدادی (ولادت ۳۹۲ھ متوفی ۴۶۳ھ) نے اپنی کتاب کفایہ کے ص۸ سے ص۱۲ تک اس حدیث کے جتنے طرق ان کو ملے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ اور ایک باب ہی اس کا اس عنوان سے باندھا ہے:

باب ما جاء فی التسویۃ بین حکم کتاب اللہ تعالیٰ وحکم سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وجوب العمل ولازم التکلیف

یعنی یہ باب ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں کے حکم کی حیثیت سے برابر ہونے میں اور وجوب عمل اور تکلیف شرعی کے عائد و لازم ہونے میں یکساں ہونے میں۔

جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے وہ تو بالکل صحیح ہے اسلئے کہ سنت رسول اللہؐ کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ کتاب اللہ کے احکام کی تعمیل جو خود رسولؐ نے کی اور رسولؐ کی تعلیم کے مطابق صحابہؓ نے کی تو سنت رسول، در اصل قرآن کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ قرآنی احکام کی تفسیر کا نام سنت رسول ہے۔ اسلئے سنتِ رسول کا اتباع عین قرآن کا اتباع ہے جس طرح قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (۴/۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

تو جس طرح اللہ کی اطاعت رسول ہی کی اطاعت کر کے ممکن ہے اسی طرح قرآن کا اتباع سنت صحیحۂ رسول کا اتباع کر کے ہی ممکن ہے یہاں تو مراد ہی کچھ اور ہے۔ ہر حدیث مروی کو سنت قرار دیکر تمام حدیثوں کو حکم و وجوب عمل میں قرآن کا ہم پلہ بنانا ان کا مقصود ہے جیسا کہ ان کی حدیثوں سے ظاہر ہے اسلئے اس باب میں جو حدیثیں جمع کی گئی ہیں ان کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔

طرقِ روایات یہ حدیث مختلف الفاظ و عبارت میں طول و مختصر متعدد طرق سے پانچ صحابیوں سے اور ایک تابعی سے مرسلاً مگر مرفوعاً مروی ہے۔

(۱) حضرت مقدام بن معدی کرب الکندی الشامی سے جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں ۸۷ھ میں ۹۱ برس کی عمر میں راہیٔ جنت ہوئے۔ ان سے دس طرق سے مروی ہے۔

(۲) حضرت ابو رافع مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کوفہ میں رہے اور بقول صحیح حضرت علی مرتضیٰؓ کے زمانۂ خلافت میں جنت کو سدھارے ان سے چھ طرق سے مروی ہے۔

(۳) حضرت عرباض بن ساریہؓ جو اصحاب صفّہ میں سے تھے اور شام میں آکر رہ گئے تھے اور شام ہی میں ۷۵ھ میں وفات پائی۔ ان سے صرف ایک ہی طریق سے مروی ہے۔

(۴) حضرت جابر بن عبد اللہ الخزرجی السلمی الانصاری جن کے سالِ وفات کے متعلق بہت اختلاف ہے ۷۳ھ، ۷۴ھ، ۷۷ھ، ۷۸ھ اور ۹۴ھ یہ سب لوگوں نے لکھا ہے۔ ابن عبدالبر نے استیعاب میں ۷۴ھ یا ۷۸ھ لکھا ہے۔ مدینہ میں وفات پائی۔ ان سے دو طریق مروی ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی دو طریق مروی ہیں، ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کہکر اور دوسرا حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف منسوب ہے۔

(۶) چھٹا قول علقمہ بن قیس الکوفی کا ہے جس کو مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کرکے انھوں نے روایت کیا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلعم کی حیات ہی میں مگر جس سال آپ کی وفات ہوئی ہے اسی سال ان کی پیدائش ہے اسلئے بلا واسطہ ان کی روایت مرسل ہے متصل نہیں۔ ان کی وفات اور عمر میں بہت سے اقوال ہیں ۶۲ھ، ۶۳ھ، ۶۵ھ، ۷۲ھ، ۷۳ھ سب لوگ لکھ گئے ہیں اور نوے برس کی عمر بتائی ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ جب ۱۰ھ یا ۱۱ھ میں ان کی ولادت ہے اور زیادہ سے زیادہ ۷۳ھ میں ان کی وفات ہے تو ان کی عمر ۶۳ برس کی ٹھہرتی ہے۔ بہرحال ان سے صرف ایک طریق مروی ہے۔

ان بائیس[۲۲] طرق میں سے گیارہ طرق تو خطیب بغدادی کی کتاب کفایہ میں ہیں اور دو طرق سنن ابو داؤد میں، اور دو ترمذی میں اور دو ابن ماجہ میں۔ اور دو سنن دارقطنی میں اور تین مسند امام احمد میں۔ بہت مناسبت کے ساتھ ان کتابوں میں یہ حدیثیں داخل کی گئیں۔

قابلِ غور نکتہ یہ حدیثیں اکابر صحابہ مہاجرین و انصار سے مروی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین اور اجلہ صحابہؓ اس حدیث سے بالکل بے خبر تھے۔ جو صحابہ شام ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی، یا کوفہ میں رہے یا اصاغر صحابہؓ سے یہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ اس قدر کم عمر تھے کہ جنگ بدر و جنگ احد میں شرکت سے ان کو ان کے والد نے روک دیا تھا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ تو وفات نبویؐ کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۳ برس کے تھے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ امام مالکؒ کی موطا اور صحیح بخاری و صحیح مسلم یہ تین کتابیں جو علمائے حدیث کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہیں ان روایتوں سے بالکل خالی ہیں۔ خطیب بغدادی کو نیشاپور میں یہ حدیثیں ملیں۔ مگر امام مسلم جو خود نیشاپوری تھے

ان حدیثوں سے بالکل بے خبر رہے۔

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس طرح اکابر صحابہ ان حدیثوں سے بالکل بے خبر رہے اسی طرح اکابر محدثین بھی ان حدیثوں سے بے خبر ر[ہے]
مسند احمد کے متعلق تو میرا مضمون التاریخ المستند لمسند الامام احمد "البیان" بابت ماہ اکتوبر و ماہ نومبر ۱۹۴۶ء میں چھپ
چکا ہے کہ یہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ دراصل امام احمد بن حنبل کے بہت بعد ایک جماعت وضاعین و کذابین نے مل کر مرتب کیا ہ[ے]
اس کو امام احمد بن حنبل یا ان کے صاحبزادے عبداللہ سے کوئی سروکار نہیں۔ اسلئے مسند احمد میں ان حدیثوں کے ہونے سے دھوکا نہیں کھا[نا]
چاہیئے وہ تو موضوعات و مکذوبات کا خزانہ ہی ہے اگر اس میں یہ حدیثیں نہ ہوتیں تو تعجب ہوتا۔ بلکہ اس پر تعجب ہے کہ عرباض بن سار[یہ]
والی روایت مسند احمد میں نہیں ہے۔ جابر بن عبداللہ والی حدیث ہے اور نہ ابن عباس والی۔ حالانکہ بعض اکابر محدثین کا قول ہے کہ
جو حدیث مسند احمد میں نہ ہو سمجھ لو کہ وہ مشتبہ ہے اسلئے کہ تمام کے ذخائر اس میں مجتمع ہیں۔

مشکوٰۃ میں بھی عرباض بن ساریہ کی حدیث نقل کی ہے اور ابوداؤد کا حوالہ دیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ابوداؤد کے متداول نسخو[ں میں]
یہ حدیث باوجود کافی جستجو کے نہیں ملی۔ مگر خود صاحب مشکوٰۃ لکھتے ہیں کہ ابوداؤد کے سلسلۂ روایت میں اشعث بن شعبۃ المصیصی
بھی آتا ہے اور ان کے متعلق ائمہ رجال کو کلام ہے۔ یہ اشعث صاحب خراسانی ہیں۔ شام کے مشہور قصبہ مصیصہ[۱] میں سکونت اخ[تیار]
کر لی تھی۔ حافظ ازدی نے ان کو ضعیف الحدیث لکھا ہے۔ اسی کی طرف صاحب مشکوٰۃ نے اشارہ کیا ہے۔

متن حدیث ان بائیس طرق کی ہر حدیث کو مع اسناد لکھنا اور ان کا ترجمہ پیش کرنا بہت طوالت طلب ہے۔ اسلئے چونکہ ان تما[م]
میں سب سے زیادہ روایتیں حضرت مقدام بن معدی کرب سے مروی ہیں اسلئے انھیں سے جو سب سے بڑی اور مکمل حد[یث]
روایت کی گئی ہے میں اسی کو نقل کر کے اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں۔ باقی حدیثوں کو اسی پر قیاس کر لیجئے۔ اختلاف الفاظ و اضطراب مضا[مین]
کو کہاں تک دکھاؤں گا۔ نفسِ مضمونِ حدیث کے اختلاف و اضطراب سے قطع نظر کر کے صرف ان کے راویوں کو دیکھئے۔ اسی قدر ا[یک]
دیانتدار انصاف پسند کے سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ تو حضرت مقداد سے یوں روایت کی گئی ہے۔

(قال ابوبکر الخطیب فی الکفایۃ اخبرنا ابو محمد الحسن بن علی بن احمد بن بشار النیسابوری بالبصرۃ قال ثنا ابوبکر محمد
بن احمد بن محمویہ العسکری قال ثنا سلیمان بن عبدالحمید البھوانی قال ثنا علی بن عیاش وابوالیمان قالا
حدثنا حریز بن عثمان قال حدثنی عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی عن المقدام بن معدیکرب عن رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ، الا انی قد اوتیت القرآن ومثلہ۔ الا یوشک رجل
یشبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ۔ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ۔
الا لا یحل لکم الحمار الاھلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطۃ من مال معاھد الا ان یستغنی عنھا صاحبھا۔

---

[۱] "مصیصہ" لب اللباب میں بکسر میم و تشدید صاد اول لکھا ہے مگر قاموس میں مصیصہ کو بفتح اول اور بغیر تشدید کے "سفینہ" کے وزن پر لکھا ہے
اور تصریح کر دی ہے کہ ولا تشدد۔ ابوالعلاء المعری کا یہ مصرع بھی صاحب قاموس کی تائید کر رہا ہے ۔ لولا المصیصی کان المجد فی مضر
مگر ابن السمعانی کتاب الانساب میں صاحب لب اللباب ہی کی تقلید کر رہے ہیں اور بالکسر بتشدید صاد اول لکھتے ہیں۔ واللہ اعلم ۱۲ منہ غفرلہ

یعنی ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب کفایہ میں لکھا ہے کہ ہمیں خبر دی ابو محمد الحسن بن علی بن احمد بن بشار النیساپوری نے بصرہ میں۔ ان سے حدیث بیان کی ابوبکر محمد بن احمد بن محمویہ العسکری نے ان سے بیان کی سلیمان بن عبد الحمید البہرانی نے۔ ان سے علی بن عیاش اور ابوالیمان (حکم بن نافع) نے۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی حریز بن عثمان نے۔ انھوں نے کہا کہ ہم سے حدیث بیان کی عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی نے انھوں نے حضرت مقدام بن معدی کرب سے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے مانند (اور بھی) اسی کے ساتھ۔ یاد رکھو کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کے مانند۔ یاد رکھو کہ عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑو اسی قرآن کو۔ تم جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو۔ یاد رکھو تمہارے لئے اہلی حمار (پالتو گدھے) کا گوشت حلال نہیں اور نہ کسی نوکیلے دانت والے درندے کا گوشت۔ اور نہ پڑا ہوا مال کسی ایسے کافر کا جس سے صلح کا معاہدہ ہو چکا ہو مگر یہ کہ وہ اپنے اس مال سے بے پروا ہو چکا ہو[1]۔

[یہ] روایت ہے جو تھوڑے تھوڑے اَدل بدل اور کمی بیشی کے ساتھ بائیس طرق سے پانچ صحابہ اور ایک تابعی سے مروی ہے۔ بعض روایات [میں] کچھ غیر معمولی اور اہم فرق ہے اس کو اس روایت کی تنقید کے وقت ظاہر کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[بائ]یس طرق کے سلسلۂ اسناد

حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب جو دس طریقوں سے یہ حدیث منسوب کی گئی ہے اس کے سلسلۂ اسناد کو ملاحظہ فرمایئے:۔

یہ روایتیں جو مقدام بن معدیکرب کی طرف منسوب ہیں ان کو حضرت مقدام سے صرف دو شامی روایت کرتے ہیں ایک ...حسن جابر اللخمی الشامی دوسرے عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی الشامی الحمصی۔ اول الذکر صاحب سے اس حدیث کے سوا اور کوئی حدیث [مرو]ی نہیں ہے۔ یہ صرف اسی حدیث کو روایت کرنے کے لئے زمرۂ رواۃ میں داخل ہو گئے یا داخل کر دیئے گئے۔ دوسرے صاحب شامی [ت]ھے ہی، شام کے مشہور شہر حمص کے قاضی بھی تھے اسی لئے بعضوں نے شامی تابعی ثقہؒ لکھدیا ہے مگر یحییٰ بن سعید القطان نے صاف [کہہ د]یا کہ یہ مجہول الحال ہیں یعنی ان کا ثقہ یا غیر ثقہ ہونا معلوم نہ ہو سکا۔ صرف تابعی ہونے سے ثقہ کہدینا صحیح نہیں۔

پھر اول الذکر یعنی لخمی صاحب سے معاویہ بن صالح الحمصی الشامی ہی صرف اس کی روایت کرتے ہیں۔ معاویہ بن صالح کے متعلق [تہذ]یب التہذیب میں ہے کہ یحییٰ بن سعید ان کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، اور ابن معین ان کو ناپسندیدہ شخص قرار دیتے تھے اور جب

---

[1] [پا]لتو گدھے کا گوشت خود محدثین کے نزدیک مختلف فیہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کو حرام نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ آخر کتاب میں آپ پڑھیں گے [باقی ر]ہا ان دونوں کا گوشت تو وہ قرآن ہی سے حرام ہے۔ احلت لکم بھیمۃ الانعام سے ظاہر ہے کہ غیر بہیمۃ الانعام یعنی درندے حرام ہیں۔ [ما]ل کسی کا بھی ہو جب اس کا مالک معلوم ہے یا جب تک اس کا گمان ہے کہ اس کا مالک آجائے گا اس وقت تک عقلاً حرام ہے اور قرآن سے بھی۔ [معاہ]د کفار یا ذمیوں کا معاملہ وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے۔ معاہدے جس انداز کے ہوں ان کی پابندی قرآن کی رو سے فرض ہے۔ غیر معاہد بھی جو [حر]بی ہیں ان کے مال پر بھی بیجا تصرف جائز نہیں البتہ جو حربی ہیں جن سے جنگ جاری ہے یا جو جنگ پر تلے ہوئے ہیں، ان کو ضرور ہر ممکن نقصان [پہنچا]نا عقلاً جائز ہے۔ قرآن بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ ۱۲ منہ غفرلہ

عبدالرحمٰن بن مہدی ان کی حدیث روایت کرتے تھے تو یحییٰ بن سعید ابن مہدی کو ڈانٹتے تھے۔ اور ابو اسحٰق الفزاری نے کہا کہ "یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی کوئی حدیث روایت کی جائے۔" اور ابو حاتم نے کہا کہ "ان کی حدیثیں سند و حجت نہیں ہیں۔"

زید بن حباب الخراسانی الکوفی اس حدیث کو بواسطہ معاویہ بن صالح ہی روایت کرتے ہیں مگر ایک طریق میں بلاواسطہ یہ حسن بن جابر اللخمی الحمصی سے روایت کرتے ہیں جو ناممکن ہے اسلئے کہ حسن بن جابر اللخمی کی وفات ۱۲۶ھ میں ہے اور زید بن حباب کی وفات ۲۰۳ھ میں ۷۲ برس کی عمر میں ہے یعنی زید بن حباب حسن بن جابر اللخمی کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوئے تھے اسلئے یقیناً اس سلسلۂ روایت میں جو مسند امام احمد میں مذکور ہے۔ راوی کو دونوں کا سال وفات معلوم نہ تھا اسلئے دروغ بے فروغ کا مرتکب ہوگیا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غلطی سے معاویہ بن صالح کا نام زید بن حباب کے نام کے بعد چھوٹ گیا ہے۔ اسلئے کہ پہلے زید بن حباب کی روایت بواسطہ معاویہ بن صالح، حسن بن جابر اللخمی سے لکھکر پھر تحویل کی نوعیت قائم کرکے زید بن حباب کی روایت بلاواسطہ حسن بن جابر سے بیان کی ہے۔ اگر یہاں بھی معاویہ بن صالح کا نام موجود ہے اور کاتب سے چھوٹ گیا ہے تو یہ اصل روایت کا اعادہ فضول ہوا، تحویل[1] نہ ہوئی۔ اسلئے ضرور یہ تحویلی نوعیت معاویہ بن صالح کی بغایت مجروحیت کو دیکھتے ہوئے قائم کی گئی تاکہ یہ کہنے کا موقع ملے کہ زید بن حباب، معاویہ بن صالح کی وساطت ہی سے یہ روایت نہیں کررہے ہیں کہ معاویہ بن صالح کی مجروحیت کا اثر اس روایت پر پڑے، بلکہ بلاواسطہ معاویہ بن صالح بذات خود بھی حسن بن جابر سے اس حدیث کی روایت کررہے ہیں اسلئے معاویہ بن صالح کی مجروحیت اس حدیث پر اثر انداز نہیں ہوسکتی مگر دروغ گو را حافظہ نباشد۔ زید بن حباب کی عمر اور حسن بن جابر کا سالِ وفات راوی صاحب کو یاد نہ رہا اور اس کا خیال نہ رہا کہ زید بن حباب کی تو ولادت ہی حسن بن جابر کی وفات کے تین چار برس بعد ہے اسلئے زید بن حباب کی روایت بلاواسطہ کسی کے حسن بن جابر سے کس طرح ممکن ہے؟

تو حسن بن جابر اللخمی الشامی سے جتنی روایتیں بھی حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء معاویہ بن صالح الشامی الحمصی ہی سے مروی ہیں اور انھیں کی من گھڑت ہیں۔ اور ان کا حال ہم اوپر لکھ چکے۔

اب عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی الحمصی جو حضرت مقدام بن معدی کرب سے روایت کرتے ہیں۔ اس سلسلۂ روایت کو بھی سن لیجئے۔ تو صرف ایک سلسلۂ روایت جو دارقطنی میں ہے اس میں عبدالرحمٰن بن ابی عوف الجرشی الحمصی سے مروان بن رؤبۃ الحمصی

---

[1] اصل روایت یوں ہے حدثنا عبداللہ قال حدثنی ابی ثنا عبدالرحمٰن و زید بن حباب قالا ثنا معاویۃ بن صالح عن الحسن بن جابر قال زید فی حدیثہ حدثنی الحسن بن جابر قال سمعت المقدام بن معدی کرب یقول۔ یعنی امام احمد سے عبدالرحمٰن بن مہدی اور زید بن حباب دونوں نے معاویہ بن صالح سے اور انھوں نے حسن بن جابر سے روایت کی۔ مگر تنہا زید بن حباب نے بلاواسطہ بذات خود حسن بن جابر سے بھی روایت کی۔" اس روایت کو بھی سن لیجئے قال سمعت المقدام بن معدی کرب یقول حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم خیبر اشیاء ثم قال یوشک احدکم ان یکذبنی وھو متکئ علی اریکتہ یحدث بحدیثی فیقول بیننا و بینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ من حلال استحللناہ وما وجدنا فیہ من حرام حرمناہ۔ الا وان ما حرم رسول اللہ مثل ما حرم اللہ۔ یعنی حسن بن جابر نے کہا کہ میں نے مقدام بن معدی کرب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلعم نے خیبر کے دن چند چیزیں حرام کیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ ملاحظہ ہو)

ان سے محمد بن الولید الزبیدی الحمصی۔ ان سے بقیۃ ابن الولید الحمصی، ان سے ابو عتبہ احمد بن الفرج الحمصی، ان سے محمد بن سلیمان النعمانی، اُن سے دارقطنی روایت کرتے ہیں۔ دارقطنی کے شیخ محمد بن سلیمان النعمانی تو بالکل مجہول الحال ہیں جن کا ذکر کتب رجال میں نہیں ملتا۔ مگر ان سے اوپر مقدام بن معدی کرب کے بعد سے ہر راوی شامی حمصی ہے۔ بقیۃ بن الولید الحمصی کے متعلق تہذیب التہذیب میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ ہر آنے والے جانے والے سے یہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے۔ ابن عیینہ لوگوں کو منع کرتے تھے کہ بقیہ سے سنن کی حدیثیں نہ لکھا کرو۔ یہ متروکین اور ضعفاء سے روایت کیا کرتے ہیں اور ان کے ناموں اور کنیتوں میں ہیر پھیر کیا کرتے ہیں۔ ابو حاتم نے کہا کہ ان کی حدیث لکھ لی جائے مگر وہ سند و حجت نہیں ہے۔ ابو مسہر غسانی نے کہا کہ بقیۃ لیست احادیثہ نقیۃ فکن منہا علی تقیۃ یعنی بقیہ کی حدیثیں (خلشوں سے) پاک نہیں ہیں اسلئے ان کی حدیثوں سے بچتے ہی رہنا چاہیئے۔ امام احمد نے کہا کہ بقیہ نے عبید اللہ بن عمر سے بہت سی منکر حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ بقیہ کی حدیثوں کو میں حجت نہیں سمجھتا۔ امام احمدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ بقیہ صرف غیر معروف ہی لوگوں سے منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں مگر یہ تو مشہور لوگوں سے بھی منکر حدیثیں روایت کرتے پائے جاتے ہیں۔ تو ہم نے غور کیا کہ آخر یہاں سے یہ حدیثیں لائے؟ تو پتا ملا کہ تدلیس کے ذریعے۔ (یعنی مجہول راویوں کا نام اڑا کر ان کی جگہ مشہور راویوں کا نام رکھدیا کرتے تھے)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ عنقریب تم میں کا کوئی مجھکو جھٹلائیگا اور وہ تکیہ لگائے اپنے تخت پر ہوگا میری حدیث بیان کی جائیگی تو وہ کہے گا ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ ہے تو ہم لوگ کتاب اللہ میں جس کو حلال پائیں اس کو حلال سمجھیں اور جس کو اس میں حرام پائیں اس کو حرام قرار دیں۔ یاد رہے اللہ کے رسول نے جس کو حرام کیا وہ اس کے مانند ہے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔" تقریبًا بالکل انہی الفاظ میں حدیث ابو بکر خطیب نے عبید اللہ بن ابی الفتح الفارسی سے، انھوں نے ابو حفص عمر بن محمد بن علی بن زیات سے ح اور پھر ابو بکر خطیب نے ابو الحسن علی بن طلحہ بن محمد المقری اور ابو الحسن احمد بن عمر بن روح النہروانی سے اور ان دونوں نے ابو حفص عمر بن محمد بن علی بن زیات مذکور سے اور ابن زیات مذکور نے عبد اللہ بن محمد بن ناجیہ سے انھوں نے عمرو بن علی ابو حفص الصیرفی سے انھوں نے عبد الرحمٰن بن مہدی سے ح اور پھر ابو بکر خطیب نے علی بن محمد بن عبد اللہ سے انھوں نے دعلج بن احمد سے انھوں نے ابن شیرویہ سے انھوں نے اسحٰق بن راہویہ سے اور وہ عبد الرحمٰن بن مہدی مذکور سے اور عبد الرحمٰن بن مہدی مذکور معاویہ بن صالح سے، وہ حسن بن جابر سے اور وہ مقدام بن معدی کرب سے۔ کفایہ میں لکھتے ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اس روایت میں یوشك احدکم ان یکذبنی کا لفظ نہیں ہے صرف یوشك رجل متکی علی اریکتہ یحدث بحدیثی الخ ہے۔ اور آخر میں مثل ما حرم اللہ کے بعد عزوجل کا لفظ بڑھا ہوا ہے اور اس کے اسناد میں زید بن حباب کا نام نہیں ہے۔ بہرحال یہ تمام طرق اور ساری تحویلات معاویہ بن صالح الشامی الحمصی کی شکم زاد ہیں۔ ان کے بعد والوں کی کثرت طرق و تحویلات اس روایت کو مطلق قوت نہیں پہنچا سکتے۔ جب کہ اس کی جڑ ہی کھوکھلی ہے اس لئے کہ جو شخص بھی اس کو روایت کرتا ہے وہ معاویہ بن صالح ہی سے روایت کرتا ہے اور ان کا حال متن میں ہم لکھ چکے کہ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی کوئی حدیث روایت کی جائے۔" خصوصًا جو حدیث درایت قرآنیہ کے بالکل خلاف ہو۔ بلکہ قرآن کی تکذیب کر رہی ہو۔ ان تمام حدیثوں کے الفاظ ان کا عنوان بیان اور ان کی رکاکت مضمون پکار پکار کر اپنی موضوعیت و مکذوبیت کی شہادت دے رہی ہے۔ جس کو تھوڑی سی بھی بصیرت فی الحدیث ہو وہ اس کو پہلی نظر میں سمجھ لے سکتا ہے مگر خدا برا کرے جذبۂ روایت پرستی کا کہ کیسے کیسے ماہرین و ناقدین حدیث اپنی غرض کے ماتحت ایسی لغو اور کھلی موضوعات کو حدیث نبوی قرار دے کر اس سے استناد کرنے لگے۔ سچ ہے حبك الشیٔ یعمی و یصم . . . . . آدمی غرض کے پیچھے باؤلا ہو جاتا ہے۔ حق و باطل کچھ نہیں سمجھتا ۱۲ منہ غفرلہ

اور بھی بہت کچھ بقیہ کے متعلق لکھا ہے۔ بقیہ ۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ مگر اب بقیہ کے شاگرد صاحب کا حال سنئے
اس حدیث کو بقیہ سے احمد بن الفرج ابو عتبہ الحمصی روایت کر رہے ہیں۔ یہ جامع حمص میں موذن تھے۔ محمد بن عوف نے ان کو جھوٹا کہا
اور ان کی بری حالت بتائی، ابو ہاشم عبد الغفار بن سلامہ نے بھی بیان کیا کہ ہم نے اپنے اکثر شیوخ سے ان کے جھوٹے ہونے کے متعلق
سنا۔ یہ بھی صاف لکھ دیا کہ بقیہ کی جو حدیث بھی یہ روایت کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ ان کی حدیثوں کے متعلق یہ اَکْذَبُ الْخَلْق
ہیں۔ اتنی تصریح کے بعد دارقطنی کی اس روایت کے متعلق کچھ کہنے کی اب ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اب ایک آخری سلسلہ حضرت مقدام بن معدی کرب کی طرف منسوب حدیث کا رہ گیا اور وہ صرف حریز بن عثمان الحمصی سے
چلتا ہے۔ یہ حریز صاحب نہایت کٹر قسم کے خارجی مشہور ہیں، ان کا معمول تھا کہ صبح شام ستر ستر مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر لعنت
کیا کرتے تھے اور مسجد میں جاتے تھے تو نماز کے بعد بغیر ستر مرتبہ لعنت کئے مسجد سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ شیعوں نے ایک جھوٹی حدیث بنا کر
جو مشہور کی کہ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ تم میرے لئے ویسے ہی ہو
جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کیلئے تھے، تو اس کو سن کر حریز حمصی نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے یوں نہیں فرمایا تھا بلکہ یوں فرمایا تھا کہ انت منی
بمنزلۃ قارون من موسیٰ۔ تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے موسیٰؑ کیلئے قارون تھا۔ معاذ اللہ من ذلک۔

مگر تعجب یہ ہے کہ ان کے بعض شیوخ بھی شیعے تھے اور بعض تلامذہ بھی شیعے اور حدیثیں یہ شیعوں کے مسلک کے مطابق بہت
روایت کیا کرتے ہیں جس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی تقیہ کی ایک شکل ہو کہ اپنے کو خارجی مشہور کر کے شیعہ مذہب کے مطابق
روایت کرتے رہو کہ یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ حدیث تو ایک سخت کٹر خارجی روایت کر رہا ہے۔ کوئی شیعہ اس کا راوی نہیں ہے۔ بہر حال محدثین
ان کی حدیثیں روایت کرتے ہیں اور ان کو ثقہ سمجھتے ہیں مگر آپ کو ان کا حال معلوم ہو گیا کہ یہ شامی ہیں حمصی ہیں اور شیعوں نے ایک جھوٹی
حدیث بنائی تو انھوں نے اس کے جواب میں اس سے زیادہ ناپاک جھوٹی حدیث بنا کر رسول اللہ صلعم پر اس کی تہمت لگائی۔ کیا اس پر بھی
یہ ثقہ ہی رہیں گے؟

تو اب ان حریز سے یزید بن ہارون الواسطی العراقی ان سے احمد بن حنبل ان سے عبد اللہ بن احمد روایت کرتے ہیں۔ یزید بن ہارون
واسط کے رہنے والے بین العراقین یعنی کوفہ و بصرہ کے درمیان شہر واسط ان کا گھر تھا ان کے متعلق تہذیب التہذیب میں ہے کہ لا یمیز
لا یبالی عمن روی یہ کچھ تمیز نہیں کرتے تے اور کچھ پروا نہیں کرتے تھے کہ کس سے روایت کر رہے ہیں۔ آنکھ سے معذور ہو گئے تھے تو
اپنی لونڈی سے اپنی کتاب نکلوا کر لوگوں کو حدیث اس سے پڑھوا کر روایت کیا کرتے تھے جس سے حدیث لکھواتے تھے اس کا نام ہارون تھا
وہ ان کی حدیثوں میں گھٹا بڑھا کر دیا کرتا تھا تو اس کو ڈانٹتے تھے اور کہتے تھے کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو مجھکو تیئیس ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ مگر پھر
بھی لونڈی سے پڑھوا پڑھوا کر حدیث روایت کرتے تھے۔ اور اسی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی حدیثیں

تہذیب التہذیب میں ضحاک بن عبد الوہاب کا قول حریز کے متعلق لکھا ہے ھو متروک متھم۔ ازدی، ابن عدی وغیرہ نے ان کے
متعلق لکھا ہے کہ ان سے روایت کرنا نہیں چاہیئے۔ لیکن مسند امام احمد کے متعلق تو ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اسکو وضاعین وکذابین ہی نے

مرتب ومدوّن کیا ہے اسلئے اگر عالی سے عالی اسناد کے ساتھ بھی مسند احمد میں کوئی حدیث درایتِ قرآنیہ کے خلاف ہو تو اس کو موضوع ہی سمجھنا چاہئے۔ متنِ حدیث کے ساتھ ساتھ اس کے وہ اسناد بھی موضوع ہیں۔ غرض مسند احمد کی کوئی حدیث بھی حجت وسند نہیں ہوسکتی۔

دوسرا طریق سنن ابوداؤد والا ہے جس کو حریز بن عثمان سے ابوعمرو بن کثیر بن دینار ان سے عبدالوہاب بن نجدہ ان سے ابوداؤد روایت کرتے ہیں۔ مگر نہ فقط شارحین ابوداؤد بلکہ دنیائے محدثین کو حیرت ہے کہ یہ ابوعمرو بن کثیر کون شخص ہے تمام شارحین ابوداؤد نے تمام کتابیں اسماء الرجال کی چھان ماریں مگر اس نام کا کوئی آدمی ملتا ہی نہیں۔ مولانا خلیل احمد دیوبندی رحمۃ اللہ اپنی کتاب البذل المجہود فی شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی شرح لکھتے ہوئے، لکھتے ہیں کہ ابوداؤد کے تمام قلمی ومطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ہے مگر میں نے اسماء الرجال اور حدیث کی تمام کتابیں چھان ڈالیں کہیں بھی اس نام کے مسمی کا پتہ نہ چلا۔ یہی حال مولانا شمس الحق مرحوم صاحب عون المعبود شرح سنن ابی داؤد کا ہے۔ بلکہ انھوں نے یہ بھی لکھدیا کہ منذری کے نسخہ ابوداؤد میں یہ حدیث ہی نہیں ہے۔ غرض یہ ایک مفقود الخبر اسم بے مسمی سے روایت ہے اس کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے اور اس حدیث کو جو اس اسم بے مسمی سے روایت کررہے ہیں۔ عبدالوہاب بن نجدہ یہ بھی حمصی ہی ہیں۔ اسلئے ممکن ہے کہ اگر واقعی ابوعمرو بن کثیر بن دینار کوئی شخص تھا تو وہ حمصی ہی ہوگا جو ایسا گمنام ہے جس کا کہیں پتہ نہیں ملتا کیونکہ عبدالرحمن بن ابی عوف الجرشی خود بھی حمصی تھے اور ان سے جتنے طرق سے بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے ان میں صرف حمصی ہی حمصی نظر آتے ہیں۔

اب ایک طریق اور باقی رہ گیا جسکو حریز بن عثمان الحمصی سے ابوالیمان[۱] حکم بن نافع الحمصی اور علی بن عیاش[۲] الحمصی دونوں روایت کرتے ہیں اور ان دونوں سے سلیمان[۳] بن عبدالحمید البہرانی الحمصی روایت کرتے ہیں۔ یہ سلیمان بن عبدالحمید البہرانی الحمصی ۵۹ برس کی عمر میں ۲۴۷ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے اور ابوالیمان کی وفات ۲۲۲ھ میں ہے اسلئے ابوالیمان کی وفات کے وقت یہ بہرانی صاحب سات برس سے زیادہ کے نہ تھے اور علی بن عیاش کی وفات ۲۱۹ھ میں ہے اس لئے ان کی وفات کے وقت بہرانی صاحب صرف چار برس کے تھے۔ تو یہ بہرانی، ابوالیمان اور علی بن عیاش سے کس طرح روایت کررہے ہیں۔ جب ہی تو ان بہرانی صاحب کے متعلق امام نسائی نے فرمایا ہے کہ کذاب لیس بثقة ولا مامون۔ کذافی تہذیب التہذیب جلد ۴ ص۲۰۸ ترجمہ سلیمان بن عبدالحمید۔

تو حضرت مقدام بن معدیکربؓ کی طرف منسوب تمام طرق کا حال آپ کو آئینے کی طرح معلوم ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ تمام طرق شام کے مشہور شہر حمص ہی میں گھڑے گئے اور وہیں سے پھیلے۔

ابورافع والی حدیث

دوسری حدیث وہ ہے جو حضرت ابورافع کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ حضرت ابورافع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ روایت ان سے ان کے صاحبزادے حضرت عبیداللہ بن ابی رافع اور ان سے سالم ابوالنضر روایت کرتے ہیں۔ یہ سالم ابوالنضر عمر بن عبیداللہ التیمی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی وفات ۱۲۹ھ میں اکسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور عبیداللہ بن ابی رافع کی وفات خلافت عبداللہ بن الزبیر میں ۷۳ھ میں ہوئی۔ اسوقت سالم ابوالنضر صرف چار برس کے تھے

---

[۱] ابوالیمان مات علی ماقال البخاری ۲۲۲ھ۔ [۲] علی بن عیاش ولادت ۱۴۳ھ وفات ۲۱۹ھ [۳] سلیمان ۲۴۷ھ وہو ابن ۵۹ سنة

اسلئے سالم ابوالنضر کا بلا واسطہ عبیداللہ بن ابی رافع سے روایت کرنا عقل کے خلاف ہے۔ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں سالم ابوالنضر کی روایت عوف بن مالک سے بھی مرسل ہی لکھی ہے اور عوف بن مالک کی بھی وفات سنہ ۷۳ھ ہی میں ہے۔ اسلئے حضرت ابورافع کی طرف منسوب حدیث کے بھی سارے طرق کو چونکہ سالم ابوالنضر ہی عبیداللہ بن ابی رافع سے روایت کر رہے ہیں اور سالم ابوالنضر کی روایت عبیداللہ بن ابی رافع سے بلا واسطہ صحیح نہیں ہوسکتی اسلئے یہ تمام طرق بھی حضرت مقدام بن معدیکرب کی طرف منسوب حدیث کے طرق کی طرح سر سے موضوع اور محض افترا، اور عبیداللہ بن ابی رافع پر بہتان ہے۔

ابورافع والی حدیث کے راویوں میں بھی خراسانی، کوفی اور مجروحین ہی کی تعداد نظر آتی ہے۔ مگر اس شجرۂ روایت کی جڑ ہی جب کٹی ہوئی ہے تو خواہ مخواہ باقی راویوں کے حالات پر بحث کرکے مضمون کو طول کیوں دیا جائے اس لئے اس حدیث ابورافع کے متعلق اب کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہوں۔ درخانہ اگر کس است حرفے بس است۔

[عرب]اض بن ساریہ والی حدیث

حضرت عرباض بن ساریہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اسکی روایت حضرت عرباض سے حکیم بن عمیر الحمصی کرتے ہیں اور ان سے ارطاۃ بن المنذر الحمصی ان سے اشعث بن شعبۃ الخراسانی المصیصی جن کے ضعیف الحدیث ہونے کی طرف صاحب مشکوٰۃ نے خود اس حدیث کو نقل کرکے اشارہ کیا ہے۔ اور ازدی وغیرہ نے جن کو ضعیف الحدیث کہا ہے ان سے محمد بن عیسیٰ بن الطباع روایت کرتے ہیں جو اذنہ ساحل شام کے رہنے والے تھے ان سے محمد بن احمد بن الولید بن برد الانطاکی روایت کرتے ہیں۔ ان سے مکرم بن احمد بن محمد بن مکرم القاضی۔ ان سے ابوعلی الحسن بن ابی بکر بن شاذان اور ان سے ابوبکر خطیب بغدادی اپنی کتاب کفایہ میں لکھتے ہیں یہ ابوبکر بن شاذان دراصل فضل بن شاذان النیساپوری مشہور شیعہ محدث ہیں۔ ان کے بیٹے ابوعلی الحسن ہیں نیساپور کے رہنے والے اور کٹر رافضی تھے، یہ اور ان کے بھتیجے ابوسعید محمد بن موسیٰ بن فضل بن شاذان وضع احادیث میں بڑے ماہر تھے۔ خود شیعوں میں بھی ان دونوں چچا بھتیجے کا کوئی اعتماد و امتیاز نہ تھا۔ غیر معروف لوگوں سے باہر والوں کے سامنے روایت کیا کرتے تھے۔ چونکہ فضل بن شاذان باوجود شیعہ ہونے کے عام لوگوں میں ایک وقار و اعتماد رکھتے تھے اس لئے ان کے بیٹے اور پوتے ان کے اثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر باہر والوں کے سامنے اپنی من گھڑت حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ سنیوں کے رجال کی کتابوں میں تو ان جیسوں کا ذکر ہونے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی مگر غیر ثقہ ہونے کی وجہ سے شیعوں کی بھی مختصر کتابوں میں ان دونوں کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ علامہ تفریشی نے اپنی کتاب نقد الرجال میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے اور دونوں کو وضاع و کذاب لکھا ہے اور پھر خطیب بغدادی کی ولادت سنہ ۳۹۲ھ میں ہے یہ سنہ ۴۱۵ھ میں ۲۳ سال کی عمر میں نیساپور گئے تھے۔ اس وقت ان کو اتنی مہارت کہاں تھی کہ کھوٹے کھرے کی تمیز کرتے۔ فضل بن شاذان کا غلغلہ نیساپور میں سنا۔ ان کے بیٹے پوتے سے ملے اور ان سے حدیثیں بھی لے لیں۔

مگر یہ فضل بن شاذان صاحب کے بیٹے ابوعلی الحسن جن سے روایت کر رہے ہیں یعنی مکرم بن احمد بن محمد بن مکرم القاضی بالکل

محمد بن الحسین ابوالفتح بن بریدہ الازدی الموصلی المتوفی سنہ ۳۷۴ھ ان کی کتاب جرح و تعدیل میں مشہور ہے ان کا ترجمہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۶ اور ابن حجر نے لسان المیزان ج ۵ ص ۱۳۹ میں لکھا ہے ۱۲ منہ

مفقود الخبر شخص ہیں ان کا پتا کہیں نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی اسم بے مسمّٰی ہے۔ اور یہ مکرم بن احمد صاحب روایت کرتے ہیں محمد بن احمد بن الولید بن بردا الانطاکی سے۔ ابن حجر اور حافظ ذہبی تو ان کا ذکر نہیں کرتے ہیں، مگر ابن السمعانی نے ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے ۳۷۵ھ میں ۵۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مگر یہ انطاکی صاحب روایت کرتے ہیں محمد بن عیسیٰ بن الطباع سے جن کی وفات ۲۲۴ھ میں اور ولادت ۱۵۰ھ میں ہے۔ تو انطاکی صاحب تو ابن الطباع کی وفات کے وقت پانچ برس سے زیادہ کے نہیں ٹھہرتے۔ پھر یہ انطاکی کی روایت ابن الطباع سے کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟ دراصل یہ سلسلہ اسناد اُسی ابو علی حسن بن ابی بکر بن شاذان کی من گھڑت ہے۔ متن حدیث بھی گھڑ لی اور اسناد بھی جوڑ لیے۔ راویوں کے سنین ولادت و وفات کا یاد رکھنا خصوصاً اس وقت جبکہ یہ فن پوری طرح مرتب و مدون بھی نہیں ہوا تھا کچھ کھیل نہ تھا اور پھر کون اتنی کرید کرتا ہے یہ سمجھ کر اندازہ و قرائن سے کام نکالا مگر دروغ کو فروغ نہیں ہوتا۔ آخر کبھی نہ کبھی جھوٹ طشت از بام ہو کر رہتا ہے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار برس کے بعد یہ وقت رکھا تھا۔

جابر بن عبداللہ والی حدیث

حضرت جابر بن عبداللہ کی طرف جو حدیث منسوب کی گئی ہے اس کی روایت حضرت جابر سے محمد بن عبدالمنکدر کرتے ہیں اور ان سے صرف دو شخص عباد بن کثیر اور یزید الرقاشی۔ یزید بن ابان البصری الرقاشی کے بارے میں تہذیب التہذیب میں ہے کہ امام شعبہ فرماتے تھے کہ میں ان سے حدیث روایت کرنے سے زنا کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ اس کی حدیث لکھنی نہیں چاہئے یہ سخت منکر الحدیث ہے۔ نسائی اور حاکم نے کہا کہ یہ متروک الحدیث غیر ثقہ ہے اور یہ بھی کہا کہ اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ وغیر ذلک۔

اور عباد بن کثیر البصری کو نقاد نے وضاع و کذاب لکھا ہے۔ عباد بن کثیر سے اس حدیث کی روایت عباد بن صہیب۔ ۔ ۔ کرتے ہیں جو اپنے استاد عباد بن کثیر سے بھی زیادہ اکذب الناس ہیں۔ ؎

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

ابن عباسؓ والی حدیث

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب دو حدیثیں ابو بکر خطیب نے کفایہ میں اس موقع پر نقل کی ہیں جن میں سے ایک مذکورہ بالا قسم کی حدیث ہے وہ یہ ہے۔ ابو بکر خطیب لکھتے ہیں مجھے خبر دی حسن بن ابی طالب نے ان سے عمر بن احمد بن عثمان الواعظ نے ان سے احمد بن اسحٰق بن البہلول نے ان سے ان کے والد (اسحٰق بن بہلول) نے۔ ان سے سمرۃ بن حجر نے ان سے حمزہ بن ابی حمزۃ النصیبی نے ان سے عمرو بن دینار نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بال اصحاب الحشایا یکذبونی یوشک احدکم یتکئ علی فراشہ یأکل مما افاء اللہ علیہ فیؤتی بحدیث عنی الاحادیث یقول لا ارب لی فیہا۔ عندنا کتاب اللہ ما نہاکم عنہ فانتہوا وما امرکم بہ فاتبعوہ۔

یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ کیا حال ہے فرشوں والوں کا کہ جھٹلاتے ہیں مجھکو۔ عنقریب کوئی تم میں کا اپنے فرش پر تکیہ لگائے کھاتا ہوگا جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے تو اس کے پاس میری حدیثوں میں کوئی حدیث بیان کی جائیگی تو وہ کہے گا کہ مجھکو ان سے کچھ کام نہیں۔ ہمارے

پاس کتاب اللہ ہے، جس سے کتاب اللہ نے تمہیں روکا ہے اس سے باز رہو اور جس کا تمہیں حکم دیا ہے اس کا اتباع کرو۔[ا]

اس روایت میں وہ مثلہ معہ وغیرہ الفاظ تو نہیں ہیں مگر مضمون وہی ہے تو اب اس کے راویوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ ابوبکر خطیب کے بعد ان کے شیخ سے پانچ سیڑھی تک تو مجاہیل اور غیر معروف لوگوں کے نام ہیں۔ چھٹے صاحب حمزہ بن ابی حمزہ النصیبی ہیں۔ جن کے بارے میں ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ یہ عام طور سے جو حدیث بھی روایت کرتے ہیں وہ منکر ہی ہوا کرتی ہے اور موضوع۔ ثقہ لوگوں سے یہ موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا ہے۔ ابن عدی نے کہا کہ یہ خود حدیثیں گھڑا کرتا ہے۔ وغیر ذلک۔ اب اس کے بعد اس حدیث کے متعلق نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے نہ کچھ پوچھنے کی۔

حضرت ابن عباسؓ کی دوسری حدیث رسول اللہ صلعم سے نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ سے منسوب ہے اور مسئلہ رجم سے متعلق ہے مسئلہ رجم کے متعلق بھی ایک مسودۂ مضمون میرے پاس تیار ہے مگر نظر ثانی اور صاف کرنے کا محتاج ہے اللہ نے چاہا تو کبھی وہ چیز بھی ہدیۂ ناظرین ہوگی بہرحال یہاں چونکہ یہ چیز سامنے آگئی ہے تو اس کی تنقید پیش کئے دیتا ہوں:

ابوبکر خطیب کفایہ میں روایت کرتے ہیں حسن بن ابی بکر سے، وہ ابو سہل احمد بن محمد بن عبداللہ بن زیاد القطان سے۔ وہ اسمٰعیل بن اسحاق القاضی سے، وہ عبداللہ بن محمد بن اسماء سے، وہ مالک بن انس۔ وہ زہری سے وہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود سے وہ عبداللہ بن عباسؓ سے کہ انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلعم کو مبعوث کیا اور ان پر کتاب اتاری اور جو کچھ نازل کیا تھا آنحضرت صلعم پر اس میں آیۂ رجم بھی تھی تو ہم لوگوں نے پڑھا اس کو اور سمجھا اس کو اور یاد کیا اس کو۔[۲] اور رسول اللہ صلعم نے رجم کیا اور آپ کے بعد ہم لوگوں نے رجم کیا۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ لوگوں پر طول زمانہ گزر جائے تو کوئی شخص کہے کہ ہم کتاب اللہ میں آیۂ رجم نہیں پاتے ہیں تو ترک ہو جائے ایک فریضہ جس کو اللہ نے نازل کیا ہے تو بیشک رجم کتاب اللہ میں ہے حق ہے اس پر جو زنا کرے جب کہ وہ شادی شدہ ہو مردوں سے اور عورتوں سے جب کہ بیّنہ (گواہ در دلیل) اس پر قائم ہو جائے اگر وہ حمل ہو، یا اعتراف ہو۔

اس حدیث کے سلسلۂ اسناد میں اسمٰعیل بن اسحاق القاضی کا نام آپ نے دیکھا ان کے متعلق ابن حجر لکھتے ہیں کہ کان یضع الحدیث یعنی یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ باقی تفصیلی بحث انشاء اللہ مسئلہ رجم والے مضمون میں آئیگی۔ یہاں اتنا ہی بہت ہے۔

علقمہ والی روایت

اب رہ گئی صرف علقمہ والی روایت یہ بھی کوئی حدیث نبوی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی صریح تعلق مثلہ معہ والے مضمون سے ہے۔ بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک استدلال ان سے روایت کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ ابوبکر خطیب

[ا] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو حدیث اس کے بالکل برعکس بخاری میں ہے وہ آگے متن میں آتی ہے۔ بتائیے یہ حدیث صحیح ہے یا صحیح بخاری والی؟ ۱۲ منہ

[۲] آیت رجم قرآن کی اور دوسری آیتوں کی طرح جب اتری اور صحابہؓ نے اس کو پڑھا سمجھا اور یاد بھی کیا پھر اس پر عمل بھی ہوتا رہا عہد نبویؐ میں اور عہد خلفائے راشدین میں بھی تو پھر قرآن سے اس کو خارج کس نے کیا؟ اور یہ کیوں قرآن سے نکال باہر کی گئی کہ بعد والوں کو اس کے متعلق شبہ ہونے کا اسی وقت لوگوں کو گمان ہوا تھا کہ کوئی آیت منزل من اللہ نہیں ہے؟ اگر یہ واقعی حضرت عمرؓ کا قول ہوتا تو حضرت عمرؓ ضرور کو واضح فرما دیتے کہ فلاں وجہ سے اس آیت کو قرآن میں لکھا نہیں گیا۔ اس روایت کے الفاظ ہی اس کے کذب و افترا کی شہادت دے رہے ہیں۔ ۱۲ منہ

روایت کرتے ہیں عبداللہ بن یحییٰ العسکری سے وہ محمد بن احمد بن الحسن سے وہ بشر بن موسیٰ سے وہ حمیدی سے وہ سفیان سے وہ منصور بن معتمر سے۔ وہ ابراہیم نخعی سے وہ علقمہ سے کہ بنی اسد کی ایک عورت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئی اور اس نے ان سے کہا کہ مجھکو خبر ملی ہے کہ تم نے ایسے ایسے کہا ہے واشمہ[1] اور مستوشمہ کے متعلق۔ تو وہ کون سی قرأت ہے دونوں کے درمیان میں تو نہیں پاتی ہوں جس کو تم کہتے ہو اور میں اپنے متعلق اس کی وجہ سے گمان کرتی ہوں کہ میں ہلاک ہو جاؤں گی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے کہا کہ جا گھر میں داخل ہو اور غور سے دیکھ۔ تو میں داخل ہوئی اور میں نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا تو پھر نکلی اور کہا حضرت ابن مسعودؓ سے کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس سے فرمایا کیا تو نے نہیں پڑھا ما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ تو اس عورت نے کہا کہ ہاں۔ تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہی ہے۔

یہ استدلال ان روایت پرست راویان حدیث کا بہت پرانا مگر سخت بودا استدلال ہے اور اس کو قوی و مستحکم کرنے کیلئے اس استدلال کو کبھی امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے کبھی کسی کی طرف اور یہاں کفایہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف اسکو منسوب کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں ابوبکر خطیب کے شیخ اور شیخ الشیخ تو مجہول الحال ہیں مگر ان کے شیخ الشیخ کے شیخ بشر بن موسیٰ عجیب غریب شخص ہیں معروف بھی اور مجہول بھی۔ مجہول اسلئے کہ رجال کی تمام کتابیں چھان ڈالئے کہیں آپ کو بشر بن موسیٰ کا پتا نہیں مل سکتا۔ اور معروف اس حیثیت سے کہ اگر "بشر" کی شین پر تشدید دیکر اور زبر دیدیجئے اور اس کو بشّار بن موسیٰ پڑھئے تو پھر بشّار بن موسیٰ کو رجال کی جس کتاب میں ڈھونڈیئے آپ کو مل جائیں گے۔ مگر محدثین محض بخیال تدلیس سلسلۂ روایت میں ان کا نام ہمیشہ بغیر الف ہی کے لکھتے ہیں تاکہ ناواقف غریب کتب رجال میں اگر بے الف والے کو ڈھونڈے تو کہیں نہ ملے اسلئے کہ اس نام کا کوئی راوی حدیث ہے ہی نہیں اور الف کے ساتھ دیکھے تو سمجھے کہ یہ تو الف والا کوئی اور ہے۔ اور ہے درحقیقت یہی الف والا بشّار بن موسیٰ جس کے متعلق ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں عمرو بن علی نے انھیں ضعیف الحدیث کہا۔ نسائی نے غیر ثقہ کہا۔ امام بخاری نے منکر الحدیث کہا۔ ابن معین نے بھی غیر ثقہ کہا اور دجالوں میں شمار کیا۔ وغیر ذلک ۲۲۸ھ میں دنیا سے سدھارے۔

غرض اس باب میں جتنی حدیثیں ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی کفایہ میں لکھی تھیں اور بھی بعض دوسری کتابوں میں شائع والی روایتیں ملیں میں نے ان سب کی تنقید کرکے دکھا دی کہ یہ سب روایتیں دراصل اہل شام خصوصاً اہل حمص و اہل نیشاپور اور خراسان و کوفہ و بصرہ و واسط والوں کی من گھڑت حدیثیں ہیں جو ایک مستقل سازش کے ماتحت گھڑی گئیں اور ان کی اشاعت کی گئی اور مصنفین کتب حدیث کی کتابوں میں کسی طرح سے داخل کرا دی گئیں جن کی کتابوں میں داخل کی جا سکیں۔

حرمتِ حُمُرِ اہلیّہ | ان بائیس طرق میں سے بعض طرق میں حمر اہلیہ یعنی پالتوگدھے کے گوشت کی حرمت کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ اوپر ۵۵

[1] یعنی گودنا گودوانے والی۔ [2] یہ آیت سورۂ حشر کے پہلے رکوع میں ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں وارد ہے عموم الفاظ سے مفہوم کو وسعت بھی دی جائیگی تو کسی مناسبت کے ساتھ نہ کہ بے جوڑ۔ مال غنیمت پر صدقات و زکوٰۃ وغیرہ کی تقسیم میں بھی اس آیت کا عموم لفظاً اثر انداز ہو سکتا ہے نہ کہ اس کے تحت میں حدیثیں بھی زبردستی کھینچ لی جائیں۔ بہرحال اگر حدیثیں بھی اسکے عموم میں کھینچکر داخل کر لی جا سکتی ہیں تو صحیح حدیثیں جو واقعی ما اتٰکم الرسول ہوں نہ کہ وضاعین و کذابین کی من گھڑت روایت؟ جو حدیثیں قرآن کے خلاف ہوں وہ تو ما نھٰکم عنہ میں داخل ہیں نہ کہ ما اتٰکم میں ۱۲ منہ

میں جو حضرت مقدام بن معد یکرب سے ایک روایت بطور مثال پیش کی گئی ہے اس میں پالتو گدھے کے گوشت کی حرمت کا ذکر موجود ہے ان بائیس طرق میں سے چھ طرق میں حضرت مقدام کی طرف جو دس طرق منسوب ہیں ان میں سے پانچ طرق میں اور حضرت عرباض کی طرف تو ایک ہی حدیث منسوب ہے۔ اس ایک حدیث میں پالتو گدھے کی حرمت کا ذکر ہے۔ اور ابو رافع یا جابر بن عبداللہ وغیرہم کی روایتوں میں پالتو گدھے کا ذکر ہی نہیں ہے اور صرف مقدام بن معد یکرب کی دو روایتوں میں جن میں عبدالرحمن بن مہدی کا نام اسناد میں مذکور ہے یوم خیبر کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن چند چیزوں کو حرام کیا اور جو کچھ فرمایا کہ قرآن کے علاوہ بھی ہمیں قرآن ہی کے برابر ملا ہے، یا جس کو رسول اللہؐ نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ نے حرام کیا وغیر ذلک۔ یہ سب خیبر ہی کے دن فرمایا۔ تو ان بائیس طرق میں سے صرف دو طرق میں یوم خیبر کا ذکر ہے۔ چونکہ ان بائیسوں طرق کے گھڑنے والے خراسانی، شامی، کوفی اور دوسرے عراقی وغیرہ ہیں جن میں شیعوں کی بھی کافی تعداد تھی اسلئے حمر اہلیہ کے گوشت کی حرمت کا تو ذکر کیا مگر متعہ کی حرمت کا ذکر کسی ایک روایت میں بھی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیثوں میں یوم خیبر میں بعض چیزوں کی حرمت یا ممانعت کا ذکر ہے جن میں عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی حرمت کا بھی ذکر ہے اور یہ سب لغویات کہ "ہم کو قرآن ملا ہے اور "مثلہ معہ" بھی"۔ یا "جس کو رسول اللہؐ نے حرام کیا وہ اس کے مثل ہے جس کو اللہ نے حرام کیا"۔ اور یہ کہ "عنقریب ایک شخص اپنے تخت پر تکیہ سے اڑا کہے گا کہ ہم کو حدیث کی ضرورت نہیں قرآن ہمارے لئے کافی ہے"۔ وغیر ذلک۔ یہ سب بخاری و مسلم کی کسی ایک روایت میں بھی نہیں ہے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیثیں

صحیح بخاری میں "باب لحوم الحمر الانسیہ" ایک مستقل باب باندھ کر اس باب میں آٹھ حدیثیں درج کی ہیں۔ جن میں سے بعض میں یوم خیبر کی تصریح موجود ہے اور بعض میں لحوم الحمر کے ساتھ سباع ذی ناب (نوکیلے دانت والے درندے) کی بھی حرمت کا ذکر ہے اور بعض میں متعہ کی حرمت کا بھی۔

اسی طرح صحیح مسلم میں بھی "باب تحریم اکل لحم الحمر الانسیہ" کے تحت میں سترہ[17] حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان میں بھی بعض میں یوم خیبر کا ذکر موجود ہے اور بعض میں متعہ کی حرمت کا بھی ذکر موجود ہے مگر بخاری و مسلم کی ان پچیس حدیثوں میں سے کسی ایک میں بھی وہ مثلہ معہ وغیرہ خرافات جو کتاب ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ و مسند احمد کی بائیس حدیثوں میں مذکور ہیں کہیں ان کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اضافے خراسان و نیشاپور و شام و کوفہ و دیگر بلاد عراق میں بعد کو گھڑے گئے اور متاخرین کی کتابوں میں ان کے داخل کر دینے کا موقع مل گیا۔ مگر متقدمین کی کتابیں جن کی نقلیں کافی طور سے ممالک اسلامیہ میں اس وقت شائع ہو چکی تھیں ان میں بعد میں داخل کرنے کی گنجائش نظر نہ آئی۔ اسی لئے موطا اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یہ اضافے درج نہ ہو سکے۔

محدثین کی کتابوں میں جھوٹی حدیثیں داخل کر دی جاتی تھیں

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اپنی کتاب تحفہ اثنا عشریہ ص۶۹ کید سی و دوم[32] مطبوعہ نول کشور میں تحریر فرماتے ہیں :-

در شہر دہلی در عہد بادشاہ محمد شاہ دو کس بودند از امرائے ایں فرقہ یعنی مرتضیٰ خان و مرید خان کہ کتب اہل سنت را مثل صحاح ستہ و مشکوٰۃ و بعضے تفاسیر بخط خوش مے نویسانیدند و دراں احادیث مطلب خود از کتب امامیہ برآوردہ داخل مے نمودند و آں نسخ را مجدول و مطلا مذہب نمودہ بقیمت سہل در گذری مے فروختند۔ و در اصفہان آغا ابراہیم بن علی شاہ، کہ یکے از امرائے کبار سلاطین صفویہ بود ہمیں اسلوب عمل کردہ۔

مگر یہ کوئی نیا دستور اس جماعت کا نہ تھا۔ ابتدا سے روافض اور ملاحدۂ عجم جو خراسان، شام، عراق اور مصر وغیرہ میں تخریبِ اسلام کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے، ان میں سے ایک جماعت کا یہی دستور تھا چنانچہ ابن حجر تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۶۱ ترجمہ قتیبہ بن سعید بن جمیل میں لکھتے ہیں کان خالد المداینی یدخل الحدیث علی الشیوخ۔ خالد مداینی اساتذۂ حدیث کی کتابوں میں حدیثیں داخل کر دیا کرتا تھا اس کی موت ۲۱۱ھ میں ہوئی۔

حماد بن سلمہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ان بعض الکذابین دخل فی حدیثہ ما لیس منہ بعض کذابین نے ان کی حدیثوں میں ایسی حدیثیں داخل کر دیں جو ان میں نہ تھیں۔ آگے چل کر صاف لکھتے ہیں کہ انھا دست فی کتبہ یعنی وہ حدیثیں ان کی کتابوں میں داخل کر دی گئیں۔

وَرّاقین وکُتّاب ان وضاعین وکذابین میں کچھ لوگوں نے وراقی یعنی جلد بندی اور کتابت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا جو محدثین کے تلامذہ میں داخل ہو کر پہلے محدثین میں اپنا رسوخ قائم کرتے تھے پھر اپنا پیشہ ظاہر کر کے ان سے کتابت کے لئے یا وراقی کے لئے ان کی کتابیں لیکر ان میں ... اپنی طرف سے حدیثیں داخل کر دیا کرتے تھے اور ان کی حدیثوں میں گھٹا بڑھا بھی دیتے تھے۔ ابن حجر احمد بن جوصا کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ان کا ایک وراق تھا جو ان سے حدیثیں پڑھتا بھی تھا اور ان کی کتابیں نکالنا رکھتا بھی تھا۔ تو اس سے ان کی کچھ ان بن ہو گئی تو انھوں نے اس کی جگہ ایک دوسرا وراق رکھنا چاہا تو اس پہلے وراق نے ان کی کتابوں میں کچھ ایسی حدیثیں داخل کر دیں جو ان کی حدیثیں نہ تھیں بن کو یہ نادانستہ اپنی حدیثیں سمجھ کر روایت کرنے لگے۔ (لسان المیزان ج ۱ ص ۱۴۲)

حبیب بن ابی حبیب ابو محمد البصری۔ امام مالک کا کاتب تھا۔ وراقی بھی کیا کرتا تھا۔ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں اس کا مفصل حال لکھتے ہیں اور اس کو "اکذب الناس" لکھا ہے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ مدینے میں وراقی کرتا تھا محدثین کی کتابوں کی، اور ثقہ لوگوں سے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ ان کی کتابوں میں وہ حدیثیں داخل کر دیتا تھا جو ان کی حدیثیں نہیں ہوتی تھیں۔ لکھا ہے کہ اس کی کل حدیثیں موضوع ہی ہوا کرتی تھیں۔ ۲۱۱ھ میں مرا۔ (میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۱۰)

غرض جب یہ زبردست سازش تھی تو اگر صحاح ستہ اور خود مؤطا میں بھی بعض موضوع حدیثیں داخل کر دی گئی ہوں تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بخاری ومسلم کو حدیث کی دوسری کتابوں کے اعتبار سے ہم بھی زیادہ صحیح سمجھتے ہیں مگر ان کی حفاظت کا وعدہ قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا ہے۔ اسلئے اگر ان میں بھی دوسری کتابوں سے کم ہی سہی مگر تصحیف وتحریف ہوا اور کچھ غلط حدیثیں داخل کر دی گئی ہوں اور بعض صحیح حدیثیں ان میں سے نکال دی گئی ہوں تو ان منافقین وملاحدۂ عجم کی زبردست سازش کے ہوتے کیا استحالۂ عقلی لازم آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا وعدہ صرف قرآن مجید ہی کے متعلق ہے اسلئے باوجود اتنی گہری سازشوں اور اسقدر اختلافاتِ قرأت کے زبردست پروپگنڈے کے ساری دنیائے اسلام میں صرف وہی ایک قرأت متواترہ وتوارثہ مروج ہے جو عہدِ نبوی سے آج تک ثابتۃً تلاوۃً، قراءۃً اور حفظاً چلی آرہی ہے اور دوسری قرأتیں صرف مدعیانِ قرأت کے مجلدات تفسیر اور روایات کے دفاتر اور فقہاء کی کتابوں ہی میں مدفون ہیں ثابت وتلاوت وقرأت وحفظ سے ان قرأتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ تو جو حفاظت اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کیلئے مخصوص رکھی ہے تو اس کو صرف قرآن ہی کیلئے مخصوص رہنا چاہئے۔ دوسری کوئی کتاب اس حفاظت ومحفوظیت میں اس کی شریک نہیں ہو سکتی۔

ن عباسؓ کی حدیث بخاری میں اگر صحیح بخاری ہی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت تو یہ ہے کہ انھوں نے پالتو گدھے کے گوشت کے حرام ہونے کو

انکار کیا اور قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الآیہ[1] یعنی حضرت ابن عباسؓ نے قرآن سے استدلال کیا کہ بس قرآن نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہی حرام ہیں ان کے سوا اور کسی چیز کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دیکھئے بخاری باب لحوم الحمر الانسیہ ج ۲ ص ۔ جسکی شرح میں ابن حجر فتح الباری میں حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول اور نقل فرماتے ہیں لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جاہلیت والے بعض چیز کھاتے تھے اور بعض چیز کو ترک کر دیتے تھے اس کو نجس سمجھ کر۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا اور ان پر اپنی کتاب اتاری اور اس کتاب کے بتائے ہوئے حلال کو حلال کیا اور اسکے بتائے ہوئے حرام کو حرام کیا۔ تو جس کو اس کتاب میں حلال کیا ہے وہ حلال ہے اور جسکو اس کتاب میں حرام کیا ہے وہ حرام ہے اور جس سے سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف ہے اور یہ آیت پڑھی قل لا اجد[1] آخر تک (فتح الباری پ ۲۳ ص ۳۱۳ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی)۔

اب بتائیے حضرت ابن عباسؓ کی طرف جس حدیث کو حمزہ بن ابی حمزہ النصیبی جیسے وضاع وکذاب کی روایت سے منسوب کرکے ابوبکر خطیب اپنی کتاب کفایہ میں نقل کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث صحیح ہے جسکو امام بخاری اپنی کتاب صحیح بخاری میں روایت کر رہے ہیں اور ابن حجر فتح الباری میں نقل کر رہے ہیں؟

مشکوٰۃ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قرآن پانچ عنوانات پر اترا ہے حلال وحرام اور محکم ومتشابہ اور امثال۔ تو اسی کے حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو اور محکم پر عمل کرو اور متشابہ پر ایمان رکھو اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔ دوسری حدیث حضرت ابوثعلبۃ الخشنی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ فرائض فرض کئے ہیں ان کو ضائع نہ کرو اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے تو ان کی خلاف ورزی نہ کرو اور کچھ حدود مقرر کئے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور بغیر بھول چوک کے بعض چیزوں سے قصداً سکوت اختیار کیا ہے، ان کی کرید میں نہ پڑو۔

ترکِ بعض وحی

اگر واقعی رسول اللہ صلعم کو قرآن کے ساتھ "مثلہ معہ" بھی ملا تھا تو پھر آخر جس طرح آپ نے قرآن کی کتابت تلاوت وقراءت وحفظ کا اور اسکی تعلیم کا انتظام فرمایا، حدیثوں کو کیوں بالکل چھوڑ دیا؟ کیا آنحضرت صلعم نعوذ باللہ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَى إِلَيْكَ کے خود کے مصداق بنے؟ یعنی جو آپ سے فرمایا گیا کہ شاید تم بعض وحی کو چھوڑ دو گے ان کفار ومشرکین کے خیال سے؟ (ہود ع ۲) تو آپ نے اس مثلہ معہ کو جو قرآن کے ساتھ آپ کو ملا تھا خود سے چھوڑ دیا اور ضائع ہونے دیا؟

سب سے پہلے حسبنا کتاب اللہ کہنے والے

اگر یہ کفایہ وغیرہ کی مثلہ معہ والی حدیثیں صحیح ہوتیں تو حضرت صدیق اکبرؓ پانچسو حدیثوں کو جمع کرکے جلا نہ دیتے اور حضرت فاروق اعظمؓ جمع سنن کا ارادہ کرکے پھر اس سے رک نہ جاتے اور یہ نہ فرماتے کہ "حسبنا کتاب اللہ" یعنی ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کے بعض خطبوں میں یہ موجود ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے حلال کو حلال سمجھو اور قرآن کے بتلائے ہوئے حرام کو حرام سمجھو اور جس چیز سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے اسکی کرید میں نہ پڑو۔ چونکہ طوالت کا خوف ہے ورنہ اس مضمون کے اقوال اکثر صحابہؓ کے ملیں گے اور اسکی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مگر جو لوگ یستمعون القول فیتبعون احسنہ اور من القی السمع وھو شھید کے مصداق ہیں الذی جاء بالصدق وصدق بہ واولئک ھم المتقون کے مطابق سچی بات کے قبول کر لینے کیلئے ہر وقت تیار ہیں ان کیلئے جتنا لکھا جا چکا ہے وہی بہت کافی ہے اور جو لوگ روایت پرستی ہی کو دین سمجھتے ہیں ان کی ہٹ دھرم طبیعت کیلئے لاکھ دلائل پیش کئے جائیں وہ تو ماننے والے ہی نہیں ہیں اسلئے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں واللہ الموفق والھدایۃ امور من لدیہ والمرجع والمعاد الیہ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ وصلی اللہ علی سیدنا محمد والہ وصحبہ وبارک وسلم واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

[1] اس آیت کی تفسیر اور ترجمے میں مفسرین ومترجمین ومحدثین نے صحیح راہ نہیں اختیار کی ہے اس روایت میں یہ عنوان بیان غلط ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کو اس طرح پیش فرمایا۔ راوی نے کچھ گڑبڑ کی ہے میرا ایک رسالہ ہے الحلال والحرام من کلام اللہ العلام اس میں قرآن مبین سے حلال وحرام کی مفصل بحث بھی ہے اور اس آیت کی صحیح تفسیر

نقد و نظر

اسلام اور فطرت

"اسلام دین فطرت ہے" یہ ایک ایسی آواز ہے جو مدت سے سنائی دیتی چلی آرہی ہے لیکن آج تک کوئی یہ نہیں بتا سکا کہ فطرت کہتے کسے ہیں اور اسلام کس طرح دین فطرت ہے۔ زیر نظر کتاب شیخ عبدالعزیز شاویش (مصری) کی کتاب "الاسلام دین الفطرت" کا اردو ترجمہ ہے۔ لیکن اس میں بھی یہ دعویٰ شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا بلکہ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غلامی مقتضائے فطرت کے مطابق ہے۔ کتاب کا ترجمہ ابو تمکین افتخار احمد صاحب نے کیا ہے جو جماعت اسلامی کی مذہبیت سے کافی متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ جہاں جہاں مصنف کوئی عقل کی بات کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی جماعت کے انداز کے دلائل سے اسے پھر سے توہم پرستیوں کی طرف لیجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتاب مکتبۂ ایوانِ اشاعت آرام باغ روڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور قیمت عہ۸ر ہے۔

حیات جمال الدین افغانی

رضا ہمدانی صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں (جو ایک سو انیس صفحات پر مشتمل ہے) سلجھے ہوئے انداز میں جمال الدین افغانی کے کوائف حیات کو بیان کیا ہے کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے اور کتاب عہ۱۲ر میں گوشۂ ادب انارکلی لاہور سے مل سکتی ہے۔

روح، قرآن اور سائنس

یہ کتاب نہیں جہالت اور جرارت کی امتزاجی کوشش ہے۔ جہالت اس لئے کہ یورپ کے کچھ مداریوں نے کچھ عرصہ پہلے روحوں کے ساتھ ملاقاتیں کرنے کا تفریحی پروگرام اختیار کیا تھا۔ یہ صاحب اسے حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں اور جرارت اس لئے کہ اس لغویت کی تائید میں بزعم خویش قرآن کی آیتیں پیش کر رہے ہیں۔ ایسی کتابوں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی کمیٹی ایسی ہونی چاہئے جو ہر کتاب کو اس کی اشاعت سے پہلے دیکھ لیا کرے۔ مصنف کے ساتھ پبلشر نے بھی کچھ کم جرارت کا ثبوت نہیں دیا جس کی طرف سے کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ "کتب بینی سب سے بڑی عبادت ہے"۔ یہ کتاب بھی گوشۂ ادب ہی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور قیمت عہ۸ر ہے۔

قطعات و رباعیات اکبر الہ آبادی

بزم اکبر کراچی نے اکبر اور اکبر کی شاعری کے متعلق تالیفات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر نظر کتابیں (قطعات و رباعیات حصہ اول و دوم) اسی کی کڑیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر تمام اصناف سخن میں سے قطعات و رباعیات میں زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اور ان کی تشریح تبویب اور ترتیب میں بھیا احسان الحق صاحب نے محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ مبتدیوں کی سہولت کے لئے ساتھ ساتھ الفاظ کے معانی دیئے گئے ہیں اور نیچے تشریحی نوٹ۔ طباعت کتابت اور جلد کی خوبصورتی بزم اکبر کی روایات کے مطابق ہے حصہ اول

کی ضخامت چار سو صفحات اور قیمت ۸ہے۔ حصہ دوم دو سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ۳ہے۔

المسلمون | عربی زبان میں ماہوار مجلہ جو سعید رمضان صاحب کی زیر ادارت، قاہرہ (مصر) سے شائع ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے پہلے دو پرچے ہمارے سامنے ہیں۔ پرچہ نسخ کے ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپا ہے۔ بدل اشتراک سالانہ دس روپے۔ ششماہی چھ روپے۔ طلباء سے سالانہ آٹھ روپے، ششماہی چار روپے۔

جن حضرات نے مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی ہے وہ مدیر رسالہ، سعید رمضان صاحب سے واقف ہوں گے۔ نہایت گرمجوش، جذباتی، خطیب قسم کے نوجوان۔ رسالہ کے مضامین قریب قریب تمام اساتذۂ مصر کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض قدیم انداز کے، بعض تجدد پسندانہ مسلک کے۔ خالص قرآنی فکر (جس کے کچھ آثار آپ کو پاکستان میں نظر آتے ہیں) کہیں نہیں۔ بایں ہمہ یہ رسالہ عربی دان حضرات کیلئے غنیمت ہے۔ کراچی میں غالباً "کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ روڈ" سے مل سکے گا۔

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن — جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں، فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

قرآنی لٹریچر کی تین اہم کتابیں

(۱) اسلامی نظام

اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں اور وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔
اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے وہ اہم مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سامنے قرآنی فکر کی نئی راہیں کھولدی ہیں۔
ضخامت ۱۸۴ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت مجلد مع گردپوش دو روپیہ صرف (علاوہ محصولڈاک)

(۲) قرآنی دستور پاکستان

حکومت کی طرف سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید، مولوی صاحبان کی طرف سے پیش کردہ بائیس نکات کا تجزیہ، اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات اور ان کی فکر و نظر کے تضادات پر تبصرہ اور اس کے ساتھ اس قرارداد مقاصد اور دستور کے مسودات جنھیں طلوع اسلام نے قرآن کی روشنی میں مرتب کر کے حکومت کے پاس بھیجے۔ غرضیکہ اس مجموعہ میں وہ سب کچھ آ گیا ہے جسے تدوین دستور پاکستان کے سلسلہ میں آپ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے ضخامت تقریباً ۲۴۰ صفحات کتابت، طباعت اور کاغذ دیدہ زیب قیمت مجلد مع گردپوش دو روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

(۳) اسباب زوالِ امت

محترم پرویز صاحب کا وہ معرکہ آرا مقالہ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا اور جس کے لئے کئی بار چھپنے کے باوجود پیہم تقاضے موصول ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ اس کتاب کا نسخہ ہر نوجوان کے سرہانے رہنا چاہئے کیونکہ اس سے ہم دوبارہ زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ ضخامت تقریباً ڈیڑھ سو صفحات۔ کتابت وطباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ مجلد مع گردپوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوع اسلام، رابسن روڈ۔ کراچی

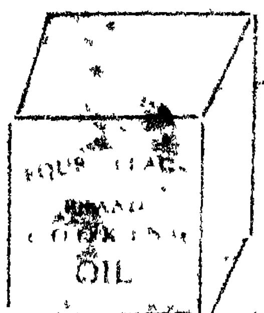
Bengal Oil Mills Ltd

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS
BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil

High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'





BENGAL OIL MILLS. LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by "QUAID-E-AZAM")

Telegrams: "BENGALI" P. O. BOX No. 162 KARACHI-2 Telephone | Office: 33-36 | Mills: 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at ... Tolu-e-Islam Office Robson